1
ZQ

تفسیر مظہری جلد پنجم

تالیف

حضرت علامہ قاضی محمد ثناء اللہ عثمانی مجددی پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ متن

ضیاء الامت حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ تفسیر

زیر اہتمام: ادارہ ضیاء المصنفین ۔ بھیرہ شریف

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور ۔ کراچی ۔ پاکستان

نام کتاب	تفسیر مظہری (جلد پنجم)
تالیف	حضرت علامہ قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ
ترجمہ متن	ضیاء الامت حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ
مترجمین	الاستاذ مولانا ملک محمد بوستان، مولانا سید محمد اقبال شاہ
	مولانا محمد انور مگھالوی
	فضلاء دار العلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ شریف
تعداد	ایک ہزار
اشاعت	دسمبر 2002ء (رمضان المبارک 1323 ہجری)
کمپیوٹر کوڈ	1Z348

ملنے کے پتے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

داتا دربار روڈ، لاہور۔ 7221953

9۔الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ 7225085-7247350

فیکس:۔ 042-7238010

14۔انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی

فون:۔ 021-2210212-2212011-2630411

e-mail:- zquran@brain.net.pk

Website:- www.ziaulquran.com

فہرست

سورۂ یونس

رکوعاتہا ۱۱	سُوْرَۃُ یُوْنُسَ مَکِّیَّۃٌ ۱۰	آیاتہا ۱۰۹

سورۂ یونس مکی ہے اور اس کی ایک سو نو آیتیں اور گیارہ رکوع ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الٓرٰ ۚ تِلْكَ اٰیٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِیْمِ ①

"الف لام را[1]۔ یہ آیتیں ہیں کتاب حکیم کی[2]۔"

[1] یہ حروف مقطعات میں سے ہیں جن پر تفصیلی بحث سورۂ بقرہ کی ابتدا میں گزر چکی ہے۔ ابن کثیر، قالون اور حفص نے آلرا و طسم اکو فتحہ کے ساتھ، ورش نے دونوں لفظوں کے درمیان اور باقی قراء نے امالہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

[2] اس سورت کی آیات یا پورے قرآن کی آیات کی طرف تلک سے اشارہ کیا گیا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا مشار الیہ وہ آیات ہیں جو اس سورت سے پہلے نازل ہوئیں۔ اور کتاب سے مراد قرآن ہے اور اضافت منی ہے 'الحکیم' کتاب کو حکیم کی صفت سے متصف کرنے کی وجہ یا تو یہ ہے کہ یہ حکمت آمیز پند و نصائح اور قصص و واقعات پر مشتمل ہے یا یہ کہ یہ کلام محکم ہے' یا اس کا یہ معنی ہے کہ اس کی آیات محکم ہیں، ان میں سے کوئی آیت منسوخ نہیں ہے۔ یہ معنی اسی صورت میں درست ہوگا جب آیات سے مراد اس سورت کی آیات ہوں۔ یا اس کا یہ مطلب ہے کہ یہ کلام جھوٹ اور اختلاف سے محفوظ اور محکم ہے۔ حضرت حسن بصری فرماتے ہیں اس کو حکیم کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں عدل' احسان' قریبی رشتہ داروں کو عطا کرنے' برائی، بغاوت اور فحش سے رکنے کے احکام دیے گئے ہیں۔ نیز اس میں اطاعت گزار کے لیے جنت اور نافرمان کے لیے دوزخ کا حکم درج ہے۔(1)

ابن جریر نے ضحاک کے حوالہ سے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے جب اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب لبیب ﷺ کو بحیثیت رسول مبعوث فرمایا تو عربوں نے انکار کیا یا ان میں سے بعض نے انکار کیا اور کہنے لگے اللہ تعالیٰ کی شان اس سے بلند ہے کہ وہ کسی انسان کو رسول بنائے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی اس غلط فہمی اور کم عقلی کے شبہ کا ازالہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔(2)

اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَیْنَاۤ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَ بَشِّرِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؔؕ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِیْنٌ ②

"کیا (یہ بات) لوگوں کے لیے باعث تعجب ہے کہ ہم نے وحی بھیجی[1] ایک مرد (کامل) پر جو ان میں سے ہے[2] کہ ڈراؤ لوگوں کو اور خوشخبری دو انہیں جو ایمان لائے کہ[3] کہ ان کے لیے مرتبہ بلند ہے ان کے رب کے ہاں[4] کفار نے کہا بلاشبہ یہ جادوگر ہے کھلا ہوا[5]"

[1] اظہار تعجب کے لیے یہ استفہام انکاری ہے' عجباً کان کی خبر ہے اور ان اوحینا اس کا اسم ہے' الناس پر لام ایک لفظ محذوف کے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 136 (الفکر)　2۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 535 (الفکر)

متعلق ہے جو عجبا سے حال ہے۔ لام اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ اس فعل پر تعجب کرتے تھے اور آپ ﷺ سے یہ بات بطور مذاق اور انکار کرتے تھے۔ عجب' انسان کی اس کیفیت کو کہتے ہیں جو اسے خلاف عادت چیز نظر آنے پر لاحق ہوتی ہے۔ ان کے اس استعجاب اور حیرت پر وجہ انکار یہ ہے کہ تم میرے محبوب کریم کی نبوت پر حیرت و تعجب کیوں کرتے ہو، جبکہ پہلے بھی تو تخلیق آدم سے لے کر آج تک بشر بحیثیت رسول مبعوث ہوتے رہے ہیں، میرے نبی مکرم محمد مصطفےٰ ﷺ کا نبی مبعوث ہونا کوئی نئی اور اچنبھے کی بات نہیں ہے جیسا کہ قرآن گواہ ہے کہ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى"۔ ترجمہ: اور ہم نے (رسول بنا کر) نہیں بھیجے آپ سے پہلے مگر مرد جن کی طرف ہم نے وحی بھیجی بستی والوں سے۔ بلکہ انسان کا انسانوں کی طرف بحیثیت نبی و رسول مبعوث ہونا عین حکمت ہے کیونکہ افادہ اور استفادہ کے لیے باہمی مناسبت ہونا ضروری ہوتا ہے دوسرا یہ ایک دستور بھی ہے کہ جب بھی کوئی بادشاہ کسی قوم کی طرف خط لکھتا ہے یا ان سے خطاب کرتا ہے تو ان کی زبان میں کرتا ہے اور جب کوئی پیغام رساں بھیجتا ہے تو ان کی جنس سے بھیجتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ۝ (اے محبوب مکرم) فرمایئے اگر ہوتے زمین میں (انسانوں کی بجائے) فرشتے جو اس پر چلتے (اور اس میں) سکونت اختیار کرتے تو ہم (ان کی ہدایت کے لیے) ان پر اتارتے آسمان سے کوئی فرشتہ رسول بنا کر۔

۲؎ عام لوگوں میں سے ایک کو رسول بنایا۔ ان کی کسی سرکردہ شخصیت کو یہ عظمت عطا نہیں فرمائی۔ وہ کہتے اگر کسی انسان کو ہی رسول بنانا ضروری تھا تو محمد (ﷺ) کے علاوہ کسی عظیم شخصیت کو بنایا جاتا' اگر کوئی بشر ہی نبی بنانا تھا تو محمد (ﷺ) کے علاوہ شخصیات رسالت کی زیادہ مستحق موجود تھیں، انہیں یہ شرف بخشا جاتا' جیسا کہ سورۂ زخرف میں ان کے قول کی طرف اشارہ فرمایا ہے لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ۝۔ یہ قرآن (مکہ و طائف) کے دونوں شہروں میں سے کسی عظیم اور رئیس شخصیت پر کیوں نہ اتارا گیا۔ یعنی کسی ایسے شخص پر کیوں نہ قرآن نازل کیا گیا۔ جو محمد (ﷺ) سے افضل ہوتا۔ ان کا مقصود مکہ سے ولید بن مغیرہ اور طائف سے مسعود بن عمرو الثقفی تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس خیال فاسد کا رد کرتے ہوئے فرمایا اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ" الآیہ۔ کیا وہ تقسیم کرتے ہیں آپ کے رب کی رحمت کو ان کا یہ کہنا کہ کسی عظیم آدمی پر نبوت کا تاج سجایا جاتا جس کے آگے لوگ دبے رہتے، ایک یتیم مکہ کا انتخاب کسی لحاظ سے بھی حکمت پر مبنی نہیں' یہ ان کی انتہائی حماقت اور وحی کی حقیقت سے جہالت کی وجہ سے تھا۔ کیونکہ وحی کا شرف اور نبوت کی عظمت کا دارومدار مال و دولت اور جاہ و حشمت پر نہیں بلکہ اس کے لیے تو اوصاف کمالیہ اور اخلاق جمیلہ سے متصف ہونا ضروری ہے۔ اور یہ اوصاف اور کمالات آپ ﷺ کی ذات میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں فقر و درویشی اس باب میں زیادہ معاون و ممد ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ سے پہلے اکثر انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام بھی اسی فقر و درویشی کی صفت سے متصف تھے۔

۳؎ ان مفسرہ ہے یا مخففہ من التثقیلہ ہے یعنی اصل میں ان (نون مشدد) کے ساتھ تھا پھر مخففہ بنایا گیا۔ اور یہ اوحینا کا مفعول ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انذار (ڈرانے) کو عام لوگوں کے لیے ذکر فرمایا ہے، جبکہ بشارت (خوشخبری) کے لیے مخصوص (صاحب ایمان) لوگوں کا ذکر کیا ہے کیونکہ انذار کی ضرورت ہر بڑے چھوٹے کو ہوتی ہے مگر خوشخبری ہر انسان کے لیے نہیں بلکہ یہ مومنین کے ساتھ خاص ہے' کفار اس کے مستحق نہیں ہیں۔

۴؎ اِنَّ سے پہلے باء حرف جر محذوف ہے۔ عطاء نے فرمایا قدم صدق سے مراد ایسا مقام ہے جس میں زوال ہے اور نہ اس میں کسی قسم کی

تگی ہے، یعنی بلند درجہ ہے جس کی طرف مومن جلدی جائیں گے۔ اور اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اس مقام کو قدم سے تعبیر کیا ہے کیونکہ چلنا اور ٹھہرنا قدم کے ساتھ ہوتا ہے۔ جیسا کہ نعمت کو ید (ہاتھ) کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ ہاتھ کے ساتھ عطا کی جاتی ہے قدم کی صدق کی طرف اضافت اس کے تحقیق کی وجہ سے ہے اور اس بات پر آگاہ کرنے کے لیے ہے کہ انہوں نے یہ عظمت اور بلند مرتبہ صدق مقال اور صدق نیت کی وجہ سے حاصل کیا ہے۔ سب سے سچا قول لا الہ الا اللہ کی شہادت ہے۔ حضرت ابن عباس کے قول کا مرجع بھی ہمارا قول ہی ہے کیونکہ انہوں نے قدم کی تفسیر یہ کی ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اچھے اعمال کا اچھا بدلہ عطا فرمائے گا۔ ضحاک کے قول کا مطلب بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں صدق کا ثواب عطا فرمائے گا کیونکہ اللہ کے نزدیک مرتبہ کو اجر اور ثواب سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ الحسن فرماتے ہیں اس سے مراد وہ عمل صالح ہے جو انہوں نے پہلے کیا تھا (1)۔ پس گویا یہ بشارت ہے کہ انہوں نے جو پہلے نیک اعمال بھیجے تھے ان کا بدلہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پائیں گے۔ اس صورت میں قدم بمعنی تقدم ہے۔ ابو عبید فرماتے ہیں خیر یا برائی میں سبقت لے جانے والے کو قدم صدق کہتے ہیں مثلاً کہا جاتا ہے فلان قدم فی الاسلام۔ فلاں اسلام میں سبقت لے جانے والا ہے و لہ عندی قدم صدق او قدم سوء میرے نزدیک وہ برائی میں یا سچائی میں سبقت لے جانے والا ہے (2)۔ حضرت علی بن ابی طلحہ نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ اس کا مطلب ذکر اول کی سعادت ہے۔

زید بن اسلم فرماتے ہیں اس سے مراد رسول اللہ ﷺ کی شفاعت ہے (3)۔ امام بخاری فرماتے ہیں زید بن اسلم نے فرمایا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ سے مراد محمد ﷺ ہیں۔

۵ کفار نے جب رسول اللہ ﷺ کی طرف سے خارق عادت امور دیکھے اور ایسا کلام سنا جس کا مقابلہ مشکل تھا تو بغض و عناد میں جل کر کہنے لگے یہ رسول تو کھلا جادوگر ہے۔ ابن کثیر اور کوفیوں نے فاعل کے وزن پر ساحر پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے بغیر الف کے لَسِحْرٌ پڑھا ہے اس صورت میں اسم اشارہ قرآن کے لیے ہوگا۔ یعنی یہ قرآن جادو ہے اس لیے ہم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسم اشارہ کا مشار الیہ ہر وہ معجزہ ہو جو انہوں نے دیکھا تھا۔

إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ ۖ يُدَبِّرُ الْأَمْرَ ۖ مَا مِن شَفِيعٍ إِلَّا مِن بَعْدِ إِذْنِهِ ۚ ذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ ۚ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ﴿٣﴾

"بیشک تمہارا رب اللہ تعالیٰ ہے جس نے پیدا فرمایا آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں ۱؎ پھر متمکن ہوا عرش پر (جیسے اسے زیبا ہے) ۲؎ ہر کام کی تدبیر فرماتا ہے ۳؎ کوئی نہیں شفاعت کرنے والا مگر اس کی اجازت کے بعد ۴؎ یہ ہے اللہ تعالیٰ جو تمہارا پروردگار ہے ۵؎ سو عبادت کرو ۶؎ اس کی تو کیا تم غور و فکر نہیں کرتے ہو"

۱؎ تمہارا رب اللہ ہے جس نے زمین و آسمان کو پیدا فرمایا جو تمام ممکنات کی اصل ہیں۔ فی ستۃ ایام دنیا کے چھ دنوں کی مقدار میں اگرچہ وہ قادر و قیوم ان تمام چیزوں کو ایک لمحہ میں بھی تخلیق کر سکتا تھا مگر تثبت اور تدریج کی حکمت کی تعلیم کی غرض سے اتنے عرصہ میں پیدا فرمایا۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 136 (الفکر)　2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 136 (الفکر)　3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 136 (الفکر)

ہے۔ اہل سنت کے قدیم وجدید علماء کا متفق علیہ مسئلہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اجسام اور حدوث کی صفات سے منزہ ومبرا ہے' اہل سنت اس آیت اور اسی جیسی دوسری آیات کے بارے دو قسم کی نظریات رکھتے ہیں۔ ایک یہ کہ ان کی ایسی تاویلات کی جائیں جو ان کے مناسب و موافق ہوں۔ یہ اس صورت میں ہے جب وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ کے قول میں اسم جلالت پر وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ کا عطف کیا جائے۔ اس پر تفصیلی بحث سورۂ آل عمران میں گزر چکی ہے۔ وہ فرماتے ہیں استوی کا معنی استولی ہے، یعنی وہ اپنے عرش پر غالب ہے جو اس کی تمام مخلوق سے عظیم ہے اور تمام جہات کو گھیرے ہوئے ہے۔ اس طرح تمام مخلوقات پر اللہ تعالیٰ کا غلبہ لازم آتا ہے۔ امام بغوی نے استواء کی استیلاء کے ساتھ تاویل کو معتزلہ کی طرف منسوب کیا ہے اور سلف صالحین کی کلام تاویل کو تسلیم نہیں کرتی۔ بلکہ ان کے نزدیک مختار قول یہ ہے کہ ان آیات پر ایمان ہونا چاہیے اور ان کا علم اللہ تعالیٰ کی ذات کو ہے اور ان پر بحث وتحمیص سے اجتناب کرنا چاہیے۔ محمد بن حسن فرماتے ہیں شرق سے غرب تک کے علماء کا اتفاق ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات جو بغیر کسی تفسیر' وصف اور شبہ کے حضور نبی کریم ﷺ سے ثقہ راویوں کے احادیث طیبہ میں اور قرآن میں ہم تک پہنچی ہیں ان تمام پر ہمارا ایمان ہے۔ مگر جس نے ان میں سے کسی آیت کی تفسیر یا تاویل بیان کی وہ نبی کریم ﷺ کے راستہ سے انحراف کر گیا اور جماعت سے جدا ہو گیا۔ حضرت امام مالک بن انس نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے عرش پر متمکن ہونے کی کیفیت ہمیں معلوم نہیں ہے مگر اس کا استوی ہمیں معلوم ہے اور اس کے متعلق گفتگو بدعت ہے۔ اس بناء پر اللہ تعالیٰ کے عرش پر استوی کا قول سلف صالحین سے ثابت ومنقول ہے۔ حالانکہ وہ اللہ کے جسمانیات اور صفات اجسام سے منزہ ومبرا ہونے کا قول بھی کرتے ہیں۔ امام بیہقی نے امام ابوحنیفہ کا قول روایت کیا ہے کہ وہ فرماتے اللہ آسمان میں ہے زمین پر نہیں ہے۔ یہ بھی ان سے روایت ہے کہ جو یہ کہے کہ میں نہیں جانتا کہ میرا رب آسمان میں ہے یا زمین میں تو اس کا کلمہ کفریہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى (بہت مہربان عرش پر متمکن ہوا) اور اس کا عرش تمام آسمانوں کے اوپر ہے۔

امام صاحب سے یہ بھی روایت ہے جس نے اللہ تعالیٰ کے آسمان میں ہونے سے انکار کیا اس نے کفر کیا۔ امام شافعی فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ اپنے آسمان میں عرش کے اوپر ہے، اپنے بندوں کے قریب ہے جیسے چاہتا ہے۔ نزول فرماتا ہے جیسے چاہتا ہے۔ امام احمد بن حنبل کا بھی اسی کی مثل قول ہے' اسحاق بن راہویہ فرماتے ہیں اہل علم کا اجماع ہے کہ وہ عرش کے اوپر متمکن ہے اور ہر چیز کو جانتا ہے' المزنی' ذہبی' بخاری' ابوداؤد' ترمذی' ابن ماجہ، ابن ابی شیبہ' ابویعلی' بیہقی اور دوسرے محدثین کا بھی یہی قول ہے۔

ابو زرعہ الرزای سے بھی یہی لکھا ہے کہ اس پر علماء اہل سنت کا اجماع ہے۔ حضرت عثمان بن سعید الدارمی الحافظ فرماتے ہیں مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں کے اوپر عرش پر ہے۔ حضرت سہل بن عبداللہ التستری فرماتے ہیں کسی مومن کے لیے یہ کہنا جائز نہیں ہے کہ اس ذات کے لیے استواء کیسے ہو سکتا ہے جس نے استوا کو خود پیدا فرمایا اور ہمیں نبی کریم ﷺ کے قول کو تسلیم کرنا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ عرش پر ہے۔ محمد بن جریر فرماتے ہیں انسان کے لیے بس اتنا تسلیم کرنا کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ عرش پر ہے' جو اس سے تجاوز کرے گا وہ خائب وخاسر ہو گا۔ ابن خزیمہ فرماتے ہیں جس نے یہ اقرار نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ ساتوں آسمانوں سے اوپر عرش پر متمکن ہے اور اپنی مخلوق سے جدا ہے' اس نے کفر کیا' مگر اس کی توبہ قبول کی جائے گی' اگر توبہ کرے تو فبہا ورنہ اسے قتل کر دیا جائے گا۔ امام طحاوی فرماتے ہیں عرش وکرسی ہیں جیسا کہ اس نے قرآن میں بیان فرمایا ہے' جبکہ وہ عرش اور دوسری چیزوں سے مستغنی ہے' ہر چیز کا احاطہ کرنے والا ہے اور وہ عرش کے اوپر ہے۔

امام الشیخ ابوالحسن الاشعری اختلاف المصلین ومقالات الاسلامیین میں فرماتے ہیں کہ اہل سنت اور محدثین تمام اللہ تعالیٰ ملائکہ'

رکھنے سے کہ اللہ تعالیٰ تمام صفات عالیہ کا مالک ہے اور وہ یہ بھی تسلیم کرتے تھے کہ احادیث میں جو عرش اور استویٰ کا ثبوت ہے وہ مسلم ہے مگر بلا کیف اور بلا تمثیل ہے اور ذات اپنی مخلوق سے جدا ہے۔ ابن عبدالبر فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ ساتوں آسمانوں کے اوپر عرش پر ہے جیسا کہ جماعت اہل سنت کا عقیدہ ہے۔ الخطیب فرماتے ہیں سلف صالحین استواء عرش کو ثابت بھی کرتے ہیں اور اسے ظاہر پر رکھتے ہیں مگر کیفیت و تشبیہ کی نفی کرتے ہیں۔

امام الحرمین فرماتے ہیں جو چیز دین میں پسندیدہ اور جس کا اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اجر ہے وہ سلف صالحین ائمہ عقیدہ کی اتباع ہے۔ ائمہ سلف تاویل کرنے سے رکتے ہیں اور ظواہر کے اپنے موارد پر اجراء سے بھی اجتناب کرتے ہیں اور ان کے معانی اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتے ہیں۔ امام بغوی فرماتے ہیں اہل سنت کا یہ عقیدہ ہے کہ الاستواء علی العرش اللہ تعالیٰ کی صفت بلا کیف ہے اس پر ایمان لانا واجب ہے(1)' امام بیضاوی فرماتے ہیں عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى کا مطلب وہی ہے جو اس ذات اقدس نے خود مراد لیا ہے۔ اور وہ استواء استقرار اور تمکن سے پاک ہے(2)۔ ابوبکر علی بن عیسیٰ الشبلی جو اپنے زمانہ کے صوفیاء میں سب سے زیادہ عالم تھے۔ وہ فرماتے ہیں رب آسمان میں ہے، فیصلے بھی صادر فرماتا ہے، جو کہتا ہے کر گزرتا ہے' شیخ الاسلام عبداللہ الانصاری فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ ساتویں آسمان میں عرش پر ہے۔ شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی غنیہ میں اس کے متعلق بحث کی ہے۔ یہ تمام اقوال جو میں نے ذکر کیے ہیں امام الذہبی کی کتاب العلو میں موجود ہیں۔ یہی مذہب اہل علم صحابہ کرام تابعین فقہاء و محدثین اور صوفیاء سے منقول ہے جن کے ذکر کرنے سے کلام طویل ہو جائے گی۔ میں یہی مسئلہ مختصراً سورۂ اعراف کی آیت ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۟ یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ کے تحت بھی ذکر کیا ہے۔ اسی طرح سورۂ بقرہ کی آیت یَاْتِیَهُمُ اللّٰهُ فِیْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ کی تفسیر کے ضمن میں بھی ذکر کیا ہے۔ اصحاب قلوب نے جو بعض مخلوقات میں اللہ تعالیٰ کی دائمی تجلیات و برقیات کا ذکر کیا ہے وہ اس چیز کی مقتضی نہیں کہ اللہ تعالیٰ کا حادث ہے یا حوادث کا محل ہے' اور نہ وہ ذات منزہ کے مرتبہ سے نزول فرماتی ہے۔ بلکہ ممکن میں امر کے حدوث پر مبنی ہیں۔ یہ اس لیے ہوتا ہے تا کہ وہ اس تجلی مخصوص کے قابل ہو جائے۔ اس طرح ہم نے تجلی کا مسئلہ قلب مومن کعبہ اور عرش عظیم کے متعلق سورۂ بقرہ میں ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ کے تحت ذکر کیا ہے وہاں سے مطالعہ کیا جائے۔

سے تدبیر کا مطلب یہ ہوتا ہے امور کے متعلق غور و فکر کرنا تا کہ ان کا انجام بہتر ہو، یعنی اللہ تعالیٰ کائنات کے امور کی اس طرح تقدیر فرماتا ہے جو عین حکمت کے مطابق ہوتی ہے۔

ے کوئی شخص شفاعت نہیں کرے گا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور بزرگی کا ثبوت ہے اور اس میں نضر بن حارث کے عقیدۂ باطلہ کا رد ہے کہ وہ کہتا قیامت کے دن لات و عزیٰ میری شفاعت کریں گے۔ نیز اس آیت کریمہ میں اس شخص کے لیے شفاعت کا ثبوت بھی ہے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 481 (الفکر)
2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 4، صفحہ 291 (العلمیہ)

جنہیں اللہ تعالیٰ خود اذن شفاعت عطا فرمائیں گے۔

۵ ان صفات کاملہ کا مالک ہی الہ ہونے کا مقتضی ہے تو وہ اللہ ہی ہے۔ ذلکم مبتدا اور اسم جلالت خبر ہے۔ ربکم خبر ثانی ہے یا مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ پھر مکمل جملہ ماقبل کا بدل ہوگا۔ مطلب یہ ہوگا کہ تمہارا رب ہی عبادت کے لائق ہے اور کوئی ایسا نہیں۔ یا یہ مطلب ہے کہ زمین و آسمان کی تخلیق، تدبیر امور قدرت کاملہ وغیرہ صفات میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔

۶ جب کوئی اس جیسا نہ انسان ہے نہ فرشتہ تو تم فقط اس معبود برحق کی عبادت کرو۔ یہ کتنی نادانی ہے کہ تم ان کی بندگی کرو جو بے حس و بے حرکت جمادات اور پتھر ہیں نہ نفع کے مالک ہیں نہ نقصان کے (تف ہے تمہاری دانش پر اور حیف ہے تمہاری سمجھ پر)

۷ کیا تم ایک لمحہ کے لیے اتنا بھی تفکر نہیں کرتے کہ تم پر واضح ہو جائے کہ عبادت کا مستحق تو وہ ہے جو زمین و آسمان کا مالک ہے نہ کہ یہ مورتیاں جن کی پوجا پاٹ میں تم لگے ہوئے ہو۔

إِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا ۖ وَعْدَ اللَّهِ حَقًّا ۚ إِنَّهُ يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ لِيَجْزِيَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ بِالْقِسْطِ ۚ وَالَّذِينَ كَفَرُوا لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيمٍ وَعَذَابٌ أَلِيمٌ بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ ۝

”اسی کی طرف لوٹنا ہے تم سب نے ۱ اللہ کا سچا وعدہ ہے ۲ بیشک وہی ابتداء کرتا ہے پیدائش کی ۳ پھر وہی دہرائے گا ۴ اسے تاکہ جزا دے انہیں جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے انصاف کے ساتھ ۵ اور جنہوں نے کفر کیا ان کے لیے کھولتا ہوا پانی اور دردناک عذاب ہوگا بوجہ اس کے کہ وہ کفر کرتے رہتے تھے۔ ۶“

۱ مرجع یا تو مصدر میمی ہے یا اسم ظرف ہے۔ جمیعاً، مرنے کے ساتھ یا قیامت کے روز دوبارہ اٹھنے کے ساتھ تم نے اس کی طرف لوٹنا ہے اس لیے اس کی ملاقات کے لیے اپنے آپ کو تیار کرو۔

۲ یہ مصدر مؤکد لنفسہ ہے (جو ماقبل جملہ کے معنی کی تاکید بیان کرتا ہے) کیونکہ الیہ مرجعکم کا قول اللہ تعالیٰ کی طرف سے وعدہ ہے اور یہ مصدر اسی معنی کو بیان کر رہا ہے۔ اس لیے اس کو مصدر مؤکد لنفسہ کہتے ہیں اور حقاً مصدر مؤکد لغیرہ ہے، جس پر وعداللہ دلالت کر رہا ہے۔

۳ حیات دنیا عطا کر کے پیدائش کی ابتدا کرتا ہے، عام قراء نے انہ ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور نئی کلام شمار کیا ہے۔ ابوجعفر نے لانہ کے معنی کی بناء پر ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا کی علت ہے کیونکہ ابداء اور اعادہ کا مقصود مکلفین کو اپنے اعمال کی جزاء و سزا دینا ہے۔ اس لیے اس کی طرف لوٹنا ضروری ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ جملہ اس عامل کی وجہ سے منصوب ہو جو وعداللہ کو نصب دے رہا ہے، یا حقاً کے ناصب کی وجہ سے مرفوع ہو۔

۴ پھر ہلاک کرنے کے بعد اخروی زندگی کی طرف لوٹائے گا۔

۵ قسط کا مطلب عدل ہے۔ اس جملہ کے کئی مطالب ہو سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے عدل کے ساتھ ایمانداروں اور نیکوکاروں کو جزاء دے یا ان مومنین کو ان کی عدالت کی وجہ اور اپنے امور کو عدل پر قائم رکھنے کی وجہ سے انہیں جزاء عطا فرمائے۔ یا قسط سے مراد ایمان ہے کیونکہ ایمان صحیح اور پختہ عدل ہے جیسے شرک ظلم عظیم ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ مومنین کو ان کے ایمان کی وجہ سے جزاء دے۔ یہ

آخری معنی زیادہ مناسب ہے کیونکہ آگے کفر کا ذکر ہو رہا ہے۔

[2] کفار کے لیے کھولتا ہوا پانی ہوگا پینے کے لیے الیم بمعنی مولم ہے، دردناک عذاب۔ مطلب یہ ہے کہ تاکہ اللہ تعالیٰ جزا دے کفار کو کھولتے ہوئے پانی سے اور دردناک عذاب سے ان کے کفر و انکار کے سبب' لیکن ان کے عذاب کے استحقاق میں مبالغہ پیدا کرنے کیلئے کلام کا اسلوب بدلا گیا ہے۔ نیز یہ بھی حکمت تھی کہ لوگ آگاہ ہو جائیں کہ ابداء اور اعادہ سے مقصود بالذات بدلہ دینا ہے۔ اللہ تعالیٰ مومنین کو اپنی شان کے لائق اپنے لطف و کرم سے بدلہ عطا فرمائے گا مگر کفار کا عذاب بالعرض ہوگا' گویا وہ ایک بیماری ہے جسے ان کی طرف اعمال اور بد اعتقادے کر آیا ہے۔

هُوَ الَّذِیۡ جَعَلَ الشَّمۡسَ ضِیَآءً وَّ الۡقَمَرَ نُوۡرًا وَّ قَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعۡلَمُوۡا عَدَدَ السِّنِیۡنَ وَ الۡحِسَابَ ؕ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِکَ اِلَّا بِالۡحَقِّ ۚ یُفَصِّلُ الۡاٰیٰتِ لِقَوۡمٍ یَّعۡلَمُوۡنَ ۝۵

"وہی ہے جس نے بنایا سورج کو درخشاں [1] اور چاند کو نور [2] اور مقرر کیں اس کے لیے منزلیں تاکہ تم جان لو گنتی برسوں کی اور حساب [3] نہیں پیدا فرمایا اس مگر حق کے ساتھ [4] تفصیل سے بیان کرتا ہے (اپنی قدرت کی) نشانیاں ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں [5]"

[1] قنبل نے سورۃ الانبیاء اور القصص میں قلب کرکے یعنی لام کلمہ کو عین پر مقدم کرکے ضئآءً اور بضئآءٍ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے یاء کے ساتھ پڑھا ہے جو اصل میں واؤ تھی اور ماقبل مکسور ہونے کی وجہ سے یا بن گئی اور ہمزہ طرف کلمہ میں ہے' یہ قیام کی طرح یا تو مصدر ہے یا سیاط کی طرح ضوء کی جمع ہے اور مضاف محذوف ہے یعنی ذات ضیاء ہے۔

[2] یہاں بھی اصل میں ذات نور کا معنی ہے۔ نور' ضوء سے اعم ہے کیونکہ یہ نور کے افراد سے اقویٰ ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں جو ذاتی روشنی ہو اسے ضیاء کہتے ہیں اور جو بالواسطہ ہو اسے نور کہتے ہیں (جس طرح سورج کی روشنی ذاتی ہے اُسے ضیاء کہتے ہیں اور چاند کی روشنی بالواسطہ ہے اسے نور کہتے ہیں)

[3] ضمیر کا مرجع الشمس اور القمر دونوں ہیں یعنی ہر ایک کے چلنے کے لیے منازل متعین فرمائیں۔ یا یہ معنی ہے کہ ہر ایک منازل والا مقدر فرمایا یا ضمیر کا مرجع صرف القمر ہے اور اس کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ اس کی منازل مشاہد ہیں اور احکام شریعت مثلاً روزہ زکوٰۃ اور حج وغیرہ کا دارومدار چاند کی تاریخوں کے اعتبار سے ہے۔ اسی وجہ سے بعد والے ارشاد لتعلموا عدد السنین کے ساتھ علت بیان فرما دی ہے، یعنی چاند کی منازل وراستے متعین فرمائے تاکہ تم ان مہینوں کو شمار کر سکو جن میں احکام شریعت واجب ہیں۔ اور اپنے معاملات و تصرفات میں دنوں اور مہینوں کے اوقات کا حساب لگا سکو۔

[4] یہ سب کرشمہ سازیاں اور ان گنت کارسازیاں نہیں ہیں مگر صرف اور صرف اس کی صفت گری کے اظہار کے لیے اور اس یک قدرت کاملہ کے اظہار کے لیے اور ان سب کاموں میں حکمت بالغہ کارفرما ہے۔

[5] یفصل' ابن کثیر' ابوعمرو اور حفص نے یا کے ساتھ غائب صیغہ پڑھا ہے کیونکہ پہلے مفرد غائب کا صیغہ ما خلق اللّٰہ استعمال ہوا ہے۔ جبکہ باقی قراء نے نفصل' نون متکلم کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور جمع کا صیغہ بطور تعظیم و تکلم ہے۔

اِنَّ فِی اخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَ النَّهَارِ وَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ لَاٰیٰتٍ

لِّقَوْمٍ يَّتَّقُوْنَ ۝

"بیشک گردش لیل ونہار میں اور جو کچھ پیدا فرمایا ہے اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین میں (ان میں اس کی) نشانیاں ہیں اس قوم کے لیے جو متقی ہے۔ 1"

1۔ دن اور رات کے ایک دوسرے کے پیچھے آنے میں یا ان کے رنگوں کے اختلاف میں۔ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اور کائنات ارضی وسماوی کی مختلف انواع میں لَاٰيٰتٍ اس صانع کے وجود، وحدت، کمال علم، کمال قدرت اور ہر قسم کے مدمقابل سے پاک ہونے پر روشن نشانیاں اور واضح علامات ہیں اس قوم کے لیے جو عواقب سے ڈرتی ہے کیونکہ انجام کا خدشہ انہیں تفکر وتدبر پر برانگیختہ کرتا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَرَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا غٰفِلُوْنَ ۝

"بیشک وہ لوگ جو امید نہیں رکھتے ہم سے ملنے کی اور خوش وخرم ہیں دنیوی زندگی سے اور مطمئن ہو گئے ہیں اس (کے ساز وسامان) سے اور وہ لوگ جو ہماری آیتوں سے غفلت برتتے ہیں۔ 1"

1۔ سب سے بڑا ثواب اللہ تعالیٰ کی ملاقات اور اس کی رویت ہے اور انہوں نے ظاہری دنیا کو آخرت پر ترجیح دی ہے۔ اور دنیا کی آرائش وزیبائش پر مطمئن ہو گئے اور صرف اور صرف زیب وزینت اور آرام وآرائش پر اکتفاء کیا اور ان اعمال کی طرف ذرہ بھر دھیان نہ دیا جو آخرت میں فائدہ مند تھے، یعنی ہماری وہ نشانیاں جو صانع کے وجود پر شاہد عادل ہیں ان سے بالکل غافل ہیں۔

اس معنی کے اعتبار سے اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا سے مراد اہل کتاب کفار ہیں جو صانع کے وجود کا اعتقاد رکھتے تھے قیامت اور اخروی زندگی کا یقین وعلم رکھتے تھے لیکن اس کے باوجود آخرت پر دنیا کو ترجیح دی اور آخرت کے ثواب سے مایوس ہو گئے اور لذائذ دنیا پر ہی قناعت کر بیٹھے۔ اور وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا الخ سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے نہ تو توحید پر ایمان لایا اور نہ روز جزاء کا عقیدہ رکھا۔ امام بیضاوی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں پہلے وہ ہیں جو آخروی زندگی کا انکار کرتے ہیں(1) اور جزاء کی توقع نہیں رکھتے ہیں اور صرف دنیوی حیات کو ہی سب کچھ سمجھتے ہیں اور دوسرے وہ ہیں جنہیں جلدی ملنے والی نعمتوں کی محبت نے دیر سے ملنے والی نعمتوں کے بارے سوچنے سے غافل کر دیا اور ان کیلئے اپنے آپ کو تیار ومستعد کرنے سے ہی باز رکھا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہاں عطف وصف کے تغایر کیلئے ہے اور یہ بتانے کیلئے ہے کہ جو آیات ربانی کو بالکل بھول جاتے ہیں یا شہوات میں منہمک ہونے کی وجہ سے ان کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ ان دونوں گروہوں کیلئے وعید شدید ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں رجاء کبھی خوف اور طمع کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اگر یہاں بھی اسی معنی کا اعتبار کیا جائے تو یہ معنی ہوگا جو ہمارے عذاب وعقاب سے نہیں ڈرتے اور ہمارے ثواب کی امید نہیں رکھتے۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں آیات سے مراد محمد ﷺ اور قرآن حکیم ہیں اور غافلون کا معنی معرضون ہے۔ یعنی وہ محمد ﷺ اور قرآن حکیم سے منہ موڑتے ہیں(2)۔

اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝

"یہی لوگ ہیں جن کا ٹھکانا دوزخ ہے۔ 1"

1۔ اُولٰٓئِكَ مبتدا اول اور مَاْوٰىهُمْ مبتدا ثانی ہے۔ النَّارُ مبتدا ثانی کی خبر ہے پھر جملہ ہو کر اُولٰٓئِكَ کی خبر ہے، پھر اُولٰٓئِكَ اپنی خبر سے مل کر اِنَّ

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 5، صفحہ 13 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 139 (الفکر)

کی خبر ہے، یعنی اس کفر اور ان کرتوتوں کے سبب جن پر وہ مصر رہے اور مواظبت اختیار کرتے رہے۔ بما کانوا کی باء محذوف کلام کے متعلق ہے جس پر موجود کلام دلالت کر رہی ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ يَهْدِيهِمْ رَبُّهُم بِإِيمَانِهِمْ ۖ تَجْرِي مِن تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ فِي جَنَّاتِ النَّعِيمِ ﴿٩﴾

"یقیناً وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے پہنچائیگا انہیں ان کا رب (منزل مقصود تک) ان کے ایمان کے باعث[1] رواں ہونگی ان کے نیچے نہریں نعمت (سرور) کے باغوں میں[2]"

[1] جو دولت ایمان سے مالا مال ہیں اور اپنی زندگی کے دامن کو اعمال صالحہ کے پھولوں سے مزین کرتے رہے ان کا رب ان کے ایمان کے سبب ایسے راستہ پر پہنچائے گا جو جنت تک پہنچاتا ہے۔

حضرت مجاہد فرماتے ہیں وہ ان کی شاہراہ پر راہنمائی فرماتا ہے جو جنت کی طرف جاتی ہے، ان کے لیے ایسا نور پیدا فرماتا ہے جس کی روشنی میں وہ اپنی منزل کی طرف لحہ بہ لحہ بڑھتے جاتے ہیں(1)۔ بعض علماء فرماتے ہیں اسکا مطلب یہ ہے کہ ان کا رب دین کے حقائق کے ادراک کی استطاعت انہیں عطا فرماتا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ مَنْ عَمِلَ بِمَا عَلِمَ وَرَّثَهُ اللّٰهُ عِلْمَ مَا لَمْ يَعْلَمْ۔ جو اپنے علم کے مطابق عمل پیرا ہوا ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے وہ علم بھی عطا فرماتا ہے جس سے پہلے وہ بے خبر ہوتا ہے۔ اس حدیث کو ابو نعیم نے الحلیہ میں روایت کیا ہے(2)۔ بعض علماء فرماتے ہیں یهدیهم کا معنی یثیبهم اور یجزیهم ہے، یعنی وہ انہیں ثواب وجزاء عطا فرمائے گا۔ یا یہ معنی ہے کہ جنت میں وہ سب کچھ انہیں عطا فرمائے گا جس کی وہ چاہت کریں گے۔

امام بیضاوی فرماتے ہیں ترتیب کا مفہوم اگرچہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ہدایت کا سبب ایمان اور عمل صالح دونوں ہیں مگر "بایمانهم" کے الفاظ صرف ایمان کے سبب ہونے پر دلالت کرتے ہیں کیونکہ عمل صالح ایمان کے تتمہ اور ردیف کی مانند ہے(3)۔

[2] یہاں من تحتهم بمعنی ایدیهم ہے، یعنی ان کے سامنے نہریں رواں ہیں جیسے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا ۞ (جاری کر دی تیرے رب نے تیرے نیچے ایک ندی) کیونکہ یہ وارد نہیں ہے کہ یہ نہر حضرت مریم کے نیچے تھی اور آپ اوپر بیٹھی تھیں۔ تجری کا جملہ یا تو مستقل کلام ہے یا خبر ثانی ہے یا ضمیر منصوب سے حال ہے جبکہ معنی یہ ہو کہ وہ انہیں حقائق کے ادراک کی ہدایت دیتا ہے یا جنت میں جس چیز کی خواہش کریں اس کی طرف ان کی رہنمائی فرمائے گا، درآں حالیکہ ان کے سامنے سے نہریں بہتی ہونگی۔

امام بغوی فرماتے ہیں اس کلام میں اضمار ہے جس کی تقدیر اس طرح ہے يَهْدِيهِمْ اَىْ يُرْشِدُهُمْ رَبُّهُمْ بِإِيمَانِهِمْ إِلَى جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ(4)۔ اس تقدیر پر تجری کا جملہ جنات کی صفت ہے۔ لیکن اس وقت اس جملہ میں ضمیر کو مقدر ماننا ہوگا یا یہ کہا جائے کہ فِي جَنَّاتِ النَّعِيمِ میں ضمیر کی جگہ اسم ظاہر کو رکھ کر ضمیر کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں فِي جَنَّاتِ النَّعِيمِ یا یہ خبر ہے یا دوسرا حال ہے ضمیر سے یا الانهار سے حال ہے یا تجری کے متعلق ہے یا یهدیهم کے متعلق ہے(5)۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 140 (الفکر)
2۔ حلیۃ الاولیاء، جلد 10، صفحہ 15 (السعادۃ)
3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 5، صفحہ 14 (العلمیہ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 140 (الفکر)
5۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 5، صفحہ 15 (العلمیہ)

دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ۚ وَ اٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۱۰

''(بہار جنت کو دیکھ کر) ان کی صدا وہاں یہ ہوگی پاک ہے تو اے اللہ[1] اور ان کی دعا یہ ہوگی کہ'' سلامتی ہو''[2] اور ان کی آخری پکار یہ ہوگی یہ سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جو مرتبہ کمال تک پہنچانے والا ہے[3]''

1۔ ان کی دعا ان باغات میں یہ ہوگی اے اللہ ہم تیری تسبیح بیان کرتے ہیں، یعنی تجھے ہر نقص اور عیب سے پاک سمجھتے ہیں۔ امام بغوی فرماتے ہیں اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ یہ کلمہ اہل جنت اور ان کے سامنے کھانا پیش کرنے والے خدام کے درمیان علامت ہوگا۔ جب وہ کھانے کا ارادہ فرمائیں گے تو وہ سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ کہیں گے فوراً وہ خدام ان کی چاہت وخواہش کے مطابق دستر لگا دیں گے۔ ہر دستر خوان ایک میل لمبا چوڑا ہوگا اور ہر دستر خوان پر ستر ہزار ڈونگے ہونگے اور ہر ڈونگہ میں قسم قسم کے کھانے ہونگے جو ایک دوسرے سے بالکل ذائقہ میں مختلف ہونگے۔ جب اہل جنت کھانے سے فارغ ہو جائیں گے تو اللہ تعالیٰ کی تعریف کریں گے۔ اسی طرف یہ قول اشارہ کرتا ہے۔ وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (1) بعض علماء فرماتے ہیں دعواھم سے مراد ان کی وہ کلام اور قول ہوگا جو وہ جنت کی بہاروں میں لطف اور روحانی مسرت محسوس کر کے سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ کہیں گے۔ امام مسلم، احمد اور ابوداؤد نے حضرت جابر سے مرفوع حدیث روایت کی ہے کہ اہل جنت کو تسبیح وتحمید کا الہام کیا جائے گا۔ جیسے سانس کا الہام کیا جائے گا (2)۔

2۔ فیھا میں ھا ضمیر کا مرجع جنت ہے، یعنی وہ اس میں ایک دوسرے پر سلام بھیجیں گے اور ان پر فرشتے داخل ہونگے ہر دروازے سے یہ کہتے ہوئے سلام علیکم بما صبر تم (سلامتی ہو تم پر بوجہ اس کے جو تم نے صبر کیا) اور فرشتے ان کے رب کی طرف سے پیغام سلام لیکر آئیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان پر سلام فرمائے گا۔

ابن ماجہ، ابن ابی الدنیا، دار قطنی اور الاجری نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ اہل جنت نعمتوں میں مصروف ہوں گے اچانک ان پر نور چھا جائے گا۔ وہ سر اٹھا کر دیکھیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کو اپنے دیدار سے مشرف فرما رہا ہوگا اور فرمائے گا اے جنتیو! السلام علیکم اتم پر سلام ہو۔ اللہ تعالیٰ کا قول سَلٰمٌ ۚ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ ۝۵۸ اسی کی طرف اشارہ کرتا ہے (3)۔

امام احمد، البزار اور ابن حبان نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے جو سب سے پہلے جنت میں داخل ہونگے وہ مہاجرین فقراء ہیں جنہیں جہاد نے سرحدوں تک پہنچایا اور ان کے ذریعے مشکل حالات کی حفاظت کی جاتی ہے اور ایک ان میں سے فوت ہوا در آں حالیکہ اس کی خواہش اس کے سینے میں تھی جس کے پورا کرنے کی وہ صلاحیت نہیں رکھتا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرشتوں کو فرمائے گا اسے لاؤ اور اسے سلام پیش کرو۔ فرشتے عرض کریں گے اے ہمارے پروردگار ہم آسمانوں کے مکین ہیں، تیری مخلوق میں بہترین ذوات ہیں تو ہمیں ان کے لانے اور انہیں سلام عقیدت پیش کرنے کا حکم فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا یہ میرے وہ پاکباز بندے ہیں جو میری عبادت کرتے تھے اور کسی کو میرا شریک نہیں ٹھہراتے تھے۔ سرحدیں ان کو اپنی جانب کھینچتی تھیں اور ان کے ذریعے مشکل حالات کا دفاع کیا جاتا ہے۔ ان میں ایک فوت ہوا در آں حالیکہ اس کے دل میں ایک خواہش باقی تھی جسے وہ پورا کرنے کی طاقت نہیں رکھتا تھا۔ پس اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان سن کر فرشتے ان کے پاس حاضر ہونگے یہ کہتے ہوئے سلام

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 41-140 (الفکر) 2۔ صحیح مسلم، جلد 17، صفحہ 143، حدیث: 2835 (العلمیہ)

3۔ مشکوٰۃ المصابیح، جلد 3، صفحہ 233، حدیث: 5664 (الفکر)

علیکم بما صبرتم فنعم عقبی الدار سلامتی ہو تم پر بوجہ اس کے جو تم نے صبر کیا۔ پس کیا عمدہ ہے یہ آخرت گھر(1)۔

۳۔ اس کا شاید یہ معنی ہو کہ جب وہ جنت میں داخل ہونگے اور اللہ تعالیٰ کی عظمت کا مشاہدہ کریں گے تو وہ اپنے رب کریم کی صفات جلال کے ساتھ بزرگی بیان کریں گے۔ پھر فرشتے انہیں سلام پیش کریں گے اور اللہ تعالیٰ انہیں آفات سے سلامتی اور گوناں گوں کرامت سے نوازنے کا مژدہ سنائے گا تو وہ اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء صفات اکرام سے کریں گے۔ ان یہ مثقلہ سے مخففہ بنایا گیا ہے۔ میں کہتا ہوں اس کو مفسرہ بنانا بھی جائز ہے کیونکہ دعا میں قول کا معنی پایا جاتا ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں وہ کلام کا افتتاح تسبیح سے کریں گے اور اختتام تحمید سے کریں گے(2) اور درمیان میں جو چاہیں گے کلام کریں گے۔

وَلَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ لَقُضِيَ إِلَيْهِمْ أَجَلُهُمْ ؕ فَنَذَرُ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ ﴿۱۱﴾

"اگر جلد بازی کرتا اللہ تعالیٰ لوگوں کو شر پہنچانے میں جیسے وہ جلد بازی کرتے ہیں بھلائی کے لیے ۱؎ تو پوری کر دی گئی ہوتی ان کی میعاد ۲؎ (لیکن یوں نہیں بلکہ) ہم چھوڑے رکھتے ہیں انہیں جو توقع نہیں رکھتے ہماری ملاقات کی تا کہ وہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں۔ ۳؎"

۱؎ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں یہ اس شخص کے بارے میں ہے جو غصہ کی حالت میں اپنے اہل و اولاد کو کہتا ہے لَعَنَكُمُ اللّٰهُ وَلَا بَارَكَ فِيكُمْ اللہ تعالیٰ تم پر لعنت کرے اور تم میں برکت نہ ڈالے(3)۔ اسی طرح حضرت قتادہ کا قول ہے۔

آیت کا معنی یہ ہے اگر اللہ تعالیٰ جلد بازی کرتا لوگوں کو اس شر کے پہنچانے کی جس کی وہ دعا مانگ رہے ہیں اور جلدی کر رہے ہیں جس طرح اس نے خیر پہنچانے میں جلدی کی ہے جس کا انہوں نے مطالبہ کیا ہے۔ کلام کچھ محذوف ہے جس پر موجود کلام دلالت کر رہی ہے تعجیل الٰہی کی جگہ استعجالهم ذکر کر کے یہ ظاہر فرمایا کہ وہ ان کی بھلائی و خیر کی دعاؤں کو جلدی قبول فرماتا ہے۔ گویا ان کے خیر کو جلدی طلب کرنا اللہ تعالیٰ کا ان کی جلدی خیر پہنچانے کی طرح ہے اور شر سے مراد وہ شر ہے جس کو وہ جلدی طلب کرتے تھے۔ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ آیت کریمہ نضر بن حارث کے حق میں نازل ہوئی ہے جب اس نے یہ دعا مانگی تھی اللّٰهُمَّ إِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَأَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِنَ السَّمَاءِ۔ اے اللہ یہ (قرآن) تیری جانب سے حق ہے تو بارش کر ہم پر پتھروں کی آسمان سے۔

۲؎ مر چکے ہوتے اور ہلاک ہو چکے ہوتے۔ ابن عامر اور یعقوب نے لقضی معروف کا صیغہ پڑھا ہے۔ اجلهم کو مفعول ہونے کی وجہ سے منصوب پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے مجہول کا صیغہ پڑھا ہے اور اجلهم کو مرفوع پڑھا ہے۔

۳؎ فنذر کا جملہ فعل محذوف پر معطوف ہے جس پر جملہ شرطیہ دلالت کرتا ہے۔ تقدیر کلام یوں ہے وَلٰكِنْ لَا نُعَجِّلُ وَلَا نَقْضِي فَنَذَرُهُمْ إِمْهَالًا وَاسْتِدْرَاجًا۔ یعنی ہم جلدی نہیں کرتے بلکہ انہیں آہستہ آہستہ عذاب کی طرف لے جانے کے لیے ڈھیل دے رہے ہیں۔

وَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْبِهِ أَوْ قَاعِدًا أَوْ قَائِمًا ۚ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهُ مَرَّ كَأَنْ لَمْ يَدْعُنَا إِلٰى ضُرٍّ مَسَّهُ ؕ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِينَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۱۲﴾

"اور جب پہنچتی ہے انسان کو کوئی تکلیف (تو اس وقت) پکارتا ہے ہمیں لیٹا ہوا ہو یا بیٹھا ہوا ہو یا کھڑا ہوا ہو ۱؎ پھر جب ہم

1۔ مسند احمد، جلد 2، صفحہ 168 (صادر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 141 (الفکر) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 141 (الفکر)

دور کر دیتے ہیں اس سے اس کی تکلیف (تو) چل دیتا ہے [۲] جیسے اس نے ہمیں (کبھی) پکارا ہی نہیں تھا کسی تکلیف میں جو اسے پہنچی تھی [۳] اسی طرح آراستہ کر دیئے گئے حد سے بڑھنے والوں کے لیے وہ کرتوت جو وہ کیا کرتے تھے [۴]"

[۱] ضر کا معنی شدت اور مصیبت ہے، یعنی اس تکلیف کے ازالہ کے لیے بڑا مومن بن کر لیٹے ہوئے، بیٹھے ہوئے یا کھڑے ہوئے ہمیں پکارتا ہے۔ لفظ "او" ذکر فرمایا جو دعا کی تعمیم کا فائدہ دے رہا ہے کہ وہ ہمیں تکلیف کے دور کرنے کے لیے ہر حال میں ہم سے فریاد کرتا رہتا۔ خواہ کھڑا ہو، خواہ بیٹھا ہو، خواہ سویا ہوا ہو سب تعلقات چھوڑ کر ہماری طرف متوجہ رہتا ہے۔

[۲] لیکن جب ہم اس کی تکلیف کو اپنی مہربانی سے دور کر دیتے ہیں تو پھر کفر کے پرانے راستہ پر چل پڑتا ہے۔ سب وعدے فراموش کر کے نافرمانی اور ناشکری کو اپنا شعار بنالیتا ہے۔

[۳] یہ اصل میں کانّہ تھا مخفف کر کے ضمیر شان کو حذف کیا گیا۔ ایسی روش اور ایسی بے اعتدالی کا شکار ہو جاتا ہے گویا اسے تو کبھی کسی مصیبت نے چھوا ہی نہیں تھا اور اس نے کبھی ہم سے اپنی حاجت برآری کے لیے سوال ہی نہیں کیا تھا۔

[۴] مسخ شدہ ذہنیت کے لوگ گناہ و معصیت میں جاذبیت محسوس کرتے ہیں۔ شہوات و لذات میں انہماک اور ذکر و عبادات سے اعراض انہیں بھلا محسوس ہوتا ہے۔

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا ۙ وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ⑬

"بیشک ہم نے ہلاک کر دیا کئی قوموں کو جو تم سے پہلے تھیں جب وہ زیادتیاں کرنے لگے [۱] اور آئے ان کے پاس رسول روشن دلیلیں لے کر [۲] اور وہ (ایسے) نہیں تھے کہ ایمان لاتے [۳] اسی طرح [۴] ہم سزا دیتے ہیں مجرم قوم کو [۵]"

[۱] یہ اہل مکہ سے خطاب ہو رہا ہے کہ تم نے کبھی عبرت کی آنکھ سے نہیں دیکھا کہ ہم نے تم سے پہلے کئی طاقتور اور متمول قوموں کو ہلاکت کے گڑھے میں پھینک کر ان کا نام و نشان مٹا دیا ہے۔ جب انہوں نے اپنی صلاحیتوں اور وسائل کو انسانی فلاح اور معاشرے کی ترقی کے کاموں کی بجائے لذت طلبی اور عیش پرستی کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ میری توحید و واحدانیت کا انکار کر کے جب اپنی ہی جانوں پر ظلم کیا تھا۔ لما اهلكنا کی ظرف ہے۔

[۲] رسل و انبیاء کی جماعت کھلی نشانیوں کے ساتھ ان کے پاس پہنچ چکی تھی، پھر بھی انہوں نے اپنی عقل و دانش کو حق کے قبول کرنے کے لیے استعمال نہ کیا۔ اس جملہ کا ظلموا پر عطف ہے یا قد کی تقدیر کے ساتھ اس کے فاعل سے حال ہے۔ رسل کے آنے کے بعد حجت کو تکمیل کرنے کے بعد کفر پر ہلاکت کو مرتب کیا گیا ہے جیسا کہ اللہ نے ارشاد فرمایا وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ۞ ہم نہیں عذاب دیتے حتیٰ کہ ہم رسول مبعوث کر لیں۔ جو حق کو روز روشن کی طرح عیاں کر دیتا ہے پھر بھی اگر کوئی راہ راست اختیار نہ کرے تو ہم سخت عذاب کی چکی میں اسے پیس کر رکھ دیتے ہیں۔

[۳] وہ ظالم قومیں نہ تھیں ایمان لانے والی اس کا عطف وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا پر ہے۔ لیؤمنوا پر لام نفی کی تاکید کے لیے ہے۔ یعنی اپنی استعداد کو ختم کرنے کی وجہ سے اب ایمان لانے کی انہیں قوت ہی نہیں ہے کیونکہ ان کے اعمال ہی ظاہر کر رہے ہیں کہ یہ گمراہ لوگوں کے زمرہ میں شامل ہونے والے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان کی ہٹ دھرمی اور متواتر انکار کی وجہ سے انہیں ذلیل و رسوا کر دیا۔ یا یہ مطلب ہے

کہ وہ اللہ تعالیٰ کے علم ازلی پر ایمان لانے والے نہیں تھے بلکہ اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ وہ کفر پر ہی مریں گے۔ اس لیے اس علم ازلی کی بناء پر فرمایا وہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں ما کانوا کا عطف ظلموا پر ہے۔

ے اسی کی مثل یعنی رسولوں کی تکذیب اور کفر پر اصرار کے سبب ہلاک کر دیتے ہیں کیونکہ اس کے بعد ان کو مہلت دینے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

ے ہم ہر مجرم کو جزا دیتے ہیں یا یہ مطلب ہے کہ ہم تمہیں جزا دیں گے ضمیر کی جگہ اسم ظاہر ذکر فرمایا تا کہ ان کے کمال جرم پر دلالت ہو جائے اور یہ بتانے کیلئے کہ وہ ایسے ہی نام کے مستحق ہیں۔

ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَیْفَ تَعْمَلُوْنَ ۝

"پھر ہم نے بنایا تمہیں جانشین زمین میں ان کے بعد تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کیسے عمل کرتے ہو لے "

لے اے کفار مکہ ہم نے تمہیں عطا کی جانشینی ان قوموں کو ہلاک کرنے کے بعد تا کہ ہم دیکھ لیں کہ تم بھی اپنے پیش رووں کی ڈگر پر چل کر برائی اور معصیت کو شعار بناتے ہو یا ان کے حالات و واقعات سے عبرت حاصل کر کے اپنی اصلاح کی کوشش کرتے ہو۔

وہ ہمہ بیں و ہمہ داں خداتم سے تمہارے اعمال کے مطابق معاملہ فرمائے گا، یعنی کیا تم ان کی ہوش ربا ہلاکت و تباہی دیکھ کر عبرت حاصل کر کے ہمارے رسول کی تصدیق کرتے ہو یا نہیں۔ کَیْفَ تَعْمَلُوْنَ کی وجہ سے منصوب ہے ننظر اس کا ناصب نہیں ہے کیونکہ استفہام کا معنی صدر کلام کا تقاضا کرتا ہے۔ اس آیت کریمہ میں یہ ایک دلیل ہے کہ جزاء میں افعال کی جہات و کیفیات معتبر ہیں۔ صرف افعال کی ذوات معتبر نہیں کبھی کوئی فعل ایک مقام پر اچھا ہوتا ہے لیکن دوسرے مقام پر قبیح سمجھا جاتا ہے۔

حضرت ابو سعید الخدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دنیا میٹھی اور بڑی سرسبز ہے اور اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس میں خلیفہ بنایا ہے تا کہ وہ دیکھے کہ تم کیسے اعمال کرتے ہو(1)۔

وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَیْهِمْ اٰیَاتُنَا بَیِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَیْرِ هٰذَاۤ اَوْ بَدِّلْهُ ؕ قُلْ مَا یَكُوْنُ لِیْۤ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِیْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰۤى اِلَیَّ ۚ اِنِّیْۤ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ۝

"اور جب پڑھی جاتی ہیں ان پر ہماری روشن آیتیں لے (تو) کہنے لگتے ہیں وہ جو توقع نہیں رکھتے ہم سے ملنے کی کہ لے آیئے (دوسرا) قرآن اس (قرآن) کے علاوہ یا رد و بدل کر دیجئے اسی میں ے فرمایئے مجھے اختیار نہیں ے کہ رد و بدل کر دوں اس میں اپنی مرضی سے ے میں نہیں پیروی کرتا (کسی چیز کی) بجز اس کے جو وحی کی جاتی ہے میری طرف میں ڈرتا ہوں اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں لے بڑے دن کے عذاب سے لے "

لے حضرت قتادہ فرماتے ہیں ھم ضمیر کا مرجع مشرکین مکہ ہیں۔ مقاتل فرماتے ہیں اس کا مرجع مندرجہ ذیل پانچ افراد ہیں (1) عبداللہ بن ابی امیہ المخزومی (2) الولید بن المغیرہ (3) مکرز بن حفص (4) عمرو بن عبداللہ بن ابی قیس العامری۔ (5) العاص بن عامر بن ہشام (2) اور بینات سے مراد ایسی نشانیاں ہیں جو واضح طور پر دلالت کرتی ہیں کہ یہ کلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔

ے جو لوگ دوبارہ اٹھنے کا خوف نہیں رکھتے اور قیامت کا انکار کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں ایک دوسری کتاب لاؤ جس کو ہم پڑھیں اور اس

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 143 (الفکر)　　2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 144 (الفکر)

میں مرنے کے بعد ثواب وعذاب جس کو بعید از عقل سمجھتے ہیں، اس کا ذکر نہ ہو اور اس میں ہمارے خداؤں کے عیوب کا ذکر بھی نہ ہو۔ یا تم ایک آیت کو دوسری آیت سے بدل دو۔

مقاتل فرماتے ہیں پانچ مذکورہ افراد نے نبی کریم ﷺ سے کہا اگر آپ چاہتے ہیں کہ ہم آپ پر ایمان لے آئیں تو پھر ایسا قرآن لاؤ۔ جس میں لات ومنات اور العزیٰ کی عبادت کو ترک کرنے کے احکامات نہ ہوں۔ اور نہ اس میں ہمارے خداؤں کی مذمت ہو۔ اگر چہ وہ خدا کی طرف سے نہ بھی ہو یہی تم کہہ دو کہ یہ خدا کی طرف سے ہے یا اسی قرآن میں تبدیلی کر دو، عذاب والی آیت کی جگہ آیت رحمت رکھ دو اور حرام کی جگہ حلال اور حلال کی جگہ حرام رکھ دو[1]۔

[2] اے محبوب مکرم ﷺ ان نادانوں سے کہو یہ میرے اختیار میں نہیں ہے۔ لِیْ کی یاء کو حرمی قراء اور ابو عمرو نے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔

[3] یعنی میرے اختیار میں نہیں کہ میں اس میں اپنی مرضی سے ردو بدل کر دوں تلقاء مصدر ہے جو بطور ظرف استعمال ہوا ہے۔ جواب میں صرف تبدیلی کے ذکر پر اکتفاء کیا ہے کیونکہ تبدیلی کا ممتنع ہونا دوسرے قرآن کے لانے کے امتناع کو مستلزم ہے، یا اس لیے صرف تبدیلی کا ذکر کیا کیونکہ تبدیلی تو انسان کے مقدور میں ہے کہ وہ آیت رحمت کی جگہ آیت عذاب پڑھ دے مگر اس معجز کلام جیسا کلام لانا انسان کے لیے ممکن ہی نہیں ہے، یا یہاں تبدیلی سے مراد وہ تبدیلی ہے جو قرآن کی دوسرے قرآن کے ساتھ تبدیلی ہے۔ یا ایک آیت کی جگہ دوسری آیت کی تبدیلی سے عام ہے۔

[4] یہ مَا یَكُوْنُ لِیْ کی تعلیل ہے کیونکہ کسی معاملہ میں دوسرے کی اتباع کرنے والا اسی میں خود تصرف کرنے کا مالک نہیں ہوتا۔ نیز اس میں بعض آیات کے بعض کے ساتھ نسخ کے اعتراض کا جواب بھی ہے اس کے علاوہ اس میں اس سوال کا رد بھی ہے جو وہ کہتے کہ یہ قرآن انکا اپنا من گھڑت ہے۔ اسی وجہ سے جواب میں تبدیلی کو مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِیْ کے قول کے ساتھ مقید فرمایا ہے۔ اور اس تبدیلی کو معصیت کہا گیا ہے۔

[6] اِنِّیْ حرمیان اور ابو عمرو نے یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی اگر میں تبدیلی کر کے اپنے رب کی نافرمانی کروں۔

[7] یوم عظیم سے مراد قیامت کا دن ہے۔ اس آیت کریمہ میں اشارہ ہے کہ وہ اس تجویز کی وجہ سے عذاب کے مستحق ہوئے

قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَیْكُمْ وَ لَاۤ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِیْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۶﴾

"آپ فرما دیجئے اگر چاہتا اللہ تعالیٰ تو میں نہ پڑھتا اسے تم پر اور نہ ہی وہ آگاہ کرتا تمہیں اس سے [1] میں تو گزار چکا ہوں تمہارے درمیان عمر (کا ایک حصہ) اس سے پہلے [2] کیا تم (اتنا بھی) نہیں سمجھتے [3]"

[1] اگر اللہ تعالیٰ اس کے علاوہ کو چاہتا یا تم پر میرے پڑھنے کو نہ چاہتا تو قرآن نازل نہ کرتا اور اللہ تعالیٰ تمہیں میری زبان کے ذریعے تعلیم نہ دیتا "بہٖ" کی ضمیر کا مرجع قرآن ہے۔ البزی نے ابن کثیر سے لادرٰکم اثبات پر قصر کے ساتھ پڑھا ہے اور لام کو تاکید بنایا ہے۔ یعنی اگر اللہ تعالیٰ چاہتا میں تم پر نہ پڑھتا اسے اور وہ تمہیں اسکی تعلیم میرے علاوہ کسی غیر کے ذریعے دیتا۔ اس آیت میں اشارہ ہے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 144 (الفکر)

کہ یہ حق ہے اس کا انکار ممکن نہیں کیونکہ اگر مجھے نہ بھیجا جاتا تو میرے علاوہ کسی اور کو یہ قرآن دیکر بھیجا جاتا۔

۲ یعنی میں نے تمہارے درمیان چالیس سال کا طویل عرصہ گزارا ہے، نزول قرآن سے پہلے بھی میں کوئی ایسی چیز نہیں لایا جو مجھ پر وحی نہ کی گئی ہو اس آیت میں اشارہ ہے کہ قرآن معجزہ اور خارق عادت کلام ہے کیونکہ وہ شخص جس نے چالیس سال ان کے درمیان گزارے اور اس عرصہ میں کسی استاد سے علم حاصل نہیں کیا۔ کبھی کوئی شعر کہا اور کبھی کوئی خطبہ دیا۔ پھر جب وہ ایسی کتاب پڑھ رہا ہے جو فصاحت وبلاغت کے ساتویں آسمان کو چھو رہی ہے اور ہر نثر اور منظوم کلام سے بلند تر ہے۔ اور اصول وفروع کے قواعد پر مشتمل ہے، پہلے لوگوں کے قصص اور آنے والے حالات کی خبروں سے بھرا ہوا ہے۔ یہ سب صورت حال یہ ظاہر کرتی ہے کہ آپ ﷺ نے یہ کلام اللہ سے سیکھا ہے۔

۳ تم غور وفکر کے لیے اپنی عقل کو کیوں استعمال نہیں کرتے تاکہ تم پر آشکارا ہو جائے کہ یہ میری طرف سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔

فائدہ: حضور نبی کریم ﷺ اہل مکہ کے درمیان وحی سے قبل چالیس سال رہے۔ پھر آپ ﷺ پر وحی کا سلسلہ شروع ہوا تو آپ ﷺ وحی کے بعد تیرا سال مکہ میں رہے۔ پھر آپ ﷺ نے ہجرت فرمائی اور مدینہ طیبہ میں دس سال رہے۔ جب آپ ﷺ نے وصال فرمایا تو اس وقت آپ ﷺ کی عمر مبارک تریسٹھ 63 سال تھی(1)۔ اسی طرح امام مسلم نے ابن عباس سے روایت فرمایا ہے۔

محمد بن یوسف الصالحی فرماتے ہیں علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ آپ ﷺ ہجرت کے بعد مدینہ طیبہ میں دس سال رہے اور اظہار نبوت سے پہلے مکہ مکرمہ میں چالیس سال رہے۔ اختلاف اس مدت میں ہے جو ہجرت سے پہلے اظہار نبوت کے بعد کی ہے۔ صحیح یہ ہے کہ آپ ﷺ تیرا سال رہے(2)۔ امام بغوی نے حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ وحی کے بعد دس سال مکہ میں رہے اور وصال کے وقت آپ ﷺ کی عمر مبارک ساٹھ سال تھی(3)۔ اسی طرح ابن سعد عمرو بن شیبہ اور الحاکم نے الاکلیل میں حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے۔ امام بغوی لکھتے ہیں پہلا قول زیادہ مشہور واظہر ہے(4)۔ امام مسلم نے حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کا وصال ہوا تو آپ کی عمر مبارک تریسٹھ سال تھی(5)۔ اسی طرح ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ ابو داؤد الطیالسی اور مسلم نے حضرت معاویہ بن ابی سفیان سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا وصال ہوا تو آپ ﷺ کی عمر تریسٹھ سال تھی(6)۔ شیخان نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ وصال کے وقت تریسٹھ سال کے تھے(7)۔ امام نووی فرماتے ہیں یہ قول مشہور ہے اور اسی پر علماء کا اجماع ہے' امام احمد اور مسلم نے عمار بن ابی عمار سے روایت کیا ہے کہ میں نے حضرت ابن عباس سے پوچھا جب آپ ﷺ کا وصال ہوا تو آپ ﷺ کی عمر مبارک کتنی تھی؟ انہوں نے فرمایا تم حساب لگانا چاہتے ہو؟ میں نے کہا ہاں۔ تو انہوں نے فرمایا' چالیس سال کے تھے تو مبعوث ہوئے، پھر پندرہ سال مکہ میں خوف وامن کی کیفیت میں رہے، پھر ہجرت کے بعد دس سال مدینہ طیبہ میں رہے(8)۔ الحاکم نے الاکلیل میں علی بن ابی زید عن یوسف بن مہران عن بن عباس کی سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ وصال کے وقت پینسٹھ سال کے تھے(9)۔ الحاکم نے الاکلیل میں اور نووی نے لکھا ہے کہ علماء کا تریسٹھ سال

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 144 (الفکر)
2۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 12، صفحہ 308 (العلمیہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 144 (الفکر)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 145 (الفکر)
5۔ صحیح مسلم، جلد 15، صفحہ 82 (العلمیہ)
6۔ صحیح مسلم، جلد 15، صفحہ 84 (العلمیہ)
7۔ صحیح مسلم، جلد 15، صفحہ 82 (العلمیہ)
8۔ صحیح مسلم، جلد 15، صفحہ 84 (العلمیہ)
9۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 12، صفحہ 307 (العلمیہ)

کی عمر پر اتفاق ہے کیونکہ اس کے متعلق اصح روایات ہیں، باقی روایات کی علماء نے تاویل کی ہے۔ ساٹھ سال والی روایت کے متعلق فرماتے ہیں کہ اس میں عقود کے ذکر پر اکتفاء کیا گیا ہے اور کسور کو چھوڑ دیا گیا۔ پینسٹھ سال والی روایت پھر مؤول ہے یا اس میں راوی کو شک پڑ گیا ہے۔ عروہ نے حضرت ابن عباس کے پینسٹھ سال کے قول پر اعتراض کیا ہے اور ان کی طرف اس کی نسبت کو غلط قرار دیا ہے کیونکہ انہوں نے نبوت کا ابتدائی دور پایا ہی نہیں ہے، بخلاف دوسرے صحابہ کرام کے (1)۔ محمد بن یوسف الصالحی فرماتے ہیں اکثر رواۃ نے جو حضرت ابن عباس سے حکایت کیا ہے وہ تریسٹھ سال ہے۔ پس ظاہر یہ ہے کہ پہلے ان کا خیال پینسٹھ سال کا تھا مگر پھر رجوع کر لیا تھا اس قول کی طرف جو اکثر صحابہ کرام کا تھا(2)۔ القاضی نے ابن عباس اور سعید بن المسیب سے ایک شاذ روایت نقل کی ہے کہ آپ نے اظہار نبوت فرمایا تو اس وقت آپ کی عمر تینتالیس سال تھی مگر صواب چالیس سال ہے(3)۔

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ ⑰

"پس کون زیادہ ظالم ہے اس سے جو افترا باندھے اللہ پر جھوٹا یا جھٹلائے اللہ تعالیٰ کی آیتوں کو بیشک مجرم فلاح نہیں پاتے ۱؎"

۱؎ پس کون زیادہ ظالم ہے اس سے جو یہ گمان کرے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک ہے یا تو اس کی اولاد ہے۔ یا اس کی آیتوں کا انکار کرے اِنَّہٗ میں ہ ضمیر ضمیر شان ہے اور مجرموں سے مراد مشرک لوگ ہیں یعنی مشرکین ہرگز کامیاب نہ ہوں گے۔

وَ يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَ لَا يَنْفَعُهُمْ وَ يَقُوْلُوْنَ هٰۤؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ؕ قُلْ اَتُنَبِّـُٔوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَ لَا فِي الْاَرْضِ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ⑱

"اور (یہ مشرک) عبادت کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کے سوا ایسی چیزوں کی جو نہ انہیں نقصان پہنچا سکتی ہیں اور نہ نفع پہنچا سکتی ہیں ۱؎ اور وہ کہتے ہیں یہ (معبود) ہمارے سفارشی ہیں اللہ تعالیٰ کے ہاں ۲؎ آپ فرمائیے کیا تم آگاہ کرتے ہو اللہ تعالیٰ کو اس بات سے جو وہ نہیں جانتا ۳؎ نہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں ۴؎ پاک ہے وہ اور بلند و بالا ہے اس شرک سے جو وہ کرتے ہیں ۵؎"

۱؎ وَيَعْبُدُوْنَ اس کا فاعل کفار مکہ ہیں، یعنی اگر یہ کفار ان بتوں کی عبادت ترک کر دیں تو یہ بت انہیں کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچا سکتے اور اگر یہ ان بتوں کی عبادت کرتے بھی رہیں تو یہ انہیں کوئی نفع نہیں پہنچا سکتے کیونکہ یہ ایک بے بس پتھر سے تراشی ہوئی مورتیاں ہیں جو نہ نفع پر قادر ہیں نہ نقصان پر۔ معبود تو وہ ہونا چاہیے جو ثواب یا عقاب دینے پر قادر ہوتا کہ نفع کے حصول یا نقصان کے دور کرنے کی غرض سے اس کی عبادت کی جائے۔

۲؎ وہ مشرک کہتے ہیں ہمارے یہ بت دنیا کے امور میں بھی ہماری شفیع ہیں اور اگر قیامت برپا ہوگئی اور دوبارہ اٹھنا ہوگا تو آخرت میں ہماری شفاعت کریں گے۔

۳؎ کیا تم اللہ تعالیٰ کو خبر دیتے ہو جس کا اسے علم نہیں وہ یہ کہ اس کا کوئی شریک ہے۔ اس میں کفار کو ان کی اس بیہودہ سرائی پر کہ یہ بت

1۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 12، صفحہ 308 (العلمیہ)

2۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 12، صفحہ 308 (العلمیہ)

3۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 12، صفحہ 308 (العلمیہ)

ہمارے شفیع ہیں' پر تمسخر کرنا اور ان سے استہزاء کرنا ہے۔ یعنی وہ چیز جو اللہ تعالیٰ کو ہی معلوم نہیں جو ہمہ بین و ہمہ داں ہے جس پر زمین آسمان کی کوئی چیز مخفی نہیں ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس چیز کا وجود ہی نہیں ہے۔

۲ؔ یہ ضمیر عائد محذوف سے حال ہے جو اس کی نفی کی تاکید کے لیے آیا ہے۔ اس آیت میں اشارہ ہے کہ جن چیزوں کو وہ خدا سمجھتے ہیں وہ یا تو آسمانی مخلوق ہوگی جیسے فرشتے یا زمینی مخلوق ہوگی، جیسے بت ان میں سے ہر دو ان کفار کی طرح حادث اور مجبور ہیں۔ پس ان کو ان کا شریک بنانا جائز ہی نہیں۔

۳ؔ یہاں یا تو ما مصدریہ ہے۔ اس وقت یہ معنی ہوگا کہ اللہ ان کے شریک ٹھہرانے سے بلند و بالا ہے، یا ما موصولہ ہے۔ اس وقت یہ معنی ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ان کے شریکوں سے بلند و بالا ہے۔ حمزہ اور الکسائی نے یہاں بھی' سورۂ نحل میں دونوں جگہ میں اور سورۂ روم میں تاء خطاب کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ خطاب مشرکین مکہ کو ہے اور باقی قراء نے غائب کے صیغہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّاۤ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا ؕ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِیَ بَیْنَهُمْ فِیْمَا فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۹﴾

"اور نہیں تھے لوگ (ابتداء میں) مگر ایک ہی امت ۱ؔ پھر (اپنی کجروی سے) باہم اختلاف کرنے لگے ۲ؔ اور اگر ایک بات پہلے سے طے نہ ہو چکی ہوتی آپ کے رب کی طرف سے تو فیصلہ کر دیا جاتا ان کے درمیان ان امور میں جن میں وہ اختلاف کیا کرتے ہیں ۳ؔ"

۱ؔ تمام لوگ فطرۃً موحد تھے یا اسلام پر متفق تھے۔ یہ حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت نوح علیہ السلام کی بعثت تک کا زمانہ ہے یا طوفان نوح کے بعد کا زمانہ ہے یا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہد سے عمرو بن لحی کے عہد تک کا دور ہے، یا یہ مطلب ہے کہ لوگ گمراہی پر متفق تھے جس دور میں رسول مبعوث نہیں ہوئے تھے۔

۲ؔ انہوں نے خواہشات نفس اور عقائد باطلہ کی پیروی کر کے وحدت انسانی کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ یا جب رسل علیہم السلام تشریف لائے تو بعض نے اتباع کی اور بعض نے کفر پر اصرار کر کے اختلاف پیدا کر دیا۔

۳ؔ اگر تمہارے رب نے ہر امت کے لیے ایک میعاد مقرر نہ کی ہوتی تو عذاب نازل کر کے دنیا میں جھٹلانے والوں کا نام نشان مٹا دیا جاتا۔ لیکن یہ اس کی مہربانی ہے کہ اس نے سوچنے سنبھلنے کے لیے موقع عطا فرمایا ہے' الکلبی فرماتے ہیں یہ امت کو ڈھیل دینا اور دنیا میں عذاب نہ دینے کی خوشخبری ہے(1)۔ حضرت الحسن فرماتے ہیں اگر اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ نہ کیا ہوتا کہ قیامت سے پہلے انہیں اختلاف کے باوجود ثواب و عقاب نہیں دینا تو دنیا میں ہی ان کا فیصلہ کر دیا جاتا، مومن جنت میں اور کافر دوزخ میں داخل کر دیا جاتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ اس لیے قیامت کے روز ہی اس کا فیصلہ ہوگا۔

وَیَقُوْلُوْنَ لَوْلَاۤ اُنْزِلَ عَلَیْهِ اٰیَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۚ فَقُلْ اِنَّمَا الْغَیْبُ لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوْا ۚ اِنِّیْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِیْنَ ﴿۲۰﴾

"اور کہتے ہیں کیوں نہ نازل کی گئی ان پر کوئی آیت ان کے رب کی طرف سے ۱ؔ سو آپ فرمائیے غیب تو صرف اللہ کے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 146 (الفکر)

لیے ہے ۲؎ پس انتظار کرو ۳؎ میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والا ہوں ۴؎ ''

۱؎ کفار مکہ کہتے ہیں محمد ﷺ پر کیوں نہ اتاری گئی ہماری تجویز کردہ آیات میں سے کوئی آیت۔

۲؎ آپ فرمایئے غیب تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ مختص ہے۔ وہ خود جانتا ہے کہ تمہاری تجویز کردہ آیتوں کو کیوں نازل نہیں فرمایا۔ اس کے علاوہ کسی کو اس کی خبر نہیں، یا یہ مطلب ہے جو چیز انسانی حواس سے غائب ہے وہ اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔

۳؎ اپنی مجوزہ آیات کے نزول کا انتظار کرو، یا یہ معنی ہے کہ حق کو باطل پر غالب کرنے کا جو فیصلہ ہمارے اور تمہارے درمیان قدرت کی طرف سے ہونا ہے اس کا انتظار کرو۔

۴؎ مجھ پر نازل شدہ آیات کے انکار اور اپنی طرف سے تجویز شدہ آیات کے نزول کے مطالبہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ جو سلوک کرنے والا ہے، میں بھی تمہارے ساتھ اس کا منتظر ہوں۔

وَاِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً مِّنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُمْ اِذَا لَهُمْ مَّكْرٌ فِيْۤ اٰيَاتِنَا ؕ قُلِ اللّٰهُ اَسْرَعُ مَكْرًا ؕ اِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُوْنَ مَا تَمْكُرُوْنَ ﴿۲۱﴾

'' جب ہم لطف اندوز کرتے ہیں لوگوں کو (اپنی) رحمت سے اس تکلیف کے بعد جو انہیں پہنچی تو فوراً وہ مکروفریب کرنے لگتے ہیں ہماری آیتوں میں ۱؎ فرمایئے اللہ زیادہ تیز ہے اس فریب کی سزا دینے میں ۲؎ بیشک ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) قلمبند کر رہے ہیں جو فریب تم کر رہے ہو ۳؎ ''

۱؎ الناس سے مراد اہل مکہ ہیں۔ رحمۃ سے مراد سرسبزی وشادابی خوشحالی اور صحت ہے۔ ضَرَّآء سے مراد قحط شدت اور مرض ہے، یعنی جب ہم نے اہل مکہ کی قحط سالی کو خوشحالی وشادابی سے بدل دیا تو بجائے شکر ادا کرنے کے ہماری آیتوں کا انکار کرنے لگے اور ان سے مذاق واستہزاء شروع کر دیا۔ مجاہد فرماتے ہیں مکر سے مراد آیات کی تکذیب اور استہزاء ہے (1)۔ میں کہتا ہوں مکر کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مخفی طریقہ سے دوسرے کو شر تک پہنچانے کا ارادہ کرنا۔ تو پھر آیات کی تکذیب اور ان سے استہزاء کو مکر سے تعبیر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ ظاہراً رسول کی تکذیب اور رسول کریم ﷺ کو اذیت پہنچانے کا ارادہ کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی تکذیب نہیں کرتے تھے لیکن اس شر اور تکذیب کا اعادہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتا تھا کیونکہ وہ آیات حقیقت میں اسی کا کلام معجز نظام تھا۔ مقاتل بن حیان فرماتے ہیں ان کا مکر یہ تھا کہ جب اللہ تعالیٰ نے بارش عطا فرما کر ان کی بدحالی کو شادابی اور خوشحالی سے بدل دیا تو وہ کہنے لگے یہ تو فلاں ستارے کے طلوع ہونے کی وجہ سے بارش برسی ہے (2)۔

بعض علماء فرماتے ہیں آیات سے انکا مکر ان سے بچاؤ کے حیلے کرنا اور ان پر طعن کرنا تھا۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ اہل مکہ قحط میں مبتلا ہوئے، پھر جب اللہ تعالیٰ نے اس قحط کو دور فرمایا اور ان پر اپنی رحمت کی برسات فرمائی تو وہ شکر ادا کرنے سے پہلے آیات کے استہزاء اور آیات کے انکار کی طرف جلدی کی۔ امام بخاری نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جب اہل مکہ کے کفریہ نظریات سے پلٹنے کی کوئی سبیل نہ دیکھی تو آپ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی اے اللہ ان لوگوں پر حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانہ کا سات سالہ قحط مسلط فرما کر میری اعانت فرما۔ زبان نبوی ﷺ سے نکلے ہوئے کلمات کو فوراً شرف قبولیت بخشا گیا تو قحط شروع ہو گیا ہر چیز ہلاک ہو گئی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 147 (الفکر)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 147 (الفکر)

حتیٰ کہ اہل مکہ چمڑے اور مردار کھانے پر مجبور ہو گئے' ابوسفیان حالات سے دل برداشتہ ہو کر بارگاہ رسالت میں حاضر ہوا اور کہا اے محمد ﷺ تو ہمیں اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور صلہ رحمی کا حکم دیتا ہے، جبکہ تمہاری قوم ہلاک ہو چکی ہے، اللہ تعالیٰ سے دعا فرمایئے کہ وہ ہم سے اس عذاب کو دور فرمائے تو آپ ﷺ نے دعا فرمائی(1) (اور حالات یکسر بدل گئے)۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ انہوں نے کہا اے ہمارے رب عذاب کو ہم سے دور فرما ہم ایمان لاتے ہیں۔ حضور ﷺ کو بتایا گیا کہ ان سے عذاب دور کیا گیا تو پھر یہ اپنی پرانی روش پر چل پڑیں گے۔ حضور ﷺ نے ان کے کہنے پر دعا فرمادی، اللہ تعالیٰ نے عذاب دور فرمادیا' تو وہ واقعی واپس پلٹ گئے اللہ تعالیٰ نے ان کے اس جرم کا انتقام بدر کے دن لیا تھا۔ اذا مفاجاتیہ کا کلمہ ان کے فوراً مکر کرنے پر دلالت کرتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے آگے اسی مفہوم کو ادا فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

2 اے محمد ﷺ فرما دیجئے اللہ تعالیٰ تم سے زیادہ تیز ہے مکر کی سزا دینے میں۔ مکر کے معنی کے اعتبار سے اس کا استعمال اللہ کے لیے جائز نہیں ہے۔ اس لیے جب اللہ تعالیٰ کی طرف یہ لفظ استعمال ہو تو اس کا معنی یا تو استدراج ہوتا ہے (یعنی کسی کو بتدریج تباہی کی طرف لے جانا اور اسے شعور تک نہ ہو) جس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول دلالت کرتا ہے جسے اللہ تعالیٰ دنیا کی وسعت عطا فرماتا ہے اور اسے یہ معلوم نہ ہو کہ یہ میرے ساتھ مکر ہے تو وہ دھوکہ میں ہے۔ میں کہتا ہوں اس کا مطلب یہ ہے جسے دنیا کی نعمتوں سے وافر حصہ دیا جائے اور وہ شکر گزار نہ ہو وہ دھوکے میں ہے۔ یا مکر کا مطلب مکر کی سزا دینا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے انہیں فوراً سزا دے دی۔ یا یہ مطلب کہ ان کیا اپنے فریب میں غور و فکر سے پہلے ان کو تباہی تک پہنچا دیا۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب تمہیں جلدی ہلاک کرنے والا ہے بنسبت تمہارے اس مکر و فریب کے جس کے ذریعے تم حق کو مٹانے کا ارادہ رکھتے ہو' کیونکہ اللہ تعالیٰ جس چیز کا ارادہ فرماتا ہے وہ ہو کر رہتی ہے کیونکہ وہ اپنے ارادے کے پورا کرنے پر قادر ہے اور تم حق کو مٹانے پر قادر نہیں ہو۔

3 جو گھناؤنی سازشیں وہ چھپ چھپ کر تیار کرتے ہیں وہ ہمارے فرشتوں پر بھی مخفی نہیں ہیں، چہ جائیکہ تمام جواہر و اعراض کے پیدا کرنے والے پر مخفی ہوں۔ یعقوب نے ماقبل کلام کی موافقت میں یاء کے ساتھ یعنی غائب کے صیغہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے تاء کے ساتھ یعنی خطاب کے صیغہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس میں انتقام کی تحقیق کا بیان ہے۔

هُوَ الَّذِيْ يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۭ حَتّٰٓي اِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ ۚ وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا بِهَا جَاۗءَتْهَا رِيْحٌ عَاصِفٌ وَّجَاۗءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّظَنُّوْٓا اَنَّھُمْ اُحِيْطَ بِهِمْ ۙ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ڬ لَىِٕنْ اَنْجَيْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ۝

"وہی ہے جو سیر کراتا ہے تمہیں خشک زمین اور سمندر میں 1 یہاں تک کہ جب تم سوار ہوتے ہو کشتیوں میں 2 اور چلنے لگتی ہیں مسافروں کو لے کر موافق ہوا کی وجہ سے 3 اور مسرور ہوتے ہیں اس سے 4 (تو اچانک) ایسی ہے انہیں تند و تیز ہوا اور آلیتی ہیں انہیں موجیں ہر جگہ (طرف) سے 5 اور وہ خیال کرنے لگتے ہیں کہ انہیں گھیر لیا گیا ہے 6 (تو اس وقت) پکارتے ہیں اللہ تعالیٰ کو خالص اسی کی عبادت کرتے ہوئے 7 کہتے ہیں (اے کریم) اگر تو نے بچا لیا ہمیں اس

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 341 (ابن کثیر)

(طوفان) سے تو ہم یقیناً ہوجائیں گے تیرے شکر گزار (بندوں) سے ۸ ؎"

۱؎ یعنی وہ تمہیں چلنے پر برانگیختہ کرتا ہے اور تمہارے لیے چلنا ممکن بناتا ہے۔ یہ جمہور کی قرأت ہے اور ابن عامر اور ابو جعفر نے ینشرکم نون اور شین کے ساتھ نشر سے مشتق کرکے پڑھا ہے۔

۲؎ فلک کا معنی کشتیاں ہے۔ فلک کا لفظ واحد اور جمع دونوں معانی کے لیے استعمال ہوتا ہے مگر یہاں جمع کے معنی میں ہے کیونکہ آگے جمع کے موافق کلام ہے۔

۳؎ جو ان پر سوار ہوتے ہیں ان کو لے کر چلتی ہیں۔ یہاں مبالغہ کے لیے خطاب سے غیبت کی طرف التفات کیا گیا ہے کیونکہ یہ غیروں کا تذکرہ ہے تاکہ ان کی حالت پر تعجب کیا جائے اور ان پر نفرت کا اظہار کیا جائے۔ بریح طیبۃ سے مراد مقصود تک پہنچانے والی نرم ہوا ہے۔

۴؎ یہ اذا کا جواب ہے اور ھا ضمیر کا مرجع یا تو فلک ہے یا ریح طیبہ ہے۔ یعنی اس ہوا کے چلنے کی وجہ سے وہ خوش ہوتے ہیں۔ ریح عاصف سخت تیز ہوا کو کہتے ہیں۔

۵؎ ہوا کی تیزی کی وجہ سے پانی کے اوپر جو لہریں بلند ہوتی ہیں انہیں موج کہا جاتا ہے۔

۶؎ وظنوا فرمایا یہاں ایقنوا نہیں فرمایا کیونکہ صرف قرائن کی وجہ سے مستقبل کے امور کے بارے میں یقین متصور نہیں ہوسکتا، یعنی وہ گمان کرتے ہیں موجوں اور مہلکات نے انہیں گھیر لیا ہے۔ اور اس طرح گھیر لیا ہے کہ نکلنے کا کوئی راستہ ہی نہیں جیسے دشمن کسی کو چاروں طرف سے گھیر لیتا ہے۔

۷؎ جب مصائب وشدائد میں گھر جاتا ہے تو انتہائی خلوص کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے التجاء کرتا ہے، اس وقت اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں پکارتا۔ عرب عام حالات میں اپنے من گھڑت خداؤں کی پوجا پاٹ میں لگے رہتے مگر مصائب وتکالیف میں صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کو پکارتے دعوا اللّٰہ کا قول ظنوا سے بدل اشتمال ہے کیونکہ ان کی دعا ان کے ظن کے لوازم سے ہے۔

۸؎ اے ہمارے پروردگار اگر تو ہمیں ایک مرتبہ اس گرداب سے نجات عطا فرمادے۔ من ھذا یعنی اس تند تیز ہوا کے جھونکوں سے بچا لے تو ہم تیرے شکر گزار بندوں میں سے ہوجائیں گے۔ یہ جملہ شرطیہ ہے، اس سے پہلے یا تو قول کا فعل محذوف ہے یا یہ دعوا کا مفعول ہے کیونکہ یہ بھی ان کے قول کا حصہ ہے۔ اس کلام میں سیر کرانے کی غایت کشتیوں میں ہونا نہیں بلکہ حتیٰ کے بعد جو جملہ شرطیہ ہے۔ اس کا پورا مضمون غایت ہے، گویا یوں کہا گیا ہے حتیٰ کہ جب اس اس طرح ہوا کا چلنا' موجوں کا بپھرنا پھر ہلاکتوں کا خیال آنا نجات کی دعا کرنا یہ سب تیسیر کی غایت ہے۔

فَلَمَّآ اَنْجٰىهُمْ اِذَا هُمْ يَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلٰٓي اَنْفُسِكُمْ ۙ مَّتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۡ ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۳﴾

"پھر جب وہ بچا لیتا ہے انہیں تو وہ سرکشی کرنے لگتے ہیں زمین میں ناحق ۱؎ اے لوگو! تمہاری سرکشی کا وبال تمہی پر پڑے گا ۲؎ لطف اٹھالو دنیوی زندگی سے ۳؎ پھر ہماری طرف ہی لوٹ کر آنا ہے ۴؎ تمہیں پھر ہم آگاہ کریں گے تمہیں جو کچھ تم کیا کرتے تھے ۵؎"

۱؎ جب اللہ تعالیٰ ان کی دعا کو شرف قبولیت عطا فرما کر انہیں نجات عطا فرماتا ہے تو فوراً وہ ظلم وسرکشی کی روش اختیار کرلیتے ہیں اور حدود

حتیٰ کہ پھلانگ کر دنگا و فساد پھیلانا شروع کر لیتے ہیں بِغَیْرِ الْحَقِّ کے الفاظ یبغون کے قول کی تاکید ہے کیونکہ حق کے ساتھ کبھی بغاوت کا ایصال نہیں ہوتا۔ ان الفاظ میں اس شبہ کا بھی ازالہ ہے کہ مسلمان بھی تو کفار کے گھروں کو تباہ کرتے ہیں، ان کے کھیتوں کو جلاتے ہیں، ان کے درختوں کو اکھیڑ پھینکتے ہیں، کیا یہ فساد فی الارض نہیں۔ فرمایا وہ سب کچھ اللہ کے اذن سے کرتے ہیں، ایسا کرنا ان کے لیے حق ہوتا ہے۔ یہ اس لیے کیا جاتا ہے تاکہ فاسقین کو سزا دی جائے اور ان کو فساد چھوڑنے پر مجبور کر کے اصلاح کی طرف لایا جائے۔

۲ اے لوگو تمہاری اس سرکشی اور بغاوت کا وبال تم پر پڑے گا رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ اَسْرَعُ الْخَيْرِ ثَوَابًا الْبِرُّ وَصِلَةُ الرَّحِمِ: سب سے جلدی ثواب پہنچانے والی نیکی حسن سلوک اور صلہ رحمی ہے۔ وَاَسْرَعُ الشَّرِّ عُقُوْبَةً الْبَغْيُ وَقَطِيْعَةُ الرَّحِمِ: اور سب سے جلدی سزا پہنچانے والی برائی بغاوت اور قطع تعلقی ہے(1)۔ اس حدیث کو ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت عائشہ سے حسن سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تین برائیاں اگر کسی میں پائی جائیں تو ان کا وبال اس کے اپنے اوپر لوٹتا ہے (۱)۔ سرکشی و بغاوت (۲) دھوکہ (۳) وعدہ خلافی(2)۔ اس حدیث کو ابو الشیخ' الخطیب اور ابن مردویہ نے التفسیر میں حضرت انس سے روایت کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لَوْ بَغٰى جَبَلٌ عَلٰى جَبَلٍ لَدُكَّ الْبَاغِيْ مِنْهُمَا. اگر پہاڑ بھی پہاڑ پر بغاوت کرے گا تو دونوں میں سے جو باغی ہوگا وہ ریزہ ریزہ ہو جائے(3)۔ اس حدیث کو ابن لال نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے۔

۳ یہ ظاہری دنیا کا ساز و سامان نفع پہنچانے کے لیے مگر ہمیشہ رہنے والا نہیں ہے۔ حضرت حفص نے مصدر موکد کی حیثیت سے اسے منصوب پڑھا ہے۔ یعنی تَمَتَّعُوْنَ مَتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا، یا یہ بغی کا مفعول ہے کیونکہ اس میں طلب کا معنی پایا جاتا ہے، جار مجرور اس کے متعلق ہوگا اور خبر محذوف ہوگی تقدیر عبارت یوں ہوگی۔ اِنَّمَا بَغْيُكُمْ مَتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مَحْذُوْرٌ اَوْ ضَلَالٌ: تمہارا دنیوی زندگی کے ساز و سامان کے لیے بغاوت کرنا محذور ہے یا گمراہی ہے۔ یا یہ اس فعل کا مفعول ہے جس پر البغی دلالت کرتا ہے اور علی انفسکم خبر ہے۔ باقی علماء نے مرفوع پڑھا ہے کیونکہ یہ خبر کے بعد دوسری خبر ہے یا یہ خبر ہے، اور علی انفسکم اس کے متعلق ہے یا یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا اور عَلٰى اَنْفُسِكُمْ بغیکم کی خبر ہے۔

۴ مرنے کے ساتھ یا قیامت کے دن ہماری طرف تمہیں لوٹنا ہے۔

۵ یعنی جو تم کرتے رہے اس کی تمہیں جزا دے کر تمہیں آگاہ کرے گا۔

اِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ مِمَّا يَاْكُلُ النَّاسُ وَالْاَنْعَامُ ؕ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ اَهْلُهَاۤ اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَاۤ ۙ اَتٰىهَاۤ اَمْرُنَا لَيْلًا اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝۲۴

"پس حیات دنیوی (کے عروج و زوال) کی مثال ایسی ہے جیسے ہم نے پانی اتارا آسمان سے سو گھنی ہو کر اگی پانی کے

1۔ الترغیب والترہیب، جلد 3، صفحہ 343 (الفکر)
2۔ کنز العمال، جلد 16، صفحہ 26 (التراث الاسلامی)
3۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 544 (العلمیہ)

باعث سرسبزی زمین کی جس سے انسان بھی کھاتے ہیں اور حیوان بھی یہاں تک کہ جب لے لیا زمین نے اپنا سنگار اور وہ خوب آراستہ ہوگئی ۱؎ اور یقین کر لیا اسکے مالکوں نے کہ (اب) انہوں نے قابو پالیا ہے اس پر (تو اچانک) آ پڑا اس پر ہمارا حکم (عذاب) رات یا دن کے وقت پس ہم نے کاٹ کر رکھ دیا اسے گویا کل وہ یہاں تھی ہی نہیں ۲؎ یونہی ہم وضاحت سے بیان کرتے ہیں (اپنی قدرت کی) نشانیوں کو اس قوم کے لیے جو غور وفکر کرتی ہے ۳؎ ''

۱؎ اس دنیا کے جلد فنا ہونے اور لوگوں کے اس کے حسن ورعنائی سے دھوکہ کھانے کی عجیب مثال ہے۔ہم آسمان سے پانی اتارتے ہیں پھر اس کی وجہ سے خوب گھنی ہوکر اگتی ہیں' زمین کے دانے' پھل اور سبزیاں جن کو انسان کھاتے ہیں اور گھاس جس کو حیوان کھاتے ہیں یہاں تک کہ جب زمین رنگ برنگے پھولوں اور پھلوں سے اپنے حسن و بہجت کو مکمل کر لیتی ہے۔اور خوب آراستہ ہو جاتی ہے'' ازینت اصل میں تزینت تھا'' ابن مسعود نے تزینت اصل پر پڑھا ہے۔

۲؎ زمین کے مالکوں نے یقین کر لیا کہ اب ہم اس زمین کی فصل کے اٹھانے پر قادر ہیں، یعنی پھل چننے' فصل کاٹنے' اس کا غلہ اٹھانے اور اس سے منتفع ہونے میں کوئی طاقت ہمارا راستہ نہیں روک سکتی' اب ہم مکمل طور پر اس پر قدرت رکھتے ہیں۔تو اس فصل کی سلامتی کے یقین کے بعد بعض آفات کے نزول کا ہمارا فیصلہ آ پہنچا تو ہم نے اس کھیتی کو کاٹ کر رکھ دیا، گویا یہاں کھیتی تھی ہی نہیں مضاف کو دونوں سے حذف کر کے مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام رکھا گیا اور یہ غنی بالمکان سے مشتق ہے۔جس کا مطلب ہوتا ہے قیام کرنا ٹھہرنا۔الامس کا مطلب ہے اس زمانہ سے تھوڑا سا پہلے۔یہ ماضی قریب کے وقت کی مثال ہے اور ممثل بہ حکایت کا پورا مضمون ہے۔یعنی نباتات کی سرسبزی' پھر ان کے مزین ہونے کے بعد نیست ونابود ہونا جبکہ اس کے مالکان اب آفات سے سلامت گمان کر رہے تھے۔صرف پانی ممثل بہ نہیں ہے اگرچہ حرف تشبیہ کے ساتھ وہی متصل ہے۔کیونکہ یہ تشبیہ مرکب ہے جس میں ایک مضمون کو دوسرے مضمون کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے۔حضرت قتادہ فرماتے ہیں دنیا کے ساز وسامان سے مشغول پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آ پہنچتا ہے جس سے وہ بالکل بے خبر ہوتا ہے(1)۔

۳؎ ہم اپنی نشانیاں بیان فرماتے اس قوم کے لیے جو غور وفکر سے کام لیتی ہے کیونکہ ان آیات سے نفع یہی لوگ حاصل کرتے ہیں اس لیے ان کی تخصیص فرما دی (حالانکہ قرآن کے ہدایت عام ہے)

وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ ۭ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝۲۵

'' اور اللہ تعالیٰ تمام لوگوں کو بلاتا ہے (امن و) سلامتی کے گھر کی طرف ۱؎ اور ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے سیدھے راستہ کی طرف ۲؎ ''

۱؎ اللہ تعالیٰ تمام لوگوں کو بلاتا ہے ایسے امن وسلامتی والے گھر کی طرف جو ہر قسم کی آفات اور ہلاکتوں سے محفوظ ہے، یعنی جنت کی طرف بلاتا ہے۔حضرت قتادہ فرماتے ہیں السلام سے اللہ تعالیٰ کی ذات اور دار سے جنت مراد ہے(2)۔اس اسم کے ساتھ تخصیص اسی بات پر تنبیہ کرنے کے لیے ہے۔حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ سوئے ہوئے تھے کہ فرشتے حاضر ہوئے آپس میں کہنے لگے اپنے اس صاحب کی مثال بیان کرو۔ایک نے کہا وہ سوئے ہوئے ہیں، دوسرے نے کہا آنکھیں سوئی ہوئی ہیں مگر دل بیدار ہے۔کہنے لگے ان کے مثال اس شخص کی مانند ہے' جس نے گھر تعمیر کیا، پھر اس میں ایک دعوت کا اہتمام کیا، ایک دعوت دینے

1۔تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 150 (الفکر) 2۔تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 150 (الفکر)

والا بھیجا جس نے اس داعی کی دعوت کو قبول کیا، وہ اس گھر میں داخل بھی ہوا اور رنگ برنگے دستر خوان سے کھایا بھی۔ لیکن جس نے اس داعی کی دعوت کو قبول نہ کیا، وہ نہ گھر میں داخل ہوا اور نہ اس کے دستر خوان سے کچھ کھایا۔ پھر کہنے لگے اس مثال کی وضاحت کرو تا کہ سمجھ لیں۔ ایک نے کہا وہ سوئے ہوئے ہیں، دوسرے نے کہا آنکھیں سوئی ہیں مگر دل بیدار ہے۔ انہوں نے کہا اس مثال میں دار سے مراد جنت ہے۔ داعی سے مراد محمد ﷺ ہیں، جس نے محمد ﷺ کی اطاعت کی اس نے اللہ تعالیٰ کی، اطاعت کی جس نے محمد ﷺ کی نافرمانی کی اس نے اللہ تعالیٰ کی۔ نافرمانی کی محمد ﷺ لوگوں کے درمیان فرق ہیں (یعنی ان کے ماننے والے مومن اور نہ ماننے والے کافر ہیں)۔ اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے(1)۔ اس حدیث کو دارمی نے ربیعہ الجرشی سے مندرجہ ذیل الفاظ میں روایت کیا ہے قِيْلَ لِيْ سَيِّدٌ بَنٰى دَارًا وَ وَضَعَ مَأْدُبَةً وَاَرْسَلَ دَاعِيًا فَمَنْ اَجَابَ الدَّاعِيَ دَخَلَ الدَّارَ وَ اَكَلَ مِنَ الْمَأْدُبَةِ وَرَضِيَ عَنْهُ السَّيِّدُ وَمَنْ لَّمْ يُجِبِ الدَّاعِيَ لَمْ يَدْخُلِ الدَّارَ وَلَمْ يَاْكُلْ مِنَ الْمَأْدُبَةِ وَسَخِطَ عَلَيْهِ السَّيِّدُ قَالَ فَاللّٰهُ السَّيِّدُ وَ مُحَمَّدٌ الدَّاعِيْ وَالدَّارُ الْاِسْلَامُ وَالْمَأْدُبَةُ الْجَنَّةُ۔ مجھے کہا گیا ایک سردار نے گھر بنایا اور اس میں دستر خوان لگایا۔ پھر ایک دعوت دینے والا بھیجا۔ پس جس نے داعی کی دعوت کو قبول کیا وہ گھر میں داخل بھی ہوا اور کھانا بھی دستر خوان سے کھایا اور سردار بھی اس سے راضی ہوا اور جس نے داعی کی دعوت کو قبول نہ کیا وہ نہ گھر میں داخل ہوا نہ اس دستر خوان سے کھایا اور اس پر سردار ناراض ہوا۔ پھر فرمایا اللہ سید ہے، محمد داعی ہے، دار سے مراد اسلام اور دستر خوان جنت ہے۔

بعض علماء فرماتے ہیں آیت میں السلام سے مراد تحیہ یعنی سلام ہی ہے اور جنت کو دارلسلام کہنے کی وجہ یہ ہے کہ جنتی ایک دوسرے پر سلام کریں گے نیز فرشتے ہر دروازے سے سلام کرتے ہوئے داخل ہوں گے۔

۲۔ لوگوں میں جسے چاہتا ہے اس کی راہنمائی فرماتا ہے دین اسلام کی طرف' سنت کے طریقہ کی طرف اور اس راستہ کی طرف جو اس کی بارگاہ قدس تک پہنچنے والا ہے۔ اس آیت کریمہ میں دعوت کو عموم کے ساتھ اور ہدایت کو مشیت کی قید کے ساتھ ذکر کرنا دلیل ہے کہ کوئی بغیر ارادہ کے بھی ہو سکتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے کافر کی ہدایت کا ارادہ نہیں فرمایا۔

لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ ؕ وَلَا يَرْهَقُ وُجُوْهَهُمْ قَتَرٌ وَّلَا ذِلَّةٌ ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۶﴾

"ان کے لیے جنھوں نے نیک عمل کیے ۱؎ نیک جزاء ہے ۲؎ بلکہ اس سے بھی زیادہ ۳؎ اور نہ چھائے گا ان کے چہروں پر (رسوائی کا) غبار اور نہ ذلت (کا اثر ہو گا) ۴؎ یہی لوگ جنتی ہیں ۵؎"

۱؎ یعنی جنھوں نے دنیا میں نیک اعمال کیے۔ رسول اللہ ﷺ نے جبریل کے سوال کے قصہ میں احسان کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا اَلْاِحْسَانُ اَنْ تَعْبُدَ رَبَّكَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ احسان یہ ہے کہ تو اپنے رب کی عبادت اس کیفیت میں ادا کر گویا تو اسے دیکھ رہا ہے، اگر یہ ممکن نہ ہو تو یہ تو خیال کر کہ وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔ یہ حدیث بخاری اور مسلم میں حضرت عمر سے مروی ہے(2)۔

۲؎ الحسنٰی سے مراد نیک جزاء یعنی جنت ہے۔ ابن مردویہ نے ابن عمر کے واسطے سے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے جنھوں نے لا الہ الا اللہ کی شہادت کا حق ادا کیا ان کے لیے جنت اور مزید دیدار الٰہی ہے(3)۔

1۔ صحیح بخاری، جلد 6، صفحہ 255 (ابن کثیر)   2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 141 (العلمیہ)   3۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 547 (العلمیہ)

سے اللہ جل شانہ کا دیدار بھی انہیں نصیب ہوگا۔ اسی طرح ابن جریر اور ابن مردویہ نے حضرت ابوموسی اشعری کے واسطے سے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ایک ندا کرنے والا بھیجے گا جو ایسی بلند آواز سے ندا دیگا کہ اولین و آخرین اسے سن لیں گے۔ اے اہل جنت اللہ تعالیٰ نے تم سے الحسنیٰ کا وعدہ فرمایا ہے۔ الحسنیٰ جنت ہے اور مزید دیدار الٰہی ہے۔ ابن جریر ابن مردویہ، اللالکائی اور ابن ابی حاتم نے ابی بن کعب کے طریق سے رسول اللہ ﷺ سے اسی طرح روایت کی ہے۔ ابن مردویہ، ابوالشیخ اور اللالکائی کے دو واسطوں سے حضرت انس سے مرفوع روایت کی ہے۔ ابوالشیخ نے ابوہریرہ سے مرفوع روایت کی ابن جریر، ابن مردویہ ابن المنذر، اور ابوالشیخ نے اپنی اپنی تفاسیر میں اور اللالکائی اور الاجری نے کتاب الرؤیۃ میں حضرت ابوبکر الصدیق سے روایت کی ہے۔ ابن جریر، ابن المنذر، ابوالشیخ اللالکائی اور الاجری نے حضرت حذیفہ بن الیمان سے اسی ایت کے تحت اسی طرح روایت کی ہے۔ ہناد، ابن ابی حاتم، ابوالشیخ اور اللالکائی سے ابوموسیٰ اشعری سے بھی اسی طرح روایت کی ہے۔ ابن مردویہ نے عکرمہ عن ابن عباس کی سند سے اسی طرح روایت کی ہے۔ ابن ابی حاتم اور اللالکائی نے عن السدی عن ابی مالک اور عن ابی صالح عن ابن عباس اور عن عروہ عن ابن مسعود کے طرق سے بھی اس طرح روایت کی ہے۔ اللالکائی نے یہ تفسیر مختلف سندوں کے ساتھ سعید بن المسیب، حسن بصری، عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ، عامر بن سعید البجلی، ابن ابی اسحاق الشعبی، عبدالرحمن بن سابط، عکرمہ، مجاہد اور قتادہ سے روایت کی ہے۔ علامہ قرطبی کتاب الرؤیہ میں لکھتے ہیں یہ تفسیر صحابہ کرام اور تابعین عظام میں مشہور و معروف تھی۔ اور یقیناً یہ توقیفی ہوسکتی ہے، مسلم اور ابن ماجہ نے صہیب کے واسطہ سے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ جب جنتی جنت میں داخل ہونگے کیا تم کسی مزید چیز کے خواہش مند ہو کہ میں تمہیں عطا کروں۔ وہ عرض کریں گے کیا تو نے ہمارے چہرے روشن نہیں کردے کیا تو نے ہمیں جنت میں داخل نہیں کیا، کیا تو نے ہمیں دوزخ سے نجات نہیں عطا فرمائی۔ (ان نعمتوں کے ملنے کے بعد ہماری اور کیا خواہش ہوسکتی ہے) اللہ تعالیٰ حجاب اٹھا دیں گے۔ اللہ تعالیٰ کا دیدار انہیں جنت کی نعمتوں سے زیادہ محبوب ہوگا۔ پھر آپ ﷺ نے یہی آیت تلاوت فرمائی (1)۔

امام بغوی نے یہ حدیث ان الفاظ میں روایت کی ہے۔ آپ ﷺ نے لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الایۃ تلاوت فرمائی۔ پھر فرمایا جب جنتی جنت میں اور دوزخی دوزخ میں داخل ہو جائیں تو ایک منادی ندا دے گا اے اہل جنت تمہارے لیے اللہ تعالیٰ کا ایک وعدہ ہے جسے وہ پورا کرنا چاہتا ہے جنتی کہیں گے وہ وعدہ کیا ہے کیا تو نے ہمارے میزان بھاری کرنہیں دیئے تو نے ہمارے چہرے روشن نہیں کر دیئے تو نے ہمیں جنت عطا نہیں فرمادی تو نے ہمیں دوزخ سے نجات نہیں دی۔ (کیا وعدہ ابھی باقی ہے) فرمایا اللہ تعالیٰ حجاب اٹھائیں گے تو جنتی اللہ تعالیٰ کا دیدار کریں گے (2) دیدار الٰہی سے زیادہ انہیں کوئی چیز محبوب نہ ہوگی۔

علامہ قرطبی فرماتے ہیں حجاب اٹھانے کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے رؤیت کے موانع دور کردیگا حتی کہ وہ عظمت و جلال کے نور کو دیکھ لیں گے۔ حجاب کا ذکر مخلوق کے اعتبار سے خالق کے اعتبار سے نہیں۔ اس کی ذات بلند و بالا اور پاک ہے ہر عیب و نقص سے۔

ے نہ چھایا ہوگا ان کے چہروں پر کوئی غبار قتر اس غبار کو کہتے ہیں جس میں کالک بھی ہو۔ ابن ابی حاتم وغیرہ نے ابن عباس اور ابن مسعود سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ ایسی رسوائی ان کے چہروں پر نہ ہوگی جیسی دوزخیوں کے چہروں پر ہوگی۔

ے جنتی جنت میں ہمیشہ رہیں گے، نہ اس سے نکالے جائیں گے اور نہ اس کی نعمتوں کا اختتام ہوگا، بخلاف دنیا اور اس کی زیب و زینت کے کہ یہ عارضی اور زوال پذیر ہے۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 3، صفحہ 15 (العلمیہ)

2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 151 (العلمیہ)

وَالَّذِيْنَ كَسَبُوا السَّيِّاٰتِ جَزَآءُ سَيِّئَةٍۢ بِمِثْلِهَا ۙ وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ؕ مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ۚ كَاَنَّمَآ اُغْشِيَتْ وُجُوْهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ الَّيْلِ مُظْلِمًا ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۷﴾

"اور جنہوں نے برے کام کیے تو برائی کی سزا اس جیسی ہوگی [۱] اور چھا رہی ہوگی ان پر ذلت نہیں ہوگا ان کے لیے اللہ (کے عذاب) سے کوئی بچانے والا [۲] گویا ڈھانپ دیے گئے ہیں ان کے چہرے کالی رات کے کسی ٹکڑے سے [۳] وہی دوزخی ہیں وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے [۴]"

[۱] اللذین کا یا تو لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا پر عطف ہے ان کے مذہب پر جو فی الدار زید و الحجرة عمرو میں عطف جائز قرار دیتے ہیں۔ یا وَالَّذِيْنَ اپنے صلہ سے مل کر مبتدا ہے اور جَزَآءُ سَيِّئَةٍ خبر ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی جزاءُ الذين كسبوا السيئات جزاءُ سيئة بمثلها یعنی ہم برائی کا بدلہ برائی کی مثل دیں گے، اس سے تجاوز نہیں کیا جائے گا اور یہ بھی جائز ہے اس کی خبر كَاَنَّمَآ اُغْشِيَتْ یا اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ہو اور درمیان میں کلام معترضہ ہو اور جَزَآءُ سَيِّئَةٍ مبتدا ہو اور اس کی خبر محذوف ہو یعنی جزاء سيئة واقع یا اسی کی مثل مقدر ہو یا باکی زیادتی کے ساتھ بمثلها خبر ہے۔

[۲] یعنی ان کے چہروں پر چھائی ہوئی ہوگی۔ ذلت و رسوائی عاصم سے پہلے من زائدہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی بھی اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے انہیں بچانے والا نہ ہوگا۔ یا یہ مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی انہیں بچانے والا نہ ہوگا۔ یا یہ معنی کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کوئی ایسا نہ ہوگا جو انہیں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچائے گا۔

[۳] اس جملہ میں قطعاً قطعۃ کی جمع ہے اور اغشیت کا مفعول ثانی ہے من اللیل یہ قطعاً کی صفت ہے۔ مظلماً اللیل سے حال ہے اور اس کا عامل اغشیت ہے کیونکہ اس کے موصوف کا عامل ہی اس کا عامل ہوتا ہے۔ یا من اللیل میں جو فعل کا معنی پایا جاتا ہے وہ اس کا عامل ہے۔ ابن کثیر، الکسائی اور یعقوب قطعاً طاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور اس کا معنی بعض ہے جیسے بقطع من اللیل کا ارشاد ہے اس صورت میں مظلماً کو قطعاً کی صفت یا اس کا حال بنانا بھی صحیح ہے۔

[۴] معتزلہ نے اس آیت کریمہ سے گناہ کبیرہ کے مرتکب کے ہمیشہ دوزخ میں رہنے پر دلیل پکڑی ہے۔ مگر ان کا یہ کہنا مردود ہے کیونکہ سیات کا لفظ گناہ صغیرہ گناہ کبیرہ اور کفر تینوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اگر یہ آیت اپنے عموم پر ہو تو پھر گناہ صغیرہ کے مرتکب کا بھی ہمیشہ دوزخ میں رہنا لازم آئے گا حالانکہ یہ قول کسی نے بھی نہیں کہا۔ اسی اللہ تعالیٰ کا ارشاد جَزَآءُ سَيِّئَةٍۢ بِمِثْلِهَا بھی گناہ کبیرہ کے ہمیشہ دوزخ میں رہنے کی نفی کرتا ہے کیونکہ یہ تقاضا کرتا ہے کہ گناہ کبیرہ کے مرتکب کی سزا کفر کی سزا سے کم اور صغائر کی سزا سے زیادہ ہو۔ اس لیے گناہ کبیرہ کے مرتکب کا ہمیشہ دوزخ میں رہنے کا قول متصور ہی نہیں ہو سکتا۔ اسم اشارہ کا مرجع اسی پر دلالت کرتا ہے کہ الَّذِيْنَ كَسَبُوا السَّيِّاٰتِ عموم پر نہیں بلکہ اس سے بعض مراد ہیں اور وہ کفار ہیں جیسا کہ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ (ان کے خاوند ان کو لوٹانے کے زیادہ حقدار ہیں) کا ارشاد وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ کے ارشاد کے بعد ہے اس میں بھی اَلْمُطَلَّقٰتُ سے مراد وہ بیویاں ہیں جنہیں مردوں نے تین طلاقیں نہ دی ہوں۔

اور یہ بھی جائز ہے کہ الَّذِيْنَ كَسَبُوا السَّيِّاٰتِ سے مراد کفار ہوں کیونکہ الذین احسنوا یہ اہل قبلہ میں سے اصحاب کبائر کو شامل ہے

کیونکہ ایمان تمام نیکیوں کی اصل ہے۔ اس لیے الَّذِیْنَ کَسَبُوا السَّیِّاٰتِ میں اصحاب کبائر شامل نہ ہونگے (کیونکہ پہلے انکا شمار دوسرے گروہ کے تحت ہو چکا ہے)۔ یہ بھی ممکن ہے کہ الَّذِیْنَ کَسَبُوا السَّیِّاٰتِ سے وہ لوگ مراد ہوں جو حضور نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں موجود تھے اور مومن جو اس زمانہ میں موجود تھے وہ تمام صحابہ کرام تھے اور وہ تمام کے تمام عادل تھے۔ اور اس پر اجماع ہے کہ اصحاب رسول اللہ ﷺ میں سے جب کسی سے بتقاضائے بشریت گناہ سرزد ہوا تو اس نے توبہ کی اور اس کی بخشش ہوگئی اور گناہ سے توبہ کرنے والا ایسے ہوتا ہے جیسے اس نے گناہ کیا ہی نہیں ہے۔ پس اس دور میں کسی اور مجرم صرف کافر ہی تھے۔ (واللہ اعلم)۔

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا مَكَانَكُمْ اَنْتُمْ وَشُرَكَآؤُكُمْ ۚ فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ وَقَالَ شُرَكَآؤُهُمْ مَّا كُنْتُمْ اِيَّانَا تَعْبُدُوْنَ ﴿۲۸﴾

"(اور ان کی پشیمانی کا تصور کرو) جس روز ہم جمع کریں گے ان سب کو (میدان حشر میں) پھر ہم حکم دیں گے مشرکوں کو اپنی اپنی جگہ پر ٹھہر جاؤ تم اور تمہارے جھوٹے معبود[1] پھر ہم منقطع کر دیں گے ان کے باہمی تعلقات[2] اور کہیں گے ان کے معبود (اے مشرکو!) تم ہماری تو عبادت نہیں کیا کرتے تھے[3]"

[1] یعنی ہم دونوں فریقوں کو جمع کریں گے میدان حشر میں، پھر ہم مشرکوں سے کہیں گے کہ اپنی اپنی جگہ کو لازم پکڑو حتی کہ تم دیکھ لو کہ تمہارے ساتھ کیسا سلوک کرتے ہیں۔ انتم یہ ضمیر الزموا فعل محذوف کے فاعل کی تاکید ہے جو مکانکم کا عامل ہے، و شرکاؤکم کا ضمیر مذکور پر معطوف ہے اور اس سے مراد ان کے ہاتھوں سے گھڑے ہوئے بت ہیں۔

[2] ہم نے ان کے وہ سب تعلقات کاٹ کر دیے جو ان کے آپس میں دنیا کے اندر تھے حتی کہ ہر جھوٹا معبود اپنے پرستاروں سے برأت کا اظہار کرے گا۔ بعض علماء مفسرین فرماتے ہیں اس کا معنی ہے، ہم مومنین اور کفار کے درمیان جدائی ڈال دیں گے اور انہیں علیحدہ علیحدہ کر دیں گے جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہے وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۵۹﴾ (اے مجرمو! آج میرے فرمانبردار بندوں سے علیحدہ ہو جاؤ)

[3] ان کے بت انہیں کہیں گے ہم نے تو تم سے اپنی عبادت کا مطالبہ نہیں کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ بتوں کو کلام کرنے کی طاقت عطا فرمائے گا۔ پس وہ شفاعت جس کی امید ان سے کافر رکھتے تھے اس کی جگہ وہ برأت کا اظہار کریں گے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہاں شرکاء سے مراد ملائکہ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں کیوں کہ فرشتوں اور عیسیٰ علیہ السلام نے نہ انہیں ایسی عبادت کا حکم دیا تھا اور نہ وہ اس کو پسند کرتے تھے۔ جب معبودان باطل یہ کہیں گے کہ ہم نے تمہیں عبادت کرنے کے لیے نہیں کہا تھا۔ تو کافر کہیں گے کیوں نہیں تم ہمیں اپنی عبادت کا کہتے تھے اور ہم تمہاری عبادت کرتے تھے۔ ان کی اس غلط بیانی پر بت کہیں گے۔

فَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اِنْ كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغٰفِلِيْنَ ﴿۲۹﴾

"پس کافی ہے اللہ تعالیٰ گواہ ہمارے درمیان اور تمہارے درمیان[1] کہ ہم تمہاری پرستش سے بالکل بےخبر تھے[2]"

[1] وہ ہر چیز کی حقیقت و کنہ کو جاننے والا ہے۔ اِنْ کنا میں اِن مخففہ من مثقلہ ہے۔ اصل میں انا کنا تھا۔

[2] غافلین پر لامِ اِن نافیہ اور اِن مخففہ کے درمیان فرق کرنے کے لیے لایا گیا ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ اِن نافیہ ہو اور لام بمعنی الا ہو عبارت یوں ہو جائے گی۔ مَا كُنَّا اِلَّا غَافِلِيْنَ عَنْ عِبَادَتِكُمْ ہم تمہاری عبادت سے بالکل بےخبر تھے، ہم تو نہ سنتے تھے نہ دیکھتے تھے، اور نہ کچھ سمجھتے تھے کیونکہ ہم تو بےجان پتھر اور مورتیاں تھے۔

هُنَالِكَ تَبۡلُوۡا كُلُّ نَفۡسٍ مَّاۤ اَسۡلَفَتۡ وَرُدُّوۡۤا اِلَى اللّٰهِ مَوۡلٰٮهُمُ الۡحَـقِّ وَضَلَّ عَنۡهُمۡ مَّا كَانُوۡا يَفۡتَرُوۡنَ ﴿۳۰﴾

"وہاں آزمالے گا ہر شخص جو اس نے آگے بھیجا تھا [1] اور انہیں لوٹا دیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف [2] جو ان کا مالک حقیقی ہے [3] اور گم ہو جائے گا ان سے جو وہ افترا باندھا کرتے تھے [4]"

[1] اس جگہ ہر نفس اپنے عمل کا نفع اور نقصان جان لے گا حمزہ اور الکسائی نے تتلوا دوتاء کے ساتھ پڑھا ہے تلاوت سے مشتق ہو گا تو یہ معنی ہو گا کہ ہر نفس اپنے نامہ اعمال کو پڑھے گا۔ یا التلو سے مشتق ہو گا جس کا معنی یہ ہو گا کہ وہ اپنے عمل کے پیچھے پیچھے جنت یا دوزخ میں جائے گا۔

[2] جو کچھ انہوں نے دنیا میں کیا تھا اس کے بدلے اللہ کے حکم اور اس کی جزاء کی طرف انہیں لوٹایا جائے گا۔

[3] وہ حقیقۃً ان کے امور کا والی ہے اور ان کو پالنے والا ہے، نہ وہ جن کو انہوں نے اللہ کے قریبی سمجھ رکھا تھا۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَاَنَّ الۡكٰفِرِيۡنَ لَا مَوۡلٰى لَهُمۡ کہ کافروں کا اس دن کوئی مولیٰ نہ ہو گا تو یہاں کیوں فرمایا انہیں اپنے مولیٰ کی طرف لوٹا دیا جائے گا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ وہاں مولیٰ بمعنی ناصر (مددگار) ہے جبکہ یہاں مولیٰ بمعنی رب) اور مالک ہے۔

[4] ان سے زائل ہو جائے اور گم ہو جائے گا جو وہ افتراء باندھتے تھے کہ ہمارے بت ہمارے شفیع بنیں گے یا یہ کہ وہ پکارتے تھے کہ یہ ہمارے خدا ہیں (تو ان کے تمام عقائد باطلہ اور خیالات فاسدہ ختم ہو جائیں گے)۔

قُلۡ مَنۡ يَّرۡزُقُكُمۡ مِّنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ اَمَّنۡ يَّمۡلِكُ السَّمۡعَ وَالۡاَبۡصَارَ وَمَنۡ يُّخۡرِجُ الۡحَـىَّ مِنَ الۡمَيِّتِ وَيُخۡرِجُ الۡمَيِّتَ مِنَ الۡحَـىِّ وَمَنۡ يُّدَبِّرُ الۡاَمۡرَ‌ ؕ فَسَيَـقُوۡلُوۡنَ اللّٰهُ‌ ۚ فَقُلۡ اَفَلَا تَتَّقُوۡنَ ﴿۳۱﴾

"آپ پوچھیے کون رزق دیتا ہے تمہیں آسمان اور زمین سے [1] یا کون مالک ہے کان اور آنکھوں کا [2] اور کون نکالتا ہے زندہ کو مردہ سے اور (کون) نکالتا ہے مردہ کو زندہ سے [3] اور کون ہے جو انتظام فرماتا ہے ہر کام کا [4] تو وہ (جواباً) کہیں گے اللہ [5] پس آپ کہیے (جب حقیقت یہ ہے) تو تم (شرک سے) کیوں نہیں بچتے [6]"

[1] آپ ان مشرکوں ہی سے پوچھئے کہ آسمان سے بارش برسا کر کون تمہیں رزق دیتا ہے۔ اور زمین سے رنگ برنگے خوش ذائقہ اناج اور پھل اگا کر تمہیں کون رزق دیتا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں من اسم موصول من کا بیان ہے اور مضاف حذف ہے۔ اصل میں من اهل السماء والارض ہے۔

[2] کون مالک ہے کان اور آنکھوں کا؟ یقیناً اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی ایسا نہیں ہے۔ صرف اللہ تعالیٰ ہی تمہیں سناتا اور دکھاتا ہے جو سننا اور دیکھنا چاہتا ہے اور یہی اس کی عادت جاریہ ہے یا یہ مطلب ہے کہ کس نے تمہیں کان اور آنکھیں عطا فرمائی ہیں اور ان کی تخلیق اور برابری کی طاقت کون رکھتا ہے۔ یا یہ معنی کہ کون ان کو آفات سے بچاتا ہے حالانکہ اتنا طویل زمانہ گزر جاتا ہے اور یہ تھوڑی سی چیز سے بھی متاثر ہو جاتے ہیں۔ لیکن وہ رحمٰن و رحیم تمہارے کانوں اور آنکھوں کے نازک آبگینوں کی خود حفاظت فرماتا ہے۔

[3] کس کو یہ قدرت ہے کہ انڈے اور نطفے جیسی بے روح چیز سے زندہ حیوان پیدا فرما دے اور کون ہے جو زندہ سے مردہ کو نکالتا ہے۔

[4] یہ سب کرشمہ سازیاں کس کی ہیں اور کون ہے جو تمام امور کے انجام و نتائج سے مکمل آگاہ ہے۔

۵ یہ خود اعتراف کریں گے کہ اللہ۔ اسم جلالت اللہ مبتدا محذوف ہو کی خبر ہے، جنہیں تم خدا سمجھتے ہو جنہیں معبود کہتے ہو ان کی طرف ان امور بالا میں سے کسی کو بھی منسوب نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ بے جان مورتیاں کسی چیز پر بھی قادر نہیں ہیں۔

۶ آپ فرمایئے جب حقیقت یہ ہے تو تم شرک سے اجتناب کر کے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے اپنے آپ کو کیوں نہیں بچاتے۔

فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۚ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ۚ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ﴿۳۲﴾

"یہ ہے اللہ جو تمہارا حقیقی پروردگار ہے۔ ۱ پس حق کے بعد کیا ہے بجز گمراہی کے۔ ۲ پھر تمہیں حق سے کدھر موڑا جا رہا ہے۔ ۳"

۱ یہ تمام امور کون سرانجام دیتا ہے؟ اللہ جو عبادت کا مستحق ہے جس کی ربوبیت وجدان و برہان کے ساتھ ثابت ہے کیونکہ اس نے تمہیں پیدا فرمایا، رزق عطا کیا اور تمام امور کی تدبیر فرمائی۔ الحق جس کا وجود ثابت ہے جس میں کسی قسم کا شبہ نہیں ہے اور نہ اس کی الوہیت میں کسی قسم کا شک ہے۔

۲ یہ استفہام انکاری ہے، یعنی حق کے سوا کچھ نہیں ہے مگر گمراہی جو حق یعنی اللہ تعالیٰ کی عبادت سے انحراف کرتا ہے اور گمراہی میں ہی گرتا ہے۔

۳ اتنے واضح اور بین دلالت کے باوجود حق کو چھوڑ کر گمراہی کی طرف کیوں تمہیں پھیرا جا رہا ہے۔

كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ فَسَقُوْٓا اَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۳﴾

"یونہی ثابت ہو چکی ہے آپ کے رب کی بات ان پر جو فسق و فجور کرتے ہیں کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ ۱"

۱ جیسا کہ اللہ کی ربوبیت، حق کے بعد گمراہی، یا ایمان سے انحراف ثابت ہو چکا ہے اسی طرح تمہارے رب کا یہ حکم بھی ثابت ہو چکا ہے کہ میں جہنم کو جنوں اور انسانوں سے بھر دوں گا۔ ابوجعفر نافع اور ابن عامر نے كَلِمٰتُ رَبِّكَ یعنی جمع پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے مفرد پڑھا ہے۔ عَلَى الَّذِيْنَ فَسَقُوْٓا جو لوگ اصلاح کی حد سے آگے نکل گئے اور کفر میں انتہائی سرکش ہو گئے۔ اَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ یہ کلمۃ سے بدل ہے یا اس کی حقیقت کی علت ہے۔ کلمۃ سے مراد عذاب ہے۔

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ۭ قُلِ اللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ﴿۳۴﴾

"(اے حبیب) آپ پوچھیے کیا تمہارے معبودوں میں کوئی ہے جو آغاز آفرینش بھی کرے پھر (فنا کے بعد) اسے لوٹا بھی دے۔ ۱ آپ ہی فرمایئے اللہ ہی آفرینش کی ابتداء بھی کرتا ہے اور (فنا کے بعد) اسے لوٹاتا بھی ہے ۲ پس (ہوش کرو) تم کدھر پھرتے جاتے ہو۔ ۳"

۱ ان مشرکوں سے پوچھیے کہ تمہارے ان معبودوں میں کوئی ایسا ہے جو اس کائنات کی تخلیق اور فناء کے بعد اس کے اعادہ کی قدرت رکھتا ہو۔ تو اللہ تعالیٰ نے الزام دینے میں اعادہ کو ابتداء کی طرح بنایا ہے کیونکہ اعادہ کی برہان ظاہر ہے۔ یعنی جو ابتداء پر قادر ہے اس کے لیے اعادہ میں کونسا امر مانع اور محال ہے۔ چونکہ وہ قیامت کے منکر تھے اس لیے اللہ تعالیٰ نے رسول مکرم ﷺ کو حکم فرمایا کہ تم ان کے قائم ہو کر خود جواب دو۔

۳؎ وہی تخلیق کی ابتداء کرتا ہے اور پھر عدم کے بعد اعادہ بھی وہی فرمائے گا، بالکل دوبارہ اسی شکل میں پیدا فرمائے گا جیسے وہ پہلے تھا۔
۴؎ اتنے بڑے اور زوردار دلائل کے بعد تم کیوں اس کی عبادت چھوڑ کر غیر کے سامنے سربجود ہوتے ہو۔

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآىِٕكُمْ مَّنْ یَّهْدِیْۤ اِلَى الْحَقِّ ؕ قُلِ اللّٰهُ یَهْدِیْ لِلْحَقِّ ؕ اَفَمَنْ یَّهْدِیْۤ اِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ یُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا یَهِدِّیْۤ اِلَّاۤ اَنْ یُّهْدٰى ۚ فَمَا لَكُمْ ٙ كَیْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴿۳۵﴾

"آپ پوچھئے تمہارے معبودوں میں سے کوئی حق کی طرف رہنمائی کر سکتا ہے ۱؎ (خود ہی جواباً) فرمائیے اللہ ہی حق کی طرف راہنمائی فرماتا ہے ۲؎ تو کیا جو راہ دکھائے حق کی وہ زیادہ مستحق ہے کہ اس کی پیروی کی جائے یا وہ جو خود ہی راہ نہ پائے ۳؎ مگر یہ کہ اس کی راہنمائی کی جائے ۴؎ (اے مشرکین) تمہیں کیا ہو گیا تم کیسے غلط فیصلے کرتے ہو ۵؎"

۱؎ آپ ان نادانوں سے پوچھئے روشن دلائل اور جلیل القدر انبیاء و رسل کو مبعوث فرما کر حق کی طرف کون راہنمائی کرتا ہے' صحیح غور و فکر کی توفیق کون مرحمت فرماتا ہے' حق و ہدایت کی تخلیق کس کی ہے۔ ہدایہ کا لفظ انتہاء کا معنی اپنے ضمن میں رکھنے کی وجہ سے الی کے ساتھ متعدی ہوتا ہے۔ اسی طرح لام کے ساتھ بھی متعدی ہوتا ہے تا کہ اس بات پر دلالت کرے کہ ہدایت سے مقصود منتہٰی ہے۔
۲؎ فرمایا اے حبیب آپ خود ہی فرمائیے کہ اللہ ہی حق کی طرف راہنمائی فرماتا ہے اور کوئی اس راہنمائی پر قادر نہیں ہے۔
۳؎ اللہ تعالیٰ جو حق کی طرف راہنمائی فرماتا ہے زیادہ حقدار ہے کہ اس کے احکام کی پیروی کی جائے یا اس کی پیروی کی جائے جو خود ہی راہ نہیں پاتا ہے۔

یهدی کو ابن کثیر' ورش اور ابن عامر نے یاء اور ھاء کے فتحہ اور دال کی تشدید کیساتھ پڑھا ہے۔ قالون اور ابو عمرو نے بھی اسی طرح پڑھا ہے مگر وہ ہاء کی حرکت کو اخفاء کرتے ہیں اور قالون ہاء کے ساکن کرنے کی نص وارد ہے۔ الیزیدی نے ابو عمرو سے اس طرح روایت کیا ہے کہ گویا وہ ہاء کو فتحہ کی صرف بو دیتے ہیں۔ ابو بکر یاء اور ھاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ حفص اور یعقوب یاء کے فتحہ اور ہاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ ان تمام قراءتوں میں اس کی اصل یهتدی ہے تاء کو پہلے دال میں ادغام کیا گیا پھر تاء کی حرکت کے ساتھ ھاء کو فتحہ دیا گیا۔ یاء سے التقاء ساکنین کی وجہ سے کسرہ دیا گیا اور ابو بکر کی قراءت پر یاء کو ہاء کی اتباع میں کسرہ دیا گیا ہے۔ ابو عمرو التقاء ساکنین کی پرواہ نہیں کرتے کیونکہ مدغم متحرک کے حکم میں ہوتا ہے۔ حمزہ اور کسائی نے یاء کے فتحہ اور ہاء کے سکون اور دال کی تخفیف کے ساتھ فعل مجرد سے پڑھا ہے۔ عربوں کا قول ہے هدی بنفسه جب کوئی خود ہدایت یافتہ ہو جائے، یا یہ معنی ہے کہ وہ غیر کی راہنمائی نہیں کرتا۔ آیت کا معنی یہ ہوگا کہ جو غیر کو ہدایت نہیں دیتا یا جو خود ہی ہدایت یافتہ نہیں ہے۔ چہ جائیکہ وہ دوسروں کو ہدایت دے کیا وہ زیادہ مستحق ہے کہ اس کی پیروی کی جائے اسے چھوڑ کر جو دوسروں کو بھی ہدایت عطا فرماتا ہے۔
۴؎ یہ مستثنیٰ مفرغ ہے ظرفیت کی بناء پر منصوب ہے، یعنی وہ کسی وقت بھی ہدایت حاصل نہیں کر پاتا مگر جس وقت اللہ تعالیٰ اس پر ہدایت کا انعام فرمائے۔ یعنی جب اللہ تعالیٰ اسے ہدایت عطا فرماتا ہے تو وہ خود بھی ہدایت پاتا ہے اور دوسروں کی بھی حق کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ یہاں کے معزز ترین خداؤں کا حال ہے جیسے فرشتے' حضرت مسیح اور حضرت عزیر علیہم السلام۔
بعض علماء فرماتے ہیں ہدایت کا معنی ایک جگہ سے دوسری جگہ کی طرف منتقل ہونا ہے۔ اس صورت میں ان کے بت بھی شامل ہو

جائیں گے، یعنی تمہارے بت منتقل نہیں ہو سکتے جب تک کہ کوئی دوسرے انہیں اٹھا کر دوسری جگہ نہ لے جائے۔ یہاں ان کے بتوں کے عجز کو بیان کرنا مقصود ہے۔

۵ اے کافرو! تمہیں کیا ہو گیا ہے کیسے تم فیصلے کرتے ہو جن کا غلط ہونا بدیہی امر ہے۔

وَمَا يَتَّبِعُ أَكْثَرُهُمْ إِلَّا ظَنًّا ۚ إِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِمَا يَفْعَلُونَ ﴿٣٦﴾

”نہیں پیروی کرتے ان میں سے اکثر مگر محض وہم و گمان کی [1] بلاشبہ وہم و گمان بے نیاز نہیں کر سکتا حق سے ذرہ بھر [2]
بیشک اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو وہ کرتے ہیں [3]“

[1] یعنی ان میں سے اکثر جو عقائد رکھتے ہیں ان کی بنیاد کسی عقلی یا نقلی دلیل پر نہیں ہے بلکہ خیالات باطلہ اور قیاسات فاسدہ پر ہے مثلاً وہ غائب کو شاہد پر اور خالق کو مخلوق پر قیاس کرتے تھے کیونکہ ان میں کوئی موہوم سی مشارکت پائی جاتی ہے۔ یہاں اکثر سے مراد یا تو تمام لوگ ہیں یا جو غور و فکر کی صلاحیت نہ رکھتے تھے اور صرف تقلید پر بھروسہ کرتے تھے۔

[2] بیشک ظن مفید نہیں ہے علم اور اعتقاد حق کی طرف سے۔ معنی یہ ہو گا کہ کچھ بھی ظن فائدہ نہیں دیتا، یا یہ معنی ہو گا کہ ظن حق کا کچھ فائدہ نہیں پہنچاتا۔ اس آیت کریمہ میں دلیل ہے کہ اعتقادات میں ظن اور تقلید پر اکتفاء کرنا جائز نہیں ہے بلکہ دلیل نقلی اور عقلی سے علم حاصل کرنا ضروری ہے۔

[3] اس آیت کریمہ میں دلائل عقلیہ اور نقلیہ سے اعراض پر وعید ہے کیونکہ انہوں نے ظن اور تقلید کی اتباع کی تھی اور دلائل عقلیہ و نقلیہ کو چھوڑ دیا تھا۔

وَمَا كَانَ هَٰذَا الْقُرْآنُ أَن يُفْتَرَىٰ مِن دُونِ اللَّهِ وَلَٰكِن تَصْدِيقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ الْكِتَابِ لَا رَيْبَ فِيهِ مِن رَّبِّ الْعَالَمِينَ ﴿٣٧﴾

”نہیں ہے یہ قرآن کہ گھڑ لیا گیا ہو اللہ تعالیٰ (کی وحی آئے) بغیر بلکہ یہ تو تصدیق کرنے والا ہے اس وحی کو [1] جو اس سے پہلے نازل ہو چکی ہے [2] اور الکتاب کی تفصیل ہے [3] ذرا شک نہیں اس میں [4] کہ یہ رب العالمین کی طرف سے (اتری) ہے [5]“

[1] یہ قرآن مجزم گھڑا ہوا نہیں ہے أَن يُفْتَرَىٰ مصدر مؤول بمعنی مفعول كَانَ کی خبر ہے۔ تصدیق کی نصب کان مقدر کی خبر ہونے کی وجہ سے ہے یا فعل محذوف کی علت ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہوگی وَلٰكِنْ اَنْزَلَهُ اللّٰهُ لِتَصْدِيْقِ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ اللہ تعالیٰ نے اسے اتارا ہے تاکہ سابقہ کتب کی تصدیق کرے۔

[2] یعنی یہ کتاب محمد ﷺ کی تصدیق کرے یا الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ سے مراد سابقہ کتب ہیں، یا قیامت ہے، یا وہ دوبارہ اٹھنا ہے جس کی خبر سابقہ کتب نے دی ہے، جبکہ یہ کتاب سابقہ کتب کی تصدیق کرتی ہے تو ثابت ہوا کہ یہ جھوٹ اور من گھڑت نہیں بلکہ کلام الٰہی ہے۔

[3] لوح محفوظ پر جو کچھ حلال، حرام، فرائض اور احکام درج ہیں ان کو یہ کتاب بیان کرتی ہے۔

[4] [illegible] نہایت اثر انگیز ہے۔ اس لیے اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہ

کَانَ کی تیسری خبر ہے اور استدراک کے حکم کے بحث داخل ہے یا یہ نئی کلام ہے۔

[5] یہ دوسری خبر ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہے کَائِنًا مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ یا یہ تصدیق یا تفصیل کے متعلق ہے اور لَارَیْبَ فِیْہِ جملہ معترضہ ہے یا یہ اس فعل کے متعلق ہے جو ان دونوں کی علت بیان کرے یا یہ الکتاب سے حال ہے یا فیہ کی ضمیر سے حال ہے۔

اس آیت کریمہ میں تنبیہ ہے کہ ظن کی اتباع سے رک کر قرآن کی اتباع کرنا واجب ہے۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَ ادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۸﴾

”کیا کافر کہتے ہیں کہ اس نے خود گھڑ لیا ہے اسے آپ فرمایئے پھر تم بھی لے آؤ ایک سورۃ اس جیسی [1] اور (امداد کے لیے) بلا لو جن کو تم بلا سکتے ہو اللہ تعالیٰ کے علاوہ [2] اگر تم (اپنے الزام میں) سچے ہو [3]“

[1] ام منقطعہ ہے جو بل کے معنی میں ہوتا ہے اور اس میں ہمزہ انکار کے لیے ہے، یعنی کیا کافر کہتے ہیں محمد ﷺ نے اس قرآن کو خود گھڑا ہے اے محمد ﷺ ان کی اس یاوہ گوئی کا رد کرتے ہوئے فرمائیں ایک سورت لے آؤ، فاء شرط مقدر کی جزاء کے لیے ہے یعنی ان افتریتہ فاتوا انتم ایضاً سورۃ اگر میں نے خود قرآن گھڑا ہے تو تم بھی ایک سورت پیش کر دو۔ جو فصاحت و بلاغت، حسن نظم اور قوت معنی قرآن کے مشابہ ہو کیونکہ تم بھی تو میری طرح عربی بھی ہو اور فصیح بھی ہو بلکہ نظم و عبارت میں تمہاری مشق مجھ سے کہیں زیادہ ہے۔

[2] اور بلا لو ان کو بھی جو اس کام میں تمہاری معاونت کر سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے علاوہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دوسرا اس معجز کلام کی مثل لانے پر قادر نہیں ہے۔

[3] اگر تم محمد ﷺ پر قرآن کے گھڑنے کا الزام لگانے میں سچے ہو۔ یہ شرط ہے مگر ماقبل کلام کی وجہ سے اسے جزاء کی ضرورت نہیں ہے، یعنی اگر تم سچے ہو تو اس کی مثل پیش کرو۔ مگر وہ ایسا نہ کر سکے۔ اس آیت کریمہ میں جب انہیں قرآن کا مقابل پیش کرنے کا چیلنج کیا گیا تو اب انہیں قرآن کے نظم اور اس کے معانی میں غور و فکر کی دعوت دی جا رہی ہے فرمایا۔

بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَ لَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۹﴾

”بلکہ انہوں نے جھٹلایا اس چیز کو جسے وہ پوری طرح نہ جان سکے [1] اور نہیں آیا ان کے پاس اس کا انجام [2] اسی طرح (بے علمی سے) جھٹلایا انہوں نے جو ان سے پہلے تھے [3] پھر دیکھ لو کیسا انجام ہوا ظالموں کا [4]“

[1] قرآن کریم کا انکار ان کی تحقیق و تفکر کا نتیجہ نہیں بلکہ انہوں نے تو سنتے ہی اس کا انکار کر دیا۔ ابھی انہوں نے اس کے معانی کے بحر ذخار میں غواصی کی ہی نہیں تھی۔ اس میں غور و فکر کی زحمت بھی نہیں اٹھائی تھی پہلے ہی انکار کر دیا۔ انہوں نے اس کی عظمت شان کا احاطہ ہی نہیں کیا اور انہیں یہ معلوم ہی نہیں کہ اس کی مثال پیش کرنا کسی بشر کے لیے ممکن ہی نہیں ہے۔

[2] یعنی وہ قرآن کے وعدوں، وعیدوں اور مبداء و معاد کی خبروں کا علم حاصل کرنے کے بعد ان کی حقیقت کو نہ سمجھ سکے حالانکہ ان کے لیے سابقہ کتب کے علماء سے ان چیزوں کا علم حاصل کرنا ممکن تھا۔ اگر وہ علماء سے رجوع کرتے تو اس قرآن کی حقیقت و صداقت ان پر بالکل عیاں ہو جاتی۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن اپنے نظم و معنی کے اعتبار سے معجزہ ہے۔ جو اس کے علوم و معارف میں تھوڑا سا بھی

غور وفکر کرے اس کے لیے اس کی صداقت وسچائی واضح ہے۔ لیکن انہوں نے قرآن کے جلوؤں کو ایک نظر دیکھا ہی نہیں اس کے معارف پر شناسائی کی کوشش ہی نہیں کی بلکہ اس کے معانی ومطلب میں غور وخوض سے پہلے ہی اس کی تکذیب کر دی۔ لما میں توقع کا معنی پایا جاتا ہے کیونکہ قرآن کا اعجاز ان کے لیے ظاہر ہو چکا تھا کیونکہ انہیں بار بار چیلنج کیا گیا ہے اور انہوں نے اپنی ساری قوتوں کو اس کے مقابلہ کے لیے آزمایا مگر سب بے سود نکلیں اور انہوں نے یہ بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ جو قرآن نے مستقبل کی پیشگوئیاں کی ہیں وہ سو فیصد درست ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا فان لم تفعلو والن تفعلو اگر تم ایسا نہ کر سکو اور تم ہرگز ایسا نہ کر سکو گے۔ اسی طرح قرآن کی یہ پیشین گوئی بھی من وعن دیکھی غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۝ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ۝ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ (ہرا دیے گئے رومی پاس کی زمین میں اور وہ ہارنے کے بعد ضرور غالب آئیں گے۔ چند برس کے اندر اسی طرح ابولہب اور اس کی بیوی کی ہلاکت کا مشاہدہ بھی انہوں نے کیا۔ قرآن نے پہلے فرما دیا تھا تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ (ٹوٹ جائیں ابولہب کے دونوں ہاتھ اور وہ تباہ و برباد ہو گیا) پس ان تمام سچائیوں اور حقیقتوں کا مشاہدہ کرنے کے بعد کچھ تو ایمان لائے اور کچھ اپنی سرکشی اور عناد کی وجہ سے ایمان نہ لائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ وہ انہیں پہچانتے ہیں جیسے وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں اور فرمایا وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ اور انہوں نے انکار کر دیا ان کا حالانکہ یقین کر لیا تھا ان کی صداقت کا ان کے دلوں نے۔

۲؎ قرآن کو ان مشرکوں نے جھٹلایا جیسا کہ ان سے پیشروؤں نے جھٹلایا تھا۔ یعنی گزشتہ امتوں نے بھی انبیاء اور ان کی کتب کو جھٹلایا تھا انہوں نے بھی ایسا ہی کیا۔

۳؎ اس آیت کریمہ میں وعید ہے کہ اگر وہ ایمان نہیں لائیں گے تو انکا حشر بھی وہی ہوگا جو ان سے پہلے ظالموں کا ہوا تھا۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهٖ ۭ وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِالْمُفْسِدِيْنَ ۝۴۰

"اور ان میں سے کچھ ایمان لائیں گے اس پر ۱؎ اور ان میں سے کچھ ایمان نہیں لائیں گے اس پر ۲؎ اور آپ کا رب جانتا ہے مفسدوں کو ۳؎"

۱؎ اب جو اتنی شد ومد سے قرآن کو جھٹلا رہے ہیں ان میں سے کچھ اس کی دل میں تصدیق کرتے ہیں اور قرآن میں غور وفکر کے بعد اس کی صداقت کا یقین رکھتے ہیں یا یہ معنی ہے کہ ان میں سے کچھ مستقبل میں قرآن کی حقیقت ظاہر ہونے کے بعد ایمان لائیں گے۔ اور اپنے اس کفر سے توبہ کریں گے۔ اس معنی کی تائید لما کا کلمہ کرتا ہے کیونکہ اس میں توقع کا معنی پایا جاتا ہے۔

۲؎ اور ان میں سے کچھ اپنی نادانی اور عباد ت کی وجہ سے اور قدرت کے اس فیصلہ کی وجہ سے کہ ان کی موت کفر پر آئے گی وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

۳؎ اور اللہ تعالیٰ معاندین اور مصرین کو خوب جانتا ہے۔

وَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ ۚ اَنْتُمْ بَرِيْۗـــُٔوْنَ مِمَّآ اَعْمَلُ وَاَنَا بَرِيْۗءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝۴۱

"اور اگر وہ آپ کو جھٹلائیں تو فرما دیجئے۔ میرے لیے میرا عمل ہے اور تمہارے لیے تمہارا عمل تم بری الذمہ ہو اس سے جو میں کرتا ہوں اور میں بری الذمہ ہوں اس سے جو تم کرتے ہو۔ ۱؎"

لے اے پیارے حبیب اگر حجت کے قیام کے بعد بھی اگر یہ تیری تکذیب کرتے ہیں تو ان سے برات کا اظہار کیجئے اور انہیں فرمایئے میرے اعمال کی جزاء ہے اور تمہارے اعمال کی اپنی سزا ہے تم میرے اعمال کے جوابدہ نہیں ہو اور تم سے میرے اعمال کا مؤاخذہ نہیں کیا جائے گا اور میرا عمل تمہیں کچھ نقصان نہیں پہنچائے گا۔ اس لیے تم مجھے اذیت دینے سے باز آ جاؤ اور جو میں کرتا ہوں اس کی وجہ سے مجھ پر طعن نہ کیا کرو۔ اور جو تم کرتے ہو ان کا مؤاخذہ مجھ سے نہ ہوگا، میں تو تمہیں وہ بات کہتا ہوں جو تمہارے بھلے کی ہوتی ہے، میں یہ سب کچھ تمہارے ساتھ اخلاص کی وجہ سے کرتا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری مثال اور جس کے ساتھ مجھے بھیجا گیا ہے۔ اس کی مثال اس شخص کی مانند ہے جو ایک قوم کے پاس آیا اور کہا اے لوگو! میں نے ایک لشکر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور میں کھلا ڈرانے والا ہوں۔ اپنے آپ کو بچالو بچالو پس ان میں سے کچھ لوگوں نے اس کی بات مان لی اور رات کے اندھیرے کو غنیمت سمجھ کر چل پڑے اور وہ نجات پا گئے کچھ لوگوں نے اس شخص کی تکذیب کی اور اپنی جگہ پر ہی ٹھہرے رہے، صبح سویرے لشکر نے ان پر چڑھائی کر دی اور انہیں ہلاک کر دیا اور انہیں نیست و نابود کر دیا۔ بالکل یہی مثال ہے کہ جس نے میری اتباع کی اور جو کچھ میں لے کر آیا اس کی اتباع کی (وہ کامیاب ہو گیا اور نجات پا گیا) اور یہی مثال ہے کہ جس نے میری نافرمانی کی اور جو میں حق لے کر آیا اس کی تکذیب کی(1) (وہ ہلاک ہو گیا)۔ یہ حدیث بخاری و مسلم میں ہے الکلبی اور مقاتل فرماتے ہیں یہ آیت جہاد والی آیت سے منسوخ ہے(2) جیسا کہ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ کی آیت منسوخ ہے۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ ؕ اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوْا لَا يَعْقِلُوْنَ ۝۴۲

”اور ان میں سے کچھ (بظاہر) کان لگاتے ہیں آپ کی طرف لے تو کیا آپ سناتے ہیں بہروں کو خواہ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوں۔ لے“

لے اے حبیب لبیب ﷺ جب آپ تلاوت کرتے ہیں یا وعظ و نصیحت فرماتے ہیں تو یہ ظاہراً بڑے انہماک سے سنتے ہیں مگر دلوں سے نہیں سنتے۔ اپنی صلاحیتوں کو ناکارہ کرنے کی وجہ سے قرآن کے حقائق و لطائف کو نہیں سمجھتے جیسا کہ ایک بہرہ شخص سننے کا ارادہ کرتا ہے مگر کان میں قوت سماعت نہ ہونے کی وجہ سے سن نہیں سکتا۔

لے کیا آپ کسی بہرے کو اپنی بات سنا سکتے ہیں، جبکہ ان کے بہرے ہونے کے ساتھ ساتھ یہ عقل سے محروم بھی ہیں کیونکہ بعض اوقات ایک بہرہ شخص اشارات و قرائن سے بات سمجھ جاتا ہے لیکن جس طرح آپ ایسے بہرے کو اپنی بات سنانے پر قادر نہیں جس کی عقل بھی نہ ہو۔ اس طرح آپ اس کو بھی اپنی بات نہیں سنا سکتے جس کے دل سے تفکر و تدبر کے سننے کی صلاحیت سلب کر لی گئی ہو۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْظُرُ اِلَيْكَ ؕ اَفَاَنْتَ تَهْدِي الْعُمْيَ وَلَوْ كَانُوْا لَا يُبْصِرُوْنَ ۝۴۳

”ان میں کچھ بظاہر دیکھتے ہیں آپ کی طرف لے تو کیا دکھاتے ہیں اندھوں کو خواہ وہ کچھ نہ دیکھتے ہوں لے“

لے ان میں سے کچھ آپ کی طرف ٹکٹکی لگا کر دیکھتے ہیں، حق کے واضح دلائل اور علامات نبوت کا لحہ بہ لحہ مشاہدہ کرتے ہیں لیکن قلبی بصیرت سے محروم ہونے کی وجہ سے آپ ﷺ کی تصدیق نہیں کرتے۔ جبکہ حق کا جلوہ فقط دل بینا کو نظر آتا ہے وہاں تک رسائی ظاہری آنکھوں کے بس کی بات نہیں۔

1۔ مشکوۃ المصابیح، جلد 1، صفحہ 89-90، حدیث: 148 (الفکر)　　2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 159 (الفکر)

۲؎ اگر دل کی آنکھیں اندھی ہوں اور اس کے ساتھ ظاہری بصارت بھی نہ ہو تو پھر بدرجہ اولی ہدایت مشکل ہوتی ہے۔ اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ اپنے محبوب کریم ﷺ کو تسلی دے رہے ہیں کہ آپ اس شخص کو پیغام حق نہیں سنا سکتے جس کی قوت سماعت ہم نے خود سلب کر لی ہے اور آپ اسے راہ ہدایت نہیں دکھا سکتے جس کی آنکھیں ہم نے خود نور سے محروم کر دی ہیں اور آپ اسے ایمان کے زیور سے آراستہ نہیں کر سکتے جس کا فیصلہ ہم نے کر دیا ہے کہ یہ ایمان نہیں لائے گا۔ دوسرا اس آیت میں برات اور مشرکین سے اعراض کی علت پائی جاتی ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا یَظْلِمُ النَّاسَ شَیْـًٔا وَّ لٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ یَظْلِمُوْنَ ۝۴۴

''یقیناً اللہ تعالیٰ ظلم نہیں کرتا لوگوں پر ذرہ برابر لیکن لوگ ہی اپنے نفسوں پر ظلم کرتے ہیں ۱؎''

۱؎ مشرک سوء استعداد اور فاسد اختیار کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی ہدایت کو قبول نہیں کرتے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے جو علم اور ہدایت مجھے عطا فرما کر بھیجا ہے اس کی مثال موسلا دھار بارش کی ہے وہ پاک زمین اور اچھی زمین پر برستی ہے تو وہ پانی کو قبول کرتی ہے، یعنی اپنے اندر جذب کرتی ہے اور سرسبز و شاداب گھاس اگاتی ہے کچھ ایسی زمین ہوتی ہے جو سخت ہونے کی وجہ سے پانی کو روک لیتی ہے اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے لوگوں کو نفع پہنچاتا ہے لوگ اس جمع شدہ پانی سے خود بھی پیتے ہیں جانوروں کو بھی پلاتے ہیں اور اپنی زمینوں کو بھی سیراب کرتے ہیں۔ ایک دوسرا زمین کا ٹکڑا ہوتا ہے جو چٹیل میدان ہوتا ہے، جس میں نہ پانی ٹھہرتا ہے اور نہ اس پر گھاس وغیرہ اگتی ہے۔ یہ اس طرح ہے کہ جس نے دین میں تفقہ حاصل کیا اور اسے اس چیز نے نفع دیا جو اللہ تعالیٰ نے مجھے عطا فرمائی تھی۔ پس اس نے اس کو خود بھی سیکھا اور دوسروں کو بھی سکھایا اور یہ اس کی مثال ہے جس نے قرآن اور اسلام کی طرف توجہ ہی نہ کی اور وہ ہدایت جو میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے لے کر آیا تھا اسے قبول نہ کیا(1)۔ یہ حدیث امام بخاری و مسلم نے حضرت ابو موسیٰ سے روایت کی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حواس و عقول جو استدلال کے آلات ہیں ان کو سلب فرما کر لوگوں پر ظلم نہیں فرماتا مگر لوگ خود اپنی نعمتوں کو فاسد کر کے اور ان کے منافع کو تباہ کر کے اور غور و خوض کو ترک کر کے اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں۔ پس آیت کریمہ دلیل ہے کہ بندے کا اپنا کسب بھی ہوتا ہے۔ بالکلیہ اس کا اختیار سلب نہیں کیا گیا جیسا کہ جبریہ فرقہ کا خیال ہے یہ ہو سکتا ہے کہ یہ ان کے لیے وعید ہے اس معنی سے کہ قیامت کے روز جو انہیں عذاب ملے گا وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عدل ہو گا یہ عذاب دے کر اللہ تعالیٰ ان پر ظلم نہیں کرے گا بلکہ عذاب کے اسباب کا ارتکاب کر کے انہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے۔ حمزہ اور الکسائی نے لکن کو تخفیف کے ساتھ اور الناس کو رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔ باقی قراء نے لکن کو تشدید کے ساتھ اور الناس کو منصوب پڑھا ہے۔

وَ یَوْمَ یَحْشُرُهُمْ كَاَنْ لَّمْ یَلْبَثُوْۤا اِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ یَتَعَارَفُوْنَ بَیْنَهُمْ ؕ قَدْ خَسِرَ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ وَ مَا كَانُوْا مُهْتَدِیْنَ ۝۴۵

''اور جس روز اللہ تعالیٰ جمع کریگا ۱؎ انہیں (وہ خیال کرینگے) گویا وہ (دنیا میں) نہیں ٹھہرے مگر ایک گھڑی دن کی ۲؎ پہچانیں گے ایک دوسرے کو ۳؎ (تب حقیقت کھلے گی کہ) گھاٹے میں رہے وہ لوگ جنہوں نے جھٹلایا اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو ۴؎ اور وہ ہدایت یافتہ نہیں تھے ۵؎''

1۔ مشکوٰۃ المصابیح، جلد 1، صفحہ 90، حدیث: 150 (الفکر)

1 حفص نے یاء غائب کے ساتھ یحشر پڑھا ہے اور ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہے اور باقی قراء نے تعظیم کیلئے نون متکلم کے ساتھ پڑھا ہے۔

2 حضرت ابن عباس فرماتے ہیں گویا وہ اپنی قبور میں نہیں ٹھہرے۔ الضحاک فرماتے ہیں وہ دنیا میں نہیں ٹھہرے (1)۔ وہ جب قیامت کی ہولناکیوں کو دیکھیں گے تو اپنی قبور یا دنیا میں ٹھہرنے کی مدت کو بہت کم تصور کریں گے۔ جملہ تشبیہ ھم ضمیر منصوب سے حال ہے ای یَحْشُرُھُمْ مُشْبِھِیْنَ بِمَنْ لَمْ یَلْبَثْ اِلَّا سَاعَۃً یعنی اللہ تعالیٰ اس شخص کی مانند انہیں اٹھائے جو صرف ایک ساعت ٹھہرا ہو یا یہ یوم کی صفت ہے اور ضمیر عائد محذوف ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہوگی کَاَنْ لَّمْ یَلْبَثُوْا قَبْلَہٗ یا یہ مصدر محذوف حشرًا کی صفت ہے یعنی حَشْرًا کَاَنْ لَّمْ یَلْبَثُوْا قَبْلَہٗ۔

3 وہ قیامت کے دن ایک دوسرے کو پہچانیں گے جیسے وہ دنیا میں پہچانتے تھے، گویا وہ جدا نہ ہوئے مگر بہت تھوڑا عرصہ۔ یہ جملہ دوسرا حال مقدرہ ہے یا کَاَنْ لَّمْ یَلْبَثُوْا کے قول کا بیان ہے یا ظرف کے متعلق ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی یَتَعَارَفُوْنَ بَیْنَھُمْ یَوْمَ یَحْشُرُھُمْ (جس دن اللہ تعالیٰ انہیں جمع کرے گا تو وہ ایک دوسرے کو پہچانیں گے) امام بغوی فرماتے ہیں یہ پہچان اس وقت ہوگی جب وہ اپنی قبور سے اٹھیں گے پھر جب قیامت کی ہولناکیوں کو دیکھیں گے تو یہ پہچان ختم ہو جائے۔ بعض آثار میں ہے کہ انسان اپنے پہلو میں کھڑے شخص کو پہچانتا ہوگا مگر ہیبت وخشیت کی وجہ سے اس سے کلام نہ کرے گا (2)۔

4 گھاٹے میں ہیں وہ جو دوبارہ زندہ ہونے کے منکر ہیں۔ اس سے پہلے قول محذوف ہے، یعنی وہ ایک دوسرے کو پہچانیں گے اور ساتھ یہ کہہ رہیں ہونگے کہ خسارے میں ہیں وہ جو قیامت کا انکار کرتے تھے۔ یا یہ اللہ تعالیٰ کی گواہی ہے کہ وہ خسارے میں ہیں کیونکہ انہوں نے ایمان کے بدلے کفر اور جنت کے بدلے دوزخ کو اختیار کیا تھا۔

5 انہوں نے معارف اور سعادت کے حصول کے لیے عطا کیے گئے اسباب کو استعمال کر کے ہدایت حاصل نہ کی یہ نئی کلام ہے اور اس میں تعجب کا معنی ہے، گویا یوں کہا گیا ہائے وہ کتنے گھاٹے میں ہیں۔

وَ اِمَّا نُرِیَنَّکَ بَعْضَ الَّذِیْ نَعِدُھُمْ اَوْ نَتَوَفَّیَنَّکَ فَاِلَیْنَا مَرْجِعُھُمْ ثُمَّ اللّٰہُ شَھِیْدٌ عَلٰی مَا یَفْعَلُوْنَ﴿۴۶﴾

"اور خواہ ہم دکھا دیں آپ کو کچھ (عذاب) جس کا ہم نے وعدہ کیا ہے ان سے یا (پہلے ہی) ہم اٹھا لیں آپ کو ہر حالت میں ہماری طرف ہی انہیں لوٹنا ہے 1 پھر اللہ تعالیٰ گواہ ہے اس پر جو وہ کرتے ہیں 2 " -

1 و امّا یہ ان شرطیہ اور ما زائدہ سے مرکب ہے۔ مطلب وَاِنْ کا ہی دیتا ہے یعنی اگر ہم آپ کو دکھائیں کچھ حصہ عذاب کا دنیا میں جیسا کہ بدر کے دن دکھایا تھا۔ یا ہم آپ کو ان کا عذاب دکھانے سے پہلے اٹھا لیں تو ہم ان کا عذاب آپ کو آخرت میں دکھائیں گے۔ یہ نتوفینک کا جواب ہے اور نرینک کا جواب محذوف ہے جو اسی طرح کا ہے۔

2 یہاں ذکر شہادت کا ہے مگر مراد مجازاً نتیجہ اور مقتضی ہے۔ اس لیے رجوع پر اس کو ثم کے ذریعے مرتب فرمایا۔ معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ان کے افعال وکردار کے مطابق سلوک فرمائے گا۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہاں ثم بمعنی واؤ ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں کہ بعض

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 159 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 60-159 (الفکر)

عذاب جو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو دکھایا تھا وہ بدر کے دن مشرکین کا قتل اور مرنے کے بعد عذاب کی تمام اقسام تھیں۔

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولٌ ۖ فَإِذَا جَاءَ رَسُولُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُم بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿٤٧﴾

"اور ہر قوم کے لیے ایک رسول ہے پس جب آیا ان کا رسول (اور انہوں نے جھٹلایا تو)[1] فیصلہ کر دیا گیا ان کے درمیان انصاف کے ساتھ[2] اور ان پر ظلم نہیں کیا جاتا[3]"

[1] ہر امت جو گزر چکی ہے رسول ان کی طرف بھیجا گیا جو انہیں اسلام کی روشن تعلیمات کی دعوت دیتا۔ پھر جب ان کے پاس ان کا رسول واضح معجزات لے کر آیا تو انہوں نے اس کی تکذیب کی۔

[2] ان کے اور ان کے رسول کے درمیان عدل و انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا گیا کہ تکذیب کرنے والے ہلاک کر دیے گئے اور رسول مکرم اور مومنین عدل کے ساتھ نجات پا گئے۔

[3] یعنی ہم نے انہیں عذاب دیکر کوئی ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود اس عذاب کے مستحق بن گئے تھے۔ مجاہد اور مقاتل فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ ہر امت میں ایک رسول بھیجا گیا تھا اور جب قیامت کا دن ہوگا تو ان کا رسول ان کے کفر یا ایمان کی گواہی دینے کے لیے آئے گا۔ پس اس نبی کی گواہی کے ساتھ مومنین کی نجات اور کفار کی تعذیب کا فیصلہ کر دیا جائے گا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَجِاْیۡٓءَ بِالنَّبِیّٖنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ قُضِیَ بَیۡنَهُمۡ اور فرمایا فَكَیۡفَ اِذَا جِئۡنَا مِنۡ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِیۡدٍ وَّ جِئۡنَا بِكَ عَلٰی هٰۤؤُلَآءِ شَهِیۡدًا ﴿٤١﴾ اور حاضر کیے جائیں گے انبیا اور (دوسرے) گواہ اور فیصلہ کر دیا جائے گا ان کے درمیان انصاف سے تو کیا حال ہوگا (ان نافرمانوں کا) جب ہم لے آئیں گے ہر امت سے ایک گواہ اور (اے حبیب) ہم لے آئیں گے آپ کو ان سب پر گواہ۔

وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿٤٨﴾

"اور وہ کہتے ہیں کب پورا ہوگا یہ عذاب کا وعدہ[1] اگر تم سچے ہو[2]"

[1] یعنی کفار مکہ کہتے مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اے محمد ﷺ جس عذاب کی تم ہمیں دھمکیاں دیتے ہو وہ کب آئے گا۔

[2] اگر تم اور تمہارے متبعین سچے ہو اس وعدہ میں یہ شرط ہے اور اس کی جزاء محذوف ہے، یعنی فاتوا بہ یہ انہوں نے بطور تکذیب اور استہزاء کہا تھا۔

قُل لَّا أَمْلِكُ لِنَفْسِي ضَرًّا وَلَا نَفْعًا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ ۗ لِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ ۚ إِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً ۖ وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ ﴿٤٩﴾

"آپ کہیں نہیں مالک ہوں میں اپنے آپ کے لیے ضرر کا اور نہ نفع کا[1] مگر جتنا چاہے اللہ تعالیٰ[2] ہر قوم کے لیے میعاد مقرر ہے جب آئے گی ان کی مقررہ میعاد تو نہ پیچھے رہ سکیں گے ایک لمحہ اور نہ آگے بڑھ سکیں گے۔[3]"

[1] اے محمد ﷺ آپ فرمائیے کہ میں نقصان کو دور کرنے اور نفع پہنچانے کا اپنی ذات کے لیے بھی اختیار نہیں رکھتا (میرا تو ہر کام اپنے رب کریم کی مشیت و مرضی کے تابع ہے، میں تو کلام بھی اس کے اذن کے بغیر نہیں کرتا) تو میں خود تمہارے لیے عذاب کیسے لا سکتا ہوں۔

[2] میرے پاس تو وہی اختیار ہے جو میرے رب نے مجھے عطا فرمایا ہے۔ یا یہ معنی ہے کہ جو اللہ چاہے گا وہ ہو کر رہے گا۔

[3] ہر قوم کے عذاب ... کا وقت مقرر ہے۔ پس وقت مقرر آ جائے گا تو وہ ایک لمحہ بھی پیچھے نہ رہیں گے اور نہ آگے بڑھ سکیں گے۔ یہ

جملہ اِذَاجَآءَ اَجَلُهُمْ پر معطوف ہے، یعنی تم عذاب کو طلب کرنے کی جلدی نہ کرو، یقیناً جب اس کا وقت آ جائے گا وہ وعدہ پورا ہو جائے گا تو پھر کوئی تاخیر نہ ہوگی آنکھ جھپکنے کی دیر میں تمہیں نیست و نابود کر دیا جائے گا۔

قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُهٗ بَیَاتًا اَوْ نَهَارًا مَّاذَا یَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۵۰﴾

"آپ فرمایئے (اے منکرو) ذرا غور تو کرو اگر آ جائے تم پر اس کا عذاب، راتوں رات یا دن دہاڑے (تو تم کیا کر لو گے) ۱؎ کس چیز کا جلدی مطالبہ کر رہے ہیں اس سے مجرم ۲؎"

۱؎ آپ فرمایئے اے کافرو! مجھے تم خود ہی بتاؤ اگر اللہ تعالیٰ کا وہ عذاب آ جائے جس کے لیے تم جلدی کر رہے ہو تمہارے سوتے ہوئے یا دن کو امور معاش میں مشغولیت کے وقت تمہیں اس وقت اپنی اس جلد بازی پر ندامت ہوگی اور اس وقت تمہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گا۔ اس جملہ شرطیہ کا جواب شرط محذوف ہے۔

۲؎ اس جملہ میں ان کی عذاب کے لیے جلد بازی پر اظہار تعجب ہے کیونکہ کسی تکلیف دہ امر کے لیے جلد بازی کرنا کوئی دانشمندی نہیں ہے۔ یہ جملہ اَرَءَیْتُمْ کے متعلق ہے اور درمیان میں کلام معترض ہے۔ ضمیر کی جگہ مجرمون اسم ظاہر ذکر کیا ہے۔ یہ ترکیب اس بات پر دلالت کرنے کے لیے وضع کی گئی ہے کہ ان کے جرم کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرتے نہ کہ عذاب کی طلب میں جلدی کرتے۔ امام بغوی فرماتے ہیں وہ عذاب کے لیے جلدی کرتے تھے اور کہتے اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَیْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ اگر یہ (قرآن) تیری جانب سے حق ہے تو بارش برسا ہم پر پتھروں کی آسمان سے اور لے آ ہم پر دردناک عذاب۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں تم کیوں عذاب کے لیے جلدی مچا رہے ہو(1) عذاب تو نری تکلیف ہی تکلیف ہے۔ میں (مصنف) کہتا ہوں یہ بھی جائز ہے کہ مَّاذَا یَسْتَعْجِلُ شرط کی جزا ہو جیسے ان اتیتک ما ذاتعطینی اگر میں تمہارے پاس آؤں تو تم مجھے کیا دو گے۔ آیت کا مطلب یہ ہے اگر اللہ تعالیٰ کا عذاب آ جائے جس کے لیے تم جلدی کر رہے ہو تو کیا پھر بھی تم اسی عذاب کی جلدی کا مطالبہ کرو گے۔ اس وقت تم اسی عذاب میں اپنی بقا کو پسند کرو گے یا اس سے چھٹکارا کی کوشش کرو گے۔ یعنی اس وقت یقیناً تم عذاب کا مطالبہ نہ کرو گے۔

اَثُمَّ اِذَا مَا وَقَعَ اٰمَنْتُمْ بِهٖ ؕ آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿۵۱﴾

"کیا جب عذاب نازل ہو جائیگا تب ایمان لاؤ گے ۱؎ ان پر (فرشتے انہیں کہیں گے) اب (آنکھیں کھلیں ۲؎) تم تو اس عذاب کے لیے بڑی جلدی مچا رہے تھے ۳؎"

۱؎ کیا جب عذاب الٰہی کی بجلی کوند پڑے گی تب تم ایمان لاؤ گے۔ یہ ظرف اٰمَنْتُمْ بِهٖ کے متعلق ہے اور اٰمَنْتُمْ بِهٖ یہ شرط کی جزاء پر معطوف ہے، خواہ محذوف ہو یا مذکورہ ہو۔ تقدیر عبارت یوں ہوگی اِنْ اَتَاكُمْ عَذَابُهٗ نَدِمْتُمْ ثُمَّ اٰمَنْتُمْ بِهٖ اَیْ بِالْعَذَابِ اَوْ بِمَنْ اَخْبَرَ بِهٖ یعنی جب اللہ تعالیٰ کا عذاب آ جائے گا تم اس وقت کف افسوس ملو گے اور پھر اس عذاب الٰہی پر ایمان لاؤ گے یا جس نے اس عذاب کی خبر دی ہے اس پر اس وقت ایمان لاؤ گے۔ ہمزہ انکار کے لیے ہے کہ تم اس وقت ایمان لاؤ گے جو تمہیں ایمان کا لانا کچھ مفید نہ ہوگا۔ یا تقدیر عبارت یوں ہوگی اِنْ اَتَاكُمْ عَذَابُهٗ اَیَّ شَیْءٍ تَسْتَعْجِلُوْنَ حِیْنَئِذٍ بِالْعَذَابِ یعنی اگر اللہ تعالیٰ کا عذاب آ جائے گا تو تم اس وقت کو بھی عذاب پر یا جس نے عذاب کی خبر دی اس پر ایمان لاؤ گے مگر اس وقت کا ایمان کچھ فائدہ مند نہ ہوگا۔ اور یہ ترکیب

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 161 (الفکر)

بھی ہو سکتی ہے کہ یہ جملہ شرطیہ سابقہ جملہ شرطیہ پر معطوف ہو اور مَاذَا یَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُوْنَ جملہ معترضہ ہو یا یہ جملہ سابقہ جملہ شرطیہ کی جزاء پر معطوف ہو۔ اور یہاں عذاب سے مراد عذاب آخرت ہو اور سابق عذاب سے مراد عذاب دنیا ہو۔ مطلب یہ ہوگا کہ تم خود ہی بتاؤ اگر اللہ تعالیٰ کا عذاب دن یا رات کے وقت دنیا میں آ جائے تو تم شرمندہ ہو گے یا تم کس عذاب کی جلدی مچاؤ گے جب آخرت کا عذاب تم پر واقع ہو جائے گا، کیا تم اس وقت ایمان لاؤ گے جب تمہیں ایمان فائدہ مند نہ ہوگا اور اس وقت تم ایمان کیوں نہیں لائے جب تمہارے لیے ایمان نفع بخش ہے اور ایمان کا نفع تو صرف دنیا میں ایمان قبول کرنے پر منحصر ہے بشرطیکہ سانس غرغرہ تک نہ پہنچ جائے۔ یعنی موت سے پہلے پہلے ایمان کی دولت کا نفع ہے جب چراغ زندگی گل ہو رہا ہو اس وقت کا ایمان کچھ سودمند نہیں ہے۔

۲۔ آلْئٰنَ سے پہلے قول محذوف ہے، یعنی تم جب عذاب الٰہی کو دیکھ کر یا موت کے وقت ایمان لاؤ گے تو تمہیں کہا جائے گا۔ اب ایمان لاتے ہو جب ایمان لانے کا کچھ فائدہ نہیں ہے۔ حضرت نافع ہمزہ کے حذف اور اس کی حرکت لام کو دیکر پڑھتے ہیں اور باقی قراء لام کے سکون اور اس کے بعد ہمزہ کو باقی رکھ کر پڑھتے ہیں اور تمام ہمزہ استفہام کے بعد ہمزہ وصلی میں تسہیل کرتے ہیں۔ یا اس میں اور اس کے مشابہ حروف میں ہمزہ کو مدہ میں قلب کرتے ہیں جیسے آلْئٰنَ وَقَدْ عَصَيْتَ، آلذّٰكَرَيْنِ، آللّٰهُ خَيْرٌ۔ کسی نے بھی اس کو ثابت نہیں رکھا اور کسی نے بھی اس کے اور اس ہمزہ کے درمیان فرق نہیں کیا جس سے پہلے الف ہوتا ہے کیونکہ وہ ضعیف ہوتا ہے۔

۳۔ جبکہ اس سے پہلے تم اس عذاب کی دھمکی پر استہزاء اور مزاح کرتے ہوئے اس کی آمد کا مطالبہ کرتے تھے۔ یہ جملہ آمنتم مقدر فعل کے فاعل سے حال ہے۔

ثُمَّ قِيْلَ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ ۚ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ﴿۵۲﴾

"پھر کہا جائے گا ظالموں سے کہ چکھو (اب) دائمی عذاب (کا مزہ) کیا تمہیں بدلہ دیا جائے گا بجز اس کے جو تم کمایا کرتے تھے۔ ۱"

۱۔ اس کا قیل مقدر پر عطف ہے، یعنی جنہوں نے شرک کے گھناؤنے فعل کا ارتکاب کیا، انہیں کہا جائے گا کہ اب دائمی عذاب کا مزہ چکھو تمہیں صرف اور صرف اپنے کفر اور معاصی کی سزا دی جائے گی۔

وَيَسْتَنْۢبِـُٔوْنَكَ اَحَقٌّ هُوَ ۭ قُلْ اِيْ وَرَبِّيْٓ اِنَّهٗ لَحَقٌّ ڤ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۵۳﴾

"اور وہ دریافت کرتے ہیں آپ سے ۱ کیا یہ واقعی سچ ہے ۲ آپ فرمائیے ہاں! بخدا یہ سچ ہے ۳ اور تم (اللہ تعالیٰ کو) عاجز کرنے والے نہیں ہو ۴"

۱۔ اے محمد ﷺ یہ تجھ سے پوچھتے ہیں اَحَقٌّ هُوَ توحید الٰہی نبوت، قرآن، قیام قیامت اور عذاب وثواب کیا یہ سب حق اور سچ ہیں یا تم ہم سے مزاح کرتے ہو اور ہمیں بے حقیقت دھمکیاں دیتے ہو۔

۲۔ حق مبتدا ہے جو مسند الیہ نہیں ہے اور ضمیر مرفوع خبر کے قائم مقام ہے یا ضمیر مبتدا ہے اور حق خبر مقدم ہے اور پھر جملہ یستنبئونک کا مفعول ہے۔

۳۔ اے ممدوح کائنات فرما دیجئے۔ ہاں قسم بخدا یہ حق ہے اس میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور ربی کی یاء کو نافع اور ابو عمرو نے فتحہ سے اور باقی قراء نے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔

۳؎ اے کفار مکہ تم عذاب سے بچنے والے اور اس کے فوت کرنے والے نہیں کیونکہ جو کسی چیز سے عاجز ہوتا ہے وہ اسے فوت کرنے والا نہیں ہوتا ہے۔

وَلَوْ اَنَّ لِكُلِّ نَفْسٍ ظَلَمَتْ مَا فِي الْاَرْضِ لَافْتَدَتْ بِهٖ ؕ وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ۚ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝

"اور اگر ہر ظالم شخص کے لیے روئے زمین کی دولت ہو تو بھی وہ ساری دولت بطور فدیہ دیدے ۱؎ اور وہ ظالم دل ہی دل میں پچھتانے لگے جب دیکھا انہوں نے عذاب کو ۲؎ اور فیصلہ کر دیا گیا ان کے درمیان انصاف سے ۳؎ اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا ۴؎"

۱؎ اگر اس شخص کے پاس جس نے اللہ تعالیٰ کا شریک بنا کر یا حدود شریعت سے تجاوز کر کے اپنے اوپر ظلم کیا' زمین کے تمام خزانے ہوں تو وہ عذاب سے بچنے کے لیے تمام کے تمام فدیہ کے طور پر دے دے۔ یا افتداء بمعنی فداء ہے۔

۲؎ ابو عبیدہ فرماتے ہیں یہاں اسر بمعنی اظہر ہے یعنی وہ برملا ندامت کا اظہار کریں گے کیونکہ اس دن کسی قسم کا بناوٹی صبر اور تکلف نہ ہوگا۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی ہے کہ وہ اپنی ندامت کو چھپائیں گے یعنی اس کے رؤساء ظاہر داری کے لیے صبر و تحمل سے کام لیکر کمزوروں سے اپنی ندامت و شرمندگی کو چھپائیں گے تا کہ وہ ملامت نہ کریں اور عار نہ دلائیں(1)۔ بعض علماء فرماتے ہیں جب وہ دردناک عذاب کو دیکھ کر مبہوت ہو نگے تو وہ ضبط نہ کر سکیں گے اور نہ بولنے کی طاقت رکھتے ہونگے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی ہے کہ وہ شرمندگی میں اخلاص کا اظہار کریں گے کیونکہ شرمندگی کا اخفاء اس کا اخلاص ہے یا کہا جاتا ہے سرّ الشيء، چیز کا خلاصہ کیونکہ وہ بھی چھپائی جاتی ہے اور اس پر بخل کیا جاتا ہے، گویا وہ شرمندگی کے اظہار میں مخلص ہو نگے۔

۳؎ ظالموں اور مظلوموں کے درمیان فیصلہ انصاف اور عدل پر مبنی ہوگا۔ یہاں مظلوموں کے لیے بھی ظلم کا لفظ ذکر کیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مظلوموں کی خاطر ظالموں پر عذاب کا فیصلہ کیا جائے گا اور وہ فیصلہ پورے عدل و انصاف پر مبنی ہوگا۔

۴؎ انہیں کسی نہ کردہ گناہ کی سزا نہ دی جائے گی۔ یہاں کلام میں تکرار نہیں ہے کیونکہ پہلا فیصلہ انبیاء اور ان کی تکذیب کرنے والوں کے درمیان تھا اور یہ فیصلہ مشرکین کو اپنے شرک کی جزا اور ظالموں اور مظلوموں کے درمیان عدل کے لیے ہے۔

اَلَاۤ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝

"سن لو! بیشک اللہ تعالیٰ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور زمین میں سن لو! یقیناً اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ۱؎ لیکن اکثر لوگ (اس حقیقت کو) نہیں جانتے۔ ۲؎"

۱؎ یہ ثواب اور عذاب دینے پر اللہ تعالیٰ کی قدرت و اقتدار کا ثبوت ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ثواب دینے کا وعدہ یا عذاب دینے کی وعید فرمائی ہے وہ حق ہے، وہ ہو کر رہے گا، اس میں کسی قسم کا خلف نہ ہوگا۔

۲؎ لیکن اکثر لوگ اپنی ناقص عقل کی وجہ سے اس حقیقت کو نہیں سمجھتے وہ صرف اور صرف ظاہری دنیا کی زیب و زینت کو ہی سب کچھ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 163 (الفکر)

سمجھتے ہیں۔

هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۵۶﴾

''وہی زندگی بخشتا ہے اور وہی مارتا ہے[1] اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے[2]۔''

[1] وہ دنیا میں زندہ کرنے اور مارنے پر قادر ہے تو آخرت میں بھی زندہ کرنے اور مارنے پر قادر ہے کیونکہ جس کی قدرت ذاتی ہوتی ہے اس کی قدرت کو کبھی زوال نہیں ہوتا۔ اور وہ مادہ جو موت وحیات کو قبول کرتا ہے وہ ہمیشہ اسے قبول کر سکتا ہے، خواہ دنیا ہو یا آخرت ہو۔

[2] مرنے کے ساتھ اور قیامت کو حشر کے ساتھ اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۵۷﴾

''اے لوگو آ گئی ہے تمہارے پاس نصیحت تمہارے پروردگار کی طرف سے[1] اور (آ گئی ہے) شفا ان روگوں کے لیے جو سینوں میں ہیں[2] اور (آ گئی ہے) ہدایت اور رحمت اہل ایمان کے لیے[3]۔''

[1] موعظة سے مراد قرآن ہے، یعنی قرآن حکیم محمد ﷺ کی زبان کے ذریعے تمہارے پاس آیا اور یہ سراپا نصیحت ہے، سراپا تنبیہ اور تذکر ہے۔ ہر نیک اور صالح عمل کی ترغیب دیتا ہے اور ہر برائی اور غلط کاری سے روکتا ہے، یعنی بعض امور کا حکم دیتا ہے اور بعض چیزوں سے منع کرتا ہے اور یہ حقیقت مسلمہ ہے کہ کسی حکیم جواد اور علیم ذات کا حکم مامور بہ کے حسن کا تقاضا کرتا ہے۔ پس وہ فعل یقیناً مرغوب ہو گا اور اس پر اجر بھی مرغوب مرتب ہو گا اور ہمہ دان وہمہ بین ذات کا کسی فعل سے منع کرنا اس فعل کے قبیح ہونے کا مقتضی ہوتا ہے اور اس کا نتیجہ ہولناک مرتب ہوتا ہے۔

[2] قرآن حکیم کی دوسری صفت یہ ہے کہ ہر لاعلاج اور کہنہ مرض کا علاج ہے، یعنی وہ امراض جو تمہارے دلوں میں موجود ہیں۔ مثلاً عقائد فاسدہ اور ماسوی اللہ سے امیدیں اور ان سے قلبی تعلقات وابستہ کرنا وغیرہ ابن مردویہ نے حضرت ابوسعید الخدری سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ میرے سینہ میں تکلیف ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا قرآن پڑھو کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ حضرت واثلہ بن الاسقع کی حدیث اس کی شاہد ہے جو امام بیہقی نے شعب الایمان میں ذکر کی ہے۔ وھدی قرآن کی تیسری صفت یہ ہے کہ یہ عقائد حقہ جنت کے راستہ اور قرب الٰہی کے مراتب کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قرآن کے قاری کو ارشاد ہو گا قرآن پڑھتا جا اور بلند ہوتا جا اور قرآن کو ترتیل سے پڑھ جیسے دنیا میں ترتیل (ٹھہر ٹھہر کر پڑھنا) سے پڑھتا تھا، تیرا آخری مقام وہ ہو گا جہاں کو آخری آیت تلاوت کرے گا (1)۔ اس حدیث کو امام احمد، ترمذی اور ابوداؤد اور نسائی نے عبداللہ بن عمرو سے روایت کیا ہے۔

[3] اور یہ ایمان والوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت ہے کیونکہ ایماندار ہی اس کتاب لاریب کی تلاوت اور اتباع کر کے فیض یاب ہوتے ہیں۔ امام بغوی فرماتے ہیں رحمت سے مراد محتاج کو نعمت عطا کرنا ہے کیونکہ اگر کوئی بادشاہ دوسرے بادشاہ کو تحفہ دیتا ہے تو اسے رحمت نہیں کہا جاتا اگرچہ وہ تحفہ اور ہدیہ ایک نعمت بھی ہو کیونکہ اس نے وہ نعمت کسی محتاج کو نہیں بلکہ ایک بادشاہ کو دی ہے (2)۔

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 5، صفحہ 381 (العلمیہ)

2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 164 (الفکر)

قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَ بِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْیَفْرَحُوْا ؕ هُوَ خَیْرٌ مِّمَّا یَجْمَعُوْنَ ﴿۵۸﴾

"(اے حبیب) آپ فرمائیے یہ کتاب محض اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی رحمت سے نازل ہوئی ہے۔[1] پس چاہیے کہ وہ اس پر خوشی منائیں۔[2] یہ بہتر ہے ان تمام چیزوں سے جن کو وہ جمع کرتے ہیں۔[3]"

[1] اے محمد مصطفیٰ ﷺ اللہ تعالیٰ نے تمہارے غلاموں پر احسان فرمایا ہے کہ انہیں لاریب کتاب عطا فرمائی ہے۔ آپ بطور شکریہ فرمائیے کہ اس کتاب مقدس کا آنا جو سراپا نصیحت ہدایت ہے جو امراض کہنہ کا علاج ہے۔ فقط یہ اللہ تعالیٰ کا احسان عظیم اور اس کی رحمت ہے، یہ ہمارا استحقاق نہیں تھا بلکہ یہ اس کی بندہ نوازی کی جھلک ہے۔

[2] اس فضل عظیم اور رحمت پر یا قرآن کی آمد پر جشن مسرت منایا کرو اظہار فرحت و انبساط کیا کرو۔ اس کی تقدیر عبارت یوں ہے فَبِذٰلِكَ لِیَفْرَحُوْا فَلْیَفْرَحُوْا فعل کے تکرار کا مفاد یہ ہے حکم میں تاکید پیدا ہو جائے نیز یہ ثابت ہو جائے۔ کہ فرحت و مسرت اللہ تعالیٰ کی رحمت کے نزول فضل و احسان اور کتاب مقدس کے نزول کے وقت خاص ہے، دنیا کے فوائد و مقاصد کے لیے جشن اور مسرت کا اہتمام نہیں ہونا چاہیے بلکہ اللہ تعالیٰ کی کسی نعمت کے حصول پر ہونا چاہے ایک فعل کے وجود کی وجہ سے دوسرے کو حذف کیا گیا ہے۔ فبذالک پر فاء جزائیہ ہے۔ گویا اسکا مفہوم اس طرح ہے کہ اگر تم کسی چیز پر خوشی کا اظہار کرو تو فقط اللہ تعالیٰ نے اس فضل و احسان یا قرآن کی آمد پر کرو۔ یا فاء ماقبل کلام سے رابطے کے لیے ہے اور اس بات پر دلالت کرنے کے لیے ہے کہ مذکورہ اوصاف کی حامل کتاب کا آنا یقیناً تمہارے لیے باعث فرحت و انبساط ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں فضل اللہ اور رحمت سے مراد قرآن کا نازل فرمانا ہے۔ مجاہد اور قتادہ فرماتے ہیں فضل اللہ سے مراد ایمان اور رحمت سے مراد قرآن۔ حضرت ابوسعید الخدری فرماتے ہیں فضل اللہ سے مراد قرآن اور رحمت سے مراد اس کا ہمیں قرآن کا اہل بنانا ہے' ابوالشیخ وغیرہ نے حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا فضل اللہ سے مراد قرآن ہے اور رحمت سے مراد اس کا تمہیں اس کا اہل بنانا ہے۔ ابن عمر نے فرمایا فضل اللہ سے مراد الاسلام اور رحمت سے مراد اس کا اسلام کو مومنین کے دلوں میں مزین کرنا ہے۔ خالد بن معدان نے فرمایا فضل اللہ سے مراد اسلام اور رحمت سے مراد اس کی سنتیں ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں فضل اللہ سے مراد ایمان اور رحمت سے مراد جنت ہے(1)۔

ان تمام اقوال میں باء اسی فعل کے متعلق ہے جس کی تفسیر مابعد فعل کر رہا ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہوگی بِفَضْلِ اللّٰهِ وَ بِرَحْمَتِهٖ فَلْیَعْتَنُوْا وَلْیَفْرَحُوْا اس فعل کے تکرار کا پہلا فائدہ تاکید اور اجمال کے بعد بیان ہے اور دوسرا فائدہ یہ ہے کہ فرحت و خوشی کے جذبات کا اظہار اللہ کی رحمت و فضل کے وقت واجب ہے۔ یعقوب نے فلتفرحوا کو تاء کے ساتھ یعنی اصل کا اعتبار کر کے پڑھا ہے کیونکہ امر میں خطاب کا صیغہ اصل ہے۔ ابوداؤد نے ابی بن کعب سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَ بِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْتَفْرَحُوْا (یعنی تاء کے ساتھ پڑھا ہے)۔

[3] اس ضمیر کا مرجع ذالک ہے یعنی قرآن کا آنا یا اللہ تعالیٰ کا فضل اور رحمت خیر مما یجمعون دنیا کی چیزوں سے بہتر ہے۔

قُلْ اَرَءَیْتُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّ حَلٰلًا ؕ قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ ﴿۵۹﴾

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 164 (الفکر)

"آپ فرمائیے بھلا بتاؤ تو جو رزق اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے اتارا ۱؎ پس بنالیا تم نے اس سے بعض کو حرام اور بعض کو حلال ۲؎ پوچھئے کیا اللہ تعالیٰ نے (ایسا کرنے کی) تمہیں اجازت دی ہے یا تم اللہ پر جھوٹ باندھ رہے ہو۔ ۳؎"

۱؎ یہاں خلق کو انزال سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ رزق کی ہر قسم بارش سے پیدا ہوتی ہے۔ یا اس لیے خلق کو انزال سے تعبیر فرمایا کہ پہلے اللہ تعالیٰ نے لوح محفوظ پر ان تمام چیزوں کو لکھا۔ پھر اس کے مطابق انہیں پیدا فرمایا۔ پس گویا کہ اس نے اسے لوح محفوظ سے نازل فرمایا ہے۔ ما انزل یا ارایتم کی وجہ سے منصوب ہے کیونکہ ارایتم کا معنی اخبرونی ہے یعنی مجھے خبر دو اور من رزق کے الفاظ انسان کی خوراک جو کھیتی یا کھیری سے ملتی ہے اس کا یہ بیان ہے اور لکم کا کلمہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس سے مراد وہ رزق ہے جو تمہارے لیے حلال ہے۔ اسی وجہ سے اس رزق میں اپنی طرف سے حلت و حرمت کی تقسیم پر زجر و توبیخ فرمائی ہے فرمایا:۔

۲؎ تم خود اپنی طرف سے اس کا بعض حلال قرار دیتے ہو اور بعض حرام قرار دیتے ہو جیسا کہ وہ اپنے زعومات باطلہ کی بناء پر کہتے هذا انعام و حرث حجر یہ مویشی اور کھیتی رکی ہوئی ہے کبھی کہتے مَا فِیْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلٰۤى اَزْوَاجِنَا جو ان مویشیوں کے شکموں میں ہے وہ تر ہمارے مردوں کے لیے ہے اور حرام ہے ہماری بیویوں پر۔ اسی طرح انہوں نے بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام اونٹنیوں کو حرام قرار دے دیا تھا۔

۳؎ اے محبوب مکرم ان سے پوچھئے کیا اللہ تعالیٰ نے تمہیں اجازت دی ہے کہ جس کو چاہو حلال کہہ دو اور جس کو چاہو حرام قرار دے دو؛ اس لیے تم اپنے خود ساختہ نظریات و عقائد اس کے حکم کی طرف منسوب کرتے ہو یا تم اس کی طرف ان چیز کی حلت و حرمت کو منسوب کر کے اللہ تعالیٰ پر افتراء باندھتے ہو۔ یہ جملہ ارایتم کے متعلق ہے اور قل کا تکرار تاکید کے لیے ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ استفہام انکاری ہو اور ام منقطعہ ہو اور اس میں ہمزہ کا معنی ان کے اللہ تعالیٰ پر افتراء کی تقریر اور ثبوت کے لیے ہو۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں حلت و حرمت کی اجازت نہیں دی بلکہ تم اس خود ساختہ حرمت و حلت کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر کے اللہ تعالیٰ پر افتراء (جھوٹ) باندھتے ہو کیونکہ تم خود کسی حرام چیز کو حلال کہہ کر یا حلال کو حرام کہہ یہ کہہ کر دیتے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ حکم دیا ہے۔

وَمَا ظَنُّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ ۝۶۰

"اور کیا گمان ہے ان لوگوں کا جو افتراء کرتے ہیں اللہ پر جھوٹا کہ قیامت کے دن ان کا کیا حال ہوگا ۱؎ بیشک اللہ تعالیٰ فضل و کرم فرماتا ہے لوگوں ۲؎ پر لیکن اکثر لوگ شکر ادا نہیں کرتے ۳؎"

۱؎ بمعنی ای شیء ہے، یعنی اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھنے والوں کا کیا گمان ہے اور يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ظن کی وجہ سے منصوب ہے۔ معنی یہ ہے کہ کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ قیامت کے دن تمہیں ان کفریہ عقائد اور شرکیہ نظریات اور گھناؤنے کردار و افعال پر کوئی سزا نہیں دی جائے گی۔ یقیناً سزا ہوگی اس مبہم وعید میں سخت قسم کی سرزنش کی دھمکی ہے۔

۲؎ اللہ تعالیٰ لوگوں پر فضل و احسان فرماتا ہے کیونکہ انہیں سوچنے کے لیے عقل کی نعمت عطا فرمائی ہے، ان کو ضلالت و گمراہی کے گھپ اندھیروں سے نکالنے کے لیے وحی کا نور اور انبیاء کرام کی راہنمائی عطا فرمائی ہے۔

۳؎ لیکن اکثر لوگ اس نعمت کا شکر ادا نہیں کرتے۔ اگر یہ شکر ادا کرتے تو عقل و نقل کی پیروی کرتے اور اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف جھوٹی

باتیں منسوب نہ کرتے۔ یہ معنی بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں پر فضل فرماتا ہے کیونکہ دنیا میں جلد انہیں سزا نہیں دیتا (بلکہ توبہ کرنے کی مہلت عطا فرماتا ہے)

وَمَا تَكُونُ فِي شَأْنٍ وَمَا تَتْلُوا مِنْهُ مِن قُرْآنٍ وَلَا تَعْمَلُونَ مِنْ عَمَلٍ إِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُودًا إِذْ تُفِيضُونَ فِيهِ ۚ وَمَا يَعْزُبُ عَن رَّبِّكَ مِن مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ وَلَا أَصْغَرَ مِن ذَٰلِكَ وَلَا أَكْبَرَ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ ﴿٦١﴾

"اور نہیں ہوتے آپ کسی حال میں اور نہ آپ تلاوت کرتے ہیں اس حال میں کچھ قرآن [1] اور (اے لوگو) نہ تم کچھ عمل کرتے ہو [2] مگر (ہر حال میں) ہم تم پر گواہ ہوتے ہیں جب بھی تم شروع ہوتے ہو کسی کام میں [3] اور نہیں چھپا ہوتا [4] آپ کے رب سے ذرہ برابر بھی زمین میں اور نہ آسمان میں [5] اور نہیں کوئی چھوٹی چیز اس ذرہ سے اور نہ بڑی مگر وہ روشن کتاب (لوح محفوظ) میں ہے۔ [6]"

[1] اے جانِ کائنات محمد مصطفیٰ ﷺ آپ جس کام میں مشغول ہوتے ہیں اور جس حال میں ہوتے ہیں۔ محققین علماء فرماتے ہیں شان کسی عام فعل کو نہیں کیا جاتا بلکہ اس کا اطلاق بڑے بڑے اور اہم امور اور احوال پر ہوتا ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں اس کی اصل شانت شانہ سے ہے، یعنی تو نے اس کا قصد کیا (1) منہ میں ضمیر کا مرجع شان ہے کیونکہ قرآن کی تلاوت کرنا نبی کریم ﷺ کے عظیم الشان کاموں میں سے تھا۔ نیز قرآن شان عظیم کے لیے کی جاتی ہے۔ پس اس صورت میں من اجلہ ہوگا یا ضمیر کا مرجع قرآن ہے اور اضمار قبل الذکر ہے اور پھر من قرآن یہ اس کا بیان اور اس کی عظمت کے لیے ذکر کیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو آپ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ قرآن تلاوت کرتے ہیں۔ من قرآن میں من تبعیضیہ ہے یا نفی کی تاکید کے لیے زائدہ ہے۔

[2] روحِ انسانیت ﷺ سے خصوصیت کے ساتھ خطاب کرنے کے بعد عام لوگوں کو خطاب کیا جا رہا ہے۔ اسی وجہ سے پہلے آپ ﷺ کے اعمال عظیمہ کا ذکر فرمایا کیونکہ آپ ﷺ کا ہر فعل اور ہر قول اپنے اندر جمال و کمال کی شان رکھتا ہے پھر عام لوگوں کے افعال کا ذکر فرمایا جس میں عظیم اور حقیر ہر قسم کے افعال ہوتے ہیں۔

[3] مگر ہم تمہارے ہر عمل و قول پر مطلع ہیں اور اسے ناظر رہے ہیں جب تم کسی کام کو شروع کرتے ہو اور اس کی طرف چل پڑتے ہو، بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی ہے جب تم کسی کام کو کثرت سے کرتے ہو۔ الا فاضہ کا معنی الدفع بکثرۃ ہے کثرت کی وجہ سے ایک دوسرے کو دھکیلنا ہے۔

[4] وما یعزب کو کسائی نے راء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ دوسرے قراء نے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس میں دونوں لغتیں ہیں اس کا معنی ہے چھپی ہوئی نہیں ہے۔

[5] مثقال مصدر میمی ہے ثقل کے معنی میں جس کا مطلب وزن ہے اور من زائدہ ہے ذرہ، چھوٹی چیونٹی یا چھوٹے چھوٹے ذرات (جو روشندان کی روشنی میں نظر آتے ہیں) الارض اور السماء سے مراد یہ ہے کہ جو چیز دائرہ امکان وجود میں ہے لیکن ذکر الارض اور السماء کا کیا ہے کیونکہ عوام کی نگاہیں صرف زمین و آسمان کو ہی جانتی ہیں اور زمین کو السماء سے پہلے ذکر فرمایا ہے کیونکہ روئے سخن زمین والوں کی

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 5، صفحہ 73 (العلمیہ)

طرف ہے۔ آیت کا مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام اشیاء کا احاطہ کیے ہوئے ہے، کوئی چیز اس کے علم سے مخفی اور پوشیدہ نہیں ہے۔ (جیسا کہ بعض لوگ فلسفیوں اور خارجیوں میں سے یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو کلیات کا علم ہے جزئیات کا نہیں۔ بعض کہتے ہیں پہلے سے اسے تفصیلی علم نہیں ہے جیسے کوئی چیز معرض وجود میں آتی ہے اس وقت اسے اس کا علم ہوتا ہے۔

۲۔ یہ مستقل کلام ہے اور ماقبل کلام کے مفہوم کو پختہ کرتی ہے۔ لانفی جنس ہے اصغر و اکبر اس کا اسم ہے اور فی کتاب اس کی خبر ہے۔ حمزہ اور یعقوب نے اصغر اور اکبر کو رفع دیا ہے کیونکہ لا کا تکرار کی وجہ سے عمل باطل ہے۔ اس لیے یہ مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہوں گے۔ مگر دوسرے قراء نے لا کو عمل کراتے ہوئے منصوب پڑھا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں دونوں لا زائدہ ہیں اور اصغر اور اکبر مثقال ذرۃ پر یا صرف ذرۃ پر معطوف ہیں اور کسرہ کی جگہ فتحہ اس لیے دیا گیا ہے کہ یہ غیر منصرف ہیں یا مثقال ذرۃ پر محمول کرتے ہوئے محل جر میں ہے اور اس پر رفع پڑھنا مثقال ذرۃ پر عطف کے باوجود بھی جائز ہے کیونکہ محل بعید پر محمول ہے' کیونکہ من کے دخول سے پہلے وہ بھی مرفوع تھا اس صورت میں مستثنیٰ منقطع ہوگا۔ الکتاب سے مراد لوح محفوظ ہے یا اعمال لکھنے والے فرشتوں کے صحائف ہیں۔

اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾

"سنو! بے شک اولیاء اللہ کو نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے ۔۱۔"

۱۔ قیامت کے روز تکلیف و مصیبت میں گرفتار ہونے کی وجہ سے لوگ خوفزدہ اور پریشان ہوں گے مگر اللہ کے مقرب بندوں کو کوئی خوف و ملال نہ ہوگا وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ اور اس وقت نہ وہ کسی امید اور آرزو کے فوت ہونے کی وجہ سے غمگین ہوں گے ولاء اور التولی کا لغوی معنی یہ ہے کہ دو یا دو سے زیادہ چیزوں کا اس طرح حاصل ہونا کہ ان کے درمیان کوئی غیر مناسب چیز نہ ہو پھر یہ لفظ مجاز ا مکان' نسبت' دین دوستی' نصرت اور اعتقاد کے اعتبار سے قرب کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ قاموس میں ہے اَلْوَلْیُ القرب والدنو وَلْیٌ (مصدر) کا معنی قرب اور نزدیکی ہے(1) اور ولی اس سے اسم ہے جس کا معنی قریبی' محب' دوست اور مددگار ہے۔ پھر یہ بھی جان لو کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کے ساتھ اپنے تمام بندوں کو قرب حاصل ہے بلکہ کائنات کی ہر چیز کو قرب حاصل ہے مگر یہ قرب ایسا ہے جس کی کیفیت بیان و تحریر سے وراء ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ ۝ ہم شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں) یہی قرب ممکنات کے وجود و بقا کے لیے ضروری ہے اگر کسی چیز کو یہ قرب نصیب نہ ہو تو اس کا وجود بھی ممکن نہیں ہو سکتا۔

ایک دوسرا قرب ہے جو اس کے بندوں میں سے مقربین و خواص کو اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ قرب بھی بلا کیف ہے اس کو قرب محبت کہتے ہیں۔ اس قرب کو کشف کی نظر کے ساتھ قرب جسمانی کی صورت کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے۔ اس قرب محبت اور پہلے قرب میں صرف اور صرف لفظی اشتراک ہے۔ پھر اس قرب محبت بے شمار درجات و مراتب ہیں جیسا کہ حدیث قدسی کے الفاظ اس کے شاہد ہیں لَا یَزَالُ عَبْدِیْ یَتَقَرَّبُ اِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰی اُحِبَّهٗ فَاِذَا اَحْبَبْتُهٗ کُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِیْ یَسْمَعُ بِهٖ وَبَصَرَهُ الَّذِیْ یُبْصِرُ بِهٖ (رواہ البخاری عن ابی ھریرۃ)(2) اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں میرا بندہ نوافل کے ذریعے میرا ایسا قرب حاصل کر لیتا ہے کہ میں اسے اپنا محبوب بنالیتا ہوں پھر جب وہ میرا محبوب بن جاتا ہے تو میں اس کے کان ہو جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے اور میں اس کی آنکھیں ہو جاتا ہوں جن سے وہ دیکھتا ہے۔ اس حدیث کو امام بخاری نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے۔ اس قرب کا ادنیٰ

1۔ القاموس المحیط، جلد 2، صفحہ 1760 (التراث العربی)
2۔ صحیح بخاری، جلد 5، صفحہ 2385، حدیث: 6137 (ابن کثیر)

عَشِيْرَتَهُمْ فَلَا يُحِبُّ اَحَدًا اِلَّا لِلّٰهِ وَلَا يُبْغِضُ اِلَّا لِلّٰهِ وَلَا يُعْطِيْ اِلَّا لِلّٰهِ وَلَا يَمْنَعُ اِلَّا لِلّٰهِ۔ ولی وہ ہوتا ہے جس کا دل صبح و شام ذکر الٰہی میں مشغول ہوتا ہے اور ذکر الٰہی سے اکتاتا نہیں ہے۔ نیز اس کا دل محبت الٰہی سے لبریز ہوتا ہے، کسی غیر کی وہاں گنجائش ہی نہیں ہوتی، اگرچہ وہ اس کے آباء و اجداد ہوں، اولاد و ابناء یا بھائی ہوں یا خاندان کے افراد کسی کی محبت' محبت الٰہی پر غالب نہیں ہوتی، وہ کسی سے محبت کرتا ہے تو اللہ کے لیے، کسی سے بغض رکھتا ہے تو اللہ کے لیے، وہ کسی کو عطا کرتا ہے تو اللہ کے لیے، وہ کسی کو عطا نہیں کرتا تو بھی اللہ کے لیے یہ وہ لوگ ہیں جو صرف اور صرف اللہ کے لیے۔ ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ بلند مرتبہ صوفیاء اس مرتبہ کو فناء قلب کا نام دیتے ہیں۔

پس جس کا ظاہر و باطن تقویٰ و پرہیز گاری سے مزین و آراستہ ہو، یعنی اپنے آپ کو تمام برے اخلاق و اعمال سے بچائے اور اس کا نفس ہر رذیل و گھٹیا خصلت مثلاً شرک جلی' شرک خفی اور شرک اخفیٰ' حسد' کینہ' تکبر' لالچ' وغیرہ کی صفات سے پاک وصاف ہو اور محاسن اخلاق و اعمال سے متصف ہو تو صوفیاء کرام اس مرتبہ و مقام کو فناء نفس سے تعبیر کرتے ہیں اور کہتے ہیں اس کا شیطان مسلمان ہو گیا۔ پہلے وصف کی طرف اللہ تعالیٰ کا ارشاد اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اشارہ کرتا ہے۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿٦٣﴾

"یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور (عمر بھر) پرہیز گاری کرتے رہے۔[1]"

[1] ایمان کا محل دل ہے اور ایمان کا کمال یہ ہے کہ دل ذکر الٰہی سے سکون حاصل کرے اور ایک لمحہ کے لیے بھی یاد خدا سے غافل نہ ہو اور نہ کسی غیر کی طرف اس کی توجہ اور التفات ہو۔ دوسرے وصف کی طرف وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ کا ارشاد اشارہ کرتا ہے وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام بجالانے اور اس کی نواہی ظاہرہ اور باطنہ سے بچنے کے لیے ہر وقت ڈرتے رہتے ہیں۔

ابوداؤد نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کے بندوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جو نہ نبی ہیں اور نہ شہید لیکن قیامت کے دن قرب الٰہی کی وجہ سے انبیاء اور شہداء ان پر رشک کریں گے۔ صحابہ کرام نے عرض کی یا رسول اللہ ہمیں بتایئے وہ کون ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے آپس میں محبت کرتے ہیں، نہ ان میں کوئی رشتہ داری ہے، نہ مالی منفعت۔ بخدا ان کے چہرے سراپا نور ہوں گے اور نور کے منبروں پر تشریف فرما ہوں گے۔ دوسرے لوگ خوفزدہ ہوں گے، انہیں کوئی خوف نہ ہو گا۔ لوگ غمگین ہوں گے مگر یہ غمگین نہ ہوں گے۔ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھی (1)۔

اس حدیث کو امام بغوی نے اپنی سند کے ساتھ ابو مالک الاشعری سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ اسی طرح امام بیہقی نے شعب

1۔ مشکوٰۃ المصابیح، جلد 2، صفحہ 17 (اظہر)

الایمان میں روایت کی ہے۔ ابن مردویہ نے ابوہریرہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ سے اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ کے مصداق کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں(1)۔ اسی طرح جابر بن عبداللہ کی حدیث ہے، اسے بھی ابن مردویہ نے روایت کیا ہے۔

فصل:۔ ولایت کے حصول کے اسباب

ولایت کا مرتبہ مشکوٰۃ نبوت کے انوار کے تجلی سے حاصل ہوتا ہے، خواہ وہ بلا واسطہ یا بالواسطہ میسر آئیں۔ اس نعمت کے حصول کے لئے محبت وعقیدت کے ساتھ بارگاہ نبوت میں یا آپ ﷺ کے نائبین یعنی اولیاء کاملین کی مجلس میں کثرت سے حاضر ہونا ضروری ہے۔ محبت نبی کریم ﷺ اور آپ ﷺ کے نائبین کی صحبت اللہ تعالیٰ کی محبت اور اپنے قلب اور قالب کو نبی کریم ﷺ کے قلب وقالب کے رنگ میں رنگنے کا باعث ہوتی ہے۔ جس کی طرف اشارہ صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً اس کے ساتھ ساتھ مسنون طریقہ پر ذکر بھی ان انوار وتجلیات کے انعکاس کو مزید قوت بخشتا ہے کیونکہ یہ ذکر دل کی صفائی کا باعث ہوتا ہے اور دل کی صفائی انوار نبوت کے متوجہ کرنے کا سبب بنتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لکل شئی صقالہ وصقالہ القلب ذکر اللّٰہ ہر چیز کے زنگ کو دور کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی چیز ہوتی ہے اور دل کا زنگ ذکر الٰہی سے دور ہوتا ہے۔ اس حدیث کو امام بیہقی نے حضرت عبداللہ بن عمرو سے روایت کیا ہے۔

حضرت معاذ بن جبل سے روایت ہے فرماتے ہیں۔ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ یَقُوْلُ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی وَجَبَتْ مَحَبَّتِیْ لِلْمُتَحَابِّیْنَ فِیَّ وَالْمُتَزَاوِرِیْنَ فِیَّ وَالْمُتَبَاذِلِیْنَ فِیَّ(2) میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں ان لوگوں سے یقیناً محبت کرتا ہوں جو میری رضا کے لیے ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ اور میری رضا کے لیے ایک دوسرے کی زیارت کرتے ہیں اور میری وجہ سے باہم خرچ کرتے ہیں اس حدیث کو امام مالک احمد، الطبرانی، الحاکم، البیہقی نے روایت کیا ہے اور امام احمد، الطبرانی اور حاکم نے اسی طرح عبادہ بن الصامت سے بھی روایت کیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ جَاءَ رَجُلٌ اِلَی النَّبِیِّ ﷺ فَقَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ کَیْفَ تَقُوْلُ فِیْ رَجُلٍ اَحَبَّ قَوْمًا وَلَمْ یَلْحَقْ بِهِمْ قَالَ اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ (متفق علیہ)(3)۔ ایک شخص نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ ایک شخص ایک قوم سے محبت کرتا ہے مگر اس کا عمل ان جیسا نہیں ہے، اس کا حشر کیسا ہوگا؟ فرمایا جو شخص جس سے محبت کرتا ہے وہ اسی کے ساتھ ہوگا۔ حدیث میں لم یلحق بھم کا مطلب لم یعمل مثل عملھم ہے یعنی ان کے اعمال جیسا اس کا عمل نہیں ہے صحیحین میں حضرت انس سے بھی اسی طرح مروی ہے۔

حضرت ابی رزین سے مروی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں فرمایا کیا میں تمہیں ایسا اہم کام نہ بتاؤں جس کی وجہ سے تو دنیا و آخرت کی سعادت سے سعادت اندوز ہو (وہ امر یہ ہے) کہ تو اہل ذکر کی محافل کو لازم پکڑ اور جب فارغ ہو تو حتی المقدور اللہ تعالیٰ کے ذکر سے اپنی زبان کو حرکت دے اور اللہ کی رضا جوئی کے لیے کسی سے محبت کر اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے کسی سے نفرت کر(1)۔ اس حدیث کو بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 166 (الفکر) 2۔ شعب الایمان: 8992 (العلمیۃ) 3۔ مشکوٰۃ المصابیح: 5008 (الفکر)

حضرت ابوذر سے مروی ہے۔ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَحَبُّ الْاَعْمَالِ اِلَى اللّٰهِ الْحُبُّ فِي اللّٰهِ وَالْبُغْضُ فِي اللّٰهِ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ ترین عمل اللہ کی رضا کے لیے محبت کرنا اور اللہ کی رضا کے لیے نفرت کرنا ہے۔ •

اس حدیث کو احمد، ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔

ذکر المرادین:۔ پہلے جن نفوس قدسیہ کا ذکر ہوا ہے وہ مریدین اولیاء کرام تھے اور کچھ اللہ کے بندے ایسے ہیں جو بامراد ہوتے ہیں جیسا کہ مسلم شریف کی حدیث دلالت کرتی ہے حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے۔ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ اللّٰهَ اِذَا اَحَبَّ عَبْدًا دَعَا جِبْرِيْلَ فَقَالَ اِنِّيْ اُحِبُّ عَبْدًا فَاَحِبَّهُ قَالَ فَيُحِبُّهُ جِبْرِيْلُ ثُمَّ يُنَادِيْ فِي السَّمَاءِ فَيَقُوْلُ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ فُلَانًا فَاَحِبُّوْهُ فَيُحِبُّهُ اَهْلُ السَّمَاءِ ثُمَّ يُوْضَعُ لَهُ الْقُبُوْلُ فِي الْاَرْضِ وَاِذَا اَبْغَضَ عَبْدًا دَعَا جِبْرِيْلَ فَيَقُوْلُ اِنِّيْ اُبْغِضُ فُلَانًا فَاَبْغِضْهُ قَالَ فَيُبْغِضُهُ جِبْرِيْلُ ثُمَّ يُنَادِيْ فِيْ اَهْلِ السَّمَاءِ اِنَّ اللّٰهَ يُبْغِضُ فُلَانًا فَاَبْغِضُوْهُ قَالَ فَيُبْغِضُوْنَهُ ثُمَّ يُوْضَعُ الْبَغْضَاءُ فِي الْاَرْضِ(2) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت فرماتا ہے تو جبریل کو بلا کر فرماتا ہے اے جبریل میں فلاں شخص سے محبت کرتا ہوں تو بھی اس سے محبت کر۔ پھر فرمایا جبریل اس سے محبت کرتا ہے۔ اس کے بعد وہ آسمان میں ندا دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فلاں شخص سے محبت کرتا ہے تم بھی اس سے محبت کرو۔ پس آسمان کے مکیں بھی اس سے محبت کرتے ہیں۔ پھر اس کی مقبولیت زمین میں پھیلا دی جاتی ہے اور جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے نفرت فرماتا ہے تو جبریل کو بلا کر فرماتا ہے میں فلاں شخص سے نفرت کرتا ہوں تو بھی اس سے نفرت کر۔ پھر جبریل بھی اس سے نفرت کرتا ہے۔ پھر وہ آسمان والوں میں منادی کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فلاں شخص سے نفرت کرتا ہے تم بھی اس سے نفرت کرو۔ فرمایا آسمان والے اس سے نفرت کرنے لگتے ہیں، پھر زمین میں اس کی نفرت پھیلا دی جاتی ہے۔

اولیاء اللہ کی علامات:۔ امام بغوی نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ سے پوچھا گیا من اولیاء اللّٰه۔ اللہ کے ولی کون ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا اَلَّذِيْنَ اِذَا رُءُوْا ذُكِرَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ وہ لوگ جنہیں دیکھ کر اللہ تعالیٰ کی یاد آ جائے(3)۔ امام بغوی فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ اَوْلِيَائِيْ مِنْ عِبَادِيْ الَّذِيْنَ يُذْكَرُوْنَ بِذِكْرِيْ وَ اُذْكَرُ بِذِكْرِهِمْ میرے بندوں میں سے میرے اولیاء وہ ہیں جن کا ذکر میرے ذکر کے ساتھ کیا جائے اور ان کے ذکر کے ساتھ میرا ذکر کیا جائے(4)۔ ابن ماجہ نے حضرت اسماء بنت یزید سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا اَلَا اُنَبِّئُكُمْ بِخِيَارِكُمْ قَالُوْا بَلٰى يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ الَّذِيْنَ اِذَا رُءُوْا ذُكِرَ اللّٰهُ کیا میں تمہیں تمہارے لوگوں کا پتہ نہ بتاؤں؟ صحابہ کرام نے عرض کی یا رسول اللہ ضرور بتایئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا وہ ایسے لوگ ہیں جنہیں دیکھ کر اللہ کی یاد آ جائے(5)۔

فائدہ:۔ اولیاء اللہ کو دیکھ کر خدا کی یاد اس لیے آ جاتی ہے کہ ان بندگان خدا کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک ایسا قرب اور ایسی معیت ہوتی ہے جو بیان اور تحریر سے وراء ہے، ان کا اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ قرب تقاضا کرتا ہے کہ ان مقربین کی مجلس اللہ تعالیٰ کی مجلس کی طرح

1۔ شعب الایمان: 9024 (العلمیہ)
2۔ صحیح مسلم، جلد 16، صفحہ 151، حدیث: 2637 (العلمیہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 167 (الفکر)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 167 (الفکر)
5۔ سنن ابن ماجہ، جلد 4، صفحہ 473، حدیث: 4119 (العلمیہ)

ہواور ان کی زیارت خدا تعالیٰ کی یاد دلانے والی ہو اور ان کا ذکر اللہ تعالیٰ کی یاد کی طرف کشش کرنے والا ہو۔ جیسے ایک آئینہ جب سورج کے سامنے رکھا جائے اور سورج کی روشنی اس میں پوری طرح سما جائے تو آئینہ میں ایسی کیفیت اور حالت پیدا ہو جاتی ہے کہ جب کوئی چیز اس آئینہ کے سامنے آئے تو وہ بھی اسی طرح روشن ہو جاتی ہے، جس طرح سورج کے سامنے والی چیز روشن ہوتی ہے بلکہ روئی کو جب اس آئینہ کے سامنے رکھا جائے تو وہ اس روئی کو جلا کر راکھ کر دیتا ہے، جبکہ سورج کے سامنے پڑی ہوئی روئی جلتی نہیں ہے کیونکہ روئی آئینہ کے قریب ہوتی ہے اور سورج سے دور ہوتی ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیاء کرام میں اثر قبول کرنے کی استعداد رکھی ہوتی ہے جس کی بناء پر وہ اللہ تعالیٰ کے قریب ہوتی ہے اور سورج سے دور ہوتی ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیاء کرام میں اثر قبول کرنے کی استعداد رکھی ہوتی ہے جس کی بناء پر وہ اللہ تعالیٰ کے قرب اور مناسبت بلا کیف کی وجہ سے انوار و تجلیات کو قبول کرتے ہیں۔ اسی طرح ان میں اللہ تعالیٰ نے دوسرے لوگوں میں اثر کرنے کی صلاحیت بھی پیدا کی ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ مناسبت جنسیہ نوعیہ اور شخصیہ کی وجہ سے دوسروں پر اثر کرتے ہیں۔ پس اثر قبول کرنے اور دوسرے پر اثر کرنے کی صلاحیتیں حضور باللہ کے حصول کا تقاضا کرتی ہیں، اور جو ان کی زیارت کرے اور ان کی مجلس اختیار کرے اس میں یاد الٰہی کی شمع روشن کرنے کا تقاضا کرتی ہیں مگر یہ فیضان ان کی صحبت سے اسے نصیب ہوگا جو ان کی عظمت اور ان کے فیضان کا منکر نہ ہو۔ اولیاء کرام کے فیضان کے انکار کرنے کے عقیدہ سے ہم اللہ کی پناہ مانگتے ہیں و اللّٰہ لا یھدی القوم الفاسقین اللہ تعالیٰ ایمان اور اطاعت سے محروم قوم کو ہدایت نہیں دیتا۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مَنْ عَادٰی لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ اٰذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ جو میرے ولی سے دشمنی رکھے گا میرا اس کے ساتھ اعلان جنگ ہے۔ اس حدیث کو امام بخاری نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے (1)۔

حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ ہم آپ کے پاس ہوتے ہیں، آپ ہمیں جنت اور دوزخ کی یاد دلاتے ہیں، یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم ان دونوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں مگر جب ہم آپ کی بارگاہ سے اٹھ کر چلے جاتے ہیں اور بیویوں، بچوں اور کھیتوں میں مشغول ہو جاتے ہیں تو بہت سی چیزوں کو بھول جاتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے جو تمہاری کیفیت ذکر میری مجلس میں ہوتی ہے اگر وہ ہمیشہ تم پر رہتی تو فرشتے تمہارے ساتھ تمہارے بستروں اور راستوں پر تم سے معانقہ کرتے لیکن اے حنظلہ یاد رکھو یہ کیفیت کسی کسی وقت ہوتی ہے، آپ نے یہ جملہ تین مرتبہ دہرایا۔

اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے (2)۔

فائدہ: عوام جو کرامات اور غیب کے علوم کی خبر دینے کو علامات اولیاء سمجھتے ہیں یہ درست نہیں ہے۔ کرامت کا ظہور اور غیب کے علوم کی خبر دینا کوئی ولایت کی علامات میں سے نہیں ہے کیونکہ اکثر اولیاء میں یہ چیزیں نہیں پائی جاتیں (یعنی نہ ان سے کسی کرامت کا ظہور ہوتا ہے اور نہ وہ کسی غیب کی خبر دیتے ہیں لیکن وہ ولایت کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہوتے ہیں) بلکہ خارق عادت امور تو استدراجاً غیر ولی سے بھی صادر ہوتے رہتے ہیں۔ ہاں بعض لوگوں سے کرامات کا ظہور ہوتا ہے مگر یہ ولایت کے لیے امر لازم نہیں ہیں۔ اور یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو فرمایا اے محبوب قُلْ اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ یُوْحٰۤى اِلَیَّ فرما دیجئے بیشک میں تمہاری طرح ظاہری صورت میں بشر ہوں میری طرف وحی کی جاتی ہے نیز فرمایا لَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَیْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَیْرِ ۚۛ وَمَا مَسَّنِیَ السُّوْٓءُ ۚۛ مزید

1۔ صحیح بخاری: 6137 (ابن کثیر) 2۔ صحیح مسلم، جلد 17 صفحہ 56، حدیث: 2750 (العلمیہ)

فرمایا قُلْ اِنَّمَا الْاٰیٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ۔ اور اگر میں (تعلیم الٰہی کے بغیر) جان لیتا غیب کو تو خود ہی بہت جمع کر لیتا خیر سے اور نہ پہنچتی مجھ کو کوئی تکلیف۔ آپ فرمایئے کہ نشانیاں تو صرف اللہ ہی کے پاس ہیں۔ بلند مرتبہ صوفیاء فرماتے ہیں اَلْکَرَامَةُ حَیْضُ الرِّجَالِ لَا بُدَّ اسْتِتَارُهَا کرامت مردوں کا حیض ہے جس کا چھپانا ضروری ہے۔ کرامت یا غیب کی اخبار کی وجہ سے کسی کو کسی پر فضیلت نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ بعض لوگوں کے ہاتھوں پر جب کرامت کا ظہور ہوا تو انہیں شرمندگی محسوس ہوئی۔

الذین امنوا بطور مدح منصوب ہے یا اولیاء اللہ کی صفت ہونے کی وجہ سے منصوب ہے یا محل رفع میں ہے کیونکہ مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہوگی ھُمُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا جملہ مادحہ ہے یا اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مبتدا ہے اور لهم البشری الخ خبر ہے۔

لَهُمُ الْبُشْرٰی فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ فِی الْاٰخِرَةِ ۭ لَا تَبْدِیْلَ لِکَلِمٰتِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِکَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ﴿۶۴﴾

"انہیں کیلئے بشارت ہے دنیوی زندگی میں [1] اور آخرت میں نہیں بدلتیں اللہ تعالیٰ کی باتیں [2] یہی بڑی کامیابی ہے۔ [3]"

[1] یہ وہ بشارت ہے جو رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کو وحی کے ذریعے عموماً یا خصوصاً دی تھی مثلاً آپ ﷺ نے فرمایا اَبُوْ بَکْرٍ فِی الْجَنَّةِ وَ عُمَرُ فِی الْجَنَّةِ وَ عُثْمَانُ فِی الْجَنَّةِ وَ عَلِیٌّ فِی الْجَنَّةِ وَطَلْحَةُ فِی الْجَنَّةِ وَالزُّبَیْرُ فِی الْجَنَّةِ وَ عَبْدُالرَّحْمٰنِ بْنُ عَوْفٍ فِی الْجَنَّةِ وَ سَعْدُ بْنُ اَبِیْ وَقَّاصٍ فِی الْجَنَّةِ وَ سَعِیْدُ بْنُ زَیْدٍ فِی الْجَنَّةِ وَ اَبُوْ عُبَیْدَةَ بْنُ الْجَرَّاحِ فِی الْجَنَّةِ(1) نبی کریم ﷺ نے ان دس نفوس قدسیہ کے نام لے کر فرمایا یہ جنت میں ہونگے۔ اس حدیث کو امام ترمذی نے عبدالرحمٰن بن عوف سے اور ابن ماجہ نے سعید بن زید سے روایت کیا ہے۔

اسی طرح حضور نبی کریم ﷺ نے سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو خصوصیت کے ساتھ یہ مژدہ سنایا اَمَا اِنَّکَ یَا اَبَا بَکْرٍ اَوَّلُ مَنْ یَّدْخُلُ الْجَنَّةَ مِنْ اُمَّتِیْ۔ (اے ابوبکر میری امت میں سے سب سے پہلے تم جنت میں داخل ہو گے) اس حدیث کو ابو داؤد نے حضرت ابوھریرہ سے روایت کیا ہے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اَنَا اَوَّلُ مَنْ یَّنْشَقُّ عَنْهُ الْاَرْضُ ثُمَّ اَبُوْ بَکْرٍ ثُمَّ عُمَرُ(2) (سب سے پہلے میری قبر کھلے گی پھر حضرت ابوبکر کی پھر حضرت عمر کی قبر کھلے گی)۔ اس حدیث کو ترمذی نے ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے۔ اور فرمایا لِکُلِّ نَبِیٍّ رَفِیْقٌ وَ رَفِیْقِیْ فِی الْجَنَّةِ عُثْمَانُ (ہر نبی کا رفیق ہوگا اور میرا رفیق جنت میں عثمان ہے)۔ اس حدیث کو ترمذی نے طلحہ بن عبداللہ سے روایت کی ہے(3)۔

اسی طرح آپ ﷺ نے حضرت علی کو فرمایا اَنْتَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُّوْسٰی اِلَّا اَنَّهٗ لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ (تم میرے لیے ایسے ہو جیسے موسیٰ علیہ السلام ہارون کے لیے تھے مگر میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے)۔ یہ حدیث بخاری و مسلم نے سعد بن ابی وقاص سے روایت کی ہے(4)۔ آپ ﷺ نے فرمایا مَنْ کُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِیٌّ مَوْلَاهُ (جس کا میں مولی ہوں علی اس کا مولی ہے)۔ اس حدیث کو امام احمد اور امام ترمذی نے زید بن ارقم سے روایت کیا ہے(5)۔ فرمایا فَاطِمَةُ بَضْعَةٌ مِّنِّیْ فَمَنْ اَغْضَبَهَا اَغْضَبَنِیْ۔

1۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی:3747 (العلمیہ)　　2۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی:3692، جلد13، صفحہ125 (العلمیہ)

3۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی:3698، جلد3، صفحہ128 (العلمیہ)

4۔ صحیح مسلم:2404، جلد15، صفحہ142 (العلمیہ)　　5۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی:3713، جلد13، صفحہ137 (العلمیہ)

فاطمہ میرے جسم کا ٹکڑا ہے، جس نے اسے ناراض کیا اس نے مجھے ناراض کیا(1)۔ اس حدیث کو بخاری و مسلم نے مسعود بن مخرمہ سے روایت کیا ہے، فرمایا اَلْحَسَنُ وَالْحُسَیْنُ سَیِّدَا شَبَابِ اَھْلِ الْجَنَّۃِ۔ حضرت امام حسن اور امام حسین رضی اللہ عنہما جنتی جوانوں کے سردار ہیں۔ فرمایا عورتوں میں بہتر مریم بن عمران تھی عورتوں میں سے بہتر خدیجہ بنت خویلد ہے(2)۔ فرمایا عائشہ رضی اللہ عنہا کو عورتوں پر یوں فضیلت ہے جیسے ثرید کو کھانوں پر فضیلت ہے(3)۔ فرمایا عبداللہ (بن عمر) صالح آدمی ہے۔ اس حدیث کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے۔ عبداللہ بن سلام کو فرمایا انه من اهل الجنة (یہ جنتیوں میں سے ہے) اس حدیث کو بھی بخاری و مسلم نے سعد بن ابی وقاص سے روایت کیا ہے۔ انصار کے متعلق فرمایا لَا یُحِبُّھُمْ اِلَّا مُؤْمِنٌ وَلَا یُبْغِضُھُمْ اِلَّا مُنَافِقٌ فَمَنْ اَحَبَّھُمْ اَحَبَّہُ اللّٰہُ وَمَنْ اَبْغَضَھُمْ اَبْغَضَہُ اللّٰہُ ان سے مومن محبت کرتا ہے۔ اور منافق ان سے بغض رکھتا ہے، جو ان سے محبت کرے گا اللہ اس سے محبت کرے گا، جو ان سے بغض رکھے گا اللہ تعالیٰ اس سے بغض رکھے گا(4)۔ فرمایا اسید بن حضیر اچھا آدمی ہے ثابت بن قیس عمدہ آدمی ہے، معاذ بن جبل اچھا آدمی ہے معاذ بن عمرو بن الجموح اچھا آدمی ہے۔ فرمایا اِنَّ الْجَنَّۃَ تَشْتَاقُ الی ثلاثة علی و عمار و سلیمان جنت تین آدمیوں کا اشتیاق رکھتی ہے (1) حضرت علی (2) حضرت عمار (3) حضرت سلیمان رضی اللہ عنہم(5)۔ اس طرح رسول اللہ ﷺ نے اکثر صحابہ کرام کو تفصیلاً خوشخبری عطا فرمائی۔ اللہ تعالیٰ نے تمام صحابہ کرام کو جنت کی خوشخبری دی کُلًّا وَّعَدَ اللّٰہُ الْحُسْنٰی اللہ تعالیٰ نے تمام کے ساتھ جنت کا وعدہ فرمایا ہے اور اسی طرح فرمایا محمد رسول اللہ والذین معہ الخ۔ اسی طرح آپ ﷺ نے فرمایا لَا تَسُبُّوْا اَصْحَابِیْ فَلَوْ اَنَّ اَحَدَکُمْ اَنْفَقَ مِثْلَ اُحُدٍ ذَھَبًا مَا بَلَغَ مُدَّ اَحَدِھِمْ وَلَا نَصِیْفَہٗ میرے صحابہ پر زبان درازی نہ کیا کرو کیونکہ اگر تم میں سے کوئی احد پہاڑ جتنا سونا خرچ کرے تو وہ میرے صحابہ کے مد بلکہ اس کے نصف کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتا(6)۔ اس حدیث کو ابو سعید خدری سے امام بخاری اور امام مسلم نے روایت کیا ہے۔ ارشاد فرمایا اَصْحَابِیْ کَالنُّجُوْمِ فَبِاَیِّھِمُ اقْتَدَیْتُمُ اھْتَدَیْتُمْ۔ (میرے صحابہ روشن ستاروں کی مانند ہیں تم جس کی بھی پیروی کرو گے ہدایت پا جاؤ گے) اس حدیث کو رزین نے حضرت عمر سے روایت کیا ہے فرمایا خَیْرُ اُمَّتِیْ قَرْنِیْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَھُمْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَھُمْ (میری امت میں بہتر میرے دور کے لوگ ہیں پھر جو ان کے بعد ہیں پھر جو ان کے بعد ہیں) اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے عمران بن حصین سے روایت کیا ہے(7)۔

جب رسول اللہ ﷺ کا وصال ہو گیا تو دنیا میں اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیاء کو کشف کے ذریعے بشارت دی۔ یعنی عالم مثال میں حالت بیداری یا نیند میں اسے اس کا مرتبہ دکھا دیتا ہے۔ رؤیا صالحہ سے یہی بشارت مراد ہے۔ کیونکہ حضور ﷺ نے فرمایا۔ لَمْ یَبْقَ مِنَ النُّبُوَّۃِ اِلَّا الْمُبَشِّرَاتُ قَالُوْا وَمَا الْمُبَشِّرَاتُ قَالَ الرُّؤْیَا الصَّالِحَۃُ نبوت باقی نہیں ہے۔ مگر صرف مبشرات باقی ہیں۔ صحابہ کرام نے عرض کی مبشرات سے کیا مراد ہے؟ فرمایا رؤیا صالحہ (سچے خواب)۔ اس حدیث کو بخاری نے ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے(8)۔ امام بغوی نے عبادہ بن الصامت سے روایت کیا ہے: سَاَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ عَنْ قَوْلِہٖ تَعَالٰی لَھُمُ الْبُشْرٰی فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا۔ میں نے رسول اللہ ﷺ سے لَھُمُ الْبُشْرٰی فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا کے متعلق دریافت کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا

1۔ مشکوٰۃ المصابیح:6139، جلد3، صفحہ369 (الفکر)
2۔ صحیح مسلم:2430، جلد15، صفحہ160 (العلمیہ)
3۔ صحیح مسلم:2431، جلد15، صفحہ161 (العلمیہ)
4۔ مسند احمد، جلد4، صفحہ292 (صادر)
5۔ مشکوٰۃ المصابیح:6234، جلد3، صفحہ390، (الفکر)
6۔ مشکوٰۃ المصابیح:6007، جلد3، صفحہ333 (الفکر)
7۔ صحیح مسلم:212، جلد16، صفحہ70 (العلمیہ)
8۔ صحیح بخاری:6589، جلد6، صفحہ2564 (ابن کثیر)

هِيَ الرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ يَرَاهَا الْمَرْءُ اَوْتُرٰى لَهٗ یہ سچا خواب ہے جو انسان اپنے متعلق خود دیکھتا ہے یا اس کے متعلق کسی کو دکھایا جاتا ہے(1)۔

امام احمد، سعید بن منصور، امام ترمذی وغیرھم نے حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ان سے لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا کے متعلق پوچھا گیا تو فرمایا جب سے میں نے اس آیت کے متعلق حضور ﷺ سے پوچھا ہے اب تک اس کے متعلق تیرے سوا کسی نے مجھ سے سوال نہیں کیا ہے۔ آپ ﷺ سے جب میں نے اس آیت کے متعلق پوچھا تھا تو آپ ﷺ نے فرمایا جب سے یہ آیت نازل ہوئی ہے تیرے سوا کسی نے مجھ سے اس کے متعلق نہیں پوچھا، یہ سچے خواب ہیں جو مومن خود دیکھتا ہے یا اسکے متعلق کسی کو دکھائے جاتے ہیں(2) یہی اس کی دنیا میں بشارت ہے اور آخرت میں اس کی بشارت جنت ہے، اس حدیث کے بہت سے طرق ہیں۔ یہاں خواب سے مراد اولیاء کرام اور نیک لوگوں کے خواب ہیں، عوام کے خواب مراد نہیں ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خواب تین قسم کے ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بشارت، نفس کی بات اور شیطان کا ڈرانا۔ اس حدیث کو امام ترمذی نے روایت کر کے اسے صحیح کہا ہے(3) ابن ماجہ نے اسے ابوھریرہ سے روایت کیا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ رؤیا سے مراد اولیاء کے خواب ہیں تو پھر بھی قطعیت کا فائدہ تو حاصل نہیں ہوتا۔ ہم کہیں گے خواب قطعیت کا فائدہ واقعی نہیں دیتا مگر غلبہ ظن کا فائدہ تو دیتا ہے۔ اور یہی غلبہ ظن بشارت کے لیے کافی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اَلرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ جُزْءٌ مِّنْ سِتَّةٍ وَّاَرْبَعِيْنَ جُزْءًا مِّنَ النُّبُوَّةِ۔ سچا خواب نبوت کا چھیالیسواں جزء ہے(4)۔ اس حدیث کو امام بخاری نے ابوسعید سے، مسلم نے ابن عمر اور ابوہریرہ سے، احمد اور ابن ماجہ نے ابورزین سے، الطبرانی نے ابن مسعود سے، ابن ماجہ نے عوف بن مالک سے، امام احمد نے ابن عمر اور ابن عباس سے روایت کیا ہے۔ اور ابن ماجہ نے ابن عمر سے یہ الفاظ روایت کیے ہیں اَلرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ جُزْءٌ مِّنْ سَبْعِيْنَ جُزْءًا مِّنَ النُّبُوَّةِ کہ سچا خواب نبوت کا سترواں جزء ہے، ابن النجار نے ابن عمر سے روایت کیا ہے کہ سچا خواب نبوت کا پچیسواں جزاء ہے۔

اس بشارت سے مراد وہ عمومی بشارت نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ نے مومنین کو جنت اور بہتر ثواب کی اپنی کتاب میں ذکر فرمائی ہے جیسا کہ ارشاد ہے وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کیونکہ یہ بشارت یقینی ایمان پر خاتمہ ہونے کے بعد متصور ہو سکتی ہے۔ اس لیے یہاں یہ عمومی بشارت مراد نہیں ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں دنیا میں بشارت سے مراد اچھی تعریف ہے جیسا کہ عبداللہ بن الصامت سے امام بغوی نے روایت کیا ہے کہ ابوذر نے عرض کی یارسول اللہ اَلرَّجُلُ يَعْمَلُ لِنَفْسِهٖ وَ يُحِبُّهُ النَّاسُ انسان عمل تو اپنے بھلے کے لیے کرتا ہے لیکن لوگ اس کے نیک اعمال کی وجہ سے اس سے محبت کرتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا یہی مومن کو جلدی ملنے والی بشارت ہے(5)۔ امام مسلم نے بھی یہی حدیث روایت کی ہے مگر اس میں یحمدہ الناس کے الفاظ ہیں۔ امام زہری اور قتادہ فرماتے ہیں اس بشارت سے مراد انسان کی موت کے وقت فرشتوں کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے بشارت پہنچانا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ: اترتے ہیں ان پر فرشتے (اور انہیں کہتے ہیں) کہ نہ ڈرو اور نہ غم کرو تمہیں بشارت ہو جنت کی۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 167 (الفکر)
2۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 3106، جلد 11، صفحہ 192 (العلمیہ)
3۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 2270، جلد 9، صفحہ 90 (العلمیہ)
4۔ صحیح بخاری: 6588، جلد 6، صفحہ 2564 (ابن کثیر)
5۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 168 (الفکر)

حضرت عطانے ابن عباس سے اسی طرح کا قول نقل فرمایا ہے۔

۲ یعنی مومن کی روح جب پرواز کرتی ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پہنچتی ہے تو اسے اللہ کی رضا کی خوشخبری دی جاتی ہے اور یوم قیامت قبر سے خروج کے وقت رضائے الٰہی کی خوشخبری دی جائے گی۔

عبادہ بن الصامت سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مَنْ اَحَبَّ لِقَاءَ اللّٰهِ اَحَبَّ اللّٰهُ لِقَاءَهٗ وَمَنْ كَرِهَ لِقَاءَ اللّٰهِ كَرِهَ اللّٰهُ لِقَاءَهٗ (1) فَقَالَتْ عَائِشَةُ اَوْ بَعْضُ اَزْوَاجِهٖ اِنَّا لَنَكْرَهُ الْمَوْتَ قَالَ لَيْسَ ذَالِكَ وَلٰكِنَّ الْمُؤْمِنَ اِذَا حَضَرَهُ الْمَوْتُ بُشِّرَ بِرِضْوَانِ اللّٰهِ وَرَحْمَتِهٖ فَاَحَبَّ لِقَاءَ اللّٰهِ وَاَحَبَّ اللّٰهُ لِقَاءَهٗ وَاِنَّ الْكَافِرَ اِذَا حَضَرَ بُشِّرَ بِعَذَابِ اللّٰهِ وَعُقُوْبَتِهٖ فَلَيْسَ شَيْءٌ اَكْرَهَ اِلَيْهِ مِمَّا اَمَامَهٗ فَكَرِهَ لِقَاءَ اللّٰهِ وَكَرِهَ اللّٰهُ لِقَاءَهٗ۔

ترجمہ:۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو پسند کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی ملاقات کو پسند کرتا ہے، جو اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو پسند نہیں کرتا اللہ تعالیٰ اس کی لقاء کو پسند نہیں کرتا۔ حضرت عائشہ نے یا کسی اور زوجہ محترمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی حضور ہم تو موت کو پسند نہیں کرتیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا میری کلام کا یہ مقصد نہیں تھا بلکہ مومن جب قریب الموت ہوتا ہے تو رضاء الٰہی اور رحمت الٰہی کی اسے خوشخبری سنائی جاتی ہے تو وہ اس وقت اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو پسند کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کی ملاقات کو پسند کرتا ہے اور کافر پر جب موت کا وقت آتا ہے تو اسے اللہ تعالیٰ کے عذاب اور اس کی سزا کی وعید سنائی جاتی ہے تو اس وقت اس کے نزدیک اس عذاب وعقاب سے زیادہ کوئی چیز ناپسندیدہ نہیں ہوتی۔ پس وہ اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو ناپسند کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی ملاقات کو ناپسند کرتا ہے۔ اس حدیث کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لا الٰہ الا اللہ پڑھنے والوں پر موت کے وقت اور قبر میں اور حشر میں کوئی وحشت و گھبراہٹ نہ ہوگی، گویا میں انہیں دیکھ رہا ہوں کہ اس چیخ اور زوردار آواز کے وقت مٹی کو اپنے سروں سے جھاڑ رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ "سب تعریف اس اللہ کے لیے ہے جس نے ہم سے غم کو دور کیا (2)۔ اس حدیث کو الطبرانی نے نقل کیا ہے۔ اسی طرح الختلی نے الدیباج میں ابن عباس سے مرفوع حدیث نقل کی ہے۔

۳ یعنی اس کے وعدوں میں کوئی خلاف ورزی نہیں کی جاتی۔ اسی ارشاد سے صوفیائے کرام کے قول الفانی لا یرد کا استنباط ممکن ہے۔

۴ دو جہانوں میں ان کو بشارتوں کا ملنا بہت بڑی کامیابی ہے۔ یہ جملہ اور اس سے پہلے والا جملہ بشریٰ کے تحقق اور اس کی عظمت شان کے لیے بطور کلام معترض ذکر کیے گئے ہیں اور کلام اعتراض کے لیے ضروری نہیں ہوتا کہ اس کے بعد ایسی کلام واقع ہو جو ماقبل سے متصل ہو۔

وَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ اِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۭ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿٦٥﴾

"اور نہ غمزدہ کریں آپ کو ان ۱ کی باتیں یقیناً ساری عزت اللہ کے لیے ہے ۲ وہ سب کچھ سننے والا ہر چیز جاننے والا ہے۔ ۳"

۱ نافع نے باب افعال سے یاء کے ضمہ اور زاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے (3) اور باقی قراء نے یاء کے فتحہ اور زاء کے ضمہ کے ساتھ مجرد باب سے پڑھا ہے، معنی دونوں کا ایک ہے یعنی ان کا شرکیہ گفتگو کرنا دل آزار باتیں کرنا۔ اور اسلام کے شجر طوبیٰ کو ملیا میٹ کرنے

1۔ صحیح مسلم، جلد 9، صفحہ 17 (العلمیہ)
2۔ مجمع الزوائد: 18324، جلد 10، صفحہ 603 (الفکر)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 168 (الفکر)

کے دھمکیاں دینا آپ کو رنجیدہ خاطر نہ کرے۔

۲؎ یہ مستقل کلام ہے اور علت کے طور پر ذکر کی گئی ہے اور اس پر فتحہ کی قرات دلیل ہے، گویا یوں ارشاد ہے اے پیارے حبیب آپ ان کی باتوں سے پریشان نہ ہوں اور ان کی یرزہ سرائی پر بالکل توجہ نہ دیں کیونکہ غلبہ اور مکمل غلبہ اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔ کوئی دوسرا غلبہ کا مالک نہیں ہے۔ وہ مالک الملک انہیں رسوا کرے گا اور تمہاری مدد اور تائید فرمائے گا۔

۳؎ وہ ان کی تمام یاوہ گوئیاں اور بدزبانیں سن رہا ہے۔ وہ ان کی نیتوں کو بھی جانتا ہے اور ان نیتوں پر انہیں جزا دے گا۔

اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِی الْاَرْضِؕ وَ مَا یَتَّبِعُ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُرَكَآءَؕ اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنْ هُمْ اِلَّا یَخْرُصُوْنَ ﴿۶۶﴾

”خبردار بیشک اللہ کے ملک میں ہے جو کوئی آسمانوں میں ہے اور جو کوئی زمین میں ہے ۱؎ اور کس کی پیروی کر رہے ہیں جو لوگ پکار رہے ہیں اللہ تعالیٰ کے سوا (دوسرے) شریکوں کو ۲؎ نہیں پیروی کر رہے مگر وہم و گمان کی ۳؎ اور نہیں وہ مگر اٹکلیں دوڑا رہے ہیں۔ ۴؎“

۱؎ زمین و آسمان میں ملائکہ جن و انس میں سے جو بھی ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہیں۔ جب یہ ممکنات میں سے اشرف ترین مخلوق ہیں مگر یہ اس کے بندے اور غلام ہونے کی وجہ سے ربوبیت و الوہیت کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ پس جو بے عقل اور بے بس مورتیاں ہیں وہ کیسے اس کی الوہیت و ربوبیت میں شریک ہو سکتی ہیں۔ پس یہ قول آنے والے ارشاد پر دلیل کی مانند ہے۔

۲؎ وہ انہیں حقیقۃً اللہ کا شریک سمجھتے تھے، جبکہ ربوبیت میں شرکت محال ہے "شرکاء" یدعون کا مفعول بنانا بھی جائز ہے اور یتبع کا مفعول محذوف ہوگا۔ اس ترکیب پر ان یتبعون الا الظن کا قول دلالت کرتا ہے۔

۳؎ یعنی وہ یقین کی اتباع نہیں کر رہے بلکہ وہ اپنے وہم و گمان کی اتباع کرتے ہوئے انہیں اللہ تعالیٰ کا شریک سمجھتے ہیں۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ ما موصولہ ہو اور اس کا عطف من پر ہو، یعنی اللہ کے لیے جس کی اتباع کر رہے ہیں وہ جو پکارتے ہیں اللہ کے سوا دوسرے شرکاء کو، یا یہ ما استفہامیہ اور یتبع کی وجہ سے منصوب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ کس کی پیروی کر رہے ہیں جو پکارتے ہیں اللہ کے سوا ملائکہ اور انبیاء میں سے کسی کے تم پروردگار ہو وہ تو صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں اور کسی دوسرے کو اپنا معبود نہیں سمجھتے تھے' اے مشرکو! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم ان انبیاء و ملائکہ کی پیروی کیوں نہیں کرتے۔ جیسے اللہ کا ارشاد ہے اُولٰٓىِٕكَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ یَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِیْلَةَ۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے رب کی بارگاہ میں پہنچنے کے لیے وسیلہ تلاش کرتے ہیں۔ پس یہ کلام دلیل کے بعد الزام ہے اور اس کے بعد والی کلام میں ان کی سند اور ان کی رائے کی منشا کے بیان کے لیے اسے خطاب نہیں کیا گیا۔

۴؎ وہ اپنے بتوں کی طرف شریک ہونے کی نسبت کرتے ہیں وہ اس میں جھوٹے ہیں۔ یا یہ معنی ہے کہ وہ باطل تقدیر سے یعنی اپنے اٹکل پچو سے انہیں اللہ کا شریک بناتے ہیں۔

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ لِتَسْكُنُوْا فِیْهِ وَ النَّهَارَ مُبْصِرًاؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّسْمَعُوْنَ ﴿۶۷﴾

”وہی ہے جس نے بنائی تمہارے لیے رات تاکہ تم آرام کرو اس میں اور روشن دن بنایا ۱؎ بیشک اس میں نشانیاں ہیں

ان لوگوں کے لیے جو (غور سے) سنتے ہیں۔ ؎ ''

۱؎ اسی نے تمہارے لیے رات کو پیدا فرمایا تا کہ دن بھر کی مشغولیت و تھکاوٹ کے بعد آرام کر لو اور اشیاء کو دیکھنے کیلئے روشن دن بنایا۔
۲؎ اتنی بڑی بڑی اشیاء کی حکمت کے مطابق تخلیق کرنے میں نشانیاں ہیں' جو اس کے کمال قدرت' عظیم نعمت اور مستحق عبادت ہونے کے روشن دلائل ہیں۔ اس قوم کے لیے جو اللہ اور نصیحت کرنے والوں کے کلام کو سنتی ہے مگر فقط سنتی ہیں بلکہ تدبر اور عبرت کے کانوں سے سنتی ہے۔

قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ هُوَ الْغَنِیُّ ؕ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ؕ اِنْ عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍۭ بِهٰذَا ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۶۸

''انہوں نے کہا بنالیا ہے اللہ تعالیٰ نے کسی کو بیٹا؎ وہ پاک ہے۔ وہ تو بے نیاز ہے ؎ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے ؎ نہیں تمہارے پاس کوئی دلیل اس (بے ہودہ بات) کی ؎ کیا تم بہتان باندھتے ہو اللہ تعالیٰ پر جس کا تمہیں علم ہی نہیں ؎ ''

۱؎ مشرکین نے کہا اللہ نے بیٹا بنالیا ہے اور وہ کہتے فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں حالانکہ وہ بیٹا بنانے سے پاک ہے۔ یہ ان نادانوں کی بات پر اظہار تعجب ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف ایسی بات منسوب کی ہے جس کا تصور ہی محال ہے'
۲؎ وہ ہر چیز سے بے نیاز ہے وہ کسی امر کو بجالانے میں کسی کا محتاج نہیں ہے۔ جبکہ باقی تمام موجودات اپنے وجود' اپنی بقاء اور اپنی صفت کے قیام کے لیے اس کی محتاج ہیں۔ بھلا اس کے اور جس کو وہ خدا کی اولاد کہتے ہیں ان کے درمیان کوئی مناسبت بھی ہے (ہرگز نہیں) کیونکہ بچہ والد کی جنس سے ہوتا ہے کہا جائے گا کہ وہ اس لیے اولاد کا خواہش مند ہے کہ عالم پیری اور کمزوری میں وہ اسے طاقت مہیا کرے یا وہ فقیر اور محتاج اور اولاد کا طلبگار ہے تا کہ فقر و تنگدستی میں اس کی معاونت کرے یا وہ ذلیل ہے بیٹا چاہتا ہے تا کہ اس کے ذریعے اسے شرف ملے' یا وہ اپنی جنس کی بقا کے لیے بیٹا چاہتا ہے۔ یہ تمام چیزیں حاجت اور ضرورت کا تقاضا کرتی ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ غنی اور قدیم ہے۔
۳؎ زمین و آسمان کی تمام چیزیں تخلیق و ملک کے اعتبار سے اس کی مملوک ہیں۔ اس لیے کوئی چیز اس کا بیٹا کیسے ہوسکتی ہے
۴؎ تمہارے پاس اس بارہ گوئی کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ لہٰذا سلطان کے متعلق ہے یا اس کی صفت ہے یا عندکم کے متعلق ہے۔ گویا یوں کہا گیا ہے تمہارے پاس اس کی کوئی دلیل نہیں ہے' یہ بیٹے کی نفی پر دلیل کے قائم کرنے کی معارض دلیل کی نفی ہے۔
۵؎ یہاں مشرکوں کو جھڑ کنے اور تنبیہ کرنے کے لیے ہے کہ تمہیں یہ زیب نہیں دیتا کہ تم ایسی بیہودہ اور بے سروپا باتیں کرو جن کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ کیونکہ عقائد کے لیے کسی ایسی دلیل قطعی کی ضرورت ہوتی ہے جو علم کا فائدہ دے۔ عقائد میں تقلید جائز نہیں ہوتی۔

قُلْ اِنَّ الَّذِیْنَ یَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا یُفْلِحُوْنَ ۝۶۹

'' آپ فرمایئے جو لوگ اللہ پر جھوٹا بہتان باندھتے ہیں وہ کامیاب نہیں ہوسکتے ؎ ''

۱؎ اے محمد ﷺ فرمایئے جو لوگ اللہ تعالیٰ کی بے نیاز ذات کی طرف بیٹے کی نسبت کرتے ہیں اور اس کا شریک ٹھہراتے ہیں وہ نہ دوزخ سے نجات پائیں گے اور نہ جنت کی نعمتوں سے شادکام ہوں گے۔

مَتَاعٌ فِي الدُّنْيَا ثُمَّ إِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ نُذِيقُهُمُ الْعَذَابَ الشَّدِيدَ بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ ﴿٧٠﴾

"(چند روزہ) لطف اندوزی ہے دنیا میں ۱؎ پھر ہماری طرف ہی انہیں لوٹنا ہے پھر ہم چکھائیں گے انہیں سخت عذاب بوجہ اس کے کہ وہ کفر کیا کرتے تھے۔ ۲؎"

۱؎ یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ یعنی ان کا جھوٹے بہتان باندھنا دنیا میں چند روز لطف اندوز ہونے کا سبب ہے۔ اسی جھوٹ کے ذریعے وہ کفر میں اپنی ریاست کو قائم رکھے ہوئے ہیں، یا یہ مطلب ہے کہ ان کی زندگی اور ان کا یہ چلنا پھرنا چند روزہ لطف اندوزی ہے یا یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے۔ یعنی ان مشرکوں کے لیے چند دن دنیا میں لطف اندوز ہونا ہے۔

۲؎ پھر مرنے کے بعد انہوں نے ہماری طرف لوٹنا ہے اور پھر ہم انہیں ان کے کفر کی وجہ سے سخت عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ نُوحٍ إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ يَا قَوْمِ إِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَقَامِي وَتَذْكِيرِي بِآيَاتِ اللَّهِ فَعَلَى اللَّهِ تَوَكَّلْتُ فَأَجْمِعُوا أَمْرَكُمْ وَشُرَكَاءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ أَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوا إِلَيَّ وَلَا تُنْظِرُونِ ﴿٧١﴾

"اور آپ پڑھ سنایئے انہیں نوح (علیہ السلام) کی خبر ۱؎ جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا ۲؎ اگر گراں ہے تم پر میرا قیام اور میرا پند و نصیحت کرنا اللہ کی آیتوں سے پس (سن لو) میں نے اللہ تعالیٰ پر توکل کر لیا ۳؎ سو تم بھی کوئی متفقہ فیصلہ کر لو ۴؎ اپنے شریکوں سے مل کر ۵؎ پھر نہ ہو تمہارا یہ فیصلہ تم پر مخفی ۶؎ پھر کر گزرو میرے ساتھ (جو جی میں آئے) اور مجھے مہلت نہ دو ۷؎"

۱؎ اے پیارے محمد ﷺ اہل مکہ کو نوح علیہ السلام کی وہ گفتگو پڑھ کر سنایئے جو انہوں نے اپنی قوم سے مخاطب ہو کر کی تھی۔

۲؎ اذ قال اذ کر فعل مقدر کے متعلق ہے یعنی جب اپنی قوم سے بڑے پر جلال انداز میں فرمایا۔

امام بغوی فرماتے وہ قوم قابیل کی اولاد تھی(1) مگر یہ درست نہیں ہے کیونکہ نوح علیہ السلام حضرت شیث علیہ السلام اولاد سے تھے نہ کہ قابیل کی اولاد سے قوم کی ان کی طرف اضافت دلیل ہے کہ وہ قوم شیث علیہ السلام کی اولاد تھی۔

۳؎ اے میری قوم اگر تم پر میرا زیادہ تمہارے درمیان ٹھہرنا تکلیف دہ ہے یا میرا دعوت و تبلیغ کرتے رہنا تم پر شاق ہے اور میرا تمہیں اللہ کی واحدنیت کی حجتیں پیش کرنا تم پر گراں ہے یا میرا آیات منزلہ پڑھ کر سنانا تمہیں ناگوار ہے تو میں نے اللہ پر توکل اور بھروسہ کیا ہے۔

۴؎ تو تم عزم مصمم کر لو یا اجمع الامر سے مشتق ہے جس کا معنی نیت کرنا یا عزم مصمم کرنا ہے۔

۵؎ اور اپنے شریکوں کو ساتھ ملا لو۔ یعقوب نے شرکاء کم کو اجمعوا کی ضمیر کو عطف کرتے ہوئے مرفوع پڑھا ہے اور درمیان میں فاصلہ ہونے کی وجہ سے یہ عطف بغیر مرفوع منفصل ضمیر کی تاکید کے بھی جائز ہے۔ یعنی تم اور تمہارے شرکاء مل کر میرے قتل کا یا مجھے کوئی تکلیف پہنچانے کا پختہ ارادہ کر لو۔ باقی قراء نے شرکاء پر نصب پڑھی ہے یا تو اس لیے کہ یہ مفعول معہ ہے اور واؤ بمعنی مع ہے۔ معنی وہی ہے جو گذر چکا ہے۔ الزجاج نے یہی ترکیب لکھی ہے یا اس کا عطف امرکم پر ہے اور مضاف محذوف ہے۔ ای اقصدوا امرکم و امر شرکاء کم یا یہ فعل مقدر کی وجہ سے منصوب ہے ای ادعوا شرکاء کم۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 170 (الفکر)

۵ یعنی جو تم میرے ساتھ کرنا چاہتے ہو۔ وہ فیصلہ تم پر مخفی نہ ہو بلکہ اسے واضح اور ظاہر ہونا چاہیے۔ یہ غمہ سے مشتق ہے جس کا مطلب کسی چیز کو چھپانا ہے یا یہ معنی ہے کہ جب مجھے ہلاک کر دو اور میرے قیام اور پند و نصیحت کے بوجھ سے چھٹکارا حاصل کر لو تو تمہاری حالت تم پر مخفی نہیں ہونی چاہیے۔

۶ تم جو مجھ پر آفت ڈالنا چاہتے ہو ڈال دو وار مجھے لمحہ بھر کی مہلت نہ دو۔ حضرت نوح علیہ السلام کا اپنی قوم کو یہ حکم دینا کہ گزرو جو کرنا چاہتے ہو ان کی عاجزی کو ظاہر کرنے کے لیے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام کے متعلق یہ خبر دی ہے کہ وہ اللہ کا بندہ اپنے خالق و مالک کی نصرت پر کتنا پر اعتماد تھا اور اپنی قوم کے مکر و فریب سے کتنا بے خوف تھا۔ کیونکہ اس کا یقین کامل تھا کہ ان کے یہ اندھے اور بہرے بت جنہیں یہ خدا سمجھتے کسی نفع اور نقصان کے مالک نہیں۔ ہوتا فقط وہی ہے جو وہ یکتا پروردگار چاہتا ہے۔

فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ ؕ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ۙ وَ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۷۲﴾

"پایں ہمہ اگر تم منہ موڑے رہو تو نہیں طلب کیا میں نے تم سے کچھ اجر۔۱ نہیں میرا اجر مگر اللہ کے ذمہ ۲ اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں ہو جاؤں مسلمانوں سے ۳۔"

۱ اس کلام میں شرط کی جزاء محذوف ہے اور جزاء کی علت کو اس کے قائم مقام رکھا گیا ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہے فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ عَنْ تَذْكِيْرِيْ وَاَعْرَضْتُمْ عَنْ قَوْلِيْ وَ قُبُوْلِ نُصْحِيْ بَعْدَ ظُهُوْرِ صِدْقِهٖ هَلَكْتُمْ اَوْ يُعَذِّبُكُمُ اللّٰهُ لِكَوْنِ ذَالِكَ التَّوَلِّيْ عَنِ الْحَقِّ بِلَا مَانِعٍ عَنْ قُبُوْلِهٖ یعنی اگر تم میرے پند و نصائح سے منہ موڑ لو اور میری بات کی صداقت کے ظاہر ہونے کے بعد بھی تم میری بات کو قبول نہ کرو تو تم ہلاک ہو جاؤ گے یا تمہیں بلا وجہ حق کی قبولیت سے اعراض کرنے پر اللہ تعالیٰ خود عذاب و عقاب میں مبتلا کرے گا، میں تو تم سے اپنی ان جانکاہیوں اور کاوشوں کا کوئی اجر طلب نہیں کرتا جو تمہیں حق کے قبول کرنے سے روکے ہوئے ہے کہ تم اس کے بوجھ کی وجہ سے حق کو قبول نہیں کر رہے۔ یا تم اس اجر کے سبب مجھ پر کوئی الزام و اتہام لگاؤ، یا یہ معنی ہے کہ اگر تم میری نصیحتوں سے اعراض کرو گے تو تم اپنی ہی جانوں پر ظلم کرو گے کہ مجھے تو اس کا کوئی خسارہ نہ ہوگا' کیونکہ میں نے تمہارے کسی اجر و معاوضہ کا سوالی ہی نہیں ہوں، تمہارے حق کو قبول نہ کرنے کی وجہ سے میں اس معاوضہ سے محروم ہو جاؤں گا بلکہ تم اگر اس روش پر چلتے رہے تو ہدایت کے پیغام شفا سے تم خود محروم ہو گے۔

۲ ان اجری کو نافع' ابو عمرو' ابن عامر اور حفص نے یاء کے فتحہ کے ساتھ ہر جگہ پڑھا ہے اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ میری اس دعوت حق اور نصائح کی تبلیغ کا اجر نہیں ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کے ذمہ تمہارے اجر و ثواب کا کوئی تعلق و واسطہ نہیں ہے۔ وہی مالک الملک مجھے ثواب عطا فرمائے گا، خواہ تم ایمان لاؤ یا اعراض کرو' میری ان کوششوں کا اجر میرا پروردگار مجھے ضرور عطا فرمائے گا۔ اس آیت میں اشارہ ہے کہ قرآن کریم یا اس جیسے تبلیغی کاموں پر اجر لینا درست نہیں ہے۔

۳ مجھے تو فقط یہی حکم ہے کہ میں ان لوگوں سے ہو جاؤں جو ایمان لانے' نیک اعمال کرنے' لوگوں کو دعوت حق کی تبلیغ کرنے میں اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کرنے والے ہیں' پس میں نے وہ حکم اور فریضہ ادا کر دیا ہے۔

فَكَذَّبُوْهُ فَنَجَّيْنٰهُ وَ مَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ وَ جَعَلْنٰهُمْ خَلٰٓئِفَ وَ اَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ

كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ ۝

"تو آپ (نوح علیہ السلام) کی قوم نے آپ کو جھٹلایا پس ہم نے نجات دی انہیں اور جوان کے ساتھ کشتی میں تھے ۱؎ اور ہم نے بنادیا انہیں ان کا جانشین ۲؎ اور ہم نے غرق کر دیا جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا ۳؎ ذرا دیکھو کیسا انجام ہوا ان کا جنہیں ڈرایا گیا تھا ۴؎ "

۱؎ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم نے سرکشی، نخوت اور غرور کی وجہ سے حق کے واضح ہونے کے بعد بھی آپ کی تکذیب پر اصرار کیا۔ پھر ہم نے حضرت نوح اور آپ کے ساتھ جو اسی افراد تھے انہیں غرق ہونے سے بچالیا۔

۲؎ پھر ہم نے انہیں ان ہلاک ہونے والوں کا جانشین بنایا۔

۳؎ ہم نے طوفان میں غرق کر دیا انہیں جو ہماری آیتوں کی تکذیب کرتے تھے۔

۴؎ ذرا دیکھو جنہیں رسولوں نے تبلیغ کی مگر وہ ایمان نہ لائے تو ان کا انجام کیا ہوا۔ اس آیت کریمہ میں جوان پر عذاب وعقاب کی بجلی کوندی اس کی بڑائی کی طرف اشارہ ہے۔ نیز اس میں رسولوں کے جھٹلانے والوں کو انجام بد سے ڈرانا ہے اور نبی کریم ﷺ کو تسلی ہے کہ اگر یہ آپ کے پیغام ہدایت کو قبول نہیں کرتے اور اکثر سرکشی اختیار کرتے ہیں تو آپ پریشان نہ ہوں، ان کا بھی وہی انجام ہوگا جو ان سے پہلے حق سے منہ موڑنے والوں کا ہوا تھا۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ فَمَا كَانُوْا لِیُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ؕ كَذٰلِكَ نَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِ الْمُعْتَدِیْنَ ۝

"پھر ہم نے بھیجے نوح (علیہ السلام) کے بعد اور رسول ان کی قوموں کی طرف پس وہ لائے ان کے پاس روشن دلیلیں تو وہ ایسے نہ تھے کہ ایمان لاتے اس پر جسے وہ جھٹلا چکے تھے ۱؎ یونہی ہم مہر لگادیتے ہیں سرکشوں کے دلوں پر ۲؎ "

۱؎ پھر ہم نے نوح علیہ السلام کے بعد مختلف انبیاء کرام مختلف قوموں کی طرف تبلیغ حق کے لیے بھیجے تو وہ رسول اپنی اپنی قوم کے پاس روشن دلائل لے کر آئے مگر وہ قومیں ایسی نہ تھیں کہ وہ ایمان لاتیں اس پر جسے رسولوں کی آمد سے پہلے نوح علیہ السلام کی قوم جھٹلا چکی تھی۔

۲؎ جس طرح پیہم نافرمانی، مسلسل اعراض کی وجہ سے ہم نے نوح علیہ السلام اور ان کے بعد کے رسولوں کی قوموں کے دلوں پر مہر لگا دی تھی۔ بالکل اسی طرح ہم نے آپ کی امت کے غرور ونخوت کے پیکروں کو رسوا کرنے کے لیے ان کے دلوں پر مہر لگادی ہے کیونکہ انہوں نے بھی گمراہی اور خواہش نفس میں منہمک ہونے میں حد کر دی ہے۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى وَ هٰرُوْنَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَاۡئِهٖ بِاٰیٰتِنَا فَاسْتَكْبَرُوْا وَ كَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِیْنَ ۝

"پھر ہم نے بھیجا ان رسولوں کے بعد موسیٰ اور ہارون (علیہما السلام) کو فرعون اور اس کے درباریوں کی طرف اپنی نشانیوں کے ساتھ تو فرعونیوں نے غرور وتکبر کیا ۱؎ اور وہ مجرم لوگ تھے ۲؎ "

۱؎ ملاء کا ذکر فرمایا یہ لفظ ان کے تکبر ونخوت کے بیان کے لیے بطور تمہید ہے۔ ان غرور ونخوت کے پیکروں نے موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کی پیروی اور اتباع سے انکار کیا۔

ک وہ جرم کرنے میں حد سے تجاوز کرنے والے تھے۔ اسی وجہ سے تو انہوں نے پیغام الٰہی کی اہانت کی اور اس کے رد کرنے کی جسارت کی۔

فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْۤا اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِیْنٌ ﴿۷۶﴾

"پھر جب آیا ان کے پاس حق ہماری طرف سے تو انہوں نے کہہ دیا کہ یقیناً یہ کھلا جادو ہے ۱؎"

۱؎ جب ہماری طرف سے فرعون اور اس کی قوم کے پاس دین حق پہنچ گیا تو انہوں نے شکوک وشبہات کو دور کرنے والے معجزات اور گمراہی کے گھپ اندھیروں میں اجالا کرنے والے دلائل کی وجہ سے حق کی حقیقت کو جان لیا۔ مگر وہ سرکشی اور تمرد کی بناء پر کہنے لگے یہ معجزات جو موسیٰ علیہ السلام دکھا رہے ہیں شعبدہ بازی اور کھلا جادو ہے۔

قَالَ مُوْسٰۤى اَتَقُوْلُوْنَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَكُمْ ؕ اَسِحْرٌ هٰذَا ؕ وَ لَا یُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ ﴿۷۷﴾

"موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا (عقل کے اندھو) کیا تم کہتے ہو (ایسی بات) حق کے متعلق ۱؎ جب وہ تمہارے پاس آیا (سوچو!) کیا یہ جادو ہے ۲؎ اور نہیں کامیاب ہوتے جادوگر ۳؎"

۱؎ موسیٰ علیہ السلام نے ان کی بیہودہ اور بے تکی بات پر اظہار تعجب اور انکار کرتے ہوئے کہا ارے نادانو تم اس چیز کو جادو کہتے ہو جو اللہ تعالیٰ کی جناب سے محقق اور ثابت ہے، تمہیں کچھ تو شرم آنی چاہیے کتنے کودن ہو!

۲؎ وہ حق ان کے پاس آیا (تو انہوں نے اسے جادو کہا) سحر ایسی ملمع سازی ہوتی ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔ ماقبل کلام کے مدلول کی وجہ سے یہاں مقولہ حذف کیا گیا ہے۔ اسحر هذا کو مقولہ بنانا جائز نہیں ہے۔ اسحر هذا یہ مستقل کلام ہے کیونکہ انہوں نے قول پر بات کو ختم کر دیا تھا۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ استفہام یہاں تقریر اور ثبوت کے لیے ہو تو پھر مقول بن سکتا ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ اتقولون للحق کا معنی یہ ہو کہ کیا تم اس کو حق خیال کرتے ہو۔ یہ عربوں کے اس قول سے مشتق ہے فلان یخاف القالة پس مفعول کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی ہے جیسے اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں مفعول محذوف ہے۔ سَیَعْنَاقَتْیْ یَّذَّ کَّرُهُمْ۔

۳؎ جادوگر کامیاب نہیں ہوتے۔ یہ موسیٰ علیہ السلام کی کلام کا حصہ ہے انہوں نے فرمایا یہ جادو نہیں ہے، اگر یہ جادو ہوتا تو میں ناکام و نامراد ہو جاتا اور تمہارے جادوگروں کا طلسم اس کے سامنے اتنا بے وقت نہ ہو جاتا ہے۔ اور جادوگر جادوگر پر جادو نہیں کر سکتا' تمہارے جادوگروں کا اس کے سامنے سر تسلیم ختم کرنا اس کی حقانیت کی دلیل ہے۔ ذرا سوچو تو کیا یہ جادو ہو سکتا ہے؟ یا یہ جملہ فرعونیوں کی کلام سے ہے کہ انہوں نے کہا یہ جادو ہے، گویا وہ کہنے لگے اے موسیٰ تم اس جادو کے ذریعے بادشاہی حاصل کرنے کی کامیابی تلاش کرتے ہو اور جادوگر کبھی اپنے مشن میں سرخرو نہیں ہوتے (تمہارا یہ خواب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ادھورا ہی رہے گا)

قَالُوْۤا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَیْهِ اٰبَآءَنَا وَ تَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِیَآءُ فِی الْاَرْضِ ؕ وَ مَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِیْنَ ﴿۷۸﴾

"کہنے لگے کیا تم اس لیے آئے ہو ہمارے پاس تاکہ ہٹا دو اس (دین) سے جس پر ہم نے پایا اپنے باپ دادا کو ۱؎ اور ہو جائے صرف تم دونوں کے لیے بڑائی سرزمین (مصر) میں ۲؎ اور ہم لوگ تو تم کو نہیں مانیں گے ۳؎"

۱؎ یعنی فرعون اور اس کے درباریوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا اے موسیٰ کیا تم اس لیے ہمارے پاس آئے کہ تم ہمیں برگشتہ کر دو

[illegible] کو ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو اس پر پایا ہے۔

۲۔ دکنوں کو ابوبکر نے یاء کے ساتھ اور باقی قراء نے تاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی تم یہ چاہتے ہو کہ اس مصر کی سرزمین میں تم دونوں بھائی حکومت کرو۔ الکبریاء سے تعبیر کا مقصد یہ ہے کہ عام طور پر بادشاہ کبر اور نخوت سے متصف ہوتے ہیں اور اپنی رعایا کی اطاعت کی وجہ سے لوگوں پر فخر کرتے ہیں۔

۳۔ جو تمہارا دعویٰ ہے ہم اس کی کبھی تصدیق نہ کریں گے۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ائْتُونِي بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيمٍ ﴿۷۹﴾

"فرعون نے حکم دیا (فوراً) لے آؤ میرے پاس ہر ماہر جادوگر ۱۔"

۱۔ حمزہ اور کسائی نے سحار پڑھا ہے۔ علیم کا معنی حاذق اور ماہر ہے۔

فَلَمَّا جَاءَ السَّحَرَةُ قَالَ لَهُم مُّوسَىٰ أَلْقُوا مَا أَنتُم مُّلْقُونَ ﴿۸۰﴾

"پھر جب آگئے جادوگر تو کہا انہیں موسیٰ (علیہ السلام) نے ڈالو (میدان میں) جو تم ڈالنے والے ہو۔"

فَلَمَّا أَلْقَوْا قَالَ مُوسَىٰ مَا جِئْتُم بِهِ السِّحْرُ ۱ إِنَّ اللَّهَ سَيُبْطِلُهُ ۲ إِنَّ اللَّهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِينَ ﴿۸۱﴾

"پھر جب ڈال دیا انہوں نے تو موسیٰ نے فرمایا یہ جو تم لائے ہو یہ جادو ہے ۱۔ یقیناً اللہ تعالیٰ ملیامیٹ کر دیگا ۲۔ اسے بیشک اللہ تعالیٰ نہیں سنوارتا شریروں کے کام کو۔ ۳"

۱۔ ابوعمرو اور ابوجعفر نے آلسِّحْرُ یعنی مد کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس بناء پر کہ ما استفہامیہ مبتدا ہے(1) اور جئتم بہ اس کی خبر ہے اور آلسحر مبتدا محذوف کی خبر ہے یا یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے۔ پھر جملہ ما جئتم بہ کا بدل ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہے أَهُوَ السِّحْرُ أَوِ السِّحْرُ هُوَ۔ جمہور علماء نے خبر کی بناء پر بغیر مد کے پڑھا ہے۔ یعنی اَلَّذِيْ جِئْتُمْ بِهِ السِّحْرُ یعنی موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تم اللہ کی آیات بینات کو جادو کہتے ہو۔ وہ جادو نہیں جادو تو یہ ہے جو تم نے پیش کیا ہے۔ ابن مسعود کی قرأت جمہور کی قرأت کی تائید کرتی ہے۔ مَا جِئْتُمْ بِهِ سِحْرٌ

۲۔ جادو باطل ہے، اللہ تعالیٰ اس کو نیست و نابود کر دے گا۔ یا اس کا بطلان ابھی ظاہر کر دے گا۔

۳۔ اللہ تعالیٰ شریر لوگوں کے کام کو ثبات اور تقویت نہیں بخشتا۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ سحر افساد اور ملمع سازی ہے، اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

وَيُحِقُّ اللَّهُ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُونَ ﴿۸۲﴾

"اور اللہ تعالیٰ حق کو حق کر دکھاتا ہے اپنے ارشادات سے اور خواہ ناپسندی کریں (اسے) مجرم ۱۔"

۱۔ اور اللہ تعالیٰ تقویت دیتا ہے اور ثابت کرتا ہے حق کو اپنی آیات کے ذریعے، اگرچہ مجرم حق کی سربلندی کو ناپسندی کرتے رہیں۔

فَمَا آمَنَ لِمُوسَىٰ إِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّن قَوْمِهِ عَلَىٰ خَوْفٍ مِّن فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِمْ أَن

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 147 (الفکر)

يَّفْتِنَهُمْ ۭ وَاِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِي الْاَرْضِ ۚ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۸۳﴾

''پس نہ ایمان لائے موسیٰ پر بجز ان کی قوم کی اولاد کے [1] (وہ بھی) ڈرتے ہوئے فرعون سے اور اپنے سرداروں سے [2] کہ کہیں وہ انہیں بہکا نہ دے [3] اور واقعی فرعون بڑا سرکش (بادشاہ) تھا ملک میں اور واقعی وہ حد سے بڑھنے والوں میں سے تھا [4] ''

[1] یعنی موسیٰ علیہ السلام کے معجزات اور آیات پیش کرنے اور بھری محفل میں شعبدہ بازوں کے شعبدہ کو آنکھ جھپکنے میں نیست و نابود کرنے کے باوجود بھی قوم نے تصدیق نہ کی مگر چند نوجوانوں نے جو آپ کی قوم سے تھے۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ ضمیر کا مرجع موسیٰ علیہ السلام ہیں، یعنی موسیٰ علیہ السلام پر بنی اسرائیل کے وہ لوگ ایمان لائے جو مصر میں آپ کے ساتھ تھے اور پھر آپ کے ساتھ مصر سے نکلے بھی تھے۔ مجاہد فرماتے ہیں یہ ان لوگوں کی اولاد تھی جن کی طرف موسیٰ علیہ السلام کو مبعوث کیا گیا تھا، ان کے آباء ہلاک ہو چکے تھے اور اولاد باقی تھی۔ اسی وجہ سے انہیں ذریت کہا گیا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ وہ لوگ تھے جو فرعون کے قتل سے بچ گئے تھے۔ جب فرعون نے بنی اسرائیل کے بیٹوں کو قتل کرنے کا حکم دیا، بنی اسرائیل کی عورتیں بچے جنتیں تو وہ کسی قبطیہ عورت کو ہبہ کر دیتیں کہ کہیں فرعون کے وظیفہ خوار اسے قتل نہ کر دیں۔ پس وہ قبطیوں میں پروان چڑھے اور جب موسیٰ علیہ السلام غالب آئے تو وہ ایمان لے آئے۔ بعض دوسرے علماء کا خیال ہے کہ ضمیر کا مرجع فرعون ہے۔ عطیہ نے ابن عباس سے یہی روایت کیا ہے ایمان لانے والے فرعون کی قوم کے لوگ تھے جو تعداد میں انتہائی قلیل تھے۔ فرعون کی بیوی' مومن' فرعون کا خازن اس خازن کی بیوی اور فرعون کو کنگھی کرنے والی خادمہ۔ ابن جریر نے ابن عباس سے یہ قول نقل کیا ہے۔ حضرت ابن عباس سے ایک اور روایت بھی ہے کہ یہ ایمان لانے والے فرعون کے قبیلہ سے ستر قبطی تھے جن کی مائیں بنی اسرائیل سے تھیں۔ یہ اپنی ماں اور خالوؤں کی پیروی کرتے تھے۔ فراء نے کہا ہے کہ انہیں ذریت اس لیے کہا گیا ہے کہ ان کے باپ قبطی تھے اور مائیں بنی اسرائیل سے تھیں، جس طرح اہل فرس کی اولاد کو ذریت کہا جاتا ہے جنہوں نے بیٹوں کو یمن میں ڈال دیا تھا۔ کیونکہ ان کی مائیں دوسری قوم سے تھیں (1)۔

[2] یعنی وہ ایمان تو لائے مگر فرعونیوں سے ڈرتے ہوئے۔ ملاتھم میں ھم ضمیر کا مرجع فرعون ہے، اگرچہ وہ مفرد ہے مگر بڑے لوگوں کے لیے جمع کی ضمیر کا استعمال معروف ہے۔ اس لیے اس کے لیے جمع کی ضمیر ذکر کی گئی ہے۔ یا فرعون سے مراد اس کی آل اور اس کا قبیلہ ہے جیسے کہا جاتا ہے ربیعہ اور مضر۔ یہ دونوں علیحدہ علیحدہ ایک شخص کا نام ہیں مگر مراد قبیلہ ہوتا ہے۔ معنی یہ ہے کہ وہ ایمان لائے مگر ال فرعون اور اس کے سرداروں سے ڈرتے ہوئے۔ یا ضمیر ذریت کے لیے یا قوم کے لیے ہے۔

[3] یعنی کہیں فرعون انہیں عذاب نہ دے۔ یہ فرعون سے بدل ہے یا خوف کا مفعول ہے۔ یہاں صیغہ مفرد ذکر کیا گیا ہے اس بات پر دلالت کرنے کے لیے کہ فرعون کے درباریوں کا خوف بھی فرعون کے سبب سے تھا۔

[4] فرعون مصر کی زمین پر ایک جابر اور متکبر بادشاہ تھا، حد سے تجاوز کرنے والوں میں سے تھا حتیٰ کہ اس نے محتاج مخلوق ہوتے ہوئے اپنے رب ہونے کا دعویٰ کر دیا تھا اور انبیاء کی اولاد کو غلام بنا لیا تھا۔

وَقَالَ مُوْسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ﴿۸۴﴾

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 174 (الفکر)

''اور موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا اے میری قوم اگر تم ایمان لائے ہو اللہ تعالیٰ پر تو اسی پر بھروسہ کرو اگر تم سچے مسلمان ہو۔ ۱ ''

۱ ۔ جب موسیٰ علیہ السلام نے ایمان لانے والے جانبازوں میں فرعون کی دہشت اور خوف کو محسوس کیا تو آپ نے فرمایا۔ اے میری قوم اگر تم اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے ہو تو حالات کی سنگینی سے بے خوف ہو کر اور فرعونیوں کے جبر و استبداد سے بے پروا ہو کر صرف اور صرف اپنے پروردگار کی تائید و نصرت پر بھروسہ کرو اگر تم سچے مسلمان ہو۔ اس شرط کی جزاء محذوف ہے جس پر سیاق کلام دال ہے، یعنی اگر تم قضاء الٰہی کے سامنے واقعی سرِ تسلیم خم کر چکے ہو اور اس کے علم توحید کو بلند کرنے کے عزم میں مخلص ہو تو اس کی ذات پر اعتماد کرو۔ یہاں حکم کو دو شرطوں کے ساتھ معلق نہیں کیا گیا بلکہ توکل کا وجوب ایمان کے ساتھ معلق ہے اور توکل کا حصول اسلام کے ساتھ معلق ہے۔ کیونکہ ایمان توکل کا متقضی ہے اور توکل علی اللہ کی صفت پیدا ہی نہیں ہو سکتی جب تک انسان اللہ کے لیے اپنے نفس کی ہر خواہش کو مٹا نہ دے۔ مطلب یہ کہ وہ اپنے نفوس کو خالصۃً اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع کر دیں وہاں خواہش نفس اور شیطان کے وساوس کا گزر تک نہ ہو۔ کیونکہ توکل تذبذب کی حالت میں ممکن ہی نہیں ہے۔ یہ صوفیاء کرام کے مقامات میں ایک بلند مقام ہے۔

فَقَالُوْا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۚ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۵﴾

''انہوں نے عرض کی اللہ پر ہی ہم نے بھروسہ کیا ہے۔ اے ہمارے رب! نہ بنا ہمیں فتنہ (کا موجب) ظالم قوم کے لیے ۱ ''

۱ ۔ وہ خلوص کے بندے اپنے خلوص کا اظہار کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں ہمیں اپنے نبی کا بتایا ہوا سبق یاد ہے، ہم نے اپنے رب پر بھروسہ کیا ہے۔ پھر اپنے پروردگار سے التجاء کرتے ہیں اے ہمارے پروردگار ہم کو آزمائش اور تکلیف کا تختہ مشق نہ بنا ظالم قوم کے لیے، یعنی اے ذروں کو اپنے قدرت سے گوہر کرنے والے ان ظالموں کو ہم پر مسلط نہ فرما کہ یہ ہمیں تکالیف پہنچانے میں حد سے گزر جائیں اور ہمارے پیمانہ صبر کو آزمانے لگیں۔ یا یہ معنی ہے کہ اے ہمارے مولا ان کی سرکشی اور کفر کا ہمیں سبب نہ بنا۔ اس طرح کہ تو ہمیں خود کسی تکلیف میں مبتلا کرے یا قوم فرعون کے ہاتھوں ہمیں تو ظلم و جبر سے دوچار کرے تو یہ کہنے لگیں کہ اگر یہ موسیٰ کی جماعت حق پر ہوتی تو تائید الٰہی ان کو ان برے حالات سے بچا لیتی اور یہ گمان کرنے لگ جائیں کہ ہم ہی ان سے بہتر ہیں، ورنہ اللہ کی غیرت ان کی یہ درگت بنتی گوارا نہ کرتی۔

وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۶﴾

''اور نجات دے ہمیں اپنی رحمت سے کافروں (کے ظلم و ستم) سے ۱ ''

۱ ۔ اے اللہ ہمیں ان کے مکر و فریب سے اور ان کے اعمال کی نحوست سے ہمیں اپنی رحمت سے بچا لے۔ اس دعا میں توکل کو دعا پر مقدم کرنے میں ایک خاص نکتہ ہے، وہ یہ کہ داعی کو پہلے توکل علی اللہ کرنا چاہیے تاکہ اس کی دعا مستجاب ہو بلکہ میں تو کہتا ہوں توکل صوفی کی صفات لازمہ میں سے ہے اور دعا اس کی صفات عارضہ سے ہے۔

وَاَوْحَيْنَاۤ اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۷﴾

''اور ہم نے وحی بھیجی موسیٰ اور ان کے بھائی کی طرف کہ مہیا کرو اپنی قوم کے لیے مصر میں چند گھر

کو قبلہ رخ [2] اور قائم کرو نماز [3] اور (اے موسیٰ) خوشخبری دو مومنوں کو [4]"

[1] ہم نے وحی بھیجی موسیٰ علیہ السلام اور ان کے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کی طرف کہ تم دونوں رہائش اور عبادت کے لیے مخصوص گھر بناؤ اپنی قوم کے لیے مصر میں۔ امام بغوی فرماتے ہیں اکثر مفسرین کا خیال یہ ہے کہ بنو اسرائیل اپنے کنیسوں اور بیعوں (عباد گاہوں) میں عبادت کرتے تھے اور وہ عبادت گاہیں معروف اور ظاہر تھیں۔ جب موسیٰ علیہ السلام نے اعلان نبوت فرمایا تو فرعون نے ان عبادت گاہوں کو مسمار کرنے کا حکم دے دیا اور بنو اسرائیل کو ان میں عبادت کرنے سے روک دیا۔ اللہ نے حکم دیا کہ تم اپنے گھروں میں مساجد بنالو اور تمہیں فرعون کا خوف ہے تو ان گھروں میں بنائی گئی مساجد میں عبادت کرلیا کرو۔ یہ قول حضرت ابراہیم نخعی اور عکرمہ نے حضرت ابن عباس سے روایت فرمایا ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں موسیٰ علیہ السلام اور آپ پر ایمان لانے والے ان عبادت گاہوں میں فرعونیوں کا خوف محسوس کرتے تھے۔ اس لیے انہیں گھروں میں مساجد بنانے کا حکم دیا گیا جس کے رخ قبلہ کی جانب ہوں۔ اور ان میں خفیہ طور پر نماز پڑھنے کی اجازت مرحمت فرمائی گئی(1)۔

[2] تم دونوں اور تمہاری قوم بناؤ اپنے گھر اس طرح کہ ان کا رخ کعبہ کی جانب ہو۔ ابن جریج حضرت ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ کعبہ موسیٰ علیہ السلام اور آپ کے صحابہ کا قبلہ تھا(2)۔

[3] ان کو ان گھر میں بنائی گئی مساجد میں ابتداء نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا تاکہ کہیں فرعونی ان پر غلبہ پا کر انہیں اذیت نہ پہنچائیں۔

[4] اے موسیٰ کلیم مومنین کو یہ مژدہ جانفزا سنادو کہ تمہارا دشمن نیست و نابود ہوگا اور تمہیں دنیا کے اندر مصر کی زمین میں ان کا جانشین بنایا جائے گا اور آخرت میں جنت کی ساری نعمتیں اور ساری بہاریں تمہارے لیے وقف ہیں۔ (قدم بڑھا کر تو دیکھو)۔ ابتداء میں ضمیر تثنیہ ذکر کی گئی کیونکہ قوم کے لیے عبادت گاہیں بنانے کے لیے ان دو بھائیوں نے قوم کے افراد کو مشورہ کے لیے جمع کیا تھا۔ پھر جمع ضمیر ذکر کی گئی کیونکہ مساجد کا بنانا اور نماز کا قائم کرنا ہر فرد پر واجب تھا۔ پھر ضمیر مفرد ذکر فرمائی کیونکہ بشارت دینا صاحب شریعت کا ہی وظیفہ ہوتا ہے۔

امام بغوی فرماتے ہیں بشر المومنین یہ نبی کریم ﷺ کو خطاب ہے(3)۔

وَقَالَ مُوسٰى رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّ اَمْوَالًا فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ ۚ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿۸۸﴾

"اور عرض کی موسیٰ نے اے ہمارے پروردگار! تو نے بخشا ہے فرعون اور اس کے سرداروں کو سامان آرائش [1] اور مال و دولت دنیوی زندگی میں اے ہمارے مولیٰ کیا اس لیے کہ وہ گمراہ کرتے پھریں (لوگوں کو) تیری راہ سے [2] اے ہمارے رب! برباد کر دے ان کے مالوں کو [3] اور سخت کر دے ان کے دلوں کو [4] تاکہ وہ نہ ایمان لائیں جب تک نہ دیکھ لیں دردناک عذاب کو [5]"

۱؎ زینت ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس سے انسان اپنی آرائش وزیبائش کرتا ہے۔ مثلاً زرق برق لباس سیم وزر کے زیورات نرم وملائم بستر، گھر کا سازوسامان، سواریاں، خدام جاہ وحشمت وغیرہ۔

۲؎ لیضلوا پر لام عاقبت کے لیے ہے اور آتیت کے متعلق ہے یعنی تو نے انہیں آرائش وزیبائش کی ہر نعمت سے نوازا مال ودولت کے انبار عطا کیے حتی کہ ان کا انجام گمراہی اور سرکشی ہو گیا۔ جیسا کہ فَالْتَقَطَهٗٓ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا میں لِيَكُوْنَ پر لام عاقبت کا ہے کہ آل فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کو اٹھایا انجام کار وہ ان کا دشمن اور باعث رنج والم بنے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ لام لام کی ہے، یعنی تو نے انہیں اس لیے یہ سب کچھ عطا فرمایا ہے تاکہ آہستہ آہستہ یہ گمراہی پر ثابت قدم ہو جائیں یا چونکہ انہوں نے اس مال واسباب کو گمراہی کا سبب بنا دیا تھا اس لیے گویا کہ انہیں یہ عطا ہی اس لیے کیا گیا تھا تاکہ وہ گمراہ کرتے رہیں۔ ربنا کا کلمہ پہلے ربنا کے تکرار کے لیے اور تضرع وزاری میں اصرار کی تاکید کے لیے ہے۔ الشیخ ابو منصور الماتریدی فرماتے ہیں جب معلوم ہو چکا تھا کہ وہ اللہ کے راستہ سے گمراہ کریں گے تو انہیں وہ سب کچھ عطا فرمایا تاکہ وہ گمراہ کرتے رہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی طرح ہے: اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا ہم انہیں مہلت دیتے ہیں تاکہ گناہ میں بڑھتے جائیں۔

یہ آیت کریمہ معتزلہ پر حجت ہے کیونکہ وہ کہتے ہیں جو چیز انسان کیلئے بہتر ہے اس کا عطا کرنا اللہ پر واجب ہے اور اللہ تعالیٰ کا مخلوق پر لطف ومہربانی کرنا بھی واجب ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ امر کے صیغہ کے ساتھ ان کیلئے بددعا ہے(1)۔

۳؎ اے ہمارے پروردگار ان کے مال ودولت کو ختم کر دے۔ یہ مجاہد کا قول ہے اور اکثر اہل تفسیر فرماتے ہیں اطمس کا مطلب ہے ان کی ہیئت کو مسخ کر دے اور ان کی حالت تبدیل کر دے۔ قتادہ فرماتے ہیں ان کے اموال، کھیتیاں، جواہر وموتی سب حمام کے تمام نقش شدہ پتھر بن گئے۔ اور حضرت عمر بن عبد العزیز نے ایک خریطہ منگوایا جس میں آل فرعون کی بقیہ اشیاء تھیں تو اس نے ان میں انڈا نکالا تو وہ بھی ٹوٹا ہوا، اخروٹ نکالا وہ بھی ٹوٹا ہوا تھا اور تھے بھی پتھر۔ السدی فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے اموال کو پتھروں کی شکل میں مسخ کر دیا تھا۔ اسی طرح ان کے کھجور اور پھلوں کے باغات کو آٹے اور دوسرے کھانوں کو پتھر بنا دیا تھا۔ اور موسیٰ علیہ السلام کی نشانیوں میں سے ایک یہ بھی نشانی تھی(2)۔

۴؎ ان کے دلوں کو سخت فرما دے اور ان پر مہر لگا دے تاکہ ان میں نہ نرمی پیدا ہو اور نہ ایمان کو قبول کرنے کے لیے ان میں انشراح ہو۔ موسیٰ علیہ السلام نے جب دیکھا میری نصیحتوں کا ان پر کوئی اثر نہیں ہو رہا بلکہ یہ سرکش سے سرکش ہوتے چلے جا رہے ہیں تو آپ نے مایوس ہو کر ان کے لئے بددعا فرمائی اور آپ کو بذریعہ وحی الٰہی معلوم ہو چکا تھا کہ یہ ایمان نہ لائیں گے۔ ان کے ایمان نہ لانے سے قبل ان کے لیے بددعا کرنا جائز نہ تھا کیونکہ آپ کا تو کام ان کو ایمان کی دعوت دینا تھا تو وہ ایمان نہ لانے کی دعا کیسے کر سکتے تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ جب آپ کو معلوم ہو چکا تھا کہ یہ ایمان نہیں لائیں گے تو پھر اس بددعا کا فائدہ کیا تھا۔ ہم کہیں گے شاید کہ اللہ کی رضا کے لئے اللہ کے دشمنوں سے بغض کا اظہار تھا یا اللہ تعالیٰ کے حکم کی پیروی میں آپ نے یہ بددعا فرمائی تھی۔ مثلاً تم بھی کہتے ہو ابلیس پر اللہ کی لعنت ہو حالانکہ یہ بات واضح ہے کہ وہ پہلے ہی ملعون ہے۔ حقیقت میں یہ اللہ تعالیٰ کے حکم اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا کی پیروی ہے۔ (بیشک شیطان تمہارا دشمن ہے تم بھی اسے دشمن سمجھو)۔

۵ یہ دعا کے جواب ہونے کی وجہ سے منصوب ہے یا لیضلوا پر معطوف ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور درمیانی کلام دعاء معترض ہے فراء کہتے ہیں یہ مجزوم ہے کیونکہ یہ نہی کے لفظ کے ساتھ بددعا ہے۔ گویا موسیٰ علیہ السلام یہ دعا فرما رہے ہیں اللھم فلا یومنوا اے اللہ یہ ایمان نہ لائیں۔ یہاں تک کہ مرنے کے بعد عذاب کو دیکھ لیں۔

قَالَ قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِيْمَا وَلَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِيْلَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۸۹﴾

”اللہ تعالیٰ نے فرمایا قبول کر لی گئی تمہاری دعا[1] بس تم ثابت قدم رہو[2] اور ہرگز نہ چلنا اس طریقہ پر جو جاہلوں کا طریقہ ہے[3]“

[1] اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو فرمایا تمہاری دعا قبول کر لی گئی ہے۔ دعا کی نسبت دونوں کی طرف کی گئی ہے حالانکہ دعا صرف موسیٰ علیہ السلام نے مانگی تھی لیکن ہارون علیہ السلام نے اس دعا پر آمین کہی تھی اور آمین کہنا بھی دعا ہی ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں بعض قصص میں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی دعا چالیس روز بعد قبول ہوئی (1)۔

[2] تم دونوں پیغام الٰہی کے فریضہ کو نبھاتے رہنا یہاں تک کہ ان نافرمانوں پر میرا عذاب آ جائے۔

[3] ولا تتبعان صیغہ تثنیہ بھی ہا نون ثقیلہ ہے اور محل جزم میں ہے۔ ابن ذکوان نے اسے نون خفیفہ کے ساتھ اور التقاء ساکنین کی وجہ سے نون کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی ان جاہلوں کے راستہ پر نہ چلنا جو دعا کی قبولیت میں جلد بازی کرتے ہیں اور انہیں اللہ کے وعدوں پر یقین محکم اور اطمینان نہیں ہوتا۔

وَجٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُوْدُهٗ بَغْيًا وَّعَدْوًا ۭ حَتّٰٓي اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ ۙ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِيْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۹۰﴾

”اور ہم پار لے گئے بنی اسرائیل کو سمندر سے پھر پیچھا کیا ان کا فرعون اور اس کے لشکر نے سرکشی اور ظلم کرتے ہوئے[1] حتیٰ کہ جب وہ ڈوبنے لگا تو (بصد یاس) کہنے لگا میں ایمان لایا کہ کوئی سچا خدا نہیں بجز اس کے جس پر ایمان لائے تھے بنی اسرائیل اور (میں اعلان کرتا ہوں کہ) میں مسلمانوں میں سے ہوں[2]“

[1] ہم بنی اسرائیل کو سمندر کے پاس کنارے پر لے گئے۔ یہاں فاعل بمعنی فعل ہے جیسے عاقب بمعنی عقب استعمال ہوتا ہے، عاقب الامیر اللص (بادشاہ نے چور کو سزا دی)۔ سمندر موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کے لیے راستہ چھوڑ چکا تھا۔ تو فرعون اور اس کے لشکر نے ان کا پیچھا کیا۔ جب کوئی شخص دوسرے کی جگہ پا لے اور اسے مل جائے تو عرب اتبعہ اور تبعہ بولتے ہیں اور جب کوئی کسی کے پیچھے پیچھے چلے اور اس کی اقتدا کرے تو اتبعہ (تشدید کے ساتھ) بولتے ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں دونوں کا معنی ایک ہے۔ بغیا وعدوا دونوں مصدر اسم فاعل کے معنی میں مستعمل ہوئے ہیں۔ یا یہ مصدر بطور علت ذکر کیے گئے ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں بغی قول میں اور عدوا فعل میں ہوتا ہے۔ جب فرعون اپنے لشکر سمیت سمندر کے کنارے پہنچا تو اندر داخل ہونے سے گھبرا گیا مگر جبریل امین ایک گھوڑی پر سوار ہو کر اس کے گھوڑے کے پاس سے گزرے تو اس کا گھوڑا مادہ کی بو کے پیچھے سمندر میں گھس گیا پھر دوسرے لشکریوں کے

(1) تفسیر بغوی، جلد 2 صفحہ 178 (الفکر)

یہ کلمات اس نے کہے تو حضرت جبریل علیہ السلام نے اس کے منہ میں سمندری کیچڑ دبا دی۔ پس توبہ کی قبولیت سے پہلے ہی مر گیا۔ وہ بد بخت قبولیت کے وقت تو ایمان لانے سے رکا رہا لیکن جب قبولیت کی گھڑیاں ختم ہو گئیں تو اس وقت ایمان کے لانے میں مبالغہ کرنے لگا۔ (یعنی تین مرتبہ اس وحدہ لاشریک کی وحدانیت کا اعتراف کیا مگر اب پچھتائے کیا ہووت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت)

آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَیْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ ۝۹۱

"کیا اب؟ اور تو نافرمانی کرتا رہا اس سے پہلے اور تو فتنہ و فساد برپا کرنے والوں سے تھا۔"

لے کیا اب تو ایمان کا اعلان کرتا ہے جو اس ظاہری زندگی سے مایوس ہو چکا ہے اور تجھے اس کے بچانے کا بھی اختیار نہیں ہے، جبکہ پوری زندگی نافرمانی اور سرکشی میں گزار دی، دنیا میں خود بھی گمراہ رہا اور دوسروں کو بھی ایمان لانے سے بھٹکاتا رہا۔ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت ابن عباس سے مروی ہے نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ نے فرعون کو غرق کیا تو اس نے کہا اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْۤ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْۤا اِسْرَآءِیْلَ جبریل نے کہا اے محمد ﷺ اگر آپ مجھے دیکھتے کہ میں سمندر میں اسے پکڑ کر غوطے دے رہا تھا کہ کہیں رحمت الٰہی اس کو پہنچ ہی نہ جائے (1)۔

فائدہ: جلال الدین الدوانی کا خیال ہے کہ فرعون مسلمان ہو کر مرا تھا کیونکہ زندگی میں ہی توحید کا اقرار کر لیا تھا اور الشیخ الاجل محی الدین ابن عربی قدس اللہ سرہ نے بھی اسی قول کی اتباع کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں فرعون شرک کی غلاظت سے پاک ہو کر مرا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ شیخ محی الدین ابن عربی کا قول ظاہر پر محمول نہیں ہے۔ بلکہ یہ ان کے کلمات سکر یہ سے ہے جو شریعت مطہرہ سے مطابقت نہیں رکھتے اور ان کا یہ قول اجماع کے خلاف ہے اور صحاح کی احادیث کے مخالف ہے۔ الدوانی فرماتے ہیں قرآن میں جہاں بھی فرعونیوں پر آگ کی وعید کا ذکر آیا ہے وہ فرعون کے درباریوں اور حواریوں کے حق میں ہے۔ فرعون کا ذکر اس وعید میں نہیں ہے مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اَدْخِلُوْۤا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ۝ اور فرمایا فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ ؕ وَ بِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ ۝ ایک اور جگہ فرمایا وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ ۝ مگر فرعون اس کو اس کے کفر پر عذاب نہ ہو گا بلکہ اسے سزا صرف حقوق العباد کی وجہ سے ہو گی جو بندے کے معاف کرنے سے معاف ہوتے ہیں۔ میں کہتا ہوں یہ قول مردود ہے، اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد فَحَشَرَ فَنَادٰی ۝ فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰی ۝ فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَ الْاُوْلٰی ۝

اور کہا میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں۔ آخرکار جکڑ لیا اسے اللہ نے آخرت اور دنیا کے (دہرے) عذاب میں۔

یہ ارشاد آخر میں اسے کفر پر سزا دینے میں صریح ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے دعا حکایت فرمائی ہے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 179 (الفکر)

رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّاَمْوَالًا الى قوله اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا ؕ اسی طرح ارشاد ہے قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا یہ بھی صریح ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے کفر پر مرنے کی بددعا کی اور آپ کی فرعون کے متعلق دعا قبول ہوئی تھی۔ پس فرعون کی کفر پر موت کا انکار اس آیت کا انکار ہے۔

فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً ؕ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ ﴿۹۲﴾

”سو آج ہم بچالیں گے [1] تیرے جسم کو [2] (سمندر کی تہ موجوں سے) تاکہ تو ہو جائے اپنے پچھلوں کے لیے (عبرت کی نشانی [3] اور حقیقت یہ ہے کہ اکثر لوگ ہماری نشانیوں سے غفلت برتنے والے ہیں [4]“

[1] پس آج ہم تیرے بدن کو زمین کی بلند جگہ پر پھینک دیں گے، یا یہ معنی ہے کہ ہم نے تیری قوم کو جس گہرائی میں غرق کیا ہے تجھے اس سے دور رکھیں گے اور تجھے مردہ مچھلی کی طرح سمندر کے اوپر تیرائیں گے۔ یعقوب نے نُنْجِيْكَ تخفیف کے ساتھ باب افعال کے ساتھ پڑھا ہے۔

[2] تیرے بدن کو جس میں روح نہ ہوگی یا تیرا کامل بدن بھی باقی رکھیں گے یا لباس سے برہنہ بدن باقی رکھیں گے یا تیری زرنگار زرہ سمیت تیرے بدن کو زندہ رکھیں گے۔ امام بغوی فرماتے ہیں جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو فرعون کی ہلاکت کی خبر دی، تو بنی اسرائیل کہنے لگے فرعون نہیں مرا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی صداقت کے لیے سمندر کو حکم دیا کہ فرعون کے جسم کو مردہ ساحل پر پھینک دے فرعون بیل کی شکل میں سرخ اور ٹھگنا تھا۔ بنو اسرائیل نے فرعون کو اپنی زرہ سمیت دیکھا تو تب انہیں یقین آیا [1]۔

[3] تو اپنے پچھلوں کے لیے نشان عبرت بن جائے۔ یا یہ مطلب ہے کہ تیرا بدن توحید کے طریقہ پر دلالت کرنے والی نشانی بن جائے اور بشر کی عاجزی کا اظہار بن جائے کہ انسان اگر چہ مملکت بادشاہی کیوں نہ ہو وہ اللہ تعالیٰ کے فیصلوں کے سامنے کوئی وقعت نہیں رکھتا بنی اسرائیل یہ سمجھتے تھے کہ وہ ظالم و جابر فرعون کبھی نہیں مر سکتا اور موسیٰ علیہ السلام کے خبر دینے کے باوجود بھی شک میں مبتلا تھے کہ وہ مرا نہیں ہوگا حتیٰ کہ انہوں نے ساحل سمندر پر ایک راستہ پر مرا پڑا دیکھ لیا۔ یا یہ معنی ہے کہ تیرے بعد جو صدیوں لے کر آئیں اور تیرے انجام بد کو تیرا مشاہدہ کرنے والوں سے سنیں گے تو تیرا یہاں بےبسی کی حالت میں مرنا ان کے لیے باعث عبرت ہوگا اور تیری سرکشی کی سزا ان کو سرکشی سے باز رکھنے کا باعث بنے گی۔

[4] اور کفار کی اکثریت ہماری ان سبق آموز نشانیوں سے غافل ہیں اور ان میں غور و فکر اور عبرت کی نگاہ سے نہیں ڈالتے۔

وَلَقَدْ بَوَّاْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مُبَوَّاَ صِدْقٍ وَّرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْا حَتّٰى جَآءَهُمُ الْعِلْمُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۹۳﴾

”اور ہم نے عطا فرمایا بنی اسرائیل کو بہترین ٹھکانا [1] اور ہم نے انہیں پاکیزہ رزق بخشا [2] پس انہوں نے اختلاف نہ کیا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 179 (الفکر)

۳؎ حتیٰ کہ آ گیا ان کے پاس حقیقت کا علم ۴؎ (اے حبیب!) بیشک آپ کا رب فیصلہ فرمائے گا ان کے درمیان روز قیامت جن باتوں میں وہ جھگڑا کرتے تھے ۵؎ "

۱؎ ہم نے فرعون کو سمندر میں غرق کرنے کے بعد مصر میں عمدہ ٹھکانہ عطا فرمایا۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ اردن اور فلسطین میں جگہ عطا فرمائی تھی۔ یہ وہ مقدس زمین ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم اور آپ کی اولاد کو وارث بنایا تھا۔ ضحاک فرماتے ہیں یہ مصر اور شام کے علاقے تھے(۱)۔

۲؎ اور ہم نے انہیں پاکیزہ اور لذیذ کھانے عطا فرمائے۔

۳؎ حضور نبی کریم ﷺ کی آمد سے پہلے بنو اسرائیل تمام متفق تھے۔ محمد اللہ کے رسول ہو نگے تورات میں ان کی صفات بڑے واضح الفاظ میں موجود ہیں۔ وہ خود لوگوں کو آپ ﷺ کی آمد کی بشارتیں دیتے تھے اور کفار سے مقابلہ کے وقت آپ ﷺ کے وسیلہ جلیلہ سے بارگاہ الٰہی میں فتح کا سوال کرتے تھے۔

۴؎ یہاں تک کہ محمد ﷺ تشریف لائے۔ یہاں علم بمعنی معلوم ہے جیسے خلق بمعنی مخلوق استعمال ہوا ہے ھٰذَا خَلْقُ اللّٰهِ (یہ اللہ کی مخلوق ہے) یا یہ معنی ہے کہ جب ان پر یہ حقیقت اظہر من الشمس ہوگئی کہ جن صفات و نعوت کا ذکر تورات میں ہے وہ بدرجہ اتم آپ ﷺ میں موجود ہیں اور آپ ﷺ کے معجزات کا ظہور جو آپ کی صداقت کی کھلی دلیل تھے، ان کے دیکھنے کے بعد بھی انہوں نے آپ کے متعلق اختلاف کیا' ایک گروہ ان میں سے ایمان لایا اور ایک گروہ نے جان بوجھ کر بغض اور حسد کی وجہ سے آپ ﷺ کی نبوت و رسالت کا انکار کیا۔

۵؎ یعنی آپ کا رب قیامت کے دن مومنین کو نجات اور کفار کو ہلاک کر کے حق کے پرستاروں اور حق کے منکروں کے درمیان فیصلہ فرمائے گا۔

فَاِنْ كُنْتَ فِيْ شَكٍّ مِّمَّاۤ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ فَسْــَٔلِ الَّذِيْنَ يَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ لَقَدْ جَآءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۝

"اور (اے سننے والے) اگر تجھے کچھ شک ہو اس میں جو ہم نے (اپنے نبی کے ذریعہ) تیری طرف اتارا ۱؎ تو دریافت کر ان لوگوں سے جو پڑھتے ہیں کتاب تجھ سے پہلے ۲؎ بیشک آیا ہے تیرے پاس حق تیرے رب کی طرف سے ۳؎ پس ہرگز نہ ہو جانا شک کرنے والوں سے ۴؎ "

۱؎ اے انسان اگر تجھے یہ شک ہے قرآن کے نزول کے بارے میں اور ہمارے رسول محمد ﷺ کی زبان حق ترجمان کے ذریعے تمہیں پیغام ہدایت ملا ہے اس میں تمہیں کوئی شبہ ہے۔

۲؎ تو آپ پوچھئے ان لوگوں سے جو تجھ سے پہلے کتاب پڑھتے ہیں مثلاً عبداللہ بن سلام اور دوسرے معتبر علماء سے تو وہ تمہیں بتائیں گے کہ نبی کریم ﷺ کی آمد کا ذکر انجیل اور تورات میں بھی آیا ہے اور اس پر نازل ہونے والی کتاب کا بھی ذکر ہے۔ جو اصول و احکام میں سابقہ کتب سے کلیتہً مطابقت رکھتی ہے۔ یہ تفسیر حضرت ابن عباس اور حضرت مجاہد نے کی

کرنے والوں سے ہے کیونکہ حضور نبی کریم ﷺ کے زمانہ اقدس میں تین قسم کے لوگ تھے (1) مصدق (تصدیق کرنے والے) (2) مکذب (جھٹلانے والے) (3) مذبذب (نہ ادھر نہ ادھر)۔ اس آیت کریمہ میں تنبیہ ہے کہ جسے کسی دین کے مسئلہ پر خلش ہو تو فوراً اس کے حل کے لیے علماء صالحین سے رجوع کرنا چاہئے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ خطاب نبی کریم ﷺ سے بر سبیل فرض اور تقدیر ہے یا ثابت قدمی میں مزید ثبات کے لیے ہے اور اس کی دلیل حضور ﷺ کا ارشاد ہے جو عبدالرزاق اور ابن جریر نے حضرت قتادہ سے نقل کیا ہے کہ میں نہ شک کرتا ہوں اور نہ کسی سے سوال کرتا ہوں (1)۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ ظاہراً خطاب آپ ﷺ سے ہے مگر مراد امت ہے جیسا کہ عربوں کا اسلوب ہے کہ وہ خطاب ایک شخص کو کرتے ہیں اور مراد کوئی دوسرا ہوتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ایک اور جگہ ارشاد ہے یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اتَّقِ اللّٰهَ۔ یہاں خطاب تو آپ ﷺ کو ہے مگر مراد مومنین ہیں کیونکہ آگے جمع کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔ فرمایا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا۝ یہاں تعمل نہیں فرمایا۔ اسی طرح ارشاد فرمایا یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ یہاں بھی خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے مگر مراد امتی ہیں۔

فراء فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کو علم تھا کہ نبی کریم ﷺ کو اس قرآن کے بارے کوئی شک وشبہ نہیں ہے مگر یہ اسلوب کلام عربوں کی عادت کے مطابق اختیار کیا گیا ہے جیسے وہ اپنے غلام کو کہتے ہیں اگر تو میرا غلام ہے تو میری اطاعت کر۔ اسی طرح اپنے بیٹے کو کہتے ہیں اگر تو میرا بیٹا ہے تو اس طرح کر، تو ان کا یہ کلام کسی شک کی بناء پر نہیں ہوتا۔

۲؎ یعنی جو ہم نے نازل کیا ہے وہ حق ہے امر مستحق ہے۔ آیات واضحہ اور قطعی دلائل سے تیرے رب کے نزدیک ثابت ہے اور اس حیثیت سے ثابت ہے کہ شک وشبہ کا کوئی دخل نہیں ہے۔

۳؎ آپ جس یقین محکم پر فائز ہیں اس میں تزلزل اور لڑکھڑاہٹ نہیں ہونی چاہیے۔

وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ فَتَكُوْنَ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ۝۹۵

"اور ہرگز نہ ہونا ان لوگوں سے جنہوں نے جھٹلایا اللہ کی آیتوں کو ورنہ تو ہو جائے گا نقصان اٹھانے والوں سے۔ ۱؎"

۱؎ یہ خطاب بھی ماقبل کلام کی طرح یا تو شک کرنے والوں سے ہے۔ یا رسول کریم ﷺ سے ہے مگر مراد دوسرے لوگ ہیں یا حضور ﷺ کو خطاب بر تقدیر فرض ہے۔ یا قطعی طور پر تثبیت اور ہر قسم کی لچک سے محفوظ کرنے کے لیے ہے جیسے فرمایا فَلَا تَكُوْنَنَّ ظَهِیْرًا لِّلْكٰفِرِیْنَ (تو آپ ہرگز کافروں کے مددگار نہ بنیں)۔

اِنَّ الَّذِیْنَ حَقَّتْ عَلَیْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا یُؤْمِنُوْنَ۝۹۶

"بیشک وہ لوگ ثابت ہو چکی ہے جن پر آپ کے رب کی بات ۱؎ وہ ایمان نہیں لائیں گے ۲؎"

۱؎ یعنی جن لوگوں پر اللہ نے میثاق کے دن دوزخی ہونے کا فیصلہ فرما دیا وہ کبھی ایمان نہ لائیں گے کیونکہ قدرت کے فیصلے میں توڑ پھوڑ نہیں ہوتی وہ اٹل اور غیر متبدل ہوتے ہیں۔

امام مالک، ترمذی اور ابوداؤد نے مسلم بن یسار سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِیْۤ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ الایۃ (اے محبوب یاد کرو جب نکالا آپ کے رب نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی اولاد کو) کا مفہوم پوچھا گیا تو آپ

1۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 571 (العلمیہ)

ساتھ دوسری سی، پھر فرمایا یہ جنت کے لیے اور یہ دوزخ کے لیے ہیں اور مجھے کوئی پرواہ نہیں(2)۔

۲ انہیں ہزاروں معجزات دکھائے جائیں، دلائل و براہین کے انبار لگا دیں یہ کبھی ایمان نہ لائیں گے کیونکہ قدرت کے فیصلوں میں ردو بدل نہیں ہوا کرتا۔

وَلَوْ جَآءَتْهُمْ كُلُّ اٰيَةٍ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿۹۷﴾

"اگرچہ آ جائیں ان کے پاس ساری نشانیاں ۱ جب تک کہ وہ نہ دیکھ لیں دردناک عذاب ۲"

۱ اگر صدق وسچائی پر کوئی بھی آپ کے پاس دلیل آ جائے جو اقتضاءً ایمان کی قبولیت کی موجب بھی ہو پھر بھی وہ ایمان نہیں لائیں گے کیونکہ ایمان کا سبب اصلی تو اللہ تعالیٰ کے ارادہ اور مشیت کا تعلق ہے جب تک اس کی مشیت نہ ہو وہ کسی دلیل و معجزہ کو دیکھ کر ایمان نہ لائیں گے۔ یہ جملہ اور اس کا معطوف علیہ جو مقدر ہے لا یومنون کے فاعل سے حال ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہے لَا يُؤْمِنُوْنَ لَوْ لَمْ يَجِئْهُمْ وَلَا جَآءَتْهُمْ كُلُّ اٰيَةٍ۔ یعنی وہ کسی حال میں بھی ایمان نہیں لائیں گے۔ اس میں کلام محذوف ہے، جس پر موجود کلام دلیل ہے۔

۲ یہ اس وقت ایمان لائیں گے قبر میں یا دوزخ میں پہنچ کر یا جب سانس غرغرہ میں پہنچنے کے وقت، عذاب کو دیکھ نہ لیں گے مگر اس وقت ان کا ایمان لانا کچھ مفید نہ ہوگا۔ جس طرح فرعون کا ایمان غرغرہ کی حالت میں فائدہ مند نہ ہوا تھا۔

فَلَوْ لَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ اِيْمَانُهَآ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ ۚ لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۹۸﴾

"پس کیوں ایسا نہ ہوا کہ کوئی بستی ایمان لاتی تو نفع دیتا اسے اس کا ایمان ۱ (کسی سے ایسا نہ ہوا) بجز قوم یونس کے ۲ جب وہ ایمان لے آئے ۳ تو ہم نے دور کر دیا ان سے رسوائی کا عذاب دنیوی زندگی میں اور ہم نے لطف اندوز ہونے دیا انہیں ایک مدت تک ۴"

۱ لولا بمعنی ھلا ہے، یعنی ان بستیوں میں سے کوئی بستی والے جنہیں ہم نے ہلاک کر دیا ہے عذاب دیکھنے سے پہلے ایمان لاتے اور ایمان کی قبولیت کو غرغرہ کی حالت تک مؤخر نہ کرتے جیسا کہ فرعون نے ایمان لانے میں تاخیر کی تھی۔ اللہ تعالیٰ ان کا ایمان قبول فرماتا۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ اِنَّ اللّٰهَ يَقْبَلُ تَوْبَةَ الْعَبْدِ مَا لَمْ يُغَرْغِرْ(3) اللہ تعالیٰ اس وقت تک بندے کی توبہ قبول فرماتا ہے جب تک اس کا سانس گلہ تک نہیں پہنچ جاتا۔ اس حدیث کو امام ترمذی، ابن ماجہ، ابن

1۔ مشکوٰۃ المصابیح، جلد 1، صفحہ 71 (الفکر)

2۔ مشکوٰۃ المصابیح، جلد 1، صفحہ 79 (الفکر)

3۔ مشکوٰۃ المصابیح، جلد 2، صفحہ 35 (الفکر)

۱۔ اِنَّ اللّٰہَ لَیَغۡفِرُ لِعَبۡدِہٖ مَالَمۡ یَقَعِ الۡحِجَابُ قَالُوۡا یَا رَسُوۡلَ اللّٰہِ وَمَا الۡحِجَابُ قَالَ اَنۡ تَمُوۡتَ النَّفۡسُ وَھِیَ مُشۡرِکَۃٌ (۱)۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی مغفرت فرماتا رہتا ہے جب تک حجاب واقع نہ ہو۔ صحابہ کرام نے عرض کی یارسول اللہ حجاب سے کیا مراد ہے؟ فرمایا نفس کو حالت شرک میں موت آ ئے۔ اس حدیث کو امام احمد اور البیہقی نے کتاب البعث والنشور میں روایت کیا ہے۔

۲۔ یہ مستثنیٰ منقطع ہے، یعنی یونس علیہ السلام کی قوم ایمان لائی اور انہیں ان کے ایمان نے فائدہ بھی پہنچایا۔ یہ بھی جائز ہے کہ جملہ نفی کے معنی میں ہو کیونکہ حرف تحضیض کے ضمن میں نفی کا معنی ہے۔ پس اس صورت میں مستثنیٰ متصل ہوگا۔ مطلب یہ ہوگا کہ کوئی نافرمان بستی والے حالتِ غرغرہ میں اخروی عذاب دیکھنے سے ایمان نہ لائے سوائے حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کے کیونکہ وہ حالت غرغرہ سے پہلے اور اخروی عذاب کے دیکھنے سے پہلے ایمان لائے تھے۔

۳۔ جب وہ حالت اختیار میں ایمان لائے تو ہم نے انکا ایمان قبول کرلیا۔ ابن مردویہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لما امنوا کا مطلب ہے جب انہوں نے دعا مانگی۔

۴۔ ہم نے ان سے دنیا میں عذاب کو دور کردیا اور دنیا میں ایک مدت مقرر تک انہیں لطف اندوز ہونے دیا۔ امام بغوی فرماتے ہیں اس آیت کی تاویل یہ ہے کہ کوئی بستی ایسی نہیں کہ عذاب دیکھنے کے وقت ایمان لاتی ہو اور اس حالت نا امیدی میں ان کے ایمان نے ان کو نفع دیا ہو سوائے حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کے ان کو ان کے ایمان نے اس قنوط و یاس کی حالت میں بھی نفع دیا۔ پھر لکھتے ہیں علماء کا اختلاف ہے کہ انہوں نے عذاب اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا یا نہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں انہوں نے عذاب کی نشانی دیکھی تھی۔ مگر اکثر علماء کا خیال ہے کہ انہوں نے واقعی عذاب دیکھ لیا تھا اور اس کی دلیل کَشَفۡنَا عَنۡھُمۡ الۡعَذَابَ الۡخِزۡیِ کا ارشاد ہے کیونکہ کشف عذاب کے وقوع کے بعد ہوتا ہے۔ امام بغوی کی کلام کا مفاد یہ ہے کہ دنیا کے عذاب کی حالت میں ایمان قبول نہیں ہوتا۔ صرف حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کا ایمان دنیا کے عذاب کو دیکھنے کے بعد بھی قبول ہوا۔ اس حالت کو حالت یاس کہا جاتا ہے۔ صحیح یہ ہے کہ عذاب الیم کا دیکھنا جو ایمان کی قبولیت سے مانع ہے وہ اخروی عذاب ہے جو موت کے وقت نظر آتا ہے جب موت کے فرشتے سامنے آجاتے ہیں کیونکہ بدر کی جنگ میں کفار نے قتل اور قید کی صورت میں دنیا کا عذاب دیکھا۔ پھر ان میں سے جو زندہ بچ گئے تھے۔ وہ ایمان لے آئے تھے اور ان کا ایمان قبول بھی ہوا۔ اسی طرح حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کا حال تھا کہ وہ بھی اخروی عذاب دیکھنے سے پہلے ایمان لائے تھے تو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں عذاب دیکھنے کے بعد ان کے ایمان کو قبول کرلیا تھا۔ پھر جب وہ ایمان لائے تو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں ان سے رسوائی کا عذاب دور فرمادیا۔ رہا فرعون کا ایمان تو وہ اس لیے قبول نہ ہوا کیونکہ اس نے حالت غرغرہ میں ایمان قبول کیا تھا۔ یا موسیٰ علیہ السلام کی دعا اشۡدُدۡ عَلٰی قُلُوۡبِھِمۡ کی وجہ سے اس نے خلوص سے نہیں بلکہ صرف زبان سے ایمان قبول کیا فرعون اور اس کے درباریوں کی یہ عادت تھی کہ جب بھی ان پر عذاب نازل ہوتا تو وہ کہتے اے موسیٰ کلیم دعا کرو ہمارے لیے اپنے (رب سے) عہد کے سبب جو اس کا تیرے ساتھ ہے اگر تم ہٹادو ہم سے یہ عذاب تو ہم ضرور ایمان لائیں گے تم پر اور ضرور روانہ کردیں (ہم) بنی اسرائیل کو۔ پھر جب اللہ تعالیٰ ان کے عذاب کو دور فرمادیتا ایک مقررہ مدت تک جس کو پہنچنے والے تھے تو فوراً وہ (عہد توڑ دیتے) فرعون بھی اس وقت اسی طرح صرف زبان سے ایمان لایا تھا۔ اس لیے اس کا ایمان قبول نہ ہوا تھا۔ ہم نے

(الملک)

توبہ کی قبولیت کا مسئلہ حالت غرغرہ میں بڑی شرح و بسط کے ساتھ سورۂ نساء میں اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ الآیہ اور وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰۤى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ کے تحت بیان کیا ہے (وہاں ملاحظہ فرمائیں)۔

حضرت یونس علیہ السلام کا واقعہ

امام بغوی نے حضرت ابن مسعود، سعید بن جبیر، وہب وغیرہم سے روایت کیا ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام کی قوم نینوی کی بستی میں رہتی تھی جو موصل کے علاقہ میں واقع ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایمان کی دعوت دینے کے لیے حضرت یونس علیہ السلام کو ان کی طرف بھیجا۔ آپ نے انہیں دعوت توحید دی تو انہوں نے یک زباں انکار کر دیا۔ حضرت یونس علیہ السلام کو کہا گیا تم انہیں بتاؤ تاوقتین دنوں تک تم پر عذاب آجائے گا۔ آپ نے انہیں بتایا تو کہنے لگے ہم نے پہلے ان کی زبان سے جھوٹ تو کبھی نہیں سنا دیکھتے ہیں۔ اگر یہ آج کی رات ہمارے ہاں گزارتا ہے تو پھر سمجھو یہ بات درست نہیں ہے۔ اگر یہ خود کہیں چلے جاتے ہیں تو یقین کرلو کہ عذاب آنے والا ہے۔ جب رات کا نصف وقت گزر گیا تو حضرت یونس علیہ السلام انہیں چھوڑ کر چلے گئے۔ جب صبح ہوئی تو عذاب نے انہیں گھیر لیا۔ صرف ایک میل کی مسافت ان کے سروں سے اوپر تھا۔ حضرت وہب فرماتے ہیں آسمان پر کالا سیاہ بادل چھا گیا اور شدید قسم کا دھواں نکل رہا تھا۔ وہ عذاب کا بادل نیچے آتا گیا حتیٰ کہ ان کے شہر کو گھیر لیا۔ جب انہیں عذاب کے اترنے کا یقین ہو گیا تو انہوں نے حضرت یونس علیہ السلام کی تلاش شروع کی مگر آپ نہ ملے اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں توبہ کی رغبت پیدا فرما دی۔ وہ سب کے سب بیویوں بچوں اور جانوروں سمیت ایک میدان میں نکل آئے، جبکہ تمام نے بالوں سے بنے ہوئے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ انہوں نے توبہ اور ایمان کا اظہار کیا اور پورے خلوص سے کیا۔ انہوں نے ہر ماں کو اپنے بچے سے جدا کر دیا، خواہ وہ انسانوں میں سے تھے یا جانوروں میں سے ہر ایک دوسرے کے فراق میں روتا اور چلاتا تھا۔ ان کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں اور وہ خوب بارگاہ الٰہی میں تضرع وزاری کر رہے تھے۔ کہنے لگے اے اللہ جو پیغامات و احکامات حضرت یونس علیہ السلام لے کر آئے تھے ہم تمام پر تہہ دل سے ایمان لائے ہیں۔ اس رحمٰن و رحیم معبود برحق کو ان پر رحم آ گیا اور ان کی دعاؤں کو شرف قبولیت بخشا اور ان پر نازل ہونے والے عذاب کو دور فرما دیا، یہ یوم عاشورہ تھا (1)۔

ابن جریر، ابن ابی حاتم، ابن المنذر اور ابوالشیخ نے حضرت قتادہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت یونس کی قوم ارض موصل میں نینوی کے مقام پر رہتی تھی۔ پھر مذکورہ بالا واقعہ لکھا ہے۔ مگر اس میں یہ بھی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان کی قلبی کیفیات کو جان لیا کہ یہ واقعی اپنے کیے پر شرمندہ ہیں اور صدق دل سے توبہ کے متمنی ہیں تو اللہ تعالیٰ نے اس آنے والے عذاب کو روک لیا اور اس وقت ان کے اور اس عذاب کے درمیان صرف ایک میل کا فاصلہ رہ گیا تھا (2)۔

ابن ابی حاتم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کی توبہ دس محرم الحرام یوم عاشور کو قبول ہوئی (3)۔ ادھر یونس علیہ السلام بستی سے باہر عذاب کی آمد اور قوم کی ہلاکت کے منتظر تھے۔ مگر عذاب نازل نہ ہوا۔ اور وہاں کا دستور تھا کہ جو غلط بیانی کرتا اور اس کے پاس دلیل نہ ہوتی تو اسے قتل کر دیا جاتا تھا۔ حضرت یونس علیہ السلام نے دل میں کہا اب میں اپنی قوم کے پاس کیسے جاؤں گا جبکہ میں نے ان سے بظاہر غلط بیانی کی ہے۔ آپ اپنے رب سے خفا ہو کر اور اپنی قوم سے ناراض ہو کر سمندر کی جانب چل پڑے۔ جب سمندر کے ساحل پر پہنچے تو ایک قوم کشتی میں سوار تھی۔ انہوں نے آپ کو پہچان لیا اور آپ کو سوار کرلیا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 183 (الفکر)
2۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 572 (العلمیہ)
3۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 573 (العلمیہ)

اور کوئی اجرت وغیرہ بھی نہ لی۔ جب کشتی سمندر کے وسط میں پہنچی جہاں طغیانی پورے عروج پر تھی تو کشتی خود بخود رک گئی، نہ آگے جاتی نہ پیچھے ہوتی۔ ملاحوں نے کہا کشتی کے ساتھ کوئی خاص وجہ بن گئی ہے۔ حضرت یونس علیہ السلام نے فرمایا میں اس کی وجہ جان گیا ہوں اس میں کوئی خاص شخص ہے۔ انہوں نے پوچھا کون ہے وہ فرمایا وہ؟ میں ہوں' تم مجھے سمندر میں پھینک دو' کشتی کے سواروں نے کہا جب تک ہمارے پاس کوعذر معقول نہ ہو، ہم آپ کے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے۔ بس انہوں نے قرعہ اندازی کی تو تین مرتبہ حضرت یونس علیہ السلام کا نام نکلا۔ ادھر کشتی کے قریب ایک بہت بڑی مچھلی منہ کھولے اپنے رب کے حکم کی منتظر تھی۔ حضرت یونس علیہ السلام نے انہیں فرمایا لوگو! قسم بخدا تم تمام ہلاک ہو جاؤ گے، اگر تم نے مجھے سمندر میں نہ پھینکا تو مجبوراً انہوں نے آپ کو پھینک دیا اور خود اپنے سفر پر چل دیے۔ آپ کو اس مچھلی نے نگل لیا جو منہ کھولے منتظر کھڑی تھی۔ یہ بھی روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک بڑی مچھلی کو حکم دیا تو وہ اس کشتی کے قریب پہنچ گئی کشتی والوں نے اسے پہاڑ کی مثل لمبا چوڑا دیکھا اور وہ مچھلی منہ کھولے کشتی والوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ گویا اسے کسی کی تلاش ہے پس کشتی سوار خوفزدہ ہوئے جب یونس علیہ السلام نے اسے دیکھا تو آپ خود ہی پانی میں چلے گئے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ حضرت یونس علیہ اپنی قوم سے ناراض ہو کر نکلے تھے۔ بحر روم کے کنارے پہنچے تو ایک کشتی سواروں سے کھچا کھچ بھری تھی۔ آپ بھی اس میں سوار ہو گئے۔ جب کشتی پانی کے وسط میں پہنچی تو ہچکولے کھانے لگی۔ قریب تھا کہ تمام سوار غرق ہو جائیں۔ ملاحوں نے کہا ہمارے درمیان کوئی خطا کار شخص ہے یا کوئی اپنے مالک سے بھاگا ہوا غلام ہے اور کشتی کا یہ دستور ہے کہ جب اس میں کوئی ایسا شخص ہو تو یہ نہیں چلتی اور دانشمندی یہی ہے کہ ایک آدمی کا غرق ہونا پوری کشتی کے ڈوبنے سے بہتر ہے۔ انہوں نے تین مرتبہ قرعہ اندازی کی۔ ہر بار حضرت یونس علیہ السلام کے نام کا قرعہ نکلا۔ حضرت یونس علیہ السلام کھڑے ہوئے اور فرمایا میں وہ خطا وار اور بھاگا ہوا غلام ہوں، یہ کہہ کر آپ نے سمندر میں چھلانگ لگا دی۔ ایک مچھلی نے آپ کو نگل لیا۔ پھر دوسری مچھلی آئی۔ اس نے حضرت یونس سمیت پہلی مچھلی کو نگل لیا۔ اللہ تعالیٰ نے مچھلی کو حکم دیا میرے یونس کا بال بھی بیکا نہ ہو۔ میں نے تیرے پیٹ کو آپ کے لیے قید خانہ بنایا ہے۔ یہ تیری خوراک نہیں ہے۔ حضرت ابن عباس سے روایت ہے مچھلی کو ندا دی گئی حضرت یونس تیری خوراک نہیں بلکہ ہم نے تیرے پیٹ کو ان کے لیے حرز اور مسجد بنایا ہے۔ یہ بھی روایت ہے کہ آپ قرعہ اندازی سے پہلے ہی کھڑے ہو کر کہنے لگے میں بھاگا ہوا غلام ہوں۔ لوگوں نے پوچھا تو کون ہے؟ فرمایا میں یونس بن متی ہوں۔ وہ آپ کو پہچان گئے تو کہنے لگے، یا رسول اللہ ہم آپ کو ویسے نہیں پھینکتے پہلے ہم قرعہ اندازی کریں گے تو قرعہ آپ کے نام کا نکلا آپ نے خود ہی پانی چھلانگ لگا دی۔

حضرت ابن مسعود فرماتے ہیں وہ آپ کو لے کر ساتویں زمین پر چلی گئی اور آپ اس کے پیٹ میں چالیس راتیں رہے۔ آپ نے سنگ ریزوں کی تسبیح سنی تو آپ نے ان تاریکیوں میں پکارا اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّىْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ اللہ تعالیٰ نے آپ کی التجاء کو قبول فرمایا۔ اور مچھلی کو حکم دیا کہ انہیں ساحل سمندر پر ڈال دے۔ تو آپ بغیر بالوں کے جس طرح چوزہ ہوتا ہے اس طرح ساحل پر پڑے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے قریب کدو کی بیل پیدا فرمائی جو آپ پر سایہ کرتی تھی ایک وحشی بکری کو حکم دیا کہ وہ آپ کو دودھ پلایا کرے تو اس کا آپ دودھ پیتے تھے۔ جب کدو کی بیل خشک ہوئی تو آپ اس پر اظہار افسوس کرنے لگے اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی اے یونس علیہ السلام تم ایک بیل کے خشک ہونے پر تو افسوس کرتے ہو اور ایک لاکھ سے زائد افراد کی ہلاکت پر افسوس نہیں کرتے بلکہ ان کی ہلاکت چاہتے ہو۔ حضرت یونس علیہ السلام کو ایک غلام ملا جو بکریاں چرا رہا تھا۔ آپ نے اس سے پوچھا اے جوان تو کون ہے؟ اس نے کہا میں یونس علیہ السلام کی قوم کا فرد ہوں۔ پھر آپ نے فرمایا جب تو ان کی طرف لوٹے تو انہیں بتانا کہ میں حضرت یونس علیہ السلام

سے ملاقات کر کے آیا ہوں۔ غلام نے کہا آپ جانتے ہیں کہ جس کے پاس بات کی دلیل نہ ہو اسے قتل کر دیا جاتا ہے، میرے پاس بھی اگر اس بات کی دلیل نہ ہوئی تو مجھے قتل کر دیا جائے گا۔ حضرت یونس علیہ السلام نے فرمایا یہ زمین کا ٹکڑا اور یہ کدو کی بیل تیری گواہی دیں گے۔ غلام نے کہا جناب آپ پھر انہیں حکم دیں۔ حضرت یونس علیہ السلام نے اس زمین اور کدو کی بیل کو فرمایا۔ جب یہ غلام آئے تو تم اس کی گواہی دینا تو انہوں نے کہا ٹھیک ہے۔ غلام جب اپنی قوم کے پاس گیا اور سارا ماجرا سنایا اور بادشاہ کو کہا میں حضرت یونس سے ملاقات کر کے آیا ہوں۔ بادشاہ نے اسے قتل کرنے کا حکم دے دیا۔ اس جوان نے کہا میرے پاس اس بات کی دلیل ہے، تم میرے ساتھ اپنے آدمی بھیجو۔ تو وہ اس زمین اور کدو کی بیل کی طرف آیا تو ان دونوں نے اس کی سچائی کی گواہی پیش کر دی۔ قوم گھبرائے ہوئے واپس پلٹی اور بادشاہ کو درخت اور زمین کی گواہی سے آگاہ کیا۔ تو بادشاہ نے اس جوان کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے تخت پر بٹھایا اور فرمایا تو مجھ سے زیادہ اس عظمت کا زیادہ حقدار ہے۔ پس اس نوجوان نے چالیس سال اس قوم کے امور سلطنت چلائے(1)۔

وَ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِی الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِیْعًا ؕ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى یَكُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ ۝۹۹

"اگر چاہتا آپ کا رب تو ایمان لے آتے جتنے لوگ زمین میں ہیں سب کے سب[1] کیا آپ مجبور کرنا چاہتے ہیں لوگوں کو یہاں تک کہ وہ مومن بن جائیں[2]"

1۔ اے محمد ﷺ اگر تیرے رب کی تکوینی مصلحتیں تقاضا کرتیں کہ تمام لوگ اسلام قبول کریں تو تمام لوگ ایمان لے آتے اور ایک بھی دولت ایمان سے محروم نہ ہوتا اور تمام لوگ ایمان پر مجتمع ہوتے، اس میں کسی کا کوئی اختلاف نہ ہوتا۔ اس آیت کریمہ میں قدریہ فرقہ کا رد ہے جو یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تو تمام لوگوں کے ایمان کو چاہتا ہے مگر وہ اپنے اختیار سے ایمان نہیں لاتے۔ مگر یہ آیت کریمہ صراحۃً دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام ایمان کو چاہا ہی نہیں، اگر وہ چاہتا تو لامحالہ تمام کے تمام ایمان لے آتے کیونکہ مشیت الٰہی کا تخلف محال ہے۔ جو وہ چاہتا ہے ہو کر رہتا ہے۔ نیز اکراہ کو مشیت کے ساتھ مقید کرنا بھی خلاف ظاہر ہے۔

2۔ کیا اے محمد ﷺ آپ مجبور کرنا چاہتے ہیں کفار کو یہاں تک کہ وہ ایمان دار بن جائیں، جبکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ایمان کو چاہا ہی نہیں۔ یہاں اکراہ کو عدم مشیت پر فاء کے ساتھ مرتب کرنا اور انکار کے لیے حرف استفہام کا داخل کرنا، ضمیر کو فعل پر مقدم کرنا یہ چیزیں اس بات کی دلیل ہیں کہ جس کو اللہ تعالیٰ نہ چاہے اس کا وجود محال ہے، اس کا حصول تو مجبور کرنے سے نہیں ہو سکتا، چہ جائیکہ حث و ترغیب سے حاصل کیا جا سکے۔ نبی کریم ﷺ لوگوں کے ایمان کے بہت زیادہ حریص اور متمنی تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ ایمان تو صرف وہی قبول کرے گا جس کی سعادت کا فیصلہ اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی لکھ دیا ہے۔ مگر جن کی شقاوت و بدبختی ازل سے لکھی گئی ہے ان کی تبلیغ کا اتنا زیادہ اہتمام نہ فرمائیں اور اپنی جان کے لیے ان کے ایمان لانے کو روگ نہ بنائیں۔ مسلمان فقط وہی ہوگا۔ جس کے ایمان کو اللہ تعالیٰ چاہے گا۔ اس آیت کریمہ میں نبی کریم ﷺ کو تسلی دی جا رہی ہے کہ آپ اپنا فریضہ تبلیغ ادا کرتے رہیے مگر انہیں ایمان لانے پر مجبور کرنا آپ کی ذمہ داری نہیں ہے۔

وَ مَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَ یَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِیْنَ لَا یَعْقِلُوْنَ ۝۱۰۰

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 85-183 (الفکر)

"اور کوئی بھی ایسا شخص نہیں کہ وہ ایمان لا سکے بغیر حکم الٰہی کے [1] اور (سنت الٰہی یہ ہے کہ) وہ ڈالتا ہے (گمراہی کی) آلودگی ان لوگوں پر جو بے سمجھ ہیں [2]"

[1] اللہ تعالیٰ کی توفیق اور ارادہ کے بغیر کوئی شخص ایمان نہیں لا سکتا۔

[2] یَجْعَلُ کو ابو بکر نے جمع متکلم کے صیغہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ جبکہ باقی قراء نے غائب کے صیغہ کے ساتھ پڑھا ہے(1) یعنی اللہ تعالیٰ کی عادت یہ ہے کہ ان لوگوں پر عذاب ڈالتا ہے جو حق و باطل میں تمیز نہیں کرتے۔ یعنی کفار کے دلوں پر مہر لگ چکی ہے اور اللہ تعالیٰ کی مشیت بھی ان کے سمجھنے کے متعلق نہیں ہوئی۔ اس لیے یہ دولت ایمان سے محروم ہیں۔

قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ مَا تُغْنِی الْاٰیٰتُ وَ النُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۱﴾

"فرمایئے غور سے دیکھو کیا کیا (عجائبات) ہیں آسمانوں اور زمین میں [1] اور فائدہ نہیں پہنچاتیں آیتیں اور ڈرانے والے [2] اس قوم کو جو ایمان نہیں لانا چاہتے [3]"

[1] اے محمد ﷺ فرما دیجئے اے لوگو! غور و فکر کرو ممکنات کی عجائبات میں مثلاً یہ چمکتا ہوا سورج، یہ روشن من موہنا چاند، یہ جھلملاتے ستارے، پھر ان کی اپنے اپنے مدار میں مناسب حرکات، یہ بلند و بالا پہاڑ، یہ نہریں یہ بحار، گھنے اور سایہ دار اشجار یہ سب اپنے قدیم قادر، علیم، متوحد فی الذات والصفات صانع کے وجود پر دلیل ہیں۔ ماذا کا کلمہ اگر اسے استفہامیہ بنایا جائے تو یہ انظروا کے متعلق ہوگا۔

[2] ما نافیہ ہے یا انکار کے لیے حالت نصب میں استفہامیہ ہے۔ یعنی کچھ فائدہ نہیں پہنچاتیں ایسی روشن آیات و تعلیمات جو علم و یقین کا موجب ہوتی ہیں۔ والنذر نذیر کی جمع ہے یعنی رسل اور ان کے علاوہ بڑھاپا اور ہم جولیوں کی موت کوئی بھی انہیں ہلاکت کے گڑھوں میں گرنے سے باز نہیں رکھ سکتا۔

[3] چونکہ ایمان امر وہبی اور عطائی ہے اور اللہ کے علم میں اور اس کی حکمت میں ہے کہ یہ قوم ایمان نہیں لائے گی۔ اس لیے انہیں کوئی قوی سے قوی دلیل اور روشن معجزہ مفید نہیں ہو سکتا۔

فَهَلْ یَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا مِثْلَ اَیَّامِ الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ قُلْ فَانْتَظِرُوْۤا اِنِّیْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِیْنَ ﴿۱۰۲﴾

"پس وہ انتظار نہیں کر رہے مگر ان لوگوں جیسے حالات کا جو گزر چکے ہیں اس سے پہلے [1] آپ فرمایئے اچھا انتظار کرو بیشک میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں [2]"

[1] یعنی مشرکین مکہ انتظار نہیں کر رہے مگر ان لوگوں جیسے حالات و واقعات کا جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ نے قوم نوح، عاد اور ثمود کو جن حالات و واقعات سے دوچار کیا تھا یہ بھی ان جیسے حالات کے منتظر ہیں۔ عرب عذاب اور نعمت دونوں کو ایام سے تعبیر کرتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد وَ ذَكِّرْهُمْ بِاَیّٰىمِ اللّٰهِ ان کو اللہ کی نعمتیں یاد دلاؤ۔ وجہ بھی خیر و شر کا واقعہ پیش آئے۔ اسے ایام سے تعبیر کیا جا سکتا ہے(2)۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 186 (الفکر)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 186 (الفکر)

۲؎ اے ممدوحِ کائنات محمد ﷺ ان سے فرما دیجئے۔ اے اہلِ مکہ تم میری ہلاکت کا انتظار کرو میں تمہاری ہلاکت و بربادی کا انتظار کرتا ہوں۔

ثُمَّ نُنَجِّيْ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ ۚ حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۳﴾

"(جب وہ عذاب آجائیگا) پھر ہم بچالیں گے اپنے رسولوں کو اور انہیں جو ایمان لائے ۱؎ بلاشبہ ایسا ہی ہوگا یہ ہمارے ذمہ ہے کہ ہم بچالیں گے اہلِ ایمان کو ۲؎"

۱؎ یہ محذوف کلام پر معطوف ہے جس پر الا مثل ایام الذین خلوا دلالت کر رہا ہے۔ گویا ارشاد ہے ہم امتوں کو تہس نہس کر دیں گے ان کے نام و نشان مٹ جائیں گے مگر اپنے رسولوں اور ان کے حلقہ ارادت میں داخل ہونے والے مومنوں کو اپنی رحمت و قدرت کے ساتھ بچالیں گے' یہ ماضی کے واقعات ہیں مگر اس کی حکایت حال سے کی گئی ہے۔ گویا ابھی یہ واقعہ ہوا ہے۔

۲؎ جس طرح سابقہ امتوں کی تباہیوں اور ہلاکتوں کے وقت ہم نے اپنے رسولوں کو بچالیا تھا۔ بالکل اسی طرح ہم محمد ﷺ اور آپ کے اصحاب ذیشان کو مشرکوں کی ہلاکت کے وقت بچالیں گے۔ حقاً علینا جملہ معترضہ ہے یعنی ہم پر واجب ہے ایسا کرنا۔ حفص اور کسائی نے باب افعال سے تخفیف کے ساتھ ننج پڑھا، جبکہ باقی قراء نے باب تفعیل سے تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔

قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ دِيْنِيْ فَلَاۤ اَعْبُدُ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ ۚ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۴﴾

"فرمایئے اے لوگو اگر تمہیں کچھ شک ہو میرے دین کے بارے ۱؎ تو (سن لو) میں عبادت نہیں کرتا ان (بتوں) کی جن کی تم پوجا کیا کرتے ہو اللہ تعالیٰ کے سوا لیکن میں تو عبادت کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کی جو مارتا ہے تمہیں ۲؎ اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں ہو جاؤں اہلِ ایمان سے ۳؎"

۱؎ یہ اہلِ مکہ کو خطاب ہے اے مکہ کے بت پرستو! اگر تمہیں میرے اس دینِ حنیف کی صحت و صداقت میں شک ہے۔ وہ شک اور تردد میں اس لیے مبتلا تھے کہ وہ نبوت کے امر کو بعید سمجھتے تھے۔ پھر جب وہ روشن آیات کو دیکھتے تو ایمان لانے پر مجبور ہوتے' لیکن جبلی شقاوت کی وجہ سے شک اور تردد کا شکار رہے۔

۲؎ تو سن لو میں تو ان گھڑے ہوئے بتوں کی عبادت نہیں کرتا۔ بلکہ میں تو فقط اس کی بارگاہ عالی میں جبین نیاز جھکاتا ہوں جو تمہیں موت و حیات دیتا ہے۔ اور جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور اختیار فرماتا ہے۔ یہاں زندگی کا ذکر نہیں صرف موت کا ذکر فرمایا، اس سے ان کو زجر و توبیخ کرنا مقصود ہے۔ فلا اعبد والا جملہ جزاء کے قائم مقام ہے جیسے سبب کو مسبب کے قائم مقام رکھا جاتا ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہے اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ دِيْنِيْ فَاَزِيْلُوْا ذٰلِكَ الشَّكَّ بِالتَّاَمُّلِ وَ التَّفَكُّرِ فِيْ دِيْنِيْ وَهُوَ هٰذَا لَا اَعْبُدُ الْحِجَارَةَ الْمَخْلُوْقَةَ الَّتِيْ لَا تَضُرُّ وَلَا تَنْفَعُ وَاَعْبُدُ اللّٰهَ الْخَالِقَ الْقَادِرَ النَّافِعَ الضَّارَّ۔ یعنی اے کافرو! تمہیں اگر میرے دین کے بارے شبہ ہے تو کچھ غور و فکر کی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر میرے دینِ حنیف کے بارے سوچو! اگر تم میں سوچ و بچار کی صلاحیتیں مفقود ہیں اور نرے کودن ہو تو میں خود اپنے دین کی وضاحت کرتا ہوں، وہ یہ ہے کہ میں ان بے نفع اور بے ضرر تمہارے ہاتھوں سے تراشے ہوئے بے بس بتوں کی عبادت نہیں کرتا بلکہ میں تو صرف اس کے سامنے اظہار بندگی کرتا ہوں جو ساری کائنات کا خالق ہے' ساری

قدرتوں کا مالک ہے نفع اور نقصان پہنچانے پر بھی مکمل قدرت رکھتا ہے۔

۳؎ اور مجھے تو فقط یہ حکم ہے کہ میں ان لوگوں میں سے ہو جاؤں جو اس دین پر ایمان رکھتے ہیں اور عقل و دانش کے بھی مطابق ہے اور سابقہ کتب سماویہ بھی اس کی مؤید ہیں۔

وَاَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۚ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۰۵﴾

''نیز (مجھے حکم دیا گیا ہے کہ) اپنا رخ سیدھا کر لے ۱؎ اس دین کی طرف ہر کجی سے بچتے ہوئے ۲؎ اور ہرگز نہ ہو جانا شرک کرنے والوں سے ۳؎''

۱؎ اس کا عطف ان اکون پر ہے۔ معطوف علیہ میں مضارع کا صیغہ ہے اور معطوف میں امر کا صیغہ ہے اور یہ جائز ہے کیونکہ دونوں سے مقصود مصدری معنی ہے اور مصدری معنی کے اعتبار سے تمام صیغے برابر ہوتے ہیں۔ معنی یہ ہے کہ مجھے حکم ہے کہ میں ایمان پر ثابت قدم رہوں، دین پر استقامت اختیار کروں، فرائض کی ادائیگی میں تندہی سے کام لوں، برائیوں سے اجتناب کروں۔ یا یہ مطلب ہے نماز میں اپنا رخ قبلہ شریف کی طرف کروں۔

۲؎ حنیفاً کا لفظ یا دین سے حال ہے یا الوجہ سے حال ہے۔

۳؎ اس کا عطف اقم پر ہے یعنی مجھے یہ بھی حکم ہے کہ مشرکین سے نہ ہو جاؤ۔ مطلب یہ ہے کہ مجھے شرک سے آلودہ ہونے سے منع کیا گیا ہے۔

وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ ۚ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۰۶﴾

''اور نہ عبادت کر اللہ تعالیٰ کے سوا اس کی جو نہ نفع پہنچا سکتا ہے تجھے اور نہ ضرر پہنچا سکتا ہے تجھے ۱؎ اور اگر تو ایسا کرے گا تو پھر تیرا شمار ظالموں میں ہو گا ۲؎''

۱؎ لا تکونن من المشرکین یہ عطف تفسیری ہے یعنی عبادت نہ کر اللہ کے سوا کسی کی۔ اگر تو اس کی عبادت کرے گا تو بھی وہ تجھے کوئی نفع نہیں پہنچائے گا۔ اور اگر تو ان بتوں کی توہین کرے گا تو یہ تجھے کوئی گزند نہ پہنچا سکیں گے۔ بلاشبہ جو تعصب اور ہٹ دھرمی کی پٹی اتار کر انصاف کی نظر سے اس دین متین میں غور و فکر کرے گا تو اسے اس کو دین کی صحت اور سچائی کا یقین محکم ہو جائے گا اور اس کے تمام شکوک و شبہات کے اندھیرے یقین کی روشنی سے منور ہو جائیں گے کیونکہ اس دین کو عقل و نقل دونوں کی تائید حاصل ہے۔

۲؎ اگر آپ ان بے نفع اور بے ضرر بتوں کی پوجا کریں گے تو ظالموں میں شمار ہونے لگیں گے۔ کیونکہ معبود حقیقی کی عبادت کو آپ نے ترک کیا ہو گا اور غیروں کو اپنا معبود بنایا ہو گا۔ یہ جملہ شرط کی جزاء ہے اور ایک مقدر سوال کا جواب ہے جو غیر اللہ کی عبادت کرنے کی صورت میں پیدا ہوتا ہے۔ یعنی سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر غیر کی عبادت کروں گا تو کیا ہو گا فرمایا ظالموں میں شمار ہو گے۔

وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ ۚ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ؕ يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۰۷﴾

''اور اگر پہنچائے تجھے اللہ تعالیٰ تکلیف تو نہیں کوئی دور کرنے والا اسے بجز اس کے اور اگر ارادہ فرمائے تیرے لیے کسی

بھلائی کا تو کوئی رد کرنے والا نہیں اس کے فضل کو۔[1] سرفراز فرماتا ہے اپنے فضل و کرم سے جس کو چاہتا ہے اپنے بندوں سے[2] اور وہی بہت مغفرت فرمانے والا ہمیشہ رحم کرنے والا ہے[3]"

[1] اگر اللہ تعالیٰ تجھے کوئی مرض، تکلیف یا مصیبت پہنچانا چاہے تو اس کو کوئی ٹالنے والا نہیں مگر وہ خود ہی اسکو ٹالتا ہے اور اگر اللہ تعالیٰ تجھے دنیا اور آخرت کی نعمت اور بھلائی عطا کرنے کا ارادہ فرمائے تو دنیا کی کوئی سپر طاقت اس کی مہربانی اور فضل کو روک نہیں سکتی۔

یہاں کلام کے انداز میں تھوڑا سا اختلاف ہے، خیر کے ساتھ ارادہ کا ذکر فرمایا اور الضر کے ساتھ مس کا ذکر فرمایا حالانکہ دونوں معاملوں میں تلازم ہے۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ خیر مراد بالذات ہے، جبکہ ضر مقصود بالذات نہیں بلکہ بالواسطہ ہے۔ دوسرا نکتہ یہاں یہ ہے کہ فضلہ کی جگہ ضمیر ہونی چاہیے تھی مگر اسم ظاہر ذکر فرمایا۔ یہ اس لیے کہ جو وہ کسی پر فضل و احسان فرمانا چاہتا ہے تو یہ اس شخص کا استحقاق نہیں ہوتا بلکہ یہ اس کا فقط فضل اور بندہ نوازی ہوتی ہے۔ جس طرح تکلیف دور کرنے میں استثناء فرمائی ہے، بھلائی پہنچانے میں استثناء نہیں فرمائی کیونکہ اللہ کے ارادہ کا رد ممکن نہیں ہے۔

[2] اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے خیر یا شر پہنچاتا ہے۔ اس لیے طاعت و بندگی کے ذریعے اس کی رحمت کو اپنی طرف متوجہ کرو؛ اپنی عبادات و ریاضات پر کامیابی و کامرانی کا بھروسہ نہ کرو اور اس کے ساتھ ساتھ بتقاضائے بشریت اگر کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو اس کی بے پایاں رحمت سے مایوس نہ ہوا کرو لیکن اس کے عذاب سے بے خوف بھی نہ ہوا کرو۔ ابونعیم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے نبی کو وحی فرمائی کہ تم اپنی امت کے اہل اطاعت کو کہہ دو کہ اپنے اعمال پر بھروسہ نہ کرو میں کسی بندے کو قیامت کے حساب کے لیے کھڑا کرونگا۔ اگر چاہوں گا تو اسے عذاب نہیں دونگا، ورنہ اسے عذاب دے دونگا اور اسی طرح اپنی امت کے گناہگاروں سے بھی کہہ دو کہ اپنے آپ کو ہلاکت کے گڑھوں میں نہ ڈالا کرو۔ میں بڑے بڑے گناہ بخش دیتا ہوں۔ مجھے کوئی پرواہ نہیں[1]۔ اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے رغبت و رہبت کے سارے راستے بند کر دیے اور فرمایا صرف اور صرف میری طرف ہی متوجہ رہا کرو کوئی امید ہو تب بھی، کوئی مشکل ہو تب بھی۔

[3] تمہارے پروردگار کی رحمت اس کے غضب سے سبقت لے گئی ہے۔

قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ وَمَاۤ اَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ؕ﴿۱۰۸﴾

"(اے حبیب) فرمائیے اے لوگو! بیشک آ گیا ہے تمہارے پاس حق تمہارے رب کی طرف سے[1] تو جو ہدایت قبول کرتا ہے تو وہ ہدایت قبول کرتا ہے اپنے بھلے کے لیے اور جو گمراہ ہوتا ہے تو وہ گمراہ ہوتا ہے اپنی تباہی کے لیے[2] اور میں تم پر نگران نہیں ہوں[3]"

[1] اے پیارے محمد ﷺ فرمائیے اے مکہ والو! بلاشبہ تمہارے پاس توحید ذاتی، توحید صفاتی، احوال قیامت کا علم قرآن اور رسول کریم ﷺ کے ذریعے تمہارے رب کی طرف سے پہنچ چکا ہے۔ اب تمہارے لیے جہالت کا کوئی عذر باقی نہیں رہا۔ یا حق سے مراد وہ چیزیں ہیں جن کا قرآن کے اعجاز اور نبی کریم ﷺ کے ذریعے تحقق اور صدق بالکل عیاں ہو چکا ہے۔ پس اب تمہارے لیے کوئی عذر

1۔ مجمع الزوائد: 18197، جلد 10، صفحہ 551 (الفکر)

باقی نہیں ہے۔

۲؎ پس جو شخص اس علم یقینی پر عمل پیرا ہوگا اور اس کے مقتضی کے مطابق اپنی زندگی کی شاہرہ کو منور کرے گا، قرآن کی اتباع اور نبی کریم ﷺ کی اطاعت و متابعت کے ساتھ نور ہدایت حاصل کرے گا۔ تو اس کا نفع اسے ہی پہنچے گا اور جو حق سے منہ موڑے گا، عناد اور تعصب کا راستہ اختیار کر کے گمراہ ہوگا تو اس کا وبال بھی اسے ہی برداشت کرنا پڑے گا۔

۳؎ تمہارے اعمال کا اب میں ذمہ دار نہیں ہوں۔ تمہاری گمراہی کا مجھ سے مواخذہ نہ ہوگا (کیونکہ میں نے تو اپنے فرائض بتوفیق الٰہی نہایت خوش اسلوبی سے ادا کر دیئے ہیں)۔

وَاتَّبِعْ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتَّىٰ يَحْكُمَ اللَّهُ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ ﴿١٠٩﴾

"اور (اے حبیب) آپ پیروی کرتے رہیں جو وحی کی جاتی ہے آپ کی طرف ۱؎ اور (ظلم کفار پر) صبر کیجئے یہاں تک کہ فیصلہ فرمادے اللہ ۲؎ اور وہ سب سے بہتر فیصلہ فرمانے والا ہے ۳؎"

۱؎ اے حبیب آپ پیروی کرتے رہیں۔ ان احکام کی جو آپ کی طرف کسی امر کو بجالانے برائیوں سے اجتناب کے متعلق وحی کیے گئے ہیں۔

۲؎ اور اطاعت الٰہی پر اور ان کفار کی اذیتوں اور دلآزار باتوں کو برداشت کرنے کی عادت پر قائم رہو۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کفار کے قتل اور ان کے جزیہ کا فیصلہ فرمادے۔

۳؎ وہ بہتر فیصلہ فرمانے والا ہے اور اس کے فیصلے میں غلطی کا امکان نہیں ہوتا کیونکہ وہ پوشیدہ اور ظاہر چیزوں پر خوب مطلع ہے۔

سورۃ ہود کی ہے اور اس کی ایک سو تیئس آیتیں اور دس رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓرٰ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ﴿۱﴾

"الف۔ لام۔ را یہ وہ کتاب ہے ۱؎ محفوظ و مستحکم بنا دی گئی ہیں جس کی آیتیں ۲؎ پھر ان کی وضاحت کر دی گئی ہے بڑے دانا اور ہر چیز سے باخبر (خدا) کی طرف سے ۳؎"

۱؎ یہ مبتدا اور خبر ہیں یا کتاب مبتدا محذوف کی خبر ہے۔

۲؎ اس کی آیات نظم و معنی کے اعتبار سے مستحکم اور پختہ ہیں کہ نہ لفظ کے اعتبار سے ان میں کوئی نقص ہے اور نہ معنی کے اعتبار سے کوئی کجی ہے، یا یہ مطلب ہے کہ اس سورت کی آیات نسخ سے محفوظ ہیں، یا یہ معنی ہے کہ اس کی آیات دلائل و براہین کے اعتبار سے پختہ ہیں، یا یہ مفہوم ہے کہ اس کی آیات کو حکیم بنایا گیا ہے کیونکہ اس کی آیات علمی اور عملی حکمتوں کے اصول پر مبنی ہیں۔ اس صورت میں یہ حَكُمَ (بالضم) سے منقول جس کا معنی ہے وہ حکیم ہو گیا۔

۳؎ اس میں عقائد، احکام، پند و نصائح اور اخبار کے فوائد بیان کئے گئے ہیں جیسے گلے کے ہاروں کو موتیوں کے ساتھ واضح کیا جاتا ہے، یا یہ معنی ہے کہ ان آیات کو سورہ کی شکل میں جدا کیا گیا ہے، یا اس کا نزول تھوڑا تھوڑا کر کے اسے جدا اور علیحدہ کیا گیا ہے، یا یہ مطلب ہے کہ اس میں بیان بھی اور ضرورت کے مطابق تلخیص بھی ہے مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ یہ ترکیب کے اعتبار سے یا یہ کتاب کی صفت ہے دوسری خبر ہے یا احکمت یا فصلت کے متعلق ہے یعنی اس علیم خبیر خدا کی طرف سے اس کی آیات میں پختگی اور استحکام ہے۔ اس کی آیات کے احکام اور تفصیل کے کامل و اکمل اور مناسب طریقہ پر ہونے کا اس جملہ میں ثبوت ہے۔ یعنی جو احکام اس کے ظاہر ہیں، یا مخفی ہیں ہر ایک میں ایک خاص حکمت کارفرما ہے۔

اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنَّنِيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ ﴿۲﴾

"کہ تم نہ عبادت کرو مگر صرف اللہ کی ۱؎ بیشک میں تمہیں اس کی طرف سے ڈرانے والا اور خوشخبری دینے والا ہوں ۲؎"

۱؎ اصل میں یہ لان لاتعبدوا ہے یا بان لا تعبدوا ہے یا فی ذالک الکتاب ان لا تعبدوا ہے یعنی یا تو یہ لام یا با کے صلہ کے ساتھ فصل کے متعلق ہے، یا یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ ان مفسرہ ہے کیونکہ فصلت میں قول کا معنی پایا جا رہا ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ اغراء کے طور پر مستقل کلام ہو۔ گویا یوں ارشاد ہے اِلْزَمُوْا اَنْ لَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ۔

۲؎ ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ ہے۔ یعنی میں تمہیں اللہ کی طرف سے نذیر شرک کے عذاب سے ڈرانے والا و بشیر اور توحید کی بشارت

دینے والا ہوں۔

وَّ اَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّ يُؤْتِ كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ ؕ وَ اِنْ تَوَلَّوْا فَاِنِّيْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيْرٍ ۝

”اور یہ کہ مغفرت طلب کرو اپنے رب سے پھر (صدق دل سے) متوجہ ہو جاؤ اس کی طرف [1] وہ لطف اندوز کرے گا تمہیں زندگی کی راحتوں سے [2] اچھی طرح مقررہ میعاد تک [3] اور عطا کرے گا ہر زیادہ نیکی کرنے والے کو زیادہ نیکی (کا ثواب) [4] اور اگر تم (یونہی) روگرداں رہے تو میں اندیشہ کرتا ہوں تم پر بڑے دن کے عذاب سے [5]“

[1] اس کا عطف ان لا تعبدوا پر ہے، یعنی مغفرت طلب کرو رب کریم اپنے پروردگار سے گزشتہ گناہوں اور معصیتوں پر اور اطاعت و امتثال کے ساتھ اس کی بارگاہ کی طرف متوجہ ہو جاؤ، یعنی اپنے ہر فعل و عمل کا قبلہ بلکہ ذہنی سوچ اور قلبی میلان کا قبلہ اس ذات اقدس کو بنا لو۔ فراء فرماتے ہیں یہاں ثم بمعنی واؤ ہے اور الاستغفار بھی تو یہ ہی ہے، یعنی یہ ایک دوسرے کو لازم ہیں (1)۔

[2] اگر تمہارا ہر کام رضا الٰہی اور اطاعت نبوی کے ماتحت ہوگا تو تمہیں امن و سکون کے ساتھ اچھی زندگی مہیا ہوگی۔ کیونکہ جس طرح معصیت اور گناہ مصائب و بلیات کا سبب بنتے ہیں اسی طرح نیکی اور بھلائی اچھی اور پر سکون زندگی کا باعث بنتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے مَاۤ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَ يَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ۔ بعض علماء فرماتے ہیں عیش حسن سے مراد قسمت کے لکھے پر راضی ہونا اور تقدیر پر صبر کرنا ہے۔

[3] یعنی توحید الٰہی کی مالا جپنے اور سنت نبوی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنانے کے بعد تمہیں مرتے دم تک لذت و راحت اور آرام و سکون سے لطف اندوز کیا جائے گا کیونکہ موت کا وقت اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقرر ہے، اس میں لمحہ بھر تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔

[4] وہ قدر دان پروردگار ہر دین و عمل میں زیادہ کوشش کرنے والے کو زیادہ جزاء دے گا یعنی دنیا میں نیکیوں کی کثرت کی توفیق طمانیت قلب، یاد الٰہی میں ذوق و شوق اور بشارتوں سے نوازے گا اور آخرت میں اعمال پر زیادہ ثواب اور مدارج قرب سے سرفراز فرمائے گا۔

[5] تولوا اصل میں تتولوا تھا ایک تاء کو حذف کیا گیا ہے، یعنی اگر تم اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی عبادت سے منہ موڑ و گے تو مجھے تم پر اس بڑے دن کے عذاب کا خدشہ ہے جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے بلکہ جس کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ یعنی مجھے تم پر قیامت کے دن کے عذاب کا اندیشہ ہے۔

اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ ۚ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ ۝

”اللہ کی طرف ہی تمہیں لوٹ کر جانا ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے [1]“

[1] یعنی دنیا و آخرت میں تمہارے تمام امور کا مرجع اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور وہ نیک اعمال پر جزاء دینے اور برے اعمال پر سزا دینے پر دونوں جہانوں میں قادر ہے، کوئی چیز اس کی دسترس سے باہر نہیں ہے۔ یہ جملہ سابقہ آیات اور احکامات کی تقریر اور ثبوت کے لئے ہے۔

اَلَاۤ اِنَّهُمْ يَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ لِيَسْتَخْفُوْا مِنْهُ ؕ اَلَا حِيْنَ يَسْتَغْشُوْنَ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 190 (الفکر)

ثِيَابَهُمْ ۙ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۚ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝

''وہ دہرا کر رہے ہیں اپنے سینوں کو تاکہ چھپالیں اللہ تعالیٰ سے (اپنے دلوں کا بغض) سنتے ہو! جس وقت وہ خوب اوڑھ لیتے ہیں اپنے کپڑے تو اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو وہ چھپاتے ہیں اور جو وہ ظاہر کرتے ہیں بلاشبہ وہ خوب جاننے والا ہے جو کچھ سینوں میں (پوشیدہ) ہے''

لہ ہ ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ ہے۔ امام بخاری نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ مسلمان جب خلاء میں قضاء حاجت کے لئے جاتے تو شرم محسوس کرتے کہ ہم اپنی شرمگاہوں کو آسمان کی طرف کھلا رکھیں اور اپنی بیویوں سے ازدواجی تعلقات قائم کریں اور ہمارے ستر کھلے ہوں۔ اس سے بھی حیاء محسوس کرتے تھے۔ تو ان حالات کے پیش نظر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی (1)۔ اسی طرح ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم ابوالشیخ اور ابن مردویہ نے محمد بن عباد بن جعفر سے، انہوں نے ابن عباس سے روایت کی ہے اور ابن ابی شیبہ، ابن جریر اور ابن المنذر نے ابی ملیکہ کے طریق سے نقل کی ہے، فرماتے ہیں میں نے ابن عباس کو یہ آیت اَلَآ اِنَّهُمْ يَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ لِيَسْتَخْفُوْا مِنْهُ پڑھتے ہوئے سنا، انہوں نے فرمایا لوگ اپنی عورتوں کے پاس جاتے اور قضاء حاجت کے لئے جاتے تو شرمگاہوں کے آسمان کی طرف کھلے ہونے کو ناپسند فرماتے تھے (2) امام بغوی فرماتے ہیں۔ عبداللہ بن شداد نے فرمایا یہ آیت بعض منافقین کے حق میں نازل ہوئی ہے جو حضور نبی کریم ﷺ کے پاس سے گزرتا تو سینے اور پیٹھ کو دہرا کرتا اور سر کو جھکا لیتا اور اپنے چہرے کو ڈھانپ لیتا تاکہ نبی کریم ﷺ اسے پہچان نہ لیں (3)۔ اسی طرح ابن جریر وغیرہ نے بھی عبداللہ بن شداد بن الہاد سے روایت کیا ہے۔

منافقین کے لفظ میں نظر ہے کیونکہ یہ آیت مکیہ ہے اور نفاق کا اظہار مدینہ طیبہ میں ہوا تھا۔ اس صورت میں منہ کی ضمیر کا مرجع نبی کریم ﷺ ہوں گے۔ امام بغوی لکھتے ہیں ابن عباسؓ نے فرمایا یہ اخنس بن شریق کے حق میں نازل ہوئی ہے۔ یہ شخص بڑا شیریں کلام اور خوش شکل تھا۔ حضور ﷺ کے سامنے ایسی باتیں کرتا جو آپ ﷺ کو اچھی لگتی تھیں مگر دل میں حضور ﷺ کے متعلق برعکس اور برائی سوچا تھا (4)۔ یثنون صدورھم کا معنی ہے وہ اپنے سینوں میں کفر دشمنی اور نبی کریم ﷺ کی عداوت کو چھپائے ہوئے ہیں۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں وہ اپنے سینوں کو ٹیڑھا کرتے تاکہ اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اللہ کے ذکر کو نہ سنیں۔ السدی کہتے ہیں یثنون کا معنی یعرضون بقلوبھم ہے اور یہ ثنیت عنانی سے ہے۔ ابن عباس نے بخاری کی روایت میں تثنونی صدورھم تاء اور یاء کے ساتھ صدور کی طرف نسبت کر کے پڑھا ہے اور یہ یثنونی سے مشتق ہوگا۔ یہ مبالغہ کے لئے وزن بنایا گیا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کافر اپنے اپنے گھروں میں داخل ہوتے تو پردے لٹکا دیتے' پیٹھ دہری کر لیتے اور اپنے کپڑے لپیٹ دیتے اور کہتے کیا اللہ تعالیٰ میری قلبی کیفیات جانتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

اَلَا حِيْنَ يَسْتَغْشُوْنَ ثِيَابَهُمْ (یعنی وہ اپنے سروں کو کپڑوں کے ساتھ ڈھانپتے ہیں)

لہ اللہ تعالیٰ ان کی باطنی کیفیات قلبی رجحانات اور ظاہری حالات کو جانتا ہے اور جو وہ اپنی زبانوں سے بکتے ہیں اس کو بھی جانتا ہے بلکہ وہ تو ایسی ذات بابرکات ہے جو نہاں خانہ دل میں اٹھنے والے خیالات و تصورات کو بھی جانتا ہے، اس سے کوئی چیز مخفی نہیں ہے۔ اے کافرو! تمہاری یہ چھپی ہوئی مکاریاں اور فریب کاریاں اور راتوں کے اندھیروں میں تیار شدہ دشمنیاں وہ علیم و خبیر خدا اپنے رسول مکرم

1۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 579 (العلمیہ)
2۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 579 (العلمیہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 191 (الفکر)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 191 (الفکر)

ﷺ اور مومنین پر آشکارا کر دے گا۔

وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَ يَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَ مُسْتَوْدَعَهَا ؕ كُلٌّ فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝

”اور نہیں کوئی جاندار زمین مگر اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے اس کا رزق [1]۔ وہ جانتا ہے اس کے ٹھہرنے کی جگہ کو اور اس کے امانت رکھے جانے کی جگہ کو [2]۔ ہر چیز روشن کتاب میں (لکھی ہوئی) ہے [3]“

[1] دابہ ہر اس حیوان کے لئے استعمال ہوتا ہے جو زمین پر چلتا ہے۔ وہ پروردگار اپنے فضل اور مہربانی سے ہر جاندار کی کفالت فرماتا ہے۔ یہاں عَلَى اللّٰهِ کے الفاظ ہیں جو وجوب پر دلالت کرتے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز واجب نہیں ہے۔ چونکہ رزق کا پہنچنا تحقیقی اور یقینی تھا اس لئے ایسی ترکیب ذکر فرمائی۔ دوسرا فائدہ اس اسلوب کا یہ ہے کہ ہر جاندار کو بھروسہ فقط اسی ذات پر ہو۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ یہاں علیٰ بمعنی من ہے اور رزقها میں اضافت عہدی ہے یعنی وہ رزق جو ایک بندے کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے معہود و معلوم ہے۔ پس اللہ تعالیٰ ہی اس کا کفیل ہے اور اسی کی طرف سے ہی وہ رزق ملے گا۔ مجاہد فرماتے ہیں جو بھی رزق ملتا ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے۔ بعض اوقات وہ رزق نہیں پہنچاتا حتیٰ کہ وہ جاندار بھوک سے مر جاتا ہے۔

[2] امام بغوی نے لکھا ہے کہ ابن مقسم فرماتے ہیں اور ابن عباس سے بھی یہ مروی ہے کہ مستقرها سے مراد وہ جگہ ہے جہاں انسان اپنے شب و روز گزارتا ہے اور مستودعها سے مراد وہ جگہ ہے جہاں انسان دفن ہوتا ہے۔ ابن مسعود فرماتے ہیں مستقر سے مراد ماؤں کے ارحام ہیں اور مستودع سے مراد باپوں کے اصلاب ہیں۔ یہ قول سعید بن جبیر علی بن طلحہ اور عکرمہ نے ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں مستقر سے مراد جنت یا دوزخ ہے اور مستودع سے مراد قبر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جنت اور دوزخ کی صفت اس لفظ سے بیان فرمائی ہے۔ فرمایا حسنت مستقرا۔ جنت اچھا ٹھکانا ہے وساءت مستقرا اور دوزخ برا ٹھکانا ہے(1)۔

[3] ہر جانور، اس کے احوال اور اس کا مناسب رزق تمام کا تمام لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے یا فرشتوں کے رجسٹروں میں لکھا ہوا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عمرو سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کی تخلیق سے پچاس ہزار سال پہلے مخلوق کی تقدیروں کو لکھ دیا تھا اور فرمایا اس کا عرش (اس وقت) پانی پر تھا(2)۔ اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابن مسعود سے مروی ہے، فرماتے ہیں صادق و مصدوق اللہ کے رسول ﷺ نے ہمیں بتایا کہ تمہاری تخلیق ان مراحل سے گزر کر ہوتی ہے، چالیس دن ماں کے پیٹ میں نطفہ، پھر چالیس دن علقہ، پھر چالیس دن مضغہ کی حیثیت سے رہتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ چار ارشادات کے ساتھ ایک فرشتہ بھیجتا ہے جو اس کا عمل اس کی عمر اس کا رزق اور اس کا سعادت مند یا بد بخت ہونا لکھ دیتا ہے(3)۔ اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔ حضرت ابو درداء سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی تخلیق کے ساتھ پانچ چیزوں سے فارغ ہو جاتا ہے: اس کی عمر، اس کا عمل، اس کی آرام گاہ، اس کا اثر اور اس کا رزق(4)۔ اس حدیث کو امام احمد نے نقل کیا ہے۔ گویا اس آیت کا مقصود یہ ہے کہ وہ ذات تمام معلومات کی عالم ہے اور اس کے بعد والی آیات میں ہے کہ وہ تمام ممکنات پر مکمل

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 192 (الفکر)
2۔ مشکوٰۃ المصابیح، جلد 1، صفحہ 67 (الفکر)
3۔ مشکوٰۃ المصابیح، جلد 1، صفحہ 67 (الفکر)
4۔ مشکوٰۃ المصابیح، جلد 1، صفحہ 67 (الفکر)

تصرف کی قدرت رکھتا ہے اس کی ذات وحدہ لاشریک ہے۔ اس کا وعدہ اور وعید متحقق اور ثابت ہے۔

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ وَّكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ وَلَئِنْ قُلْتَ اِنَّكُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ مِنْۢ بَعْدِ الْمَوْتِ لَيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝

"اور وہی (خدا) ہے جس نے پیدا فرمایا آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں [1] اور (اس سے پہلے) اس کا عرش پانی پر تھا [2] (زمین اور آسمان پیدا کئے) تاکہ آزمائے تمہیں کہ تم میں سے کون اچھا ہے عمل کے لحاظ سے [3] اور اگر آپ (انہیں) کہیں کہ یقیناً تم اٹھائے جاؤ گے موت کے بعد تو ضرور کہیں گے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا کہ نہیں ہے یہ مگر جادو کھلا ہوا [4]"

[1] آسمانوں اور زمینوں اور جو کچھ ان میں ہے تمام کو چھ دوروں میں پیدا فرمایا۔ یا السموات سے مراد جہت علو (اوپر) ہے اور ارض سے مراد جہت سفل (نیچے) ہے اور پھر سموات کو جمع اور الارض کو مفرد ذکر کرنے میں یہ اشارہ ہے کہ علویات اصل اور ذات کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور سفلیات ایک جیسی ہیں۔

[2] آسمانوں اور زمین کی تخلیق سے پہلے اللہ تعالیٰ کا عرش پانی پر تھا۔ امام بغوی فرماتے ہیں وہ پانی ہوا کے متن پر تھا۔ حضرت کعب الاحبار فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے سبز یاقوت پیدا فرمایا پھر اس کی طرف ہیبت کی نظر سے دیکھا تو وہ پانی بن گیا اور کانپنے لگا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ہوا کو پیدا فرمایا اور اسے ہوا کے متن پر ٹھہرایا۔ پھر اس پانی پر اپنا عرش رکھا۔ حضرت ضمرہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کا عرش پانی پر تھا پھر اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمایا اور قلم کو پیدا فرمایا۔ پھر قلم کے ساتھ جو کچھ ہونا تھا اور جو اس نے پیدا کرنا تھا سب کچھ لکھ دیا۔ پھر قلم کسی تخلیق سے پہلے ہزار سال اللہ تعالیٰ کی تسبیح اور بزرگی بیان کرتا رہا (1)۔ امام بخاری نے عمران بن حصین سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ تھا اور اس سے پہلے کچھ نہ تھا اور اس کا عرش پانی پر تھا۔ پھر اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمایا اور ہر چیز کا ذکر (لوح محفوظ) میں لکھا ہے (2)۔ عرش کے متعلق جو اخبار وارد ہیں ان کا ذکر ہم نے آیت الکرسی کی تفسیر میں کر دیا ہے۔

[3] وہ ہمہ بین وہمہ دان خدا تمہارے احوال اور باطنی کیفیات سے پہلے بھی واقف ہے۔ یہ احکام اس لئے ہیں کہ تمہارے اچھے اعمال پر اچھی جزاء اور تمہارے برے اعمال پر بری جزاء مرتب کی جائے کیونکہ اس عمل سے پہلے اس کی جزاء یا سزا دینا عادت الٰہیہ نہیں ہے اور آسمان وزمین اور ان میں جو کچھ ہے تمہاری معیشت اور تمہاری بقا اور تمہاری نشوونما کے اسباب ہیں۔ ان تمام کا تقاضا یہ ہے کہ تم ان نعمتوں سے فائدہ اٹھا کر اس کا شکر ادا کرو۔ نیز زمین وآسمان کی تخلیق میں ایسے روشن دلائل اور واضح علامات ہیں جن کے ذریعے تم اپنے خالق اور صانع کی معرفت اور اپنے پروردگار کی قدرت کاملہ کی پہچان کر سکتے ہو۔ لیبلوکم کا قول خلق کے متعلق ہے اور اس میں اشارہ ہے کہ آسمان اور زمین کی تخلیق اور ان میں گوناں گوں انسان کی بہتری کی چیزوں کی تخلیق بالذات مقصود نہیں بلکہ یہ مکلفین کی تخلیق کے لئے بلکہ مومنین کی تخلیق کے لئے نہیں بلکہ جواز روئے اعمال اچھے لوگ ہیں۔ ان کی تخلیق کے لئے بطور تمہید وتوطیہ پیدا کی گئی ہیں اور وہ اعمال کے لحاظ سے بہتر لوگ کون ہیں؟ وہ ہمارے آقا ومولا محمد ﷺ اور آپ کے متبعین اور آپ کے مشابہ اعمال کرنے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 193 (الفکر)
2۔ تفسیر کبیر، جلد 18، صفحہ 205 (العلوم والحکم)

والے لوگ ہیں۔ یہاں عمل سے مراد ہر عمل ہے خواہ وہ جوارح ظاہری سے ہو یا دل کی نیت سے ہو۔ ابن المنذر، ابن ابی حاتم، ابن مردویہ اور الحاکم نے التاریخ میں ایک ضعیف سند کے ساتھ نبی کریم ﷺ سے روایت نقل کی ہے کہ آپ ﷺ نے ایکم احسن عملاً کی تفسیر میں فرمایا جو اللہ کی محارم سے پرہیز کرنے والا ہو(1) اور اس کے احکام کی اطاعت میں تیزی کرنے والا ہو۔ اعمال میں سب سے بہتر دل کے اعمال ہیں اور اعمال میں سب سے خوب تر اللہ کی محبت اس کے ذکر میں مشغولیت اور اس کی ذات میں استغراق ہے۔ پس زمین و آسمان کی تخلیق سے مقصود اہل اللہ کا وجود ہے۔ اس آیت کے الفاظ میں اسم تفضیل کے صیغہ ''احسن'' میں علم و عمل کے مراتب میں ہمیشہ ترقی کرنے پر برانگیختہ کیا گیا ہے۔

۲؎ اگر تم انہیں کہو کہ تم مرنے کے بعد اٹھائے جاؤ گے تو کافر کہتے ہیں یہ دوبارہ زندہ ہونا یا دوبارہ زندہ کرنے کی بات یا قرآن جس کی آیات میں دوبارہ اٹھنے کا ذکر ہے یہ جادو کی طرح دھوکہ اور باطل ہے۔ حمزہ اور کسائی نے الا ساحر پڑھا ہے یعنی ھذا کا مشار الیہ قیامت کا ذکر کرنے والا ہے اور ساحر مبطل اور جھوٹا ہے۔

وَلَئِنْ اَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِلٰۤى اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ لَّيَقُوْلُنَّ مَا يَحْبِسُهٗ ؕ اَلَا يَوْمَ يَاْتِيْهِمْ لَيْسَ مَصْرُوْفًا عَنْهُمْ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝۸

''اور اگر ہم ملتوی کر دیں ان سے عذاب کچھ عرصہ تک ۱؎ تو (از راہ مذاق) کہیں گے کہ کس چیز نے روک دیا ہے اس عذاب کو وہ کان کھول کر سن لیں جس دن عذاب آئے گا ان پر تو نہیں پھیرا جا سکے گا ان ۲؎ سے اور گھیر لے گا انہیں وہ عذاب جس کا وہ تمسخر اڑایا کرتے تھے ۳؎''

۱؎ ابن ابی حاتم نے قتادہ سے روایت کیا ہے کہ جب اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ کا ارشاد نازل ہوا تو لوگوں نے کہا قیامت قریب ہے اس لئے کچھ وقت کے لئے جرائم اور معصیوں سے رک گئے مگر وقت گزرنے کے ساتھ پھر وہ برے اعمال اور باعث شرم افعال میں گرفتار ہو گئے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اَتٰۤى اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ کا ارشاد نازل فرمایا تو لوگوں نے کہا اللہ کا حکم آنے والا ہے اس لئے اس زمانہ کے لوگ برائیوں سے اجتناب کرنے لگے مگر پھر کچھ وقت کے گزرنے کے بعد سابقہ مکاریوں اور نفس فریبیوں میں مبتلا ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ وَلَئِنْ اَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِلٰۤى اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ الخ نازل فرمائی(2)۔ ابن جریر نے ابن جریج سے اسی کی مثل روایت کی ہے۔

یہاں امت کا معنی وقت ہے۔ القاموس میں امۃ کے معانی میں ایک الحین بھی ذکر کیا گیا ہے جس کا معنی وقت ہے(3)۔ امام بغوی لکھتے ہیں الی اجل معدود۔ اصل میں امہ کا معنی جماعت ہے۔ گویا یوں کہا گیا ہے کہ ایک جماعت کے ختم ہونے اور دوسری جماعت کے آنے تک(4)۔ امام بیضاویؒ فرماتے ہیں اِلٰى جَمَاعَةٍ مِّنَ الْاَوْقَاتِ مَعْدُوْدَةٍ اَیْ قَلِيْلَةٍ(5)۔ یعنی تھوڑے اوقات تک۔

۲؎ کافر از راہ مذاق کہیں گے اس عذاب کو واقع ہونے سے کونسی چیز مانع ہے۔ غور سے سنو اللہ کے علم میں عذاب کا وقت مقرر ہے، جب

1۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 582 (العلمیہ)
2۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 583 (العلمیہ)
3۔ القاموس المحیط، جلد 2، صفحہ 1420 (التراث العربی)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 193 (الفکر)
5۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 5، صفحہ 130 (العلمیہ)

وہ عذاب آجائے گا جیسے جنگ بدر کا دن آیا تھا تو عذاب ان سے پھیرا نہیں جائے گا۔ یوم کی نصب معروفا کی وجہ سے ہے۔

۲ یہاں تحقیق اور تہدید میں مبالغہ پیدا کرنے کے لئے مستقبل کے صیغہ کی جگہ ماضی کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ یعنی جس عذاب کے لئے وہ جلدی مچا رہے تھے اور تمسخر اڑاتے ہوئے کہتے اس عذاب کو کس نے روکا ہے تو وہ انہیں گھیر لے گا۔ یَسْتَعْجِلُوْنَ کی جگہ یستھزء ون استعمال کیا گیا ہے۔

وَلَىِٕنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ ۚ اِنَّهٗ لَيَـُٔوْسٌ كَفُوْرٌ ﴿۹﴾

"اور اگر ہم چکھائیں کسی انسان کو اپنی طرف سے رحمت کا (مزہ) پھر ہم چھین لیں اس رحمت کو اس سے تو وہ بڑا مایوس اور ناشکرا بن جاتا ہے ۱۔"

۱ یہاں انسان سے جنس انسان مراد ہے۔ کوئی مخصوص فرد نہیں اور رحمت سے صحت امن وعافیت وغیرہ مراد ہے اور لئن پر لام مقدر قسم کا شعور دیتا ہے۔ ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ میں ھا سے مراد نعمت ہے اور ہ کا مرجع انسان ہے جواب قسم اور شرط کی جزاء اِنَّهٗ لَيَـُٔوْسٌ كَفُوْرٌ ہے۔ یئوس مبالغہ کا صیغہ ہے جو شخص انتہائی مایوس ہو جسے اس چھنی ہوئی نعمت کے دوبارہ ملنے کی قطعاً کوئی امید نہ ہو اور صبر کی قلت اور ذات پر اعتماد اور قضاء الہٰی کے تسلیم نہ کرنے کی وجہ سے اللہ کے فضل عظیم سے امیدیں توڑ چکا ہو۔ کفور بھی مبالغہ کا صیغہ ہے یعنی بہت ناشکرا ہے۔ کیونکہ سابقہ گوناگوں نعمتوں کو اور موجودہ بے شمار نعمتوں کے احسان کو بھول جانے والا ہے کیونکہ انسان کبھی بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے کلیۃً محروم نہیں ہوتا (لیکن اس کی ناشکری کی حد ہے کہ تھوڑی سی آزمائش پر شکوہ وشکایت شروع کر دیتا ہے۔ جبکہ کسی ایک نعمت کے چھن جانے کے بعد بھی تو اکی کروڑوں نعمتیں استعمال کر رہا ہوتا ہے)

وَلَىِٕنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ ؕ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ ﴿۱۰﴾

"اور اگر ہم چکھاتے ہیں اسے کوئی نعمت اس تکلیف کے بعد جو اسے پہنچی تو وہ کہہ اٹھتا ہے کہ دور ہو گئیں سب تکلیفیں مجھ سے بیشک وہ بڑا خوش ہونے والا اترانے والا ہے ۱۔"

۱ مسته۔ یہ ترکیبی اعتبار سے ضراء کی صفت ہے۔ لیقولن یہ قسم اور شرط کا جواب ہے۔ اگر مصائب وآلام بیماری ورنجوری سے نجات ملتی ہے تو اسے اللہ تعالیٰ کا فضل واحسان نہیں سمجھتا اور اس کا شکریہ ادا نہیں کرتا بلکہ مصائب کے دور ہونے کو حادثات زمانہ کی طرف منسوب کرتا ہے۔ اور اس صحت عزت اور مال ودولت کے ملنے پر اتراتا اور تکبر کرتا ہے۔ فرح دل کی اس لذت کو کہتے ہیں جو خواہش اور آرزو کے پورا ہونے کے بعد پیدا ہوتی ہے اور لوگوں پر فخر کرتا ہے اور ان تمام نعمتوں کو اپنا ذاتی استحقاق سمجھتا ہے اور لوگوں سے اپنے آپ کو بلند گمان کرتا ہے اور خوشی اور تکبر کی وجہ سے اپنے کریم پروردگار کے شکر کو بھول جاتا ہے۔

اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ اُولٰٓىِٕكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ﴿۱۱﴾

"مگر وہ لوگ جو صبر کرتے ہیں اور نیک کام کرتے ہیں (وہ ایسے کم ظرف نہیں ہوتے) ۱ وہی ہیں جن کے لئے بخشش بھی ہے اور بڑا اجر بھی ہے ۲۔"

۱؎ یہ انسان سے مستثنیٰ ہے، یعنی مومنین جنس انسانیت میں ایک منفرد خصوصیت کے حامل ہوتے ہیں، نہ وہ اپنے رب کریم کے فضل وکرم سے مایوس ہوتے ہیں اور نہ نعمت کے چھن جانے پر شکوہ وشکایت کرتے ہیں بلکہ ہمیشہ اللہ کے فضل کے امیدوار رہتے ہیں نیز موجودہ اور سابقہ نعمتوں پر شکر ادا کرتے رہتے ہیں اور نہ اپنے رب کے انعامات ونوازشات پر لوگوں سے اپنے آپ کو بڑا سمجھتے ہیں بلکہ ہمیشہ اپنے پروردگار کی نعمتوں پر سراپا سپاس رہتے ہیں۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کی جگہ مومنین کا لفظ ذکر نہیں فرمایا ان صفات کے ذکر سے یہ شعور دلانا مقصود تھا کہ وہ تکالیف میں صبر کرتے ہیں اور خوشحالی اور اقبال مندی کے وقت شکر کے طور پر نیک اعمال کرتے ہیں۔ حضرت صہیبؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا واہ! مومن کی ہر حالت خیر ہوتی ہے۔ اور یہ نعمت صرف مومن کو ہی حاصل ہے، اگر اسے خوشحالی نصیب ہو تو وہ شکر کرتا ہے، یہ اس کے لئے خیر ہے اور اگر اسے کوئی تکلیف پہنچے تو وہ اس پر صبر کرتا ہے تو یہ تکلیف بھی اس کے لئے خیر ہے۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے(1)۔ فراء نحوی کہتا ہے یہ مستثنیٰ منقطع ہے۔ معنی یہ ہے کہ صبر کرنے والے اور نیک اعمال کرنے والے ایسے لوگ ہیں اگر انہیں کوئی مصیبت پہنچے تو وہ صبر کرتے ہیں اور کوئی نعمت ملے تو شکر کرتے ہیں۔ فراء کے قول کے مطابق الانسان پر الف لام عہدی ہوگا (یعنی جب ہم کافر انسان جس کا ذکر گزر چکا ہے کو نعمت عطا فرماتے) کیونکہ مستثنیٰ منقطع اسی صورت میں بن سکتا ہے۔

۲؎ صابر وشاکر لوگوں کے لئے گناہوں کی بخشش اور اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کی نعمتوں بھری جنت ہے۔ حضرت عیاض بن حمار المجاشعی سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے میری طرف وحی بھیجی ہے کہ تم تواضع اور انکساری اختیار کرو حتیٰ کہ کوئی ایک دوسرے پر فخر نہ کرے اور کوئی ایک دوسرے پر بغاوت نہ کرے۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے(2)۔

فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا يُوْحٰۤى اِلَيْكَ وَضَآئِقٌۢ بِهٖ صَدْرُكَ اَنْ يَّقُوْلُوْا لَوْلَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ ؕ اِنَّمَاۤ اَنْتَ نَذِيْرٌ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ﴿۱۲﴾

”پس کیا یہ ہو سکتا ہے کہ آپ چھوڑ دیں کچھ حصہ اس کا جو وحی کی جاتی ہے آپ کی طرف ۱؎ اور تنگ ہو جائے اس کے ساتھ آپ کا سینہ (اس اندیشہ سے) کہ کافر کہیں گے کہ کیوں نہ اتارا گیا اس پر خزانہ ۲؎ یا کیوں نہ آیا اس کے ساتھ کوئی فرشتہ ۳؎ آپ تو صرف ڈرانے والے ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کا نگہبان ہے ۴؎“

۱؎ اے پیارے حبیب ﷺ کیا آپ ان آیات کو چھوڑ دیں گے جن میں بتوں کی مذمت کی گئی ہے۔ یہ اس وقت آیت نازل ہوئی جب کفار نے کہا کہ آپ کے اس قرآن پر ہم ایمان نہیں لاتے کیونکہ اس میں ہمارے خداؤں کی برائی اور مذمت بیان ہوتی ہے، آپ ایسا قرآن لائیے جس میں ہمارے خداؤں کو برا بھلا نہ کہا گیا ہو۔ امام بغوی نے اس آیت کے نزول کی یہی توجیہ لکھی ہے(3)۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں کسی کام کی توقع سے اس چیز کا وقوع لازم نہیں ہوتا۔ اس لئے اس چیز سے بھی منع کرنا جائز ہے جس سے انسان پہلے ہی محفوظ ہو۔ تو نبی کریم ﷺ وحی میں ذرہ برابر خیانت سے اور تبلیغ میں تقیہ سے پہلے ہی محفوظ ومعصوم تھے۔ اس لئے اس آیت سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپ سے کوئی ایسا فعل سرزد ہونے والا تھا جس سے پہلے روکا گیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ امام بیضاوی کے اس مفہوم سے وہ اعتراض بھی اٹھ گیا جس میں کہا جاتا ہے کہ اللہ کی طرف سے لعل کا استعمال واجب الوقوع کے معنی میں ہوتا ہے۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 18، صفحہ 98 (العلمیہ) 2۔ مشکوٰۃ المصابیح، جلد 3، صفحہ 54-53 (الفکر) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 195 (الفکر)

۱ بہ کی ضمیر مبہم ہے جس کی تفسیر بعد میں ہے اَنْ يَّقُوْلُوْا لَوْلَآ میں لولا بمعنی ھلا ہے انزل علیہ میں ہ ضمیر کا مرجع محمد ﷺ ہیں۔ کنز وہ خزانہ جیسے رعایا پر بادشاہوں جیسے لوگ خرچ کرتے ہیں۔

۲ یا کوئی فرشتہ ان کے ساتھ ہوتا جو ان کی تصدیق کرتا۔ عبداللہ بن امیہ المخزومی نے یہی مفہوم بیان کیا ہے یعنی آپ ان کی ان ہرزہ سرائیوں اور یاوہ گوئیوں سے دل تنگ ہوں گے اور یہ معنی بھی جائز ہے کہ شاید آپ ان کی ان بے رخیوں کی وجہ سے آپ ان کو وحی شدہ آیات کی تبلیغ نہ کریں گے اور اس ترک تبلیغ سے آپ کا سینہ تنگی اور گھٹن محسوس کرے گا۔ یقیناً امر الٰہی کا ترک دل تنگی اور گھٹن کا باعث بنتا ہے۔ جس طرح کہ احکام الٰہیہ کا بجا لانا شرح صدر کی وجہ سے بنتا ہے، یعنی ان کے اس کہنے سے کہ ان پر خزانہ کیوں نہیں اتارا گیا، ان کے ساتھ فرشتہ کیوں نہیں بھیجا گیا، اگرچہ رسول برحق ہیں آپ دل تنگ ہوں گے اور ان کے انکار اور استہزاء کی وجہ سے آپ ان کو تبلیغ کرنا چھوڑ دیں گے۔

۳ اے حبیب لبیب آپ کے ذمہ تو فقط وحی الٰہی کے ذریعے انہیں عذاب وعقاب سے ڈرانا ہے، اگر یہ نہیں مانتے بلکہ الٹا مذاق کرتے ہیں تو آپ پر اس کا کوئی مواخذہ نہیں۔ اگر یہ ان آیات کو رد کرتے ہیں اور اپنی لایعنی تجویز پیش کرتے ہیں اس کے علاوہ کوئی قرآن لاؤ تو آپ پر ان کے اس بیہودہ کلام کی وجہ سے کوئی سوال نہ ہوگا کیا وجہ ہے کہ آپ ان کی باتوں کی وجہ سے یا ان کے انکار کی وجہ سے تبلیغ کو ترک کر دیں گے یا ان کے قول کی وجہ سے آپ دل میں تنگی محسوس کریں گے۔ جو وہ بک رہے ہیں اللہ تعالیٰ اسے محفوظ کر رہا ہے اور اس پر انہیں ضرور سزا دے گا۔

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ ۖ قُلْ فَأْتُوا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهِ مُفْتَرَيَاتٍ وَادْعُوا مَنِ اسْتَطَعْتُم مِّن دُونِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿١٣﴾

"کیا کفار کہتے ہیں کہ اس نے یہ (قرآن خود) گھڑ لیا ہے ۱ آپ فرمایئے (اگر ایسا ہے) تو تم بھی لے آؤ دس سورتیں اس جیسی گھڑی ہوئی اور بلا لو (اپنی مدد کے لئے) جس کو بلا سکتے ہو اللہ تعالیٰ کے ۲ سوا اگر تم (اس الزام تراشی) میں سچے ہو ۳"

۱ ام منقطعہ ہے اور اس میں استفہام انکاری ہے۔ معنی یہ ہوگا بل یقولون (بلکہ وہ کہتے ہیں) افتراہ میں ہ ضمیر کا مرجع ما یوحی ہے۔

۲ اگر یہ سوال ہو کہ سورۂ یونس میں ایک سورت کا چیلنج ہوا تھا اور وہ اس کو قبول کرنے سے عاجز ہو گئے تھے۔ تو پھر یہاں دس سورتوں کے ساتھ چیلنج کیوں کیا گیا ہے، یہ تو ایسے ہی ہے کہ ایک آدمی کو ایک درہم دینے کو کہا گیا ہے، اس نے عجز ومعذرت ظاہر کر دی۔ پھر اس سے دس درہم دینے کا سوال کیا گیا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ سورۂ ہود پہلے نازل ہوئی جس میں دس سورتوں کا چیلنج تھا۔ جب وہ دس سورتیں پیش کرنے سے عاجز آ گئے تو معاملہ کو سہل کرتے ہوئے سورۂ یونس میں فرمایا ایک سورت پیش کرو۔ المبرد نے اس جواب کا انکار کیا ہے اور لکھا ہے کہ سورۂ یونس پہلے نازل ہوئی ہے اور خود اس نے مذکورہ سوال کا جواب یہ دیا ہے کہ سورۂ یونس فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّثْلِهِ میں یہ چیلنج تھا کہ تم ایسا کلام پیش کرو جس میں اس جیسی غیب کی خبریں ہوں اور سابقہ کتب کے مطابق وعدے وعیدیں اور احکام ہوں مگر وہ اس مقابلہ سے عاجز آ گئے پھر انہیں اپنی فصاحت وبلاغت پر بڑا ناز تھا تو سورۂ ہود میں فرمایا تم بڑے نثر نگار اور شعر گو ہو اور اپنی فصاحت وبلاغت پر نازاں ہو، ذرا صرف فصاحت وبلاغت اور حسن نظم میں کوئی شاہ پارہ اس کے مقابلہ میں لاؤ۔ (مگر وہ اس

سے بھی عاجز رہے)۔ میں کہتا ہوں پھر سورۂ بقرۃ میں فرمایا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ یعنی یہ قرآن فصاحت و بلاغت، نظم ونسق، واقعات واخبار، وعدہ اور وعید ہر اعتبار سے بے مثل اور یکتا ہے۔ اگر تم کہتے ہو کہ یہ قرآن حضور ﷺ نے خود گھڑا ہے تو تم بھی اپنی طرف سے اس جیسی دس سورتیں گھڑ کر پیش کر دو۔ تم بھی تو فصحاء عرب ہو تم بھی تو میری طرح زبان دانی پر قدرت رکھتے ہو بلکہ تمہارا تو مشغلہ بھی یہی ہے اور تمہیں اس میں مہارت بھی زیادہ ہے (کیوں ایسا نہیں کرتے)۔ تمہارا مجھ پر تو یہ الزام ہے کہ یہ قرآن میں نے اکیلے گھڑا ہے تو میں تمہیں مزید رخصت دیتا ہوں کہ تم خود بھی جمع ہو جاؤ اور عرب وعجم سے اپنے مزید حمائتیوں کو بھی بلا لو تا کہ وہ بھی تمہاری اس کام میں مدد کریں۔

۱۳ اے کافرو! اگر تم اس الزام تراشی میں سچے ہو کہ یہ قرآن میں نے خود گھڑا ہے۔ یہ شرط ہے اور اس کی جزاء محذوف ہے کیونکہ ماقبل کلام اس پر دلیل ہے۔

فَاِلَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ وَاَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۴﴾

"پس اگر وہ نہ قبول کر سکیں تمہاری دعوت ۱؎ تو پھر جان لو یہ قرآن محض علم الٰہی سے اتارا گیا ہے اور (یہ بھی جان لو کہ) نہیں کوئی معبود سوائے اللہ تعالیٰ کے ۲؎ پس کیا (اب) تم اسلام لے آؤ گے ۳؎"

۱؎ اگر وہ تمہاری دعوت کو قبول نہ کر سکیں لکم میں کم ضمیر یا تو نبی کریم ﷺ کی تعظیم کی خاطر جمع ذکر کی گئی ہے یا مومنین کے لئے ہے کیونکہ مومنین بھی کافروں کو یہ چیلنج دیتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کا یہ امر مومنین کو بھی شامل تھا کیونکہ آپ کی اتباع ہر معاملہ میں ان پر واجب تھی، سوائے اس امر کے جو آپ ﷺ کی ذات کے ساتھ کسی دلیل کی وجہ سے مخصوص تھا اور کم ضمیر اس بات پر تنبیہ کے لئے ہے کہ یہ چیلنج مومنین کی قوت یقین کو مستحکم کرتا تھا اور ان کے ایمان کی جڑوں کو مضبوط کرتا تھا۔ پس وہ اس چیلنج سے غافل نہیں تھے۔ اسی وجہ سے تو اس کلام پر فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ کو مرتب کیا گیا ہے۔ یہ دلیل ہے کہ کم ضمیر کا مرجع مومنین ہیں۔

۲؎ یا التباس کے لئے ہے یعنی یہ کلام اتارا گیا ہے اللہ کے اس علم کے ساتھ جسے اس کے سوا کوئی نہیں جانتا اور اس کے سوا اور کوئی اس پر قدرت نہیں رکھتا۔ وہ اس چیز کو جانتا ہے اور اس پر قدرت رکھتا ہے جس کو اور کوئی نہیں جانتا۔ اس لئے اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے اور یہ بھی اس کے معبود برحق ہونے کی دلیل ہے کہ کفار کے خدا اس کے مقابلہ اور معارضہ سے عاجز آ گئے اور یہ جملہ قرآن حکیم کے کلام الٰہی ہونے پر نص قائم کرنے کے لئے ہے کیونکہ یہ وہ کلام ہے جس کی صداقت اس کے اعجاز سے ثابت ہو چکی ہے۔ اس آیت کریمہ میں انہیں تہدید اور مایوس کرنا ہے اس بات سے جو وہ گمان کرتے تھے کہ اللہ کے عذاب سے ان کے بت انہیں محفوظ کر لیں گے۔

۳؎ اب تو تم اسلام پر ثابت قدم رہو گے اور اس میں اخلاص اور پختگی کا اظہار کرو گے کیونکہ تمہارے سامنے اس کلام کا اعجاز محقق ہو چکا ہے اور یہ بھی جائز ہے اس آیت میں مخاطبین مشرکین ہوں اور لم یستجیبوا کی ضمیر کا مرجع من استطعتم ہو۔ معنی یہ ہوگا اگر تمہارے حمائتی بھی تمہاری اس سلسلہ میں مدد نہ کریں اور اپنے عجز کا اظہار کر دیں اور تم خود پہلے اس کے مقابلہ سے شکست تسلیم کر چکے ہو تو پھر جان لو کہ یہ ایسا کلام ہے جو منزل من اللہ ہے اور اللہ کے سوا پہلے اس کی کسی کو خبر نہیں ہے اور تم یہ جان چکے ہو کہ اس قرآن نے

تمہیں جس توحید کی دعوت دی ہے وہ حق ہے تو کیا اب اتنے روشن دلائل اور قاطع براہین کے بعد تم اسلام میں داخل ہو گئے؟ اس استفہام میں ایجاب بلیغ ہے کیونکہ اس میں طلب کا معنی بھی ہے، موجب کے قیام پر تنبیہ بھی ہے اور عذر کا زوال بھی ہے۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ ﴿۱۵﴾

"جو طلبگار ہیں دنیوی زندگی اور اس کی زیب و زینت کے تو ہم پورا بدلہ دیں گے ان کے اعمال کا اس زندگی میں اور انہیں اس میں نقصان نہیں اٹھانا پڑے گا[1]"

[1] جو لوگ اپنے عمل اور اپنے احسانات سے دنیا کی بقاء اور صحت کا ارادہ کرتے ہیں اور اموال کی کثرت' اولاد کی زیادتی اور جاہ و حشمت اور بیویاں اور خدام کی غرض سے اعمال خیر کرتے ہیں تو ہم دنیا میں شہرت' ناموری وغیرہ کے ذریعے انہیں ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیں گے اور دنیا میں ان کے اجروں میں کوئی کمی نہ ہوگی۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ ۖ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶﴾

"یہ وہ لوگ ہیں نہیں ہیں جن کے لئے آخرت میں مگر آگ اور اکارت گیا جو کچھ انہوں نے دنیا میں کیا[1] اور (درحقیقت مٹ جانے والا تھا جو وہ کیا کرتے تھے[2]"

[1] کیونکہ دنیا میں ان کے اعمال حسنہ کا صلہ انہیں مل چکا ہوگا اور آخرت میں تو صرف ان کے لئے ان کے اعمال بد کا ثقیل بوجھ ہوگا۔ جو کچھ انہوں نے نیکیاں اور رفاہ عامہ کے کام کئے ہوں گے وہ سب رائیگاں ہوں گے اور آخرت میں ان کے لئے کوئی اجر و ثواب نہ ہو گا۔ کیونکہ دنیا میں ان کی اس ساری تگ و دو کا مطلب رضاء الٰہی نہیں بلکہ دنیا کی شہرت اور ناموری تھی۔ اس لئے اللہ تعالیٰ انہیں کوئی اجر نہیں عطا فرمائیں گے۔

فیہا کی ظرف یا تو حبط کے متعلق ہے اور ھا ضمیر کا مرجع آخرت ہے یا صنعوا کے متعلق ہے اور ھا ضمیر کا مرجع الدنیا ہے۔

[2] اور دنیا میں جو کچھ نیکی کے کام انہوں نے کئے وہ سب خود بخود مٹ جائیں گے کیونکہ انہوں نے خلوص نیت سے رضاء الٰہی کی خاطر کام نہیں کیے تھے۔ گویا یہ دونوں جملے سابقہ کلام کی علت نہیں۔ اس کا ظاہر اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ یہ کفار کے حق میں ہے۔ امام بخاری نے عمر بن الخطاب سے ایک طویل حدیث نقل کی ہے۔ جس میں ہے حضرت عمر فرماتے ہیں میں نے حضور نبی کریم ﷺ کے کاشانہ اقدس میں نظر اٹھا کر دیکھا، مجھے صرف تین کچے چمڑے کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ میں نے عرض کی یارسول اللہ! دعا فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی امت پر وسعت فرمائے، فارس وروم پر خوشحالی ہے اور دنیا کے مال سے مالا مال ہیں حالانکہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت بھی نہیں کرتے۔ حضور نبی کریم ﷺ ٹیک لگا کر بیٹھے تھے۔ حضرت عمر کی یہ بات سنتے ہی آپ اٹھ بیٹھے۔ فرمایا اے عمر تمہاری زبان سے ایسی بات! وہ لوگ ایسے ہیں جنہیں دنیا میں ہی مال و ثروت دے دی گئی ہے مگر مومن وہ دنیا و آخرت دونوں میں نعمتوں کا ارادہ رکھتا ہے اور مومن کا ارادہ آخرت غالب۔ ہے پس اسے دنیا میں بھی نیک اعمال کی وجہ سے بہتر جائزہ ملے گی اور آخرت میں بھی ان نیکیوں پر ثواب

ملے گا(1)۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کسی مومن کی نیکی کو ضائع نہیں کرے گا بلکہ دنیا میں بھی اس پر بہتر ثمرہ مرتب ہوگا اور آخرت میں بھی اس پر عمدہ جزاء ہوگی۔ رہا کافر تو اسے دنیا میں نیکیوں کے بدلے کھانا کھلا دیا جائیگا حتیٰ کہ جب آخرت میں جائے گا تو اس کے پاس کوئی ایسی نیکی نہ ہوگی جس پر اسے خیر عطا کی جائے(2)۔ اس حدیث کو مسلم اور احمد نے روایت کیا ہے۔ میں کہتا ہوں لَیْسَ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ کا جملہ قرینہ ہے کہ یہ آیت کفار کے حق میں اتری ہے کیونکہ علماء امت کا اس پر اجماع ہے کہ مومن کا انجام یقیناً جنت ہے بعض علماء فرماتے ہیں یہ آیت ریاکاروں کے حق میں ہے۔ حضرت ابوسعید بن فضالہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا قیامت کے روز جب تمام لوگوں کو اللہ تعالیٰ جمع فرمائے گا جس دن کے وقوع میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے تو ایک ندا کرنے والا ندا کرے گا۔ جس نے اپنے عمل میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک ٹھہرایا اسے چاہئے کہ وہ اب غیر اللہ سے ثواب طلب کرے بیشک اللہ تعالیٰ شرکاء کے شرک سے بے نیاز ہے۔ اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے(3)۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ جو شخص طلب آخرت کے لئے نیک کام کرتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اس کے دل کو غنی کر دیتا ہے اس کے پراگندہ حال کو درست فرما دیتا ہے اور دنیا اسکے قدموں میں ذلیل ہو کر حاضر ہوتی ہے اور جس شخص کے پیش نظر دنیا کا حصول ہوتا ہے تو اس کی غربت اسکی آنکھوں کے سامنے کر دی جاتی ہے، اس کے حالات کو پراگندہ کر دیا جاتا ہے اور اس خستہ حالی کے باوجود دنیا اسے اتنی ہی ملتی ہے جتنی اس کے مقدر میں لکھی جا چکی ہے(4)۔ اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے اور اسی حدیث کو امام احمد اور دارمی نے ابان عن زید بن ثابت سے روایت کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد نُوَفِّ اِلَیْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِیْهَا وَهُمْ فِیْهَا لَا یُبْخَسُوْنَ۔ نبی کریم ﷺ کے ارشاد لا یاتیه الا ما کتب له۔ (اسے وہی ملے گا جو اس کی تقدیر میں لکھ دیا گیا) کے منافی نہیں ہے کیونکہ دنیا میں انہیں پورا پورا بدلہ ملنا ہی ان کے لئے لکھا ہوا ہے اور یہی ان کو بالضرور ملے گا لیکن اگر دنیا کا طالب مزید کے حصول کے لئے اپنی ساری صلاحیتیں صرف کر دے ایڑی چوٹی کا زور لگا دے تو بھی نوشتہ تقدیر سے زیادہ نہ ملے گا۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے اگر ابن آدم کے لئے سونے کی دو وادیاں ہوں تو وہ تیسری کا طلب گار ہوگا۔ میرا خیال یہ ہے کہ اگر یہ آیت ریاکاروں کے حق میں ہے تو پھر لَیْسَ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ کا معنی یہ ہوگا جو انہوں نے دکھاوے اور نمود و نمائش کے لئے اعمال کئے ان پر انہیں سوائے آگ کے اور کوئی جزاء نہ ملے گی۔

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وَیَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰۤى اِمَامًا وَّرَحْمَةً ؕ اُولٰٓئِكَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ یَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ ۚ فَلَا تَكُ فِیْ مِرْیَةٍ مِّنْهُ ۗ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۷﴾

"تو کیا وہ شخص (انکار کر سکتا ہے) جس کے پاس روشن دلیل ہو اپنے رب کی طرف سے اور اس کے پیچھے ایک سچا گواہ بھی آ گیا ہو اللہ تعالیٰ کی طرف سے [1] اور اس سے قبل کتاب موسیٰ بھی آ چکی ہو جو امام اور سراپا رحمت ہے؟ (قطعاً نہیں بلکہ) [2] یہ لوگ تو ایمان لائیں گے اس پر [3] اور جو کفر کرے اس کے ساتھ مختلف گروہوں سے تو آتش (جہنم) ہی اس

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 335 (وزارت تعلیم)
2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 374 (قدیمی)
3۔ مشکوٰۃ المصابیح، جلد 1، صفحہ 454 (قدیمی)
4۔ مشکوٰۃ المصابیح، جلد 1، صفحہ 454 (قدیمی)

کے وعدہ کی جگہ ہے؀ پس (اے سننے والے) نہ پڑ جا شک میں اس کے متعلق بلاشبہ یہ حق ہے تیرے رب کی طرف سے لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے ؀"

۱۔ کیا جس کے پاس اپنے رب کی طرف سے ایسی دلیل ہو جو حق اور صواب راہ کی طرف راہنمائی کرتی ہو (وہ انکار کر سکتا ہے) نہیں بلکہ وہ تو اللہ تعالیٰ کی عبادت کو بتوں کی عبادت پر اور ہمیشہ باقی رہنے والے دار آخرت اور اس کی دائمی نعمتوں کو دنیا کی فانی رہائش گاہ اور دنیا کی فانی لذتوں پر ترجیح دیتا ہے اس جملہ کی ترکیب نحوی اس طرح ہے کہ من موصول مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے اور فاء تعقیب کے لئے ہے اور ہمزہ حکم کے انکار کے لئے ہے کہ جس کی یہ شان ہے اس کو دوں ہمت اور دنیا کی فانی لذتوں پر اپنی فکر کو صرف کرنے والے کے ساتھ مشابہت نہ دو کیونکہ یہ کم ظرف لوگ لَیْسَ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ کا ارشاد سننے کے بعد آخرت کے متعلق نہیں سوچتے۔ اس واضح مفہوم کی وجہ سے خبر کی ضرورت ہی محسوس کی گئی ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے اَفَمَنْ كَانَ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ كَمَنْ كَانَ یُرِیْدُ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا۔ اور اسم موصول سے مراد مومنین مخلصین ہیں۔ اور جنہوں نے اسم موصول سے نبی کریم ﷺ مراد لیا ہے۔ تو انہوں نے عموم اور اسم اشارہ اولئک کیوجہ سے نبی کریم ﷺ اور آپ کے متبعین مراد لئے ہیں۔ ابوالشیخ نے ابوالعالیہ اور ابراہیم النخعی سے افمن كان علی بینة من ربه سے محمد ﷺ کی ذات مراد لینا روایت کیا ہے(1)۔ اسی طرح ابن ابی حاتم، ابن مردویہ اور ابونعیم نے المعرفہ میں حضرت علی سے یہی معنی روایت کیا ہے اور بینة سے مراد قرآن ہے یتلوہ میں ہ ضمیر کا مرجع بینة ہے اور شاهد منه ضمیر کا مرجع اللہ ہے۔

۲۔ ومن قبله میں ہ ضمیر کا مرجع قرآن ہے۔ یعنی موسیٰ کی کتاب بھی اللہ کی طرف شاہد بن کر آ چکی ہے جو قرآن کی تصدیق کرتی ہے اور یہ ایسی کتاب ہے دین کے احکام میں اسکی اتباع واقتداء کی جاتی ہے اور اس کا نزول ان پر رحمت ہے۔ اماماً اور رحمةً کتاب موسیٰ سے حال ہیں اور شاہد سے مراد جبرئیل امین علیہ السلام ہیں۔ ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم، ابوالشیخ اور ابن مردویہ نے ابن عباسؓ سے کئی طرق کے ذریعے شاہد سے مراد جبرئیل امین روایت کیا ہے۔

وہ اللہ کی طرف سے شاہد اس اللہ کی کتاب کی تلاوت کرتا ہے جو محمد ﷺ پر نازل ہوئی اور اس سے پہلے وہ موسیٰ علیہ السلام پر تورات تلاوت کرتے تھے جیسے محمد ﷺ پر قرآن تلاوت کیا ہے(2)۔ اسی طرح امام بغوی نے ابن عباسؓ، علقمہ، ابراہیم، مجاہد، عکرمہ، الضحاک اور اکثر اہل تفسیر کا قول ذکر کیا ہے کہ شاہد سے مراد جبرئیل امین ہیں۔ حضرت حسن بصری اور قتادہ نے فرمایا شاہد سے مراد محمد ﷺ کی زبان حق ترجمان ہے(3)۔ یعنی مومنین کا جس دلیل پر عقیدہ ہے اللہ کی طرف سے ایک شاہد یعنی نبی کریم ﷺ اس کی تلاوت کرتے ہیں اور اس سے کتاب موسیٰ اس کی شاہد ہے ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم، الطبرانی فی الاوسط اور ابوالشیخ نے محمد بن علی بن ابی طالب سے روایت کیا ہے کہ میں نے اپنے والد محترم حضرت علیؓ سے عرض کی کہ ابا حضور لوگ "یتلوه شاهد منه" میں شاہد سے مراد آپ کی ذات لیتے ہیں، واقعی شاہد آپ ہیں؟ فرمایا وَدِدْتُ اَنِّیْ اَنَا هُوَ وَلٰكِنَّهٗ لِسَانُ مُحَمَّدٍ ﷺ میں چاہتا تو ہوں کہ شاہد میں بنوں مگر یہاں شاہد محمد ﷺ کی زبان پاک ہے(4)۔ ابوالشیخ نے ابی نجیح کے واسطہ سے مجاہد سے یہی روایت کیا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یتلوا التلو سے ہے جس کا معنی پیچھے آنا ہے اور الشاهد سے مراد وہ فرشتہ ہے جو حفاظت کرتا ہے اور یتلوہ میں ضمیر کا

1۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 586 (العلمیہ)
2۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 587 (العلمیہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 198 (العلمیہ)
4۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 586 (العلمیہ)

مرجع یا تو من ہے یا معنی کے اعتبار سے بینہ ہے اور من قبلہ کتاب موسیٰ نیا جملہ ہے۔

ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم، اور ابوالشیخ نے مجاہد سے اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ سے مراد محمد ﷺ اور شاہد سے مراد وہ فرشتہ لیا ہے جو آپ ﷺ کی حفاظت کرتا تھا(1)۔ بعض علماء فرماتے ہیں شاہد سے مراد حضرت علیؓ ہیں۔ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت علیؓ نے فرمایا مَا مِنْ رَجُلٍ مِّنْ قُرَيْشٍ اِلَّا وَقَدْ نَزَلَتْ فِيْهِ آيَةٌ مِّنَ الْقُرْآنِ۔ قریش کے ہر مرد کے متعلق قرآن کی ایک آیت نازل ہوئی ہے۔ ایک شخص نے پوچھا جناب کے حق میں کون سی آیت نازل ہوئی؟ فرمایا وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ(2)۔

اگر یہ کہا جائے کہ یہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو شاہد کیوں کہا گیا؟ میں کہوں گا شاید یہ وجہ ہو کہ آپ نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا تھا اور سب سے پہلے نبی کریم ﷺ کی نبوت کی صداقت کی گواہی دی تھی اور میرے نزدیک بہتر وجہ یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کمالات ولایت کے قطب تھے اور تمام اولیاء کرام حتی کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم مقام ولایت میں آپ کے متبعین ہیں اور خلفاء ثلاثہ کی افضلیت ایک دوسری وجہ سے ہے جیسا کہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مکتوبات کے آخر میں ایک مکتوب میں یہ ثابت فرمایا ہے پس آیت کریمہ اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ کا معنی یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ اپنے رب کی طرف سے ایسی قطعی دلیل اور واضح حجت پر ہیں جو آپ کو اس بات کا علم قطعی دیتی ہے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں اور وہ قطعی دلیل اور واضح حجت آپ ﷺ کے معجزات ہیں اور ان میں سے افضل ترین معجزہ قرآن ہے اور وہ علوم ہیں جن کا اعتماد وحی پر ہے۔ ویتلوہ اور آپ کے پیچھے اللہ کی طرف سے آپ کی صداقت کا شاہد آتا ہے اور وہ شاہد حضرت علیؓ اور آپ کی مثل اولیاء کاملین ہیں کیونکہ کرامات اولیاء حقیقت میں نبی کریم ﷺ کے معجزات ہیں اور اولیاء کاملین کے علوم جو کشف والہامات سے انہیں حاصل ہوتے ہیں وہ علوم نبوت کا عکس ہیں۔ تو گویا یہ سب کرامات وعلوم نبی کریم ﷺ کی صداقت پر گواہ ہیں۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے اَنَا دَارُ الْحِكْمَةِ وَعَلِيٌّ بَابُهَا میں حکمت کا گھر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہے(3)۔ اس حدیث کو امام ترمذی نے سند صحیح کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ وَاَنَا مَدِيْنَةُ الْعِلْمِ وَعَلِيٌّ بَابُهَا فَمَنْ اَرَادَ الْعِلْمَ فَلْيَأْتِ الْبَابَ(4)۔ میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہے، جو علم و معرفت حاصل کرنا چاہتا ہے وہ دروازے پر آئے۔ اس حدیث کو ابن عدی نے الکامل میں اور العقیلی نے الضعفاء میں، الطبرانی اور الحاکم نے ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ابن عدی سے اور الحاکم نے حضرت جابر سے روایت کیا ہے۔ حضور ﷺ کے ان ارشادات میں جن علوم کا ذکر ہے وہ اولیاء کرام کے علوم ہیں کیونکہ فقہاء کے علوم کا حصول حضرت علیؓ پر منحصر نہیں ہے۔ بلکہ علوم فقہ کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اَصْحَابِيْ كَالنُّجُوْمِ بِاَيِّهِمُ اقْتَدَيْتُمُ اهْتَدَيْتُمْ(5)۔ میرے تمام صحابہ ستاروں کی مانند ہیں جس کی اقتداء کرو گے ہدایت پا جاؤ گے۔ بعض علماء فرماتے ہیں شاهد منه سے مراد انجیل ہے اور قبلہ کتاب موسیٰ سے مراد تورات ہے جو انجیل کی شاہد ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں بینة سے مراد دلیل عقلی ہے اور شاہد سے مراد قرآن ہے۔ الحسین بن الفضل فرماتے ہیں شاہد قرآن اس کا نظم اور اس کا اعجاز ہے(6)۔ معنی یہ ہوگا کیا جو برہان عقلی پر قائم ہے اور اس برہان عقلی کے پیچھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے شاہد یعنی قرآن بھی آیا ہے جو اس برہان کی صحت کی گواہی دیتا ہے اور قرآن سے کتاب موسیٰ یعنی تورات بھی اس برہان عقلی کی گواہی دیتی ہے اور

1۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 587 (العلمیۃ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 198 (الفکر)
3۔ مشکوۃ المصابیح، جلد 1، صفحہ 564 (قدیمی)
4۔ مستدرک حاکم، جلد 3، صفحہ 127 (النصر)
5۔ مشکوۃ المصابیح، جلد 1، صفحہ 554 (قدیمی)
6۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 198 (الفکر)

موصول سے مراد مخلص مسلمان ہیں۔

۳؎ یہ اسم اشارہ ہے اور اس کا مشار الیہ من کان علی بینۃ ہے۔ جمع اسم اشارہ اس لئے ہے کہ من سے مسلمانوں کی جماعت مراد ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ شاہد اس کا مشار الیہ ہو اگر شاہد سے مراد حضرت علی اور آپ جیسے اولیاء کاملین ہوں۔

۴؎ یعنی ان اقوام وملل میں سے جو محمد ﷺ یا قرآن کا انکار کرتے ہیں ان کے وعدہ کی جگہ آتش جہنم ہے۔ ابوھریرہؓ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں محمد ﷺ کی جان ہے۔ میری بات کو اس امت کا کوئی فرد یہودی یا نصرانی جو بھی سنے گا اور پھر مجھے جو پیغام دے کر بھیجا گیا ہے اس پر ایمان نہیں لائے گا تو وہ دوزخیوں میں سے ہوگا۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے(1)۔

۵؎ اے مخاطب اس موعد یا قرآن کے بارے ذرا شک نہ کر یہ تیرے رب کی طرف سے حق ہے لیکن اکثر لوگ اپنے فکری اختلال اور قلت تدبر کی وجہ سے ایمان نہیں لاتے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ؕ اُولٰٓئِكَ یُعْرَضُوْنَ عَلٰى رَبِّهِمْ وَ یَقُوْلُ الْاَشْهَادُ هٰۤؤُلَآءِ الَّذِیْنَ كَذَبُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ ۚ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۸﴾

”کون زیادہ ظالم ہے اس شخص سے جو بہتان لگاتا ہے اللہ تعالیٰ پر جھوٹا ؎۱ یہ لوگ پیش کئے جائیں گے اپنے رب کے سامنے ؎۲ اور کہیں گے گواہ ؎۳ یہی وہ (گستاخ) ہیں جنہوں نے اپنے رب پر جھوٹ بولا تھا خبردار اللہ کی پھٹکار ہو ظالموں پر ؎۴“

۱؎ یعنی کوئی زیادہ ظالم نہیں اس شخص سے جس نے جھوٹی بات منسوب کی اللہ تعالیٰ کی طرف مثلاً اس نے کہا اللہ کا بیٹا ہے یا اس کا کوئی شریک ہے یا جو اس نے نازل نہ کیا اس کے متعلق کہہ دیا کہ یہ منزل من اللہ ہے اور جو اس نے نازل کیا اس کا انکار کر دیا ہے جو اس کی حلال کردہ ہے اسے حرام اور اس کی حرام کردہ کو حلال کہہ دیا۔

۲؎ یہ اپنی طرف سے باتیں گھڑ کر اللہ کی طرف منسوب کرنے والے۔ قیامت کے روز اپنے رب کے حضور بحیثیت مجرم پیش کیے جائیں گے پھر وہ ان کے اعمال کے متعلق باز پرس کرے گا۔

۳؎ پھر فرد جرم ایسے نہیں عائد ہوگا بلکہ گواہ گواہی دیں گے گواہوں سے مراد فرشتے ہیں جو ان کے اعمال کو نوٹ کر رہے ہیں۔ ابوالشیخ نے مجاہد سے یہی مفہوم روایت کیا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ وہ گواہ اور انبیاء رسل ہوں گے۔ یہ ضحاک کا قول ہے اسکی تائید اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ذیشان بھی کرتا ہے فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّ جِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰۤؤُلَآءِ شَهِيْدًا۔ یعنی ہر امت سے اس پر گواہ لائیں گے اور ان سب پر آپ کو گواہ بنا کر لائیں گے (2)۔ حضرت ابن مبارک نے حضرت سعید بن المسیبؓ سے نقل کیا ہے قَالَ لَيْسَ مِنْ يَّوْمٍ اِلَّا وَتُعْرَضُ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ اُمَّتُهٗ غُدْوَةً وَّ عَشِيَّةً فَيَعْرِفُهُمْ بِسِيْمَاهُمْ وَاَعْمَالِهِمْ فَلِذٰلِكَ يَشْهَدُ عَلَيْهِمْ یعنی آپ ﷺ پر آپ کی امت ہر روز صبح شام پیش کی جاتی ہے۔ آپ ﷺ انہیں ان کے چہروں اور اعمال کی وجہ سے پہچانتے ہیں۔ اس لئے قیامت کے دن ان پر گواہی دیں گے(3)۔

1۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 588 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 199 (الفکر)

3۔ التذکرۃ از قرطبی جلد 1 صفحہ 397 (ابن زیدون)

قتادہ فرماتے ہیں گواہ تمام مخلوق ہوگی(1)۔ صحیحین میں ہے ابن عمر رسول اللہ ﷺ سے روایت فرماتے ہیں اِنَّ اللّٰہَ یُدْنِی الْمُؤْمِنَ فَیَضَعُ عَلَیْہِ کَنَفَہٗ وَیَسْتُرُہٗ فَیَقُوْلُ اَتَعْرِفُ ذَنْبَ کَذَا فَیَقُوْلُ نَعَمْ اَیْ رَبِّ حَتّٰی قَرَّرَہٗ بِذُنُوْبِہٖ وَ رَاٰی فِیْ نَفْسِہٖ اَنَّہٗ قَدْ ھَلَکَ قَالَ سَتَرْتُھَا عَلَیْکَ فِی الدُّنْیَا وَاَنَا اَغْفِرُھَا لَکَ الْیَوْمَ فَیُعْطٰی کِتَابَ حَسَنَاتِہٖ وَاَمَّا الْکُفَّارُ وَالْمُنَافِقُوْنَ فَیُنَادٰی بِھِمْ عَلٰی رُءُوْسِ الْخَلَائِقِ(2)۔ (ترجمہ) اللہ تعالیٰ قیامت کے روز مومن کو اپنے قریب کرے گا پھر اس پر اپنی شان کے لائق اپنا ہاتھ رکھ کر اسے ڈھانپ لے گا اور فرمائے گا اے میرے بندے تو نے یہ گناہ کیا تھا۔ مومن کہے گا ہاں میرے پروردگار! حتی کہ اپنے تمام گناہوں کا خود ہی اعتراف کرلے گا پھر سوچے گا میں تو اب ہلاک ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا اے مومن بندے میں نے دنیا میں تیرے گناہوں کی پردہ دری نہیں کی اور آج بھی تیرے ان گناہوں کی بخشش کرتا ہوں۔ پس اللہ تعالیٰ اسے نیکیوں والا اعمال نامہ عطا فرمادیں گے۔ مگر کافر اور منافق انکی سرعام پیشی ہوگی۔

یہ اس آیت کریمہ میں اس سزا کی ہولناکی بیان ہے جو انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف جھوٹی باتیں منسوب کرنے کی پاداش میں دی جائے گی۔ میں کہتا ہوں اوپر جن گواہوں کا تذکرہ گزرا ہے۔ گواہ صرف یہ ہی نہ ہوں گے بلکہ انسان کے اپنے اعضاء بھی گواہ ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اَلْیَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰۤى اَفْوَاهِهِمْ وَ تُكَلِّمُنَاۤ اَیْدِیْهِمْ وَ تَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ (آج ہم مہر لگا دیں گے ان کے مونہوں پر اور بات کریں گے ہم سے ان کے ہاتھ اور گواہی دیں گے ان کے پاؤں ان (بدکاریوں پر) جو وہ کمایا کرتے تھے۔ ایک اور جگہ ارشاد ہے وَ قَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَیْنَاؕ (وہ اپنی کھالوں کو کہیں گے تم نے ہمارے خلاف گواہی کیوں دی) ایک اور مقام پر فرمایا یَّوْمَ تَشْهَدُ عَلَیْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَ اَیْدِیْهِمْ وَ اَرْجُلُهُمْ جس دن ان پر ان کی اپنی زبانیں ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں گواہی دیں گے۔

حضرت انس کی حدیث مسلم میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے كَفٰى بِنَفْسِكَ الْیَوْمَ عَلَیْكَ حَسِیْبًا۔ آج کے دن تیرا نفس تجھ پر حساب لینے والا کافی ہے۔ اور کراما کاتبین گواہ کافی ہے اور اس کے منہ پر ہم مہر لگا دیں گے۔ اور اس کے اعضاء کو کہا جائے گا اب تم بولو(3)۔ مزید اس موضوع پر احادیث مذکورہ آیات کے ضمن میں ان شاء اللہ بیان کریں گے۔ اس طرح گواہ مقامات اور زمانے بھی ہوں گے اس کے متعلق ہم نے یَوْمَىٕذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا کی تفسیر میں کچھ چیزیں ذکر کی ہیں۔ حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے زمین ہر بندے اور بندی پر اس کے عمل کی گواہی دے گی جو بھی اس نے اسکی پیٹھ پر کیا ہوگا۔ امام بخاری نے حضرت ابو سعید الخدری سے روایت کیا ہے کہ جو جن وانس شجر و مدر (مٹی کا ڈھیلا) موذن کی آواز سنے گا وہ قیامت کے روز اسکی شہادت دے گا(4)۔ ابن خزیمہ نے کچھ الفاظ کے اختلاف کے ساتھ یہی حدیث روایت کی ہے(5)۔ ابوداؤد اور ابن خزیمہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث نقل کی ہے کہ موذن کو اپنی آواز کی دوری بخشوائے گی اور ہر خشک و تر اس کی گواہی دے گا(6)۔ ابن مبارک نے حضرت عمر سے روایت کیا ہے کہ جس نے کسی درخت یا پتھر کے پاس سجدہ کیا وہ قیامت کے روز اسکی گواہی دے گا(7)۔ عطاء خراسانی سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ ابونعیم نے معقل بن یسار کے طریق سے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے۔ کوئی دن ابن آدم پر نہیں گزرتا مگر اس میں ندا دی جاتی ہے اے ابن آدم میں نئی تخلیق ہوں جو تو عمل کرے گا میں تیرے متعلق کل گواہی دوں گا۔ اس لئے مجھ میں بہتر اور نیک اعمال کر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 199 (الفکر) 2۔ مشکوۃ المصابیح، جلد 1، صفحہ 485 (قدیمی) 3۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 409 (قدیمی)
4۔ الترغیب والترہیب، جلد 1، صفحہ 175 (الفکر) 5۔ الترغیب والترہیب، جلد 1، صفحہ 175 (الفکر)
6۔ الترغیب والترہیب، جلد 1، صفحہ 175 (الفکر) 7۔ التذکرۃ از قرطبی، جلد 1، صفحہ 389 (ابن زیدان)

تاکہ میں تیرے حق میں گواہی دوں گا میں آ کر گزر جاؤں گا پھر تو کبھی مجھے نہیں دیکھے گا۔ اسی طرح رات کہتی ہے (1)۔ امام مسلم نے حضرت ابوسعید الخدری سے روایت کیا ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ مال و دولت سرسبز ہے، میٹھا ہے اور اچھا ہے اور اس مسلمان کا ساتھی ہے جو اسے قیدی، یتیم اور مسافر پر خرچ کرتا ہے تو وہ مال اس پر گواہ ہوگا اور جو شخص مال کو بغیر حق کے حاصل کرتا ہے وہ اس شخص کی مانند ہے جو کھاتا ہے مگر سیر نہیں ہوتا۔ پس وہ مال اس شخص پر قیامت کے دن گواہ ہوگا (2)۔ ابونعیم نے طاؤس سے روایت کیا ہے کہ روز قیامت مال اور صاحب مال کو لایا جائے گا دراں حالیکہ وہ آپس میں جھگڑ رہے ہوں گے (3)۔

الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ يَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ؕ وَ هُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝۱۹

"جو بدنصیب روکتے ہیں اللہ تعالیٰ کی راہ سے اور چاہتے ہیں کہ اس راہ کو ٹیڑھا بنائیں اور وہی آخرت کے منکر ہیں 1۔"

1۔ جو لوگ دین سے لوگوں کو منع کرتے ہیں اور اس کی اس طرح وضاحت کرتے ہیں کہ یہ حق اور صواب سے ہٹا ہوا راستہ ہے یا یہ معنی ہے کہ وہ دین داروں کے متعلق یہ خواہش کرتے ہیں کہ یہ بھی دین سے مرتد ہو کر دین سے پھر جائیں۔ اور حال یہ ہے کہ وہ آخرت کے منکر ہیں۔ ھم کا کلمہ ان کے کفر کی تاکید اور کفر کے ساتھ اختصاص کے لئے ہے۔

اُولٰٓئِكَ لَمْ يَكُوْنُوْا مُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ وَ مَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ۘ يُضٰعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ ؕ مَا كَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ السَّمْعَ وَ مَا كَانُوْا يُبْصِرُوْنَ ۝۲۰

"یہ لوگ (اللہ تعالیٰ کو) عاجز کرنے والے نہیں تھے زمین میں 1 اور نہ ہی ان کے لئے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی مددگار تھا 2 دوگنا کر دیا جائے گا ان کے لئے عذاب کو 3 وہ نہ (آواز حق) سن سکتے تھے نہ وہ (نور حق) دیکھ سکتے تھے 4۔"

1۔ حضرت ابن عباسؓ نے معجزین کا معنی سابقین (سبقت لے جانے والے) کیا ہے۔ قتادہ نے ھاربین (بھاگنے والے) کیا ہے اور مقاتل نے فائتین (ہم سے چھپ جانے والے) کیا ہے (4)۔ ان تمام تعبیروں کا معنی و مدعا ایک ہی ہے، یعنی دنیا میں وہ اللہ کو عذاب دینے سے عاجز کرنے والے نہیں ہیں۔

2۔ یعنی ان کا کوئی مددگار نہ ہوگا جو انہیں اللہ کے عذاب سے چھٹکارا دلائے لیکن ان نافرمانیوں اور کفر سامانیوں کے باوجود اللہ تعالیٰ نے خود قیامت تک عذاب میں تاخیر فرمائی ہے۔ تاکہ انہیں سخت اور دائمی عذاب دے۔

3۔ یہ مستقل علیحدہ کلام ہے۔ ابن عامر، ابن کثیر اور یعقوب نے باب تفعیل میں یُضَعَّفُ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے باب مفاعلہ سے پڑھا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں ان کو دوہرا عذاب اس لئے ہوگا کہ انہوں نے دوسرے کو گمراہ کیا اور عوام الناس نے ان کی پیروی کی۔

4۔ یہ حق کی آواز کو نہیں سن سکتے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حق کو سننے کی ان میں استعداد پیدا ہی نہیں فرمائی۔ پس گویا یہ بہرے ہیں، حق کے متعلق کچھ سنتے ہی نہیں۔ اور آیات الٰہیہ سے اندھے ہونے کی وجہ سے ہدایت کی جگمگاتی راہ کو دیکھ ہی نہیں سکتے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں نور بصیرت رکھا ہی نہیں۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَ ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۝۲۱

1۔ التذکرۃ از قرطبی، جلد 1، صفحہ 389 (ابن زیدون) — 2۔ صحیح مسلم جلد 1، صفحہ 336 (قدیمی)

3۔ مصنف عبدالرزاق، جلد 11، صفحہ 98 (منشورات المجلس العلمی) — 4۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 200 (الفکر)

"یہی وہ (بدقسمت) ہیں جنھوں نے نقصان پہنچایا اپنے آپ [1] کو اور گم ہو گئیں ان سے وہ باتیں جو وہ تراشا کرتے تھے [2]"

[1] انہوں نے اللہ تعالیٰ کی عبادت کو چھوڑ کر پتھروں کی عبادت کو ترجیح دے کر اپنے آپ کو نقصان پہنچایا اور جنت کے بدلے آگ خرید کر خسارہ اٹھایا۔

[2] یہ سب دوراز حقیقت تصورات اور باطل خیالات مفقود پائیں گے کہ ہمارے بت اللہ کے حضور ہماری سفارش کریں گے۔

لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ ﴿۲۲﴾

"یقیناً یہی لوگ ہیں جو آخرت میں سب سے زیادہ نقصان اٹھانے والے ہوں گے [1]"

[1] اس کے متعلق کئی اقوال ہیں، ایک یہ ہے کہ یہاں لا کے معنی میں ہے۔ یہ سابقہ کلام کا رد ہے، یعنی معاملہ ایسا نہیں ہے جیسا انہوں نے خود گھڑا ہے اور جرم مستقل کلام ہے جسکا معنی کسب ہے اور اس کا فاعل مضمر ہے اور اَنَّهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ مفعول ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے، یعنی کسب الحکم بخسرانھم اپنے خسارے کا حکم پایا۔ بعض علماء فرماتے ہیں جرم کا معنی وَجَبَ اور حَقَّ ہے۔ اس صورت میں اَنَّهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ کا جملہ فاعل ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ ان اور لا جرم یہ کلمے ہیں مرکب ہو گئے ہیں۔ دونوں کا معنی حقا ہے اور اَنَّهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ محل رفع میں ہے کیونکہ یہ فاعل ہے یعنی حق حقا انھم خاسرون یعنی ان کا خسارہ اٹھانا ثابت اور یقینی ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ اس کا معنی لا محالہ ہے۔ القاموس (لغت کی مشہور کتاب) میں ہے لا جرم' لاذا جرم ولاان حرم ولا ان ذا جرم اور لا جُرْمَ بروزن کَرُمَ (بالضم) ان کا معنی لابد یا حقا یا لامحالة ہے (1) یہ تو تھی اسکی اصل مگر اب یہ قسم کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اسی وجہ سے اس کے جواب پر لام آتا ہے جیسے لاجرم لاتینک۔ یہ لوگ تمام لوگوں سے زیادہ خسارہ اٹھانے والے اس لئے ہیں کہ دوسرے لوگوں نے تو اپنے کفر اور اپنے گناہوں کا خسارہ اٹھایا مگر انہوں نے اپنے کفر کے خسارہ کے ساتھ دوسروں کو ایمان سے روکنے کا بھی خسارہ اٹھایا۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ اَخْبَتُوْۤا اِلٰی رَبِّهِمْ ۙ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۳﴾

"بیشک جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے اور عجز و نیاز سے جھک گئے اپنے پروردگار کی طرف۔ یہی لوگ جنتی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے [1]"

[1] حضرت ابن عباس فرماتے ہیں اخبتوا کا معنی خافوا ہے یعنی جو اپنے رب کے عذاب سے ڈر گئے۔ قتادہ فرماتے ہیں اس کا معنی ہے انہوں نے اپنے رب کی طرف رجوع کیا۔ مجاہد فرماتے ہیں اس کا معنی ہے وہ مطمئن ہو گئے (2)۔ القاموس میں اخبت خشع و تواضع والخبیت الشئ الحقیر۔ یعنی اخبت کا معنی عجز و انکساری ہے اور خبیت حقیر شی کو کہتے ہیں (3)۔

مَثَلُ الْفَرِیْقَیْنِ كَالْاَعْمٰى وَ الْاَصَمِّ وَ الْبَصِیْرِ وَ السَّمِیْعِ ؕ هَلْ یَسْتَوِیٰنِ مَثَلًا ؕ

1۔ القاموس المحیط، جلد 2، صفحہ 1434 (التراث العربی)۔
2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 201 (الفکر)
3۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 246 (التراث العربی)

أَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۴﴾

"ان دونوں فریقوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک اندھا اور بہرا ہو اور دوسرا دیکھنے والا اور سننے والا ہو۔ ۱؎ کیا یکساں ہے ان دونوں کا حال ۲؎ کیا تم (اس مثال میں) غور وفکر نہیں کرتے ۳؎"

۱؎ یعنی مومنین اور کافرین کی مثال ہے، اندھا اور بہرا کافر کی مثال ہے کیونکہ وہ آواز حق کو سننے کی طاقت نہیں رکھتے اور نور حق اور نور ہدایت کو دیکھنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ دیکھنے والا اور سننے والا یہ مومن کی مثال ہے کیونکہ وہ بات کو غور سے سنتے ہیں۔ پھر اچھی بات کی پیروی کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے جو ان کے دلوں میں نور بصیرت پیدا فرمایا ہے اس کے ساتھ نور حق کو دیکھتے ہیں۔ کافر کو اندھے اور بہرے شخص سے تشبیہ دی گئی اور مومن کو دیکھنے اور سننے والے سے تشبیہ دی گئی ہے اور ہر دو صفات کے درمیان عطف صفت پر صفت کے عطف کے لئے ہے۔ اسی لئے فرمایا هَلْ يَسْتَوِيٰنِ۔

۲؎ یستوون نہیں فرمایا۔ الفراء نحوی نے یہی تشریح لکھی ہے۔ (یعنی کافر اندھا اور بہرا ہے اور مومن دیکھنے اور سننے والا ہے) صفات کے درمیان عطف ہے (ذات وافراد کے تغایر کے اعتبار سے نہیں بلکہ صفات کے تغایر کے اعتبار سے ہے) مثلاً کا معنی تمثیل یا صفت یا حالت ہے۔

۳؎ وہ ان دلنشین اور ذہنوں میں رچ بس جانے والی مثالوں سے نصیحت حاصل کیوں نہیں کرتے۔ ان واضح حقائق کو سمجھنے سے انہوں نے اپنی عقلوں کو بانجھ کر دیا ہے۔ اس میں تاء کو ذال میں ادغام کیا گیا ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖٓ ۡ اِنِّىْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۲۵﴾

"بیشک ہم نے بھیجا نوح کو ان کی قوم کی طرف (انہوں نے کہا اے قوم) میں تمہیں کھلا کھلا ڈرانے والا ہوں۔ ۱؎"

۱؎ ابن کثیر، ابو عمرو اور کسائی نے اَنِّیْ ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور اس سے پہلے حرف جر با مضمر ہے۔ معنی یہ ہے کہ ہم نے نوح علیہ السلام کو اپنی قوم کی طرف اِنِّىْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ کے کلام کے ساتھ بھیجا۔

انی اصل میں ہمزہ مکسور کے ساتھ ہے مگر پہلے حرف جر کی وجہ سے مفتوح ہو گیا۔ جیسے کانی کو فتحہ دیا جاتا ہے اور معنی کسرہ والا ہی ہے۔ باقی قراء نے انی ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی اصل میں فقال انی کے معنی میں ہے کیونکہ ارسال میں قول کا معنی پایا جاتا ہے۔ مبین کا مطلب یہ ہے کہ میں تمہارے سامنے عذاب وثواب کا باعث بننے والی اشیاء کو بیان کرتا ہوں۔

اَنْ لَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنِّىْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ اَلِيْمٍ ﴿۲۶﴾

"کہ تم نہ عبادت کرو کسی کی سوائے اللہ تعالیٰ کے ۱؎ بے شک میں ڈرتا ہوں کہ تم پر عذاب کا دردناک دن نہ آ جائے ۲؎"

۱؎ یا تو یہ انی لکم سے بدل ہے یا مبین کا مفعول ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ ان مفسرہ ہو اور ارسلنا یا نذیر کے متعلق ہو۔ انی نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔

۲؎ تمہارے شریک ٹھہرانے سے تم پر عذاب آ جائے، مجھے اس بات کا خوف ہے۔ الیم بمعنی مولم ہے۔ اصل میں یہ معذب (عذاب

دینے والے) کی صفت ہے مگر عذاب یا زمانے کی اس کے ساتھ صفت لگائی جاتی ہے جیسے کہا جاتا ہے جد جدہ و نہارک صائم

فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَ مَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِیْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِیَ الرَّاْیِ ۚ وَ مَا نَرٰى لَكُمْ عَلَیْنَا مِنْ فَضْلٍۭ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِیْنَ ﴿۲۷﴾

"تو کہنے لگے ان کی قوم کے سردار جنہوں نے کفر اختیار کیا تھا (اے نوح!) ہم نہیں دیکھتے تمہیں مگر انسان اپنے جیسا[1] اور ہم نہیں دیکھتے تمہیں کہ پیروی کرتے ہوں تمہاری بجز ان لوگوں کے جو ہم میں حقیر و ذلیل ظاہر ہیں[2] اور ہم نہیں دیکھتے کہ تمہیں ہم پر کوئی فضیلت ہے[3] بلکہ ہم تو تمہیں جھوٹا خیال کرتے ہیں[4]"

[1] ملاء قوم کے رؤسا اور اشراف کو کہا جاتا ہے کیونکہ وہ ہیبت سے دلوں کو بھر دیتے ہیں۔ اس طرح مجالس و محافل پر اس کا رعب و دبدبہ طاری ہو جاتا ہے۔ اس لئے مبالغہ کے لئے انہیں ملاء کہا جاتا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے کافر کہنے لگے اے نوح ہم تمہیں اپنے جیسا ایک آدمی دیکھتے ہیں، آپ کو ہم پر کوئی عظمت اور فضیلت نہیں ہے کہ آپ کو نبی بنایا گیا ہو اور آپ کی اطاعت واجب ہے۔ گویا ان نادانوں کی سوچ یہ تھی کہ نبی کوئی فرشتہ ہوتا ہے یا کوئی بادشاہ ہوتا ہے۔ (حالانکہ یہ تو وہبی عظمت ہے وہ جسے چاہتا ہے نبوت کے مرتبہ علیا پر فائز کر دیتا ہے)۔ اس میں کسی غریب و امیر کا لحاظ نہیں رکھا جاتا، دوسرا یہ کہ تبلیغ احکام انسانوں کو کرنا ہوتا ہے تو پیغام رساں بھی انسان ہی ہونا چاہئے۔ اسی حکمت کے تحت اللہ تعالیٰ نے انسانوں میں سے ہی نبی بنائے)۔

[2] کہنے لگے ہم تجھے نبی اس لئے بھی تسلیم کرتے کہ آپ کے متبعین گھٹیا پیشہ اور مفلوک الحال لوگ ہیں۔ الرذل چیز کے گھٹیا حصہ کو کہتے ہیں اس کی جمع ارذل ہے پھر اس کی جمع اراذل بنائی گئی جیسے کلب و اکلب و اکالب کیونکہ یہ غلبہ کی وجہ سے اسم بن گیا ہے۔ حضرت عکرمہ فرماتے ہیں یہاں اراذل سے مراد گھٹیا پیشوں والے لوگ ہیں اور بادی الرای (الرای) سے مراد آنکھ اور دل سے دیکھنا ہے۔ الرای اعتقاد کو بھی کہتے ہیں۔ قاموس میں اسی طرح ہے(1) بادی الرای کا معنی بغیر گہرائی میں جائے کسی چیز کو دیکھنا ہے اور یہ البدو سے مشتق ہے یا یہ البدء سے مشتق ہے جسکا معنی پہلی نظر دیکھ کر رائے قائم کر لینا ہے اور اس صورت میں یا ہمزہ کا بدل ہوگی کیونکہ اس کا ماقبل مکسور تھا۔ اس لئے ہمزہ یا سے بدل گیا۔ ابوعمرو نے دال کے بعد ہمزہ مفتوحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے ساتھ پڑھا ہے اور اس پر نصب ظرف کی بناء پر ہے اور اس کا مضاف محذوف ہے اور اس کا عامل اتبعک ہے۔ ان لوگوں نے ان مسکین لوگوں کی ظاہری خستہ حالی اور ناداری کو دیکھ کر انہیں ذلیل اور کمینہ سمجھا کیونکہ ان دو ہمت اور کم ظرف لوگوں کے نزدیک معیار شرف دنیا کی کثرت تھی اور جو اس دولت و ثروت سے محروم ہوتا تو اسے وہ ذلیل سمجھتے اور دوسری وجہ انہیں ذلیل سمجھنے کی یہ تھی کہ وہ ظاہر نہیں ہیں، زیادہ گہرائی میں جا کر غور و فکر کرنے کے عادی نہیں ہیں۔

[3] اے نوح (علیہ السلام) ہم تجھے اور تیرے متبعین اور پیروکاروں کو کسی اعتبار سے اپنے زیادہ فضیلت والا نہیں دیکھتے، نہ تو تمہیں ہم پر کوئی مال و جاہ کی فضیلت ہے نہ افرادی قوت تمہارے پاس ہے۔ ہم تمہیں کس وجہ سے نبوت کا اہل سمجھیں اور کیوں تمہاری اتباع کو اپنے اوپر لازم جانیں۔

1۔ القاموس المحیط، جلد 2، صفحہ 1687 (التراث العربی)

۳؎ بلکہ ہم تو تمہیں اس دعویٰ نبوت میں اور تمہارے پیروکاروں کو تیری تصدیق اور تیری سچائی کے علم کے دعویٰ میں جھوٹا خیال کرتے ہیں۔ یہاں مخاطبین کو غائبین پر غلبہ دیا گیا ہے یعنی مخاطبین کا ذکر کیا گیا ہے اور جو غائب تھے ان کا ذکر نہیں ہے۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ ؕ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ ﴿۲۸﴾

"آپ نے فرمایا اے میری قوم! بھلا یہ بتاؤ اگر میرے پاس روشن دلیل ہو اپنے رب کی طرف سے اور اس نے عطا فرمائی ہو مجھے خاص رحمت اپنی جناب سے پھر پوشیدہ کردی گئی ہو تم پر (اس کی حقیقت) تو کیا ہم جبراً مسلط کریں تم پر یہ دعوت درآں حالیکہ تم اسے ناپسند کرتے ہو ۱؎"

۱؎ حضرت نوح علیہ السلام نے بڑے محبت بھرے اور مشفقانہ انداز میں فرمایا اے میری قوم تم خود ہی مجھے بتاؤ، اگر میں ایسی واضح حجت پر ہوں جو میرے دعویٰ نبوت کی صداقت پر روشن دلیل ہو اور اس نے مجھے روشن دلیل یا صداقت اور نبوت عطا فرمائی ہو مگر تم پر وہ حقیقت پوشیدہ کردی گئی ہو تو کیا ہم اس دعوت کو تم پر لازم کردیں گے اور تمہیں اسکی قبولیت پر مجبور کریں گے۔ جبکہ تم اس دعوت کو پسند نہ بھی کرتے ہو (ایسا ہرگز نہ ہوگا)۔ جو دامن پھیلاتا ہی نہیں اس کو نعمتوں سے سرفراز کرنا یہ ہماری عادت جاریہ نہیں ہے۔

حضرت قتادہ فرماتے ہیں اگر انبیاء کرام اپنی اپنی قوموں پر ایمان کو لازم کرنے پر قادر ہوتے تو وہ ان پر لازم کردیتے مگر قدرت نے انہیں یہ کام سونپا ہی نہیں، وہ اس پر قادر ہی نہیں ہوتے(1)۔ حمزہ اور الکسائی نے فعمیت کو باب تفعیل سے عین کے ضمہ اور میم کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے جس کا معنی اخفیت (چھپائی گئی) ہے۔ باقی قراء نے عین کے فتح اور میم کی تخفیف کے ساتھ فعل مجرد سے مشتق کرکے پڑھا اور اس کا معنی خفیت علیکم ہے یعنی تم پر وہ حقیقت چھپائی گئی ہے۔ اس لئے تم نے ہدایت نہیں پائی حجت کے ذریعے۔ جس حجت سے ہدایت حاصل ہو اسے مبصرہ یا بصیرہ کہتے ہیں اور جس سے ہدایت نہ ملے اسے عمیاء کہا جاتا ہے۔ پیچھے بینہ اور رحمت دو چیزوں کا ذکر ہے جبکہ فعمیت صیغہ مفرد کہا گیا ہے۔ اس کی مندرجہ ذیل وجوہ ہوسکتی ہیں بینہ اور رحمت ایک چیز ہیں یا بینہ کا خفاء نبوت کا خفاء ہے یا تقدیر عبارت اس طرح ہے فعمیت بہ النبوۃ۔ اور عبارت کا حذف اختصار کے لئے ہے یا ضمیر مفرد بینہ اور رحمت ہر ایک کے لئے ہے۔

وَيٰقَوْمِ لَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا ؕ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَمَاۤ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَلٰكِنِّيْۤ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ﴿۲۹﴾

"اور اے میری قوم! میں نہیں طلب کرتا تم سے اس تبلیغ پر کوئی مال نہیں میرا اجر مگر اللہ تعالیٰ کے ذمہ اور ۱؎ میں (تمہیں خوش کرنے کے لئے) ان کو نکالنے والا نہیں جو ایمان لے آئے ہیں ۲؎ بیشک وہ اپنے رب سے ملاقات کرنے والے ہیں البتہ میں تمہیں دیکھتا ہوں کہ تم ایسی قوم ہو جو (حقیقت سے) ناواقف ہے ۳؎"

۱؎ ہ ضمیر سے مراد تبلیغ ہے، اگرچہ پہلے اسکا ذکر نہیں لیکن سیاق سے معلوم ہے، یعنی میں تم سے اس تبلیغی کوششوں پر کسی وظیفہ کا طلبگار نہیں کہ جس کی ادائیگی تم پر گراں ہو یا تم مجھے ادا نہ کرو تو مجھ پر تمہارا یہ رویہ تکلیف دہ ہو۔ بلکہ میرا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے جسکا اس نے اپنے فضل

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 203 (الفکر)

سے وعدہ فرمایا ہے۔ نافع، ابن عامر، ابوعمرو اور حفص نے اجری کے یاء پر فتحہ پڑھا ہے اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔

۲؎ انہوں نے نوح علیہ السلام سے کہا ہم آپ پر ایمان تب لے آئیں گے جب آپ ان چیتھڑوں میں ملبوس درویشوں کو اپنی مجلس سے اٹھا دیں۔ ان کا یہ سوال ان سے نفرت کی بناء پر تھا تو آپ نے ارشاد فرمایا میں تمہاری خوشنودی کے لئے ان حق کے پرستاروں بلند کرداروں کو اپنی مجلس سے اٹھانے والا نہیں ہوں (مجھے تم جیسے دنیا پرست اور غرور و تکبر کے پیکروں کے ایمان کی ضرورت نہیں)

۳؎ بفرض محال اگر میں تمہاری خوشی کے لئے آج انہیں اپنی مجلس سے اٹھا دوں تو یہ کل قیامت کو اپنے رب کی بارگاہ میں مجھ سے جھگڑیں گے، یا یہ مطلب ہے کہ یہ تو وہ لوگ ہیں جو اپنے رب کے قرب کی منازل طے کرنے کے ساتھ اس سے ملاقات کرنے والے ہیں۔ یہ اس کے قریبی اور اولیاء ہیں۔ میں اس کے اولیاء کرام کو اپنی مجلس سے دور ہونے کا حکم کیسے دے سکتا ہوں لیکن میں تمہاری باتیں سن کر یہ خیال کرتا ہوں کہ تم اپنے رب کی ملاقات کے مقام و مرتبہ سے ناواقف ہو یا تو مراتب قرب الٰہی سے ناشناس ہو یا جو تم نے انہیں نکالنے کا مطالبہ کیا ہے اس میں تمہاری نادانی کا اظہار ہوتا ہے۔ یا یہ مطلب ہے کہ تم نے ان جانثاروں اور اسلام کے شیدائیوں کو گھٹیا ہونے کا طعنہ دے کر اپنے احمق ہونے کا ثبوت دیا ہے، یا یہ معنی ہے کہ تم اپنے انجام سے ناواقف ہو۔

وَ يٰقَوْمِ مَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ طَرَدْتُّهُمْ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۳۰﴾

"اے میری قوم کون مدد کر سکتا ہے میری اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں اگر میں نکال دوں اہل ایمان کو ۱؎ کیا تم اتنا بھی نہیں سوچتے ۲؎"

۱؎ اے میری قوم اگر میں ان بادہ توحید کے میکشوں کو اپنی مجلس سے دور کر دوں تو اللہ تعالیٰ کے انتقام کا جو کوڑا برسے گا اس سے مجھے کون بچائے گا۔

۲؎ تم کیوں نصیحت حاصل نہیں کرتے اور تم کیوں غور و فکر سے عاری ہو گئے ذرا تو سوچو تو سہی تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ تمہارا یہ مطالبہ بالکل غلط اور انتہائی ناروا ہے۔

وَ لَاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآىِٕنُ اللّٰهِ وَ لَاۤ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَ لَاۤ اَقُوْلُ اِنِّيْ مَلَكٌ وَّ لَاۤ اَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ تَزْدَرِيْۤ اَعْيُنُكُمْ لَنْ يُّؤْتِيَهُمُ اللّٰهُ خَيْرًا ؕ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ ۚۖ اِنِّيْۤ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۱﴾

"اور میں نہیں کہتا تم سے کہ میرے پاس اللہ تعالیٰ کے خزانے ہیں ۱؎ اور نہ یہ کہ میں خود بخود جان لیتا ہوں غیب کو ۲؎ اور نہ یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں اور نہ ۳؎ ہی یہ کہتا ہوں کہ جن لوگوں کو تمہاری نگاہیں حقیر جانتیں کہ ہرگز نہ دے گا انہیں اللہ تعالیٰ کچھ بھلائی اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے جو ان کے دلوں میں ہے ۴؎ (اگر میں ایسا کروں تو) میں بھی ہو جاؤں گا ظالموں سے ۵؎"

۱؎ یعنی میں تمہیں نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ تعالیٰ کے رزق اور مال کے خزانے ہیں، یعنی میں تم پر مال کے اعتبار سے تو اپنی فضیلت کا دعویدار نہیں ہوں کہ تم منکر بنے ہوئے اور کہتے ہو کہ ما نری لکم علینا من فضل (تمہیں ہم پر کوئی فضیلت نہیں ہے)۔

۲؎ اس کا عطف عندی خزائن اللہ پر ہے، یعنی میں نہیں کہتا کہ میں غیب جانتا ہوں کہ تم اس بات کو بعید سمجھ کر میری تکذیب کرتے ہو یا یہ

مطلب ہے کہ میں غیب کا دعویٰ ہی نہیں کرتا کہ میں جان لوں کہ یہ لوگ جو میری اتباع کرتے ہیں بغیر بصیرت اور بغیر قلبی لگاؤ کے ایمان لاتے ہیں۔ اس دوسرے معنی کے اعتبار سے اس کا عطف اقول پر ہوگا۔

۲؎ اور میں تمہیں یہ بھی نہیں کہتا کہ میں فرشتہ ہوں حتی کہ تم میرا انکار کرو اور تم کہو کہ ما انت الا بشر مثلنا تو تو صرف ہماری طرح بشر ہے۔

۳؎ اور نہ میں ان لوگوں کے متعلق یہ کہتا ہوں جنہیں تم فقر اور درویشی کی حالت میں دیکھ کر نفرت کرتے ہو۔ (کہ انہیں کچھ بھلائی نہ ملے گی) تزدری یہ باب افتعال ہے اور زراء سے مشتق ہے جس کا مطلب ہے کہ کسی کو معیوب سمجھنا تا کو دال سے بدلا گیا ہے کیونکہ جہر میں راء کے متجانس ہے اور فعل کی عین (آنکھ) کی طرف نسبت مبالغہ کے لئے ہے اور اس بات پر آگاہ کرنے کے لئے ہے کہ انہوں انہیں بغیر دیکھے حقیر سمجھا تھا، یا انہوں نے ان کی ظاہری کمزور حالت اور مالی قلت کی بناء پر انہیں حقیر سمجھا تھا اور ان کی قلبی طہارت اور بلند کردار اور اخلاق کی پختگی جیسے کمالات وصفات کا مشاہدہ ہی نہیں کیا تھا۔ میں تو یہ نہیں کہتا کہ اللہ تعالیٰ ان کمزور حال لوگوں کو ہرگز بھلائی عطا نہیں کرے گا بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ جو اللہ تعالیٰ نے انہیں دنیا میں ایمان اور ہدایت کی ابدی نعمت سے سرفراز کیا ہے اور آخرت میں جنت کی سرمدی زندگی اور بلند درجات عطا فرمائے گا۔ یہ دنیا میں ایمان وہدایت کی روشنی اور آخرت کی نعمتیں تمہارے اس دنیوی مال ومتاع سے بہتر ہے بلکہ ہزار درجہ بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھ سے اور تم سے زیادہ جاننے والا ہے کہ ان کے دلوں میں اللہ کی محبت کا چراغ روشن ہے اور محاسن اخلاق کے کسی اعلیٰ معیار کے حامل ہیں اور عقائد حقہ کے کتنے خوبصورت گلشن آباد ہیں۔

۵؎ نافع، ابو عمرو نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اگر میں ان خدا کے محبوبوں اور درویش صفت انسانوں کو اپنی مجلس سے اٹھا دو اور میں ان کے متعلق یہ کہوں کہ اللہ تعالیٰ انہیں کوئی خیر و برکت نہ عطا فرمائے گا تو پھر میں ظالموں میں سے ہو جاؤں گا۔

قَالُوْا یٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ﴿۳۲﴾

"وہ (برافروختہ ہوکر) بولے اے نوح تم نے ہم سے جھگڑا کیا اور اس جھگڑے کو بہت طول دیا (اس مباحثہ کو رہنے دو) اور لے آؤ ہمارے پاس جس (عذاب) کی تم ہمیں دھمکی دیتے رہتے ہو اگر تم سچے ہو[1]"

۱؎ کہنے لگے اے نوح تو نے ہمارے ساتھ جھگڑا کیا اور جھگڑے کو تو نے بہت طول دیا ہے کیونکہ تو نے جھگڑنے کے بہت سے انداز اپنائے ہیں۔ پس تو ہمارے پاس وہ عذاب لے آ جس کی تو ہمیں دھمکی دیتا ہے اگر تو اپنے دعویٰ نبوت اور ایمان کو چھوڑنے پر وعید سنانے میں سچا ہے کیونکہ آپ کا یہ مناظرہ تو ہم پر غیر موثر ہو گیا ہے۔

قَالَ اِنَّمَا یَاْتِیْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَآءَ وَ مَاۤ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِیْنَ ﴿۳۳﴾

"آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ ہی لے آئے گا اسے تمہارے پاس اگر چاہے گا اور نہیں ہو تم عاجز کرنے والے[1]"

۱؎ ارے نادانو! اس عذاب کو لانا میرے اختیار میں نہیں کہ میں اسے جلدی لے آؤں۔ ان شاء اگر وہ جلدی یا بدیر چاہے گا تو وہ خود عذاب بھیجے گا میرے ذمہ یہ کام نہیں ہے (1)۔ جب اللہ تعالیٰ کا عذاب آ جائے گا تو پھر تمہیں اس سے بچاؤ یا بھاگنے کی گنجائش نہ ہوگی۔

وَ لَا یَنْفَعُكُمْ نُصْحِیْۤ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ اِنْ كَانَ اللّٰهُ یُرِیْدُ اَنْ یُّغْوِیَكُمْ ؕ

هُوَ رَبُّكُمْ ۟ وَ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۳۴﴾

”نہیں فائدہ پہنچائے گی تمہیں میری خیر خواہی اگر چہ میرا ارادہ ہو کہ میں تمہاری خیر خواہی کروں اگر اللہ کی مرضی یہ ہو کہ وہ تمہیں گمراہ کر دے [1] وہی پروردگار ہے تمہارا اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے [2]“

[1] نافع اور ابو عمرو نے نصحی کی یاء پر فتحہ پڑھا ہے اور بقیہ قراء نے یاء کو ساکن کر کے پڑھا ہے اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ۔ یہ جملہ شرط اور جواب کی دلیل ہے اور یہ ان کان اللّٰہ کے جواب کی دلیل ہے ان کان اللّٰہ یرید ان یغویکم۔ تقدیر کلام اس طرح ہے ان کان اللّٰہ یرید ان یغویکم فَاَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ لَا یَنْفَعُ نُصْحِیْ۔ اس آیت کریمہ میں یہ دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ اغواء کیساتھ بھی متعلق ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے مراد کا خلاف محال ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں ان یغویکم کا معنی ہے وہ تمہیں ہلاک کرنے کا ارادہ کرے اور یہ غوی الفصیل سے مشتق ہے جس کا معنی ہلاک ہونا ہے۔

[2] وہ تمہارا خالق ہے اور تم میں وہ ہر تصرف کرنے والا ہے اور تم اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے اور وہ تمہیں اپنے کئے کی سزا دے گا۔

اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ اِنِ افْتَرَیْتُهٗ فَعَلَیَّ اِجْرَامِیْ وَ اَنَا بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُجْرِمُوْنَ ﴿۳۵﴾

”کیا وہ کہتے ہیں کہ اس نے خود گھڑ لیا ہے [1] اسے آپ فرمائیے اگر میں نے خود گھڑا ہے اسے تو مجھ پر ہوگا وبال میرے جرم کا [2] اور میں بری الذمہ ہوں ان گناہوں سے جو تم کرتے ہو [3]“

[1] ام بمعنی بل ہے یعنی بل یقولون افتراہ۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں نوح علیہ السلام کی قوم نے کہا کہ یہ نوح نے خود گھڑا ہے۔ مقاتل فرماتے ہیں اس کا معنی ہے تم کہتے ہو محمد ﷺ نے خود گھڑا ہے(1)۔

[2] خطاب حضرت نوح علیہ السلام کو ہے یا نبی کریم ﷺ کو ہے۔ اگر میں نے اسے گھڑا ہے تو میرے اس جرم کا وبال مجھ پر پڑے گا۔ اجرام کا معنی ہے گناہ کرنا۔

[3] تم نے جو جو میری طرف آیات الٰہیہ کو خود گھڑنے کی نسبت کر کے گناہ کیا ہے میں اس سے بری ہوں۔

امام بغوی فرماتے ہیں الضحاک نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ نوح علیہ السلام کی قوم نوح علیہ السلام پر تشدد کرتی حتیٰ کہ آپ زمین پر گر پڑتے تو وہ آپ کو کپڑوں پر لٹا کر ایک کمرے میں چھوڑ جاتے اور یہ گمان کرتے کہ اب وہ فوت ہو چکے ہیں۔ پھر آپ دوسرے دن باہر نکلتے اور انہیں توحید کی تبلیغ شروع فرما دیتے(2)۔ روایت ہے کہ ایک بوڑھا شخص تھا جو لاٹھی کے سہارے چل رہا تھا اور اس کے ساتھ اس کا بیٹا بھی تھا۔ بوڑھا اپنے بیٹے کو حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں یہ نصیحت کر رہا تھا کہ بیٹا اس مجنوں شخص کے دھوکہ میں کبھی نہ آنا۔ اس لڑکے نے کہا اے باپ لاٹھی مجھے دے۔ اس نے لاٹھی لے کر آپ کو شدید زخمی کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو تسلی دینے کے لئے مندرجہ ذیل آیت نازل فرمائی(3)۔

وَ اُوْحِیَ اِلٰی نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ یُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَىِٕسْ بِمَا كَانُوْا یَفْعَلُوْنَ ﴿۳۶﴾

”اور وحی کی گئی نوح علیہ السلام کی طرف کہ نہیں ایمان لائیں گے آپ کی قوم سے بجز ان کے جو ایمان لا چکے ہیں اس

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 205 (الفکر)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 206 (الفکر)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 206 (الفکر)

لئے آپ غمگین نہ ہوں اس سے جو وہ کیا کرتے ہیں ؎۱ "

؎۱ اس آیت کریمہ میں تبتئس بؤس سے مشتق ہے اور باب افتعال ہے جس کا معنی ہے دن، یعنی آپ غمزدہ نہ ہوں اور ان کی تکذیب اور ایذا اور ساتیوں سے پریشان نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام کو ان کے ایمان سے کلی طور پر مایوس کر دیا تھا تا کہ آپ ان کو دعوت دینے میں اپنے آپ کو تکلیف نہ دیتے رہیں اور انہیں اس وعدہ پر غمزدہ ہونے سے بھی منع فرمادیا کہ میں ان منکروں کو ہلاک کروں گا اور آپ کو ان سے نجات دلاؤں گا۔ ان حالات میں حضرت نوح علیہ السلام نے ان بدبختوں کے لئے یہ بددعا کی رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا اے میرے رب زمین پر نہ چھوڑ کافروں میں سے کسی کو بستا ہوا۔

محمد بن اسحاق نے عبید بن عمر اللیثی سے حکایت کیا ہے کہ انہیں یہ خبر پہنچی ہے کہ وہ ظالم حضرت نوح علیہ السلام کو پکڑ لیتے اور ان کا گلہ دبا دیتے حتی کہ آپ مدہوش ہو جاتے مگر جب افاقہ ہوتا تو کہتے رَبِّ اغْفِرْ لِقَوْمِيْ فَاِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ اے میرے رب میری قوم کو معاف فرما دے، یہ میری شان کو نہیں سمجھتے(1)۔ یہ سلسلہ تبلیغ اور ان کی طرف سے ظلم و زیادتی جاری رہی حتی کہ نسل در نسل یہی کچھ ہوتا رہا، جو نسل پیدا ہوتی وہ پہلی سے زیادہ بد اور خبیث ہوتی۔ پس وہ کہتے یہ مجنون ہمارے آباؤ اجداد کے زمانے کا ہے۔ اور آپ کی پند و نصائح پر بالکل دھیان نہ دیتے تو آخر کار آپ کی روحانی کوفت اس حد تک پہنچ گئی کہ آپ نے اپنے رب ذوالجلال سے التجاء کی رَبِّ اِنِّيْ دَعَوْتُ قَوْمِيْ لَيْلًا وَّنَهَارًا اے میرے رب میں نے اپنی قوم کو دن رات تیرے احکام کی دعوت دی ہے" مگر بے سود" آخر میں آپ نے عرض کی رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ۝ اے میرے رب روئے زمین پر کافروں میں سے کو بستا نہ چھوڑ۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی فرمائی۔

وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ۝۳۷

"اور بنائیے ایک کشتی ہماری آنکھوں کے سامنے اور ہمارے حکم ؎۱ اور نہ بات کیجئے مجھ سے ان لوگوں کے بارے میں جنہوں نے ظلم کیا وہ ضرور غرق کیے جائیں گے ؎۲۔"

؎۱ بِاَعْيُنِنَا میں با ملابست کے لئے ہے اور حال واقع ہو رہی ہے۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں اسکا معنی ہے ہمارے سامنے۔ مقاتل فرماتے ہیں اس کا معنی ہے ہمارے علم کے ساتھ (2)۔ بعض فرماتے ہیں اسکا معنی ہے ہماری حفاظت میں اور یہاں حفاظت کو آنکھ سے تعبیر فرمایا کیونکہ حفظ کے آلات میں آنکھ بڑا آلہ ہے اور اس میں دوسرے حواس کی نسبت خلل بھی بہت کم ہے۔ اور اس کے مطابق بنانا جو ہم تیری طرف وحی کریں، یعنی ہم بتائیں کہ کس طرح کی کشتی بنانی ہے، یا یہ معنی ہے کہ اس کی بناوٹ ہمارے حکم کے ساتھ ہو۔

؎۲ اے نوح علیہ السلام اب مجھ سے ظالموں کے بارے میں عذاب کی دوری کی دعا نہ کرنا ازل سے ان کو طوفان کے ذریعے غرق کرنے کا میں نے فیصلہ کر دیا ہے اب اس کے ٹلنے کی کوئی سبیل نہیں ہے۔

امام بغوی نے حضرت نوح علیہ السلام کا قصہ لکھا ہے جس میں ہے کہ جبرئیل علیہ السلام حضرت نوح علیہ السلام کے پاس آئے اور اور پیغام دیا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں تم ایک کشتی بناؤ۔ حضرت نوح نے کہا میں کشتی کیسے بناؤں؟ میں بڑھئی تو نہیں ہوں۔ جبرئیل علیہ السلام نے کہا تمہارا پروردگار فرماتا ہے تم بناؤ۔ بیشک تم میری آنکھوں کے سامنے ہو۔ آپ نے فرمان الٰہی سن کر کلہاڑا لیا اور بنانا شروع کر دی اور آپ سے کوئی خطا نہ ہوئی۔ بعض علماء نے لکھا ہے حضرت نوح علیہ السلام کی طرف وحی کی گئی تھی کہ جوجو پرندے کی طرح بناؤ(3)۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 206 (الفکر)　2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 207 (الفکر)　3۔ [illegible]

وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَاٌ مِّنْ قَوْمِهٖ سَخِرُوْا مِنْهُ قَالَ اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ ﴿۳۸﴾

"اور نوح (علیہ السلام) کشتی بنانے لگے [1] اور جب بھی گزرتے ان کے پاس سے ان کی قوم کے سردار (تو) آپ کا مذاق اڑاتے [2] آپ کہتے اگر تم مذاق اڑاتے ہو ہمارا تو (ایک دن) ہم بھی تمہارا مذاق اڑائیں گے جس طرح تم مذاق اڑاتے ہو [3]"

[1] نوح علیہ السلام نے کشتی بنانی شروع کر دی۔ یہاں ماضی کی حالت کو مضارع سے تعبیر کیا گیا ہے۔ امام بغوی لکھتے ہیں نوح علیہ السلام اپنی قوم سے بالکل بے پروا ہو کر اپنے رب کے حکم سے کشتی بنانے میں لگ گئے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی قوم کے لوگوں کی عورتوں کو بانجھ کر دیا ایک بچہ بھی پیدا نہ ہوا۔ حضرت نوح علیہ السلام لکڑی کاٹتے کیل لگاتے اور اس کے اوپر سے گزرتے تو مذاق کرتے(1)۔

[2] وہ آپ کے کشتی بنانے کے عمل پر مذاق اڑاتے کہ یہ ایک ایسی جگہ جس کشتی تیار کر رہے ہیں جہاں قریب قریب پانی کا نشان بھی نہیں ہے، آپ کو دیکھ کر ہنستے اور کہتے اے نوح نبوت کا تاج اتار کر بڑھئی بن گئے ہو۔ روایت ہے کہ وہ حضرت نوح سے پوچھتے اے نوح یہ کیا بنا رہے ہو؟ آپ فرماتے ایسا گھر بنا رہا ہوں جو پانی پر چلے گا تو وہ آپ کی یہ بات سن کر خوب ہنستے۔

[3] جس طرح تم ہمارا مذاق اڑاتے ہو ہم بھی تمہارا مذاق اڑائیں گے جب تم دنیا میں غرق ہونے اور آخرت میں جلنے کے عذاب میں مبتلا ہو گے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ کلام بطور مشاکلہ ذکر کی گئی ہے اور معنی یہ ہے کہ اگر آج تم مجھ سے ناواقف بنے ہوئے ہو تو جس دن تم پر عذاب نازل ہوگا تو میں بھی انجان بن جاؤں گا۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ تم ہم سے مذاق کرتے ہو تم اپنے اس مذاق اڑانے کے انجام کو عنقریب دیکھ لو گے۔ کما تسخرون جس طرح تم ہماری کشتی کو دیکھ کر ہمارا مذاق اڑاتے ہو ہم بھی ایسا ہی تمہارا مذاق اڑائیں گے۔

فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿۳۹﴾

"سو تم جان لو گے کہ کس پر آتا ہے عذاب جو رسوا کر دے گا اسے اور (کون ہے) اترتا ہے جس پر عذاب ہمیشہ رہنے والا [1]"

[1] من موصول تعلمون کا مفعول ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ یخزیہ کا معنی یہینہ جو اسے رسوا کر دے گا یحل علیہ کا معنی ہے اس پر نازل ہوگا یا یہ معنی کہ عذاب اسے یوں چمٹ جائیگا جیسے قرض انسان کو چمٹ جاتا ہے اور دور ہونیکا نام نہیں لیتا عذاب مقیم سے مراد دائمی عذاب ہے۔ ان پر اللہ کا عذاب آیا حتی کہ سب کے سب مر گئے اور قیامت تک عالم برزخ میں عذاب پانے والے ہو گئے۔ پھر قیامت کے روز ان کا لوٹنا آگ کے عذاب کی طرف ہوگا اور وہ بہت بری جگہ ہے۔

امام بغوی فرماتے ہیں یہودیوں کا یہ خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام کو شیشم کی لکڑی سے کشتی بنانے کا حکم دیا اور یہ بھی فرمایا کہ اس کشتی کا درمیانی حصہ ٹیڑھا ہو اور پھر اس کشتی کو اندر اور باہر سے تارکول لگا دو اور اس کی لمبائی اسی ہاتھ اور چوڑائی پچاس ہاتھ ہو اور اس کی بلندی تیس ہاتھ ہو اور ہاتھ مکمل کندھے تک ہو اور اس کشتی کو تین منزلہ بنانا اور اس میں روشندان بھی ہوں۔ تو حضرت نوح علیہ السلام نے ایسا ہی کیا جیسے اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا تھا(2)۔ اسحاق بن بشر اور ابن عساکر نے حضرت ابن عباسؓ سے اس طرح نقل کیا ہے

کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں کشتی بنانے کا حکم دیا تو آپ نے عرض کی یا رب لکڑی کہاں سے لوں؟ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا درخت لگاؤ تو آپ نے بیس سال درخت لگائے۔ آپ ان کے حق میں بددعا کرنے سے رک گئے اور وہ لوگ مذاق اڑانے سے باز آ گئے۔ جب درخت تیار ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ انہیں کاٹ کر خشک کرو آپ نے ایسا ہی کیا۔ پھر عرض کی یا رب میں یہ گھر کیسے بناؤں فرمایا اس کو تین شکلوں پر بناؤ اس کا سر مرغ کے سر کی مانند ہو، اس کا سینہ جوہ جوہ پرندے کی طرح ہو اور اسکی دم مرغ کی طرح ہو اور اسے طبقوں کی صورت میں بناؤ اور اس کی اطراف میں اس کے دروازے بناؤ اور لوہے کے کیلوں کے ساتھ اسے جوڑ دو۔ اللہ تعالیٰ نے جبرئیل امین کو بھیجا اور انہوں نے حضرت نوح علیہ السلام کو کشتی کی بناوٹ کے متعلق سب کچھ بتایا(1)۔ اسی طرح ابن عساکر سعید بن میتب عن عبداللہ بن عمرو بن العاص وکعب کی سند سے نقل کیا ہے۔

امام بغوی فرماتے ہیں حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا نوح علیہ السلام نے وہ کشتی دو سال میں تیار فرمائی تھی۔ اس کی لمبائی تین سو ہاتھ اور چوڑائی پچاس ہاتھ اور اونچائی تیس ہاتھ تھی اور وہ شیشم کی بنی ہوئی تھی اور اس کے تین درجے تھے نچلی منزل میں وحوش' درندے اور خونخوار جانور سوار کیے اور درمیانی منزل میں چوپائے سوار کیے اور اوپر والی منزل خود اور اپنے حواریوں کو سوار کیا اور زاد راہ بھی اپنے ساتھ رکھا(2)۔

ابن مردویہ نے سمرہ بن جندب سے روایت کیا ہے کہ اس کشتی کا طول تین سو ہاتھ' عرض پچاس ہاتھ اور اونچائی تیس ہاتھ تھی۔

ابن المنذر' ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ نے ابن عباسؓ سے عرض کی مقدار کے بغیر نقل کیا ہے(3)۔ عبد بن حمید' ابن المنذر اور ابو الشیخ نے حضرت قتادہ سے روایت کیا ہے کہ اس کی لمبائی تین سو ہاتھ عرض پچاس ہاتھ اور اونچائی تیس ہاتھ تھی اور اس کے دروازے چوڑائی کی جانب تھے(4)۔

ابن جریر نے ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ اس کشتی کے تین طبقات بنے، ایک طبقہ میں چوپائے اور درندے تھے اور ایک طبقہ میں پرندے تھے(5) اور خلاصۃ السیر کی شرح میں ہے کہ نچلے طبقہ میں پرندے' درندے اور دوسرے حیوان تھے۔ درمیانے طبقہ میں کھانا' پانی اور کپڑے تھے اور اوپر والے طبقہ میں انسان تھے۔ علامہ شامی نے لکھا ہے کہ اس کی لمبائی اسی ہاتھ تھی، عرض پچاس ہاتھ اور بلندی تیس ہاتھ تھی اور ہاتھ بازو تک تھے۔ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ اس کا طول ساٹھ ذراع ہے۔ امام بغوی نے حضرت حسن سے روایت کیا ہے اس کا طول 200 ہاتھ تھا اور عرض 600 ہاتھ تھا۔ معروف پہلا قول ہے کہ اس کی لمبائی 80 ہاتھ تھی(6)۔ حضرت زید بن اسلم سے مروی ہے کہ نوح علیہ السلام 100 سال درخت لگاتے اور کاٹتے رہے اور سو سال کشتی بناتے رہے۔ بعض نے لکھا ہے کہ چالیس سال درخت لگائے، چالیس سال انہیں خشک کیا(7)۔ حضرت کعب الاحبار سے مروی ہے کہ نوح علیہ السلام نے تیس سال کشتی پر کام کیا۔ روایت ہے کہ اس کے تین طبقے تھے۔ نچلا طبقہ وحوش اور چوپائیوں کے لئے تھا۔ جب جانوروں کا گوبر زیادہ ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام کو وحی فرمائی کہ ہاتھی کی دم پر مارو تو اس طرح خنزیر نر اور مادہ پیدا ہوئے۔ پس وہ سارا گوبر کھا گئے پھر جب چوہے نے کشتی کو کاٹنا شروع کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی کہ شیر کی آنکھوں کے درمیان مارو تو آپ نے اسے مارا تو فوراً اس کے نتھنے سے بلا اور بلی پیدا ہو گئے اور انہوں نے چوہے کو سبق سکھا دیا(8)۔

1۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 593 (العلمیہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 8-207 (الفکر)
3۔ تفسیر قرطبی، جلد 5، صفحہ 31
4۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 22 (الامیریہ)
5۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 22 (الامیریہ)
6۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 208 (الفکر)
7۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 208 (الفکر)
8۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 208 (الفکر)

حَتّٰۤی اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَ فَارَ التَّنُّوْرُ ۙ قُلْنَا احْمِلْ فِیْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ وَ اَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَیْهِ الْقَوْلُ وَ مَنْ اٰمَنَ ؕ وَ مَاۤ اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِیْلٌ ۝

''یہاں تک کہ جب آ گیا ہمارا حکم [1] اور ابل پڑا تنور [2] تو ہم نے (نوح کو) فرمایا سوار کرلو کشتی میں ہر جنس سے نر و مادہ دو اور اپنے گھر والوں کو [3] سوائے ان کے جن پر پہلے ہو چکا ہے حکم اور (سوار کرلو) جو ایمان لا چکے ہیں [4] اور نہیں ایمان لائے تھے آپ کے ساتھ مگر تھوڑے لوگ [5]''

[1] یہ ویصنع فعل کی غایت ہے اور یصنع اور حتی جاء کے درمیان والی کلام یصنع کی ضمیر سے حال ہے یا یہ حتی ابتدائیہ ہے جس کے بعد نئی کلام شروع ہوتی ہے۔

[2] التنور کے متعلق مفسرین کے مختلف اقوال ہیں ابوالشیخ نے عکرمہ اور الزہری سے روایت کیا ہے کہ تنور سے مراد سطح زمین ہے(1)۔ امام بغوی نے بھی اسی طرح روایت کیا ہے کہ سعید بن منصور، ابن جریر، ابن المنذر، اور ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے ابن عباسؓ سے یہی مفہوم روایت کیا ہے، یعنی نوح علیہ السلام کو کہا گیا کہ جب تو دیکھے کہ سطح زمین سے پانی ابل رہا ہے تو کشتی پر سوار ہو جانا۔ عبد بن حمید، ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے حضرت قتادہ سے التنور کا مطلب ٹیلے اور بلند جگہ روایت کیا ہے(2)۔ ابن ابی حاتم نے ابن عباسؓ سے یہ بھی روایت کیا ہے کہ تنور سے مراد وہ جزیرہ کا چشمہ ہے جسے عین الوردۃ کہا جاتا ہے(3) حضرت علیؓ سے مروی ہے فار التنور کا مطلب فجر کا طلوع اور صبح کا نور ہے۔ الحسن، مجاہد اور الشعبی فرماتے ہیں تنور سے مراد روٹیاں پکانے والا تنور ہی ہے(4)۔ یہ اکثر مفسرین کا قول ہے اور عطیہ کی ابن عباس ﷺ سے روایت بھی یہی ہے۔ حضرت ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے ابن عباس سے یہ الفاظ روایت کیے ہیں کہ جب تم دیکھو کہ تمہارے گھر کے تنور سے پانی نکل رہا ہے تو یقین کر لینا کہ تمہاری قوم کی ہلاکت آ پہنچی ہے(5)۔ حضرت الحسن فرماتے ہیں یہ پتھروں کا بنا ہوا تنور تھا جس میں حضرت حواء علیہا السلام روٹیاں پکاتی تھیں۔ پھر یہ حضرت نوح تک پہنچا۔ حضرت نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام سے کہا گیا کہ جب تم اس تنور سے پانی ابلتا دیکھو تو خود بھی اور اپنے اصحاب کو بھی کشتی پر سوار کر لینا(6)۔ یہ تنور کہاں تھا اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ مجاہد اور الشعبی فرماتے ہیں یہ کوفہ کی ایک طرف میں تھا اور امام الشعبی قسم اٹھا کر کہتے تھے کہ وہ کوفہ کی ایک طرف میں تھا اور فرماتے ہیں حضرت نوح علیہ السلام نے کوفہ کی مسجد کے درمیان میں کشتی بنائی تھی اور تنور باب کندہ سے متصل اندر دائیں جانب تھا(7) اور اس تنور سے پانی کا نکلنا حضرت نوح کے لئے علامت تھا کہ اب اس نافرمان قوم پر ہلاکت آنے والی ہے اور تم اس کشتی پر سوار ہو جاؤ۔ ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے حضرت علی بن ابی طالب سے روایت کیا ہے کہ باب کندہ کی طرف سے مسجدِ کوفہ سے تنور ابلا تھا(8)۔ ابوالشیخ نے الشعبی کی طریق سے حضرت علیؓ سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس نے دانے کو اگایا روحوں کو پیدا فرمایا۔ یہ تمہاری چوتھی مسجد ہے مسلمانوں کی مساجد میں سے جس میں دو رکعتیں پڑھنا میرے شرف

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 209 (الفکر)
2۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 596 (العلمیہ)
3۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 595 (العلمیہ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 209 (الفکر)
5۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 595 (العلمیہ)
6۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 209 (الفکر)
7۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 209 (العلمیہ)
8۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 595 (العلمیہ)

ہے کہ اس کی دائیں جانب تنور ابل پڑا تھا(1)۔ مقاتل فرماتے ہیں یہ تنور آدم علیہ السلام کا تھا اور یہ شام میں اس جگہ تھا جسے عین وردہ کہا جاتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ بھی مروی ہے کہ وہ تنور ہند میں تھا(2)۔ ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم، ابو الشیخ اور الحاکم نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہی روایت کیا ہے۔ فوران کا معنی ابلنا ہے۔

۲ ہم نے حکم دیا کہ کشتی میں سوار کرلو ہر جوڑا۔ زوجین ہر دو ایسی چیزوں کو کہتے ہیں جو ایک دوسرے سے جدا نہ ہوسکیں جیسے زوج خف اور زوج نعل ایک موزے اور ایک جوتے کے لئے استعمال ہوتا ہے اور یہاں زوجین سے مراد مذکر اور مونث ہے، یعنی ہر جنس کا ایک مذکر اور ایک مونث سوار کرلو "اثنین" احمل کے مفعول کی حیثیت سے منصوب ہے، یعنی ہر مذکر اور ہر مونث کا ایک ایک فرد سوار کرلو۔ یہ معنی جمہور قرأت کل کے زوجین کی طرف مضاف ہونے کی صورت میں ہے۔ اور حضرت حفص نے یہاں اور سورۃ المومنین میں کل کو تنوین کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ حیوانوں کی ہر نوع سے ایک جوڑا یعنی مذکر اور مونث سوار کرلو۔ اس معنی کے اعتبار سے من کل زوجین مفعول ہوگا اور اثنین تاکید کے لئے ہوگا۔ امام بغوی لکھتے ہیں حضرت نوح علیہ السلام نے عرض کی یارب میں کیسے ہر جنس کا جوڑا سوار کروں گا۔ تو اللہ تعالیٰ نے تمام درندوں اور پرندوں کو آپ کے پاس جمع فرما دیا۔ آپ ہر جنس پر ہاتھ مارتے۔ دائیں ہاتھ میں مذکر اور بائیں ہاتھ میں مونث ہوتی اور آپ ان کو کشتی میں سوار کردیتے۔ اھلک کا اثنین یا زوجین پر عطف ہے اور اہل سے مراد آپ کی بیوی، بیٹے اور ان کی بیویاں ہیں(3)۔

۳ آپ کی بیوی واعلہ اور اس کے بطن سے آپ کا بیٹا کنعان یہ دونوں کافر تھے۔ ومن آمن سے مراد یہ ہے کہ سوار کرلو جو دوسرے لوگوں میں سے ایمان لائے ہیں۔

۵ آپ کے ساتھ بہت تھوڑے ایمان لائے، ان کی تعداد میں مفسرین کا اختلاف ہے۔ حضرت قتادہ، ابن جریج، محمد بن کعب القرظی فرماتے ہیں کشتی میں صرف آٹھ اشخاص سوار ہوئے تھے۔ حضرت نوح ایک آپ کی بیوی تین بیٹے سام، حام اور یافث اور ان کی بیویاں(4)۔ ابن جریر اور ابو الشیخ نے ابن جریج سے نقل فرمایا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے ساتھ تین بیٹے اور اور ان کی تین بیویاں سوار کی تھیں۔ حام نے کشتی میں اپنی بیوی سے ازدواجی تعلقات قائم کئے تو آپ نے دعا مانگی کہ ان کا نطفہ بدل جائے تو ان کی بیوی نے سودان کو جنم دیا(5)۔ الاعمش فرماتے ہیں وہ سات افراد تھے نوح، آپ کے تین بیٹے اور ان کی تین بیویاں(6)۔ یہ دونوں قول ایسے ہیں جن کا قرآن انکار کرتا ہے کیونکہ ومن آمن کا اھلک پر عطف مغائرت پر دلالت کرتا ہے اور یہ مذکورہ سات افراد آپ کے اہل میں سے تھے۔ ابن اسحاق فرماتے ہیں وہ دس افراد تھے۔ حضرت نوح آپ کے تین بیٹے سام، حام، یافث اور چھ دوسرے اشخاص جو ایمان لائے تھے اور ساتھ ان تمام کی بیویاں بھی تھیں(7) یعنی دس مرد اور دس عورتیں تھی۔ حضرت مقاتل کا قول ہے کہ وہ بہتر مرد اور عورتیں تھیں۔ تین آپ کے بیٹے اور ان کی بیویاں تھیں پس کل اٹھتر افراد تھے نصف مرد اور نصف عورتیں تھیں(8)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نوح علیہ السلام کی کشتی میں 80 مرد تھے جن میں ایک جرہم تھا(9)۔ ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور ابو الشیخ

1۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 595 (العلمیہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 209 (الفکر)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 210 (الفکر)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 210 (الفکر)
5۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 210 (الفکر)
6۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 26 (الامیریہ)
7۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 210 (الفکر)
8۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 210 (الفکر)
9۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 210 (الفکر)

نے ابن نزدیک دوسری مساجد کی نسبت دس رکعتوں سے افضل ہے مگر مسجد حرام مسجد نبوی ﷺ کا ثواب اس سے زیادہ ہے۔ اس مسجد کو یہ عباس سے روایت کیا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں 80 انسان تھے اور آپ کی زبان عربی تھی(1)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا سب سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام نے طوطے کو کشتی میں سوار کیا تھا اور سب سے آخر میں گدھے کو سوار کیا تھا۔ جب گدھا سوار ہونے لگا تو اس کا اگلا حصہ داخل ہو گیا مگر پچھلا حصہ یعنی پچھلی ٹانگیں نہ اٹھا سکتا تھا کیونکہ شیطان اس کی دم کے ساتھ لٹک گیا تھا۔ حضرت نوح علیہ السلام اسے ہلکارتے مگر وہ کوشش کے باوجود داخل نہ ہو سکتا تھا۔ پھر آپ نے فرمایا داخل ہو اگرچہ تیرے ساتھ شیطان بھی ہو۔ یہ کلمہ جب آپ کی زبان پر جاری ہوا تو شیطان نے اسے چھوڑ دیا۔ اس طرح گدھا بھی کشتی میں داخل ہو گیا اور شیطان بھی داخل ہو گیا۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اسے فرمایا اے شیطان۔ اے اللہ کے دشمن تجھے کس نے داخل کیا ہے؟ اس نے کہا آپ نے خود نہیں کہا اگرچہ تیرے ساتھ شیطان بھی ہو۔ آپ علیہ السلام نے فرمایا اے اللہ کے دشمن مجھ سے دور ہو جا۔ شیطان نے کہا اب میں تمہارے ساتھ ہی رہوں گا۔ وہ کشتی کی چھت پر تھا جیسا کہ علماء کا خیال ہے(2)۔ روایت ہے کہ ایک سانپ اور بچھو حضرت نوح علیہ السلام کے پاس آئے اور کہا ہمیں بھی سوار کر لو۔ آپ نے فرمایا تم دونوں تکلیف اور نقصان کا سبب ہو، اس لئے میں تمہیں سوار نہیں کرتا۔ انہوں نے کہا آپ ہمیں سوار کر لیں۔ ہم تمہیں ضمانت دیتے ہیں کہ جس کو ہم تکلیف پہنچائیں گے وہ تمہارا ذکر کرے گا(3)۔ پس جسے سانپ اور بچھو کی تکلیف کا خوف ہو وہ سَلٰمٌ عَلٰی نُوْحٍ فِی الْعٰلَمِیْنَ پڑھے تو سانپ اور بچھو اسے نقصان نہ پہنچائیں گے۔ حضرت الحسن نے فرمایا حضرت نوح نے وہ جانور سوار کئے جو بچے یا انڈے دیتے تھے اور جو مٹی سے پیدا ہوتے ہیں انہیں سوار نہ کیا جیسے پسو مچھر وغیرہ(4)۔

وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا ؕ اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۴۱﴾

"اور نوح نے کہا سوار ہو جاؤ اس (کشتی) میں ا؎ اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ ہی اس کا چلنا اور اس کا لنگر انداز ہونا ہے ۲؎ بیشک میرا پروردگار غفور رحیم ہے ۳؎۔"

ا؎ کشتی میں بیٹھنے کو سوار ہونا فرمایا کیونکہ پانی میں کشتی کا ہونا زمین پر سواری کی مانند ہے۔

۲؎ بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا ارْكَبُوْا کی ضمیر سے حال ہے۔ یعنی اس میں سوار ہو جاؤ اللہ کا نام لیتے ہوئے یا بسم اللہ پڑھتے ہوئے۔ اس کے چلنے اور ٹھہرنے کے وقت یا اس کے چلنے یا ٹھہرنے کی جگہ میں۔ یہ معنی اسوقت ہوگا جب مجری اور مرسی وقت مکان یا مصدر کے لئے ہوں اور مضاف محذوف تصور کیا جائے جیسے عربوں کا قول ہے اتیک خفوق النجم۔ اور مجری اور مرسی کی نصب حال مقدر کی وجہ سے ہے ان دونوں کو بسم اللہ کی وجہ سے رفع دینا بھی جائز ہے۔ اس صورت میں یہ دونوں مصدر ہوں گے یا یہ جملہ اسمیہ ہے۔ تقدیر یوں ہوگی اجراء ھا بسم اللہ بسم اللہ خبر ہے یا اس کا صلہ ہے اور خبر محذوف ہے اور اس جملہ کا ماقبل کلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ گویا نوح علیہ السلام نے انہیں سوار ہونے کا حکم دیا پھر انہیں بتایا کہ اس کا چلنا اور ٹھہرنا اللہ کے نام کے ساتھ ہے۔ اسم کا لفظ مقحم ہے یا یہ ارکبوا کی ضمیر سے حال مقدرہ ہے اور فیہا کی ضمیر مجرور سے حال ہے۔ حمزہ، الکسائی اور حفص نے میم کے فتحہ کے ساتھ جری سے مشتق کر کے پڑھا ہے۔

1۔ الدرالمنثور، جلد 3، صفحہ 601 (العلمیۃ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 211 (الفکر)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 211 (الفکر)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 211 (الفکر)

محمد بن محیصن نے مَجْرٰىهَا وَمُرْسٰهَا دونوں کو میم کے فتحہ کے ساتھ جریت اور رست سے مشتق کر کے پڑھا ہے۔ یہ لفظ تینوں احتمال رکھتے ہیں اسم زمان اسم مکان اور مصدر اور باقی قراء نے میم کے ضمہ کے ساتھ اجریت و ارسیت سے مشتق کر کے پڑھا ہے۔ حفص نے صرف قرآن میں راء کے امالہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

۳ یعنی اگر وہ تمہارے گناہوں کو نہ بخشتا اور اس کی تم پر رحمت نہ ہوتی تو تم کبھی نجات حاصل نہ کرتے۔ امام بغوی فرماتے ہیں الضحاک نے فرمایا جب نوح علیہ السلام کشتی کے چلنے کا ارادہ فرماتے تو پڑھتے بسم اللہ جرت اور جب ٹھہرانے کا ارادہ فرماتے تو کہتے بسم اللہ رست (1)۔

وَهِيَ تَجْرِيْ بِهِمْ فِيْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ ۗ وَنَادٰى نُوْحُ ِۨابْنَهٗ وَكَانَ فِيْ مَعْزِلٍ يّٰبُنَيَّ ارْكَبْ مَّعَنَا وَلَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ ۝۴۲

"اور وہ چلنے لگی انہیں لے کر ایسی موجوں میں جو پہاڑ کی مانند ہیں ۱ اور پکارا نوح (علیہ السلام) نے اپنے بیٹے کو اور وہ (ان سے) الگ تھا ۲ بیٹا سوار ہو جاؤ ہمارے ساتھ ۳ اور نہ ملو کافروں کے ساتھ ۴"

۱ یہ کلام محذوف کے ساتھ متصل ہے جس پر ارْكَبُوْا کا فعل دلالت کر رہا ہے۔ یعنی وہ سوار ہو گئے اور وہ ان کو لے کر چلنے لگی، جبکہ وہ اس میں سوار تھے۔ فی موج۔ یہ موجۃ کی جمع ہے جیسے ثمرۃ کی جمع ثمر آتی ہے اور موجہ اس پانی کے اچھال کو کہتے ہیں جو تیز ہوا کے وقت پانی میں پیدا ہوتا ہے۔ کالجبال کا مطلب یہ ہے کہ ہر موجہ تہ در تہ ہونے اور بلند ہونے میں پہاڑ کی مثل تھا۔

۲ نوح کے بیٹے کا نام کنعان تھا۔ عبید بن عمیر کہتے ہیں وہ سام تھا اور یہ بھی کافر تھا (2)۔ معزل عزل عنه سے مشتق ہے اور ظرف مکان کا صیغہ ہے، یعنی اس نے اپنے آپ کو اپنے باپ سے یا اپنے دین سے دور کر دیا تھا۔

۳ عاصم نے الف جو یا کا بدل ہے اس کی جگہ فتحہ پر اکتفاء کرتے ہوئے یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ تیرے قول یا بنیا سے ہے اور باقی قراء نے یاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، یا اضافت کی وجہ سے اس پر اکتفا کیا ہے۔ ارکب معنا، ابن عامر، حمزہ یعقوب اور ابو بکر نے بروایت عاصم باء کے اظہار کے ساتھ پڑھا ہے اور دوسرے قراء باء کو میم میں ادغام کرتے ہیں۔ التیسیر میں ورش، ابن عامر اور حمزہ نے اظہار کیا ہے۔ قالون، الیزیدی اور خلاد سے اختلاف مروی ہے، تقدیر یوں ہے اے بیٹے اسلام قبول کر اور ہمارے ساتھ سوار ہو جا۔ آپ کا اسے سوار کرنا اسلام پر دلالت کرتا ہے کیونکہ سوار ہونا اسلام قبول کرنے کے ساتھ مشروط تھا۔

۴ اور کافروں کا ساتھ نہ ہونے کا معنی یہ ہے کہ اور علیحدہ ہونے میں کافروں کے ساتھ نہ دو، ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے۔

قَالَ سَاٰوِيْۤ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِيْ مِنَ الْمَآءِ ۗ قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ ۚ وَحَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ ۝۴۳

"بیٹے نے کہا (مجھے کشتی کی ضرورت نہیں) میں پناہ لے لوں گا کسی پہاڑ کی وہ بچا لے گا مجھے پانی سے ۱ آپ نے کہا (بیٹا) آج کوئی بچانے والا نہیں اللہ تعالیٰ کے حکم سے مگر جس پر وہ رحم کرے (اسی اثناء) میں حائل ہو گئی ان کے درمیان موج پس ہو گیا وہ ڈوبنے والوں سے) ۲۔"

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 211 (الفکر)　　2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 212 (الفکر)

1۔ کنعان نے کہا میں نہ اسلام قبول کرتا ہوں اور نہ آپ کے ساتھ سوار ہوتا ہوں لیکن میں پہاڑ کی پناہ لوں گا جو مجھے غرق ہونے سے بچا لے گا۔

2۔ حضرت نوح نے اسے فرمایا آج اللہ تعالیٰ کے حکم سے کوئی بچانے والا نہیں ہے مگر جس پر وہ رحم فرمائے بعض۔ علماء فرماتے ہیں من محل رفع میں ہے، یعنی کوئی اللہ کے عذاب کو روکنے والا نہیں ہے مگر اللہ جو رحم فرمانے والا ہے۔ یہی معنی ہے کہ اللہ کے عذاب سے بچانے والا کوئی نہیں ہے مگر ان کی جگہ جن پر اللہ نے رحم فرمایا اور وہ مومنین ہیں۔ یہ اس کلام کا رد ہے کہ آج کوئی بلند وبالا پہاڑ عذاب الٰہی سے بچالے گا۔ آج تو صرف وہ بچانے والا ہے جو مومنین کو بچائے گا یعنی کشتی۔ بعض فرماتے ہیں من یہ محل نصب میں ہے۔ معنی یہ ہے کہ کوئی بچنے والا نہیں ہے مگر جس پر اللہ تعالیٰ رحم فرمائے گا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے عِيشَةٍ رَّاضِيَةٍ۔ یعنی عیشة مرضیة بعض علماء فرماتے ہیں یہ مستثنیٰ منقطع ہے، یعنی لیکن جس پر اللہ رحم فرمائے گا وہ بچ جائے گا۔ و حال بینهما میں هما ضمیر کا مرجع نوح علیہ السلام اور آپ کا بیٹا ہے یا آپ کا بیٹا اور پہاڑ ہے اور کان۔ کان بمعنی صار ہے۔ یا یہ مطلب ہے کہ علم الٰہی میں یہ بات ہے۔ روایت ہے کہ پانی پہاڑوں کی چوٹیوں سے اوپر چالیس ہاتھ تھا۔ بعض فرماتے ہیں پندرہ ہاتھ تھا۔ امام بغوی فرماتے ہیں روایت ہے کہ جب پانی گلیوں میں کثیر ہو گیا تو ام صبی اپنے بچے پر خوف کھانے لگی، وہ اس سے بہت محبت کرتی تھی۔ وہ پہاڑ کی طرف نکلی حتی کہ پہاڑ کے تیسرے حصہ تک پہنچ گئی۔ جب پانی وہاں پہنچا تو مزید اوپر چڑھ گئی۔ جب پانی وہاں تک پہنچ گیا تو وہ پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گئی۔ جب پانی اس کی گردن تک پہنچا تو اس نے اپنے بچے کو ہاتھوں پر اوپر اٹھالیا۔ حتی کہ پانی اس کو بہا کر لے گیا۔ اگر اللہ تعالیٰ ان میں سے کسی ایک پر رحم فرماتا تو ام الصبی پر رحم فرماتا(1)۔ لیکن یہ واقعہ اس روایت کے خلاف ہے جس میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام کی قوم کی عورتوں کو غرق سے پہلے کئی سال بانجھ بنادیا تھا۔ حتی کہ جب وہ غرق ہوئے تو ان میں ایک بھی بچہ نہ تھا۔

وَقِيلَ يَٰٓأَرْضُ ٱبْلَعِى مَآءَكِ وَيَٰسَمَآءُ أَقْلِعِى وَغِيضَ ٱلْمَآءُ وَقُضِىَ ٱلْأَمْرُ وَٱسْتَوَتْ عَلَى ٱلْجُودِىِّ ۖ وَقِيلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ ٱلظَّٰلِمِينَ ﴿٤٤﴾

”اور حکم دیا گیا اے زمین نگل لے اپنے پانی کو اور اے آسمان تھم جا1 اور اتر گیا پانی2 اور حکم الٰہی نافذ ہو گیا3 اور ٹھہر گئی کشتی جودی (پہاڑ) پر اور کہا گیا ہلاکت و بربادی ہو ظالم قوم کے لئے4“

1۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے طوفان کے امر کو انتہاء کو پہنچنے کے بعد فرمایا۔ اے زمین اپنا پانی نگل جا۔ تو زمین نے اپنا پانی اپنے اندر کھینچ لیا اور آسمان کا پانی باقی رہا۔ وہ نہروں اور دریاؤں کی شکل چلنے لگا۔ پھر آسمان کو حکم دیا اے آسمان رک جا۔ بارش برسانا بند کر دے تو وہ رک گیا۔

2۔ اللہ نے پانی کو کم کر دیا۔ غاض لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔

3۔ اللہ تعالیٰ نے کفار کو ہلاک کرنے اور مومنین کو نجات دینے کا وعدہ فرمایا تھا وہ پورا ہو گیا۔ موصل کے قریب جزیرہ میں جودی پہاڑ پر کشتی ٹھہر گئی۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ شام کے قریب پہاڑ پر ٹھہری تھی۔

4۔ یہاں فعل محذوف ہے۔ اصل میں کلام بَعُدَ الْقَوْمُ الظّٰلِمُوْنَ بُعْدًا مِّنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ تھا۔ لِلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ کو مصدر کا موصوف بنا دیا گیا ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں روایت ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے کوے کو بھیجا کہ وہ زمین کی خبر لائے وہ ایک مردار پر بیٹھ گیا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 213 (الفکر)

اور واپس نہ آیا۔ پھر آپ نے کبوتر کو بھیجا۔ وہ اپنی چونچ میں زیتون کا پتہ لیکر آیا اور اس کا پاؤں کیچڑ سے آلودہ تھا۔ پس نوح علیہ السلام اسے دیکھ کر سمجھ گئے کہ پانی خشک ہو چکا ہے۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے کوے کے لئے خوف اور ڈر کی بددعا فرمائی۔ اسی وجہ سے وہ گھروں سے انس نہیں رکھتا اور کبوتر کے گلے کا طوق یہ امن کی علامت ہے۔ آپ علیہ السلام نے کبوتر کے لئے امان کی دعا فرمائی تھی۔ اس لئے وہ گھروں سے انس رکھتا ہے(1) عبد بن حمید، ابن المنذر اور ابو الشیخ نے حضرت قتادہ سے روایت کیا ہے کہ وہ کشتی انہیں دس رجب کو لے کر چلی اور پانی پر ڈیڑھ سو دن رہی۔ پھر جودی پہاڑ پر رک گئی وہ تمام 10 محرم کو زمین پر اترے(2)۔

ابن عساکر نے خالد الزیات سے کچھ زیادتی نقل کی ہے کہ وہ کشتی یوم عاشور کو رکی اور نوح علیہ السلام کے ساتھ جو جن و انس تھے، تمام کو فرمایا آج کے دن روزہ رکھو(3)۔ امام بغوی لکھتے ہیں کہ نوح علیہ السلام کشتی پر سوار ہوئے تو اس دن رجب کے دس دن گزر چکے تھے۔ پھر یہ کشتی انہیں چھ مہینے لے کر پھرتی رہی۔ وہ بیت اللہ شریف کے پاس سے گزری تو اس نے سات چکر لگائے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو غرق ہونے سے بچالیا تھا اور قبلہ کی جگہ غرق ہونے سے بچ گئی تھی۔ وہ تمام عاشورہ کے روز زمین پر اترے اور آپ نے اپنے ساتھیوں کو شکر الٰہی کے لئے روزہ رکھنے کا حکم فرمایا۔ بعض لوگوں نے لکھا ہے غرق ہونے سے عوج بن عنق بچ گیا تھا۔ پانی اس کی ناف تک آیا تھا اور اس کی نجات کا سبب یہ تھا کہ نوح علیہ السلام کو شیشم کی لکڑی کی ضرورت تھی تو آپ وہ شام سے اٹھا کر نہیں لا سکتے تھے تو عوج وہ لکڑی اٹھا کر لایا تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اسے (نبی کی معاونت کی وجہ سے) نجات عطا فرما دی تھی(4)۔ میں کہتا ہوں عوج کا قصہ نصوص قرآنیہ کے مخالف ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَقَالَ نُوحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّارًا۔ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِينَ ظَلَمُوا۔ فرمایا لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ إِلَّا مَن رَّحِمَ۔ ان نصوص قطعیہ عمومیہ کی موجودگی میں عوج بن عنق کی تخصیص قطعاً جائز نہیں۔ ہاں اگر کوئی نص قطعی موجود ہوتی تو تخصیص جائز ہوتی۔ یہ قصہ عقل و نقل کے معیار پر پورا نہیں اترتا۔

وَنَادَىٰ نُوحٌ رَّبَّهُ فَقَالَ رَبِّ إِنَّ ابْنِي مِنْ أَهْلِي وَإِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَأَنتَ أَحْكَمُ الْحَاكِمِينَ ﴿٤٥﴾

"اور پکارا نوح نے اپنے رب کو اور عرض کی میرے پروردگار! میرا بیٹا بھی تو میرے اہل سے ہے اور یقیناً تیرا وعدہ سچا ہے [1] اور تو سب حاکموں سے بہتر حکم کرنے والا ہے [2]"

1۔ فقال پر فا ندا کی تفسیر ہے۔ نوح علیہ السلام نے عرض کی اے میرے پروردگار کنعان میرا بیٹا میرے اہل سے ہے اور تیرے وعدہ کا خلف نہیں ہوتا تو نے وعدہ فرمایا تھا کہ تو میرے اہل کو نجات دے گا اور وہ میرے اہل سے ہے، اسے نجات کیوں نہ ملی۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ نداء کنعان کے غرق ہونے سے پہلے ہو۔

2۔ بیشک تو ان کو زیادہ جاننے والا اور ان سے عدل فرمانے والا ہے۔ تیرے فیصلہ کا خلف جائز نہیں ہے۔ یقیناً تو نے قوم کی ہلاکت اور میرے اہل کی نجات کا فیصلہ کیا ہے۔ یا یہ معنی ہے کہ تو تمام صاحب حکمت اور فیصلہ کرنے والوں سے زیادہ حکمت والا ہے۔

قَالَ يَا نُوحُ إِنَّهُ لَيْسَ مِنْ أَهْلِكَ ۖ إِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ ۖ فَلَا تَسْأَلْنِ مَا لَيْسَ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 213 (الفکر)
2۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 29 (الامیریہ)
3۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 599 (العلمیہ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 14-213 (الفکر)

لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنِّیْۤ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِیْنَ ۝۴۶

"اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے نوح وہ تیرے گھر والوں سے نہیں (کیونکہ) اس کے عمل اچھے نہیں ۔ پس نہ سوال کیا کرو مجھ سے ۔ جس کا تجھے علم نہ ہو ۔ میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ نہ ہو جانا نادانوں سے ۔"

۱۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے نوح یہ تیرے اہل سے نہیں کیونکہ مومنین اور کفار کا کوئی رشتہ اور تعلق نہیں ہے اِنَّهٗ عَمَلٌ غَیْرُ صَالِحٍ کے الفاظ اہل میں سے نہ ہونے کی تعلیل ہے ۔ الکسائی اور یعقوب نے بکسر میم عَمِلَ ماضی کے صیغہ کی بناء پر پڑھا ہے اور غیر مفعول ہونے کی وجہ سے منصوب ہے، یعنی اس نے شرک اور تکذیب کا عمل کیا ہے ۔ باقی قراء نے بفتحہ میم اور تنوین کے ساتھ مصدر کی بناء پر مرفوع پڑھا ہے اور یہ مضاف کے حذف کے ساتھ ان کی خبر ہے اور مضاف کا اعراب نقل کر کے اسے دے دیا گیا ہے ۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے انه ذو عمل غیر صالح اس کلام مبالغہ ہے کہ اس کی ذات کو عمل کی ذات قرار دیا ہے ۔ یا یہ معنی ہے کہ اے نوح تیرا اس کی نجات کے لئے سوال کرنا عمل غیر صالح ہے ۔

۲۔ فَلَا تَسْـَٔلْنِ کو نافع اور ابن عامر نے لام کے فتحہ اور نون مشددہ کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی اصل میں تسئلننی تھا، نون وقایہ تین نونوں کے اجتماع کی وجہ سے حذف کی گئی اور یا کی وجہ سے نون مشددہ کو کسرہ دیا گیا ۔ پھر کسرہ پر اکتفاء کرتے ہوئے یا کو بھی حذف کیا گیا ۔ ابن کثیر نے بھی اس طرح پڑھا ہے مگر نون مشددہ کو انہوں نے فتحہ دیا ہے ۔ اس قرأت میں نہ نون وقایہ ہے اور نہ یاء متکلم ضمیر منصوب ہے ۔ باقی قراء نے لام کے سکون اور نون وقایہ کے کسرہ اور نون کی تخفیف اور یاء کے حذف کے ساتھ پڑھا ہے ۔ ابو جعفر ابو عمرو ورش اور یعقوب نے وصل میں یاء کو ثابت رکھا ہے ۔

۳۔ جس کا تمہیں علم نہیں کہ یہ درست ہے یا غلط ہے ۔ اس نداء کو سوالاً کہا گیا ہے کیونکہ اس کے ضمن میں اہل کی نجات کے وعدہ کا ذکر ہے جو بیٹے کی نجات کے بارے میں پورا کرنے کے مطالبہ کا شعور دلاتا ہے ۔ یا اس نداء کو استفسار کہا گیا ہے کیونکہ اس کے حق میں وعدہ کو پورا کرنے سے منع کیا گیا ہے اور اس استفسار کو جہل کا نام دیا ہے اور اس پر تنبیہ فرمائی ہے ۔

۴۔ نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو نے انی کو یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی میں نصیحت کرتا ہوں تمہیں کہ نہ ہو جانا نادانوں میں سے کیونکہ تیرے اہل سے مَنْ سَبَقَ عَلَیْهِ الْقَوْلُ کے جملہ سے استثناء ہو چکی ہے ۔ حال دلالت کرتا ہے کہ تمام کی نجات نہ ہوگی اور یہ کلام سوال کرنے سے مستغنی کرتا ہے ۔ امام بغوی فرماتے ہیں اس بیٹے کے متعلق علماء کا اختلاف ہے ۔ مجاہد اور الحسن کا قول ہے کہ یہ حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا نہیں تھا جس کے متعلق آپ کو علم نہیں تھا ۔ اس لئے فرمایا مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ (1) ۔ حسن نے فخانتا هما پڑھا تھا کہ دونوں نے خیانت کی تھی ۔ ابو جعفر الباقر علیہ السلام فرماتے ہیں وہ آپ کی بیوی کا بیٹا تھا ۔ اس لئے آپ نے اہلی فرمایا منی نہیں فرمایا (2) ابن عباس، عکرمہ، سعید بن جبیر، الضحاک اور اکثر مفسرین فرماتے ہیں کہ وہ نوح علیہ السلام کا پوتا تھا ۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا کسی نبی کی بیوی نے برائی نہیں کی ۔ اور اِنَّهٗ لَیْسَ مِنْ اَهْلِكَ کا مطلب ہے کہ وہ آپ کے دین کا پیروکار نہیں ہے (3) کیونکہ وہ کافر ہے فخانتاهما یعنی دین اور عمل میں خیانت کی نہ کہ بستر میں خیانت کی اور اِنِّیْۤ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِیْنَ کا مطلب یہ ہے کہ میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ نادانوں میں سے نہ ہو جاؤ، یعنی پہلے خود کافروں کی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 215 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 215 (الفکر) 3۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 606 (الفکر)

ہلاکت کا سوال کرتے ہو پھر ایک کافر کے لئے نجات کی دعا کرتے ہو۔ الشیخ ابو منصور فرماتے ہیں حضرت نوح کا بیٹا منافق تھا۔ حضرت نوح اس کے کفر کو پہچانتے نہ تھے۔ ورنہ حضرت نوح علیہ السلام ان ابنی من اھلی کا قول درست نہ ہوگا اور آپ کو پتہ ہوتا تو آپ سوال ہی نہ کرتے کیونکہ اس جیسے افراد کے لئے سوال کرنے سے پہلے منع کیا جا چکا تھا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد وَلَا تُخَاطِبْنِي فِي الَّذِينَ ظَلَمُوا ۚ إِنَّهُمْ مُغْرَقُونَ ﴿۳۷﴾ بھی اسی بات پر دلالت کرتا ہے کہ آپ کو اس کی حقیقت کا علم نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آگاہ فرمایا کہ وہ آپ کے اہل سے نہیں ہے۔ ابو منصور کے اس قول میں نظر ہے کیونکہ يَٰبُنَيَّ ٱرْكَب مَّعَنَا وَلَا تَكُن مَّعَ ٱلْكَٰفِرِينَ ﴿۴۲﴾ قَالَ سَـَٔاوِىٓ إِلَىٰ جَبَلٍ يَعْصِمُنِى مِنَ ٱلْمَآءِ ۚ کا ارشاد صراحۃً دلالت کرتا ہے کہ وہ کفر کا اظہار کرتا تھا۔ واللہ اعلم

قَالَ رَبِّ إِنِّىٓ أَعُوذُ بِكَ أَنْ أَسْـَٔلَكَ مَا لَيْسَ لِى بِهِۦ عِلْمٌ ۖ وَإِلَّا تَغْفِرْ لِى وَتَرْحَمْنِىٓ أَكُن مِّنَ ٱلْخَٰسِرِينَ ﴿۴۷﴾

"عرض کرنے لگے میرے پروردگار! میں پناہ مانگتا ہوں تجھ سے کہ میں سوال کروں تجھ سے ایسی چیز کا جس کا مجھے علم نہیں اور اگر تو مجھے نہ بخشے اور مجھ پر رحم نہ کرے تو میں ہو جاؤں زیاں کاروں سے ۔ ۱"

۱۔ نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو نے انی کو یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی نوح نے عرض کی اے میرے پروردگار میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں کہ میں آئندہ تجھ سے سوال کروں ایسی چیز کا جس کی صحت کے بارے مجھے علم نہیں ہے۔ وَإِلَّا تَغْفِرْ لِى اور اگر کافر کی نجات کے سوال کی اجتہادی خطا کو تو معاف نہ فرمائے اور توبہ کی قبولیت اور مجھ پر احسان کرنے کی رحمت نہ فرمائے تو میں گھاٹے کے اعمال کرنے والوں سے ہو جاؤں گا۔

قِيلَ يَٰنُوحُ ٱهْبِطْ بِسَلَٰمٍ مِّنَّا وَبَرَكَٰتٍ عَلَيْكَ وَعَلَىٰٓ أُمَمٍ مِّمَّن مَّعَكَ ۚ وَأُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ يَمَسُّهُم مِّنَّا عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۴۸﴾

"ارشاد ہوا اے نوح (کشتی سے) اتریئے امن وسلامتی کے ساتھ ہماری طرف سے برکتوں کے ساتھ جو آپ پر ہیں اور ان قوموں پر جو آپ کے ہمراہ ۱ ہیں اور آئندہ کچھ قومیں ہوں گی ہم لطف اندوز کریں گے انہیں پھر پہنچے گا انہیں ہماری طرف سے دردناک عذاب ۲"

۱۔ ارشاد ہوا اے نوح کشتی سے اتریئے ہماری طرف سے ہر تکلیف سے امن وسلامتی کے مژدہ کے ساتھ، یا یہ مطلب ہے کہ تم پر ہماری طرف سے سلام ہو اور برکات اس خیر کو کہتے ہیں جو بڑھنے والی ہو۔ یہاں برکات سے مراد اللہ تعالیٰ کے قرب کے مراتب، اس کی بے پایاں رحمت اور اس کا عظیم فضل ہے، نیز اولاد کی کثرت، قیامت تک ان کے سلسلہ نسب کی بقاء اور ان کی اولاد سے انبیاء وصالحین کی جماعت کا ہونا ہے اور وعلی امم ممن معک میں من بیانیہ ہے اور امم سے مراد وہ ہیں جو کشتی میں آپ کے ہمراہ تھے کیونکہ وہ جماعات تھے۔ امتوں کا سلسلہ ان سے شروع ہوتا تھا۔ اس لئے انہیں امم کہا گیا۔ یا من غایت کی ابتداء کے لئے ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ ان پر بھی سلامتی اور برکتیں ہیں جو امتیں آپ کے ہمراہیوں سے پیدا ہوں گی۔ محمد بن کعب فرماتے ہیں اس میں قیامت تک آنے والے مومنین شامل ہیں (1)۔ اگر یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف آپ کی اولاد کو باقی رکھنے کا وعدہ فرمایا تھا وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهُۥ هُمُ ٱلْبَاقِينَ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 216 (الفکر)

یہ ارشاد صراحۃً آپ کی اولاد میں بقاء کو محصور کرتا ہے۔ ہم اس کے جواب میں کہیں گے کہ آپ کے ساتھ کشتی میں آپ کے تین بیٹے سوار تھے۔ پس معنی یہ ہوگا کہ ان امتوں پر بھی برکتیں اور سلامتی ہوگی جو آپ کے بیٹوں سے پیدا ہوں گی۔ وامم۔ یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی مِمَّنْ مَّعَکَ اُمَمٌ لَا بَرَکَۃَ عَلَیْهِمْ۔ اور آپ کے ہمراہیوں سے ایسی امتیں بھی ہوں گی جو ہماری برکات ونوازشات سے محروم ہوں گی۔

۷ بلکہ ہم دنیا میں ہم انہیں مادی چیزوں سے نوشتہ تقدیر کے مطابق لطف اندوز کریں گے۔ پھر آخرت میں ان کفر کی وجہ سے انہیں دردناک عذاب ملے گا۔ بعض علماء فرماتے ہیں ان امم سے مراد قوم ھود، قوم صالح، قوم لوط اور قوم شعیب علیہم السلام ہیں اور عذاب سے عذاب دنیا مراد ہے۔

تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ۛ فَاصْبِرْ ۛ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۹﴾

"یہ قصہ غیب کی خبروں سے ہے جنہیں ہم وحی کر رہے ہیں آپ کی طرف ۱ نہ آپ جانتے تھے اسے اور نہ ہی آپ کی قوم اس سے پہلے ۲ پس آپ صبر کریں یقیناً نیک انجام پرہیزگاروں کے لئے ہے ۳"

۱ تلک سے مراد نوح علیہ السلام کا قصہ۔ ترکیب کلام میں تلک مبتدا ہے اور اس کی خبر مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ ہے مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ میں من تبعیضیہ ہے، یعنی جو بعض حالات وواقعات آپ سے غائب تھے۔ نوحیھا میں ھا ضمیر کا مرجع انباء ہے۔ یہ جملہ تلک کی خبر ثانی ہے یا انباء سے حال ہے۔ یا نوحیھا تلک کی خبر ہے اور مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ اس کے متعلق ہے یا ھا ضمیر منصوب سے مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ حال ہے۔ الیک میں ک ضمیر سے مراد محمد ﷺ ہیں۔

۲ یہ جملہ کی تیسری خبر ہے یعنی نوح علیہ السلام کے واقعات ہماری وحی سے پہلے تمہارے پاس اور تمہاری قوم کے پاس غیر یقینی تھے۔ یا یہ جملہ نوحیھا میں ھا ضمیر منصوب سے حال ہے یا الیک کی ک ضمیر مجرور سے حال ہے، یعنی آپ اور آپ کی قوم نوح علیہ السلام کے حالات سے مکمل آگاہ نہ تھے۔ یہ آیت کریمہ نبی کریم ﷺ کے معجزہ پر دلیل ہے کہ آپ سے صدیوں پہلے ہونے والے حالات سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو آگاہ کر دیا ہے کیونکہ آپ ﷺ نے اپنی پوری زندگی اپنی قوم میں گزاری۔ کسی دوسری قوم سے علوم ومعارف کے حصول کے لئے اپنی قوم سے بھی جدا نہ ہوئے۔ جب آپ کی قوم کا کوئی فرد ان واقعات وحالات کو نہیں جانتا تھا تو آپ نے یہ حالات وواقعات کیسے جان لیے تھے؟ پھر آپ ﷺ کا ان تمام حالات کی خبریں سابقہ کتب کے مطابق بیان کرنا آپ کی نبوت کی کھلی اور واضح دلیل ہے۔

۳ اے محبوب مکرم۔ نوح علیہ السلام کی طرح تم بھی کفار کی اذیتوں اور تکلیفوں پر صبر کیجئے، آپ پر جب حقیقت حال کھل چکی ہے تو تبلیغ دین کے سلسلہ میں جو کفار کی طرف سے دل آزاری کا اقدام ہو اس پر صبر واستقامت کا مظاہرہ کیجئے۔ یقیناً دنیا کی کامیابی اور آخرت کی کامرانی کا تاج سرمدی شرک ومعاصی سے اجتناب کرنے والوں کے لئے ہے۔ یہ جملہ صبر واستقامت، عدم عجلت اور پریشان نہ ہونے کی علت بیان کر رہا ہے۔

وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ۚ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۚ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ ﴿۵۰﴾

”اور عاد کی طرف (ہم نے) ان کے بھائی ہود کو بھیجا۔[1] آپ نے کہا اے میری قوم! عبادت کرو اللہ تعالیٰ کی نہیں ہے تمہارا کوئی معبود اس کے سوا نہیں ہو تم مگر افتراء پرداز۔[2]“

[1] اس کا عطف الیٰ نوح پر ہے، یعنی ہم نے قوم عاد کی طرف بھیجا ان کے نسبی بھائی ”ہود“ کو ہوداً اخاھم سے عطف بیان ہے۔

[2] آپ نے فرمایا اے میری قوم صرف اللہ کی عبادت کرو۔ اس معبود حقیقی کے علاوہ تمہارا اور کوئی معبود نہیں ہے تم نے ان تراشیدہ بتوں کو خدا بنا کر اور انہیں خدا کا عبادت میں شریک ٹھہرا کر اللہ تعالیٰ پر افتراء باندھا ہے اور تم نے انہیں اپنے خیالات فاسدہ میں شفیع بنا رکھا ہے۔ یہ بھی تمہارا غلط اور باطل نظریہ ہے۔

يٰقَوْمِ لَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ؕ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى الَّذِيْ فَطَرَنِيْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۵۱﴾

”اے میری قوم! نہیں مانگتا میں تم سے اس (تبلیغ) پر کوئی اجرت نہیں ہے میری اجرت مگر اس (ذات پاک) کے ذمہ جس نے مجھے پیدا فرمایا۔[1] کیا تم (اس حقیقت کو) نہیں سمجھتے ہو۔[2]“

[1] تم سے اپنی تبلیغی سرگرمیوں اور پیغام رسانی کی مشقتوں پر کسی اجر کا سوال نہیں کرتا جس کی ادائیگی تمہیں پیغام الٰہی کی قبولیت سے مانع ہو۔ یا یہ مطلب ہے کہ میں تم سے جب کسی اجر کا متمنی نہیں ہوں تو مجھے جھوٹ بولنے پر اور کون سی چیز برانگیختہ کر سکتی ہے۔ اِنْ اَجْرِيَ کو نافع، ابن عامر، ابو عمر اور حفص نے یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے یعنی میرا ثواب نہیں ہے مگر اس کے ذمے۔ جس نے مجھے نیست سے ہست کیا اور عدم سے وجود بخشا۔ فطرنی کو نافع اور البزی نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔

[2] تم عقل کے دشمن کیوں بن گئے ہو۔ تم اپنی عقول استعمال کیوں نہیں کرتے تاکہ تم پر یہ حقیقت واضح اور روشن ہو جائے کہ ایسے بے لوث اور خلوص کے پیکر شخص کی تصدیق واجب ہے۔

وَيٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّ يَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿۵۲﴾

”اے میری قوم! مغفرت طلب کرو اپنے رب سے پھر (دل و جان سے) رجوع کرو اس کی طرف وہ اتارے گا آسمان سے تم پر موسلا دھار بارش اور بڑھا دے گا تمہیں قوت میں تمہاری پہلی قوت سے اور نہ منہ موڑو (اللہ تعالیٰ سے) جرم کرتے ہوئے۔[1]“

[1] اے میری قوم اپنے گزشتہ شرکیہ اعمال اور غیر اخلاقی افعال پر اپنے پروردگار سے مغفرت طلب کرو۔ یہ اسلام کا طرۂ امتیاز ہے کہ وہ سابقہ غلطیوں اور کوتاہیوں کی معافی کا سبب بنتا ہے فَاِنَّ الْاِسْلَامَ يَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهٗ۔ اس حدیث کو امام مسلم نے عمرو بن العاص سے مرفوعاً روایت کیا ہے(1)۔ پھر تم غیروں کے سامنے جبین نیاز خم کرنا ترک کر کے اس اپنے پروردگار کی اطاعت و فرمان برداری کو اپنا شعار بناتے ہوئے اسی کی طرف رجوع کرو۔ وہ تم پر آسمان سے اپنی رحمت کا مینہ برسائے گا اور تمہاری طاقت میں کئی گنا اضافہ کر دے گا۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے نافرمانیوں اور شرک سامانیوں کے باعث ان سے تین سالی بارش روک لی تھی اور ان کی عورتوں کو بانجھ کر دیا

1۔ مشکوٰۃ المصابیح، جلد 1، صفحہ 14 (قدیمی)

تھا جیسا کہ سورۂ اعراف میں گزر چکا ہے۔ پھر انہیں حضرت ہود نے فرمایا اے میری قوم اگر اب بھی تم اپنے کیے پر ندامت کا اظہار کرو اور اسی خالق و مالک رب کی طرف رجوع کرلو تو وہ تم پر اپنی نظر شفقت فرمائے گا۔ تم پر آسمان سے بارش برسائے گا جس سے تمہاری اولاد کی کثرت ہو جائے گی۔ پس تم مال و دولت اور اولاد کی فراوانی پاؤ گے۔ بعض علماء فرماتے ہیں قوۃ سے مراد بدنی قوت و طاقت ہے۔ یعنی تمہاری جسمانی قوتوں میں اضافہ کر دے گا۔

۲۔ اس کا عطف استغفروا پر ہے یعنی اے میری قوم جس پیغام ہدایت اور دین متین کی طرف میں تمہیں اتنی دل سوزی سے بلا رہا ہوں اس سے اپنے گناہوں پر اصرار کرتے ہوئے منہ نہ موڑو۔

قَالُوْا یٰهُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَیِّنَةٍ وَّ مَا نَحْنُ بِتَارِكِیْۤ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَ مَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِیْنَ ﴿۵۳﴾

”انہوں نے کہا اے ہود! نہیں لے آیا تو ہمارے پاس کوئی دلیل اور نہیں ہیں ہم چھوڑنے والے اپنے خداؤں کو تمہارے کہنے سے ۱؎ اور نہیں ہیں ہم تجھ پر ایمان لانے والے ۲؎“

۱؎ آپ کی قوم نے کہا اے ہود آپ ہمارے پاس اپنے دعوے کی صحت پر کوئی حجت پیش نہیں کر سکے یہ ان کا کہنا صرف اور صرف عناد اور ہٹ دھرمی کی بناء پر تھا ورنہ حضرت ہود تو ان کو کئی روشن معجزات دکھا چکے تھے۔ ہم آپ کی باتوں کی وجہ سے قطعاً اپنے خداؤں کی پرستش چھوڑنے والے نہیں ہیں۔ عن قولک تارکی کے متعلق ہے یا یہ تارکی کی ضمیر سے حال ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہو گی صَادِرِیْنَ عَنْ قَوْلِکَ۔

۲؎ ہم آپ کی کسی حال میں تصدیق کرنے والے نہیں ہیں۔ ان کا یہ جملہ اجابت اور تصدیق سے کلی طور پر آپ کو مایوس کرنے کیلئے ہے۔

اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ ؕ قَالَ اِنِّیْۤ اُشْهِدُ اللّٰهَ وَ اشْهَدُوْۤا اَنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ﴿ۙ۵۴﴾

”ہم تو کہیں گے مبتلا کر دیا تجھے ہمارے کسی خدا نے دماغی خلل میں ۱؎ ہود نے کہا میں گواہ بناتا ہوں اللہ تعالیٰ کو اور تم بھی گواہ رہنا کہ میں بیزار ہوں ان بتوں سے جنہیں تم شریک ٹھہراتے ہو ۲؎“

۱؎ آپ کو ہمارے کسی خدا نے جنون اور پاگل پن سے دوچار کر دیا ہے اس وجہ سے کہ آپ (نعوذ باللہ) ایسی خرافات بیان کر رہے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ ہمارے خداؤں کو برا بھلا کہتے ہیں اور ان کی عبادت سے روکتے ہیں۔ اس لئے ہماری کسی خدا نے تم سے ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے تمہیں مجنون بنا دیا ہے۔ یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ ہم تمہارے حق میں اور تو کچھ نہیں کہتے مگر یہ کہ عنقریب ہمارا کوئی خدا تمہیں ضرور ہلاک کر دے گا اور تمہیں اذیت پہنچائے گا کیونکہ آپ ان کی مذمت کرتے ہیں۔ مستقبل کے واقعہ کو ماضی کے ساتھ تعبیر کرنا تحقیق اور تہدید میں مبالغہ کے لئے ہے، یعنی ضرور تمہیں تکلیف پہنچے گی۔ یہ تاویل حضرت ہود کے جوابی ارشاد کے مناسب ہے۔ اعتری یہ عراہ یعروہ سے مشتق ہے جس کا معنی ہے کسی کو کسی چیز کا پہنچنا۔

۲؎ حضرت ہود نے فرمایا میں اللہ کو گواہ بناتا ہوں اور تم بھی گواہ بن جاؤ، میں بیزار ہوں ان بتوں سے جنہیں تم شریک ٹھہراتے ہو۔ الی

مِنْ دُوْنِهٖ فَكِيْدُوْنِيْ جَمِيْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ ﴿۵۵﴾

"اس کے سوا پس سازش کر لو میرے خلاف سب مل کر پھر مجھے مہلت نہ دو [1]"

[1] نہ تو میں اس کے سوا کسی بت کی عبادت کرتا ہوں اور اور نہ میں ان سے کسی قسم کا ڈر اور اندیشہ کرتا ہوں۔ پس تم بھی اور تمہارے خدا بھی مل کر میرے خلاف کوئی حیلہ سازی کر لو میری ہلاکت یا مجھے اذیت دینے کا کوئی پروگرام طے کر لو۔ پھر مجھے ایک لمحہ کے لئے مہلت نہ دو۔ حضرت نوح کی اس کلام میں مشرکوں اور ان کے بتوں کی اہانت اور اللہ تعالیٰ کی ذات پر غیر متزلزل یقین اور ان کے جھوٹے خداؤں کے عجز کا اظہار ہے۔ یعنی وہ پتھر ہیں بے بس مورتیاں، ہیں نہ نفع پر قادر ہیں نہ نقصان پر۔ اس کلام میں اس معجزہ کا بھی اظہار ہے کہ آپ کی یہ پر جلال کلام سننے کے بعد بھی ان کے گرانڈیل جابرہ جو آپ کے خون کے پیاسے تھے آپ کا بال بھی بیکا نہ کر سکے۔

اِنِّيْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّيْ وَرَبِّكُمْ ؕ مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا ؕ اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۵۶﴾

"بلاشبہ میں نے بھروسہ کر لیا ہے اللہ تعالیٰ پر جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب [1] ہے کوئی جاندار بھی ایسا نہیں ہے مگر اللہ تعالیٰ نے پکڑا ہوا ہے اسے پیشانی کے بالوں سے بیشک میرا رب سیدھی راہ پر ہے [2]"

[1] میرا ناقابل شکست اعتماد اس معبود پر ہے جو میرا رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے۔

[2] یعنی کوئی جاندار بھی ایسا نہیں ہے مگر اللہ تعالیٰ اس کی پیشانی کے بالوں کو پکڑے ہوئے ہے الاخذ بالناصیۃ۔ یہ قاہر کے مقہور پر قہر کی تمثیل ہے اور مقہور کی قاہر کے سامنے ذلت کی تمثیل ہے، یعنی مغلوب غالب کے سامنے بے بس ہے، جیسے چاہتا ہے وہ اس میں تصرف فرماتا ہے۔

امام بغوی فرماتے ہیں یہاں ناصیہ کا ذکر فرمایا ہے کیونکہ جب عرب کسی انسان کی ذلت کا اظہار کرنا چاہتے ہیں تو کہتے ہیں نَاصِيَةُ فُلَانٍ بِيَدِ فُلَانٍ۔ (فلاں کی پیشانی فلاں کے ہاتھ میں ہے)۔ حضرت الضحاک فرماتے ہیں اس کا مطلب ہے وہ انہیں مارتا اور زندہ کرتا ہے۔ فراء فرماتے ہیں اس کا معنی ہے کہ وہ ان کا مالک اور ان پر مکمل تصرف کی قدرت رکھتا ہے، قتیبی فرماتے ہیں وہ ان پر غالب ہے کیونکہ جب تو کسی کی پیشانی کو پکڑے گا تو تو اس پر غالب آ جائے گا(1)۔ ان ربی علی صراط مستقیم۔ یعنی میرا رب حق اور عدل پر ہے وہ محسن کو اس کے احسان کی جزا دے گا اور مجرم کو اس کے جرم کی سزا دے گا اور اس کے دامن عفو و کرم کو پکڑنے والا اور اس کی عبادت میں مشغول رہنے والا کبھی ضائع نہیں ہوگا اور نہ وہ اس کی رحمت سے محروم ہوگا۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّاۤ اُرْسِلْتُ بِهٖۤ اِلَيْكُمْ ؕ وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّيْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۚ وَلَا تَضُرُّوْنَهٗ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ ﴿۵۷﴾

"پھر اگر تم روگردانی کرو تو میں نے تو پہنچا دیا ہے تمہیں وہ پیغام جسے دے کر مجھے بھیجا گیا ہے تمہاری طرف اور جانشین بنا دے گا میرا رب کسی اور قوم کو تمہارے علاوہ اور تم اس کا کچھ نہ بگاڑ سکو گے۔ بے شک میرا رب ہر چیز کا نگہبان ہے۔"

[1] یہ اصل میں تتولوا تھا ایک تاء کو حذف کیا گیا ہے۔ یعنی اگر تم میری دعوت، میری تبلیغ اور میرے پیغام سے روگردانی کرو۔ تو مجھ پر تو

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 219 (الفکر)

کوئی بوجھ نہیں میں نے اپنا فریضہ تبلیغ بحسن وخوبی پوری جگر کاوی سے پہنچا دیا گیا ہے، یعنی اگر تم اعراض کرو تو تمہیں اللہ تعالیٰ نیست و نابود کر دے گا اور تمہارا جانشین ایک ایسی قوم کو بنا دے گا جو تم سے زیادہ اطاعت شعار اور عبادت گزار ہو گی۔ میری اس پیغام رسانی کے بعد اب تمہارے پاس کوئی عذر باقی نہیں ہے۔ اس وحدہ لاشریک کی عبادت سے اعراض کر کے اسے تم کوئی نقصان نہیں پہنچا رہے ہو بلکہ اس روگردانی کا وبال تمہارے اپنے نفسوں پر پڑے گا۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ تمہیں اگر وہ ہلاک کر دے تو اس کی ذات وصفات میں کچھ کمی نہ ہو گی کیونکہ اس کے نزدیک تمہارا ہونا اور نہ ہونا برابر ہے۔ جو کچھ تم کر رہے ہو اسے وہ ہمہ بین خدا دیکھ رہا ہے وہ تمہیں جزاء دینے سے غافل نہیں ہے۔ یا یہ معنی ہے کہ وہ غالب ہے کوئی چیز اسے نقصان وضرر نہیں پہنچا سکتی۔

وَ لَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّیْنَا هُوْدًا وَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا ۚ وَ نَجَّیْنٰهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِیْظٍ ﴿۵۸﴾

”اور جب آ گیا ہمارا حکم تو ہم نے نجات دے دی ہود کو اور جو ایمان لائے تھے ان کے ساتھ بوجہ اپنی رحمت کے اور ہم نے نجات دے دی انہیں سخت عذاب سے [1]“

[1] جب ہمارا عذاب کا حکم نامہ آ گیا یا جب ہمارا عذاب آ پہنچا تو ہم نے حضرت ہود اور آپ کے چار ہزار ساتھیوں کو نجات دی۔ اپنی مہربانی اور رحمت سے یہ ان کی نجات ان کے عمل کی وجہ سے نہ تھی۔ یا یہ معنی ہے کہ ہم نے انہیں اس ایمان کے سبب نجات دی جو ہم نے انہیں خود انعام کیا تھا۔ نجینا کا تکرار تاکید تعظیم اور ہولناکی کے بیان کے لئے ہے اور عذاب غلیظ سے مراد وہ ہوا ہے جس کے ذریعے قوم عاد کو اللہ تعالیٰ نے ہلاک کیا تھا۔ ان کا قصہ سورۂ اعراف میں گزر چکا ہے۔

وَ تِلْكَ عَادٌ ۟ۙ جَحَدُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ وَ عَصَوْا رُسُلَهٗ وَ اتَّبَعُوْۤا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِیْدٍ ﴿۵۹﴾

”یہ قوم عاد (کی داستان) ہے انہوں نے انکار کیا اپنے رب کی آیتوں کا اور نافرمانی کی اس کے رسولوں کی [1] اور پیروی کرتے رہے ہر متکبر منکر حق کے حکم کی [2]“

[1] اسم اشارہ مونث قبیلہ کی تاویل کی وجہ سے ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں مشار الیہ قوم عاد کے آثار ہیں، یعنی زمین میں چلو اور سفر کرو اور ان کی تباہی کے آثار کا بچشم عبرت مشاہدہ کرو۔ ان کی اس تباہی اور بربادی کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے اپنے پروردگار کی آیات کا انکار کیا اور اس کے رسولوں مثلاً حضرت ہود اور دوسرے انبیاء کی نافرمانی کی جو انہیں توحید کی طرف دعوت دیتے رہے اور ان تمام رسولوں کا پیغام ایک تھا۔ بعض بعض کی تصدیق کرتے تھے۔ ان میں سے ایک کی نافرمانی تمام کی نافرمانی ہے۔ اس لئے رسل ذکر فرمایا ہے۔

[2] اور انہوں نے ہر متکبر اور منکر حق کے حکم کی پیروی کی۔ عنید اس شخص کو کہتے ہیں جو حق کی پہچان کا بھی انکار کرے۔ ابو عبید فرماتے ہیں العنید، العنود اور المعاند وہ شخص جو تیری مخالفت کرے (1)۔ یعنی انہوں نے اپنے سرکش اور متکبر لوگوں کی اتباع کی اور جو انہیں ایمان کی دعوت دیتے تھے ان کا انکار کیا اور اس چیز کو ترک کیا جو نجات کا باعث تھی اور ان کی اطاعت کی جو انہیں کفر کی طرف بلاتے تھے اور انہوں نے ایسے کرتوت کیے جو انہیں ہلاکت کے گڑھے میں پھینکنے والے تھے۔

وَ اُتْبِعُوْا فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا لَعْنَةً وَّ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ عَادًا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ؕ اَلَا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 220 (الفکر)

بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُوْدٍ ﴿۶۰﴾

"اور ان کے پیچھے لگادی اس دنیا میں بھی لعنت اور قیامت کے دن بھی سنو! عاد نے انکار کیا اپنے رب کا [1] سنو! ہلاکت و بربادی ہو عاد کے لئے جو ہود کی قوم تھی [2]"

[1] یعنی اس دنیا میں لوگ اور فرشتے ان پر لعنت کرتے رہیں گے اور قیامت کے روز ان پر اللہ کی طرف سے لعنت ہوگی یعنی دنیا و آخرت میں ان پر لعنت ہوگی اور لعنت کا معنی رحمت سے دور کرنا ہے۔ سنو! کفار اپنے رب کی نعمتوں کا کفر کیا اس صورت میں مضاف محذوف ہوگا یا یہ معنی کہ کفار نے اپنے رب کا انکار کیا۔

[2] بعض علماء فرماتے ہیں بعدا کا معنی رحمت سے دور کرنا ہے اور بعض فرماتے ہیں اس کا معنی ہلاک کرنا ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں بُعد کے دو معانی ہیں 1۔ ضد القرب (قرب کی ضد) 2۔ ہلاک کرنا(1)۔ قاموس میں بھی اس طرح ہے(2)۔ یہ جملہ قوم عاد پر لعنت اور ہلاکت کی بددعا ہے اور اس سے مراد یہ بتانا ہے کہ وہ اس عذاب کے مستحق اپنے انکار اور نافرمانی کی وجہ سے ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے الا کا لفظ مکرر فرمایا اور ان کا ذکر بھی دوبار فرمایا تاکہ ان کے معاملہ کی بڑائی ظاہر ہو اور لوگ ان کی حالت کو عبرت کی نگاہ سے دیکھیں۔ قوم ہود کے الفاظ عطف بیان ہے عاد سے۔ اس کا مفاد اشارہ کرنا ہے اس بات کی طرف کہ اس دوری کے مستحق وہ حضرت ہود علیہ السلام سے بدکلامی اور بدزبانی اور ان کے انکار کی وجہ سے تھے۔

وَ اِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَ اسْتَعْمَرَكُمْ فِیْهَا فَاسْتَغْفِرُوْهُ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَیْهِ ؕ اِنَّ رَبِّیْ قَرِیْبٌ مُّجِیْبٌ ﴿۶۱﴾

"اور قوم ثمود کی طرف (ہم نے) ان کے بھائی صالح کو بھیجا۔ آپ نے کہا اے میری قوم عبادت کرو اللہ کی نہیں ہے تمہارا کوئی معبود اس کے سوا اس نے پیدا فرمایا تمہیں زمین [1] سے اور بسا دیا تمہیں اس میں [2] پس مغفرت طلب کرو اس سے پھر (دل و جان سے) رجوع کرو اس کی طرف بیشک میرا رب قریب ہے اور التجائیں قبول فرمانے والا ہے [3]"

[1] زمین سے پیدا کرنے سے مراد یہ ہے کہ اس نے تمہیں آدم سے پیدا کیا اور آدم کو مٹی سے تخلیق فرمایا۔

[2] وَاسْتَعْمَرَكُمْ کا معنی ہے اس نے تمہیں آباد کیا۔ حضرت ضحاک فرماتے ہیں اس کا مطلب ہے اس نے تمہیں لمبی عمر عطا فرمائی۔ حتی کہ تمہارے افراد کو تین سو سال سے ہزار سال تک عمریں عطا فرمائیں۔ اسی طرح قوم عاد کو بھی لمبی عمریں عطا کی تھیں(3)۔ فیھا میں ھا کا مرجع الارض ہے یعنی زمین میں تمہیں بسایا۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی ہے اس نے تمہیں اس زمین کی آبادکاری پر قدرت عطا فرمائی۔ تمہیں اس کا رہائشی اور تعمیر کرنے والا بنایا۔ مجاہد فرماتے ہیں یہ العمری سے ہے، یعنی زندگی میں تمہیں زمین کا مالک بنایا(4) اور تمہاری عمر کے ختم ہونے کے بعد تمہاری اولاد کو اس کا وارث بنایا، یا یہ معنی ہے کہ تمہیں اپنے شہروں کو آباد کرنے والا بنایا تاکہ تم اپنی مدت عمر میں اس میں خود سکونت اختیار کرو پھر تم غیروں کے لئے چھوڑ جاؤ۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 221 (الفکر)
2۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 396 (التراث العربی)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 221 (الفکر)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 221 (الفکر)

۳؎ پس مغفرت طلب کرو پھر اس کی طرف رجوع کرو، بیشک وہ اپنے بندوں کے قریب ہے اور وہ قریب کیسے نہ ہو، جبکہ اس نے انہیں نعمت وجود عطا فرمائی۔ یا یہ معنی ہے کہ وہ بلا کیف بالذات قریب ہے۔ یا اپنے اولیاء کو رحمت پہنچانے کے اعتبار سے قریب ہے۔ وہ اپنے بندوں کی دعاؤں کو قبول فرمانے والا ہے۔

قَالُوا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ اَتَنْهٰىنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا وَاِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ﴿۶۲﴾

"انہوں نے کہا اے صالح! تم ہی ہم میں (ایک شخص) تھے جس سے امیدیں وابستہ تھیں اس سے پہلے کیا تم روکتے ہو ہمیں اس سے کہ ہم عبادت کریں ان (بتوں) کی جن کی عبادت کرتے تھے ہمارے باپ دادا۱؎ اور بیشک ہم اس امر کے بارے میں جس کی طرف تو ہمیں بلاتا ہے ایک بے چین کر دینے والے شک میں مبتلا ہو گئے ہیں ۲؎"

۱؎ ہم تو یہ توقع رکھتے تھے کہ تم ہمارے سردار بنو گے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم تو یہ امید رکھتے تھے کہ تم ہمارے ساتھ دین میں موافقت کرو گے اور ہمارے مسلک کی طرف لوٹ آؤ گے۔ بتوں کی عبادت کے ترک کرنے کے قول سے پہلے تو ہم یہی توقع رکھتے تھے کہ تم بھی ہمارے معمولات دینیہ کو اپناؤ گے مگر تمہاری یہ بتوں کے متعلق توہین آمیز گفتگو سن کر ہماری ساری تمناؤں پر پانی پھر گیا ہے۔ کیا تو ہمیں روکتا ہے ان بتوں کی عبادت سے جن کی عبادت ہمارے آباؤ اجداد کرتے تھے۔ حالت ماضیہ کی حکایت کے طور پر مستقبل کے صیغوں کے ساتھ کلام ذکر کی گئی ہے۔

۲؎ آپ جو ہمیں ایک خدا کی عبادت کرنے اور بتوں کی عبادت ترک کرنے کا درس دیتے ہیں اس سے تو ہم ایسے شک میں مبتلا ہو گئے ہیں جس نے ہمارے قلوب و اذہان میں اضطراب پیدا کر دیا ہے۔ مریب بمعنی ذی ریبہ ہے اور شک کی طرف یہ نسبت مجازی ہے اور یہ اراب فی الامور سے مشتق ہے۔ یا یہ موقع فی الریبۃ کے معنی میں ہے۔ اس صورت میں یہ ارابہ سے مشتق ہو گا جس کا معنی ہے اس نے اسے شک میں ڈال دیا اور ریبہ کا مطلب نفس کا پریشان ہونا اور طمانیت اور سکون کا ختم ہونا ہے۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَيْتُهٗ فَمَا تَزِيْدُوْنَنِيْ غَيْرَ تَخْسِيْرٍ ﴿۶۳﴾

"آپ نے کہا اے میری قوم! بھلا یہ تو بتاؤ اگر میں روشن دلیل پر ہوں اپنے رب کی طرف ۱؎ سے اور اس نے عطا کی ہو مجھے اپنی جناب سے خاص رحمت تو کون ہے جو بچائے گا مجھے اللہ (کے عذاب سے) سے اگر میں اس کی نافرمانی کروں ۲؎ تم تو نہیں زیادہ کرنا چاہتے میرے لئے سوائے نقصان کے ۳؎"

۱؎ یہاں بینۃ کا معنی بیان اور بصیرت ہے۔ یہاں حرف شک (ان) ذکر فرمایا مخاطبین کے اعتبار سے، ورنہ نبی کو بصیرت و ہدایت پر ہونے میں کوئی شک نہیں ہوتا۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ ان مخففہ من مثقلہ ہو، اس کا اسم ضمیر شان ہو یا ضمیر متکلم محذوف ہو، یعنی انی کنت او انہ کنت علی بینۃ من ربی۔

۲؎ یہاں رحمت کا معنی نبوت اور حکمت ہے۔ من اللہ کا معنی اللہ کا عذاب ہے۔ اگر میں رسالت کی تبلیغ اور شرک سے منع کرنے سے رک جاؤں تو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچانے میں میری مدد کون کرے گا۔

۴ کہ اللہ تعالیٰ نے جو مجھ پر نوازشات فرمائی ہیں۔ تم تو فقط ان کو مجھ سے ضائع کرنا چاہتے ہو۔ یہ عذاب الٰہی سے تعریض ہے۔ حسین بن فضل فرماتے ہیں حضرت صالح خسارہ میں نہ تھے یہاں تک کہ فرمایا فما تزیدوننی غیر تخسیر۔ معنی یہ ہوگا کہ جو تم میرے متعلق کہتے ہو اس سے تم مجھ میں کچھ اضافہ نہیں کرتے مگر یہ کہ تم مجھے گھاٹے اور خسارے کی طرف منسوب کرتے ہو۔ تفسیق اور تفجیر لغت میں فسق اور فجور کی طرف نسبت کرنے کو کہتے ہیں۔ اسی طرح تخسیر کا معنی گھاٹے کی طرف نسبت کرنا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں۔ تم مجھ میں اضافہ نہیں کرتے مگر یہ کہ مجھے تم میں گھاٹا اور خسارہ ہی نظر آتا ہے (1)۔

وَ یٰقَوْمِ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰیَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِیْۤ اَرْضِ اللّٰهِ وَ لَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَیَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ قَرِیْبٌ ﴿۶۴﴾

"اے میری قوم! یہ اللہ کی اونٹنی ہے تمہارے لئے نشانی ہے ۱؎ پس چھوڑ دو اسے کھاتی پھرے اللہ تعالیٰ کی زمین میں اور نہ ہاتھ لگاؤ اسے برائی سے ورنہ پکڑ لے گا تمہیں عذاب بہت جلد ۲؎ "

۱؎ آیۃً حال ہونے کی بناء پر منصوب ہے اور اس کا عامل اسم اشارہ کا معنی ہے اور لکم اٰیۃ سے حال ہے، مقدم اس لئے ہے کہ ذوالحال نکرہ ہے اس اونٹنی کی تخلیق اس طرح ہوئی کہ آپ کی قوم نے نبوت کی صداقت کے لئے ایک معین چٹان سے دس ماہ کی گابھن (حاملہ) اونٹنی پیدا ہونے کا معجزہ طلب کیا۔ حضرت صالح علیہ السلام نے دعا فرمائی تو فوراً اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس چٹان سے ان کی فرمائش کے مطابق دس ماہ کی حاملہ اونٹنی پیدا ہوئی اور پھر اس نے بچہ جنا۔ مزید تفصیل سورۃ اعراف میں ملاحظہ فرمائیں۔

۲؎ تم اسے چھوڑ دو یہ جڑی بوٹیاں کھائے گی اور پانی پیئے گی تم پر اس کی کوئی مشقت نہیں ہے۔ اسے کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچانا اگر تم نے اسے تکلیف پہنچائی تو تین دنوں میں تم پر عذاب آ جائے گا۔

فَعَقَرُوْهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوْا فِیْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَیَّامٍ ؕ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَیْرُ مَكْذُوْبٍ ﴿۶۵﴾

"پس انہوں نے اس کی کونچیں کاٹ ڈالیں۔ تو صالح نے فرمایا لطف اٹھا لو اپنے گھروں میں تین دن ۱؎ یہ اللہ کا وعدہ ہے جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا ۲؎ "

۱؎ یعنی قوم کے مشورہ سے قدار بن سالف نے اس اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں۔ فقال حضرت صالح علیہ السلام نے انہیں فرمایا عیش کر لو لطف اٹھا لو دنیا میں یا اپنے شہر میں بدھ، جمعرات، جمعہ کے تین دن پھر ہفتہ کے دن تمہارے چہرے زرد ہوں گے۔ دوسرے دن سرخ ہوں گے۔ تیسرے دن سیاہ ہوں گے پھر تم ہلاک ہو جاؤ گے۔

۲؎ اس میں کسی قسم کا جھٹلانا نہیں ہے۔ ظرف کو مفعول فیہ کے قائم مقام رکھا گیا یا یہ مکذوب کذب مصدر کے معنی میں ہے۔ یعنی یہ سچا وعدہ ہے جیسے مجلود اور معقول مصدر کے طور پر استعمال ہوتے ہیں یا غیر مکذوب کا مجازی معنی ہے۔ گویا وعدہ کرنے والا یہ کہہ رہا ہے کہ میں تجھ سے کئے گئے وعدہ کو پورا کروں گا۔ پس اگر وہ پورا کرے گا تو اس کی تصدیق کی جائے گی ورنہ تکذیب کی جائے گی۔ پس جس طرح حضرت صالح نے وعدہ فرمایا ویسا ہی ہوا۔ چوتھے دن وہ عذاب الٰہی کی لپیٹ میں آ گئے۔

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّیْنَا صٰلِحًا وَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَ مِنْ خِزْیِ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 222 (الفکر)

يَوْمِىٕذٍؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِیُّ الْعَزِیْزُ ﴿۶۶﴾

"پھر جب آ گیا ہمارا حکم تو ہم نے بچالیا صالح کو اور انہیں جو ایمان لائے تھے ان کے ساتھ اپنی رحمت سے نیز بچالیا اس دن کی رسوائی سے۔ بیشک (اے محبوب) تیرا رب ہی بہت قوت والا بہت عزت والا ہے۔[1]"

[1] یعنی ہم نے صالح علیہ السلام اور آپ کے صحابہ کو اس دن کی رسوائی سے بچالیا جس دن ایک چیخ کے ساتھ کافروں کو ہلاک کیا گیا۔ ابوجعفر نافع اور کسائی نے یہاں بھی اور سورۂ معارج "من عذاب یومئذ" میں یوم کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے یعنی مضاف نے مضاف الیہ سے بناء حاصل کی ہے اور باقیوں نے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

وَ اَخَذَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوا الصَّیْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دِیَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ ﴿۶۷﴾

"اور پکڑلیا ظالموں کو ایک خوفناک کڑک نے اور صبح کی انہوں نے اس حال میں کہ وہ اپنے گھروں میں گھٹنوں کے بل اوندھے گرے پڑے تھے۔[1]"

[1] یہ حضرت جبرئیل امین کی زوردار چیخ تھی۔ بعض علماء فرماتے ہیں ان پر آسمان سے ایک زوردار چیخ آئی تھی، اس میں ہر کڑک اور زمین کی ہر شی کی آواز تھی۔ پس آواز سے ان کے دل ٹوٹ گئے اور وہ گر پڑے اور اپنے گھروں میں ہی ہلاک ہو گئے تھے۔

كَاَنْ لَّمْ یَغْنَوْا فِیْهَاؕ اَلَاۤ اِنَّ ثَمُوْدَاۡ كَفَرُوْا رَبَّهُمْؕ اَلَا بُعْدًا لِّثَمُوْدَ ﴿۶۸﴾

"(انہیں یوں نیست و نابود کر دیا گیا) گویا وہ یہاں کبھی آباد ہی نہ ہوئے تھے سنو! ثمود نے انکار کیا اپنے رب کا سنو! بربادی ہو ثمود کے لئے۔[1]"

[1] گویا وہ کبھی مقیم ہی نہ تھے۔ فِیْهَا کی ضمیر کا مرجع دیار ہے۔ حضرت حفص، یعقوب اور حمزہ نے یہاں بھی اور سورۂ نجم اور فرقان میں ثمود کی دال پر بغیر تنوین کے فتحہ پڑھا ہے اور بغیر الف کے وقف کیا ہے، جبکہ باقی قراء نے تنوین کیساتھ پڑھا ہے اور الف کے ساتھ وقف کیا ہے اور بُعْدًا لِّثَمُوْدَ میں کسائی نے ثمود کی دال کو کسرہ اور تنوین کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے بغیر تنوین کے دال کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

وَ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَاۤ اِبْرٰهِیْمَ بِالْبُشْرٰى قَالُوْا سَلٰمًاؕ قَالَ سَلٰمٌ فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِیْذٍ ﴿۶۹﴾

"اور بلاشبہ آئے ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) ابراہیم کے پاس خوشخبری لے کر[1] انہوں نے کہا (اے خلیل) آپ پر سلام ہو آپ نے فرمایا تم پر بھی سلام ہو[2] پھر آپ جلدی لے آئے[3] (ان کی ضیافت کیلئے) ایک بچھڑا بھنا ہوا[4]"

[1] ابن عباس اور عطا فرماتے ہیں وہ تین فرشتے جبرائیل میکائیل اور اسرافیل تھے۔ محمد بن کعب فرماتے ہیں وہ جبرئیل اور ان کے ساتھ اور سات فرشتے تھے۔ ضحاک فرماتے ہیں وہ نو فرشتے تھے مقاتل فرماتے ہیں وہ بارہ فرشتے تھے۔ السدی فرماتے ہیں وہ گیارہ فرشتے تھے جو نہایت خوبصورت اور روشن چہروں والے جوانوں کی شکلوں میں تھے (1)۔ انہوں نے حضرت ابراہیم کو بشارت دی اور وہ بیٹے حضرت اسحاق اور پوتے حضرت یعقوب کی بشارت تھی۔ بعض فرماتے ہیں بشارت سے مراد قوم لوط کی ہلاکت کی خبر ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 224 (الفکر)

ل یہ اصل میں نسلم علیک سلاماً ہے یہ بھی جائز ہے کہ سلام کی نصب قالوا کی وجہ سے ہو۔ اس صورت میں یہ ذکر و اسلاما ہے۔ پھر حضرت ابراہیم کے سلام یعنی تمہارا معاملہ یا میرا جواب بھی سلام ہی ہے۔ یا علیکم سلام ہے۔ آپ نے سلام کا جواب بہتر انداز میں دیا کیونکہ انہوں نے جملہ فعلیہ استعمال کیا تھا مگر آپ نے جملہ اسمیہ استعمال فرمایا اور جملہ اسمیہ دوام اور استمرار پر دلالت کرتا ہے۔ جبکہ جملہ فعلیہ میں ایسی خصوصیت نہیں ہے۔ حضرت حمزہ اور کسائی نے یہاں اور سورۃ ذاریات میں سِلم سین کے کسرہ کے ساتھ اور الف کے بغیر پڑھا ہے اور یہ دونوں لغتیں ہیں مثلاً حل واحلال حرم واحرام۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس سے مراد صلح ہے، ہم تمہارے ساتھ بغیر جنگ کے صلح کرتے ہیں۔

ع اَنْ جَآءَ۔ اصل میں فی ان ہے، یعنی آپ نے بچھڑے کو لانے میں تاخیر نہ کی حرف جر مقدر ہے یا محذوف ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ اَنْ جَآءَ فاعل ہونے کی بنا پر محل رفع میں ہو یعنی فما ابطئی ء مجیء ابراھیم حضرت ابراہیم کا آنا تاخیر سے نہ تھا۔

سے پتھروں پر بھونا ہوا بچھڑا۔ قاموس میں ہے الشاۃ یحنذھا حنذا اور تحناذا شواھا۔ یعنی اس نے بکری کو بھونا اور اس پر گرم پتھر رکھے تاکہ وہ بھن جائے۔ پس وہ بھونی ہوئی چیز حنیذ کہلاتی ہے(1)۔ بعض علماء فرماتے ہیں حنیذ سے مراد وہ قطرے مراد ہیں جو چربی وغیرہ سے گرتے ہیں یہ حنذت الفرس مشتق ہوگا جس کا مطلب گھوڑے کا پسینہ نکالنا ہے۔ قاموس میں ہے کہ کوئی شخص جب اپنے گھوڑے کو دو یا تین چکر دوڑائے اور پھر اس پر کپڑے اور جل ڈال دے تاکہ اس کا پسینہ نکل آئے تو اسے حنیذ کہتے ہیں(2) اس صورت میں مجازاً سمین (موٹا) کے معنی میں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد بھی اس کی موافقت کرتا ہے جاء بعجل سمین۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں حضرت ابراہیم کا عام مال گائیں تھیں(3)۔

فَلَمَّا رَاٰۤ اَیْدِیَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَیْهِ نَكِرَهُمْ وَ اَوْجَسَ مِنْهُمْ خِیْفَةً ؕ قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّاۤ اُرْسِلْنَاۤ اِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ ؕ

" پھر جب دیکھا کہ ان کے ہاتھ نہیں بڑھ رہے ہیں کھانے کی طرف لے تو اجنبی خیال کیا انہیں اور دل ہی دل میں ان سے اندیشہ کرنے لگے ۲ے فرشتوں نے کہا ڈریئے نہیں ہمیں تو بھیجا گیا ہے قوم لوط کی طرف سے "

لے جب حضرت ابراہیم نے ان فرشتوں کو دیکھا کہ وہ اپنے ہاتھ اس کھانے کی طرف نہیں بڑھا رہے ہیں اور کھانا تناول نہیں فرما رہے ہیں تو آپ نے اس چیز کو ناپسند فرمایا۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں نکر و انکر استنکر تینوں ایک ہی معنی " ناپسند کرنا " میں استعمال ہوتے ہیں(4)۔ قاموس (لغت کی مشہور کتاب) میں ہے کہ التنکر خوش کن کیفیت سے ناپسندیدہ حالت کی طرف تبدیل ہونا ہے(5)۔

ع وَاَوْجَسَ کا معنی دل ہی دل میں محسوس کرنا ہے۔ قاموس میں اس کا یہی معنی لکھا ہے(6)۔ مقاتل فرماتے ہیں اس کا مطلب ہے دل میں واقع ہونا ہے۔ امام بغوی لکھتے ہیں وجوس کی اصل دخول ہے۔ گویا خوف ان کے دل کو لاحق ہوا(7)۔ منھم یعنی ان مہمانوں سے خوف محسوس ہوا جب انہوں نے کھانے کی طرف ہاتھ نہ بڑھائے۔ خیفۃ کا معنی خوف ہے۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں خوف کی وجہ یہ تھی

1۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 478 (التراث العربی)
2۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 478 (التراث العربی)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 197 (التجاریہ)
4۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد 3، صفحہ 245 (الفکر)
5۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 675 (التراث العربی)
6۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 792 (التراث العربی)
7۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 197 (التجاریہ)

کہ اس معاشرہ میں یہ معروف تھا کہ جب کوئی مہمان آتا اور کھانا نہ کھاتا تو میزبان سمجھ جاتے کہ یہ کوئی خیر سے نہیں آیا بلکہ کسی شر کو لے کر آیا ہے(1)۔ بعض علماء فرماتے ہیں ان کا دستور تھا کہ جب رات کے وقت کوئی مسافر آتا اور کھانا کھالیتا تو گھر والے اس سے مامون ہو جاتے ورنہ وہ اس سے خوفزدہ رہتے آپ کو اندیشہ ہوا کہ یہ کوئی شر کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اور آپ نے انہیں چور خیال کیا۔ ظاہر یہ ہے کہ آپ نے محسوس تو کر لیا تھا کہ یہ فرشتے ہیں اور خوف اس لئے لاحق ہوا کہ شاید ان کا نزول کسی ایسے امر کے لئے ہو جسے اللہ نے ان پر ناپسند کیا ہو یا آپ کو خوف اپنی قوم کے عذاب دیے جانے پر ہو۔

۳۔ فرشتوں نے کہا اے ابراہیم آپ پریشان نہ ہوں ہمیں قوم لوط کی طرف عذاب دے کر بھیجا ہے۔

وَامْرَاَتُهٗ قَآىِٕمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ ۙ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ ۝

"اور آپ کی اہلیہ (سارا پاس) کھڑی تھیں ۱۔ وہ ہنس پڑیں ۲۔ تو ہم نے خوشخبری دی سارہ کو اسحاق کی اور اسحاق کے بعد یعقوب کی ۳۔"

۱۔ آپ کی اہلیہ سارہ بنت ہاران بن ناخور یہ حضرت ابراہیم کے چچا کی بیٹی تھیں، پردے کے پیچھے یہ ساری گفتگو سن رہی تھیں۔ بعض فرماتے ہیں وہ مہمانوں اور حضرت ابراہیم کی خدمت کر رہی تھیں کیونکہ آپ مہمانوں کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔

۲۔ فَضَحِكَتْ کا معنی مجاہد اور عکرمہ فرماتے ہیں وہ اسی وقت حائضہ ہو گئی۔ عرب کہتے ہیں ضحکت الارنب خرگوش کی مادہ حائضہ ہو گئی(2) اسی طرح قاموس میں بھی ہے کہا جاتا ہے ضحکت السمرۃ جب درخت کی گوند نکلنے لگے۔ اکثر مفسرین کا خیال ہے کہ ضحک سے مراد معروف ہنسنا ہی ہے۔ پھر اس میں اختلاف ہے کہ ان کے ہنسنے کا سبب کیا تھا۔ بعض فرماتے ہیں جب فرشتوں نے لا تخف کہا تو خوف کے زوال کی وجہ سے ہنس پڑیں۔ سدی فرماتے ہیں جب حضرت ابراہیم نے کھانا مہمانوں کے سامنے رکھا تو انہوں نے کھانا شروع نہ کیا تو حضرت ابراہیم خوف زدہ ہوئے اور انہیں چور گمان کیا۔ پھر پوچھا تم لوگ کھانا کیوں نہیں کھاتے؟ انہوں نے کہا ہم یہ قیمت دے کر کھائیں گے۔ حضرت ابراہیم نے فرمایا اس کی قیمت دے دو۔ انہوں نے پوچھا اس کی قیمت کیا ہے؟ فرمایا تم ابتداء میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو گے اور آخر میں اس کی حمد کرو گے تو قیمت ادا ہو جائے گی۔

جبرئیل نے میکائیل کی طرف دیکھا اور فرمایا یہ اس قابل ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنا خلیل بنالے۔ پھر جب حضرت ابراہیم اور سارہ نے دیکھا کہ یہ اپنے ہاتھ کھانے کی طرف نہیں بڑھا رہے تو حضرت سارہ ہنس پڑیں۔ فرمایا تعجب ہے کہ ہم بذات خود اپنے مہمانوں کی خدمت کر رہے ہیں اور یہ کھانا ہی نہیں کھاتے۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں وہ قوم لوط کی غفلت اور ان کے عذاب کے قریب ہونے پر ہنسی تھیں(3)۔ بعض علماء فرماتے ہیں وہ اس لئے ہنسی تھیں کہ اس کی رائے ٹھیک نکلی تھی۔ کیونکہ آپ ہر وقت حضرت ابراہیم سے کہتی رہتی تھیں کہ حضرت لوط کو اپنے ساتھ ملا لیں، میں جانتی ہوں کہ اس قوم پر عذاب نازل ہوگا۔ مقاتل اور الکلبی فرماتے ہیں کہ آپ حضرت ابراہیم کے خوف پر ہنسی تھیں۔ جو ان فرشتوں کی وجہ سے ان کو لاحق ہوا تھا، جبکہ آپ کے خدام بھی ساتھ موجود تھے۔

بعض فرماتے ہیں وہ بچے اور پوتے کی بشارت اور فسادیوں کی ہلاکت کا پیغام سننے پر ہنسی تھیں۔ حضرت ابن عباس اور وہب فرماتے ہیں آپ اس بات پر تعجب کرتے ہوئے ہنسی تھیں کہ میرے ہاں بچہ پیدا ہوگا، جبکہ میں خود بھی اور میرے سرتاج ابراہیم بھی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 197 (التجاریہ)　2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 197 (التجاریہ)　3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 197 (التجاریہ)

بڑھاپے کو پہنچ چکے ہیں۔ اس قول کی صورت میں کلام میں تقدیم و تاخیر ہوگی۔ تقدیر عبارت یوں ہوگی اور آپ کی اہلیہ کھڑی تھیں تو ہم نے حضرت سارہ کو بیٹے اسحٰق اور پوتے یعقوب کی بشارت دی تو آپ ہنس پڑیں(1)۔

ابن عامر، حمزہ اور حفص نے یعقوب کو فعل مضمر کے ساتھ نصب دی ہے جس فعل کی تفسیر موجود کلام کر رہی ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہوگی وَهَبْنَا لَهَا مِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ۔ بعض علماء فرماتے ہیں یعقوب کا عطف اسحٰق کے مقام پر ہے، یا لفظ اسحٰق پر ہے مگر اس کی نحو غیر منصرف ہونے کی وجہ سے ہے لیکن ظرف کے ساتھ درمیان میں فاصلہ کی وجہ سے اس قول کا رد کیا گیا ہے۔ باقی علماء نے مبتدا کی حیثیت سے مرفوع پڑھا ہے اور اس کی خبر ظرف ہے۔ مطلب یہ ہوگا کہ اسحٰق کے بعد یعقوب پیدا ہوں گے۔ بعض علماء فرماتے ہیں تقدیر عبارت یوں ہوگی مِنْ بَعْدِ اِسْحَاقَ يُوْلَدُ يَعْقُوْبُ۔ بعض فرماتے ہیں الوراء کا معنی الولد۔ یعقوب کو شاید اس لئے اس نام سے پکارا گیا کیونکہ آپ حضرت اسحٰق کے بعد پیدا ہوئے تھے۔ اس صورت میں پھر حضرت اسحٰق کی طرف نسبت سے نہیں کہ یعقوب ان کے بعد پیدا ہوئے تھے بلکہ وہ حضرت ابراہیم کی نسبت سے یعقوب کہلائیں گے۔ حضرت امام بیضاوی فرماتے ہیں اس قول میں نظر ہے، یہ دونوں اسماء بشارت میں واقع ہونے کا احتمال رکھتے ہیں جس طرح حضرت زکریا کو یحییٰ نام کے فرزند ارجمند کی بشارت دی گئی تھی۔ یہ بھی احتمال ہے ان کے پیدا ہونے کے بعد حکایۃً ان دونوں ناموں کا ذکر کیا گیا ہو۔ پھر ان کے یہ نام رکھے گئے ہوں۔ یہاں بشارت کی نسبت حضرت سارہ کی طرف ہے۔ یہ دلیل ہے کہ جس بچہ کی شہادت دی جارہی ہے وہ ان کے بطن سے ہوگا(2)۔ دوسرا یہ کہ عورتیں اولاد نرینہ پر مردوں کی نسبت زیادہ خوش ہوتی ہیں۔ چونکہ پہلے آپ بانجھ تھیں اور بچے کی زیادہ خواہشمند تھیں تو انہیں بچے اور پوتے کی خوشخبری دی گئی۔ یہ اس بات پر دلیل ہے کہ آپ اتنی لمبی عمر گزاریں گی کہ اپنے پوتے کو بھی دیکھ لیں گی۔ جب آپ کو یہ بیٹے اور پوتے کی بشارت ملی تو آپ نے از روئے تعجب اپنا ہاتھ منہ پر مارا۔

قَالَتْ يٰوَيْلَتٰٓى ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ وَّهٰذَا بَعْلِىْ شَيْخًا ؕ اِنَّ هٰذَا لَشَىْءٌ عَجِيْبٌ ﴿۷۲﴾

"اور سارہ نے کہا اوا ے حیرانی کیا[1] میں بچہ جنوں گی[2] حالانکہ میں بوڑھی ہوں اور یہ میرے میاں ہیں یہ بھی بوڑھے ہیں بلاشبہ یہ تو عجیب و غریب بات ہے[3]"

[1] ویلتی یہ اصل میں کسی شر پر اظہار افسوس کے لئے بولا جاتا ہے۔ پھر یہ کسی خوفناک امر اور کسی تعجب خیز چیز کو دیکھنے کے وقت بولا جاتا ہے۔ اس کا الف یاء اضافت کا بدل ہے جس پر حضرت حسن کی قرأت دلالت کرتی ہے کہ انہوں نے اصل پر یو یلتی یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ الف ندبہ کا ہے، اصل میں یا ویلتاہ تھا۔

[2] آپ اس وقت ابن اسحاق کے قول کے مطابق نوے سال کی تھیں اور مجاہد کے قول کے مطابق ننانوے سال کی تھیں(3)۔ بعل اصل میں۔ معاملہ کو سرانجام دینے والے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ ابن اسحٰق کے قول کے مطابق حضرت ابراہیم کی عمر اس وقت ایک سو بیس سال تھی اور مجاہد کے قول کے مطابق سو سال تھی۔ بشارت اور ولادت کے درمیان ایک سال کا فاصلہ تھا(4)۔ شیخاً پر نصب حال ہونے کی وجہ سے ہے اور اس کا عامل اسم اشارہ کا معنی ہے۔

قَالُوْٓا اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ ؕ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 197 (الفکر)
2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد 3، صفحہ 246 (الفکر)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 198 (التجاریہ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 198 (التجاریہ)

اِنَّهٗ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ﴿۷۳﴾

"فرشتے کہنے لگے کیا تم تعجب کرتی ہو اللہ تعالیٰ کے حکم پر[1] اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کی برکتیں ہوں تم پر[2] اے ابراہیم کے گھرانے والو[3] بیشک وہ ہر طرح تعریف کیا ہوا بڑی شان والا ہے[4]"

[1] ان کے اس تعجب پر انکار کرتے ہوئے فرشتوں نے کہا کیا تم اللہ تعالیٰ کے فیصلے اور قدرت پر تعجب کرتی ہو، اللہ تعالیٰ جو ارادہ فرماتا ہے وہ ہو کر ہی رہتا ہے۔ اگر کوئی کہے کہ عجب اس حالت کو کہتے ہیں جو انسان کو کوئی امر بدیع اور عادت کے خلاف معاملہ پر لاحق ہوتی ہے اور معاملہ یہاں بھی ایسا ہی تھا۔ اور کسی معاملہ کا قدرت الٰہی میں ہونا انسان کے تعجب کے منافی نہیں ہے کیونکہ ویسے تو ہر کام اللہ تعالیٰ کی قدرت میں ہے، اگرچہ وہ عجیب اور عادت کے خلاف ہو تو حضرت سارہ کا تعجب کوئی انوکھی بات تو نہ تھی۔ تو پھر فرشتوں نے ان کی تعجب کا انکار کیوں کیا۔ ہم جواباً یہ کہیں گے اہل بیت نبوت اور جن پر معجزات کا ہر وقت نزول رہتا ہو اور جو لوگ مزید نعمتوں اور کرامتوں کے ساتھ خاص ہوں ان کے لئے خوارق العادات امور بدیع اور عجیب نہیں ہوتے، کسی امر خارق عادت پر کسی عقلمند کا تعجب کرنا بھی مناسب نہیں چہ جائیکہ تعجب کرے جس کا بچپن اور جوانی ان چیزوں کے مشاہدہ و ملاحظہ میں گزری ہو۔

[2] بعض علماء فرماتے ہیں یہ ملائکہ کی طرف سے دعا کے معنی پر ہے۔ بعض فرماتے ہیں خبر کے معنی پر ہے اور رحمت کا معنی نعمت اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے محبت ہے اور برکت ہر خیر میں زیادتی اور اضافے کو کہتے ہیں۔ بعض فرماتے ہیں رحمت سے مراد نبوت ہے اور برکات سے مراد بنی اسرائیل کے قبائل ہیں۔ کیونکہ بنی اسرائیل کے انبیاء ان میں سے تھے اور وہ تمام حضرت سارہ کی اولاد سے تھے۔ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ کا جملہ تعجب پر انکار کے لئے تعلیل کے مقام پر مستقل کلام ہے۔ گویا یوں کہا گیا ہے اے اہل بیت نبوت تم ہرگز تعجب نہ کرو کیونکہ اس قسم کی رحمتیں اور برکتیں تو تم پر پہلے بھی کثیر ہیں۔ یہ خبر کی تقدیر کی صورت میں ہوگا۔

[3] مدح کے طور پر یا تخصیص کے ارادہ سے نداء کے طور پر منصوب ہے جیسے اللھم اغفرلنا ایتھا العصابة میں ایتھا العصابة مدح یا تخصیص کے لئے منصوب ہے۔ اس آیت کریمہ میں رافضیوں کے ایک مسئلہ کا رد بھی ہے، وہ کہتے ہیں نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات اہل بیت میں شامل نہیں ہیں، حالانکہ اہل کا لغوی معنی ہی ازواج ہے اور دوسرے لوگ ان کی اتباع میں شامل ہیں (جب حضرت ابراہیم کے ذکر میں اہل بیت میں آپ کی زوجہ محترمہ شامل ہے تو حضور ﷺ کے ذکر میں اہل بیت میں آپ کی ازواج کیوں شامل نہیں۔ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ (مترجم)

[4] وہ ذات جو حمد کی مستحق ہے ایسے افعال کا کرنے والا جو حمد کا موجب ہیں۔ الصحاح (لغت کی معتبر ترین کتاب) میں ہے المجید بزرگی اور کرم میں وسیع ہونا۔ اللہ تعالیٰ کو کرم سے اس لئے متصف کیا جاتا ہے کہ اس کا احسان اور انعام بے شمار ہے اور بندے کو اس کے ظاہری اخلاق حمیدہ اور افعال جمیلہ کی وجہ سے متصف کیا جاتا ہے۔ کریم کسی کو اس وقت کہا جائے گا جس سے اچھے اخلاق اور عمدہ افعال ظاہر ہوں۔ امام بغوی فرماتے ہیں۔ المجید اصل معنی رفیع ہے[1]۔ امام بیضاویؒ فرماتے ہیں جو بہت زیادہ احسان اور بھلائی کرنے والا ہو[2]۔ قاموس میں ہے المجید الرفیع العالی الکریم والشریف الفعال[3]۔ یعنی وہ ذات جو بلند مرتبہ ہو عمدہ اخلاق کی جامع ہو اور اچھے افعال کثرت سے سرانجام دینے والی ہو۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 198 (الفکر)   2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد 3، صفحہ 246 (الفکر)   3۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 460 (التراث العربی)

فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرٰهِیْمَ الرَّوْعُ وَجَآءَتْهُ الْبُشْرٰى یُجَادِلُنَا فِیْ قَوْمِ لُوْطٍ ﴿۷۴﴾

"پھر جب دور ہو گیا ابراہیم (علیہ السلام) سے خوف اور مل گیا انہیں مژدہ تو۱؎ وہ ہم سے جھگڑنے لگے قوم لوط کے بارے ۲؎"

۱؎ روع کا معنی خوف اور گھبراہٹ ہے، یعنی خوف کی جگہ جب حضرت اسحٰق اور حضرت یعقوب کی خوشخبری مل گئی۔

۲؎ یُجَادِلُنَا کا جواب ہے۔ حال کی حکایت پر مضارع کا صیغہ لایا گیا ہے یا اس لیے کے جواب کے سیاق میں ماضی کا معنی ہے جیسے جواب میں ماضی ہوتا ہے یا یہ جواب محذوف کی دلیل ہے مثلاً اِجْتَرٰی عَلٰی خِطَابِنَا اَوْ شَرَعَ فِیْ جِدَالِنَا۔ یعنی وہ ہم سے جھگڑنے لگے یا یہ محذوف جواب کے متعلق ہے اور اس کے قائم مقام اسے رکھا گیا ہے مثلاً اَخَذَ اَوْظَلَّ اَوْ اَقْبَلَ یُجَادِلُنَا۔ بعض فرماتے ہیں اس کا معنی ہے وہ ہم سے کلام کرنے لگے کیونکہ حضرت ابراہیم اپنے رب سے جھگڑنے والے نہیں تھے بلکہ وہ تو سوالی اور ملتجی تھے۔ اکثر مفسرین نے اس کا معنی یہ کیا ہے کہ وہ ہمارے فرشتوں سے جھگڑنے لگے اور ان کا مجادلہ لوط علیہ السلام کی قوم کے متعلق تھا۔ آپ نے فرمایا اے فرشتو اگر لوط کی بستیوں میں پچاس آدمی مومن ہوں تو کیا تم انہیں ہلاک کر دو گے۔ فرشتوں نے کہا نہیں۔ پھر فرمایا کیا چالیس مومن ہوں گے تو تم انہیں ہلاک کر دو گے۔ انہوں نے کہا نہیں۔ پھر فرمایا تیس ہوں گے تو ہلاک کرو گے۔ انہوں نے کہا نہیں۔ پھر فرمایا اگر ایک آدمی مومن ہوگا تو انہیں ہلاک کر دو گے۔ انہوں نے کہا نہیں۔ پھر فرمایا حضرت لوط بھی تو ان بستیوں میں رہتے ہیں۔ فرشتوں نے کہا ہاں، ہم انہیں جو ان بستیوں میں رہتے ہیں، ہم حضرت لوط اور ان کے گھر والوں کو بچا لیں گے، سوائے ان کی بیوی کے وہ پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہے۔

اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ لَحَلِیْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِیْبٌ ﴿۷۵﴾

"بے شک ابراہیم بڑے بردبار رحم دل (اور) ہر حال میں ہماری طرف رجوع کرنے والے تھے ۱؎"

۱؎ وہ مجرم سے انتقام لینے میں جلد بازی نہیں کرتے تھے۔ اَوَّاهٌ اپنے گناہوں اور دوسرے انسانوں کے اعمال پر افسوس کرتے ہوئے کثرت سے آہ بلب رہنے والا اور قاموس میں ہے اس کا مطلب ہے یقین کرنے والا یا کثرت سے دعا کرنے والا یا نہایت مہربان، نرم دل یا فقیہ یا خشیہ کے ساتھ ایمان لانے والا (۱)۔ منیب اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والا۔ ان صفات کے بیان کا مقصود یہ ہے کہ انہی صفات عظیمہ کی بناء پر جھگڑ رہے تھے، ان کا دل انتہائی نرم تھا، کسی کی تباہی اور بربادی اس سے دیکھی نہ جاتی تھی۔ رحمت کا جذبہ ان میں ہر وقت موجزن رہتا تھا۔ مجرم سے انتقام ان کی عادت نہیں تھی تو فرشتوں نے آپ کے اس جھگڑے پر کہا۔

یٰۤاِبْرٰهِیْمُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۚ اِنَّهٗ قَدْ جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ۚ وَ اِنَّهُمْ اٰتِیْهِمْ عَذَابٌ غَیْرُ مَرْدُوْدٍ ﴿۷۶﴾

"اے ابراہیم اس بات کو رہنے دیجئے بیشک آ گیا تیرے رب کا حکم اور ان پر آ کر رہے گا عذاب جو پھیرا نہیں جا سکتا ۱؎"

۱؎ اے ابراہیم اس جھگڑے کو چھوڑ دیجئے، ان کے عذاب کا فیصلہ ازل سے ہو چکا ہے، وہ ان کی حالت کو خوب جانتا ہے۔ اب آپ کے

1۔ القاموس المحیط، جلد 2، صفحہ 1631 (التراث العربی)

جھگڑنے سے ان مشرکوں کا عذاب قطعاً ٹلنے گا اور نہ آپ کی دعا سے اور نہ کسی اور وجہ سے اب عذاب رد ہوگا۔

وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِیْٓءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَّقَالَ هٰذَا یَوْمٌ عَصِیْبٌ ﴿۷۷﴾

"اور جب آئے ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) لوط (علیہ السلام) کے پاس وہ دلگیر ہوئے[1] ان کے آنے سے اور بڑے پریشان ہوئے ان کی وجہ سے اور[2] بولے آج کا دن تو بڑی مصیبت کا دن ہے[3]"

[1] حضرت لوط کے پاس انتہائی خوش شکل اور مہروش جوانوں کی صورتوں میں ملائکہ تشریف لائے تو حضرت لوط ان کی آمد سے غمگین ہوئے۔ آپ انہیں دیکھ کر اس لئے غمزدہ ہوئے کہ آپ کو اپنی قوم کی بدسیرتی کا علم تھا اور آپ کو یہ اندیشہ ہوا کہ ان کی قوم کہیں میرے ان مہمانوں کو تکلیف نہ پہنچائے اور میں ان کا دفاع کرنے سے عاجز نہ ہو جاؤں۔ نافع' ابن عامر اور کسائی نے سورۂ ملک' سورۂ عنکبوت اور یہاں سِیْٓءَ کی سین کو ضمہ کے اشمام کے ساتھ پڑھا ہے، باقی قراء نے سین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

[2] حضرت لوط ان کے سبب بہت دل گیر ہوئے۔ ذرعاً نسبت سے تمیز ہے، یعنی ان کا ہاتھ تنگ ہوا۔ امام بغوی فرماتے ہیں ان کا دل تنگ ہوا(1)۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں ان کے مرتبے کی وجہ سے ان کا دل تنگ ہوا(2)۔ میں کہتا ہوں ذرع اصل میں کلائی یا کہنی تک ہاتھ کو کہتے ہیں۔ پھر اس کا اطلاق قوت پر ہوتا ہے جسے ید کا اطلاق قوت پر ہوتا ہے۔ یہاں معنی یہ ہے کہ ان کی وجہ سے انہوں نے اپنی طاقت کو کمزور پایا اور انہیں اس ناپسندیدہ حالت سے خلاصی کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ قاموس میں بھی اسی طرح ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں یہ الفاظ انتہائی انقباض اور دل تنگی سے کنایہ ہیں، جو انسان کو اس وقت لاحق ہوتی ہے جب انسان اپنے آپ کو مکروہ چیز کو دور کرنے سے عاجز سمجھتا ہے اور اس سے بچ نکلنے کا کوئی حیلہ نہیں پاتا(3)۔

[3] فرمایا یہ بہت سخت دن ہے۔ قتادہ اور سدی فرماتے ہیں ملائکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ملاقات سے فارغ ہو کر حضرت لوط علیہ السلام کے شہر کی طرف نکلے تو وہ حضرت لوط سے دوپہر کے وقت ملے جبکہ وہ اپنی زمین میں کام کر رہے تھے۔ بعض فرماتے ہیں وہ لکڑیاں کاٹ رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ اس قوم کو اس وقت تک ہلاک نہ کرنا جب تک لوط علیہ السلام چار مرتبہ ان کے خلاف گواہی نہ دے دیں۔ فرشتے آپ کے پاس پہنچے تو انہوں نے کھانا طلب کیا۔ آپ انہیں لے کر گھر کی طرف چل پڑے۔ جب کچھ دیر چلے تو آپ نے پوچھا تم اس شہر میں کیسے آئے ہو۔ فرشتوں نے پوچھا یہ کیسے لوگ ہیں؟ آپ نے فرمایا اللہ کی قسم پوری زمین میں ان سا بدکوئی نہ ہوگا۔ یہ آپ نے چار مرتبہ فرمایا۔ وہ فرشتے آپ کے گھر آپ کی معیت میں پہنچ گئے۔ روایت ہے کہ آپ لکڑیاں اٹھائے ہوتے تھے اور فرشتے آپ کے پیچھے پیچھے تھے۔ آپ اپنی قوم کی ایک جماعت کے پاس سے گزرے تو وہ آپس میں اشارے کرنے لگے۔ حضرت لوط نے فرمایا میری قوم تمام مخلوق سے بدتر ہے۔ پھر ایک دوسرے گروہ سے گزرے تو انہوں نے بھی ایسا کیا۔ پھر آپ نے بھی اسی طرح فرمایا کہ میری قوم بدترین مخلوق ہے۔ پھر ایک تیسری جماعت کے پاس سے گزرے تو ایسا ہی ہوا جیسے پہلے ہوا تھا۔ جب حضرت لوط ان کی برائی کو بیان کرتے تو حضرت جبرئیل فرشتوں کو فرماتے تم گواہ ہو جاؤ، یہاں تک کہ میں اس قوم کے پاس پہنچ جاؤں۔ یہ بھی روایت ہے کہ ملائکہ حضرت لوط کو اپنے گھر کے دروازے پر ملے تھے۔ ان کی آمد کا آپ کے گھر والوں کے سوا کسی کو علم نہ تھا۔ تو آپ کی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 199 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد 3، صفحہ 247 (الفکر)

بیوی نے آپ کی قوم کو آگاہ کیا انہیں بتایا کہ لوط علیہ السلام کے گھر ایسے مرد آئے ہیں جن کی مثل حسین چہرے میں نے نہیں دیکھے (1)۔

وَ جَآءَهٗ قَوْمُهٗ یُهْرَعُوْنَ اِلَیْهِ ؕ وَ مِنْ قَبْلُ كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ السَّیِّاٰتِ ؕ قَالَ یٰقَوْمِ هٰۤؤُلَآءِ بَنَاتِیْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ لَا تُخْزُوْنِ فِیْ ضَیْفِیْ ؕ اَلَیْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِیْدٌ ﴿۷۸﴾

"اور (مہمانوں کی خبر سنتے ہی) آئے ان کے پاس ان کی قوم کے لوگ دوڑتے ہوئے اور اس سے پہلے ہی وہ کیا کرتے تھے برے کام [1] لوط نے کہا اے میری قوم (دیکھو) یہ میری قوم کی بیٹیاں ہیں [2] وہ پاک اور حلال ہیں تمہارے لئے [3] تم خوف خدا کرو اور مجھے رسوانہ کرو میرے مہمانوں کے معاملہ میں کیا تم [4] میں ایک بھی سمجھدار آدمی نہیں [5]"

[1] حضرت ابن عباسؓ اور حضرت قتادہ فرماتے ہیں یُهْرَعُوْنَ بمعنی یسرعون ہے یعنی وہ دوڑتے ہوئے آئے۔ مجاہد فرماتے ہیں یُهَرْوِلُوْنَ حضرت حسن فرماتے ہیں درمیانی چال مراد ہے۔ شمر بن عطیہ فرماتے ہیں یہ ہرولہ اور جمز یعنی تیز چلنے اور تیز دوڑنے کی درمیانی چال مراد ہے (2) قاموس میں ہے اس کا معنی تیزی کے ساتھ چلنا لکھا ہے (3) جلدی اور اضطراب کے کمال کو ظاہر کرنے کے لئے مجہول فعل استعمال ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ جلدی جلدی دوڑتے ہوئے آئے۔ یہ ان کی برائی کی پوری کوشش پر دلالت کرتا ہے۔ اس وقت پہلے وہ مردوں کے ساتھ برائی کرتے تھے اور اس برائی میں مستغرق ہونے کی وجہ سے اتنے بے حیا ہو چکے تھے کہ بغیر کسی شرم وحیا کے علی الاعلان برائی کی طرف لپکتے تھے۔

[2] جب انہوں نے حضرت لوط کے مہمانوں کا قصد کیا اور انہوں نے انہیں خوبرو نوجوان گمان کیا تو آپ نے فرمایا۔ یعنی یہ میری بیٹیاں ہیں ان سے نکاح کرلو اس سے پہلے وہ آپ سے آپ کی بیٹیوں کا رشتہ طلب کرتے تھے۔ لیکن آپ ان کی بد عادتوں اور عدم کفاءت کی وجہ سے ان سے رشتہ نہیں کرتے تھے۔ ان کے کافر ہونے اور عورتوں کے مسلمان ہونے کی وجہ سے ان کا رشتہ رد فرماتے تھے کیونکہ دین محمد ﷺ سے پہلے مسلمان عورت کا کافر مرد سے نکاح جائز تھا جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی بیٹیوں کا نکاح عتبہ بن ابی لہب اور ابوالعاص بن ربیع سے کیا تھا حالانکہ یہ دونوں کافر تھے۔ یہ وحی سے پہلے کا واقعہ ہے۔ حسین بن فضل فرماتے ہیں حضرت لوط علیہ السلام نے اپنی بیٹیوں کا رشتہ اسلام کی شرط کے ساتھ ان پر پیش کیا۔ مجاہد اور سعید بن جبیر فرماتے ہیں هٰۤؤُلَآءِ بَنَاتِیْ سے مراد آپ نے ان کی بیویاں لی تھیں اور ان کی نسبت اپنی طرف اس لئے فرمائی تھی کہ ہر نبی اپنی امت کا باپ ہوتا ہے اور ابی بن کعب کی قرأت میں اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗ اُمَّهٰتُهُمْ وَهُوَ اَبٌ لَّهُمْ ہے (4) یعنی نبی مومنین کی جانوں سے بھی زیادہ قریب ہے اور اس کی ازواج (مطہرات) ان کی مائیں ہیں۔ اور وہ نبی ان کا باپ ہے۔ یہ قول معنی کی حیثیت سے راجح ہے کیونکہ آپ کی دو بیٹیوں کا تو پوری جماعت کے ساتھ نکاح ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس ترجیح کے جواب میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرت لوط کی قوم کے دو سردار تھے جن کی اطاعت کی جاتی تھی۔ آپ نے انہیں اپنی بیٹیوں کا رشتہ دینے کو کہا۔ بعض علماء فرماتے ہیں حضرت لوط نے یہ قول ان کی برائی کو دور کرنے کے لئے کہا تھا جس کا وہ قصد کرتے تھے نہ کہ حقیقتاً آپ انہیں بیٹیوں کا رشتہ دینا چاہتے تھے۔ یعنی مہمانوں کی بے حرمتی کی نسبت

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 199 (التجاریہ)

2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 199 (التجاریہ)

یہ کہنا آسان تھا۔

۳؎ یعنی از روئے فعل کے یہ تمہارے لئے بہتر ہے (برائی دونوں فعلوں میں ہے)۔ لیکن اس میں برائی کم ہے جیسے تیرا قول ہے اَلْمَیْتَۃُ اَطْیَبُ مِنَ الْمَغْصُوْبِ وَاَحَلُّ مِنْہُ مردار مغصوب سے پاک ہے اور حلال ہے۔ ھٰؤلاء مبتدا ہے اور بناتی عطف بیان ہے اور ھن فصل ہے اور اطھر مبتدا کی خبر ہے یا بناتی ھٰؤلاء کی خبر ہے اور ھن اطھر مبتدا اور خبر ہیں۔

۴؎ برائی کو ترک کر کے اللہ سے ڈرو۔ ابوعمرو نے لا تخزون کو وصلاً یا کے اثبات کے ساتھ پڑھا ہے (یعنی مجھے رسوا نہ کرو) یہ خزی سے مشتق ہے۔ یا اس کا معنی ہے مجھے شرمندہ نہ کر۔ اس صورت میں یہ خزایۃ سے مشتق ہوگا جس کا معنی حیاء ہے۔ فی ضیفی کو نافع اور ابو عمرو نے یاء کے فتح کیساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی مجھے اپنے مہمانوں کے بارے میں رسوا نہ کرو کیونکہ کسی کے مہمان کو رسوا کرنا اس شخص یعنی میزبان کو رسوا کرنا ہے۔

۵؎ کیا تم میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں جو حق تک پہنچنے والا ہو اور برائی سے بچنے والا ہو۔ ابن اسحاق فرماتے ہیں اس کا مطلب ہے تم میں کوئی ایسا شخص نہیں جو نیکی کا حکم دے اور برائی سے منع کرے (1)۔

قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِیْ بَنٰتِكَ مِنْ حَقٍّ ۚ وَ اِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِیْدُ ﴿۷۹﴾

"کہنے لگے تم خوب جانتے ہو ہمیں تمہاری (قوم کی) بیٹیوں سے کوئی سروکار نہیں اور تم یہ اچھی طرح جانتے ہو کہ ہم کیا چاہتے ہیں ۱؎۔"

۱؎ کہنے لگے اے لوط تم خوب جانتے ہو کہ وہ تمہاری بیٹیاں ہماری بیویاں نہیں ہیں اور ہم ان کے ساتھ نکاح کے بھی مستحق نہیں ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی کہ ہمیں ان کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

قَالَ لَوْ اَنَّ لِیْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِیْۤ اِلٰى رُكْنٍ شَدِیْدٍ ﴿۸۰﴾

"لوط نے (بصد حسرت) کہا اے کاش! میرے پاس بھی تمہارے مقابلہ کی قوت ہوتی یا میں پناہ ہی لے سکتا کسی مضبوط سہارے کی اور آپ جانتے ہیں کہ ہم مردوں سے برائی کرتے ہیں ۱؎۔"

۱؎ حضرت لوط نے انہیں فرمایا تم سے بچنے کی بدنی طاقت ہوتی تو میں اپنے نفس کو ضرور بچا لیتا یا میں کسی ایسے قومی معاشرہ کے ساتھ مل سکتا جس کے ذریعے میں تم سے اپنا دفاع کرتا تو میں ضرور ایسا کرتا لو کا جواب حذف ہے۔ معاشرہ کو شدت میں پہاڑ کی قوی جانب کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ قاموس میں ہے اَلرُّكْنُ بِالضَّمِّ الْجَانِبُ الْاَقْوٰی وَمَا تَقْوٰی بِہٖ مِنْ مَلِكٍ اَوْ جُنْدٍ وَغَیْرِہٖ وَالْعِزُّ وَالْمَنَعَۃُ (2) یعنی رکن بالضم کا مطلب طاقتور جانب ہے اور ہر وہ چیز ہے جس کے ذریعے تقویت حاصل ہو، خواہ وہ کسی بادشاہ یا لشکر کے ذریعے یا عزت وعظمت کے ذریعے ہو۔ صحیحین میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ میرے بھائی لوط پر رحم فرمائے، وہ کسی مضبوط سہارا کی پناہ لیتے تھے۔ ایک حدیث میں ہے اللہ تعالیٰ حضرت لوط کی مغفرت فرمائے، وہ مضبوط سہارا کی پناہ لیتے تھے۔ اسحاق اور ابن عساکر نے جویبر مقاتل عن الضحاک عن ابن عباسؓ کے طریق سے نقل کیا ہے اور امام بغوی نے بھی ان سے روایت کیا ہے کہ حضرت لوط نے اپنا دروازہ اور مہمانوں کا دروازہ بند کر لیا اور اب انہیں دروازے کے پیچھے سے دیکھ رہے تھے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 200 (الفکر) 2۔ القاموس المحیط، جلد 2، صفحہ 1579 (التراث العربی)

اوردوا سطے دے رہے تھے اور وہ دیوار پھلانگنے کے حیلے کر رہے تھے جب فرشتوں نے ان کی طرف سے حضرت لوط کی تکلیف دیکھی(1)۔

قَالُوْا يٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَّصِلُوْٓا اِلَيْكَ فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَ لَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ اِلَّا امْرَاَتَكَ ۭ اِنَّهٗ مُصِيْبُهَا مَآ اَصَابَهُمْ ۭ اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ ۭ اَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيْبٍ ﴿81﴾

"فرشتوں نے کہا اے لوط ہم آپ کے رب کے بھیجے ہوئے ہیں یہ لوگ آپ کو کوئی گزند نہ پہنچا سکیں گے [1] پس آپ لے کر نکل جایئے اپنے اہل وعیال کو جب [2] رات کا کچھ حصہ گزر جائے اور پیچھے مڑ کر تم میں سے کوئی نہ دیکھے مگر اپنی بیوی کو ساتھ نہ لے جایئے [3] بیشک وہی (عذاب) اسے بھی پہنچے گا جو ان (دوسرے مجرموں) کو پہنچا ان پر عذاب آنے کا مقررہ وقت صبح کا وقت ہے۔ کیا نہیں ہے صبح (بالکل) قریب [4]"

[1] فرشتے آپ کی پریشانی کو دیکھ کر کہنے لگے اے لوط آپ کا سہارا مضبوط ہے۔ یہ آپ کو کوئی تکلیف نہیں پہنچا سکتے۔ ہم تیرے رب کے فرستادہ فرشتے ہیں۔ دروازہ کھول دیجئے اور انہیں اور ہمیں اپنے حال پر چھوڑ دیجئے۔ حضرت لوط نے دروازہ کھولا تو وہ ناہنجار اندر داخل ہو گئے۔ حضرت جبرئیل نے اپنے رب سے ان کو سزا دینے کی اجازت طلب کی تو اللہ تعالیٰ نے اسے اجازت دے دی۔ پس جبرئیل امین اس حالت میں اٹھے جس پر پہلے تھے اور اپنے پروں کو پھیلایا۔ آپ کے اوپر ایک موتیوں سے مرصع چادر تھی۔ دانت انتہائی چمکدار تھے۔ پیشانی انتہائی روشن تھی۔ سر کے بال موتیوں کی طرح لہرلہر تھے۔ گویا وہ برف کی طرح سفید تھے اور دونوں پاؤں سبزہ تک تھے۔ آپ نے اپنے پر ان کے چہرے پر مارے تو ان کی آنکھیں ختم ہو گئیں اور انہیں اندھا کر دیا۔ پس وہ اپنے گھروں کا راستہ بھی بھول گئے۔ وہ نجانجا کی صدائیں دینے لگے اور پھر کہتے تھے لوط کے گھر جادوگر آئے ہیں۔ انہوں نے ہم پر جادو کر دیا ہے اور حضرت لوط کو دھمکیاں دیتے اے لوط تو ایسا ہے، تو ایسا ہے ذرا صبح ہونے دے، ہم آپ کا جو حشر کریں گے دیکھ لینا۔ وہ یہ دھمکیاں دے رہے تھے تو حضرت لوط نے کہا ان کی ہلاکت کا وقت کیا ہے؟ فرشتوں نے کہا صبح۔ آپ نے فرمایا میرا خیال تو جلدی کا ہے، اگر تم ابھی انہیں ہلاک کر دو تو بہتر ہے۔ فرشتوں نے کہا صبح قریب نہیں ہے(2)۔

[2] فرشتوں نے کہا اے لوط اپنے اہل کو لے کر چلو۔ حرمیون نے فاسروان اسر الف وصل کے ساتھ پڑھا ہے جہاں بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے اور انہوں نے اسے فعل مجرد سے مشتق کر کے پڑھا ہے۔ اس صورت میں باء تعدیہ کے لئے ہوگی۔ باقی قراء نے الف کو قطعی اور باب افعال سے مشتق بنایا ہے اور باء کو زائدہ بنایا ہے۔ اس کا مطلب رات کو چلنا ہے۔

[3] حضرت ابن عباس فرماتے ہیں اس کا معنی رات کا کچھ حصہ ہے۔ الضحاک فرماتے ہیں رات کا بقیہ حصہ ہے۔ قتادہ فرماتے ہیں اسکا رات کے ابتدائی حصہ گزر جانے کے بعد کا حصہ ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس سے مراد سحری کی ابتداء ہے(3)۔ ولا یلتفت منکم احد یعنی کوئی شخص جانے سے پیچھے نہ رہے، ورنہ وہ تجھ سے پیچھے رہ جائے گا۔ قاموس میں ہے لفتہ یلفتہ، جس کا معنی ہے اپنی رائے سے پھرنا اور لوٹنا ہے۔ اسی سے الالتفات اور التلفت ہے(4)۔ میں کہتا ہوں اس کا مجرد متعدی اور التفات لازم بمعنی انصراف استعمال

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 200 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 210 (التجاریہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 201 (التجاریہ)
4۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 257 (التراث العربی)

ہوتا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں لا یلتفت کا معنی ہے کہ وہ پیچھے نہ دیکھے۔ لے کر چلنے کا حکم حضرت لوط کو ہے اور مڑ کر یا پیچھے نہ دیکھنے کی نہی آپ کے پیروکاروں کو ہے۔

ابن کثیر اور ابو عمرو نے الا امراۃ کو مرفوع پڑھا ہے کیونکہ یہ احد کا بدل ہے اور یہ انصراف تخلف یا پیچھے دیکھنے کی نہی سے مستثنیٰ ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں اس قرأت پر آیت کا معنی یہ ہوگا کوئی پیچھے نہ دیکھے مگر تمہاری بیوی وہ پیچھے دیکھے گی اور ہلاک ہو جائے گی۔ حضرت لوط اپنے پورے گھرانے کو ساتھ لیکر چلے آپ کی بیوی بھی آپ کے ساتھ۔ آپ نے تمام ساتھیوں کو پیچھے دیکھنے سے منع فرمایا مگر اپنی بیوی کو یہ نہ بتایا۔ جب اس بدبخت بیوی نے عذاب کی آواز سنی تو مڑ کر دیکھا اور کہا ہائے میری قوم پس اسی لمحے ایک پتھر لگا اور اسے قتل کر دیا۔ اکثر قراء نے استثناء کی وجہ سے منصوب پڑھی ہے۔ پس علماء اور مفسرین کا اختلاف ہے، امام بغوی وغیرہ فرماتے ہیں یہ اسراء سے استثناء ہے، یعنی اے لوط اپنی بیوی کو ساتھ نہ لے جانا اور بقیہ تمام گھر والوں کو ساتھ لے جاؤ، اسے اپنی قوم میں چھوڑ کر جانا کیونکہ یہ اپنی قوم سے شغف رکھتی ہے۔ اس معنی کی تائید ابن مسعود کی قرأت فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ اِلَّا امْرَاَتَكَ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ کرتی ہے(1)۔ اس کلام کا مقتضیٰ یہ ہے کہ اپنے اہل کے ساتھ بیوی کو ساتھ لے جانے میں دو روایتیں ہیں 1۔ ایک یہ کہ آپ اسے دوسرے اہل کے ساتھ باہر لے گئے تھے۔ دوسرے تمام کو مڑ کر پیچھے نہ دیکھنے کا حکم کیا گیا تھا۔ مگر اسے یہ حکم نہ پہنچایا گیا تو اس نے عذاب کی آواز سنی تو مڑ کر دیکھا اور کہا یاقوماہ تو فوراً ہلاک ہوگئی۔ دوسری روایت یہ ہے کہ اسے ساتھ لے جانے کا حکم ہی نہیں تھا۔ چونکہ وہ قوم سے محبت رکھتی تھی اس لئے آپ اسے ساتھ نہ لے گئے۔ قرأتوں کا اختلاف روایتوں کے اختلاف کی وجہ ہے۔ صاحب مدارک نے اسی طرح لکھا ہے۔ لیکن یہ قول درست نہیں ہے کیونکہ دونوں روایتیں ایک دوسرے کی ضد ہیں، ان کا جمع کرنا ممکن ہی نہیں کیونکہ نکلنا اور نہ نکلنا ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ان میں سے ایک یقیناً باطل ہوگی اور دونوں قرأتیں قطعی ہیں اور قطعی روایتوں کو متناقض معانی پر محمول کرنا صحیح نہیں ہے۔ اسی وجہ سے امام بیضاوی فرماتے ہیں بہتر یہ ہے کہ دونوں قرأتوں کی صورت میں استثناء لا یلتفت منکم احد سے ہے اور اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا ارشاد مَا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِيْلٌ، وَاِلَّا قَلِيْلًا ہے دو قرأتوں پر۔ لیکن اس پر نحویوں کے مختار قول سے رد ہو جاتا ہے کیونکہ نحویوں کا مختار قول کلام غیر موجب میں بدل ہے، اگرچہ نصب بھی جائز ہے۔

پس اکثر قراء کی قرأت کو غیر افصح پر محمول کرنا غیر مناسب ہے امام بیضاوی اس کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں اکثر قراء کی قرأت کو غیر افصح پر محمول نہیں کیا گیا کیونکہ یہ فصیح قول ہے اور التفات سے نہی سے استثناء سے التفات کا امر لازم نہیں آتا بلکہ استصلاحاً اس کو نہی نہ کرنا لازم آتا ہے۔ اسی وجہ سے آگے استیناف کے طریقہ پر اس کی علت بھی بیان کردی ہے۔

میں کہتا ہوں کہ امام بیضاوی نے جو ابن مسعود کی قرأت کا محمل ذکر کیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان کا اپنا کلام ہے، وہ قرآن کی اپنے انداز میں تفسیر کر رہے ہیں، یعنی انہوں نے اہل سے استثناء کی ہے جیسا کہ اکثر مفسرین کی رائے ہے۔ میں کہتا ہوں نصب کی قرأت پر اس کا مستثنیٰ منقطع ہونا بھی جائز ہے کیونکہ لوط کی بیوی آپ کے اہل سے نہ تھی کیونکہ وہ کافرتھی کیونکہ اس کا عمل غیر صالح تھا۔ اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام کو بیٹے کے متعلق فرمایا اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ۔ پس لا یلتفت منکم احد کے قول میں مخاطبین میں شامل ہی نہیں ہے اور اگر رفع کی قرأت کا اعتبار کیا جائے تو وہ مخاطبین کے زمرہ میں شامل ہوگی اس اعتبار سے کہ اس کا حضرت لوط سے نکاح

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 201 (التجاریۃ)

کا تعلق تھا۔ پس دونوں اعتبار کے درمیان کوئی منافات نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں یہ کہنا بھی جائز ہے کہ اہل سے استثناء کی وجہ سے نصب کی قرأت ممکن ہے اور احد سے استثناء کی وجہ سے رفع کی قرأت ممکن ہے۔ پس دونوں کے درمیان کوئی منافات نہیں ہے۔ دونوں کی قرأتوں کی بنا۔ لوط کی بیوی کے خروج اور عدم خروج کی روایتوں پر نہیں ہے بلکہ دونوں قرأتوں کا معنی ہر روایت کے اعتبار سے صحیح ہے کیونکہ اہل سے استثناء کی صورت میں آیت کا معنی ہر روایت کے اعتبار سے صحیح ہے کیونکہ اہل سے استثناء کی صورت میں آیت کا معنی یہ ہوگا اپنے اہل کو ساتھ لے جانے پر مامور تھے سوائے اپنی بیوی کے۔ اس طرح ان کا خروج اور عدم خروج کا مسئلہ لازم ہی نہیں آتا۔ اس کا خروج کیسے ہو سکتا ہے۔ جبکہ وہ لوط کے ساتھ نکلنے پر مامور ہی نہ تھی اور حضرت لوط بھی اس کو ساتھ لے جانے پر مامور نہ تھے۔ اسی طرح اس کا عدم خروج بھی لازم نہیں آتا، اگرچہ حضرت لوط نے اسے نکلنے کا حکم نہ بھی دیا ہو اور التفات سے استثناء کی تقدیر پر التفات کی نہی حضرت لوط اور آپ کے متبعین کی طرف متوجہ ہوگی آپ کی بیوی کو یہ نہی ہوگی ہی نہیں، تو یہ نہی اس کے خروج یا عدم خروج کا تقاضا نہیں کرتی۔ پس مستثنیٰ مسکوت عنہ کے حکم میں ہوتا ہے۔ شاید وہ نکلی ہو اور متوجہ ہوئی ہو جیسا کہ روایت کیا گیا ہے شاید وہ بالکل نہ نکلی ہو اور اگر لوط علیہ السلام نے اسے نکلنے کا حکم دیا ہو اور وہ نہ نکلی ہو۔ شاید امام بیضاوی نے بھی میری توجیہ کی طرح سوچا ہے۔ اسی وجہ سے انہوں نے فرمایا دونوں قرأتوں میں استثناء التفات سے کرنا بہتر ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ یہ واجب ہے۔ واللہ اعلم

گویا یہ جملہ اسراء کے امر کی علت ہے، یعنی ان کی ہلاکت کا وقت صبح کا وقت ہے۔ حضرت لوط نے فرمایا میں تو اس سے جلدی ان کی ہلاکت چاہتا ہوں۔ فرشتوں نے کہا کیا صبح قریب نہیں ہے؟

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِیَهَا سَافِلَهَا وَ اَمْطَرْنَا عَلَیْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّیْلٍ ۙ۬ مَّنْضُوْدٍ ﴿۸۲﴾ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ ؕ وَ مَا هِیَ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ بِبَعِیْدٍ ﴿۸۳﴾

”پھر جب آپہنچا ہمارا حکم تو ہم نے کر دیا اس کی بلندی کو اس کی پستی ۱؎ اور ہم نے برسائے ان پر پتھر اور آگ میں پکے ہوئے پے در پے جو نشان زدہ تھے آپ کے رب کی جانب ۲؎ سے اور نہیں (لوط کی) بستی ظالموں سے کچھ دور ۳؎“

۱؎ یعنی جب ہمارا عذاب آ گیا یا ہم نے عذاب کا حکم دیا۔ تعذیب کو جعلنا عالیها سافلها کے قول کے ذریعے اللہ کی طرف سے مسبب بنایا گیا ہے۔ یعنی ملائکہ مامورین نے اس کی بلندی کو پستی میں بدل ڈالا۔ لیکن پست کرنے کی نسبت اپنی ذات کی طرف کی کیونکہ حقیقی مسبب اللہ تعالیٰ کی ذات خود ہے۔ یہ انداز اس لئے اپنایا تاکہ معاملہ کی بڑائی کا اظہار ہو۔ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت جبرئیل علیہ السلام نے اپنے پر قوم لوط کی بستیوں کے نیچے داخل کئے اور یہ پانچ بستیاں تھیں اور ان میں چار لاکھ افراد تھے اور بعض علماء فرماتے ہیں چار کروڑ تھے۔ حضرت جبرئیل نے تمام بستیوں کو اوپر اٹھایا حتی کہ آسمان والوں نے مرغ کی اذان اور کتوں کے بھونکنے کی آواز سن لی، نہ کوئی برتن الٹا اور نہ کوئی سونے والا بیدار ہوا۔ پھر آپ نے انہیں الٹا کر دیا اس کے اوپر کے حصہ کو نیچے اور نیچے والے کو اوپر کر دیا (1)۔ ابن جریر، ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے سعید بن جبیر سے اسی طرح روایت کیا ہے۔

۲؎ جو نوح کی بستی سے جدا بستیاں تھیں ان پر بھی۔ بعض علماء فرماتے ہیں ان کو الٹنے کے بعد ان پر پتھروں کی بارش برسائی۔ حجارۃ من سجیل ابن عباس اور سعید بن جبیر فرماتے ہیں یہ سنگ گل سے معرب ہے۔ قتادہ اور عکرمہ فرماتے ہیں سجیل سے مراد مٹی ہے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 201 (التجاریہ)

کیونکہ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں ہے لنرسل علیہم حجارۃ من طین۔ مجاہد فرماتے ہیں ان کی ابتداء پتھر اور آخر مٹی تھی۔ حضرت حسن فرماتے ہیں پتھروں کی اصل مٹی تھی پھر وہ پکائے گئے تھے۔ الضحاک فرماتے ہیں اس سے مراد پکی اینٹوں کے روڑے ہیں(1) بعض علماء فرماتے ہیں یا اسجل سے مشتق ہے جس کا معنی چھوڑ دینا اور عطا کرنا ہے۔ معنی یہ کہ وہ چھوڑی گئی چیز کی مثل تھے یا عطیہ کی مثل تھے کثرت میں یا یہ سجل سے مشتق ہے، یعنی جسے اللہ تعالیٰ نے لکھ دیا تھا کہ انہیں وہ اس کے ساتھ عذاب دے گا۔ بعض علماء فرماتے ہیں السجیل آسمان دنیا کا نام ہے۔ بعض فرماتے ہیں یہ آسمان میں پہاڑ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِيْهَا مِنْۢ بَرَدٍ۔ (اور اتارتا ہے اللہ تعالیٰ آسمان سے برف جو پہاڑوں کی طرح ہے)(2)

ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں یہ نضد سے مفعول کا صیغہ ہے جس کا معنی ہے کسی چیز کا ایک دوسرے کے اوپر رکھنا، یعنی اس کا معنی ہے کسی چیز کا متواتر ہونا(3) اور مسومۃ عند ربک۔ یہ حجارۃ سے حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور اس کا معنی نشان زدہ ہے۔ ابن جریج فرماتے ہیں ان پر علامت بنی ہوئی تھی جو زمین کے پتھروں سے مشابہت نہ رکھتے تھے۔ قتادہ اور عکرمہ فرماتے ہیں ان پتھروں پر سرخ خطوط تھے۔ حسن اور سدی فرماتے ہیں ان پر مہریں لگی ہوئی تھیں اور ہر پتھر پر اس شخص کا نام لکھا ہوا تھا جس کو اس نے قتل کرنا تھا(4)۔

وماھی میں ضمیر کا مرجع حجارۃ ہے من الظالمین سے مشرکین مکہ مراد ہیں۔ امام بغوی لکھتے ہیں حضرت قتادہ اور عکرمہ فرماتے ہیں الظالمین سے مراد اس امت کے ظالم ہیں(5)۔ ابن جریر، ابن ابی حاتم اور ابو الشیخ نے قتادہ سے روایت کیا ہے بعید کا معنی دور ہے۔ وہ ظالم اس لائق تھے کہ ان پر پتھروں کی بارش برسائی جاتی، قسم بخدا ان پتھروں سے اللہ تعالیٰ نے کسی ظالم کو نہ بچایا۔ امام بغوی لکھتے ہیں بعض آثار میں ہے کوئی ظالم ایسا نہیں ہے۔ مگر وہ ایک پتھر کے سامنے ہے جو اس پر کسی وقت گرے گا(6) امام بیضاوی فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے جبرئیل امین سے پوچھا تو اس نے کہا۔ آپ کی امت کا کوئی ظالم ایسا نہیں جس کے مقابلہ میں ایک پتھر نہ ہو اس پر کسی وقت ضرور گرے گا(7)۔ امام سیوطی فرماتے ہیں ثعلبی نے اس حدیث کو بغیر سند کے ذکر کیا ہے اور میں اس کی سند سے آگاہ نہیں ہوا۔ الدر المنثور میں ہے کہ ابن ابی حاتم اور ابو الشیخ نے ربیع سے اس آیت کے تحت ذکر کیا ہے کہ ہر ظالم کے مقابلہ میں ایک پتھر ہے جو انتظار میں ہوتا ہے کہ اسے کس وقت اس پر گرنے کا حکم ہوتا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں ماھی میں ضمیر کا مرجع وہ دیہات ہیں جو کہ مکہ کے ظالموں کے قریب ہیں، شام کی طرف سفر کرتے وقت ان کے اوپر سے گزرتے ہیں۔ انہیں اس خوفناک کھنڈرات سے عبرت حاصل کرنی چاہئے اور بعید کا مذکر ہونا حجر یا مکان کی تاویل کی وجہ سے ہے۔

وَ اِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ وَ لَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَ الْمِيْزَانَ اِنِّيْۤ اَرٰىكُمْ بِخَيْرٍ وَّ اِنِّيْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيْطٍ ﴿۸۴﴾

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 201 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 201 (التجاریہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 201 (التجاریہ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 202 (التجاریہ)
5۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 202 (التجاریہ)
6۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 202 (التجاریہ)
7۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد 3، صفحہ 251 (الفکر)

"اور اہل مدین کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیب کو بھیجا[1] آپ نے کہا اے میری قوم عبادت کرو اللہ تعالیٰ کی نہیں ہے تمہارا کوئی خدا اس کے بغیر اور نہ کمی کیا کرو ناپ اور تول میں[2] میں دیکھتا ہوں تمہیں کہ تم خوشحال ہو اور[3] میں ڈرتا ہوں کہ کہیں تم پر اس دن کا جواب نہ آ جائے جو ہر چیز کو گھیرنے والا ہے۔[4]"

[1] یا تو مراد مدین بن ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہے یا اہل مدین مراد ہیں۔ یہ ایک شہر ہے جسے مدین بن ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کیا تھا۔ اس لئے اس کا نام ہی مدین پڑ گیا۔ حضرت شعیب کو نسبی اعتبار سے بھائی کہا گیا ہے۔

[2] خطیب الانبیاء حضرت شعیب علیہ السلام نے سب سے پہلے توحید کا درس دیا جو پورے دین اسلام کی بنیاد ہے۔ پھر انہیں اس قبیح حرکت سے روکا جس کے وہ عادی ہو چکے تھے۔ یعنی ناپ تول میں کمی جو عدل کے منافی اور مقابلہ کی حکمت کے متضاد ہے۔

[3] انی کو نافع، البزی اور ابو عمرو نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ میں تمہیں معاشی اعتبار سے خوشحال دیکھتا ہوں(1)۔ تمہیں تو اس طرح لوگوں کے حقوق میں کمی کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے یا یہ معنی ہے کہ تم خوشحال ہو اللہ تعالیٰ نے تمہیں مال و دولت کی فراوانی عطا فرمائی ہے۔ حق تو یہ تھا کہ تم اس نعمت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے لوگوں پر احسان و مہربانی فرماتے نہ کہ ان کے حقوق پر ڈاکہ ڈالتے۔ مجاہد فرماتے ہیں آپ نے انہیں ڈرایا کہ اگر تم نے اس گھٹیا حرکت سے توبہ نہ کی تو یہ نعمت چھن جائے گی، قیمتیں بڑھ جائیں گی اور تم پر سزا کا دور شروع ہو جائے گا(2)۔

[4] وانی کو نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ مجھے تم پر ایسے عذاب کا اندیشہ ہے جو ہر چیز کو گھیر لے گا مجھے خوف ہے کہ وہ عذاب تمہیں بھی گھیرے گا اور تم تمام کو ہلاک کر دے گا، کوئی ایک بھی تم میں سے نہیں بچے گا۔ بعض نے محیط کا معنی مہلک لکھا ہے، یعنی ہلاک کرنے والا عذاب اور یہ احیط بثمرہ سے مشتق ہے اور عذاب سے قیامت کے دن کا عذاب ہے یا استیصال کا عذاب ہے۔ یوم کو احاطہ کے ساتھ موصوف کیا گیا ہے حالانکہ یہ عذاب کی صفت ہے کیونکہ وہ دن عذاب پر مشتمل ہوگا۔

وَيٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۸۵﴾

"اور اے میری قوم پورا کیا کرو ناپ اور تول کو انصاف کے ساتھ[1] اور نہ گھٹا کر دیا کرو لوگوں کو ان کی چیزیں اور نہ پھرو زمین میں فساد برپا کرتے ہوئے[2]"

[1] نہی کے بعد صراحتاً امر دیا جا رہا ہے۔ یہ اسلوب حکم میں مبالغہ کرنے اور اس بات پر تنبیہ کرنے کے لئے ہے کہ صرف ناپ تول میں کمی کا ارادہ ترک کافی نہیں بلکہ پورا پورا تولنے کی کوشش کرنا بھی ان پر لازم ہے، اگرچہ کچھ زیادتی کے ساتھ ہو مگر کمی نہیں ہونی چاہئے۔ اسی وجہ سے امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں جس نے کوئی کیلی چیز کیل کر کے یا وزنی چیز وزن کے ساتھ خریدے تو مشتری کے لئے آگے فروخت کرنا اور کھانا جائز نہیں ہے حتیٰ کہ دوبارہ کیل اور وزن کرلے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے کھانے کی بیع سے منع فرمایا ہے یہاں تک کہ اس میں دو صاع جاری ہو جائیں بائع کا صاع اور مشتری کا صاع(3)۔ اس حدیث کو ابن ماجہ اور اسحاق بن ابی شیبہ نے حضرت جابر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 202 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 202 (التجاریہ)
3۔ سنن ابن ماجہ، جلد 1، صفحہ 162 (وزارت تعلیم)

سے روایت کیا ہے۔ عبدالرحمن بن ابی حاتم نے علت بیان کی ہے۔ بزار نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اسی طرح روایت کی ہے۔ حضرت انس اور حضرت ابن عباس سے دو ضعیف طرق سے مروی ہے۔ ابن ہمام فرماتے ہیں یہ حدیث کثرت طرق کی وجہ سے اور ائمہ کی قبولیت کی وجہ سے حجت ہے۔ امام مالک، شافعی اور احمد نے بھی ہمارے قول کی موافقت کی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وزن کرو اور راجح کرو(1) کیونکہ ہم انبیاء کا گروہ اسی طرح وزن کرتے ہیں۔ اس حدیث کو احمد، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے روایت کر کے صحیح کہا ہے اور ابن حبان نے سوید بن قیس سے روایت کی ہے۔

ے تخصیص کے بعد تعمیم ہے کیونکہ یہ ہر قسم کی مقدار کو اور دوسری چیزوں میں کمی نہ کرنے کو شامل ہے۔ اسی طرح وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ ہے کیونکہ العثو حقوق کی کمی اور دوسرے فسادات تمام کو شامل ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں بخشش کا معنی کمی کرنا ہے جیسے معاملات کرتے وقت دسواں حصہ لے لینا اور عثو میں چوری، ڈاکہ اور غارت گری بھی شامل ہے۔ مُفْسِدِیْنَ۔ بعض علماء فرماتے ہیں مفسدین کے ذکر کا فائدہ یہ ہے کہ وہ افعال خارج کیے جائیں جو ظاہراً تو فساد ہوتے ہیں مگر ان سے اصلاح مقصود ہوتی ہے جیسے حضرت خضر علیہ السلام کا بچے کو قتل کرنا اور کشتی کو توڑنا وغیرہ۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ اپنے دینی معاملات اور آخرت کی مصالح کو ضائع کرتے ہوئے زمین میں نہ پھرو۔ یہ عامل کے معنی کے لئے حال مؤکدہ ہے کیونکہ عثی بمعنی افسد ہے۔

بَقِیَّتُ اللّٰهِ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۚ۬ وَ مَاۤ اَنَا عَلَیْكُمْ بِحَفِیْظٍ ﴿۸۶﴾

" جو بچ رہے اللہ تعالیٰ کے دیئے سے وہی بہتر ہے تمہارے لئے [1] اگر تم ایمان دار ہو [2] اور نہیں ہوں میں تم پر نگہبان [3] "

[1] حضرت ابن عباس فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ پورا پورا کیل اور وزن کرنے کے بعد حلال رزق اللہ کے دیئے ہوئے سے جو بچ جائے وہ اس سے بہتر ہے جو تم کم وزن اور کیل کے حاصل کرتے ہو۔ مجاہد فرماتے ہیں اس کا معنی اللہ کی اطاعت کرنا تمہارے لئے بہتر ہے(2)۔ اس کی مثال یہ ارشاد ہے وَالْبٰقِیٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَیْرٌ (باقی رہنے والے نیک اعمال بہتر ہیں)۔

[2] یعنی ان اعمال کی خیریت ایمان کے ساتھ مشروط ہے کیونکہ نیکیوں پر اجر صرف مومنین کو ہی حاصل ہوگا اور کافروں کے اعمال کو اللہ خالی ضائع کر دے گا اور بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ اگر تم میری بات کی تصدیق کرتے ہو تو جو تمہیں میں کیل اور وزن کے پورا کرنے کا حکم دیتا ہوں اس پر عمل کرو۔

[3] میں تمہیں برائی سے جبراً روکنے والا نہیں ہوں، یا یہ معنی ہے کہ میں تم پر تمہارے اعمال کا نگہبان نہیں کہ میں تمہیں ان پر جزا دوں بلکہ میرا کام تو فقط نصیحت کرنا اور تبلیغ کرنا ہے۔ جب میں نے تمہیں انجام بد سے ڈرا دیا ہے تو میں نے اپنا فرض منصبی پورا کر دیا ہے۔ یا یہ معنی ہے کہ اگر تم اپنے برے کرتوتوں کو ترک نہ کرو تو میں تم پر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے چھن جانے سے حفاظت کرنے والا نہیں ہوں۔

قَالُوْا یٰشُعَیْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَاۤ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِیْۤ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ؕ اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِیْمُ الرَّشِیْدُ ﴿۸۷﴾

1۔ سنن ابن ماجہ، جلد 1، صفحہ 161 (العلمیہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 203 (التجاریہ)

"قوم نے کہا اے شعیب! کیا تمہاری نماز تمہیں حکم دیتی ہے کہ ہم چھوڑ دیں انہیں جن کی عبادت کیا کرتے تھے ہمارے باپ دادا[1] یا نہ تصرف کریں اپنے مالوں میں جیسے ہم چاہیں[2] (از راہ تمسخر بولے) بس تم ہی ایک دانا (اور) نیک چلن رہ گئے ہو[3]۔"

[1] حمزہ اور کسائی اور حفص نے صلوٰۃ کو مفرد پڑھا ہے اور دوسرے قراء نے صلوٰۃ کو جمع پڑھا ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں حضرت شعیب علیہ السلام کثرت سے نماز پڑھتے تھے۔ اس لئے انہوں نے یہ بات کہی۔ اعمش فرماتے ہیں اس کا معنی ہے کہ تمہاری قرأت یہ حکم دیتی ہے(1)۔ یعنی کیا نماز تجھے حکم دیتی ہے کہ ہم ان بتوں کی عبادت ترک کر دیں جن کی عبادت ہمارے آباؤ اجداد کرتے تھے۔ یہاں مضاف کو حذف کیا گیا ہے۔ اس تقدیر کی وجہ یہ ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے کا فعل کا پابند نہیں کیا جاتا۔ انہیں توحید کا درس دیا تو انہوں نے استہزاء اور مزاح کے ساتھ جواب دیا اور نماز پر پھبتی کسی۔ اور وہ یہ شعور دینا چاہتے تھے کہ کوئی عقلمند داعی تو ایسی بات کی تبلیغ نہیں کرتا۔ شاید آپ جو اس طرح کی ہمیشہ عبادت و ریاضت میں مصروف رہتے ہیں۔ اس کی وجہ سے آپ کے دل میں خطرات و وساوس پیدا ہوتے ہیں جو تمہیں ایسی باتوں پر برانگیختہ کرتے ہیں (کہ ہم دولت و ثروت حاصل کریں اور اپنے آباؤ اجداد کے طریق عبادت کو بھی ترک کر دیں) آپ کثرت سے نماز ادا فرماتے تھے جیسا کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا۔ اسی وجہ سے انہوں نے لفظ صلوٰۃ جمع ذکر کیا اور ذکر میں بھی صرف نماز کو خاص کیا۔

[2] اس کا عطف موصول پر ہے، یعنی ہم اپنے اموال میں جو تصرف کرنا چاہتے ہیں وہ ترک کر دیں۔ یہ جملہ انہوں نے کم تولنے پر منع کرنے اور پوری پوری پیمائش کرنے کے جواب میں کہا ہے۔

[3] ابن عباس فرماتے ہیں یہ جملہ انہوں نے آپ کو سفیہ اور بے وقوف کہنے کے لئے کہا ہے۔ جیسا کہ عرب بعض اوقات کسی چیز کو اس کی ضد کے ساتھ متصف کرتے ہیں۔ جیسے سانپ کے ڈسے ہوئے شخص کو سلیم اور فلاۃ (صحرا) کو مفازۃ (کامیابی اور نجات) سے تعبیر کرتے ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں انہوں نے یہ بطور استہزاء کہا تھا(2) اور مراد ان صفات کی ضدیں لی تھیں۔ ان دونوں تاویلوں میں فرق یہ ہے کہ پہلی تاویل میں لفظ مجازی معنی میں استعمال ہوا ہے اور دوسری تاویل میں مذمت سے کنایہ کر کے استعمال ہوا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ تمہارے گمان میں فقط تو ہی دانا اور نیک چلن ہے۔ بعض فرماتے ہیں یہ کنایہ نہیں حقیقت پر محمول ہے۔ معنی یہ کہ ہم تو تمہیں بڑا دانا اور نیک سیرت شخص سمجھتے تھے۔ ہم تو یہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ آپ ایسی باتیں کرنا شروع کر دیں گے۔ جیسا کہ حضرت صالح علیہ السلام کی قوم نے کہا تھا قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ، یعنی اس سے پہلے تو ہم میں تم ہی ایک شخص تھے جس سے امیدیں وابستہ تھیں۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَرَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ؕ وَمَاۤ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَاۤ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ ؕ اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ؕ وَمَا تَوْفِيْقِيْۤ اِلَّا بِاللّٰهِ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ ۝۸۸

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 203 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 203 (التجاریہ)

''آپ نے کہا اے میری قوم! بھلا یہ تو بتاؤ اگر میں روشن دلیل پر ہوں اپنے رب کی طرف سے [1] اور اس نے عطا بھی کی ہو مجھے اپنی جناب سے عمدہ روزی [2] اور میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ خود تمہارے خلاف کرنے لگوں اس امر میں جس سے میں تمہیں روکتا ہوں [3] نیز نہیں چاہتا ہوں مگر (تمہاری) اصلاح (اور درستی) جہاں تک میرا بس ہے [4] اور نہیں میرا راہ پانا مگر اللہ تعالیٰ کی امداد سے [5] اسی پر میں نے بھروسہ کیا ہے اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں [6]''

[1] بَيِّنَة کا معنی بصیرت اور واضح بیان ہے، یعنی اپنے رب کی طرف سے وحی اور نبوت ملنے کی وجہ سے روشن دلیل پر ہوں۔

[2] وَرَزَقَنِي مِنْهُ میں ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے میری کاوش کے بغیر عطا ہوا ہے۔ یہ رزقاً سے حال ہے۔ مقدم اس لئے ہے کیونکہ ذوالحال نکرہ ہے۔ رزقاً حسناً سے مراد رزق حلال ہے۔ کہا جاتا ہے کہ شعیب علیہ السلام مالدار اور صاحب ثروت شخص تھے (1)۔ شرط کا جواب محذوف ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے کیا جائز ہے میرے لئے کہ اللہ تعالیٰ کی وحی میں خیانت کروں اور اس کے امر و نہی کی مخالفت کروں۔ آپ ان کی کڑی باتیں سن کر یہ کلام بطور اعتذار پیش کر رہے ہیں۔

[3] میں یہ تو نہیں چاہتا کہ میں خود اس فعل کا ارتکاب کروں جس سے میں تمہیں منع کرتا ہوں۔ اگر لوگوں کے حقوق غصب کرنے میں ثواب ہوتا تو میں کبھی اس کو نہ چھوڑتا لیکن میں جو اپنے لئے پسند کرتا ہوں تمہارے لئے بھی وہی پسند کرتا ہوں اور تمہارے لئے وہ ناپسند کرتا ہوں جو اپنے لئے ناپسند کرتا ہوں۔ کہا جاتا ہے خالفت زیداً الی کذا اب جب تو ایسی چیز کا قصد کرے جس کو وہ چھوڑ چکا ہے۔ خالفته عنه جب تو اس کام کو چھوڑے جس کو وہ کرنے والا ہے۔ ان ارید شرک سے روکنے ناپ تول میں کمی سے منع کرنے اور توحید کی تبلیغ کرنے اور پورا پورا عدل کے ساتھ وزن کرنے کے احکام سے میں نہیں چاہتا الا الاصلاح مگر تمہارے عقائد اور اعمال کی اصلاح اور عالم کو فساد سے خالی کرنا چاہتا ہوں۔

[4] ما مصدریہ ظرفیہ ہے، یعنی اصلاح کی مجھ میں جس وقت تک طاقت ہے اور جب تک میرے جسم میں جان ہے میں تمہاری اصلاح کی کوشش کرتا رہوں گا۔ یا ما موصولہ ہے اور الاصلاح سے بدل ہے یعنی اتنی مقدار جتنی میں طاقت رکھتا ہوں یا یہ معنی کہ جس چیز کی اصلاح کی میں طاقت رکھتا ہوں اس صورت میں مضاف محذوف ہوگا۔

[5] وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ میں نافع، ابو عمرو اور ابن عامر نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ توفیق کا مطلب اچھے مطلوب کے حصول کے لئے تمام اسباب مہیا کرنا ہے، یعنی جتنا میرے لئے حق اور صحیح بات پہنچانا ممکن ہوگا پہنچاؤں گا۔ مگر اس کی راہنمائی اور مدد سے۔

[6] میرا اسی پر ناقابل شکست بھروسہ ہے کیونکہ وہ قادر مطلق ہے اور ہر چیز پر قادر ہے اس کے علاوہ ہر ذات اپنی ذات کے اعتبار سے عاجز ہے بلکہ اس کے مقابلہ میں معدوم اور اعتبار کے درجہ سے ساقط ہے اس کلام میں خالص توحید کی طرف اشارہ ہے۔ مبدا کے اعتبار سے علم کے مراتب کی انتہاء ہے اور یہ صوفیاء کرام کے مقامات سے ایک مقام ہے اور ہر مشکل اور کٹھن میں اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

بعض علماء فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ آخرت میں میں اسی کی طرف رجوع کروں گا۔ یہ کلام فعل پر صلہ کے مقدم ہونے کی وجہ سے حصر کا فائدہ دے رہی ہے۔ انابت کا معنی یہ ہے کہ کسی کام کے کرنے یا چھوڑنے میں حق تک پہنچنے کے لئے اللہ تعالیٰ سے توفیق طلب کرنا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 203 (التجاریہ)

تمام بڑے اور چھوٹے امور میں اس سے استعانت طلب کرنا اور کلیۃً اس کی طرف متوجہ رہنا۔ حضرت شعیب کی اس کلام میں کفار پر امید کو ختم کرنا اور ان کے کسی دعوے اور دھمکی کی پروانہ کرنے کا اظہار کرنا ہے اور رجوع الی اللہ کے ذریعے ان کو جزائے بد سے ڈرانا ہے۔

وَيٰقَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِيْٓ اَنْ يُّصِيْبَكُمْ مِّثْلُ مَآ اَصَابَ قَوْمَ نُوْحٍ اَوْ قَوْمَ هُوْدٍ اَوْ قَوْمَ صٰلِحٍ ؕ وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ ﴿۸۹﴾

"اور اے میری قوم ہرگز نہ اکسائے تمہیں میری عداوت (اللہ کی نافرمانی پر) مبادا پہنچے تمہیں بھی ایسا عذاب جو پہنچا تھا قوم نوح یا قوم ہود یا قوم صالح کو [1] اور قوم لوط کو تم سے کچھ دور نہیں [2]"

[1] شِقَاقِيْٓ کو نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کیساتھ پڑھا ہے، یعنی میری مخالفت نہ اکسائے اللہ کی نافرمانی پر مبادا تمہیں عذاب پہنچے۔ جیسا کہ غرق کا عذاب پہنچا قوم نوح کو یا قوم ہود کو ہوا کا عذاب پہنچا اور قوم صالح یا قوم صالح کو چیخ اور جھٹکے کا عذاب پہنچا۔ ترکیب نحوی کے اعتبار سے ان یصیبکم یجرمنکم کا مفعول ثانی ہے کیونکہ یہ متعدی بیک مفعول اور متعدی بدو مفعول دونوں طرح کسب کی طرح استعمال ہوتا ہے۔

[2] زمانہ کے اعتبار سے قوم لوط تم سے دور نہیں ہے۔ ان کی ہلاکت تمہارے زمانے کے بالکل قریب ہے حتیٰ کہ انکے عذاب کو تم جانتے ہو، یا یہ معنی ہے کہ قوم لوط کے شہر اور گھر تم سے دور نہیں، وہ تمہارے پڑوسی تھے یا یہ معنی کہ کفر اور معاصی کی وجہ سے تم سے دور نہیں ہیں وہ تمہارے پڑوسی تھے یا یہ معنی کہ کفر اور معاصی کی وجہ سے تم جس عذاب کے مستحق ہو، اس میں قوم لوط تم سے زیادہ دور نہ تھی۔ بعید کو مفرد اس لئے ذکر فرمایا کیونکہ مراد وما اھلاکھم اوماھم بشیء بعید او ما مکانھم ببعید ہے۔ یعنی معنی کا اعتبار کرتے ہوئے بعید مفرد ذکر کیا۔ (اس کی توجیہ پہلے حضرت لوط کے واقع میں بھی گزر چکی ہے) بعض علماء فرماتے ہیں۔ القریب، البعید، القلیل اور الکثیر یہ تمام الفاظ الصہیل، النھیق وغیرہ مصادر کے وزن پر ہونے کی وجہ سے مذکر اور مونث دونوں کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔

وَاسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ؕ اِنَّ رَبِّيْ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ ﴿۹۰﴾

"اور مغفرت طلب کرو اپنے رب سے پھر (دل و جان سے) رجوع کرو اس کی طرف بیشک میرا رب بڑا مہربان (اور) پیار کرنے والا ہے۔ [1]"

[1] ایمان قبول کرنے، گناہوں پر شرمسار ہونے اور مغفرت طلب کرنے کے ساتھ اپنے پروردگار سے گزشتہ غلطیوں اور عصیان شعاریوں کی معافی طلب کرو اور دل و جان سے اس کی طرف لوٹو، مستقبل میں اطاعت شعاری اور نیاز مندی کا عہد کرو، بیشک میرا پروردگار توبہ کرنے والے مومنین پر حد درجہ مہربان ہے۔ ودود ود سے مبالغہ کا صیغہ ہے فاعل اور مفعول کے معنی میں استعمال ہوا ہے، یعنی وہ مومنین سے بہت زیادہ پیار کرنے والا ہے اور وہ اس کا محبوب ہے۔ یہ جملہ گناہوں کے اصرار پر وعید کے بعد توبہ پر بخشش کے وعدہ کو ظاہر کر رہا ہے۔

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ وَاِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا ۚ وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ ۫ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيْزٍ ﴿۹۱﴾

”وہ بولے اے شعیب ہم نہیں سمجھ سکتے بہت سی باتیں جو تو کہتا ہے [1] اور بلاشبہ ہم دیکھتے ہیں تجھے کہ تو ہم میں بہت کمزور ہے [2] اور اگر تمہارے کنبہ کا لحاظ نہ ہوتا تو ہم نے تمہیں سنگسار کر دیا ہوتا [3] اور نہیں ہو تم ہم پر غالب [4]“

[1] اے شعیب ہم نہیں سمجھ سکتے تمہاری اکثر باتیں جیسے اللہ ایک ہے۔ کم تولنا حرام ہے اور جو آپ نے اپنی ان باتوں پر دلائل قائم کئے ہیں وہ بھی ہماری سمجھ سے بالاتر ہیں۔ آپ کی قوم کا یہ قول حقیقت پر مبنی نہیں بلکہ وہ ان کی دانائی اور حکمت آمیز باتوں پر غور وفکر کی زحمت ہی گوارا نہ کرتے تھے۔ دوسرا یہ ان کی عقل کی کمزوری تھی ورنہ حضرت شعیب کی باتوں کی صداقت میں تو کوئی ابہام واسرار نہیں تھا۔ بعض علماء فرماتے ہیں ان کا یہ کہنا آپ کی کلام کی اہانت کے لئے تھا۔ یہ اس لئے کہ ان کو حضرت شعیب علیہ السلام سے انتہائی نفرت تھی۔ اس لئے وہ ان باتوں کی طرف اپنے ذہنوں کو متوجہ ہی نہ کرتے تھے۔ میں (مفسر) کہتا ہوں ان کو آپ کی باتیں واقعی سمجھ نہ آتی تھیں کیونکہ ان کے پیہم انکار اور نبی کی توہین اور بت پرستی پر اصرار کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی تھی۔ کیونکہ دل رحمٰن کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہیں۔ جیسے چاہتا ہے انہیں کسی چیز کی طرف راغب کر دیتا ہے اور کسی چیز سے ان کو پھیر دیتا ہے۔

[2] ہم دیکھتے ہیں کہ تمہاری کوئی طاقت نہیں ہے کہ اگر ہم تجھے تکلیف پہنچانے کا ارادہ کریں تو ہمیں روک سکے یا یہ معنی کہ ہم تمہیں ذلیل دیکھتے ہیں تمہاری معاشرے میں کوئی عزت ووقار نہیں ہے۔

امام بغوی فرماتے ہیں آپ کی بینائی کمزور تھی۔ انہوں نے ضعیف سے مراد ضعف بصارت لیا ہے (1)۔ بعض علماء فرماتے ہیں قبیلہ حمیر کی لغت میں الضعیف اندھے کو کہتے ہیں لیکن فینا ظرف کی قید اس معنی کو قبول نہیں کرتی۔

فائدہ: بعض معتزلہ کہتے ہیں کہ نبی نابینا نہیں ہو سکتا، وہ اسے قضاء اور شہادت پر قیاس کرتے ہیں مگر فرق ظاہر ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی بصارت کا چلا جانا نص قرآنی سے ثابت ہے وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيْمٌ وَقَالَ فَارْتَدَّ بَصِيْرًا۔ (اور سفید ہو گئیں ان کی دونوں آنکھیں غم کے باعث اور وہ اپنے غم کو ضبط کئے ہوئے تھے۔ اور کہا وہ فوراً بینا ہو گئے)

[3] یعنی اگر تمہاری قوم اور قبیلہ کا لحاظ نہ ہوتا تو ہم تجھے سنگسار کر دیتے۔ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت شعیب علیہ السلام کی حفاظت اپنی قوم کی وجہ سے تھی (2)۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں اس کا معنی ہے اگر ہمارے نزدیک تمہاری قوم کی عزت نہ ہوتی کیونکہ وہ ہمارے دین پر ہیں، ان کی شوکت ورعب کی وجہ سے نہیں تو ہم تجھے سنگسار کر دیتے کیونکہ رھط کا اطلاق تین سے دس افراد تک ہوتا ہے۔ بعض فرماتے ہیں سات تک ہوتا ہے (3)۔ میں کہتا ہوں پہلے قول کی تائید اللہ تعالیٰ کا ارشاد تسعة رھط کرتا ہے۔ الصحاح (لغت کی مشہور کتاب) میں ہے **الرھط العصابة دون العشرة**۔ ایسا جتھہ جس کی تعداد دس سے کم ہو۔ بعض فرماتے ہیں اس کا اطلاق چالیس تک ہوتا ہے النہایہ میں الجزری فرماتے ہیں مردوں کا وہ گروہ جو دس سے کم ہوں۔ بعض فرماتے ہیں چالیس تک کی تعداد پر رھط کا اطلاق ہوتا ہے جن میں عورت نہ ہو۔ قاموس میں ہے **الرھط قوم الرجل وقبيلة**۔ یعنی رھط انسان کی قوم اور قبیلہ کو کہتے ہیں۔ اس کا اطلاق تین سے سات تک یا دس تک یا دس سے کم تک ہوتا ہے جن میں عورت نہ ہو۔ لفظاً اس کا کوئی واحد نہیں ہے (4)۔ میں کہتا ہوں امام بغوی کی کلام سے بھی یہی مفہوم ملتا ہے کہ رھط سے مراد مطلقاً انسان کی قوم ہے جیسا کہ صاحب قاموس نے لکھا ہے۔ واللہ اعلم۔

[4] اور آپ کی ہم پر کوئی عزت نہیں کہ آپ کی عزت ہمیں سنگساری سے روک لے گی۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 204 (التجاریہ) — 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 204 (التجاریہ)

3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد 3، صفحہ 257 (الفکر) — 4۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 902 (التراث العربی)

نادانوں اور لایعنی لوگوں کا ہمیشہ یہی وطیرہ ہوتا ہے کہ وہ دلائل و براہین کے مقابلہ سب و شتم اور گالی گلوچ سے کرتے ہیں۔ ضمیر پر حرف نفی کا ذکر اس لئے ہے کہ کلام آپ کے متعلق ہے، آپ کی عزت کے ثبوت میں نہیں ہے اور ان کو ایذاء دینے سے مانع آپ کی قوم کی عزت تھی۔

قَالَ یٰقَوْمِ اَرَهْطِیْۤ اَعَزُّ عَلَیْكُمْ مِّنَ اللّٰهِؕ وَ اتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَآءَكُمْ ظِهْرِیًّاؕ اِنَّ رَبِّیْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِیْطٌ ﴿۹۲﴾

"آپ نے فرمایا اے میری قوم کیا میرا کنبہ زیادہ معزز ہے تمہارے نزدیک اللہ تعالیٰ سے اور تم نے ڈال دیا ہے اسے پس پشت بے شک میرا رب جو عمل تم کرتے ہو (اس کو اپنے علم سے) احاطہ کئے ہوئے ہے۔"

لہ اَرَهْطِیْۤ کو نافع، ابن کثیر، ابو عمرو اور ابن ذکوان نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور دوسرے قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ حضرت شعیب نے فرمایا تم مجھے اپنے قبیلہ کی وجہ سے قتل نہیں کرتے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے رسالت و نبوت حاصل ہے اور اس کا خیال نہیں کرتے اور اللہ تعالیٰ کو تم نے پس پشت ڈال دیا ہے جس کی دلیل یہ ہے کہ تم اس کا بتوں کو شریک ٹھہراتے ہو اور اس کے برگزیدہ رسول کی اہانت کرتے ہو۔ استفہام انکار، توبیخ اور رد و تکذیب کا احتمال رکھتا ہے۔ ظِهری ظہر کی طرف منسوب ہے اور کسرہ نسبتوں کی تبدیلیوں کی وجہ سے ہے۔

وَ یٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّیْ عَامِلٌؕ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَۙ مَنْ یَّاْتِیْهِ عَذَابٌ یُّخْزِیْهِ وَ مَنْ هُوَ كَاذِبٌؕ وَ ارْتَقِبُوْۤا اِنِّیْ مَعَكُمْ رَقِیْبٌ ﴿۹۳﴾

"اور اے میری قوم تم عمل کئے جاؤ اپنی جگہ پر اور میں (اپنے طور پر) عمل پیرا ہوں لہ تمہیں پتہ چل جائے گا کہ کس پر آتا ہے عذاب جو اسے رسوا کر دے گا اور کون جھوٹا ہے ۲ اور تم بھی انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والا ہوں ۳"

لہ تم اپنی قدرت و طاقت کے مطابق مجھ سے دشمنی کی روش پر چلتے رہو، میں تو تمہارا بھلا سوچتا رہوں گا اپنی استطاعت کے مطابق۔

۲ مَن استفہامیہ ہے اور تعلمون کے فعل سے معلق ہے، گویا یوں فرمایا تم جان لوگے کس پر عذاب آتا ہے جو مجھے یا تمہیں رسوا کر دے گا اور پتہ چل جائے گا کہ کون جھوٹا ہے۔ یا مَن موصولہ ہے اور تعلمون کا فعل اس کا عامل ہے گویا یوں فرمایا تم اس بدبخت کو جان لوگے جس پر عذاب آئے گا۔ اسی طرح کی آیت سورۂ انعام میں گزری چکی ہے لیکن وہاں اس بات کی صراحت کے لئے فا ذکر ہے کہ اصرار ان کے اس عذاب کا سبب ہے اور یہاں فا حذف ہے اور فرمایا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ۔ کیونکہ یہ ایک سائل کا جواب ہے، گویا اس کے بعد کیا ہوگا تو فرمایا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ۔ یہ کلام ہولناکی بیان کرنے میں زیادہ بلیغ ہے وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ۔ اس کا عطف مَنْ یَّاْتِیْهِ پر ہے اس لئے نہیں کہ یہ اس کا قسیم ہے بلکہ وہ چونکہ آپ کو دھمکیاں دیتے تھے اور آپ کو جھٹلاتے تھے تو فرمایا جان لوگے کہ عذاب کسے ملتا ہے اور جھوٹا کون ہے میں یا تم۔ بعض علماء فرماتے ہیں قیاس کا تقاضا تو یہ تھا کہ یہاں مَنْ هُوَ كَاذِبٌ ہونا چاہئے تھا تاکہ مَنْ یَّاْتِیْهِ کا قول ان کی طرف اور یہ قول آپ کی طرف لوٹتا۔ لیکن چونکہ وہ آپ کو کاذب کہتے تھے۔ اس لئے ان کے گمان پر فرمایا مَنْ هُوَ كَاذِبٌ۔ بعض علماء فرماتے ہیں مَن کا محل رفع ہے تقدیر کلام یوں ہوگی و من هو كاذب يعلم سوء عاقبة یعنی جو جھوٹا ہوگا وہ اپنا برا انجام جان لے گا۔

۳ اپنے برے انجام کا اور جو میں تمہیں کہتا ہوں اس کا انتظار کرو اِنِّیْ مَعَكُمْ رَقِیْبٌ میں تمہارے ساتھ انتظار کرنے والا ہوں۔ رقیب بمعنی

راقب ہے جیسے صریم بمعنی صارم ہوتا ہے یا بمعنی مراقب ہے جیسے عشیر بمعنی معاشر ہوتا ہے یا بمعنی مرتقب ہے جیسے رفیع بمعنی مرتفع ہوتا ہے۔

وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّیْنَا شُعَیْبًا وَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَ اَخَذَتِ الَّذِیْنَ ظَلَمُوا الصَّیْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دِیَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ ﴿۹۴﴾

"اور جب آ پہنچا ہمارا حکم (یعنی عذاب) [۱] تو ہم نے بچالیا شعیب کو اور انہیں جو ایمان لائے تھے آپ کے ساتھ اپنی خاص رحمت سے اور آلیا ظالموں کو خوفناک کڑک نے تو صبح کی انہوں نے اپنے گھروں میں اس حال میں کہ وہ گھٹنوں کے بل گر پڑے تھے [۲]"

[۱] یہاں عذاب کے ذکر کو واؤ کے ساتھ ذکر فرمایا جیسا کہ قوم عاد کے قصہ میں تھا کیونکہ اس سے پہلے وعدہ کا ذکر نہیں ہے جس کے سبب کے قائم مقام رکھا جاتا بخلاف صالح اور لوط علیہما السلام کے قصوں کے کہ وہ وعدہ کے ساتھ ذکر کیے گئے ہیں وہ ارشاد یہ ہیں وعد غیر مکذوب اور ان موعدهم الصبح اس لئے وہاں فاء سببیہ کے ساتھ اس کا ذکر کیا۔

[۲] بعض علماء نے لکھا ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے زوردار چیخ ماری تو ان کی روحیں نکل گئیں بعض فرماتے ہیں آسمان سے ایک چیخ آئی اور اس نے انہیں ہلاک کر دیا۔ جاثمین کا معنی میتین۔ یعنی مرے پڑے تھے الجثوم کا اصل معنی کسی مکان کو لازم پکڑنا ہے۔

كَاَنْ لَّمْ یَغْنَوْا فِیْهَا ؕ اَلَا بُعْدًا لِّمَدْیَنَ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُوْدُ ﴿۹۵﴾

"گویا کبھی وہ ان میں بسے ہی نہ تھے [۱] سنو! ہلاکت ہو مدین کے لئے جیسے ہلاک ہو چکے تھے ثمود [۲]"

[۱] گویا کبھی وہ یہاں زندہ ہو کر ٹھہرے ہی نہیں کبھی انہوں نے ان میں کوئی تصرف ہی نہیں کیا۔ کبھی ان میں گھومے پھرے ہی نہیں۔

[۲] ان کو قوم ثمود سے تشبیہ دی کیونکہ ان کا عذاب بھی سخت کڑک کے ساتھ تھا۔ صرف فرق اتنا تھا کہ ان کی کڑک کے نیچے سے اور ان کی کڑک اوپر سے آئی تھی۔ بَعِدَتْ کی اصل بَعُدَتْ بضم العین ہے اور کسرہ بعد کے اس معنی کی تخصیص کے لئے ہے جو ہلاکت کا سبب ہوتا ہے اور البعد بضم الباء دونوں فعلوں کا مصدر ہے اور الباء اور العین کے فتحہ کے ساتھ ہو تو بعد بکسر العین کا مصدر ہوتا ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰیٰتِنَا وَ سُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ ﴿۹۶﴾

"اور بے شک ہم نے بھیجا موسیٰ کو اپنی نشانیوں اور صریح غلبہ کے ساتھ [۱]"

[۱] آیات سے مراد معجزات ہیں تورات کی آیات مراد نہیں کیونکہ تورات فرعون کی ہلاکت کے بعد نازل ہوئی تھی۔ وَسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ سے مراد ظاہری غلبہ ہے جس کے ساتھ آپ تنہا ہونے کے باوجود فرعون اور لشکریوں پر غالب آئے تھے اور فرعون آپ کی ہلاکت کے ارادہ کے باوجود آپ پر قادر نہ ہوا۔ بعض علماء فرماتے ہیں سلطان مبین سے مراد آپ کا عصا ہے۔ اگرچہ یہ بھی آیات میں شامل تھا مگر اس کا علیحدہ ذکر اس لئے فرمایا کیونکہ اس کا غلبہ بہت عیاں تھا۔ یہ بھی جائز ہے کہ آیات اور سلطان مبین دونوں سے ایک مراد ہو۔ یعنی ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو بھیجا کہ آپ کے پاس ہماری نشانیاں بھی تھیں اور نبوت پر دلیل بھی جو خود بڑی واضح تھی یا آپ کی نبوت کو واضح کرنے والی تھی ابان کا فعل لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ آیت اور سلطان میں فرق یہ ہے کہ آیت علامت اور دلیل قطعی کے لئے عام ہے اور سلطان دلیل قطعی کے ساتھ خاص ہے اور مبین اس کے لئے جس میں چمک اور روشنی ہو۔

اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَاۡىِٕهٖ فَاتَّبَعُوْۤا اَمْرَ فِرْعَوْنَ ۚ وَ مَاۤ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِیْدٍ ﴿۹۷﴾

"فرعون اور اس کے درباریوں کی طرف تو انہوں نے پیروی کی فرعون کے حکم کی اور فرعون کا حکم بالکل غلط تھا ¹۔"

¹۔ انہوں نے کفر سرکشی اور گمراہی میں منہمک ہوتے میں فرعون کے حکم کی پیروی کی۔ جبکہ فرعون کا حکم کوئی قابل تعریف نہ تھا۔ نری گمراہی تھا۔ رشد ہر اس کام کے لئے استعمال ہوتا ہے جو محمود اور پسندیدہ ہو اور یہ غی کی ضد ہے اور غی ہر اس کام کے لئے استعمال ہوتا ہے جو قابل مذمت اور ناپسندیدہ ہو۔ اس کلام میں فرعون کے پیروکاروں کی جہالت اور احمقانہ پن کا اظہار ہے کہ وہ اس شخص کی پیروی کرتے رہے جس کا ہر حکم بالکل باطل اور عقل دانش کے خلاف تھا۔ مثلاً اس نے خدائی کا دعویٰ کیا (اور یہ تسلیم کرتے رہے) حالانکہ وہ بھی ان جیسا انسان تھا اور وہ ببانگ دہل شرک، کفر اور ظلم کرتا تھا لیکن یہ پھر بھی اس کی اطاعت میں مگن رہے۔ اس نے موسیٰ علیہ السلام کی متابعت کو ترک کر دیا حالانکہ آپ معجزات باہرہ اور عقل ونقل کی تائید کے ساتھ ہدایت دینے والے تھے (مگر یہ عقل کے دشمن موسیٰ کلیم کی اطاعت چھوڑ کر فرعون کے سامنے سر تسلیم خم کیے رہے)

يَقْدُمُ قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ ؕ وَ بِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ ﴿۹۸﴾

"وہ ایسی قوم کے آگے آگے ہوگا روز قیامت اور لا ڈالے گا انہیں آتش (جہنم) میں بہت بری داخل ہونے کی جگہ ہے جہاں انہیں داخل کیا جائے گا ¹۔"

¹۔ قدم بمعنی تقدم ہے۔ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ جس طرح دنیا میں وہ گمراہی میں انکی قیادت کرتا تھا آگ میں بھی ان کی قیادت کرے گا فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ کے جملہ میں تحقق میں مبالغہ کے لئے ماضی کا صیغہ ذکر فرمایا اور ان کے لئے آگ کو پانی کے قائم مقام بنایا۔ اسی وجہ سے آگ پر آنے کو ورود اسے تعبیر فرمایا۔ وَ بِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ۔ یعنی اس پر ورود بہت برا ہے کیونکہ اترا جاتا ہے جگر کو ٹھنڈا کرنے اور پیاس بجھانے کے لئے اور آگ میں اس کے خلاف ہوتا ہے یہ آیت وما امر فرعون برشید کے ارشاد پر دلیل کی طرح ہے کیونکہ جس کا یہ انجام ہو اس کا حکم رشد وہدایت یا اس قول کی تفسیر ہے، جبکہ رشد سے مراد وہ جس کا انجام بہتر اور محفوظ ہو۔

وَ اُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهٖ لَعْنَةً وَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ ﴿۹۹﴾

"اور ان پر بھیجی جاتی رہیں گی اس دنیا میں لعنت اور قیامت کے دن بھی بہت ¹۔ برا عطیہ ہے جو انہیں دیا جائے گا ²۔"

¹۔ یعنی اس دنیا میں انبیاء اور مومنین کی زبانوں کے ذریعے ان نابکاروں پر لعنت کی گئی اور قیامت کے روز بھی ان پر لعنت بھیجی جائے گی۔

²۔ بِئْسَ بالخصوص بالذم اللعنة محذوف ہے، یعنی وہ مدد جو انکی کی گئی یا وہ بخشش جو ان کی عطا کی گئی وہ بہت بری ہے۔ رفد کا اصل معنی وہ چیز ہے جو کسی چیز کی مدد کے لئے اس کے ساتھ ملائی جاتی ہے۔ قاموس میں ارفاد کا معنی اعانت اور عطا کرنا ہے(1)۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ مِنْهَا قَآئِمٌ وَّ حَصِيْدٌ ﴿۱۰۰﴾

"یہ ان بستیوں کی بعض خبریں ہیں جو ہم بیان کر رہے ہیں ¹۔ آپ سے ان میں سے کچھ ہیں اور کچھ کٹ گئی ہیں ²۔"

¹۔ یہ مبتدا ہے اور اس کا مابعد اس کی خبر ہے۔ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى سے مراد ہلاک شدہ دیہاتوں کی اخبار میں سے بعض ہیں نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ۔ یہ ذلک کی خبر ثانی ہے۔

²۔ ان تباہ شدہ بستیوں میں سے کچھ کے نشانات باقی ہیں اور کچھ ایسی بستیاں ہیں جس کی تباہی کا کوئی اثر باقی نہیں ہے جیسا کہ کٹی

1۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 414 (التراث العربی)

ہوئی کھیتی ہوتی ہے۔ مقاتل فرماتے ہیں قائم جس کا کوئی نشان باقی ہو اور حصید جس کا کوئی نشان باقی نہ ہو (1)۔ بعض علماء فرماتے ہیں قائم کا معنی آباد اور حصید کا معنی خراب ہے۔ یہ جملہ مستقل کلام ہے قصہ کی ضمیر سے حال نہیں ہے کیونکہ واؤ اور ضمیر کا کوئی رابطہ موجود نہیں ہے۔

وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَمَآ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِیْ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ لَّمَّا جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ؕ وَمَا زَادُوْهُمْ غَیْرَ تَتْبِیْبٍ ۝

''اور نہیں ظلم کیا ہم نے ان پر بلکہ انہوں نے خود زیادتی کی تھی اپنی جانوں پر پس نہ فائدہ پہنچایا انہیں ان کے جھوٹے (خداؤں) نے جن کی وہ عبادت کیا کرتے تھے اللہ تعالیٰ کے سوا کچھ بھی جب آ گیا حکم آپ کے رب کا۔ ان دیوتاؤں نے تو فقط ان کی بربادی میں ہی اضافہ کیا لے''

لے وَظَلَمْنٰهُمْ میں ھم ضمیر کا مرجع قری (بستیاں) ہیں اور مراد بستیوں والے ہیں، یعنی ہم نے انہیں ہلاک کر کے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ انہوں نے خود کفر اور گناہوں کا ارتکاب کر کے اپنے اوپر یہ ظلم ڈھایا۔ پس ان کے بے بس خداؤں نے انہیں کوئی نفع نہ پہنچایا اور نہ وہ ایسے عذاب دور کرنے کی قدرت رکھتے تھے۔ پھر جب تمہارے رب کے عذاب کا حکم نامہ آ پہنچا تو سوائے خسارے اور تباہی کے ان بتوں نے کچھ اضافہ نہ کیا۔

وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَاۤ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِیَ ظَالِمَةٌ ؕ اِنَّ اَخْذَهٗۤ اَلِیْمٌ شَدِیْدٌ ۝

''اور یونہی گرفت ہوتی ہے آپ کے رب لے کی جب وہ پکڑتا ہے بستیوں کو درآں حالیکہ وہ ظالم ہوتی ہیں ہے بیشک اس کی پکڑ بڑی دردناک اور سخت ہوتی ہے سے''

لے اَخْذُ رَبِّكَ مبتدا ہے اور كَذٰلِكَ اس کا خبر مقدم ہے۔

ہے وَهِیَ ظَالِمَةٌ۔ یہ القری سے حال ہے۔ حقیقت میں بستیوں والے ظالم تھے لیکن جب مضاف الیہ کو مضاف کی جگہ رکھا گیا تو دوسرے صیغے بھی اسی کے مطابق ذکر کیے گئے۔ حالیہ جملہ کے ذکر کا مفاد یہ ہے کہ ان کی پکڑ ان کے ظلم کی وجہ سے تھی۔

سے اس کی پکڑ ایسی تکلیف دہ ہے کہ اس سے خلاصی ممکن نہیں۔ حضرت ابوموسیٰ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ ظالم کو مہلت دیتا ہے حتیٰ کہ جب اسے پکڑتا ہے تو پھر اسے چھوڑتا نہیں۔ راوی فرماتے ہیں پھر آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھی كَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَاۤ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِیَ ظَالِمَةٌ (2)۔ اس حدیث کو بخاری، مسلم، ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْاٰخِرَةِ ؕ ذٰلِكَ یَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ ۙ لَّهُ النَّاسُ وَ ذٰلِكَ یَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ ۝

''بیشک ان واقعات میں (عبرت کی) نشانی ہے اس کے لیے جو ڈرتا ہے عذاب آخرت سے لے یہ وہ دن ہے ہے جس دن اکھٹے کیے جائیں گے سب لوگ اور یہ وہ دن ہے جب سب کو حاضر کیا جائے گا۔ سے''

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 205 (التجاریۃ) 2۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 678 (وزارت تعلیم)

۱۔ ان ہلاک شدہ بستیوں کے متعلق جو کچھ نازل ہوا اور جو اللہ تعالیٰ نے آپ پر بیان کیا ہے اس میں عبرت اموزی کے نشان موجود ہیں لیکن یہ واقعات اس کے لیے عبرت ہیں جو آخرت کے عذاب سے ڈرتا ہے اور جانتا ہے کہ جو ان بستیوں پر عذاب نازل ہوا وہ ایک مثال ہے اس عذاب کی جو اللہ تعالیٰ نے مجرمین کے لئے تیار کر رکھا ہے۔ یا یہ معنی ہے کہ یہ واقعات اسے گناہوں سے باز رکھتے ہیں جو جانتا ہے کہ یہ عذاب ایک مختار خدا کی طرف سے آیا ہے۔ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَرْحَمُ مَنْ يَّشَآءُ جسے چاہتا ہے عذاب دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے اس پر رحم فرماتا ہے اور جو آخرت کا منکر ہے وہ ڈھور ڈنگروں کی مانند ہے، نہ اس کے پاس بصارت ہے نہ بصیرت، وہ ان واقعات کو عبرت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا بلکہ وہ انہیں اتفاقی حادثات سمجھتا ہے۔

۲۔ ذالک۔ کا مشار الیہ یوم قیامت ہے جس پر عذاب الاخرۃ دلالت کر رہا ہے۔

۳۔ یعنی محاسبہ اور جزاء کے لئے اس میں جمع ہوں گے۔ عبارت کی تبدیلی اس دن جمع کے معنی کے ثبات پر دلالت کرنے کے لئے ہے اور اس دن کی یہ شان ہے کہ لوگ ضرور اس میں جمع ہوں گے۔

۴۔ اس دن گواہ لوگوں پر گواہی دیں گے یا یہ معنی کہ اس دن تمام موقف میں حاضر ہوں گے کوئی بھی غائب نہ ہوگا۔ ظرف کے مفعول کے قائم مقام رکھ کر وسعت پیدا کی گئی ہے۔

وَمَا نُؤَخِّرُهٗۤ اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ ﴿۱۰۴﴾

''اور ہم نے نہیں موخر کیا ہے اسے مگر ایک مقررہ مدت تک جو گنی ہوئی ہے۔ ۱۔''

۱۔ یعنی اس دن کو موخر نہیں کیا۔ یعقوب نے یؤخر غائب کا صیغہ پڑھا ہے یعنی اللہ نے موخر نہیں فرمایا ہے مگر اس مدت کو پورا کرنے کیلئے جو اللہ تعالیٰ کے ہاں معلوم ہے۔ مضاف محذوف ہے اور اجل سے تاخیر کی مدت مراد ہے، اس کی انتہا مراد نہیں کیونکہ اس میں تعدد نہیں ہے۔

يَوْمَ يَاْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَّسَعِيْدٌ ﴿۱۰۵﴾

''جب وہ دن آئے گا (تو اس کی ہیبت سے) کوئی شخص نہیں بول سکے گا بجز اس کی اجازت کے ۱۔ بعض ان میں سے بدنصیب ہوں گے اور بعض خوش نصیب۔ ۲۔''

۱۔ یعنی جزاء کا دن آئے گا یا وہ دن آئے گا۔ یہ دوسرا معنی تب ہوگا جب یوم بمعنی حین ہو یا یات کا فاعل جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّاۤ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ رَبُّكَ۔ ابن عامر، عاصم اور حمزہ نے یات کو یاء کے حذف کے ساتھ پڑھا ہے اور کسرہ کو یاء کے قائم مقام کیا ہے اور نافع، ابو عمرو اور کسائی نے اصل پر یاء کے ساتھ پڑھا ہے اور ابن کثیر نے دونوں حالتوں میں پڑھا ہے، ظرف اذکر کے متعلق ہے۔ یا لا تکلم کے متعلق ہے۔ لا تکلم اصل میں لا تتکلم تھا۔ نفس یعنی کوئی شخص ایسی کلام نہیں کر سکے گا جو نفع بخش اور جواب دہی سے نجات دے، یا یہ مطلب ہے کہ کوئی نفس شفاعت نہ کرے گا مگر اللہ کے اذن و اجازت سے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لَا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ (کوئی نہ بول سکے گا بجز اس کے جس کو رحمٰن اذن دے)۔

۲۔ فَمِنْهُمْ میں ضمیر اہل موقف کے لئے ہے جس پر لا تکلم نفس دلالت کر رہا ہے یا ضمیر کا مرجع یوم مجموع له الناس کے ارشاد میں الناس ہے۔ شقی جس کے نوشتہ تقدیر میں شقاوت لکھی گئی ہے و سعید جس کے لئے سعادت لکھی گئی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں ہم ایک جنازہ پر گئے۔ ہم بقیع میں تھے کہ رسول اللہ ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے، آپ ﷺ کے ہاتھ میں ایک

لکڑی تھی، آپ آئے تو بیٹھ گئے اور اس لکڑی کے ساتھ کچھ لمحہ زمین کریدتے رہے۔ پھر فرمایا ہر نفس کا جنت یا دوزخ میں ٹھکانا لکھا جا چکا ہے۔ ہر نفس کا بدبخت یا سعادت مند ہونا لکھا جا چکا ہے۔ حضرت علی فرماتے ہیں ایک شخص نے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ! پھر ہم اپنے نوشتہ تقدیر پر بھروسہ کرتے ہوئے عمل چھوڑ کیوں نہ دیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا نہیں لیکن عمل کرو، ہر ایک کو اس کے لکھے ہوئے کے مطابق میسر آئے گا۔ اہل شقاوت کو اہل شقاوت کے اعمال میسر آئیں گے اور اہل سعادت کو اہل سعادت کے عمل کی توفیق ہوگی۔ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھی فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ۝ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۝ پھر جس نے (راہ خدا میں) اپنا مال دیا اور (اس سے) ڈرتا رہا اور (جس نے) اچھی بات کی تصدیق کی (1)۔ اس حدیث کو امام بغوی نے روایت کیا ہے اور صحیحین میں بھی اسی طرح ہے۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّشَهِيْقٌ ۝

"سو وہ جو بدنصیب ہیں وہ آگ میں ہوں گے ان کے (مقدر میں) وہاں چیخنا اور چلانا ہوگا[1]۔"

[1] ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں زفیر سخت آواز کو کہتے ہیں اور الشہیق پست آواز کو کہتے ہیں۔ الضحاک اور مقاتل فرماتے ہیں الزفیر گدھے کے ہینگنے کی ابتدا اور الشہیق اس کا آخر ہے جب وہ اسے اپنے اندر لوٹاتا ہے (2) قاموس میں اسی طرح ہے۔ ابو العالیہ فرماتے ہیں زفیر حلق کی آواز اور شہیق سینے کی آواز ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں زفیر سانس کا نکالنا اور شہیق اس کا واپس لوٹانا ہے اور ان کا دونوں کا استعمال گدھے کے ہینگنے کی ابتدائی اور آخری آواز کے لئے ہوتا ہے (3) قاموس میں ہے زفر یزفر زفراً و زفیراً اس نے سانس کھینچنے کے بعد باہر نکالا۔ یہ جملہ حال واقع ہو رہا ہے اور اس کا عامل ظرف مستقر ہے۔

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ۭ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ۝

"وہ دوزخ میں رہیں گے جب تک آسمان اور زمین قائم ہیں[1]۔ مگر جتنا چاہے آپ کا پروردگار بیشک آپ کو مرتبہ کمال تک پہنچانے والا کرتا ہے جو چاہتا ہے[2]۔"

[1] الضحاک فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک جنت اور دوزخ کے آسمان اور زمین باقی رہیں گے۔ جو چیز تجھ سے بلند ہے وہ سماء ہے اور ہر وہ چیز جس پر تیرا قدم قرار پذیر ہے ارض ہے۔ اس میں شک نہیں کہ لوگوں کا اجتماع جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے دلالت کرتا ہے۔ لوگوں کے لئے کوئی سائبان اور قدم رکھنے کی جگہ بھی ہوگی۔ اہل المعانی اس عبادت سے ہمیشگی اور دوام مراد لیتے ہیں جیسا کہ عرب کہتے ہیں لَا اٰتِيْكَ مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ یعنی اس سے مراد ابدیت لیتے ہیں۔

[2] اس آیت کا ظاہر اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ وہ آگ میں ہمیشہ نہ رہیں گے۔ اور اس کی تائید حضرت ابن مسعود کی روایت کرتی ہے کہ جہنم پر ایک ایسا زمانہ گزرے گا جب اس میں کوئی شخص بھی نہ ہوگا اور کفار کے کئی احقاب ٹھہرنے کے بعد ہوگا۔ حضرت ابو ھریرہؓ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ شیخ محی الدین ابن عربی کو جو صوفیاء میں سے ہیں وہ بھی یہی فرماتے ہیں لیکن یہ قول اجماع اور نصوص کی وجہ سے مردود ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فِي الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ۔ الطبرانی، ابو نعیم اور ابن مردویہ نے حضرت ابن مسعود سے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 206 (التجاریۃ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 206 (التجاریۃ)
3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد 3، صفحہ 262 (الفکر)

روایت کیا ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر دوزخیوں کو کہا جائے کہ تم کنکریوں کی تعداد میں دوزخ میں رہو گے تو وہ خوش ہوں گے اور اگر جنتیوں کو کہا جائے کہ تم کنکریوں کی تعداد میں جنت میں رہو گے تو وہ پریشان ہوں گے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے دوزخیوں کو ہمیشہ دوزخ میں اور جنتیوں کو ہمیشہ جنت میں رکھنا مقدر فرمایا ہے(1)۔ الطبرانی نے الکبیر میں اور حاکم نے معاذ بن جبل سے روایت کیا ہے اور حاکم نے اس کی تصحیح بھی کی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں یمن کی طرف بھیجا۔ جب وہ یمنیوں کے پاس پہنچے تو لوگوں سے فرمایا اے لوگوں میں رسول اللہ ﷺ کا فرستادہ ہوں، وہ تمہیں خبر دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جنت اور دوزخ کی طرف لوٹنا ہے اور انہیں ہمیشہ رہنا ہے بغیر موت کے، وہاں اقامت ہے بغیر سفر کے، جسموں میں موت طاری نہ ہوگی(2)۔ شیخان نے ابن عمر سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جنتی جنت میں اور دوزخی دوزخ میں داخل ہوں گے۔ پھر ایک اعلان کرنے والا کھڑا ہوگا اور کہے اے دوزخیوں اب مرنا نہیں ہے۔ اے جنتیو! اب موت نہیں ہے، جو کوئی جہاں ہے اس میں ہمیشہ رہے گا(3)۔ بخاری نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے جنتیو! تم نے ہمیشہ رہنا ہے موت نہ ہوگی(4)۔ اے دوزخیوں تم نے ہمیشہ رہنا ہے موت نہ ہوگی۔ جب جنتیوں کو نہ مرنے کا مژدہ اور دوزخیوں کو نہ مرنے کی خبر سنا دی جائے گی تو ندا اور موت کو ذبح کر دیا جائے گا۔ یہ حدیث بخاری و مسلم نے ابن عمر، ابو سعید سے نقل کی ہے اور حاکم نے تصحیح کے ساتھ ابو ہریرہؓ سے روایت کی ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت ابن مسعود اور حضرت ابو ہریرہ کا قول کہ جہنم پر ایک ایسا زمانہ آئے گا جس وقت اس میں کوئی شخص نہ ہوگا اس کا مطلب اہل سنت کے نزدیک یہ ہے بشرطیکہ حدیث ثابت ہو کہ کوئی ایماندار اس میں نہ ہوگا مگر کفار کے ٹھکانے تو ہمیشہ بھرے رہیں گے۔ میں نے لٰبِثِیْنَ فِیْهَاۤ اَحْقَابًا کی تفسیر میں لکھا ہے کہ یہ اہل قبلہ میں سے اہل ہواء کے حق میں ہے اور اکثر مفسرین کے نزدیک احقاب سے مراد غیر متناہی احقاب ہیں۔ جب کفار کے دوزخ میں رہنے پر اجماع ثابت ہوا تو علماء مفسرین کا اس آیت کی تفسیر اور ان استثناؤں کی تاویل میں اختلاف واقع ہو گیا۔

میرے نزدیک مختار یہ ہے کہ اس آیت میں استثناء اس بات پر محمول ہے کہ دوزخی جحیم سے حمیم کی طرف نکالے جائیں گے۔ پھر حمیم میں گھسیٹے جائیں گے۔ پھر آگ میں بھڑکائے جائیں گے۔ اسی طرح یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ امام بغوی یَطُوْفُوْنَ بَیْنَهَا وَ بَیْنَ حَمِیْمٍ اٰنٍ کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ وہ حمیم اور جحیم کے درمیان دوڑتے رہیں گے۔ جب وہ آگ سے پناہ مانگیں گے تو کھولتے ہوئے پانی کا عذاب دیا جائے گا جو پیپ کی مانند ہوگا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَ اِنْ یَّسْتَغِیْثُوْا یُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ یا آگ سے سخت ٹھنڈک کی طرف پھیرے جائیں گے۔

شیخین نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے وہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ آگ نے اپنے رب سے شکایت کی یا رب میرا بعض بعض کو کھا رہا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اسے دو سانس لینے کی اجازت عطا فرمائی، ایک سانس سردیوں میں اور ایک سانس گرمیوں میں۔ پس جب لوگ سخت گرمی محسوس کرتے ہیں تو وہ اسی کی گرمی ہوتی ہے اور جب سخت ٹھنڈک محسوس کرتے ہیں تو وہ دوزخ کی ٹھنڈک کی وجہ سے ہوتی ہے(5)۔ اسی طرح البزار نے ابو سعید سے تخریج کی ہے اور ابو سعید نے اس

1۔ مجمع الزوائد، جلد 10، صفحہ 26-726 (الفکر)
2۔ مجمع الزوائد، جلد 10، صفحہ 726 (الفکر)
3۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 969 (وزارت تعلیم)
4۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 969 (وزارت تعلیم)
5۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 77 (وزارت تعلیم)

کی مثل حضرت انس سے روایت کی ہے۔ بعض محققین فرماتے ہیں اہل شقاوت کے متعلق استثناء ایمانداروں کی طرف لوٹتی ہے کہ پہلے اللہ تعالیٰ ان کے گناہوں کی وجہ سے آگ میں ڈالے گا پھر وہاں سے انہیں نکال دے گا۔ حضرت انسؓ سے مروی ہے، فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا تو موں کو اپنے گناہوں کی وجہ سے آگ کا اثر پہنچے گا، ان گناہوں کی سزا پائیں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ اپنے فضل و رحمت سے انہیں جنت میں داخل فرمائے گا ان کو جہنمیون کہا جائے گا۔ اس حدیث کو بخاری نے نقل فرمایا ہے(1)۔

عمران بن حصین نبی کریم ﷺ سے روایت فرماتے ہیں ایک قوم نبی کریم ﷺ کی شفاعت سے دوزخ سے باہر نکلے گی۔ پھر وہ جنت میں داخل ہوں گے اور انہیں جہنمیون کہا جائے گا۔ اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے(2)۔ اسی کی مثل حضرت مغیرہ بن شعبہ سے الطبرانی نے روایت کی ہے۔ اس میں یہ زیادتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں گے کہ ان کا یہ نام مٹا دیا جائے تو اللہ تعالیٰ ان کا یہ نام مٹا دیں گے۔

حضرت جابر بن عبداللہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت کے کچھ لوگ اپنے گناہوں کی وجہ سے عذاب پائیں گے۔ پس وہ آگ میں رہیں گے جتنی مدت اللہ تعالیٰ چاہے گا۔ پھر مشرک ان کو شرم دلائیں گے تمہاری تصدیق کا بھی کوئی فائدہ تو ہمیں نظر نہیں آتا تو اللہ تعالیٰ ہر کلمہ گو کو دوزخ سے نکال لیں گے اور کوئی موحد دوزخ میں نہیں رہے گا۔ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ۞۔

اس حدیث کا مفہوم ایک طویل حدیث میں ابو موسیٰ سے الطبرانی، بیہقی اور ابن ابی حاتم نے روایت کیا ہے اور ابو سعید سے الطبرانی نے روایت کیا ہے گناہ گار مومنین کا آگ میں داخل ہونا اور ان کا پھر دوزخ سے نکلنا، اس کے متعلق احادیث حد تواتر کو پہنچی ہوئی ہیں۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں فاسق مومنین کا آگ سے نکلنا، یہ استثناء کی صحت کے لئے کافی ہے کیونکہ تمام سے حکم کا زوال بعض سے اس کا زوال کافی ہے۔ استثناء ثانی سے یہی مراد ہے۔ پس وہ عذاب کے دنوں میں جنت سے جدا رہیں گے۔ پس معین مبدا سے تابید ابتداء کے اعتبار سے ٹوٹ جاتی ہے جس طرح انتہاء کے اعتبار سے ٹوٹ جاتی ہے۔ یہ لوگ اپنے گناہوں کی وجہ سے شقی ہیں مگر اپنے ایمان کی وجہ سے سعادت مند ہیں۔ یہ اعتراض نہ کیا جائے کہ پھر تو اس طرح **فمنهم شقی و سعید** کی تقسیم صحیح نہیں رہتی کیونکہ اس کے لئے شرط ہے ہر قسیم کی صفت اس کے قسیم سے منتفی ہو اور یہ شرط انفصال حقیقی کی صورت میں پائی جاتی ہے یا منع الجمع کی صورت میں پائی جاتی ہے اور یہاں مراد منع الخلو ہے۔ معنی یہ ہے کہ اہل موقف ان دونوں قسموں سے باہر نہ ہوں گے اور شقاوت اور سعادت کی حالات سے خارج نہ ہوں گے اور ایک شخص میں دو اعتباروں کی وجہ سے دو امروں کا اجتماع ممتنع نہیں ہے۔

بعض علماء فرماتے ہیں یہاں ماشاء بمعنی من شاء ہے اور من سے مراد دونوں استثناؤں میں نافرمان مومنین ہیں۔ اس قول کا مرجع قول ثانی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں دونوں فریقوں میں مستثنیٰ حساب کے لئے موقف میں ان کے توقف کا زمانہ ہے کیونکہ ظاہر کا تقاضا یہ ہے کہ وہ دوزخ یا جنت میں ہوں جب وہ دن آئے یا مستثنیٰ دنیا اور برزخ میں ان کے ٹھہرنے کی مدت ہے اگر حکم مطلقاً ہو یوم کے ساتھ مقید نہ ہو۔ اس تاویل پر یہ احتمال ہے کہ استثناء خلود سے ہو جیسا کہ امام بیضاوی کے کلام سے سمجھا گیا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ استثناء **لهم فيها زفير و شهيق** کے قول سے ہے۔ امام سیوطیؒ البدور السافرہ میں فرماتے ہیں صواب کے زیادہ قریب یہ قول ہے کہ یہ استثناء نہیں ہے بلکہ الا بمعنی سوا ہے جیسے تو کہتا ہے لَكَ عَلَيَّ اَلْفُ دِرْهَمٍ اِلَّا الْاَلْفَانِ الْقَدِيْمَانِ۔ یعنی

1۔ [illegible] جلد 2 صفحہ 215 (الفکر)
2۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 971 (وزارت تعلیم)

میں نے تیرے ہزار درہم دینے ہیں سوائے دو ہزار کے جو پہلے ہیں۔ اور معنی یہ ہے کہ دنیا میں زمین و آسمان کے دوام کی مدت وہ اس میں رہیں گے سوائے اس کے جو اس پر زیادتی اللہ تعالیٰ چاہے جس کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ یہ ہمیشگی کو تعبیر کرتا ہے۔ زمین و آسمان کی مدت کو پہلے ذکر کرنے میں نکتہ یہ ہے کہ معہود کے ذکر کے ساتھ مدت کو واضح کے قریب کیا جائے پھر ایسی مدت کا ذکر فرمایا جس کا احاطہ ذہن نہیں کرسکتا۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہاں الا بمعنی واؤ ہے یعنی ان کا خلود جب تک دنیا میں زمین و آسمان ہیں اور جب تک اللہ چاہے گا رہیگا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لِئَلَّا یَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَیْكُمْ حُجَّةٌ ﳓ اِلَّا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا۔ اس آیت کریمہ میں الا بمعنی واؤ ہے۔ فراء نحوی کہتا ہے یہ استثناء ہے لیکن اس پر عمل نہ ہوگا جسے تو کہتا ہے میں تجھے ضرور ماروں گا مگر یہ کہ میں کوئی اور دیکھوں اور تیرا مارنے کا ارادہ پختہ ہے۔ پس معنی یہ ہوگا کہ مگر اللہ چاہے گا تو انہیں دوزخ سے نکال دے گا لیکن وہ چاہے گا نہیں۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں اس استثناء کا مفہوم اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔

وَ اَمَّا الَّذِیْنَ سُعِدُوْا فَفِی الْجَنَّةِ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ عَطَآءً غَیْرَ مَجْذُوْذٍ ﴿۱۰۸﴾

"اور وہ جو خوش نصیب ۱؎ ہیں تو وہ (نعیم) جنت میں ہوں گے ہمیشہ رہیں گے اس میں جب تک آسمان اور زمین قائم ہیں مگر جتنا چاہے آپ کا رب ۲؎ یہ وہ عطا ہے جو ختم نہ ہوگی۔ ۳؎"

۱؎ حفص، حمزہ اور کسائی نے مجہول ہونے کی وجہ سے سین کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ سعد اللہ بمعنی اسعدہ سے مشتق مانا ہے اور باقی قراء نے معروف کا صیغہ پڑھا ہے۔ پس یہ فعل لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔

۲؎ سابقہ صفحات میں اس استثناء کے متعلق میں نے کثرت سے اقوال ذکر کئے ہیں اور میرے نزدیک مختار یہ ہے کہ اہل جنت بعض اوقات ایسی چیز سے لطف اندوز ہوں گے جو جنت سے اعلیٰ ہے اور وہ رویت باری تعالیٰ میں مستغرق ہونا ہے اور بلا کیف جناب باری تعالیٰ سے کمال اتصال ہوتا ہے۔ مفسرین نے وُجُوْهٌ یَّوْمَىِٕذٍ نَّاضِرَةٌ ۔ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ کئی چہرے اس روز تروتازہ ہوں گے اور اپنے رب کے (انوار و جمال) کی طرف دیکھ رہے ہوں گے، کی تفسیر میں لکھا ہے کہ جار مجرور کی تقدیم حصر کا تقاضا کرتی ہے اور اس بات کا فائدہ دیتی ہے کہ جب وہ اپنے رب کا ارادہ کریں گے تو وہ اس کی رویت میں مستغرق ہوں گے۔ اس وقت کسی غیر کو نہ دیکھیں گے۔ حضرت جابر سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اہل جنت اپنی نعمتوں سے مشغول ہوں گے کہ اچانک ان پر ایک نور چھا جائے گا۔ وہ اپنے سر اوپر اٹھائیں گے تو وہ دیکھیں گے کہ ان کا رب ان کے اوپر سے توجہ فرما ہے اور انہیں سلام دے رہا ہے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی طرف دیکھے گا اور وہ بندے مشاہدہ جمال الٰہی میں یوں مستغرق ہوں گے کہ جنت کی نعمتوں کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہ ہوگا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنے اوپر حجاب عظمت ڈال لیں گے۔ اس کا نور اور اس کی برکت ان میں باقی رہے گی (1)۔ اس حدیث کو ابن ماجہ، ابن ابی الدنیا اور دارقطنی نے روایت کیا ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی نے اپنے مکتوب نمبر 100 جلد ثالث میں حضرت یعقوب علیہ السلام کے قلب کا محبت یوسف میں مشغول ہونے کے راز کی تحقیق میں لکھا ہے کہ ہر شخص کی جنت اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے کسی اسم کے ظہور سے عبارت ہے وہی اسم اس شخص کا

1۔ سنن ابن ماجہ، جلد 1، صفحہ 17 (وزارت تعلیم)

مبدء تعیین ہے اور وہ اسم تجلی فرماتا ہے کبھی درختوں، کبھی نہروں، کبھی محلات، کبھی حور و غلمان کی صورت میں۔ یہ مکشوف حضور ﷺ کے اس فرمان سے مزید مستحکم ہوتا ہے کہ جنت پاکیزہ مٹی میٹھا پانی ہے وہ ایک میدان ہے اور جس میں (پھلدار) درخت لگانا یہ ہیں یعنی سبحان اللّٰہ، الحمد اللّٰہ و لا الہ الا اللّٰہ و اللّٰہ اکبر۔ پھر مجدد فرماتے ہیں یہ درخت اور نہریں کبھی کبھی آئینہ کی طرح ہو جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی بلا کیف رویت کا وسیلہ بنتے ہیں تو اس حالت کی طرف لوٹ جاتے ہیں جس پر پہلے ہوتے ہیں۔ پس ان سے مشغول رہتا ہے اور ہمیشہ ہمیشہ ایسا ہو رہے گا ہم نے سورۃ القیامۃ میں مزید تفصیل سے آیت رویت کے تحت کلام لکھی ہے۔

ے عطاء کا مصدر موکد کی حیثیت سے منصوب ہے، یعنی اصل میں اعطوا عطاء ہے یا جنت سے حال کی حیثیت سے منصوب ہے۔ میں کہتا ہوں ممکن ہے یہ الا ماشآء ربک کے مفعول بہ کی حیثیت سے منصوب ہو۔ یعنی وہ جنت میں رہیں گے مگر تیرے رب کی عطا کے چاہنے کے وقت تک۔ عطاء غیر مجذوذ کا مطلب یہ ہے کہ وہ وصال اور رویت بلا حجاب ختم نہ ہوگی۔ اس وصال اور رویت کو عطاء غیر مجذوذ سے تعبیر کرنے کی وجہ کیا ہے حالانکہ جنت کی تو تمام نعمتیں نہ ختم ہونے والی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ خود موجود ہے جبکہ جنت کی دوسری نعمتیں اس کے وجود کے ظل کے وجود کے ساتھ موجود ہیں۔ پس موجود بنفسہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ (ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے سوائے اس کی ذات کے)۔ جیسے مانگ کر کپڑا پہننے والا کپڑے کے مالک کی نسبت سے عاری ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کی عطاء اس کی ذات کے ساتھ متصل ہے، گویا وہ مضبوط اور نہ ختم ہونے والی ہے مگر جنت کی دوسری نعمتیں ذات الٰہی کی نسبت سے ان کا وجود ختم ہونے والا ہے واللہ اعلم۔ ابن زید فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس چیز کی خبر دی ہے جو وہ اہل جنت کے لئے چاہتا ہے۔ فرمایا عطاء غیر مجذوذ اور جو وہ اہل نار کے لئے چاہتا ہے اس کی خبر نہیں دی بلکہ فرمایا إِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ۔

فَلَا تَكُ فِي مِرْيَةٍ مِّمَّا يَعْبُدُ هَٰؤُلَاءِ ۚ مَا يَعْبُدُونَ إِلَّا كَمَا يَعْبُدُ آبَاؤُهُم مِّن قَبْلُ ۚ وَإِنَّا لَمُوَفُّوهُمْ نَصِيبَهُمْ غَيْرَ مَنقُوصٍ ﴿١٠٩﴾

"تو (اے سننے والے) نہ ہو جا تو شک میں ان کے متعلق [1] جن کی یہ پوجا کرتے ہیں وہ نہیں پوجتے مگر ایسے ہی جیسے پوجتے تھے ان کے باپ دادا اس سے پہلے اور ہم یقیناً پورا پورا دینے والے ہیں انہیں ان کا حصہ جس میں ذرا کمی نہیں ہوگی [2]"

ا۔ جب ہم نے تجھے خبر دے دی ہے لوگوں کے انجام کے متعلق تو اب کسی قسم کے شک میں مبتلا نہ ہوں ان مشرکین کی عبادت کے متعلق، یقیناً وہ ایسی گمراہی ہے جو اس عذاب کا موجب بنے گی جو ان سے پہلے لوگوں پر آیا تھا، جن کی بری عادت ہم نے پہلے آپ کے سامنے بیان کر دی ہے یا ان کی حالت کے متعلق کسی شک میں مبتلا نہ ہوں جن کی یہ عبادت کرتے ہیں کہ وہ نقصان دے سکتے ہیں نہ نفع۔

۲۔ یہاں کان حذف کیا گیا ہے کیونکہ پہلا کان اس پر دلالت کر رہا ہے۔ یہ مستقل جملہ ہے اس کا معنی اس شک سے نہی کی علت بیان کرنا ہے کہ وہ اور ان کے آباء و اجداد شرک میں برابر ہیں، یعنی یہ بھی اپنے آباء کی طرح عبادت کرتے ہیں یا یہ معنی کہ یہ بھی اپنے آباء کی طرح بتوں کی عبادت کرتے ہیں۔ پس آپ کو خبر پہنچ چکی ہے جو ان کے آباء کے ساتھ ہوا تھا۔ پس انہیں بھی اسی کی مثل عذاب دیا جائے گا کیونکہ اسباب میں تمثیل مسببات میں تمثیل کا تقاضا کرتی ہے وَإِنَّا لَمُوَفُّوهُمْ نَصِيبَهُمْ ہم ان کو ان کے آباء کی طرح عذاب کا پورا پورا حصہ دینے والے ہیں یا انہیں رزق کا پورا حصہ پہنچانے والے ہیں۔ پس ان کے عذاب کے موجب کے پائے جانے کے

باوجود ان کے عذاب میں تاخیر کرنے کا یہ عذر ہوگا اور غیر منقوص کے الفاظ مکمل عطا کرنے کی تاکید ہے، یعنی اس حصہ سے کچھ کمی نہ ہوگی تو کہنا ہے وفیتہ حقہ میں ان کا حق ادا کر دیا جبکہ تو اس سے مجازاً بعض حق مراد لے۔

وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِیْهِ ؕ وَ لَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِیَ بَیْنَهُمْ ؕ وَ اِنَّهُمْ لَفِیْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِیْبٍ ﴿۱۱۰﴾

''اور بیشک ہم نے عطا فرمائی موسیٰ کو کتاب ۱؎ پھر اختلاف کیا جانے لگا اس میں اور اگر ایک ۲؎ بات طے نہ کر دی گئی ہوتی آپ کے پروردگار کی جانب سے تو فیصلہ کر دیا گیا ہوتا ان کے درمیان اور بیشک وہ ایسے شبہ میں ہیں اس کے متعلق جو بے چین کر دینے والا ہے ۳؎''

۱؎ الکتٰب سے مراد تورات ہے، یعنی ایک گروہ ایمان لایا اور ایک گروہ نے کفر کیا جس طرح انہوں نے قرآن میں اختلاف کیا ہے۔ اس آیت میں نبی کریم ﷺ کو تسلی دی گئی۔

۲؎ اگر قیامت تک مہلت متعین نہ ہوتی حق کے علمبرداروں اور باطل پرستوں کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا، یعنی باطل کے پجاریوں پہ عذاب نازل کیا جاتا تاکہ حق کے پیروکار ممتاز ہو جاتے۔

۳؎ وہ قرآن یا عذاب کے بارے ایسے شک میں مبتلا ہیں جو بے چین کرنے والا ہے۔

وَ اِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَیُوَفِّیَنَّهُمْ رَبُّكَ اَعْمَالَهُمْ ؕ اِنَّهٗ بِمَا یَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ ﴿۱۱۱﴾

''اور یقیناً ان سب (اختلاف کرنے والوں) کو پورا پورا بدلہ دے گا انہیں آپ کا رب ان کے کرتوتوں ۱؎ کا بیشک اللہ تعالیٰ جو وہ کام کرتے ہیں ان سے خوب آگاہ ہے ۲؎''

۱؎ نافع، ابن کثیر اور ابوبکر نے ان کو مخففہ من الثقیلہ پڑھا ہے اور اصل کے اعتبار سے عاملہ بنایا ہے، جبکہ دوسرے قراء نے مشددہ پڑھا ہے کلا۔ مضاف الیہ کے عوض آخر میں تنوین آئی ہے، یعنی مومنین اور کفار میں سے ہر ایک اختلاف کرنے والا ہے۔ لما کو عاصم، ابن عامر اور حمزہ نے یہاں بھی سورۃ یٰسین میں بھی اور سورۃ الطارق میں میم مشدد کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے میم کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ جنہوں نے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے ان کے نزدیک پہلا لام قسمیہ اور دوسرا تاکید کے لئے یا اس کا الٹ ہے اور ما ان دونوں لاموں کے درمیان فاصلہ کے لئے ہے۔ بعض فرماتے ہیں ما بمعنی من ہے جیسا کہ فانکحوا ما طاب لکم میں ما بمعنی من ہے۔ پہلی صورت میں معنی یہ ہوگا لیوفینهم اور دوسری صورت میں معنی یہ ہوگا۔

اور جنہوں نے لما کو تشدید کے ساتھ پڑھا ہے ان کے نزدیک اس کی اصل لمن ما ہے، نون کو ادغام کی وجہ سے میم سے بدلا تو تین میم جمع ہو گئے تو پہلے میم کو حذف کیا گیا۔ یہاں بھی زائدہ ہوگا۔ معنی یہ ہوگا لمن لیوفینهم۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ لم کا مصدر ہے تنوین کے ساتھ الف پر وقف کیا گیا۔ پس یہ لما بن گیا پھر وصل میں بھی وقف کا معاملہ کیا گیا۔

یہ بھی جائز ہے کہ یہ دعوی اور بشری وغیرہ مصادر کی طرح مصدر ہو جن کے آخر میں الف تانیث ہوتا ہے۔ الزہری نے وَاِنَّ كُلًّا لَّمًّا تنوین کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ قرأت اس آخری قول کی تائید کرتی ہے۔ معنی یہ ہوگا وان کلا جمیعا صاحب الایجاز فرماتے ہیں لما میں ظرف کا معنی پایا جاتا ہے اور کلام میں اختصار ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے وَاِنَّ كُلًّا لَمَّا بُعِثُوْا لَیُوَفِّیَنَّهُمْ۔

ہر خیر و شر میں ہے جو وہ کرتے ہیں وہ اس سے خوب واقف ہے، اس سے کوئی چیز مخفی نہیں۔

فَاسْتَقِمْ كَمَاۤ اُمِرْتَ وَ مَنْ تَابَ مَعَكَ وَ لَا تَطْغَوْا ؕ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ﴿۱۱۲﴾

"پس آپ ثابت قدم رہیے جیسے حکم دیا گیا ہے آپ کو اور وہ بھی (ثابت قدم رہیں) جو تائب ہو کر آپ کے ہمراہ ہیں اور سرکشی نہ کرو بیشک جو کچھ تم کرتے ہو وہ اسے خوب دیکھتا ہے۔"

من تاب کا عطف استقم کی پوشیدہ ضمیر پر ہے، اگرچہ پہلے ضمیر منفصل کے ساتھ تاکید نہیں لگائی گئی، درمیان میں فاصل کو اس کے قائم مقام کر دیا گیا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے توحید و نبوت کے متعلق اختلاف کرنے کا امر بیان فرمایا اور وعدہ وعید کی شرح میں بڑی طویل کلام فرمائی تو پھر اپنے رسول مکرم ﷺ اور آپ کے متبعین کو استقامت کا حکم فرمایا جس طرح پہلے حکم دیا گیا تھا۔ یہ استقامت کا امر عقائد میں استقامت کو بھی شامل ہے (جیسے تشبیہ و تعطیل، جبر و اختیار وغیرہ میں اعتدال)۔ اسی طرح اعمال میں استقامت کو شامل ہے مثلاً وحی کی تبلیغ اور شریعت کا بیان اس طرح کرنا جس طرح وہ نازل ہوئی ہے اسی طرح عبادات کو افراط و تفریط کے بغیر ادا کرنے کو بھی شامل ہے۔ سفیان بن عبداللہ ثقفی سے مروی ہے، فرماتے ہیں میں نے عرض کی یا رسول اللہ مجھے اسلام کے متعلق ایسی بات بتائیں کہ آپ کے بعد پھر اس کے متعلق کسی سے سوال نہ کروں۔ آپ ﷺ نے فرمایا تو کہہ امنت باللّٰه پھر اس پر استقامت اختیار کر(1)۔ استقامت کا لفظ ایک جامع لفظ ہے۔ حضرت عمر بن خطاب نے فرمایا استقامت کا یہ معنی ہے کہ تو اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی پر ثابت قدمی سے عمل پیرا رہے اور لومڑی کی طرح ہیر پھیر نہ کرتا رہے۔ یعنی صراط مستقیم سے ادھر ادھر نہ ہو۔ یہ انتہائی مشکل مقام ہے اس لئے صوفیاء فرماتے ہیں الاستقامة فوق الكرامة۔ استقامت کا درجہ کرامت سے بہت بلند ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ کے عہد میں اس آیت سے سخت آیت نازل نہ ہوئی۔ اس لئے حضور ﷺ نے فرمایا مجھے سورۂ ہود نے بوڑھا کر دیا ہے(2)۔ میں کہتا ہوں حضرت ابن عباس کا قول اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اسی آیت کی شدت رسول اللہ ﷺ پر تھی حتیٰ کہ اس نے آپ ﷺ کو بوڑھا کر دیا۔ اسی آیت کی وجہ سے آپ ﷺ استقامت کا حکم دینے والے تھے۔ آپ ﷺ کے نفس شریفہ میں اگر استقامت رکھی گئی تھی اور خلق عظیم کی فطرت پر آپ کو تخلیق کیا گیا تھا۔ لیکن یہ آیت کریمہ آپ کے متبعین پر شاق تھی۔ اسی وجہ سے آپ ﷺ کو امت کی شفقت نے بوڑھا کر دیا تھا۔

میرے نزدیک حضور ﷺ کے ارشاد کہ "سورۂ ہود نے مجھے بوڑھا کر دیا ہے" اس کا مطلب ہے کہ یہ سورت امتوں کی ہلاکت کے واقعات پر مشتمل ہے جس میں آپ کی امت کے ظالموں کی ہلاکت کی وعید ہے اور اس میں قیامت کا ذکر ہے جیسا کہ سورت کے آخر میں ہم وضاحت کریں گے۔

یعنی حدود شرع سے تجاوز نہ کرو۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی ہے غلو نہ کرو تم میرے امر و نہی سے بڑھنے لگو۔ حضرت ابو ہریرہؓ رسول اللہ ﷺ سے روایت فرماتے ہیں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا دین آسان ہے اور جو اس میں سختی اختیار کرے گا وہ مغلوب ہو جائے گا (یعنی اپنی اختیار کردہ سختیوں کو نبھا نہیں سکے گا) اس لئے سیدھے چلو اور میانہ روی اختیار کرو۔ لوگوں کو دین کی سہولتوں کی بشارت دو اور صبح و شام اور رات کی سیر سے مدد حاصل کرو(3)۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 48 (وزارت تعلیم)   2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 209 (التجاریہ)

3۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 10 (وزارت تعلیم)

وَ لَا تَرْكَنُوْۤا اِلَى الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُۙ وَ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِیَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ﴿۱۱۳﴾

”اور مت جھکو ان کی طرف جنہوں نے ظلم ۱؎ کیا ورنہ چھوئے گی تمہیں بھی آگ ۲؎ اور (اس وقت) نہیں ہوگا تمہارے لئے اللہ کے سوا کوئی مددگار ۳؎ پھر تمہاری مدد بھی نہ کی جائے گی ۴؎“

۱؎ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں اس کا معنی ہے نہ جھکو۔ رکون کا معنی محبت اور دل کا میلان ہے۔ ابوالعالیہ فرماتے ہیں اس کا معنی ہے ان کے اعمال کو پسند نہ کرو۔ سدی فرماتے ہیں ظالموں کی خوشامد نہ کرو۔ عکرمہ فرماتے ہیں ان کی اطاعت نہ کرو۔ بعض فرماتے ہیں ظالموں سے اطمینان حاصل نہ کرو(1)۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں ان ظالموں کے ساتھ تھوڑا سا قلبی میلان بھی نہ رکھو۔ رکون کا معنی تھوڑا سا میلان ہے جیسے ان کے لباس جیسا لباس پہننا اور ان کے ذکر کی تعظیم کرنا وغیرہ(2)۔

۲؎ یعنی ان کی طرف میلان کی وجہ سے تمہیں آگ چھوئے گی۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں جب ظالموں کی طرف تھوڑے سے میلان کی سزا یہ ہے تو پھر جو کلی میلان رکھتا ہے اس کی کیا حالت ہوگی۔ پھر جو خود ظلم کرتا ہے اور ظلم میں منہمک رہتا ہے اس کا کتنا برا انجام ہوگا۔ شاید یہ آیت ظلم سے منع کرنے میں بلیغ ترین ہے(3)۔ روایت ہے کہ ایک شخص نے امام کے پیچھے نماز پڑھی۔ جب امام نے یہ ہدایت پڑھی تو اس پر غشی طاری ہوگئی۔ جب اسے افاقہ ہوا تو پوچھا گیا تمہیں کیا ہوا۔ تو اس نے کہا یہ ظالموں کی طرف رجحان کرنے والوں کی سزا ہے تو خود ظالم کی کتنی سزا ہوگی۔ حضرت حسن نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے دین کو دو لا کے درمیان رکھا ہے یعنی لا تطغوا و لا ترکنوا۔ امام اوزاعی سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس عالم سے کوئی چیز زیادہ مبغوض نہیں جو ظالموں سے ملاقات کرتا ہے۔ حضرت اوس سے مروی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا۔ جو کسی ظالم کو ظالم جانتے ہوئے اس کو تقویت دینے کے لئے اس کے ساتھ چلا تو وہ اسلام سے خارج ہوگیا۔ حضرت ابوھریرہؓ فرماتے ہیں انہوں نے ایک شخص کو سنا کہ وہ کہہ رہا تھا ظالم اپنے آپ کو ہی نقصان دیتا ہے(4)۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کیوں نہیں قسم بخدا حتی کہ چکورا اپنے آشیانہ میں ظالم کے ظلم کی وجہ سے کمزور ہو کر مر جاتی ہے۔ یہ دونوں حدیثیں شعب الایمان میں ہیں۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں یہ خطاب رسول کریم ﷺ اور مومنین کو ہے تاکہ استقامت پر ثابت قدم رہیں جس کا مطلب عدل ہے کیونکہ استقامت سے زوال افراط وتفریط کی ایک طرف ضرور جھکاؤ ہوگا تو یہ اپنے اوپر یا غیر پر ظلم کرے گا بلکہ یہ زوال خود ایک ظلم ہے(5)۔

۳؎ یعنی کوئی مددگار نہیں ہوگا جو تم سے عذاب کو دور کرے۔ یہ واؤ حالیہ ہے اور یہ جملہ فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ کے مفعول سے حال ہے۔

۴؎ پھر اللہ تعالیٰ تمہاری مدد نہ کرے گا کیونکہ اس کا فیصلہ ہو چکا ہے کہ تمہیں عذاب دینا ہے۔ ثم اللہ تعالیٰ کی مدد کے استبعاد کو ظاہر کرنے کے لئے ہے یا مطلقاً نصرت کے استبعاد کے لئے ہے۔ پس جب اس نے ذکر کیا کہ انہیں اللہ عذاب دے گا اور ہر وہ جسے اللہ تعالیٰ عذاب دے گا اس کی نصرت پر کوئی قادر نہ ہوگا۔ پس نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی مدد نہ کی جائے گی۔

امام ترمذی اور نسائی نے ابی الیسر سے روایت کیا ہے اور امام بغوی فرماتے ہیں وہ عمرو بن غزیہ الانصاری ہیں، فرماتے ہیں ایک

1۔ تفسیر بغوی، جلد3، صفحہ209 (التجاریہ)　　2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد3، صفحہ 266 (الفکر)

3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد3، صفحہ 67-266 (الفکر)　　4۔ مشکوٰۃ المصابیح، جلد3، صفحہ 97 (الفکر)

5۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد3، صفحہ 267 (الفکر)

عورت میرے پاس کھجوریں خریدنے کے لئے آئی تو میں نے اسے کہا کمرے کے اندر اس سے بہتر کھجوریں پڑی ہیں۔ پس وہ میرے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی تو میں نے اس کے ساتھ پیار کیا۔ پھر مجھے اپنے اس فعل پر ندامت ہوئی تو میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور اپنی شرمندگی کا اظہار کیا۔ آپ نے فرمایا اپنے نفس پر پردہ ڈالو اور توبہ کرو۔ راوی فرماتے ہیں پھر میں عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس آیا تو انہوں نے مجھے بھی یہی فرمایا کہ اپنے نفس پر پردہ ڈالو اور توبہ کرو۔ میرے دل کو قرار نصیب نہ ہوا میں بارگاہ رسالت میں حاضر ہوا پورا واقعہ عرض کیا۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا تو نے اللہ کے راستہ میں جہاد کرنے والے کی بیوی سے یہ غداری کی ہے۔ حتی کہ یہ گمان ہونے لگا کہ یہ دوزخی ہے۔ پس رسول اللہ ﷺ نے سر جھکایا حتی کہ آپ کی طرف وحی آئی (1)۔

وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَ زُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ؕ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ ﴿۱۱۴﴾

”اور قائم کیجئے نماز دن کے دونوں سروں پر[1] اور کچھ رات کے حصوں میں[2] بیشک نیکیاں مٹا دیتی ہیں برائیوں کو[3] یہ نصیحت ہے نصیحت قبول کرنے والے کے لئے۔[4]“

[1] صحابہ کرام نے یہ مژدہ جانفزا سن کر عرض کی حضور یہ ارشاد اسی شخص کے ساتھ خاص ہے یا عام لوگوں کے لئے بھی ہے۔ فرمایا نہیں بلکہ یہ خوشخبری تمام لوگوں کے لئے ہے۔ صاحب لباب النقول فرماتے ہیں ابی الیسر کی حدیث کی مانند ابوامامہ، ابن عباس رضی اللہ عنہما اور بریدہ وغیرہ سے بھی مروی ہے۔ طرفی پر نصب ظرف کی وجہ سے ہے کیونکہ یہ مضاف الیہ ہے اور اس کا معنی صبح شام ہے۔

[2] یہ ازلف سے مشتق ہے جس کا معنی قریب کرنا ہے اور زلفا جمع ہے زلفۃ کی۔ ابوجعفر نے لام کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں طرف النھار سے مراد صبح اور مغرب کی نماز ہے اور زلفا من اللیل سے مراد اس صورت میں عشاء کی نماز ہوگی۔ حضرت حسن فرماتے ہیں طرف النھار سے مراد صبح اور عصر کی نماز ہے اور زلفا من اللیل سے مغرب اور عشاء کی نماز ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں طرف النھار سے مراد صبح اور ظہر کی نماز ہے اور زلفا من اللیل سے مغرب اور عشاء کی نماز ہے (2)۔ اس قول سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ظہر اور عصر کا وقت ایک ہے، اگرچہ ضرورت کے وقت ہو۔ اسی طرح مغرب اور عشاء کا وقت بھی ایک ہے۔ اسی وجہ سے امام مالک، امام احمد اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہم فرماتے ہیں جب کوئی کافر مسلمان ہو اور حائضہ پاک ہو یا کوئی بچہ بالغ ہو عصر کے وقت کے آخر میں تو اس پر ظہر اور عصر دونوں نمازیں واجب ہوں گی۔ اور جب کوئی کافر مسلمان ہو حائضہ پاک ہو اور بچہ بالغ ہو تو عشاء کے آخر وقت میں تو مغرب اور عشاء کی دونوں نمازیں اس پر واجب ہوں گی۔ لیکن امام ابوحنیفہ کا قول ان سے مختلف ہے، وہ فرماتے ہیں مذکورہ افراد پر صرف عصر کی اور صرف عشاء کی نماز واجب ہوگی اور ہم (احناف) کے دلائل وہ احادیث طیبہ ہیں جو نماز کے اوقات کے بارے میں وارد ہیں جن کا ذکر میں نے سورۂ نساء میں اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا کے تحت کیا ہے۔ وہ تمام احادیث دلالت کرتی ہیں کہ ہر نماز کا وقت دوسری نماز کے وقت سے جدا ہے۔ اسی وجہ سے امام ابوحنیفہ کے نزدیک ظہر اور عصر کو اور مغرب و عشاء کو کسی علت سفر، مرض یا بارش کی وجہ سے جمع کرنا جائز نہیں ہے جس طرح بغیر کسی علت کے اجماعاً جمع کرنا جائز نہیں ہے۔ امام شافعی، امام مالک اور امام احمد فرماتے ہیں سفر میں ان نمازوں کو جمع کرنا جائز ہے اور امام مالک اور امام احمد کے نزدیک بارش کی وجہ سے صرف مغرب اور عشاء کو جمع کرنا جائز ہے اور امام شافعی کے نزدیک بارش کی وجہ سے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 210 (التجاریہ)
2۔ تفسیر خازن، جلد 3، صفحہ 210 (التجاریہ)

ظہر اور عصر کو جمع کرنا جائز ہے اور امام احمد کے نزدیک مرض کی وجہ سے جمع کرنا جائز ہے اور ان کی حجت حضور نبی کریم ﷺ کا حمنہ بنت جحش کو حکم فرمانا ہے کہ وہ جب وہ استحاضہ ہوئی تو آپ نے اسے جمع کرنے کا حکم دیا فرمایا ظہر کو مؤخر کر اور عصر کو جلدی پڑھ، پھر غسل کر اور دو نمازوں کو جمع کرلے(1)۔ اس حدیث کو احمد اور ترمذی نے روایت فرمایا ہے اور فرمایا یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ آپ ﷺ نے سفر میں ظہر اور عصر کو اور مغرب وعشاء کو جمع فرمایا تھا۔ صحیحین میں ابن عباسؓ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ سفر میں مغرب وعشاء اور ظہر وعصر کو جمع فرماتے تھے(2)۔ اسی طرح صحیحین میں حضرت انسؓ سے مروی، ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ جب سورج ڈھلنے سے پہلے سفر کا ارادہ فرماتے تھے ظہر کو عصر کے وقت تک مؤخر فرماتے۔ پھر سواری سے اترتے اور دونوں نمازوں کو جمع فرماتے اور سفر شروع کرنے سے پہلے سورج ڈھل چکا ہوتا تو ظہر کی نماز پڑھ کر سواری پر سوار ہوتے تھے(3)۔ مسلم نے معاذ بن جبل سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ غزوہ تبوک کے موقع پر ظہر اور عصر کو اور مغرب وعشاء کو جمع فرمایا تھا۔ راوی فرماتے ہیں میں نے پوچھا آپ نے ایسا کیوں کیا تھا تو انہوں نے فرمایا تاکہ آپ ﷺ کی امت تکلیف میں مبتلا نہ ہو(4)۔ امام ابو حنیفہ ان تمام احادیث کے متعلق فرماتے ہیں کہ یہ احادیث جمع صوری پر محمول ہیں، یعنی آپ ﷺ ظہر کی نماز کو اس کے آخر وقت میں اور عصر کی نماز کو اس کے وقت کی ابتداء میں ادا فرماتے تھے۔ اسی طرح مغرب اور عشاء کو اپنے اپنے وقت میں جمع فرماتے تھے۔ صورۃً یہ دونوں جمع ہیں مگر ہر ہر نماز اپنے وقت میں ادا فرماتے تھے۔ جیسا کہ حضرت حمنہ کی حدیث میں صراحت ہے۔ ہماری اس دلیل پر صحیحین کی وہ روایت جو ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے وہ بھی دلالت کرتی ہے کہ آپ ﷺ نے مدینہ طیبہ میں بغیر خوف اور بغیر سفر کے مدینہ طیبہ میں نمازوں کو جمع فرماتے۔ مسلم کے بعض الفاظ میں ہے ظہر وعصر اور مغرب وعشاء کو بغیر خوف وبارش کے جمع فرماتے تھے تو فرمایا تاکہ امت کو تکلیف نہ ہو(5)۔ الطبرانی کی روایت میں ہے کہ مدینہ طیبہ میں آپ بغیر کسی وجہ کے نمازوں کو جمع فرماتے تو پوچھا گیا آپ ﷺ ایسا کیوں کرتے تھے؟ فرمایا امت پر وسعت کرنے کے لئے۔ یہ تمام احادیث جمع صوری پر محمول ہیں کیونکہ بغیر کسی وجہ کے جمع کرنے کے عدم جواز پر اجماع ہے۔ اسی طرح عمرو بن دینار سے صحیح حدیث میں صراحۃً آیا ہے کہ میں نے پوچھا اے ابوشعثاء میرا خیال ہے آپ ﷺ ظہر کو مؤخر کرتے ہوں گے اور عصر کو جلدی پڑھتے ہوں گے اور مغرب کو مؤخر اور عشاء کو جلدی پڑھتے ہوں گے۔ ابوشعثاء نے فرمایا میں بھی ایسا ہی گمان کرتا ہوں(6)۔

اگر کوئی یہ سوال کرے کہ جمع تاخیر کو تو جمع صوی پر محمول کرنا ممکن ہے لیکن جو روایات جمع تقدیم پر دلالت کرتی ہیں ان کو جمع صوری پر محمول کرنا ممکن نہیں ہے مثلاً ابن عباسؓ کی روایت جسے احمد، دار قطنی نے حسین بن عبید اللہ بن عباس عن عکرمہ وکریب عن ابن عباس کی طریق سے روایت کیا ہے، فرمایا جب سورج گھر میں ڈھل جاتا تو آپ ﷺ سوار ہونے سے پہلے ظہر اور عصر کو جمع فرمالیتے اور جب گھر میں نہ سورج ڈھلتا تو آپ چل پڑتے۔ جب عصر کا وقت ہوتا تو سواری سے اترتے اور ظہر وعصر کو جمع فرماتے اور گھر میں جب مغرب ہو جاتی تو مغرب وعشاء کو جمع فرماتے اور جب گھر میں مغرب کا وقت نہ ہوتا تو آپ سفر شروع فرمادیتے حتی کہ جب عشاء کا وقت ہوتا تو سواری سے اتر کر دونوں نمازوں کو جمع فرماتے(7)۔ اسی طرح حضرت انسؓ کی حدیث ہے جیسے الاسماعیلی اور البیہقی نے اسحاق بن راہویہ

1۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 255 (العلمیۃ)
2۔ صحیح بخاری: 1056، جلد 1، صفحہ 373 (ابن کثیر)
3۔ صحیح مسلم: 46، جلد 5، صفحہ 182 (العلمیۃ)
4۔ صحیح مسلم: 53، جلد 5، صفحہ 184 (العلمیۃ)
5۔ صحیح مسلم: 54، جلد 5، صفحہ 184 (العلمیۃ)
6۔ صحیح مسلم: 55، جلد 5، صفحہ 184 (العلمیۃ)
7۔ سنن الدار قطنی، جلد 1، صفحہ 388 (المحاسن)

سے بایں الفاظ روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب سفر میں ہوتے اور سورج ڈھل چکا ہوتا تو ظہر و عصر کو اکٹھا پڑھ لیتے اور پھر سفر شروع کرتے۔ امام نووی فرماتے ہیں اس کی سند صحیح ہے۔ اسی طرح حضرت معاذ کی حدیث ہے جسے امام احمد ابو داؤد ترمذی ابن حبان حاکم دار قطنی اور بیہقی نے قتیبہ عن اللیث عن یزید بن ابی حبیب عن ابی الطفیل عن معاذ کے طریق سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ غزوۂ تبوک میں تھے، جب سورج سفر سے پہلے ڈھل جاتا تو آپ ظہر اور عصر کو جمع فرما لیتے اور سورج ڈھلنے سے پہلے سفر شروع فرماتے تو ظہر کو مؤخر فرماتے حتیٰ کہ عصر کے لئے اترتے اور مغرب کے بارے بھی اسی طرح کی حدیث ہے(1)۔

ہم جواباً کہتے ہیں کہ جو تم نے ابن عباس کی روایت ذکر کی ہے اس میں حسین راوی ضعیف ہے۔ ابن معین نے اس کے متعلق یہی لکھا ہے نسائی فرماتے ہیں وہ متروک ہے۔ رہی حضرت انس کی حدیث اگرچہ اس کے متعلق امام نووی نے لکھا ہے کہ اس کی سند صحیح ہے لیکن امام ذہبی فرماتے ہیں ابو داؤد اسحاق پر معترض ہیں۔ لیکن اس کی متابع ہے جسے حاکم نے اربعین میں روایت کیا ہے اس میں ہے جب سفر شروع کرنے سے پہلے سورج ڈھل چکا ہوتا تو ظہر اور عصر کو پڑھ کو سواری پر سوار ہوتے۔ یہ زیادتی غریب ہے اور صحیح الاسناد ہے۔ اس کو الطبرانی نے الاوسط میں روایت کیا ہے۔ نبی کریم ﷺ جب سفر میں ہوتے اور سفر شروع کرنے پہلے سورج ڈھل چکا ہوتا تو ظہر اور عصر جمع فرماتے اور سورج ڈھلنے سے پہلے سفر شروع فرماتے تو عصر کے ابتدائی وقت میں دونوں نمازوں کو اکٹھا پڑھتے اور مغرب وعشاء میں بھی اسی طرح کرتے تھے(2)۔ فرماتے ہیں یعقوب بن محمد الزھری اسکو روایت کرنے میں منفرد ہیں۔ باقی رہی معاذ کی حدیث تو اس کے متعلق امام ترمذی نے فرمایا قتیبہ اس میں منفرد ہے اور جسے امام مسلم نے روایت کیا ہے وہ معروف ہے۔ ابوداؤد لکھتے ہیں یہ حدیث منکر ہے اور جمع تقدیم میں کوئی حدیث صحیح نہیں ہے۔ ابوسعید بن یونس فرماتے ہیں اس حدیث کو صرف قتیبہ نے بیان کیا ہے، کہا جاتا ہے کہ اسے غلطی لاحق ہوئی تھی اور حاتم نے اس کی علت بیان کی ہے۔ حاکم نے اس کی علت کے بیان میں بہت طویل بحث کی ہے بخاری اور ابن حزم نے بھی اس کی علت بیان کی ہے۔ سفر میں جمع کرنے کے متعلق حضرت علی کی حدیث ہے جسے دار قطنی نے اہل البیت سے اپنی سند کے ساتھ روایت کی ہے۔ اس کی سند میں بھی غیر معروف راوی ہے اور اس کے علاوہ اس سند میں المنذر القابوسی ہے، وہ ضعیف ہے۔

امام ابوحنیفہ نے حضرت ابن مسعود کی حدیث کو حجت بنایا ہے جو صحیحین میں مروی ہے، فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو کبھی بغیر وقت کے نماز پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا سوائے نویں ذی الحج کے۔ آپ نے مغرب اور عشاء کو نویں ذی الحجہ کو جمع فرمایا اور پھر اگلے دن یعنی دسویں کی صبح کو وقت سے پہلے پڑھی(3) یعنی اندھیرے میں پڑھی، یعنی وقت معتاد سے پہلے پڑھی۔ اسی طرح آپ کی دوسری دلیل حدیث لیلۃ التعریس ہے جس میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا نیند میں تفریط نہیں ہے تفریط تو بیداری کی حالت میں ہے کہ انسان نماز کو مؤخر کرے حتیٰ کہ دوسری نماز کا وقت داخل ہو جائے۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے(4)۔

ح الطبرانی نے سند ضعیف کے ساتھ ابن عباسؓ سے انہوں نے آپ ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا میں نے کوئی چیز ایسی نہیں دیکھی جیسی کہ نئی نیکی پرانی بدی کا پیچھا کرتی ہے اور جلدی کے ساتھ اس کو پہنچ جاتی ہے۔ بیشک نیکیاں برائیوں کو مٹا دیتی ہیں(5)۔ احمد نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ مجھے وصیت فرمائیے۔

1۔ سنن الدار قطنی، جلد 1، صفحہ 392 (المحاسن)
2۔ مجمع الزوائد: 2973، جلد 2، صفحہ 366 (الفکر)
3۔ سنن ابی داؤد مع شرح، جلد 5، صفحہ 69 (الرشد)
4۔ صحیح مسلم: 311، جلد 5، صفحہ 158 (الفکر)
5۔ معجم کبیر: 12798، جلد 12، صفحہ 174 (العلوم والحکم)

آپ ﷺ نے فرمایا جب تجھ سے کوئی برائی ہو جائے تو فوراً اس کے بعد نیکی کر، وہ اس برائی کو مٹا دے گی۔ پھر میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ لا الہ الا اللہ نیکیوں میں سے ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا یہ نیکیوں میں سے افضل ترین نیکی ہے (1)۔ حضرت ابن مسعود سے مروی ہے کہ ایک شخص نے ایک اجنبیہ عورت کا بوسہ لیا۔ پھر شرمندہ ہو کر نبی کریم ﷺ کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہوا اور پورا واقعہ بیان کیا تو اللہ تعالیٰ نے واقم الصلوۃ طرفی النھار یہی آیت نازل فرما دی۔ (جس میں ہے کہ نیکیاں برائیوں کو مٹا دیتی ہیں)۔ اس شخص نے عرض کی حضور! یہ مژدہ فقط میرے لئے ہے؟ یا تمام امت کے لئے ہے فرمایا میری تمام امت کے لئے ہے (2)۔ بخاری کی ادب میں ہے میری امت کے ہر اس شخص کے لئے ہے جس نے عمل کیا۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے۔ مسلم کی روایت میں بھی اسی طرح ہے اور اس میں یہ بھی ہے کہ اسے حضرت عمر نے فرمایا اگر تو نے اپنے نفس پر پردہ ڈالتا تو اللہ تعالیٰ بھی پردہ ڈالتا۔

الحاکم، البیہقی نے معاذ بن جبل سے اس طرح روایت کی ہے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا پانچوں نمازیں اور جمعہ تک جمعہ اور رمضان تک رمضان کفارہ ہیں ان گناہوں کا جو ان کے درمیان ہوئے جبکہ وہ گناہ کبیرہ سے اجتناب کرے۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے (3)۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے ہی مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر تم میں سے کسی کے دروازے پر نہر ہو وہ اس میں ہر روز پانچ مرتبہ غسل کرتا ہو کیا اس کے جسم پر کوئی میل باقی رہے گی؟ صحابہ نے عرض کی کوئی میل باقی نہیں رہے گی۔ آپ ﷺ نے فرمایا یہی مثال ہے پانچوں نمازوں کی۔ اللہ ان سے گناہوں کو مٹا دیتا ہے (4)۔

ؔ ذالک کا مشار الیہ فاستقم اور مابعد کلام ہے اور بعض نے فرمایا قرآن کی طرف اشارہ ہے یعنی یہ حکم یا یہ قرآن نصیحت حاصل کرنے والوں کے لئے نصیحت ہے۔

وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۱۵﴾

"اور آپ صبر کیجئے [1] بلاشبہ اللہ تعالیٰ ضائع نہیں کرتا نیکوں کے اجر کو [2]"

[1] اے پیارے حبیب ﷺ طاعات پر قائم رہیے اور حسب معمول غیر شائستہ کاموں سے مجتنب رہئے اور جو آپ کو اذیت پہنچی ہے اس پر صبر کیجئے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا مطلب ہے نماز پر قائم رہئے اور حسب معمول غیر شائستہ کاموں سے مجتنب رہئے اور جو آپ کو اذیت پہنچی ہے اس پر صبر کیجئے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا مطلب ہے نماز پر قائم رہئے۔ اس کی قول کی مثال قرآن میں موجود ہے وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا۔ (اپنے اہل نماز کا حکم دو اور اس پر خود قائم رہو)

[2] ضمیر کی جگہ اسم ظاہر ذکر کیا گیا ہے تاکہ مقصود و مطلوب پر دلیل کی طرح ہو جائے اور اس میں دلیل ہے کہ نماز اور صبر ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے اور یہ بھی اشارہ ہے کہ بغیر اخلاص کے ان دونوں کا کوئی اعتبار و ثواب نہیں ہے۔

فَلَوْ لَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ ۚ وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَاۤ اُتْرِفُوْا فِيْهِ وَكَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿۱۱۶﴾

1۔ مسند احمد، جلد 5، صفحہ 169 (صادر)
2۔ صحیح بخاری: 503، جلد 1، صفحہ 97-196 (ابن کثیر)
3۔ صحیح مسلم: 16، جلد 3، صفحہ 101 (العلمیہ)
4۔ صحیح مسلم: 283، جلد 5، صفحہ 144 (العلمیہ)

"تو کیوں ایسا نہ ہوا کہ ان امتوں میں جو تم سے پہلے گزری ہیں ایسے زیرک لوگ ہوتے [1] جو روکتے زمین میں فتنہ و فساد برپا کرنے سے مگر وہ قلیل تھے جنہیں ہم نے نجات دی تھی ان [2] سے اور پیچھے پڑے رہے ظالم اس عیش و طرب کے جس میں وہ تھے اور وہ مجرم تھے [3]"

[1] فلولا یہ بمعنی ھلا ہے اور اولو بقیۃ سے مراد صاحب عقل و فضل لوگ ہیں۔ عقل کو بقیہ اس لئے کہتے ہیں کہ انسان اپنی عمدہ اور افضل چیز کو محفوظ رکھتا ہے۔ جب کسی شخص میں خیر اور بھلائی ہو تو کہتے ہیں فلان ذو بقیہ۔ اسی سے ہے فَلَانٌ مِنْ بَقِيَّةِ الْقَوْمِ اَیْ مِنْ خِيَارِهِمْ۔ یعنی فلاں اپنی قوم کے صاحب خیر اور زیرک لوگوں سے ہے۔ اسی سے عربوں کا قول ہے فِي الزَّوَايَا خَبَايَا وَفِي الرِّجَالِ بَقَايَا۔ (یعنی مکان کے کونوں میں پوشیدہ چیزیں ہوتی ہیں اور مردوں میں بہتر لوگ ہوتے ہیں)

بعض علماء فرماتے ہیں اولو بقیہ کا معنی اطاعت کرنے والے ہیں جیسا کہ ہم نے بقیت اللہ خیر لکم اور والباقیات الصالحت خیر کے تحت ذکر کیا ہے بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی عمدہ اخلاق کے مالک لوگ ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ تقیہ کی طرح مصدر ہو۔ قاموس میں ہے بقی یبقی بقاء و بقًا و بقیا (1) یعنی اپنے نفسوں کو بچانے والے اور عذاب سے انہیں محفوظ رکھنے والے۔

[2] یہ وہ لوگ تھے جو انبیاء کرام کی اتباع کرنے والے تھے، لوگوں کو فساد فی الارض سے منع کرتے تھے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ یہاں الرستثناء متصل ہو جب نفی لازم کو تخصیص کے لیے بنایا جائے اور ممن انجینا بیان کے لیے ہو اور بعضیت کے لیے نہ ہو۔

[3] جنہوں نے برائی سے منع کرنے کو چھوڑ دیا انہوں نے اتباع کی ان شہوات کی جن میں وہ گم تھے۔ پس وہ اپنے عیش و طرب کے اسباب کی تحصیل میں مشغول رہے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے کنارہ کش رہے۔ مقاتل بن حیان نے اس کا معنی ماحولوا بیان کیا ہے یعنی جن خواہشات و شہوات میں گھرے ہوئے تھے۔ فراء نحوی فرماتے ہیں اس کا معنی ہے جس کے وہ عادی تھے (2)۔ اور اتبع کا جملہ فعل مقدر پر معطوف ہے تقدیر عبارت اس طرح ہوگی اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ نَهَوْا عَنِ الْفَسَادِ وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا شَهَوَاتِهِمْ۔

وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّ اَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ ﴿۱۱۷﴾

"اور آپ کا رب ایسا نہیں کہ برباد کر دے بستیوں کو ظلم سے حالانکہ ان میں بسنے والے نیکوکار ہیں [1]"

[1] لام نفی کی تاکید کے لئے ہے اور ان مصدریہ اس کے بعد مقدر ہے یعنی تیرے پروردگار کی یہ صفت نہیں کہ وہ ہلاک کر دے بستیوں کو، یا یہ معنی کہ تمہارا رب بستیوں کو ہلاک کرنے والا نہیں۔ بظلم کا کلمہ یہلک کی ضمیر سے حال ہے، یعنی اللہ تعالیٰ ان پر ظلم کرتے ہوئے ان کو ہلاک کرنے والا نہیں، جبکہ ان میں بسنے والی قوم مسلمان ہو اس میں ظلم سے اللہ تعالیٰ کی تنزیہ بیان کی گئی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں ظلم سے مراد شرک ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ان کے شرک کے سبب ان بستیوں کو ہلاک کرنے والا نہیں جبکہ ان بستیوں والے ایک دوسرے کی اصلاح کرنے والے ہوں اور انصاف کے ساتھ معاملات کرنے والے ہوں اور ایک دوسرے پر ظلم کرنے والے نہ ہو۔ طبرانی اور ابوالشیخ نے جریر بن عبداللہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ان بستیوں والے ایک دوسرے سے انصاف کرتے ہوں (3)۔ اللہ تعالیٰ کی یہ مہربانی اس کی رحمت واسعہ کے سبب اور اپنے حقوق سے درگزر کے سبب ہے۔ یہی وجہ ہے جب حقوق اللہ اور حقوق العباد جمع ہو جائیں تو فقہاء حقوق العباد کو مقدم کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ کفر

1۔ القاموس المحیط، جلد 2، صفحہ 1659 (التراث العربی) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 249 (الفکر)
3۔ معجم کبیر: 2281، جلد 2، صفحہ 308 (العلوم والحکم)

کی وجہ سے بادشاہی باقی رہتی ہے مگر ظلم کی وجہ سے باقی نہیں رہتی۔

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ﴿۱۱۸﴾

"اور اگر چاہتا آپ کا رب تو بنا دیتا سب لوگوں کو ایک امت ۱؎ (لیکن حکمت کا یہ تقاضا نہیں اسلئے) وہ ہمیشہ آپس میں اختلاف کرتے رہیں گے ۲؎"

۱؎ اگر تمہارا رب چاہتا تو تمام لوگوں کو نیک صالح اور دولت ایمان سے مشرف فرما دیتا لیکن اس کی حکمت بالغہ کا یہ تقاضا نہیں) اس آیت میں ایک کھلی دلیل ہے کہ امر اور ارادہ ایک چیز نہیں ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر شخص کے ایمان کا ارادہ نہیں فرماتا کیونکہ جس کا وہ ارادہ فرمائے اس کا وقوع واجب ہوتا ہے۔

۲؎ وہ ہمیشہ حق کو چھوڑ کر باطل کی مختلف شکلوں پر ہوں گے کچھ یہودی، کچھ نصرانی، کچھ مجوسی اور کچھ بت پرست ہوں گے، ان میں سے کچھ جبری، کچھ قدری کچھ رافضی اور کچھ خارجی ہوں گے۔

اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ۭ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ۭ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَاَمْلَـَٔنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۱۹﴾

"مگر وہ جن پر آپ کے رب نے رحم فرمایا (وہ اس فتنہ سے محفوظ رہیں گے) ۱؎ اور اسی (رحمت) کے لئے انہیں پیدا فرمایا ہے اور پوری ہوگئی آپ کے رب کی (یہ) بات ۲؎ کہ میں ضرور بھر دوں گا جہنم کو جن وانسان (دونوں) سے ۳؎"

۱؎ مگر جن کو اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے صراط مستقیم کی طرف ہدایت عطا فرمائی وہ عقائد صحیحہ کے اصولوں اور اوامر الٰہی کی پیروی اور مناہی سے اجتناب پر متفق رہیں گے۔ حضرت ابن مسعود سے مروی ہے فرمایا ہمارے لئے رسول اللہ ﷺ ایک سیدھا خط کھینچا پھر فرمایا یہ اللہ کا راستہ ہے۔ پھر اس خط کے دائیں بائیں اور خطوط کھینچے اور فرمایا یہ وہ راستے ہیں جن میں سے ہر ایک پر شیطان ہے جو اپنی طرف بلا رہا ہے۔ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھی اَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ۔ اس حدیث کو امام احمد، نسائی اور دارمی نے روایت کیا ہے (1)۔

۲؎ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد اور قتادہ اور ضحاک فرماتے ہیں ذالک کا مشار الیہ رحمت ہے، یعنی انہیں رحمت کیلئے پیدا فرمایا (2) اور ھم ضمیر کا مرجع من ہے اور اشارہ رحمت کی طرف ہے۔ حسن اور عطا فرماتے ہیں اشارہ اختلاف کی طرف ہے، یعنی اختلاف کے لئے انہیں پیدا فرمایا۔ اشہب فرماتے ہیں میں نے اس آیت کا مفہوم امام مالک سے پوچھا تو آپ نے فرمایا تاکہ ایک فریق جنت میں اور ایک دوزخ میں ہو۔ ابو عبیدہ فرماتے ہیں مجھے اس شخص کا قول پسند ہے جس نے یہ کہا ہے کہ اس نے ایک فریق کو رحمت کے لئے اور ایک فریق کو عذاب کے لئے پیدا فرمایا۔ فراء فرماتے ہیں اہل رحمت کو رحمت کے لئے اور اہل اختلاف کو اختلاف کے لئے پیدا فرمایا (3)۔ اس صورت میں ضمیر کا مرجع الناس ہے اور اشارہ اختلاف اور رحمت دونوں کی طرف ہے اور لام عاقبت کے لئے ہے۔ اس تاویل کی تائید اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کرتا ہے وتمت کلمۃ ربک۔ یعنی تمہارے رب کا قدیم فیصلہ مکمل ہو چکا۔ یا جو اس

1۔ سنن الدارمی: 208، جلد 1، صفحہ 60 (المحاسن)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 250 (الفکر)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 250 (الفکر)

نے فرشتوں کو کہا تھا وہ قول مکمل ہو چکا۔

۲ میں جنوں اور انسانوں میں سے نافرمانوں سے جہنم کو بھروں گا، یا یہ معنی کہ ان تمام سے جہنم کو بھروں گا نہ کہ ایک جنس سے۔

وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ ۚ وَجَآءَكَ فِيْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَّذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۲۰﴾

”اور یہ سب جو ہم بیان کرتے ہیں آپ سے پیغمبروں کی سرگزشتیں یہ اس لئے ہیں کہ پختہ کردیں ان سے آپ کے قلب مبارک ۱ کو اور آیا ہے آپ کے پاس اس سورت میں حق اور یہ نصیحت اور یاددہانی ہے اہل ایمان کے لئے ۲“

۱ ہر خبر جو ہم رسولوں کی خبروں سے اور ان کی امتوں کی خبروں سے جو بیان کرتے ہیں آپ سے۔ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ کا جملہ کلا کا بیان یا اس کا بدل ہے اور اس جملہ کا فائدہ قصوں کے بیان سے مقصود پر تنبیہ کرنا ہے اور وہ مقصود آپ ﷺ کے یقین میں اضافہ رسالت کی ادائیگی پر دل کو مضبوط کرنا اور کفار کی اذیتوں اور دل آزاریوں کو برداشت کرنے پر تقویت دینا ہے یا یہ جملہ مفعول ہے اور کلا مصدر یا ظرف کے طور پر منصوب ہے۔ یعنی اقتصاص کی انواع میں سے ہر نوع یا اوقات میں سے ہر وقت تجھ پر بیان کرتے ہیں انبیاء کے واقعات تاکہ آپ کے دل کو مستحکم اور مضبوط کردیں ان واقعات سے۔

۲ حسن اور قتادہ فرماتے ہیں ھذہ سے مراد ھذہ الدنیا ہے۔ دوسرے علماء فرماتے ہیں فی ھذہ السورۃ ہے(۱) ظاہر یہ ہے کہ اشارہ انباء (خبریں) کی طرف ہے یعنی ان بیان شدہ خبروں میں آچکا ہے آپ کے پاس جو حق ہے۔ وموعظة وذكرى للمؤمنين۔ یہ جملہ اشارہ ہے تمام فوائد کی طرف۔

وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ ۭ اِنَّا عٰمِلُوْنَ ﴿۱۲۱﴾

”اور آپ فرما دیجئے انہیں جو ایمان نہیں لائے کہ تم عمل کرتے رہو اپنی جگہ پر اور ہم (اپنے طور پر) عمل پیرا ہیں ۱“

۱ آپ ایمان نہ لانے والوں کو فرمائیں کہ تم اپنی حالت اور اپنی غلط جہت پر اور اپنی قدرت کے مطابق عمل کرتے رہو۔ اس میں ان کے لئے تہدید اور وعید ہے اور ہم اپنی حالت اور اپنی قوت کے مطابق عمل پیرا ہیں۔

وَانْتَظِرُوْا ۚ اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾

”اور تم بھی انتظار کرو اور ہم بھی منتظر ہیں ۱“

۱ تم ہم پر گردش زمانہ کا انتظار کرو ہم بھی منتظر ہیں تم پر اس عذاب کے نزول کے جو پہلے تم جیسے منکروں پر نازل ہوا تھا۔

وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ۭ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

”اور اللہ ہی کے لئے ہیں چھپی ہوئی چیزیں آسمانوں کی اور زمین کی ۱ اور اسی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں سارے کام ۲ تو آپ بھی اس کی عبادت کیجئے اور اسی پر بھروسہ رکھیئے اور نہیں ہے آپ کا رب بے خبر اس سے جو تم لوگ

1 تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 251 (الفکر)

کرتے ہو۔"

۱۔ زمین و آسمان میں بندوں سے غائب ہے، اس کا علم اللہ تعالیٰ کے لئے خاص ہے، زمین و آسمان کے درمیان کوئی چیز اس پر مخفی نہیں ہے اور نہ تمہارے اعمال اس سے پوشیدہ ہیں۔

۲۔ وَإِلَيْهِ يُرْجَعُ کو نافع اور حفص نے یاء کے ضمہ اور جیم کے فتحہ کے ساتھ مجہول کا صیغہ پڑھا ہے۔ باقی قراء نے یاء کے فتحہ اور جیم کے کسرہ کے ساتھ معروف کا صیغہ پڑھا ہے۔ یعنی یقیناً آپ کا اور ان کا معاملہ اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹے گا اور آپ کی خاطر اللہ تعالیٰ ضرور ان سے انتقام لے گا، وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جو ارادہ فرماتا ہے اسے محکم کرتا ہے۔ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ یہاں عبادت کے ذکر کو توکل سے پہلے ذکر کرنے میں یہ حکمت ہے کہ توکل عبادت کے ساتھ مفید ہے۔

۳۔ نافع، ابن عامر، حفص اور یعقوب نے یہاں بھی اور سورۂ نمل میں تعملون کو تاء فوقانیہ سے پڑھا ہے اور باقی قراء نے یاء تحتانیہ سے غائب کا صیغہ پڑھا ہے۔

امام بغوی فرماتے ہیں حضرت کعب نے فرمایا تورات کا خاتمہ سورۂ ہود کا خاتمہ ہے(1)۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ حضرت ابوبکر نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ آپ بوڑھے ہوگئے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا مجھے سورۂ ہود، واقعہ، المرسلات، عم یتساءلون اور اذا الشمس کورت نے بوڑھا کردیا ہے(2)۔ اس حدیث کو ترمذی، بغوی اور حاکم نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اس کو صحیح بھی کہا ہے۔ حاکم نے اسی حدیث کو ابوبکر سے، ابن مردویہ نے سعد سے اور ابن مردویہ نے ابوبکر سے ان الفاظ میں بھی روایات کی ہے کہ مجھے سورۂ ہود اور اس جیسی سورتوں نے بوڑھا ہونے سے پہلے بوڑھا کردیا ہے۔ ابو یعلی نے سند ضعیف کے ساتھ حضرت انس سے اور ابن مردویہ نے عمران سے ان الفاظ میں یہی حدیث روایت کی ہے کہ مجھے سورۂ ہود اور اس جیسی سورتوں نے جو طوال مفصل سے ہیں، بوڑھا کردیا ہے۔ اسی حدیث کو ابن مردویہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بایں الفاظ روایت کیا ہے مجھے سورۂ ہود اور اس جیسی سورتوں، الواقعہ، القارعہ، الحاقہ، اذا الشمس کورت اور سأل سائل نے بوڑھا کردیا ہے۔ طبرانی نے الکبیر میں عقبہ بن عامر اور ابی جحفہ نے ان الفاظ میں روایت کی ہے مجھے سورۂ ہود اور اس جیسی سورتوں نے بوڑھا کردیا ہے اور طبرانی نے سہل بن سعد سے ضعیف سند کے ساتھ الواقعہ، الحاقہ اور اذا الشمس کورت کی زیادتی کے ساتھ روایت کی ہے(3)۔ ابن عساکر نے محمد بن علی سے مرسل روایت کی ہے، اس کے الفاظ ہیں کہ سورۂ ہود اور اس جیسی سورتوں اور جو کچھ مجھ سے پہلے امتوں کے ساتھ ہوا اس نے مجھے بوڑھا کردیا ہے۔

عبداللہ بن احمد نے زوائد الزہد میں اور ابوالشیخ نے اپنی تفسیر میں ابو عمران الجونی سے مرسلاً بایں الفاظ روایت کی ہے مجھے سورۂ ہود قیامت کے دن کے ذکر اور پہلی امتوں کے قصص نے بوڑھا کردیا ہے۔ احادیث مذکورہ کے الفاظ دلیل ہیں کہ آپ کا بڑھاپا قیامت کے ذکر اور سابقہ امتوں کی ہلاکتوں کی وجہ سے تھا نہ کہ آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو استقامت کے امر کی وجہ سے تھا ورنہ صرف سورۂ ہود پر اکتفا کیا جاتا اور دوسری سورتوں کا ذکر ساتھ نہ ہوتا۔ واللہ اعلم

اختتام ترجمہ سورۂ ہود 8 جولائی 1999ء بوقت پونے سات صبح الحمد للہ علی ذالک والصلوۃ والسلام علی النبی المختار۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 252 (الفکر)　　2۔ جامع ترمذی، جلد 5، حدیث: 3297 (العلمیہ)

3۔ معجم کبیر: 5804، جلد 6، صفحہ 148 (العلوم والحکم)

سورۂ یوسف

آیاتہا ۱۱۱ | سُوْرَۃُ یُوْسُفَ مَکِّیَّۃٌ ۱۲ | رکوعاتہا ۱۲

سورۂ یوسف مکی ہے اور اس میں ایک سو گیارہ آیتیں اور بارہ رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الٓرٰ ۫ تِلْكَ اٰیٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِیْنِ ۟

"الف۔لام۔را۔یہ آیتیں ہیں روشن کتاب کی۔[۱]"

[۱] یہ آیات قرآنیہ کی طرف اشارہ ہے اور اضافت منی ہے اور کتاب سے بھی آیات قرآنیہ ہی مراد ہیں۔ یعنی آیات قرآنیہ اپنے اعجاز میں ظاہر ہیں، یا یہ معنی کہ یہ آیات قرآنیہ حلال، حرام، حدود و احکام کے بیان میں ظاہر ہیں۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں ہیں۔ مبین کا معنی اللہ کی برکت اس کی ہدایت اور اس کی رشد کو ظاہر کرنے والی ہے۔ زجاج فرماتے ہیں اس کا معنی وہ حق کو باطل سے اور حرام کو حلال سے ممتاز کرنے والی ہیں(1)۔ بعض فرماتے ہیں اشارہ سورت کی آیات کی طرف ہے اور کتاب سے بھی یہی مراد ہے۔ یعنی یہ آیات اس سورت کی آیات ہیں اور ان کا معاملہ ہر غور و فکر کرنے والے شخص پر واضح ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں یا یہ معنی کہ یہ یہود کو ظاہر کرنے والی ہیں۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں روایت ہے کہ یہود کے علماء نے مشرکین کو کہا کہ محمد ﷺ سے پوچھو کہ یہود شام کی طرف کیوں منتقل ہوئے تھے۔ حضرت یوسف کا قصہ کیا ہے تو یہ سورت نازل ہوئی(2)۔ صاحب لباب النقول نے اسباب نزول میں یہ سبب ذکر نہیں کیا۔

اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِیًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝

"بیشک ہم نے اتارا اسے یعنی قرآن عربی کو تا کہ تم (اسے) خوب سمجھ سکو۔[۱]"

[۱] اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ میں ضمیر کا مرجع کتاب ہے۔ قُرْءٰنًا۔ قرآن اسم جنس ہے جو کل اور بعض دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ پھر غلبہ کی وجہ سے کل کے لئے علم بن گیا۔ پھر اس کو کتاب پر محمول کرنا بھی ممکن ہے، اگرچہ مراد سورۂ یوسف ہو اور قرآنا پر نصب حال کی وجہ سے ہے اور پھر قرآنا خود یا تو توطیہ اور تمہید کے لئے ہے اور عربیا حال ہے یا قرآنا مصدر بمعنی مفعول ہونے کی وجہ سے حال ہے اور عربیا اس کی صفت ہے یا قرآنا کی ضمیر سے حال ہے یا دوسرا حال ہے اور عربیا ذکر کرنے کا مقصود یہ ہے کہ ہم نے اس قرآن کو تمہاری لغت پر نازل کیا ہے۔ تا کہ تم اس کے معانی جان لو اور تم اس میں اپنی عقل کو استعمال کرو تو تم اس کے لفظی اور معنوی لطائف و اعجاز کو پا لو گے۔ حاکم وغیرہ نے سعید بن ابی وقاص سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں حضور نبی کریم ﷺ پر قرآن نازل ہوا آپ ان پر ایک زمانہ تک تلاوت کرتے رہے۔ پھر انہوں نے کہا یا رسول اللہ لَوْ حَدَّثْتَنَا کاش آپ ہم پر بیان کرتے تو اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 253 (الفکر)
2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 5، صفحہ 258 (العلمیہ)

نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِیْثِ (1) ابن ابی حاتم نے یہ زائد روایت کیا ہے کہ انہوں نے عرض کی لو ذکرتنا (آپ ہمیں یاد دلاتے) تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ۔

ابن جریر نے ابن عباس سے روایت کیا ہے اور ابن مردویہ نے ابن مسعود سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں انہوں نے عرض کی یارسول اللہ لَوْ قَصَصْتَ عَلَیْنَا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (2)۔

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَیْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَاۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ۖۗ وَ اِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِیْنَ ۝۳

"ہم بیان کرتے ہیں آپ سے ایک بہترین قصہ اس قرآن کے ذریعے سے جو ہم نے آپ کی طرف وحی کیا ہے اگرچہ آپ اس سے پہلے غافلوں میں سے تھے [1]۔"

[1] امام بغوی نے سعید بن ابی وقاص سے روایت کیا ہے تین فصول ہیں لیکن تیسری کو دوسری پر مقدم کیا گیا ہے۔ اَحْسَنَ الْقَصَصِ مصدر کی حیثیت سے منصوب ہے، یعنی احسن الاقتصاص کیونکہ اس واقعہ کو بہترین اسلوب میں بیان کیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ ہم نے آپ سے گزشتہ امتوں کے حالات و واقعات بیان کئے اور گزری ہوئی قوموں کی سرگزشتیں بیان کیں اور عمدہ طریقہ سے بیان کیں یا یہ مفعول کی حیثیت سے منصوب ہے، یعنی جو ہم بیان کرتے ہیں وہ بہت عمدہ ہے اور مراد یہاں یوسف علیہ السلام کا قصہ ہے، اس کو احسن القصص کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں عجائب، عبرت آمیز واقعات، کئی حکمتیں اور اہم نکات موجود ہیں اور اس میں ایسے فوائد کا بھی ذکر ہے جن کا دین و دنیا کے مسائل سے گہرا تعلق ہے مثلاً بادشاہوں، غلاموں، علماء کی سیرت، مکر نساء، دشمنوں کی اذیت پر صبر، اور اذیت دینے والوں سے انتقام کی قدرت کے وقت درگزر کرنا وغیرہ۔ اس صورت میں فَعَلٌ کے وزن پر قصص مفعول کے معنی میں ہے جیسے نقض اور سلب مفعول کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں اور یہ قص اثرہ سے مشتق ہے جس کا معنی اتباع کرنا پیچھا کرنا ہے اور القاص وہ شخص جو آثار تلاش کرتا ہے اور خبر ان کے مطابق لاتا ہے۔ خالد بن معدان فرماتے ہیں سورۂ یوسف اور سورۂ مریم سے اہل جنت جنت میں بھی لطف اندوز ہوں گے۔ ابن عطاء فرماتے ہیں سورۂ یوسف کوئی غمزدہ سنتا ہے تو وہ بھی اس سے راحت پاتا ہے (3)۔ ما اوحینا میں ما مصدریہ ہے یعنی ہمارے وحی کرنے کے ساتھ هذا القرآن اوحینا کا مفعول ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ نقص کا مفعول ہو جبکہ احسن مصدر کی حیثیت سے منصوب ہو وَاِنْ كُنْتَ میں ان مخففہ من مثقلہ ہے اور اس کا اسم ضمیر محذوف ہے، یعنی آپ پر ہماری وحی آنے سے پہلے آپ اس قصہ سے بے خبر تھے یا یہ معنی کہ آپ پر جو قصص، شرائع اور احکام وحی کیے گئے ہیں۔ ان سے پہلے آپ ناواقف تھے۔

اِذْ قَالَ یُوْسُفُ لِاَبِیْهِ یٰۤاَبَتِ اِنِّیْ رَاَیْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ رَاَیْتُهُمْ لِیْ سٰجِدِیْنَ ۝۴

"یاد کرو جب کہا یوسف نے اپنے والد سے کہ اے میرے (محترم) باپ میں نے (خواب میں) دیکھا ہے [1] یارہ ستاروں کو اور سورج اور چاند کو میں نے انہیں دیکھا کہ وہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں [2]۔"

1۔ مستدرک حاکم: 3319، جلد 8، صفحہ 376 (العلمیہ)

2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 5 (العلمیہ)

3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 254 (الفکر)

1۔ اگر اَحْسَنَ الْقَصَصِ کو مفعول بہ بنایا جائے اور مراد یوسف علیہ السلام کا قصہ ہو تو یہ اس سے بدل اشتمال ہے کیونکہ اس واقعہ پر مشتمل ہے یا یہ اذکر مقدر کے ساتھ منصوب ہے یوسف عبرانی زبان کا اسم ہے۔ اس لئے یہ غیر منصرف ہے۔ آپ یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بیٹے ہیں۔ امام احمد اور بخاری نے ابن عمر سے اور انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا الکریم ابن الکریم بن الکریم بن الکریم یوسف بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم (1) ابیہ سے مراد یعقوب علیہ السلام ہیں آیا بت کو ابن عامر اور ابو جعفر نے پورے قرآن میں تاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے تاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن کثیر اور ابن عامر حاء کے ساتھ اور باقی تاء کے ساتھ وقف کرتے ہیں جیسے یآبَہْ اور یآبَتْ۔

اِنِّيْ رَاَيْتُ۔ یعنی میں نے خواب میں دیکھا عالم بیداری کی رویت مراد نہیں ہے۔ اس کی دلیل یہ ارشادات ہیں **لا تقصص رءیاک** اور **ھذا تاویل رءیای**۔

2۔ سعید بن منصور نے اپنی سنن میں بزار اور ابو یعلی نے اپنی اپنی سند میں ابن جریر، ابن منذر، ابن ابی حاتم، ابو الشیخ اور ابن مردویہ نے اپنی اپنی تفاسیر میں العقیلی اور ابن حبان نے الضعفاء میں حاکم نے مستدرک میں اور ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ مسلم کی شرط صحیح ہے۔ ابو نعیم اور البیہقی نے اپنی دلائل نبوت میں حضرت جابر بن عبد اللہ سے روایت کیا ہے اور یہودی کا نام بیہقی نے بستان ذکر کیا ہے۔ اس نے پوچھا اے محمد ان ستاروں کے متعلق مجھے بتایئے جو حضرت یوسف نے دیکھے تھے۔ آپ خاموش ہو گئے تو فوراً جبرئیل آئے اور آپ ﷺ کو ان ستاروں کے متعلق خبر دی۔ پھر آپ ﷺ نے یہودی کو فرمایا اگر میں تجھے ان ستاروں کے متعلق بتا دوں تو تم اسلام قبول کر لو گے؟ اس نے کہا ہاں۔ آپ ﷺ نے فرمایا وہ یہ تھے۔ جریان۔ طارق۔ ذیال۔ قابس۔ عمودان۔ فلیق۔ مصبح۔ ضروح۔ فرغ۔ وثاب اور ذوالکتفین۔

یوسف علیہ السلام نے انہیں دیکھا تھا اور چاند سورج کو یہ تمام آسمان سے نازل ہوئے تھے اور آپ کو سجدہ کیا تھا۔ یہودی نے کہا قسم بخدا یہی ان ستاروں کے نام ہیں (2)۔ رایتھم کا کلمہ پہلے رایت کی تاکید ہے یا یہ مستقل کلام ہے اور ان ستاروں کو بیان کرنے کے لئے ہے۔ ستاروں کے لئے صیغہ اور ضمیر ایسی ذکر کی گئی ہے جو عقلا کے لئے ہوتی ہے حالانکہ غیر ذوالعقول ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے ایسا کام کیا تھا جو ذوی العقول کرتے ہیں۔ اس لئے ان کے اس وصف کی وجہ سے ضمیر اور صیغہ ذوالعقول ذکر کئے گئے اور تاویل میں نجوم سے مراد آپ کے بھائی تھے، وہ گیارہ تھے اور ان سے یونہی روشنی حاصل کی جاتی تھی جیسے ستاروں سے حاصل کی جاتی تھی اور الشمس سے مراد آپ کے والد محترم اور القمر سے مراد آپ کی والدہ ماجدہ ہیں۔ السدی کہتے ہیں قمر سے مراد آپ کی خالہ ہے کیونکہ آپ کی والدہ ماجدہ راحیل وصال فرما چکی تھیں۔ ابن جریج فرماتے ہیں القمر سے مراد والد اور شمس سے مراد آپ کی والدہ ہیں کیونکہ شمس مؤنث اور قمر مذکر استعمال ہوتا ہے (3)۔

میں کہتا ہوں شمس کا مؤنث ہونا لفظی ہے جو لغت عرب کے ساتھ خاص ہے۔ پس ماں سے کنایہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ اس کے علاوہ سورج چاند سے زیادہ روشن ہوتا ہے۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ آپ نے جمعہ کی رات کو یہ خواب دیکھا تھا اور وہ لیلۃ القدر تھی۔

قَالَ یٰبُنَیَّ لَا تَقْصُصْ رُءْیَاكَ عَلٰۤى اِخْوَتِكَ فَیَكِیْدُوْا لَكَ كَیْدًاؕ اِنَّ الشَّیْطٰنَ

1۔ مشکوۃ المصابیح: 4894، جلد 3، صفحہ 53 (الفکر) 2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 6 (العلمیہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 255 (الفکر)

لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝

"آپ نے فرمایا اے میرے بچے نہ بیان کرنا اپنا خواب اپنے بھائیوں پر ورنہ وہ سازش کریں گے میرے خلاف بے شک شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔"

بنی ابن کی تصغیر ہے۔ آپ نے یہ بطور شفقت یا ان کی صغرسنی کی وجہ سے بنی فرمایا۔ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت یوسف نے جب خواب دیکھا تھا تو آپ کی عمر مبارک بارہ سال تھی(1)۔ حفص نے یہاں بھی اور سورۃ الصافات میں یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ دوسروں نے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ۔ رؤیا نیند اور استغراق کے ساتھ مختص ہے رؤیا اور رویت میں فرق تانیث کے حروف کے ساتھ ہے جیسے القربۃ اور القربی۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں رؤیا اس صورت منعکسہ کو کہتے ہیں جو قوت متخیلہ کے افق سے حسن مشترک تک پہنچتی ہے اور پھر رؤیا صادقہ یہ جب نفس بدن کی تدبیر سے فارغ ہو کر ملکوت کے ساتھ متصل ہوتا (کیونکہ اس کے ساتھ اس کی مناسبت ہے۔) تو ان معانی کی تصاویر بناتا ہے جو بدن کے ساتھ اتصال کے وقت متصور نہیں ہوتے پھر قوت متخیلہ اس معنی کو مناسب صورت کے ذریعے حکایت کرتی ہے۔ پھر وہ اسے حس مشترک کے ساتھ ارسال کرتی ہے تو اس طرح وہ مشاہدہ ہو جاتی ہے پھر اگر اس معنی کے ساتھ شدید مناسبت یہاں تک کہ کلیت و جزئیت کے سوا کوئی تفاوت نہ ہو تو وہ خواب تعبیر کا بھی محتاج نہیں ہوتا اور اگر شدید مناسبت نہ ہو تو تعبیر کا محتاج ہوتا ہے(2)۔ میں کہتا ہوں خواب یا رؤیا کی تعریف یہ ہے کہ نفس کا نیند استغراق اور اغماء وغیرہ کی حالت میں محسوسات کے مطالعہ سے فارغ اور غافل ہو کر قوت متخیلہ کے افق سے حسن مشترک میں منعکس صورتوں کا مطالعہ کرنا رؤیا ہے، پھر رؤیا کی تین قسمیں ہیں، دو قسمیں باطل ہیں، اور ایک قسم صحیح ہے اور اصل حیثیت سے صالحہ ہے لیکن عوارض کی وجہ سے فاسد ہو جاتی ہے۔ ان عوارض کی وجہ سے اس میں خطا واقع ہوتی ہے اور کبھی اس کی تاویل میں خطا واقع ہوتی ہے۔ پہلی دو باطل اقسام۔1۔ انسان خواب میں وہی صورتیں دیکھتا ہے جو وہ حالت بیداری میں دیکھی تھیں یا وہ غور و فکر کرتا ہے اور اصل کے خلاف صورتیں اختراع کرتا ہے یعنی واقع میں جن کی کوئی اصل نہیں ہوتی اس رؤیا کو حدیث النفس کہا جاتا ہے۔ دوسری باطل قسم وہ ہے جو انسان کے خیال میں شیطان القاء کرتا ہے اسے ڈرانے یا اس کا دل بہلانے کے لئے مثلی شکل اختیار کرتا ہے کیونکہ شیطان انسان میں خون کے چلنے کی طرح چلتا ہے۔ اس لئے اس کو رؤیا سوء اور تخویف الشیطان اور حلم کہتے ہیں۔

تیسری قسم جو صحیح ہوتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے بندے کو خزائن غیب میں کسی چیز پر مطلع کرنا اور اس کا الہام کرنا ہے یا صفات پوشیدہ اور احوال مخفیہ اور درجات قرب وغیرہ میں سے کسی چیز کو خبر کر دینا ہے حتی کہ وہ اس کے لئے بشارت ہوتی ہے۔ حضرت عبادہ بن الصامت سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مومن کا خواب ایک کلام ہے کہ بندہ نیند میں اپنے رب سے کلام کرتا ہے(3)۔ الطبرانی نے اس حدیث کو سند صحیح سے روایت کیا ہے۔ اور الضیاء نے بھی روایت کیا ہے۔ رؤیاء صالحہ کی صوفیاء کے نزدیک حقیقت یہ ہے کہ عالم کبیر کا ایک شخص ہے جس کا نفس، روح اور انسانی ہیئت پر اس کی قوتیں ہیں۔ اسی وجہ سے عالم کو انسان کبیر کہا جاتا ہے اور اسی مشابہت کی وجہ سے انسان کو عالم صغیر کہا جاتا ہے۔ پھر جس طرح عالم صغیر یعنی انسان میں قوت متخیلہ ہوتی ہے اس

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 255 (الفکر)
2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 5، صفحہ 266 (العلمیہ)
3۔ مجمع الزوائد، جلد 7، صفحہ 11728 (الفکر)

طرح عالم کبیر میں بھی قوت متخیلہ ہوتی ہے جس کے ذریعے وہ محسوسات معقولات، اعراض، جواہر، مجردات معانی کا تصور کرتا ہے۔ پس تمام اشیاء حتی کہ واجب تعالیٰ اور اس کی صفات، تمام ممکنات پھر ان میں سے مجردات اور مادیات اور ایسی چیزیں جن کی صورت ہوتی ہی نہیں مثلاً موت، حیات، ایام، سال اور امراض میں صورت متخیلہ میں اللہ تعالیٰ کی ایجاد کے ساتھ موجود ہوتی ہیں۔ اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے بخار کو سیاہ عورت کی شکل پر دیکھا، حضرت یوسف علیہ السلام نے گائیں اور سنابل کی تعبیر سالوں سے فرمائی۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس نظر آنے والی صورت کا محکی عنہ کی جنس سے ہونا شرط نہیں ہے، یا اس کے تمام خصائص پر مشتمل ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ اس نوع سے مناسبت بھی کافی ہے۔ اسی مناسبت ظاہر اور خفیہ کی وجہ سے عالم کبیر کی متخیلہ میں وہ شے اس صورت کے ساتھ متمثل ہوتی ہے۔ اسی مناسبت خفیہ کی وجہ سے حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے والدین اور اپنے بھائیوں کو شمس وقمر اور ستاروں کی صورت میں دیکھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا رؤیا چھ ہیں عورت خیر ہے، اونٹ جنگ ہے، دودھ فطرت ہے، سبزہ جنت ہے، کشتی نجات ہے اور کھجور رزق ہے اس حدیث کو ابو یعلی نے اپنی معجم میں کثیر صحابہ سے سند ضعیف کے ساتھ روایت کیا ہے۔ عالم کبیر یہ قوت متخیلہ اصطلاح صوفیاء میں عالم المثال کہلاتی ہے۔ پھر یہ صورت اسی مناسبت کی وجہ سے عالم کبیر کی متخیلہ سے عالم صغیر یعنی انسان کی قوت متخیلہ فی منعکس ہوتی ہے اور نفس یہ اس وقت دیکھتا ہے جب محسوسات کے مطالعہ سے فارغ ہو۔ انبیاء کرام علیہم السلام ان کے خواب صرف اور صرف اس آخری قسم میں منحصر ہوتے ہیں، کیونکہ وہ شیطان کی دخل اندازی سے پاک ہوتے ہیں وہم کے عارضہ سے بھی منزہ ہوتے ہیں اور اس وجہ سے بھی کہ ان کی نیند آنکھوں تک محدود ہوتی ہے، ان کی آنکھیں سوتی ہیں، دل بیدار ہوتے ہیں۔ پس خیال کی مخترعات کو الہام کے حقائق سے تمیز کر لیتے ہیں۔

پھر نیند کے لئے عوارض مفسدہ جو رؤیا میں خطا کے وقوع کا سبب بنتے ہیں ان کے نہ ہونے کی وجہ سے انبیاء کرام کے خواب یقینی ہوتے ہیں اور ان کے خواب وحی قطعی ہوتے ہیں حتی کہ خلیل اللہ علیہ السلام اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کے لئے تیار ہو گئے جیسے قَالَ یٰبُنَیَّ اِنِّیْۤ اَرٰى فِی الْمَنَامِ اَنِّیْۤ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ؕ قَالَ یٰۤاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۔ (آپ نے فرمایا اے میرے پیارے فرزند میں نے دیکھا ہے خواب میں کہ میں تمہیں ذبح کر رہا ہوں اب بتا تیری کیا رائے ہے عرض کیا میرے پدر بزرگوار کر ڈالئے جو آپ کو حکم دیا گیا ہے۔)

اولیائے کرام جنہوں نے عبادات وریاضات کے ذریعے اپنے نفسوں کو پاک کر لیا ہوتا ہے اور جبلی کدورتوں کو زائل کر چکے ہوتے ہیں اور گناہوں کی تاریکیوں سے منزہ ہوتے ہیں اور اپنے باطن کو نبوت کے انوار کے اقتباس سے روشن کر چکے ہوتے ہیں ان کے خواب صالح اور سچے ہوتے ہیں سوائے چند ایک کے، یہ شاذ و نادر صورت اس وقت بنتی ہے جب وہ کوئی مشتبہات میں سے کوئی چیز کھا لیتے ہیں جس کی وجہ کدورت لاحق ہو جاتی ہے یا ضرورت سے زائد کھا لیتے ہیں۔ اس کی وجہ سے بھی کدورت پیدا ہو جاتی ہے یا کسی گناہ صغیرہ کی وجہ سے کدورت پیدا ہو جاتی ہے کیونکہ اولیاء کرام معصوم نہیں ہوتے یا عوام کی صحبت کے اثر سے کدورت پیدا ہو جاتی ہے۔ اولیاء کرام کے رؤیا، وحی کے مشابہ ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا مومن کا خواب نبوت کا چھیالیسواں جزء ہے[1]' یہ حدیث متفق علیہ ہے اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، حضرت انس اور عبادہ بن الصامت سے مروی ہے۔ امام احمد نے بھی ان تینوں سے روایت کی ہے۔ ابو داؤد اور ترمذی حضرت عبادہ سے، بخاری نے ابو سعید سے، مسلم نے ابن عمر اور ابو

1۔ مشکوٰۃ المصابیح: 4622، جلد 2، صفحہ 522 (الفکر)

ہریرہ رضی اللہ عنہ سے، احمد اور ابن ماجہ نے ابی رزین سے الطبرانی نے ابن مسعود سے ان الفاظ میں روایت کی ہے سچا خواب نبوت کا چھیالیسواں جزء ہے اور ابن ماجہ نے سند صحیح کے ساتھ ابوسعید سے روایت کی ہے نیک مسلمان کا خواب نبوت کا سترواں جزء ہے(1) ابن ماجہ اور احمد نے سند صحیح کے ساتھ ابن عمر سے احمد نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ نیک خواب نبوت کا سترواں جزء ہے۔ ترمذی میں ابورزین کی حدیث میں ہے مومن کا خواب نبوت کا چالیسواں جزء ہے(2) عباس بن عبدالمطلب کی حدیث میں الطبرانی میں ہے نیک مومن کا خواب اللہ تعالیٰ کی بشارت ہے اور یہ نبوت کا پچاسواں جزء ہے(3) ابن عمر کی حدیث میں ابن نجار کے ہاں یہ الفاظ ہیں نبوت کا پچیسواں جزء ہے۔

اگر کوئی یہ کہے کہ خواب نبوت کا چھیالیسواں جزء ہے اس کا کیا مطلب ہے اور احادیث میں تعداد کے اختلاف میں وجہ تطبیق کیا ہے۔ تو ہم کہیں گے کہ حضور نبی کریم ﷺ کی طرف وحی تیئیس سال آتی رہی اور ان میں سے چھ ماہ سچے خواب کے ذریعے وحی آئی، آپ نیند میں جو کچھ دیکھتے تھے۔ صبح کو صبح کے پھوٹنے کی طرح دیکھتے تھے اس لئے فرمایا یہ نبوت کا چھیالیسواں جزء ہے۔ چالیس اور پچاس والی روایات کسر کو پورا کرنے اور کسر کو شمار نہ کرنے پر مبنی ہیں، تقریباً عقود کو لیا گیا ہے اور ستر والی روایت سے مراد مطلق کثرت ہے کیونکہ کثرت کا اطلاق ستر پر ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں ستر سے مراد کثرت لی گئی ہے، ارشاد ہے اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِیْنَ مَرَّةً فَلَنْ یَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ۔ پس معنی یہ ہے کہ وحی کے اجزاء کثیرہ میں ایک جزء ہے اور پچیس والی روایت شاذ ہے۔

عوام کے خواب ان کی نیندیں اگرچہ عالم مثال سے مستفاد ہوتی ہیں لیکن وہ اکثر فاسد اور جھوٹے ہوتے ہیں کیونکہ جبلی نفسانی کدورتوں کی وجہ سے ان کے خیالات بھی مکدر ہوتے ہیں اور کدورات گناہوں کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ پھر کبھی کبھی خواب کی تعبیر میں خطا واقع ہو جاتی ہے۔ جب صورت اور عالم مثال کی تجلی عنہ کے درمیان مناسبت خفیہ ہو اور تعبیر کی صحت اللہ تعالیٰ کے الہام سے ہوتی ہے آیت میں اسی کی طرف اشارہ ہے یعلمک من تاویل الاحادیث یعنی وہ تمہیں خوابوں کی تعبیریں الہام کرے گا اور یہ کیفیت صرف اور صرف نیک صالح اور الہام کے اہل شخص کو حاصل ہوتی ہے، یا تعبیر کی صحت عقل سلیم کے ذریعے ہوتی ہے۔ ترمذی نے سند صحیح کے ساتھ ابورزین سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خواب نبوت کا چالیسواں جزء ہے اور یہ پرندے کے پاؤں پر ہوتا ہے جب تک کسی کے سامنے بیان نہیں کیا جاتا۔ جب اس کو بیان کرتا ہے تو وہ ساقط ہو جاتا ہے۔ پس خواب بیان نہ کرو مگر کسی عقلمند یا حبیب سے(4)۔ بعض روایات میں ہے مگر کسی ایسے شخص سے بیان کرو جو تم سے محبت کرتا ہے۔ ابن ماجہ اور ابوداؤد نے سند صحیح کے ساتھ ان الفاظ میں روایت کی ہے۔ اَلرُّؤْیَا عَلٰی رِجْلِ طَائِرٍ مَالَمْ یُعَبَّرْ فَاِذَا عُبِّرَتْ وَقَعَتْ وَلَا تَقُصَّهَا اِلَّا عَلٰی وَادٍّ اَوْ ذِیْ رَأْیٍ(5)۔

میرے نزدیک طائر سے مراد نوشتہ تقدیر ہے۔ قرآن میں بھی اسی طرح استعمال ہوا ہے كُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِیْ عُنُقِهٖ اور میرے نزدیک اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ مومن کا خواب اللہ تعالیٰ کی قضاء پر مبنی ہے اور اس قدر پر جو اس کے لئے مقدر کی گئی ہے وہ نہیں جانتا کہ اس کے لئے کیا مقدر کیا گیا ہے جب تک وہ اسے بیان نہیں کرتا اور کوئی معبر اس کی تعبیر نہیں بتاتا۔ جب وہ خواب بیان

1۔ سنن ابن ماجہ:3895، جلد4، صفحہ338 (العلمیہ)
2۔ جامع ترمذی:2278، جلد4، صفحہ465 (العلمیہ)
3۔ مجمع الزوائد:11717، جلد7، صفحہ360 (الفکر)
4۔ جامع ترمذی:2278، جلد4، صفحہ465 (العلمیہ)
5۔ سنن ابن ماجہ:3914، جلد4، صفحہ345 (العلمیہ)

کرتا ہے اور معبر تعبیر دیتا ہے الہام کے ذریعے یا رائے کی قوت کے ذریعے یا اس استنباط کے ذریعے جو اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ودیعت ہوتا ہے تو واضح ہو جاتا ہے جو اس کا مقتضی ہوتا ہے اور خواب کسی نیک آدمی سے بیان کرو جو اللہ اور مومنین سے محبت کرتا ہے اور اللہ اور مومنین اس سے محبت کرتے ہوں کیونکہ مومن نیک مومن سے ہی محبت کرتا ہے۔

لبیب سے مراد وہ شخص ہے جو سلیم رائے سے تعبیر دے اور حبیب جو الہام کے ساتھ تعبیر بتائے پس ان دونوں کی تعبیروں میں خطا واقع نہیں ہوتی۔

میں نے خواب کی جو اقسام ذکر کی ہیں وہ احادیث سے مستفاد ہیں۔ ابن ماجہ نے سند صحیح کے ساتھ عوف بن مالک سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خواب تین قسم کے ہوتے ہیں 1۔ شیطان کا خوفزدہ کرنا تاکہ ابن آدم غمگین ہو 2۔ جو انسان عالم بیداری میں دیکھتا ہے وہ عالم خواب میں دیکھتا ہے 3۔ جو نبوت کا چھیالیسواں جز ہوتا ہے(1)۔ ترمذی اور ابن ماجہ نے سند صحیح کے ساتھ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خواب تین ہیں 1۔ اللہ کی طرف سے بشارت، 2۔ حدیث النفس، 3۔ شیطان کا ڈرانا۔ جب تم میں سے کوئی خواب دیکھے اور اسے اچھا لگے تو وہ چاہے تو بیان کر دے اور اگر خواب میں کوئی ناپسندیدہ چیز دیکھے تو وہ کسی کے سامنے بیان نہ کرے اور اسے چاہئے کہ اٹھ کر نماز پڑھے(2) اور میں خواب میں طوق کو ناپسند کرتا ہوں اور قید کو پسند کرتا ہوں اور قید دین میں ثبات ہے۔ مسلم نے حضرت قتادہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نیک خواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے، برا خواب شیطان کی طرف سے ہوتا ہے۔ پس جو کوئی ناپسندیدہ خواب دیکھے تو اسے بائیں جانب تھوک دینا چاہئے اور اللہ تعالیٰ کی شیطان سے پناہ مانگے (یعنی اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم) پڑھے۔ یہ کوئی نقصان نہیں پہنچاتا اور ایسا خواب کسی کے سامنے بیان نہ کرے۔ اگر کوئی اچھا خواب دیکھے تو خوش ہو اور صرف اس سے بیان کرے جو اس سے محبت رکھتا ہو(3)۔ حضرت قتادہ سے صحیحین میں اور ابو داؤد اور ترمذی میں ان الفاظ سے مروی ہے اَلرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ مِنَ اللّٰهِ وَ الْحُلْمُ مِنَ الشَّيْطَانِ فَاِذَا رَاٰى اَحَدُكُمْ شَيْئًا يَكْرَهُهُ فَلْيَنْفُثْ حِيْنَ يَسْتَيْقِظُ عَنْ يَسَارِهٖ ثَلَاثًا وَلْيَتَعَوَّذْ بِاللّٰهِ مِنْهَا فَاِنَّهَا لَا تَضُرُّهٗ(4)۔

ترجمہ: نیک خواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور ڈراؤنا خواب شیطان کی طرف سے ہوتا ہے۔ جب تم میں سے کوئی ناپسندیدہ خواب دیکھے تو بیدار ہو کر تین مرتبہ بائیں جانب تھوک دے۔ پھر اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم پڑھے، وہ برا خواب اسے کوئی نقصان نہ دے گا۔

اگر کوئی یہ پوچھے کہ آپ ﷺ نے تعوذ پڑھنے اور تھوکنے کا حکم کیوں فرمایا؟ ہم کہیں گے اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ شیطان کی تخویفات سے ہوگا تو تعوذ سے اس کے وساوس دفع ہو جائیں گے اور اگر وہ عالم مثال سے ہوگا تو وہ قضاء معلق سے حکایت ہوگا۔ تعوذ باللہ سے قضاء معلق ٹل جائے گی، ان شاء اللہ وہ خواب کوئی ضرر نہیں پہنچائے گا۔ اور حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا کہ وہ کسی کے سامنے اس خواب کو بیان نہ کرے اور اٹھ کر نفل ادا کرے کیونکہ اگر وہ بیان کرے گا تو اس کی تعبیر اس کو خوفزدہ اور پریشان کرے گی۔ پس بہتر یہ ہے کہ وہ نماز اور دعا کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے تاکہ اس خواب کے لئے جو قضاء معلق حکایت کی گئی ہے وہ دفع ہو جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لَا يَرُدُّ الْقَضَاءَ اِلَّا الدُّعَاءُ(5) قضاء کو صرف دعا ہی رد کرتی ہے۔ اس حدیث کو صحیحین میں

1۔ سنن ابن ماجہ:3907، جلد4، صفحہ342 (العلمیہ)
2۔ سنن ابن ماجہ:3907، جلد4، صفحہ342 (العلمیہ)
3۔ صحیح مسلم، جلد15، صفحہ16 (العلمیہ)
4۔ صحیح مسلم، جلد15، صفحہ16 (العلمیہ)
5۔ جامع ترمذی:2139، جلد4، صفحہ390 (العلمیہ)

شیخین نے سلمان سے اور ابن حبان اور حاکم نے ثوبان سے روایت کیا ہے لیکن برے خواب کو بیان کرنے کی نہی نہ تحریکی ہے نہ تنزیہی کیونکہ حضور نبی کریم ﷺ خود ایسے خواب بیان فرمائے ہیں مثلاً آپ ﷺ صحابہ کرام کو جنگ احد کے دن فرمایا میں نے خواب میں اپنی تلوار ذوالفقار کو ٹوٹا ہوا دیکھا ہے اور یہ مصیبت ہے۔ فرمایا میں نے گائے دیکھی ہے جسے ذبح کیا گیا ہے، یہ مصیبت ہے۔ سورۂ آل عمران میں اِذۡ غَدَوۡتَ مِنۡ اَهۡلِكَ کی تفسیر کے تحت حدیث گزر چکی ہے۔ آپ ﷺ کو منبر پر بنی امیہ دکھائے گئے تو آپ نے اسے ناپسندہ خواب شمار کیا یہ بھی آپ ﷺ نے بیان فرمایا تھا۔ سورۃ القدر کی تفسیر میں ہم نے حدیث ذکر کی ہے۔ ابن عباس نے خواب میں حضرت امام حسین کے قتل کو آپ کے قتل ہونے کے دن دیکھا اور اسے بیان فرمایا اس کے متعلق احادیث کثرت سے مروی ہیں۔

میں کہتا ہوں ناپسندیدہ خواب کو بیان کرنے سے نہی اس لئے بھی ہو سکتی ہے تا کہ دشمن خوش نہ ہوں اور اچھے خواب حبیب لبیب کے سوا کسی کے سامنے بیان کرنے کی نہی اس لئے ہے تا کہ دشمن حسد نہ کریں۔ اسی وجہ سے حضرت یعقوب علیہ السلام نے حضرت یوسف علیہ السلام کو بھائیوں کے سامنے اپنا خواب بیان کرنے سے منع فرمایا۔ لَا تَقۡصُصۡ رُءۡيَاكَ عَلٰۤى اِخۡوَتِكَ کہ اپنے بھائیوں پر اپنا خواب بیان نہ کرو۔

1؎ ورنہ وہ تیری ہلاکت کا حسد کی وجہ سے حیلہ کریں گے۔ کید کو لام کے ساتھ متعدی کیا حالانکہ وہ خود متعدی بنفسہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں ضمناً ایک ایسے فعل کا معنی بطور تاکید ذکر کیا گیا ہے جو متعدی بلام ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے اس مصدر کے ساتھ مؤکد فرمایا اور مندرجہ ذیل قول سے اس کی علت بھی بیان فرمائی۔

2؎ شیطان اپنی دشمنی کو ظاہر کرنے والا ہے۔ پس وہ سازشوں جیسے گھناؤنے جرم کو خوشنما بنا کر ظاہر کرتا ہے اور ایسے برے کاموں پر برانگیختہ کرتا ہے۔

وَكَذٰلِكَ يَجۡتَبِيۡكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنۡ تَاۡوِيۡلِ الۡاَحَادِيۡثِ وَيُتِمُّ نِعۡمَتَهٗ عَلَيۡكَ وَعَلٰۤى اٰلِ يَعۡقُوۡبَ كَمَاۤ اَتَمَّهَا عَلٰۤى اَبَوَيۡكَ مِنۡ قَبۡلُ اِبۡرٰهِيۡمَ وَاِسۡحٰقَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ عَلِيۡمٌ حَكِيۡمٌ ۝٦

''اسی طرح چن لے گا تجھے تیرا رب اور سکھا دے گا تجھے باتوں کا انجام (یعنی خوابوں کی تعبیر) اور پورا فرمائے گا اپنا انعام تجھ پر اور یعقوب کے گھرانے پر جیسے اس نے پورا فرمایا اپنا انعام اس سے پہلے تیرے دو باپوں ابراہیم اور اسحٰق پر یقیناً تیرا پروردگار سب کچھ جاننے والا بہت دانا ہے 1؎''

1؎ یعنی جس طرح اس نے تجھے اس خواب کے لئے چن لیا جو فضل و کمال پر دلالت کرتا ہے۔ اسی طرح تیرے رب نے تجھے چن لیا ہے۔ نبوت، بادشاہی اور امور عظیمہ کے لئے الاجتباء یہ جبیت الشیء سے مشتق ہے جس کا معنی کسی چیز کو اپنے لئے مخصوص کر لینا ہے اور جبیت الماء فی الحوض کا معنی جمع کرنا ہے۔

2؎ وہ تجھے خوابوں کی تعبیر کا علم سکھائے گا کیونکہ اگر خواب سچا ہو تو وہ فرشتہ کی بات ہوتی ہے۔ اگر جھوٹا ہو تو شیطان کی بات ہوتی ہے۔ یہاں تعبیر کو تاویل سے ذکر کیا ہے کیونکہ تاویل وہ ہوتی ہے جس کی طرف معاملہ کا انجام لوٹایا جاتا ہے اور جو انسان خواب میں دیکھتا ہے اس کی طرف بھی معاملہ کا انجام لوٹایا جاتا ہے، یا اس کا مطلب ہے کہ اللہ کی کتب کے اسرار اور انبیاء کی سنن کی حکمتوں کی تاویل وہ تمہیں

عطا فرمائے گا۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ مستقل کلام اور تشبیہ سے خارج ہے۔ گویا یوں کہا گیا ہے وھو یعلمک اور ظاہر یہ ہے کہ یہ ما قبل پر معطوف ہے کیونکہ تاویلات کی تعلیم اور اتمام نعمت یہ اجتبا کی اقسام سے ہیں۔ پس یہ عطف الخاص علی العام کے قبیل سے ہو گا۔ ویتم نعمته علیک میں نعمت سے مراد نبوت ہے وعلی آل یعقوب میں بعض علماء فرماتے ہیں آل مراد آپ کے بیٹے ہیں اور آپ کے بیٹے تمام نبی تھے پس اس سے کواکب کی روشنی استدلالاً معلوم ہوگئی۔ بعض فرماتے ہیں اس سے مراد بنی اسرائیل کے انبیاء ہیں کما اتمها میں ھا کا مرجع نعمت ہے علی ابویک سے مراد باپ اور دادا ہیں اور من قبل کا مطلب یہ ہے کہ نعمت کو مکمل کرنے سے پہلے ابراھیم و اسحق یہ ابویک کا عطف بیان ہے۔

۳؎ تمہارا پروردگار جانتا ہے کہ جو اجتباء کا مستحق ہے وہ وہی کرتا ہے جو مناسب اور ایسے کرتا ہے جیسے اسے ہونا چاہئے۔

لَقَدْ كَانَ فِيْ يُوْسُفَ وَاِخْوَتِهٖۤ اٰيٰتٌ لِّلسَّآىِٕلِيْنَ ۝

”بیشک یوسف اور اس کے بھائیوں (کے قصہ) میں ۱؎ (عبرت کی) نشانیاں ۲؎ ہیں دریافت کرنے والوں کے لئے ۳؎“

۱؎ آپ کے دس علاتی بھائی تھے چھ لیا بنت لیان کے بطن سے تھے، یہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے ماموں کی بیٹی تھی۔ ان چھ کے اسماء یہ تھے۔ 1۔ روبیل یہ سب سے بڑا تھا۔ 2۔ شمعون 3۔ لاوی 4۔ یہودا 5۔ ریان 6۔ یشجر اور حضرت یعقوب کی اسی زوجہ سے ایک بیٹی تھی جس کا نام دینہ تھا اور حضرت یعقوب کے چار بیٹے دو کنیزوں زلفہ اور بلہمہ کے بطن سے تھے دان، نفتالی، جاد اور آشر۔ امام بغوی نے اسی طرح لکھا ہے اور مزید لکھا ہے کہ جب لیا فوت ہوگئی تو آپ نے اس کی بہن راحیل سے نکاح کیا اور اس کے بطن سے حضرت یوسف علیہ السلام اور بنیامین پیدا ہوئے۔ اس طرح حضرت یعقوب علیہ السلام کے کل بارہ بیٹے تھے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں بعض علماء نے لکھا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان دونوں بہنوں کو نکاح میں جمع کیا تھا اور اس وقت دو بہنوں سے نکاح کرنا حرام نہ تھا(1)۔

۲؎ ابن کثیر نے اٰیة مفرد پڑھا ہے اور باقی قراء نے جمع پڑھا ہے اور آیات سے مراد اللہ تعالیٰ کی قدرت، اس کی حکمت پر دلائل اور نشانیاں مراد ہیں یا آپ کی نبوت کی علامات مراد ہیں۔

۳؎ امام بغوی لکھتے ہیں یہ اس طرح ہے کہ یہود نے رسول اللہ ﷺ سے حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ کے متعلق دریافت کیا تھا۔ بعض علماء نے لکھا ہے یہود نے آپ ﷺ سے اولاد یعقوب کا کنعان سے مصر کی طرف منتقل ہونے کا سبب پوچھا تھا۔ پس آپ نے پورا واقعہ ذکر فرمایا جو انہوں نے بعینہ تورات کے موافق پایا(2)۔ بعض علماء فرماتے ہیں آپ کے قصہ میں نشانیاں ہیں ہر شخص کے لئے جو سوال کرے اور جو سوال نہ کرے جیسا ارشاد باری تعالیٰ ہے سَوَآءً لِّلسَّآىِٕلِيْنَ۔ بعض فرماتے ہیں اس واقعہ میں عبرت حاصل کرنے والوں کے لئے عبرت کی نشانیاں ہیں کیونکہ یہ واقعہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کے حسد پر پھر ان کی آخرکار شرمندگی وغیرہ پر مشتمل ہے۔ اسی طرح یہ آپ کے خواب اور جو اس خواب سے متحقق ہوا اس پر بھی مشتمل ہے۔ اسی طرح اس میں اشتعال انگیز صورت حال کے وقت حضرت یوسف علیہ السلام کا اپنے جذبات کو قابو میں رکھنا، آپ کی ایام غلامی، قید پھر بادشاہی، اللہ تعالیٰ کی رضا،

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 5، صفحہ 269 (العلمیہ)

2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 258 (الفکر)

حضرت یعقوب علیہ السلام کا حزن وملال پھر انجام کار آپ کا مراد ومقصود تک پہنچنا وغیرہ بہت سی نشانیاں ہیں۔

اِذْ قَالُوْا لَیُوْسُفُ وَ اَخُوْهُ اَحَبُّ اِلٰۤى اَبِیْنَا مِنَّا وَ نَحْنُ عُصْبَةٌؕ اِنَّ اَبَانَا لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنِۚۖ۝۸

''جب بھائیوں نے (آپس میں) کہا کہ یوسف اور اس کا بھائی زیادہ پیارا ہے ہمارے باپ کو ہم [1] سے حالانکہ ہم ایک (مضبوط) جتھہ ہیں [2] یقیناً ہمارے والد (ایسا کرنے میں) کھلی غلطی کا شکار ہیں [3]''

[1] لَیُوْسُفُ پر لام جواب قسم کے لئے ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے واللّٰہ لیوسف اور واخوہ سے مراد وہ ہے جو حضرت یوسف کا باپ اور ماں کی طرف سے بھائی تھا۔ اسی وجہ سے انہوں نے اس کو اضافت کے ساتھ خاص کیا ہے (کیونکہ باقی بھائی آپ کے علاتی تھے سگے نہ تھے) اَحَبُّ اِلٰۤى اَبِیْنَا مِنَّا یہاں احب مفرد کا صیغہ استعمال ہوا ہے کیونکہ افعل واحد، تثنیہ، جمع، مذکر اور مونث ہر ایک کے لئے استعمال ہوتا ہے بخلاف اسم تفضیل کے دوسرے صیغوں کے، کیونکہ معرف بلام کے لئے موصوف کے مطابق ہونا واجب ہوتا ہے اور مضاف ہونے کی صورت میں موصوف کے مطابق اور مفرد دونوں طرح جائز ہوتا ہے۔

[2] فراء کہتے ہیں عصبہ دس اور دس سے زائد کے لئے بولا جاتا ہے۔ بعض فرماتے ہیں ایک سے لے کر دس تک کے درمیان کے لئے ہوتا ہے۔ بعض فرماتے ہیں تین سے دس تک کے درمیان کے لئے ہوتا ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں دس سے پندرہ تک کے لئے ہوتا ہے۔ بعض فرماتے ہیں دس سے چالیس تک کے جتھہ کے لئے استعمال ہوتا ہے(1)۔ قاموس میں اسی طرح لکھا ہے کہ مردوں، گھوڑوں اور پرندوں کا ایسا جتھہ جو دس سے چالیس تک کے درمیان ہو۔ اسی طرح عصابہ (بالکسر) ہے(2)۔ الجزری نے نھایہ میں لکھا ہے عصابہ لوگوں کی ایسی جماعت کو کہتے ہیں جو دس سے چالیس تک کے درمیان ہو۔ عصب، عصبۃ کی جمع ہے جسے عصابہ اور اس کا لفظاً کوئی مفرد نہیں ہے جیسے نفر اور رھط کا لفظاً کوئی مفرد نہیں ہے۔ بعض فرماتے ہیں العصبہ مضبوط جماعت کو کہتے ہیں اور نحن عصبۃ کا معنی یہ ہے کہ ہم ایک ایسی جماعت ہیں جن کی کلام ایک دوسرے کی کلام کے موافق ہے اور جو ایک دوسرے کے معاون ہیں۔

[3] یہاں ضلال سے مراد دین اور عقیدہ کی گمراہی مراد نہیں ہے۔ اگر وہ یہ مراد لیتے تو کافر ہو جاتے بلکہ ان کی مراد تدبیر میں خطا تھی اور اسی کو انہوں نے ضلال سے تعبیر کیا۔ ان کا مفہوم یہ تھا کہ ہم دنیا کے معاملات اصلاح معاش اور جانوروں کی دیکھ بھال کے اعتبار سے ہم زیادہ اپنے والد کے لئے نفع بخش ہیں۔ اس لئے محبت زیادہ ہم سے ہونی چاہئے مگر وہ حضرت یوسف علیہ السلام اور بنیامین سے زیادہ محبت کر کے غلطی کرتے ہیں اور ہمیں چھوڑ کر ان سے زیادہ پیار کہاں کی عقلمندی اور دانشمندی ہے۔

اقْتُلُوْا یُوْسُفَ اَوِ اطْرَحُوْهُ اَرْضًا یَّخْلُ لَكُمْ وَجْهُ اَبِیْكُمْ وَ تَكُوْنُوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ قَوْمًا صٰلِحِیْنَ۝۹

''قتل کر ڈالو یوسف کو [1] یا دور پھینک آؤ اسے کسی علاقہ میں (یوں) تنہا ہو جائے گا تمہاری طرف تمہارے باپ کا رخ اور [2] ہو جانا اس کے بعد (توبہ کر کے) نیک قوم [3]''

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 258 (الفکر)　　2۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 201 (التراث العربی)

1۔ وہب فرماتے ہیں یہ قتل کا مشورہ شمعون نے دیا تھا۔ کعب فرماتے ہیں دان اور مقاتل فرماتے ہیں روبیل نے دیا تھا۔ یہ جملہ اذ قالوا کے قول کے بعد ذکر کیا گیا ہے اور اس قول کی نسبت تمام کی طرف کی گئی ہے حالانکہ کہنے والا ایک تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ تمام اس پر راضی اور خوش تھے سوائے اس کے جس نے قتل نہ کرنے کا مشورہ دیا تھا اور تمام کی طرف اس قول کی نسبت مجازی ہے۔ اکثر کی طرف اس کی نسبت صحیح ہے کیونکہ وہ تمام اس مشورہ سے متفق تھے۔

2۔ یا اسے دور دراز علاقہ میں پھینک آؤ جو آبادی سے منقطع ہو۔ اس طرح وہ اپنے باپ سے دور ہو جائے گا۔ ارضا کی تنکیر اور ابہام کا بھی معنی ہے اور اسی وجہ سے اس کو نصب ظروف مبہمہ کی طرح دی گئی ہے اور یخل لکم۔ یہ آخر کا جواب ہے وجہ ابیکم کا مطلب یہ ہے کہ حضرت یوسف جب نہ ہوں گے تو والد صاحب کی پوری توجہات تمہاری طرف ہوں گی اور کوئی والد صاحب کی محبت میں ہمارا شریک نہ ہوگا۔ وتکونوا اس پر جزم یخل پر معطوف ہونے کی وجہ سے ہے۔ من بعدہ کا مفہوم یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام کے بعد یا قتل یا دور پھینکنے سے فارغ ہونے کے بعد یا ان کے قتل یا ان کو پھینکنے کے بعد۔

3۔ اپنے جرم کی اللہ تعالیٰ سے توبہ کر لینا تو وہ تمہیں معاف فرما دے گا یا یہ مطلب کہ باپ سے صلح کر لینا اور جو تم عذر پیش کرو گے۔ اس کی وجہ سے تمہارے اور والد صاحب کے درمیان صلح ہو جائے گی۔ مقاتل نے اسی طرح لکھا ہے یا یہ معنی کہ پھر اپنے دنیاوی امور درست کر لینا کیونکہ اس کے بعد والد صاحب کی توجہات فقط تمہاری طرف ہوں گی تو وہ تمہاری تنظیم کرے گا۔

قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ لَا تَقْتُلُوْا يُوْسُفَ وَ اَلْقُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ يَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّيَّارَةِ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ۝۱۰

"(یہ سن کر) ان میں سے ایک کہنے والے نے کہا کہ نہ قتل کرو یوسف کو 1 (بلکہ) پھینک دو اسے کسی گہرے کنویں کی تاریک تہہ میں اٹھا لیں گے اسے کوئی راہ چلتے مسافر اگر تم نے کچھ کرنا ہی ہے 2۔"

1۔ یہ کہنے والا یہودا تھا۔ قتادہ فرماتے ہیں روبیل تھا۔ بغوی فرماتے ہیں پہلا قول اصح ہے۔ یعنی کہنے والے نے کہا قتل نہ کرو، یہ بہت بڑا گناہ ہے اور اسے کسی گہرے کنویں میں پھینک دو۔ غیابہ ہر اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں کوئی چیز چھپ جائے اور نظر نہ آئے۔ گہرائی کو غیابہ اس لئے کہتے ہیں کہ جو کچھ وہاں ہوتا ہے دیکھنے والے کو نظر نہیں آتا۔ یہ جمہور کی قرآت ہے لیکن ابو جعفر اور نافع نے غیبت الجب یعنی جمع پڑھا ہے۔ گویا اس کنویں میں کئی گہرائیاں تھیں۔ امام بغوی فرماتے ہیں جب اس کنویں کو کہتے ہیں جو لپٹا ہوا نہ ہو کیونکہ جب کا معنی ہے قطع (کٹا ہوا) جو لپٹا ہوا نہ ہو(1)۔ قاموس میں ہے الجب ایسا کنواں جو انتہائی گہرا اور زیادہ پانی والا ہو یا جو ایسی جگہ پر ہو جو گھاس وغیرہ کے اعتبار سے عمدہ ہو یا وہ جو لپٹا ہوا نہ ہو اور خود بخود بن گیا ہو۔ لوگوں نے اسے نہ کھودا ہو(2)۔

2۔ التقات کا مطلب ہے خفیہ طریقہ سے کوئی چیز اٹھا لینا یہاں تک کہ محسوس نہ ہو۔ تم حضرت یوسف اور حضرت یعقوب کے درمیان صرف جدائی ہی ڈالنا چاہتے ہو تو اسی پھینکنے پر ہی اکتفا کرو۔ محمد بن اسحاق فرماتے ہیں ان بھائیوں کا یہ فعل کئی جرائم پر مشتمل تھا۔ مثلاً قطع الرحم، والد کی نافرمانی۔ ایسے چھوٹے معصوم بچے پر شفقت کی کمی جس کا کوئی گناہ نہیں ہے۔ امانت میں خیانت، ترک عہد، اور اپنے باپ کے ساتھ جھوٹ۔ لیکن ان تمام جرائم کے باوجود اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف فرما دیا تا کہ کوئی مجرم میری رحمت سے مایوس نہ ہو(3)۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 260 (الفکر)
2۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 137 (التراث العربی)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 260 (الفکر)

میں کہتا ہوں اللہ تعالیٰ نے انہیں ان تمام جرائم کے باوجود اس لئے معاف فرمایا تھا کیونکہ وہ اپنے باپ حضرت یعقوب علیہ السلام سے محبت کرتے تھے اور انہوں نے یہ سب جرائم اسی محبت کے باعث کئے تھے کیونکہ وہ خالصۃً اپنے باپ کی محبت اپنے لئے چاہتے تھے اور کسی کو اس میں شریک دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ بعض اہل علم فرماتے ہیں انہوں نے آپ کو قتل کا ارادہ کیا مگر اللہ تعالیٰ نے ان پر رحم کرتے ہوئے انہیں اس فعل سے بچالیا۔ اگر وہ یہ اقدام کر بیٹھتے تو سب ہلاک ہو جاتے اور یہ سب کچھ انہوں نے انبیاء بننے سے پہلے کیا تھا۔ ابوعمرو بن العلاء نے اسی طرح لکھا ہے۔ پس جس نے ان کے انبیاء ہونے کا قول کیا ہے، اس نے نبوت سے قبل نبی سے معصیت کے صدور کو بھی جائز قرار دیا ہے اور اکثر علماء کا قول یہ ہے کہ وہ نبی نہیں تھے اور انبیاء کے شمار میں جو اسباط وارد ہوا ہے۔ اس سے مراد ان کی نسل سے انبیاء بنی اسرائیل ہیں۔ واللہ اعلم

قَالُوْا يٰۤاَبَانَا مَا لَكَ لَا تَاْمَنَّا عَلٰى يُوْسُفَ وَ اِنَّا لَهٗ لَنٰصِحُوْنَ ﴿۱۱﴾

"(یہ طے کرنے کے بعد) انہوں نے (آکر) کہا اے ہمارے باپ کیا ہوا آپ کو کہ آپ اعتبار ہی نہیں کرتے [1] ہم پر یوسف کے بارے میں حالانکہ ہم تو اس کے سچے خیر خواہ ہیں [2]"

[1] لَا تَاْمَنَّا کو ابوجعفر نے اشمام اور روم کو ترک کر کے پڑھا ہے اور باقی قراء نے اشمام کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی ہونٹوں کے ساتھ ضمہ کی طرف اشارہ کر کے پڑھا ہے جیسے کسی پیاری چیز کو بوسہ دینے کے لئے ہونٹوں کو گول کیا جاتا ہے یا روم کے ساتھ پڑھا ہے یعنی پہلے نون کی بعض حرکت پڑھنا یعنی ساکن نہ کرے بلکہ اس کے ساتھ آواز پست کرے اور مدغم اور مدغم فیہ کے درمیان فاصلہ کرے۔ ان کی مراد یہ تھی کہ آپ کیوں خوفزدہ ہیں۔

[2] جب حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان سے حسد کی آگ محسوس کی تھی تو بیٹے اس کلام کے ذریعے یوسف کی حفاظت کے متعلق جو آپ کو خدشہ تھا اس کو دور کرنا چاہتے تھے۔ مقاتل فرماتے ہیں اس کلام میں تقدیم و تاخیر ہے۔ انہوں نے عرض کیا تھا کہ (ارسلہ معنا) آپ اسے ہمارے ساتھ بھیجیں۔ تو ان کے باپ نے کہا انی لیحزننی الایہ مجھے غمزدہ کرتی ہے یہ بات کہ تم اسے لے جاؤ تو اس وقت بیٹوں نے کہا مالک لا تامنا (1)۔ النصح کا مطلب اصلاح کی کوشش کرنا اور خیر مطلوب ہونا ہے۔ بعض فرماتے ہیں النصح سے مراد نیکی کرنا اور مہربانی کرنا ہے۔ یعنی ہم تو ان کی خیر خواہی کا ارادہ کرتے ہیں ہم ان کی حفاظت کریں گے اور آپ تک دوبارہ لوٹا دیں گے۔

اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَّرْتَعْ وَ يَلْعَبْ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿۱۲﴾

"آپ بھیجئے اسے ہمارے ساتھ کل تا کہ خوب کھائے پیئے اور کھیلے کودے اور (کوئی فکر نہ کیجئے) [1] ہم اسکے نگہبان ہیں [2]"

[1] يَّرْتَعْ وَ يَلْعَبْ کو ابوعمرو اور ابن عامر نے دونوں صیغے جو متکلم یعنی نون کے ساتھ پڑھے ہیں اور عین کے جزم کے ساتھ پڑھا ہے نرتع کو رَتَعَ يَرْتَعُ رَتْعًا سے مراد سرسبزی ہے۔ اس کلام سے ان کی مراد یہ تھی تا کہ ہم پھل وغیرہ کھائیں دوڑیں، شکار کریں، اور تیر اندازی کریں وغیرہ جو شریعت میں مباح ہیں۔ ابن کثیر نے دونوں صیغوں میں نون کے ساتھ اور عین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اصل میں نرتعی تھا۔ یہ باب افتعال ہے اور رعی سے مشتق ہے۔ ابوربیعہ اور ابن الصباح نے بروایت قنبل وصلاً اور وقفاً یاء کے اثبات کے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 261 (الفکر)

ساتھ پڑھا ہے اور دوسرے قراء نے دونوں حالتوں میں یاء کے حذف کے ساتھ قنبل سے روایت کیا ہے۔ البزی نے اس کو دونوں حالتوں حذف کے ساتھ پڑھا ہے۔ معنی یہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کی حفاظت کرتے ہیں۔ نافع، عاصم، حمزہ، کسائی اور ابوجعفر نے یاء کے ساتھ غائب کے صیغہ پڑھے ہیں اور دونوں فعلوں کی نسبت حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف ہے مگر نافع اور ابوجعفر یرتع کی عین کو کسرہ دیتے ہیں اور لام کلمہ میں یا کو حذف کرتے ہیں، یعنی یہ ارتعی یرتعی سے مشتق ہے، یعنی یوسف بھی جانور چرائے گا جیسے ہم چراتے ہیں اور باقی عین کو جزم دیتے ہیں اور یرتع سے مشتق ہے۔ معنی یہ ہے کہ وہ کھائے اور کھیلے۔ یعقوب نے نون اور عین کی جزم کے ساتھ پڑھا ہے جیسا کہ ابوعمرو نے پڑھا ہے اور یلعب کو یاء کے ساتھ پڑھا ہے جیسے کوفی پڑھتے ہیں۔

۲۔ ہم کسی مکروہ چیز کے لاحق ہونے سے اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

قَالَ اِنِّیْ لَیَحْزُنُنِیْۤ اَنْ تَذْهَبُوْا بِهٖ وَ اَخَافُ اَنْ یَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ وَ اَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُوْنَ ﴿۱۳﴾

”آپ نے فرمایا بے شک مجھے غمزدہ بناتی ہے یہ بات کہ تم اسے لے جاؤ اور میں ڈرتا ہوں کہ کہیں کھا نہ جائے اس کو بھیڑیا[۱] اور تم (سیر و تفریح کے باعث) اس سے بے خبر ہو[۲]“

۱۔ اِنِّیْ لَیَحْزُنُنِیْۤ کو نافع اور ابن کثیر نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہاں حزن سے مراد دل کا وہ درد ہے جو محبوب کی جدائی اور کم صبری کے باعث محبت کے دل میں اٹھتا ہے، اور لام ابتدائیہ ہے۔

امام بغوی فرماتے ہیں حضرت یعقوب علیہ السلام نے خواب میں دیکھا کہ ایک بھیڑیا نے حضرت یوسف پر حملہ کیا ہے۔ اس لئے آپ کو خوف تھا(1)۔ لیکن میرے نزدیک یہ قول درست نہیں ہے کیونکہ انبیاء کرام کے خواب وحی اور قطعی الوجود ہوتے ہیں۔ اگر آپ نے یہ دیکھا ہوتا تو آپ تحقق اور یقین سے یہ بات کہتے اور یہ احتیاط نفع بخش نہ ہوتا لیکن آپ نے تحقیق کے ساتھ یہ نہیں فرمایا۔ ورش، کسائی، ابوعمرو نے بغیر ہمزہ کے یاء کے ساتھ پڑھا ہے جب توقف کیا جائے لیکن باقی قراء نے دونوں حالتوں میں ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے اور حمزہ نے اصل میں پڑھا ہے کیونکہ ان کے نزدیک ہمزہ متوسط وقف میں خالص حرف سے بدل جاتا ہے۔

۲۔ میں تمہاری سازش اور فریبی کے خیال سے نہیں بلکہ تمہارے لعب ولہو میں مشغول ہونے کی وجہ سے مجھے اس کے کسی مکروہ حالت سے دوچار ہونے کا خوف ہے یا مجھے خوف ہے کہ تم اس کی حفاظت کا خیال نہیں رکھو گے۔

قَالُوْا لَىِٕنْ اَكَلَهُ الذِّئْبُ وَ نَحْنُ عُصْبَةٌ اِنَّاۤ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۱۴﴾

”کہنے لگے اگر کھا جائے اسے بھیڑیا[۱] حالانکہ ہم مضبوط جتھہ ہیں بلاشبہ ہم تو بڑے زیاں کار ہوئے[۲]“

۱۔ الذئب سے مراد جنس ذئب ہے۔

۲۔ یعنی ہم دس طاقتور افراد ہیں ہم سے تو غفلت متصور ہی نہیں ہوسکتی اور لام قسم کا شعور دیتا ہے اور اس کا جواب اِنَّاۤ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ہے۔ یعنی بھیڑیا اسے کھالے گا جبکہ ہم ایک مضبوط جتھہ ہیں یہ جواب شرط کے قائم مقام ہے، یعنی ہم اگر ایک دوسرے کی حفاظت پر ہی قادر نہیں ہیں تو ہمارے جانور ہلاک ہو جائیں گے اور کمزور اور خسارہ اٹھانے والے ہوں گے یا یہ معنی کہ پھر تو ہم مستحق ہیں کہ ہمیں خسارہ کے ساتھ موصوف کیا جائے۔ واؤ حالیہ ہے۔ حضرت یعقوب نے دو وجہ سے ان کے ساتھ یوسف کو بھیجنے سے معذرت کی، ان کی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 262 (الفکر)

جدائی کے غم کی وجہ سے اور بھیڑیئے کے کھانے کے خوف کی وجہ سے انہوں نے آپ کے دوسرے عذر کا جواب دیا پہلے کا نہیں دیا کیونکہ حزن کے دفع پر وہ قدرت بھی نہ رکھتے تھے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ چیز ان کے غصہ کا باعث بنی تھی۔

فَلَمَّا ذَهَبُوا بِهٖ وَ اَجْمَعُوْۤا اَنْ يَّجْعَلُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ ۚ وَ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِاَمْرِهِمْ هٰذَا وَ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝۱۵

"پھر جب (بڑے اصرار سے) اسے لئے گئے اور سب نے یہی طے کر لیا کہ ڈال دیں اسے کسی گہرے کنویں کی تاریک تہہ میں ۱۔ اور (عین اس وقت) ہم نے اس کی طرف وحی کی ۲۔ گھبراؤ نہیں) تم ضرور انہیں آگاہ کرو گے ان کے اس فعل پر اور وہ (تیرے رتبہ عالی کو) نہیں سمجھتے ۳۔"

۱۔ لما کا جواب محذوف جس کا یہ مفہوم ہے انہوں نے اس کے ساتھ وہی کیا جس کا انہوں نے ارادہ کیا تھا۔ امام بغوی فرماتے ہیں لما کا جواب وَ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْهِ الایہ ہے اور واؤ زائدہ ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَلَمَّاۤ اَسْلَمَا وَ تَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ۝ وَ نَادَيْنٰهُ یعنی لما اسلما ناديناه شرط جزا ہیں۔ امام بغوی فرماتے ہیں وہب وغیرہ نے لکھا ہے کہ پہلے تو وہ حضرت یوسف علیہ السلام کو انتہائی عزت واکرام سے لے گئے اور کندھوں پر اٹھا کر لے گئے۔ جب صحرا میں پہنچے تو پھینک دیا اور مارنا شروع کر دیا۔ جب ایک مارتا تو دوسرے سے آپ مدد طلب کرتے پھر دوسرا مارنا شروع کر دیتا۔ آپ نے کسی سے رحم کا جذبہ نہ پایا۔ وہ مارتے رہے، قریب تھا کہ وہ آپ کو قتل کر دیتے۔ آپ چیختے چلاتے تھے اور کہتے تھے اے اباجان کاش آپ دیکھتے کہ لونڈیوں کے بیٹوں نے تیرے بیٹے کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ جب وہ قتل کرنے لگے تو یہودا نے کہا تم نے میرے ساتھ وعدہ نہیں کیا تھا کہ تم اسے قتل نہیں کرو گے۔ پھر وہ آپ کو کنویں پر لے گئے تاکہ اس میں پھینک دیں۔ آپ کی عمر اس وقت بارہ سال تھی اور بعض نے فرمایا اٹھارہ سال تھی۔ وہ آپ کو ایک ایسے کنویں پر لے آئے جو گہرا تنگ منہ تھا۔ مقاتل فرماتے ہیں وہ حضرت یعقوب کی منزل سے تین فرسخ پر لے گئے۔ کعب فرماتے ہیں مدین اور مصر کے درمیان لے گئے تھے۔ وہب فرماتے ہیں اردن کی زمین لے گئے تھے۔ قتادہ فرماتے ہیں وہ بیت المقدس کا کنواں تھا۔ انہوں نے کنویں میں لٹکانا چاہا تو آپ کناروں سے چمٹ گئے۔ پھر انہوں نے آپ کے ہاتھ باندھ دیئے اور آپ کی قمیص بھی اتار لی۔ آپ نے کہا اے میرے بھائیو! مجھے میری قمیص تو واپس کر دو تاکہ میں کنویں میں اس کے ساتھ اپنے جسم کو ڈھانپ لوں۔ وہ کہتے اب سورج، چاند اور ستاروں کو بلاؤ جو تجھے انس دیں۔ آپ نے فرمایا میں نے کچھ نہیں دیکھا۔ پس انہوں نے آخرکار آپ کو کنویں میں پھینک دیا۔ بعض علماء نے لکھا ہے انہوں نے آپ کو ایک ڈول میں بٹھا کر لٹکایا تھا۔ جب آپ کنویں کے درمیان میں پہنچے تو انہوں نے رسی کو چھوڑ دیا تاکہ آپ فوت ہو جائیں۔ کنویں میں پانی تھا۔ آپ اس میں گر گئے۔ پھر آپ نے کنویں کے اندر چٹان کا سہارا لیا اور اس پر ٹھہر گئے۔ بعض نے لکھا ہے کہ انہوں نے جب آپ کو کنویں میں پھینکا تو آپ رونے لگے۔ انہوں نے آپ کو ندا دی تو آپ نے سمجھا کہ اب انہیں رحم آ گیا ہے۔ آپ نے اندر سے جواب دیا۔ پھر انہوں نے پتھر مارے اور قتل کرنے کا ارادہ کیا تو یہودا نے انہیں منع کیا(1)۔ ابن جریر، ابن ابی حاتم نے سدی سے ایک طویل حدیث لکھی ہے کہ یعقوب علیہ السلام کی اولاد شام آئی تھی تو آپ کو صرف یوسف اور بنیامین کا ہر وقت فکر رہتا تھا۔ پس بھائیوں نے حسد کیا یہاں تک کہ اسے صحرا تک لے آئے۔ آگے اسی طرح واقعہ لکھا ہے۔ بعض نے لکھا ہے انہوں نے آپ کو ڈول میں رکھا پھر

۱۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 263 (الفکر)

اسے کنویں میں لٹکا دیا حتی کہ آپ کنویں کے نصف تک پہنچے تو آپ کو مارنے کا ارادہ سے رسی کو چھوڑ دیا۔ کنویں میں پانی تھا۔ آپ اس میں گر گئے۔ پھر آپ نے ایک چٹان کا سہارا لیا اور اس پر ٹھہر کر رونے لگے۔ اس وقت جبرئیل امین وحی لے کر آئے جیسا کہ فرمایا ہے۔

۲ ہم نے آپ کو غمزدہ دل کو تسلی دینے کے لئے وحی کی۔ ظاہر یہ ہے کہ یہ وحی نبی بنانے پیغام پہنچانے اور تبلیغ کے لئے نہیں تھی بلکہ یہ ایسے تھی جیسے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ ماجدہ کو وحی کی گئی تھی۔ ان ارضعیه (کہ اسے دودھ پلاؤ) یہ وحی تبلیغ کے لئے نہ تھی کیونکہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا فَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗۤ اٰتَیْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا (اور جب وہ پہنچے اپنے جوبن کو تو ہم نے عطا فرمائی انہیں نبوت اور علم)۔ ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور ابو الشیخ نے مجاہد سے وَاَوْحَیْنَاۤ اِلَیْهِ کے ارشاد کے متعلق روایت کیا ہے کہ یوسف علیہ السلام کو نبی بنانے کے لئے کنویں میں وحی کی گئی تھی(1)۔

۳ وہ اس وحی اور انس اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اطلاع کو نہیں سمجھتے تھے۔ بعض فرماتے ہیں وہ اس دن کا شعور نہیں رکھتے جس دن آپ انہیں خبر دیں گے آپ یوسف ہیں کیونکہ اس دن آپ کا مرتبہ بہت بلند ہوگا اور ان کے وہم وگمان سے آپ کی شان بلند و بالا ہوگی اور زمانہ کے گزرنے کی وجہ سے آپ کے حالات اور ہیئت بدل چکی ہوگی۔ یہ اسی وقت ہوگا جب وہ آپ کے پاس آئیں گے اور آپ انہیں پہچان لیں گے لیکن وہ آپ کو نہ پہچان سکیں گے۔ امام بغوی لکھتے ہیں یہودا آپ کے پاس کھانا لاتا تھا۔ اور آپ کنویں میں تین راتیں رہے تھے(2) اس وقت آپ کو وحی کی گئی۔ آپ کی طرف جبرئیل کو بھیجا تاکہ وہ وحشت کو دور کرے اور کنویں سے نکلنے کی خوشخبری سنائے اور بتائے کہ آپ انہیں خبر دیں گے جو انہوں نے کیا اور آپ انہیں جزاء دیں گے درآں حالیکہ انہیں خبر تک نہ ہوگی۔

ابن ابی شیبہ اور احمد نے الزہد میں، ابن عبد الحکم نے فتوح مصر میں، ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم، ابو الشیخ، الحاکم اور ابن مردویہ نے حضرت الحسن سے روایت کیا ہے کہ یوسف علیہ السلام اس وقت سترہ سال کے تھے۔ بعض فرماتے ہیں آپ قریب البلوغ تھے۔ آپ کو بچپن میں وحی کی گئی جس طرح حضرت یحییٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کی طرف بچپن میں وحی کی گئی تھی اور القصص میں ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کو جب میں آگ میں ڈالا گیا تو آپ کی قمیص اتار لی گئی تھی۔ جبرئیل امین جنت کے حریر کی قمیص آپ کو پہنائی تھی۔ پھر وہ حضرت ابراہیم نے حضرت اسحق کو دی تھی حضرت اسحق نے حضرت یعقوب کو دی تھی۔ پھر حضرت یعقوب نے اسے تعویذ بنا کر حضرت یوسف کے گلے میں ڈال دیا۔ جبرئیل نے وہاں سے نکال کر آپ کو پہنا دی تھی۔ امام بغوی فرماتے ہیں ابن عباس نے فرمایا کہ بھائیوں نے ایک بکری کا بچہ ذبح کیا اور اس کا خون حضرت یوسف کی قمیص پر لگا دیا تھا(3)۔

وَجَآءُوْۤ اَبَاهُمْ عِشَآءً یَّبْكُوْنَ ﴿۱۶﴾

"اور آئے اپنے باپ کے پاس عشاء کے وقت گریہ زاری کرتے ہوئے ۱"

۱ اہل معانی فرماتے ہیں کہ وہ عشاء کی تاریکی میں آئے تاکہ ان کے جھوٹ پر پردہ پڑ جائے۔ روایت ہے کہ یعقوب علیہ السلام نے ان کی چیخ و پکار سنی تو آپ گھر سے باہر نکلے اور پوچھا بیٹو! کیا تمہاری بکریوں کو کوئی مصیبت لاحق ہوئی ہے۔ انہوں نے کہا نہیں۔ پھر فرمایا پھر تمہیں کیا مصیبت پہنچی ہے اور یوسف کہاں ہے؟

قَالُوْا یٰۤاَبَانَاۤ اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَ تَرَكْنَا یُوْسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَاَكَلَهُ الذِّئْبُۚ وَ

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 14 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 263 (الفکر) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 263 (الفکر)

مَاۤ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَ لَوْ كُنَّا صٰدِقِیْنَ ﴿۱۷﴾

''(آ کر) کہا باوا جی ہم ذرا گئے کہ دوڑ لگائیں [1] اور ہم چھوڑ گئے یوسف کو اپنے سامان کے پاس (ہائے افسوس) کھا گیا اس کو بھیڑیا اور آپ نہیں مانیں گے ہماری بات اگرچہ ہم سچے ہیں [2]۔''

[1] ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ کا یا تو یہ معنی ہے کہ ہم دوڑنے میں مقابلہ کے لئے گئے۔ السدی نے یہی معنی بیان کیا ہے۔ یا اس کا معنی ہے کہ ہم تیر اندازی اور نیزہ بازی کے لئے گئے۔ افتعال اور تفاعل میں اشتراک پایا جاتا ہے جیسے انتضال اور تناضل۔

[2] یعنی ہم یوسف کو اپنے کپڑوں کے پاس چھوڑ کر چلے گئے۔ پیچھے اس کو بھیڑیا کھا گیا اور آپ ہماری بات پر یقین نہیں کریں گے کیونکہ آپ کا ہمارے متعلق گمان کچھ درست نہیں ہے اور یوسف علیہ السلام سے آپ کی محبت بہت شدید ہے۔ اگرچہ ہم آپ کے پاس سچے ہیں لیکن آپ یقین نہیں کریں گے کیونکہ آپ اس واقعہ میں ہمیں متہم کرتے ہیں کیونکہ حضرت یوسف کی محبت میں آپ خود رفتہ ہیں۔ آپ کیسے ہماری بات مانیں گے جبکہ ہمارے متعلق آپ سوء ظن رکھتے ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں آپ ہمارے متعلق سوء ظن رکھنے کی وجہ سے ہماری تصدیق نہ کریں گے یا یہ کہ ہماری سچائی پر کوئی دلیل نہیں ہے، اگرچہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ہم سچے ہیں۔

وَ جَآءُوْ عَلٰى قَمِیْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ ؕ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ؕ فَصَبْرٌ جَمِیْلٌ ؕ وَ اللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ﴿۱۸﴾

''اور لے آئے اس کی قمیص پر جھوٹا خون لگا کر [1] آپ نے فرمایا (غلط کہتے ہو یوں نہیں) بلکہ آراستہ کر دکھایا تمہیں تمہارے نفسوں نے اس (سنگین جرم) کو [2] (اس جانگاہ حادثہ پر) صبر جمیل کروں گا [3] اور اللہ تعالیٰ سے مدد مانگوں گا اس پر جو تم بیان کرتے ہو [4]۔''

[1] کذب یا ذی کذب کے معنی میں یا مکذوب فیہ کے معنی میں ہے یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مبالغہ کے لئے مصدر کے ساتھ صفت لگائی گئی ہو اور علیٰ قمیصہ ظرف کی بناء پر محل نصب میں ہے، یعنی فوق قمیصہ یا دم سے حال ہے اگر ذوالحال کو مجرور پر مقدم کرنا جائز ہو۔

ابن جریر، ابن المنذر اور ابوالشیخ نے حسن سے روایت کیا ہے کہ جب حضرت یعقوب علیہ السلام نے یوسف کی خبر سنی تو آپ چیخے اور یوسف علیہ السلام کی قمیص کے بارے میں پوچھا۔ جب یوسف کی قمیص لائی گئی تو آپ اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگے، آپ نے اس میں کوئی شق اور پھٹن نہ دیکھی۔ پھر فرمایا اے بیٹو! قسم خدا میں نے ایسا حلیم بھیڑیا نہیں دیکھا جو میرا بیٹا کھا گیا ہے اور اس کی قمیص کو سلامت چھوڑ گیا ہے(1) جب آپ کو ان کے جھوٹ کا علم ہو گیا۔

[2] سول سے مشتق ہے جس کا معنی ڈھیلا ہونا ہے۔ قاموس میں ہے کہ الاسول اس شخص کو کہتے ہیں جس کا نچلا حصہ ڈھیلا ہو۔ السولۃ پیٹ وغیرہ کا ڈھیلا ہونا(2)۔ بعض فرماتے ہیں اس کا معنی زینت ہے۔ قاموس میں اسی طرح ہے سول لہ الشیطان۔ شیطان نے اس کو اغوا کیا۔ بعض فرماتے ہیں السول سے مراد وہ حاجت ہے جس پر نفس حریص ہوتا ہے۔ التسویل نفس کا اس چیز کو مزین کرنا جس پر وہ حریص ہوتا ہے اور قبیح چیز کو حسین کی صورت میں پیش کرنا ہے۔

[3] اصل میں امری صبر جمیل ہے یعنی میرا کام تو صبر جمیل ہے۔ بعض فرماتے ہیں اصل میں فَصَبْرٌ جَمِیْلٌ اختارہ ہے یعنی میں صبر جمیل کو

1۔ [illegible] صفحہ 18 (العلمیہ) 2۔ القاموس المحیط، جلد 2، صفحہ 1344 (التراث العربی)

پسند کرتا ہوں۔ امام بغوی فرماتے ہیں صبر جمیل وہ ہوتا ہے جس میں مخلوق کی طرف شکوہ اور جزع فزع نہیں ہوتا(1)۔ ابن جریر نے حبان بن جمیہ سے مرسلاً روایت کی ہے کہ صبر جمیل وہ ہے جس میں شکوہ نہ ہو۔

یوسف کی ہلاکت کے جو تم احتمال بیان کرتے ہو میں اس پر اللہ تعالیٰ سے مدد چاہتا ہوں اور اس مصیبت میں صبر پر بھی، اللہ تعالیٰ سے مدد کا خواستگار ہوں۔ امام بغوی فرماتے ہیں ان کے قصہ میں یہ بھی ہے کہ وہ ایک بھیڑیا پکڑ لائے اور کہا یہ وہ بھیڑیا ہے جس نے یوسف علیہ السلام کو کھایا ہے۔ حضرت یعقوب نے بھیڑیے کو مخاطب ہو کر فرمایا۔ اے بھیڑیے تو نے میرے بیٹے اور میرے دل کے پھل کو کھایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بھیڑیے کو قوت گویائی عطا فرمائی تو اس نے کہا قسم بخدا میں نے تو آپ کے بیٹے کو دیکھا ہی نہیں۔ حضرت یعقوب نے پوچھا تو کنعان کی زمین میں کیسے آیا؟ اس نے کہا میں تو رشتہ داری کے صلہ کے لئے آیا تھا کہ انہوں نے مجھے پکڑ لیا اور یوسف علیہ السلام کنویں میں تین دن رہے(2)۔

وَجَآءَتْ سَيَّارَةٌ فَأَرْسَلُوا وَارِدَهُمْ فَأَدْلٰى دَلْوَهٗ ۖ قَالَ يٰبُشْرٰى هٰذَا غُلٰمٌ ۚ وَأَسَرُّوهُ بِضَاعَةً ۚ وَاللّٰهُ عَلِيمٌۢ بِمَا يَعْمَلُونَ ﴿۱۹﴾

"اور (تھوڑی دیر بعد) ایک قافلہ نے آیا تو اہل قافلہ نے (پانی لانے کے لئے) اپنا آبکش بھیجا۔ اس نے لٹکایا اپنا ڈول [1]، وہ پکار اٹھا مژدہ باد [2] کتنا من موہنا بچہ ہے اور انہوں نے چھپا دیا اسے متاع (گراں بہا) سمجھتے ہوئے [3] اور اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا ہے جو وہ کر رہے تھے [4]"

[1] ایک قافلہ آیا جو مدین سے سفر کر کے مصر کی طرف جا رہا تھا۔ وہ راستہ بھول گئے اور اس کنویں کے قریب پڑاؤ کیا۔ یہ کنواں آبادی سے دور چرواہوں اور مسافروں کے لئے تھا۔ اس کا پانی نمکین تھا لیکن جب یوسف علیہ السلام کو اس میں ڈالا گیا تو وہ پانی میٹھا ہو گیا۔ جب قافلہ والے وہاں اترے تو انہوں نے ایک شخص کو پانی لانے کے لئے بھیجا جو مدین کا باشندہ تھا اور اس کا نام مالک بن دعر تھا۔ وارد اس شخص کو کہتے ہیں جو قافلہ سے آگے پانی لینے کے لئے جاتا ہے اور ادلی کا معنی ہے کنویں میں ڈول لٹکانا اور دلی کا معنی ہے ڈول کنویں سے باہر نکالنا۔ پس اس نے ڈول لٹکایا تو حضرت یوسف علیہ السلام اس کی رسی سے لٹک گئے۔ جب آپ باہر تشریف لائے تو آپ کا حسن و جمال نگاہوں کو خیرہ کر رہا تھا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا حضرت یوسف علیہ السلام کو حسن کا جزء عطا ہوا تھا(3)۔ اس حدیث کو ابن ابی شیبہ، احمد، ابویعلی اور حاکم نے حضرت انس سے روایت کیا ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں کہا جاتا ہے کہ آپ کو یہ حسن و جمال اپنی دادی سارہ سے ملا تھا۔ حضرت سارہ کو حسن کا سدس یعنی چھٹا حصہ ملا تھا۔ ابن اسحق فرماتے ہیں حضرت یوسف اور آپ کی والدہ کا حسن دو ثلث یعنی 2/3 تھا۔ جب مالک بن دعر نے ایسا من موہنا، حسن و زیبائی کا مرقع بچہ دیکھا(4)۔

[2] یٰبُشْرٰی کو کوفیوں نے الف مقصوری کے ساتھ فعلی کے وزن پر پڑھا ہے۔ حمزہ اور کسائی نے امالہ کیا ہے۔ اس نے بشارت کو پکارا اپنے لئے یا اپنی قوم کے لئے۔ گویا یوں کہا اے بلند و ارفع خوشخبری تیرا یہی وقت ہے۔ بعض فرماتے ہیں بشری اس کے ساتھی کا نام تھا۔ اس نے اس کو پکارا تا کہ اس کے نکالنے پر مدد کرے۔ باقی قراء نے یابشری راء کے بعد الف اور الف کے بعد یاء متکلم مفتوحہ بالا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 264 (الفکر)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 265 (الفکر)
3۔ مستدرک حاکم: 4082، جلد 2، صفحہ 622 (العلمیہ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 265 (الفکر)

ضافہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ورش نے الراء کو بین بین اور باقی قراء نے خالص فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

۲؎ مجاہد اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ کنواں رونے لگا تھا جب یوسف علیہ السلام کو اس سے نکالا گیا تھا۔یعنی وارد اور اس کے ساتھیوں نے اس بچہ کو قافلہ والوں سے مخفی رکھا تا کہ کوئی ان میں سے ہمارا اس بچہ میں شریک نہ بن جائے۔بعض فرماتے ہیں انہوں نے یوسف کے معاملہ کو چھپایا اور کہا ہمیں یہ پانی والوں نے دیا ہے تا کہ ہم اسے مصر میں ان کے لئے فروخت کریں۔بعض علماء فرماتے ہیں ضمیر یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کے لئے ہے۔واقعہ اس طرح ہے کہ یہودا ہر روز آپ کے پاس کھانا لاتا تھا۔اسی دن وہ پہنچا تو یوسف علیہ السلام کو کنوئیں میں نہ پایا۔واپس جا کر اپنے بھائیوں کو خبر دی تو وہ اس کی تلاش میں نکل پڑے تو انہوں نے مالک بن دعر اور اس کے ساتھیوں کا پڑاؤ دیکھا۔وہ ان کے پاس آئے یوسف علیہ السلام ان کے پاس تھے۔انہوں نے یوسف علیہ السلام کے معاملہ کی حقیقت کو چھپایا اور کہا یہ ہمارا بھاگا ہوا غلام ہے اور کہا جاتا ہے کہ جب وہ یہ جھوٹ بول رہے تھے۔تو ساتھ یوسف علیہ السلام کو بھی دھمکی دی کہ حقیقت بیان نہ کرنا۔تو حضرت یوسف علیہ السلام قتل کے خوف سے خاموش رہے۔بضاعة کا کلمہ حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے،یعنی انہوں نے اس معاملہ کی حقیقت پر پردہ ڈالا سامان تجارت بنانے کے لئے۔یہ بضع سے مشتق ہے۔وہ مال جو تجارت کی خاطر بضاعت (رضا کارانہ طور) پر دیا جاتا ہے (اس میں فروخت کرنے والے کو کچھ حصہ نہیں ملتا)۔

۳؎ اور اللہ تعالیٰ ان کے اسرار کو جانتا ہے،اس میں سے کوئی راز مخفی نہیں ہے یا جو کچھ بھائیوں نے یوسف علیہ السلام اور اپنے باپ یعقوب علیہ السلام سے کھیل کھیلا ہے وہ اس سے باخبر ہے۔

وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍۭ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ ۚ وَكَانُوْا فِيْهِ مِنَ الزّٰهِدِيْنَ ۝

''اور انہوں نے بیچ ڈالا ۱؎ یوسف کو حقیری قیمت پر ۲؎ چند درہموں کے عوض ۳؎ اور وہ (پہلے ہی) اس میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے تھے ۴؎''

۱؎ یعنی انہوں نے یہ کہنے کے بعد کہ ہمارا بھاگا ہوا غلام ہے اسے فروخت کر دیا۔بعض فرماتے ہیں شری بمعنی اشتری ہے،یعنی اس آب کش اور اس کے ساتھیوں نے یوسف علیہ السلام کو ان کے بھائیوں سے خرید لیا۔

۲؎ بِثَمَنٍۭ بَخْسٍ کے متعلق الضحاک،مقاتل اور السدی فرماتے ہیں اس سے مراد حرام قیمت ہے کیونکہ آزاد کی قیمت حرام ہے۔حرام کو بخس اس لئے کہا جاتا ہے اس میں برکت نہیں ہوتی۔حضرت ابن عباس اور ابن مسعودؓ سے مروی ہے کہ بخس سے مراد کھوٹے سکے ہیں عکرمہ اور شعبی فرماتے ہیں بخس سے قلیل مراد ہے(1)۔

دَرَاهِمَ۔یہ ترکیب نحوی کے اعتبار سے ثمن سے بدل ہے۔معدودة سے مراد قلیل ہے کیونکہ جو اوقیہ تک پہنچتا اسے وزن کرتے تھے اور اس سے کم کو شمار کرتے تھے۔ابن عباس،ابن مسعود اور قتادہ فرماتے ہیں وہ بیس درہم تھے۔تمام بھائیوں نے دو دو درہم تقسیم کر لیے تھے۔مجاہد فرماتے ہیں وہ بائیس درہم تھے۔عکرمہ فرماتے ہیں وہ چالیس درہم تھے(2)۔

۳؎ کیونکہ انہیں معلوم ہی نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس نفس صالحہ کا کتنا مرتبہ ہے۔بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ وہ قیمت سے دلچسپی نہیں رکھتے تھے کیونکہ ان کا مقصد قیمت کا حصول نہیں تھا بلکہ وہ تو صرف یوسف علیہ السلام کو اپنے باپ سے دور کرنا

1۔تفسیر بغوی،جلد 3،صفحہ 267 (الفکر)　　　　2۔تفسیر بغوی،جلد 3،صفحہ 267 (الفکر)

چاہتے تھے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں اگر کانوا کی ضمیر قافلہ والوں کے لئے ہو اور وہ فروخت کرنے والے ہوں تو ان کی عدم دلچسپی کا پتہ اس طرح چلتا ہے کہ انہوں نے اس کو راستہ سے اٹھایا تھا اور ملتقط للشیء۔ اس شی کو حقیر سمجھتا ہے اور اسے چھن جانے کا خوف ہوتا ہے اور اسے فروخت کرنے میں وہ جلدی کرتا ہے اور اگر وہ خریدنے والے ہوں تو وہ یوسف علیہ السلام میں اس لئے دلچسپی نہ رکھتے تھے کیونکہ وہ انہیں بھاگنے والا غلام گمان کرتے تھے۔ فی الزاهدین کے متعلق ہوگا اگر لام تعریف کا بنایا جائے اور اگر لام بمعنی الذی ہو تو محذوف کے متعلق ہوگا جس کو الزاہدین واضح کر رہا ہے کیونکہ صلہ کا متعلق موصول سے مقدم نہیں ہو سکتا(1)۔ پھر مالک بن دعر اور اس کے ساتھی حضرت یوسف کو لے کر چلے تو بھائیوں نے ان کا پیچھا کیا اور کہا کہ اس سے عہد لو کہ یہ نہیں بھاگے گا۔ وہ قافلہ آپ کو لے کر مصر پہنچا۔ اور مالک نے فروخت کرنے کے لئے منڈی میں پیش کیا۔ ابن عباس فرماتے ہیں آپ کو قطفیر نے خریدا تھا۔ بعض فرماتے ہیں اطفیر نے خریدا جو بادشاہ کا وزیر خزانہ تھا اور اسے العزیز کہا جاتا تھا۔ اور اس وقت اور اس کے اردگرد علاقوں کا بادشاہ عمالقہ سے ریان بن الولید بن ثروان تھا۔ بعض نے لکھا ہے کہ اس بادشاہ کا وصال نہ ہوا تھا حتی کہ یوسف علیہ السلام پر ایمان لایا تھا اور یوسف علیہ السلام کے دین کی اتباع کرتا تھا۔ پھر اس کا وصال ہوا جبکہ ابھی یوسف علیہ السلام زندہ تھے۔ ابن عباس فرماتے ہیں جب قافلہ مصر میں داخل ہوا تو قطفیر، مالک بن دعر سے ملا اور اس سے یوسف علیہ السلام کو بیس دینار، ایک جوتا اور دو سفید کپڑوں کے بدلہ میں خرید لیا۔ وھب بن منبہ فرماتے ہیں قافلہ والے یوسف کو مصر کے بازار میں لائے اور بیچنے کیلئے پیش کیا لوگوں نے بولی دینی شروع کی حتی کہ آپ کی ثمن سونا، چاندی، کستوری اور حریر کے چار سو رطل تک پہنچ گئی۔ آپ کی اس وقت عمر مبارک تیرہ سال تھی تو اس قیمت سے قطفیر نے آپ کو خرید لیا(2)۔

وَ قَالَ الَّذِی اشْتَرٰىهُ مِنْ مِّصْرَ لِامْرَاَتِهٖۤ اَكْرِمِیْ مَثْوٰىهُ عَسٰۤى اَنْ یَّنْفَعَنَاۤ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا ؕ وَ كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِیُوْسُفَ فِی الْاَرْضِ ٘ وَ لِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ ؕ وَ اللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰۤى اَمْرِهٖ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱﴾

"اور کہا اس شخص نے جس نے یوسف کو خریدا تھا اہل مصر سے اپنی بیوی کو عزت و اکرام سے اسے ٹھہراؤ[1]۔ امید ہے ہمیں نفع پہنچائے[2] یا بنالیں ہم اسے اپنا فرزند[3] یوں (اپنی حکمت کاملہ سے) ہم نے قرار بخشا یوسف کو (مصر کی) سرزمین[4] میں اور تاکہ ہم سکھادیں اسے خوابوں کی تعبیر[5] اور اللہ تعالیٰ غالب ہے اپنے ہر کام[6] پر لیکن اکثر لوگ (اس حقیقت کو) نہیں جانتے ہے"

[1] قطفیر نے کہا اپنی بیوی راعیل سے، بعض نے اس کا نام زلیخا لکھا ہے۔ مثوی کا لغوی معنی ٹھہرنے کی جگہ ہے اور یہاں مراد مرتبہ و مقام ہے۔ ابن جریج اور قتادہ نے اسی طرح لکھا ہے۔ بعض فرماتے ہیں اس کا معنی کھانے، پینے اور لباس کا پورا اہتمام کرنا ہے۔

[2] ہو سکتا ہے ہم اگر بیچنا چاہیں تو نفع کے ساتھ بیچیں یا یہ معنی کہ ہو سکتا ہے ہماری زمینوں اور اموال وغیرہ کی دیکھ بھال کے لئے ہماری کفایت کرے اور ہمارے مفاد و مصالح کا اس کے ذریعے ظہور ہو۔

[3] قطفیر بے اولاد تھا تو اس نے کہا ہو سکتا ہے ہم اسے اپنا متبنی بنالیں جب اس سے عقل و دانش اور فہم و فراست کے آثار ظاہر ہوں۔

1۔ تفسیر بیضاوی، جلد 5، صفحہ 282 (العلمیہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 68-267 (الفکر)

۴؎ جس طرح ہم نے قتل سے اسے بچایا اور کنویں سے نکالا اور اس کے لئے عزیز مصر کے دل میں محبت کے جذبات ڈال دیئے اسی طرح ہم نے یوسف علیہ السلام کو ہم نے مصر کی سرزمین میں وزیر خزانہ بنایا۔

۵؎ اس کا عطف مضمر کلام پر ہے۔ تقدیر عبارت اسی طرح ہے۔ لیحکم بالعدل و لنعلمہ یعنی اسے نجات دینے اور یہ اعلیٰ مرتبہ بخشنے کا مقصود یہ تھا کہ وہ عدل قائم کرے، لوگوں کی فلاحی امور کی تدبیر کرے لوگوں کو اللہ کی کتاب کے معانی اور احکام سکھائے اور ان احکام کا نفاذ بھی عمل میں لائے یا یہ معنی کہ ہم اسے سکھائیں گے آنے والے حادثات پر دلالت کرنے والے خوابوں کی تعبیر تا کہ ان کے لئے تیاری کی جائے اور ان حادثات کے وقوع سے پہلے ان کی تدبیر کرلی جائے۔ بعض علماء فرماتے ہیں واؤ زائدہ ہے۔

۶؎ ہ ضمیر کا مرجع اسم جلالت ہے، یعنی جو چاہتا ہے وہی کرتا ہے اور اس کے امر کو کوئی چیز رد نہیں کرسکتی اور اس کی چاہت میں کوئی اس کی مخالفت نہیں کرتا۔ بعض فرماتے ہیں ہ ضمیر کا مرجع یوسف علیہ السلام ہیں، یعنی یوسف کے بھائیوں نے آپ کے متعلق کچھ ارادہ کیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے آپ کے متعلق اس کے خلاف ارادہ کیا تو وہی ہوا جو اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمایا تھا۔

۷؎ لیکن اللہ تعالیٰ کی صنعت گری کے لطائف اور اس کے لطف کے اسرار کو اکثر لوگ نہیں جانتے یا یہ معنی کہ اکثر لوگ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ کیا چاہتا ہے اور کیا کرتا ہے۔

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗۤ اٰتَیْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا ؕ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۲۲﴾

"اور جب وہ پہنچے اپنے پورے جوبن کو ۱؎ تو ہم نے عطا فرمائی انہیں نبوت اور علم اس کے ذریعے ۲؎ یونہی ہم نیک جزا دیتے ہیں اچھے کام کرنے والوں کو ۳؎"

۱؎ یعنی جب یوسف علیہ السلام اپنی جوانی اور صلاحیتوں کی انتہا تک پہنچے۔ مجاہد فرماتے ہیں سے مراد تیس سال ہے۔ الکلبی فرماتے ہیں اشد اٹھارہ سے تیس سال کی عمر کے درمیانی حصہ کو کہتے ہیں۔ امام مالک سے اشد کا مفہوم پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا الحلم، یعنی بلوغت ہے(1)۔

۲؎ حکماً سے مراد نبوت ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس سے مراد درست قول ہے اور علماً سے مراد دین میں تفقہ یا خوابوں کی تعبیر ہے۔ بعض فرماتے ہیں حکیم اور عالم میں فرق یہ ہے کہ عالم وہ ہوتا ہے جو اشیاء کو جانتا ہے اور حکیم وہ ہوتا ہے جو علم کے مطابق عمل کرتا ہے۔

۳؎ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں۔ محسنین سے مراد مومنین ہیں آپ سے اس کا معنی مہتدین یعنی ہدایت یافتہ بھی مروی ہے۔ الضحاک فرماتے ہیں جو مصائب پر صبر کرنے والے ہیں(2)۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں اس آیت میں تنبیہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ جزاء عالم شباب میں حسن عمل اور تقویٰ کی بناء پر عطا فرمائی تھی(3)۔

وَ رَاوَدَتْهُ الَّتِیْ هُوَ فِیْ بَیْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ وَ غَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَ قَالَتْ هَیْتَ لَكَ ؕ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّیْۤ اَحْسَنَ مَثْوَایَ ؕ اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۳﴾

"اور بہلانے پھسلانے لگی انہیں وہ عورت جس کے گھر میں آپ تھے کہ ان سے مطلب براری کرے ۱؎ اور (ایک دن) اس نے تمام دروازے بند کردیئے ۲؎ (بصد ناز) کہنے لگی بس آ بھی جا ۳؎ یوسف (پاکباز) نے فرمایا خدا کی پناہ! (یوں نہیں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 269 (الفکر)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 269 (الفکر)
3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 5، صفحہ 286 (العلمیہ)

ہوسکتا) ۳؎ وہ (تیرا خاوند) میرا محسن ہے اس نے مجھے بڑی عزت سے ٹھہرایا ہے ۵؎ بیشک ظالم فلاح نہیں پاتے ۶؎ ''

۱؎ المراودة کسی چیز کی طلب کے لئے آنا جانا۔ اس سے الرائد ہے۔ بعض فرماتے ہیں اس کا مطلب نرمی سے کسی چیز کا طلب کرنا ہے اسی سے روید بمعنی امہل ہے جس کا معنی نرمی کرنا، اور آہستگی اختیار کرنا ہے، اور یہاں مراد حیلہ سازی کرنا ہے۔

ھو سے مراد یوسف علیہ السلام ہیں فی بیتھا میں ھا ضمیر سے مراد عزیز کی بیوی زلیخا ہے۔ عن نفسہ کا مطلب یہ ہے کہ اس نے حیلہ مطلب براری کے لئے کیا۔

۲؎ اس نے دروازے بند کر لئے اور وہ دروازے سات تھے اور غلقت کی تشدید مستقل کلام نہیں ہے تکثیر یا مبالغہ کے لئے ہے۔

۳؎ ہیت لک کو نافع اور ابن ذکوان نے بغیر ہمزہ کے ھاء کے کسرہ اور تاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ہشام نے بھی اسی طرح پڑھا ہے مگر وہ ہمزہ دیتے ہیں اور ان سے تاء کا ضمہ مروی ہے اور ابن کثیر نے ھاء کے فتحہ اور تاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے ھاء اور تاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ قتادہ اور السلمی نے ھاء کے کسرہ اور تاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اسی طرح ہشام سے بھی مروی ہے۔ اس کا معنی ہے تھیئت لک نفسی۔ میں نے تیرے لئے اپنے نفس کو تیار رکھا ہے۔ اس صورت میں لام صلہ کے لئے ہو گا لیکن ابو عمرو اور کسائی نے اسی ترکیب کا انکار کیا ہے، وہ فرماتے ہیں عربوں سے یہ حکایت نہیں ہے اور پہلا قول ہی عربوں کے ہاں معروف ہے۔ ابن مسعود فرماتے ہیں مجھے رسول اللہ ﷺ نے ھیت لک یعنی ھاء اور تاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھایا ہے۔ ابو عبیدہ فرماتے ہیں کسائی کہتے ہیں یہ اہل حوران کی لغت ہے اور حجاز میں در آئی تھی اور اس کا معنی تعال ہے۔ عکرمہ بھی فرماتے ہیں کہ یہ حورانیہ زبان کا لفظ ہے اور اس کا معنی ھلم ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں یہ لغت عرب ہے اور کسی کام پر برانگیختہ کرنے اور متوجہ کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے (1) یہ اسم فعل ہے اور مبنی علی الفتح ہے جیسے این اور لام تبیین کے لئے ہے جیسے سقیا لک میں ہے اور جنہوں نے تاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے انہوں نے اسے حیث کے مشابہہ کی وجہ سے اس طرح پڑھا ہے۔ اس کا تثنیہ، جمع اور مونث کا صیغہ نہیں بنتا۔ ابو عبیدہ نے بھی اسی طرح کہا ہے، فرماتے ہیں قاموس میں ہے ہیت اس کے آخری حرف پر تینوں حرکتیں آسکتی ہیں اور کبھی کبھی اس کی ابتدا کو کسرہ دیا جاتا ہے اور اس کا معنی ھلم ہے (2)۔

۴؎ اس اشتعال انگیزی کے باوجود یوسف علیہ السلام نے اسے فرمایا معاذ اللہ (میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں) یہ مصدر ہے اور اس کا فعل محذوف ہے، یعنی جس کام کی تو مجھے دعوت دیتی ہے اس سے میں اللہ کی حفاظت چاہتا ہوں۔

۵؎ انہ ربی کو نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے ان کے بعد ہ ضمیر، ضمیر شان ہے، یعنی شان یہ ہے کہ میرا مالک قطفیر میرا محسن ہے کیونکہ اس نے اپنی بیوی کو حکم دیا کہ اس کے لباس، طعام کا خصوصی خیال کرنا تو پھر اس کی جزا یہ تو نہیں کہ میں اس کے گھر والوں سے خیانت کروں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ضمیر کا مرجع قطفیر ہو یعنی تیرا خاوند قطفیر جو میرا مالک ہے اس نے مجھے عمدہ ٹھکانا دیا ہے۔ بعض فرماتے ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ ہے، یعنی اللہ تعالیٰ میرا خالق ہے اور اس نے مجھے اچھا ٹھکانا دیا ہے کیونکہ اس نے قطفیر کے دل میں میرے متعلق رافت و شفقت پیدا فرما دی ہے میں اس کی نافرمانی نہیں کرسکتا۔

۶؎ یعنی جو اپنے محسنوں کو برائی کے ساتھ جزا دیتے ہیں وہ کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہاں ظالموں سے مراد زنا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 270 (الفکر) 2۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 282 (التراث العربی)

کار ہیں کیونکہ زانی اپنے نفس پر اور مزنیہ کے اہل پر ظلم کرتا ہے۔ سدی اور ابن اسحٰق فرماتے ہیں جب عزیز کی بیوی نے آپ کو پھسلانے کی کوشش کی اور آپ کے محاسن ذاتی کا تذکرہ شروع کیا۔ پھر اپنے نفس کی طرف رغبت دلانے لگی اور کہا اے یوسف تیرے کاکل مشک بار کتنے حسین ہیں۔ یہ سب سے پہلے میرے جسم سے بکھریں گے۔ اس نے کہا اے یوسف تیری آنکھیں کتنی دلآویز ہیں آپ نے فرمایا یہ دونوں ایسی چیز ہیں جو سب سے پہلے میرے چہرے پر بہیں گی۔ پھر کہنے لگی جناب کا چہرہ کتنا حسین وجمیل ہے۔ فرمایا یہ مٹی کے لئے ہے، وہ اسے کھائے گی۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس نے آپ سے کہا یہ ریشمی بستر بچھا ہے، اٹھئے اور اپنی حاجت پوری کیجئے۔ آپ نے فرمایا پھر تو میرا جنت کا حصہ ضائع ہو جائیگا۔ وہ اسی طرح متواتر آپ کو لالچ دیتی رہی اور لذت کی دعوت دیتی رہی اور حالت یہ تھی کہ آپ کا عنفوان شباب پورے جوبن پر تھا اور آپ کے وہی جذبات تھے جو کسی حسین وجمیل عورت کی دعوت کے وقت کے کسی مرد کے ہوتے ہیں(1)۔ اسی طرف اللہ تعالیٰ کا ارشاد اشارہ کرتا ہے۔

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ؕ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ؕ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۲۴﴾

”اس عورت نے تو قصد کر لیا تھا اس کا اور وہ بھی قصد کرتے اگر نہ دیکھ لیتے [1] (روشن) دلیل [2] یوں ہوا تا کہ ہم دور کر دیں یوسف سے برائی اور بے حیائی کو [3] بیشک وہ ہمارے ان بندوں میں سے تھے جو چن لئے گئے ہیں [4]۔“

[1] یعنی زلیخا نے یوسف کا قصد کیا کہ وہ اس کے ساتھ خواہش نفس کو پورا کرے اور یوسف کا بھی میلان طبع ہو چکا تھا۔ مگر آپ اپنے نفس پر ضبط کئے ہوئے تھے جیسا کہ معاذ اللہ (اللہ کی پناہ) کا قول دلالت کر رہا ہے۔ یہاں ارادہ اختیاری مراد نہیں بلکہ وہ طبعی میلان اور نفس کی خواہش مراد ہے جو تکلیف کے تحت داخل نہیں ہے۔ (یعنی اس کو روکنے کا انسان مکلف نہیں ہے) بلکہ اس میلان کے ہوتے ہوئے نفس پر ضبط مدح اور اجر جزیل کے لائق ہے کیونکہ ملائکہ پر بشر کی فضیلت کا سبب بھی ارادہ کے باوجود نفس فعل سے روکنے کی صلاحیت ہے۔ الشیخ ابومنصور الماتریدی کہتے ہیں۔ یوسف کے ارادہ سے مراد وہ ارادہ ہے جس میں بندے کو اختیار نہیں ہوتا اور اس پر مؤاخذہ بھی نہیں ہوتا۔ اگر یوسف علیہ السلام کا ارادہ ہمارے ارادہ جیسا ہوتا تو اللہ تعالیٰ ان کی مدح نہ فرماتے۔ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ کہ ہمارے چنے گئے بندوں سے تھا۔ بعض اہل حقائق فرماتے ہیں ہم یعنی قلبی ارادہ کی دو قسمیں ہیں (1) ہم ثابت وہ ارادہ جو ثابت ہوتا ہے جس کے ساتھ عزم، رضا اور پختہ عقد ہوتا ہے جیسے عزیز مصر کی بیوی کا ارادہ تھا۔ (2) ہم عارض جیسے ایسا خیال جس میں عزم اور اختیار نہیں ہوتا جیسے یوسف علیہ السلام کا ارادہ تھا اور اس خیال پر بندے کا مواخذہ نہیں ہوتا جب تک کلام نہ کرے یا عمل نہ کرے(2)۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں جب بندہ کسی نیک کام کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو میں اس کی دس نیکیوں کو لکھتا ہوں اور جب کسی برائی کا ارادہ کرتا ہے تو میں اس ارادہ کو معاف کر دیتا ہوں جب تک اس برائی کو کر نہ لے۔ جب برائی کر لیتا ہے تو میں اس کی ایک برائی لکھتا ہوں(3)۔ اس حدیث کو امام بغوی نے ابوہریرہ سے روایت کیا ہے۔ صحیحین اور جامع ترمذی میں یہ الفاظ ہیں اِذَا هَمَّ عَبْدِيْ بِحَسَنَةٍ وَّلَمْ يَعْمَلْهَا كَتَبْتُهَا لَهٗ حَسَنَةً فَاِنْ عَمِلَهَا كَتَبْتُهَا عَشْرَ حَسَنَاتٍ اِلٰى سَبْعِ مِائَةِ ضِعْفٍ وَاِذَا هَمَّ بِسَيِّئَةٍ وَّلَمْ يَعْمَلْهَا لَمْ اَكْتُبْهَا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 271 (الفکر)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 272 (الفکر)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 272 (الفکر)

عَلَيْهِ فَإِنْ عَمِلَهَا كَتَبْتُهَا سَيِّئَةً وَاحِدَةً (1)۔ یعنی جب میرا بندہ نیکی کا ارادہ کرتا ہے اور عمل نہیں کر پاتا تو میں اس کے لئے ایک نیکی لکھتا ہوں اور اگر وہ اس نیک ارادہ کو عملی جامہ پہنا لیتا ہے تو میں دس نیکیوں سے سات سو گنا تک لکھ دیتا ہوں اور جب برائی کا ارادہ کرتا ہوں اور اس پر عمل نہیں کرتا تو میں اس کا کوئی گناہ نہیں لکھتا اور جب برائی کا ارادہ کر لیتا ہے تو میں اس کا ایک گناہ لکھتا ہوں۔

اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہاں ہم بھا کے معنی ہے۔ ارادہ کے قریب ہونے والا۔ اور ھم بھا کی تفسیر میں جو بعض علماء نے لکھا کہ آپ نے ازار کھول دیا تھا اور آپ اس کے قریب اس طرح بیٹھ گئے تھے جس طرح مرد عورت کے پاس بیٹھتا ہے اور جو لکھا ہے کہ آپ نے شلوار کھول دی تھی اور اپنے کپڑے لپیٹنے شروع کر دیئے تھے اور ان اقوال کی نسبت سعید بن جبیر جیسے متقدمین علماء کی طرف کی گئی ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے کلام کا سیاق ان اقوال کی صراحۃً تکذیب کرتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں گناہ صغیرہ اور کبیرہ دونوں کی نفی کی ہے، جبکہ سوء گناہ صغیرہ ہے اور جو علماء کی طرف منسوب اقوال ہیں ان میں گناہ صغیرہ کا ذکر تو یقینی ہے۔ اگر یہ گناہ ہوتے تو آپ کی توبہ واستغفار کا ذکر ہوتا جیسا کہ آدم، نوح، ذی النون اور داؤد علیہ السلام کے لئے توبہ واستغفار کا ذکر ہے کہ حالانکہ ان سے جو کچھ صادر ہوا وہ معصیت کے قصد کے بغیر ہوا تھا۔ جیسا کہ ہر ایک کا ذکر اپنے اپنے مواقع پر ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے صرف برأت کا ذکر کیا ہے فرمایا هِيَ رَاوَدَتْنِيْ عَنْ نَّفْسِيْ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ - اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ۔ یہ تمام ارشادات یوسف علیہ السلام کی پاکدامنی اور عفت کا برملا اظہار کر رہے ہیں۔

ج۔ لولا کا جواب محذوف ہے تقدیر عبارت یوں ہے۔ لجامعها۔ اگر آپ اللہ تعالیٰ کی برہان نہ دیکھ لیتے تو اس کے ساتھ ہم بستر ہو جاتے۔ بعض فرماتے ہیں لولا کا جواب اس سے مقدم ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہے لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ لَهَمَّ بِهَا۔ اگر رب کی برہان نہ دیکھ لیتے تو اس کا قصد کرتے لیکن آپ نے برہان دیکھ لی تھی۔ اس لئے قصد نہیں کیا تھا۔ نحوی اس ترکیب کا انکار کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں لولا ادوات شرط کے حکم میں ہے اور ان کی جزا شرط سے مقدم نہیں ہوتی۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ماقبل کا ھم بھا جواب پر دلیل ہو اور اس صورت میں ھم مذکور کا معنی مشرف الهم ہوگا۔ پس یہ اس قول کی مانند ہے قَتَلْتُهٗ لَوْ لَمْ اَخَفِ اللّٰهَ تقدیر عبارت اس طرح ہے شَارَفْتُ عَلٰى قَتْلِهٖ لَوْلَا اَخَافُ اللّٰهَ لَقَتَلْتُهٗ یعنی میں اس کے قتل کا ارادہ کرنے والا تھا اگر میں اللہ تعالیٰ سے نہ ڈرا ہوتا تو اسے قتل کر دیتا۔

پھر جو برہان آپ نے دیکھی تھی؟ وہ کیا تھی اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ حضرت جعفر بن محمد الصادق فرماتے ہیں برہان سے مراد نبوت ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے سینے میں ودیعت فرمائی تھی۔ پس وہ نبوت آپ کے اس گناہ کے درمیان حائل ہوگئی (2)۔ یہ قول میرے نزدیک سب سے درست ہے۔ قتادہ اور اکثر مفسرین کی رائے یہ ہے کہ آپ نے حضرت یعقوب علیہ السلام کی صورت دیکھی جو کہہ رہے تھے اے یوسف تو بے وقوفوں جیسا کام کرتا ہے جبکہ آپ کا نام انبیاء کرام میں لکھا ہوا ہے (3)۔ حضرت الحسن، سعید بن جبیر، مجاہد، عکرمہ اور الضحاک فرماتے ہیں کمرے کی چھت پھٹ گئی اور آپ نے یعقوب علیہ السلام کو اپنی انگلی کاٹتے ہوئے دیکھا۔ سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ حضرت یعقوب کا مثالی جسم ظاہر ہوا۔ آپ نے یوسف علیہ السلام کے سینہ پر ہاتھ مارا تو آپ کی شہوت انگلیوں کے پوروں سے نکل گئی (4)۔ ابن جریر، ابن ابی حاتم اور ابو الشیخ نے محمد بن سیرین سے روایت کیا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام مثل دکھائی گئی جو اپنی انگلی کاٹ رہے تھے اور فرما رہے تھے یوسف بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم خلیل الرحمٰن تیرا نام انبیاء میں ہے اور تو بے وقوفوں جیسا کام کرتا ہے (5)۔ سدی کہتے ہیں

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 78 (قدیمی) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 273 (الفکر) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 272 (الفکر)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 272 (الفکر) 5۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 23 (العلمیہ)

اے یوسف اس کے ساتھ واقع ہوگا تو بیشک تیری مثال جب تک تو اس فعل میں واقع نہیں ہوا اس پرندے کی مانند ہے جو آسمان کی فضا میں ہے اور پکڑا نہیں جاتا اور تیری مثال جب اس کے ساتھ واقع ہوگا اس جیسی ہوگی جو مرتا ہے اور زمین پر گرتا ہے اور اپنے سے کسی چیز کو دور کرنے کی طاقت نہیں رکھتا اور تیری مثال جب تک تو اس کے ساتھ واقع نہیں ہوا اس مشکل اور سخت بیل کی طرح ہے جس کو پکڑا نہیں جاتا اور تیری مثال اگر تو اس کے ساتھ واقع ہوا تو اس بیل کی مانند ہوگی جس کے سینگوں کی جڑوں میں چیونٹیاں داخل ہوئی ہیں اور وہ ان کو دور کرنے کی طاقت نہیں رکھتا (1)۔ ابن جریر نے قاسم بن ابی بزہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں یہ ندا آئی اے ابن یعقوب اس پرندے کی طرح نہ ہو جانا جس کے پر ہوتے ہیں، جب وہ زنا کرتا ہے تو اس کا کوئی پر نہیں رہتا۔ پس آپ نے ندا سے اعراض نہ کیا۔ اپنا سر اٹھایا تو حضرت یعقوب کو دیکھا وہ اپنی انگلی کاٹ رہے ہیں۔ پس آپ اپنے باپ سے حیاء کی وجہ سے خوفزدہ ہو کر کھڑے ہو گئے (2)۔ مجاہد ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ جبرئیل اترے جبکہ وہ انگلی کاٹ رہے تھے اور کہہ رہے تھے اے یوسف تو بے وقوفوں والا کام کرتا ہے جبکہ اللہ کی بارگاہ میں تو انبیاء میں شامل ہے۔ یہ بھی روایت ہے کہ آپ جبرئیل نے یوسف علیہ السلام کو اپنے پروں سے چھوا تو آپ کی شہوت انگلیوں کے پوروں سے باہر نکل گئی۔ محمد بن کعب القرظی فرماتے ہیں جب یوسف علیہ السلام نے ارادہ کیا تو چھت کی طرف سر اٹھایا تو آپ نے کمرے کی دیوار پر لکھا ہوا پایا لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰۤی اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَ سَآءَ سَبِیْلًا۔ بدکاری کے قریب بھی نہ جاؤ۔ بے شک یہ بڑی بے حیائی ہے اور بہت ہی برا راستہ ہے۔ عطیہ نے ابن عباس سے برھان کے متعلق روایت کیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے ایک فرشتہ کی مثال دیکھی تھی۔ علی بن الحسین رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، فرماتے ہیں کمرے میں ایک بت تھا۔ عورت اٹھی اور اس پر کپڑا ڈال دیا۔ حضرت یوسف نے اسے کہا یہ تو نے کیوں کیا ہے؟ عورت نے کہا مجھے شرم آتی ہے کہ مجھے وہ معصیت پر دیکھے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا کیا تو اس سے حیا کرتی ہیں جو نہ سنتا ہے نہ دیکھتا ہے اور نہ سمجھتا ہے۔ تو پھر میں زیادہ حقدار ہوں کہ میں اپنے رب سے حیا کروں۔ یہ کہہ کر آپ بھاگ نکلے (3)۔

سے یوں ہوا یا ہم نے ایسا کیا تا کہ ہم یوسف سے دور کر دیں۔ گناہ صغیرہ کو اور گناہ کبیرہ کو بھی۔

سے الْمُخْلَصِیْنَ نافع اور کوفیوں نے لام کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے جہاں بھی معرف باللام واقع ہوا ہے۔ یعنی وہ ہمارے ان بندوں سے ہے جو نبوت کے لئے چنے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی ذات کے لئے خاص کیا ہے اور باقی قراء نے لام کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے یعنی خالصۃ وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور عبادت کرنے والے ہیں۔

وَ اسْتَبَقَا الْبَابَ وَ قَدَّتْ قَمِیْصَهٗ مِنْ دُبُرٍ وَّ اَلْفَیَا سَیِّدَهَا لَدَا الْبَابِ ؕ قَالَتْ مَا جَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْٓءًا اِلَّاۤ اَنْ یُّسْجَنَ اَوْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۲۵﴾

”اور دونوں دوڑ پڑے دروازہ کی طرف لے اور اس عورت نے پھاڑ ڈالا اس کا کرتہ پیچھے سے اور (اتفاق ایسا ہوا کہ) ان دونوں نے کھڑا پایا اس کے خاوند کو دروازے کے پاس ۲ جھٹ بول اٹھی (میرے سرتاج بتایئے) کیا سزا ہے اس کی جو ارادہ کرے تیری بیوی کے ساتھ برائی کا بجز اس کے کہ اسے قید کر دیا جائے یا اسے دردناک عذاب دیا جائے ۳“

لہ یہاں حرف جر کو حذف کر کے فعل کو بلا واسطہ مجحول کے ساتھ ملا دیا گیا ہے۔ اصل میں و استبقا الی الباب تھا۔ یا استبقا کے ضمن

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 272 (الفکر) 2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 24-23 (العلمیۃ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 273 (الفکر)

میں ابتدر کا معنی پایا جاتا ہے اس تضمین پر دلالت کرنے کیلئے حرف جر کو حذف کیا گیا۔ یعنی تسابق یوسف و زلیخا الی الباب۔ جب یوسف علیہ السلام اس سے بھاگے تا کہ اس سے نکل جائیں تو وہ پیچھے تیزی سے دوڑی کہ یوسف کو نکلنے سے منع کرے۔ اس نے پیچھے سے آپ کی قمیص کو پکڑ لیا اور اپنی طرف کھینچا حتی کہ آپ نکل نہ سکے۔ یہاں باب کو مفرد ذکر کیا گیا ہے جبکہ غلقت الابواب میں جمع ذکر کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں وہ دروازہ مراد لیا گیا ہے جو گھر سے نکلنے کا تھا۔ جب یوسف علیہ السلام بھاگے تو دروازے ٹوٹتے گئے اور تالے کھلتے گئے اور گرتے گئے۔

۲۔ القد طولاً کاٹنے کو اور القط عرضاً کاٹنے کو کہتے ہیں جب دونوں نکلے تو دونوں نے عورت کے خاوند قطفیر کو دروازے پر موجود پایا۔ امام بغوی فرماتے ہیں انہوں نے قطفیر کو دروازے پر زلیخا کے چچازاد بھائی کے ساتھ بیٹھا ہوا پایا۔ بعض فرماتے ہیں وہ دروازے سے داخل ہو رہا تھا۔ جب اس نے اسے دیکھا تو ڈر گئی (1)۔

۳۔ جھٹ اپنے خاوند کے سامنے اپنے نفس کی پاکیزگی کا اقرار کرنے لگی اور یوسف علیہ السلام پر عیب لگا کر خاوند کو انتقام پر بھڑکانے لگی۔ یعنی اس کی کیا جزاء ہے جو تیری بیوی کے ساتھ زنا کا ارادہ کرتا ہے۔ ما نافیہ ہے یا استفہامیہ بمعنی ای شیء ہے۔ جب یوسف علیہ السلام نے اس کی جھوٹی باتیں سنیں تو آپ نے اس کی کلام کا رد کرتے ہوئے فرمایا۔

قَالَ هِيَ رَاوَدَتْنِي عَنْ نَّفْسِي وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ أَهْلِهَا ۚ إِنْ كَانَ قَمِيصُهُ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَهُوَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۲۶﴾

"آپ نے (جواباً) فرمایا (میں نے نہیں بلکہ) اس نے بہلانا چاہا ہے مجھے کہ مطلب براری کرے ۱؎ اور گواہی دی ایک گواہ نے جو اس عورت کے خاندان سے تھا ۲؎ (کہ دیکھو!) اگر یوسف کی قمیص آگے سے پھٹی ہوئی ہے تو اس نے سچ کہا ہے اور وہ جھوٹوں میں سے ہے ۳؎"

۱۔ فرمایا اس نے مجھ سے بے حیائی کے ارتکاب کا مطالبہ کیا آپ نے یہ اس کا رد کرتے ہوئے کہا کیونکہ اس نے قید اور عذاب کو آپ پر پیش کیا، اگرچہ یوسف علیہ السلام کے قول کی اس عورت نے تکذیب نہیں کی تھی۔

۲۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ وہ گواہی دینے والا چچا کا بیٹا تھا۔ بعض نے فرمایا زلیخا کے خالو کا بیٹا تھا۔ سعید بن جبیر اور الضحاک فرماتے ہیں وہ بچہ تھا جسے اللہ تعالیٰ نے پنگھوڑے میں قوت گویائی عطا فرمائی تھی۔ امام بغوی فرماتے ہیں اور یہ عوفی کی ابن عباس سے اور انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کی ہے کہ چار شخص بچپن میں بولے تھے۔ 1۔ فرعون کی بیٹی کو کنگھی کرنے والی کا بیٹا 2۔ حضرت یوسف کا گواہ 3۔ جریج کا ساتھی 4۔ عیسیٰ بن مریم (2)۔ محمد بن محمد السعاف نے بیضاوی کی تخریج میں یہی حدیث نقل کی ہے۔ احمد نے اپنی مسند میں ابن حبان نے اپنی صحیح میں حاکم نے مستدرک میں روایت کی ہے اور صحیح کہا ہے۔ حاکم نے ابو ہریرہؓ سے بھی روایت کی ہے اور لکھا ہے کہ یہ شیخین کی شرط پر صحیح ہے اور الطیبی اس پر مطلع نہ ہوئے اور فرمایا صحیحین کی حدیث جو ابو ہریرہؓ سے مروی ہے وہ اس بات کا رد کرتی ہے کیونکہ اس میں ہے کہ پنگھوڑے میں صرف تین شخصوں نے بات کی تھی، عیسیٰ بن مریم، جریج والا بچہ اور وہ بچہ جس کو اس کی ماں دودھ پلا رہی تھی۔ ایک سوار گزرا جو بہت خوش شکل تھا۔ ماں نے کہا اے اللہ میرے بچے کو فلاں کی مثل بنا دے۔ بچے نے کہا اے اللہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 75-274 (الفکر)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 275 (الفکر)

تعالیٰ مجھے ایسا نہ بنا۔پس مذکورہ افراد کی اضافت سے کل پانچ افراد ہو گئے۔امام سیوطی فرماتے ہیں پانچ سے بھی وہ زیادہ تھے۔صحیح مسلم میں ہے کہ اصحاب الاخدود (کھائی والے) کے قصہ میں بھی بچے نے کلام کی تھی۔فرماتے ہیں میں نے پنگھوڑے میں بات کرنے والوں کی تعداد جمع کی ہے وہ گیارہ تک پہنچی ہے پس میں نے ایک قطعہ لکھا ہے۔

تَكَلَّمَ فِي الْمَهْدِ النَّبِيُّ مُحَمَّدٌ	وَيَحْيٰى وَعِيْسٰى وَالْخَلِيْلُ وَ مَرْيَمُ
وَمُبَرِّىْ جُرَيْجٍ ثُمَّ شَاهِدُ يُوْسُفَ	وَطِفْلٌ لَدَى الْاُخْدُوْدِ يَرْوِيْهِ مُسْلِمُ
وَطِفْلٌ عَلَيْهِ مُرَّ بِالْاَمَةِ	اَلَّتِيْ يُقَالُ لَهَا تَزْنِيْ وَلَا تَتَكَلَّمُ
مَاشِطَةٌ فِيْ عَهْدِ فِرْعَوْنَ طِفْلُهَا	وَفِيْ زَمَنِ الْهَادِي الْمُبَارَكِ يَخْتِمُ

اس شاہد نے کہا (1)۔

سے اگر قمیص آگے سے پھٹی ہوئی ہے تو وہ سچی ہے اور وہ جھوٹوں میں سے ہے کیونکہ یہ دلیل ہے کہ اس نے عورت کا قصد کیا تو عورت نے اپنا دفاع کرنے کے لئے آگے سے قمیص کو پھاڑ دیا یا یہ کہ یوسف نے اس کو پیچھے سے پکڑتے کے لئے جلدی کی تو دامن سے اٹک گئے اور گریبان خود بخود پھٹ گیا۔

وَ اِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَهُوَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝

''اور اگر اس کی قمیص پھٹی ہوئی ہو پیچھے سے تو پھر اس نے جھوٹ بولا اور یوسف سچوں میں سے ہے لے۔''

لے اگر قمیص پیچھے سے پھٹی ہے تو وہ جھوٹی ہے اور وہ سچوں میں سے ہے کیونکہ پیچھے سے پھٹا ہوا ہونا دلیل ہے کہ عورت نے یوسف کا پیچھا کیا اور اس کے کپڑے کو کھینچا اور پیچھے سے کپڑے کو پھاڑ دیا جملہ شرطیہ قول کے ارادہ سے خبر یہ ہے، یا اس لئے کہ شہادت کا فعل قول سے ہے اس کو شہادت اس لئے کہا ہے کیونکہ اس کلام نے شہادت کا مواد مہیا کیا تھا۔یہاں کلام میں ان اور کان کو جمع کیا گیا ہے کیونکہ معنی یہ ہے کہ اگر تجھے معلوم ہو جائے کہ قمیص اس طرح پھٹی ہوئی...... اس کی مثال یہ ہے کہ اگر تو مجھ پر احسان کرے تو میں اس سے پہلے تجھ پر احسان کر چکا ہوں کیونکہ اس کا معنی یہ ہے کہ اگر تو مجھ پر اپنا احسان جتلاتا ہے تو میں اپنے سابق احسان کی وجہ سے تم احسان جتلاتا ہوں۔

فَلَمَّا رَاٰ قَمِيْصَهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ اِنَّهٗ مِنْ كَيْدِكُنَّ ؕ اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ ۝

''پس جب عزیز نے دیکھا پیرا ہن یوسف کو کہ پھٹا ہوا ہے پیچھے سے تو بول اٹھا یہ سب تم عورتوں کا فریب ہے لے بیشک تم عورتوں کا فریب بڑا (خطرناک) ہوتا ہے ہے۔''

لے قمیص پیچھے سے پھٹی ہوئی ہے تو اسے اپنی بیوی کی خیانت اور یوسف کی براءت کا علم ہو گیا۔تو قطفیر نے زلیخا سے کہا یعنی برائی یا یہ امر یا تیرا یہ قول کہ کیا جزاء ہے جس نے تیری بیوی سے برائی کا ارادہ کیا، تمہارے فریبوں اور مکروں سے ہے۔خطاب کی جمع ضمیر اس عورت اور اس جیسی دوسری عورتوں کے لئے ہے یا تمام عورتوں کے لئے ہے۔

سے بے شک تم عورتوں کا فریب بڑا (خطرناک) ہوتا ہے کیونکہ ان کا ظاہر کمزور ہوتا ہے اور ان کے صدق وسچائی پر دلالت کرتا ہے اور ان کا باطن خبیث اور ٹیڑھا ہوتا ہے کیونکہ عورت آدم کی پسلی سے پیدا کی گئی اور ان کی عقل کم اور ان کا دین ناقص ہوتا ہے اور عقول سلیمہ

1۔تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 5، صفحہ 292 (العلمیہ)

اور دین قویم بھی ممنوع چیز سے ان کو نہیں روک سکتا۔

ان کے ساتھ شیطان ہوتا ہے مردوں کے ساتھ سازش کرتی ہیں اور شیطان ان کے ذریعے چوری چھپے وسوسہ اندازی کرتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عورتیں شیطان کا جال ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا میں نے دین وعقل کے اعتبار سے ناقص کوئی نہیں دیکھا جو تم سے زیادہ ایک محتاط آدمی کی عقل کو لے جانے والا ہو۔ بعض علماء سے مروی ہے کہ وہ فرماتے ہیں شیطان سے زیادہ عورتوں سے ڈرتا ہوں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے شیطان کی سازش اور حیلہ سازی کو کمزور کہا ہے۔ فرمایا اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا اور ان کے مکروفریب کو عظیم کہا ہے اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ۔

يُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۜ وَاسْتَغْفِرِيْ لِذَنْۢبِكِ ۖ اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِـِٕيْنَ ۝۲۹

"اے یوسف (پاکباز) اس بات کو جانے دو اور (اے عورت) اپنے گناہ کی معافی مانگ بیشک تو ہی قصور داروں میں سے ہے ا۔"

ا یُوْسُفُ اصل میں یا یوسف تھا یعنی اے یوسف اس بات کا کسی سے تذکرہ نہ کرنا کہ بدنامی عام نہ ہو۔ اور اے زلیخا تو بھی اپنے گناہ کی معافی مانگ تو گناہ گاروں سے ہے۔ یہ خطیئی سے مشتق ہے جس کا معنی جان بوجھ کر گناہ کرنا ہے۔ یہاں من الخاطئات نہیں کہا کیونکہ یہاں اس نے عورتوں کے متعلق خبر کا قصد نہیں کیا بلکہ اس نے ہر اس شخص کے متعلق خبر دینے کا قصد کیا۔ جس نے ایسا کیا خواہ وہ مرد ہو یا عورت اسی طرح مذکر کا صیغہ ذکر کیا مذکروں کو غلبہ دیتے ہوئے اس کی مثال قرآن کریم میں بھی ہے وَكَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِيْنَ وَاِنَّهَا كَانَتْ مِنْ قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ عزیز حلیم الطبع تھا اور غیرت کا مادہ کچھ کم رکھتا تھا۔ اسی لئے تو اس نے سیدھا بیوی کو خطاب کرنے کے بجائے تمام عورتوں کی طرف کید کی نسبت کی۔

وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِيْنَةِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ تُرَاوِدُ فَتٰىهَا عَنْ نَّفْسِهٖ ۚ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا ۭ اِنَّا لَنَرٰىهَا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝۳۰

"اور کہنے لگیں عورتیں ا شہر میں کہ عزیز کی بیوی بہلاتی ہے ۲ اپنے (نوجوان) غلام کو تا کہ اس سے مطلب براری کرے اس کے دل میں گھر کر گئی ہے اس کی محبت ہم دیکھ رہی ہیں اسے کہ کھلی گمراہی میں ہے ۳"

ا نسوۃ امراۃ کی اسم جمع ہے۔ پس اس اعتبار سے اس کی تانیث اس اعتبار سے غیر حقیقی ہے۔ اسی وجہ سے فعل مذکر ذکر کیا گیا اور فی المدینۃ۔ قال کی ظرف ہے یا نسوۃ کی صفت ہے، یعنی جب یوسف علیہ السلام اور زلیخا کی مطلب براری کا واقعہ مصر میں پھیل گیا تو عورتیں کہنے لگیں۔ مقاتل فرماتے ہیں کہ ان سے مراد پانچ عورتیں ہیں جو کیدار کی بیوی، پانی لانے والے کی بیوی، روٹی پکانے والے کی بیوی، جیل کے داروغے کی بیوی اور جانور چرانے والے کی بیوی(1)۔

۲ یعنی عزیز کی بیوی بہلاتی ہے اپنے کنعانی غلام کو عن نفسہ اپنی مطلب براری کے لئے قد شغفھا حبا۔ یعنی یوسف نے اس کے دل کے پردوں کو پھاڑا ہے اور اس کے دل میں اس کی محبت نے ڈیرہ ڈال دیا ہے۔ حبا نسبت سے تمیز ہے یعنی اس کی محبت زلیخا کے دل میں داخل ہو گئی ہے۔ السدی کہتے ہیں شغاف اس باریک پردے کو کہتے ہیں جو دل پر لپٹا ہوتا ہے۔ الکلبی کہتے ہیں یوسف علیہ السلام کی محبت اس کے دل پر اس طرح چھا گئی تھی کہ وہ اس کے علاوہ کسی چیز کو کچھ سمجھتی ہی نہیں تھی(2)۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 77-276 (الفکر)   2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 277 (الفکر)

ؔ ہم اس رشد و صواب سے بہت دور دیکھتی ہیں اور اس کی عقل و فہم سے بیگانگی واضح ہے کیونکہ اس نے شاہی بیگمات کی پاکدامنی اور عصمت کو تار تار کر دیا ہے۔

فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ أَرْسَلَتْ إِلَيْهِنَّ وَأَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَأً وَآتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّينًا وَقَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ ۖ فَلَمَّا رَأَيْنَهُ أَكْبَرْنَهُ وَقَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ وَقُلْنَ حَاشَ لِلَّهِ مَا هَٰذَا بَشَرًا إِنْ هَٰذَا إِلَّا مَلَكٌ كَرِيمٌ ﴿٣١﴾

”پس جب زلیخا نے سنا ان کی مکارانہ باتوں کو ۱؎ تو اس نے انہیں بلا بھیجا اور ۲؎ تیار کیں ان کے لئے مسندیں ۳؎ اور (جب وہ آ گئیں تو) دے دی ہر ایک کو ان میں سے ایک ایک چھری ۴؎ اور یوسف کو کہا کہ (ذرا) نکل (تو) آ ؤ ان کے سامنے ۵؎ پس جب (یوسف آئے اور) انہوں نے اس کو دیکھا تو اس کی عظمت (حسن) کی قائل ہو گئیں ۶؎ اور (وارفتگی کے عالم میں) کاٹ بیٹھیں اپنے ہاتھوں کو اور کہا انہیں سبحان اللہ یہ انسان نہیں بلکہ یہ تو کوئی معزز فرشتہ ہے ۸؎“

۱؎ جب زلیخا نے ان کی رشک آمیز باتوں کو سنا ان کے رشک کو مکر کہا گیا ہے کیونکہ انہوں نے اس قول کو چھپایا تھا جیسے مکر کرنے والا اپنے مکر کو چھپاتا ہے۔ ابن اسحٰق کہتے ہیں انہوں نے یہ مکر اس لئے کیا تھا تا کہ وہ انہیں یوسف کا دیدار کرائے جس کے حسن و جمال کا تذکرہ وہ صبح و شام ان کے سامنے کرتی ہے۔ بعض علماء نے لکھا ہے اس سے اس کا راز ان کے سامنے افشا ہو گیا تھا۔ پھر انہوں نے اسے چھپائے رکھا پھر افشا کیا۔ اس لئے اسے مکر سے تعبیر کیا گیا ہے (1)۔

۲؎ تو زلیخا نے ان کو دعوت دی وہب کہتے ہیں اس نے ایک پر تکلف شاہی کھانا تیار کیا اور ان چالیس عورتوں کو مدعو کیا جنہوں نے اسے یوسف پر فریفتگی کا طعنہ دیا تھا (2)۔

۳؎ اور ان کے لئے مخملی مسندیں بچھا دیں۔ ابن عباس سعید بن جبیر، حسن، قتادہ، اور مجاہد فرماتے ہیں متکا سے مراد کھانا ہے۔ کھانے کو متکا اس لئے کہا ہے کیونکہ کھانے والے جب بیٹھتے ہیں تو تکیوں پر ٹیک لگاتے ہیں۔ پس کھانے کو استعارۃ مسند سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کہتے ہیں اتکانا عند فلان۔ ہم نے فلاں کے پاس کھانا کھایا (3) اور ٹیک لگا کر کھانا کھایا متکبرین کی عادت تھی اس لئے رسول اللہ ﷺ نے بائیں ہاتھ سے کھانے (4) اور ٹیک لگا کر کھانا کھانے سے منع فرما دیا۔ اس حدیث کو ابن ابی شیبہ نے اپنی مصنف میں حضرت جابر سے روایت کیا ہے۔ بعض فرماتے ہیں متکا اس کھانے کو کہا جاتا ہے جسے ٹکڑے ٹکڑے کیا جاتا ہے۔ گویا کاٹنے والا چھری پر سہارا لیتا ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں اس سے مراد اترج یعنی ترنج ہے۔ مجاہد سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ بعض فرماتے ہیں لغت حبشی میں ترج سے ترنج مراد ہے۔ عکرمہ اور ابو زید الانصاری کہتے ہیں ہر وہ چیز جو چھری سے کاٹ کر کھائی جاتی ہے وہ عربوں کے نزدیک متک ہے اور المتک اور البتک، میم اور باء کے ساتھ ہو تو اس کا معنی کاٹنا ہے (5)۔

امام بغوی فرماتے ہیں عزیز مصر کی بیوی نے رنگ برنگے پھلوں اور کھانوں سے دستر خوان چن دیا اور گاؤ تکیے لگا دیے پھر عورتوں کو دعوت دی (6)۔

۴؎ جب وہ آ گئیں تو ان میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں ایک چھری دے دی۔ جب وہ گوشت کو چھری سے کاٹنے لگیں و قالت تو زلیخا نے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 277 (الفکر) | 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 277 (الفکر) | 3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 277 (الفکر)
4۔ مصنف ابن ابی شیبہ، جلد 5، صفحہ 133 (الزمان) | 5۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 278 (الفکر) | 6۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 278 (الفکر)

کہا۔ ابو عمرو، عاصم اور حمزہ نے وصلاً تاء کے کسرہ کے ساتھ اور دوسرے علماء نے وصلاً تاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

۵ یوسف علیہ السلام پہلے ایک دوسری مجلس میں بیٹھے تھے تو اچانک یوسف علیہ السلام ان کے سامنے نمودار ہوئے۔ عکرمہ کہتے ہیں یوسف علیہ السلام کو حسن کے اعتبار سے لوگوں پر ایسی فضیلت تھی جیسی چودھویں کے چاند کو تمام ستاروں پر ہے (1)۔ ابن جریر، حاکم اور ابن مردویہ نے ابو سعید الخدری سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں نے معراج کی رات آسمان کی طرف دیکھا تو یوسف چودھویں کے چاند کی طرح تھے (2)۔ ابوالشیخ نے اپنی تفسیر میں اسحٰق بن عبداللہ ابی فروہ سے روایت کیا ہے، فرمایا جب یوسف علیہ السلام مصر کی گلیوں میں چلتے تو آپ کے چہرہ کی چمک دیواروں پر یوں دکھائی دیتی (3) جیسے پانی اور سورج کی چمک دیواروں پر پڑتی ہے۔

۶ جب مصر کی عورتوں نے دیکھا اکبرنہ تو وہ آپ کے حسن سے مسحور و مرعوب ہو گئیں۔ ابوالعالیہ فرماتے ہیں وہ مبہوت ہو گئیں (4)۔ بعض فرماتے ہیں اس کا معنی ہے وہ حیضہ ہو گئیں۔ اکبرت المرءۃ سے مشتق ہے جس کا معنی ہے عورت کو حیض آ گیا ہے یا مضاف کے حذف پر یوسف کے لئے ہے، یعنی وہ جذبات کی وجہ سے حائضہ ہو گئیں۔

۷ انہوں نے اپنا ہاتھ ان چھریوں سے کاٹ دیئے درآں حالیکہ وہ یہ گمان کر رہی تھیں کہ وہ اترج کاٹ رہی ہیں، ان کے دل حضرت یوسف کے حسن و جمال میں یوں مستغرق تھے کہ انہیں ہاتھ کٹنے کی تکلیف کا احساس ہی نہ ہوا۔ مجاہد فرماتے ہیں انہوں نے سوائے خون کے کچھ محسوس نہ کیا۔ قتادہ فرماتے ہیں انہوں نے اپنے ہاتھ جدا کر دیئے تھے حتی کہ ہاتھ پھینک دیئے تھے۔ مگر اصح یہ ہے کہ وہ کٹے تھے مگر بالکل جدا نہ ہوئے تھے۔ وھب کہتے ہیں ان میں سے ایک جماعت اسی سبب سے مر گئی تھی (5)۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی ہر عجز سے پاکی بیان کی اور تخلیق پر کامل قدرت رکھنے پر تعجب کا اظہار کیا۔ اصل میں حاشا للہ کذا ہے ابو عمرو نے دونوں جگہ پر وصل کر کے پڑھا ہے اور جب وقف کیا تو خط کی اتباع کرتے ہوئے الف کو حذف کر دیا۔ یہ یزیدی سے نصاً مروی ہے اور باقی قراء دونوں حالتوں میں تخفیفاً الف کو حذف کرتے ہیں۔ یہ ایک حرف ہے جو استثناء کے باب میں تنزیہ کا فائدہ دیتا ہے پھر تنزیہ کے قائم مقام رکھا گیا ہے اور لام بیان کے لئے ہے جیسے سقیاً لک میں لام بیان کے لئے ہے۔

۸ ما اہل حجاز کی لغت میں لیس کی طرح عمل کرتا ہے کیونکہ دونوں حال کی نفی میں شریک ہیں۔ بغوی فرماتے ہیں یہ صفت کے حرف حذف کے ساتھ منصوب ہے یعنی لیس ھذا ببشر تھا (6) ان ھذا ان بمعنی ما ہے الا ملک مگر یہ ملائکہ میں سے ہے کریم اللہ کے نزدیک بڑا معزز ہے کیونکہ ایسا جمال کسی بشر میں تو متصور ہی نہیں ہے اور بشر سے بلند فرشتہ ہے یا اس لئے انہوں نے آپ کو فرشتہ کہا یہ جمال بے مثال اور کمال بے بدل، اور عصمت بالغہ فرشتوں کے خواص سے ہے۔

قَالَتْ فَذٰلِكُنَّ الَّذِیْ لُمْتُنَّنِیْ فِیْهِ ؕ وَ لَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ ؕ وَ لَىٕنْ لَّمْ یَفْعَلْ مَاۤ اٰمُرُهٗ لَیُسْجَنَنَّ وَ لَیَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِیْنَ ﴿۳۲﴾

"زلیخا (فاتحانہ انداز میں) بولی یہ ہے وہ (پیکر رعنائی) جس کے بارے میں تم مجھے ملامت کیا کرتی تھیں ۱؎ بخدا میں نے اسے بہت بہلایا پھسلایا لیکن وہ بچا ہی رہا اور اگر وہ نہ بجا لایا جو میں اس کو حکم دیتی ہوں تو اسے قید کر دیا جائے گا اور وہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 278 (الفکر)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 278 (الفکر)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 278 (الفکر)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 278 (الفکر)
5۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 278 (الفکر)
6۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 278 (الفکر)

ہو جائے گا ان لوگوں سے جو بے آبرو ہیں ۔[1]"

[1] زلیخا نے کہا یہ وہ کنعانی غلام ہے جس کی تصویر تم نے اپنے ذہنوں میں تصور کر رکھی تھی اور مجھے ملامت کرتی تھیں۔ یعنی تم نے اس کا حقیقی تصور کیا ہی نہیں ورنہ تم مجھے اس ابتلاء میں معذور سمجھتیں یا یہ معنی کہ یہ ہے جس کے متعلق تم مجھے ملامت کرتی تھیں۔ ھذا کی جگہ ذالک ذکر کیا ہے مشار الیہ کی عظمت و رفعت ظاہر کرنے کے لئے۔

[2] زلیخا نے خود اقرار کیا جب اس نے جان لیا کہ وہ اب مجھے معذور سمجھ رہی ہیں تا کہ یوسف کا دل نرم کرنے پر اس کی معاون بنیں انہوں نے یوسف کو کہا تو اپنی مالکن کی اطاعت کر اور زلیخا نے کہا جو میں اسے حکم دیتی ہوں اگر ایسا نہیں کرے گا یعنی میرے امر کے مطابق عمل نہیں کرے گا۔ اس صورت میں ہ ضمیر کا مرجع یوسف علیہ السلام ہیں، یا یہ معنی کہ یوسف کو جو میں حکم دیتی ہوں حرف جر کو حذف کیا گیا ہے اور ضمیر موصول کے لئے ہے لیکونا کے آخر میں نون تاکید خفیفہ ہے جو وقفاً الف سے بدل گیا ہے کیونکہ وہ تنوین کے مشابہ ہے اس کی مثال لنسفعاً ہے اور من الصغرین یہ صغر یصغر سے مشتق ہے (باب سمع یسمع) اور مصدر صغر اصغار آتے ہیں۔

قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْۤ اِلَیْهِ ۚ وَ اِلَّا تَصْرِفْ عَنِّیْ كَیْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَیْهِنَّ وَ اَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِیْنَ ﴿۳۳﴾

"یوسف نے عرض کی اے میرے پروردگار! قید خانہ (کی صعوبتیں مجھے زیادہ پسند ہیں اس (گناہ) سے جس کی طرف یہ مجھے بلاتی ہیں اور اگر تو (اپنی عنایت سے) نہ دور کرے مجھ سے ان کے مکر کو تو میں مائل ہو جاؤں گا ان کی طرف اور بن جاؤں گا نادانوں سے ۔[2]"

[1] السجن (قید خانہ) کو یعقوب نے سین کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے سین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْۤ اِلَیْهِ یعنی اس بدکاری سے مجھے قید و بند کی صعوبتیں زیادہ محبوب ہیں۔ یوسف علیہ السلام نے معصیت اور نافرمانی پر قید خانہ کو پسند فرمایا جب عورت نے دھمکی دی تھی۔ یہاں دعا کا صیغہ جمع ذکر کیا گیا ہے حالانکہ دعوت صرف زلیخا نے دی تھی۔ یہ تصریح سے تعریض کی طرف خروج کے لئے اسلوب اختیار کیا گیا ہے یا اس لئے جمع کا صیغہ ذکر فرمایا کیونکہ ان تمام نے یوسف علیہ السلام کو اپنی مالکن کی مخالفت سے ڈرایا تھا اور اس کی اطاعت کا مشورہ دیا تھا۔ بعض علماء فرماتے ہیں تمام نے آپ کو بدکاری کی دعوت دی تھی۔

بعض علماء نے لکھا ہے کہ اگر یوسف علیہ السلام قید خانہ کا سوال نہ کرتے یعنی اَلسِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ نہ کہتے تو قید خانہ کی صعوبت سے دوچار نہ ہوتے۔ بہتر یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ سے عافیت کا سوال کرے۔ اس لئے رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو صبر کا سوال کرتے سنا تو فرمایا تو معصیت کا سوال کرتا ہے؟ اللہ تعالیٰ سے عافیت کا سوال کر۔ ترمذی نے یہ حدیث معاذؓ سے روایت کی ہے۔

الطبرانی نے عباس بن عبد المطلب سے روایت کیا ہے، فرمایا میں نے عرض کی یا رسول اللہ مجھے کوئی ایسی چیز سکھا دیں جو میں اللہ تعالیٰ سے مانگوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا اپنے رب سے عافیت کا سوال کرو۔

[2] اگر ان اشتعال انگیز حالات میں تو مجھے عصمت پر محفوظ نہ رکھتا تو میں ان کی بات کی طرف مائل ہو جاتا یا طبعی اور شہوت کے مقتضی کی وجہ سے ان کے نفسوں کی طرف راغب ہو جاتا۔ الصبوۃ محبت کے میلان کو کہتے ہیں اور میں بدکاری کا ارتکاب کر کے نادانوں میں سے ہو جاتا کیونکہ حلیم آدمی فعل قبیح نہیں کرتا یا ان لوگوں سے ہو جاتا جو اپنے علم کے مطابق عمل نہیں کرتے کیونکہ ایسے اشخاص بھی حکماً جاہل ہوتے ہیں۔

امام بغوی فرماتے ہیں اس میں دلیل ہے کہ مومن جب کسی گناہ کا ارتکاب کرتا ہے تو جہالت کی وجہ سے کرتا ہے(1)۔

فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۳۴﴾

"پس قبول فرمالی اس کی دعا اس کے رب نے 1 اور دور کر دیا اس سے ان عورتوں کے مکر و فریب کو 2 بیشک وہ (اپنے بندوں کی فریادیں) سننے والا اور 3 (ان کے) حالات خوب جاننے والا ہے 4"

1 اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا قبول فرمائی جو الا تصرف عنی الخ کے قول کے ضمن میں ہے۔

2 پس اللہ تعالیٰ نے آپ کو عصمت پر ثابت قدم فرمایا حتی کہ آپ نے قید و بند کی مشقتوں کو معصیت کی لذت پر ترجیح دی۔

3 وہ اپنے فریادیوں کی فریاد سننے والا ہے۔

4 اور ان کے حالات اور ان کی مصلحتوں کو خوب جاننے والا ہے۔

ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰيٰتِ لَيَسْجُنُنَّهٗ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۳۵﴾

"پھر مناسب معلوم ہوا انہیں اس کے باوجود کہ وہ (یوسف کی پاکبازی کی) نشانیاں دیکھ چکے تھے کہ وہ اسے قید کر دیں کچھ عرصہ تک 1"

1 پھر عزیز اور اس کے ساتھی متمول افراد نے یہی رائے قائم کی اس کے بعد کہ وہ یوسف علیہ السلام کی پاکدامنی اور عفت مآبی کی کھلی نشانیاں دیکھ چکے تھے۔ مثلاً بچے نے آپ کی صفائی میں کلام کی۔ پیچھے سے قمیص کا پھٹا ہوا ہونا۔ عورتوں کا ہاتھ کاٹنا اور ان سے آپ کا بیزاری کا اعتراف کرنا وغیرہ۔ بدا کا فاعل ضمیر مبہم ہے جس کی تفسیر لیسجننہ حتی حین کا قول بیان کر رہا ہے۔ یعنی اتنی مدت کہ جتنا انہوں نے آپ کو قید میں رکھنا مناسب سمجھا۔ اس عفت مآب پیکر کو بغیر کسی جرم کے قید میں انہوں نے اس لئے ڈالا تھا کہ بیوی اپنے خاوند کو صبح و شام ملامت کرتی تھی اور عزیز اپنی بیوی کا اس طرح تابع تھا جیسا کہ اس نکیل اس کے ہاتھ میں ہے۔ اس کی دلی تمنا یہ تھی کہ قید و بند کی صعوبتیں یوسف کو میری اطاعت پر مائل کر دیں گی اور وہ ان کے مطیع بن جائیں گے یا اس لئے اس نے آپ کو قید میں ڈالنے کو کہا کہ لوگ یوسف علیہ السلام کے متعلق عجب نظروں سے دیکھنے لگے تھے اور مختلف خیالات ظاہر کرنے لگے تھے تو زلیخا کو شرمندگی اور کلیۃً مایوسی کے خوف نے اسے پردے میں رکھنے پر راضی ہونے پر مجبور کر دیا بجائے اس کے کہ وہ کہیں دوسری جگہ بھیج دیا جائے۔ یہ حیلہ اس نے اس لئے کیا تھا تاکہ جب اسے اس کے دیدار سے روک دیا جائے گا اور مطلب براری کا موقع بھی چھن جائے گا تو وہ اس کی خبروں سے اپنے دل بیتاب کو تسلی و تشفی دے گی۔ زلیخا نے خاوند سے کہا اس کنعانی غلام نے مجھے لوگوں میں رسوا کر دیا ہے۔ یہ انہیں بتاتا ہے کہ میں نے اس سے مطلب براری کی خواہش کی تھی یا تو تو مجھے اجازت دے کہ میں گھر سے باہر نکل کر لوگوں کے سامنے اپنا عذر پیش کروں۔ یا تو اسے قید کر دے تاکہ لوگوں کی زبانیں بند ہو جائیں اور وہ یہ گمان کرنے لگیں کہ یہ واقعی مجرم تھا۔ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا یوسف علیہ السلام سے تین مرتبہ فروگزاشت ہوئی۔ جب آپ نے ارادہ فرمایا تھا زلیخا کا تو قید میں ڈالے گئے۔ جب آپ نے کہا تھا اذکرنی عند ربک تو کئی سال جیل میں ٹھہرے رہے اور جب بھائیوں کو کہا تھا اِنَّكُمْ لَسٰرِقُوْنَ ۞ قَالُوْۤا اِنْ يَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ۔ (تم چور ہو تو انہوں نے کہا اگر اس نے چوری کی ہے تو اس کے بھائی نے اس سے قبل چوری کی تھی)(2)

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 280 (الفکر)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 281 (الفکر)

وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ ۭ قَالَ اَحَدُهُمَآ اِنِّيْٓ اَرٰىنِيْٓ اَعْصِرُ خَمْرًا ۚ وَقَالَ الْاٰخَرُ اِنِّىْٓ اَرٰىنِيْٓ اَحْمِلُ فَوْقَ رَاْسِيْ خُبْزًا تَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْهُ ۭ نَبِّئْنَا بِتَاْوِيْلِهٖ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝۳۶

”اور داخل ہوئے آپ کے ساتھ ہی قید خانہ میں دو نوجوانوں [1]۔ اُن میں سے ایک نے (آ کر) کہا کہ میں نے (خواب میں) اپنے آپ کو دیکھا ہے کہ میں شراب نچوڑ رہا ہوں [2]۔ اور دوسرے نے کہا میں نے (خواب میں) اپنے آپ کو دیکھا کہ میں اٹھائے ہوئے ہوں اپنے سر پر کچھ روٹیاں، پرندے کھا رہے ہیں اس سے بتائیے ہمیں اس کی تعبیر بے شک ہم دیکھ رہے ہیں آپ کو نیکو کاروں سے [3]“

[1] حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ قید خانہ میں دو نوجوان بھی داخل ہوئے۔ وہ دونوں ولید بن ثروان العملیقی بادشاہ مصر کے غلام تھے۔ ایک اس کے مطبخ کا منتظم تھا اور دوسرا محفل مے خانہ کا نگران تھا۔ بادشاہ ان پر ناراض ہوا اور انہیں محبوس کر دیا۔ اتفاق سے وہ دونوں یوسف علیہ السلام کے ساتھ جیل میں داخل ہوئے جیسا کہ آیت میں مع کا کلمہ دلالت کرتا ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں ان دونوں نوجوانوں کو محبوس کا سبب یہ تھا کہ ایک گروہ نے بادشاہ کو دھوکے اور فریب سے قتل کرنے کا ارادہ کیا۔ انہوں نے ان دونوں کو رشوت دینے کی ضمانت دی اس بات پر کہ وہ بادشاہ کو کھانے اور شراب میں زہر دے دیں۔ دونوں لالچ میں آ گئے اور ان سے متفق ہو گئے لیکن بعد میں شراب پلانے والے نے اپنے محسن سے ایسی خیانت کرنے سے انکار کر دیا لیکن دوسرے نے رشوت لے لی اور بادشاہ کے کھانے میں زہر ملا دی۔ جب کھانا لایا گیا تو شراب پلانے والے نے کہا بادشاہ سلامت کھانا نہ کھائیے، اس میں زہر ہے۔ روٹیاں پیش کرنے والے نے کہا شراب نہ پیجئے اس میں زہر ہے۔ بادشاہ نے ساقی کو کہا تو خود یہ شراب پی تو اس نے پی لی۔ پھر بادشاہ نے خباز سے کھانا کھانے کو کہا تو اس نے انکار کر دیا۔ کھانا ایک جانور کے آگے ڈالا گیا اس نے کھایا تو وہ مر گیا۔ بادشاہ نے دونوں کو قید کرنے کا حکم دیا۔ حضرت یوسف علیہ السلام جب جیل میں بند ہوئے تو آپ نے وہاں بھی تعلیم کا سلسلہ شروع فرما دیا۔ آپ لوگوں کو کہتے کہ میں تمہیں خواب کی تعبیریں بتاؤں گا۔ ان دونوں جوانوں میں سے ایک نے دوسرے کو کہا آیئے ہم اس کنعانی غلام کا تجربہ کریں۔ ان دونوں نے آپ سے ایسے خوابوں کی تعبیر پوچھی جو دیکھے نہ تھے (1)۔ ابن مسعود فرماتے ہیں انہوں نے دیکھا کچھ نہیں تھا، صرف یوسف علیہ السلام کا تجربہ کرنے کے لئے بات بنائی تھی۔ علماء کی قوم کا خیال ہے کہ انہوں نے حقیقۃً یہ خواب دیکھے تھے پھر یوسف علیہ السلام نے انہیں مغموم دیکھا تو ان سے وجہ پوچھی۔ انہوں نے کہا ہم بادشاہ کے خاص لوگوں میں سے تھے۔ آج ہم نے خواب دیکھے ہیں جو ہمیں غمزدہ کئے ہوئے ہیں (2)۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا جو کچھ تم نے خواب میں دیکھا ہے بیان کرو۔ پس دونوں نے وہ خواب بیان کئے۔

[2] انی نافع اور ابو عمرو نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور ارٰنی کو نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو نے یا کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی میں نے خواب میں اپنے آپ کو انگور نچوڑتے ہوئے دیکھا اور انگوروں کو خمر اس لئے کہا کیونکہ آخر کار اس نے شراب بننا تھا جیسے کہا جاتا ہے فلان یطبخ الاجر یعنی وہ کچی اینٹوں کو پختہ بنانے کے لئے پکاتا ہے۔ بعض فرماتے ہیں ہیں عمان کی لغت میں خمر انگوروں کو کہتے ہیں۔ یہ حالت ماضیہ کی حکایت ہے۔ گویا اس نے یوں کہا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 281 (الفکر)　　2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 281 (الفکر)

کہ میں نے خواب دیکھا ہے کہ میں ایک باغ میں ہوں۔ پھر میں ایک ایسی انگور کی بیل کے پاس ہوں جس پر انگور کے تین گچھے ہیں۔ میں وہ لے کر آیا بادشاہ کا جام میری ہاتھ میں ہے۔ پھر میں ان انگوروں کو اس میں چھوڑ دیا ہے۔ پھر میں نے بادشاہ کو پلایا تو وہ پی گیا۔

ے انی نافع اور ابو عمرو نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے ارنی نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی میں خواب میں دیکھا ہے کہ میں اپنے سر پر تین ٹوکرے اٹھائے ہوئے ہوں جن میں روٹی اور رنگ برنگے کھانے ہیں اور پرندے انہیں نوچ رہے ہیں۔ یعنی ہم آپ کو اچھی تعبیر بتانے والوں سے دیکھتے ہیں یا تمہیں قیدیوں سے احسان کرنے والوں سے دیکھتے ہیں، ہمیں بھی خوابوں کی تعبیر بتا کر ہم پر احسان کیجئے اگر آپ تعبیر جانتے ہیں۔ روایت ہے کہ ضحاک بن مزاحم سے اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ کے قول کے بارے میں پوچھا گیا کہ آپ کا احسان کیا تھا جو آپ کو محسن کہا گیا ہے تو انہوں نے فرمایا آپ جیل میں مریضوں کی عیادت کرتے ان کی دیکھ بھال کرتے۔ جب مجلس تنگ ہوتی تو ان کے لئے کھلا کرتے جب انہیں کسی چیز کی احتیاج ہوتی تو جمع کرتے۔ اس کے ساتھ ساتھ عبادت وریاضت بھی بڑے ذوق وشوق سے کرتے۔ ساری ساری رات اپنے پروردگار کی بارگاہ میں ہاتھ باندھے کھڑے رہتے۔ کہا جاتا ہے کہ جب آپ قید خانہ میں داخل ہوئے تو ایک قوم دیکھی جن کی تکلیف سخت تھی۔ ان کی امیدیں کٹ چکی تھیں اور غم واندوہ طویل ہو چکا تھا۔ آپ نے انہیں تسلی دی اور فرمایا خوش رہو۔ صبر کرو تمہیں اجر ملے گا وہ کہتے ہیں اے نوجوان اللہ تجھ میں برکت دے۔ تیرا چہرہ کتنا خوبصورت ہے، تیرا اخلاق کتنا بلند ہے، تیری باتیں کتنی شیریں اور میٹھی ہیں۔ تیرے پڑوس کی برکت سے ہم پر برکت ہوئی ہے، تو کون ہے اے نوجوان؟ آپ نے فرمایا میں یوسف بن صفی اللہ یعقوب بن ذبیح اللہ اسحاق بن ابراہیم خلیل اللہ ہوں۔ ایک جیل کے دروغہ نے کہا اگر مجھے طاقت ہوتی تو میں آپ کو چھوڑ دیتا لیکن میں تجھ سے یہ احسان کروں گا کہ جیل کے جس کمرے میں آپ رہیں آپکو اجازت ہے۔ روایت ہے کہ ساقی اور خباز ان دونوں نوجوانوں نے کہا اے یوسف ہم نے جب سے آپ کو دیکھا ہے آپ سے محبت کرتے ہیں۔ آپ نے انہیں فرمایا قسم بخدا آپ دونوں مجھ سے محبت نہ کرو۔ قسم بخدا مجھ سے کسی نے محبت نہیں کی مگر اسکی محبت کی وجہ سے مجھ پر مصیبت آپڑی۔ مجھ سے میری پھوپھی نے محبت کی تو مجھ پر مصیبت آئی۔ میرے باپ نے مجھ سے محبت کی تو مجھے کنویں میں ڈالا گیا۔ عزیز کی بیوی نے محبت کی تو مجھے قید میں ڈالا گیا(1)۔ جب ان نوجوانوں نے اپنے خواب بیان کیے تو یوسف علیہ السلام نے ان کی تعبیر بتانے کو پسند نہ کیا کیونکہ ایک کی تعبیر اچھی نہ تھی۔ پس آپ نے ان کے سوالات کا جواب دینے سے اعراض کیا اور آپ معجزہ کے اظہار اور توحید کی طرف دعوت میں مشغول ہو گئے۔

قَالَ لَا يَأْتِيْكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖۤ اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِيْلِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّاْتِيَكُمَا ؕ ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ ؕ اِنِّيْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۳۷﴾

”آپ نے فرمایا نہیں آئے گا تمہارے پاس کھانا جو تمہیں کھلایا جاتا ہے مگر میں تمہیں بتا دوں گا اس کی تعبیر اس سے پیشتر کہ کھانا تمہارے پاس آئے [1] یہ ان علموں میں سے ہے جو سکھایا ہے مجھے میرے رب نے [2] میں نے چھوڑ دیا ہے دین اس قوم کا جو نہیں ایمان لاتے اللہ تعالیٰ پر نیز وہ آخرت کا انکار کرنے والے ہیں [3]“

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 283-282 (الفکر)

۱؎ بعض علماء فرماتے ہیں تُرْزَقٰنِهٖۤ سے مراد وہ کھانا لیا ہے جو نیند میں تمہیں دیا جائے گا فرمایا وہ کھانا تمہارے پاس نہیں آئے گا جو تمہیں نیند میں دیا جاتا ہے مگر میں تمہیں اس کی تاویل بیداری میں بتاؤں گا اس کی تاویل تمہارے پاس آنے سے پہلے۔ بعض فرماتے ہیں اس سے مراد یہ ہے کہ جو کھانا تمہارے گھروں سے آتا ہے اور عالم بیداری میں تمہیں دیا جاتا ہے یعنی جو تم کھاتے ہو۔ مگر میں اس کی مقدار اور رنگ اور وقت بتاؤں گا تمہارا کھانا آنے سے پہلے اور جو تم کھانا کھاؤ گے اور جب تم کھاؤ گے سب بتاؤں گا۔ یہ آپ کا معجزہ تھا۔ عیسیٰ علیہ السلام کے معجزہ کی طرح آپ نے بھی فرمایا تھا اُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ فِیْ بُیُوْتِكُمْ ۔

وہ جوان کہنے لگے یہ تو کاہن اور قیافہ شناس لوگوں کا کام ہے آپ کو یہ علم کیسے آیا ہے یوسف علیہ السلام نے فرمایا میں کاہن نہیں ہوں بلکہ یہ تو ان علوم سے ہے جو میرے رب نے مجھے سکھائے ہیں۔

۲؎ نافع اور ابو عمرو نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی میرے رب نے مجھے وحی قطعی کے ذریعے علم سکھایا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں آیت کریمہ یاتیکما طعام کا معنی یہ ہے کہ تمہارے گھروں سے کھانا نہیں پہنچے گا کہ اس سے پہلے میں تمہیں تمہارے خواب کی تعبیر بتاؤں گا۔ جو تاویل میرے رب نے مجھے الہام اور وحی کے ذریعے سکھائی ہے۔ یہ علم نجوم اور علم کہانت نہیں ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں یوسف علیہ السلام نے انہیں پہلے توحید اور صراط مستقیم کی دعوت دینے کا ارادہ فرمایا ان کے سوال کا جواب دینے سے پہلے کیونکہ انبیاء کرام اور علماء راشدین کا ہمیشہ سے یہی اسلوب دلربا رہا ہے۔ پہلے آپ نے اپنے معجزہ کا اظہار فرمایا جو غیب کی خبروں سے تھا اور آپ کی صداقت اور دعوت و تعبیر میں آپ کی سچائی پر دلالت کرتا تھا۔

۳؎ یہ ماقبل کلام کی تعلیل ہے، یعنی میرے رب نے مجھے یہ علم اس لئے عطا فرمایا ہے کہ میں نے باطل لوگوں کے دین کو چھوڑ دیا ہے اور ھم کے کلمہ کا تکرار ان کے اختصاص اور ان کے آخرت کے عقیدہ کے انکار پر تاکید کے لئے ہے۔

وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِیْۤ اِبْرٰهِیْمَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ ؕ مَا كَانَ لَنَاۤ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ؕ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَیْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَشْكُرُوْنَ ﴿۳۸﴾

''اور میں تو پیرو بن گیا اپنے باپ دادا ابراہیم، اسحاق اور یعقوب کے دین کا۱؎ نہیں روا ہمارے لئے کہ ہم شریک ٹھہرائیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی چیز کو یہ (توحید پر ایمان) تو اللہ تعالیٰ کا خاص احسان ہے ہم پر اور لوگوں پر۲؎ لیکن بہت سے لوگ اس احسان پر شکر ہی بجا نہیں لاتے۳؎۔''

۱؎ یہ جائز ہے کہ انی ترکت (آخر تک) ایک مستقل کلام ہو۔ دعوت کی تمہید اور اس بات کے اظہار کے لئے کہ میرا تعلق خانوادۂ نبوت سے ہے، تاکہ وہ دونوں بات کو غور سے سنیں اور بات پر وثوق اور پختہ یقین کریں۔ اس انداز دلربائی اور اسلوب سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب لوگ کسی عالم کے علمی پایہ کو جانتے ہوں اور وہ ان کے سامنے علم کے سچے موتی بکھیرنا چاہتا ہو تو اس کے لئے جائز ہے کہ پہلے وہ اپنی علمی قدر و منزلت کا اظہار کرے حتی کہ لوگ اس کا مقام پہچان لیں اور اس سے اکتساب فیض کریں۔ یہ خود نمائی اور خود ستائی نہیں ہے بلکہ اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے اور انبیاء کرام کو اس امر کا حکم دیا گیا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کریم ﷺ کو ارشاد فرمایا وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ (اپنے رب کی نعمتوں کا اظہار کرو) پس ہلاکت و بربادی ہے ان لوگوں کے لئے جو اولیاء کاملین پر طعن و [illegible] (جیسا کہ مجدد الف ثانی

رحمۃ اللہ علیہ اور سیدنا غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اظہار کیا ہے) تو ان کا یہ طعن صرف اور صرف حسد اور جہالت کی بناء پر ہے۔

۲ ہم انبیاء کے گروہ کے لئے ممکن ہی نہیں ہے کہ ہم کسی چیز کو اس کا شریک بنائیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں توحید کی جبلت پر پیدا کیا ہے اور شرک کی غلاظت سے اس نے خود ہمیں محفوظ رکھا ہے اور یہ توحید اور علم ہم پر وحی کے ذریعے اللہ کا فضل ہے اور تمام لوگوں پر بھی کیونکہ اس نے ان کی ہدایت اور رہنمائی کے لئے ہمیں مبعوث فرمایا اور پھر انہیں توحید پر ثابت قدمی بھی عطا فرمائی۔

۳ مگر جن لوگوں کی طرف انبیاء کرام مبعوث کئے گئے وہ اس نعمت توحید پر شکر ادا نہیں کرتے بلکہ منہ موڑتے ہیں اور اس بندہ نوازی کو سمجھتے ہی نہیں ہیں۔ یا یہ معنی کہ اس نے ہم پر اور دوسرے لوگوں پر دلائل کے قیام اور آیات کے نزول کے ساتھ کرم فرمایا لیکن وہ ان کھلے دلائل پر غور و خوض نہیں کرتے اور ان آیات سے استدلال نہیں کرتے بلکہ وہ انہیں بے فائدہ سمجھتے ہیں اس شخص کی مانند جو نعمت کا انکار کرتا ہے اور اس کا شکر ادا نہیں کرتا۔ پھر آپ نے انہیں اسلام کی دعوت دی۔

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۳۹﴾

''اے قید خانہ کے میرے دو رفیقو! (یہ تو بتاؤ) کیا بہت سے جدا جدا رب بہتر ہیں یا ایک اللہ جو سب پر غالب ہے ۱''

۱ یعنی جیل میں میرے ساتھ رہنے والو یا جیل میں میرے ساتھیو! ان دونوں کو سجن کی طرف مضاف کرنا مجازی ہے جیسے کہا جاتا ہے یاسارق اللیلۃ کیا متعدد خدا بہتر ہیں جو امکان و عجز کی صفت میں برابر ہیں خواہ وہ بت ہیں جو سونے کے بنے ہیں یا چاندی یا لوہے یا پتھر کے خواہ وہ ملائکہ اور بشر وغیرہ ہیں۔ اللہ سے بہتر ہیں یا ایک خدا جو اپنی ذات کے جلال اور اپنی صفات کے کمال میں منفرد ہے، نہ اس کا کوئی ذات میں شریک ہے اور نہ اس کی صفات میں اس کا کوئی ہم شکل ہے اور نہ افعال میں اس کا کوئی مماثل ہے، وہ غالب ہے، ایسا غالب کہ اس کا نہ کوئی ہمسر ہے اور نہ کوئی مقابل وہ دوسروں تمام سے بہتر ہے۔

اس کے بعد آپ نے بتوں کے بطلان کو بیان فرمایا۔

مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۰﴾

''تم نہیں پوجتے اس کے علاوہ مگر چند ناموں کو جو رکھ لئے ہیں تم نے اور تمہارے باپ دادا نے ۱ نہیں اتاری اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے کوئی دلیل ۲ نہیں ہے حکم (کا کوئی اختیار کسی کو) سوائے اللہ تعالیٰ کے ۳ اسی نے حکم دیا ہے کہ کسی کی عبادت نہ کرو بجز اسکے یہی ۴ دین قیم ہے لیکن بہت سے لوگ (اس حقیقت کو) نہیں جانتے ۵''

۱ مِنْ دُوْنِهٖ ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام خطاب دو کو فرما رہے تھے لیکن صیغہ جمع ذکر فرمایا کیونکہ آپ نے ہر وہ شخص مراد لیا جو ان دونوں کی طرح شرک کی غلاظت میں ملوث تھا۔ الا اسماء یعنی وہ ذوات جو الوہیت کی صفت سے خالی ہیں۔ سَمَّيْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ تم نے خود ان کو الہ اور رب کہا ہے، یا یہ معنی کہ تم نہیں عبادت کرتے کسی چیز کی مگر نام ہے جو تم نے رکھے ہیں حقیقت میں ان کا کوئی وجود نہیں ہے تم خیال کرتے ہو، کہ وہ بتوں میں حلول کیے ہوئے ہیں یا مجرد ہیں۔

۲ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کے وجود پر کوئی دلیل نہیں بتائی یا اللہ تعالیٰ نے ان کے مستحق عبادت ہونے پر کوئی حجت قائم نہیں فرمائی جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے وجود پر دلائل قائم فرمائے ہیں۔ اور اپنے مستحق عبادت ہونے پر براہین قاطع صفحۂ ہستی پر رقم فرمائے ہیں اور اپنے انبیاء ورسل کی صداقت پر آیات نازل فرمائی ہیں۔

۳ عبادت کرنے کا حکم کسی کے لئے نہیں ہے مگر اللہ کے لئے ہے کیونکہ وہ ذاتی طور پر عبادت کا مستحق ہے کیونکہ اس کی ذات واجب الوجود ہے، دوسروں کی تخلیق فرمانے والا ہے، علی الاطلاق منعم حقیقی ہے، وہ مالک ہے، قاہر ہے، نفع اور نقصان پہنچانے پر قادر ہے، اگر کسی غیر کی عبادت جائز ہوتی تو اس کا حکم بھی جائز ہوتا۔

۴ اس نے اپنے انبیاء ورسل کے ذریعے حکم دیا کہ کسی چیز کی عبادت نہ کرو الا ایاہ مگر اسی کی کیونکہ اس کے الٰہ ہونے پر حجج وبینات دلالت کرتی ہیں۔

۵ یہ دین قیم ہے کیونکہ اس پر براہین ودلائل دلالت کرتے ہیں لیکن اکثر لوگ حق اور باطل میں تمیز نہیں کر سکتے اور اپنی جہالت میں ٹامک ٹوئیاں کھا رہے ہیں۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں حضرت یوسف علیہ السلام کا یہ اسلوب بیان دعوت اسلام اور حجت کے الزام میں تدریج کے اصول پر مبنی ہے۔ سب سے پہلے آپ نے خطاب کے طریقہ پر توحید الٰہی کو بتوں کو خدا بنانے سے راجح فرمایا۔ پھر فرمایا جنہیں تم خدا کہتے ہو اور جن کے سامنے جبیں فرسائی کرتے ہو وہ عبادت کے مستحق ہی نہیں ہیں کیونکہ عبادت کا استحقاق یا ذاتی ہوتا ہے یا بالغیر ہوتا ہے اور ان سے دونوں استحقاق منتفی ہیں۔ پھر نص قائم فرمائی اس پر کہ دین مستقیم اور حق قویم ہے، عقل جس کے سوا کو چاہتی ہی نہیں اور علم جس کے علاوہ کسی کو پسند ہی نہیں کرتا(1)۔ اس طویل دعوت وخطاب کے بعد آپ نے ان کے خواب کی تعبیر بتائی۔

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ اَمَّاۤ اَحَدُكُمَا فَيَسْقِيْ رَبَّهٗ خَمْرًا ۚ وَ اَمَّا الْاٰخَرُ فَيُصْلَبُ فَتَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْ رَّاْسِهٖ ؕ قُضِيَ الْاَمْرُ الَّذِيْ فِيْهِ تَسْتَفْتِيٰنِ ۝۴۱

"اے قید خانہ کے میرے دو ساتھیو! (اب خوابوں کی تعبیر سنو) تم میں سے ایک (یعنی پہلا) تو پلایا کرے گا اپنے مالک کو شراب ۱ لیکن دوسرا سولی دیا جائے گا اور (نوچ) کھائیں گے پرندے اس کے سر سے ۲ (اٹل) فیصلہ ہو چکا اس بات کا جس کے متعلق تم دریافت کرتے ہو ۳"

۱ آپ نے فرمایا میرے قید خانہ کے ساتھیو! ساقی تو اپنے مالک کو شراب پلائے گا تین گچھوں سے مراد تین دن ہیں، یعنی تین دن یہ قید خانہ میں رہے گا۔ پھر اس کا مالک بلائے گا اور پہلے کی طرح اس کو اپنا مقام عطا کر دے گا۔

۲ باقی رہا خباز (نان بائی) اسے تین دن کے بعد سولی پر چڑھایا جائے گا اور تین ٹوکرے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ تین دن وہ قید خانہ میں رہے گا۔ پھر نکال کر پھانسی دیا جائے گا۔ پھر پرندے اس کے سر سے کھائیں گے۔ میں کہتا ہوں یہ اس کو اس لئے بتایا کہ اس نے واقعی ایسا خواب دیکھا تھا اور تجربہ کیا تھا کیونکہ نان بائی نے کھانے میں زہر ملائی تھی اور ساقی نے شراب میں زہر نہ ملائی تھی۔ ابن مسعود فرماتے ہیں جب ان دونوں نے آپ کی یہ تعبیر سنی تو کہنے لگے ہم نے تو کچھ بھی نہیں دیکھا تھا بلکہ ہم نے مذاق کیا ہے(2) تو یوسف علیہ السلام نے فرمایا۔

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 5، صفحہ 308 (العلمیہ)

2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 286 (الفکر)

۳؎ جس کے متعلق تم نے دریافت کیا ہے اس میں اللہ تعالیٰ کی قضا جاری ہو چکی ہے، یعنی جیسا میں نے کہا ہے ایسا ہی ہوگا خواہ تم نے خواب دیکھا ہے یا نہیں دیکھا۔ یہاں ضمیر مفرد ذکر کی ہے، اگرچہ انہوں نے دو امروں کے متعلق پوچھا تھا لیکن دونوں کے اس انجام کے ظہور کا ارادہ کیا تھا جو ان دونوں کا ہوگا۔

وَ قَالَ لِلَّذِیْ ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِیْ عِنْدَ رَبِّكَ٘ فَاَنْسٰىهُ الشَّیْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ فَلَبِثَ فِی السِّجْنِ بِضْعَ سِنِیْنَ۠ ﴿۴۲﴾

"اور کہا (یوسف علیہ السلام) نے اسے جس کے بارے میں آپ کو یقین تھا کہ وہ نجات پا جائے گا ان دونوں سے کہ میرا تذکرہ کرنا اپنے آقا کے پاس ۱؎ لیکن فراموش کرا دیا اسے شیطان نے کہ وہ ذکر کرے اپنے بادشاہ کے پاس ۲؎ پس آپ ٹھہرے رہے قید خانہ میں کئی سال ۳؎"

۱؎ یہاں ظن بمعنی یقین ہے اگر ضمیر کا مرجع یوسف علیہ السلام ہوں۔ آپ کو اس تعبیر میں شک نہیں تھا۔ اس لئے فرمایا قضی الامر اس امر کا قطعی فیصلہ ہو چکا ہے جس کے متعلق تم دونوں دریافت کرتے ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ ضمیر کا مرجع اسم موصول ہو اور مراد ساقی ہو۔ اذْكُرْنِیْ عِنْدَ رَبِّكَ۔ یعنی اپنے بادشاہ کے پاس میرا ذکر کرنا اور کہنا کہ جیل میں ایک بے گناہ معصوم غلام محبوس ہے اور وہ ان صفات عالیہ سے موصوف ہے تاکہ بادشاہ مجھے جیل سے رہائی دے۔

۲؎ شیطان نے ساقی کو بھلا دیا کہ وہ اپنے بادشاہ کے پاس آپ کا ذکر کرے۔ مصدر کو بہ کی طرف مضاف کیا گیا ہے اس کی مناسبت کی وجہ سے یا بتقدیر عبارت ذکر اخبار ربه ہے۔ ابن عباس اور اکثر مفسرین فرماتے ہیں کہ آیت کا معنی یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام کو شیطان نے اپنے رب کا ذکر فراموش کرا دیا حتیٰ کہ آپ نے غیر سے خلاصی طلب کی اور مخلوق سے مدد طلب کی۔ یہ وہ غفلت ہے جو شیطان کے ذریعے یوسف علیہ السلام کو لاحق ہوئی (1)۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ میرے بھائی یوسف پر رحم فرمائے۔ اگر وہ اذْكُرْنِیْ عِنْدَ رَبِّكَ نہ کہتے تو اتنی طویل مدت جیل میں بند نہ رہتے جتنا کہ رہے تھے۔ اس حدیث کو ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ نے روایت کیا ہے (2)۔

۳؎ بضع سے مراد قتادہ فرماتے ہیں تین سے نو تک کی تعداد ہے اور یہ البضع سے مشتق ہے جس کا معنی کاٹنا ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں تین سے سات تک ہے۔ اکثر مفسرین کا خیال ہے کہ آپ سات سال جیل میں رہے۔ وہب فرماتے ہیں حضرت ایوب علیہ السلام کو سات سال تکلیف رہی، حضرت یوسف سات سال جیل میں رہے (3)۔

الکلبی کہتے ہیں پانچ سال جیل میں پہلے رہے اور سات سال اذْكُرْنِیْ عِنْدَ رَبِّكَ کہنے کے بعد رہے، یعنی کل بارہ سال جیل میں رہے (4)۔ میں کہتا ہوں اللہ تعالیٰ کا ارشاد دخل معه السجن فتيان ان دونوں کا یوسف علیہ السلام کے ساتھ جیل میں داخل ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ جب وہ دونوں نوجوان تین دن جیل میں رہے تو پھر یوسف علیہ السلام اذْكُرْنِیْ عِنْدَ رَبِّكَ کے قول سے پانچ سال پہلے کیسے جیل میں رہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 286 (الفکر)
2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 37 (العلمیہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 286 (الفکر)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 286 (الفکر)

مالک بن دینار فرماتے ہیں۔ جب یوسف علیہ السلام نے ساقی کو کہا اذْكُرْنِي عِنْدَ رَبِّكَ تو یوسف کو کہا گیا تو نے میرے سوا کو اپنا کارساز بنایا ہے، میں تیری قید میں اضافہ کروں گا۔ یوسف علیہ السلام یہ سن کر رونے لگے اور کہا اے میرے پروردگار کثرت بلوی یعنی کثیر آزمائش نے میرے دل کو بھلا دیا ہے۔ میں نے ایک کلمہ کہا ہے لیکن آئندہ ایسا کلمہ زبان پر نہ لاؤں گا(1)۔ حضرت الحسن فرماتے ہیں جبرئیل امین، یوسف علیہ السلام کے پاس جیل میں آئے۔ جب یوسف علیہ السلام نے اسے دیکھا تو پہچان گئے اور کہا اے ڈرانے والوں کے بھائی تم خطا کاروں کے درمیان کیسے آ گئے ہو۔ جبرئیل نے کہا یا طاهر بن طاهرین اے پاک بازوں کے بیٹے! رب العالمین تمہیں سلام کہتا ہے اور فرماتا ہے کہ جب تو نے انسانوں سے شفاعت طلب کی ہے تو تو نے مجھے بھلا دیا ہے، مجھے اپنی عزت کی قسم میں تجھے چند سال اور قید میں رکھوں گا۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے پوچھا میرا رب مجھ پر راضی ہے۔ جبرئیل نے کہا ہاں تو آپ نے فرمایا پھر مجھے اس صعوبت کی کوئی پروا نہیں(2)۔ کعب فرماتے ہیں جبرئیل نے یوسف علیہ السلام کو کہا اللہ پوچھتے ہیں تجھے کس نے پیدا کیا؟ آپ نے کہا اللہ نے۔ پھر پوچھا تجھے تیرے باپ کے نزدیک محبوب کس نے بنایا؟ آپ نے کہا اللہ نے۔ تجھے کنویں سے نجات کس نے دی؟ آپ نے کہا اللہ نے پھر پوچھا تجھے خوابوں کی تعبیر کا علم کس نے دیا؟ آپ نے کہا اللہ نے۔ پھر پوچھا تجھ سے گناہ صغیرہ اور کبیرہ کو کس نے دور کیا؟ آپ نے کہا اللہ نے۔ پھر فرمایا تو پھر اپنے جیسوں سے سفارش کیوں طلب کی ہے(3) ابن عباس کی حدیث طبرانی میں ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا یوسف علیہ السلام اتنا عرصہ جیل میں نہ رہتے۔ اگر آپ نے وہ کلمہ نہ کہا ہوتا جس کے ذریعے آپ نے غیر اللہ سے رہائی طلب کی تھی۔

جب سات سال گزر گئے اور یوسف صدیق علیہ السلام کی رہائی کا وقت قریب آ گیا تو مصر کے بادشاہ ریان بن ولید نے ایک خوفناک خواب دیکھا۔ وہ یہ تھا کہ اس نے سات گائیں دیکھیں ہیں جو سمندر سے نکلی ہیں۔ پھر ان کے پیچھے اور سات گائیں نکلیں ہیں جو انتہائی دبلی اور کمزور ہیں۔ وہ دبلی گائیں موٹی گائیں کو کھا گئی ہیں اور وہ پوری کی پوری دبلی گائیں کے پیٹ میں چلی گئیں ہیں اور ان کا کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا اور ان دبلی گائیں پر ان کا کوئی اثر بھی نہیں ہے۔ پھر اس نے سات سرسبز خوشے دیکھے جن میں دانے پڑ چکے ہیں اور سات دوسرے خشک خوشے دیکھے جو کٹے ہوئے ہیں اور خشک خوشے سبز پر غالب آ گئے ہیں حتی کہ ان کی سبزی میں سے کچھ نہیں بچا۔ تو بادشاہ نے بڑے بڑے جادوگر، کاھن، دانشور جمع کئے اور ان پر اپنے خواب بیان کئے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

وَقَالَ الْمَلِكُ إِنِّيٓ أَرَىٰ سَبْعَ بَقَرَٰتٍ سِمَانٍ يَأْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَسَبْعَ سُنۢبُلَٰتٍ خُضْرٍ وَأُخَرَ يَابِسَٰتٍ ۖ يَٰٓأَيُّهَا ٱلْمَلَأُ أَفْتُونِى فِى رُءْيَٰىَ إِن كُنتُمْ لِلرُّءْيَا تَعْبُرُونَ ﴿٤٣﴾

”اور (کچھ عرصہ بعد ایک روز) بادشاہ نے کہا[1] کہ میں (خواب میں کیا) دیکھتا ہوں کہ سات گائیں ہیں موٹی تازی کھا رہی ہیں انہیں سات دبلی گائیں اور سات سبز خوشے ہیں اور دوسرے سات خشک سوکھے ہوئے آؤ درباریو بتاؤ مجھے میرے خواب کی تعبیر اگر تم خوابوں کی تعبیر بتایا کرتے ہو۔“

[1] نافع، ابوعمرو اور ابن کثیر نے انی کی یاء کو فتحہ کے ساتھ اور دوسرے قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے أَرىٰ سَبْعَ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ يَأْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَسَبْعَ سُنْبُلَاتٍ خُضْرٍ وَأُخَرَ يَابِسَاتٍ۔ خوشوں کی حالت کو بیان نہیں فرمایا کیوں پہلے (بقرات)

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 286 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 87-286 (الفکر) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 287 (الفکر)

گا ئیں کی حالت ذکر ہو چکی ہے اور سمان کو بطور تمیز ذکر فرمایا کیونکہ اس کے ساتھ ان کی تمیز بیان کی گئی ہے اور دوسرے سبع کا عجاف کے ساتھ وصف بیان کیا کیونکہ اس کے ساتھ تمیز ممکن نہ تھی کیونکہ پہلے موصوف نہیں تھا کیونکہ یہ جنس کے بیان کے لئے ہے اور قیاس یہ تھا کہ یہاں عجف ہوتا کیونکہ یہ عجفاء کی جمع ہے لیکن سمان پر محمول کیا گیا ہے کیونکہ وہ اس کی ضد ہے۔ یعنی اگر تم خواب کی تعبیر جانتے ہو تو میرے خوابوں کی تعبیر بتاؤ خواب کی تعبیر کا مطلب صور مثالیہ سے معانی نفسانیہ کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ یعنی جو عالم مثال میں ان کی صورتیں ہیں ان کو بیان کرنا یہ عبور سے مشتق ہے جس کا معنی تجاوز کرنا ہے۔ عبرت الرؤیا عبارۃ یہ عبرتھا تعبیراً سے زیادہ جامع عبارت ہے اور لام بیان کے لئے ہے یا عامل کو تقویت دینے کے لئے ہے کیونکہ فعل جب مفعول سے مؤخر ہو جاتا ہے تو اس کا عمل کمزور اور ضعیف ہو جاتا ہے۔ اس لئے لام کے ساتھ تقویت دی گئی جیسے اسم فاعل کے معمول پر لام لگا کر اسے تقویت دی جاتی ہے یا تعبرون کے ضمن میں ایسے فعل متعدی کا معنی پایا جاتا ہے جو لام کے ساتھ متعدی ہوتا ہے۔ گویا یوں کہا گیا ہے اِنْ كُنْتُمْ تَنْتَدِبُوْنَ لِعِبَارَةِ الرُّؤْيَا للرؤیا کنتم کی خبر ہے جیسے کوئی کہتا ہے فلان لھذا الامر جب کوئی اس کام میں مستقل اور راسخ ہو اور تعبرون دوسری خبر یا حال ہے اور تعبرون کا مفعول محذوف ہے کیونکہ ماقبل کلام اس پر دلالت کر رہی ہے۔

قَالُوْۤا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ ۚ وَمَا نَحْنُ بِتَاْوِیْلِ الْاَحْلَامِ بِعٰلِمِیْنَ ﴿۴۴﴾

"درباریوں نے کہا (اے بادشاہ) یہ خواب پریشان ہیں[1] پریشان خوابوں کی تعبیر جاننے والے ہیں[2]"

[1] یہ ضغث کی جمع ہے۔ اصل میں لکڑی یا گھاس کے گٹھا کو کہتے ہیں۔ پھر استعارۃً جھوٹے خواب کے لئے استعمال ہونے لگا اور پھر حلم کے وصف میں بطلان کا مبالغہ کرنے کے لئے جمع ذکر کیا جیسے عرب کہتے ہیں فلان یرکب الخیل یا اس خواب کے ضمن میں بہت سی مختلف چیزیں تھیں۔ اسے لئے جمع ذکر کیا گیا ہے۔ حلم، خواب کو کہتے ہیں اور اس سے فعل ماضی بفتح عین آتی ہے اور مضارع بضمہ عین آتا ہے یعنی باب نصر ینصر چلتا ہے۔

[2] احلام سے مراد خاص طور پر باطل خواب ہیں، یعنی ہمارے نزدیک ان کی کوئی تاویل نہیں ہے کیونکہ تاویل تو سچے خوابوں کی ہوتی ہے۔ گویا اس کی تاویل سے ناواقفیت پر عذر پیش کرنے کے لئے دوسرا مقدمہ ہے۔

وَقَالَ الَّذِیْ نَجَا مِنْهُمَا وَادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ اَنَا اُنَبِّئُكُمْ بِتَاْوِیْلِهٖ فَاَرْسِلُوْنِ ﴿۴۵﴾

"اور (اس وقت) بولا وہ شخص جو بچ گیا تھا ان دو (قیدیوں) سے اور (اب) اسے یوسف کی یاد آئی ایک عرصہ بعد[1] بتاتا ہوں تمہیں اس خواب کی تعبیر مجھے (قید خانہ تک) جانے دیجئے[2]"

[1] وَادَّكَرَ اصل میں ادتکر ہے تاء کو دال سے بدلا گیا پھر ادغام کیا گیا۔ یعنی ساقی کو یوسف اور آپ کا قول "اذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ" عرصہ دراز کے بعد یاد آیا اور وہ مدت سات سال تھی۔ یہ جملہ معترضہ ہے اور القول کا مفعول ہے۔

[2] البغوی نے کہا ہے کہ ساقی بادشاہ کے سامنے بیٹھا اور کہا قید خانہ میں ایک شخص ہے جو خوابوں کی تعبیر بتاتا ہے(1)، مجھے قید خانہ تک جانے دو پس بادشاہ نے یوسف کی طرف اسے بھیج دیا۔ پس وہ قید خانہ میں پہنچایا گیا۔ ابن عباس نے فرمایا کہ قید خانہ شہر کے اندر نہ تھا(2)۔ جب ساقی یوسف علیہ السلام کے پاس پہنچا تو کہا۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 288 (الفکر)

2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 288 (الفکر)

يُوسُفُ أَيُّهَا الصِّدِّيقُ أَفْتِنَا فِي سَبْعِ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ يَأْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَسَبْعِ سُنبُلَاتٍ خُضْرٍ وَأُخَرَ يَابِسَاتٍ لَّعَلِّي أَرْجِعُ إِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿٤٦﴾

"اے یوسف! اے صدیق[1] بتایئے ہمیں (اس خواب کی تعبیر) کہ سات موٹی تازہ گائیں ہیں کھا رہی ہیں انہیں سات لاغر گائیں اور سات خوشے ہیں سرسبز اور دوسرے (سات خوشے) خشک[2] تاکہ (آپ کا جواب لے کر) واپس آ جاؤں لوگوں کی طرف[3] شاید وہ (آپ کے علم و فضل کو) جان لیں[4]"

[1] اصل میں یا یوسف تھا ایھا الصدیق۔ صدق میں مبالغہ کیا اور صدق کا وصف اس لئے بیان کیا کیونکہ اس نے اپنے اور اپنے ساتھی کے خواب کی تاویل میں آپ کی سچائی کا تجربہ کر لیا تھا۔

[2] یہ خواب ہے جو بادشاہ نے دیکھا ہے اور اس نے مجھے آپ کی طرف بھیجا ہے۔

[3] تاکہ میں بادشاہ اور اس کے ہم نشینوں تک اس بادشاہ کے خواب کی تاویل لے جاؤں۔ اس نے لعل کا کلمہ ذکر کیا۔ یقینی کلام نہیں کی کیونکہ لوگ جب خواب کی تاویل سے عاجز آ گئے تھے اور بادشاہ اس خواب سے بہت خوفزدہ تھا۔ اس نے اس کی تاویل کو بہت بلند سمجھا اور مقصود کے حصول کو یقینی نہ سمجھا۔

[4] تاکہ وہ تیری علمی فضیلت کو جان لیں۔ لعل کا کلمہ دوبارہ ذکر کیا کیونکہ وہ انتہائی غفلت کی وجہ سے اہل فضل کی فضیلت کو نہیں سمجھتے تھے جیسا کہ عزیز یوسف علیہ السلام کی فضیلت پر آگاہ نہ ہوا حالانکہ اس نے آپ کی عظمت شان کی بہت سی نشانیاں دیکھ لی تھیں۔

قَالَ تَزْرَعُونَ سَبْعَ سِنِينَ دَأَبًا فَمَا حَصَدتُّمْ فَذَرُوهُ فِي سُنبُلِهِ إِلَّا قَلِيلًا مِّمَّا تَأْكُلُونَ ﴿٤٧﴾

"آپ نے فرمایا[1] کہ تم کاشت کرو گے سات سال تک حسب دستور تو جو تم کاٹو گے اسے رہنے دو خوشوں میں مگر تھوڑا سا (ضرورت کے لئے نکال لو) جسے تم کھا لو[2]"

[1] یوسف علیہ السلام نے اسے بتایا کہ موٹی گائیں اور سبز خوشے اس سے مراد سات خوشحال و سرسبز سال ہیں اور دبلی گائیں اور خشک خوشوں سے مراد قحط کے سال ہیں۔

[2] داب کا معنی عادت ہے اور اس پر نصب حال کی بناء پر ہے اور بمعنی دائبین ہے، یعنی تم اپنی عادت کے مطابق یا مضمر فعل کے مصدر کی حیثیت سے منصوب ہے، یعنی تداٰبون داباً اور جملہ حال ہے۔ بعض فرماتے ہیں اس کا معنی کوشش اور اجتہاد ہے۔ حضرت حفص نے داباً ہمزہ کے فتحہ اور باقی قراء نے ہمزہ کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ دونوں لغتیں ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں تزرعون امر ہے، نصیحت میں مبالغہ کے لئے خبر کی صورت میں ذکر کیا ہے۔ جو کاٹو اسے خوشوں میں رہنے دو تاکہ اسے گھن نہ لگ جائے۔ یہ جملہ بھی پہلے جملہ کی طرح نصیحت ہے اور اصل عبارت یعنی امر کو مبالغہ کے لئے ماضی کی شکل ذکر کیا گیا ہے۔

ثُمَّ يَأْتِي مِن بَعْدِ ذَٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ يَأْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ إِلَّا قَلِيلًا مِّمَّا تُحْصِنُونَ ﴿٤٨﴾

" پھر آئیں گے اس (خوشحالی) کے بعد سات (سال) بہت سخت کھا جائیں گے جو ذخیرہ تم نے پہلے جمع کر رکھا ہوگا ان کیلئے مگر تھوڑا سا جو تم محفوظ کر لو گے ۱؎ "

۱؎ پھر آئیں گے اس کے بعد سخت سات سال۔ قحط والے سالوں کو شداد کی صفت سے موصوف کیا گیا ہے کیونکہ وہ لوگوں پر بہت سخت ہوں گے۔ اکل کی نسبت سالوں کی طرف مجازاً ہے اور خواب کی تعبیر کی تطبیق کے لئے ہے۔

ثُمَّ يَأْتِي مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَامٌ فِيْهِ يُغَاثُ النَّاسُ وَ فِيْهِ يَعْصِرُوْنَ ﴿٤٩﴾

" پھر آئے گا اس عرصہ کے بعد ایک سال جس میں مینہ برسایا جائے گا لوگوں کیلئے اور اس سال وہ (پھلوں کا) رس نکالیں گے ۱؎ "

۱؎ پھر اس کے بعد ایک سال آئے گا جس میں بارش برسے گی۔ اس صورت میں یغاث، غیث سے مشتق ہوگا جس کا معنی بارش ہے، یا یہ معنی ہے کہ قحط سے ان کی مدد کی جائے گی۔ اس صورت میں غوث سے مشتق ہوگا۔ وَ فِيْهِ يَعْصِرُوْنَ کو حمزہ اور کسائی نے تاء فوقانیہ کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی خطاب کا صیغہ پڑھا ہے کیونکہ کلام ساری کی ساری خطاب کے صیغوں کے ساتھ ہے اور باقی قراء نے یاء کے ساتھ یعنی غائب کا صیغہ پڑھا ہے اور ضمیر کا مرجع لوگ ہیں۔ معنی یہ ہے وہ انگور، زیتون، تل اور اس جیسی چیزیں نچوڑیں گے۔ مراد یہ ہے کہ وہ سال بڑا شاداب ہوگا اور اس میں کثرت سے نعمتیں ہوں گی۔ ابو عبیدہ کہتے ہیں تعصرون کا معنی تکلیف اور قحط سے نجات پانا ہے او رالعصر کا معنی منجا اور ملجا ہے (1)۔ آپ نے لوگوں کو یہ بشارت دی اس کے بعد آپ نے موٹی گائیں اور سبز خوشوں کی سرسبز سال کے ساتھ تعبیر فرمائی اور دبلی گائیں اور خشک خوشوں کی قحط کے سالوں کے ساتھ تعبیر فرمائی۔ موٹی گائیں کو دبلی گائیں کے نگلنے کی خوشحالی کے سالوں میں جمع شدہ کو کھانے سے تعبیر فرمائی اور یہ آپ کو سات دبلی گائیں کی تعداد سے معلوم ہوا تھا کیونکہ اگر سات سالوں کے بعد سرسبز سال نہ آتا تو قحط کے سالوں کی تعداد سات سے زیادہ ہو جاتی۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں شاید آپ کو وحی کے ذریعے اس خوشحالی کے سال کا علم ہوا ہو یا اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ وہ اپنے بندوں پر تنگ دستی کے بعد وسعت فرماتا ہے۔ واللہ اعلم (2)۔

وَ قَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِيْ بِهٖ ۚ فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ قَالَ ارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَسْـَٔلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِيْ قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ ؕ اِنَّ رَبِّيْ بِكَيْدِهِنَّ عَلِيْمٌ ﴿٥٠﴾

" (یہ تعبیر سنتے ہی) بادشاہ نے کہا (فوراً) لے آؤ انہیں میرے پاس۔ پس جب (فرمان شاہی لے کر) ان کے پاس قاصد آیا (تو) آپ نے فرمایا لوٹ جاؤ اپنے بادشاہ کے پاس اور اس سے پوچھو کہ حقیقت حال کیا تھی ان عورتوں کی جنہوں نے کاٹ ڈالے تھے اپنے ہاتھ ۱؎ بے شک میرا پروردگار تو ان کے مکر (و فریب) سے خوب آگاہ ہے ۲؎ "

۱؎ جب ساقی بادشاہ کے خواب کی تعبیر لے کر آیا اور یوسف علیہ السلام نے جو کچھ بتایا تھا اس کی خبر دی تو بادشاہ کو یوسف علیہ السلام فضیلت وعظمت کا پتہ چلا یا اور جو کچھ آپ نے فرمایا اس کے ہونے کا بھی اسے یقین ہو گیا۔ جب وہ قاصد یوسف علیہ السلام کی رہائی کا پروانہ لے کر پہنچا تو اس نے بادشاہ کے پاس جانے کا بھی حکم سنایا لیکن یوسف علیہ السلام نے قاصد کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ کہا جب تک مجھ پر جو فسق کی تہمت لگائی گئی تھی وہ دور نہیں ہو جاتی میں اس قید خانہ سے باہر نہ نکلوں گا۔ اور آپ نے قاصد کو فرمایا اپنے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 290 (الفکر)　　2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 5، صفحہ 318 (العلمیہ)

بادشاہ کی طرف لوٹ جا اور اس سے پوچھ کہ ان عورتوں کی حقیقت حال کیا تھی جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹے تھے۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ انسان کو اپنی ذات سے تہمت کو دور کرنے کے لئے پوری کوشش اور سعی کرنی چاہیے۔ خصوصاً اس شخص کو جو لوگوں کا امام اور مقتدا ہو۔ آپ نے صراحۃً ادب و احترام کی وجہ سے عزیز کی بیوی کا ذکر نہیں کیا۔ اسحاق بن راہویہ نے اپنی مسند میں میں طبرانی نے معجم میں اور ابن مردویہ نے ابن عباس کی حدیث نقل کی ہے حضرت ابن عباس نبی کریم ﷺ سے روایت فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا مجھے اپنے بھائی یوسف کے صبر اور کرم پر تعجب ہے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے کہ جب ان سے خواب کی تعبیر پوچھنے کے لئے قاصد آیا تو آپ نے اسے تعبیر بتادی۔ اگر میں ہوتا تو میں ایسا نہ کرتا حتی کہ قید خانہ سے باہر آ جاتا(1)۔ مجھے تعجب ہے ان کے صبر اور کرم پر اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے قاصد آیا تاکہ آپ قید خانہ سے باہر آ جائیں مگر وہ نہ نکلے حتی کہ اپنی پاکدامنی کی خبر دی۔ اگر میں ہوتا تو میں یہ خبر سن کر دروازے پر آ جاتا اور اگر انہوں نے غیر اللہ سے رہائی طلب نہ کی ہوتی تو جیل میں اتنا عرصہ نہ رہتے۔ اسی حدیث پاک کو عبدالرزاق اور ابن جریر نے اپنی اپنی تفسیر میں عکرمہ کی حدیث مرسلاً روایت کی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے یوسف علیہ السلام کی ذات آپ کے کرم اور صبر پر تعجب ہے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، جب آپ سے پوچھا گیا دبلی اور موٹی گائیوں کے بارے میں۔ اگر میں ان کی جگہ ہوتا تو میں انہیں تعبیر بتانے کے لئے اپنی رہائی کی شرط لگاتا۔ مجھے تعجب ہے جب آپ کے پاس قاصد آیا اور آپ نے اسے اپنے بادشاہ کی طرف لوٹنے کو کہا۔ اگر میں ان کی جگہ ہوتا اور جیل میں اتنی مدت میں ٹھہرا ہوتا تو جتنے وہ ٹھہرے ہیں تو میں بادشاہ کی بات کو قبول کرنے میں جلدی کرتا اور دروازے کی طرف دوڑ پڑتا(2) اور کوئی عذر تلاش نہ کرتا، وہ حلیم الطبع اور متانت کے پیکر تھے۔ اصل حدیث صحیحین میں مختصراً موجود ہے۔

فائدہ: آپ ﷺ کا یوسف علیہ السلام کی حالت پر تعجب کرنا اور آپ ﷺ کا یہ فرمانا کہ میں جلدی کرتا یہ آپ ﷺ کے کمال نزول پر مبنی ہے جو دین کے پھیلاؤ اور لوگوں کے نفوس میں تاثیر کرنے اور تکمیل کا مدار ہے، شیخ مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مکاتیب میں اس کے مقام کو ثابت فرمایا ہے۔ یہ ایک ایسی کیفیت ہے جسے اہل کمال کی فہم بھی نہیں سمجھ سکتی، چہ جائیکہ عام آدمی اس کا ادراک کریں۔

۲۔ جب تمام رئیس زادیوں نے مجھے اپنی مالکن کی اطاعت کا حکم دیا، یا اپنی مطلب براری چاہی تو ان کے ان سارے مکروں کو میرا پروردگار جانتا ہے۔ اس میں ان کے مکر کی برائی اور اللہ تعالیٰ کے علم سے اس پر استشہاد ہے اور اس بات پر بھی استشہاد ہے کہ جو انہوں نے مجھ پر تہمت لگائی تھی میں اس سے بری ہوں۔ اس میں ان کے مکر کی وعید بھی ہے تو وہ قاصد آپ کا پیغام لے کر بادشاہ کے پاس پہنچا تو بادشاہ نے دوسری عورتوں اور عزیز کی بیوی کو بلایا۔

قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ اِذْ رَاوَدْتُّنَّ یُوْسُفَ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا عَلِمْنَا عَلَیْهِ مِنْ سُوْٓءٍ ؕ قَالَتِ امْرَاَتُ الْعَزِیْزِ الْـٰٔنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ٘ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِیْنَ ﴿۵۱﴾

"بادشاہ نے (ان عورتوں کو بلا کر) پوچھا کیا معاملہ ہوا تمہارا جب تم نے یوسف کو بہلایا تھا اسی مطلب براری کے لئے۔

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 42 (العلمیہ)
2۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 139 (الامیریہ)

بیک زبان) بولیں حاشاللہ! انہیں معلوم ہوئی ہمیں تو اس میں ذرا برائی عزیز کی بیوی (گویا رائے ضبط نہ رہا) کہنے لگی اب تو آشکارا ہوگیا حق میں نے ہی اسے پھسلانا چاہا تھا اپنی مطلب براری کے لئے بلاشبہ وہ تو سچا ہے۔"

ـ بادشاہ نے ان عورتوں سے پوچھا تمہاری حالت کیا تھی خطب ایسے امر کو کہتے ہیں جو اس لائق ہوتا ہے کہ اس کی وجہ سے کا ساتھی اس سے مخاطب ہو۔ بادشاہ نے تمام کو خطاب کیا کیونکہ تمام نے مطلب براری کا ارادہ کیا تھا، یا اس لئے کہ ان تمام نے یوسف علیہ السلام کو اپنی مالکن کی اطاعت کا حکم دیا تھا۔ یا خطاب تو تمام کو کیا مگر مراد عزیز کی بیوی ہے یعنی کیا تم نے کسی عورت کی طرف ان کا میلان دیکھا تھا۔

ـ حاشا کے متعلق قرأت کا اختلاف گزر چکا ہے، یعنی یہ اللہ تعالیٰ کی تنزیہ اور اس کی پاک تخلیق پر اس کی قدرت کاملہ پر تعجب کرنے کے لئے ہے۔ ہم نے یوسف علیہ السلام پر کوئی برائی نہیں دیکھی، یعنی نہ کوئی اس میں گناہ دیکھا ہے نہ خیانت۔ بعض علماء فرماتے ہیں عورتوں نے عزیز کی بیوی کی طرف توجہ کی۔ انہوں نے اسے ملامت کی۔ بعض فرماتے ہیں عزیز کی بیوی کو خدشہ ہوا کہ تمام عورتیں اس کے خلاف گواہی نہ دے دیں۔ تو اس نے فوراً خود اقرار کر لیا۔

ـ عزیز کی بیوی نے کہا اب حق ظاہر ہو گیا۔ یہ حصحص سے مشتق ہے جس کا معنی جڑ سے اکھیڑنا یہاں تک کہ اس کے مرکا چہرہ ظاہر ہو جائے یا اس کا معنی ثبت اور استقر ہے اور یہ حصحص البعیر سے مشتق ہے جس کا معنی ہے اونٹ نے اپنے بیٹھنے کی جگہ پر اپنے آپ کو ڈال دیا تا کہ اسے بٹھایا جائے۔

ـ میں نے اسے پھسلایا تھا اپنی مطلب براری کے لئے اس نے جو یہ بھی راودتنی عن نفسی" (اس عورت نے مجھے اپنی مطلب براری کے لئے پھسلانا چاہا تھا) کا قول کیا تھا اس میں یہ سچا تھا۔ جب یوسف علیہ السلام نے یہ سنا تو کہا۔

ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ ﴿۵۲﴾

"یہ میں نے اس لئے کہا تھا کہ عزیز جان لے کہ میں نے اس کی غیر حاضری میں خیانت نہیں کی ۱ اور یقیناً اللہ تعالیٰ کامیاب نہیں ہونے دیتا دغابازوں کی فریب کاری کو ۲"

ـ میں نے قاصد کو بادشاہ کی طرف اس لئے لوٹایا تھا تا کہ عزیز جان لے میں نے اس کی بیوی سے خیانت نہیں کی۔ اس کی عدم موجودگی میں یہ فاعل یا مفعول سے حال ہے، یعنی میں نے اس سے خیانت نہیں کی درآں حالیکہ میں اس سے غائب تھا وہ مجھ سے غائب تھا۔ یا یہ ظرف ہے، یعنی پردوں اور بند دروازوں کے پیچھے کی جگہ میں نے خیانت نہیں کی۔

ـ یعنی ان خائنوں کے مکر کو نافذ نہیں کرتا اور اس کو درست سمت نہیں چلاتا بلکہ وہ حق کو ظاہر فرماتا ہے، اگرچہ کچھ عرصہ کے بعد، یا یہ معنی ہے اللہ تعالیٰ خائنوں کو ان کے مکر کے ساتھ ہدایت نہیں دیتا کید پر فعل کا وقوع مبالغہ کے لئے ہے۔ اس قول میں زلیخا کی اپنے خاوند سے خیانت کرنے کی طرف اشارہ ہے اور آپ کے امین ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ اس لئے اس کے بعد ارشاد فرمایا۔

وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ ۭ اِنَّ رَبِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۵۳﴾

"اور میں اپنے نفس کی برات (کا دعویٰ) نہیں کرتا ۱ بیشک نفس تو حکم دیتا ہے برائی کا ۲ مگر وہی (بچتا ہے) جس پر میرا رب رحم فرما دے ۳ یقیناً میرا رب غفور رحیم ہے ۴"

۱؎ نَفْسِیْ کو نافع اور ابوعمرو نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ جملہ تنبیہ ہے کہ آپ نے اپنے نفس کی براءت کا دعویٰ نہیں فرمایا اور اپنی حالت پر فخر و مباہات کا اعلان نہیں فرمایا بلکہ اللہ تعالیٰ نے عصمت اور توفیق کا جو انعام فرمایا تھا اس کا اظہار فرمایا اور اس میں لوگوں کو اقتداء اور آپ کے نقش پا کی پیروی کی ترغیب ہے۔ ابن مردویہ حضرت انس کی حدیث مرفوعاً نقل کی ہے۔ جب یوسف علیہ السلام نے لیعلم انی لم اخنہ بالغیب فرمایا تو جبرئیل نے آپ کو کہا و لا حین هممت'' اور نہ اس وقت جب تو نے ارادہ کیا تھا'' اس وقت حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ امام بیضاوی نے یہ حدیث ابن عباس سے مرفوعاً نقل کی ہے(۱)۔

۲؎ یعنی وہ نفس حیوانی جو عناصر اربعہ کی پیداوار ہے اور جو قلب، روح اور دوسرے عالم امر کے لطائف سے مرکب ہے اور جس کا مقر عرش سے اوپر ہے، طبعی طور پر یہ ان شہوات ورذائل کی طرف مائل ہے جو عناصر اربعہ کے خصائص سے ہیں۔ جیسے غصہ اور کبر جو آگ کے عنصر کا مقتضی ہیں۔ خست اور گھٹیا پن زمین کا مقتضی ہے۔ تلون اور کمی صبر یہ پانی کا مقتضی ہے۔ مزاح اور لہو یہ ہواء کا مقتضی ہے۔

۳؎ ربی کو نافع اور ابوعمرو نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہاں ما بمعنی من ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ پس اللہ تعالیٰ جس کو بچا لے وہ نفس کی اطاعت نہیں کرتا بلکہ وہ اس کا مقابلہ کرتا ہے۔ اسی وجہ سے مجاہد ملائکہ پر بھی فضیلت حاصل کر لیتا ہے، یا یہ معنی کہ میرے رب کے رحمت فرمانے کے وقت۔ اس صورت میں ما مصدریہ ظرفیہ ہوگا، یعنی جب انسان اجتباء (اللہ تعالیٰ کا کسی کو چن لینا) یا انابت الی الانبیاء (انبیاء کرام کی پیروی) کے ساتھ رحمٰن کی رحمت کو پالیتا ہے تو اس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے تزکیہ کے ساتھ اپنے نفس کا تزکیہ کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ تم اپنے نفسوں کی پاکیزگی بیان نہ کرو بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ بلکہ اللہ تعالیٰ پاکیزگی بیان کرتا ہے جس کو چاہتا ہے اور وہ نفس اللہ تعالیٰ کی رضا پر مطمئن ہو جاتا ہے اور اسے یوں خطاب ہوتا ہے ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ الصالحین۔ اپنے رب کی طرف لوٹ در آں حالیکہ تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی اور میرے نیک بندوں کی صف میں داخل ہو جا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ اس کی برائیوں کو نیکیوں میں تبدیل فرما دیتا ہے اور نیکیوں میں تمام لطائف کے لئے اسے امام بنا دیتا ہے اور تجلیات صفاتیہ کے لئے مستعد ہو جاتا ہے، جبکہ عالم امر کے لطائف اس کے لئے اب راس نہیں ہوتے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ استثناء منقطع ہے لیکن میرے رب کی رحمت ہی جو نفس کو برائیوں سے روک دیتی ہے اور اسے صحیح سمت پر گامزن کر دیتی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ دونوں آیتیں زلیخا کے قول سے حکایت ہیں اور مستثنیٰ یوسف علیہ السلام اور آپ جیسے پاکباز لوگوں کا نفس ہے۔ معنی یہ ہے کہ (زلیخا کہتی ہے) میں نے جو یوسف کی براءت ذکر کی ہے وہ اس لئے ہے کہ یوسف جان لے کہ میں نے غائب ہونے کے وقت اس کے متعلق جھوٹ نہیں بولا۔ جب مجھ سے ان کے متعلق پوچھا گیا تو میں نے سچ سچ بتا دیا وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ۔ میں خیانت سے اپنے نفس کی براءت کا دعویٰ نہیں کرتی یقیناً میں نے جب آپ پر تہمت لگائی تھی تو میں نے چالاکی کا مظاہرہ کیا تھا اور میں نے پورے فریب سے کہا تھا مَا جَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْٓءًا اِلَّآ اَنْ يُّسْجَنَ اور پھر میں نے اس جیل میں ڈلوایا تھا اور اس کے نفس سے جو کچھ ہوا تھا اس کی معذرت پیش کر رہی ہے۔ یعنی ہر نفس برائی کا حکم دینے والا ہے مگر جس نفس پر اللہ تعالیٰ رحم فرمائے جیسے یوسف علیہ السلام اور دوسری پاکیزہ ہستیوں کے نفوس ہیں اللہ تعالیٰ رحم فرمائے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے انہیں محفوظ رکھا تھا۔ قالون اور البزی نے بسوء کے ہمزہ کو واؤ سے بدل کر ادغام کیا ہے اور یہ وہ حالت وصل میں کرتے ہیں اور الا کے ہمزہ کو ثابت رکھتے ہیں۔ ورش اور قنبل دونوں مکسور

ہمزوں کو اپنے اصول پر پڑھتے ہیں اور ابو عمرو اپنے قانون پر پڑھتے ہیں اور باقی قراء اپنے اصولوں پر پڑھتے ہیں۔

ع میرا رب بڑا رحیم اور غفور ہے وہ نفس کے خطرات اور وساوس کو معاف فرماتا ہے اور جس کو چاہتا ہے عصمت کے ساتھ اس پر رحمت فرماتا ہے یا یہ معنی کہ جو اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہوئے مغفرت طلب کرتا ہے اس کی مغفرت فرماتا ہے اور جو اس سے رحمت اور مغفرت کا خواستگار ہوتا ہے اس پر رحم فرماتا ہے۔

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِيْ بِهٖۤ اَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِيْ ۚ فَلَمَّا كَلَّمَهٗ قَالَ اِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِيْنٌ اَمِيْنٌ ﴿۵۴﴾

"اور بادشاہ نے حکم دیا کہ لے آؤ اسے میرے پاس میں چن لونگا اسے اپنی ذات کے لئے لے پھر جب اس نے آپ سے گفتگو کی (اور مطمئن ہو گیا) تو کہا آپ آج سے ہمارے ہاں بڑے محترم (اور) قابل اعتماد (درباری ہیں) ع"

لے جب بادشاہ کے سامنے یوسف علیہ السلام کی پاکدامنی اور عفت کا معاملہ ظاہر ہو گیا اور اس نے ایک علمی قدر و منزلت اور امانت کے بلند مقام کو پہچان لیا تو کہا اسے میرے پاس لے آؤ، میں اسے اپنے لئے خاص کروں گا۔ قاصد آیا اور یوسف علیہ السلام کو بادشاہ کا پیغام سنایا کہ ابھی بادشاہ کے پاس پہنچو۔ عبدالحکم نے فتوح مصر میں الکلبی، عن ابی صالح عن ابن عباس کی سند سے روایت کیا ہے کہ قاصد آیا اور یوسف علیہ السلام کو کہا قیدیوں والا لباس اتارو، نئے کپڑے پہنو اور بادشاہ کی طرف چلو (1)۔ ابن ابی شیبہ اور ابن المنذر نے فرید العمی سے روایت کیا ہے کہ یوسف علیہ السلام نے عزیز مصر کو دیکھا تو یہ دعا پڑھی اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْئَلُكَ بِخَيْرِكَ مِنْ خَيْرِهٖ وَاَعُوْذُ بِعِزَّتِكَ مِنْ شَرِّهٖ (2) یا اللہ میں تجھ سے تیری خیر کے ساتھ اس کی بھلائی کا سوال کرتا ہوں اور تیری عزت کے ساتھ اس کے شر سے پناہ مانگتا ہوں۔ امام بغوی فرماتے ہیں روایت ہے کہ آپ کھڑے ہوئے اور قیدیوں کے لئے دعا فرمائی اور اے اللہ نیک لوگوں کے دلوں کو ان پر پھیر دے اور ان پر خبروں کو پوشیدہ نہ فرما۔ پس آپ کی دعا سے وہ ہر شہر کی خبروں کو زیادہ جانتے تھے۔ جب آپ قید خانہ سے نکلے تو قید خانہ کے دروازے پر لکھا: هٰذِهٖ قُبُوْرُ الْاَحْيَاءِ وَبَيْتُ الْاَحْزَانِ وَتَجْرِبَةُ الْاَصْدِقَاءِ وَشَمَاتَةُ الْاَعْدَاءِ یہ زندوں کی قبور ہیں، یہ غمزدہ لوگوں کا گھر ہے، یہ دوستوں کی تجربہ گاہ ہے اور دشمنوں کے خوش ہونے کی جگہ ہے۔ قید خانہ کی میل کو آپ نے صاف کیا، اچھے کپڑے پہنے اور بادشاہ کا قصد کیا (3) وہب کہتے ہیں جب آپ بادشاہ کے دروازے پر کھڑے ہوئے تو یہ دعا پڑھی حَسْبِيَ رَبِّيْ مِنْ دُنْيَايَ وَحَسْبِيَ رَبِّيْ مِنْ خَلْقِهٖ عَزَّ جَارُهٗ وَجَلَّ ثَنَاؤُهٗ وَلَا اِلٰهَ غَيْرُهٗ۔ میری دنیا کی طرف سے میرا رب کافی ہے اور اپنی مخلوق کی طرف سے میرا رب مجھے کافی ہے، اس کا پڑوس عزت والا ہے، اس کی ثنا بلند ہے اور اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ جب آپ بادشاہ کے پاس پہنچے تو یہ دعا پڑھی اَللّٰهُمَّ اَسْئَلُكَ بِخَيْرِكَ مِنْ خَيْرِهٖ وَاَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّهٖ وَشَرِّ غَيْرِهٖ۔ پھر جب بادشاہ نے آپ کی طرف دیکھا تو آپ نے اسے عربی زبان میں سلام دیا۔ بادشاہ نے کہا یہ کونسی زبان ہے؟ آپ نے فرمایا یہ میرے چچا اسماعیل کی زبان ہے۔ پھر آپ نے عبرانی زبان میں دعا کی۔ تو بادشاہ نے کہا یہ کونسی زبان ہے؟ آپ نے فرمایا یہ میرے آباء کی زبان ہے۔ بادشاہ یہ دونوں زبانیں نہیں جانتا تھا۔ وہب نے کہا ہے بادشاہ ستر زبانیں جانتا تھا۔ بادشاہ جس زبان میں کلام کرتا یوسف علیہ السلام اسی زبان میں جواب دیتے اور آپ کو عبرانی اور عربی دو زبانیں زائد آتی تھیں۔ بادشاہ اس جوانی کے عالم میں اتنی زبانوں کی

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 44 (العلمیہ) 2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 44 (العلمیہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 93-292 (الفکر)

مہارت دیکھ کر بہت متعجب ہوا۔ یوسف علیہ السلام اس وقت تیس سال کے تھے۔ بادشاہ نے آپ کو اپنے پاس بٹھایا(1)۔

پھر جب کلام کی اور آپ کی فہم فراست کو دیکھا تو کہا اب آپ ہمارے ہاں محترم اور قابل اعتماد ہوں گے، ہر چیز پر آپ امین ہوں گے۔ امام بغوی نے لکھا ہے کہ روایت ہے کہ بادشاہ نے یوسف علیہ السلام سے کہا میں بالمشافہ آپ سے اپنا جواب سننا چاہتا ہوں۔ یوسف علیہ السلام نے فرمایا ہاں میں سناتا ہوں۔ بادشاہ سلامت آپ نے سات گائیں دیکھی تھیں جو چتکبری تھیں، ان کی پیشانیاں سفید تھی اور وہ بڑی خوبصورت تھیں۔ دریائے نیل کے کنارے سے تجھے نظر آئیں۔ ان کے تھنوں میں دودھ تھا۔ پھر اس سے سات دبلی پتلی گائیں نظر آئیں جن کی نہ کھریاں تھیں نہ دودھ۔ ان کی داڑھیں، دانت اور ہاتھ کتوں کی طرح تھے اور ان کی سونڈ جیں درندوں کی طرح تھیں۔ انہوں نے موٹی گائیوں پر درندوں کی طرح حملہ کر دیا۔ ان کا گوشت کھایا ان کی کھالیں پھاڑ دیں، ان کی ہڈیاں توڑ دیں اور ان کی ہڈیوں سے گودا چوس لیا۔ یہ سب منظر تو دیکھ رہا تھا اور متعجب ہو رہا تھا۔ پھر سات سبز خوشے اور سات سیاہ خوشے تو نے دیکھے جن کا تنا ایک تھا۔ ان کی جڑیں مٹی اور پانی میں تھیں اور تو دل میں سوچ رہا تھا کہ یہ کیسے ہے کہ یہ سات سبز اور پھل دار ہیں اور یہ خشک سیاہ ہیں، جبکہ نیچے تنا ایک ہے اور ان کی جڑیں پانی میں ہیں۔ ہوا چلی۔ پس خشک خوشوں کے پتے سبز خوشوں پر بکھر گئے۔ پھر ان میں آگ بھڑک اٹھی اور اس نے اس کو جلا دیا۔ پس وہ سیاہ ہو گئے۔ یہ آپ نے خواب دیکھا تھا۔ پھر آپ ڈر کر بیدار ہو گئے۔ بادشاہ سن کر کہنے لگا قسم بخدا جو میں نے آپ سے سنا ہے یہ تو اس خواب سے بھی زیادہ عجیب ہے، اگرچہ وہ خواب بھی عجیب تھا۔ پھر بادشاہ نے کہا اے صدیق اس خواب کی تعبیر کا حل کیا ہے۔ یوسف علیہ السلام نے فرمایا اس کی صورت یہ ہے کہ تو خوراک کو جمع کر اور ان سالوں میں کثرت سے زراعت اور پھر اس خوراک اپنے خوشوں اور چھلیوں میں رہنے دے تاکہ چھلیاں اور خوشے چوپاؤں کا چارہ بنیں اور تو لوگوں کو خمس ادا کرنے کا حکم دے۔ یہ خوراک جو تو وصول کرے گا یہ شہر والوں اور ارد گرد کے لوگوں کے لئے کافی ہے۔ پھر لوگ تیرے پاس دور سے خوراک لینے کے لئے آئیں گے اور تیرے پاس اتنا خزانہ جمع ہو جائے گا کہ اس سے پہلے کبھی نہ ہوا ہوگا۔ بادشاہ نے کہا یہ میرے لئے کون جمع کرے گا اور کون بیچے گا اور کون مجھے اتنے بڑے کام سے کفایت کرے گا(2)۔

قَالَ اجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآىِٕنِ الْاَرْضِۚ اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ ۝۵۵

”آپ نے فرمایا مجھے مقرر کر دے زمین کے خزانوں پر بیشک میں (ان کی) حفاظت کرنے والا اور (معاشی مسائل کا) ماہر ہوں [1]“

[1] یوسف علیہ السلام نے کہا یعنی مصر کی زمین کی خوراک کے خزائن اور اموال کے خزائن پر مجھے متعین کرو۔ اِنِّیْ حَفِیْظٌ اور ان خزانوں کو ناجائز اخراجات سے بچانے والا ہوں اور ان کے مصارف کو بھی جانتا ہوں۔

یوسف علیہ السلام نے اپنی ذات کے لئے امانت اور کفایت کے لئے اہلیت کا اظہار کیا اور ولایت کو طلب فرمایا تاکہ اس عہدہ کے ذریعے احکام الٰہی کو نافذ کریں، حق کو قائم کریں اور عدل کو جاری فرمائیں اور وہ تمام امور سرانجام دیں جن کے لئے انبیاء کرام کو بندوں کی طرف مبعوث کیا جاتا ہے کیونکہ آپ کو علم تھا ان کے علاوہ کوئی دوسرا شخص اس اہلیت کا مالک نہیں ہے۔ پس آپ کا اس حکومتی عہدہ کو طلب کرنا فقط رضائے الٰہی کے لئے تھا نہ دنیا کی جاہ و حشمت کے لئے تھا۔ خلفاء راشدین کا خلافت کا عہدہ سنبھالنا بھی اسی قبیل سے تھا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 293 (الفکر) 2۔ ایضاً

اور حضرت علی کا حضرت امیر معاویہؓ سے معارضہ اس لئے تھا کہ آپ اپنے آپ کو نفاذ شریعت کے لئے زیادہ قوی سمجھتے تھے اور اپنے نفس پر زیادہ ضبط اور قدرت رکھتے تھے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں شاید یوسف علیہ السلام نے جب دیکھا کہ بادشاہ انہیں لامحالہ کسی عہدہ پر فائز کرنے والا ہے تو آپ نے ایسے عہدہ کو ترجیح دی جس کے فوائد کثیر تھے اور منافع عظیم تھے۔ اس آیت میں عہدہ قضاء اور ولایت کی طلب پر جواز کی دلیل ہے اور کسی عہدہ کی اہلیت کا اظہار جائز ہے (1) جبکہ انسان کو اپنی ذات پر پورا ضبط ہو اور اس میں یہ بھی دلیل ہے کہ انسان کوئی عہدہ قبول کرسکتا ہے، خواہ حاکم وقت ظالم اور کافر بھی ہو، جبکہ یہ علم ہو اقامۃ الحق اور سیاسۃ الحق اس کافر یا جابر کی تمکین کے بغیر ممکن نہیں۔ سلف صالحین امت ظالم و جابر حکمرانوں کے دور حکومت میں عہدہ قضاء قبول کرتے رہے ہیں۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ بادشاہ اپنی رائے سے سبکدوش ہو چکا تھا۔ یوسف علیہ السلام جو رائے قائم کرتے وہ اسی پر معترض نہ ہوتا تھا۔ حقیقۃً وہ بادشاہ آپ کے حکم کے تابع تھا۔ امام بغوی نے اپنی سند کے ساتھ ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ میرے بھائی یوسف پر رحم فرمائے، اگر وہ اِجْعَلْنِیْ عَلٰى خَزَآىِٕنِ الْاَرْضِ کہتے تو بادشاہ اسی وقت انہیں اس منصب پر فائز کردیتا لیکن ایک سال بعد آپ کو یہ عہدہ ملا تھا اور آپ ایک سال بادشاہ کے ساتھ اس کے گھر میں رہے تھے (2)۔ ابن عباسؓ سے ہی مروی ہے، فرماتے ہیں جس سال آپ نے امارت کا سوال کیا تھا وہ ختم ہو گیا تو بادشاہ نے آپ کو بلایا تاج پہنایا اور اپنی تلوار کے آپ کو عطا کی پھر آپ کے لئے سونے کا موتیوں اور یاقوت سے مرصع تخت سجایا اور آپ کو ریشمی قیمتی لباس پہنایا۔ اس تخت کی لمبائی تیس ہاتھ، عرض دس ہاتھ تھی اور اس پر تیس بستر لگے تھے اور ساٹھ مخملی چادریں بچھی تھیں۔ پھر بادشاہ نے آپ کو باہر آنے کا حکم دیا، آپ باہر نکلے تو سر پر تاج رکھا جس کی رنگت سفید اولوں کی طرح تھی اور آپ کا چہرہ چودھویں کے چاند کی طرح چمک رہا تھا۔ دیکھنے والا اپنا چہرہ آپ کی رنگت کی صفائی میں دیکھتا۔ آپ چلتے چلتے تخت پر جا بیٹھ گئے۔ سارے علاقوں کے بادشاہ آپ کے قریب آ کر بیٹھ گئے۔ پھر بادشاہ اپنے گھر میں داخل ہوا اور مصر کی بادشاہی آپ کے سپرد کردی اور قطفیر کا جو منصب تھا اس سے اسے معزول کر کے یوسف علیہ السلام کو وہ مقام عطا کردیا۔ ابن اسحاق نے یہی لکھا ہے۔ ابن زید نے لکھا ہے کہ بادشاہ مصر ریان کے بہت سے خزانے تھے اس نے ان تمام خزانوں کو آپ کے سپرد کردیا تھا اور آپ کے ہر حکم اور فیصلہ کو نافذ کردیا (3)۔ ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے ابن اسحٰق سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں مورخین نے ذکر کیا ہے کہ قطفیر ان دنوں ہلاک ہو گیا تھا اور بادشاہ نے قطفیر کی بیوی زلیخا کا نکاح یوسف علیہ السلام سے کردیا تھا۔ جب آپ زلیخا کے پاس آئے تو فرمایا کیا یہ بہتر نہیں اس سے جو تو چاہتی تھی۔ زلیخا نے کہا اے صدیق مجھے ملامت نہ کیجئے، میں ایک حسین و جمیل عورت تھی جیسا کہ تو نے دیکھا اور دنیا اور بادشاہی کی وجہ سے ناز و نعم میں پرورش ہوئی تھی اور میرا خاوند وہ تھا جو عورتوں کے پاس آتا ہی نہ تھا اور آپ حسن و جمال کے مرقع تھے۔ اس لئے مجھ پر آپ کی محبت غالب آ گئی۔ علماء نے لکھا ہے زلیخا نے آپ کو کنوارا پایا۔ پھر آپ زلیخا کے بطن سے دو بیٹے پیدا ہوئے (4) افرائیم اور میشا۔ جب بادشاہ مصر نے یوسف علیہ السلام کو سب کچھ عطا کردیا اور آپ تمام لوگوں کا حکمران بنا دیا تو آپ سے مرد اور عورتیں محبت کرنے لگے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد اسی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

وَ كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِیُوْسُفَ فِی الْاَرْضِ ۚ یَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَیْثُ یَشَآءُ ؕ نُصِیْبُ

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 5، صفحہ 324 (العلمیہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 295 (الفکر)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 295 (الفکر)
4۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 46 (العلمیہ)

بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ وَ لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۶﴾

”یوں ہم نے تسلط (اور اقتدار) بخشا یوسف کو سرزمین مصر میں تا کہ رہے اس میں جہاں چاہے۱ ہم سرفراز کرتے ہیں اپنی رحمت سے جسے چاہتے ہیں اور ہم ضائع نہیں کرتے اجر عمدہ کام کرنے والوں کا۲“

۱۔ یعنی بادشاہ کی مجلس میں عزت و عظمت کی طرح ہم نے اقتدار کی عزت بھی بخشی یوسف علیہ السلام کو مصر کی زمین میں تا کہ اس کے شہروں میں جہاں چاہیں قیام کریں۔ ابن کثیر نے نشاء کو جمع متکلم کا صیغہ پڑھا اور باقی قراء نے غائب کا صیغہ پڑھا ہے اور اس کا فاعل یوسف علیہ السلام ہیں۔

۲۔ ہم پہنچاتے ہیں اپنی نعمت اس کو جسے ہم چاہتے ہیں دنیا میں بھی، آخرت میں بھی۔ ہم محسنین کا اجر ضائع نہیں کرتے بلکہ جلدی اور بدیر پورا پورا اجر دیتے ہیں۔ ابن عباس اور وہب فرماتے ہیں محسنین کا معنی الصابرین ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں یوسف علیہ السلام بادشاہ کو اسلام کی دعوت دیتے رہے اور اس سے شفقت و محبت سلوک کرتے رہے حتیٰ کہ وہ اسلام کی دولت سرمدی سے مشرف ہوا اور اس کے ساتھ اور بھی کثیر لوگ مسلمان ہوئے یہ تو تھی دنیا کی عزت(1)۔

وَ لَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿۵۷﴾

”اور آخرت کا اجر (اس سے) یقیناً بہتر ہے ان کے لئے جو ایمان لے آئے اور تقویٰ اختیار کئے رہے۱“

۱۔ آخرت کا ثواب دنیا کی نعمتوں سے بہتر ہے ان لوگوں کے لئے جو ایمان لائے اور تقویٰ اختیار کیا۔

جب یوسف علیہ السلام نے ملک کا نظم و نسق سنبھال لیا تو آپ نے خوراک کو جمع کرنے کی تدبیر کی اور خوب تدبیر کی بڑے بڑے غلے کے گودام اور سٹور تیار کئے اور ان میں اضافی اور زائد از ضرورت خوراک جمع کرنی شروع کر دی تا کہ آنے والے قحط کے سالوں میں کام آئے۔ آپ معروف طریقہ پر خرچ کرتے رہے حتیٰ کہ شادابی کے سال گزر گئے اور قحط کا زمانہ شروع ہو گیا اور ایسا قحط پڑا کہ پہلے اس قسم کے قحط سے کبھی واسطہ نہ پڑا تھا۔ سب سے پہلے آپ نے بادشاہ اور اس کے حاشیہ نشینوں کے کھانے کی تدبیر کی۔ انہیں ہر روز دو پہر کا کھانا دیا جاتا تھا۔ جب قحط کے سال شروع ہوئے تو سب سے پہلے دو پہر کو بھوک نے ستایا تھا وہ بادشاہ تھا۔ اس نے یوسف علیہ السلام کو پکارا۔ ہائے بھوک، ہائے بھوک۔ یوسف علیہ السلام نے فرمایا یہ قحط کا وقت ہے۔ قحط کے پہلے سال ہی وہ تمام لوگ ہلاک ہو گئے جنہوں نے شادابی کے سالوں میں آپ کی مخالفت کی تھی۔ اہل مصر یوسف علیہ السلام سے کھانا خریدتے تھے۔ پہلے سال آپ نے انہیں نقدی کے ساتھ کھانا دیا حتیٰ کہ مصر میں تمام درہم و دینار آپ کے قبضہ میں آ گئے۔ دوسرے سال جواہر و زیورات کے ساتھ خوراک دی یہاں تک کہ لوگ زیوارت و جواھرات سے بھی خالی ہو گئے۔ تیسرے سال جانوروں کے عوض کھانا دیا تو وہ بھی تمام کے تمام آپ کے پاس جمع ہو گئے۔ چوتھے سال غلاموں اور لونڈیوں کے بدلے کھانا دیا حتیٰ کہ کسی کے پاس کوئی غلام اور لونڈی نہ رہی۔ پانچویں سال ان کو ان کی جائیدادوں زمینوں اور گھروں کے عوض کھانا دیا حتیٰ کہ ان پر بھی آپ کا قبضہ ہو گیا۔ چھٹے سال ان کو ان کی اولاد کے عوض خوراک دی حتیٰ کہ تمام آپ کے غلام بن گئے۔ ساتویں سال ان کی اپنی گردنوں کے عوض خوراک مہیا کی حتیٰ کہ مصر کا ہر آزاد مرد اور عورت آپ کا غلام بن گیا۔ میں کہتا ہوں اگر یہ روایت صحیح ہے تو یہ دلیل ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی شریعت میں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 296 (الفکر)

انسان کا اپنے آپ کو اور اپنی اولاد کو بیچنا جائز تھا جیسا کہ چور کو غلام بنانا جائز تھا۔ بعض علماء نے قحط کے سالوں میں اپنے آپ کو بیچنے کا فتویٰ دیا ہے۔ لیکن ہماری شریعت میں اس قول کی کوئی اصل نہیں ہے واللہ اعلم۔ اس وقت لوگ کہتے تھے کہ ہم نے یوسف علیہ السلام سے زیادہ کوئی عظیم بادشاہ نہیں دیکھا ہے۔ یوسف علیہ السلام نے بادشاہ سے کہا میرے رب کریم نے مجھے جو جاہ و جلال بخشا ہے اور تمام لوگوں کو میرا غلام بنا دیا اب اس کا کیا کیا جائے بادشاہ نے کہا جو آپ کی رائے ہے وہ ہماری رائے ہے، ہم تو آپ کے تابع ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا اللہ تعالیٰ اور تجھے گواہ بناتا ہوں کہ میں نے تمام اہل مصر کو آزاد کر دیا ہے اور ان کی جائدادیں اور مال بھی انہیں واپس کر دیئے ہیں(1)۔ روایت ہے کہ یوسف علیہ السلام ان قحط کے سالوں میں خود بھی سیر ہو کر کھانا نہ کھاتے تھے۔ آپ سے عرض کی گئی جناب آپ بھوکے رہتے ہیں حالانکہ آپ کے پاس مصر کی سرزمین کے خزانے ہیں۔ آپ نے فرمایا مجھے خوف ہے کہ میں سیر ہو کر کھاؤں اور بھوکوں کو بھول جاؤں۔ یوسف علیہ السلام نے مطبخ کے نگرانوں کو حکم دیا تو صبح کا کھانا دوپہر کو دیا جائے۔ اس سے آپ کا مقصد یہ تھا کہ بادشاہ بھوک کی تکلیف چکھے تاکہ بھوکوں کو بھول نہ جائے۔ پھر آپ نے تمام بادشاہوں کا صبح کا کھانا دوپہر کے وقت کر دیا۔ فرمایا ہر طرف سے لوگ خوراک کے حصول کے لئے مصر کا قصد کرنے لگے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کسی کو بھی ایک اونٹ کے بوجھ سے زیادہ کھانا نہ دیتے تھے، خواہ وہ کتنا ہی عظیم آدمی ہوتا تاکہ عدل قائم رہے اور زیادہ سے زیادہ لوگ نفع اٹھائیں اور کنعان اور شام کے شہروں میں سخت قحط کے آثار ظاہر تھے۔ یعقوب علیہ السلام بھی اسی تکلیف میں مبتلا تھے۔ جس میں لوگ مبتلا تھے آپ کا گھر فلسطین کے علاقہ غرمات میں تھا جو شام کی سرحد پر تھا۔ یہ بھی دیہاتی لوگ تھے جو مال مویشی اونٹ اور بکریاں پالتے تھے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو خوراک لینے کے لئے مصر روانہ کیا اور فرمایا مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ مصر میں ایک نیک بادشاہ ہے جو کھانا فروخت کرتا ہے، تم بھی جاؤ اور اس سے کھانا لے آؤ۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے بنیامین کو جو یوسف علیہ السلام کے سگے بھائی تھے انہیں اپنے پاس روک لیا(2)۔

وَجَآءَ اِخْوَةُ یُوْسُفَ فَدَخَلُوْا عَلَیْهِ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ﴿۵۸﴾

"اور (ایک روز آ نکلے برادران یوسف (علیہ السلام) اور ان کی خدمت میں حاضر ہوئے سو آپ نے تو انہیں پہچان لیا لیکن وہ آپ کو نہ پہچان سکے۔"

یوسف علیہ السلام کے دس بھائی آئے فَدَخَلُوْا عَلَیْهِ میں ہ ضمیر کا مرجع یوسف علیہ السلام ہیں، یعنی وہ یوسف علیہ السلام کے پاس پہنچے آپ نے انہیں پہچان لیا۔ ابن عباس اور مجاہد فرماتے ہیں یوسف علیہ السلام نے انہیں پہلی نظر میں پہچان لیا اور الحسن فرماتے ہیں آپ نے انہیں نہ پہچانا حتیٰ کہ انہوں نے آپ کو اپنا تعارف کرایا(3)۔

وَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ۔ یعنی انہوں نے یوسف علیہ السلام کو نہ پہچانا۔ ابن عباس فرماتے ہیں جب سے انہوں نے آپ کو کنویں میں پھینکا تھا اور اب جبکہ وہ آپ کے پاس پہنچے، ان کے درمیان چالیس سال کا عرصہ گزر چکا تھا اس لئے نہ پہچانا تھا(4) عطاء فرماتے ہیں انہوں نے آپ کو نہ پہچانا تھا کیونکہ آپ تخت شاہی پر جلوہ فرما تھے اور آپ کے سر پر شاہی تاج تھا۔ بعض علماء فرماتے ہیں نہ پہچاننے کی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 296 (الفکر)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 297 (الفکر)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 298 (الفکر)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 298 (الفکر)

وجہ یہ تھی کہ آپ نے بادشاہوں والا ریشمی لباس زیب تن کیا ہوا تھا اور آپ کے گلے میں سونے کا طوق تھا۔ میں کہتا ہوں یہ تب متصور ہو سکتا ہے جب شریعت یوسفی میں ریشم اور سونے کا استعمال جائز ہو۔ جب یوسف علیہ السلام نے انہیں دیکھا اور انہوں نے آپ سے عبرانی زبان میں کلام کی تو آپ نے پوچھا بتاؤ تم کون ہو، تمہارا مدعا کیا ہے، میں تو تمہارے کام کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ انہوں نے کہا ہم شام سے آئے ہیں اور ہم جانور چراتے ہیں۔ ہم سخت تکلیف میں مبتلا ہیں ہم آپ کے پاس خوراک لینے آئے ہیں۔ آپ نے فرمایا شاید تم میرے شہروں کو غیر محفوظ سمجھتے ہو۔ انہوں نے کہا نہیں خدا کی قسم ہم جاسوس نہیں ہیں۔ ہم تمام آپس میں بھائی ہیں اور ایک باپ کی اولاد ہیں۔ ہمارے باپ بوڑھے اور سچے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کے انبیاء میں سے ایک نبی ہیں۔ آپ نے پوچھا تم کتنے بھائی ہو۔ انہوں نے کہا ہم بارہ تھے اور ہمارا ایک چھوٹا بھائی جنگل کی طرف گیا تھا اور ہلاک ہو گیا تھا۔ وہ ہمارے والد صاحب کو بہت پیارا تھا۔ پھر آپ نے پوچھا اب تم یہاں کتنے آئے ہو۔ انہوں نے کہا دس آپ نے فرمایا گیارہواں بھائی کہاں ہے۔ انہوں نے کہا وہ ہمارے والد صاحب کے پاس ہے کیونکہ اس کا ماں کی طرف سے بھائی ہلاک ہو گیا ہے۔ اس لئے ہمارے والد صاحب ان سے تسلی اور سکون حاصل کرتے ہیں۔ آپ نے پوچھا کیسے پتہ چلے گا کہ تم سچ کہہ رہے ہو۔ انہوں نے کہا اے بادشاہ سلامت ہم ایسی جگہ پر ہیں جہاں ہمارا کوئی واقف نہیں ہے۔ پس یوسف علیہ السلام نے ان میں سے ہر ایک کو اونٹ کا بوجھ عطا فرمایا اور انہیں سامانِ خوراک مہیا کر دیا اور جہاز اس سامان کو کہتے ہیں جو مسافروں کے لئے تیار کیا جاتا ہے(1)۔

وَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ قَالَ ائْتُونِي بِأَخٍ لَّكُم مِّنْ أَبِيكُمْ ۚ أَلَا تَرَوْنَ أَنِّي أُوفِي الْكَيْلَ وَأَنَا خَيْرُ الْمُنزِلِينَ ﴿٥٩﴾

"سو جب مہیا کر دیا ان کے لئے ان (کی رسد و خوراک) کا سامان تو فرمایا (دوبارہ آؤ) تو لے آنا میرے پاس اپنے پدری بھائی کو کیا تم نہیں دیکھتے کہ میں کس طرح پیمانہ پورا بھر کر دیتا ہوں اور میں کتنا بہتر مہمان نواز ہوں[1]"

[1] جب آپ نے ان کو سامان رسد و خوراک مہیا کر دیا تو فرمایا اپنے بھائی کو ساتھ لے آنا اگر تم سچے ہو، میں تم سے خوش ہو کر تمہیں تمہارے بھائی کی وجہ سے ایک اونٹ کا بوجھ زیادہ دوں گا اور میں تمہیں مزید عزت سے نوازوں گا۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ میں کتنا پورا پیمانہ دیتا ہوں اور کچھ کمی نہیں کرتا۔ میں کتنا بہتر مہمان نواز ہوں اور آپ نے ان کی خوب ضیافت کی تھی۔ یہ مجاہد کا قول ہے(2)۔

فَإِن لَّمْ تَأْتُونِي بِهِ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِندِي وَلَا تَقْرَبُونِ ﴿٦٠﴾

"اور اگر تم اسے نہ لے آتے میرے پاس تو (سن لو) کوئی پیمانہ تمہارے لئے میرے پاس نہیں ہوگا[1] اور نہ تم میرے قریب آ سکو گے۔"

[1] یعنی تمہیں میں کوئی کھانا کیل کر کے نہ دوں گا اور نہ تم میرے قریب آ سکو گے اور نہ میرے ملک میں داخل ہو سکو گے یا تو یہ نہی ہے یا نفی کا صیغہ ہے اور جزا پر معطوف ہے۔

قَالُوا سَنُرَاوِدُ عَنْهُ أَبَاهُ وَإِنَّا لَفَاعِلُونَ ﴿٦١﴾

"وہ بولے ہم ضرور مطالبہ کریں گے اس کے بھیجنے کے متعلق اس کے باپ سے اور ہم ضرور ایسا کریں گے[1]"

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 298 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 299 (الفکر)

۱۔ کہنے لگے ہمارے والد صاحب اس کے فراق سے مغموم ہوں گے، ہم اس کے باپ سے اس کو طلب کرنے کی کوشش کریں گے اور ہم اس کے متعلق اس کو دھوکہ دیں گے جو آپ نے کہا ہم اس کو ضرور بجالائیں گے۔ آپ نے فرمایا تم اپنے میں سے کسی کو گروی رکھ جاؤ حتی کہ تم اپنے بھائی کو میرے پاس لاؤ۔ انہوں نے آپس میں قرعہ اندازی کی تو قرعہ شمعون کے نام کا نکلا۔ یہ یوسف علیہ السلام کے متعلق اچھی رائے رکھتا تھا۔ پس انہوں نے اسے یوسف علیہ السلام کے پاس چھوڑ دیا۔

وَ قَالَ لِفِتْيٰنِهِ اجْعَلُوْا بِضَاعَتَهُمْ فِيْ رِحَالِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَعْرِفُوْنَهَاۤ اِذَا انْقَلَبُوْۤا اِلٰۤى اَهْلِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۶۲﴾

"اور آپ نے فرمایا اپنے غلاموں کو کہ (چپکے سے) رکھ دو ان کا سامان (جس کے عوض انہوں نے غلہ خریدا) ان کی خورجیوں میں ۱۔ تا کہ وہ اسے پہچان لیں جب وہ واپس لوٹیں گے اپنے گھر والوں کے پاس شاید وہ لوٹ کر آئیں ۲۔"

۱۔ لفتینہ کو حفص، حمزہ اور کسائی نے الف، نون، کے ساتھ جمع کثرت کے وزن پر پڑھا ہے اور دوسرے قراء نے فتیۃ یعنی تاء کے ساتھ بغیر الف کے جمع قلت کے وزن پر پڑھا ہے۔ اس میں الصبیان و الصبیۃ کی طرح دونوں لغتیں ہیں۔ بضاعتھم سے دراہم ہیں۔ الضحاک نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ وہ ثمن چمڑا تھا۔ بعض علماء فرماتے ہیں وہ نقل کے ستو کی آٹھ بوریاں تھیں۔ امام بغوی فرماتے ہیں پہلا قول اصح ہے (1) رحال سے مراد ان کی خورجیاں تھیں۔

۲۔ شاید وہ لوٹانے کا حق پہچان لیں اور دونوں بدلوں کو لوٹانے کی تکریم کے حق کو پہچان لیں جب وہ مصر کی طرف واپس لوٹیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں یوسف علیہ السلام نے احسان اور نیکی اور ان کی عزت کی خاطر ان کے پیسے لوٹا دیئے تھے تا کہ دوبارہ آنے کی انہیں زیادہ ترغیب ملے، یعنی لَعَلَّهُمْ يَعْرِفُوْنَهَاۤ تا وہ ہمارے ہاں اپنی عزت پہچان لیں۔ بعض فرماتے ہیں جب آپ نے دیکھا کہ باپ اور بھائیوں سے ان کی حاجت کے باوجود ان سے قیمت وصول کرنا باعث ملامت اور اخلاق عالیہ کے خلاف ہے تو آپ نے ان کی رقم واپس کر دی اور پھر مہربانی کرتے ہوئے اس طرح واپس کی کہ انہیں پتہ بھی نہ چلا۔ الکلبی کہتے ہیں اس خوف سے واپس کی کہ والد صاحب کے پاس مزید دراہم نہ ہوں گے جو یہ دوبارہ لے کر آئیں گے۔ بعض فرماتے ہیں حضرت یوسف علیہ السلام نے ایسا اس لئے کیا کہ آپ کو معلوم ہو چکا تھا کہ ان کی دیانت انہیں پیسے لوٹانے پر برانگیختہ کرنے کی غلطی کو دور کرنے کے لئے اور وہ اس کو اپنے پاس رکھنا حلال نہ سمجھیں گے (اور واپس رقم پہنچانے آ جائیں گے) (2)۔

فَلَمَّا رَجَعُوْۤا اِلٰۤى اَبِيْهِمْ قَالُوْا يٰۤاَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الْكَيْلُ فَاَرْسِلْ مَعَنَاۤ اَخَانَا نَكْتَلْ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿۶۳﴾

"پھر جب واپس لوٹے اپنے باپ کے پاس ۱۔ تو عرض کرنے لگے ہمارے پدر (بزرگوار) روک دیا گیا ہے ہم سے غلہ ۲۔ سو (ازراہ نوازش) بھیجئے ہمارے ساتھ ہمارے بھائی جان بنیامین کو تا کہ ہم غلہ لا سکیں ۳۔ اور ہم یقیناً اس کی نگہبانی کریں گے ۴۔"

۱۔ جب مصر سے واپس آئے تو کہنے لگے ہم تو ایک سخی اور فیاض شخص کے پاس پہنچے تھے اور اس نے ہم پر نہایت کرم نوازی کی ہے۔ اگر وہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 299 (الفکر)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 300 (الفکر)

آل یعقوب سے ہوتا تو ہم پر ایسی عنایات نہ کرتا۔ یعقوب علیہ السلام نے بیٹوں کو کہا جب تم بادشاہ مصر کے پاس جانا تو اسے میرا اسلام کہنا اور یہ کہنا کہ ہمارا باپ تمہارے اوپر صلاۃ بھیجتا ہے اور تم نے جو ہم پر شفقت فرمائی ہے۔ اس کی وجہ سے تمہیں دعائیں دیتا ہے۔ یعقوب علیہ السلام نے پوچھا شمعون کہاں ہے؟ کہنے لگے ہم تو انہیں بادشاہ کے پاس رہن رکھ آئے ہیں۔ پھر پورا قصہ بیان کیا۔ آپ نے انہیں فرمایا تم نے اسے بتایا کیوں تھا؟ انہوں نے کہا انہوں نے ہمیں پکڑ لیا تھا اور کہا تم جاسوس ہو کیونکہ ہم نے عبرانی زبان میں کلام کی تھی پھر انہوں نے وضاحت سے قصہ سنایا کہنے لگے۔

۲؎ ابا حضور! اگر ہم بنیامین کو ساتھ نہ لے گئے تو وہ ہمیں غلہ نہیں دے گا۔ یہ حضرت حسن کا قول ہے۔ بعض فرماتے ہیں یوسف علیہ السلام نے ہر آدمی کے نام ایک اونٹ دیا اور بنیامین کے غلہ کو ہم سے روک لیا گیا ہے۔ کیل سے مراد طعام غلہ ہے (1)۔

۳؎ آپ ہمارے ساتھ بنیامین کو بھیجئے تا کہ ہم غلہ لے آئیں نکتل کو حمزہ اور الکسائی نے یاء کے ساتھ غائب کا صیغہ پڑھا ہے، یعنی یامین ہمارے ساتھ غلہ لائے اور دوسرے قراء نے نکتل جمع متکلم کا صیغہ نون کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی ہم وہ کھانا لائیں اور وہ مانع دور ہو جائے۔ بعض فرماتے ہیں اس کا مطلب ہے ہم اس کے لئے کھانا لے آئیں۔

۴؎ ہم اس کو ہر تکلیف و مکروہ چیز سے بچائیں گے۔

قَالَ هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَيْهِ اِلَّا كَمَاۤ اَمِنْتُكُمْ عَلٰۤى اَخِيْهِ مِنْ قَبْلُ ؕ فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا ۪ وَّ هُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ۞

"آپ نے (جواباً) فرمایا کیا میں اعتماد کروں تم پر اس کے بارے میں بجز اس کے جیسے میں نے اعتماد کیا تھا تم پر اس کے بھائی کے بارے میں اس سے قبل ۱؎۔ پس اللہ تعالیٰ ہی بہتر حفاظت کرنے والا ہے اور زیادہ مہربان ہے تمام مہربانی کرنے والوں سے ۲؎"

۱؎ اخیہ سے مراد یوسف علیہ السلام ہیں۔ یعنی میں کیسے اس پر اعتماد کر لوں جبکہ تم نے یوسف علیہ السلام کے بارے میں بھی اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ کہا تھا اور پھر جو تم نے اس کے ساتھ کیا وہ تمہیں معلوم ہے۔ فَاللّٰهُ خَيْرٌ اصل میں خیر منکم ومن کل احد ہے یعنی اللہ تم سے اور ہر ایک سے بہتر حفاظت کرنے والا ہے۔ پس میں اس پر توکل کرتا ہوں اور اپنا معاملہ اس کے سپرد کرتا ہوں۔ میں امید کرتا ہوں کہ وہ اس کی حفاظت فرما کر مجھ پر رحم فرمائے گا اور مجھ پر دو مصیبتوں کو جمع نہ فرمائے گا۔ حفظاً کو نصب تمیز ہونے کی وجہ سے ہے اکثر قراء نے مصدر کے لفظ کے ساتھ پڑھا ہے۔ حفص، حمزہ اور الکسائی نے اسم فاعل کے وزن پر حافظاً پڑھا ہے۔ اس صورت میں حال اور تمیز دونوں کا احتمال رکھتا ہے جیسے عربوں کا قول ہے للہ درہ فارساً

وَلَمَّا فَتَحُوْا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوْا بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ اِلَيْهِمْ ؕ قَالُوْا يٰۤاَبَانَا مَا نَبْغِيْ ؕ هٰذِهٖ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ اِلَيْنَا ۚ وَنَمِيْرُ اَهْلَنَا وَنَحْفَظُ اَخَانَا وَنَزْدَادُ كَيْلَ بَعِيْرٍ ؕ ذٰلِكَ كَيْلٌ يَّسِيْرٌ ۞

"جب انہوں نے کھولا اپنا سامان تو انہوں نے دیکھا کہ ان کا مال انہیں واپس لوٹا دیا گیا ہے (ترغیب دینے کے لئے)

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 300 (الفکر)

کہنے لگے اے ہمارے پدر (محترم) ہم اور کیا چاہتے ہیں یہ (دیکھیے) ہمارا مال بھی لوٹا دیا گیا ہے ہماری طرف۔[1] اور (اگر بن یامین ساتھ گیا تو) ہم رسد لائیں گے اپنے اہل خانہ کے لئے اور رکھوالی کریں گے اپنے بھائی کی اور ہم زیادہ لیں گے ایک اونٹ کا بوجھ۔[2] یہ غلہ بہت تھوڑا ہے۔[3]"

1۔ وَ لَمَّا فَتَحُوْا کا فاعل یوسف علیہ السلام کے بھائی ہیں۔ مَتَاعَهُمْ سے مراد انکا سامان ہے جو مصر سے اٹھا کر لائے تھے حتی کہ جب انہوں نے غلہ اور اس کی قیمت دونوں کو موجود پایا تو کہنے لگے۔ کیا ہم اس سے زیادہ کیا چاہتے ہیں کہ انہوں نے ہماری خوب تکریم کی بہتر رہائش دی، ہم سے غلہ فروخت کیا اور پھر قیمت بھی ہمیں لوٹا دی۔ یہ معنی اس صورت میں ہوگا جب ما کو استفہامیہ بنایا جائے۔ یا یہ ما نافیہ ہے۔ مطلب یہ کہ ہم اس کے بعد کوئی احسان طلب نہیں کرتے۔ یا ما بمعنی ای شیء ہے یعنی ہم کلام کے ذریعے ان کے احسان کی کونسی چیز طلب کریں یا یہ معنی کہ ہم بات میں حد سے تجاوز نہیں کرتے، ہم نے جو کیا ہے اس میں اضافہ نہیں کرتے کیونکہ ہماری صداقت پر دلیل آپ خود دیکھ رہے ہیں۔ یا یہ معنی ہے کہ ہم تجھ سے مزید ثمن کا مطالبہ نہیں کرتے اور ھذہ بضاعتنا ردت الینا۔ یہ مستقل کلام ہے جو ما نبغی کے قول کی وضاحت کر رہا ہے۔

2۔ یہ محذوف کلام پر معطوف ہے اگر ما استفہامیہ ہو۔ یعنی ہمیں قیمت واپس کر دی گئی ہے۔ پس ہم اس کے ذریعے سواریاں حاصل کریں گے اور بادشاہ کی طرف لوٹ جائیں گے اور اپنے گھر والوں کے لئے کھانا لائیں گے۔ کہا جاتا ہے مار اھلہ یمیر میرا جب کوئی شخص دوسرے شہر سے اپنے اہل وعیال کے لئے کھانا لائے۔ اسی طرح امتار یمتار امتاراً ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ یہ جملہ اپنے معطوف کیساتھ مل کر ما نبغی پر معطوف ہو اگر ما نافیہ ہو یعنی ہم اپنی بات کا مطالبہ نہیں کرتے اور ہم کھانا لاتے ہیں۔

3۔ آنے جانے میں ہر خطرہ سے اپنے بھائی کی حفاظت کریں گے اور ایک اونٹ کا بوجھ زیادہ لائیں گے جو اس کی وجہ سے ہمیں ملے گا کیونکہ شاہ مصر قافلہ کے افراد کی تعداد کے برابر اونٹوں کا بوجھ دیتے ہیں۔ یہ جو ہم لیکر آئے ہیں یہ بہت کم ہے، ہمارے لئے اور ہمارے خاندان کے لئے کافی نہیں ہے، یا یہ معنی کہ بادشاہ پر اپنی سخاوت کی وجہ سے ایک اونٹ کا اضافی بوجھ دینا آسان ہے۔

قَالَ لَنْ اُرْسِلَهٗ مَعَكُمْ حَتّٰى تُؤْتُوْنِ مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ لَتَاْتُنَّنِیْ بِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ یُّحَاطَ بِكُمْ ۚ فَلَمَّاۤ اٰتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِیْلٌ ﴿۶۶﴾

"آپ نے کہا میں ہرگز نہیں بھیجوں گا اسے تمہارے ساتھ یہاں تک کہ کرو تم میرے ساتھ وعدہ جو پختہ کیا گیا ہو اللہ کی قسم سے کہ تم ضرور لے آؤ گے میرے پاس[1] اسے مگر یہ کہ تمہیں بے بس کر دیا جائے[2] پس جب وہ لے آئے آپ کے پاس اپنا پختہ وعدہ[3] تو آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جو ہم گفتگو کر رہے ہیں اس پر گواہ ہے۔[4]"

1۔ یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو فرمایا میں اسے تمہارے ساتھ ہرگز نہ بھیجوں گا کیونکہ پہلے میں تمہارے کرتوت دیکھ چکا ہوں حَتّٰى تُؤْتُوْنِ کو ابن کثیر نے وصلاً اور وقفاً یاء کے اثبات کے ساتھ پڑھا ہے اور ابو عمرو نے صرف وصلاً یاء کو ثابت رکھا ہے اور باقی قراء نے دونوں حالتوں میں یاء کو حذف کیا ہے، یعنی تم مجھے دو پختہ وعدہ جو اللہ تعالیٰ کی قسم کے ساتھ مؤکد ہو یا اس پر اللہ کی شہادت ہو تو میں اعتماد کر لوں گا۔ لتاتننی به۔ یہ جواب قسم ہے کیونکہ معنی یہ ہے کہ حتی کہ تم قسم اٹھاؤ کہ تم اسے لے آؤ گے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 243 (التجاریہ)

۲؎ مجاہد فرماتے ہیں اس کا معنی یہ کہ مگر تم تمام ہلاک ہو جاؤ۔ قتادہ فرماتے ہیں اس کا معنی ہے حتی کہ تم مغلوب ہو جاؤ حتی کہ تمہیں اس کے لوٹانے کی طاقت نہ رہے (1)۔ یہ استثناء مفرغ ہے اعم الاحوال سے، یعنی تم اسے ہر حال میں لے آؤ گے مگر احاطہ کی حالت میں نہیں یا یہ اعم العلل سے حال ہے جب کہ لاتاتننی بہ نفی کی تاویل میں ہو۔ یعنی تم کسی چیز کی وجہ سے تم اس بچے واپس لانے سے نہ رکو گے مگر تمہارا احاطہ ہو جائے۔ جیسے یہ ہے اَقْسَمْتُ بِاللّٰهِ اِلَّا فَعَلْتَ یعنی میں طلب نہیں کرتا تمہارا فعل۔

۳؎ پس جب انہوں نے پختہ وعدہ دے دیا۔ بعض علماء فرماتے ہیں انہوں نے باللہ رب محمد کہہ کر قسم اٹھائی اور اپنی پوری کوشش کی حتی کہ یعقوب علیہ السلام کے پاس بنیامین کو بھیجنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔

۴؎ یعقوب علیہ السلام نے فرمایا یہ جو ہم وعدہ لے اور دے رہے ہیں اور اس کی واپسی کا مطالبہ کر رہے ہیں، اس پر اللہ تعالیٰ گواہ ہے۔ بعض فرماتے ہیں اس کا معنی ہے وہ محافظ ہے۔ حضرت کعب فرماتے ہیں اس پر اللہ تعالیٰ گواہ ہے۔ بعض فرماتے ہیں اس کا معنی ہے وہ محافظ ہے۔ حضرت کعب فرماتے ہیں جب حضرت یعقوب علیہ السلام نے کہا واللہ خیر حافظا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا تو نے مجھ پر توکل کیا ہے اس لئے میں دونوں بیٹوں کو تم پر لوٹاؤں گا۔

وَ قَالَ يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّ ادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ؕ وَ مَاۤ اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۚ وَ عَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴿۶۷﴾

"اور آپ نے کہا: اے میرے بچو! (شہر میں) نہ داخل ہونا ایک دروازہ سے بلکہ داخل ہونا مختلف دروازوں سے اور نہیں فائدہ پہنچا سکتا میں تمہیں اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے کچھ بھی ۲؎ نہیں ہے حکم مگر اللہ تعالیٰ کے لئے ۳؎ اسی پر میں نے توکل کیا ہے اور اسی پر توکل کرنا چاہئے توکل کرنے والوں کو ۴؎"

۱؎ جب بیٹوں نے حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس سے جانے کا ارادہ کیا تو آپ نے فرمایا ایک دروازے سے داخل نہ ہونا بلکہ مختلف دروازوں سے داخل ہونا (1) یہ آپ نے اس لئے فرمایا تھا وہ تمام بڑے حسین بارعب، طاقتور اور سرو قد تھے اور مصر میں بادشاہ کی قرابت اور کرامت کے ساتھ مشہور تھے۔ آپ کو ان پر نظر لگنے کا خدشہ لاحق ہوا۔ حدیث شریف میں العین حق۔ نظر کا لگنا حق ہے۔ نظر کے متعلق سورہ نون میں وَ اِنْ يَّكَادُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا الخ کی تفسیر میں تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ شاید یعقوب علیہ السلام نے پہلی مرتبہ جاتے وقت انہیں یہ وصیت نہیں فرمائی تھی کیونکہ وہ اس وقت مجہول الحال تھے۔ اور اس بات پر برانگیختہ کرنے والی چیز بنیامین پر آپ کا خوف تھا۔ ابراہیم النخعی سے مروی ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے یہ تجویز اس لئے دی تھی کہ وہ یوسف علیہ السلام کو علیحدہ علیحدہ دیکھیں پہلا قول اصح ہے۔

۲؎ اللہ نے جو فیصلہ کر دیا اس سے تمہیں کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتا کیونکہ تقدیر الٰہی یقیناً ہونے والی ہے۔ حضرت عائشہؓ سے مروی ہے فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تقدیر سے کوئی احتیاط فائدہ نہیں پہنچاتی (2)۔ اس حدیث کو حاکم نے روایت کیا ہے اور احمد نے معاذ بن جبل سے اور بزار نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 243 (التجاریہ)

2۔ مستدرک حاکم: 1813، جلد 1، صفحہ 668 (العلمیہ)

۳۔ اگر اللہ تعالیٰ نے تمہیں تکلیف دینے کا فیصلہ فرما دیا ہے تو لامحالہ تمہیں وہ تکلیف پہنچے گی۔ تمہیں کوئی چیز اس سے بچاؤ کا نفع نہ دے گی۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیا اور فرمایا میرا تو اسی پر ہی اعتماد ہے۔

۴۔ ایک جملہ کا دوسرے جملہ پر عطف کرتے ہوئے دو حرف عطف جمع فرما دیئے۔ صلہ اختصاص کے لئے مقدم کیا گیا ہے۔ گویا واؤ عطف کے لئے ہے اور فاء سببیت کا فائدہ دینے کے لئے ہے پس انبیاء کا فعل سبب ہے کہ اس کی دوسرے لوگ اقتداء کریں۔

وَلَمَّا دَخَلُوْا مِنْ حَیْثُ اَمَرَهُمْ اَبُوْهُمْ ؕ مَا كَانَ یُغْنِیْ عَنْهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ اِلَّا حَاجَةً فِیْ نَفْسِ یَعْقُوْبَ قَضٰىهَا ؕ وَ اِنَّهٗ لَذُوْ عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنٰهُ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۶۸﴾

"اور جب وہ (مصر میں) داخل ہوئے جس طرح حکم دیا تھا انہیں انکے باپ نے ۱؎ نہیں فائدہ پہنچا سکتا تھا انہیں اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے کچھ بھی مگر (یہ احتیاطی تدبیر) ایک خیال تھا نفس یعقوب میں جسے انہوں نے پورا کیا اور بیشک وہ صاحب علم تھے بوجہ اس کے جو ہم نے سکھایا تھا انہیں ۲؎ لیکن اکثر لوگ (اس حقیقت کو) نہیں جانتے ۳؎"

۱؎ جب وہ مصر میں داخل ہوئے اور اپنے باپ کے حکم کے مطابق مختلف دروازوں سے۔ بعض فرماتے ہیں شہر کے چار دروازے تھے، پس وہ ان سے داخل ہوئے۔

۲؎ یا من شئ مفعول مطلق ہے، یعنی کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتی یہاں تک کہ بنیامین پکڑے گئے اور یعقوب علیہ السلام پر مصیبت کئی گنا ہو گئی۔ جو کچھ یعقوب علیہ السلام نے کہا تھا اس کی اللہ تعالیٰ نے تصدیق فرما دی۔ الا حاجة فی نفس یعقوب۔ یہ استثناء منقطع ہے یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام کی ان پر شفقت تھی کہ انہیں نظر نہ لگ جائے۔ آپ نے اس خیال کو ظاہر کیا اور انہیں اس کی وصیت کر دی۔ وہ صاحب علم تھے کیونکہ ہم نے انہیں وحی اور حجتوں کے قیام کے ساتھ علم دیا تھا۔ اسی لئے فرمایا وَمَآ اُغْنِیْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ؕ یا یہ معنی کہ وہ صاحب تھے کیونکہ ہم نے انہیں تعلیم دی تھی۔ بعض فرماتے ہیں کہ آپ صاحب علم اس لئے کہا گیا ہے کہ آپ اپنے علم کے مطابق عمل کرتے تھے۔ سفیان فرماتے ہیں جو اپنے علم کے مطابق عمل نہیں کرتا وہ عالم نہیں ہے(1)۔ بعض فرماتے ہیں وہ حفاظت کرنے والے تھے کیونکہ ہم نے انہیں سکھا دیا تھا۔

۳؎ اکثر لوگ وہ نہیں جانتے جو یعقوب علیہ السلام جانتے تھے۔ یا اکثر لوگ تقدیر کو نہیں جانتے کہ احتیاط اس میں کچھ فائدہ مند نہیں ہوتی۔ یا یہ معنی کہ اللہ تعالیٰ جو اپنے اولیاء کو الہام فرماتے ہیں اسے اکثر لوگ نہیں جانتے۔

وَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى یُوْسُفَ اٰوٰۤى اِلَیْهِ اَخَاهُ قَالَ اِنِّیْۤ اَنَا اَخُوْكَ فَلَا تَبْتَىٕسْ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۶۹﴾

"اور جب پہنچے یوسف کے پاس ۱؎ تو یوسف نے جگہ دی اپنے پاس اپنے بھائی کو ۲؎ (نیز) اسے فرمایا میں تمہارا بھائی ہوں ۳؎ نہ غمزدہ ہو (ان حرکتوں پر) جو یہ کیا کرتے تھے ۴؎"

۱؎ جب بھائی یوسف علیہ السلام کے پاس پہنچے تو کہا یہ ہے ہمارا وہ بھائی جس کو لے آنے کا صرف تم نے ہمیں حکم فرمایا تھا، ہم اسے لے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 244 (التجاریہ)

آئیں ہیں۔ آپ نے فرمایا تم نے بہت اچھا کیا اس پر میری طرف سے جزاء ملے گی۔ پھر آپ نے انہیں عزت واحترام سے ٹھہرایا۔ اور ان کی ضیافت کا اہتمام کیا۔ ایک دسترخوان پر دو دو بھائیوں کو بٹھایا اور ان کی ضیافت کا اہتمام کیا۔ بنیامین اکیلے رہ گئے تو رونے لگے اور فرمایا اگر میرا بھائی یوسف زندہ ہوتا تو وہ مجھے اپنے ساتھ بٹھاتا۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا تمہارا یہ بھائی اکیلا رہ گیا ہے۔ اسے آپ نے اپنے ساتھ بٹھایا اور کھانا شروع کر دیا۔ جب رات ہوئی تو آپ نے انہیں دو دو ہونے کا حکم دیا اور فرمایا تم تمام دو دو ہو گئے ہو اور بنیامین اکیلے رہ گئے ہیں۔ یوسف علیہ السلام نے فرمایا یہ میرے ساتھ میرے بستر پر سوئے گا۔ آپ نے اپنے بھائی کے ساتھ رات گزاری۔ حضرت یوسف اس سے بغل گیر ہوئے، اس کی خوشبو سونگھتے یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔ روبیل نے کہا ہم نے ایسا معاملہ نہیں دیکھا۔ جب صبح ہوئی تو یوسف علیہ السلام نے کہا میں نے اس شخص کو دیکھا ہے کہ اس کے ساتھ دوسرا نہیں ہے۔ اس لئے یہ میرے مکان میں میرے ساتھ رہے گا تو آپ نے اسے اپنے مکان میں ٹھہرایا اور کھانا پیش کرنے کا حکم دیا۔

۲؎ اپنے ساتھ ملا لیا اپنے بھائی بنیامین کو یعنی اپنے ساتھ ٹھہرایا۔ جب خلوت ہوئی تو آپ نے اس سے اس کا نام پوچھا تو اس نے کہا بنیامین۔ فرمایا کون بنیامین؟ اس نے کہا جس کی ماں اس کے پیدا ہونے کے بعد فوت ہو گئی تھی۔ آپ نے فرمایا کیا تو پسند کرتا ہے کہ میں تیرا بھائی بن جاؤں اس کی جگہ جس کی محبت تجھے مضطرب کئے ہوئے ہے۔ بنیامین نے کہا اے بادشاہ تیرے جیسا بھائی کون پائے گا لیکن تو میرا بھائی کیسے ہو گا جبکہ تجھے یعقوب وراحیل نے جنا ہی نہیں۔ یوسف علیہ السلام یہ سن کر رونے لگے اور اٹھ کر بنیامین سے معانقہ کیا (1)۔

۳؎ اور اسے کہا میں تیرا بھائی یوسف ہوں۔

انی کی یاء پر نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو نے فتحہ پڑھا ہے اور باقی قراء نے ساکن پڑھی ہے۔

۴؎ یعنی غمزدہ نہ ہو اس پر جو کچھ ان بھائیوں نے ہمارے ساتھ پہلے کیا ہے، اللہ تعالیٰ نے ہم پر احسان فرمایا ہے، ان بھائیوں کو نہ بتانا جو کچھ میں نے تجھے بتایا ہے۔ پھر آپ نے تمام بھائیوں کو ایک ایک اونٹ کا بوجھ دیا اور بنیامین کے نام کا بھی ایک اونٹ دیا۔

فَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ جَعَلَ السِّقَايَةَ فِي رَحْلِ أَخِيهِ ثُمَّ أَذَّنَ مُؤَذِّنٌ أَيَّتُهَا الْعِيرُ إِنَّكُمْ لَسَارِقُونَ ۝

”پھر جب فراہم کر دیا انہیں ان کا سامان (خوراک) تو رکھ دیا (اپنا) پیالہ اپنے بھائی کی خورجی میں ۱؎ پھر پکارا ایک پکارنے والا اے قافلہ والو! ۲؎ بلاشبہ تم چور ہو ۳؎“

۱؎ السِّقَايَةَ سے مراد وہ پیالہ ہے جس میں بادشاہ پانی پیتا تھا۔ یعنی حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے غلاموں کو ایسا کرنے کا حکم دیا۔ ابن عباس نے فرمایا وہ پیالہ زبرجد کا تھا۔ ابن اسحٰق فرماتے ہیں وہ چاندی کا تھا۔ بعض نے فرمایا وہ سونے کا تھا۔ عکرمہ فرماتے ہیں وہ چاندی کا تھا جو جواہر سے مزین تھا۔ یوسف علیہ السلام نے کھانے کی عزت کے لئے اس کو پیمانہ بنایا تھا تاکہ کسی دوسرے پیمانہ کے ساتھ نہ ماپا جائے اور اسی میں آپ پانی پیتے تھے۔ السقایہ اور الصواع ایک چیز ہیں۔ پس وہ پیالہ بنیامین کی خورجی میں رکھ دیا گیا۔ فِي رَحْلِ أَخِيهِ بھائی کی خورجی میں پیالہ رکھا گیا اور بھائی کو محسوس نہ ہوا۔ کعب فرماتے ہیں جب یوسف علیہ السلام نے بنیامین کو کہا میں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 244 (التجاریۃ)

تمہارا بھائی ہوں تو بنیامین نے کہا میں تم سے جدا نہ ہوں گا۔ یوسف علیہ السلام نے فرمایا میرے والد محترم کو جو میرا غم تھا اس کا تو تجھے علم ہے۔ اگر میں تجھے یہاں روک لوں گا تو ان کے غم میں اضافہ ہو جائے گا اور یہ میرے لئے تب ممکن ہے جبکہ میں تمہاری طرف ایسے فعل کو منسوب کردوں جو محمود نہیں ہے اور تجھے ایک امر قبیح کے ساتھ مشہور نہ کروں۔ بنیامین نے کہا مجھے کوئی پرواہ نہیں ہے، جو چاہیں آپ کریں، میں آپ کو نہیں چھوڑوں گا۔ یوسف علیہ السلام نے کہا پھر میں آپ کی خورجی میں اپنا پیالہ چھپا دیتا ہوں۔ پھر تم پر چوری کی منادی کروں گا تا کہ آپ کا لوٹنا میری طرف ممکن ہو جائے۔ بنیامین نے کہا تم ایسا کرو تو آپ نے ایسا کر دیا (1)۔

۲۔ ثم کا کلمہ تراخی پر دلالت کرتا ہے۔ انہوں نے سفر شروع کر دیا تھا اور یوسف علیہ السلام نے انہیں ڈھیل دی تھی یہاں تک کہ وہ ایک منزل سفر کر چکے تھے۔ بعض علماء فرماتے ہیں وہ عمارت سے نکل گئے۔ پھر آپ نے منادی بھیجا اور اس نے انہیں پیچھے سے پکڑ لیا۔ العیر سے مراد وہ اونٹ ہیں جن پر بوجھ لادا جاتا ہے کیونکہ وہ آتے جاتے رہتے ہیں۔ دونوں والوں کو مجازاً العیر کہا گیا ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے گھوڑوں والوں کو کہا یا خیل اللہ ارکبی (2)۔ ابو داؤد نے سمرہ بن جندب سے روایت کیا ہے۔ بعض فرماتے ہیں یہ عیر کی جمع ہے، اس کا اصل وزن فعل بضم الفاء ہے جیسے سقف۔ پھر بیض کے قاعدہ کے مطابق عیر بن گیا۔ پھر گدھوں کے قافلہ کے لئے مجازاً استعمال ہونے لگا۔ پھر ہر قافلہ کے لئے استعمال ہوا۔ مجاہد فرماتے ہیں العیر سے مراد گدھے ہیں، فراء کہتے ہیں وہ اونٹ ہیں (3)۔

۳۔ بعض علماء فرماتے ہیں انہوں نے یہ یوسف علیہ السلام کے حکم کے بغیر کہا تھا۔ بعض فرماتے ہیں انہوں نے آپ کے حکم سے کہا تھا لیکن چور کا لفظ آپ سے بے ساختہ نکلا تھا۔ بعض فرماتے ہیں انہوں نے اسی تاویل سے کہا تھا کہ انہوں نے یوسف علیہ السلام کو اپنے باپ سے چوری کیا تھا اور میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ انہوں نے یہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے کہا تھا اور اللہ تعالیٰ کی وہ ذات ہے جس سے کسی کام کے متعلق پوچھا نہ جائے گا اور دوسروں سے سوال کیا جائے گا اور اس میں حکمت یعقوب علیہ السلام کی آزمائش تھی جیسا کہ ہم بعد میں ذکر کریں گے۔

قَالُوْا وَاَقْبَلُوْا عَلَيْهِمْ مَّاذَا تَفْقِدُوْنَ ﴿۷۱﴾

"(حیرت زدہ ہو کر) وہ بولے درانحالیکہ وہ ان کی طرف متوجہ تھے کون سی چیز تم نے گم کی ہے ۱؎۔"

۱؎ الفقد کسی چیز کے کسی سے غیب ہونے کو کہتے ہیں۔ اس طرح کہ اس کا امکان معلوم نہ ہو۔

قَالُوْا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ وَلِمَنْ جَآءَ بِهٖ حِمْلُ بَعِيْرٍ وَّاَنَا بِهٖ زَعِيْمٌ ﴿۷۲﴾

"انہوں نے کہا ہم نے گم کیا ہے بادشاہ کا پیالہ اور وہ شخص جو ڈھونڈ لائے گا اسے بطور انعام بار شتر (غلہ) دیا جائے گا اور میں اس کا ضامن ہوں ۱؎۔"

۱؎ یعنی بادشاہ کے پیغام رساں اور اس کے بھائیوں نے کہا ہم نے بادشاہ کا پیالہ گم کیا ہے اور تمہارے علاوہ کسی کو ہم متہم نہیں کرتے۔ جو ڈھونڈ لائے گا اسے بطور انعام ایک اونٹ کا بوجھ دیا جائے گا۔ جو لے آئے گا میں اس کا ضامن ہوں۔ اس آیت میں انعام کے جواز اور کفالت کے جواز پر دلیل ہے اور انعام کی کفالت کام مکمل کرنے سے پہلے بھی ہو سکتی ہے۔

قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِی الْاَرْضِ وَمَا كُنَّا سٰرِقِیْنَ ﴿۷۳﴾

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 245 (التجاریہ)　2۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 133 (الامیریہ)　3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 245 (التجاریہ)

”کہنے لگے خدا کی قسم تم خوب جانتے ہو کہ ہم (یہاں) اس لئے نہیں آئے کہ فساد برپا کریں زمین میں اور نہ ہی ہم چوری پیشہ ہیں 1۔“

1۔ قسم ہے اور اس میں تعجب کا معنی ہے، یعنی ہم مصر کی زمین میں چوری کرنے کے لئے نہیں آئے۔ اپنے نفس کی براءت پر ان کے علم سے استشہاد کیا کیونکہ ان کے دوبارہ آنے میں انہیں ایسی باتیں معلوم ہوگئی تھیں جو ان کے فرط امانت پر دلالت کرتی ہیں جیسے ثمن کا واپس لوٹانا اور جانوروں کے منہ باندھنا تا کہ لوگوں کے کھیت نہ کھائیں۔

قَالُوْا فَمَا جَزَآؤُهٗۤ اِنْ كُنْتُمْ كٰذِبِيْنَ ۝

”خدام (یوسف) نے کہا پھر اس کی کیا سزا ہے اگر تم جھوٹے ثابت ہو جاؤ 1۔“

1۔ ندا کرنے والے اور اس کے ساتھیوں نے کہا یعنی چور یا چوری یا پیالہ کی کیا سزا ہے؟ مضاف محذوف ہے براءت کے دعویٰ میں اگر تم جھوٹے ثابت ہو جاؤ۔

قَالُوْا جَزَآؤُهٗ مَنْ وُّجِدَ فِیْ رَحْلِهٖ فَهُوَ جَزَآؤُهٗ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِی الظّٰلِمِیْنَ ۝

”انہوں نے کہا کہ اسکی سزا یہ ہے کہ جسکے سامان میں یہ پیالہ دستیاب ہو تو وہ خود ہی اس کا بدلہ ہے 1۔ اسی طرح ہم سزا دیا کرتے ہیں ظالموں کو 2۔“

1۔ یعنی یوسف کے بھائیوں نے کہا جزاء یعنی چوری کی جزاء جس کے سامان میں پیالہ پایا جائے اس کو پکڑ لینا اور غلام بنانا ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی شریعت میں اسی طرح تھا۔ فَهُوَ جَزَآؤُهٗ یہ سابق حکم کا ثبوت ہے یا من کی خبر ہے اور فاء اس لئے ہے کیوں کہ من میں شرط کا معنی پایا جاتا ہے، یا جواب شرط ہے کہ من شرطیہ ہے اور جملہ جزاءہ کی خبر ہے، اسم ظاہر کو ضمیر کے قائم مقام رکھا گیا ہے۔ گویا یوں کہا گیا ہے جَزَآؤُهٗ مَنْ وُّجِدَ فِیْ رَحْلِهٖ فَهُوَ هُوَ۔

2۔ شریعت یعقوب میں چوری کر کے ظلم کرنے والوں کو ہم اسی طرح سزا دیتے ہیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی شریعت میں تھا چور اگر چوری تسلیم کر لیتا تو جس کی چوری کی گئی ہوتی وہ اس چور کو غلام بنا لیتا۔ پھر اس خادم نے کہا تمہارے سامان کی تفتیش ضروری ہے۔ پس تفتیش میں وہ پیالہ مل گیا۔ یہ بھی روایت ہے کہ وہ خادم انہیں یوسف علیہ السلام کی طرف لوٹا کر لے گیا۔ پھر یوسف نے جو اپنے سامنے تفتیش کرنے کا حکم دیا(1)۔

فَبَدَاَ بِاَوْعِیَتِهِمْ قَبْلَ وِعَآءِ اَخِیْهِ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِّعَآءِ اَخِیْهِ ؕ كَذٰلِكَ كِدْنَا لِیُوْسُفَ ؕ مَا كَانَ لِیَاْخُذَ اَخَاهُ فِیْ دِیْنِ الْمَلِكِ اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ وَ فَوْقَ كُلِّ ذِیْ عِلْمٍ عَلِیْمٌ ۝

”پس تلاشی لینی شروع کی ان کے سامانوں کی یوسف کے بھائی کے سامان کی تلاشی سے پہلے 1۔ آخر کار نکال لیا وہ پیالہ اس کے بھائی کی بوری 2 سے یوں تدبیر کی ہم نے یوسف کیلئے 3 ہیں رکھ سکتے تھے یوسف اپنے بھائی کو بادشاہ مصر کے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 246 (التجاریہ)

قانون میں ۴؎ مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ چاہے ۵؎ ہم بلند کر دیتے ہیں درجے جن کے چاہتے ہیں ۶؎ اور ہر صاحب علم سے برتر دوسرا صاحب علم ہوتا ہے ۷؎''

۱؎ منادی یا یوسف علیہ السلام نے ان کے سامان کی تلاشی شروع کی حتی کہ بنیامین کے سامان سے انہوں نے وہ پیالہ نکال لیا۔ قتادہ فرماتے ہیں ہمیں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ کھولنے والا سامان نہیں کھولتا تھا مگر پہلے اس گناہ کی معافی مانگتا تھا جو انہوں نے انہیں چور کہہ کر کیا تھا حتی کہ جب صرف بنیامین کا سامان باقی رہ گیا تو کہنے لگا میرا خیال ہے کہ اس نے وہ پیالہ اٹھایا ہوگا۔ بھائیوں نے کہا ہم نہیں جائیں گے یہاں تک کہ تو اس کے سامان کی تلاشی لے لے۔ کیونکہ یہ چیز ہمارے اور تمہارے لئے بہتر اور قلبی پاکیزگی کا باعث ہے(1)۔

۲؎ پھر جب بنیامین کا سامان اس نے کھولا تو وہ پیالہ نکال لایا۔ ھا ضمیر کا مرجع السقایہ یا الصواع ہے کیونکہ یہ مذکر اور مونث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ اخیہ سے مراد بنیامین ہے۔ جب اس نے اس کے سامان سے وہ پیالہ نکالا تو حیاء کی وجہ سے بھائیوں کے سر جھک گئے اور وہ بنیامین کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا یہ تو نے کیا کیا، ہمیں تو نے رسوا کر دیا اور ہمارے منہ کالے کر دیئے۔ اے راحیل کے بیٹے جب سے تو نے پیالہ اٹھایا ہے اس وقت سے ہمیں تمہاری طرف سے تکلیف پہنچ رہی ہے۔ بنیامین نے کہا نہیں بلکہ بنو راحیل کو تم سے ہمیشہ تکلیف رہی ہے، تم نے میرے بھائی کو پکڑا اور اسے صحرا میں ہلاک کر دیا اور یہ پیالہ اس نے رکھا ہے میرے سامان میں جس نے تمہارے سامانوں میں تمہاری ثمن رکھی تھی۔ فرماتے ہیں بنیامین کو غلام بنالیا گیا۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ اس تلاشی لینے والے نے بنیامین کی گردن سے پکڑا اور چوروں کی طرح پکڑ کر یوسف کی طرف لے گیا۔

۳؎ کذالک محل نصب میں ہے، یعنی اسی تدبیر کی طرح ہم نے یوسف کے لئے تدبیر کی، یعنی ہم نے انہیں یہ تدبیر سکھائی اور ہم نے یہ تدبیر اسے وحی کی اس سے پتہ چلتا ہے کہ منادی کا قول انکم لسارقون اور مابعد کلام سب یوسف علیہ السلام کے حکم سے تھا اور اللہ تعالیٰ کی وحی کے ساتھ تھا۔ اس میں کوئی معصیت اور گناہ نہیں ہے امام بغوی فرماتے ہیں۔ یہاں کید سے مراد جزاء الکید ہے یعنی انہوں نے یوسف علیہ السلام سے ابتداء میں فریب کیا تھا تو ہم نے انہیں اس فریب کی سزا دی۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام کو بتایا تھا فیکیدوا لک کیداً کہ تیرے بھائی تجھ سے فریب کاری کریں گے۔ پس ہم نے ان کے معاملہ میں یوسف کے لئے تدبیر کی۔ کید کا لفظ مخلوق کیلئے حیلہ کے لئے استعمال ہوتا ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ کے لئے تدبیر حق کے لئے استعمال ہوتا ہے، یعنی ہم نے یوسف کے لئے ایسا کیا یہاں تک کہ اس نے اپنے بھائی کو پکڑ لیا اور اپنے ساتھ ملا لیا اور اس کے درمیان اور اس کے بھائیوں کے درمیان حائل ہو گئے(2)۔

۴؎ ابن عباس فرماتے ہیں بادشاہ کی سلطنت میں بھائی کو پاس رکھنا جائز نہ تھا۔ قتادہ فرماتے ہیں بادشاہ کے حکم میں(3) کیونکہ اس کا حکم یہ تھا کہ چور کو مارا جائے اور اس سے چوری شدہ مال کی دوہری قیمت وصول کی جائے۔

۵؎ مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اس حکم کو بادشاہ کا حکم بنادے استثناء اعم الاحوال سے ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ مستثنیٰ منقطع ہو، یعنی یوسف علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی مشیت، اذن اور لطف حاصل کر لیا اسطرح کہ آپ نے اپنے ارادے تک پہنچنے کا راستہ پالیا کیونکہ یوسف علیہ السلام نے حکم بھائیوں کی طرف لوٹا دیا اور اللہ تعالیٰ نے ان کی زبانوں پر جاری کر دیا کہ چور کی سزا اسے غلام بنالینا ہے۔ پس یوسف علیہ السلام کی مراد اللہ تعالیٰ کی مشیت سے حاصل ہوگئی۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 246 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 247 (التجاریہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 247 (التجاریہ)

لے کوفیوں نے نسبت سے تمییز کی وجہ سے تنوین کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے اضافت کے ساتھ پڑھا ہے جیسا کہ ہم نے یوسف علیہ السلام کا مرتبہ اس کے بھائیوں پر بلند کیا تھا۔ یعقوب نے یرفع اور یشاء دونوں کو غائب کے صیغوں کے ساتھ پڑھا ہے۔

ے مخلوق میں سے ہر صاحب علم کے اوپر علیم سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے کیونکہ لغت میں علیم اسے کہتے ہیں جس کا علم انتہاء کو پہنچا ہوا ہو یا یہ معنی کہ مخلوق میں سے ہر صاحب علم سے برتر دوسرا صاحب علم ہوتا ہے، اگر چہ تفوق اور برتری کسی وجہ سے ہو۔ جیسا کہ خضر علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا کہ میں اللہ تعالیٰ کے علوم میں ایک خاص علم کی مقدار رکھتا ہوں جو اللہ نے مجھے سکھائی ہے اور تم اسے نہیں جانتے اور تو اللہ تعالیٰ کے علوم کا وہ حصہ رکھتا ہے جو میں نہیں جانتا۔ اس حدیث کو بخاری وغیرہ نے موسیٰ علیہ السلام اور خضر علیہ السلام کے قصہ میں نبی کریم ﷺ سے روایت کر کے لکھا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاُمُوْرِ دُنْیَاكُمْ۔ تم مجھ سے دنیا کے امور زیادہ جانتے ہو، آیت کا یہ معنی جائز نہیں کہ مخلوق میں سے ہر صاحب علم سے برتر دوسرا صاحب علم ہوتا ہے اور وہ برتری من کل وجہ ہوتی ہے، ورنہ تسلسل لازم آئے گا۔ ابن عباس فرماتے ہیں ہر صاحب علم سے برتر ایک صاحب علم ہے یہاں تک کہ علم کی انتہا اللہ تعالیٰ تک ہوتی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ ہر عالم سے برتر علم والا ہے (1)۔

قَالُوْۤا اِنْ یَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ ۚ فَاَسَرَّهَا یُوْسُفُ فِیْ نَفْسِهٖ وَ لَمْ یُبْدِهَا لَهُمْ ۚ قَالَ اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا ۚ وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُوْنَ ﴿۷۷﴾

”بھائی بولے اگر اس نے چوری کی ہے (تو کیا تعجب ہے) بیشک چوری کی تھی اس کے بھائی نے بھی اس سے پہلے لے اس چھپالیا اس بات کو یوسف علیہ السلام نے اپنے جی میں اور نہ ظاہر کیا اسے ان پر (جی میں) کہا تم بہت بری جگہ ہو ے اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو تم بیان کر رہے ہو سے“

لے یوسف کے بھائیوں نے کہا اگر بنیامین نے چوری کی ہے فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ تو اس کے ماں جایا بھائی یعنی یوسف نے بھی چوری کی تھی اس سے پہلے۔ سعید بن جبیر اور قتادہ فرماتے ہیں آپ کے نانا کا ایک بت تھا جس کی عبادت کی جاتی تھی۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے خفیہ طریقہ سے وہ اٹھالیا اور اس کو توڑ کر راستہ میں پھینک دیا تا کہ اسکی عبادت نہ کی جائے (2)۔ ابن مردویہ نے ابن عباس سے اور انہوں نے نبی کریم ﷺ سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے سعید بن جبیر سے اسی طرح روایت کی ہے۔ امام بغوی لکھتے ہیں کہ مجاہد فرماتے ہیں حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس ایک سائل آیا تو آپ نے ایک انڈا گھر سے لے کر اسے دے دیا۔ سفیان بن عیینہ فرماتے ہیں آپ نے یعقوب علیہ السلام کے گھر سے ایک مرغی پکڑی اور سائل کو دے دی۔ وہب فرماتے ہیں آپ فقراء کے لئے کھانا دستر خوان سے چھپالیتے تھے (3)۔ میں کہتا ہوں یوسف علیہ السلام ایک کریم اور سخی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور یعقوب علیہ السلام سائلین کو عطا کرنے پر خوش ہوتے تھے تو اس لینے دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ بھائیوں نے ان افعال کو چوری حسد کی بناء پر کہا تھا۔ محمد بن اسحٰق مجاہد سے روایت کرتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام اپنی والدہ کی وفات کے بعد اپنی پھوپھی کی حضانت میں تھے۔ وہ ان کی پرورش کرتی تھیں اور آپ سے انتہائی محبت کرتی تھیں۔ جب آپ بڑے ہو گئے تو یعقوب علیہ السلام کے دل میں آپ کی محبت پیدا ہو گئی۔ یعقوب علیہ السلام اپنی ہمشیرہ کے پاس آئے اور کہا اے بہن یوسف علیہ السلام

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 247 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 247 (التجاریہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 248 (التجاریہ)

اب مجھے دے دو قسم بخدا اب تو میں ایک لمحہ بھی ان کی جدائی برداشت نہیں کر سکتا۔ بہن نے کہا نہیں۔ یعقوب علیہ السلام نے فرمایا خدا کی قسم میں اب اسے نہیں چھوڑوں گا۔ بہن نے کہا اسے کچھ دن میرے پاس رہنے دو تا کہ میں اس سے تسلی حاصل کروں۔ آپ نے اس کی بات مان لی۔ بہن نے حضرت اسحٰق علیہ السلام کے منطقہ کا قصد کیا جو وراثت میں بڑے کو ملتا تھا۔ وہ بہن کے پاس تھا کیونکہ وہ اسحاق علیہ السلام کی اولاد میں سب سے بڑی تھی۔ اس نے وہ منطقہ یوسف علیہ السلام کے کپڑوں کے نیچے باندھ دیا، جبکہ آپ ابھی چھوٹے تھے۔ پھر بہن نے کہا اسحٰق کا منطقہ گم ہو گیا ہے، گھر والوں کی تلاشی لو۔ جب تلاشی لی گئی تو وہ یوسف علیہ السلام کے ساتھ پایا گیا۔ بہن نے کہا قسم بخدا اب تو یہ میرے پاس ہی رہے گا۔ حضرت یعقوب نے فرمایا اگر یوسف علیہ السلام نے ایسا کیا ہے تو وہ تمہاری تحویل میں رہے گا تو بہن نے یوسف علیہ السلام کو اس حیلہ سے روک لیا حتی کہ وہ فوت ہو گئی۔ اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بھائیوں نے کہا تھا (1) اِنۡ یَّسۡرِقۡ فَقَدۡ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنۡ قَبۡلُ۔ (اگر اس نے چوری کی ہے تو اس سے پہلے اس کے بھائی نے بھی چوری کی تھی)۔

۲۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے انکی اس بات کو چھپائے رکھا کہ اس نے چوری کی ہے، گویا آپ نے ان کی یہ بات سنی ہی نہیں۔ یا انہوں نے جو چوری کی آپ کی طرف نسبت کی تھی اسکو چھپائے رکھا۔ آپ نے ظاہر نہ کیا کہ آپ نے یہ بات سنی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا کہ یہ ضمیر تفسیر کی شرط پر کنایہ ہے اور اس کی تفسیر آئندہ کلام کرتی ہے جو قَالَ اَنۡتُمۡ شَرٌّ مَّكَانًا ہے کیونکہ یہ اَسَرَّهَا يُوۡسُفُ فِىۡ نَفۡسِهٖ سے بدل ہے، معنی یہ ہے کہ تم بری جگہ میں ہو کیونکہ تمہارے بھائی نے چوری کی ہے یا تم نے یوسف کی طرف چوری کی نسبت کر کے برا کام کیا ہے اور ضمیر کا مونث ذکر کرنا کلمہ یا جملہ کے اعتبار سے ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں اسی قول میں نظر ہے کیونکہ جملہ کے ساتھ تفسیر صرف ضمیر شان کی بیان کی جاتی ہے (2)۔

۳۔ یعنی اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ معاملہ اس طرح نہیں ہے جیسے تم بیان کرتے ہو۔ جب یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائی کو پکڑ لیا تو دوسرے بڑے غصہ ہوئے اور حضرت یعقوب کی اولاد جب غصے میں آتی تو پھر ان کا مقابلہ مشکل ہوتا۔ روبیل جب غصے میں آتا تو کوئی چیز اس کے غصہ کے سامنے قائم نہ رہتی۔ جب وہ چیخ مارتا تو حاملہ عورت بچہ گرا دیتی اور پھر جب حضرت یعقوب علیہ کی اولاد کا فرد اسے چھوتا تو اس کا غصہ ٹھنڈا ہو جاتا۔ بعض نے لکھا ہے کہ یہ شمعون کی صفت تھی جو یعقوب علیہ السلام کی اولاد سے تھا (3)۔ روایت ہے کہ شمعون نے بھائیوں سے پوچھا مصر کے کتنے بازار ہیں۔ انہوں نے کہا دس؟ اس نے کہا تم بازاروں کی طرف سے میری کفایت کرو۔ میں بازاروں کی طرف سے تمہاری کفایت کرتا ہوں۔ وہ یوسف علیہ السلام کے پاس آئے تو روبیل نے کہا تم ہمارا بھائی واپس کر دو یا میں ایسی چیخ ماروں گا کہ ہر حاملہ عورت کا حمل گر جائے گا۔ روبیل کے جسم کا ہر بال کھڑا ہو گیا اور کپڑوں سے باہر نکل آیا۔ یوسف علیہ السلام نے اپنے چھوٹے بیٹے کو کہا روبیل کے پہلو میں کھڑا ہو جاؤ اور اسے چھو۔ اور یہ بھی روایت ہے کہ آپ نے فرمایا اس کا ہاتھ پکڑ کر میرے پاس لے آ۔ بچہ گیا اور اس کو چھوا تو اس کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ روبیل نے کہا یہاں یعقوب علیہ السلام کی اولاد کا کوئی اثر ہے۔ یوسف علیہ السلام نے فرمایا یہاں یعقوب کی اولاد سے موجود ہے۔ اور یہ بھی روایت ہے کہ وہ دوبارہ غصے ہوا تو یوسف علیہ السلام اس کی طرف بڑھے اور اپنے پاؤں سے اسے ٹھوکر لگائی اور اسے گریبان سے پکڑ کر زمین پر گرا دیا اور کہا تم عبرانی گروہ ہو اور تم یہ گمان کرتے ہو کہ تم پر کوئی غالب نہیں۔ جب انہوں نے یہ صورت حال دیکھی تو سمجھ گئے کہ اب تو ہماری خلاصی کا کوئی راستہ نہیں رہا۔ پس فوراً عجز و انکساری کا راستہ اختیار کیا۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 248 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 5، صفحہ 342 (العلمیہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 248 (التجاریہ)

قَالُوۡا يٰۤاَيُّهَا الۡعَزِيۡزُ اِنَّ لَهٗۤ اَبًا شَيۡخًا كَبِيۡرًا فَخُذۡ اَحَدَنَا مَكَانَهٗ ۚ اِنَّا نَرٰٮكَ مِنَ الۡمُحۡسِنِيۡنَ ﴿۷۸﴾

"وہ کہنے لگے اے عزیز اس کا باپ بہت بوڑھا ہے (اس کی جدائی برداشت نہ کر سکے گا) پس ہم میں سے کسی کو اس کی جگہ پکڑ لیجئے بیشک ہم تجھے نیکوکاروں سے دیکھتے ہیں [۱]"

[۱] کہنے لگے اے عزیز اس کے باپ کی عمر بہت زیادہ ہے۔ قدر میں بڑا ہے وہ اس سے محبت کرتا ہے وہ اس کے ہلاک شدہ بھائی پر بہت زیادہ پریشان ہے۔ اب وہ اس سے انس حاصل کرتا تھا۔ انہوں نے باپ کی یہ کیفیت بیان کی تا کہ ان پر بادشاہ رحم کرتے ہوئے آزاد کر دے۔ اس کی جگہ دوسرا کوئی پکڑ لیجئے۔ ہم تجھے اخلاق و افعال میں محسن دیکھتے ہیں۔ آپ نے ہمیں پورا پورا پیمانہ خوراک دیا۔ خوب مہمان نوازی کی اور ہماری رقم بھی واپس کر دی تھی۔ پس اب بھی ہمارے اوپر اپنا احسان مکمل فرمایئے۔

قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اَنۡ نَّاۡخُذَ اِلَّا مَنۡ وَّجَدۡنَا مَتَاعَنَا عِنۡدَهٗۤ ۙ اِنَّاۤ اِذًا لَّظٰلِمُوۡنَ ﴿۷۹﴾

"آپ نے کہا ہم خدا کی پناہ مانگتے ہیں اس سے کہ پکڑ لیں ہم مگر اس کو جس کے پاس ہم نے اپنا سامان پایا ہے [۱] نہ ہم ظالم ہوں گے [۲]"

[۱] مَعَاذَ اللّٰهِ۔ یہ اصل میں اعوذ معاذ اللہ ہے یعنی ہم اگر غیر کو پکڑیں تو تمہارے فتوے کے مطابق یہ ظلم ہوگا۔ یہاں آپ نے اِلَّا مَنۡ وَّجَدۡنَا فرمایا الا من سرق نہیں فرمایا تا کہ جھوٹ نہ بن جائے۔

[۲] اگر میں اس کی جگہ تمہیں پکڑ لوں تو پھر یہ تمہارے دین کے مطابق ظلم ہوگا۔ مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے پکڑنے کا حکم دیا ہے جس کی خورجی میں وہ پیالہ پایا جائے کیونکہ اس میں مصلحت اور رضا تھی۔ اگر میں کسی اور کو پکڑ لوں تو میں ظالم ہوں گا۔

فَلَمَّا اسۡتَيۡئَسُوۡا مِنۡهُ خَلَصُوۡا نَجِيًّا ؕ قَالَ كَبِيۡرُهُمۡ اَلَمۡ تَعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اَبَاكُمۡ قَدۡ اَخَذَ عَلَيۡكُمۡ مَّوۡثِقًا مِّنَ اللّٰهِ وَمِنۡ قَبۡلُ مَا فَرَّطۡتُّمۡ فِىۡ يُوۡسُفَ ۚ فَلَنۡ اَبۡرَحَ الۡاَرۡضَ حَتّٰى يَاۡذَنَ لِىۡۤ اَبِىۡۤ اَوۡ يَحۡكُمَ اللّٰهُ لِىۡ ۚ وَهُوَ خَيۡرُ الۡحٰكِمِيۡنَ ﴿۸۰﴾

"پھر جب وہ مایوس ہو گئے یوسف سے تو الگ جا کر سرگوشی کرنے لگے [۱] ان کے بڑے بھائی نے کہا [۲] کیا تم نہیں جانتے کہ تمہارے باپ نے لیا تھا تم سے وعدہ جو پختہ کیا گیا تھا اللہ کے نام سے اور اس سے پہلے جو زیادتی یوسف کے حق میں تم کر چکے ہو (وہ بھی تمہیں یاد ہے [۳]) سو میں تو نہیں چھوڑوں گا اس زمین کو جب تک کہ اجازت نہ دیں مجھے میرے باپ یا فیصلہ فرمائے اللہ تعالیٰ میرے لئے اور وہ تمام فیصلہ کرنے والوں سے بہتر ہے [۴]"

[۱] فَلَمَّا اسۡتَيۡئَسُوۡا مِنۡهُ کو بزی نے فَلَمَّا اسۡتَايَسُوۡا، وَلَا تَايۡسُوۡا مِنۡ رَّوۡحِ اللّٰهِ. اِنَّهٗ لَا يَايۡئَسُ. وَحَتّٰۤى اِذَا اسۡتَايۡئَسَ الرُّسُلُ، اَفَلَمۡ يَايۡئَسِ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا پڑھا ہے۔ یعنی فاء کلمہ کی جگہ الف اور عین کلمہ کی جگہ یاء مفتوح بغیر ہمزہ کے پڑھا ہے اور باقی قراء نے ہمزہ اور الف کے بغیر یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور حمزہ جب وقف کرتے تو ہمزہ کی حرکت اپنی اصل کے مطابق یاء کو دے دیتے۔ یعنی جب بھائی یوسف علیہ السلام سے کلیۃً مایوس ہو گئے۔ سین اور تاء کی زیادتی فعل میں مبالغہ کے لئے ہے۔ ابو عبیدہ فرماتے ہیں

استیئسو کا معنی استیئسوا ہے۔ یعنی جب انہوں نے یقین کرلیا کہ وہ ہمارا بھائی ہمیں واپس نہیں کریں گے (1) تو وہ علیحدہ ہو کر سرگوشی کرنے لگے۔ نجیا کو مفرد ذکر کیا گیا ہے حالانکہ یہ متناجین کے معنی میں ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مصدر ہے یا مصدر کے رتبہ میں ہے جیسے کہا جاتا ہے هم صديق اور نجی کی جمع انجیۃ ہے جیسے ندی کی جمع اندیۃ ہے۔

۲ ان میں سے جو علم و فضل میں بڑا تھا اس نے کہا عمر میں بڑا مراد نہیں ہے۔ یہ کہنے والا یہودا تھا۔ ابن عباس اور الکلبی نے اسی طرح لکھا ہے۔ بعض فرماتے ہیں عمر میں بڑا مراد ہے اور وہ روبیل تھا۔ اسی نے بھائیوں کو یوسف علیہ السلام کے قتل سے روکا تھا۔ قتادہ، السدی اور الضحاک کا یہی قول ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں وہ شمعون تھا اور اسے اپنے بھائیوں پر اقتدار حاصل تھا (2)۔

۳ موثقاً کا معنی پختہ عہد ہے من اللہ۔ انہوں نے اللہ کی قسم پختہ عہد کیا ہے کیونکہ اس کے اذن سے تھا اور اس کی جہت سے موکد تھا اور من قبل اصل میں قبل ھذا ہے اور مافرطتم فی یوسف میں ما زائدہ ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ ما مصدریہ ہو اور تعلموا کے مفعول پر عطف کی بنا پر محل نصب میں ہو اور ظرف کے ساتھ عطف میں فاصلہ کی وجہ سے کوئی حرج نہیں ہے یا ان کے اسم پر معطوف ہے اور اس کی خبر فی یوسف یا من قبل ہے یا ابتداء کی وجہ سے مرفوع ہے اور من قبل اس کی خبر ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں اس ترکیب میں نظر ہے کیونکہ جب قبل خبر یا صلہ ہو تو اضافت سے منقطع نہیں ہوتا تا کہ نقص نہ ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ما موصولہ ہو، یعنی جو تم نے اس کے حق میں پہلے خیانت کی ہے (3)۔ اس کا ترکیبی محل رفع یا نصب ہے جیسا کہ پہلے مصدریہ کے بارے گزر چکا ہے۔

۴ ارض سے مراد مصر کی زمین ہے حتی یاذن لی میں نافع اور ابوعمرو نے یاء پر فتحہ پڑھا ہے اور باقی قراء نے ساکن پڑھا ہے ابی۔ نافع اور ابوعمرو اور ابن کثیر نے یاء پر فتحہ اور دوسروں نے اس کو ساکن پڑا ہے، یعنی میرا باپ مجھے لوٹنے کی اجازت دے اور یحکم اللہ لی کا مطلب یہ ہے کہ یا یعقوب علیہ السلام کی زبان کے ذریعے اللہ تعالیٰ مجھے نکلنے اور بھائی کو چھوڑنے کا حکم دے۔ یا یہ معنی کہ میرے مرنے کا فیصلہ دے یا ان سے میرے بھائی کی رہائی کا فیصلہ کرے یا خلاصی کے لئے ان سے قتال کا فیصلہ دے۔ اور اس کا حکم حق پر ہی مبنی ہوتا ہے۔

اِرْجِعُوْۤا اِلٰۤى اَبِیْكُمْ فَقُوْلُوْا یٰۤاَبَانَاۤ اِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ ۚ وَ مَا شَهِدْنَاۤ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا وَ مَا كُنَّا لِلْغَیْبِ حٰفِظِیْنَ ﴿۸۱﴾

"تم لوٹ جاؤ اپنے باپ کی طرف پھر (انہیں یہ) عرض کرو اے ہمارے محترم باپ! بلاشبہ آپ کے بیٹے نے چوری کی (اس لئے وہ گرفتار کر لیا گیا) اور ہم نے (آپ سے) وہی کچھ بیان کیا ہے جسکا ہمیں علم تھا ۱ اور ہم نہیں تھے غیب کی نگہبانی کرنے والے ۲"

۱ یعنی آپ کے بیٹے نے اس طرح چوری کی ہے کہ ہمیں کوئی خبر نہ ہوئی۔ ابن عباس اور الضحاک نے سُرِّق باب تفعیل سے مجہول کا صیغہ پڑھا ہے، یعنی چوری کی طرف ان کی نسبت کی گئی ہے جیسے کہا جاتا ہے خونہ یعنی میں نے اسے خیانت کی طرف منسوب کیا۔ وما شھدنا ہم نے اس پر چوری کی گواہی نہیں دی مگر اپنے یقین کے سبب۔ ہم نے دیکھا کہ واقعی پیالہ اس کی خورجی سے نکالا گیا ہے۔ بعض فرماتے ہیں یہ معنی ہے کہ ہم نے کوئی بات بیان نہیں کی مگر جس کا ہمیں علم ہے۔ ان کا گمان یہ تھا کہ یہ ہماری گواہی نہیں بلکہ یہ آپ کے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 249 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 249 (التجاریہ)
3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 5، صفحہ 345 (العلمیہ)

بیٹے کے فعل کی خبر ہے۔ بعض علماء کرام نے لکھا ہے کہ یعقوب علیہ السلام نے انہیں فرمایا وہ شخص یہ نہیں جانتا تھا کہ چور کو چوری کی وجہ سے غلام بنایا جاتا ہے مگر تمہارے قول سے انہوں نے کہا ہم نے یوسف علیہ السلام کے پاس یہ گواہی نہیں دی تھی کہ چور کو غلام بنایا جاتا ہے مگر جس کا ہمیں علم تھا اور یہ حکم یعقوب اور آپ کے بیٹوں کے ہاں تھا۔

ہ ہم باطن کے حال کے محافظ نہیں ہیں ابن عباس فرماتے ہیں اس کا مطلب ہے کہ ہم اس کی رات، اس کے دن اور اس کے آنے، جانے کی نگہبانی کرنے والے نہ تھے۔ شاید رات کے وقت اس کے سامان میں چھپایا گیا تھا۔ مجاہد اور قتادہ فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ ہم نے جب آپ سے وعدہ کیا تھا اس وقت ہمیں معلوم نہ تھا کہ آپ کا بیٹا چوری کرے گا۔ اور ہم ایسی صورت حال سے دوچار ہوں گے اور تم ایسی مصیبت میں گرفتار ہو گے جیسے یوسف کی وجہ سے ہوتے تھے۔ ہم نے کہا تھا کہ ہم اس کی حفاظت کریں گے جب تک ہمارا بس چلے گا(1)۔

وَسْئَلِ الْقَرْيَةَ الَّتِي كُنَّا فِيهَا وَالْعِيرَ الَّتِي أَقْبَلْنَا فِيهَا ۖ وَإِنَّا لَصَادِقُونَ ﴿٨٢﴾

"اور (اگر آپ کو اعتبار نہ آئے تو) دریافت کیجئے بستی والوں سے جس میں ہم رہے اور (پوچھئے) اس قافلہ سے جس میں ہم آئے اور یقیناً ہم سچ عرض کر رہے ہیں ۔"

لہ قریۃ سے مراد مصر ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں قریۃ سے مراد وہ بستی ہے جس بستی میں انہیں منادی ملا تھا اور اس سے وہ مصر واپس گئے تھے(2)۔ یعنی اس قافلہ سے پوچھو جس میں ہم تھے اور وہ یعقوب علیہ السلام کے پڑوس کی کنعانی قوم تھی۔ ابن اسحٰق کہتے ہیں جس بھائی نے مصر میں اپنے آپ کو محبوس کر دیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ جب یہ والد محترم کے پاس پہنچیں گے تو ان پر الزام ہوگا (کہ یہ جھوٹے ہیں) کیونکہ یوسف علیہ السلام کے معاملہ میں وہ ایسے ثابت ہو چکے تھے۔ اس لئے اس بھائی نے انہیں حکم دیا کہ اپنے باپ کو یہ کہنا کہ وَ إِنَّا لَصٰدِقُوْنَ کہ ہم یقیناً سچے ہیں(3)۔ امام بغوی فرماتے ہیں یوسف علیہ السلام نے اپنے والد محترم کے ساتھ ایسا معاملہ کیوں کیا اور اپنی رہائش گاہ کی خبر کیوں نہ دی اور اپنے بھائی کو محبوس کر لیا حالانکہ آپ کو علم تھا کہ والد محترم ان سے انتہائی محبت رکھتے ہیں۔ ان تمام امور میں والد پر ظلم قطیعۃ الرحم اور قلت شفقت کا اظہار ہے۔ ہم کہتے ہیں اکثر علما کا یہی خیال ہے اور صحیح یہ ہے کہ یہ سب کچھ آپ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے کیا تھا تاکہ یعقوب علیہ السلام کی مصیبت میں اضافہ ہوتا کہ آپ کا اجر کئی گنا ہو جائے اور اپنے آباء کرام کے درجہ تک پہنچ جائیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں یوسف علیہ السلام نے اپنے آپ کو ظاہر نہیں کیا کیونکہ آپ کو اپنے بھائیوں کی سازش پر امن نہ تھا کہ کہیں پھر باپ سے یہ بات پوشیدہ نہ رکھیں۔ پہلا قول اصح ہے(4)۔ میں کہتا ہوں بلکہ صرف وہی صحیح ہے اس کے علاوہ کوئی قول صحیح نہیں ہے بڑے بھائی کے سوا باقی سب برادران یوسف اپنے باپ کے پاس لوٹ آئے اور جو کچھ بڑے بھائی نے انہیں سکھایا تھا وہی انہوں نے اپنے باپ سے ذکر کر دیا۔

قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنْفُسُكُمْ أَمْرًا ۖ فَصَبْرٌ جَمِيلٌ ۖ عَسَى اللَّهُ أَنْ يَأْتِيَنِي بِهِمْ جَمِيعًا ۚ إِنَّهُ هُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ ﴿٨٣﴾

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 250 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 250 (التجاریہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 250 (التجاریہ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 250 (التجاریہ)

"آپ نے (یہ سن کر) کہا بلکہ آراستہ کر دی ہے تمہارے لئے تمہارے نفسوں نے یہ بات [1] (میرے لئے) اب صبر ہی زیبا ہے [2] قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ لے آئے گا میرے پاس ان سب کو بیشک وہ سب کچھ جاننے والا بڑا دانا ہے [3]"

[1] یعقوب علیہ السلام نے فرمایا معاملہ اس طرح نہیں ہے جیسے تم نے کہا ہے بلکہ مزین کر دی تمہارے نفسوں نے تمہارے لئے یہ بات۔ تم نے اس بات کا ارادہ کیا اور تم نے اس بات کو چھپایا۔ بادشاہ تو نہیں جانتا تھا کہ چور چوری کی وجہ سے پکڑا جاتا ہے بلکہ تم نے اپنے بھائی کے سامان کو مصر لیجانے کا ارادہ کیا تھا تا کہ تم جلدی نفع حاصل کرو۔

[2] صبر جمیل اصل میں امری صبر جمیل یاصبری صبر جمیل ہے۔ یعنی لوگوں کی طرف کوئی شکوہ نہیں ہے، مجھے صبر ہی زیبا ہے۔

[3] یعنی یوسف، بنیامین اور ان کا بھائی جو مصر میں محبوس ہے تمام کو میرے پاس لے آئے گا۔ وہ میرے اور ان کے حالات سے باخبر ہے الحکیم۔ وہ اپنی تخلیق کی تدبیر میں حکمت سے کام لیتا ہے، اس نے مجھے تکلیف میں مبتلا نہیں کیا مگر کسی حکمت بالغہ سے۔ جب آپ کو یامین کی یہ خبر پہنچی تو آپ کا حزن وغم انتہا کو پہنچ گیا اور اس میں ایک ہیجان برپا ہو گیا۔

وَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰٓاَسَفٰى عَلٰى يُوْسُفَ وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيْمٌ ﴿۸۴﴾

"اور منہ پھیر لیا آپ نے ان کی طرف سے اور کہا ہائے افسوس یوسف کی جدائی [1] پر اور سفید ہو گئیں ان کی دونوں آنکھیں غم کے باعث [2] اور وہ اپنے غم کو ضبط کئے ہوئے تھے [3]"

[1] اور آپ کو جو بیٹوں کی طرف سے دکھ اور رنج ملا تھا اس کی وجہ سے آپ نے ان سے منہ پھیر لیا۔ یاسفی اصل میں یہ یا اسفی تعال فھذا اوانک تھا۔ اے میرے درد وغم آ جا، یہی تیرے آنے کا وقت ہے۔ الاسف شدت حزن وحسرت کو کہتے ہیں۔ الف یاء متکلم کا بدل ہے۔ عبدالرزاق اور ابن جریر نے سعید بن جبیر سے موقوفاً روایت کیا ہے کہ سوائے امت محمدیہ کے مصیبت کے وقت انا للہ و انا الیہ راجعون کہنا کسی امت کو عطا نہیں کیا گیا۔ آپ دیکھتے نہیں کہ جب یعقوب علیہ السلام کو تکلیف پہنچی تو آپ نے انا للہ و انا الیہ راجعون نہیں کہا بلکہ یاسفی کہا ہے (1)۔ بیہقی نے شعب الایمان میں اسی طرح روایت کیا ہے اور فرمایا الضعفاء نے اس حدیث کو ابن عباس کے واسطہ سے نبی کریم ﷺ تک مرفوع کیا ہے۔ الثعلبی نے سعید بن جبیر سے مرفوعاً نقل کی ہے مگر الاتری الی یعقوب کے الفاظ نہیں ہیں۔

[2] بہت زیادہ رونے کی وجہ سے آپ کی آنکھیں سفید ہو گئیں۔ من الحزن غم کی وجہ سے۔ کثرت بکاء کی وجہ سے آپ کی آنکھوں کی سیاہی ختم ہو گئی اور آپ کی بینائی جاتی رہی۔ مقاتل فرماتے ہیں چھ سال تک آپ کو کچھ نظر نہ آیا (2)۔ بعض علماء فرماتے ہیں آپ کی بینائی ختم نہیں ہوئی تھی، صرف کمزور ہوئی تھی۔

[3] الکظم۔ سانس نکلنے کی جگہ۔ کہتے ہیں اخذ بکظمہ۔ اس نے اس کو غمزدہ کر دیا۔ اور کظوم کا مطلب ہے سانس کو روک لینا اور اسکے ساتھ سکوت اور خاموشی کو تعبیر کیا جاتا ہے۔ پس کظیم وہ شخص جو خاموش اور ساکت ہو۔ یہ فعیل بمعنی فاعل ہے، یعنی وہ شخص جو غم واندوہ پر ضبط کئے ہوئے ہو اور لوگوں کے سامنے اس کا اظہار نہ کرے۔ اسی سے کظم البعیر ہے جس کا مطلب اونٹ کا جگالی نہ کرنا ہے یعنی جو کچھ اس نے کھایا تھا اسے اس نے اپنے پیٹ میں روک لیا ہے۔ کظم السقاء یعنی برتن کو بھرنے کے بعد اس کا منہ بند کر دیا ہے۔ کبھی کبھی کظیم کا اطلاق لبریز اور بھرے ہوئے پر بھی ہوتا ہے کیونکہ بھری ہوئی چیز کا منہ باندھا جاتا ہے اور جو کچھ اس میں ہوتا ہے اسے

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 27 (الامیریہ)

2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 251 (التجاریہ)

روک لیا جاتا ہے۔ اس معنی کے اعتبار سے جائز ہے کہ یہ مفعول کے معنی میں ہو، یعنی جو غم وغصہ سے بھرا ہوا ہو۔ قتادہ فرماتے ہیں اس کا معنی ہے اس نے اپنے غم کو اندر ہی لوٹایا اور بھلائی کے سوا کچھ نہ کہا۔ حضرت حسن فرماتے ہیں حضرت یوسف علیہ السلام کے خروج اور حضرت یعقوب سے ملاقات کے درمیان اسی سال کا عرصہ گزر گیا مگر یوسف علیہ السلام کے ہجر و فراق میں آپ کی آنکھیں خشک نہ ہوئیں اور سطح زمین پر اس وقت اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان سے زیادہ کوئی معزز و محترم نہ تھا(1)۔

یہاں چند اشکال ہیں جو تصوف کے قاعدہ پر وارد ہوتے ہیں وہ یہ کہ اہل تصوف فرماتے ہیں صوفی جب فناء فی اللہ کے مقام پر فائز ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے سوا اس کا دل کسی چیز سے مشغول نہیں ہوتا اور دنیا میں کسی چیز کی محبت اس کے دل میں نہیں سماتی۔ پھر یعقوب علیہ السلام جو جلیل القدر پیغمبر تھے ان کا دل یوسف علیہ السلام کی محبت سے کیوں اتنا مشغول تھا کہ رو رو کر آنکھیں بھی سفید ہو گئیں تھی دراں حالیکہ آپ اپنے نفس پر ضبط کیے ہوئے تھے۔ دوسرا یہ کہا جاتا ہے کہ ستار اعالم اللہ تعالیٰ کی نشانی ہے اور یعقوب علیہ السلام کا دل جو یوسف علیہ السلام کی محبت و عشق میں مستغرق تھا وہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی محبت میں مستغرق تھا۔ یہ قول ابتدائی اور متوسط طبقہ کے موحدین کا ہے اور اہل انتہاء کا رتبہ تو اس سے بھی بلند ہے تو پھر انبیاء کرام کی معرفت کا اندازہ کیسے لگایا جاسکتا ہے۔ فرماتے ہیں اگر ہر چیز میں اللہ تعالیٰ کا دیدار ہوتا ہے اور ہر چیز کی محبت اللہ تعالیٰ کی محبت ہے تو پھر یوسف علیہ السلام کی محبت کی تخصیص کی کوئی وجہ نہیں رہتی۔ اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ یہ حکم دنیاوی اشیاء سے مستغرق ہونے کے بارے میں ہے۔ صوفی جب فنافی اللہ کے مقام پر پہنچتا ہے تو دنیا کی کسی چیز سے اس کا دل معلق نہیں ہوتا مگر اخروی اشیاء کی یہ حیثیت نہیں ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا اَلدُّنْیَا مَلْعُوْنَةٌ وَ مَلْعُوْنٌ مَا فِیْهَا اِلَّا ذِكْرَ اللّٰهِ وَ مَا وَالَاهُ وَ عَالِماً وَ مُتَعَلِّماً دنیا اور جو کچھ اس میں ہے سب ملعون ہے مگر اللہ کا ذکر اور جو اس سے محبت کرتا ہے اور عالم اور متعلم یہ ملعون نہیں ہیں(2)۔ اس حدیث کو ابن ماجہ نے ابوہریرہؓ سے، اور الطبرانی نے ابن مسعود سے سند صحیح کے ساتھ، البزار نے ابن مسعود سے اور الطبرانی نے سند صحیح کے ساتھ ابوالدرداء سے روایت کیا ہے۔ مگر آخرت کی اشیاء کا یہ حکم نہیں ہے کیونکہ آخرت کی اشیاء رضائے الٰہی کا باعث ہیں اور ان کے ساتھ دل کا معلق ہونا اللہ تعالیٰ کی رضا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَ اذْكُرْ عِبٰدَنَاۤ اِبْرٰهِیْمَ وَ اِسْحٰقَ وَ یَعْقُوْبَ اُولِی الْاَیْدِیْ وَ الْاَبْصَارِ۔ یعنی ہمارے بندوں ابراہیم، اسحٰق اور یعقوب کو یاد کرو جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر طاقت رکھتے تھے اور اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کے احکام میں بصارت رکھتے ہیں۔ اِنَّاۤ اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ۔ یعنی ہم نے ایک خالص خصلت کے ساتھ خالص کیا جس میں کسی دوسری چیز کا امتزاج نہیں ہے اور وہ دار آخرت کا ذکر ہے۔ مالک بن دینار فرماتے ہیں نَزَعْنَا مِنْ قُلُوْبِهِمْ حُبَّ الدُّنْیَا وَ ذِكْرَهَا وَ اَخْلَصْنَاهُمْ بِحُبِّ الْاٰخِرَةِ۔ یعنی ہم نے ان کے دلوں سے دنیا کی محبت دور کر دی ہے اور آخرت کی محبت سے ہم نے ان کو خاص کر دیا ہے اور جو وہ کرتے ہیں یا جو چھوڑتے ہیں ہر کام میں رضا الٰہی اور آخرت ہی ان کے پیش نظر ہوتی ہے۔ آخرت پر دار کا اطلاق یہ شعور دلاتا ہے کہ حقیقی گھر اور ٹھکانا آخرت ہی ہے، دنیا تو صرف گزرگاہ ہے۔ یہ آیت کریمہ اس بات کی صراحت کرتی ہے کہ آخرت اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ چیز ہے اور اس کی اور اس میں پائی جانے والی اشیاء کی محبت مدح کا موجب ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے خواب میں بتایا گیا کہ ایک سردار نے گھر بنایا، اس میں دسترخوان سجایا۔ پھر ایک دعوت دینے والا بھیجا، جس نے اس کی دعوت کو قبول کیا وہ اس گھر میں داخل بھی ہوا اور اس دسترخوان سے کھایا بھی اور اس پر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 251 (التجاریہ)

2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 56 (وزارت تعلیم)

سردار خوش بھی ہوا۔ اور جس نے داعی کی دعوت کو قبول نہ کیا وہ نہ گھر میں داخل ہوا، نہ دستر خوان سے کھایا اور اس سے سردار بھی ناراض ہوا۔ پھر فرمایا اللہ سردار ہے، محمد دعوت دینے والا ہے اور گھر اسلام اور دستر خوان جنت ہے (1)۔ اس حدیث کو دارمی نے ربیعہ الجرشی سے روایت کیا ہے۔ یہ اکمل لوگوں کی معرفت کی انتہاء ہے جس پر متوسط لوگ مطلع نہیں ہوتے، چہ جائیکہ اہل ابتداء اور عوام مطلع ہوں۔ اگر رابعہ بصریہ اس مقام پر مطلع ہوتی تو یہ نہ کہتی کہ میں جنت کو جلانا چاہتی ہوں تاکہ لوگ جنت کی خاطر اللہ کی عبادت نہ کریں۔ کیا آپ نے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نہیں سنا مَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَآءَ اللّٰهِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ۔ یعنی آخرت کی ملاقات کا وقت اور اس کی ملاقات کی جگہ جنت ہے۔ اسی طرح نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے جنت پاکیزہ مٹی ہے۔ یہ ایک مفیدہ زمین ہے جس کے درخت یہ ہیں یعنی سبحان اللہ والحمد للہ و لا الہ الا اللہ واللہ اکبر (2)۔ اس حدیث کو ترمذی نے ابن مسعود سے نقل کیا ہے اور شیخین نے صحیحین میں، الحاکم اور طبرانی نے یہ الفاظ لکھے ہیں يُغْرَسُ لَكَ بِكُلِّ وَاحِدٍ شَجَرَةٌ فِي الْجَنَّةِ۔ یعنی ہر کلمہ تیرے لئے جنت میں ایک درخت لگائے گا۔ حضرت مجدد الف ثانی فرماتے ہیں معنی تنزیہی یہ ہے کہ اس نے دنیا میں حروف و کلمات کا لباس پہنا اور جنت میں اشجار و ثمرات کا لباس پہنے گا۔ پس ان کے ساتھ تنزیہات کے ساتھ محبت ہے اسی پر دوسروں کو بھی قیاس کر لو۔ حضرت مجدد فرماتے ہیں میرے نزدیک ہر ایک کی جنت اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے اس اسم کے ظہور سے عبارت ہے جو اس کے تعین کے لئے مبدء ہے اور وہ اسم اس شخص کے لئے اشجار، انہار، حور و قصور اور غلمانوں کی صورت میں ظاہر ہوگا اور مختلف اشخاص کے لئے جنات کا اختلاف صفات و اسماء کے جامعیت اور عدم جامعیت کے تفاوت کے اعتبار سے ہوگا اور اس کی ذات کے قرب اور اس کے علاوہ چیزوں کے اعتبار سے ہوگا۔ یہ اشجار اور اس جیسی دوسری چیزیں کبھی اجرام زجاجیہ کی ہیئت پر ہوں گی اور رویت ذات باری تعالیٰ غیر متکیف کا وسیلہ ہوں گی۔ پھر وہ اپنی ہیئت پر لوٹ آئیں گی۔ ہمیشہ اسی طرح ہوتا رہے گا۔ اگر یہ کہا جائے کہ ممکن فی نفسہ لاشئی عدم اور شر و نقص کا مقتضی ہے اور اس میں جو حسن و جمال اور خیر و کمال ہے وہ واجب تعالیٰ سے مستعار ہے۔ اور محبت اور اشتغال قلب حسن و جمال کے ساتھ متعلق ہوتا ہے اور یہ ہر ممکن میں واجب تعالیٰ سے مستعار ہے تو پھر اشیاء دنیویہ اور اخرویہ کے درمیان فرق کیا ہوا اور ایک کے ساتھ محبت کے تعلق کا جواز اور دوسری کے ساتھ عدم جواز کیوں ہے؟ ہم جواباً کہیں گے عالم تمام کا تمام اللہ تعالیٰ کے اسماء اس کی صفات کا مظہر اور مجال ہے، اور اللہ کی صفات اپنی ذات کے اعتبار سے ممکن اور اللہ تعالیٰ کی ذات کے اعتبار سے واجب ہیں، کیونکہ وہ اس ذات کی محتاج ہیں لیکن ان پر امکان اور وجوب بالغیر کے لفظ کا اطلاق نہیں کیا جاتا تاکہ ان کے حدوث اور ذات باری سے ان کے انفکاک کا شبہ پیدا نہ ہو۔ جب صفات اپنی ذات کے اعتبار سے ممکن ہیں، اگرچہ غیر کی وجہ سے ان کا انعدام محال ہے تو ان میں امکان اور عدم کی بو پائی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے صوفی کے اوپر صفات دو جہتوں سے منکشف ہوتی ہیں۔ 1۔ وجود کی جانب کی جہت سے جو ذات کے مرتبہ سے مستفاد ہے۔ 2۔ اور عدم احتمال کی جانب کی جہت سے ان کے ذاتی امکان کا اعتبار کرتے ہوئے ان کے وجود کی جہت یقیناً حسین اور جمیل ہے اور ان کے عدم کی جہت بھی حسن و جمال سے خالی نہیں ہے کیونکہ انہیں وجود کے جہت کی مجاورت حاصل ہے، اگرچہ یہ حسن وہم کے مرتبہ میں ہے۔ پس جاننا چاہئے کہ سالک کی نظر میں ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات دنیوی اشیاء میں عدم جہت سے روشن ہیں اور اس حیثیت سے یہ اشیاء دنیویہ کو پایہ تکمیل تک پہنچانے والی ہیں اور اخروی اشیاء میں یہ صفات وجود کی جہت سے روشن ہوتی ہیں اور اس حیثیت سے

1۔ سنن الدارمی، جلد 1، صفحہ 15 (المحاسن)
2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 184 (وزارت تعلیم)

اخروی اشیاء کو پایہ تکمیل تک پہنچانے والی ہیں۔ اسی وجہ سے آخرت اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مقبول ہے اور ان کے ساتھ دل کا تعلق ان کے مالک کے ساتھ تعلق کی طرح ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کی محبت میں کامل دار آخرت کی محبت میں کامل ہوتے ہیں۔ یہی اشیاء دنیویہ اور اشیاء اخرویہ میں فرق ہے اور ایک کے ساتھ محبت کا تعلق جائز ہے اور دوسری کے ساتھ جائز نہیں۔

اس تمہید کے بعد ہم کہتے ہیں کہ مجدد الف ثانی کیلئے نظر صحیح اور کشف صحیح کے ساتھ ظاہر ہوا ہے کہ یوسف علیہ السلام کا وجود اور جمال اگرچہ دار دنیا میں مخلوق تھا لیکن وہ دنیا کی تمام موجود اشیاء سے مختلف تھا۔ وہ موجودات اخرویہ کی جنس سے تھا جن کی تربیت اللہ تعالیٰ کی صفات نے وجود کے اعتبار سے کی تھی جیسے جنت اور اس میں حور و غلمان کی تربیت کی ہے۔ پس یقیناً اہل کمال کے دل کا تعلق اور آپ کے ساتھ ان کی محبت جائز ہے جیسا کہ جنت و مافیھا سے دل کا تعلق جائز ہے۔ حضرت مجدد نے جلد ثالث کے مکتوب 100 میں اسی طرح ذکر کیا ہے۔

اس سلسلہ میں دو اشکال اور باقی ہیں۔ 1۔ حضرت مجدد نے ایک دوسرے مقام پر لکھا ہے کہ انبیاء کرام اور ملائکہ کے علاوہ تمام ممکنات اللہ تعالیٰ کے ان اسماء و صفات کے ظلال کے مظاہر و مجال ہیں جو ان کے تعینات کے لئے مبدء ہیں، خود اسماء و صفات کے مظاہر نہیں ہیں اور انبیاء و ملائکہ ان کے تعینات مبدأ اسماء و صفات کے اصول ہیں اور انبیاء و ملائکہ ان اسماء و صفات کے مجال و مظاہر ہیں تو پھر یہاں کیسے فرمایا کہ ممکنات اسماء و صفات الٰہیہ کے مجال و مظاہر ہیں اور یہ کیسے متصور ہو سکتا ہے کہ وہی صفات اشیاء دنیویہ میں اعدام کی جہت سے روشن نہیں اور اشیاء اخرویہ میں وجود کی جہت سے ظاہر ہیں۔ اس کا حل یہ ہے کہ ممکنات کا اسماء کے ظلال کا مجال و مظاہر ہونا ان کے اصول کے ظلال کے مظاہر ہونے کے منافی نہیں ہے کیونکہ ہر شی کے ظل کا ظل اسی شی کا ظل ہوتا ہے۔ پس اسماء و صفات انبیاء کرام میں ظلال کے واسطہ کے بغیر روشن ہوتی ہیں اور دوسری ممکنات میں ظلال کے واسطہ سے ظاہر ہوتی ہیں۔ پھر یہ صفات اشیاء دنیویہ میں ظلال کے وجود اور ذات کے اعتبار سے روشن ہوتی ہیں اور اشیاء اخرویہ میں خالص وجود اور ذات کے اعتبار سے روشن ہوتی ہیں۔ پس ان کے درمیان کوئی منافات نہیں ہے۔

اس طرح یوسف علیہ السلام کی تمام انبیاء پر بلکہ اس ذات پر جو تمام سے افضل ہے افضلیت لازم آتی ہے کیونکہ سابق کلام یہ شعور دلاتی ہے کہ یوسف علیہ السلام کے علاوہ باقی تمام انبیاء دنیا میں صفات الٰہی کی مجال ان کے عدم کی جہت سے ہیں اس کا حل یہ ہے کہ یہ شعور لقب کے مفہوم کی وجہ سے ہے اور لقب کے مفہوم کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا بلکہ حق یہ ہے کہ تمام انبیاء کرام صفات الٰہی کی مجال ہیں ان کے وجود کی جہت کے اعتبار سے اور بقیہ انبیاء کرام سے آخرت کے حسن کا عدم ظہور دنیا میں ان کے صفات الٰہیہ کی جہت عدم کے اعتبار سے مجال ہونے کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ کسی مخفی امر کی وجہ سے ہے جسے صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔

حضرت مجدد نے خاتم الرسل ﷺ کے حسن کے متعلق لکھا ہے کہ محمد ﷺ کا رب اور اس کے تعین کا مبدء علم اجمالی کی صفت ہے اور یہ ذات کی اقرب ترین صفت ہے۔ آپ دیکھتے نہیں کہ علم حضوری عالم اور معلوم کے ساتھ متحد ہوتا ہے اور اس کے علاوہ جو صفات ہیں مثلاً قدرت، ارادہ، کلام، سمع اور بصر یہ اس مقام کی نہیں ہیں اور اجمال از روئے درجہ کے بلند اور ذات کے قریب ہے بنسبت اس کی تفاصیل کے۔ علم کیلئے ایسا حسن ذاتی ہے جو دوسری صفات کے لئے نہیں ہے۔ پس علم اللہ تعالیٰ کو دوسری صفات سے زیادہ محبوب ہے اور علم کے لئے ایسا حسن و جمال ہے جس کی کوئی کیفیت نہیں ہے۔ اسی کمال لطافت اور علو درجہ کی وجہ سے محمد ﷺ میں ایسا حسن و

جمال ظاہر ہوا جسے اس دنیا میں دنیوی آنکھوں کی قوت اپنے ضعف کی وجہ سے آپ کا ادراک نہیں کرسکتیں۔ جیسے اس دنیا میں ذات الٰہیہ کا ادراک نہیں کرسکتیں۔ آپ کا حسن و جمال آخرت میں ظاہر ہوگا۔ یوسف علیہ السلام کو اگرچہ دنیا میں حسن کے دو ثلث عطا کئے گئے مگر آخرت میں تو صرف حسن محمدی حسن ہوگا اور آپ کا جمال ہی جمال ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میرے بھائی یوسف صبیح تھے اور میں ملیح ہوں (1) اور محققین کے نزدیک صباحت و ملاحت میں وہی فرق ہے جو سورج اور چاند میں اور جو سونے اور چاندی میں ہے۔ ان دونوں کے درمیان بہت زیادہ دوری اور فرق ہے۔ یوسف علیہ السلام کا حسن وہ تھا جس سے یعقوب علیہ السلام اور خلائق محبت کرتے تھے اور حسن محمدی ﷺ وہ ہے جس سے یعقوب علیہ السلام اور خلائق کا رب محبت کرتا ہے۔ مٹی اور رب الارباب میں کتنا فرق ہے! جب یہ ثابت ہوگیا تو معلوم ہوگیا کہ صوفی کا دل فناء فی اللہ کے مقام پر فائز ہونے کے بعد غیر اللہ سے مشغول نہیں ہوتا اور اس کے دل میں غیر اللہ کی محبت کی گنجائش نہیں ہوتی لیکن صوفیاء کے دلوں کا انبیاء کرام کی محبت سے مشغول ہونا محبت الٰہی کے منافی نہیں ہے کیونکہ انبیاء کرام کی محبت عین اللہ تعالیٰ کی محبت ہے۔ حضرت انس سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں کوئی شخص کامل مومن نہیں ہوسکتا یہاں تک کہ میں اسے اپنے والد، اپنی اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب ہو جاؤں۔ متفق علیہ (2)۔ حضرت انس سے ہی مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تین چیزیں ایسی ہیں جس میں پائی جاتی ہیں وہ ان کی وجہ سے ایمان کی حلاوت کو پائے گا۔ جس کے نزدیک اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول ہر چیز سے محبوب ہوں۔ متفق علیہ (3)۔

حضرت رابعہ بصریہ کا یہ کہنا کہ میرا دل اللہ تعالیٰ کی محبت سے لبریز ہے اس میں محمد ﷺ کی محبت کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ خطا ہے اور سکر کے غلبہ کی وجہ سے یہ جملہ ان کی زبان سے نکلا ہے اور مجدد کا ابتدائی حالت میں یہ کہنا کہ میں اللہ تعالیٰ سے محبت کرتا ہوں کیونکہ اس نے محمد ﷺ کو پیدا فرمایا ہے۔ یہ قول بھی سکر کی بناء پر ہوا ہے لیکن اصالت کی نوع سے خالی نہیں ہے۔

مسئلہ: اس آیت کریمہ میں مصیبت کے وقت اظہار افسوس اور رونے کے جواز پر دلیل ہے جبکہ اس کے ساتھ نوحہ اور طمانچے مارنا، گریبان چاک کرنا وغیرہ نہ ہو کیونکہ غمزدہ ہونا اور افسوس کا اظہار یہ تکلیف کے تحت داخل نہیں ہیں کیونکہ بہت کم افراد ایسے ہوتے ہیں جو تکلیف کے وقت غمزدہ نہ ہوں۔ صحیحین میں ہے رسول اللہ ﷺ اپنے شہزادے حضرت ابراہیم کے پاس جلدی میں تشریف لائے اور آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے پوچھا یارسول اللہ آپ رو رہے ہیں؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اے ابن عوف یہ رحمت ہے۔ پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا آنکھیں آنسو بہا رہی ہیں، دل غمگین ہے اور ہم نہیں کہتے مگر جس پر ہمارا رب راضی ہے۔ اے ابراہیم ہم تیرے فراق میں غمزدہ ہیں (4)۔ صحیحین میں اسامہ بن زید کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے نواسے کے پاس تشریف لائے۔ آپ کی آواز میں لڑکھڑاہٹ تھی اور آپ کی آنکھیں بہہ رہی تھیں۔ حضرت سعد نے پوچھا رسول اللہ یہ کیا ہے؟ فرمایا یہ رحمت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے دلوں میں رکھا ہے، وہ اپنے رحیم بندوں پر رحم فرماتا ہے (5)۔ صحیحین میں حضرت ابن عمر کی حدیث ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ آنکھ کے آنسوؤں کی وجہ سے عذاب نہیں دیتا اور نہ دل کے غمزدہ ہونے سے عذاب دیتا ہے لیکن وہ اس کی وجہ سے عذاب دیتا ہے یا رحم فرماتا ہے اور آپ ﷺ نے اپنی زبان

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 49 (قدیمی) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 49 (قدیمی) 3۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 49 (قدیمی)
4۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 174 (وزارت تعلیم) 5۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 301 (قدیمی)

کی طرف اشارہ کیا۔ اور میت پر اس کے اہل خانہ کے نوحہ کرنے کی وجہ سے عذاب دیا جاتا ہے(1)۔ صحیحین میں حضرت ابن مسعود کی حدیث ہے جس نے منہ پر طمانچے مارے گریبان چاک کیا اور زمانہ جاہلیت کے پکارنے کی طرح پکارا وہ ہماری جماعت سے نہیں ہے(2)۔ صحیحین میں ابو بردہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں اس سے بری ہوں جس نے مصیبت کے وقت بال مونڈ دیئے یا گلہ پھاڑ کر رویا بلند آواز سے نوحہ کیا اور کپڑے پھاڑ دیئے(3)۔

قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوْسُفَ حَتّٰى تَكُوْنَ حَرَضًا اَوْ تَكُوْنَ مِنَ الْهٰلِكِيْنَ ﴿۸۵﴾

”بیٹوں نے عرض کی بخدا آپ ہر وقت یاد کرتے رہتے ہیں ۱؎ یوسف کو کہیں بگڑ نہ جائے آپ کی صحت ۲؎ یا آپ ہلاک نہ ہو جائیں ۳؎ “

۱؎ تفتؤ یہ اصل میں لا تفتؤ تھا عدم التباس کی وجہ سے لا کو ہمیشہ حذف کیا جاتا ہے کیونکہ اگر اس کا معنی اثبات ہوتا تو فعل پر لام اور نون ضروری لگایا جاتا۔

۲؎ مرض یا بڑھاپے کے سبب ہلاکت کے قریب پہنچنے والے ہیں۔ حرض کا اصلی معنی ہے فرط غم، غلبہ عشق اور بڑھاپے کی بناء پر بدنی اور عقلی قوتوں میں فساد کا پیدا ہو جانا۔ وہ شخص جس کی صحت خراب ہو اور ہلاکت کے قریب ہو۔ قاموس میں اسی طرح ہے۔ یہ مصدر ہے، اس لئے یہ مذکر ہے نہ مونث ہے اور یہاں صفت کی جگہ استعمال ہوا ہے۔

۳؎ یہاں الهالكين بمعنی الميتين ہے۔

قَالَ اِنَّمَاۤ اَشْكُوْا بَثِّیْ وَ حُزْنِیْۤ اِلَى اللّٰهِ وَ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۶﴾

”آپ نے فرمایا میں تو شکوہ کر رہا ہوں ۱؎ اپنی مصیبت اور اپنے دکھوں کا خدا کی بارگاہ میں اور میں جانتا ہوں اللہ کی طرف سے جو تم نہیں جانتے ۲؎ “

۱؎ البث شدت غم کو کہتے ہیں کیونکہ انتہائی مغموم شخص اسے چھپا نہیں سکتا حتی کہ وہ ظاہر ہو جاتا ہے۔ حضرت الحسن فرماتے ہیں بث کا معنی حالی ہے(4)۔ یعنی تمہاری جناب میں یا کسی غیر سے انہیں صرف اپنے خدا کی بارگاہ میں شکوہ کر رہا ہوں اپنی مصیبت اور اپنے دکھوں کا۔ تم مجھے اور میری شکایت کو چھوڑ دو۔ امام بغوی فرماتے ہیں روایت ہے کہ یعقوب علیہ السلام کے پاس آپ کا پڑوسی آیا اور کہا اے یعقوب میں تجھے کیسے دیکھ رہا ہوں۔ کہ آپ بالکل ٹوٹ چکے ہیں اور فناء ہو چکے ہیں حالانکہ آپ ابھی تو اس عمر کو نہیں پہنچے جس تک آپ کا والد محترم پہنچا تھا۔ حضرت یعقوب نے فرمایا مجھے اللہ تعالیٰ کی جانب سے یوسف کے غم سے دوچار کر نیکی آزمائش نے توڑ دیا ہے اور فنا کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے وحی بھیجی اے یعقوب اس میں شکایت میری مخلوق سے کر رہا ہے۔ حضرت یعقوب نے عرض کی اے میرے پروردگار! مجھ سے خطا ہوئی ہے، مجھے معاف کر دے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں نے تجھے معاف کر دیا ہے۔ اس کے بعد جب آپ سے پوچھا گیا تو آپ نے کہا اِنَّمَاۤ اَشْكُوْا بَثِّیْ وَ حُزْنِیْۤ اِلَى اللّٰهِ۔ روایت ہے کہ حضرت یعقوب سے کہا گیا اے یعقوب کس چیز نے تیری آنکھوں کی بینائی ختم کر دی ہے اور کس نے تیری کمر کو دوہرا کر دیا ہے۔ آپ نے فرمایا یوسف پر رونے نے میری بینائی ختم کر

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 2-301 (قدیمی)
2۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 137 (وزارت تعلیم)
3۔ مشکوۃ المصابیح، جلد 1، صفحہ 150 (وزارت تعلیم)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 317 (الفکر)

دی ہے اور اس کے بھائی کے غم نے میری کمر ٹیڑھی کر دی ہے تو اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی کیا تو میری شکایت کر رہا ہے۔ مجھے اپنے عزت کی قسم میں تیری تکلیف کو دور نہ کروں گا یہاں تک کہ تو میری بارگاہ میں فریاد کرے تو اس وقت آپ نے کہا اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّیْ وَحُزْنِیْۤ اِلَى اللّٰهِ۔ اللہ تعالیٰ نے پھر وحی بھیجی کہ مجھے اپنی عزت کی قسم اگر وہ دونوں مردہ بھی ہوتے تو میں ان دونوں کو تیری خاطر نکال لاتا۔ میں نے دیکھا کہ تم نے ایک بکری ذبح کی تھی اور تمہارے دروازے پر مسکین تھا اور تم نے اسے کچھ بھی نہیں کھلایا تھا اور میرے نزدیک میری مخلوق سے محبوب ترین، انبیاء پھر مساکین ہیں۔ پس اب کھانا پکاؤ اور اس پر مساکین کو دعوت دو۔ آپ نے کھانا پکایا پھر اعلان فرمایا جو روزہ دار ہو آج رات آل یعقوب کے پاس افطار کرے۔ روایت ہے کہ اس کے بعد جب صبح ہوئی تو آپ نے منادی کا حکم دیا کہ وہ نداء دے کہ جو صبح کھانا کھانا چاہتا ہے وہ یعقوب کے پاس آئے۔ پس آپ صبح شام مساکین کی معیت میں کھانا کھاتے تھے (1)۔ وہب بن منبہ سے مروی ہے فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے یعقوب علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی کہ تو جانتا ہے کہ میں نے تجھے کیوں عقاب کیا ہے اور اسی سال یوسف علیہ السلام کو کیوں تجھ سے دور رکھا ہے۔ آپ نے عرض کی نہیں یا الٰہی فرمایا تو نے ایک بکری بھونی تھی اور اپنے پڑوسی پر کنجوسی کی تھی تو نے وہ بکری خود کھائی تھی اور پڑوسن کو نہیں کھلائی تھی۔ روایت ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو اس تکلیف میں اللہ تعالیٰ نے اس لئے مبتلا کیا تھا کہ آپ نے ایک بچھڑا بچھڑے کی ماں کے سامنے ذبح کیا تھا اور وہ آواز نکال رہی تھی (2)۔

وہب اور سدی وغیرہ نے لکھا ہے کہ جبرئیل علیہ السلام قید خانہ میں حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس آئے اور پوچھا اے صدیق تم مجھے جانتے ہو؟ یوسف علیہ السلام نے فرمایا میں تمہیں ایک پاکیزہ صورت اور پاکیزہ خوشبو دیکھتا ہوں۔ حضرت جبرئیل نے فرمایا میں رب العالمین کا رسول اور روح الامین ہوں۔ حضرت یوسف نے پوچھا تمہیں گناہ گاروں کی جگہ میں کس نے داخل کیا ہے حالانکہ تم پاکیزہ میں سے پاکیزہ ترین اور مقربین کے سردار اور رب العالمین کے امین ہو۔ جبرئیل نے کہا اے یوسف تجھے معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ انبیاء کی پاکیزگی کی وجہ سے گھروں کو پاک کرتا ہے اور وہ زمین جس میں انبیاء داخل ہوتے ہیں وہ تمام زمینوں سے پاکیزہ ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تیری وجہ سے قید خانہ اور اس کے اردگرد کو پاک کر دیا ہے۔ اے پاکیزہ لوگوں میں سے پاکیزہ ترین اور اے نیک چیدہ لوگوں کی اولاد۔ یوسف علیہ السلام نے کہا میرا نام صدیقین کی فہرست میں کیسے آیا ہے اور تو نے مجھے مخلصین وطاہرین میں کیسے شمار کیا ہے حالانکہ میں مجرموں کی جگہ داخل کیا گیا ہوں اور مجھے فاسقین کے نام کے ساتھ موسوم کیا گیا ہے۔ جبرئیل نے کہا اس کی وجہ یہ ہے کہ تو نے اپنے دل کو فتنہ میں مبتلا نہیں کیا تھا اور اپنے رب کی معصیت میں اپنی مالکن کی اطاعت نہیں کی تھی۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے صدیقین میں تیرا نام رکھا ہے اور تجھے مخلصین میں شمار کیا ہے اور تیرے نیک آباؤ اجداد کے ساتھ تجھے لاحق کیا ہے۔ حضرت یوسف نے پوچھا اے روح الامین کیا تجھے یعقوب علیہ السلام کا علم ہے۔ جبرئیل نے کہا ہاں، اللہ تعالیٰ نے انہیں صبر جمیل عطا فرمایا ہے اور تیرے غم کے ساتھ آزمایا ہے دراں حالیکہ وہ ضبط کئے ہوئے ہیں۔ پوچھا ان کے غم کا اندازہ کیا ہے۔ فرمایا جتنا ان ستر عورتوں کو غم ہوتا ہے جن کی اولاد فوت ہو گئی ہوتی ہے۔ یوسف علیہ السلام نے پوچھا ان کا اجر کتنا ہے؟ فرمایا سو شہید کا۔ پوچھا کیا میری ان سے ملاقات ہوگی۔ فرمایا ہاں؟ یوسف علیہ السلام بڑے خوش ہوئے اور فرمایا اگر میں انہیں دیکھ لوں تو مجھے ان تکلیفوں کی کوئی پرواہ نہیں ہے (3)۔

مجھے میں اللہ کی صنعت اور اس کی رحمت کو جانتا ہوں کہ پکارنے والے کو وہ خائب و نامراد نہیں کرتا اور اپنے فریادی کو کبھی نہیں چھوڑتا۔ یہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 317 (الفکر)

2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 317 (الفکر)

3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 18-317 (الفکر)

معنی کہ اللہ تعالیٰ نے جو مجھے الہام کیا ہے اسکو میں جانتا ہوں، یعنی یوسف علیہ السلام کی زندگی کے بارے میں، تم نہیں جانتے۔ روایت ہے کہ ملک الموت نے یعقوب علیہ السلام کی زیارت کی تو یعقوب نے پوچھا اے میرے فرشتے جس کی خوشبو بڑی پیاری اور صورت بڑی دلربا ہے، کیا تو نے میرے بچے کی روح قبض کر لی ہے تو ملک الموت نے کہا نہیں۔ یعقوب علیہ السلام کو قرار مل گیا اور ان کے دیدار کی امید کرنے لگے بعض فرماتے ہیں اس کا یہ مفہوم ہے کہ میں جانتا ہوں کہ یوسف کا خواب سچا تھا اور میں اور تم عنقریب اس کو سجدہ کریں گے۔ السدی کہتے ہیں جب یعقوب علیہ السلام کو اپنے بیٹے نے بادشاہ کی سیرت کے متعلق بتایا تو یعقوب علیہ السلام کے نفس نے محسوس کیا اور امید کی اور فرمایا شاید وہ یوسف ہو(1)۔ ابن ابی حاتم نے نضر بن عربی سے روایت کیا ہے، فرمایا مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ یعقوب علیہ السلام چوبیس سال اس حالت رہے کہ آپ کو علم نہ تھا کہ یوسف زندہ ہے یا وصال فرما گیا ہے۔ حتیٰ کہ ملک الموت انسانی شکل میں آئے اور آپ نے پوچھا تو کون ہے؟ اس نے کہا میں ملک الموت ہوں۔ تو آپ نے فرمایا میں تجھے خدا کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں کہ تو نے یوسف علیہ السلام کی روح قبض کر لی ہے؟ ملک الموت نے کہا نہیں۔ اس وقت آپ نے فرمایا(2)۔

يٰبَنِيَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَاَخِيْهِ وَلَا تَايْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۷﴾

"اے میرے بیٹو! لگاؤ یوسف کا اور اس کے بھائی کا اور مایوس نہ ہو جاؤ رحمت الٰہی سے بلاشبہ مایوس نہیں ہوتے رحمت الٰہی سے مگر کافر لوگ ۲۔"

۱۔ التحسس کا معنی تطلب الاحساس ہے یعنی تشخیص کرنا اور پہچاننا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں اس کا معنی تلاش کرنا ہے(3)۔ وَلَا تَايْـَٔسُوْا یعنی مایوس نہ ہو جاؤ اللہ کی رحمت سے۔ بعض فرماتے ہیں اس کا مطلب ہے اللہ کی طرف سے خوشی اور انہیں روح پھونکنے سے مایوس نہ ہو جاؤ۔ یعنی جو اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات کا انکار کرنے والے لوگ ہیں وہی لوگ مایوس ہوتے ہیں۔ لیکن عارف رحمت الٰہی سے کسی حال میں بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوتا۔ پس برادران یوسف مصر کی طرف لوٹے حتیٰ کہ وہ مصر پہنچ گئے۔ پھر یوسف علیہ السلام کے پاس گئے۔

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلَيْهِ قَالُوْا يٰۤاَيُّهَا الْعَزِيْزُ مَسَّنَا وَاَهْلَنَا الضُّرُّ وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰىةٍ فَاَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَجْزِي الْمُتَصَدِّقِيْنَ ﴿۸۸﴾

"پھر جب وہ گئے (یوسف علیہ السلام) کے پاس تو انہوں نے عرض کی اے عزیز! پہنچی ہے ہمیں اور ہمارے اہل خانہ کو مصیبت اور (اس مرتبہ) ہم لے آئے ہیں حقیری پونجی ۱۔ پس پورا ناپ دیں ہمیں پیمانہ ۲ اور اس کے علاوہ ہم پر خیرات بھی کریں بیشک اللہ تعالیٰ نیک بدلہ دیتا ہے خیرات کرنے والوں کو ۳۔"

۱۔ الضر سے مراد سخت بھوک ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰىةٍ سے مراد ایسے ردی دراہم ہیں جو خرچ نہیں کئے جاتے۔ ابوعبیدہ اور ابن ابی شیبہ، ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے ابن عباس سے روایت کیا ہے۔ اسی طرح ابن ابی حاتم نے عکرمہ سے روایت کیا ہے۔ عکرمہ نے سعید بن منصور، ابن المنذر اور ابوالشیخ نے بھی کہا ہے بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰىةٍ کا معنی دراہم قلیلہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 318 (الفکر) 2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 61 (العلمیہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 319 (الفکر)

ہیں۔ ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے عبداللہ بن الحارث سے روایت کیا ہے کہ اعراب کا سامان اون اور گھی تھا۔ بعض فرماتے ہیں اون اور چمڑا تھا۔ ابن جریر، ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے ابوصالح سے نقل کیا ہے، فرماتے ہیں وہ صنوبر اور سبزیوں کے دانے تھے۔ ابن النجار نے ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ وہ مقل کا ستو تھا۔ بعض فرماتے ہیں وہ چمڑا اور جو تے تھے۔ الازجاء کی اصل پھینک دینا اور چلانا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اَنَّ اللّٰهَ یُزْجِیْ سَحَابًا اللہ تعالیٰ بادل کو چلاتا ہے، کھوٹے دراہم کو بھی مزاجۃ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ بھی مسترد کر دیئے جاتے ہیں۔ اور پھینک دیئے جاتے ہیں اسی طرح قلیل دراہم کو بھی کہا جاتا ہے کیونکہ وہ بھی متاع عزیز کے مقابلہ میں وصول نہیں کئے جاتے اور پھینک دیئے جاتے ہیں۔ اسی طرح دراہم کے علاوہ ردی چیزوں کیلئے بھی استعمال ہوتا ہے کیونکہ انہیں بھی ثمن کے طور پر قبول نہیں کیا جاتا مگر جب بائع راضی ہو جائے۔

2؎ پس پورا ناپ کر دیں ہمیں پیمانہ جس طرح آپ نے ہمیں اس سے پہلے عمدہ ثمن کے بدلے پورا پیمانہ دیا تھا۔ وتصدق علینا۔ عمدہ اور ردی ثمنوں کے جو درمیان ہے۔ اس کے بدلہ میں ہم پر مہربانی کرو اور ہمارے لئے کمی نہ کیجئے۔ اکثر مفسرین کا یہی خیال ہے۔ ابن جریج اور الضحاک فرماتے ہیں اس کا معنی ہے کہ ہمارے بھائی کو واپس فرما کر ہم پر مہربانی کیجئے(1)۔

3؎ اللہ تعالیٰ خیرات کرنے والوں کو دنیا اور آخرت میں بہتر جزاء عطا فرماتا ہے الا جزاء والتصدق کا معنی مطلقاً مہربانی کرنا ہے۔ اسی سے حضور ﷺ کا سفر میں نماز قصر کے بارے میں ارشاد ہے هٰذِهٖ صَدَقَةٌ تَصَدَّقَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَاقْبَلُوْا صَدَقَتَهٗ(2)۔ یہ تخفیف اللہ کی خیرات اور نوازش ہے جو اللہ نے تم پر کی ہے پس اس کی مہربانی کو قبول کرو۔ اسی حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے۔ لیکن عرفاً صدقہ مختص ہے جس میں ثواب اور رضاء الٰہی مطلوب ہو اور اسی عرف پر یہ روایت بھی مبنی ہے جو حضرت حسن نے سنی کہ ایک شخص کہہ رہا ہے اللهم تصدق علی اے اللہ مجھ پر صدقہ فرما تو آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ صدقہ نہیں فرماتا صدقہ وہ کرتا ہے جو ثواب کا متلاشی ہوتا ہے بلکہ اس طرح دعا مانگ اللهم اعطنی و تفضل علی۔ اے اللہ مجھے عطا فرما اور مجھ پر مہربانی فرما۔ الضحاک نے کہا انہوں نے یہ نہیں کہا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں جزاء دے گا کیونکہ وہ نہیں جانتے تھے کہ آپ مومن ہیں(3)۔ میں کہتا ہوں بلکہ انہوں نے یہ اس لئے کہا کہ وہ نہیں جانتے تھے کہ آپ صدقہ کریں گے یا نہیں۔

فائدہ: سفیان بن عیینہ سے پوچھا گیا کیا سوائے ہمارے نبی محمد ﷺ کے بقیہ انبیاء پر صدقہ حرام تھا۔ حضرت سفیان نے فرمایا کیا تم نے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نہیں سنا وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَجْزِي الْمُتَصَدِّقِيْنَ(4)۔ ابن جریر نے اسی طرح نقل کیا ہے۔ میں کہتا ہوں انبیاء کے لئے صدقہ کی حلت پر اس آیت سے حضرت سفیان نے استدلال کیا ہے مگر یہ استدلال مکمل نہیں ہوتا جب تک برادران یوسف کی نبوت ثابت نہ ہو۔ جب بھائیوں نے یہ کلام کی تو یوسف علیہ السلام پر رقت طاری ہو گئی اور آپ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور آپ پہلے جو چھپائے ہوئے تھے اسے ظاہر فرما دیا۔

قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ وَاَخِيْهِ اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ ﴿۸۹﴾

"آپ نے پوچھا کیا تمہیں علم ہے جو سلوک تم نے کیا یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ 1؎ جب تم نادان تھے 2؎"

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 320 (الفکر)
2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 241 (قدیمی)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 320 (الفکر)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 320 (الفکر)

۱؎ آپ نے پوچھا کیا تمہیں علم ہے جو تم نے ظالمانہ سلوک یوسف سے کیا تھا اور جو ظلم اس کے بھائی کے ساتھ کیا تھا کہ تم نے اسے یوسف سے جدا کر دیا تھا اور اسے یوں ذلیل کیا تھا کہ وہ عجز و ذلت کی وجہ سے کلام بھی نہیں کر سکتا تھا جو تم نے برے افعال کئے تھے ان سے توبہ کرو۔

۲؎ جب تم اس قباحت سے ناواقف تھے اس لئے تم نے یہ اقدام کیا تھا، یا یہ معنی کہ کیا تم نے جو برائی کی تھی تمہیں اس کا انجام معلوم ہے۔ یہ کلام آپ نے انہیں توبہ پر ابھارنے اور ان پر بطور شفقت فرمائی تھی۔ زجر و توبیخ کے لئے نہ تھی۔ اس پر آپ کا ارشاد لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْكُمُ الْیَوْمَ ؕ دلالت کرتا ہے۔ ابن اسحٰق نے یوسف علیہ السلام کی اس کلام کا یہی سبب بیان کیا ہے۔ الکلبی کہتے ہیں یہ کلام آپ نے اس وقت فرمائی جب بھائیوں کے سامنے بیان ہوا کہ مالک بن عمرو نے کہا میں نے کنویں میں اس کیفیت کا غلام پایا تھا اور پھر میں نے اسے اتنے درہم میں خریدا تھا تو بھائی کہنے لگے وہ غلام ہم نے اسے بیچا تھا تو یہ سن کر یوسف علیہ السلام کو غصہ آ گیا اور ان کو قتل کرنے کا حکم دیا۔ جب یوسف علیہ السلام کے کارندے ان کے قتل کرنے کے لئے لے جا رہے تھے تو یہودا نے پیچھے مڑ کر کہا حضرت یعقوب ہم میں سے ایک کے مفقود ہونے پر اتنے غم زدہ ہوئے کہ آنکھوں کی بینائی ختم کر بیٹھے تو سارے بیٹے قتل ہو جائیں گے تو اس وقت ان کی حالت کیا ہوگی۔ بھائی کہنے لگے اگر آپ ہمارے ساتھ ایسا کرنا چاہتے ہیں تو ہمارا سامان فلاں جگہ ہمارے باپ کے پاس پہنچا دیں۔ یہ سن کر آپ کو رحم آ گیا اور پھر آپ نے یہ کلام فرمائی (1)۔ عبد اللہ بن یزید بن ابی فروہ سے مروی ہے کہ یعقوب علیہ السلام کو جب بنیامین کے محبوس ہونے کی خبر پہنچی تو آپ نے یوسف علیہ السلام کو بھائیوں کے ہاتھ ایک خط روانہ کیا جب وہ تیسری مرتبہ غلہ لینے جا رہے تھے۔ خط کی عبارت یہ تھی: یعقوب اسرائیل اللہ بن اسحاق ذبیح اللہ بن ابراہیم خلیل اللہ کی طرف سے بادشاہ مصر کی طرف۔ فرمایا ہم ایسے گھر والے ہیں جن پر آزمائش ڈالی گئی ہے۔ میرے دادا ابراہیم کے ہاتھ، پاؤں باندھ کر آگ میں ڈالا گیا پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر وہ آگ سرد اور ٹھنڈی کر دی۔ میرے باپ کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے گئے اور ان کے گلے پر چھری رکھی گئی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی جگہ فدیہ دیا اور میں میرا ایک بیٹا تو جو مجھے تمام بیٹوں سے زیادہ پیارا تھا اسے اس کے بھائی جنگل کی طرف لے گئے اور پھر ان کی قمیص خون سے لت پت کر کے لے آئے اور کہا اسے بھیڑیا کھا گیا ہے۔ پس رو رو کر میری آنکھیں ختم ہو گئیں ہیں۔ پھر میرا ایک اور بیٹا تھا۔ اس کی اور اس پہلے بیٹے کی ماں ایک تھی۔ میں اس سے اپنے دل کو تسلی دیتا تھا۔ اسے تو نے روک لیا ہے اور تیرا خیال ہے کہ اس نے چوری کی ہے۔ ہم اہل بیت نہ چوری کرتے ہیں اور نہ چوروں کو جنم دیتے ہیں۔ اگر تو میرا وہ بیٹا واپس کر دے تو فبہا ورنہ میں تیرے لئے ایسی بددعا کروں گا جس کا اثر تیری ساتویں پشت تک ہوگا۔ جب یوسف علیہ السلام نے یہ خط پڑھا تو آپ رونے لگے اور اپنے دل کی بات ظاہر کر دی اور فرمایا تم نے جو یوسف اور اس کے بھائی کی لاعلمی کی وجہ سے کیا تھا وہ یاد ہے؟ یعنی تمہیں معلوم نہ تھا کہ معاملہ تو یوسف علیہ السلام کی طرف لوٹ جائے گا۔ بعض فرماتے ہیں جاھلون کا معنی ہے جب تم مجرم و خطا کار تھے۔ الحسن فرماتے ہیں جب تم جوان تھے اور تم پر جوانی حیوانی کا خمار تھا (2)۔

قَالُوْۤا ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ یُوْسُفُ ؕ قَالَ اَنَا یُوْسُفُ وَ هٰذَاۤ اَخِیْ٘ ؗ قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَیْنَا ؕ اِنَّهٗ مَنْ یَّتَّقِ وَ یَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ ۝۹۰

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 21-320 (الفکر)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 321 (الفکر)

"(سراپا حیرت بن کر) کہنے لگے کیا (سچ مچ) آپ ہی یوسف ہیں [1] فرمایا (ہاں) میں یوسف ہوں اور میرا بھائی ہے بڑا کرم فرمایا ہے اللہ نے ہم پر یقیناً جو شخص تقویٰ اختیار کرتا ہے اور صبر کرتا ہے [2] (وہ آخرکار کامیاب ہوتا ہے) بلاشبہ اللہ تعالیٰ نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا [3] "

[1] ءَاِنَّكَ۔ جمہور نے استفہام تقریر کے طور پر پڑھا ہے۔ اس لئے ان اور لام ذکر کیا گیا ہے اور ہمزہ مفتوحہ اور مکسورہ کو اپنے اپنے اصول پر پڑھا ہے۔ ابن کثیر نے خبر کے طور پر انک پڑھا ہے۔ واقعی آپ یوسف ہیں۔ ابن اسحاق کہتے ہیں یوسف علیہ السلام ان سے پردے کے پیچھے سے کلام کرتے تھے۔ جب آپ نے هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ فرمایا تو پردہ اٹھا دیا جب پردہ اٹھایا تو بھائی پہچان گئے(1) میں کہتا ہوں یہ بات مستبعد ہے اور مذکورہ قصہ اس کے ساتھ کوئی موافقت نہیں کرتا۔ الضحاک کہتے ہیں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ جب آپ نے یہ جملہ فرمایا تو آپ مسکرا پڑے بھائیوں نے آپ کے موتیوں کی طرح چمکتے ہوئے دانت دیکھے تو انہوں نے بادشاہ مصر کو یوسف کے ساتھ تشبیہ دی۔ عطاء کہتے ہیں ابن عباس سے مروی ہے کہ بھائیوں نے آپ کو نہ پہچانا حتیٰ کہ آپ نے اپنے سر مبارک سے وہی شاہی تاج اتار کر رکھ دیا جو آپ کے سر مبارک میں ایک علامت تھی اور حضرت یعقوب علیہ السلام میں بھی وہ علامت تھی۔ اسحٰق علیہ السلام میں بھی ایسی علامت تھی اور حضرت سارہ کی اسی کی مثل علامت تھی۔ وہ شامہ کی مانند تھی۔ پس انہوں نے اس علامت سے آپ کو پہچان لیا اور کہا تو یوسف ہے اور بعض علماء لکھتے ہیں انہوں نے یہ بطور توہم کہا(2) حتیٰ کہ آپ نے خود تصدیق کر دی اور فرمایا میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی بنیامین ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام سے بھائیوں نے اپنے متعلق پوچھا تھا مگر آپ نے اپنے بھائی عظمت شان اور آئندہ قول میں شریک کرنے کے لئے ساتھ ان کا بھی ذکر کر دیا۔ اس نے ہمیں عزت و سلامتی کے ساتھ جمع فرما کر ہم پر احسان فرمایا ہے۔

[2] یتق کو قنبل نے وصلاً اور وقفاً کے اثبات کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی علماء نے دونوں حالتوں میں یاء کے حذف کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی جو فرائض کی ادائیگی اور گناہوں سے اجتناب کر کے اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے اور بلیات و طاعات پر صبر کرتا ہے اور گناہوں سے رکتا ہے۔

[3] اللہ تعالیٰ محسنین کے اجر کو دنیا و آخرت میں ضائع نہیں کرتا۔ یہاں ضمیر کی جگہ محسنین کا لفظ ذکر فرمایا اس بات پر آگاہ کرنے کے لئے کہ محسن وہ ہوتا ہے جو تقویٰ اور صبر کا جامع ہوتا ہے۔

قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَ اِنْ كُنَّا لَخٰطِـٕيْنَ ﴿۹۱﴾

"بھائیوں نے کہا خدا کی قسم بزرگی دی ہے اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہم پر [1] بیشک ہم ہی خطاکار تھے [2] "

[1] معذرت کرتے ہوئے کہنے لگے خدا کی قسم اللہ تعالیٰ نے آپ کو حسن صورت، کمال سیرت اور تمام فضائل دنیویہ و اخرویہ کے اعتبار سے ہم پر فضیلت دی ہے۔

[2] حالت یہ تھی کہ ہم نے تمہارے ساتھ ظلم کر کے جرم کیا تھا خطا خطأً کا معنی جان بوجھ کر خطا کرنا اور اخطا کا معنی ہے جس غلطی میں ارادہ نہ ہو۔

قَالَ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ؕ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ ۟ وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۹۲﴾

"آپ نے فرمایا نہیں کوئی گرفت تم پر آج کے دن معاف فرما دے اللہ تعالیٰ تمہارے (قصوروں) کو [1] اور وہ سب

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 321 (الفکر)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 321 (الفکر)

مہربانوں سے زیادہ مہربان ہے[2]۔"

[1] حضرت یوسف علیہ السلام نے نہایت حلم کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرمایا لا تثریب (کوئی گرفت نہیں) یہ باب تفعیل کا مصدر ہے جو ثرب سے مشتق ہے اور ثرب اس چربی کو کہتے ہیں جو اوجھ کے اوپر چھائی ہوتی ہے اور اس کا معنی ثرب کا اتارنا ہے۔ پھر یہ اس توبیخ کے لئے استعمال ہونے لگا جو عزت و وقار کو پھاڑ دے اور چہرے کے پانی کو ختم کر دے اور علیکم الیوم تثریب کے متعلق ہے یا مقدر کے متعلق ہے جو لا تثریب کی خبر واقع ہوگا۔ معنی یہ ہے کہ آج کے دن بھی میں تمہیں زجر و توبیخ نہیں کرتا تو بقیہ ایام میں تمہارا کیا خیال ہے یا یہ کہ میں نے تمہارے اعتراف جرم کے بعد تمہیں معاف کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہارے گناہ معاف فرمائے گا۔

[2] یعنی میں نے تمہیں معاف کر دیا ہے جو میں فقیر اور کمزور ہوں تو پھر تمہارا اس غنی و غفور کے متعلق کیا خیال ہے، وہ تو صغائر و کبائر کو معاف فرماتا ہے اور توبہ کرنے والے پر مہربانی فرماتا ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں حضرت یوسف علیہ السلام کی یہ کرم نوازی تھی کہ انہوں نے جب آپ کو پہچانا اور انہوں نے آپ کی طرف پیغام بھیجا کہ جناب آپ صبح و شام ہمیں کھانے پر بلاتے ہیں جبکہ ہم سے آپ کے بارے میں جو کوتاہی ہوئی ہے۔ اس کی وجہ سے ہمیں شرم محسوس ہو رہی ہے۔ تو آپ نے فرمایا اہل مصر مجھے پہلی نظر سے دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں پاک ہے وہ ذات جس نے بیس درہموں سے خریدے ہوئے غلام کو اس عظیم مقام پر پہنچایا۔ یقیناً میں نے تمہاری وجہ سے شرف پایا ہے اور ان کی نظروں میں تمہاری وجہ سے عظیم بنا ہوں کیونکہ اب انہیں پتہ چلا ہے کہ تم میرے بھائی ہو اور ابراہیم علیہ السلام کی اولاد سے ہو(1)۔

امام بغوی فرماتے ہیں جب یوسف علیہ السلام نے انہیں اپنا تعارف کرایا اور ان سے اپنے والد محترم کے بارے میں پوچھا تو فرمایا میرے بعد میرے والد صاحب کا کیا حال ہوا۔ انہوں نے کہا ان کی رو رو کر آنکھیں چلی گئی ہیں تو آپ نے انہیں اپنی قمیص عطا فرمائی(2) اور اپنے والد محترم کو بلا بھیجا اور فرمایا۔

اِذْهَبُوْا بِقَمِیْصِیْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ اَبِیْ یَاْتِ بَصِیْرًا ۚ وَ اْتُوْنِیْ بِاَهْلِكُمْ اَجْمَعِیْنَ ﴿۹۳﴾

"لے جاؤ میرا یہ پیراہن پس ڈالو اسے میرے باپ کے چہرے پر وہ بینا ہو جائیں گے[1] اور (جا کر) لے آؤ میرے پاس اپنے سب اہل و عیال کو[2]"

[1] یہ پیراہن لے جاؤ اور میرے باپ کے چہرہ پر ڈالو، وہ میری طرف بینا ہو کر آئیں گے۔ یا یہ معنی کہ وہ بینا ہو جائیں گے۔ حضرت الحسن فرماتے ہیں آپ کو حضرت یعقوب کے بینا ہونے کا علم نہ ہوا تھا مگر اللہ تعالیٰ کے آگاہ کرنے کے بعد۔ الضحاک کہتے ہیں وہ قمیص جنت کی بنی ہوئی تھی۔ مجاہد کہتے ہیں حضرت یوسف علیہ السلام کو جبرئیل نے کہا تھا کہ تم اپنی قمیص یعقوب علیہ السلام کی طرف بھیجو اور یہ قمیص ابراہیم علیہ السلام کی تھی۔ یہ وہی قمیص تھی جو آپ سے اتاری گئی تھی اور پھر آپ کو برہنہ کر کے آگ میں ڈالا گیا تھا تو فوراً جبرئیل امین جنت سے ریشمی قمیص لائے تھے اور آپ کو پہنائی تھی تو یہ قمیص پھر حضرت ابراہیم کے وصال کے بعد حضرت اسحق کو وراثت میں ملی۔ جب آپ کا وصال ہوا تو یعقوب علیہ السلام کو ملی جب یوسف علیہ السلام جوان ہوئے تو یعقوب علیہ السلام کو ان پر نظر بد کے لگنے کا خدشہ ہوا تو وہ قمیص آپ نے ایک تعویذ میں ڈال کر آپ کے گلے میں ڈالی دی۔ جب یوسف علیہ السلام و برہنہ کر کے کنویں میں ڈالا گیا تو جبرئیل امین

1۔ تفسیر بیضاوی، جلد 5، صفحہ 366 (العلمیہ)　　2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 322 (الفکر)

آئے اور وہ قمیص اس تعویذ سے نکال کر آپ کو پہنا دی۔ اس وقت جبرئیل حضرت یوسف کے پاس آئے اور فرمایا اپنی قمیص والد صاحب کی طرف بھیج دو کیونکہ اس میں جنت کی خوشبو ہے، کسی مصیبت زدہ اور بیمار کے اوپر ڈالی جائے تو اسے عافیت ہو جاتی ہے۔ تو یوسف علیہ السلام نے وہ قمیص اپنے بھائیوں کو دی اور فرمایا اسے میرے والد صاحب کے چہرے پر ڈال دو۔ وہ بینا ہو جائیں گے(1)۔

میں کہتا ہوں جب مجدد الف ثانی کے کشف سے ثابت ہے کہ یوسف علیہ السلام کا وجود جنت کی اشیاء میں سے تھا تو پھر قمیص کے جنتی ہونے کے ثبوت کی ضرورت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس مصیبت زدہ کو شفا ملتی ہے بلکہ اس کا یوسف علیہ السلام کا ملبوس ہونا کافی ہے کیونکہ یوسف علیہ السلام کا وجود جنت کی اشیاء کی جنس سے تھا۔ اور تم خود بھی آؤ اور میرے والد محترم اپنی بیویاں بچے اور غلام تمام کو میرے پاس لے آؤ۔

وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيْرُ قَالَ اَبُوْهُمْ اِنِّيْ لَاَجِدُ رِيْحَ يُوْسُفَ لَوْلَاۤ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ ﴿۹۴﴾

"اور جب قافلہ (مصر سے) روانہ ہوا (تو ادھر کنعان میں) ان کے باپ نے فرمایا کہ میں تو یوسف کی خوشبو سونگھ رہا ہوں[1] اگر تم مجھے بے وقوف خیال نہ کرو[2]"۔

[1] اور جب وہ قافلہ مصر سے روانہ ہوا جس میں یوسف علیہ السلام کی قمیص تھی اور وہ مصر کی آبادی سے کنعان کی طرف نکلا قَالَ اَبُوْهُمْ تو یعقوب علیہ السلام نے اپنے پاس بیٹھے ہوئے لوگوں کو فرمایا اِنِّيْ لَاَجِدُ رِيْحَ يُوْسُفَ میں یوسف کی خوشبو سونگھ رہا ہوں۔ اس میں دلیل ہے کہ جنت کی خوشبو یوسف علیہ السلام کی ذات میں تھی، قمیص میں نہ تھی ورنہ آپ فرماتے میں یوسف کی قمیص کی خوشبو سونگھ رہا ہوں۔ امام بغوی فرماتے ہیں روایت ہے کہ باد نسیم نے اللہ تعالیٰ سے یہ اذن طلب کیا کہ وہ یوسف کی خوشبو پہلے پہنچا دے۔ خوشخبری دینے والے کے پہنچنے سے پہلے۔ مجاہد فرماتے ہیں یعقوب علیہ السلام کو تین دن کی مسافت سے یوسف علیہ السلام کی خوشبو محسوس ہوئی تھی۔ ابن عباسؓ سے آٹھ دنوں کی مسافت منقول ہے۔ الحسن فرماتے ہیں دونوں کے درمیان اسی فرسخ کا فاصلہ تھا۔ بعض فرماتے ہیں ہوا چلی تھی اور اس نے یعقوب علیہ السلام تک قمیص کی خوشبو پہنچائی تھی۔ پس یعقوب علیہ السلام نے جنت کی خوشبو پائی اور جان لیا کہ جنت کی خوشبو تو زمین پر کی اس قمیص میں تھی۔ اس لئے فرماتے ہیں یوسف کی خوشبو سونگھ رہا ہوں(2)۔

[2] تم مجھے نادانی کی طرف منسوب نہ کرو، فند اس نادانی کو کہتے ہیں جو بڑھاپے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اس وجہ سے عجوز مفندہ نہیں کہا جاتا کیونکہ اس کی عقل کا نقصان ذاتی ہوتا ہے۔ لولا کا جواب محذوف ہے جس کی تقدیر یہ ہے کہ لَصَدَّقْتُمُوْنِيْ یا لَقُلْتُ اِنَّهٗ قَرِيْبٌ۔ قالوا یعنی جو حضرت یعقوب کے پاس بیٹھے تھے انہوں نے کہا۔

قَالُوْا تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِيْ ضَلٰلِكَ الْقَدِيْمِ ﴿۹۵﴾

"گھر والوں نے کہا بخدا (باباجی) آپ قسم بخدا اپنی پرانی محبت میں مبتلا ہیں[1]"

[1] یوسف علیہ السلام کی محبت افراط اور ان کی ملاقات کی توقع اور ان کا کثرت سے ذکر کرنے کی وجہ سے تم پہلے کی طرح درست سمت کھو بیٹھے ہو۔

فَلَمَّاۤ اَنْ جَآءَ الْبَشِيْرُ اَلْقٰىهُ عَلٰى وَجْهِهٖ فَارْتَدَّ بَصِيْرًا ۚ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ ۚ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 23-322 (الفکر)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 323 (الفکر)

اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۹۶﴾

''پس جب انہیں خوشخبری سنانے والا آیا (اور) اس نے ڈالا وہ پیراہن آپ کے چہرہ پر تو وہ فوراً بینا ہو گئے آپ نے فرط مسرت سے کہا۔ ۱؎ دیکھو کیا میں تمہیں کہا کرتا تھا تمہیں کہ میں جانتا ہوں اللہ کے بتانے سے) جو تم نہیں جانتے ۲؎ ''

۱؎ لما کے بعد ان زائدہ ہے۔ ابن مسعود فرماتے ہیں وہ خوشخبری دینے والا قافلہ سے پہلے آیا۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں وہ یہودا تھا۔ سدی فرماتے ہیں یہودا نے کہا خون سے لت پت قمیص بھی میں حضرت یعقوب کے پاس لے گیا تھا۔ اور میں نے کہا تھا کہ یوسف کو بھیڑیا کھا گیا ہے تو آج بھی میں ان کے پاس قمیص لے جاتا ہوں، انہیں بتاتا ہوں کہ یوسف زندہ ہے۔ پس میں ہی انہیں خوش کروں گا جیسے میں نے انہیں غمزدہ کیا تھا۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں یہودا نے قمیص اٹھائی اور ننگے پاؤں ننگے سر دوڑ پڑا اور اس کے ساتھ سات روٹیاں تھیں۔ اس نے ابھی تمام روٹیوں کو کھایا نہیں تھا کہ وہ اپنے باپ کے پاس پہنچ گیا اور وہ 80 فرسخ کی مسافت تھی۔ بعض علماء فرماتے ہیں وہ خوشخبری دینے والا مالک بن دعر تھا (1) اس خوشخبری دینے والے نے یوسف علیہ السلام کی قمیص یعقوب علیہ السلام کے چہرۂ مبارک پر ڈالی تو آپ فوراً بینا ہو گئے۔ کھوئی ہوئی بینائی کے بعد آپ کی آنکھیں کھل گئیں، کمزوری کے بعد آپ کی طاقت واپس آ گئی اور بڑھاپے کے بعد آپ کا شباب لوٹ آیا۔

۲؎ نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو نے انی کو یاء کے فتحہ کے ساتھ اور دوسرے علماء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ حضرت یعقوب نے فرمایا میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یوسف علیہ السلام کی زندگی کو جانتا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اکٹھا فرمائے گا۔ یہ ایسی بات ہے جو تم نہیں جانتے۔ بعض فرماتے ہیں انی اعلم یہ مستقل کلام ہے اور آپ نے جو پہلے قول فرمایا تھا وہ یہ تھا لَا تَايْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ. وَاِنِّیْ لَاَجِدُ رِیْحَ یُوْسُفَ ۔ امام بغوی فرماتے ہیں روایت ہے کہ یعقوب علیہ السلام نے خوشخبری دینے والے سے پوچھا یوسف کیسے ہیں۔ اس نے کہا وہ تو شاہ مصر ہیں۔ حضرت یعقوب نے فرمایا میں بادشاہی کو کیا کروں، میں تو یہ پوچھ رہا ہوں کہ وہ کس دین پر ہے؟ خوشخبری دینے والے نے کہا وہ اسلام کا پیرو ہے تو آپ نے فرمایا اب نعمت کی تکمیل ہوئی (2)۔

قَالُوۡا یٰۤاَبَانَا اسۡتَغۡفِرۡ لَنَا ذُنُوۡبَنَاۤ اِنَّا کُنَّا خٰطِـِٕیۡنَ ﴿۹۷﴾

''بیٹوں نے عرض کی اے ہمارے پدر محترم! مغفرت مانگیے ہمارے لئے ہمارے گناہوں کی بیشک ہم ہی قصور وار تھے ۱؎ ''

۱؎ ہم خلوص نیت سے توبہ کرتے ہیں اور اپنی خطاؤں کا اعتراف کرتے ہیں۔ ہمارے لئے بارگاہ رب العزت میں ہماری غلطیوں کی بخشش کے لئے دعا فرمائیے۔

قَالَ سَوۡفَ اَسۡتَغۡفِرُ لَکُمۡ رَبِّیۡ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الۡغَفُوۡرُ الرَّحِیۡمُ ﴿۹۸﴾

''فرمایا عنقریب مغفرت طلب کروں گا تمہارے لئے اپنے رب سے بیشک وہی غفور رحیم ہے ۱؎ ''

۱؎ ربی کی یاء کو نافع اور ابو عمرو نے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اکثر مفسرین فرماتے ہیں یعقوب علیہ السلام نے دعا کو سحری تک موخر فرمایا کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ ہر رات آسمان دنیا پر اپنی شان کے لائق نزول فرماتا ہے۔ جب رات کا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 324 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 324 (الفکر)

تیسرا حصہ باقی ہوتا ہے اور فرماتا ہے کوئی ہے دعا کرنے والا کہ میں اس کی دعا قبول کروں، کوئی ہے سوال کرنے والا کہ میں اسے عطا کروں، کوئی ہے مغفرت طلب کرنے والا کہ میں اس کی مغفرت کروں۔ یہ حدیث حضرت ابو ہریرہؓ سے صحیحین میں مروی ہے(1)۔

جب وقت آیا تو یعقوب نے نماز تہجد ادا فرمائی۔ پھر جب فارغ ہوئے تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ہاتھ اٹھائے اور عرض کی اے اللہ! یوسف علیہ السلام پر جو میں نے جزع وفزع کی اور جو میں نے قلب صبر کا اظہار کیا وہ معاف فرما اور میری اولاد کی بھی وہ لغزش معاف فرما جو انہوں نے اپنے بھائی یوسف کے ساتھ ظالمانہ سلوک کر کے کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے یعقوب علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی۔ میں نے تجھے اور ان کو معاف کردیا ہے۔ حضرت عکرمہ حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ یعنی جمعہ کے دن میں تمہارے لئے استغفار کروں گا۔ وہب فرماتے ہیں آپ بیس سال سے زیادہ ہر جمعہ کی رات ان کی مغفرت کی دعا کرتے رہے۔ طاؤس فرماتے ہیں آپ نے جمعہ کی رات سحری کے وقت تک مؤخر کیا تو عاشوراء کی رات کی موافقت ہوگئی۔ الشعبی فرماتے ہیں سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّیْ کا معنی یہ ہے کہ میں پہلے یوسف علیہ سے تمہاری معافی طلب کروں گا، پھر اپنے رب سے تمہاری معافی کی خواستگاری کروں گا(2) کیونکہ اللہ تعالیٰ کی معافی کے لئے مظلوم کا معاف کرنا شرط ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں آپ نے اس وقت تک دعا کو مؤخر فرمایا یہاں تک کہ آپ نے ان کے صدق توبہ کی کیفیت پہچان لی۔

امام بغوی فرماتے ہیں روایت ہے کہ یوسف علیہ السلام نے خوشخبری دینے والے کے ساتھ یعقوب علیہ السلام کی طرف دوسواریاں اور کثیر سامان بھیجا تاکہ وہ یعقوب علیہ السلام آپ کی ازواج اور آپ کی اولاد کو لے آئیں۔ پس جب یعقوب علیہ السلام اپنے اہل اولاد کے ساتھ مصر کی طرف روانہ ہوئے تو مردوں اور عورتوں کی کل تعداد بہتر تھی۔ مسروق کہتے ہیں وہ ترانوے تھے۔ جب وہ مصر کے قریب پہنچے تو یوسف علیہ السلام نے اپنے سے اوپر والے بادشاہ سے حضرت یعقوب کی آمد کی بات کی تو یوسف علیہ السلام اور بادشاہ چار ہزار لشکریوں کے ساتھ استقبال کے لئے نکلے اور اس کے علاوہ اہل مصر بھی ان کیساتھ تھے۔ وہ تمام یعقوب علیہ السلام کے سامنے آئے جبکہ آپ یہودا کے سہارے چل رہے تھے۔ آپ نے گھوڑوں اور لوگوں کا انبوہ کثیر دیکھا تو یہودا سے پوچھا اس شان و شوکت کے ساتھ یہ فرعون مصر آرہا ہے۔ اس نے کہا نہیں یہ آپ کا بیٹا ہے(3)۔

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى یُوْسُفَ اٰوٰۤى اِلَیْهِ اَبَوَیْهِ وَ قَالَ ادْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِیْنَ ﴿۹۹﴾

"پھر جب وہ یوسف کے روبرو ہوئے 1 تو آپ نے جگہ دی اپنے پاس اپنے والدین کو 2 اور (انہیں) کہا داخل ہو جاؤ مصر میں اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو تم خیروعافیت سے رہو گے 3"

1۔ جب یعقوب علیہ السلام اور آپ کے اہل وعیال داخل ہوئے عَلٰى یُوْسُفَ یوسف علیہ السلام کے پاس۔ میں کہتا ہوں شاید یوسف علیہ السلام مصر سے یعقوب علیہ السلام کے استقبال کے لئے نکلے تھے، کسی محل میں قیام پذیر ہو گئے تھے جو مصر سے باہر بنا ہوا تھا اور وہاں آپ کے پاس یعقوب علیہ السلام مع اہل وعیال داخل ہوئے تھے۔ امام بغوی فرماتے ہیں جب باپ بیٹا ایک دوسرے کے قریب ہوئے تو یوسف علیہ السلام نے پہلے سلام پیش کرنا چاہا تو جبرئیل نے کہا پہلے یعقوب علیہ السلام سلام فرمائیں گے(4)۔ میں کہتا ہوں

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 153 (وزارت تعلیم)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 325 (الفکر)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 325 (الفکر)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 325 (الفکر)

شاید اس کی وجہ وہ اللہ تعالیٰ کی محبوبیت کا مرتبہ ہو جو یوسف علیہ السلام میں ظاہر ہوا تھا۔ یعقوب علیہ السلام نے کہا اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا مُذْهِبَ الْاَحْزَانِ۔ اے غموں کو دور کرنے والے تم پر سلام ہو۔

۲۔ اکثر مفسرین فرماتے ہیں ابوی سے مراد حضرت یعقوب اور حضرت یوسف کی خالہ ہے۔ خالہ کو ماں کے قائم مقام رکھا گیا جس طرح چچا کو باپ کے قائم مقام رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد اٰبَآئِكَ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ میں۔ یا اس لئے کہ یعقوب علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام کی والدہ کی وفات کے بعد ان سے شادی کر لی تھی اور تربیت کرنے والی کو (ام) ماں کہا گیا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی والدہ حضرت بنیامین کی پیدائش کے بعد وفات پا گئیں۔ حضرت الحسن فرماتے ہیں ابویہ سے مراد آپ کے ماں باپ ہی ہیں اور وہ اس وقت زندہ تھی، یعنی تفاسیر میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی والدہ کو زندہ فرمایا تھا حتیٰ کہ وہ یعقوب علیہ السلام کے ساتھ مصر آئی تھی (1)۔ بغوی فرماتے ہیں روایت ہے کہ یوسف اور یعقوب علیہم السلام اتر کر ایک دوسرے کے گلے ملے تھے۔ الثوری فرماتے ہیں وہ گلے مل کر روئے تھے۔ یوسف علیہ السلام نے کہا ابا حضور آپ مجھ پر اتنے روئے کہ آنکھیں ضائع کر دیں، کیا آپ کو معلوم نہیں تھا کہ قیامت کے روز ہم نے جمع ہونا ہے۔ یعقوب علیہ السلام نے کہا ہاں مجھے علم تھا اے جان پدر! لیکن مجھے یہ خوف تھا کہ کہیں تیرا دین تجھ سے چھن نہ جائے اور یہی چیز میرے اور تیرے درمیان حائل نہ ہو جائے (2)۔

۳۔ مصر سے باہر ملاقات کرنے کے بعد یوسف علیہ السلام نے فرمایا کسی بادشاہ کی اجازت کے بغیر وہ اس سے پہلے مصر میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ آپ نے فرمایا اب اجازت نامہ کی ضرورت نہیں ہے۔ یا یہ معنی کہ تم قحط اور مصائب سے امن میں رہو گے۔ مشیت دخول کے متعلق ہے جو مکیف بالامن ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ اور بعض فرماتے ہیں یہاں ان بمعنی اذ ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں آیت میں تقدیم و تاخیر ہے اور استثناء استغفار کی طرف راجع ہے جو حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں سے کہا تھا، یعنی تقدیر کلام اس طرح ہے سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ۔

وَرَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا ۚ وَقَالَ يٰٓاَبَتِ هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ مِنْ قَبْلُ ۫ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّيْ حَقًّا ۭ وَقَدْ اَحْسَنَ بِيْٓ اِذْ اَخْرَجَنِيْ مِنَ السِّجْنِ وَجَآءَ بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّيْطٰنُ بَيْنِيْ وَبَيْنَ اِخْوَتِيْ ۭ اِنَّ رَبِّيْ لَطِيْفٌ لِّمَا يَشَآءُ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۝۱۰۰

"(جب شاہی دربار میں پہنچے تو) آپ نے اوپر بٹھایا اپنے والدین کو تخت پر اور وہ گر پڑے آپ کے لئے سجدہ کرتے ہوئے اور (یہ منظر دیکھ کر) یوسف نے کہا اے میرے بزرگوار! یہ تعبیر ہے میرے خواب کی جو پہلے (عرصہ ہوا میں نے) دیکھا تھا میرے پروردگار نے اسے سچا کر دکھایا ہے اور اس نے بڑا کرم فرمایا مجھ پر جب اس نے نکالا مجھے قید خانہ سے اور لے آیا تمہیں صحرا سے اس کے بعد کہ ناچاقی ڈال دی تھی شیطان نے میرے درمیان اور میرے بھائیوں کے درمیان۔ بیشک میرا رب لطف و کرم فرمانے والا ہے جس کے لئے چاہتا ہے وہی سب کچھ جاننے والا بڑا دانا ہے۔"

۱۔ یوسف علیہ السلام نے اپنے والدین کو تخت پر بٹھایا۔ الرفع کا معنی پستی سے بلندی کی طرف منتقل کرنا ہے۔ یوسف علیہ السلام کے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 326 (الفکر)　　2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 27-326 (الفکر)

والدین اور بھائی ان کو سجدہ کرتے ہوئے گر پڑے۔ یہاں سجدہ سے زمین پر پیشانی رکھنا نہیں بلکہ جھکنا اور تواضع کرنا مراد ہے، یعنی انہوں نے یوسف علیہ السلام کے لئے تواضع وانکساری کی۔ بعض علماء فرماتے ہیں انہوں نے واقعی زمین پر اپنی پیشانیاں رکھ کر سجدہ کیا تھا اور وہ سجدہ سجدہ عبادت نہیں تھا بلکہ سجدہ تعظیمی تھا اور اس دور میں لوگوں کا سلام سجدہ تھا اور یہ سجدہ تعظیمی سابقہ امتوں کی شریعتوں میں جائز تھا لیکن اس شریعت یعنی شریعت محمدیہ میں منسوخ ہو گیا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سجدہ شکر ادا کرتے ہوئے یوسف علیہ السلام کے سامنے گر گئے (1)۔ لہ کی ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ میں کہتا ہوں یوسف علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کے اذن سے گویا قبلہ بنایا گیا تھا جیسے کعبہ ہمارے لئے قبلہ ہے اور جسطرح آدم علیہ السلام کو فرشتوں کے لئے قبلہ بنایا گیا تھا جب انہیں سجدہ کا حکم ملا تھا۔

بعض علماء فرماتے ہیں وہ یوسف علیہ السلام کی خاطر اور آپ کی ملاقات کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے سجدہ میں گر گئے۔ پہلا قول صحیح ہے۔ تخت پر بٹھانا سجدہ میں گرنے سے مؤخر تھا، اگرچہ آپ نے اپنے والدین کی تعظیم کے اہتمام کی خاطر لفظاً مقدم کیا ہے۔ اسوقت یوسف علیہ السلام نے فرمایا اے میرے پدر بزرگوار یہ تعبیر ہے میرے اس خواب کی جو میں نے بچپن میں دیکھا تھا کہ میں نے گیارہ ستارے، سورج، چاند کو دیکھا کہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں۔ اسے میرے رب نے سچا کر دکھایا ہے۔

وقد احسن بی میں بی کی یاء کو نافع اور ابوعمرو نے فتحہ کے ساتھ اور دوسروں نے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی اس نے مجھ پر بڑا انعام فرمایا جب اس نے نکالا مجھے قید خانہ سے۔ آپ نے کنویں سے نکالنے کا ذکر نہیں کیا حالانکہ وہ تو قید خانہ سے بھی زیادہ تکلیف دہ منظر تھا تو یہ آپ کا کرم تھا کہ تاکہ بھائی شرمندہ نہ ہوں کیونکہ آپ پہلے انہیں لاتثریب علیکم الیوم فرما چکے تھے اور صرف قید خانہ سے اخراج کے ذکر کی یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ قید خانہ سے نکالنا اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت تھی کیونکہ کنویں سے نکلنے کے بعد آپ غلامی کے جال میں پھنس گئے تھے اور پھر عورتوں کے مکر سے دوچار ہوئے تھے۔ لیکن قید خانہ سے رہائی کے بعد آپ ملک کے بادشاہ بن گئے تھے۔

لے بدو اس کھلی اور وسیع زمین کو کہتے ہیں جہاں جانوروں کے مالک اپنے جانور بٹھاتے ہیں اور یہ تمام لوگ دیہاتی اور مویشی پالنے والے تھے۔ اخوتی کے یاء کو ورش نے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے سکون کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی ہمارے درمیان اس نے حسد کے ذریعے ناچاقی ڈال دی اور یہ نزغ الرابض الدابة سے مشتق ہے جس کا معنی ہے اس نے اسے چلنے پر برانگیختہ کیا۔

لے بیشک میرے رب کی تدبیر بڑی لطیف ہے۔ کیونکہ کوئی مشکل نہیں مگر اس میں وہ اپنی مشیت کو نافذ فرماتا ہے اور آسانی پیدا فرماتا ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں اس کا معنی ذو لطف ہے (2) یعنی لطف وکرم فرمانے والا ہے۔ لطیف وہ ہوتا ہے جو دوسروں تک بڑی نرمی سے اپنے احسانات پہنچاتا ہے اور وہ مصالح کی وجوہ اور تدابیر کو جانتا ہے اور وہ ہر کام ایسے وقت میں اور ایسے طریقہ پر کرتا ہے جس کا اس کی حکمت تقاضا کرتی ہے۔

امام بیضاوی فرماتے ہیں روایت ہے کہ یوسف علیہ السلام نے اپنے والد محترم کو اپنے خزانوں کی سیر کرائی جب آپ کاغذ کے خزانہ میں داخل ہوئے تو فرمایا اے بیٹے۔ تیرے پاس اتنے کاغذ کے خزانے ہیں تو تجھے کس چیز نے غافل رکھا کہ تو نے مجھے اٹھ مراحل پر خط نہ لکھا۔ یوسف علیہ السلام نے عرض کی مجھے جبرئیل نے خط نہ لکھنے کا حکم کیا تھا۔ فرمایا تو نے اس سے اس کی وجہ نہ پوچھی تھی۔ یوسف

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 327 (الفکر)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 328 (الفکر)

علیہ السلام نے کہا آپ مجھ سے زیادہ اسکے قریب ہیں تو آپ نے جبرئیل سے وجہ پوچھی تو جبرئیل نے کہا اللہ تعالیٰ نے مجھے اسکا حکم دیا تھا کیونکہ آپ نے خود کہا تھا کہ مجھے خوف ہے کہ اسے بھیڑیا کھا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تو نے میرا خوف کیوں نہیں کیا(1)۔ البغوی فرماتے ہیں اہل تاریخ نے لکھا ہے کہ یعقوب علیہ السلام مصر میں یوسف علیہ السلام کے پاس بڑے خوش وخرم اور عیش وسہولت میں رہے تھے۔ مصر میں ہی آپ کا انتقال ہوا۔ جب آپ کی موت کا وقت قریب آیا تو آپ نے یوسف علیہ السلام کو وصیت فرمائی کہ میرا جسم اپنے والد حضرت اسحٰق کے پاس دفن کرنا۔ یوسف علیہ السلام نے آپ کی وصیت پر عمل کیا اور آپ کو شام میں جا کر دفن کیا اور پھر مصر لوٹ آئے۔ امام احمد نے الزہد میں مالک سے روایت کیا ہے کہ یعقوب علیہ السلام جب بھاری ہو گئے تو اپنے لخت جگر یوسف کو فرمایا اپنا ہاتھ میری صلب کے نیچے داخل کر اور رب یعقوب کی قسم اٹھا کر تو مجھے میرے آباء کے ساتھ دفن کرے گا۔ میں عمل میں ان کا شریک رہا تو مجھے قبور میں ان کا شریک کر۔ پھر جب یعقوب علیہ السلام کا وصال ہو گیا تو یوسف علیہ السلام نے ایسا ہی کیا کہ آپ یعقوب علیہ السلام کو کنعان لے آئے اور ان کے آباء کے ساتھ انہیں دفن کر دیا۔ سعید بن جبیر فرماتے ہیں یعقوب علیہ السلام کو شیشم کے تابوت میں بیت المقدس نقل کیا گیا تو اسی دن عیص بھی مرا تھا۔ تو دونوں کو ایک قبر میں دفن کیا گیا اور یہ دونوں ایک ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے اور دونوں کی عمر ایک سو چوہتر سال تھی۔

پھر جب اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کے تمام امور جمع فرما دیئے تو آپ نے جان لیا کہ دنیا کی نعمتیں ہمیشہ رہنے والی نہیں ہیں تو آپ نے اللہ تعالیٰ سے حسن عاقبت کا سوال کیا(2)۔

رَبِّ قَدْ اٰتَیْتَنِیْ مِنَ الْمُلْكِ وَ عَلَّمْتَنِیْ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِۚ-فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ۫-اَنْتَ وَلِیّٖ فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِۚ-تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ(۱۰۱)

”اے میرے رب! عطا فرمایا تو نے مجھے یہ ملک نیز تو نے سکھایا مجھے باتوں کے انجام کا علم اے بنانے والے آسمانوں اور زمین کے تو ہی میرا کارساز ہے دنیا میں اور آخرت ۱؎ میں مجھے وفات دے دراں حالیکہ میں مسلمان ہوں اور ملا دے مجھے نیک بندوں کے ساتھ ۲؎“

۱؎ اے میرے رب تو نے مجھے ملک عطا فرمایا، یعنی مصر کا ملک عطا فرمایا۔ (ملک کا مطلب قدرت کا وسیع ہوتا ہے اس شخص کے لئے جسے سیاست وتدبیر کا حق حاصل ہو۔ اور تو نے مجھے خوابوں کی تعبیر سکھائی۔ یہاں بھی من بعضیہ ہے کیونکہ آپ کو ہر تاویل نہیں سکھائی گئی تھی۔ وَ فَوْقَ كُلِّ ذِیْ عِلْمٍ عَلِیْمٌ۔ ہر صاحب علم سے دوسرا صاحب علم زیادہ علم والا ہوتا ہے۔ فاطر پر نصب یا تو منادی کی صفت کی بناء پر ہے یا یہ بذات خود منادی ہے اور عرض کی تو میرے دنیا وآخرت کے امور کا متولی اور تو ہی میرا مددگار ہے۔ یا یہ معنی کہ تو نے ہی مجھے دنیا وآخرت کی نعمتوں کا والی بنایا اور ملک فانی کو ملک باقی کے ساتھ ملایا۔

۲؎ اور میری روح قبض کر دراں حالیکہ میں مسلمان ہوں اور ملا دے مجھے نیک بندوں یعنی انبیاء کے ساتھ کیونکہ صلاح کا کمال عصمت ہے اور یہ انبیاء کے ساتھ مختص ہے۔ قتادہ فرماتے ہیں نبیوں میں سے کسی نے بھی سوائے یوسف علیہ السلام کے موت کا سوال نہیں کیا(3)۔

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد5، صفحہ 362 (العلمیہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد3، صفحہ 328 (الفکر)
3۔ تفسیر بغوی، جلد3، صفحہ 329 (الفکر)

مگر یہ قول محل نظر ہے کیونکہ حضور نبی کریم ﷺ نے عرض کی تھی اَللّٰھُمَّ الرَّفِیْقَ الْاَعْلٰی ۔اے اللہ تعالیٰ مجھے الرفیق الاعلیٰ مختار ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ سے مروی ہے، فرماتی ہیں میں نے سنا تھا کہ کسی نبی پر موت نہیں آتی یہاں تک کہ اسے دنیا و آخرت کا اختیار دیا جاتا ہے۔ فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ کو مرض میں سخت تکلیف لاحق ہوئی تو میں نے آپ کو یہ پڑھتے ہوئے سنا مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَ الصِّدِّیْقِیْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِیْنَ ۚ وَ حَسُنَ اُولٰٓىٕكَ رَفِیْقًا ۔تو مجھے یقین ہو گیا کہ آپ کو اختیار دیا گیا ہے(1)۔ اس حدیث کو شیخین نے صحیحین میں اور ابن سعد نے روایت کیا ہے۔ اس قصہ میں یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام پر تمام خواہشات مکمل فرما دیں اور ان کے والدین اور اہل و عیال کو ان سے ملا دیا تو آپ نے رب کا اشتیاق کیا اور یہ دعا مانگی تھی۔ الحسن فرماتے ہیں اس کے بعد آپ بہت سے سال زندہ رہے تھے۔ دوسرے علماء نے لکھا ہے کہ جب آپ نے یہ دعا مانگی تھی تو ایک ہفتہ بعد آپ کا وصال ہو گیا تھا۔ امام بغوی فرماتے ہیں علماء کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ یوسف علیہ السلام کتنی مدت اپنے باپ سے غائب رہے تھے۔ الکلبی فرماتے ہیں وہ مدت بائیس سال تھی۔ بعض نے فرمایا چالیس سال تھی۔ الحسن فرماتے ہیں یوسف علیہ السلام کو کنویں میں ڈالا گیا تو آپ کی عمر سات سال تھی اور اسی سال اپنے باپ سے غائب رہے اور یعقوب علیہ السلام کی ملاقات کے بعد 23 سال زندہ رہے اور جب آپ کا وصال ہوا تو آپ کی عمر ایک سو بیس سال تھی اور تورات میں 110 سال ہے اور عزیز کی بیوی سے حضرت یوسف کے تین بچے ہوئے تھے۔ افرائیم، میشا دو بیٹے اور ایک بیٹی رحمت۔ یہ بیٹی حضرت ایوب علیہ السلام کے عقد میں آئی تھیں اور افرائیم کی اولاد سے یوشع بن نون صاحب موسیٰ تھے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یوسف علیہ السلام اپنے باپ کے وصال کے بعد ساٹھ سال زندہ رہے۔ بعض نے زیادہ سال لکھے ہیں۔ اس کے متعلق مختلف اقوال ہیں۔ آپ کا وصال ہوا تو آپ کی عمر ایک سو بیس سال تھی۔ سنگ مرمر کے صندوق میں رکھ کر آپ کو نیل میں دفن کیا گیا۔ جب آپ کا وصال ہوا تو ہر محلہ والے جھگڑنے لگے انہیں ہمارے محلہ میں دفن کیا جائے کیونکہ لوگ آپ کی برکت کی امید رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ جھگڑا قتال تک پہنچنے لگا تو انہوں نے یہ طے کیا کہ آپ کو دریائے نیل میں دفن کرتے ہیں جہاں سے پانی مصر پہنچتا ہے تو آپ کے جسم سے پانی گزر کر آئے گا تو تمام کو برکت نصیب ہوگی۔ عکرمہ فرماتے ہیں آپ کو دریائے نیل کی دائیں جانب دفن کیا گیا تو وہ طرف سرسبز ہو گئی اور دوسری طرف بنجر ہو گئی تو پھر آپ کو دوسری بائیں جانب نقل کیا گیا تو وہ بائیں جانب سرسبز اور دائیں جانب بنجر ہو گئی تو لوگوں نے آپ کو درمیان میں دفن کر دیا۔ تو اس طرح دونوں اطراف سرسبز رہیں یہاں تک کہ موسیٰ علیہ السلام آپ کو نکال کر شام لے گئے اور آپ کے آباء کے قریب انہیں دفن فرمایا(2)۔ ابن اسحٰق، ابن ابی حاتم نے عروہ بن زبیر سے نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب موسیٰ علیہ السلام کو بنی اسرائیل کے لیجانے کا حکم دیا تو یہ بھی حکم دیا کہ یوسف علیہ السلام کے جسم کو بھی ساتھ لے جاؤ تو یہ بھی حکم دیا کہ انہیں مصر کی زمین میں واپس نہیں لے آنا اور انہیں ساتھ لے کر چلنا یہاں تک کہ ارض مقدسہ میں انہیں دفن کرنا۔ موسیٰ علیہ السلام نے پوچھا یوسف علیہ السلام کی قبر کو کوئی پہچانتا ہے تو بنی اسرائیل کی ایک بوڑھی عورت کے سوا کسی کو علم نہ تھا۔ اس بوڑھی نے کہا اے اللہ کے نبی مجھے یوسف علیہ السلام کی قبر کا علم ہے۔ میں آپ کو بتاؤں گی اگر آپ مجھے اپنے ساتھ لے جائیں اور مجھے پھر مصر کی زمین میں نہ چھوڑنا۔ اس شرط پر میں آپ کی رہنمائی کرتی ہوں۔ موسیٰ علیہ السلام نے وعدہ فرمایا کہ میں تیری شرط پوری کروں گا۔ موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو چاند کے طلوع کے وقت

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 286 (قدیمی)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 329 (الفکر)

چلنے کو کہا تھا۔ آپ نے دعا مانگی یا اللہ چاند کا طلوع موخر فرما دے حتیٰ کہ یوسف علیہ السلام کے معاملہ سے فارغ ہو جائیں۔ تو ایسا کیا کہ آپ بوڑھی کو ساتھ لے گئے۔ اس نے دریا کے کنارے میں پانی کے اندر آپ کی قبر بتائی تو موسیٰ علیہ السلام نے وہ صندوق نکالا اور اٹھا کر لے گئے (1)۔ یوسف علیہ السلام کے بعد عمالقہ متواتر مصر کے فرعون بنتے رہے اور بنو اسرائیل ان کے ماتحت دین یوسفی پر زندگی گزارتے رہے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو مبعوث فرمایا اور ان کے ہاتھوں فرعون کو ہلاک فرمایا۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْهِ اِلَیْكَۚ وَ مَا كُنْتَ لَدَیْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْۤا اَمْرَهُمْ وَ هُمْ یَمْكُرُوْنَ ﴿۱۰۲﴾

"(اے حبیب!) یہ قصہ غیب کی خبروں میں سے ہے جو ہم وحی کرتے ہیں آپ کی طرف اور آپ ان کے پاس نہیں تھے جب وہ متفق ہو گئے تھے اس بات پر دراں حالیکہ وہ مکر کر رہے تھے [1]"

[1] اے پیارے حبیب! یہ یوسف علیہ السلام کا قصہ غیب کی خبروں میں سے ہے جو ہم نے آپ کو وحی کے ذریعے بتایا ہے۔ اور یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں نے یعقوب علیہ السلام کو کنویں کی تاریکیوں میں پھینکنے کا پختہ عہد کر لیا تھا اس وقت آپ ان کے پاس موجود نہ تھے۔

وَ مَاۤ اَكْثَرُ النَّاسِ وَ لَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۰۳﴾

"اور نہیں ہیں اکثر لوگ خواہ آپ کتنا ہی چاہیں ایمان لانے والے [1]"

[1] اے محمد ﷺ آپ ان اکثر لوگوں کے ایمان پر کتنا ہی حرص کریں اور آیات کے اظہار میں مبالغہ کریں یہ ایمان لانے والے نہیں ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ ان پر کفر اور آگ کا فیصلہ فرما دیا ہے۔

وَ مَا تَسْـَٔلُهُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۰۴﴾

"اور نہیں طلب کرتے آپ ان سے کوئی معاوضہ نہیں ہے مگر نصیحت تمام جہانوں کے لئے [1]"

[1] یعنی یہ قرآن حجت عام ہے کافروں کے خلاف اور بصیرت و رحمت ہے مومنین کے حق میں۔

وَ كَاَیِّنْ مِّنْ اٰیَةٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ یَمُرُّوْنَ عَلَیْهَا وَ هُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ﴿۱۰۵﴾

"کتنی ہی (بے شمار) نشانیاں ہیں جو آسمانوں اور زمین (کے ہر گوشہ) میں (بچی ہوئی) ہیں جن پر یہ (ہر صبح شام) گزرتے ہیں اور وہ ان سے روگردانی کئے ہوتے ہیں [1]"

[1] یعنی بہت سی نشانیاں۔ یہ اصل میں كَاَیِّ عَدَدٍ شِئْتَ مِنَ الدَّلَائِلِ الدَّالَّةِ عَلٰی وُجُوْدِ الصَّانِعِ وَ حِكْمَتِهٖ وَ كَمَالِ قُدْرَتِهٖ وَ تَوْحِیْدِهٖ۔ یعنی تو اس صانع کے وجود، اس کی حکمت بالغہ، کمال قدرت اور اس کی توحید پر کتنی نشانیاں اور دلائل چاہتا ہے وہ نشانیاں آسمانوں اور زمین میں بچی ہوئی ہیں جن کے اوپر سے یہ کفار گزرتے ہیں اور اپنی سر کی آنکھوں سے مشاہدہ کرتے ہیں اور حالت یہ ہے کہ یہ ان سے روگردانی کرتے ہیں، یعنی گزشتہ ہلاک شدہ امتوں کے آثار و کھنڈرات آئے روز دیکھتے ہیں جو آنے والی نسلوں کے لئے عبرت کی کھلی نشانیاں ہیں مگر یہ نہ تو ان میں کبھی غور و فکر کرتے ہیں اور نہ ان کے انجام بد سے عبرت حاصل کرتے ہیں۔ اکثر اس کے وجود اور اس کے خالق ہونے کا اقرار کرتے ہیں۔

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 74 (العلمیۃ)

وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ﴿۱۰۶﴾

"اور نہیں ایمان لاتے اکثر اللہ کے ساتھ مگر اس حالت میں کہ وہ شرک کرنے والے ہوتے ہیں[1]۔"

[1] مگر وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ عبادت میں غیروں کو شریک ٹھہراتے ہیں۔ جب ان سے پوچھا جائے کہ آسمانوں اور زمین کا خالق کون ہے تو بلا تامل بیک زبان کہتے ہیں اللہ! جب ان سے پوچھا جائے کہ آسمان سے بارش کون برساتا ہے تو کہتے ہیں اللہ۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ پتھروں سے بنے ہوئے بتوں کی عبادت بھی کرتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ فلاں ستارے کی وجہ سے بارش ہوتی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے، فرماتے ہیں یہ آیت مشرکین عرب کے تلبیہ کے بارے میں نازل ہوئی کہ وہ اپنے تلبیے اس طرح پڑھتے لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ اِلَّا شَرِيْكًا هُوَ لَكَ تَمْلِكُهٗ وَ مَا مَلَكَ۔ میں حاضر ہوں، اے اللہ میں حاضر ہوں حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں ہے سوائے اس شریک کے تو اس کا مالک ہے اور وہ مالک نہیں(1)۔ عطا فرماتے ہیں یہ ان کی دعا کے متعلق نازل ہوئی کہ خوشحالی کے وقت اپنے رب کو فراموش کر دیتے تھے اور جب تکلیف و مصیبت سے دوچار ہوتے تو خالص اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے: اِذَا رَكِبُوْا فِی الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ۚ۬ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ یُشْرِكُوْنَ پھر جب سوار ہوتے ہیں کشتی میں تو دعا مانگتے ہیں اللہ تعالیٰ سے خالص کرتے ہوئے اس کے لئے اپنے دین کو۔ اس کے علاوہ حالات میں بھی اللہ تعالیٰ کو فراموش کر دیتے تھے(2)۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ وہ اپنے علماء و مشائخ کی امر الٰہی کے خلاف بات مان کر انہیں خدا بنا کر شرک کرتے تھے یا وہ اللہ تعالیٰ کی طرف بیٹے کی نسبت کر کے شرک کرتے تھے یا اس کی طرف نور و ظلمت کی نسبت کر کے شرک کرتے تھے اور شرکیہ اقوال یہ قدریہ کا قول بھی ہے جس میں وہ بندے کے لئے تخلیق کی قدرت کا اثبات کرتے ہیں تو حید وہی ہے جو اہل سنت کہتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی خالق نہیں ہے بلکہ مسبب حقیقی کو چھوڑ کر اسباب عارضیہ کی طرف دیکھنا بھی توحید کے منافی ہے۔ پس حقیقی موحدین صوفیاء کرام ہیں جو اس مقام اعلیٰ پر فائز ہوتے ہیں۔

اَفَاَمِنُوْۤا اَنْ تَاْتِیَهُمْ غَاشِیَةٌ مِّنْ عَذَابِ اللّٰهِ اَوْ تَاْتِیَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً وَّ هُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ ﴿۱۰۷﴾

"کیا وہ بے غم ہو گئے ہیں اس بات سے کہ آئے ان پر چھا جانے والا اللہ تعالیٰ کا عذاب یا آجائے ان پر قیامت اچانک اور انہیں اس کی آمد کا شعور تک نہ ہو۔"

کیا وہ اپنے رب کو بھول گئے ہیں اور امن میں ہو گئے ہیں اس بات سے کہ آ جائے ان پر چھا جانے والی سزا جو ہر چیز کو اپنے احاطہ میں لے لے گی۔ قتادہ فرماتے ہیں اللہ کے عذاب سے مراد گرنے والی آفت ہے(3)۔ الضحاک فرماتے ہیں اس سے مراد کڑک ہے اور تاتیهم الساعة بغتة یا ان پر آ جائے قیامت اچانک اور عذاب جو جہنم پر مشتمل ہے(4)۔ بغتة کا معنی اچانک ہے یعنی جس کا پہلے علم نہ ہو اور اس کے وقت کے تعین پر کوئی علامت نہ ہو اور انہیں اس کی آمد کا شعور تک نہیں ہے اور وہ اس کے لئے بالکل تیار نہیں ہیں۔ یہ استفہام انکاری ہے، یعنی ان کو یہ بھول نہیں ہونی چاہئے اور انہیں عذاب الٰہی سے مامون نہیں ہونا چاہئے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 261 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 261 (التجاریہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 261 (التجاریہ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 261 (التجاریہ)

فرماتے ہیں لوگوں کے درمیان ایک زوردار چیخ پیدا ہوگی جبکہ وہ اپنے بازاروں میں ہوں گے(1)۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت قائم ہوگی درآں حالیکہ دو آدمی کپڑا پھیلا رہے ہوں گے۔ پس قیام قیامت سے پہلے وہ نہ اس کپڑے کی خرید و فروخت کر سکیں گے اور نہ اس کو لپیٹ سکیں گے الحدیث(2)۔ پہلے یہ حدیث سورۂ اعراف میں یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَیَّانَ مُرْسٰىهَا کے تحت گزر چکی ہے۔

قُلْ هٰذِهٖ سَبِیْلِیْۤ اَدْعُوْۤا اِلَى اللّٰهِ ؔ عَلٰى بَصِیْرَةٍ اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِیْ ؕ وَ سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَ مَاۤ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۝

''آپ فرما دیجئے یہ میرا راستہ ہے میں بلاتا ہوں صرف اللہ تعالیٰ کی طرف واضح دلیل پر ہوں میں اور (وہ بھی) جو میری پیروی کرتے ہیں اور ہر عیب سے پاک ہے اللہ تعالیٰ اور نہیں ہوں میں مشرکوں سے ۔1''

1۔ اے پیارے محمد ﷺ یہ توحید کی طرف دعوت اور قیامت کے لئے اپنے آپ کو تیار کرنا میرا راستہ ہے۔ سبیل کا لفظ طریق کی طرح مذکر و مؤنث استعمال ہوتا ہے۔ آگے السبیل کی تفسیر بیان فرمائی ہے۔

میں تمہیں اللہ تعالیٰ کے وجود، اس کی وحدانیت پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہوں۔ نیز میں تمہیں دعوت دیتا ہوں کہ جو چیز اس کے لائق نہیں ہے اس سے اس کی تنزیہہ بیان کرو اور اس کے قرب کے درجات کی تلاش کرو۔ میں یقین و معرفت پر ہوں یعنی میں انکل پچو لڑانے والوں میں سے نہیں ہوں جو بغیر علم کے اشیاء کے متعلق باتیں کرتے ہیں یا یہ معنی کہ میں واضح دلیل اور حجت پر ہوں۔'' انا '' ادعوا میں ضمیر مستتر کی تاکید ہے یا علی بصیرۃ میں جو ضمیر ہے اس سے تاکید ہے کیونکہ یہ اس سے حال ہے یا یہ انا مبتدا ہے اور علی بصیرۃ خبر ہے۔''و من اتبعنی'' یہ معطوف علیہ ہے یعنی جو مجھ پر ایمان لایا اور میری تصدیق کی وہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف بلاتا ہے۔ الکلبی اور ابن زید کہتے ہیں جو شخص آپ ﷺ کی اتباع کرتا ہے اس پر فرض ہے کہ وہ بھی اس چیز کی دعوت دے جس کی دعوت آپ ﷺ دیتے رہے اور قرآن کو یاد کرے۔ یا یہ معنی ہے کہ میں اور میرے متبعین واضح دلیل پر ہیں(3)۔

ابن عباس فرماتے ہیں من اتبعنی سے مراد محمد ﷺ کے اصحاب ہیں جو بہتر طریقہ اور عمدہ ہدایت پر تھے جو معدن العلم کنز الایمان اور جند الرحمٰن تھے، یعنی وہ علم کی کان ایمان کا خزانہ اور رحمان کا لشکر تھے(4)۔ ابن مسعود فرماتے ہیں جو کسی کی پیروی کرنا چاہتا ہے تو وہ گزرے ہوئے سلف صالحین کی پیروی کرے(5)۔ وہ اصحاب محمد ﷺ ہیں جو اس امت میں تمام لوگوں سے زیادہ شفاف دل، گہرا علم اور کم تکلف رکھتے تھے۔ وہ ایسے افراد ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم ﷺ کی صحبت کے لئے پسند فرمایا ہے اور اپنے دین کی ترویج کے لئے اختیار فرمایا ہے۔ پس ان کے اخلاق و کردار کی مشابہت اختیار کرو وہی لوگ ہدایت پر تھے و سبحان اللّٰہ کا عطف ادعوا پر ہے یعنی میں اللہ تعالیٰ کی طرف بلاتا ہوں اور ہر شریک سے اس کی پاکیزگی بیان کرتا ہوں اور میں مشرکوں سے نہیں ہوں۔

وَ مَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیْۤ اِلَیْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى ؕ اَفَلَمْ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 261 (التجاریہ) 2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 406 (قدیمی) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 261 (التجاریہ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 62-261 (التجاریہ) 5۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 262 (التجاریہ)

يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اتَّقَوْا ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۰۹﴾

"اور ہم نے (رسول بنا کر) نہیں بھیجے آپ سے پہلے مگر مرد جن کی طرف ہم نے وحی بھیجی بستی والوں سے کیا ا۔ یہ (منکر) لوگ سیر و سیاحت نہیں کرتے زمین میں تا کہ وہ دیکھیں کہ کیا ہوا تھا انجام ان (منکرین) کا جو ان سے پہلے (ہو گزرے) تھے اور آخرت یقیناً بہتر ہے ان کے لئے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں (اے سننے والو!) کیا تم نہیں سمجھتے ۲۔"

ا۔ اے محمد ﷺ آپ سے پہلے جو ہم نے رسول بنا کر بھیجے تھے وہ بھی مرد تھے۔ ملائکہ کو رسول بنا کر نہیں بھیجا تھا۔ یہ مشرکوں کے اس قول کا رد ہے لَوْ شَآءَ رَبُّنَا لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً۔ اگر ہمارا رب چاہتا تو فرشتے نازل فرماتا۔ پہلے رسولوں کی طرف بھی ہم نے وحی بھیجی تھی جیسے تمہاری طرف وحی بھیجتے ہیں۔ پس وہ اس وحی کی وجہ سے دوسرے لوگوں سے ممتاز تھے۔ حضرت حفص نے یہاں بھی، سورۂ نحل میں اور سورۂ انبیاء کی ابتداء میں جمع متکلم معروف کا صیغہ نُوْحِيْ پڑھا ہے اور باقی قراء نے غائب مجہول کا صیغہ يُوْحٰي پڑھا ہے۔ من اهل القرى سے مراد شہری لوگ ہیں کیونکہ وہ زیادہ عقلمند، زیادہ علم والے اور حلم والے ہوتے ہیں، جبکہ دیہاتی تند طبیعت اور ظالم ہوتے ہیں ان سے رسول نہیں بنائے۔ حضرت حسن نے اسی آیت کی بناء پر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے کسی بدوی، جن اور عورت کو نبی بنا کر مبعوث نہیں فرمایا(1)۔ میں کہتا ہوں اس آیت میں جنوں کی نبوت کی نفی پر کوئی دلیل نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ۔ اور یہ کہ انسانوں میں سے چند مرد پناہ لینے لگے جنات میں سے چند مردوں کی اور کلام انسانوں کی طرف رسولوں کو بھیجنے کے بارے میں ہے اور یہ آیت جن کو جن کی طرف عدم ارسال کا تقاضا نہیں کرتی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لَوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا۔ اگر ہوتے زمین میں (انسانوں کی بجائے) فرشتے جو اس پر چلتے (اور اس میں) سکونت اختیار کرتے تو ہم (ان کی ہدایت کے لئے) ان پر اتارتے آسمان سے کوئی فرشتہ رسول بنا کر۔ کیا یہ منکر مشرک سیر و سیاحت نہیں کرتے۔ تا کہ دیکھیں کہ کیا ہوا تھا انجام ان منکرین کا جو ان سے پہلے (ہو گزرے) تھے۔ جو رسول و آیات کو جھٹلاتے تھے۔ پس یہ اس سے عبرت حاصل کریں اور تیری تکذیب سے گریز کریں۔ یا یہ معنی کہ جو دنیا میں مستغرق تھے اور اس مردار پر اوندھے گرے پڑے تھے ان سے عبرت حاصل کریں تا کہ اس دنیا کی محبت کو دل سے اکھیڑ پھینکیں۔

الآخرة سے پہلے موصوف محذوف ہے وہ یا تو الحالة ہے یا الساعة ہے یا الحياة ہے یعنی آخری حالت، آخری ساعت یا آخری حیات کا گھر بہتر ہے۔ ان لوگوں کے لئے جو شرک اور معاصی سے اجتناب کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ ہم نے اپنے اطاعت شعاروں کو دنیا میں عذاب کے نزول کے وقت بچا لیا اور آخرت میں جو کچھ حور و غلمان، اور دوسری نعمتیں رکھی ہیں وہ ان کے لئے بہتر ہیں۔ پس جس چیز کا ذکر ہونا چاہئے اسے چھوڑ دیا گیا کیونکہ اس پر موجود کلام دلالت کر رہی ہے۔

۲۔ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۔ تم عقل کو استعمال کیوں نہیں کرتے تا کہ تم جان لو کہ آخرت بہتر ہے۔ نافع، ابن عامر، عاصم اور یعقوب نے خطاب کے صیغے کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے یاء کے ساتھ غائب کا صیغہ پڑھا ہے۔

1۔ تفسیر خازن، جلد 3، صفحہ 263 (التجاریہ)

حَتّٰۤى اِذَا اسْتَیْــٴَـسَ الرُّسُلُ وَ ظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَآءَهُمْ نَصْرُنَا ۙ فَنُجِّیَ مَنْ نَّشَآءُ ؕ وَ لَا یُرَدُّ بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِیْنَ ﴿۱۱۰﴾

"(جب نصیحت کرتے کرتے) مایوس ہو گئے رسول اور وہ منکرین گمان کرنے لگے کہ ان سے جھوٹ بولا گیا ہے اس وقت آ گئی ان کے پاس ہماری مدد پس بچالیا گیا (عذاب سے) جس کو ہم نے چاہا اور نہیں ٹالا جاسکتا ہمارا عذاب اس قوم سے جو جرائم پیشہ ہے [1]"

[1] الرسل سے مراد ہے مخصوص رسول مراد نہیں وَ مَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا اس عموم پر دلالت کر رہا ہے، یعنی انکی نصرت میں تاخیر ہوئی ہے حتی کہ وہ مایوس ہو گئے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں یہ محذوف کلام کی غایت ہے جس پر موجود کلام دلالت کر رہی ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے لا یغرنهم تمادی ایامهم. فان من قبلهم امهلوا حتی استیئس الرسل من ایمانهم لا نهماکهم فی الکفر مترفین متمادین فیه من غیر وزع۔ یعنی ان کی سرکشی انہیں دھوکے میں نہ ڈالے کیونکہ ان سے پہلے لوگوں کو مہلت دی گئی حتی کہ رسول ان کے ایمان سے مایوس ہو گئے کیونکہ وہ کفر میں منہمک تھے اور عیش طرب میں تھے اور سرکشی میں انتہا کو پہنچے ہوئے تھے۔ قد کذبوا کو کوفیوں اور ابو جعفر نے ذال کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ اس آیت کے ظاہری معنی کا اعتبار کرتے ہوئے اس قرأت کا انکار کرتی تھیں۔ یعنی وہ گمان کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے جو وعدہ کیا تھا اس کا ایفا نہیں کیا گیا لیکن یہ قرأت متواتر ہے، اگرچہ حضرت عائشہؓ نے نبی کریم ﷺ سے یہ قرأت نہ سنی تھی اور انہیں اس کا تواتر نہیں پہنچا تھا اور معنی یہ ہے کہ رسولوں نے گمان کیا کہ ان سے جھوٹ بولا گیا ہے، یعنی جب انہوں نے بیان کیا کہ ان کی مدد کی جائے گی تو ان کے نفسوں میں اس کے خلاف کا وہم ہوا۔ یا یہ معنی کہ قوم نے ایمان کے وعدہ کے ساتھ جھوٹ بولا ہے۔ یعنی جب انہوں نے بیان کیا کہ ان کی مدد کی جائے گی تو ان کے نفسوں میں اس کے خلاف کا وہم ہوا۔ یا یہ معنی کہ قوم نے ایمان کے وعدہ کے ساتھ جھوٹ بولا ہے یا یہ معنی کہ کفار نے گمان کیا کہ رسل نے اسے دعوت و وعید کے ساتھ جھوٹ بولا ہے۔ یا یہ معنی کہ کفار نے گمان کیا کہ رسولوں کے ساتھ جو نصرت کا وعدہ کیا گیا ہے اسے ایفا نہیں کیا گیا اور انبیاء پر معاملہ خلط ملط ہو گیا ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں ابن عباس سے مروی ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ رسولوں کے دل کمزور پڑ گئے، یعنی رسولوں نے گمان کیا کہ ان سے جو نصرت کا وعدہ کیا گیا تھا وہ پورا نہیں کیا جائے گا۔ چونکہ انبیاء بشر تھے تو بشری تقاضا کے عین مطابق انہیں یہ خیال گزرا۔ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی حَتّٰى یَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ۔ اس معنی کا حضرت عائشہؓ انکار کرتی تھیں (1)۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں اگر یہ روایت ابن عباس سے صحیح ہو تو ظن سے مراد وہ خیال ہے جو دل میں بطریق وسوسہ پیدا ہوتا ہے (2)۔ الطیبی فرماتے ہیں یہ روایت صحیح ہے اور اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ آیت سے مراد تاخیر میں مبالغہ اور بطور تمثیل تاخیر میں مبالغہ کرنا ہے کوفیوں کے علاوہ نے تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ معنی یہ ہے کہ رسولوں نے یقین کر لیا کہ قوم نے ان سے جو وعدہ کیا تھا انہیں وہ ایفا نہیں کریں گے۔ اب انکے ایمان کی کوئی امید نہیں ہے۔ قتادہ نے اسی طرح کہا ہے۔ بعض فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ جب رسول اپنی قوم کے افراد کی تصدیق کرنے سے مایوس ہو گئے اور یہ گمان کیا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 263 (التجاریہ) — 2۔ تفسیر بیضاوی، جلد 13، صفحہ 326 (العلمیہ)

کہ جو ایمان لائے ہیں وہ بھی شدت محنت اور تکلیف اور نصرت کی تاخیر سے مرتد ہو جائینگے۔

جاء ھم میں ھم کا مرجع رسل ہے نصرنا فنجی من نشاء۔ ابن عامر، عاصم اور یعقوب نے ایک نون اور جیم کے تشدید اور یاء کے فتحہ کے ساتھ ماضی مجہول کا صیغہ پڑھا ہے۔ اس صورت میں من اور باقی قراء نے دونوں کے ساتھ باب افعال سے مضارع متکلم کا صیغہ پڑھا ہے۔ اس صورت میں من محل نصب میں ہوگا اور من نشاء سے مراد نبی اور مومنین ہیں۔ قرآن نے یہاں تعیین نہیں فرمائی تا کہ اس بات پر دلالت کرے کہ یہی لوگ نجات کے اہل ہیں۔ اگر ہم نجات دینا چاہیں کوئی دوسرا ان کے ساتھ شریک نہیں ہے اور دوسروں کی طرف وہم جاتا ہی نہیں۔ باسنا باس سے مراد عذاب ہے جب مجرموں پر عذاب نازل ہوتا ہے تو اسے لوٹایا نہیں جاتا۔ اس میں دونوں مشیتوں کا بیان ہے۔ میں کہتا ہوں ممکن ہے من نشاء سے مراد بعض مومنین ہوں کیونکہ بعض مومنین کفار کے پڑوس کی وجہ سے ہلاک ہو جاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً اور ڈرتے رہو اس فتنہ سے (جو اگر برپا ہو گیا تو) نہ پہنچے گا صرف انہیں کو جنہوں نے ظلم کیا تم میں سے۔

لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ؕ مَا كَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى وَ لٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

"بلاشبہ پہلی قوموں (کے عروج و زوال) کی داستانوں میں [۱] درس عبرت ہے سمجھداروں کے لئے نہیں ہے یہ قرآن ایسی بات جو (یونہی) گھڑ لی گئی ہو بلکہ یہ تصدیق کرتی ہے ان کتابوں کی جو اس سے پہلے (نازل ہوئی ہیں) اور یہ قرآن ہر چیز کی تفصیل ہے اور سراپا ہدایت و رحمت ہے اس قوم کے لئے جو ایمان لاتے ہیں [۲]"

[۱] یقیناً انبیاء اور ان کی امتوں کے واقعات میں یا یہ معنی کہ یوسف اور ان کے بھائیوں کے واقعات میں۔

[۲] یعنی عبرت ہے ان عقول سلیمہ کے لئے جو انانیت کی شوائب اور حس کی طرف میلان سے مبرا ہیں۔ کیونکہ یوسف علیہ السلام کنویں کی تاریکی سے محبت کی تاریکی کی طرف منتقل ہوئے چٹائی سے شاہی تخت کی طرف بلند ہوئے۔ پس ثابت ہوا کہ صبر کا انجام سلامتی اور کرامت ہے اور فریب کاری دھوکہ دہی کا انجام رسوائی اور ندامت ہے۔ ماکان۔ یہ قرآن تورات انجیل اور زبور کی تصدیق کرتا ہے اور دین میں بندے کو جن احکام کی احتیاج ہے ان کی تفصیل اس میں ہے کیونکہ کوئی بھی دینی معاملہ ایسا نہیں ہے جس کی سند قرآن میں بالواسطہ یا بلا واسطہ نہ ہو کیونکہ کچھ سنت سے ثابت ہیں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ۔ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ۔ مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ کیونکہ کچھ اجماع سے ثابت ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى۔ اور کچھ قیاس سے ثابت ہیں۔ ارشاد ہے فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ۔ پس عبرت حاصل کرو اے دیدۂ بینا رکھنے والو۔ نیز یہ قرآن گمراہی سے ہدایت دیتا ہے اور اس کے ذریعے دارین کی سعادت نصیب ہوتی ہے لیکن اس قوم کو جو اس کی تصدیق کرتی ہے۔ یہاں مومن قوم کا ذکر فرمایا کیونکہ نفع قرآن سے صرف مومن قوم ہی حاصل کرتی ہے۔ دوسرے لوگ اس منفعت سے محروم ہوتے ہیں اور لکن کے بعد جو نصب ہے وہ خبر کان پر معطوف

ہونے کی وجہ سے ہے۔ شیخ ابو منصور فرماتے ہیں یوسف علیہ السلام اور آپ کے بھائیوں کے قصہ کے ذریعے رسول کریم ﷺ کو قریش کی اذیتوں پر صبر اور تسلی دینا مقصود ہے۔ گویا یوں کہا گیا ہے کہ یوسف کے بھائی اس کے باوجود کہ دین میں آپ کے موافق تھے، ایک باپ کی اولاد تھے۔ انہوں نے اپنے فعل کی قباحت کو جاننے کے باوجود سازش وفریب کاری کا رویہ یوسف کے ساتھ روا رکھا لیکن یوسف علیہ السلام اس پر صابر وشاکر رہے اور انہیں معاف بھی فرما دیا۔ تو اے محبوب مکرم ﷺ آپ اپنی قوم کی اذیت پر صبر کرنے کے زیادہ حقدار ہیں کیونکہ یہ کافر اور جاہل ہیں اپنے فعل کی قباحت کو بھی نہیں جانتے۔ حضرت وہب فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے کوئی کتاب نازل نہیں فرمائی مگر اس میں سورۂ یوسف مکمل نازل فرمائی جیسا کہ یہ قرآن میں موجود ہے۔ واللہ اعلم۔

9:10 صبح 8-8-1999

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی نَعْمَائِہٖ وَآلَائِہٖ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الصِّدِّیْقِیْنَ قُدْوَۃِ الصّٰلِحِیْنَ مُحَمَّدِنِ الْمَبْعُوْثِ رَحْمَةً لِّلْعَالَمِیْنَ۔

سورۂ رعد

آیاتها ۴۳ | سُوْرَةُ الرَّعْدِ مَدَنِيَّةٌ ۱۳ | رکوعاتها ۶

سورۃ الرعد مدنی ہے اور اس میں تینتالیس آیتیں اور چھ رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓمّٓرٰ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ ؕ وَ الَّذِيْۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ①

"الف لام میم را یہ آیتیں ہیں کتاب (الٰہی) کی اور جو نازل کیا گیا ہے آپ کی طرف آپ کے رب کی جانب سے [1] وہ حق ہے [2] لیکن اکثر لوگ (اپنی کج فہمی کے باعث) ایمان نہیں لاتے [3]"

[1] ایٰتُ اور الکتٰب میں اضافت منی ہے اور کتاب سے مراد سورت یا قرآن ہے اور تِلْكَ کا مشار الیہ اس کی آیات ہیں، یعنی یہ آیات سورۂ کاملہ یا قرآن کی آیات ہیں۔ وَ الَّذِيْۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ سے مراد تمام قرآن ہے۔ یہ اعراب کے اعتبار سے محل جر میں ہے کیونکہ اس کا عطف کتاب پر ہے اور یہ عطف خاص پر عام کے عطف کی طرح ہے بشرطیکہ کتاب سے مراد سورت ہو، یا ایک صفت کا عطف دوسری صفت پر ہے اگر کتاب سے مراد قرآن ہو۔

[2] الحق یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے، یعنی یہ حق ہے، اس میں کوئی شک نہیں ہے، یا اسم موصول محل رفع میں ہے اور مبتدا ہے اور الحق اس کی خبر ہے اور یہ جملہ پہلے جملے پر حجت کی مانند ہے۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ خبر کا معرف باللام ہونا منزل کے حق ہونے کے اختصاص پر دلالت کرتا ہے حالانکہ سنت، اجماع اور قیاس میں سے ہر ایک حق کا فائدہ دیتا ہے تو ہم جواباً کہیں گے بما انزل سے مراد منزل سے اعم ہے خواہ وہ صراحۃً منزل ہو یا ضمناً منزل ہو جس کی اتباع کا حکم منزل صریح نے خود بیان کیا ہے۔

[3] لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے کیونکہ ان کے غور و فکر اور تامل کی قوت میں خلل اور فساد ہے۔ مقاتل فرماتے ہیں جب مشرکین مکہ نے کہا کہ محمد ﷺ نے یہ قرآن اپنی طرف سے بیان کیا ہے تو یہ آیت کریمہ ان کے حق میں نازل ہوئی ان کے اس لایعنی قول کو رد فرمایا اور توحید کے دلائل بیان فرمائے (1)۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ ؕ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ ②

"اللہ وہ (قدرت و حکمت والا ہے) جس نے بلند کیا آسمانوں کو بغیر ستونوں کے (جیسے) تم انہیں دیکھ رہے ہو پھر وہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 2 (التجاریہ)

متمکن ہوا عرش پر ۱؎ اور پابند حکم بنایا سورج اور چاند کو ہر ایک رواں ہے مقررہ میعاد تک ۲؎ اللہ تعالیٰ تدبیر فرماتا ہے ہر کام کی ۳؎ کھول کر بیان کرتا ہے اپنی نشانیوں کو شاید تم اپنے رب سے ملاقات کا یقین کرلو۔ ۴؎ ''

۱؎ اَللّٰهُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ مبتدا اور خبر ہیں یا موصول صفت ہے اور خبر یُدَبِّرُ ہے۔ بغیر عمد عمد جمع ہے عماد کی جیسے اهاب واهب یا عمود کی جمع ہے جیسے ادیم وادم مراد ستون ہیں۔ یہ السموات سے حال ہے اور ترونها عمد کی صفت ہے یا اس کے آسمانوں کے دیکھنے پر استشہاد کیلئے مستقل کلام ہے۔ اسی طرح یہ الصانع حکیم کے وجود پر دلیل بھی ہے کیونکہ ان آسمانوں کا ان تمام اجسام سے بلند ہونا حالانکہ جسمیت میں ان کے برابر ہیں اور ان کا اپنے تقاضوں کے ساتھ خاص ہونا دلالت کرتا ہے کہ کوئی ایسا مخصص ہے جو نہ جسم ہے نہ جسمانی ہے اس ذات نے بعض ممکنات کو بعض پر اپنے ارادہ سے ترجیح دی ہے۔ اس طریقہ پر ان تمام چیزوں کا حل ہے جن کا دوسری آیات میں ذکر ہے۔ ثم استوی علی العرش سورۃ یونس میں اس پر بحث گذر چکی ہے۔

۲؎ یعنی اس نے چاند اور سورج کو اپنے ارادہ کے مطابق مسخر و مطیع بنا دیا ہے کہ انہیں چلنے کی ایک مخصوص رفتار عطا فرمائی ہے جو یومیہ حوادث کے لئے نفع بخش ہے۔ ان میں سے ہر ایک آسمان دنیا میں چلتا ہے ایک مدت معینہ کے لئے جس پر ایک کا دور مکمل ہوتا ہے یا یہ معنی کہ یہ ایک غایت معلوم کے لئے چل رہا ہے اور وہ دنیا کے فنا کا وقت ہے۔

۳؎ ایجاد و اعدام موت وحیات وغیرہ امور کا اپنی ملکوت میں فیصلہ فرماتا ہے۔

۴؎ وہ آیات کو نازل فرماتا ہے یا یہ معنی کہ وہ ان کو مفصل بیان فرماتا ہے، یا یہ مطلب کہ وہ یکے بعد دیگرے دلائل بیان فرماتا ہے تاکہ تم ان آیات میں غور و فکر کرو اور اس کی قدرت کاملہ کو پہچان لو اور جان لو کہ جو ان اشیاء کی تخلیق اور ان کی تدبیر پر قادر ہے وہ اعادہ اور جزاء پر بھی قادر ہے۔

وَهُوَ الَّذِیْ مَدَّ الْاَرْضَ وَجَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ وَاَنْهٰرًا ؕ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِیْهَا زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ۝۳

'' اور وہ وہی ہے جس نے پھیلا دیا زمین کو اور بنا دیئے اس میں پہاڑ اور دریا اور ہر قسم کے پھلوں میں سے دو دو جوڑے بنا دیئے ۱؎ اور وہ ڈھانپ دیتا ہے رات سے دن کو ۲؎ بے شک ان تمام چیزوں میں (اس کی قدرت کی) نشانیاں ہیں اس قوم کے لئے جو غور و فکر کرتے رہتے ہیں۔ ۳؎ ''

۱؎ وہ وہ ہے جس نے زمین کو ہموار بنایا اور پھیلایا تاکہ اس پر قدم ٹک سکیں اور حیوان اس پر چلتے پھرتے رہیں رواسی جمع ہے راسیۃ کی اور اس کا مطلب یہ جمے ہوئے پہاڑ ہیں اور یہ رسی یرسی سے مشتق ہے جس کا معنی ثابت ہونا ہے اور اس کے آخر میں تاء تانیث کے لئے ہے کیونکہ یہ الجبل کی صفت ہے یا ت مبالغہ کے لئے ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں ابوقبیس پہلا پہاڑ ہے جو زمین پر رکھا گیا تھا(۱) اور انهٰرًا کو پہاڑوں کے ساتھ ملا کر ذکر فرمایا اور دونوں کے لئے ایک ہی فعل ذکر فرمایا کیونکہ پہاڑ نہروں کے پیدا ہونے کا سبب ہیں اور ومن كل الثمرٰت ترکیبی اعتبار سے جعل فیها کے متعلق ہے یعنی زمین میں تمام اقسام و انواع کے پھل پیدا فرمائے۔ زوجین اثنین سے مراد عمدہ اور ردی جوڑے ہیں۔ میں کہتا ہوں ممکن ہے اس سے مراد پھلوں کی مختلف اقسام ہوں اور کم از کم دو قسمیں ہوں۔

۱۔ تفسیر بغوی، جلد ۴، صفحہ ۲ (التجاریۃ)

2۔ وہ دن کی جگہ رات کو لے آتا ہے کہ فضا روشن ہونے کے بعد تاریک ہوجاتی ہے اور تاریک ہونے کے بعد روشن ہوجاتی ہے۔ حمزہ، کسائی اور ابو بکر نے یغشی کو شین کی شد کے ساتھ پڑھا ہے۔

3۔ بیشک ان میں غور و فکر کرنے والی اقوام کے لئے نشانیاں ہیں جو ان نشانیوں میں غور و تامل کرتے ہیں کیونکہ ان کا تخلیق کرنا پھر ہر ایک کا ایک مخصوص وجہ اور کام کے ساتھ خاص ہونا صانع حکیم کے وجود پر دلیل ہے جو ان کے امور کی تدبیر فرماتا ہے اور ان کیلئے اسباب مہیا کرتا ہے۔

وَ فِي الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّ جَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّ زَرْعٌ وَّ نَخِيْلٌ صِنْوَانٌ وَّ غَيْرُ صِنْوَانٍ يُّسْقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ ۫ وَ نُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِي الْاُكُلِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝

"اور زمین میں (مختلف قسم کے) ٹکڑے ہیں جو قریب قریب ہیں اور باغات ہیں انگوروں کے اور کھیتیاں ہیں 1 اور کھجوریں کچھ ایک تنے سے پھوٹی ہیں اور کچھ الگ الگ تنوں سے 2 سیراب کیا جاتا ہے 3 ایک ہی پانی سے (اس کے باوجود) ہم فضیلت دیتے ہیں بعض (درختوں) کو بعض پر ذائقہ اور بو میں اور بے شک ان میں (اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی) کی نشانیاں ہیں اس قوم کے لئے جو عقلمند ہو۔"

1۔ اور زمین میں قریب قریب ٹکڑے ہیں، بعض عمدہ ہیں اور بعض سیم وتھور والے ہیں بعض نرم ہیں اور بعض سخت ہیں۔ بعض کھیتی کے قابل ہیں درخت اگانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ بعض اس کے برعکس ہیں۔ بعض میں کم گھاس اور سبزہ ہوتا ہے اور بعض میں زیادہ اگر یہ قادر مطلق کی تخصیص نہ ہوتی تو ان میں کبھی اختلاف نہ ہوتا کیونکہ زمین کی طبیعت اور لوازم میں تو یہ سب ٹکڑے مشترک ہیں اور اسباب سماویہ کے توسط سے تمام کو لوازم برابر عطا کئے جاتے ہیں۔ پس اس حیثیت سے بھی یہ نسب اور وضع میں ایک دوسرے سے متصل اور مشترک ہیں۔ اور اسی زمین کے ٹکڑوں میں کہیں انگوروں کے باغات ہیں اور کھیتیاں ہیں۔ زرع کو مفرد ذکر کیا ہے کیونکہ یہ اصل میں مصدر ہے۔

2۔ ایسے کھجوروں کے درخت ہیں جن کی جڑ اور تنا ایک ہیں صنوان جمع ہے۔ صنو کی جیسے قنوان جمع ہے قنو کی۔ ان کے تثنیہ اور جمع میں صرف یہی فرق ہوتا ہے کہ تثنیہ میں نون مکسورہ بلا تنوین ہوتا ہے۔ اور جمع میں نون منون ہوتا ہے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت عباس کے بارے میں ارشاد بھی اسی سے ہے ان عم الرجل صنو ابیہ انسان کا چچا بھی اس کے باپ کی مانند ہے (1) کچھ الگ الگ تنوں والے کھجور کے درخت ہیں۔ ابن کثیر، ابو عمرو اور حفص نے زرع و نخیل صنوان و غیر صنوان چاروں پر جنت پر عطف کی بناء پر رفع پڑھا ہے اور باقی قراء نے اعناب پر عطف کی بناء پر جر پڑھا ہے۔

3۔ یسقی کو عاصم، ابن عامر اور یعقوب نے تاء تانیث کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ ضمیر جمع کی طرف راجع ہے اور باقی قراء نے مَا ذُكِرَ کی تاویل پر یا مذکر کے ساتھ پڑھا ہے۔

4۔ وَ نُفَضِّلُ کو حمزہ اور الکسائی نے یدبر کی مطابقت کی وجہ سے یاء غائبہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے جمع متکلم کا صیغہ پڑھا ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 4 (التجاریہ)

یعنی ایک پانی سے سیراب کئے جاتے ہیں اور ہم بعض کو بعض پر قد رزذائقہ رنگ اور خوشبو میں فضیلت دیتے ہیں۔ ترمذی نے حدیث نقل کی ہے اور اسے حسن بھی لکھا ہے اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں کہ فرمایا کچھ ردی، کچھ عمدہ، کچھ میٹھے اور کچھ کھٹے پھل ہوتے ہیں(1) اور یہ چیز بھی صانع حکیم کے وجود پر دلالت کرتی ہے کیونکہ تنے اور اسباب کے برابر ہونے کے باوجود رنگ وذائقہ میں مختلف ہونا کسی قادر مطلق کی تخصیص سے ہی ہو سکتا ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں جیسے اولاد آدم مختلف ہوتے ہیں، کوئی نیک اور صالح اور کوئی خبیث اور بد طینت حالانکہ تمام کا باپ ایک ہے(2)۔ حضرت الحسن فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کے دلوں کی یہ مثال بیان فرمائی ہے، رحمٰن کے ہاتھوں میں زمین کی مٹی ایک تھی۔ اس نے اسے ہموار کیا اور بچھایا تو وہ قریب قریب کے ٹکڑے بن گئی۔ پھر اس پر پانی نازل فرمایا اور اسی سے اس کی کلیاں، درخت اور پھل نکالے اور اسی زمین سے اس کا شورہ، نمک اور خبیث نکالا۔ حالانکہ تمام زمین ایک ہی پانی سے سیراب کی گئی تھی۔ اسی طرح اس نے تمام لوگوں کو آدم سے پیدا فرمایا۔ پھر اس نے آسمان سے یاد کرا اتارا تو کچھ دل ڈرنے والے اور جھکنے والے ہو گئے اور کچھ سخت اور غافل ہو گئے(3)۔ الحسن فرماتے ہیں جو بھی قرآن پڑھنے کے لئے بیٹھتا ہے قرآن اسے زیادتی یا کمی عطا فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا اور ہم نازل کرتے ہیں قرآن میں وہ چیزیں جو (باعث) شفا ہیں اور سراپا رحمت ہیں اہل ایمان کے لئے اور قرآن نہیں بڑھاتا ظالموں کے لئے مگر خسارہ۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ۔ بیشک ان میں اس قوم کے لیے نشانیاں ہیں جو غور وفکر کے لیے اپنی عقل کو استعمال کرتی ہے۔

وَاِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۬ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

”اے سننے والے اگر تو (ان کے تعصب پر) حیران ہوتا ہے تو حیرت انگیز ان کا یہ قول بھی ہے کہ کیا جب ہم (مرکر) مٹی ہو جائیں گے تو کیا ہمیں نئے سرے سے (دوبارہ) پیدا کئے جائے گا یہی (منکرین قیامت) وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے پروردگار کا انکار کیا[1] اور انہیں (بدنصیبوں) کی گردنوں میں طوق ہوں گے اور یہی لوگ جہنمی ہیں وہ اس (آگ) میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔[2]“

[1] اے پیارے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اگر آپ حیران اور متعجب ہیں کہ وہ معجزات ظاہرہ اور علامات قاہرہ کو دیکھ کر بھی آپ کی رسالت کو تسلیم نہیں کرتے اور اسکے ساتھ ساتھ بغیر دلیل کے پتھر سے بنی ہوئی ایسی چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو نہ نفع بخش ہیں نہ نقصان دہ۔ تو تعجب کے لائق تو ان کا یہ قول ہے کیا جب ہم مرنے کے بعد مٹی ہو جائیں گے تو کیا ہمیں نئے سرے سے دوبارہ زندہ کیا جائے گا۔

[2] دو استفہام جب جمع ہو جائیں جیسا کہ اس آیت میں یا دوسری آیات اِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ۝۔ ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِي الْاَرْضِ ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ان کے متعلق قراء کا اختلاف ہے اور دو استفہام پورے قرآن میں گیارہ مقامات پر جمع ہیں۔ نافع اور کسائی اور یعقوب نے پہلے کو دونوں ہمزوں کے ساتھ استفہاماً پڑھا ہے اور دوسرے کو ایک ہمزہ کے ساتھ خبراً پڑھا ہے۔

1۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 140 (قدیمی) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 4 (التجاریہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 4 (التجاریہ)

ابوجعفر اور ابن عامر نے اس کے برعکس پڑھا ہے اور باقی قراء نے دونوں میں استفہاماً پڑھا ہے۔ مگر نافع نے النمل، العنکبوت میں پہلے دونوں کو خبراً اور دوسرے کو استفہاماً پڑھا ہے۔ ابن کثیر اور حفص نے العنکبوت میں اسی طرح پڑھا ہے۔ ابوجعفر نے الصفت کے اولی میں نافع کی موافقت کی ہے مگر دوسرے میں موافقت نہیں کی۔ ابن عامر نے النمل اور النازعات میں اس کے برعکس پڑھا ہے اور واقعہ میں نے دونوں استفہام کے ساتھ پڑھا ہے۔ پھر قراء کے دو ہمزوں کے اجتماع کے وقت اپنے اپنے اصول ہیں۔ نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو ہمزہ اور اس کے بعد یاء کے ساتھ استفہام پڑھتے ہیں اور ابن کثیر ہمزہ کے بعد مد نہیں کرتے، ابوعمرو مد کرتے ہیں، قالون دونوں ہمزوں کے درمیان الف داخل کرتے ہیں اور ہشام دونوں ہمزوں کے درمیان الف داخل کرتے ہیں۔

جملہ استفہامیہ قولهم سے بدل ہے یا اس کا مفعول بہ ہے۔ یعنی ان کا یہ قول دوبارہ اٹھنے کے انکار کا شعور دیتا ہے۔ اس لئے یہ تعجب کے لائق ہے کیونکہ وہ خود خلق کی ابتداء اللہ تعالیٰ سے ہونے کا اقرار کرتے ہیں اور پھر بعثت کا انکار کرتے ہیں حالانکہ ان کے دلوں میں یہ ثابت تھا کہ اعادہ ابتداء سے آسان ہوتا ہے۔ اذا کا عامل محذوف ہے جس پر ءَاِنَّا لَفِیْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ دلالت کر رہا ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے اِنْ عُدْنَا فِیْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ کَمَا کُنَّا قَبْلَ الْمَوْتِ اِذَا مِتْنَا وَ کُنَّا تُرَابًا۔

یا اس آیت کا یہ معنی ہے کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اگر آپ ان کی اس بات پر تعجب کرتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے بدء خلق کا اقرار کرتے ہیں اور بعثت کا انکار کرتے ہیں تو یہ قول واقعی تعجب کے لائق ہے کیونکہ جو نئے سرے سے پیدا کرنے پر قادر ہوتا ہے اس کے لئے اس چیز کا اعادہ آسان اور ایسر ہوتا ہے۔ بے شمار آیات کریمہ جس طرح مبدء کے وجود پر دلالت کرتی ہیں اسی طرح اعادہ کے امکان پر بھی دلالت کرتی ہیں کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے کمال قدرت اور اس مواد کے اس کے مختلف تصرفات کو قبول کرنے پر دلالت کرتی ہیں۔ یہ منکرین قیامت و بعثت اپنے رب کی بعثت پر قادر ہونے کا انکار کرتے ہیں اور عاجز رب ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ گویا یہ اپنے رب کا بھی حقیقت میں انکار کرتے ہیں۔

۲۔ یعنی یہ لوگ گمراہی میں جکڑے ہوئے ہیں اور ان کی خلاصی کی کوئی امید نہیں ہے، یا یہ معنی کہ قیامت کے روز ان کے گلے میں بیڑیاں ہوں گی اصحاب النار اور یہ لوگ قیامت کے روز دوزخ میں ہوں گے اور اولئک کا تکرار معاملہ کی عظمت پر دلالت کرتا ہے وہ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے جار مجرور کو درمیان میں ذکر کرنے کا معاد یہ ہے کہ کفار ہی کا ہمیشہ دوزخ میں رہنا خاص ہے جیسا کہ اہل سنت کا مذہب ہے۔ معتزلہ اس کے خلاف عقیدہ رکھتے ہیں (یعنی وہ گناہ کبیرہ کے مستحق کے بارے بھی ہمیشہ دوزخ میں رہنے کا قول کرتے ہیں)

وَ یَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالسَّیِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ وَ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلٰتُ ؕ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلْمِهِمْ ۚ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَشَدِیْدُ الْعِقَابِ ۝

"اور جلدی سے مطالبہ کرتے ہیں آپ سے برائی (عذاب) کا نیکی (یعنی بخشش) سے پہلے ۱ اور (ان نادانوں کو یاد نہیں کہ) گزر چکے ہیں ان سے پہلے نزول عذاب کے کئی واقعات ۲ اور (اے محبوب!) بلاشبہ آپ کا رب بہت بخشنے والا (بھی) ہے لوگوں کے لئے ان کے ظلم (زیادتی) کے باوجود اور بے شک آپ کا رب سخت عذاب دینے والا (بھی) ہے۔ ۳"

۱۔ الاستعجال کا مطلب ہے کسی چیز کو وقت سے پہلے جلدی طلب کرنا، اور یہاں السیئۃ سے مراد سزا اور عقوبت ہے اور الحسنۃ سے مراد

نعمت اور عافیت ہے۔ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب مشرکین مکہ عافیت کی بجائے مسلمانوں سے استہزاء کرتے ہوئے عقوبت کا مطالبہ کرتے تھے وہ کہتے اَللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (اے اللہ اگر یہی قرآن سچ تیری طرف سے ہے تو برسا ہم پر پتھر آسمان سے اور لے آ ہم پر دردناک عذاب)۔

2۔ ان سے پہلے گزر چکے ہیں مکذبین کی سزاؤں کے حالات۔ پس یہ ان سے عبرت کیوں حاصل نہیں کرتے۔ اپنے اوپر اس قسم کے عذاب کے نزول کو کیوں جائز نہیں سمجھتے۔ المثلة ثاء کے فتحہ اور ضمہ کے ساتھ ہے جیسے الصدقة اور الصدقة ہے اس کا معنی عذاب ہے کیونکہ معاقب علیہ کی یہ مثل ہے۔ اسی سے الشال قصاص کے لئے استعمال ہوتا ہے امثلت الرجل من صاحبه جب کوئی دوسرے سے قصاص لے یہ جملہ بولا جاتا ہے۔

3۔ اور بے شک اللہ تعالیٰ لوگوں کی مغفرت فرمانے والا ہے باوجود اس کے کہ انہوں نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا ہے علی ظلمهم حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور اس کا عامل مغفرة ہے۔ میں کہتا ہوں ظاہر یہ ہے کہ یہ آیت منکرین قیامت کے لئے ہے اور مغفرت سے مراد مہلت دینا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ بردبار ہے کفار کو بھی ان کے ظلم پر مہلت دیتا ہے اور انہیں عذاب نہیں دیتا حالانکہ وہ خود جلد سزا ملنے کا مطالبہ کرتے ہیں لیکن جب ان کا عذاب آ جاتا ہے تو کوئی اسے دور کرنے والا نہیں ہوتا۔ السدی فرماتے ہیں اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلْمِهِمْ کا ارشاد خاص مومنین کے حق میں ہے اور یہ کتاب اللہ میں امید افزا آیت ہے کیونکہ اس میں اپنی جانوں کے ظلم کے باوجود مغفرت کا وعدہ سنایا گیا ہے اس آیت میں دلیل ہے کہ بغیر توبہ کے بھی معافی ہو سکتی ہے کیونکہ توبہ کرنے والا اپنی جان پر ظلم کرنے والا نہیں ہوتا بلکہ گناہ سے توبہ کرنے والا تو ایسے ہو جاتا ہے جیسے اس نے گناہ کیا ہی نہیں اس حدیث کو ابن ماجہ نے ابن مسعود سے مرفوعاً روایت کیا ہے(1) اور اِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيْدُ الْعِقَابِ کا ارشاد کفار کے ساتھ خاص ہے بعض علماء فرماتے ہیں دونوں ارشاد مومنین کے بارے میں ہیں لیکن دونوں میں مشیت معلق ہے يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ یعنی جسے چاہتا ہے بخشتا ہے جسے چاہتا ہے عذاب دیتا ہے۔ ابن ابی حاتم البیہقی اور الواحدی نے سعید بن مسیب سے مرسلاً روایت کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا! اگر اللہ تعالیٰ کا عفو اور درگزر نہ ہوتا تو کوئی شخص یہاں زندہ نہ رہتا، اگر اس کی وعید اور عذاب نہ ہوتا تو ہر ایک اس کے عفو پر بھروسہ کرتا(2)۔

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّ لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ۝

"اور کافر کہتے ہیں کہ کیوں نہ اتاری گئی ان کی طرف کوئی نشانی ان کے رب کی طرف سے آپ تو (کجروی کے انجام بد سے) ڈرانے والے ہیں 1 اور ہر قوم کے لئے آپ ہادی ہیں۔ 2"

1۔ کافر کہتے ہیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر کیوں نہ اتاری گئی ان کے رب کی طرف سے ایسی علامت اور حجت جو اس کی نبوت کی واضح دلیل ہوتی۔ انہوں نے ان بے شمار نازل ہونے والی آیات کو علامت و حجت شمار ہی نہ کیا اور از روئے عناد اور ہٹ دھرمی دوسری علامات کی تجویز پیش کی۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا آپ پر صرف اور صرف تبلیغ اور انذار ہے، ان کی تجویز کردہ آیات کا لے آنا آپ کے

1۔ سنن ابن ماجہ، جلد 1، صفحہ 323 (وزارت تعلیم) 2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 86 (العلمیہ)

ذمہ نہیں ہے اور نہ ان کو زبردستی ہدایت پر برانگیختہ کرنا آپ پر لازم ہے۔

۳؎ ابن کثیر نے وصل کی صورت میں ھاد' وال' واق اور ما عند اللّٰہ باق کو تنوین کے ساتھ پڑھا ہے اور جب وقف کرتے ہیں تو ان چاروں حروف میں ہر جگہ یاء کے ساتھ وقف کرتے ہیں اور باقی قراء تنوین کے ساتھ وصل کرتے ہیں اور بغیر یاء کے وقف کرتے ہیں۔

معنی یہ ہے کہ ہر قوم کے لئے ایک ہادی ہے، یعنی ان کی ہدایت پر قادر ہے اور وہ اللہ تعالیٰ ہے یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ سعید بن جبیر کا بھی یہی قول ہے(1) عکرمہ فرماتے ہیں الہادی سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں(2) اور معنی یہ ہے کہ آپ ڈرانے والے اور ہادی ہیں، یعنی ہر قوم کو حق کے راستہ کی طرف بلانے والے ہیں اور اس صورت میں ہدایت کا معنی اراءۃ الطریق ہوگا بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی ہے ہر قوم کا ایک نبی ہے جو انہیں آیات الٰہیہ کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی طرف بلاتا ہے نہ کہ ان کی تجویز کردہ آیتوں کے ذریعے رافضیوں کو اللہ تعالیٰ تباہ و برباد فرمائے، وہ کہتے ہیں کہ قرآن میں لکل قوم ھاد علی تھا۔ حضرت عثمان نے حسد کی وجہ سے لفظ علی حذف کر دیا۔ اللہ تعالیٰ ان پر لعنت فرمائے، وہ کہاں بھٹک رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ کا انکار کر رہے ہیں۔

اگر رافضیوں کی بات درست ہو تو حضرت علی کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی فضیلت لازم آتی ہے کیونکہ اس صورت میں معنی یہ ہوگا آپ تو صرف ڈرانے والے ہیں ہدایت دینے والے نہیں ہیں لیکن علی ہر قوم کے ہادی ہیں۔ اس سے جو عقیدہ میں قباحت لازم آتی ہے وہ ہر خاص و عام سے مخفی نہیں۔

پھر اللہ تبارک و تعالیٰ نے ایسی چیزیں ذکر کی ہیں جو مزید اس کے کمال علم اور لازوال قدرت اور قضاء و قدر پر دلالت کرتی ہیں۔ اس بات پر تنبیہ کرتے ہوئے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری تجویز کردہ چیزوں کے انزال پر بھی قادر ہے لیکن اس نے نازل نہیں کیں کیونکہ اسے علم ہے کہ تمہاری یہ تجویزیں حق کی تلاش کی خاطر نہیں بلکہ عناد کے طور پر ہیں۔ اور وہ ذات ان کفار کو بھی ہدایت دینے پر قادر ہے لیکن وہ انہیں ہدایت نہیں دیتا کیونکہ ان پر اس کا فیصلہ کفر کا ہو چکا ہے۔

اَللّٰهُ یَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى وَ مَا تَغِیْضُ الْاَرْحَامُ وَ مَا تَزْدَادُ ؕ وَ كُلُّ شَیْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ ۝۸

"اللہ جانتا ہے جو (شکم میں) اٹھائے ہوئے ہوتی ہے کوئی مادہ ۱؎ اور (جانتا ہے) جو کم کرتے ہیں رحم اور جو زیادہ کرتے ہیں ۲؎ اور ہر چیز اس کے نزدیک ایک اندازہ سے ہے۔ ۳؎"

۱؎ اللہ تعالیٰ جانتا ہے ہر مونث کے حمل کو، یا یہ معنی کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو ہر مادہ اپنے شکم میں مذکر یا مونث' تام الخلقت یا ناقص الخلقت ایک یا ایک سے زیادہ جو کچھ اٹھائے ہوئے ہے۔ وہ جس موجود حالت میں ہے یا مستقبل میں جس حالت میں ہوگا وہ اسے جانتا ہے۔

۲؎ غاض اور زاد ہر ایک فعل لازم اور متعدی استعمال ہوتا ہے۔ قاموس میں ہے غاض الماء غیضاً و مغاضاً قل و نقص یعنی پانی کم ہو گیا جیسے انغاض کا معنی کم ہونا ہے غاض الماء وثمن السلعۃ پانی کم ہو گیا اور سامان کی قیمت کم ہو گئی و غاض الماء وثمن السلعۃ اس نے پانی کو کم کر دیا اور سامان کی قیمت کو کم کر دیا جیسے اغاض کا معنی ہے اذ داد القوم علی عشیرۃ قوم دس سے زیادہ ہو گئی و نزداد کیل بعیر ہم ایک اونٹ کا بوجھ زیادہ دیں گے۔ اگر ان دونوں کو فعل لازم بنائیں تو ما مصدریہ ہوگا۔ معنی یہ ہوگا اللہ تعالیٰ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 5 (التجاریہ)　2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 5 (التجاریہ)

جانتا ہے رحم کے کم ہونے اور ان کے زیادہ ہونے کو ارحام کی کمی اور زیادتی کی نسبت مجازی ہے کیونکہ گھٹتا اور بڑھتا وہ ہے جو ان کے اندر ہوتا ہے، یعنی جو رحموں میں ہے وہ جثہ مدت اور تعداد میں گھٹتا ہے اور زیادہ ہوتا ہے۔ اگر ان کو متعدی بنایا جائے تو ما موصولہ اور مصدریہ دونوں کا احتمال رکھتا ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو ارحام زیادہ یا کم کرتے ہیں جثہ مدت یا تعداد میں مسئلہ حمل کی کم از کم مدت چھ ماہ متفق علیہ ہے۔ روایت ہے کہ ایک شخص نے ایک عورت سے نکاح کیا تو اس نے چھ ماہ کا بچہ جن دیا۔ حضرت عثمان نے اسے رجم کرنے کا ارادہ کیا تو حضرت ابن عباس نے فرمایا اگر میں تم سے کتاب اللہ کے ذریعے جھگڑا کروں تو میں جھگڑا کر سکتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا۔ فرمایا دودھ چھڑانا دو سال میں ہے تو حمل کے لئے چھ ماہ باقی رہ گئے۔ حضرت عثمان نے یہ سن کر اسکی حد کو چھوڑ دیا۔ ابن ہمام نے کہا حضرت عثمان کا حد کو دور کرنا اور کسی کا مخالفت نہ کرنا۔ یہ اجماع کی دلیل ہے چھ ماہ کے بچے پیدا ہوتے ہیں اور زندہ رہتے ہیں۔ حمل کی زیادہ سے زیادہ مدت امام ابوحنیفہ کے نزدیک دو سال ہے(1) کیونکہ دار قطنی اور بیہقی نے اپنی اپنی سنن میں ابن مبارک کے طریق سے روایت کیا ہے، کہ ابو داؤد بن عبدالرحمٰن نے ہمیں ابن جریج سے روایت کر کے بتایا ہے کہ انہوں نے جمیلہ بنت سعد سے انہوں نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے فرماتی ہیں عورت کا حمل دو سال سے زائد چرخے کے ستون کے سایہ کے پھرنے کی مقدار بھی نہیں ہو سکتا(2)۔ بعض روایات میں ہے کہ چرخے کے سایہ کی مقدار بھی دو سال سے زائد نہیں ہو سکتا۔ امام شافعی اور امام مالک کے نزدیک زیادہ سے زیادہ مدت چار سال ہے(3) بعض فرماتے ہیں امام مالک کے نزدیک پانچ سال ہے۔ حماد بن مسلمہ کہتے ہیں ہرم بن حیان کو ھرم اس لئے کہا جاتا تھا کہ وہ ماں کے پیٹ میں چار سال رہے۔ بیہقی نے ولید بن مسلم سے روایت کیا ہے، فرمایا میں نے مالک بن انس سے پوچھا کہ مجھے یہ حدیث جو حضرت عائشہ کی طرف سے بیان کی گئی ہے کہ بچہ ماں کے پیٹ میں چرخے کے سایہ کی مقدار بھی دو سال سے زائد نہیں رہتا(4) تو امام مالک ابن انس نے فرمایا سبحان اللہ یہ کون کہتا ہے، ہماری پڑوسن محمد بن عجلان کی بیوی جو سچی ہے اور اس کا خاوند بھی سچا ہے اس نے تین بچے بارہ سال میں جنے اور ہر بطن چار سال میں تھا۔ ابن ہمام فرماتے ہیں حضرت عائشہ کا قول مرفوع حدیث کے حکم میں ہے کیونکہ یہ قول آپ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر ہی فرمایا ہو گا(5)۔ یہ محمد بن عجلان کی بیوی کی حکایت سے مقدم ہے کیونکہ شارع علیہ السلام کی طرف نسبت کی صحت کے بعد اسے خطا لاحق نہیں ہوتی بخلاف حکایت کے کیونکہ مالک اور اس عورت کی طرف نسبت کی صحت کے باوجود اس میں خطا کا احتمال ہے کیونکہ ہوسکتا ہے کہ اس کا خون چار سال میں ختم ہوا ہو اور پھر بچا جنا ہو یہ کوئی قطعی امر نہیں کہ مکمل چار سال وہ حاملہ رہی ہو کیونکہ یہ بھی جائز ہے کہ اسکا طہر دو سال یا زیادہ طویل ہو گیا ہو اور پھر حاملہ ہوئی ہو اور پیٹ میں حرکت کا وجود بھی حمل کے یقینی ہونے کو مفید نہیں ہے کیونکہ ہوسکتا ہے کہ حرکت بچہ کے علاوہ کسی اور وجہ سے ہو، ہمیں ایک عورت کی خبر پہنچی ہے کہ اس نے نو ماہ کی مدت میں حرکت کو محسوس کیا، حیض کا خون بھی رک گیا، پیٹ بھی بڑھ گیا اور درد زہ بھی ہوا لیکن جب دایہ اس کے پاس بیٹھی تو کچھ بھی نہ نکلا، اس نے صرف پانی ہی نچوڑا، اس طرح اس کا پیٹ کم ہوتا گیا اور دایہ بغیر ولادت بچہ کے فارغ ہوگئی۔ فی الجملہ یہ حکایات روایات کے معارض نہیں ہو سکتیں۔

روایت ہے کہ حضرت عمر نے اس عورت کے بچے کے نسب کو ثابت کیا جس کا خاوند دو سال سے غائب تھا۔ پھر وہ واپس آیا تو اس نے اپنی بیوی کو حاملہ پایا اس نے اُسے رجم کرانے کا ارادہ کیا تو حضرت معاذ نے اسے فرمایا اگر تجھے اس پر کوئی حق ہے تو جو اس کے

1۔ ہدایہ اولین، صفحہ 433 2۔ سنن کبریٰ بیہقی، جلد 7، صفحہ 443 (الفکر) 3۔ ہدایہ اولین، صفحہ 433
4۔ سنن کبریٰ بیہقی، جلد 7، صفحہ 433 (الفکر) 5۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 5 (التجاریہ)

پیٹ میں ہے اس پر تجھے کوئی حق نہیں ہے۔ اس نے یہ سن کر اسے چھوڑ دیا یہاں تک کہ اس عورت نے بچہ جنا جس کے اگلے دانت اگے ہوئے تھے اور اس کے دانت اپنے باپ کے مشابہ تھے۔ جب اس شخص نے دیکھا تو کہا رب کعبہ کی قسم یہ میرا بچہ ہے، بے شک یہ فراش کے قیام کی وجہ سے ہوا اور اس شخص نے بچے کے نسب کا دعویٰ کیا۔

مسئلہ:۔ پیٹ میں بچوں کی تعداد کی کوئی حد نہیں ہے۔ بعض فرماتے ہیں چار تک تعداد معروف ہے۔ امام ابوحنیفہ کا یہی خیال ہے۔ امام شافعی فرماتے ہیں مجھے ایک یمنی بزرگ نے بتایا کہ اس کی عورت نے کئی مرتبہ پانچ پانچ بچے جنے۔ میں کہتا ہوں دیار ہند میں مشہور ہے کہ قاضی قدوہ کی بیوی نے ایک بطن میں سو بچوں کو جنم دیا تھا اور وہ تمام زندہ تھے واللہ اعلم۔

امام بغوی فرماتے ہیں اہل تفسیر نے لکھا ہے تغیض الارحام کا مطلب یہ ہے کہ حیض ارحام کے حمل کم کرتا ہے۔ جب حاملہ کو حیض آئے تو یہ بچے میں نقصان کا باعث ہوتا ہے کیونکہ حیض کا خون رحم میں بچے کی غذا بنتا ہے اور جب خون بہنے لگے تو غذا کم ہو جاتی ہے اور بچہ کمزور ہوتا ہے اور جب حاملہ کو حیض نہ آئے تو بچہ زیادہ اور مکمل ہوتا ہے۔ پس خون کے نکلنے کی وجہ سے بچے کی خلقت کا نقصان ہوتا ہے۔ قرآن کریم کی آیت سے وہی نقصان مراد ہے۔ اور خون کے رکنے کی وجہ سے جو تخلیق تام ہوتی ہے وہ زیادتی مراد ہے(1) بعض فرماتے ہیں جب عورت کو حیض آتا ہے تو خوراک کم ہو جاتی ہے اور مدت حمل زیادہ ہو جاتی ہے یہاں تک کہ نو ماہ طہر کی حالت میں مکمل ہوتے ہیں۔ اگر اسے پانچ خون آئیں تو وہ نو ماہ پانچ دن میں بچہ جنتی ہے۔ پس نقصان غذا میں اور زیادتی مدت میں ہوتی ہے۔ الحسن فرماتے ہیں کمی سے مراد نو ماہ سے کمی ہے اور زیادتی سے مراد نو ماہ سے زیادتی ہے(2)۔ بعض فرماتے ہیں النقصان سے مراد وہ بچہ جو ناقص الخلقت گر جاتا ہے اور زیادتی سے مراد اس کا تام الخلقت ہونا ہے۔

ے یعنی اللہ تعالیٰ کے علم میں ہر چیز کی متعین حد ہے، اس سے وہ نہ تجاوز کرتی ہے اور نہ کم ہوتی ہے۔

عٰلِمُ الْغَیْبِ وَ الشَّهَادَةِ الْكَبِیْرُ الْمُتَعَالِ ۝

"وہ جاننے والا ہے ہر پوشیدہ چیز کو اور ہر ظاہر چیز کو سب سے بڑا عالی مرتبہ ہے۔ لے"

لے الْغَیْبِ اور الشَّهَادَة کی شرح سورۂ جن میں ہم نے بیان کی ہے۔ الکبیر وہ ذات جو ہر چیز سے بلند ہو۔ المتعال جو اپنی قدر کی وجہ سے ہر چیز سے بلند ہو یا وہ مخلوق کی صفت سے بلند ہو۔ ابن کثیر نے وصلاً اور وقفاً یا کے اثبات کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء دونوں حالتوں میں یاء کے حذف کے ساتھ پڑھتے ہیں۔

سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَ مَنْ جَهَرَ بِهٖ وَ مَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍۭ بِالَّیْلِ وَ سَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ ۝

"(اس کے علم میں) یکساں ہیں تم میں سے وہ جو آہستہ بات کرتا ہے اور جو بلند آواز سے بات کرتا ہے اور وہ بھی جو چھپا رہتا ہے رات کے وقت اور جو چلتا پھرتا رہتا ہے دن کے وقت۔ لے"

لے سارب سرب سروبا سے مشتق ہے جس کا معنی ظاہر ہونا ہے۔ بعض فرماتے ہیں اس کا معنی راستہ پر ظاہرا چلنے والا ہے اور اسرب راستہ کو کہتے ہیں۔ القتیبی فرماتے ہیں سَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ سے مراد اپنی حوائج وضروریات میں تصرف کرنے والا ہے(3) اس

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 5 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 5 (التجاریہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 6 (التجاریہ)

کا عطف من یا مستخف پر ہے۔اس صورت میں من دو کے معنی میں ہوگا۔ گویا یوں فرمایا کہ تم میں سے دونوں برابر ہیں چھپنے والا بھی اور ظاہر ہونے والا بھی۔ ابن عباس فرماتے ہیں اس آیت میں مذکور شخص سے مراد رات میں چھپ کر بدکاری کرنے والا ہے جو دن کے وقت جب باہر نکلتا ہے تو لوگوں پر ظاہر کرتا ہے کہ میں گناہ سے بری ہوں(1)۔ اس معنی کے اعتبار سے اس کا عطف مستخف پر ہوگا اور من سے مراد ایک شخص ہوگا جو مختلف صفتوں سے متصف ہے۔

لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ مِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ؕ وَ اِذَاۤ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ۚ وَ مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ ﴿۱۱﴾

''انسان کے لئے یکے بعد دیگرے آنے والے فرشتے ہیں اس کے آگے بھی اور اسکے پیچھے بھی وہ نگہبانی کرتے ہیں اس کی اللہ کے حکم سے۔ بے شک اللہ تعالیٰ نہیں بدلتا کسی قوم کی (اچھی یا بری) حالت کو جب تک وہ لوگ اپنے آپ میں تبدیلی پیدا نہیں کرتے اور جب ارادہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ کسی قوم کو تکلیف پہنچانے کا تو کوئی ٹال نہیں سکتا اسے اور نہ ہی ان کے لئے اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں کوئی مددگار رہنے والا ہوتا ہے۔''

لَهٗ میں ضمیر کا مرجع من ہے یا ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے فرشتے ہیں معقبت یہ معقبۃ کی جمع ہے اور عقب سے مشتق ہے جس کا معنی یکے بعد دیگرے آنا ہے یا یہ اعتقب سے مشتق ہے۔ پھر تاء کو قاف میں مدغم کیا گیا ہے اور تاء مبالغہ کے لئے ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں اس کا واحد معقب ہے اور اس کی جمع معقبہ ہے۔ پھر معقبہ کی جمع معقبات ہے جیسے کہا جاتا ہے ابناوات سعد و رجالات بکر۔ اس کا معنی ہے کہ وہ فرشتے رات دن تم میں آتے جاتے رہتے ہیں۔ جب رات کے فرشتے اوپر جاتے ہیں تو اسکے پیچھے دن کے فرشتے آجاتے ہیں جب دن کے فرشتے اوپر جاتے ہیں تو ان کے پیچھے رات کے فرشتے آجاتے ہیں۔ پس وہ فرشتے بندوں کے اعمال بھی لکھتے ہیں اور ان کی آفات سے حفاظت بھی کرتے ہیں۔ امام بغوی نے سند صحیح کے ساتھ حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا دن اور رات کے فرشتے تمہارے اوپر یکے بعد دیگرے اترتے رہتے ہیں اور صبح اور عصر کی نماز کے وقت جمع ہوتے ہیں۔ پھر جب رات کے فرشتے بلند ہوتے ہیں تو ان کا رب ان سے پوچھتا ہے حالانکہ وہ سب کچھ جانتا ہے تم نے میرے بندوں کو کیسے چھوڑا۔ وہ کہتے ہیں ہم نے انہیں چھوڑا تو وہ نماز پڑھ رہے تھے اور ہم ان کے پاس گئے تو وہ نماز پڑھ رہے تھے(2) مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ۔ معقبات کی صفت ہے یعنی وہ رات کو چھپنے والے اور دن کو ظاہر ہونے کے والے آگے آگے بھی ہوتے ہیں اور ان کی دوسری تمام اطراف میں بھی ہوتے ہیں اور يَحْفَظُوْنَهٗ میں ضمیر کا مرجع من ہے یعنی وہ فرشتے بندے کی آفات سے حفاظت کرتے ہیں جب تک کہ تقدیر کا فیصلہ نہ آجائے۔ جب تقدیر آجاتی ہے تو وہ اسے چھوڑ دیتے ہیں۔ مجاہد فرماتے ہیں ہر بندے پر ایک فرشتہ مقرر ہے جو اسکی نیند اور بیداری کی حالت میں جنوں انسانوں اور کیڑوں مکوڑوں سے حفاظت کرتا ہے۔ کوئی چیز اس کا ارادہ کرتی ہے تو وہ فرشتہ اسے بتاتا ہے کہ تیرے پیچھے (فلاں شی ہے) مگر جس چیز کو اللہ تعالیٰ اسے گزند پہنچانے کا اذن دیتے ہیں تو وہ اسے تکلیف پہنچاتی ہے(3) کعب الاحبار فرماتے ہیں اگر اللہ تعالیٰ نے تم پر فرشتے مقرر نہ کئے ہوتے جو تمہارے کھانے پینے اور پیشاب کرنے کے وقت تمہارے قریب

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 6 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 6 (التجاریہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 6 (التجاریہ)

ہوتے ہیں تو جن تمہیں اٹھا کر لے جاتے(1)' یا یہ معنی کہ وہ تمہارے اعمال کی حفاظت کرتے ہیں اگر آیت دائیں بائیں نیکیاں اور برائیاں لکھنے والے فرشتوں کے متعلق ہو جیسے ارشاد باری تعالیٰ اِذْ یَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّیٰنِ عَنِ الْیَمِیْنِ وَ عَنِ الشِّمَالِ قَعِیْدٌ۔

ابن جریج فرماتے ہیں یعنی وہ بندے کے اعمال کی حفاظت کرتے ہیں(2) مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ کے الفاظ میں بعض علماء فرماتے ہیں یہ معقبات کی دوسری صفت ہیں، یعنی وہ اللہ کے امر سے آتے جاتے رہتے ہیں یا یہ ظرف لغو ہے اور یحفظون کے متعلق ہے یعنی وہ اللہ تعالیٰ کے اس امر کی وجہ سے ان کی حفاظت کرتے ہیں جو ان کے پاس حفاظت کرنے کا آیا ہے۔ یا یہ معنی کہ وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے اس کی حفاظت کرتے ہیں اس کے گناہ کے بعد اس کے لیے استغفار اور مہلت طلب کرنے کے ساتھ۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہاں من بمعنی الباء ہے، یعنی وہ اللہ تعالیٰ کے اذن سے اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ بعض فرماتے ہیں المعقبات سے مراد وہ محافظ ہیں جو بادشاہ کے اردگرد ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی قضاء کے بارے میں وہم پیدا ہونے سے اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ امام بغوی لکھتے ہیں بعض علماء فرماتے ہیں کہ لہٗ کی ضمیر کا مرجع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے رحمٰن کی طرف سے آگے پیچھے محافظ ہیں جو اللہ کے امر سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شیطانوں کے شر سے اور رات اور دن کے وقت حملہ آوروں سے حفاظت کرتے ہیں۔

عبدالرحمٰن بن زید فرماتے ہیں یہ آیت عامر بن طفیل اور اربد بن ربیعہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ ان کا قصہ الکلبی نے ابو صالح کے ذریعے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ عامر بن طفیل اور اربد بن ربیعہ نبی کریم ﷺ کے پاس آئے آپ ﷺ اس وقت صحابہ کرام کے جھرمٹ میں مسجد کے اندر تشریف فرما تھے۔ وہ دونوں مسجد میں آئے۔ لوگوں نے عامر کے جمال کو اٹھ اٹھ کر دیکھا حالانکہ وہ کانا تھا اور وہ تمام لوگوں سے خوبصورت تھا۔ ایک شخص نے کہا یا رسول اللہ یہ عامر بن الطفیل ہے، آپ سے ملنے آیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا اسے چھوڑ دیجئے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے اس کی بھلائی کا ارادہ فرمایا تو اسے ہدایت دے گا۔ وہ بدبخت آپ کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا اور کہا اے محمد ﷺ اگر میں اسلام قبول کروں تو مجھے کیا ملے گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو مسلمانوں کو ملتا ہے وہ تجھے ملے گا اور جو مسلمانوں پر احکام نافذ ہوتے ہیں وہ تجھ پر بھی نافذ ہوں گے۔ وہ کہنے لگا کیا آپ اپنے بعد ولایت کا امر میرے لئے کر دیں گے۔ فرمایا یہ میری ذمہ داری نہیں، اللہ تعالیٰ جسے چاہے گا خلافت عطا فرمائے گا۔ اس نے کہا صحراؤں میں رہنے والوں پر مجھے حاکم بنادیں اور شہریوں پر خود حکومت کریں۔ اس نے کہا میرے لئے کیا کریں گے۔ فرمایا میں تیرے لئے گھوڑوں کی باگیں کرسکتا ہوں جن پر تو جنگ کرے۔ اس نے کہا کیا آج تک میرے لئے یہ نہیں ہوا میرے ساتھ چلئے میں تم سے علیحدگی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس نے اربد بن ربیعہ کو پہلے سمجھایا تھا کہ جب تو مجھے ان سے کلام کرتے دیکھے تو تو ان کے پیچھے پھر جانا اور تلوار کا وار کر دینا۔ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کر رہا تھا۔ حضور ﷺ اس کی باتوں کا جواب دے رہے تھے۔ پس اربد پیچھے کی طرف سے تلوار مارنے کے لئے آیا۔ اس نے تلوار نیام سے کھینچی لیکن اللہ تعالیٰ نے اسے روک لیا اور وہ تلوار مارنے پر قادر نہ ہوا۔ عامر نے اسے اشارے کرنا شروع کر دیئے۔ حضور ﷺ نے مڑ کر دیکھا تو اربد اور جو کچھ اس نے تلوار کے ساتھ کیا تھا اسے دیکھا آپ ﷺ نے یہ دعا پڑھی اللّٰهُمَّ اكْفِنِيْهِمَا بِمَا شِئْتَ اللہ تعالیٰ نے اربد پر بالکل صاف دن میں ایک کڑک مسلط کی جس نے اسے جلا کر راکھ کر دیا اور عامر بھاگ گیا اور یہ بک رہا تھا اے محمد ﷺ تو نے اپنے رب سے دعا کی ہے حتیٰ کہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 7 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 7 (التجاریہ)

اربد قتل ہوگیا ہے۔ میں آپ کے علاقہ کو گھوڑوں اور جوانوں سے بھر دوں گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ تیرے فعل سے بچائے گا۔ اور قبیلہ کے دونوں بیٹے یعنی اوس اور خزرج کو بھی لے آؤں گا۔ عامر نے سلولیہ عورت کے گھر میں رات گذاری۔ جب صبح ہوئی تو اپنے ہتھیار لگائے دراں حالیکہ اس کی رنگت بدلی ہوئی تھی۔ صحراء کی طرف دوڑ پڑا اور کہہ رہا تھا اے ملک الموت ظاہر ہو جا اور شعر پڑھ رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ اللات والعزیٰ کی قسم میں محمد ﷺ اور ان کے ساتھی یعنی ملک الموت میں اپنا نیزہ آر پار کروں گا۔ اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتہ بھیجا جس نے اسے اپنا پر مارا اور اسے مٹی میں ملا دیا۔ اسی وقت اس کے گھٹنے پر ایک بڑا چھالہ نکلا۔ وہ پھر سلولیہ کے گھر لوٹا اور کہہ رہا تھا یہ غدہ (چھالہ) اونٹ کے غدہ کی مانند ہے اور موت سلولیہ کے گھر میں ہے۔ پھر اس نے اپنا گھوڑا منگوایا اور اس پر سوار ہو گیا۔ اسے چلاتا رہا یہاں تک کہ گھوڑے کی پیٹھ پر ہی مر گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول مکرم ﷺ کی دعا قبول فرمائی۔ پس وہ نیزہ کے ساتھ اور اربد کڑک کے ساتھ ہلاک ہوگیا (1)۔ اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کے بارے یہ ارشاد سَوَآءٌ مِّنۡكُمۡ مَّنۡ اَسَرَّ الۡقَوۡلَ الخ نازل فرمایا، یعنی رسول اللہ ﷺ کے لئے آگے پیچھے فرشتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے آپ کی حفاظت کرتے ہیں۔ الطبرانی نے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ اربد بن قیس اور عامر بن الطفیل مدینہ طیبہ میں حضور نبی کریم ﷺ کے پاس آئے عامر نے کہا یا محمد! اگر میں مسلمان ہو جاؤں تو آپ میرے لئے کیا کریں گے۔ آپ ﷺ نے فرمایا جو حقوق مسلمانوں کے ہیں وہ تجھے ملیں گے اور جو مسلمانوں کے فرائض ہیں وہ تجھ پر بھی لازم ہوں گے۔ اس نے کہا کیا آپ اپنے بعد مجھے والی بنائیں گے۔ فرمایا یہ تیرے لئے اور تیری قوم کے لئے نہیں ہے۔ عامر نے اربد کو کہہ رکھا تھا کہ میں محمد ﷺ کو باتوں کے ذریعے غافل کروں گا تو ان پر تلوار کا وار کر دینا۔ وہ دونوں لوٹے عامر نے کہا اے محمد میرے ساتھ اٹھئے۔ آپ اس کے ساتھ کھڑے ہوئے۔ وہ آپ سے باتیں کرنے لگا۔ اربد نے تلوار نکالی۔ پھر جب اپنا ہاتھ تلوار کے دستہ پر رکھا تو وہ وہاں خشک ہوگیا۔ آپ ﷺ نے مڑ کر اسے دیکھا اور پھر دونوں سے اعراض فرما لیا۔ وہ دونوں وہاں سے نکل پڑے حتیٰ کہ جب دونوں الرقم میں تھے تو اللہ تعالیٰ نے اربد پر کڑک نازل فرما کر اسے ہلاک کر دیا (2)۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اَللّٰهُ يَعۡلَمُ مَا تَحۡمِلُ كُلُّ اُنۡثٰى سے شديد المحال تک آیات نازل فرمائیں۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کسی قوم کی عافیت و نعمت کو تبدیل نہیں فرماتا حتیٰ کہ وہ قوم اپنے اخلاق عالیہ اور کردار صافیہ کو افعال قبیحہ اور گھناؤنی حرکات سے بدل نہ دے اور جب اللہ تعالیٰ ان مذموم خصلتوں والی قوم کو عذاب دینے یا ہلاک کرنے کا ارادہ فرمائے تو اسے کوئی ٹال نہیں سکتا مرد مصدر بمعنی فاعل ہے، یعنی لا راد لہ اور اذا کا عامل وہ کلام ہے جس پر جواب دلالت کرتا ہے اور نہ ہی ان کے لئے اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں مدد کرنے والا ہوتا ہے۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مراد کا خلاف محال ہے۔

هُوَ الَّذِيۡ يُرِيۡكُمُ الۡبَرۡقَ خَوۡفًا وَّطَمَعًا وَّيُنۡشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ ﴿۱۲﴾

"وہی ہے جو تمہیں دکھاتا ہے بجلی (کبھی) ڈرانے کے لئے اور (کبھی) امید دلانے کے لئے اور اٹھاتا ہے (دوش ہوا پر) بھاری بادل۔ ۱؎"

۱؎ وہ وہی ہے جو کبھی تمہیں دکھاتا ہے بجلی کڑک سے ڈرانے کے لئے اور سفر میں بارش کے نقصان سے ڈرانے کے لئے اور بعض اوقات اور بعض جگہ میں کھیتی کے نقصان سے ڈرانے کے لئے اور بادل سے امید دلانے کے لئے کہ بادل برسے گا، کھیتی سرسبز و شاداب ہوگی یا گرمی کی تپش دور ہوگی خوفا اور طمعا کی نصب علت کی بناء پر ہے اور مضاف مقدر ہے، یعنی ارادہ خوف اور طمع یا یہ اضافہ اور

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 7 (التجاریہ) 2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 89 (العلمیہ)

اطماع کی تاویل میں ہیں۔ یا البرق سے حال یا مخاطبین سے ذوی کی تقدیر کے ساتھ حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہیں یا مصدر بمعنی مفعول یا فاعل کی حیثیت سے حال ہیں۔

۲؎ السحاب' سحابۃ کی جمع ہے۔ اس کا معنی بادل ہے کیونکہ یہ بھی ہوا کے ذریعے فضا میں چلتا ہے۔ قاموس میں بھی اسے سحابۃ کی جمع لکھا ہے امام بیضاوی فرماتے ہیں یہ اسم ہے اور اس میں جمع کا معنی ہے۔ اسی وجہ سے اثقال اس کی صفت لگائی گئی ہے۔ ثقال ثقیلۃ کی جمع ہے یعنی وہ بارش سے لبریز ہوتا ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا بادل پانی کی غربال (چھانی) ہے(1)۔

وَ يُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَ الْمَلٰٓىِٕكَةُ مِنْ خِيْفَتِهٖ ۚ وَ يُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيْبُ بِهَا مَنْ يَّشَآءُ وَ هُمْ يُجَادِلُوْنَ فِي اللّٰهِ ۚ وَ هُوَ شَدِيْدُ الْمِحَالِ ﴿۱۳﴾

''اور رعد اس کی پاکی بیان کرتا ہے اس کی حمد کے ساتھ ۱؎ اور فرشتے بھی اس کے خوف سے (اس کی تسبیح کرتے ہیں) ۲؎ اور اللہ تعالیٰ کڑکتی ہوئی بجلیاں بھیجتا ہے ۳؎ پھر گراتا ہے انہیں جس پر چاہتا ہے اس حال میں کہ لوگ اللہ تعالیٰ کے بارے میں جھگڑ رہے ہوتے ہیں ۴؎ اور اس کی پکڑ بہت سخت ہے ۵؎''

۱؎ رعد اس کی حمد کے ساتھ اس کی پاکی بیان کرتا ہے، یعنی وہ سبحان اللہ اور الحمد للہ کہتا ہے۔

ترمذی اور نسائی نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ سے رعد کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا یہ ایک فرشتہ ہے جو بادل پر مقرر ہے، اس کے ساتھ آگ کے کوڑے ہوتے ہیں جن کے ساتھ وہ بادل کو ہانکتا ہے(2)۔

۲؎ اور فرشتے بھی اللہ تعالیٰ کے خوف اور اس خشیت سے اس کی تسبیح بیان کرتے ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں ان فرشتوں سے مراد وہ فرشتے ہیں جو رعد فرشتے کی مدد کے لئے مقرر کئے گئے ہیں۔ وہ فرشتے ڈرنے والے انکساری والے اور اطاعت کرنے والے ہیں۔ پس اس صورت میں خیفتہ میں ضمیر کا مرجع رعد کو بنانا بھی جائز ہے، یعنی وہ معاون فرشتے رعد کے خوف سے تسبیح بیان کرتے ہیں۔

ابن عباس فرماتے ہیں جو کڑک سنے اور سُبْحَانَ الَّذِیْ یُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَالْمَلَائِکَةُ مِنْ خِیْفَتِهٖ وَهُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ پڑھے اگر اس پر بجلی گری تو اس کی دیت مجھ پر ہے(3)۔ عبد اللہ بن الزبیر سے مروی ہے کہ جب وہ کڑک کی آواز سنتے تو بات ختم کر دیتے اور یہ پڑھتے سُبْحَانَ مَنْ یُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَالْمَلَائِکَةُ مِنْ خِیْفَتِهٖ اور فرماتے یہ زمین والوں کے لئے شدید وعید ہے۔ حضرت عباس سے مروی ہے کہ الرعد بادل پر مقرر ہے، جہاں کا اسے حکم ملتا ہے وہاں یہ اسے لیجاتا ہے۔ پانی کے سمندر اس کے انگوٹھے کے گھڑے میں ہیں۔ وہ جب اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتا ہے تو آسمان کے تمام فرشتے تسبیح کے ساتھ آواز بلند کرتے ہیں اور اس وقت بارش نازل ہوتی ہے(4)۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہارا پروردگار فرماتا ہے اگر میرے بندے میری اطاعت کریں تو میں انہیں رات کے وقت بارش سے سیراب کروں گا اور ان پر دن کے وقت سورج طلوع کروں گا اور انہیں رعد کی آواز نہیں سناؤں گا۔ اس حدیث کو احمد نے سند صحیح کے ساتھ اور حاکم نے روایت کیا ہے(5)۔

امام بیضاوی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ رعد کو سننے والے اس کے ساتھ تسبیح بیان کرتے ہیں اور بلند آواز سے سبحان اللہ اور

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 8 (التجاریہ) 2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 140 (وزارت تعلیم) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 8 (التجاریہ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 8 (التجاریہ) 5۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 8 (التجاریہ)

الحمد للہ کہتے ہیں(1) یا یہ مفہوم ہے کہ رعد اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور کمال قدرت پر دلالت کرتا ہے اور ساتھ ہی اس کے فضل اور اس کی رحمت کے نزول پر دلالت کرتا ہے۔ میں کہتا ہوں یہ اس وقت ہوگا جب رعد تسبیح کرنے والا فرشتہ ہونا ثابت نہ ہو۔

؎ الصواعق یہ صاعقۃ کی جمع ہے اور یہ مہلک عذاب ہے اور یہاں مراد وہ آگ ہے جو آسمان سے اترتی ہے اور بجلی سے نکلتی ہے اور جس پر پڑتی ہے اسے جلا دیتی ہے۔

؎ پھر گراتا ہے انہیں جس پر چاہتا ہے پھر اسے ہلاک کر دیتا ہے۔ جبکہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جھگڑ رہے ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی توحید، اس کے کمال علم کے اقرار اور اس کے کمال قدرت کے بارے میں نیز اس کے لوگوں کو دوبارہ زندہ کرنے اور اس کے جزاء و سزا دینے کے بارے میں جھگڑ رہے ہوتے ہیں۔ جدال جھگڑے میں تشدد کرنے کو کہتے ہیں اور یہ جدل سے مشتق ہے جس کا معنی فتل ہے اور ”واؤ“ یا تو جملہ کے جملہ پر عطف کے لئے ہے یا حال کے لئے ہے۔ یعنی اَللّٰهُ یَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى یَفْعَلُ كَذَا وَ كَذَا وَ یُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو ہر مادہ اٹھاتی ہے اور وہ ایسے ایسے کرتا اور کڑکتی بجلیاں بھیجتا ہے درآں حالیکہ منکر لوگ اس کی صفات کمال کا انکار کر رہے ہوتے ہیں اور وہ ان مذکورہ افعال سے اس کے وجود اور اس کے کمال قدرت پر استدلال نہیں کرتے اور نبی کریم ﷺ اور مومنین سے جھگڑتے ہیں۔

اربد بن ربیعہ کے قصہ میں آیت کے نزول کی تقدیر پر جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے واؤ حالیہ ہوگی اور جملہ یشاء کے مفعول سے حال ہوگا یعنی جس پر وہ یہ بجلیاں گرانا چاہتا ہے وہ اس پر گر جاتی ہیں۔ اور وہ اربد بن ربیعہ اور اس جیسے دوسرے خبیث لوگ ہیں۔ اور ان پر یہ بجلیاں اس وقت گرتی ہیں جب وہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں جھگڑ رہے ہوتے ہیں۔ امام بغوی فرماتے ہیں محمد بن علی الباقر نے فرمایا الصاعقہ یعنی بجلی مسلم اور غیر مسلم پر گرتی ہے لیکن ذکر کرنے والے پر نہیں گرتی(2)۔ نسائی اور بزار نے حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے زمانہ جاہلیت کے ایک سردار کی طرف اپنا ایک صحابی بھیجا تا کہ اسے اللہ تعالیٰ کی طرف بلائے۔ سردار کہنے لگا تمہارا وہ رب کون ہے جس کی طرف تم مجھے بلاتے ہو، کیا وہ لوہے کا ہے یا تانبے کا۔ چاندی کا ہے یا سونے کا۔ وہ شخص اس کے یہ لا یعنی سوال سن کر واپس آ گیا اور حضور نبی کریم ﷺ کو ساری صورت حال بتائی اور آپ ﷺ نے اس صحابی کو دوسری اور تیسری مرتبہ بھیجا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس پر بجلی گرائی جس نے اسے ہلاک کر دیا اس وقت یہ آیت کریمہ وَ یُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَیُصِیْبُ بِهَا مَنْ یَّشَآءُ الخ نازل فرمائی۔ امام بغوی فرماتے ہیں یہ اربد بن ربیعہ کے متعلق نازل ہوئی جب اس نے نبی کریم ﷺ سے کہا کہ تمہارا رب موتیوں کا ہے یا یاقوت کا یا سونے کا ہے۔ پس اچانک آسمان سے بجلی گری اور اسے جلا کر راکھ کا ڈھیر کر دیا(3) اور فرماتے ہیں حضرت الحسن سے آیت کریمہ وَ یُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ الخ کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا عربوں کا ایک سرکش ترین شخص تھا۔ نبی کریم ﷺ نے اپنے اصحاب کی ایک جماعت اسے اللہ اور اس کے رسول کی طرف دعوت دینے کے لئے بھیجی۔ انہوں نے اسے دعوت دی تو وہ کہنے لگا محمد ﷺ کا رب کون ہے جس کی تم مجھے دعوت دیتے ہو، کیا وہ سونے کا ہے یا چاندی کا یا لوہے کا ہے یا تانبے کا۔ مسلمانوں کو اس کی کلام بہت گراں گزری۔ انہوں نے واپس بارگاہ نبوی میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ ہم نے ایسا سیاہ دل اور سرکش کبھی نہیں دیکھا۔ حضور ﷺ نے فرمایا دوبارہ جاؤ۔ وہ دوبارہ گئے تو اس نے وہی گفتگو کی اور اتنا مزید کہا کہ میں محمد (ﷺ) کی دعوت قبول کر کے ایسے رب کو مان لوں جسے میں نے دیکھا ہے نہ پہچانا ہے۔ صحابہ کرام پھر واپس آئے اور عرض کی یا رسول اللہ اسکا خبث پہلے سے بھی زیادہ ہو گیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا

1۔ تفسیر بیضاوی، جلد 13، صفحہ 322 (دار الفکر)　2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 9 (التجاریہ)　3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 9 (التجاریہ)

پھر جاؤ صحابہ کرام پھر اس کے پاس گئے گفتگو جاری تھی وہ پہلے کی طرح بے تکی باتیں ہانک رہا تھا۔ ایک بادل اٹھا اس سے بجلی چمکی' کڑک پیدا ہوئی اور بجلی گری اور اس کافر کو جلا دیا، جبکہ صحابہ کرام اس کے پاس بیٹھے تھے۔ صحابہ کرام جلدی جلدی واپس آ رہے کہ آپ ﷺ کو اس کی خبر دیں تو انہیں راستہ میں صحابہ کرام کی ایک اور جماعت ملی جنہوں نے کہا وہ شخص جل گیا ہے۔ انہوں نے پوچھا تمہیں کیسے پتہ چلا ہے۔ تو انہوں نے کہا اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ پر وحی بھیجی ہے وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيبُ بِهَا مَنْ يَّشَآءُ وَهُمْ يُجَادِلُوْنَ فِي اللّٰهِ (1)

؎ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت حسن فرماتے ہیں شديد المحال کا معنی شديد الحقد ہے (2) مجاہد فرماتے ہیں وہ شديد القوة ہے (3) ابو عبیدہ فرماتے ہیں وہ شديد العقوبة ہے (4) بعض فرماتے ہیں وہ شديد المكر والمغالبه ہے القاموس میں ہے المحال کتاب کی طرح ہے، اس کا معنی دھوکا دینا، حیلہ سازی کے ذریعے معاملہ کو پھیرنا' تدبیر کرنا' مکر کرنا' قدرت' جدال' عذاب' عقاب' عداوت' قوت' شدت' ہلاک اور اہلاک ہے۔ ان معانی میں سے اکثر کا اطلاق یہاں صحیح ہے۔ یہ المحل سے مشتق ہے اور بروزن فعال ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا وزن مفعل ہے اور یہ حول یا حیلہ یا حیلولہ سے مشتق ہے اور بغیر قیاس کے اس میں اعلال کیا گیا ہے۔ اس کی بناء پر ابن عباس نے فرمایا اس کا معنی شديد الحول ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا اس کا معنی شديد الاخذ یعنی سخت پکڑ کرنے والا ہے۔

لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ ؕ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ اِلَى الْمَآءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ ؕ وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ۝

"اسی کو پکارنا سچ ہے[1] اور وہ لوگ جو پکارتے ہیں اللہ تعالیٰ کے سوا وہ نہیں جواب دے سکتے انہیں کچھ بھی[2]۔ مگر اس شخص کی طرح جو پھیلائے ہوا اپنی دونوں ہتھیلیوں کو پانی کی طرف تاکہ اس کے منہ تک پانی پہنچ جائے اور (یوں تو) پانی اس کے منہ تک نہیں پہنچ سکتا اور نہیں کافروں کی دعا بجز اس کے کہ وہ بھٹکتی پھرتی ہے۔[3]"

[1] مقبول دعوت اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے جیسا کہ آیت کا مابعد دلالت کرتا ہے' یا یہ معنی کہ اس کو پکارنا حق ہے کیونکہ وہ حقدار ہے کہ اس کی عبادت کی جائے اور اس کی عبادت کی طرف بلایا جائے اور اسی سے حوائج کا سوال کیا جائے۔ یا یہ معنی کہ اس کو اخلاص کے ساتھ پکارنا ہے۔ ان تمام تاویلات کی صورت میں حق کا کلمہ باطل کی ضد ہوگا۔ ظاہر میں یہ اضافت اضافة الموصوف الى صفته یعنی موصوف کو صفت کی طرف مضاف کیا گیا ہے۔ پس مسجد الجامع اور جانب الغربي کے طریقہ پر مؤول ہوگا۔ اور کہا جاتا ہے دعوة المدعو الحق کیونکہ اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو پکارنا متحقق ہوتا ہے یا کہا جاتا ہے کہ دعوت کو حق کی طرف اس لئے مضاف کیا گیا ہے کیونکہ ان کے درمیان ملابست پائی جاتی ہے جیسے کہا جاتا ہے رجل صدق بعض فرماتے ہیں الحق سے مراد اللہ تعالیٰ ہے اللہ تعالیٰ کی ہر پکار حق ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ حمل غیر مفید ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی پکار حق ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ حمل غیر مفید ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کو پکارنا اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہی مختص ہے جیسا کہ غیر کو پکارنا غیر کے ساتھ مختص ہے۔ ہم کہیں گے اللہ کے کلام میں حق کا لفظ یہ شعور دیتا ہے کہ اس کو پکارنا حق ہے کیونکہ حق کو پکارنا حق ہی ہوتا ہے اور باطل کو پکارنا باطل ہی ہوتا ہے۔ اس تاویل پر مذکورہ معنی کی طرف مؤول ہوگا۔ یہ دعوی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 9 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 9 (التجاریہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 9 (التجاریہ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 10-9 (التجاریہ)

مع البرہان کے قائم مقام ہوگا۔ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا دعوۃ الحق توحید ہے(1) ابن عباس نے فرمایا دعوۃ سے مراد لا الہ الا اللہ کی شہادت ہے(2) میں کہتا ہوں توحید اور شہادت اگر حق کی تفسیریں ہیں تو پھر اضافت حقیقیہ ہوگی۔ اور معنی یہ ہوگا کہ اللہ کے لئے دعوت وشہادت کی طرف بلاتا ہے۔ اگر آیت کا نزول عامر اور اربد کے بارے میں ہو دونوں جملوں سے مراد یہ ہوگا کہ ان کی ہلاکت اس طرح ہوئی کہ محسوس ہی نہ ہوا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی پکڑ ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی دعوت کو قبول فرمایا ہے اور دلالت کرتا ہے کہ آپ حق پر ہیں اور اگر آیت عام ہو تو مراد کفار کو رسول اللہ ﷺ سے جھگڑا کرنے کے سبب عذاب کے نزول کی وعید سناتا ہے اور انہیں دھمکی دینا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے خلاف اپنے رسول کی دعا کو قبول کرتا ہے یا ان کی گمراہی اور فاسد رائے کا بیان ہے۔

ع یعنی وہ لوگ جو بتوں کی عبادت کرتے ہیں اور ان کا ذکر کرتے ہیں اور ان سے اپنی حاجات کا سوال کرتے ہیں۔ مفعول کو حذف کیا گیا ہے کیونکہ من دونہ اس پر دلالت کر رہا ہے۔ یا یہ معنی کہ جو اللہ کے سوا جن کو پکارتے ہیں وہ مشرک۔ پس ضمیر عائد کو حذف کیا گیا اور موصول سے مراد اصنام یعنی بت ہیں۔ لا یستجیبون کی ضمیر کا مرجع تقدیر ثانی کی صورت میں اسم موصول ہوگا اور تقدیر اول کی صورت میں ضمیر کا مرجع من دونہ کا موصوف محذوف ہوگا اور اس کا معنی وہ جواب نہیں دیتے لھم میں ھم کا مرجع کفار ہیں۔ بشئی اس سے مراد نفع یا دفع ضرر ہے۔ پانی کی طرف اپنے ہاتھ پھیلانے والے کی قبولیت کی طرح ان کی قبولیت ہوتی ہے جو کنویں پر پیاسا بیٹھا ہے، پانی کی طرف ہاتھ پھیلاتا ہے اور اس کا ہاتھ پانی کی گہرائی تک نہیں پہنچتا اور وہ پانی کو پکارتا ہے لیبلغ فاہ۔ یہ باسط کے متعلق ہے وہ طلب کرتا ہے کہ پانی اس کے منہ تک پہنچ جائے اور پانی اس کے منہ تک نہیں پہنچتا کیونکہ وہ ایک بے شعور چیز ہے جو اس کی پکار کو نہیں سمجھتا اور اس کی دعا کو قبول کرنے پر قدرت بھی نہیں رکھتا اور جو اس کے بس میں نہیں وہ اسے کرنے کی بھی طاقت نہیں رکھتا۔ اسی طرح ان کے ان بے جان و بے بس خداؤں کا حال ہے جو نہ تو ان کی دعاؤں کا شعور رکھتے ہیں اور نہ ان کی قبولیت کی قدرت رکھتے ہیں۔ الباسط کی طرف استجابہ کی اضافت مصدر کی مفعول کی طرف اضافت کی طرح ہے۔ مجاہد کے قول کا بھی یہی مفہوم ہے۔ اسی کی مثل حضرت علی اور عطاء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں بتوں کو پکارنے کے بے فائدہ ہونے کو تشبیہ دی گئی ہے ایسے شخص کے ساتھ جو پانی پینے کے لیے پانی ہاتھوں پر لیتا ہے۔ پھر ہاتھ کو کھلا کر دیتا ہے تاکہ پانی پر قبضہ کرے اور پانی پر قبضہ کرنے والے کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں ہوتا اور نہ اس کے منہ تک کوئی چیز پہنچتی ہے۔ اسی طرح جو بتوں کو پکارتے ہیں جو نہ نقصان دیتے ہیں نہ نفع تو ان کے ہاتھ میں بھی کچھ نہیں ہوتا۔ یہ تاویل ابن عباس سے مروی ہے، فرمایا پیاسے کی طرح جب وہ پانی میں اپنی ہتھیلی کو پھیلاتا ہے، جب تک ہاتھوں کے ساتھ پانی نہ انڈیلے اسے کچھ نفع نہیں پہنچتا اور اس کے منہ تک وہ پانی نہیں پہنچتا جب تک اس کا ہاتھ کھلا ہوتا ہے۔ یہ مثال ہے جو کفار کے خائب وخاسر ہونے کے لئے بیان کی گئی ہے۔

ع یعنی کفار کا ان بتوں کو پکارنا، یعنی ان کی عبادت کرنا، ان سے حاجات طلب کرنا ضیاع خسارہ اور باطل ہے۔ الضحاک ابن عباس سے روایت فرماتے ہیں کفار کا اللہ تعالیٰ کو پکارنا ضیاع ہے کیونکہ کفر اور معاصی کے پردوں کی وجہ سے ان کی آوازیں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پہنچنے سے محروم ہیں(3) واللہ اعلم۔

وَ لِلّٰهِ یَسْجُدُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّ ظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَ الْاٰصَالِ ﴿۱۵﴾

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 10 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 10 (التجاریہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 10 (التجاریہ)

''اور اللہ تعالیٰ کے لئے سجدہ کر رہی ہے ہر چیز جو آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے بعض خوشی سے اور بعض مجبوراً اور ان کے سائے بھی (سجدہ ریز ہیں) صبح کے وقت بھی اور شام کے وقت بھی۔ ۱؎ ''

۱؎ یعنی آسمان میں اور زمین میں جو فرشتے اور مومن ہیں وہ سرافگندہ ہوتے ہیں اللہ کے حضور خوشی سے اور منافقین و کفار تلوار کے ذریعے سجدہ پر مجبور ہو گئے ہیں، یا یہ معنی کہ وہ شدت اور ضرورت کی حالت میں سجدہ کرتے ہیں، اگرچہ وہ اسے ناپسند کر رہے ہوتے ہیں۔ طوعاً اور کرھاً کی نصب حال یا علت کی وجہ سے ہے اور ان کے ساتھ جو عرض ہیں۔ یعنی سائے (وغیرہ) بھی سجدہ ریز ہیں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سجدہ سے مراد اطاعت و پیروی کرنا ہو، یعنی جب وہ ان سے ارادہ کرتا ہے تو وہ اطاعت کرتے ہیں، خواہ وہ پسند کریں یا نہ کریں۔ اور ان کے سایوں کا انقیاد یہ ہے کہ وہ انہیں لمبا کرتا اور چھوٹا کرتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ سے مراد آسمانوں اور زمین کی اشیاء کے حقائق ہوں اور مومنین اور فرشتوں کی روحیں ہوں اور ظلال سے مراد ان کے اشخاص اور قوالب ہوں جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی دعا میں الظاہر کو سواد کے ساتھ اور الباطن کو خیال کے ساتھ تعبیر فرمایا ہے۔ آپ ﷺ نے سجدہ کی حالت میں عرض کی سَجَدَ لَکَ سَوَادِیْ وَ خَیَالِیْ۔ میرے ظاہر و باطن نے تجھے سجدہ کیا۔ یہ تاویل پہلی تاویل سے اولیٰ ہے سایہ وہ ہوتا ہے جو سورج کی روشنی میں دیکھا جاتا ہے اور اس تاریک جگہ سے عبارت ہوتا ہے جس تک جسم کے حجاب کی وجہ سے سورج کی روشنی نہیں پہنچتی اور یہ ایک معدوم امر ہے جس کا وجود نہیں ہے۔ اس لئے اس کی طرف سجدہ کی نسبت کیسے ہو سکتی ہے اور بالغدو والاصال یسجد کی ظرف ہیں اور دونوں سے مراد دوام ہے الاصال اصیل کی جمع ہے اور اس سے مراد عصر اور مغرب کے درمیان کا وقت ہوتا ہے۔

قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قُلِ اللّٰهُ ؕ قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ لَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا ؕ قُلْ هَلْ يَسْتَوِى الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۙ اَمْ هَلْ تَسْتَوِى الظُّلُمٰتُ وَالنُّوْرُ ۚ اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ ؕ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَىْءٍ وَّهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۱۶﴾

''آپ (ان سے) پوچھئے کون ہے پروردگار آسمانوں کا اور زمین کا؟ (خود ہی) فرمائیے اللہ ۱؎ (انہیں کہیے کیا تم نے بنا لئے ہیں اللہ کے سوا ایسے حمایتی جو اختیار نہیں رکھتے اپنے لئے بھی کسی نفع کا اور نہ نقصان کا ۲؎ (ان سے) پوچھئے کیا برابر ہوتا ہے اندھا اور بینا ۳؎ کیا یکساں ہوتے ہیں اندھیرے اور اور کیا انہوں نے بنائے ہیں اللہ کے لئے ایسے شریک جنہوں نے کچھ پیدا کیا ہو جیسے اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا ۴؎ پس یوں تخلیق ان پر مشتبہ ہو گئی ہو ۵؎ فرمائیے اللہ تعالیٰ پیدا کرنے والا ہے ہر چیز کو اور وہ ایک ہے سب پر غالب ہے۔ ۶؎ ''

۱؎ آپ ان سے پوچھئے آسمانوں اور زمین کا خالق اور ان کا مدبر اور ان کے امر کا والی کون ہے۔ یہ استفہام تقریری ہے کیونکہ وہ اعتراف کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ہمارا اور زمین و آسمان کا خالق ہے، یعنی اگر یہ پس و پیش کریں اعتراف حقیقت میں تو آپ خود ان کی طرف سے جواب دیجیے کہ اللہ! کیونکہ ان کے لیے بھی اس کے سوا کوئی جواب نہیں۔ وہ بھی یہی کہتے ہیں کیونکہ یہ ایک واضح حقیقت ہے جو اختلاف کا احتمال ہی نہیں رکھتی۔ یا یہ مطلب ہے کہ ان کو اس جواب کی تلقین فرمائیے۔ امام بغوی فرماتے ہیں روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین سے پوچھا مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ آسمان اور زمین کا خالق کون ہے تو انہوں نے کہا آپ

خود ہی جواب دیجئے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا آپ کہیے اللہ! پھر فرمایا ان پر یہ لازم کیجئے[1]۔

۲؎ اس کا محذوف کلام پر عطف ہے اور استفہام انکاری ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے ءَ اَقْرَرْتُمْ بِرُبُوْبِیَّتِہٖ تَعَالٰی لِلْعٰلَمِیْنَ فَاتَّخَذْتُمْ اَشْیَآءَ کَآئِنَۃً یعنی تم اسکی ربوبیت سے فرار اختیار کرتے ہو جو تمام جہانوں کا رب ہے اور دوسری اشیاء کو تم اپنا ولی بناتے ہو۔ اور ایسے تم نے پیٹھ کے پیچھے ڈال دیا ہے، یعنی فراموش کر دیا ہے اور یہ امر تو عقل کے تقاضا سے بھی بہت بعید ہے۔ پھر اولیاء کی صفات ذکر کیں، یعنی تم ایسے لوگوں کو اپنا ولی اور حمایتی بناتے ہو جو اپنے آپ کو بھی نفع نہیں پہنچا سکتے اور اپنے آپ کو ضرر سے بھی بچا سکتے۔ پھر وہ تمہارے امور زندگی کے والی کیسے بن سکتے ہیں۔ وہ اپنے نفع اور نقصان پر قادر نہیں بھلا وہ تمہیں کیسے خیر و بھلائی پہنچا سکتے ہیں یا تم سے تکلیف اور ضرر کو کیسے دور کر سکتے ہیں۔ یہ ان کفار کی گمراہی اور فساد رائے پر دوسری دلیل ہے کہ انہوں نے ایسے بے بس معبودوں کو ولی بنایا ہے اس امید پر کہ وہ ان کی شفاعت کریں گے۔

۳؎ کیا وہ جس کے پاس نہ عقل کی دولت ہے نہ بصیرت کا نور یا جس کے پاس یہ دونوں ہیں مگر استعمال نہیں کرتا وہ اور جو صاحب بصیرت ہے جو عبادت کی حقیقت اور اس کے موجب کا ادراک رکھتا ہے ولایت و عبادت کے مستحق اور غیر مستحق میں تمیز کرتا ہے، کیا یہ دونوں برابر ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں اعمٰی سے مراد وہ معبود ہے جو تم سے بے خبر اور غافل ہے اور بصیر سے مراد وہ معبود حقیقی ہے جو تمام حالات و کیفیات سے باخبر ہے۔

۴؎ تستوی کو حمزہ کسائی اور ابوبکر نے یاء تحتانیہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے تاء فوقانیہ کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ فاعل مونث ہے لیکن وہ مونث غیر حقیقی ہے۔ اَلظُّلُمٰتُ وَ النُّوْرُ سے کفر کی تاریکیاں اور ایمان کا نور مراد ہے۔ اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ میں بھی استفہام انکاری ہے۔ اور خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ شرکاء کی صفت ہے جو انکار کے حکم کے تحت داخل ہے۔

۵؎ مطلب یہ ہے کہ وہ جن کو انہوں نے اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرایا ہے وہ اس کی مثل کسی چیز کے خالق ہی نہیں ہیں تاکہ یہ تخلیق ان پر مشابہ ہو جائے اور وہ یہ کہیں کہ انہوں نے بھی اللہ تعالیٰ کی طرح کوئی چیز پیدا کی ہے۔ پس یہ بھی عبادت کے مستحق ہیں جیسے اللہ تعالیٰ مستحق عبادت ہے لیکن ان عقل کے اندھوں نے تو ایسے عاجز پتھروں کو شریک ٹھہرایا ہے جو ایسی چیز پر قادر ہی نہیں ہیں جس پر دوسری مخلوق قادر ہوتی ہے، چہ جائیکہ یہ اس پر قادر ہوں جس پر خالق قادر ہے۔

۶؎ فرمایئے جسم، اعراض اور ارواح مجردہ میں سے ہر چیز کا خالق اللہ ہے، کوئی دوسرا خالق نہیں ہے، اس کے خالق ہونے کا تصور ہی نہیں ہو سکتا جس کا اپنا وجود اور وذات غیر کی تخلیق کی محتاج ہو۔ پس ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کی عبادت جائز نہیں ہے جو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بندوں کے افعال کا خالق نہیں بلکہ وہ خود ان کے خالق ہیں وہ بھی ان لوگوں سے ہیں جن پر تخلیق مشابہ ہو گئی ہے۔ ربوبیت اور مستحق عبادت ہونے میں وہ یکتا ہے بلکہ موجود حقیقی بھی وہی ایک ہے، باقی سب موجودات اس کے وجود کا ظل اور پرتو ہیں۔ وہ ہر چیز پر غالب ہے، کوئی اس کا مقابل نہیں ہے کیونکہ جو فی نفسہ معدوم ہے اور غیر کے وجود کے ساتھ موجود ہے وہ اس غیر کا مقابل کیسے ہو سکتا ہے جو اپنے وجود میں اصل ہے اور موجود حقیقی ہے۔

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِیَۃٌۢ بِقَدَرِھَا فَاحْتَمَلَ السَّیْلُ زَبَدًا رَّابِیًا ؕ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 11 (التجاریۃ)

وَ مِمَّا يُوْقِدُوْنَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَآءَ حِلْيَةٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَ الْبَاطِلَ ؕ۬ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۚ وَ اَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ؕ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ ؕ﴿۱۷﴾

"اس نے اتارا آسمان سے پانی پس بہنے لگیں وادیاں اپنے اپنے اندازے کے مطابق تو اٹھالیا سیلاب کی رو نے ابھرا ہوا جھاگ [۱] اور جن چیزوں کو آگ کے اندر تپاتے ہیں زیور بنانے کے لئے یا دیگر سامان بنانے کے لئے اس میں بھی ویسا ہی جھاگ اٹھتا ہے [۲] یوں اللہ تعالیٰ مثال بیان فرماتا ہے حق اور باطل کی [۳] پس (بیکار) جھاگ تو رائیگاں چلا جاتا ہے [۴] اور جو چیز نفع بخش ہے لوگوں کیلئے تو وہ باقی رہے گی [۵] زمین میں یونہی اللہ تعالیٰ مثالیں بیان فرماتا ہے۔ [۶]"

[۱] وادٍ کی جمع اودیۃ ہے۔ وادی اس جگہ کو کہتے ہیں جس میں پانی کثرت سے بہتا ہے۔ پھر اس کے معنی میں وسعت پیدا کی گئی، جاری پانی کے لئے بھی استعمال ہونے لگا جیسے کہا جاتا ہے سال المیزاب (پرنالہ بہا) اودیۃ کی تنکیر کی وجہ یہ ہے کہ بارش کا پانی مخصوص راستوں سے آتا ہے۔ اس لئے بعض وادیوں کا پانی چلتا ہے اور بعض کا نہیں چلتا اور وہ وادیاں اپنی چھوٹی اور بڑی جس حیثیت میں ہوتی ہیں اسی کے مطابق بہتی ہیں۔

[۲] يُوْقِدُوْنَ کو حمزہ کسائی اور حفص نے یاء کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ ضمیر الناس کے لئے اور اس کا اعتبار اس کے معلوم ہونے کی وجہ سے ہے اور باقی قراء نے تاء خطاب کے ساتھ پڑھا ہے۔ ایقاد کا مطلب یہ کہ آگ کو کسی چیز کے نیچے کرنا تاکہ وہ پگھل جائے اور من ابتدائے غایت کے لئے ہے، یعنی ان سے بھی جھاگ ابھرتا ہے جیسے پانی کا جھاگ ابھرتا ہے، یا من تبعیضیہ ہے، یعنی بعض وہ چیزیں جنہیں تم جلاتے ہو۔ یہ تمام قسم کی دھاتوں کو شامل ہے مثلاً سونا، چاندی، لوہا، تانبا، پیتل اور فی النار حال ہے علیہ کی ضمیر سے۔ ابتغاء حلیۃ (زیور بنانے کے لئے) یہ يُوْقِدُوْنَ کے فاعل سے حال ہونے کی وجہ سے یا علت کی وجہ سے منصوب ہے، یعنی وہ جلاتے ہیں زیور بنانے کی غرض سے یا زینت کی غرض سے جیسے سونا اور چاندی یا ایسی چیز بنانے کے لئے آگ جلاتے ہیں جن سے لطف اٹھایا جاتا ہے اور نفع حاصل کیا جاتا ہے جیسے تانبے اور پیتل سے برتن بنانے اور لوہے سے آلات حرب و حرث بنانے کے لئے اس سے مقصود ان کے منافع کا بیان ہے، یعنی پانی کے جھاگ کی مثل ان چیزوں سے بھی جھاگ اٹھتا ہے۔ یہ وہ خبث ہے جسے آگ کی بھٹی دور کرتی ہے اور زبد فاعل ہے مما یوقدون کا یا مبتدا ہے اور مما یوقدون اس کی خبر مقدم ہے۔

[۳] کیونکہ حق یعنی وہ علم جو آسمان سے نازل ہوتا ہے اور وہ اپنے افادہ اور لوگوں کو اس سے مختلف قسم کی دینی اور دنیاوی منافع حاصل کرنا اور دل کا اس کے ساتھ اپنی اپنی مقدار کے مطابق منشرح ہونا اور قیامت تک بلکہ ہمیشہ ہمیشہ تک کے لئے اس کا ثبات اس پانی کی مثل ہے جو آسمان سے اترتا ہے اور اس سے وادیاں حاجت و مصلحت کی مقدار پر اور وادیوں کے چھوٹا یا بڑا ہونے کی بناء پر بہہ پڑتی ہیں۔ اور لوگ اس سے مختلف منافع حاصل کرتے ہیں اور وہ زمین میں ٹھہرتا ہے اس طرح کہ اس کا بعض اس کے منافع میں پہنچ جاتا ہے۔ بعض زمین کی گہرائیوں میں چشموں اور کنوؤں تک پہنچ جاتا ہے۔ وہ علم منزل ان دھاتوں کی مثل ہے جن سے لوگ زیورات بنانے اور دیگر سامان بنانے کے لئے نفع حاصل کرتے ہیں اور وہ طویل مدت باقی رہتے ہیں اور باطل یعنی کفار کی خرافات اور نفس کے وساوس اور شیطان کے خطرات ان کی مثال پھیلاؤ، شہرت اور عدم انتفاع میں اور عدم استقرار میں اس جھاگ کی مثل ہے جو پانی یا دھاتوں کے

اوپر ابھرتا ہے۔

[3] کہا جاتا ہے جفا الوادی واجفا جب اس کے کوڑے پھینک دے بعض فرماتے ہیں جفاء کا معنی متفرقاً ہے۔ کہا جاتا ہے جَفَاتِ الرِّیْحُ۔ ہوا نے اس کو بکھیر دیا اور اس کی نصب حال کی وجہ سے ہے مطلب یہ کہ حق باطل پر چوٹ لگاتا ہے اور اسے ریزہ ریزہ کر دیتا ہے۔

[5] اور پانی، دھات اور علم نافع جو لوگوں کے لئے نفع بخش ہے وہ باقی رہتا ہے اور لوگ اس سے نفع اٹھاتے ہیں۔

[6] اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے حق اور باطل کی مثال بیان فرمائی ہے اسی طرح وہ دوسری مثالیں بیان فرماتا ہے تاکہ مشتبہات کی وضاحت ہو جائے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ آیت کریمہ مسلمانوں کو تسلی دینے کے لئے ہے کہ کفر کی ظلمت زائل ہوگی، اگرچہ ظاہر او بلند و بالا ہو۔ اور اسلام کا نور باقی رہے گا اور قیامت تک باقی رہے گا۔

لِلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمُ الْحُسْنٰى ؔ وَالَّذِيْنَ لَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهٗ لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لَافْتَدَوْا بِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ سُوْٓءُ الْحِسَابِ ۙ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۱۸﴾

"ان لوگوں کے لئے جنہوں نے اپنے رب کا حکم مان لیا بھلائی (ہی بھلائی) ہے [1] اور جنہوں نے نہیں مانا اس کا حکم [2] تو اگر ان کے ملک میں ہو جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب اور اتنا ہی اور اس کے ساتھ۔ تو وہ (عذاب سے بچنے کے لئے) اسے بطور فدیہ دیں [3] یہی وہ (بدنصیب) ہیں جن کے لئے سخت باز پرس ہوگی اور ان کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بہت بری قرارگاہ ہے۔ [4]"

[1] الحسنیٰ مصدر محذوف کی صفت ہے، یعنی الاستجابۃ الحسنیٰ یا استجابوا کا مفعول ہے یعنی انہوں نے اپنے رب کی اچھی اور عمدہ دعوت کو قبول کیا اور للذین سے پہلے والا لام یضرب کے متعلق ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دونوں فریقوں کے لئے مثالیں بیان فرمائی ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں للذین استجابوا خبر ہے الحسنیٰ کی۔ اور الحسنیٰ سے مراد عمدہ اجر یا جنت ہے اور والذین لم یستجیبوا مبتدا ہے اور لوان لہم الخ خبر ہے۔

[2] دوسری ترکیب میں یہ مستقل کلام ہوگی جو قبول نہ کرنے والوں کے انجام کو بیان کرنے کے لئے ہے۔

[3] یہی وہ (بدنصیب) ہیں جن کے لئے سخت باز پرس ہوگی، ان سے مناقشہ ہوگا اور کوئی گناہ معاف نہیں کیا جائے گا۔ ابراہیم النخعی کا یہی قول ہے۔

[4] اور ان کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بہت بری قرارگاہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ایک دوسری جگہ ارشاد ہے لَهُمْ مِّنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَّمِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ ؕ ان کے لئے دوزخ کا ہی بچھونا ہوگا اور ان کے اوپر اسی کا اوڑھنا۔

اَفَمَنْ يَّعْلَمُ اَنَّمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ اَعْمٰى ؕ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۱۹﴾

"تو کیا جو شخص جانتا ہے کہ جو نازل کیا گیا ہے آپ کی طرف آپ کے رب کی جانب سے وہ حق ہے وہ اس جیسا ہوگا جو

اندھا ہے[1] نصیحت وہی قبول کرتے ہیں جو عقلمند ہوں۔[2]"

[1] کیا جو شخص جانتا ہے کہ جو نازل کیا گیا ہے آپ کی طرف آپ کے رب کی طرف سے وہ حق ہے۔ پس وہ اس پر ایمان لاتا ہے اور اس کے مطابق عمل پیرا ہوتا ہے۔ وہ اس جیسا ہوگا جو دل کا اندھا ہے نہ بصیرت کا نور رکھتا ہے اور نہ حق و باطل میں تمیز کر سکتا ہے۔ ہمزہ انکار کے لئے ہے اور فاء محذوف پر عطف کے لئے ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے کیا اس مثال کے بعد دونوں فریقوں کا امر مشتبہ ہو گیا ہے۔ پس جو جانتا ہے مخاطب کے نزدیک اندھے کی مانند ہے نہیں ہرگز نہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ آیت حضرت حمزہ یا عمار اور ابوجہل کے حق میں نازل ہوئی جاننے والا حضرت حمزہ یا عمار ہے اور دل کا اندھا ابوجہل ہے۔

[2] نصیحت صرف وہی قبول کرتے ہیں جن کی عقلیں سلیم ہیں غرور کے شائبہ سے پاک ہیں اور وہم کے معارضہ سے مبرا ہیں۔

الَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَ لَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ ﴿۲۰﴾

"وہ جو پورا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کئے ہوئے وہ وعدہ کو اور نہیں توڑتے پختہ وعدہ کو۔[1]"

[1] یعنی جنہوں نے اپنے نفسوں پر میثاق کے دن بلیٰ کہہ کر اپنے رب کی ربوبیت کا اعتراف کر کے عہد کیا تھا اور جو اللہ تعالیٰ نے ان سے احکام کی پیروی اور مناہی سے اجتناب کا عہد لیا تھا اسے وہ پورا کرتے ہیں۔ اور جو انہوں نے آپس میں عہد کئے ہیں یا اللہ تعالیٰ کے ساتھ عہد کئے ہیں ان کو نہیں توڑتے۔ یہ تخصیص کے بعد تعمیم ہے۔

وَ الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ يُّوْصَلَ وَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَ يَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ ﴿۲۱﴾

"اور جو لوگ جوڑتے ہیں اسے جس کے متعلق حکم دیا ہے اللہ تعالیٰ نے کہ جوڑا جائے اور ڈرتے رہتے ہیں اپنے رب سے اور خائف رہتے ہیں سخت حساب سے۔[1]"

[1] یہ لفظ عام ہے۔ اس میں تمام کتب اور رسول پر ایمان لانا بھی داخل ہے کیونکہ ان کے درمیان فرق نہیں کیا جا سکتا اور اس میں مومنین کے تعلقات اور صلہ رحمی بھی شامل ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں اکثر علماء کا خیال ہے کہ اس سے مراد صلہ رحمی ہے(1)۔ عبدالرحمٰن بن عوف سے مروی ہے، فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میں اللہ ہوں، میں رحمٰن ہوں، میں نے رحم کو پیدا کیا ہے، میں نے اپنے نام سے اس کا اسم نکالا ہے، جو اس کو جوڑے گا میں اس کو جوڑوں گا اور جو اس کو توڑے گا میں اس کو توڑ دوں گا(2)۔ اس حدیث کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا فرمایا جب اس سے فارغ ہوا تو رحم کھڑا ہو گیا اور رحمٰن کے دامن کو پکڑ لیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا رک جا۔ اس نے عرض کی یہ اس کا مقام ہے جو قطع تعلقی سے تیری پناہ چاہتا ہے۔ کیا تو یہ پسند نہیں کرتا کہ میں اسے جوڑوں جو تجھے جوڑے اور میں اسے کاٹ دوں جو تجھے کاٹے۔ رحم نے کہا ہاں میں یہی پسند کرتا ہوں اے میرے پروردگار! اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ عظمت تیرے لئے ہے(3)۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے۔ عبدالرحمٰن بن عوف سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول ﷺ نے فرمایا قیامت کے روز تین چیزیں عرش کے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 11 (التجاریہ) 2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 13 (وزارت تعلیم)
3۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 885 (وزارت تعلیم)، صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 315 (قدیمی)

پہنچے ہوں گی۔ قرآن مجید جو بندوں سے جھگڑے گا۔ امانت۔ رحم (رشتہ داری) جو پکارے گی خبردار جس نے مجھے ملایا اسے اللہ تعالیٰ ملائے گا اور جس نے مجھے توڑا اسے اللہ تعالیٰ توڑے گا۔ اس حدیث کو امام بغوی الحکیم محمد بن نصر نے روایت کیا ہے(1)۔ انس بن مالک سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو یہ پسند کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے کشادہ رزق عطا فرمائے اور اس کے گناہوں کے آثار مٹائے جائیں تو اسے چاہئے کہ وہ رشتہ داریوں کو قائم رکھے۔ متفق علیہ(2) ابو ایوب انصاری سے مروی ہے، فرماتے ہیں ایک اعرابی آپ ﷺ کے گھر میں حاضر ہوا اور عرض کی حضور مجھے کیا چیز جنت کے قریب کرے گی اور کون سی چیز مجھے دوزخ سے دور کرے گی۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا تو اللہ تعالیٰ کی عبادت کر، کسی چیز کو اس کا شریک نہ بنا، نماز قائم کر، زکوٰۃ ادا کر اور صلہ رحمی کر۔ اس حدیث کو امام بغوی نے روایت کیا ہے(3)۔ عبداللہ بن عمرو سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا صلہ رحمی کرنے والا وہ نہیں جو صلہ رحمی کے بدلہ میں ایسا کرے۔ صلہ رحمی کرنے والا وہ ہے جب رشتہ ٹوٹنے لگے تو وہ اسے جوڑے۔ اسے بخاری نے روایت کیا ہے(4)۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں ایک شخص نے عرض کی یا رسول اللہ! سب سے زیادہ میرے حسن سلوک کا کون حقدار ہے؟ فرمایا تیری ماں۔ پھر اس نے کہا پھر کون ہے؟ فرمایا تیری ماں، پھر پوچھا اس کے بعد کون ہے؟ فرمایا تیری ماں۔ پھر پوچھا اس کے بعد کون؟ فرمایا تیرا باپ۔ ایک روایت میں ہے فرمایا تیری ماں، پھر تیری ماں، پھر تیری ماں، پھر تیرا باپ، پھر تیرا اقرب، پھر تیرا اقرب۔ متفق علیہ(4)۔ ابن عمر سے مروی ہے، فرمایا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بے شک سب سے بڑی نیکی انسان کا اپنے باپ کے پیاروں سے صلہ رحمی کرنا ہے اس کے چلے جانے کے بعد۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے(5)۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنے نسبوں کو سیکھو جس کے ذریعے تم اپنے رشتوں کو ملاتے ہو، صلہ رحمی کی وجہ سے خاندان میں محبت پیدا ہوتی ہے، مال میں زیادتی ہوتی اور عمر میں طوالت اور ڈھیل ہوتی ہے۔ اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے اور فرمایا یہ حدیث غریب ہے(6)۔

وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ یعنی عموماً اس کی وعید سے ڈرتے ہیں وَيَخَافُونَ سُوءَ الْحِسَابِ اور خصوصاً برے حساب سے ڈرتے ہیں اس لئے محاسبہ سے پہلے وہ اپنا محاسبہ خود کرتے ہیں۔

وَالَّذِينَ صَبَرُوا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَنْفَقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً وَيَدْرَءُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ﴿٢٢﴾

"اور جو لوگ (مصائب و آلام میں) صبر کرنے والے ہیں 1 اپنے رب کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے 2 اور صحیح ادا کرتے رہے نماز کو اور خرچ کرتے رہے اس مال سے جو ہم نے ان کو دیا پوشیدہ طور پر اور اعلانیہ طور پر 3 اور مدافعت کرتے رہتے ہیں نیکی سے برائی کی 4 انہیں لوگوں کے لئے دار آخرت کی راحتیں ہیں۔ 5"

1۔ ابن عباس فرماتے ہیں جو انہیں احکام ملے تھے ان پر ثابت قدمی سے عمل کرتے رہے(7)۔ عطا فرماتے ہیں مصائب پر صبر کیا(8)۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 14 (التجاریۃ)
2۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 885 (وزارت تعلیم)، صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 315 (قدیمی)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 15 (التجاریۃ)
4۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 886 (وزارت تعلیم)
4۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 883 (وزارت تعلیم)، صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 312 (قدیمی)
5۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 414 (قدیمی)
6۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 19 (وزارت تعلیم)
7۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 15 (التجاریۃ)
8۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 15 (التجاریۃ)

بعض فرماتے ہیں خواہشات نفسانی سے رکے رہے۔ بعض فرماتے ہیں گناہوں سے باز رہے۔ اولی یہ ہے کہ وہ خواہش کی مخالفت پر ڈٹے رہے، معنی کیا جائے کیونکہ وہ تمام اقوال کو جامع ہے۔

۲؎ یعنی ان کا خواہشات نفسانی کی مخالفت فقط اپنے رب کی رضا کے لئے تھا کسی دنیوی لالچ یا ریاکاری اور شہرت کی خاطر نہ تھا۔

۳؎ اور فرض نمازیں قائم کیں اور مرضی کے مطابق سنن و نوافل بھی ادا کرتے رہے۔ اور جو ہم نے رزق انہیں عطا فرمایا اس میں سے کچھ فرضی زکوٰۃ' واجبات اور نفلی صدقات کے طور پر ادا کرتے رہے خفیہ طور پر اور اعلانیہ طور پر۔ نفلی صدقات مخفی طور پر ادا کرنا افضل ہے اور فرضی صدقات اعلانیہ طور پر دینا بہتر ہے تاکہ منکر زکوٰۃ کی تہمت کی نفی ہوتی رہے۔ سر کو اعلانیہ پر مقدم اس لئے فرمایا کیونکہ اکثر اوقات مسلمان نفلی صدقات ہی دیتا ہے اور مسلمان پر زکوٰۃ بہت کم واجب ہوتی ہے۔

۴؎ (اور مدافعت کرتے رہتے ہیں نیکی سے برائی کی) ابن عباس فرماتے ہیں اس کا معنی ہے وہ نیک عمل کے ساتھ برے عمل کو رد کرتے رہتے ہیں۔ اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ " نیکیاں برائیوں کو ختم کر دیتی ہیں (1) حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب تو کوئی برائی کر بیٹھے تو فوراً اس کے بعد نیکی کر وہ اس گناہ کو مٹا دے گی۔ اس حدیث کو امام احمد نے سند صحیح کے ساتھ روایت کیا ہے (2) ابن عساکر نے عمر بن الاسود سے مرسلاً روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب تو دس خطائیں کرے تو نیکی کر جس کے ذریعے تو ان کو دور کر دے (3)۔ عقبہ بن عامر سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص برائیاں کرتا ہے۔ پھر نیکیاں کرتا ہے اس کی مثال اس شخص کی مانند ہے جس کے اوپر تنگ زرہ ہو جس سے وہ گھٹن محسوس کرتا ہو۔ پھر وہ نیک عمل کرتا ہے تو ایک حلقہ کھل جاتا ہے۔ پھر وہ دوسرا نیک عمل کرتا ہے تو دوسرا حلقہ کھل جاتا ہے حتیٰ کہ وہ اسے زمین پر پھینک دیتا ہے۔ اس حدیث کو طبرانی نے روایت کیا ہے ابن کیسان فرماتے ہیں آیت کا معنی یہ ہے وہ اپنے گناہوں کو توبہ سے دور کرتے ہیں (4)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تجھ سے کوئی گناہ ہو جائے تو اس وقت خفیہ گناہ کی توبہ خفیہ کر و اور علانیہ کی توبہ علانیہ کر اس حدیث کو احمد نے الزھد میں عطاء سے مرسلاً روایت کیا ہے (5)۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی ہے وہ برائی کا بدلہ برائی سے نہیں بلکہ برائی کو خیر کے ساتھ رد کرتے ہیں۔ السدی کہتے ہیں اس کا معنی ہے کہ جب ان پر کوئی بیوقوفی اور سفلہ پن کی وجہ سے زیادتی کرتا ہے تو وہ حلم کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ السئۃ برائی اور الحلم نیکی ہے۔ قتادہ فرماتے ہیں وہ برائی کرنے والے پر بھی نیکی اور خیر کو لوٹاتے ہیں (6) اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَ اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا حضرت حسن فرماتے ہیں اگر انہیں محروم کیا جاتا ہے تو وہ عطا کرتے ہیں جب ان پر ظلم کیا جاتا ہے تو وہ درگزر کرتے ہیں۔ اگر ان کے ساتھ قطع رحمی کی جائے تو وہ صلہ رحمی کرتے ہیں (7) حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے ایک شخص نے عرض کی یا رسول اللہ! میرے رشتہ دار ہیں میں ان سے رشتہ جوڑتا ہوں وہ مجھ سے قطع تعلق کرتے ہیں اور میں ان سے بھلائی کرتا ہوں وہ مجھ سے برائی کرتے ہیں اور میں پھر بھی حلم کا مظاہرہ کرتا ہوں اور وہ مجھ پر جہالت کا برتاؤ کرتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر تو ایسا ہے جیسا تو کہہ رہا ہے تو گویا تو ان کے منہ میں خاک ڈال رہا ہے اور ہمیشہ ان کے خلاف اللہ تعالیٰ کی طرف سے تیرا ایک مددگار ہو گا جب

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 15 (التجاریۃ)　2۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 153 (صادر)　3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 15 (التجاریۃ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 15 (التجاریۃ)　5۔ کتاب الزہد از امام احمد، صفحہ 35　6۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 15 (التجاریۃ)
7۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 15 (التجاریۃ)

تک تو اس کیفیت پر رہے گا اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے[1]۔ عبداللہ بن مبارک فرماتے ہیں یہ آٹھ خصائل ہیں جو جنت کے آٹھ دروازوں کی طرف اشارہ کرتی ہیں[2]۔

ﮩ انہی لوگوں کے لئے دار آخرت کی راحتیں ہیں۔ العقبیٰ کسی امر کی جزاء کو کہتے ہیں عقبہ جازاہ یعنی اس نے اسکو جزاء دی۔ قاموس میں اسی طرح ہے۔ فعل کی جزاء کو عقبیٰ کہتے ہیں کیونکہ وہ فعل کے بعد ہوتی ہے لیکن العقبة العقبیٰ والعاقبة یہ ثواب اور نیکی پر اچھی جزاء کے ساتھ مختص ہیں۔ جیسا کہ عقوبۃ معاقبۃ اور عقاب، عذاب اور برائی پر بری جزاء کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ثواب کے متعلق فرمایا خیر ثوابا و خیر عقبا اور فرمایا اُولٰٓىِٕكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ۔ نعم عقبى الدار۔ والعاقبة للمتقين اور عذاب کے متعلق فرمایا فَحَقَّ عِقَابِ شَدِيْدُ الْعِقَابِ۔ وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ ۖ وَمَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوْقِبَ بِهٖ۔ لیکن اضافت کے ساتھ عاقبۃ عقوبۃ کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوا السُّوْٓاٰى۔ فَكَانَ عَاقِبَتَهُمَآ اَنَّهُمَا فِي النَّارِ۔ پس یہ استعمال یا تو اشتراک کی وجہ سے ہے یا اپنی ضد میں استعارۃ استعمال ہوا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ دار سے مراد آخرت کی رہائش گاہ ہے کیونکہ وہ مستقر یعنی حقیقی قرار کی جگہ ہے بخلاف دنیا کے اور یہ مسافر خانہ ہے اور فقط گزرگاہ ہے اور عقبیٰ کی دار کی طرف اضافت لغوی ہے جیسے مصارع مصر میں اضافت لغوی ہے۔ پس معنی یہ ہے کہ ان لوگوں کے لئے دار آخرت میں بہتر جزاء ہے۔ یہ جملہ موصولات کی خبر ہے اگر تو موصولات ابتداء کی وجہ سے مرفوع بنائے اور اگر ان صفات کو اولی الالباب کی صفات بنائے تو یہ ان صفات کے موجب کے ذکر کے لئے نیا کلام ہوگی۔

جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا وَ مَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآىِٕهِمْ وَ اَزْوَاجِهِمْ وَ ذُرِّيّٰتِهِمْ وَ الْمَلٰٓىِٕكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ﴿۲۳﴾

"(یعنی) سدا بہار باغات[1] جن میں وہ داخل ہوں گے اور جو صالح ہوں گے ان کے باپ دادوں، ان کی بیویوں اور ان کی اولاد سے (وہ بھی داخل ہوں گے)[2] اور فرشتے (یہ کہتے ہوئے) داخل ہوں گے ان پر ہر دروازہ سے۔"

[1] یہ عقبی الدار کا عطف بیان ہے یا مبتدا ہے اور اس کی خبر مابعد کلام ہے۔

[2] من معطوف ہے یدخلون کی ضمیر پر اور بصریوں کے نزدیک ضمیر منصوب کے فاصلہ کی وجہ سے عطف جائز ہے اور زجاج فرماتے ہیں یہ مفعول معہ ہے اور صلاح سے مراد نفس ایمان ہے، کمال صلاح مراد نہیں ہے جو والحقنی بالصالحین میں مراد ہے۔ عطف کا قرینہ اس بات کی دلیل ہے کیونکہ عطف مغائرت پر دلالت کرتا ہے۔ اگر صلاح سے مراد کمال صلاح ہو تو معطوف معطوف علیہ میں داخل ہو جائے گا۔ یہ آیت دلالت کرتی ہے اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کے آباؤ اجداد، بیویوں اور اولاد کو ان کاملین کے درجات پر فائز فرما دیتے ہیں، اگرچہ انہوں نے ان کاملین جیسے اعمال بھی نہ کئے ہوں بشرطیکہ ایمان کی پونجی موجود ہو اور یہ عنایت محض اپنے مقبول بندوں کے دلوں کو خوش کرنے اور ان کی عظمت شان کے اظہار کے لئے فرمائی جاتی ہے۔ صلاح کے ساتھ تقید کا یہ مفاد ہے کہ صرف نسب بغیر ایمان کے کچھ مفید اور نفع بخش نہیں ہے اور دلالۃ النص کی وجہ سے مائیں بھی آباء کے حکم میں داخل ہیں۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 315 (قدیمی) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 15 (التجاریۃ)

اس آیت کریمہ کے مفہوم کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا تضاد لازم آتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کُلُّ سَبَبٍ وَّ نَسَبٍ مُنْقَطِعٌ یَوْمَ الْقِیَامَةِ اِلَّا سَبَبِیْ وَنَسَبِیْ قیامت کے روز میرے سبب اور نسب کے بغیر تمام اسباب وانساب منقطع ہو جائیں گے۔ اس حدیث کو الطبرانی، حاکم اور البیہقی نے حضرت عمر سے صحیح روایت کیا ہے (1) اور طبرانی نے ابن عباس اور المسور بن مخرمہ سے روایت کی ہے۔ ابن عساکر نے ابن عمر سے سند صحیح کے ساتھ بایں الفاظ روایت کی ہے کُلُّ نَسَبٍ وَّ صِهْرٍ یَنْقَطِعُ اِلَّا نَسَبِیْ وَ صِهْرِیْ۔ یہ حدیث طیبہ دلالت کرتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کا تعلق اور رشتہ قیامت کے دن غیر مفید ہوگا۔ میرے نزدیک اس اشکال کا حل یہ ہے کہ مومنین تمام کے تمام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روحانی فرزند ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اَلنَّبِیُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَ اَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ ؕ ابی کی قرأت میں وھو اب لھم زائدہ ہے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا انما المومنون اخوۃ ہم نے سورۂ کوثر کی تفسیر میں ذکر کیا ہے کہ العاص بن وائل نے جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کہا کہ انہیں چھوڑ دو یہ ابتر ہے اس کا سلسلہ نسب ختم ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس کے متعلق فرمایا اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ اے محبوب آپ کا دشمن منقطع النسل ہے حالانکہ عاص بن وائل کے پیچھے دو بیٹے عمرو اور ہشام موجود تھے تو اس کی تاویل یہ ہے کہ عمرو اور ہشام نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ اس لئے عاص بن وائل اور اس کا رشتہ ختم ہو گیا تھا حتیٰ کہ وہ دونوں اس کے وارث بھی نہ بنے تھے۔ پس وہ دونوں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے روحانی فرزند بن گئے۔ پس حدیث کا مطلب بھی یہی ہے کہ ہر نسب اور سبب منقطع ہوگا سوائے میرے سبب اور نسب کے۔ اگر چہ واسطہ کے ساتھ ہو یا نسب کے ساتھ ہو یا میرے بیٹوں کے نسب سے ہو، اگر چہ بہت نیچے کے ہی ہوں اور میرا سبب اور جس کے لئے مجھ سے سبب ہو وہ تعلق بھی منقطع نہ ہوگا۔ گویا مراد یہ ہے کہ کفار کی دوستیاں اور تعلقات ختم ہو جائیں گے لیکن مومنوں کی دوستیاں اور قرابتیں ختم نہ ہوں گی۔ اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اَلْاَخِلَّآءُ یَوْمَىٕذٍۭ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِیْنَ گہرے دوست اس روز ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے بجز ان کے جو متقی اور (پرہیزگار) ہیں۔

3۔ فرشتے جنت کے دروازوں یا ان کے محلات کے دروازوں سے ابواب الفتوح والتحف سے ان پر داخل ہوں گے۔ مقاتل فرماتے ہیں دنیا کے دن رات کی مقدار کے وقت ان کے پاس تحائف لئے ہوئے تین مرتبہ آئیں گے یہ کہتے ہوئے سلام علیکم (2)۔

سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ؕ ﴿۲۴﴾

"سلامتی ہو تم پر بوجہ اس کے جو تم نے صبر کیا پس کیا عمدہ ہے یہ آخرت کا گھر"

1۔ یہ قول کی تقدیر کے ساتھ حال ہے۔ جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں ان آفات سے سلامت رکھے جن سے تم ڈرتے ہو اور جو اس نے تم پر انعام فرمایا ہے وہ تمہارے پاس ہمیشہ رہے۔

2۔ یہ علیکم کے متعلق ہے یا محذوف کے متعلق ہے، یعنی یہ ثواب تمہیں گناہوں سے اجتناب طاعات پر مداومت اور مصائب پر صبر کرنے کی وجہ سے دیا جا رہا ہے۔ یہ سلام کے متعلق نہیں ہے کیونکہ خبر فاصل ہے اور باء سببیت کے لئے ہے۔

3۔ کیا عمدہ ہے آخرت کا گھر۔ ابو امامہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں مومن جب جنت میں داخل ہوگا تو صوفہ پر متمکن ہوگا اور اس کے پاس خدمت کے لئے خادم ہوں گے اور وہ خدام دو قطاروں میں ہوں گے۔ دونوں قطاروں کے آخر میں ایک بند دروازہ ہوگا۔ دروازہ

1۔ مستدرک حاکم، جلد 3، صفحہ 142 (انصر الحدیث)　　2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 16 (التجاریۃ)

سے فرشتہ اندر آنے کی اجازت طلب کرے گا تو مومن اپنے قریبی خادم سے اور وہ خادم دوسرے خادم سے اور وہ اپنے قریب والے سے کہے گا اور یہ سلسلہ آخری خادم تک پہنچ جائے گا کہ فرشتہ اندر آنے کی اجازت چاہتا ہے تو دروازہ کے قریب والا خادم دروازہ کھول دے گا۔ فرشتہ اندر آ کر سلام کرے گا پھر واپس چلا جائے گا(1)۔

ابن عمر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں کہ فرمایا سب سے پہلے جنت میں اللہ تعالیٰ کی مخلوق مہاجرین کے فقراء جائیں گے(2)۔

ان میں سے کوئی ایک فوت ہوتا ہے اور اس کی حاجت اس کے دل میں ہوتی ہے وہ اسے پورا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا۔ اللہ اپنے فرشتوں میں سے جنہیں چاہے گا فرمائے گا میرے ان بندوں کے پاس جاؤ اور ان کو سلام پیش کرو۔ فرشتے عرض کریں اے ہمارے رب، ہم تیرے آسمان کے مکین ہیں اور تیری مخلوق سے تیرے نزدیک بہتر ہیں تو ہمیں ان لوگوں کو سلامی کا حکم فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا یہ میرے وہ بندے ہیں جو میری عبادت کرتے ہیں اور میرا کسی کو شریک نہیں ٹھہراتے تھے۔ ان کے ذریعے سرحدوں کا دفاع ہوتا تھا۔ اور ان سے کوئی وصال کرتا تھا اور اس کی حاجت اس کے دل میں ہوتی تھی اور یہ اسے پورا کرنے کی طاقت نہیں رکھتا تھا۔ فرمایا پس فرشتے امر الٰہی کی اطاعت کرتے ہوئے اس وقت ان کے پاس آئیں گے اور ان پر ہر دروازے سے سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ کہتے ہوئے داخل ہوں گے۔

وَ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَ يَقْطَعُوْنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ يُّوْصَلَ وَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۙ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَ لَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ ۝

"اور وہ لوگ جو توڑتے ہیں اللہ (سے کئے) وعدہ کو اسے پختہ کرنے کے بعد [1] اور کاٹتے ہیں ان رشتوں کو جن کے متعلق حکم دیا گیا ہے اللہ تعالیٰ نے کہ انہیں جوڑا جائے [2] اور (فتنہ) فساد برپا کرتے ہیں زمین میں [3] یہی لوگ ہیں جن پر لعنت کی ہے اور ان کے لئے برا گھر ہے۔ [4]"

[1] اور وہ لوگ جو پہلے خوش نصیبوں کے مقابل ہیں جو اللہ کے ساتھ اقرار و قبول کا پختہ عہد کرنے کے بعد اسے توڑتے ہیں۔

[2] یعنی وہ بعض کتاب پر ایمان لاتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں۔ اللہ اور اس کے رسول کے درمیان جدائی کرتے ہیں اور رشتوں کو توڑتے ہیں۔

[3] برے اعمال کرتے ہیں کھیتیوں کو تباہ کرتے ہیں۔ نسلوں کو اجاڑتے ہیں۔ راستوں کو کاٹتے ہیں اور حق کے علاوہ کی تلاش کرتے ہیں۔ ابی بکرہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں، فرمایا بغاوت اور قطع رحمی سے زیادہ کوئی گناہ نہیں ہے جس کی سزا اس کے کرنے والے کو دنیا میں اللہ تعالیٰ جلدی دے اور اس کے ساتھ اس کے لئے آخرت میں ذخیرہ بھی کیا جاتا ہے(3)۔ اس حدیث کو احمد اور البخاری نے الادب میں ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ اور ابن حاکم اور ابن حبان نے روایت کیا ہے۔ حضرت جبیر بن مطعم سے روایت ہے، فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ قطع رحمی (تعلق) کرنے والا جنت میں داخل نہ ہوگا۔ متفق علیہ(4)۔ عبداللہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 16 (التجاریۃ)
2۔ مسند احمد، جلد 2، صفحہ 117 (صادر)
3۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 74 (وزارت تعلیم)
4۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 885 (وزارت تعلیم)

بن ابی اوفی فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ اس قوم پر اللہ تعالیٰ کی رحمت نازل نہیں ہوتی جس میں قطع رحمی کرنے والا ہوتا ہے۔ اس حدیث کو بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے(1)۔ عبداللہ بن عمرو سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا احسان جتلانے والا، والدین کی نافرمانی کرنے والا، ہمیشہ شراب میں دھت رہنے والا جنت میں داخل نہ ہوگا۔ اس حدیث کو نسائی اور دارمی نے روایت کیا ہے(2)۔

۴ یہی لوگ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور ہیں اور ان کے لئے آخرت میں بری جزاء ہے اور وہ جہنم کی آگ ہے۔

اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يَقْدِرُ ؕ وَ فَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ وَ مَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ ﴿۲۶﴾

"اللہ تعالیٰ کشادہ روزی دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور تنگ روزی دیتا ہے (جسے چاہتا ہے) ۱ اور کفار بڑے مسرور ہیں دنیوی زندگی (کی راحتوں) سے ۲ اور (حقیقت یہ ہے کہ) نہیں ہے دنیوی زندگی آخرت کے مقابلہ میں مگر متاع حقیر ۳"

۱ اللہ تعالیٰ کشادہ روزی دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور تنگ روزی دیتا ہے (جسے چاہتا ہے)۔

۲ یعنی اہل مکہ بڑے خوش اور اترائے ہوئے ہیں دنیوی زندگی کی کشادہ روزی پر اور دوسری نعمتوں پر اور شکر ادا نہیں کرتے۔

۳ اور دنیوی زندگی آخرت کے مقابلہ میں کچھ نہیں ہے مگر لطف اندوز ہونا جس کو دوام نہیں ہے جیسے سوار کا عجالہ اور چرواہے کا زاد۔ دنیا کی نعمتیں ایسی نہیں ہیں کہ انسان ان پر ہی قانع ہو جائے اور آخرت کے لئے سعی ترک کر دے اور اسی پر خوش و خرم رہے اور اتراتا پھرے بلکہ اس دنیوی زندگی کے مال و متاع کو ان راستوں میں صرف کرے جو آخرت کی نعمت کا موجب ہیں۔

وَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْۤ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ ﴿۲۷﴾

"اور کفار کہتے ہیں کہ اگر (یہ سچے نبی ہیں) تو کیوں نہ اتاری گئی ان پر کوئی نشانی ان کے رب کی طرف سے ۱ آپ فرمایئے (نشانیاں تو بہت ہیں) لیکن اللہ تعالیٰ گمراہ کرتا ہے جسے چاہتا ہے ۲ اور راہنمائی فرماتا ہے اپنی (بارگاہ کی) طرف جو صدق دل سے رجوع کرتا ہے۔ ۳"

۱ آیات قطعیہ اور معجزات قاہرہ کو دیکھنے کے بعد کافر کہتے ہیں کیوں نہ اتاری گئی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر کوئی نشانی ان کے رب کی طرف سے جو اس کی صداقت کی شہادت دے یعنی کفار نے عناد اور ہٹ دھرمی کی بناء پر نئے معجزات و علامات کی فرمائش کی۔

۲ آپ فرمایئے آیات کے نزول اور شواہد کے قیام کی تو کوئی کمی نہیں ہے لیکن آیات ہدایت کا موجب نہیں بنتی کیونکہ ہدایت اور گمراہی اللہ تعالیٰ کے دست قدرت میں ہے، جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے، ان میں سے جو تمہاری صفات سے متصف ہوتا ہے پس ان کی ہدایت کا کوئی راستہ نہیں ہے، اگرچہ ان کی فرمائش کے مطابق ہر آیت و نشانی نازل کی جائے۔

۳ اور وہ راہنمائی فرماتا ہے ایمان و طاعت اور اپنے مدارج قرب یا اپنی جنت کی طرف اس کی جو صدق دل سے اس کی طرف رجوع

1۔ شعب الایمان، جلد 6، صفحہ 223 (العلمیہ)　2۔ سنن نسائی، جلد 8، صفحہ 318 (وزارت تعلیم)

کرتا ہے۔ یعنی جس کو اللہ تعالیٰ لوٹانا چاہتا ہے تو وہ صدق دل کے ساتھ اس کی طرف لوٹ آتا ہے اور عناد و ہٹ دھرمی چھوڑ دیتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ اس کی راہنمائی فرماتا ہے اس کے ذریعے جو میں لے کر آیا بلکہ اسکے ذریعے نشانیوں میں سے اس سے بھی کم ہے۔

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ تَطْمَىِٕنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ؕ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ ؕ﴿۲۸﴾

”جو لوگ ایمان لائے [1] اور مطمئن ہوتے ہیں جن کے دل ذکر الٰہی سے [2] دھیان سے سنو! اللہ تعالیٰ کی یاد سے ہی دل مطمئن ہوتے ہیں [3]“

[1] یہ من اناب سے بدل ہے یا مبتدا محذوف کی خبر ہے۔

[2] اور ان کے دلوں میں ایمان یقین راسخ ہوتا ہے اور شکوک و شبہات کے اندھیرے زائل ہو چکے ہوتے ہیں اور ذکر الٰہی یعنی قرآن سے مطمئن ہوتے ہیں کیونکہ ایمان طمانیت ہے اور نفاق شک و ریب ہے یا یہ معنی کہ اللہ کے ذکر سے مومنین کے دلوں سے شیطان کے وساوس زائل ہوتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کوئی شخص ایسا نہیں مگر اس کے دل میں دو گھر ہوتے ہیں، ایک میں فرشتہ ہوتا ہے اور دوسرے میں شیطان ہوتا ہے۔ جب وہ انسان اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے تو شیطان پیچھے چلا جاتا ہے۔ جب انسان ذکر نہیں کرتا تو شیطان اپنی چونچ اس کے دل پر مارتا ہے اور اس میں وسواس پیدا کرتا ہے۔ اس حدیث کو ابن ابی شیبہ نے المصنف میں عبد اللہ بن شقیق سے روایت کیا ہے۔ امام بخاری نے تعلیقاً ابن عباس سے بایں الفاظ مرفوع ذکر کی ہے اَلشَّيْطَانُ جَاثِمٌ عَلٰى قَلْبِ ابْنِ آدَمَ فَإِذَا ذَكَرَ اللّٰهَ خَنَسَ وَإِذَا غَفَلَ وَسْوَسَ یعنی ابن آدم کے دل پر شیطان بیٹھا ہوا ہے جب وہ اللہ کا ذکر کرتا ہے تو شیطان پیچھے ہٹ جاتا ہے اور جب وہ غافل ہو جاتا ہے تو شیطان وسوسہ اندازی کرتا ہے۔

یا یہ معنی ہے کہ مومنین کے صاف دلوں کی خوراک اللہ تعالیٰ کا ذکر ہوتا ہے۔ جب وہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ سے اس کی وجہ سے انکے دل اس طرح مطمئن ہوتے ہیں جیسے مچھلی پانی میں مطمئن ہوتی ہے اور خشکی کا جانور فضا میں اور وحشی صحرا میں مطمئن ہوتا ہے اور جب ان پر کوئی ایسی کیفیت وارد ہوتی ہے جو غفلت کا موجب ہوتی ہے، یا وہ اہل غفلت کی صحبت کی وجہ سے ابتلاء کا شکار ہوتے ہیں تو وہ یوں مضطرب اور پریشان ہوتے ہیں جیسے مچھلی خشکی میں بری حیوان پانی میں اور وحشی پنجرے میں مضطرب ہوتا ہے۔ صوفیاء رحمہم اللہ کے خدام کیلئے یہ حالت بدیہی بھی وجدانیات سے ہے۔ پس اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ تَطْمَىِٕنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ سے مراد صوفیائے کرام ہیں۔

(3) یہ قلوب سے مراد قلوب مذکیہ ہیں، یعنی پاکیزہ دل امام۔ بغوی فرماتے ہیں اگر یہ کہا جائے کہ کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ صرف وہی سچے ایمان دار ہیں کہ جب ذکر کیا جاتا ہے اللہ تعالیٰ کا تو کانپ اٹھتے ہیں ان کے دل تو پھر طمانیت اور وجل ایک حالت میں کیسے ہو سکتے ہیں؟ تو یہ کہا جائے گا کہ وعید عقاب کے ذکر کے وقت ان کے دل کانپتے ہیں اور وعدہ ثواب کے ذکر کے وقت ان کے دل سکون پاتے ہیں۔ پس دل کانپتا ہے جب اللہ تعالیٰ کے عدل اور شدت حساب کا ذکر ہوتا ہے اور دل قرار پاتا ہے جب اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کے کرم کا ذکر ہوتا ہے(1)۔ یہ کلام طمانیت اور وجل کے درمیان منافات کا تقاضا کرتی ہے۔ اور میرے نزدیک ان دونوں کے درمیان کوئی منافات نہیں ہے کیونکہ طمانیت اس پر مبنی ہے اور یہ وجل (خوف) کے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 17 (التجاریہ)

ساتھ جمع ہوتی ہے۔اسی طرح خوف اور امید ایک حالت میں جمع ہوتے ہیں۔حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے،فرمایا نبی کریم ﷺ ایک نوجوان کے پاس تشریف لے گئے جو موت کے قریب تھا۔آپ ﷺ نے اس سے پوچھا تیری کیا کیفیت ہے۔عرض کی یارسول اللہ!اللہ تعالیٰ سے امید رکھتا ہوں اور اپنے گناہوں سے ڈر بھی رہا ہوں۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کسی دل میں ایسی حالت میں دو کیفیتیں جمع نہیں ہوتیں مگر اللہ تعالیٰ اسے عطا فرماتا ہے جس کی وہ امید رکھتا ہے اور اسے امن دیتا ہے اس سے جس سے وہ خوفزدہ ہوتا ہے۔اس حدیث کو ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور ترمذی فرماتے ہیں یہ حدیث غریب ہے(1)۔

اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوۡبٰی لَہُمۡ وَ حُسۡنُ مَاٰبٍ ﴿۲۹﴾

"وہ لوگ جو ایمان بھی لائے اور عمل بھی نیک کئے مژدہ ہو ان کے لئے اور (انہی) کیلئے انجام اچھا ہے۔۱"

۱۔ طوبیٰ یہ طیب سے فعلی کا وزن ہے اور طاب یطیب کا مصدر ہے جیسے بشریٰ اور زلفی اور اس کی یاء کو واؤ بدلا گیا ہے کیونکہ اس کا قبل ضمہ ہے اور ترکیبی محل رفع یا نصب ہے جیسے طیبا لک وطیب لک۔ وسلاما علیک و سلام علیک۔اور لہم میں لام بیانیہ ہے جیسے سقیا لک اور ابن عباس کے قول پر اس کا معنی ہے کہ ان کے لئے دل کی خوشی اور آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔عکرمہ فرماتے ہیں اس کا معنی ہے انکا انجام اچھا ہے(2)۔قتادہ فرماتے ہیں ان کے لئے بھلائی ہے(3)۔حضرت معمر قتادہ سے روایت کرتے ہیں جب تجھے کوئی بھلائی پہنچے تو کوئی تجھے کہتا ہے طوبیٰ لک(4)۔ابراہیم فرماتے ہیں ان کے لئے بھلائی اور کرامت ہے(5)۔سعید بن جبیر فرماتے طوبیٰ حبشی زبان میں جنت کا نام ہے(6)۔امام بغوی فرماتے ہیں حضرت ابی امامہ حضرت ابو ہریرہ اور ابو الدرداء رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ طوبیٰ جنت میں ایک درخت ہے جو تمام جنتوں پر سایہ کرتا ہے اس کی جڑ نبی کریم ﷺ کے گھر میں ہوگی اور اس کی ایک ایک ٹہنی ہر گھر اور کمرہ میں ہوگی۔اللہ تعالیٰ نے کوئی رنگ اور کوئی پھول ایسا پیدا نہیں فرمایا مگر اس میں اس درخت کا کچھ حصہ ہے سوائے سواد کے (کالے رنگ کے) اور اللہ تعالیٰ نے کوئی پھل ان میں ایسا پیدا نہیں فرمایا مگر اس میں اس کا کچھ حصہ ہے اس کی جڑ سے کافور اور سلسبیل کے دو چشمے پھوٹتے ہیں(7)۔مقاتل فرماتے ہیں اس کا ہر پتہ ایک امت پر سایہ کرے گا۔اس پر ایک فرشتہ ہے جو اللہ کی مختلف انداز میں تسبیح کرتا ہے(8)۔احمد،ابن حبان،الطبرانی،ابن مردویہ اور البیہقی عتبہ بن عبداللہ السلمی سے روایت کرتے ہیں،فرمایا ایک اعرابی نے عرض کی یارسول اللہ!جنت میں پھل ہیں؟فرمایا ہاں اس میں ایک طوبیٰ کا درخت ہے جو فردوس کے مطابق ہے۔پوچھا حضور ہماری زمین کا کونسا درخت اس کے مشابہ ہے،فرمایا تمہاری زمین کا کوئی درخت اس کے مشابہ نہیں لیکن کیا تو شام گیا ہے۔اس نے کہا نہیں فرمایا وہ شام کے ایک درخت کے مشابہ ہے جسے جوزہ (اخروٹ) کہا جاتا ہے،ایک کونپل پر اگتا ہے،پھر اوپر کو پھیلتا جاتا ہے۔اس نے پوچھا اس کے تنے کی موٹائی کتنی تھی؟فرمایا اگر تو اپنے گھر والوں کے اونٹوں کا ریوڑ لے کر تنا کے اردگرد چکر لگائے تو تو بوڑھا ہو کر گر جائے گا لیکن اس درخت کے تنا کا چکر پورا نہ ہوگا۔سائل نے عرض کیا کیا اس میں انگور بھی ہوں گے؟فرمایا ہاں۔پھر اس نے پوچھا ان کا خوشہ کتنا ہوگا؟فرمایا چت کبرے کوے کی ایک ماہ کی اڑان کی مسافت کے برابر ہوگا۔پھر اس نے عرض کی اس کا دانہ کتنا ہوگا؟فرمایا تیرے باپ نے کبھی کوئی بڑا بکرہ ذبح کیا ہے؟عرض کی جی ہاں۔فرمایا کیا اس کی کھال اتار کر تیری ماں کو دے کر یہ کہا تھا کہ اس کی دباغت کرکے ڈول بنا لینا جس میں

1۔جامع ترمذی،جلد 1،صفحہ 117 (وزارت تعلیم)
2۔تفسیر بغوی،جلد 4،صفحہ 17 (التجاریہ)
3۔تفسیر بغوی،جلد 4،صفحہ 17 (التجاریہ)
4۔تفسیر بغوی،جلد 4،صفحہ 17 (التجاریہ)
5۔تفسیر بغوی،جلد 4،صفحہ 17 (التجاریہ)
6۔تفسیر بغوی،جلد 4،صفحہ 18 (التجاریہ)
7۔تفسیر بغوی،جلد 4،صفحہ 18 (التجاریہ)
8۔تفسیر بغوی،جلد 4،صفحہ 18 (التجاریہ)

ہم پانی بھر کر جانوروں کو پلائیں گے۔ اس نے عرض کی یعنی اس کا ایک دانہ میرے اور میرے گھر والوں کا پیٹ بھر دے گا فرمایا ہاں (1)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا طوبیٰ کیا ہے؟ فرمایا جنت میں ایک درخت ہے جس کی مسافت سو سال ہے۔ ایک جنت کے کپڑے اس کے شگوفوں سے نکلیں گے۔ اس حدیث کو ابن حبان نے روایت کیا ہے (2)۔ معاویہ بن قرۃ اپنے باپ سے مرفوعاً روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا طوبیٰ ایک درخت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے دست قدرت سے لگایا ہے اور اس میں اپنی روح پھونکی ہے۔ اس سے زیور اور لباس پیدا ہوتے ہیں۔ اس کی ٹہنیاں جنت کی دیوار کے پیچھے نظر آتی ہیں (3)۔ امام بغوی اپنی سند سے حضرت ابو ہریرہ سے روایت فرماتے ہیں جنت میں ایک درخت ہے جس کے سائے میں ایک سوار 100 سو سال چلے تو تب بھی اس کا سایہ ختم نہ ہوگا۔ اگر تم چاہو تو یہ پڑھو وَّظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ متفق علیہ (4)۔ امام احمد نے بھی نقل کی ہے اور اس کے آخر میں یہ زائد ہے کہ اس کا پتہ جنت کو ڈھانپ لیتا ہے۔ امام بغوی اور ہناد بن سری نے الزہد میں ذکر کی ہے اور اس کے آخر میں یہ خبر کعب کو پہنچی۔ تو انہوں نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس نے موسیٰ علیہ السلام پر تورات اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن نازل کیا ہے اس نے سچ کہا ہے، اگر کوئی شخص چار یا پانچ سالہ اونٹ پر سوار ہو کر اس کے تنے کے ارد گرد اسے گھمائے تو وہ اس کا احاطہ نہیں کر سکے گا یہاں تک کہ وہ بوڑھا ہو کر گر جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے ہاتھ سے لگایا ہے اور اس میں اپنی روح پھونکی ہے اور اس کی ٹہنیاں جنت کی دیوار کے پیچھے جو اس تک پہنچتی ہیں۔ جنت میں کوئی ایسی نہر نہیں مگر وہ اس درخت کی جڑ سے نکلتی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے، فرمایا جنت میں ایک درخت ہے جسے طوبیٰ کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو فرماتا ہے میرے بندے کے لئے وہ نکال جو وہ چاہتا ہے۔ پس وہ چاہتا ہے تو وہ اس کے لئے گھوڑا اس کی زین لگام نکالتا ہے اور اس کی ہیئت وہی ہوتی جیسے وہ چاہتا ہے وہ اس کے لئے اونٹ کے کجاوے اور مہار کے ساتھ نکالتا ہے۔ جیسے وہ چاہتا ہے اور کپڑے نکالتا ہے اس حدیث کو ابن ابی الدنیا اور البغوی نے روایت کیا ہے۔ ابن المبارک اور ابن جریر نے شہر بن حوشب سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں طوبیٰ جنت میں ایک درخت ہے۔ جنت کا ہر درخت اس کی ٹہنیوں سے ہے خواہ وہ جنت کی دیوار کے پیچھے ہے (5)۔

كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ فِيْٓ اُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَآ اُمَمٌ لِّتَتْلُوَا۟ عَلَيْهِمُ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَهُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ ۭ قُلْ هُوَ رَبِّيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ مَتَابِ ﴿۳۰﴾

"اسی طرح ہم نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا ایک قوم میں جس سے پہلے گذر چکی ہیں کئی قومیں تا کہ آپ پڑھ کر سنائیں انہیں وہ (کلام) جو ہم نے آپ کی طرف وحی کیا[1] اور یہ کفار انکار کر رہے ہیں رحمٰن کا فرمایئے وہی میرا پروردگار ہے نہیں کوئی معبود بجز اس کے اسی پر ہی میں نے بھروسہ کر رکھا ہے اور اسی کی جناب میں رجوع کئے ہوں۔[2]"

[1] جس طرح ہم نے تجھ سے پہلے رسول بھیجے ہیں اے پیارے محمد (ﷺ) ہم نے تجھے بھی بھیجا ہے ایک ایسی امت میں جس سے پہلے گذر چکی ہیں کئی امتیں۔ ان کی طرف بھی رسول بھیجے گئے تھے کہ آپ کو بھیجنا کوئی انوکھا امر نہیں ہے۔ تا کہ آپ پڑھ کر سنائیں انہیں

1۔ الدرالمنثور، جلد 4، صفحہ 111 (العلمیۃ)　2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 18 (التجاریۃ)　3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 18 (التجاریۃ)

4۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 461 (وزارت تعلیم)، صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 378 (قدیمی)　5۔ الدرالمنثور، جلد 4، صفحہ 113 (العلمیۃ)

وہ قرآن جو ہم نے آپ کی طرف وحی کیا اور ان کی حالت یہ ہے کہ وہ اس رحمٰن کا انکار کرتے ہیں جس کی رحمت ان کا احاطہ کئے ہوئے ہے اور اس کی رحمت ہر شے پر وسیع ہے۔ یہ اس کی نعمتوں کا شکر نہیں کرتے، خصوصاً جو اس نے آپ کو ان کی طرف بھیج کر اور قرآن نازل فرما کر رحمت فرمائی ہے اس کا شکر ادا نہیں کرتے۔ یہ قرآن وہ رحمت ہے جو ان کے دنیوی اور دینی منافع کا مدار ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں کہ قتادہ، مقاتل اور ابن جریج فرماتے ہیں۔ یہ آیت صلح الحدیبیہ کے موقع پر نازل ہوئی (1)۔ اسی طرح ابن جریر، ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے قتادہ سے نقل کی ہے۔ یہ اس طرح ہوا کہ سہل بن عمرو جب آیا اور تمام صلح نامہ لکھنے پر متفق ہونے جیسا کہ ہم نے سورۂ فتح میں پورا واقعہ ذکر کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی کو فرمایا لکھو بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ تو کافر کہتے ہم تو رحمٰن کو نہیں جانتے ہاں وہ صاحب یمامہ ہے۔ اس سے ان کی مراد مسیلمہ الکذاب تھا۔ فرمایا لکھو جیسے تم پہلے لکھتے ہو باسمک اللھم ھم یکفرون بالرحمن کا یہی معنی ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں معروف یہ ہے کہ یہ آیت مکیہ ہے اور اس کے نزول کا سبب یہ ہے کہ ابوجہل نے حضور ﷺ کو حجر میں کھڑے ہو کر یا اللہ یا رحمٰن کے الفاظ سے دعا مانگتے ہوئے سنا تو وہ مشرکین کے پاس آیا اور کہا اب محمد نے دو خداؤں کو پکارنا شروع کر دیا ہے، وہ اللہ کو پکارتا ہے اور رحمٰن کو پکارتا ہے، ہم تو رحمٰن الیمامہ (مسیلمہ کذاب) کے سوا کسی رحمٰن کو نہیں پہچانتے تو یہ آیت کریمہ اور قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۚ کی آیت نازل ہوئی (2)۔

ے اے پیارے محمد فرمائیے وہ رحمٰن جس کی معرفت کے تم منکر ہو وہی میرا خالق اور میرا کارساز ہے، کوئی عبادت کا مستحق نہیں سوائے اس کے، مجھے اس پر بھروسہ ہے کہ وہ تمہارے خلاف میری نصرت فرمائے گا، میری توبہ اس کی جناب میں ہے۔ یا یہ معنی کہ میرا مرجع وہی ہے مجھے ثواب عطا فرمائے گا۔ یعقوب نے دونوں حالتوں میں متابی، عقابی مابی یاء کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء یاء کو حذف کرتے ہیں۔ الطبرانی وغیرہ نے ابن عباس سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں کفار نے نبی کریم ﷺ سے فرمایا اگر جو تم کہتے ہو وہ حقیقت ہے تو ہمیں اپنے مردہ زندہ کر کے دکھائیے کہ ہم ان سے کلام کریں اور یہ مکہ کے پہاڑ ہمارے لئے ہموار زمین بن جائیں تو اس کے جواب میں یہ آیت کریمہ نازل فرمائی (3)۔

وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ اَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْاَرْضُ اَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتٰى ؕ بَلْ لِّلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِيْعًا ؕ اَفَلَمْ يَايْـَٔسِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَهَدَى النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا تُصِيْبُهُمْ بِمَا صَنَعُوْا قَارِعَةٌ اَوْ تَحُلُّ قَرِيْبًا مِّنْ دَارِهِمْ حَتّٰى يَاْتِيَ وَعْدُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ﴿۳۱﴾

"اور اگر کوئی ایسا قرآن اترتا جس کے ذریعے پہاڑ چلنے لگتے ۱؎ یا اس کے اثر سے پھٹ جاتی زمین ۲؎ یا مردوں کے ذریعے بات کی جا سکتی ۳؎ (یہ قدرت سے بعید نہ تھا) بلکہ سب کام اللہ کے اختیار میں ہیں ۴؎ (بایں ہمہ وہ ایمان نہ لاتے) کیا نہیں جانتے ایمان والے ۵؎ کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا ۶؎ تو سب لوگوں کو ہدایت دے دیتا ۷؎ اور کفار اس حالت میں رہیں گے پہنچتا رہے گا انہیں آئے دن اپنی کرتوتوں کی وجہ سے کوئی نہ کوئی صدمہ ۸؎ یا اترتی رہے گی کوئی نہ کوئی مصیبت ان کے گھروں کے گردونواح میں ۹؎ یہاں تک کہ آ جائے اللہ کے وعدہ (کے ظہور کا دن) ۱۰؎ بے شک

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 18 (التجاریہ)　2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 18 (التجاریہ)　3۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 116 (العلمیہ)

اللہ تعالیٰ وعدہ خلافی نہیں کرتا!!“

1۔ اور اگر کوئی ایسا قرآن اترتا جس کے ذریعہ سے پہاڑ چلنے لگتے۔ ابن ابی حاتم، ابن مردویہ نے عطیہ العوفی سے نقل کیا ہے، فرمایا کفار نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مطالبہ کیا کہ اگر مکہ کے پہاڑ دور ہٹ جائیں یہاں تک کہ فضا کھل جائے اور ہماری کھیتی باڑی کے لئے زمین فراخ ہو جائے اور آپ ہمارے لئے زمین کو ہوا کے ذریعے طے کریں جیسے سلیمان علیہ السلام اپنی قوم کے لئے ہوا کے دوش پر سفر کرتے تھے اور آپ ہمارے لئے بھی مردے زندہ کریں جیسے عیسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کے لئے مردہ زندہ کرتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی(1)۔ امام بغوی نے تفصیل سے لکھا ہے کہ یہ آیت مشرکین مکہ کی ایک جماعت کے متعلق نازل ہوئی جن میں ابو جہل بن ہشام عبد اللہ بن امیہ وغیرہ شامل تھے۔ وہ کعبہ کے پیچھے بیٹھے ہوئے تھے تو انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بلایا عبد اللہ بن امیہ کہنے لگا اگر آپ کو پسند ہے کہ آپ کی اتباع کریں تو قرآن کے ذریعے یہ مکہ کے پہاڑ چلا دیجئے حتیٰ کہ زمین فراخ ہو جائے کیونکہ ہماری کھیتی باڑی کے لئے زمین تنگ ہے اور اس نہر میں پانی کے چشمے اور نہریں جاری ہو جائیں تاکہ ہم درخت لگائیں اور کھیتی باڑی کریں اور باغات لگائیں جیسا کہ آپ کہتے ہیں اپنے رب کے نزدیک داؤد علیہ السلام سے کم مرتبہ نہیں، ان کے لئے پہاڑ مسخر تھے اور وہ آپ کے ساتھ تسبیح کیا کرتے تھے یا ہمارے لئے ہوا کو مسخر کیجئے کہ ہم اس پر سوار ہو کر شام کی طرف تجارت اور ضروریات کے لئے سفر کیا کریں اور اسی دن واپس آ جائیں اور ہوا سلیمان علیہ السلام کے لئے مسخر تھی جیسا کہ آپ کا خیال ہے اور آپ حضرت سلیمان سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک کم مرتبہ نہیں ہیں اور ہمارے لئے اپنے دادا قصی کو زندہ کر دیجئے یا ہمارے مردوں میں سے جس کو چاہتے ہیں زندہ کر دیجئے تاکہ ہم اپنے معاملہ میں ان سے دریافت کریں کہ یہ حق ہے یا باطل کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام مردوں کو زندہ کرتے تھے اور آپ عیسیٰ علیہ السلام سے کم مرتبہ نہیں ہیں۔ ان کی یہ فرمائشیں سن کر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی(2)۔

ابو یعلی نے اپنی مسند میں اسی کے ہم معنی زبیر بن العوام کی حدیث نقل کی ہے، یعنی اگر یہ قرآن کتب سماویہ سے ہوتا تو اس کے ساتھ پہاڑ اپنی جگہ سے دور ہو جاتے۔

2۔ یا چلنے کے لئے زمین اس کے ذریعے طے کی جاتی اس طرح کہ اللہ تعالیٰ ہوا کو مسخر کرتا، وہ اس کی دوش پر سوار ہو جاتے اور زمین کی مسافت کو طے کرتے، یا یہ معنی کہ زمین پھٹ جاتی اور اس میں نہریں اور چشمے رواں ہو جاتے۔

3۔ یعنی اس کے ذریعے مردے زندہ ہوتے یہاں تک کہ کلام کرتے کلم کی تذکیر اس لئے ہے کہ مردے مذکر حقیقی پر مشتمل ہیں بلکہ موتی سے مراد قصی اور اس جیسے شیوخ تھے۔ جواب شرط محذوف ہے لَكَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ۔ قرآن میں غایت اعجاز موجود ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے ایسا مقدر نہیں فرمایا یا یہ جزاء محذوف ہے لَمَا اٰمَنُوْا۔ ایک دوسری آیت میں یہ مفہوم ثابت ہے وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَاۤ اِلَیْهِمُ الْمَلٰٓىِٕكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَیْهِمْ كُلَّ شَیْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِیُؤْمِنُوْۤا۔ اور اگر ہم اتارتے ان کی طرف فرشتے اور باتیں کرنے لگتے ان سے مردے (قبروں سے اٹھ کر) اور ہم جمع کر دیتے ہر چیز کو ان کے روبرو تب بھی وہ ایمان نہ لاتے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس شرط کا جواب هم يكفرون بالرحمن مقدم ہے اور ان کے درمیان جو کلام ہے وہ جملہ معترضہ ہے۔ گویا یوں ارشاد ہے اگر پہاڑ بھی اس کے ساتھ چلائے جاتے تو پھر بھی یہ رحمن کا انکار کرتے اور ایمان نہ لاتے۔ کیونکہ ہم نے ان کی شقاوت لکھ دی ہے اور ان کے تعین کا مبدء الاسم المضل کا ظل ہے۔ پس انہیں ہدایت کیسے مل سکتی ہے۔

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 117 (العلمیۃ)

2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 19 (التجاریۃ)

ے بلکہ سب کام اللہ کے اختیار میں ہیں۔ یہ کلام مقدر سے اضراب ہے جس پر پہاڑوں کے چلاتے زمین کے قطع کرنے اور مردوں کے کلام کرنے کی نفی جو لو کے معنی میں ہے وہ دلالت کر رہی ہے۔ تقدیر کلام کا مطلب یہ ہے کہ ان تمام امور کی نفی کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی یہ قدرت میں نہیں ہیں بلکہ اللہ تو سب امور کا مختار ہے جو یہ فرمائشیں اور مطالبات کر رہے ہیں اور اس کے علاوہ جو امور ہیں ان سب پر وہ قادر ہے مگر اس کا ارادہ ان کے متعلق نہیں ہوا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ یہ ایمان نہیں لائیں گے، اگر چہ دیکھ لیں ہر نشانی حتیٰ کہ دیکھ لیں دردناک عذاب کو، یا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایت کا ارادہ نہیں فرمایا۔ امام بغوی فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام نے مشرکین کے یہ مطالبات سنے تو وہ تمنا کرنے لگے کہ اللہ تعالیٰ ان کے مطالبات پورے فرما دے تا کہ یہ ایمان لے آئیں تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی(1)۔

ے البزی نے یاء کے فتحہ کے ساتھ بغیر ہمزہ کے پڑھا ہے، یعنی کیا ایماندار ان کے ایمان سے مایوس نہیں ہوئے کہ اب بھی ان کے ایمان لانے کی خواہش کر رہے ہیں جبکہ ان کی ہٹ دھرمی اور عناد کو دیکھ چکے ہیں ان کفار نے پہلے بڑے بڑے معجزات دیکھے لیکن ایمان نہ لائے کیا آپ نے دیکھا نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی انگلی کے اشارہ سے چاند کا کلیجہ شق ہونا پہاڑوں کو چلانے اور زمین کو پھاڑنے سے بڑا معجزہ ہے کنکریوں کا کلام کرنا مردوں کے کلام کرنے سے بڑا معجزہ ہے اس کے علاوہ بڑے بڑے معجزات انہوں نے اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھے مگر یہ ایمان نہ لائے پس اب تم ان کے ایمان کی خواہش نہ کرو۔

ے ان مخففہ من الثقیلہ ہے اصل میں انہ ہے لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ یہ محذوف کلام کے متعلق ہے تقدیر عبارت یوں ہے اَفَلَمْ يَايْـَٔسِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْ اِيْمَانِهِمْ عِلْمًا مِّنْهُمْ اَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ کیا ایمان لانے والے ان کے ایمان سے مایوس نہیں ہوئے جبکہ انہیں علم ہے کہ اگر اللہ چاہتا تو۔

ے یا یہ امنوا کے متعلق ہے اور ان مصدریہ ہے، یعنی جو ایمان لاتے ہیں کہ اگر اللہ چاہتا تو سب لوگوں کو ہدایت دے دیتا۔ اکثر مفسرین نے افلم یا یئس کا معنی افلم یعلم معنی کیا ہے نہیں جانتے۔ الکلبی کہتے ہیں یہ انخع کی لغت ہے(2) اور بعض فرماتے ہیں یہ ہوازن کی لغت ہے۔ فراء نے علم کے معنی میں ہونے سے انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ کسی نے کسی عرب سے یئست بمعنی علمت نہیں سنا ہے اور یہ کہنا ممکن ہے کہ ایاس بمعنی علم مجازاً استعمال ہوا ہو کہ یہ علم کا مسبب ہے کیونکہ مایوس عنہ معلوم ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے اس کو اَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ سے معلق کیا ہے، یعنی اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تمام لوگوں کو ہدایت دیتا۔ اس قول کا سبب وہ روایت ہے جو ابن جریر نے حضرت علی سے اور ابو عبیدہ، سعید بن منصور اور ابن المنذر نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ یہ دونوں حضرات اَفَلَمْ يَتَبَيَّنِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَهَدَى النَّاسَ جَمِيْعًا پڑھتے تھے۔ گویا یہ افلم یا یئسوا کی تفسیر ہے(3) واللہ اعلم۔

ے اور کفار ہمیشہ اس حالت میں رہیں گے کہ انہیں اپنے کفر اور بد کرتوتوں کی وجہ سے پہنچتا رہے گا کوئی صدمہ، یعنی کبھی قحط سے کبھی سلب سے اور کبھی قتل وقید کی مصیبتوں میں گرفتار ہوں گے۔ ابن عباس فرماتے ہیں قَارِعَةٌ سے مراد وہ لشکر ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی طرف بھیجتے تھے۔

ے یا ان لشکروں وغیرہ کی مصیبت اترتی رہے گی۔ قریبا من دارھم ان کے گھروں کے ارد گرد اور ان کا شر ان پر چھایا رہے گا۔ بعض فرماتے ہیں اس کا یہ معنی ہے کہ اے پیارے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان کے گھروں کے قریب اتریں گے اور حضور حدیبیہ میں اترے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 19 (التجاریہ)　2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 19 (التجاریۃ)　3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 19 (التجاریۃ)

؎ یہ آیت اس معنی پر یا جو ابن عباس نے فرمایا کہ کفار مکہ کے بارے میں نازل ہوئی۔

؎ یعنی موت یا قیامت آ جائے اگر آیت عام ہو۔ اگر کفار مکہ کے بارے میں ہو تو وعدہ سے مراد فتح مکہ ہوگا۔

؎ اللہ تعالیٰ وعدہ خلافی نہیں فرماتا کیونکہ کذب اور خلف اس کے کلام میں ممتنع ہے۔

جب کفار نے بطور استہزاء ان اشیاء کا مطالبہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو تسلی دینے کے لئے یہ آیت نازل فرمائی۔

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَأَمْلَيْتُ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثُمَّ أَخَذْتُهُمْ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ﴿٣٢﴾

"اور بے شک تمسخر اڑایا گیا رسولوں کا جو آپ سے پہلے گزرے ہیں ؎ پس میں نے ڈھیل دی کافروں کو (کچھ عرصہ تک) ؎ پھر میں نے پکڑ لیا انہیں ؎ تو (دیکھو) کیسا (بھیانک) تھا میرا عذاب ؎۔"

؎ بے شک تمسخر اڑایا گیا رسولوں کا جو آپ سے پہلے گزرے جس طرح یہ کفار آپ سے استہزاء اور تمسخر کرتے ہیں۔

؎ الملوة زمانے کی طویل مدت کو کہتے ہیں۔ اسی سے دن اور رات کے لمبے ہونے کے اعتبار سے ان کو الملوان کہا جاتا ہے الملوان دن اور رات کی حقیقت نہیں ہے کیونکہ شاعر کا قول ہے نهار وليل دائم ملوهما۔ عليه كل حال المرء يختلفان اگر ملوان سے مراد دن اور رات ہوتے تو اسے هما ضمیر کی طرف مضاف نہ کیا جاتا۔ امليت للذين كفروا کا معنی یہ ہے کہ میں نے بغیر تعذیب کے ایک مدت ڈھیل دی اور انہیں چھوڑے رکھا۔

؎ یعنی کیسے میں نے انہیں عذاب دیا پس میں اس کے ساتھ بھی یہی سلوک کروں گا جو آپ سے استہزاء کرے گا۔

أَفَمَنْ هُوَ قَائِمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ ۚ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَاءَ ۭ قُلْ سَمُّوْهُمْ ۭ أَمْ تُنَبِّئُوْنَهٗ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي الْأَرْضِ أَمْ بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ ۭ بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مَكْرُهُمْ وَصُدُّوْا عَنِ السَّبِيْلِ ۭ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴿٣٣﴾

"کیا وہ خدا جو نگہبانی ؎ فرما رہا ہے ہر نفس کی اس کے اعمال (نیک و بد) کے ساتھ (ان کے بتوں جیسا ہے؟ ہرگز نہیں) ؎ اور مشرکین نے بنا لئے ہیں اللہ تعالیٰ کے شریک ؎ فرمائیے ذرا نام تو لو ان کا ؎ (نادانو) کیا تم آگاہ کرتے ہو اللہ تعالیٰ کو ایسی بات سے جسے وہ (ہمہ دان) ساری زمین میں نہیں جانتا ؎ یا یونہی یا وہ گوئی کر رہے ہو بلکہ آراستہ کر دیا ہے کافروں کے لئے ان کا مکر و فریب ؎ اور روک دیئے گئے ہیں (راہ راست) سے ؎ اور جس کو اللہ تعالیٰ گمراہ ہونے دے تو اس کو کوئی ہدایت دینے والا نہیں ؎۔"

؎ کیا وہ خدا جو نگہبانی فرما رہا ہے ہر نفس کی اس کے نیک و بد اعمال کے ساتھ جس پر اعمال میں سے کوئی چیز مخفی نہیں ہے اور ان کی جزاء میں کوئی بھی چیز اس سے فوت نہ ہوگی۔ اس کی خبر محذوف ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہے كَمَنْ لَيْسَ كَذٰلِكَ یعنی وہ خدا اس کی طرح ہے جو ایسی قدرت کا مالک نہیں۔ یہ استفہام انکاری ہے اور ما محذوف کلام پر عطف کے لئے ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے أَتُشْرِكُوْنَ بِاللّٰهِ أَصْنَامًا فَتَجْعَلُوْنَ مَنْ هُوَ قَائِمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍ كَمَنْ لَيْسَ كَذٰلِكَ کیا تم ان بتوں کو اللہ کا شریک بناتے

ہو، جو ہر نفس کا نگہبان ہے اسے اس کی طرح سمجھتے ہو جو ایسا نہیں ہے۔ یہ بے بس بے جان پتھر اس کمال سے عاجز ہیں۔ پس ان کو اس کا شریک نہ بناؤ۔

٢ یہ مستقل کلام ہے یا ما کو مصدر یہ بنایا جائے تو اس کا کسبت پر عطف ہوگا یا کلام مقدر پر معطوف ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے لم یُوَحِّدُوْهُ جَعَلُوْا لِلّٰہِ شُرَکَاءَ یعنی انہوں نے اس کی توحید بیان نہیں کی اس کے لئے شریک بنائے۔ ضمیر کی جگہ اسم ظاہر ذکر کرنا اس تنبیہ کے لئے ہے کہ صرف وہی مستحق عبادت ہے۔

٣ فرمایئے ذرا ان کا وصف تو بیان کرو، اور پھر دیکھو کیا یہ مستحق عبادت ہیں، یہ شرکت کی اہلیت رکھتے ہیں؟

٤ کیا تم اللہ تعالیٰ کو آگاہ کرتے ہو ایسی بات سے جو وہ ساری زمین میں نہیں جانتا، یعنی جن کو تم مستحق عبادت بتاتے ہو اللہ تعالیٰ تو انہیں نہیں جانتا۔ یا جن صفات کی وجہ سے تم انہیں مستحق عبادت سمجھتے ہو اللہ تعالیٰ تو ان صفات کو نہیں جانتا حالانکہ وہ ہر چیز کو جانتا ہے (یعنی اگر اسے علم نہیں تو اس کا صاف مطلب ہے کہ وہ ایسے ہیں ہی نہیں تم نے یہ شریک کہاں سے ڈھونڈ لئے ہیں)

٥ یعنی تم انہیں ظاہری سنائی باتوں کی وجہ سے اس کے شریک بناتے ہو حقیقت میں ان کا کوئی مصداق نہیں جیسے حبشی کو کافور کہتے ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی ہے وہ بیہودہ اور باطل بات کرتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے۔

وَتِلْكَ شَكَاةٌ ظَاهِرٌ عَنْكَ عَارُهَا عَيَّرَنِي الْوَاشُوْنَ اَنِّي اُحِبُّهَا

یعنی لوگ مجھے عار دلاتے ہیں کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں حالانکہ یہ باطل ہے۔

٦ یعنی شیطان نے کفار کے لئے آراستہ کر دیا ہے ان کا مکر و فریب یہاں تک کہ وہ باطل یا اپنے مکر و فریب کو اسلام خیال کرتے ہیں شرک کرنے کے باوجود۔

٧ صدوا کوکوفیوں نے صاد کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے یہاں بھی اور سورۂ حم المومن میں بھی۔ یعنی وہ دین سے روک دیئے گئے ہیں اللہ تعالیٰ نے انہیں روک دیا ہے اور شیطان نے انہیں گمراہ کر دیا ہے۔ باقی قراء نے صاد کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی وہ لوگوں کو ایمان لانے اور ہدایت کے راستہ سے روکتے ہیں۔

٨ جس کو اللہ تعالیٰ رسوا کرنے کے لئے گمراہ ہونے دے تو اس کو کوئی ہدایت کی توفیق دینے والا نہیں۔

لَهُمْ عَذَابٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَقُّ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ ۝ مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ۭ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۭ اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّظِلُّهَا ۭ تِلْكَ عُقْبَى الَّذِيْنَ اتَّقَوْا ڰ وَّعُقْبَى الْكٰفِرِيْنَ النَّارُ ۝

"ان (بدبختوں) کے لئے عذاب ہے دنیوی زندگی میں اور آخرت کا عذاب تو بڑا سخت ہوگا اور نہیں ان کے لئے اللہ تعالیٰ کی گرفت سے کوئی بچانے والا ١ اس جنت کی کیفیت جس کا وعدہ پرہیزگاروں سے کیا گیا ہے ایسی ہے کہ رواں ہیں اس کے نیچے ندیاں ٢ اس کا پھل ہمیشہ رہتا ہے ٣ اور اس کا سایہ بھی نہیں ڈھلتا ٤ یہ انجام ہے ان کا جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں ٥ اور کفار کا انجام آگ ہے۔ ٦"

١ ان کے لئے قتل قید اور ٹیکس کا عذاب ہے اور آخرت کا عذاب تو دنیا سے بہت سخت اور دائمی ہے اور ان کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے

کوئی بچانے والا نہیں۔"

۲؎ اس جنت کی صفت جو حسن وغرابت میں ایک مثال ہے۔ یہ مبتداء ہے اور سیبویہ کے نزدیک اس کی خبر محذوف ہے جو فیما یقص علیکم ہے اور اس کا مابعد ضمیر عائد محذوف سے حال ہے اور بعض فرماتے ہیں اس کی خبر تجری من تحتها الانهار ہے جیسے کہ تیرا قول ہے صفته زید اسمه یا موصوف کے حذف پر یعنی مثل الجنة جنة یا کہا جائے گا کہ مثل کا لفظ زائد ہے، یعنی مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِیْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ کا معنی مثل کے بغیر ہوگا۔

۳؎ البزار اور الطبرانی نے حضرت ثوبان سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ جنت سے کوئی شخص پھل توڑے گا تو اسی کی مثل اسی جگہ دوسرا پھل آجائے گا۔ اس آیت اور اس حدیث میں جہمیہ فرقہ کا رد ہے جو کہتے ہیں کہ جنت کی نعمتیں فنا ہونے والی ہیں۔

۴؎ یعنی اس کا سایہ ختم نہ ہوگا جیسے دنیا میں سورج کے ساتھ سایہ ختم ہو جاتا ہے۔ بیہقی نے شعیب بن الجحان سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں میں اور ابو العالیہ الریاحی سورج کے طلوع ہونے سے پہلے باہر نکلے۔ انہوں نے کہا مجھے خبر دی گئی ہے کہ جنت اس طرح ہے پھر یہ تلاوت کیا وَّظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ۔

۵؎ یعنی یہ جنت جس کا تذکرہ ہو رہا ہے یہ متقین کی جزاء یا انکا انجام اور امر منتہی ہے۔

۶؎ اور کفار کا انجام آگ ہے، اگرچہ عقبیٰ نیک جزاء کے لئے استعمال ہوتا ہے لیکن یہاں اس کا استعمال استعارہ کے طریقہ پر سزا کے لئے ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ - فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ۔

وَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَفْرَحُوْنَ بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَ مِنَ الْاَحْزَابِ مَنْ يُّنْكِرُ بَعْضَهٗ ؕ قُلْ اِنَّمَاۤ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ وَ لَاۤ اُشْرِكَ بِهٖ ؕ اِلَيْهِ اَدْعُوْا وَ اِلَيْهِ مَاٰبِ ﴿۳۶﴾

"اور جنہیں ہم نے کتاب عطا فرمائی ۱؎ وہ خوش ہو رہے ہیں اس کتاب پر جو نازل کی گئی آپ کی طرف ۲؎ اور ان لوگوں میں سے ایسے بھی ہیں ۳؎ جو بعض قرآن کا انکار کرتے ہیں ۴؎ فرمادیجئے مجھے تمہاری مخالفت کی پرواہ نہیں) مجھے تو یہی حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کروں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤں ۵؎ اسی کی طرف دعوت دیتا ہوں اور اسی کی طرف سب کو لوٹنا ہے۔ ۶؎"

۱؎ جنہیں ہم نے کتاب عطا فرمائی، یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب یا اہل کتاب کے مومنین جیسے عبد اللہ بن سلام اور ان کے ساتھی اور جو حبشیوں میں نصرانی ایمان لائے تھے۔

۲؎ وہ خوش ہو رہے ہیں اس کتاب سے جو آپ کی طرف نازل کی گئی ہے کیونکہ اس میں ان کی کتابوں کی موافقت پائی جاتی ہے۔

۳؎ یعنی وہ کفار جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے گروہ گروہ بن گئے تھے یا یہود و نصاریٰ میں کا فر جیسے کعب بن اشرف اور اس کے ساتھی۔ السید اور العاقب اور ان جیسے دوسرے افراد۔

۴؎ وہ اس حصہ کا انکار کرتے ہیں جو ان کی خواہشات کے مخالف ہوتا ہے یا جس میں ہماری اور ان کی شریعت میں مخالفت ہوتی ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا بھی انکار کرتے ہیں۔ امام بغوی فرماتے ہیں قرآن کی ابتداء میں رحمٰن کا ذکر کم تھا۔ جب عبد اللہ بن سلام اور ان کے ساتھی

ایمان لائے تو قرآن میں رحمٰن کے ذکر کی کمی انہیں گراں گزری کیونکہ تورات میں رحمٰن کا ذکر کثرت سے تھا۔ جب اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اس کا تکرار فرمایا تو وہ بہت خوش ہوئے(1)۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمادی۔ بعض علماء فرماتے ہیں ومن الاحزاب من ینکر بعضہ سے مراد یہ ہے کہ جب کتاب الصلح میں بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ لکھوادیا تو مشرکین مکہ کہنے لگے مسیلمہ کذاب رحمان الیمامہ کے علاوہ کسی کو نہیں جانتے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائیں۔ وَ هُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ كٰفِرُوْنَ۔ وَ هُمْ یَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ فرمایا وہ بعض کا انکار کرتے ہیں کیونکہ وہ اللہ کے ذکر کا انکار نہیں کرتے تھے اور رحمٰن کے ذکر کا انکار کرتے تھے اے پیارے محمد فرمادیجئے۔

5 مجھے تو حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کروں اور کسی کو اس کے ساتھ شریک نہ ٹھہراؤں۔ اگر یہ آیت اہل کتاب منکرین کے جواب میں ہو تو معنی یہ ہے کہ آپ انہیں فرمادیجئے کہ جو مجھ پر نازل کیا گیا ہے اس میں مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کروں اور اسے وحدہٗ لاشریک تسلیم کروں۔ اسی چیز پہ دین کا دارومدار ہے۔ تمہارے لئے اس کے انکار کی گنجائش نہیں ہے اور جس کا تم اس اس وجہ سے انکار کرتے ہو کہ وہ احکام تمہاری شریعتوں میں نہیں تھے تو یہ بھی کوئی انوکھی اور نئی بات نہیں ہے کیونکہ شریعتیں اور کتب سماویہ ایک دوسرے کے جزئیات کو منسوخ کرتی رہتی ہیں اور اگر یہ عام کفار کے متعلق ہو تو معنی یہ ہوگا کہ مجھے تو اس ایک اللہ کی عبادت کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور اس کے اسماء کا کثیر ذکر کرنا مثلاً اللہ رحمٰن رحیم یہ اس کی توحید کے منافی نہیں ہے۔ تمہارا الرحمٰن کے اسم پر انکار بے معنی ہے۔ شاید رحمٰن کے ذکر کا انکار کرنا اس وجہ سے ہو کہ ان کی استعداد اللہ تعالیٰ کی رحمت قبول ہی نہ کرتی ہو۔

6 میں لوگوں کو صرف اسی کی طرف بلاتا ہوں اور صرف اس کی طرف میرا لوٹنا ہے۔ اس کے انکار کی بھی گنجائش نہیں۔

وَ كَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِیًّا ؕ وَ لَىٕنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّ لَا وَاقٍ ﴿۳۷﴾ وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَ جَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّ ذُرِّیَّةً ؕ وَ مَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ یَّاْتِیَ بِاٰیَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ﴿۳۸﴾

"اور اسی طرح ہم نے اتارا ہے اسے فیصلہ عربی زبان میں 1 اور اگر تم پیروی کرو ان کی خواہشات کی اس کے بعد کہ آ چکا تمہارے پاس صحیح علم تو نہیں ہوگا تمہارے لئے اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں کوئی مددگار اور نہ کوئی محافظ 2 اور بے شک ہم نے بھیجے کئی رسول آپ سے پہلے 3 اور بنائیں ان کے لئے بیویاں اور اولاد 4 اور ممکن نہیں کسی رسول کے لئے کہ وہ لے آئے کوئی نشانی اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر 5 ہر میعاد کے لئے ایک نوشتہ ہے 6"

1 جس طرح ہم نے سابقہ کتب کو مرسل الیہم کی زبان میں نازل کیا۔ اسی طرح ہم نے اس قرآن کو آپ پر نازل کیا قضایا' واقعات' حل و حرمت وغیرہ میں قول فیصل بنا کر اور جو تیری عرب قوم کی زبان میں مترجم ہے تاکہ آپ کے لئے اور آپ کی قوم کے لئے اس کا سمجھنا آسان ہو۔

2 فرض کیا اگر آپ پیروی کرنے لگو ان کی خواہشات کی ان احکام کے بارے میں جن کا یہ آپ پر انکار کرتے ہیں اس کے بعد کہ آ چکا تمہارے پاس علم تو نہیں ہوگا۔ تمہارے لئے اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں کوئی مددگار اور نہ کوئی محافظ جو آپ کو بچا سکے اور اللہ کے عذاب سے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 21 (التجاریہ)

تمہیں محفوظ کر سکے۔

۳ روایت ہے کہ یہود نے کہا یہ شخص سوائے عورتوں کے اور تو ارادہ نہیں رکھتا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی: یقیناً ہم نے آپ سے پہلے آپ کی مثل بشر رسول بھیجے وہ بھی ملائکہ نہ تھے(1)۔

۴ ان کی بیویاں اور اولاد تھی جیسے آپ کی ہے۔

۵ کسی رسول کے لئے ممکن ہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر وہ کوئی نشانی لے آئے۔ جس کا اس سے مطالبہ کیا جائے یا کوئی ایسا حکم دے جس کی اس سے فرمائش کی جائے کیونکہ وہ سب اس کے عبید اور پروردہ تھے۔

۶ ہر میعاد کے لئے ایک نوشتہ ہے اور ہر چیز کے وقت کے لئے ایک لکھی ہوئی تحریر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ازل میں اس کی ابتداء اور انتہاء کو لکھا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ازل میں لکھ دیا ہے کہ زید فلاں وقت میں پیدا ہوگا اتنی مدت کافر رہے گا، فلاں وقت میں اسلام قبول کرے گا اور اس طرح کے دوسرے احکام۔ اسی طرح قرآن کریم کی کسی آیت کا نزول یا کسی معجزہ کا ظہور ان کے وجود کا وقت اللہ تعالیٰ کے ہاں لکھا ہوا ہے جو لوگوں کی عجلت سے مقدم یا مؤخر نہیں ہو سکتا اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ ارشاد و من الاحزاب من ینکر بعضہ کے متعلق ہو اس بناء پر کہ یہ آیت اہل کتاب کے تورات کے مخالف احکام پر انکار کی وجہ سے نازل ہوئی ہو۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ہر میعاد اور وقت کا ایک حکم ہے جو بندوں کی استصلاح کے تقاضوں کے مطابق بندوں پر لکھا گیا ہے۔

يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَ يُثْبِتُ ۚۖ وَ عِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ ﴿۳۹﴾

"مٹاتا ہے اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے اور باقی رکھتا ہے (جو چاہتا) ہے ۱؎ اور اسکے پاس ہے اصل کتاب ۲؎"

۱؎ ابن کثیر، ابو عمرو، یعقوب اور عاصم نے باب افعال سے تخفیف کے ساتھ یُثْبِتُ پڑھا ہے اور باقی قراء نے باب تفعیل سے تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس آیت کے معنی میں علماء کا اختلاف ہے۔ سعید بن جبیر اور قتادہ فرماتے ہیں اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ فرائض و شرائع میں سے جو چاہتا ہے منسوخ کرتا ہے اور اسکا بدل لاتا ہے اور جو چاہتا ہے منسوخ نہیں کرتا، اسے ثابت رکھتا ہے(2) یہ معنی اس سے پہلی آیت کی دوسری تاویل کے مناسب ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں یعنی جو لوح میں لکھا ہوا ہے اس میں سے جو چاہتا ہے مٹاتا ہے اور جو چاہتا ہے باقی رکھتا ہے(3) اور جو لکھا ہو مٹانے کے قابل ہوتا ہے اسے قضاء معلق کہتے ہیں۔ اللہ اس چیز کو پیدا فرما کر اسے مٹاتا ہے جس کے ساتھ اسکا مٹانا معلق ہے جو یہ تعلیق لوح میں لکھی ہوئی ہو، یا اللہ تعالیٰ کے علم میں مضمر ہو اور جو مٹانے کے قابل نہیں ہوتا اسے قضاء مبرم کہا جاتا ہے اور یہ قضا اٹل ہوتی ہے۔ اس میں رد و بدل نہیں ہوتا۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے مٹاتا ہے اور جو چاہتا ہے باقی رکھتا ہے مگر رزق، عمر، سعادت اور شقاوت ان کو نہیں مٹایا جاتا۔

امام بغوی فرماتے ہیں ہم نے حذیفہ بن اسید سے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ ماں کے رحم میں نطفہ کے استقرار کے چالیس یا پینتالیس دن کے بعد ایک فرشتہ نطفہ پر داخل ہوتا ہے وہ پوچھتا ہے اے میرے پروردگار یہ شقی ہے یا سعید تو اسے لکھ دیا جاتا ہے پھر پوچھتا ہے یہ مذکر ہے یا مونث تو اسے لکھ دیا جاتا ہے پھر اس کا عمل، عمر، موت، رزق لکھا جاتا ہے اس کے بعد صحیفے لپیٹ دیئے جاتے ہیں۔ پھر نہ اس لکھے ہوئے میں زیادتی ہوتی ہے اور نہ کمی(4)۔ صحیحین میں ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 22 (التجاریۃ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 22 (التجاریۃ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 22 (التجاریۃ)

فرماتے ہیں ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا جو صادق و مصدوق ہیں کہ تم میں سے کسی کی تخلیق کے یہ مراحل ہوتے ہیں، پہلے ماں کے پیٹ میں چالیس دن نطفہ رہتا ہے۔ پھر اتنی مدت جما ہوا خون رہتا ہے۔ پھر اتنی مدت گوشت کا ٹکڑا رہتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ ایک فرشتہ بھیجتے ہیں جو چار کلمات لیکر آتا ہے۔ پس اس کا عمل، عمر، رزق اور اسکا سعید یا بدبخت ہونا لکھا جاتا ہے۔ پھر اس میں روح پھونکی جاتی ہے(1) امام بغوی فرماتے ہیں کہ حضرت عمر اور ابن مسعود سے یہ بھی مروی ہے کہ وہ فرماتے کہ اللہ تعالیٰ سعادت اور شقاوت کو بھی مٹاتا ہے اور رزق اور عمر کو بھی مٹاتا ہے اور جو چاہتا ہے باقی رکھتا ہے(2)۔ حضرت عمر سے مروی ہے کہ آپ بیت اللہ شریف کا طواف کر رہے تھے اور رورو کر یہ التجا کر رہے تھے اے اللہ اگر تو نے مجھے سعادت مندوں میں لکھا ہے تو مجھے ان میں ہی باقی رکھ اور اگر تو نے مجھ پر شقاوت لکھی ہے تو اسے مجھ سے مٹا دے اور مجھے اہل سعادت و مغفرت میں کر دے بے شک تو مٹاتا ہے جو چاہتا ہے اور ثبت کرتا ہے جو چاہتا ہے اور ام الکتاب تیرے پاس ہے(3)۔ ابن مسعود سے بھی اسی کی مثل مروی ہے اور بعض آثار میں ہے کہ ایک شخص کی عمر کے تیس سال باقی ہوتے ہیں، وہ قطع رحمی کرتا ہے تو انہیں تین ایام کی طرف لوٹا دیا جاتا ہے اور ایک شخص کی عمر کے تین دن رہتے ہوتے ہیں کہ وہ صلہ رحمی کا عمل کرتا ہے تو انہیں تیس سال تک بڑھا دیا جاتا ہے۔ پھر امام بغوی نے اپنی سند سے ابودرداء سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ رات کی آخری تین گھڑیوں میں اپنی شان کے لائق نزول فرماتا ہے۔ پس پہلی گھڑی میں وہ اس کتاب کو دیکھتا ہے جسے اس کے علاوہ کوئی نہیں دیکھتا۔ پس وہ جو چاہتا ہے مٹاتا ہے اور جو چاہتا ہے باقی رکھتا ہے(4)۔ ابن مردویہ نے حضرت علی سے روایت فرمایا ہے آپ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت کے متعلق پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے علی میں اس آیت کی تفسیر سے تیری آنکھ بھی ٹھنڈی کروں گا اور اپنی امت کی آنکھ بھی ٹھنڈی کروں گا، صدقہ کو صحیح مصرف پر خرچ کرنا، ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرنا اور نیکی کرنا، ایسے اعمال ہیں جو بدبختی کو نیک بختی سے بدل دیتے ہیں، عمر میں اضافہ کا باعث ہوتے ہیں اور برے انجاموں سے بچاتے ہیں(5)

میں کہتا ہوں حضرت عمر اور حضرت ابن مسعود کا مذہب اس کلام کے موافق ہے جو مقامات مجددیہ میں ذکر کی گئی ہے کہ حضرت مجدد الف ثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کشف کی نظر سے دیکھا کہ ملا طاہر لاہوری کی پیشانی پر شقی (بدبخت) لکھا ہوا ہے اور ملا طاہر آپ کے شہزادوں محمد سعید اور محمد معصوم کا استاد تھا حضرت مجدد الف ثانی نے اس کی شقاوت کا تذکرہ اپنے صاحبزادوں سے کیا تو انہوں نے التجا کی کہ آپ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ ہمارے استاد کی شقاوت کو مٹا دے اور اس کی جگہ سعادت لکھ دے۔ حضرت مجدد الف فرماتے ہیں میں نے لوح محفوظ میں دیکھا تو وہ قضاء مبرم تھی جس میں ردوبدل نہیں ہوتا۔ بچوں نے پھر دعا کے لئے اصرار کیا۔ حضرت مجدد رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں مجھے غوث الثقلین سید السند محی الدین عبد القادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول یاد آیا کہ آپ فرماتے تھے کہ میری دعا سے قضاء مبرم بدل جاتی ہے۔ میں نے اللہ تعالیٰ سے ان الفاظ میں دعا کی اَللّٰهُمَّ رَحْمَتُکَ وَاسِعَةٌ وَ فَضْلُکَ غَيْرُ مُقْتَصِرٍ عَلٰى اَحَدٍ وَّاَرْجُوْكَ وَاَسْئَلُکَ مِنْ فَضْلِکَ الْعَمِيْمِ اَنْ تُجِيْبَ دَعْوَتِيْ فِيْ مَحْوِ كِتَابِ الشَّقَاءِ مِنْ نَاصِيَةِ مُلَّا طَاهِرٍ وَّ اِثْبَاتِ السَّعَادَةِ مَكَانَهٗ كَمَا اَجَبْتَ دَعْوَةَ سَيِّدِ السَّنَدِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ یعنی اے اللہ تیری رحمت بڑی وسیع ہے تیرا فضل کسی ایک پر منحصر نہیں ہے، میں تجھ سے امید کرتا ہوں اور سوال کرتا ہوں کہ اپنے فضل عمیم کے طفیل میری دعا کو قبول فرما ملا طاہر کی

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 332 (قدیمی) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 22 (التجاریہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 23-22 (التجاریہ) 4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 23 (التجاریہ)

پیشانی سے شقاوت کو مٹا کر سعادت کندہ فرما دے جس طرح تو نے سیدنا السند غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی دعا قبول فرمائی تھی۔

حضرت مجدد فرماتے ہیں پھر گویا میں نے ملا طاہر کی پیشانی کو دیکھا کہ اس سے شقی کا کلمہ مٹا دیا گیا ہے اور اس کی جگہ سعید کا کلمہ لکھا گیا ہے وَّمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ۔ اللہ تعالیٰ پر یہ کام مشکل نہیں ہے۔ پھر مجھ پر اس مسئلہ کا حل مشکل ہو گیا کہ قضاء مبرم کسی کی دعا سے کیسے بدل سکتی ہے کیونکہ اسے تو کسی صورت میں بدلا ہی نہیں جاتا۔ اگر وہ بدل جاتی ہے تو وہ مبرم نہیں ہوتی اور یہ خلف ہے یا محال کو لازم ہے پس اللہ تعالیٰ نے مجھے اس اشکال کا حل الہام فرمایا۔ کہ قضاء معلق کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جس کا لوح محفوظ میں معلق ہونا لکھا ہوتا ہے اور لکھا ہوتا ہے کہ اس قضاء کا رد فلاں فعل سے معلق ہے، دوسری وہ جس کا معلق ہونا لوح محفوظ میں لکھا ہوا نہیں ہوتا، وہ لوح محفوظ میں مبرم کی صورت میں ہوتی ہے لیکن اس کا مٹانا اور اس کا اثبات علم الٰہی میں معلق تھا۔ پس سیدنا غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو ارشاد فرمایا کہ قضاء مبرم میری دعا سے بدل جاتی ہے۔ یہ اس قضاء کے متعلق ہے جو لوح محفوظ میں مبرم شکل میں ہوتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے علم میں مبرم نہیں ہوتی۔ پس ملا طاہر کی شقاوت اسی قبیل سے تھی، یعنی لوح محفوظ میں مبرم کی شکل میں تھی، لیکن اللہ تعالیٰ کے علم میں حضرت مجدد کی دعا کے ساتھ اس کا مٹنا معلق تھا۔ واللہ اعلم۔

الضحاک اور الکلبی فرماتے ہیں آیت کا معنی یہ ہے کہ انسان کے کندھوں پر مقرر فرشتے انسان کے تمام اعمال اور اقوال لکھتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ ان کے دفتروں سے ان اقوال اور اعمال کو مٹاتا ہے جس میں کوئی ثواب یا عقاب نہیں ہوتی (1)۔ جیسے انسان کہتا ہے میں نے کھایا میں نے پیا میں داخل ہوا نکلا وغیرہ، یعنی ایسی کلام جس میں سچ ہو اور ان اقوال و اعمال کو باقی رکھتا ہے جس میں ثواب و عقاب ہوتا ہے۔ الکلبی کہتے ہیں تمام باتیں لکھی جاتی ہیں جب جمعرات کا دن آتا ہے تو وہ تمام چیزیں پھینک دی جاتی ہیں جن میں ثواب و عقاب نہیں ہوتا (2)۔ حضرت عطیہ حضرت ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا ایک شخص اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتا رہتا ہے پھر وہ اس کی معصیت پر اتر آتا ہے۔ پس وہ گمراہی پر مرتا ہے تو یہ ہے وہ جسے اللہ تعالیٰ مٹاتا ہے اور ایک شخص اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتا رہتا ہے اور اسی اطاعت میں ہی مرتا ہے تو یہی چیز ہے جسے اللہ تعالیٰ باقی رکھتا ہے (3)۔

امام مسلم عبداللہ بن عمرو سے روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بنی آدم کے دل رحمٰن کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ایک دل کی مانند ہیں وہ جسے چاہتا ہے پھیر دیتا ہے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں دعا کی اَللّٰهُمَّ مُصَرِّفَ الْقُلُوْبِ صَرِّفْ قُلُوْبَنَا عَلٰى طَاعَتِكَ اے اللہ اے دلوں کو پھیرنے والے ہمارے دل اپنی اطاعت پر پھیر دے (4)۔

حضرت الحسن فرماتے ہیں یمحو اللّٰه ما یشاء الخ کا مطلب یہ ہے کہ جس کی عمر پوری ہو جاتی ہے اسے اٹھا لیتا ہے اور جس کی ابھی عمر باقی ہوتی ہے اُسے اپنی عمر تک باقی رکھتا ہے (5)۔ سعید بن جبیر سے مروی ہے فرمایا اللہ تعالیٰ بندوں کے گناہوں سے جو چاہتا ہے مٹاتا ہے اور معاف فرماتا ہے اور جو چاہتا ہے باقی رکھتا ہے، ان کو معاف نہیں فرماتا۔ حضرت عکرمہ فرماتے ہیں توبہ کے ساتھ جن گناہوں کو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور گناہوں کے بدلہ میں نیکیاں ثبت فرماتا ہے جیسا کہ ارشاد ہے اُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ (یہ وہ لوگ ہیں جن کی برائیوں کو اللہ تعالیٰ نیکیوں میں تبدیل فرما دیتا ہے)۔ امام مسلم حضرت ابوذر سے روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کے روز ایک شخص کو لایا جائے گا، حکم ہو گا اس پر اسکے چھوٹے گناہ پیش کرو۔ پس اس پر اس کے چھوٹے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 23 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 23 (التجاریہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 23 (التجاریہ)
4۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 335 (قدیمی)
5۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 23 (التجاریہ)

گناہ پیش کیئے جائیں گے اور بڑے گناہ چھپائے جائیں گے۔ اسے کہا جائے گا تو نے یہ یہ برے اعمال کیئے وہ اقرار کرتا جائے گا اور انکار نہیں کرے گا اور وہ بڑے گناہوں کے چھپائے جانے سے ڈر رہا ہوگا اللہ تعالیٰ فرمائے گا اس کو ہر برائی کے بدلے میں نیکی دے دو۔ پس وہ بندہ کہے گا میرے اور بھی گناہ تھے جو مجھے یہاں نظر نہیں آئے۔ راوی فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ اس بات پر مسکرائے حتیٰ کہ آپ کی داڑھیں مبارک ظاہر ہوگئیں(1)۔ میں کہتا ہوں شاید یہ ان عظیم صوفیاء کرام کا مقام ہے جو محبوبیت کے بحر میں غوطہ زن ہوتے ہیں۔ السدی کہتے ہیں یَمۡحُوا اللّٰہُ مَا یَشَآءُ کا مطلب یہ ہے کہ وہ چاند کو مٹاتا ہے اور سورج کو باقی رکھتا ہے اور اس کا بیان اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے فَمَحَوۡنَاۤ اٰیَۃَ الَّیۡلِ وَ جَعَلۡنَاۤ اٰیَۃَ النَّہَارِ مُبۡصِرَۃً اور ہم نے مدہم کر دیا رات کی نشانی کو اور بنادیا دن کی نشانی کو روشن(2)۔

ربیع فرماتے ہیں یہ ارواح کے متعلق ہے اللہ تعالیٰ نیند کے وقت انہیں قبض فرماتا ہے۔ پس جس کی موت کا ارادہ فرماتا ہے اس کو مٹادیتا ہے اور اسے روک لیتا ہے اور جس کی بقاء کا ارادہ فرماتا ہے اسے باقی رکھتا ہے اور اسے بندے میں لوٹا دیتا ہے۔ اس کا بیان یہ ارشاد ہے اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الۡاَنۡفُسَ حِیۡنَ مَوۡتِہَا اللہ تعالیٰ قبض کرتا ہے جانوں کو موت کے وقت۔

بعض علماء فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرشتوں کے دفتروں سے ان اعمال کو مٹاتا ہے جو ریاکاری اور دکھاوے کے لئے ہوتے ہیں اور ان اعمال کو باقی رکھتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے ہوتے ہیں۔ بعض فرماتے ہیں وہ ایک قوم کو مٹاتا ہے اور ایک قوم کو باقی رکھتا ہے۔

۲۔ یعنی کتاب کی اصل اس کے پاس ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کا علم ہے۔ ابن عباس نے حضرت کعب سے ام الکتاب کا معنی پوچھا تو آپ نے فرمایا یہ اللہ کا علم ہے(3)۔ حضرت عکرمہ حضرت ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ دو کتابیں ہیں ایک کتاب ام الکتاب کے علاوہ ہے اس سے اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے مٹاتا ہے اور جو چاہتا ہے باقی رکھتا ہے اور ام الکتاب وہ ہے جس میں کوئی تبدیلی نہیں کی جاتی(4)۔ امام بغوی فرماتے لوح محفوظ وہ ہے جس میں ردو بدل نہیں ہوتا(5)۔ حضرت عطاء سے مروی ہے کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا اللہ تعالیٰ کی سفید موتی سے بنی ایک لوح محفوظ ہے جس کے گتے یاقوت کے ہیں اور اس کی مسافت پانچ سو سال ہے۔ اللہ تعالیٰ کے لئے اس میں ہر روز تین سو تیس لحظے ہیں، جو چاہتا ہے مٹاتا ہے، جو چاہتا ہے باقی رکھتا ہے(6)۔

وَ اِنۡ مَّا نُرِیَنَّکَ بَعۡضَ الَّذِیۡ نَعِدُہُمۡ اَوۡ نَتَوَفَّیَنَّکَ فَاِنَّمَا عَلَیۡکَ الۡبَلٰغُ وَ عَلَیۡنَا الۡحِسَابُ ﴿۴۰﴾

"اور اگر ہم دکھادیں آپ کو کچھ (عذاب) جس کی ہم نے کفار کو دھمکی دی ہے (تو ہماری مرضی) ۱؎ یا ہم (پہلے ہی) اٹھا لیں آپ کو (تو ہماری مرضی) ۲؎ سو آپ پر صرف تبلیغ فرض ہے اور یہ ہمارے ذمہ ہے کہ ان سے حساب لیں ۳؎"

۱؎ اس میں ان شرطیہ نون کو ما زائدہ میں مدغم کیا گیا ہے، یعنی اگر ہم دکھادیں گے آپ کو موت سے پہلے کچھ عذاب جسکی ہم نے کفار کو دھمکی دی ہے کہ ہم انہیں عذاب دیں گے اور دنیا میں مغلوب کریں گے اور اہل اسلام کو غلبہ عطا فرمائیں گے جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 106 (قدیمی)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 23 (التجاریہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 23 (التجاریہ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 24 (التجاریہ)
5۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 24 (التجاریہ)
6۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 24 (التجاریہ)

وسلم کو کفار کی ہزیمت، ان کا قتل ہونا اور قیدی ہونا بدر کے دن دکھایا گیا تھا۔ اس کا وعدہ دیا گیا ہے سَیُہْزَمُ الْجَمْعُ وَیُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ۞ قریب پسپا ہوگی یہ جماعت اور پیٹھ پھیر کر بھاگ جائیں گے۔ اس شرط کا جواب محذوف ہے۔

ع یا جو ہم نے کفار کو دھمکی دی ہے اسکے پورا ہونے سے پہلے آپ کو ہم اٹھالیں پھر ہم انہیں عذاب دیں۔ تو آپ ان کے اعراض سے مغموم نہ ہوں اور ان کے عذاب کا جلدی مطالبہ نہ کیجئے۔

ع سو آپ پر صرف تبلیغ فرض ہے جو آپ کر رہے ہیں اور قیامت کے روز ان سے حساب لینا اور جزا دینا ہمارے ذمہ ہے۔ پس جب یہ ہمارے پاس آئیں گے تو ہم انہیں جزا دیں گے آپ پر یہ ذمہ داری نہیں ہے۔

اَوَ لَمْ یَرَوْا اَنَّا نَاْتِی الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ؕ وَ اللّٰهُ یَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ ؕ وَ هُوَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ۞

''کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم (ان کے مقبوضہ) علاقہ کو ہر طرف سے رفتہ رفتہ کم کر رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کوئی نہیں رد و بدل کر سکتا اس کے حکم میں ع اور وہ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔ ع''

ل امام بغوی فرماتے ہیں اکثر مفسرین کا یہ خیال ہے کہ اس سے مراد مشرکوں کے شہروں کی فتح ہے کیونکہ جب اسلام کے دیار میں اضافہ ہوا تو دیار شرک میں کمی ہو گئی (1)۔ تقدیر کلام یہ ہے کہ اس کا انکار کرتے ہیں جو ہم نے دھمکی دی ہے کہ یہ اپنے مال خرچ کریں گے۔ پھر ان پر حسرت ہوگی۔ پھر یہ مغلوب ہوں گے اور انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم کفار کی زمین کا قصد کر رہے ہیں اور ہم مسلمانوں کو یکے بعد دیگرے فتح دے کر ان کفار کی زمین کو کم سے کم کر رہے ہیں۔ پس یہ عبرت کیوں نہیں پکڑتے یہ قول قتادہ، ابن عباس اور ایک جماعت علماء کا ہے۔ اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی ہے کہ آپ پریشان نہ ہوں اور جان لیں کہ یقیناً اللہ تعالیٰ نے کامیابی و کامرانی کا وعدہ فرمایا ہے وہ پورا ہوگا (2)۔ ایک قوم کا خیال ہے کہ اس سے مراد زمین کو خراب کرنا ہے اور معنی یہ ہے کہ کیا یہ ڈرتے نہیں کہ ہم انہیں ہلاک کریں گے اور ان کے دیار کو تباہ و برباد کریں گے اور انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم ان کے علاقے پر قبضہ کر رہے ہیں اور اسے خراب کر رہے ہیں اور ان کے اہل کو ہلاک کر رہے ہیں۔ اسی کی مثل مجاہد اور الشعبی کا قول ہے۔

ع یعنی اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق میں جو چاہتا ہے حکم فرماتا ہے اور اس کے فیصلہ کو کوئی رد کرنے والا اور اس کے حکم کو کوئی توڑنے والا نہیں۔ معقب جو کسی چیز کو توڑتا ہے اور اس کے ابطال کی وجہ سے اسے دوبارہ کرتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے غلبہ اور کفر کی ہزیمت کا فیصلہ فرما دیا ہے۔ اس لئے یہ ہو کر رہے گا۔ اس فیصلہ کو کوئی رد کرنے والا نہیں۔ لا مع المنفی کا محل حال ہونے کی بناء پر منصوب ہے یعنی وہ فیصلہ فرماتا ہے اور اس کا فیصلہ نافذ ہونے والا ہوتا ہے۔

ع وہ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔ پس دنیا میں جلا وطنی، قید اور قتل کی سزا دینے کے بعد آخرت میں بھی ان کفار کا محاسبہ فرمائے گا۔

وَ قَدْ مَكَرَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلِلّٰهِ الْمَكْرُ جَمِیْعًا ؕ یَعْلَمُ مَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ ؕ وَ سَیَعْلَمُ الْكُفّٰرُ لِمَنْ عُقْبَى الدَّارِ۞

''اور مکاریاں کرتے ہیں وہ لوگ جو ان سے پہلے تھے ل سو اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے ان سب کو مکر کی سزا دینا ع''

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 24 (التجاریۃ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 24 (التجاریۃ)

وہ جانتا ہے جو کماتا ہے ہر شخص [3] اور عنقریب کفار بھی جان لیں گے [4] کہ دار آخرت کی ابدی مسرتیں کس کے لئے ہیں۔ [5]"

[1] ان مشرکین مکہ سے پہلے سابقہ امتوں کے کفار بھی انبیاء کرام اور جو مومنین تھے ان سے مکر و فریب کرتے رہتے تھے جیسے آج یہ تمہارے ساتھ کر رہے ہیں۔ مکر کا معنی یہ ہے کہ کسی کو ایسی طریق سے تکلیف پہنچانا کہ اسے احساس تک نہ ہو۔

[2] ان کے مکر کی جزا اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے مکر کا خالق ہے اس کے ہاتھ میں بھلائی ہے اور شر ہے۔ اس کے اختیار میں نفع اور نقصان ہے۔ کوئی کسی کے ساتھ مکر نہیں کر سکتا مگر اس کے اذن سے۔ پس گویا انکا مکر معدوم ہے۔

[3] وہ جانتا ہے جو کماتا ہے ہر شخص۔ پس وہ اس کے عمل کے مطابق اسے جزا دیگا۔ پس یہی وہ کل مکر ہے کہ اللہ تعالیٰ ان پر اپنی سزا کا حکم نافذ کرے گا اور اس سے پہلے انہیں اس کا شعور ہی نہ ہوگا۔

[4] ابن عامر اور کوفیوں نے جمع کے صیغہ کے ساتھ کفار پڑھا ہے اور اہل حجاز اور ابو عمرو نے (کافر) جنس کے ارادہ پر مفرد پڑھا ہے۔

[5] ان دونوں (مومنین و کفار) گروہوں میں سے دار آخرت میں نیکیوں کی جزا کس کے لئے ہوگی جب ان کفار کو عذاب ملے گا جبکہ یہ اس سے غافل ہوں گے اور مومنین جنت میں داخل ہوں گے۔ یہ گویا اللہ تعالیٰ کے ان کے ساتھ مکر کی تفسیر ہے۔

وَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَسْتَ مُرْسَلًا ؕ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَ بَيْنَكُمْ ۙ وَ مَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ ۝

"اور کفار کہتے ہیں کہ آپ رسول نہیں ہیں [1] آپ فرمائیے میری رسالت پر اللہ تعالیٰ گواہ کافی ہے میرے اور تمہارے درمیان [2] (اور وہ لوگ بطور گواہ کافی ہیں) جن کے پاس کتاب کا علم ہے۔ [3]"

[1] بعض علماء فرماتے ہیں اس سے مراد یہود کے سردار ہیں جنہوں نے کہا تھا کہ آپ رسول نہیں ہیں۔

[2] اے پیارے محمد صلی اللہ علیہ وسلم فرما دیجئے میری رسالت پر اللہ تعالیٰ کی گواہی کافی ہے۔ باء زائدہ ہے جو فاعل پر داخل ہوتی ہے اور شہیداً نسبت سے تمیز ہے۔ کیونکہ میری رسالت پر بڑی دلیل ہے جس نے ہر گواہ کی گواہی سے مستغنی کر دیا ہے کیونکہ وہ اللہ یوم جزاء کا حاکم ہے۔ پس ان کے پاس اس دن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کرنے کے لئے کوئی عذر نہ ہوگا۔

[3] اس کا عطف اللّٰہ پر ہے اور اس سے مراد اہل کتاب کے مومنین ہیں جیسے عبد اللہ بن سلام اور ان جیسے دوسرے خوش نصیب افراد۔ یعنی یہود کے علماء میں سے مومنین بھی گواہی دیتے ہیں۔ پس کافرین کا انکار کوئی نقصان دہ نہیں ہے کیونکہ ان میں سے جو اقرار کرتا ہے اس کے اقرار میں تو کوئی تہمت نہیں ہے لیکن ان میں سے کفار کا انکار مال و جاہ کی وجہ سے حسد و عناد پر مبنی ہے۔ اس تاویل کی بناء پر بعض علماء فرماتے ہیں یہ آیت مدنی ہے۔ اگرچہ بقیہ تمام سورت مکی ہے۔ الشعبی اور ابو بشر نے اس تاویل کا انکار کیا ہے۔ فرماتے ہیں یہ سورت مکی ہے اور عبد اللہ بن سلام مدینہ طیبہ میں مشرف با اسلام ہوئے تھے(1)۔ میں کہتا ہوں اگر ہم اس آیت کو مکیہ تسلیم کر بھی لیں تو اسم موصول سے اہل کتاب مراد لینے میں کوئی حرج نہیں۔ گویا یہ کفار مکہ کو ارشاد ہے کہ اگر تمہیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا یقین

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 26 (التجاریہ)

نہیں آتا تو اہل کتاب سے پوچھ لو ان میں سے جو ثقہ ہیں وہ ضرور آپ کی رسالت کی گواہی دیں گے۔ حضرت الحسن اور مجاہد فرماتے ہیں وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ سے مراد اللہ تعالیٰ ہے اور کتاب سے مراد لوح محفوظ ہے اور معنی یہ ہے کہ اس کی گواہی کافی ہے جو مستحق عبادت ہے اور اس کی گواہی جو لوح محفوظ میں جو کچھ ہے اسے جانتا ہے پس ہم میں سے جو جھوٹا ہوگا اسے وہ سزا دے گا(1)۔

اس قول کی تائید حضرت حسن اور سعید بن جبیر کی قرأت کرتی ہے مَنْ عِنْدِهٖ یعنی میم اور دال کے کسرہ کے ساتھ یعنی مِن جارہ ہے وعُلِمَ الكتاب ماضی مجہول کا صیغہ ہے واللہ اعلم۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ وَالسَّلَامُ عَلٰى سَيِّدِ الْعَاصِيْنَ شَفِيْعِ الْمُذْنِبِيْنَ مُحَمَّدِنِ الْمَبْعُوْثِ رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ

سورۃ الرعد کی تفسیر اللہ تعالیٰ کی توفیق سے 9 بجے دن مورخہ 1999-8-12 کو مکمل ہوئی۔ میں اس نعمت اور بندہ نوازی پر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سراپا شکر ہوں اور سوالی ہوں کہ وہ تادم واپسیں قرآن حکیم و حدیث نبوی کی خدمت میں مصروف رکھے اور اسی خدمت کے طفیل روز قیامت اپنے محبوب مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لواء الحمد کے نیچے جگہ عطا فرمائے اور بغیر حساب و کتاب کے جنت میں صالحین کی معیت عطا فرمائے آمین بِجَاهِ النَّبِيِّ الْمُرْسَلِيْنَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَصْحٰبِهٖ اَجْمَعِيْنَ۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 26 (التجاریہ)

سورۂ ابراہیم

ایاتھا ۵۲ | سُوْرَۃُ اِبْرٰهِیْمَ مَکِّیَّۃٌ ۱۴ | رکوعاتھا ۷

سورۂ ابراہیم مکی ہے اور اس میں باون آیات اور سات رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الٓرٰ ۚ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَیْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ۬ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِیْزِ الْحَمِیْدِ ۙ﴿۱﴾

"الٓرٰ یہ (عظیم الشان) کتاب ہے [1] ہم نے اتارا ہے اسے آپ کی طرف تاکہ آپ نکالیں لوگوں کو (ہر قسم کی) تاریکیوں سے نور ہدایت اور عرفان) کی طرف ان کے رب کے اذن سے [2] عزیز و حمید کے راستہ کی طرف [3]"

[1] الف لام را۔ کتاب سے پہلے ھذا مبتدا محذوف ہے، یعنی یہ سورت یا یہ قرآن عظیم الشان کتاب ہے۔

[2] یہ جملہ کتاب کی صفت ہے اور لتخرج انزلنا کے متعلق ہے، یعنی ہم نے اتارا ہے تاکہ آپ انہیں کتاب مبین کے احکام کی طرف بلا کر اور انہیں حقوق و فرائض کی تعلیم دے کر ہر قسم کی گمراہیوں سے نکال کر نور ہدایت کی طرف لے جائیں ان کے رب کی توفیق اور تسہیل سے۔ اذن اس اذن سے مستعار ہے جو پردے کو تسہیل کرنے کے لئے ہوتا ہے اور یہ لتخرج کا صلہ ہے یا اس کے فاعل یا مفعول سے حال ہے یہ عامل کے تکرار کے ساتھ الی النور سے بدل ہے یا یہ مستقل کلام ہے اس کے جواب میں جو نور کے متعلق سوال کرتا ہے کہ وہ کیا ہے۔

[3] عزیز کا معنی غالب ہے اور حمید سے مراد وہ محمود جس کے سوا کوئی حمد کا مستحق نہ ہو، صراط کی اللہ تعالیٰ کی طرف اضافت یا تو اس لئے ہے کہ وہ اس کا مقصد ہے یا اس کو ظاہر کرنے والا ہے اور ان دو وصفوں کے ساتھ تخصیص اس لئے کہ اس کے راستہ پر چلنے والا کبھی رسوا نہیں ہوتا اور کبھی نامراد نہیں لوٹتا۔

اللّٰهِ الَّذِیْ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَ وَیْلٌ لِّلْكٰفِرِیْنَ مِنْ عَذَابٍ شَدِیْدِ ۙ﴿۲﴾

"وہی اللہ جس کے ملک میں ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے [1] اور بربادی ہے کفار کے لئے سخت عذاب کے باعث [2]"

[1] اکثر قراء نے اسم جلالت کو مجرور پڑھا ہے کہ یہ العزیز کا عطف بیان ہے۔ ابو عمرو فرماتے ہیں اس میں تقدیم و تاخیر ہے۔ اس کا مجاز اِلٰی صِرَاطِ الْعَزِیْزِ الْحَمِیْدِ ہے۔ ابو جعفر، نافع اور ابن عامر نے رفع کے ساتھ پڑھا ہے کہ یہ مبتدا ہے اور مابعد اس کی خبر ہے، یا یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے اور اس کا مابعد اس کی صفت ہے وہی اللہ جس کی ملک اور تخلیق ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔

[2] امام بیضاوی فرماتے ہیں یہ الوال کی نقیض ہے جس کا معنی نجات ہے (1) اس کی اصل نصب ہے کیونکہ یہ ھلاک کی طرح مصدر

1۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 335 (فراس)

ہے لیکن اس سے اشتقاق نہیں ہوتا لیکن ثبات اور دوام کا فائدہ دینے کے لئے مرفوع پڑھا گیا ہے۔ پس یہ وعید ہے ان کے لئے جو کتاب حکیم کے منکر ہیں اور سخت عذاب کے باعث گمراہیوں کی تاریکیوں سے نور عرفان وہدایت کی طرف نہیں نکلے۔

الَّذِيْنَ يَسْتَحِبُّوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ وَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ يَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ؕ اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍۭ بَعِيْدٍ ۝

”جو [1] پسند کرتے ہیں دنیوی زندگی کو آخرت کی ابدی زندگی پر اور (دوسروں کو بھی) روکتے ہیں خدا سے [2] اور وہ چاہتے ہیں راہ راست کو ٹیڑھا بنادیں [3] یہ لوگ بڑی دور کی گمراہی میں ہیں [4]“

[1] یہ للکافرین کی صفت ہے یا مذمت کے لئے منصوب ہے یا مذمت کے لئے ہی مرفوع ہے تقدیر عبارت یہ ہے اعنی الذین یا ھم الذین۔ یا یہ اس اعتبار سے مرفوع ہے کہ یہ مبتدا ہے اور اس کے صلہ کے بعد والی کلام خبر ہے۔

[2] کسی چیز کو پسند کرنے والا خواہش کرتا ہے کہ یہ چیز اسے دوسروں سے زیادہ محبوب ہو۔ اس لئے معنی یہ ہوگا کہ دنیوی زندگی کی لذتوں کو آخرت (کی ابدی زندگی) پر ترجیح دیتے ہیں اور لوگوں کو اللہ کے رسول کی اتباع کرنے سے منع کرتے ہیں۔

[3] ھا ضمیر کا مرجع سَبِيْلِ اللّٰهِ ہے، یعنی وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے راستہ کو حق سے ٹیڑھا کردیں تاکہ اس میں اعتراض وطعن کرسکیں حرف جارہ کو حذف کر کے فعل کو اسم سے ملا دیا گیا ہے۔ یا یہ معنی ہے وہ اللہ کے راستہ کو حق سے اعراض کر کے طلب کرتے ہیں، اگرچہ یہ محال ہے، بعض علماء فرماتے ہیں ضمیر منصوب کا مرجع الدنیا ہے یعنی وہ حق سے روگردانی کر کے حرام اور حرص کے ذریعے دنیا کو طلب کرتے ہیں۔

[4] یہ لوگ حق سے بہت دور کی گمراہی میں ہیں۔ بعد حقیقت میں ضال (گمراہ) کی صفت ہوتا ہے لیکن یہاں مبالغہ کے لئے ضلال کی صفت بنایا گیا ہے۔ یا یہ اس امر کے لئے ہے جس میں گمراہی ہوتی ہے۔ پھر ملابست کی وجہ سے ضلال کی صفت بنایا گیا ہے۔

وَ مَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ؕ فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝

”اور ہم نے نہیں بھیجا کسی رسول کو مگر اس کی قوم کی زبان کیساتھ تاکہ وہ کھول کر بیان کرے ان کے لئے (احکام الٰہی کو) [1] پس گمراہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے اور ہدایت بخشتا ہے جسے چاہتا ہے [2] اور سب پر غالب بہت دانا ہے [3]“

[1] یعنی وہ رسول اس قوم کا ایک فرد ہوتا ہے جسے ان کی طرف مبعوث کیا جاتا ہے۔ عبد بن حمید، ابن جریر اور ابن المنذر نے قتادہ سے روایت کیا ہے، وہ فرماتے ہیں بِلِسَانِ قَوْمِهٖ کا مطلب یہ ہے کہ اگر اس قوم کی زبان عربی ہو تو وہ عربی بولتا ہے، اگر سریانی ہو تو وہ سریانی بولتا ہے، اگر عجمی ہو تو عجمی بولتا ہے تاکہ کھول کر بیان کرے وہ احکام جو انہیں حکم دیا گیا ہے تاکہ وہ انہیں سہولت اور آسانی کے ساتھ اس رسول سے سمجھ سکیں (1) اور وہ رسول اس کو ان کے خلاف حجت بنائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے تمام رسول اپنی قوم کی طرف مبعوث کیے گئے، انہوں نے اللہ تعالیٰ کے احکام بیان کیے۔ لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام لوگوں کی طرف مبعوث کیا گیا تھا لیکن سب سے پہلے اس دعوت کا آغاز اپنی قوم سے کرنے کا حکم دیا گیا۔ ارشاد ہوا وَ اَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈرایئے۔ پھر تبلیغ کے دائرہ کو اپنے شہر کے اردگرد کے علاقہ میں وسیع کرنے کا ارشاد ہوا۔ لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَ مَنْ حَوْلَهَا (تاکہ آپ کہ

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 131

والوں اور اس کے ارد گرد والوں کو ڈرائیں) پھر ارشاد ہوا لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ تاکہ آپ اس قوم کو ڈرائیں جن کے باپ دادا کو ڈرایا گیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اہل حجاز کے عربی ہونے کی وجہ سے عربی زبان کے ساتھ مبعوث کیا گیا اور باقی تمام لوگ اہل عرب کے تابع ہیں کیونکہ انہوں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلیم حاصل کی۔ پھر انہوں نے احکام کو نقل کیا اور ان کا ترجمہ کیا۔ اسی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لوگ خیر و شر میں قریش کے تابع ہیں(1)۔ اس حدیث کو امام احمد اور امام مسلم نے حضرت جابر سے روایت کیا ہے، یعنی تمام کفار کفر میں قریش کے تابع ہیں کیونکہ انہوں نے پہلے کفر کیا۔ پھر دوسروں نے کفر کیا اس لئے تمام کفار کا گناہ ان قریش کفار پر ہوگا اور تمام مومنین قریش مومنین کے تابع ہیں کیونکہ سب سے پہلے وہ ایمان لائے۔ پس تمام ایمان لانے والوں کا اجر ان کو ملے گا۔ حضرت جریر سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے اسلام میں کوئی نیک کام شروع کیا اس کو اس کا اجر ملے گا اور جتنے لوگ اس پر عمل پیرا ہوں گے ان کا اجر بھی اسے ملے گا لیکن ان کے اجروں میں کچھ کمی نہ ہوگی اور جس نے اسلام میں کوئی برا طریقہ جاری کیا تو اس کا گناہ اسے ملے گا اور جو لوگ اس پر عمل کریں گے ان کا گناہ بھی اس پر پڑے گا لیکن ان کے گناہوں میں کچھ قصر نہ ہوگی۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے(2)۔ ابن عساکر نے ابوسعید سے ضعیف سند کے ساتھ روایت کیا ہے فرمایا اے اہل مدینہ لوگ علم میں تمہارے تابع ہیں۔ اہل مدینہ سے مراد مہاجرین اور انصار ہیں کیونکہ دوسرے لوگ ان کے تابع ہیں لیکن انصار مہاجرین کے تابع ہیں۔ پس دونوں حدیثوں کے درمیان کوئی منافات نہیں ہے۔ ابورافع نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں شیخ اپنے اہل میں اس طرح ہوتا ہے جیسے نبی اپنی امت میں ہوتا ہے۔ اس حدیث کو الخلیلی نے اپنی مشیخت میں روایت کیا اور ابن نجار نے بھی روایت کیا ہے حضرت عمر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں، فرمایا شیخ اپنے گھر میں اس طرح ہوتا ہے جس طرح نبی اپنی امت میں ہوتا ہے۔ اس حدیث کو ابن حبان نے الضعفاء میں روایت کیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا علماء انبیاء (کرام) کے وارث ہیں(3)۔ اس حدیث کو ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ اور دارمی نے کثیر بن قیس سے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اس کا نام قیس بن کثیر بتایا ہے۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لوگ تمہارے تابع ہیں، مرد تمہارے پاس زمین کے دور دراز کے علاقہ سے آئیں گے تاکہ دین حاصل کریں۔ جب وہ تمہارے پاس آئیں تو انہیں بھلائی کی نصیحت کرو۔ اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے(4)۔

بعض علماء فرماتے ہیں قومہ میں ہ ضمیر کا مرجع محمد ﷺ ہیں یعنی تمام کتابیں عربی میں نازل کی گئیں۔ پھر جبرائیل نے ان کا ترجمہ کیا۔ اس حدیث کو ابن مردویہ نے الکلبی کے طریق سے ابن عباس سے نقل کیا ہے، فرمایا جبرائیل کو عربی میں وحی کی جاتی تھی۔ پھر وہ ہر نبی کے پاس اس کی قوم کی زبان کے ساتھ اترتا تھا(5)۔ ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے سفیان ثوری سے روایت کیا ہے، فرمایا وحی صرف عربی میں نازل ہوئی۔ پھر ہر نبی نے اس کا ترجمہ اپنی قوم کی زبان میں کیا اور فرمایا قیامت کے دن کی زبان سریانی ہوگی اور جو جنت میں داخل ہوگا وہ عربی بولے گا(6) میں کہتا ہوں قومہ کی ضمیر کو محمد ﷺ کی طرف لوٹانا بعید ہے اور لیبین لھم کا قول اس کی تائید نہیں کرتا۔

ے پس جسے اللہ تعالیٰ چاہتا ہے ایمان سے محروم فرماتا ہے اور جسے چاہتا ہے ایمان کی توفیق عطا فرماتا ہے اور اس میں حق کا یقین پیدا فرماتا ہے۔

1۔ صحیح مسلم، جلد2، صفحہ 119 (قدیمی) 2۔ صحیح مسلم، جلد2، صفحہ 341 (قدیمی) 3۔ جامع ترمذی، جلد2، صفحہ 93

4۔ جامع ترمذی، جلد2، صفحہ 89 (وزارت تعلیم) 5۔ الدر المنثور، جلد4، صفحہ 131 (العلمیہ) 6۔ الدر المنثور، جلد4، صفحہ 131 (العلمیہ)

۲۰۔ اس کی مشیت اور ارادہ پر کوئی غالب نہیں، جسے اللہ ہدایت دیتا ہے اسے کوئی گمراہ کرنے والا نہیں اور جسے وہ گمراہ کرتا ہے اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں اور وہ حکیم ہے، کسی کو گمراہ نہیں کرتا مگر کسی حکمت کی بناء پر اور کسی کو ہدایت نہیں دیتا مگر کسی حکمت کے باعث۔

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَاۤ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ۬ وَ ذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ۝

''اور بیشک ہم نے بھیجا موسیٰ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ (اور انہیں حکم دیا) کہ نکالو اپنی قوم کو ۱؎ (گمراہی کے) اندھیروں سے نور (ہدایت) کی طرف اور یاد دلاؤ انہیں اللہ تعالیٰ کے دن ۲؎ یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ہر بہت صبر کرنے والے شکر گزار کے لئے ۳؎''

۱؎ اَنْ مفسرہ ہے کیونکہ ارسال میں قول کا معنی پایا جاتا ہے یا مصدریہ ہے حرف جر کی تقدیر کے ساتھ کیونکہ افعال کے صیغے مصدر پر دلالت کرنے میں برابر ہیں۔ پس تمام افعال پر ان مصدریہ کا داخل کرنا جائز ہے اصل میں بان اخرج تھا۔

۲؎ ابن عباس اور ابی بن کعب' مجاہد اور قتادہ فرماتے ہیں ایام اللہ سے مراد اللہ کی نعمتیں ہیں(1)۔ مقاتل فرماتے ہیں اس سے مراد قوم نوح' عاد اور ثمود کے واقعات ہیں(2)۔ مثلاً کہا جاتا ہے فلان عالم با یام العرب یعنی فلاں عربوں کے واقعات کا عالم ہے۔ پس تقدیر یہ ہے کہ انہیں اللہ تعالیٰ کی گذشتہ نعمتیں اور آزمائشیں یاد دلاؤ۔

۳؎ بے شک ان واقعات میں صانع کے وجود اس کے علم اور قدرت اور اس کی حکمت و وحدت پر نشانیاں ہیں ہر اس شخص کے لئے جو مصائب اور طاعت پر بہت زیادہ صبر کرنے والا ہے اور جو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا بہت زیادہ شکر کرنے والا ہے۔ اس سے مراد ہر مومن ہے اللہ تعالیٰ نے مومنین کو صبار اور شکور کے نام سے یاد فرمایا تاکہ اس بات پر تنبیہ ہو جائے کہ ہر مومن کو ان صفات عالیہ سے متصف ہونا چاہئے۔ ابن ابی حاتم اور البیہقی نے شعب الایمان میں ابوظبیان عن علقمہ عن ابن مسعود کے طریق سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا صبر نصف ایمان ہے اور یقین پورا ایمان ہے(3)۔ یہی حدیث علاء بن بدر کے سامنے ذکر کی گئی تو انہوں نے فرمایا کیا قرآن میں نہیں ہے۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّلْمُؤْمِنِیْنَ امام بیہقی حضرت انس سے اور حضرت انس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں، فرمایا ایمان کے دو حصے ہیں نصف صبر میں اور نصف شکر میں ہے(4)۔ ابو یعلی اور طبرانی مکارم الاخلاق میں روایت فرماتے ہیں کہ ایمان صبر اور سماحت ہے(5)۔ امام مسلم اور امام احمد نے صہیب سے مرفوعاً روایت کی ہے، فرمایا داہ مومن کا معاملہ خیر ہی خیر ہے اور یہ سعادت صرف مومن کے حصہ میں ہے، اگر اسے کوئی خوشی پہنچے تو وہ شکر ادا کرتا ہے اور یہ اس کے لئے خیر اور بھلائی ہے اور اگر اسے کوئی مصیبت پہنچے تو وہ صبر کرتا ہے اور یہ بھی اس کے لئے خیر ہے(6)۔ بیہقی نے حضرت سعد بن ابی وقاص سے روایت کی ہے کہ مسلم کا معاملہ عجب ہے جب اسے مصیبت لاحق ہوتی ہے تو وہ صبر کرتا ہے اور جب اسے بھلائی پہنچتی ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی حمد و شکر کرتا ہے، مسلم کو ہر شئی میں اجر ملتا ہے حتیٰ کہ وہ لقمہ جو منہ کی طرف لے جاتا ہے اسے اسکا بھی اجر ملتا ہے(7)۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 27 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 27 (التجاریہ)
3۔ شعب الایمان، جلد 7، صفحہ 123 (العلمیہ)
4۔ شعب الایمان، جلد 7، صفحہ 123 (العلمیہ)
5۔ شعب الایمان، جلد 7، صفحہ 122 (العلمیہ)
6۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 413 (قدیمی)
7۔ شعب الایمان، جلد 7، صفحہ 189 (العلمیہ)

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں میں نے ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا اے عیسیٰ (علیہ السلام) میں تیرے بعد ایک امت پیدا کرنے والا ہوں۔ جب انہیں کوئی محبوب چیز ملے گی تو وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں گے اور اگر کوئی ناپسندیدہ صورت لاحق ہوگی تو وہ ثواب کی نیت سے صبر کریں گے۔ نہ کوئی حلم اور نہ کوئی عقل کا دخل ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام نے عرض کی تو پھر یہ انہیں کیسے حاصل ہوگا جبکہ نہ حلم ہوگا نہ عقل ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں انہیں اپنے حلم اور علم سے عطا کروں گا۔ اس حدیث کو بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے(1)۔

وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ اَنْجٰىكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ وَ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَ يَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ۭ وَ فِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ۝

"اور جب فرمایا موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم کو کہ یاد کرو اللہ تعالیٰ کی نعمت و (احسان) کو جو تم پر ہوا جب اس نے نجات دی تمہیں فرعونیوں سے [1] جو پہنچاتے تھے تمہیں سخت عذاب اور ذبح کرتے تھے تمہارے فرزندوں کو اور زندہ چھوڑ دیتے تھے تمہاری عورتوں (بیٹیوں) کو [2] اور اس میں بڑی بھاری آزمائش تھی تمہارے رب کی طرف سے۔"

[1] اذ انجاکم' نعمة اللہ کے متعلق ہے، یعنی یاد کرو اللہ کی نعمت کو جس وقت اس نے تمہیں نجات دی یا علیکم کے متعلق ہے۔ اگر اسے ظرف مستقر بنایا جائے تو نعمت کی صفت ہوگی اس کا صلہ نہ ہوگی۔ نعمت سے مراد عطیہ ہے انعام نہیں ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ اسے نعمة اللہ سے بدل اشتمال بنایا جائے۔

[2] یہ آل فرعون یا مخاطبین کی ضمیر سے یا دونوں سے احوال ہیں۔ عذاب سے یہاں مراد ذبح کرنا نہیں ہے اور جو اس پر عطف ہے وہ بھی مراد نہیں ہے بلکہ ان کو غلام بنانا اور ان کو مشکل اور سخت کاموں پر لگانا ہے اور اس پر دلیل عطف ہے کیونکہ عطف مغایرت پر دلالت کرتا ہے لیکن سورۂ بقرہ اور سورۂ اعراف میں تو ذبح کرنا اور اس کا معطوف عذاب کی تفسیر ہے۔

وَ اِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَ لَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ ۝

"اور یاد کرو جب (تمہیں) مطلع فرمایا تمہارے رب نے [1] (اس حقیقت سے) کہ اگر تم پہلے احسانات پر شکر ادا کرو تو میں مزید اضافہ کر دوں گا اور اگر تم نے ناشکری کی (تو جان لو) یقیناً میرا عذاب شدید ہے [2]۔"

[1] یہ بھی موسیٰ علیہ السلام کی کلام ہے اور تاذن کا معنی اعلم ہے جیسے اذن بمعنی اعلم ہوتا ہے لیکن زیادہ بلیغ ہے کیونکہ باب تفعل میں تکلیف اور مبالغہ کا معنی پایا جاتا ہے۔

[2] اے بنی اسرائیل اپنے نبی پر ایمان لاؤ گے اور اسکی اطاعت کرو گے تو میں نعمت میں اضافہ کروں گا کیونکہ شکر موجود کے لئے قید ہے اور مفقود کے لئے جال ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شکر کرے گا وہ زیادتی سے محروم نہ ہوگا۔ اس حدیث کو ابن مردویہ نے ابن عباس سے روایت کیا ہے(2)۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی ہے اگر تم طاعت کے ساتھ شکر ادا کرو گے تو میں ثواب میں مزید اضافہ کروں گا اور اگر تم میری نعمت کی ناشکری کرو گے (تو جان لو) یقیناً میرا عذاب سخت ہے، یعنی میں دنیا میں نعمت کو چھین کر اور

1۔ شعب الایمان، جلد 7، صفحہ 190 (العلمیہ)
2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 134 (العلمیہ)

آخرت میں عذاب دے کر تمہیں سخت عذاب دوں گا کیونکہ میرا عذاب بڑا سخت ہے۔ یہاں وعید کی تعریض کے لئے جزاء کو حذف کیا گیا ہے اور علت کو اسکے قائم مقام رکھا گیا ہے کیونکہ وعدہ میں صراحت اور وعید میں تعریض کریم لوگوں کا شیوہ ہے۔ نیز اس بات پر آگاہ کرنے کے لئے ایسا کیا گیا ہے۔ کہ مزید شکر کو لازم ہے شکر سے نعمت کا اضافہ کبھی جدا نہیں ہوتا اور ناشکری کے بعد عذاب اللہ تعالیٰ کی مشیت پر منحصر ہے۔ اگر وہ چاہے تو عذاب دیتا ہے چاہے تو معاف فرما دیتا ہے۔ اور جملہ شرطیہ مقدر قول کا مفعول ہے یا تاذن کا مفعول ہے اس بناء پر کہ وہ قال کے قائم مقام ہے کیونکہ تاذن قال کی نوع سے ہے۔

وَقَالَ مُوْسٰۤى اِنْ تَكْفُرُوْۤا اَنْتُمْ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِیٌّ حَمِیْدٌ ۝

"نیز (یہ بھی) فرمایا موسیٰ نے کہ اگر تم ناشکری کرنے لگو (صرف تم ہی نہیں بلکہ) جو بھی سطح زمین پر ہے (ناشکری کرے) تو بیشک اللہ تعالیٰ غنی (اور سب) تعریفوں کا مستحق ہے[1]"

[1] موسیٰ نے فرمایا اگر تم ناشکری کرنے لگو اے بنی اسرائیل اور تمام جن وانس بھی ناشکری کرنے لگیں۔ اور تم شکر ادا نہ کرو تو اللہ تعالیٰ تمہارے شکر سے غنی اور بے پرواہ ہے، وہ اپنی ذات میں حمد کا مستحق ہے اور ایسی حمد کے ساتھ محمود ہے جو اس کی ذات سے اس کی ذات کے لئے ہمیشہ صادر ہے اور ایسی حمد کے ساتھ محمود ہے جو ملائکہ اور مخلوقات کے ذرہ ذرہ سے صادر ہو رہی ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہے کہ اگر تم کفر کرتے ہو تو اپنے آپ کو سخت عذاب کے لئے پیش کر کے خود کو نقصان پہنچاتے ہو اور مزید انعامات سے خود محروم ہوتے ہو اللہ تعالیٰ تو غنی اور خوبیوں والا ہے۔

اَلَمْ یَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّ عَادٍ وَّ ثَمُوْدَ ۛ۬ وَ الَّذِیْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۛؕ لَا یَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ ؕ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ فَرَدُّوْۤا اَیْدِیَهُمْ فِیْۤ اَفْوَاهِهِمْ

"کیا نہیں پہنچی تمہیں اطلاع ان (قوموں) کی جو پہلے گزر چکی ہے یعنی قوم نوح، عاد اور ثمود اور جو لوگ ان کے بعد گزرے[1] نہیں جانتا انہیں مگر اللہ تعالیٰ[2] لے آئے تھے ان کے پاس ان کے رسول روشن دلیلیں۔ پس انہوں نے (از راہ تمسخر) ڈال لئے اپنے ہاتھ اپنے مونہوں میں[3]"

[1] یہ استفہام تقریری ہے اور موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل سے کلام فرما رہے ہیں یا یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مستقل کلام ہے اور خطاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو ہے، یعنی کیا نہیں پہنچی تمہیں اطلاع ان قوموں کی جو پہلے گزر چکی ہیں، یعنی قوم نوح، عاد اور ثمود اور جو ان کے بعد گذرے مثلاً قوم ابراہیم نمرود وغیرہ قوم لوط، اصحاب الرس اصحاب مدین، اصحاب الایکہ اور قوم تبع۔

[2] ان کی کثرت کی وجہ سے ان کی تعداد کوئی نہیں جانتا سوائے اللہ تعالیٰ کے۔ یہ جملہ معترضہ ہے۔ ابن مسعود سے مروی ہے کہ انہوں نے یہ آیت تلاوت کی۔ پھر فرمایا کذب النسابون 'نسب بیان کرنے والوں نے جھوٹ بولا ہے(1)۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے فرمایا حضرت ابراہیم اور عدنان کے درمیان تیس صدیاں ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا(2)۔ مالک بن انس فرماتے ہیں انسان کا اپنا سلسلہ نسب آدم علیہ السلام تک بیان کرنا مکروہ ہے(3)۔ اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں ہے۔

[3] ابن مسعود فرماتے ہیں انہوں نے اپنے ہاتھوں کو غصہ سے کاٹا جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے عَضُّوْا عَلَیْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَیْظِ چباتے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 28 (التجاریۃ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 28 (التجاریۃ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 28 (التجاریۃ)

ہیں تم پر انگلیاں غصے سے (1)۔

ابن عباس فرماتے ہیں جب انہوں نے اللہ کی کتاب کی تلاوت سنی تو تعجب کرنے لگے اور اپنے ہاتھوں کو ازروئے تعجب اور استہزاء اپنے مونہوں پر رکھا جیسے وہ شخص رکھتا ہے جو ہنسی سے مغلوب ہو جائے (2)۔ الکلبی کہتے ہیں انہوں نے اپنے رسولوں کو خاموش رہنے اور اپنے منہ بند کرنے کا اشارہ کرنے کے لئے اپنے مونہوں پر ہاتھ رکھے تھے یا یہ معنی کہ انہوں نے رسولوں کے مونہوں پر ہاتھ رکھے تھے (3)۔ مقاتل فرماتے ہیں انہوں نے رسولوں کو خاموش کرنے کے لئے ان کے مونہوں پر ہاتھ رکھے تھے (4)۔ بعض علماء فرماتے ہیں الایدی بمعنی ایادی ہے جس کا معنی نعمتیں ہے۔ یعنی انہوں نے انبیاء کرام کی نعمتیں واپس کر دیں اور وہ نعمتیں ان کی پندو نصائح اور وہ احکام اور شریعتیں تھیں جو ان کی طرف وحی کی گئی تھیں کیونکہ جب انہوں نے ان ساری نعمتوں کو جھٹلایا اور انہیں قبول نہ کیا۔ تو گویا انہوں نے وہ وہاں واپس کر دیں جہاں سے وہ نعمتیں آئی تھیں۔ مجاہد اور قتادہ کے قول کا بھی یہی معنی ہے (5)۔ وہ فرماتے ہیں انہوں نے رسولوں کو جھٹلایا اور جو کچھ وہ احکام و شریعتیں لے کر آئے تھے وہ انہیں واپس لوٹا دیا کہا جاتا ہے ردت قول فلان فی فیہ۔ یعنی میں نے اس کو جھٹلایا بعض علما فرماتے ہیں فی افواھم کا معنی با فواھم ہے یعنی انہوں نے انبیاء کرام نعمتیں حکم و مواعظ اپنی زبانوں کے ساتھ لوٹا دیں۔

وَقَالُوْۤا اِنَّا كَفَرْنَا بِمَاۤ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ وَ اِنَّا لَفِیْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَنَاۤ اِلَیْهِ مُرِیْبٍ ۝۹

"اور (بڑی بے باکی سے) کہا ہم نے انکار کیا اس دین کا جس کے ساتھ تم بھیجے گئے ہو اور جس کی تم ہمیں دعوت دیتے ہو اس کی (صداقت کے بارے) میں ہم شک میں ہیں جو تذبذب میں ڈالنے والا ہے [1]"

[1] ان امتوں نے رسولوں کو کہا ہم نے انکار کیا اس دین کا جس کے ساتھ تم بھیجے گئے ہو۔ اور ہم اللہ تعالیٰ پر ایمان اور اس کی توحید جس کی طرف آپ ہمیں دعوت دیتے ہیں اس کے متعلق تذبذب میں ڈالنے والے شک میں مبتلا ہیں۔ مریب کا معنی شک کی جگہ یا شک والا ہے۔

قَالَتْ رُسُلُهُمْ اَفِی اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ یَدْعُوْكُمْ لِیَغْفِرَ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَ یُؤَخِّرَكُمْ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ قَالُوْۤا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ؕ تُرِیْدُوْنَ اَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا كَانَ یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا فَاْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ ۝۱۰

"ان کے پیغمبروں نے پوچھا کیا (تمہیں) اللہ تعالیٰ کے متعلق شک ہے [1] جو پیدا فرمانے والا ہے آسمانوں اور زمین کا [2] جو (اتنا کریم ہے کہ) بلاتا ہے تمہیں تا کہ بخش دے تمہارے گناہ اور جو (اتنا مہربان ہے کہ پیہم نافرمانی کے باوجود) [3] جو تمہیں کر روک دو ہمیں ان (بتوں) [4] سے جن کی پوجا ہمارے باپ دادا کیا کرتے تھے پس لے آؤ ہمارے پاس کوئی روشن دلیل [5]"

[1] یہ استفہام انکاری ہے شک ظرف کی وجہ سے مرفوع ہے ظرف پر ہمزہ داخل کیا گیا ہے کیونکہ کلام میں شک کیا گیا تھا نہ کہ شک میں یعنی ہم تو صرف تمہیں ایک اللہ کی طرف بلاتے ہیں۔ یہ ایک ایسا امر ہے جو شک کا احتمال ہی نہیں رکھتا کیونکہ معقولات' محسوسات میں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 29 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 29 (التجاریہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 29 (التجاریہ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 29 (التجاریہ) 5۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 135 (العلمیہ)

سے ہر چیز اس کے وجود اور وحدت پر دلالت کر رہی ہے اور اس کی طرف انہوں نے اپنے اس قول کے ساتھ اشارہ کیا۔

ﮰ یہ صفت یا بدل ہے۔

ﮱ وہ تمہیں اپنی طرف بلاتا ہے اور اس چیز پر ایمان لانے کی طرف بلاتا ہے جس کے ساتھ اس نے ہمیں تمہاری طرف مبعوث کیا ہے۔ من ذنوبکم تا کہ بخش دے تمہارے گناہ یا یہ معنی کہ وہ تمہیں مغفرت کی طرف بلاتا ہے۔ جیسے تمہارا قول ہے دعوتہ لینصرنی میں نے اسے بلایا تا کہ وہ میری مدد کرے من ذنوبکم میں من بعض علماء کے نزدیک زائدہ ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اسلام اپنے سے ماقبل گناہوں کو گرا دیتا ہے۔ اس حدیث کو مسلم نے عمرو بن العاص کی حدیث سے روایت کیا ہے(1)۔ بعض علماء فرماتے ہیں من بعضیہ ہے کیونکہ اسلام اس کے وہ گناہ ساقط کرتا ہے جو اس کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہوتے ہیں۔ حقوق العباد غصب کر کے جو مظالم کیے ہوتے ہیں وہ معاف نہیں ہوتے۔ بعض علماء فرماتے ہیں من کے ساتھ ذکر کفار سے خطاب کے وقت ہوتا ہے مومنین سے خطاب کے وقت من ذکر نہیں کیا گیا تا کہ دونوں خطابوں کے درمیان فرق ہو جائے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ کفار سے خطاب کے وقت مغفرت کا ذکر ایمان کے مرتبہ پر ہوتا ہے اور مومنین سے خطاب کے وقت مغفرت طاعت کی قبولیت اور گناہوں سے بچاؤ کے مرتبہ میں ہوتی ہے۔ اس طرح یہ مظالم کے خروج کو بھی شامل ہوگی۔

﮲ وہ تمہیں مہلت دیتا ہے اس مدت تک جو اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائی ہے اور اس نے عذاب کو تمہاری عمروں کے آخری حصے تک مؤخر کیا ہے وہ تمہیں جلدی عذاب نہیں دیتا۔ یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ سابقہ امتوں میں معذبین کے حق میں کفر پر اصرار ان کی ہلاکت کے لئے قضاء معلق تھا۔ اور قضاء معلق میں تھا کہ اگر وہ ایمان لائیں گے تو ان کی عمریں لمبی ہو جائیں گی۔

﮳ انہوں نے رسولوں کو کہا نہیں ہو تم مگر ہماری طرح بشر، ماہیت میں بھی، صورت میں بھی تمہیں ہم پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔ پھر تمہیں اس خصوصیت کے ساتھ کیوں خاص کیا گیا۔ اگر اللہ تعالیٰ بشروں کی طرف رسول بھیجتا تو افضل جنس سے بھیجتا جیسا کہ وہ کہتے تھے اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو فرشتے نازل کرتا تم یہ چاہتے ہو کہ ہمیں روک دو اس دعوت کے ذریعے ان بتوں کی عبادت سے جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کیا کرتے تھے۔ پس اپنی فضیلت یا اس کرامت کے استحقاق پر واضح حجت لے آؤ یا اپنے دعویٰ نبوت کی صحت پر دلیل پیش کرو۔ انہوں نے ان معجزات پر اکتفا نہ کیا جو رسول لے کر آئے تھے بلکہ اپنی طرف سے دوسری نشانیوں کی عناد اور ہٹ دھرمی کی بنا پر فرمائشیں کرنے لگے۔

قَالَتۡ لَهُمۡ رُسُلُهُمۡ اِنۡ نَّحۡنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُكُمۡ وَلٰـكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنۡ يَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِهٖ ؕ وَمَا كَانَ لَنَاۤ اَنۡ نَّاۡتِيَكُمۡ بِسُلۡطٰنٍ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰهِ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلۡيَتَوَكَّلِ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ۞ وَمَا لَنَاۤ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَقَدۡ هَدٰٮنَا سُبُلَنَا ؕ وَلَنَصۡبِرَنَّ عَلٰى مَاۤ اٰذَيۡتُمُوۡنَا ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلۡيَتَوَكَّلِ الۡمُتَوَكِّلُوۡنَ ۞

"کہا انہیں ان کے رسولوں نے کہ ہم تمہاری طرح انسان ہی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ احسان فرماتا ہے جس پر چاہتا ہے اپنے بندوں سے ﮰ اور ہمیں یہ طاقت نہیں کہ ہم لے آئیں تمہارے پاس کوئی دلیل بجز اذن خداوندی کے ﮱ اور مومنوں کو

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 176 (قدیمی)

صرف اللہ تعالیٰ پر ہی بھروسہ کرنا چاہیے [3] اور ہم کیوں نہ بھروسہ کریں اللہ تعالیٰ پر حالانکہ اس نے دکھائی ہیں ہمیں (کامیابی کی) راہیں ہم ضرور صبر کریں گے تمہاری ایذا رسانیوں پر [4] پس اللہ تعالیٰ پر ہی توکل کرنا چاہیے توکل کرنے والوں کو [5]"

[1] یعنی نبوت وغیرہ کا احسان فرماتا ہے، انبیاء کرام نے نبوت کے ساتھ اختصاص کی وجہ بیان کی۔ جس میں مشارکت تسلیم کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے احسان اور اس کے فضل کو بیان فرمایا۔

[2] یعنی تمہاری فرمائشیں پوری کرنا ہمارے اختیار اور استطاعت میں نہیں ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے متعلق امر ہے، ہر نبی کو مخصوص معجزات عطا کیے گئے تھے جو ان کے دعویٰ نبوت کی صحت پر استدلال کے لئے کافی ہیں۔

[3] گویا یہ ارشاد ہے ان لوگوں کو جو انبیاء کرام پر ایمان لائے۔ کہ کفار کی معاندت میں اللہ تعالیٰ پر توکل کرو اور صبر کی اتباع کرو۔ اس سے انہوں نے اپنی ذات کا قصد کیا تھا۔ یا گویا انہوں نے کہا کہ ہمارا حق اللہ پر توکل کرنا ہے۔ اس سے یہ شعور ملتا ہے کہ اللہ پر ایمان توکل کا تقاضا کرتا ہے کیونکہ جب انسان یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ شر و خیر کا پیدا کرنے والا عطا کرنے والا روکنے والا صرف اور صرف اللہ واحد وقہار ہے تو اسے اپنے معاملات بھی اللہ کے سپرد کرنے چاہئیں۔ پھر انہوں نے اس شعوری بات کو صراحۃً بیان کیا ہے۔

[4] ہمارے پاس اللہ تعالیٰ پر عدم توکل کا کوئی عذر نہیں ہے اور ہمیں اللہ نے ہدایت دی اپنے راستوں کو جن کے ذریعے ہم پہچانتے ہیں کہ تمام امور اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ پس ہم اس پر ایمان لائے ہیں، ہم اور ہمارے متبعین صبر کریں گے؟ تمہاری اذیت رسانیوں پر، یہ قسم محذوف کا جواب ہے، یعنی واللہ ینصرون انہوں نے اپنے توکل اور کفار کی اذیت رسانیوں کی عدم پرواہ کو قسم کے ساتھ مؤکد کیا۔

[5] ایمان جس توکل کا تقاضا کرتا ہے اس پر ثابت رہنا چاہیے

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَاۤ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ؕ فَاَوْحٰۤى اِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ ۙ﴿۱۳﴾

"اور کہا کفار نے اپنے رسولوں کو کہ ہم ضرور باہر نکال دیں گے تمہیں اپنے ملک سے یا تمہیں لوٹ آنا ہوگا ہماری ملت میں [1] پس وحی بھیجی ان کی طرف ان کے پروردگار نے کہ (مت گھبراؤ) [2] ہم تباہ کردیں گے ان ظالموں کو [3]"

[1] کفار رسولوں کی رسالت کو جھٹلانے اور ملک سے باہر نکالنے کی دھمکی دینے میں یک زبان تھے اور انہوں نے قسم اٹھائی تھی کہ دو کاموں میں سے ایک کام ضرور ہوگا تو ہم انہیں باہر نکالیں گے یا انہیں ہماری ملت کی طرف لوٹنا ہوگا۔ لوٹنے سے مراد یہ کہ وہ ہماری ملت میں شامل ہو جائیں کیونکہ رسولوں نے کفار کی ملت کو پہلے بھی کبھی اختیار نہیں کیا تھا۔ یہ بھی جائز ہے کہ خطاب ہر رسول اور ہر اس شخص کو ہو جو ان پر ایمان لایا ہو، ہر ایک جماعت کو غلبہ دیا گیا۔ یا او تقسیم کے لئے ہو، یعنی جو ہماری ملت کی طرف نہیں لوٹیں گے ہم انہیں ضرور نکال دیں گے اور جو ہماری ملت کی طرف لوٹ آئیں گے ہم انہیں نہیں نکالیں گے۔ یہ بھی جائز ہے کہ او بمعنی الا ان یا الی ان ہو، یعنی ہم تمہیں نکال دیں گے مگر یہ کہ تم ہماری ملت کی طرف لوٹ آؤ یا یہاں تک کہ تم لوٹ آؤ۔

[2] ھم ضمیر کا مرجع رسول ہیں۔

۳؎ یا تو اس سے پہلے قول محذوف ہے یا ایحاء کو قول کے قائم مقام رکھا گیا ہے کیونکہ یہ قول کی ایک قسم ہے یعنی (گھبراؤ مت) ہم تباہ کر دیں گے ان ظالموں کو۔

وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِیْ وَخَافَ وَعِیْدِ ﴿۱۴﴾

"نیز ہم یقیناً آباد کریں گے تمہیں (ان کے) ملک میں انہیں (برباد کرنے) کے بعد ۱؎ یہ (وعدہ نصرت) ہر اس شخص کے لئے ہے جو ڈرتا ہے میرے روبرو کھڑے ہونے سے ۲؎ اور خائف ہے میری دھمکی سے ۳؎"

۱؎ خطاب رسولوں اور ان پر ایمان لانے والوں کو ہے الارض سے مراد کفار کے شہر ہیں۔ ذٰلک کا مشار الیہ دشمنوں کو ہلاک کرنا رسولوں اور ایمانداروں کو ان کے ملک پر تسلط دینا ہے۔

۲؎ یہ (وعدہ نصرت) ہر اس شخص کے لئے ہے جو ڈرتا ہے میرے روبرو کھڑا ہونے سے قیامت کے روز اس کی نظیر قرآن حکیم میں ہے لِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ بندے کے قیام کو اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ یا یہ معنی کہ جو میرے موقف سے ڈرتا ہے اس سے مراد وہ جگہ جہاں قیامت کے روز بندے فیصلہ سننے کے لئے منتظر کھڑے ہوں گے۔ یا یہ معنی کہ جہاں پر میرا قیام ہوگا۔ یا یہ معنی کہ میرے اعمال کے حفاظت کرنے سے ڈرتا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں مقام کا لفظ یہاں مقحم ہے۔ مطلب یہ کہ جو مجھ سے ڈرتا ہے۔

۳؎ ورش نے صرف وصل میں یاء کو باقی رکھا ہے اور باقی قراء دونوں حالتوں میں یاء کو حذف کرتے ہیں، یعنی جو میرے عذاب کی دھمکی سے ڈرتا ہے یا جس عذاب کا کفار سے میں نے وعدہ کیا ہے اس سے ڈرتا ہے۔

وَاسْتَفْتَحُوْا وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِیْدٍ ﴿۱۵﴾

"اور رسولوں نے حق کی فتح کے لئے التجا کی (جو دعا قبول ہوئی) ۱؎ اور نامراد ہو گیا ہر سرکش منکر حق ۲؎"

۱؎ رسولوں نے اللہ تعالیٰ سے دشمنوں پر فتح کا سوال کیا یا ان کے درمیان اور ان کے دشمنوں کے درمیان فیصلہ کا سوال کیا۔ یہ الفتاحۃ سے مشتق ہوگا جیسے ارشاد ہے رَبَّنَا افْتَحْ بَیْنَنَا وَبَیْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ (اے ہمارے پروردگار ہمارے درمیان اور ہماری قوم کے درمیان حق کیساتھ فیصلہ فرما)۔ اس کا عطف فاوحی پر ہے اور ضمیر کا مرجع انبیاء کرام ہیں۔ مجاہد کا یہی قول ہے (1)۔ ابن جریر، ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے مجاہد سے اسی طرح روایت کیا ہے اور قتادہ نے فرمایا جب رسول اپنی قوم کے ایمان سے مایوس ہو گئے تو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے اپنی قوم پر فتح اور عذاب کا سوال کیا جیسا کہ نوح علیہ السلام نے کہا تھا رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَی الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ دَیَّارًا اے میرے رب نہ چھوڑ زمین پر کافروں میں سے کسی کو بستا ہوا اور موسیٰ علیہ السلام نے یہ کہا تھا رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰۤی اَمْوَالِهِمْ اے ہمارے رب برباد کر ان کے اموال۔ یا ضمیر کا مرجع کفار ہیں۔ ابن عباس اور مقاتل کا یہی قول ہے (2) جیسا کہ انہوں نے دعا مانگی تھی اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَیْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اے اللہ اگر یہ سچ ہے تیری جانب سے تو پھر ہم پر آسمان سے پتھر برسا۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ دونوں فریقوں کے لئے ہے کہ ہر ایک فریق نے سوال کیا تھا کہ وہ حق پرستوں کی مدد فرمائے اور باطل کے پجاریوں کو ہلاک کر دے كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَیْهِمْ فَرِحُوْنَ ہر گروہ اپنے نظریات پر مسرور ہے۔

۲؎ یہ محذوف کلام پر معطوف ہے۔ تقدیر یوں ہے فَفُتِحَ لَهُمْ فَاَصْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَخَابَ یعنی دعا قبول ہوئی مومنین کو کامیابی نصیب

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 30 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 30 (التجاریہ)

ہوئی اور ہر سرکش اور متکبر ہلاک اور خائب وخاسر ہوا۔ قاموس میں ہے تجبر وتکبر اللہ تعالیٰ کو جبار کہا جاتا ہے کیونکہ وہ حق کے ساتھ تکبر فرماتا ہے اور ہر سرکش کے لئے استعمال ہوتا ہے کہ وہ باطل کے ساتھ تکبر کرتا ہے۔ یا جبار سے مراد ہر وہ شخص ہے جس کے دل میں رحمت دخول نہیں ہوتا اور بغیر حق کے قتال کرنے والا ہوتا ہے۔ یا اس سے مراد وہ متکبر ہے جو کسی کا اپنے اوپر کوئی حق نہیں سمجھتا۔ امام بغوی فرماتے ہیں جبار وہ ہے جو کسی کو اپنے سے بلند نہیں سمجھتا (1)۔ الجبر یہ ایسی بلندی طلب کرنا جس کے اوپر بلندی نہ ہو اور اس وصف کا مستحق صرف اللہ تعالیٰ ہے، جو اس کے علاوہ اس وصف کا دعویٰ کرتا ہے وہ لعنت اور دوری کا مستحق ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں الجبار وہ ہوتا ہے جو اپنی مرضی کے مطابق مخلوق کو مجبور کرتا ہے۔ عنید جو حق کی مخالفت اور حق سے پہلوتہی کرنے والا ہو۔ قاموس میں ہے عَنَدَ خالَفَ الْحَقَّ عارِفًا بِهٖ فَهُوَ عَنِيْدٌ وَّ عَانِدٌ یعنی جو حق کو حق جانتے ہوئے اس کی مخالفت کرے۔ ابن عباس فرماتے ہیں جو حق سے اعراض کرنے والا ہو۔ مقاتل فرماتے ہیں اس کا معنی تکبر کرنے والا ہے۔ قتادہ فرماتے ہیں عنید وہ ہوتا ہے جو لا الٰہ الا اللہ کہنے کا منکر ہو (2)۔

مِّنْ وَّرَآىٕهٖ جَهَنَّمُ وَ یُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِیْدٍۙ (۱۶)

"اس (نامرادی) کے بعد جہنم ہے [1] اور پلایا جائے گا اسے خون اور پیپ کا پانی [2]"

[1] یعنی اس کے آگے جہنم ہے، گویا وہ اس کے پہنچنے کی جگہ ہے، وہ دنیا میں اس جہنم کے کنارے پر کھڑا ہے، آخرت میں اسے جہنم میں دھکیلا جائے گا۔ بعض فرماتے ہیں اس کا مطلب ہے اس کو اس زندگی کے بعد جہنم میں ڈالا جائے گا۔ مقاتل فرماتے ہیں وراء کا معنی بعد ہے (3)۔ ابو عبیدہ فرماتے ہیں وراء کا لفظ اضداد میں سے ہے، یعنی دونوں معانی میں استعمال ہوتا ہے اور اس کا حقیقی معنی ہے وہ چیز جو تجھ سے پوشیدہ ہو۔

[2] اس کا محذوف کلام پر عطف ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے مِنْ وَّرَآىٕهٖ جَهَنَّمُ یُلْقٰی فِیْهَا وَ یُسْقٰی اس کے بعد جہنم ہے جس میں اسے پھینکا جائے گا اور پلایا جائے گا خون اور پیپ کا پانی، یعنی ایسا پانی جو دوزخیوں کی کھالوں اور پیٹوں سے نکلا ہوگا جو خون اور پیپ سے ملا ہوا ہوگا۔ صدید ماء کا عطف بیان ہے۔ محمد بن کعب فرماتے ہیں جو زانیوں کی شرمگاہوں سے نکلے گا وہ کافروں کو پلایا جائے گا (4)۔ بیہقی نے مجاہد سے ماء صدید کی تفسیر پیپ اور خون نقل کی ہے۔ امام احمد، ترمذی اور نسائی حاکم، ابن جریر، ابن ابی حاتم، ابن المنذر اور ابن ابی الدنیا نے صفت النار میں بیہقی اور بغوی نے ابی امامہ سے انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت کے تحت روایت کیا ہے کہ یہ خون اور پیپ اس کے قریب کیا جائے گا تو وہ اسے ناپسند کرے گا۔ جب اسے مزید قریب کیا جائے گا تو اس کا چہرہ جل جائے گا اور اس کے سر کے اوپر گرے گا۔ جب وہ اسے پئے گا تو وہ اس کی انتڑیوں کو کاٹ دے گا حتی کہ وہ اس کی دبر سے نکل جائے گا (5)۔ ارشاد ہے وَسُقُوْا مَآءً حَمِیْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَآءَهُمْ۔ وَ اِنْ یَّسْتَغِیْثُوْا یُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ یَشْوِی الْوُجُوْهَ "اور انہیں کھولتا ہوا پانی پلایا جائے گا اور وہ کاٹ دے گا ان کی آنتیں اور اگر وہ فریاد کریں گے تو ان کی فریاد رسی کی جائے گی ایسے پانی کیساتھ جو پیپ کی طرح (غلیظ) ہے اور (اتنا گرم) کہ بھون ڈالتا ہے چہروں کو۔

یَّتَجَرَّعُهٗ وَ لَا یَكَادُ یُسِیْغُهٗ وَ یَاْتِیْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّ مَا هُوَ بِمَیِّتٍؕ وَ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 30 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 30 (التجاریہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 30 (التجاریہ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 30 (التجاریہ)
5۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 82 (وزارت تعلیم)

مِنْ وَّرَآىٕهٖ عَذَابٌ غَلِیْظٌ ﴿۱۷﴾

”وہ بمشکل ایک ایک گھونٹ بھرے گا اور حلق سے نیچے نہ اتار سکے گا[1] اور آئے گی اس کے پاس موت ہر سمت سے[2] اور وہ (بایں ہمہ) مرے گا نہیں (علاوہ ازیں) اس کے پیچھے ایک اور سخت عذاب ہوگا[3]“

[1] یہ ماء کی صفت ہے یا یسقی کی ضمیر سے حال ہے اور حلق سے نیچے نہ اتار سکے گا۔ یہ نیچے کیسے اترے گا بلکہ گلے میں اٹک کر رہ جائے گا اور عذاب اور تکلیف بڑھ جائے گی۔ سوغ کا معنی شراب کا سہولت سے حلق سے نیچے اترنا اور نفس کا اسے قبول کرنا ہے۔ قاموس میں ہے ساغ الشراب سوغا یعنی اس کا مدخل آسان ہے۔

[2] یعنی موت کے اسباب مثلاً شدائد اور آلام اسے پہنچیں گے ہر طرف سے، یعنی موت اسے ہر طرف سے گھیر لے گی۔ یا یہ معنی کہ موت کی سختیاں اور موت کی تکالیف جسم کے انگ انگ کو پہنچیں گی۔ ابن ابی شیبہ، ابن جریر، ابن المنذر، اور ابن ابی حاتم نے ابراہیم التیمی سے روایت کیا ہے کہ موت اسے جسم کے ہر ہر بال کی جگہ سے آئے گی(1)۔

[3] ابن جریج کہتے ہیں اس کا سانس اس کے حلق میں اٹک جائے گا، نہ تو باہر نکلے گا اور نہ اپنی جگہ واپس جائے گا(2)۔ ابن المنذر نے فضیل بن عیاض سے روایت کیا ہے کہ وہ اپنے سانسوں کو روک لے گا(3)۔

بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی ہے کہ وہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔ بعض فرماتے ہیں یہ آیت کریمہ انبیاء کرام کے قصہ سے منقطع ہے اور اہل مکہ کے حق میں نازل ہوئی ہے کہ انہوں نے بارش طلب کی جن سالوں میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت حق دے کر ان کی طرف مبعوث فرمایا۔ پس اللہ تعالیٰ نے کفار کی امیدوں کو ثمر بار نہ فرمایا اور ان سے وعدہ کیا کہ بارش کے بجائے دوزخیوں کی پیپ پلائی جائے گی۔

مَثَلُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ ﰳاشْتَدَّتْ بِهِ الرِّیْحُ فِیْ یَوْمٍ عَاصِفٍ ؕ لَا یَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰى شَیْءٍ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِیْدُ ﴿۱۸﴾

”ان لوگوں کی مثال جنہوں نے اپنے رب کا انکار کیا ایسی ہے کہ ان کے اعمال راکھ کا ڈھیر ہیں جسے تند ہوا تیزی سے اڑا کر لے گئی سخت آندھی کے دن[1] نہ حاصل کریں گے ان اعمال سے جو انہوں نے کمائے تھے کوئی فائدہ[2] یہ (اعمال کا اکارت جانا ہی) بہت بڑی گمراہی ہے[3]“

[1] ان لوگوں کی مثال جنہوں نے اپنے رب کا انکار کیا یعنی ان کی صفت انتہائی عجیب ہے۔ ترکیب کلام میں مثل مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے یعنی فیما یتلی علیکم یہ جملہ مثلھم کے بیان کے لئے مستقل کلام ہے یا یہ جملہ مثل کی خبر ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اعمالھم مثل سے بدل ہے اور خبر کرماد ہے۔

نافع نے الریاح یعنی جمع پڑھا ہے اور باقی قراء نے مفرد پڑھا ہے۔ عصوف ہواؤں کی تیزی کو کہتے ہیں اور زمانہ کے ساتھ اس کی صفت مبالغہ کے لئے لگائی گئی ہے جیسے نهاره صائم وليله قائم اور اعمال سے مراد وہ اعمال ہیں جنہیں وہ نیکیاں گمان کرتے تھے اور اس پر حسن جزاء کی امید رکھتے تھے جیسے صدقہ، صلہ رحمی، مظلوم کی مدد، غلام آزاد کرنا وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اعمال کو ضائع ہونے

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 138 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 31 (التجاریہ) 3۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 139 (العلمیہ)

میں راکھ کے ساتھ تشبیہ دی ہے جنہیں سخت آندھیاں اڑا لے گئی ہوں کیونکہ ان اعمال کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اللہ تعالیٰ کی رضا پر نہ تھی۔ یا اس لئے کہ وہ ایسے بتوں کی خاطر تھے جنہیں اپنی عبادت کا شعور ہی نہ تھا اور نہ وہ کسی قدرت کے مالک تھے۔

۲؎ یعنی کفار روز قیامت قادر نہ ہوں گے ان اعمال کا فائدہ حاصل کرنے پر جو انہوں نے دنیا میں کیے تھے یعنی ان کا کوئی ثواب وصلہ نہ پائیں گے، ان کے ضائع ہونے کی وجہ سے کوئی اثر نہیں پائیں گے۔ یہ اس تمثیل کا خلاصہ ہے۔

۳؎ یہ ان کی گمراہی کی طرف اشارہ ہے حالانکہ وہ اپنے آپ کو محسن خیال کرتے تھے۔

۴؎ حق سے بہت دور تھے حتیٰ کہ جن کاموں کو وہ نیکیاں شمار کرتے تھے وہ بھی گمراہ تھے کیونکہ ان میں بھی اللہ کے ساتھ شرک تھا اور ان میں مقصود غیر اللہ کی رضا تھی۔ جب یہ اعمال جنہیں وہ نیکیاں گردانتے تھے وہ گمراہی ہیں تو پھر ان کی برائیوں کا کیا حال ہوگا۔

الم تر ان اللہ خلق السموت والارض بالحق ان یشا یذھبکم ویات بخلق جدید ﴿۱۹﴾ وما ذلک علی اللہ بعزیز ﴿۲۰﴾

"کیا تم نے ملاحظہ نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ نے ہی پیدا کیا ہے آسمانوں اور زمین کو ۱؎ حق کے ساتھ ۲؎ اگر وہ چاہے تو تم سب کو ہلاک کر دے اور لے آئے کوئی نئی مخلوق اور یہ اللہ تعالیٰ کے لئے کوئی مشکل نہیں ۳؎"

۱؎ حمزہ اور کسائی نے خلق السموت اور سورۂ نور میں خالق کل دابۃ پڑھا ہے یعنی فاعل کے وزن پر مضاف کر کے پڑھا ہے اور باقی قراء نے خلق ماضی کا صیغہ پڑھا ہے اور الارض کو حمزہ، کسائی نے جر کے ساتھ اور باقی قراء نے نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔

۲؎ حکمت بالغہ کے ساتھ اور پیدا کیا جیسا کہ اسے پیدا کرنے کا حق تھا۔ یہ صانع کے وجود پر دلیل ہے جو لوگوں کی حق اور ایمان کی طرف راہنمائی فرماتی ہے۔

۳؎ اگر وہ چاہے تو تمہیں ہلاک کر دے اور لے آئے کوئی نئی مخلوق جو تم سے زیادہ اطاعت شعار ہو۔ اس آیت کو خلق السموت پر مرتب فرمایا ہے کیونکہ جو آسمانوں اور زمینوں کا خالق ہے جو دوسری تخلیق کے ساتھ تبدیلی پر بھی قدرت رکھتا ہے اور یہ اس کے لئے کوئی مشکل نہیں ہے جیسا کہ خود ہی فرمایا کہ اللہ کے لئے کوئی مشکل و متعذر نہیں ہے کیونکہ وہ ذاتی طور پر قادر ہے اور اس کی قدرت کسی ایک چیز میں منحصر نہیں ہے۔ پس جس کی یہ شان ہے وہ اس لائق ہے کہ اس کی عبادت کی جائے اور اس کی اطاعت کی جائے اور اس سے ثواب کی امید رکھی جائے اور اس کے عذاب سے ڈرا جائے۔

وبرزوا للہ جمیعا فقال الضعفؤا للذین استکبروا انا کنا لکم تبعا فھل انتم مغنون عنا من عذاب اللہ من شیء قالوا لو ھدنا اللہ لھدینکم سواء علینا اجزعنا ام صبرنا ما لنا من محیص ﴿۲۱﴾

"اور (روز حشر) اللہ تعالیٰ کے سامنے (سب چھوٹے بڑے) حاضر ہوں گے ۱؎ تو کہیں گے کمزور (پیروکار) ان (سرداروں) سے جو متکبر تھے (اے سردارو!) ۲؎ ہم تو (ساری عمر) تمہارے فرمانبردار رہے ہے ۳؎ پس کیا (آج) تم ہمیں بچا سکتے ہو عذاب الٰہی سے ۴؎ وہ کہیں گے اگر اللہ تعالیٰ ہمیں ہدایت دیتا تو ہم ضرور تمہاری راہنمائی کرتے ۵؎ [illegible]

ہے ہمارے لئے خواہ ہم گھبرائیں یا صبر کریں ہمارے لئے (آج) کوئی راہ فرار نہیں ہے[6]"

[1] قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کے محاسبہ کے لئے سب اپنی قبروں سے نکل کر اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہوں گے۔ یہاں ماضی کا صیغہ ذکر فرمایا کیونکہ اس ظہور و حضور کا وقوع یقینی اور محقق ہے۔

[2] ضعفاء ضعیف کی جمع ہے اور اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو دنیا کا مال و متاع کم رکھنے کی وجہ سے کمزور حال تھے یا ضعیف الرائے مراد ہیں، یعنی ضعفاء نے ان سرداروں سے کہا جو لوگوں پر تکبر اور اپنی بڑائی کا اظہار کرتے تھے اور انبیاء کرام کی پیروی کرنے سے منع کرتے تھے۔

[3] ہم رسولوں کی تکذیب اور ان کی پند و نصائح سے اعراض کرنے میں تمہاری تقلید کرتے تھے۔ تبعا یہ تابع کی جمع ہے جیسے حارس کی جمع حرس ہے۔

[4] من بیانیہ ہے اور حال واقع ہو رہا ہے اور من شئ سے پہلے من تبعیضیہ ہے اور مفعول بہ واقع ہو رہا ہے، یعنی کیا تم اللہ کے عذاب میں سے کچھ حصہ ہم سے دور کر سکتے ہو۔ یہ بھی احتمال ہے کہ من دونوں جگہ بعضیہ ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پہلا مفعول ہو اور دوسرا مصدر ہو یعنی کیا تم ہم سے بعض عذاب کو کچھ دور کر سکتے ہو۔

[5] متکبر اور سرداران کفار اپنے پیروکاروں کے عتاب کا جواب دیتے ہوئے اور جو کچھ انہوں نے ان کے ساتھ گمراہ کن سلوک کیا تھا اس پر معذرت کرتے ہوئے کہیں گے۔ اگر اللہ تعالیٰ ہمیں ایمان کی ہدایت دیتا تو ہم تمہیں بھی ہدایت کی طرف بلاتے لیکن ہم خود بھی گمراہ تھے، تمہیں بھی گمراہ کیا، یعنی ہم نے تو تمہارے لئے وہی پسند کیا تھا جو ہم اپنے لئے پسند کرتے تھے۔ یا یہ معنی کہ اگر ہمیں اللہ تعالیٰ عذاب سے نجات کا راستہ عطا فرماتا تو ہم تمہاری بھی راہنمائی کرتے اور تم سے اس عذاب کو دور کرتے جیسا کہ ہم نے تمہیں اس عذاب میں مبتلا کیا ہے۔ لیکن ہمارے لئے تو اپنی خلاصی اور نجات کا رستہ بند کر دیا گیا ہے۔

[6] ہم پر جزع فزع کرنا اور صبر کرنا برابر ہے۔ یہ جملہ حال واقع ہو رہا ہے۔ ہمارے لئے اب کوئی نجات گاہ اور راہ فرار نہیں ہے۔ یہ الحیص سے مشتق ہے جس کا معنی راہ فرار اختیار کرنا ہے۔ محیص یا تو مصدر ہے جیسے غیب یا ظرف مکان ہے جیسے مبیت اور یہ جملہ یا تو رئیسوں کی کلام کا حصہ ہے اور دونوں فریقوں کا کلام ہے۔ مقاتل کہتے ہیں وہ دوزخ میں آپس میں مشورہ کریں گے آؤ مل کر ہم اس عذاب اور پریشانی اور گھبراہٹ کا اظہار کریں۔ پس وہ پانچ سو سال جزع فزع کریں گے لیکن انہیں اس سے کچھ نفع نہ ہوگا۔ پھر وہ کہیں گے آؤ اب صبر کریں۔ وہ پانچ سو سال صبر کریں گے تو صبر بھی کچھ نفع بخش نہ ہوگا۔ اس وقت کہیں گے ہمارے لئے جزع فزع کرنا یا صبر کرنا برابر ہے، ہمارے لئے کوئی راہ فرار نہیں ہے (1)۔

ابن ابی حاتم، طبرانی اور ابن مردویہ نے کعب بن مالک سے مرفوعاً اس آیت کے متعلق روایت نقل کی ہے کہ دوزخی کہیں گے آؤ ہم صبر کریں۔ پس وہ پانچ سو سال صبر کریں گے۔ جب کچھ فائدہ نظر نہ آئے گا تو کہیں گے سواءٌ علینا الخ۔ محمد بن کعب القرظی کہتے ہیں مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ دوزخی دوزخ کے داروغوں سے مدد طلب کریں گے (2) وَقَالَ الَّذِیْنَ فِی النَّارِ لِخَزَنَةِ جَهَنَّمَ ادْعُوْا رَبَّكُمْ یُخَفِّفْ عَنَّا یَوْمًا مِّنَ الْعَذَابِ کہیں گے سارے دوزخی جہنم کے داروغوں کو کہ دعا کرو اپنے رب سے کہ ایک دن تو ہمارے عذاب میں (کچھ)

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 32 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 32 (التجاریہ)

تخفیف فرما دے تو دوزخ کے داروغے کہیں گے کہ اَوَلَمْ تَكُ تَاْتِيْكُمْ رُسُلُكُمْ بِالْبَيِّنٰتِؕ قَالُوْا بَلٰىؕ دوزخ کے فرشتے کہیں گے اُدْعُوْاۚ وَ مَا دُعٰٓؤُا الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ جب وہ دوزخ کے فرشتوں کی مدد سے مایوس ہو جائیں گے تو پھر پکاریں گے یٰمٰلِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَؕ اے مالک (داروغہ جہنم) تمہارا رب ہمارا کام تمام کردے وہ موت کا سوال کریں گے مگر وہ انہیں اسی 80 سال جواب نہ دے گا اور ایک سال 360 دن کا ہوگا اور ایک دن ہزار سال کا ہوگا۔ اسی سال کے بعد ارشاد ہوگا اِنَّكُمْ مّٰكِثُوْنَ۝ ۔

جب وہ مایوس ہو جائیں گے تو ایک دوسرے کو کہیں گے مصیبت تو نازل ہو چکی ہے، آیئے صبر کریں۔ شاید صبر ہمیں فائدہ دے جیسا کہ دنیا میں نیکوکاروں نے طاعت الٰہی پر صبر کیا تو انہیں نفع پہنچا۔ پس وہ تمام مل کر صبر کریں گے۔ جب صبر کی مدت لمبی ہوگی تو جزع وفزع کریں گے۔ جب اس کی مدت بھی طویل ہو جائے گی تو کہیں گے سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِيْصٍ فرمایا اس وقت ابلیس خطاب کرے گا اور کہے گا۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے جو وعدہ تم سے کیا تھا وہ وعدہ سچا تھا اور میں نے بھی تم سے وعدہ کیا تھا۔ پس میں نے تم سے وعدہ خلافی کی اور نہیں تھا میرا تم پر کچھ زور مگر یہ کہ میں نے تم کو (کفر) کی دعوت دی اور تم نے (فوراً) قبول کر لی میری دعوت۔ سو تم مجھے ملامت نہ کرو بلکہ اپنے آپ کو ملامت کرو کیونکہ تمہیں ایمان کی طرف دعوت دی گئی۔ پس تم نے (ایمان کی بجائے) کفر کیا۔ دوبارہ وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کریں گے رَبَّنَآ اَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا اِنَّا مُوْقِنُوْنَ اے ہمارے رب ہم نے (اپنی آنکھوں سے) دیکھ لیا اور (کانوں سے) سن لیا۔ پس ایک بار بھیج ہمیں (دنیا میں) اب ہم نیک عمل کریں گے۔ ہمیں اب پورا یقین آ گیا ہے۔ ان کے اس سوال کو یہ فرما کر رد کر دیا جائے گا۔ وَلَوْ شِئْنَا لَاٰتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰىهَا اگر ہم چاہتے تو ہم دے دیتے ہر شخص کو اس کی ہدایت۔ تیسری مرتبہ پھر وہ عرض کریں گے رَبَّنَآ اَخِّرْنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍۙ نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَنَتَّبِعِ الرُّسُلَؕ اے ہمارے رب ہمیں مہلت دے تھوڑی دیر کے لئے، ہم تیری دعوت پر لبیک کہیں گے اور ہم رسولوں کی پیروی کریں گے تو ان کی اس درخواست کو یہ فرما کر رد کیا جائے گا۔ اَوَلَمْ تَكُوْنُوْٓا اَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلُ مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍ (اے کافرو) کیا تم قسمیں نہ اٹھایا کرتے تھے اس سے پہلے کہ تمہیں یہاں سے کہیں نہیں جانا۔ پھر وہ چوتھی مرتبہ عرض کریں گے رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُؕ اے ہمارے رب (ایک بار) ہمیں یہاں سے نکال، ہم بڑے نیک کام کریں گے، ایسے نہیں جیسے پہلے ہم کرتے تھے۔ تو جواباً یہ ارشاد ہوگا اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَآءَكُمُ النَّذِيْرُؕ کیا ہم نے تمہیں اتنی لمبی عمر نہ دی تھی کہ جس میں (با سانی) نصیحت قبول کر سکتا جو نصیحت قبول کرنا چاہتا اور تشریف لے آیا تھا تمہارے پاس ڈرانے والا۔

وہ اسی حالت میں رہیں گے جتنا اللہ تعالیٰ چاہے گا پھر ارشاد ہوگا اَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ۝ کیا ہماری آیتیں نہ پڑھی جاتی تھیں تمہارے سامنے اور تم انہیں جھٹلایا کرتے تھے۔ جب وہ یہ سنیں گے تو یہ کہیں گے کیا ہمارا رب ہم پر رحم نہیں فرمائے گا۔ پھر وہ پکاریں گے رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا وَكُنَّا قَوْمًا ضَآلِّيْنَ۔ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْهَا فَاِنْ عُدْنَا فَاِنَّا ظٰلِمُوْنَ اے ہمارے رب غالب آ گئی تھی ہم پر ہماری بدبختی اور ہم گم کردہ راہ قوم تھے اے ہمارے مالک (ایک بار) نکال ہمیں اس سے۔ پھر ہم اگر نافرمانی کی طرف رجوع کریں تو پھر ہم ظالم ہوں گے۔ تو جواب ملے گا اخْسَـُٔوْا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ پھٹکارے ہوئے پڑے رہو اس میں اور مت بولو میرے ساتھ۔ پس ان کی امید اور پکار منقطع ہو جائے گی۔ پھر ایک دوسرے کے چہروں پر پھونکیں ماریں گے اور ان پر آگ مسلط کر دی جائے گی۔

وَ قَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَ وَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ ؕ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّاۤ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ مَاۤ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَاۤ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ ؕ اِنِّيْ كَفَرْتُ بِمَاۤ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ ؕ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۲﴾

"اور شیطان کہے گا جب (سب کی قسمت کا) فیصلہ ہو چکے گا [1] بے شک اللہ تعالیٰ نے جو وعدہ تم سے کیا تھا [2] وہ سچا تھا اور میں نے تم سے وعدہ کیا تھا [3] پس میں نے تم سے وعدہ خلافی کی [4] اور نہیں تھا میرا تم پر کچھ زور مگر یہ کہ میں نے تم کو (کفر) کی دعوت دی [5] اور تم نے فوراً قبول کر لی میری دعوت سو تم مجھے ملامت نہ کرو بلکہ اپنے آپ کو ملامت کرو [6] نہ میں (آج) تمہاری دادرسی کر سکتا ہوں اور نہ تم میری فریادرسی کر سکتے ہو [7] میں انکار کرتا ہوں اس امر سے کہ تم نے مجھے شریک بنایا اس سے پہلے [8] بے شک ظالموں کے لئے دردناک عذاب ہے [9]"

[1] یعنی جنتی جنت میں دوزخی دوزخ میں داخل ہو چکے ہوں گے۔ مقاتل فرماتے ہیں دوزخ میں شیطان کے لئے ایک منبر رکھا جائے گا تمام کفار اپنے اپنے سرداروں کے ساتھ جمع ہوں گے تو وہ جن و انس کے بدبختوں کو خطاب کرتے ہوئے کہے گا (1)۔ طبرانی نے الکبیر میں ابن المبارک، ابن جریر، ابن مردویہ، ابن ابی حاتم اور بغوی نے اپنی اپنی تفاسیر میں عقبہ بن عامر سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ اولین و آخرین کو جمع فرمائیگا اور ان کے درمیان فیصلہ فرما دے گا اور اپنے فیصلہ سے فارغ ہو جائے گا تو مومنین کہیں گے ہمارے رب نے ہمارے درمیان فیصلہ فرما دیا، اب ہماری شفاعت بارگاہ الٰہی میں کون کرے گا۔ وہ کہیں گے آدم علیہ السلام کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے دست قدرت سے تخلیق فرمایا اور ان سے کلام فرمائی۔ تمام لوگ آپ کے پاس آئیں گے اور کہیں گے ہمارے رب نے ہمارے درمیان فیصلہ فرما دیا ہے اور فیصلہ سے فارغ ہو گئے ہیں۔ آپ اٹھئے اور ہماری شفاعت فرمایئے۔ حضرت آدم علیہ السلام فرمائیں گے آپ نوح علیہ السلام کے پاس جائیں۔ وہ نوح علیہ السلام کے پاس جائیں گے۔ وہ ان کی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف راہنمائی کریں گے۔ وہ حضرت ابراہیم کے پاس پہنچیں گے۔ تو وہ موسیٰ علیہ السلام کی طرف راہنمائی فرمائیں گے۔ لوگ موسیٰ علیہ السلام کے پاس حاضر ہوں گے تو وہ عیسیٰ علیہ السلام کی طرف راہنمائی فرمائیں گے۔ وہ فرمائیں گے میں تم کو نبی امی عربی الفخر کی بارگاہ بتاتا ہوں۔ وہ میرے پاس آئیں گے، اللہ تعالیٰ مجھے اذن فرمائے گا اور میں کھڑا ہوں گا۔ میری مجلس سے ایسی خوشبو مہکے گی جسے آج تک کسی نے نہ سونگھا ہوگا۔ میں اپنے رب کریم کے پاس آؤں گا اور شفاعت کروں گا تو اللہ تعالیٰ میری شفاعت کو قبول فرمائے گا اور میری زلفوں سے لے کر میرے قدموں کے ناخنوں تک نور ہی نور ہوگا۔ یہ منظر دیکھ کر کافر کہیں گے کہ مومنوں کو تو شفیع المذنبین مل گیا۔ اب ہماری شفاعت کون کرے گا۔ پھر کہیں گے شیطان کے سوا ہمارا کوئی نہیں کہ اس نے ہمیں گمراہ کیا تھا۔ وہ اس کے پاس آئیں گے اور کہیں گے کہ مومنوں کو تو شفاعت کرنے والا مل گیا۔ اب تو ہماری شفاعت کر کیونکہ تو نے ہی ہمیں گمراہ کیا تھا۔ اس کی مجلس سے ایک ناقابل برداشت بدبو اٹھے گی اس سے پہلے کسی نے نہ سونگھی ہوگی۔ وہ جہنم کی بڑائی بیان کرے گا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 32 (التجاریہ)

اور کہے گا (1)۔

۲؎ اللہ تعالیٰ نے جو وعدہ فرمایا تھا وہ اس نے پورا فرما دیا۔ یا یہ مطلب کہ اس کا پورا کرنا حق تھا اور وہ وعدہ دوبارہ زندہ کرنے اور جزا و سزا دینے کا وعدہ تھا۔

۳؎ میں نے تم سے جھوٹا وعدہ کیا تھا کہ کوئی بعثت و حساب وغیرہ نہیں ہے۔ اگر فرض کیا حساب و کتاب ہوا تو تمہارے یہ بت تمہاری شفاعت کریں گے۔

۴؎ یہاں وعدہ خلافی کے بیان کرنے کو اس کی طرف سے اخلاف کی طرح فرمایا۔

۵؎ حفص نے لِیَ کو یاء کے فتحہ کے ساتھ اور دوسرے قراء نے سکون کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی میرا تم پر کوئی تسلط نہیں تھا کہ میں نے تمہیں کفر و نافرمانی پر مجبور کیا۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی ہے کہ میں نے تمہارے اوپر کوئی نبیوں کی مخالفت اور انکار آخرت پر دلیل پیش نہیں کی تھی۔ میں نے تو فقط میٹھی میٹھی فریب آمیز باتوں کے ذریعے تمہیں دعوت دی تھی۔ یہ دلیل کی جنس سے نہ تھا مگر اسے دلیل اس طریقہ پر کہا گیا جیسے عرب کہتے ہیں تحیة بینهم ضرب وجیع کہ ان کا سلام سخت ضربیں لگاتا ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ مستثنیٰ منقطع ہو۔

۶؎ تم نے میری دعوت کو بہت جلد قبول کیا اور صاحب حجت نبی کی دعوت کا تم نے انکار کر دیا۔ پس میری وسوسہ اندازی کی وجہ سے مجھے ملامت نہ کرو کیونکہ جو عداوت کا بیج ڈالتا ہے اسے اس طرح ملامت نہیں کیا جاتی۔ اپنے آپ کو ملامت کرو کیونکہ تم نے بغیر کسی حجت و دلیل کے میری اطاعت کی اور اپنے پروردگار کی اطاعت نہ کی۔ معتزلہ ان جیسی آیتوں سے بندے کو اپنے افعال کا مختار و خالق سمجھتے ہیں۔ لیکن ان آیات میں ایسی کوئی دلیل نہیں ہے کیونکہ بندے کی طرف فعل کی نسبت کے صحیح ہونے کے لئے بندے کا اس فعل میں داخل ہونا ہی کافی ہے اور وہ کسب ہے جیسا کہ ہمارے اصحاب اہل سنت کا عقیدہ ہے۔

۷؎ میں عذاب سے بچانے میں مدد نہیں کر سکتا اور نہ تم میری مدد کر سکتے ہو۔ حمزہ نے التقائے ساکنین کی صورت میں اصل پر یاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی علماء نے یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ اس جیسے الفاظ میں اصل کو ترک کیا جاتا ہے کیونکہ اس میں تین کسروں کا اجتماع ہوتا ہے باوجودیکہ یاء اضافت کی حرکت فتحہ ہے۔ جب کسرہ نہیں دیا جاتا حالانکہ اس کا قبل الف ہے تو زیادہ مناسب ہے کہ کسرہ نہ دیا جائے، جبکہ اس سے پہلے یا ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ حمزہ کی قرأت بنو یربوع کی لغت پر مبنی ہو جو یاء اضافت پر یاء کا اضافہ کرتے ہیں جیسے عصو بتمو ہ اور اعطیتکاہ میں ہاء اور کاف کے قائم مقام کرنے کے لئے اور یاء کو کسرہ پر اکتفا کی وجہ سے حذف کیا گیا ہے۔

۸؎ ابو عمرو نے وصلاً یاء کے اثبات کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء دونوں حالتوں میں اسے حذف کرتے ہیں اور من قبل یا تو ما مصدریہ ہے اور من اشر کتمونی کے متعلق ہے، یعنی میں نے برأت کا اظہار کیا اور اس سے پہلے جو تم نے اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں مجھے شریک بنایا میں اس کا انکار کرتا ہوں۔ اس کی مثال یہ ارشاد ہے یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ یَکۡفُرُ بَعۡضُکُمۡ یا ما موصولہ بمعنی من ہے جیسے اس ارشاد میں ہے سبحان ما یسخر کن لنا، وَنَفۡسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا اور من کفرت کے متعلق ہے یعنی میں نے اس کا انکار کیا جس کا تم نے مجھے اطاعت میں شریک ٹھہرایا وہ اللہ تعالیٰ ہے کیونکہ میں نے تمہیں بتوں وغیرہا کی عبادت کی دعوت دی تو تم نے میری دعوت کو قبول کیا، جبکہ میں تمہارے شرک کرنے سے پہلے انکار کر چکا ہوں۔ جب مجھے آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا حکم ملا تھا اور میں نے اسی حکم کو رد کر دیا تھا۔ اشرک یہ شرکم زیداً سے مشتق ہے اور دوسرے مفعول کی طرف متعدی کرنے کے لئے باب افعال بنایا گیا ہے۔

1۔ معجم کبیر طبرانی، جلد 17، صفحہ 21-320 (العلوم والحکم)

۹ یہ سابقہ کلام کا تتمہ ہے یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے مستقل کلام ہے اور اسی قسم کی کلام کی حکایت میں سامعین کے لئے لطف ہوتا ہے اور ان کو چوکنا کرنا مقصود ہوتا ہے کہ وہ اپنے نفسوں کا خود محاسبہ کریں اور اپنے انجام میں غور وفکر کریں۔

وَ اُدْخِلَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ؕ تَحِیَّتُهُمْ فِیْهَا سَلٰمٌ ﴿۲۳﴾

"اور داخل کیا جائے گا ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کئے باغات میں رواں ہوں گی جن کے نیچے ندیاں وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے اپنے رب کے حکم سے ۱؎ ان کی دعا وہاں ایک دوسرے کو یہ ہوگی کہ تم سلامت رہو ۲؎

۱؎ ان خوش نصیبوں کو داخل کرنے والے فرشتے ہوں گے۔"

۲؎ وہ ایک دوسرے پر سلام بھیجیں گے اور فرشتے بھی ان پر سلام بھیجیں گے۔ بعض علماء فرماتے ہیں سلام بھیجنے والا اللہ تعالیٰ ہوگا۔

اَلَمْ تَرَ كَیْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَیِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَیِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِی السَّمَآءِ ﴿۲۴﴾

"کیا تم نے ملاحظہ نہیں کیا کہ کیسی عمدہ مثال بیان کی ہے اللہ تعالیٰ نے کہ کلمہ طیبہ ایک پاکیزہ درخت کی مانند ہے ۱؎ جس کی جڑیں بڑی مضبوط ہیں اور شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی ہیں ۲؎"

۱؎ مثل سے مراد وہ مشہور قول ہوتا ہے جو کسی چیز کو دوسری چیز سے تشبیہ دینے کے لئے ذکر کیا جاتا ہے۔ اس سے مراد اخلاص کے ساتھ لا الہ الا اللہ کہنا ہے۔

اس کلمہ طیبہ کو اس درخت کے ساتھ تشبیہ دی ہے جو مضبوط اور بلند ہے اور اس کی بلند و بالا شاخیں آسمان سے محو گفتگو ہیں اور اس کا پھل پاکیزہ بھی ہے اور باقی رہنے والا بھی ہے۔ یہ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا کی تفسیر ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کلمة مثلاً کا بدل ہو اور کشجرة اس کی صفت ہو یا یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے، یعنی ھی کَشَجَرَةٍ طَیِّبَةٍ بھی ہوسکتا ہے کلمه ضرب کا مفعول اول ہو اور ضرب جعل کے قائم مقام ہو۔

۲؎ جائز ہے کہ فرع سے مراد شاخیں ہوں اور اسم جنس کے لفظ پر اکتفا کیا گیا ہے کیونکہ اضافت سے استغراق کا معنی حاصل ہوتا ہے۔

تُؤْتِیْۤ اُكُلَهَا كُلَّ حِیْنٍۭ بِاِذْنِ رَبِّهَا ؕ وَ یَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۵﴾

"وہ دے رہا ہے اپنا پھل ہر وقت اپنے رب کے حکم سے ۱؎ اور بیان فرماتا ہے اللہ تعالیٰ مثالیں لوگوں کے لئے تاکہ وہ انہیں خوب ذہن نشین کرلیں ۲؎"

۱؎ یعنی وہ پھل دے رہا ہے ہر اس وقت جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے مقرر فرمایا ہے اپنے خالق و موجد کے ارادہ اور اس کی تکوین سے اسی طرح اس کلمہ طیبہ کی اصل معرفت و تصدیق کے ساتھ بندہ مومن کے دل میں راسخ ہوتی ہے۔ جب وہ اس کلمہ کا ورد کرتا ہے تو وہ بلند ہو جاتا ہے حتیٰ کہ وہ بارگاہ رب العزت میں پہنچ جاتا ہے۔ ارشاد ہے کہ یَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّیِّبُ عبداللہ بن عمرو سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سبحان اللہ نصف میزان ہے اور الحمد للہ اس کو بھر دیتا ہے اور لا الہ الا اللہ کا کلمہ اس کے اور اللہ

تعالیٰ کے درمیان کوئی پردہ اور حجاب نہیں ہے۔اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے(1)۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو بندہ اخلاص کے ساتھ کلمہ طیبہ پڑھتا ہے اسکے لئے آسمان کے دروازے کھل جاتے ہیں حتیٰ کہ وہ عرش تک پہنچ جاتا ہے، جبکہ وہ شخص گناہ کبیرہ سے اجتناب کرتا ہو۔اس حدیث کو ترمذی نے جید سند کے ساتھ روایت کیا ہے(2)۔ ترمذی' نسائی' ابن حبان' حاکم نے حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا شجرۃ طیبہ سے مراد کھجور کا درخت ہے اور شجرۃ خبیثۃ سے مراد حنظل (تمہ) کی بیل ہے(3)۔ الحین لغت میں وقت کو کہتے ہیں۔ مجاہد اور عکرمہ فرماتے ہیں الحین سے مراد یہاں ایک سال ہے کیونکہ کھجور کا درخت ہر سال پھل دیتا ہے(4)۔ سعید بن جبیر، قتادہ اور حضرت حسن فرماتے ہیں اس سے مراد پھل کے ظہور سے کٹنے تک کا چھ ماہ کا عرصہ ہے(5)۔ یہی قول ابن عباس سے بھی مروی ہے(6)۔ بعض فرماتے ہیں یہ چار ماہ کا عرصہ ہے، یعنی ظہور سے پکنے تک' سعید بن مسیب فرماتے ہیں یہ دو ماہ کا عرصہ ہے، یعنی کھانے کے قابل ہونے سے لے کر کٹنے تک(7)۔ الربیع بن انس فرماتے ہیں کل حین سے مراد صبح وشام ہے کیونکہ کھجور کا پھل ہمیشہ کھایا جاتا ہے، خواہ رات ہو یا دن' خواہ گرمی ہو یا سردی' پکا ہو یا کچا' تر ہو یا خشک اسی طرح بندہ مومن کا عمل دن کے ابتداء، درمیان، آخر میں بلند ہوتا ہے۔ اسی طرح رات کے ابتداء' درمیان اور آخر میں بلند ہوتا ہے اور ایمان کی برکت کبھی منقطع نہیں ہوتی بلکہ یہ ہر وقت انسان کو پہنچتی رہتی ہے(8)۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے۔ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک ایسا درخت ہے جس کے پتے نہیں گرتے، وہ مسلمان کی مثل ہے، بتاؤ وہ کون سا درخت ہے۔ حضرت عبداللہ فرماتے ہیں لوگ دیہاتوں کے درختوں کا ذکر کرنے لگے، میرے دل میں خیال آیا کہ یہ کھجور کا درخت ہے مگر میں نے حیاء کی وجہ سے نہیں بتایا۔ پھر صحابہ کرام نے عرض کی یا رسول اللہ آپ خود ہی بتا دیجئے فرمایا وہ کھجور کا درخت ہے(9)۔ امام بغوی فرماتے ہیں ہر درخت کے لیے تین چیزیں ہوتی ہیں گہری جڑ، مضبوط تنا، اور بلند و بالا شاخیں۔ اسی طرح ایمان کے لئے بھی تین چیزیں ہیں (1) تصدیق قلبی (2) اقرار باللسان اور (3) عمل بالارکان(10)۔

ابو ظبیان' ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا شجرہ طیبہ جنت میں ایک درخت ہے(11)۔ حضرت جابر سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے سبحان اللّٰہ العظیم و بحمدہ کہا اس کے لئے جنت میں ایک درخت لگ جاتا ہے۔ اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے(12)۔

ے اور اللہ تعالیٰ لوگوں کے لئے مثالیں بیان فرماتا ہے تاکہ خوب ذہن نشین کریں کیونکہ مثال کے ذریعے مسئلہ کو سمجھنا اور یاد کرنا زیادہ بہتر ہوتا ہے اور مثال سے معانی ایک شکل وتصویر کی صورت میں آجاتے ہیں اور حس سے زیادہ قریب ہو جاتے ہیں۔

وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيثَةٍ اجْتُثَّتْ مِن فَوْقِ الْأَرْضِ مَا لَهَا مِن قَرَارٍ ﴿٢٦﴾

"اور مثال ناپاک کلمہ کی ایسی ہے جیسے ناپاک درخت ہو، جسے اکھاڑ لیا جائے زمین کے اوپر سے (اور) اسے کچھ بھی

1۔ جامع ترمذی، جلد2، صفحہ 190 (وزارت تعلیم) 2۔ جامع ترمذی، جلد2، صفحہ 198 (وزارت تعلیم)
3۔ جامع ترمذی، جلد2، صفحہ 140 (وزارت تعلیم) 4۔ تفسیر خازن، جلد4، صفحہ 134 (التجاریہ) 5۔ تفسیر بغوی، جلد4، صفحہ 34 (التجاریہ)
6۔ الدر المنثور، جلد4، صفحہ 145 (العلمیہ) 7۔ الدر المنثور، جلد4، صفحہ 145 (العلمیہ)
8۔ الدر المنثور، جلد4، صفحہ 145 (العلمیہ) 9۔ الدر المنثور، جلد4، صفحہ 145 (العلمیہ) 10۔ تفسیر بغوی، جلد4، صفحہ 34 (التجاریہ)
11۔ الدر المنثور، جلد4، صفحہ 145 (العلمیہ) 12۔ جامع ترمذی، جلد2، صفحہ 184 (وزارت تعلیم)

قرار نہ ہو سکے۔"

۱؎ میں کہتا ہوں اس سے مراد وہ کلمہ ہے جو نفاق کے ساتھ کہا جائے اور اس سے اللہ تعالیٰ کی رضا مقصود نہ ہو کیونکہ آگے ارشاد ہے کشجرۃ خبیثۃ یعنی اس درخت کی مانند ہے جو غیر نافع ہو اور زمین پر قرار پذیر نہیں ہے۔

۲؎ اکھاڑ لیا جائے زمین کے اوپر سے کیونکہ اس کی جڑیں زیادہ گہری نہیں ہوتیں بلکہ قریب ہوتی ہیں اور اس سے کچھ بھی قرار نہ ہو۔ اسی طرح جس سے رضا الٰہی مقصود نہ ہو اس کا کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔ ابن مردویہ نے حیان بن شعبہ عن انس بن مالک کے طریق سے اس آیت کے متعلق روایت کیا ہے کہ حضرت انس نے فرمایا اس سے مراد الشریانہ ہے۔ پوچھا گیا الشریانہ کیا ہے؟ حضرت انس نے فرمایا اس سے مراد حنظلہ (تمہ) ہے۔ میں کہتا ہوں شجرۃ طیبہ کھجور اور دوسرے درختوں کے لئے عام ہے۔ اسی طرح شجرۃ خبیثہ حنظلہ اور دوسرے درختوں کو شامل ہے اور حدیث طیبہ میں بطور تمثیل بعض کا ذکر کیا گیا ہے۔

يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَ يُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ ۙ۫ وَ يَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ﴿۲۷﴾

"ثابت قدم رکھتا ہے اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو اس پختہ قول (کی برکت) سے دنیوی زندگی میں بھی ۱؎ اور آخرت میں بھی ۲؎ اور بھٹکا دیتا ہے اللہ تعالیٰ رزق کی زیادتی کرنے والوں کو ۳؎ اور کرتا ہے اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے ۴؎"

۱؎ قول ثابت سے مراد اخلاص کے ساتھ کلمہ توحید ہے کیونکہ یہ مسلمانوں کے دلوں میں پختہ اور ثابت ہے اور اس کے ثواب کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ثبات ملتا ہے۔ پس وہ دنیا میں اپنے دین پر ثابت قدمی اور استقلال جبکہ انہیں اپنے دین سے برگشتہ کرنے کے لئے کئی فتنوں میں مبتلا کیا گیا جیسے حضرت زکریا علیہ السلام، یحییٰ علیہ السلام، جرجیس، شمعون، اصحاب الاخدود، خبیب، آپ کے اصحاب اور بئر معونہ والے۔

۲؎ اور قبور میں سوال کے مشکل لمحہ میں بھی اللہ تعالیٰ ان کو ثابت قدم رکھتا ہے۔

۳؎ یعنی منافقین اور کفار کو آزمائش کی گھڑیوں میں کلمہ توحید پر ثابت قدم نہیں رکھتا اور ان کے قدم ایسے حالات میں پہلے ہی مرحلہ پر ڈگمگا جاتے ہیں اور آخرت میں تو اس سے بھی زیادہ گمراہ اور پھسلنے والے ہوں گے۔ حضرت براء بن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ائمہ ستہ نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب مسلمان سے قبر میں سوال کیا جاتا ہے تو وہ گواہی دیتا ہے کہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ (1) اور يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ میں قول ثابت سے یہی مراد ہے اور ایک روایت آپ ﷺ سے مروی ہے کہ يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ (الآیۃ) عذاب قبر کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ پوچھا جاتا ہے من ربک تیرا رب کون ہے وہ کہتا ہے ربی اللّٰہ و نبی محمد ﷺ (متفق علیہ) اس حدیث کو امام احمد، ابو داؤد وغیرہما نے اس طرح روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا دو فرشتے آتے ہیں، وہ اسے بٹھا دیتے ہیں اور پھر اسے کہتے ہیں تیرا رب کون ہے؟ وہ کہتا ہے میرا رب اللہ تعالیٰ ہے۔ پھر پوچھتے ہیں تیرا دین کیا ہے؟ وہ کہتا ہے میرا دین اسلام ہے۔ پھر وہ کہتے ہیں جو شخص تمہاری طرف مبعوث کیا گیا تو اس کے متعلق کیا کہتا ہے؟ وہ کہتا ہے وہ اللہ کے رسول ہیں۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 386 (قدیمی)، صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 682 (قدیمی)

وہ اس سے پوچھتے ہیں تجھے یہ سب کچھ کیسے پتہ چلا؟ وہ کہتا ہے میں نے اللہ تعالیٰ کی کتاب کو پڑھا۔ پھر اس پر ایمان لایا اور اس کی میں نے تصدیق کی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد یُثَبِّتُ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اسی قول کا طرف اشارہ کرتا ہے۔ پھر آسمان سے نداء کرنے والا نداء کرتا ہے کہ میرے بندے نے سچ کہا۔ اس کے لئے جنت میں بستر لگاؤ اور اس کو جنت کا لباس پہنا دو اور اس کے لئے جنت کا دروازہ کھول دو۔ فرمایا جنت کی خوشبو اور ٹھنڈک اس کے پاس آتی رہے گی اور اس کی قبر تا حد نگاہ کشادہ ہو جائے گی لیکن کافر(1)۔ آپ ﷺ نے اس کی موت کا ذکر فرمایا اور فرمایا اس کی روح اس کے جسم میں لوٹائی جاتی ہے۔ دو فرشتے آتے ہیں، اسے بٹھا دیتے ہیں اور پوچھتے ہیں تیرا رب کون ہے؟ وہ کہتا ہے ھاہ ھاہ لا ادری ہائے ہائے مجھے معلوم نہیں۔ پھر پوچھتے ہیں تیرا دین کیا ہے؟ وہ کہتا ہے ھاہ ھاہ مجھے علم نہیں۔ پھر پوچھتے ہیں اس شخصیت کے متعلق کیا خیال اور عقیدہ رکھتا تھا جو تمہاری طرف مبعوث کی گئی تھی۔ وہ کہتا ہے ھاہ ھاہ مجھے علم نہیں۔ پھر آسمان سے ایک منادی نداء دیتا ہے کہ اس نے جھوٹ بولا، اس کے لئے آگ کا بستر بچھا دو اور اسے آگ کا لباس پہنا دو اور اس کے لئے دوزخ کا دروازہ کھول دو۔ فرمایا پس جہنم کی گرمی اور اس کی گرم لو اس کی طرف آتی رہتی ہے۔ فرمایا اس پر قبر اتنی تنگ ہو جاتی ہے کہ اس کی دائیں طرف کی پسلیاں بائیں طرف اور بائیں طرف کی پسلیاں دائیں طرف ہو جاتی ہیں۔ پھر اس پر ایک اندھا بہرہ فرشتہ مسلط کیا جاتا ہے اور اس کے ہاتھ میں لوہے کا گرز ہوتا ہے۔ اگر یہی پہاڑ پر مارا جائے وہ مٹی ہو جائے۔ وہ اس کافر کو اس گرز سے اس طرح مارتا ہے کہ اس کی آواز جن وانس کے علاوہ تمام مخلوق سنتی ہے۔ پس وہ مر کر مٹی ہو جاتا ہے۔ پھر اس کی روح لوٹائی جاتی ہے۔ حضرت عثمان سے مروی ہے فرمایا نبی کریم ﷺ جب میت کے دفن سے فارغ ہوتے تو اس پر کھڑے ہو جاتے اور فرماتے اپنے بھائی کے لئے استغفار کرو۔ پھر اس کے لئے ثابت قدمی کا سوال کرو کیونکہ اب اس سے سوال ہو رہا ہے۔ اس حدیث کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے(2)

حضرت انس سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بندے کو جب قبر میں رکھا جاتا ہے اور اس کے دوست احباب واپس پلٹتے ہیں تو وہ میت ان کے قدموں کی آہٹ سنتی ہے اس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں۔ پھر وہ اسے بٹھا دیتے ہیں۔ اس کے بعد پوچھتے ہیں اس شخص محمد رسول اللہ ﷺ کے متعلق کیا عقیدہ رکھتا تھا۔ پس جو ایماندار ہوتا ہے وہ کہتا ہے اشھد انہ عبد اللّٰہ و رسولہ میں گواہی دیتا ہوں آپ ﷺ اللہ کے برگزیدہ بندے اور اس کے رسول ہیں۔ پھر اسے کہا جاتا ہے کہ اپنا دوزخ کا ٹھکانا دیکھ لے، اللہ تعالیٰ نے تجھے اس بدلہ میں جنت کا ٹھکانہ عطا فرمایا ہے۔ پس وہ اپنے دونوں ٹھکانے دیکھتا ہے لیکن کافر اور منافق جب ان سے پوچھا جاتا ہے تو اس شخص کے بارے میں کیا کہتا تھا۔ تو وہ کہتا ہے مجھے معلوم نہیں، میں تو وہی کہتا تھا جو لوگ کہتے تھے۔ تو اسے کہا جاتا ہے تو کبھی نہ جانے اور کبھی نہ پڑھے اور ایک لوہے کے گرز سے سخت ضربیں لگائی جاتی ہیں جنہیں جن وانس کے علاوہ ہر چیز سنتی ہے (متفق علیہ)(3)

حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب میت کو قبر میں رکھا جاتا ہے تو دو سیاہ رنگ کے اور نیلی آنکھوں والے فرشتے آتے ہیں جن میں سے ایک کو منکر اور دوسرے کو نکیر کہا جاتا ہے۔ وہ پوچھتے ہیں تو اس شخص کے بارے میں کیا کہتا ہے؟ وہ کہتا ہے ھو عبد اللّٰہ ورسولہ اشھد ان لا الہ الا اللّٰہ واشھد ان محمد عبدہٗ ورسولہ آپ ﷺ اللہ کے عبد (مکرم) اور اس کے رسول ہیں، میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ پس وہ کہتے ہیں یقیناً ہم جانتے تھے کہ تو یہی کہے گا۔ پھر اس کی قبر لمبائی اور چوڑائی میں ستر ہاتھ وسیع کر دی جاتی ہے۔ پھر اس کے لئے اس میں نور بھرا جاتا ہے۔ پھر کہا جاتا ہے کہ سو جا۔ وہ کہتا ہے میں اپنے گھر والوں کی طرف لوٹتا ہوں تا کہ انہیں اپنے

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 654 (نور محمد)　2۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 459 (نور محمد)　3۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 388 (قدیمی)

حسن انجام سے آگاہ کروں۔ پھر وہ فرشتے کہتے ہیں تو دلہن کی طرح سو جا جسے کوئی شخص بیدار نہیں کرتا سوائے اس گھر والوں میں سے محبوب ترین شخص کے۔ حتیٰ کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اسے اپنی اس آرام گاہ سے اٹھائے گا۔ اگر وہ بندہ منافق ہوگا تو وہ کہے گا میں لوگوں سے ایک بات سنتا تھا، میں بھی اس کی مثل کہتا تھا اور مجھے کچھ معلوم نہیں۔ پس وہ فرشتے کہتے ہیں ہم جانتے ہیں کہ تو یہی کہے گا۔ پھر زمین کو حکم ہوگا اس شخص پر سکڑ جا۔ پس وہ اس پر اس طرح سکڑ جائے گی کہ اس کی پسلیاں ادھر ادھر ہو جائیں گی۔ اسے ہمیشہ عذاب ہوتا رہے گا یہاں تک کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اسے دوبارہ اس ٹھکانا سے اٹھائے گا۔ اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے (1)۔

یہ توفیق ثابت قدمی میں سے جو چاہتا ہے کرتا ہے، کوئی اس پر اعتراض کرنے والا نہیں ہے۔

حضرت ابو درداء، نبی کریم ﷺ سے روایت فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جب آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا تو اس کے دائیں کندھے پر مارا اور چیونٹیوں کی طرح سفید اولاد نکالی اور بائیں کندھے کو مارا تو سیاہ اولاد نکالی، گویا وہ کوئلے ہیں۔ دائیں جانب والوں کے متعلق فرمایا یہ جنتی ہیں، مجھے کوئی پرواہ نہیں۔ بائیں کندھے والوں کے متعلق فرمایا یہ دوزخی ہیں اور مجھے کوئی پرواہ نہیں (2)۔ حضرت ابی بن کعب سے مروی ہے، فرمایا اگر اللہ تعالیٰ تمام آسمانوں کے باسیوں اور زمین کے مکینوں کو عذاب دے دے تو پھر بھی وہ ان پر ظلم کرنے والا نہ ہوگا اور اگر ان پر رحم فرما دے تو اس کی رحمت ان کے اعمال سے ان کے لئے بہتر ہے اور اگر تم اللہ کی راہ میں احد پہاڑ کی مثل سونا خرچ کرو تو اللہ تعالیٰ قبول نہیں فرمائے گا حتیٰ کہ تم تقدیر پر ایمان لے آؤ تو یہ جان لے کہ جو تجھے تکلیف پہنچی ہے یہ کبھی خطا ہونے والی نہ تھی اور جو تجھے تکلیف نہیں پہنچی یہ کبھی تجھے پہنچنے والی نہ تھی اور اگر تو اس کے خلاف عقیدہ رکھ کر مر گیا تو دوزخ میں داخل ہو گا۔ حضرت ابن مسعود اور حضرت حذیفہ بن الیمان نے بھی اسی طرح فرمایا ہے اور زید بن ثابت نے نبی کریم ﷺ سے بھی اسی طرح روایت کیا ہے اور اس روایت کو امام احمد، ابوداؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے (3)۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ بَدَّلُوا نِعْمَتَ اللَّهِ كُفْرًا وَأَحَلُّوا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ﴿٢٨﴾

"کیا آپ نے نہیں دیکھا ان لوگوں کی طرف جنہوں نے بدل دیا اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو ناشکری سے لے اور اتارا اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر میں ہے"

لے انہوں نے نعمت کی جگہ ناشکری کو رکھا یا نفس نعمت کو کفر سے بدل دیا کیونکہ جب انہوں نے ناشکری کی تو ان سے وہ نعمت سلب کر لی گئی۔ پس وہ خود ہی اس نعمت کو چھوڑنے والے اور اس کی جگہ کفر کو اختیار کرنے والے بن گئے

امام بخاری نے اپنی صحیح میں حضرت ابن عباس سے روایت نقل کی ہے، فرمایا یہ بدلنے والے قسم بخدا کفار قریش ہیں (4)۔ حضرت عمر نے فرمایا وہ قریش ہیں اور اللہ کی نعمت سے مراد محمد ﷺ ہیں (5)۔ ابن جریر نے عطاء بن یسار سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت کریمہ ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جو یوم بدر کو قتل ہوئے تھے (6)۔ یعنی اہل مکہ جنہیں اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا اور انہیں ایسے حرم میں سکونت عطا فرمائی جس میں ہر قسم کے پھل جمع ہوتے ہیں اصحاب فیل سے ان کا دفاع کیا اور انہیں اپنے گھر کی خدمت کی سعادت بخشی اور سردیوں اور گرمیوں میں سفر کی محبت کے ساتھ ان پر اپنے رزق کے دروازے کھول دیے۔ اور محمد ﷺ کو رسول بنا کر بھیجا جو ان میں

1۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 127 (وزارت تعلیم)
2۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 47 (تورحجہ)
3۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 646 (تورحجہ)
4۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 682 (قدیمی)
5۔ تفسیر خازن، جلد 4، صفحہ 37 (التجاریۃ)
6۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 37 (التجاریۃ)

سے تھے۔ ان پر اللہ کی آیت تلاوت فرماتے تھے اور ان کا تزکیہ کرتے اور کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے تھے اور تمام لوگوں کو ان کا تابع بنایا۔ لیکن انہوں نے ان نعمتوں کا کفر کیا اور محمد ﷺ سے دشمنی اور عداوت کا مظاہرہ کیا اور اندھے پن کو ہدایت پر ترجیح دی۔ پس اس طرح سات سال انہیں قحط سے دوچار ہونا پڑا جنگ بدر کے روز کچھ قیدی اور کچھ قتل ہو گئے اور ذلیل و رسوا ہو گئے۔ پس ان سے نعمتیں چھین لی گئیں اور کفر سے متصف رہے حتیٰ کہ وہ مر گئے یا قتل ہو گئے۔

۲؎ جنہوں نے کفر میں ان کی اتباع کی ان کو بھی دارِ ہلاکت کے گڑھے میں کیونکہ انہیں نے کفر پر برانگیختہ کیا تھا۔

جَهَنَّمَ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۖ وَبِئْسَ الْقَرَارُ ﴿٢٩﴾

''یعنی دوزخ میں جھونکے جائیں گے اس میں ۱؎ اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے ۲؎۔''

۱؎ جهنم دار البوار سے عطف بیان ہے اور يصلونها دار البور سے حال ہے یا قوم سے حال ہے، یعنی وہ اس دوزخ میں داخل ہوں گے اور اس کی تپش برداشت کریں گے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے جهنم منصوب ہو فعل مضمر کی بناء پر جس کی تفسیر مابعد فعل کر رہا ہے۔

۲؎ یعنی جہنم بہت برا ٹھکانہ ہے۔ ابن مردویہ نے نقل کیا ہے کہ ابن عباس سے مروی ہے کہ انہوں نے حضرت عمر سے کہا اے امیر المومنین الذین بدلوا نعمت الله كفرا سے کون مراد ہیں؟ فرمایا قریش کے فاجر قبیلے یعنی بنومغیرہ اور بنوامیہ' لیکن بنومغیرہ کا بدر کے دن تم سے کام تمام کر دیا اور بنوامیہ وہ کچھ عرصہ تک متمتع ہوتے رہے۔ بغوی نے حضرت عمر کا قول ذکر کیا ہے۔ ابن جریر' ابن المنذر' ابن ابی حاتم' الطبرانی فی الاوسط' حاکم اور ابن مردویہ نے اپنے طریق سے حضرت علی سے اسی کی مثل قول روایت کیا ہے۔ میں کہتا ہوں بنو امیہ کفر پر رہے حتیٰ کہ ابوسفیان' معاویہ' عمرو بن العاص وغیرہم اسلام لائے۔ پھر یزید اور اس کے حواریوں نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری کی کہ انہوں نے آل نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عداوت رکھی اور امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ظلماً قتل کیا۔ یزید نے دین محمدی کا انکار کیا تھا۔ جب اس نے امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو قتل کیا تھا تو اس نے یہ شعر کہے تھے جن کا مفہوم یہ تھا کہ میرے بزرگ کہاں ہیں؟ وہ اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرتے، میں نے آل محمد اور بنی ہاشم سے انتقام لیا ہے اور اس کے آخری شعر یہ تھے۔

وَلَسْتُ مِنْ جُنْدُبٍ اِنْ لَّمْ اَنْتَقِمْ   مِنْ بَنِیْ اَحْمَدَ مَا كَانَ فَعَلَ

ترجمہ:۔ اگر میں آل نبی سے انتقام نہ لوں تو میں مشائخ عرب کی اولاد سے نہ ہوں۔

اسی طرح یزید نے شراب کو حلال قرار دیا تھا کہتا ہے۔ شراب کا خزانہ ایسے برتن میں ہے جو چاندی کی طرح ہے اور انگور کی شاخ انگوروں سے لدی ہوئی ہے جو ستاروں کی مثل ہیں۔ انگور کی بیل کی گہرائی آفتاب کے برج کے قائم مقام ہے پس آفتاب کا مشرق ساقی کا ہاتھ ہے اور اس کا مغرب میرا منہ ہے۔ اگر یہ شراب دین احمد میں ایک دن حرام ہوئی تو اے مخاطب اس کو مسیح ابن مریم کے دین پر لے لے۔

انہوں نے منبروں پر بیٹھ کر آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو برا بھلا کہا۔ یہ لوگ اس گمراہی کے ساتھ ہزار ماہ متمتع ہوئے پھر اللہ تعالیٰ نے ان سے انتقام لیا حتیٰ کہ کوئی بھی باقی نہ رہا۔

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ ۗ قُلْ تَمَتَّعُوْا فَاِنَّ مَصِيْرَكُمْ اِلَى النَّارِ ﴿٣٠﴾

''اور بنا لئے انہوں نے اللہ تعالیٰ کے لئے مدمقابل ۱؎ تاکہ بھٹکا دیں (لوگوں کو) ان کی راہ سے ۲؎ آپ (انہیں)

فرمائیے (کچھ وقت) لطف اٹھالو[3]۔ پھر یقیناً تمہارا انجام آگ کی طرف ہے[4]۔"

[1] انہوں نے عبادت کے لئے اللہ تعالیٰ کے امثال بنائے۔ یا یہ مطلب کہ انہوں نے غیروں کو الہ بنایا حالانکہ اس کی کوئی مثل اور مدمقابل نہیں ہے۔

[2] لام عاقبت کا ہے کیونکہ اللہ کے مدمقابل بنانے سے ان کی غرض گمراہ ہونا یا گمراہ کرنا نہیں تھا۔ لیکن گمراہی اس کا نتیجہ تھا۔ اس لئے اس غرض کی طرح بنادیا۔ ابن کثیر ابوعمرو نے یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور اسی طرح سورۂ حج "لقمان اور زمر میں مجرد سے بفتحہ یا پڑھا ہے اور باقی قراء نے باب تفعیل سے بضم یا پڑھا ہے، یعنی تاکہ وہ لوگوں کو گمراہ کریں اللہ تعالیٰ کے رستہ سے۔

[3] آپ فرمائیے کچھ وقت اپنی شہوات یا بتوں کی عبادت اور گمراہیوں سے لطف اٹھالو جو تمہارے لئے مقدر کی گئی ہیں۔ حضرت ذوالنون فرماتے ہیں التمتع کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی طاقت کے مطابق اپنی شہوت کو پورا کرے اور دھمکی کے وقت امر کا صیغہ اس لئے فرمایا کہ جس چیز پر تمہیں دھمکی دی گئی ہے۔ یہ مطلوب چیز کی مانند ہے یہ تمہیں ضرور اپنے انجام تک پہنچائیں گی۔ اور یہ دونوں امر لامحالہ وقوع پذیر ہوں گے اسی لئے اسی کی علت۔

[4] (پھر یقیناً تمہارا انجام آگ کی طرف ہے) ذکر فرمائی ہے چونکہ مخاطب اس میں منہمک اور مستغرق ہے جیسے کوئی کسی امر مطاع کا مامور ہوتا ہے اس لئے اس مفہوم کو اس اسلوب کے ساتھ تعبیر فرمایا ہے۔

قُلْ لِّعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ يُنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَ لَا خِلٰلٌ ﴿۳۱﴾

"آپ فرمائیے میرے بندوں کو جو ایمان لائے ہیں[1] کہ وہ صحیح صحیح ادا کیا کریں نماز اور خرچ کیا کریں اس سے جو ہم نے انہیں رزق دیا ہے[2] پوشیدہ طور پر اور اعلانیہ اس سے پیشتر کہ آجائے وہ دن جس میں نہ کوئی خرید و فروخت ہوگی اور نہ دوستی[3]۔"

[1] عبادی کو ابن عامر، حمزہ اور کسائی نے یاء کے اسکان کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ خطاب کو مومنین کے ساتھ خاص فرمایا اور عبودیت کے ساتھ ان کا وصف بیان فرمایا ہے اور عزت و شرف عطا کرنے کے لئے اپنی طرف ان کو منسوب فرمایا اور یہ اسلوب اختیار فرما کر آگاہ فرمایا کہ وہ عبودیت کے حقوق ادا کرنے والے ہیں۔ اس لئے وہ اس خطاب کے اہل ہیں جو انہیں حکم ہوتا ہے وہ اسے بسر و چشم قبول کرتے ہیں۔ قل کا مفعول محذوف ہے جس پر اس کا جواب دلالت کر رہا ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے (میرے ایماندار بندوں کو فرمادو کہ وہ نماز قائم کریں اور خرچ کریں)

[2] یہ امر کے جواب کی وجہ سے مجزوم ہے، یعنی قل کے صیغہ کی وجہ سے اور شرط کی جزاء مقدر ہے، یعنی اِنْ تَقُلْ لَهُمْ اَقِيْمُوْا يُقِيْمُوْا۔ اگر تم ان کو نماز قائم کرنے کا حکم دو گے تو یہ قائم کریں گے۔ اس اسلوب میں یہ بھی شعور ملتا ہے کہ وہ اطاعت رسول میں یوں مستغرق ہیں کہ کوئی فعل اطاعت رسول کے بغیر ان کا پایا ہی نہیں جاتا۔ گویا وہ سبب کی طرح ہے اور لام امر مقدر بھی ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں یہ قول کا مفعول ہوگا۔

[3] سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً۔ مصدر کی بنا پر دونوں منصوب ہیں، یعنی پوشیدہ طور پر اور اعلانیہ طور پر خرچ کریں اس سے پیشتر کہ آجائے وہ دن

جس میں کوئی خرید و فروخت نہ ہوگی کہ کوئی کوتاہی کرنے والا کوئی ایسی چیز خرید ے جس کے ساتھ اپنی کوتاہیوں کا کفارہ ادا کر سکے یا اپنی ذات کا فدیہ دے سکے اور نہ کوئی دوستی ہوگی کہ کوئی دوست اس کی شفاعت کرے گا۔

اگر یہ کہا جائے کہ روز قیامت متقین کی دوستی کا ثبوت قرآن مجید میں موجود ہے اَلْاَخِلَّآءُ یَوْمَئِذٍۭ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِیْنَ گہرے دوست اس دن ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے بجز ان کے جو متقی اور (پرہیزگار) ہیں۔ اور بعض مومنین کا بعض کی شفاعت کرنا ثابت ہے تو یہاں جنس کی نفی کیوں فرمائی ہے۔ میں کہتا ہوں نماز کی اقامت اور ایتاء زکوٰۃ کا حکم تقویٰ کا حکم ہے اور خلت کی جنس کی نفی عدم تقویٰ کی صورت میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر وہ اقامت صلوٰۃ اور ایتاء زکوٰۃ کے ساتھ تقویٰ اختیار نہیں کریں گے تو اس دن ان کا کوئی خلیل اور دوست نہ ہوگا۔ ابن کثیر اور ابو عمرو اور یعقوب نے لائفی جنس کو عمل کراتے ہوئے دونوں اسموں پر فتحہ پڑھا ہے اور باقی قراء نے تکرار کی وجہ سے لاء کے عمل کو باطل قرار دیتے ہوئے رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِیَ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ۚ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ ﴿۳۲﴾

”اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے پیدا فرمایا آسمانوں کو اور زمین کو اور اتارا بلندی سے پانی پھر پیدا کئے اس لئے پانی سے پھل اتارے کھانے کے لئے[1] اور اس نے مسخر کر دیا تمہارے لئے کشتی کو تا کہ وہ چلے سمندر میں اس کے حکم سے[2] اور تابع فرمان کر دیا تمہارے لئے دریاؤں کو[3]“

[1] رزق کا لفظ کھانے پہننے کی چیزوں کو شامل ہے رزقاً اخرج کا مفعول ہے اور من الثمرات اس سے حال ہے اور اس کے برعکس ترکیب کا بھی احتمال ہو سکتا ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ رزقاً مصدر کی بناء پر منصوب ہو کیونکہ اخرج بمعنی رزق ہے یا علت کی بناء پر منصوب ہے۔

[2] اور اس نے تمہاری سواری اور بوجھ برداری کے لئے کشتی کو مسخر کر دیا تا کہ وہ چلے سمندر میں اللہ تعالیٰ کی مشیت سے جہاں تم جانا چاہو۔

[3] اور تابع فرماں کر دیا تمہارے لئے نہروں کو کہ تم جہاں چاہتے ہو نکال کر لے جاتے ہو اور ان کے پانیوں سے نفع اٹھاتے ہو اور ان کے اوپر بڑے چھوٹے پل بناتے ہو۔

وَ سَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ دَآىٕبَیْنِ ۚ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الَّیْلَ وَ النَّهَارَ ﴿۳۳﴾

”اور مسخر کر دیا تمہارے لئے آفتاب و مہتاب کو جو برابر چل رہے ہیں[1] اور مسخر کر دیا تمہارے لئے رات اور دن کو[2]“

[1] اور سورج چاند کو تمہاری مصلحتوں کے مطابق جاری فرمایا کبھی کوتاہی نہیں کرتے۔ قاموس میں ہے کہ داب فی عملہ کمنع دابا یعنی متواتر کام میں لگا رہتا ہے۔ دؤب ضمہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی کوشش کرنا اور تھک جانا ہے۔ الدائبان' الجدیدان' السوق الشدید یعنی چلنے میں جلدی کرتے ہیں۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں اس کا مطلب ہے دونوں اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں گردش کر رہے ہیں(1)۔

[2] دن اور رات کو تمہارے لئے مسخر کیا کہ دونوں ایک دوسرے کے پیچھے آتے جاتے ہیں۔ رات کو اس طرح بنایا کہ تم دن بھر کام کرنے کی تھکاوٹ کے بعد اس میں آرام کرو اور دن کو اشیاء کو ظاہر و روشن کرنے والا بنایا تا کہ تم اپنی معاش کے ذرائع تلاش کرو۔

1۔ تفسیر خازن، جلد 4، صفحہ 38 (التجاریہ)

وَ اٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ؕ وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ﴿۳۴﴾

"اور عطا فرمایاں تمہیں ہر اس چیز سے جس کا تم نے اس سے سوال کیا[1] اور اگر تم گننا چاہو تو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو تو تم ان کا شمار نہیں کر سکتے[2] بیشک انسان بہت زیادتی کرنے والا[3] از حد ناشکرا ہے[4]"

[1] اور جو تم اس سے سوال کرتے ہو اس میں سے بعض چیزیں تمہیں عطا فرماتا ہے اشیاء یہاں محذوف ہے کیونکہ تبعیض پر کلام دلالت کر رہی ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں شاید مَا سَاَلْتُمُوْهُ سے مراد وہ چیزیں ہوں جن کا سوال کرنا یقینی ہو کیونکہ لوگوں کو اس چیز کی ضرورت ہوتی ہے، خواہ اس کا سوال کیا جائے یا نہ کیا جائے (1)۔ ما موصوفہ یا موصولہ یا مصدریہ ہے اور مصدر بمعنی مفعول ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ بیان کے لئے زائدہ ہو اور کل کا لفظ کثرت کے اظہار کے لئے ہے جیسے فلان یعلم کل شیء یعنی فلاں شخص کثیر معلومات رکھتا ہے اتاہ کل انسان اس کے پاس کثیر لوگ آئے۔ اسی طرح ارشاد ہے فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیئے۔ الحسن نے کل کو تنوین کے ساتھ پڑھا ہے۔ مطلب یہ کہ ہر چیز جس کے تم محتاج ہو اور زبان حال سے اس کا سوال کر رہے ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ما نافیہ ہو اور ترکیب میں حال ہو، یعنی اس نے تمہیں ہر چیز عطا فرمائی حالانکہ تم نے ان کا سوال بھی نہیں کیا تھا۔

[2] اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو شمار کرو۔ اس میں دلیل ہے کہ مفرد اضافت کے ساتھ استغراق کا فائدہ دیتا ہے (یعنی نعمت مفرد ہے لیکن معنی جمع ہے) تم ان کا شمار نہیں کر سکتے۔ تم ان نعمتوں کا علیحدہ علیحدہ شمار ہی نہیں کر سکتے کیونکہ وہ غیر متناہی ہیں تو پھر ان کا شکر کیسے ادا کر سکتے ہو۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی مہربانی اور فضل سے شکر سے عجز کے اعتراف کو شکر شمار فرمایا۔ مومنین کو شکور فرمایا ان کے اعتراف عجز کی وجہ سے اور جو عجز کا اعتراف نہیں کرتا اس کے متعلق فرمایا۔

[3] کہ وہ اپنے رب کا تکلیف اور پریشانی کے وقت شکوہ کرتا ہے اور صبر نہیں کرتا۔ اور وہ یہ نہیں جانتا کہ جو تکلیف اسے پہنچی ہے جواد، کریم، رحیم اور حکیم کی طرف سے پہنچی ہے، یقیناً یہ حکمت سے خالی نہ ہوگی، اگرچہ اس حکمت کا ادراک نہ ہو سکے۔

[4] نعمت اور خوشحالی کے وقت انتہائی ناشکری کا مظاہرہ کرتا ہے۔ مومنین کے متعلق صبار، شکور فرمایا اور دوسرے لوگوں کے متعلق ان صیغوں کی ضد کو ذکر فرمایا کیونکہ کفار صراحۃً شکور کی ضد ہے اور ظلوم صبار کی دلالۃً ضد ہے کیونکہ ظلم کا مطلب ہوتا ہے کسی چیز کو غیر مناسب جگہ پر رکھنا اور مصیبت، تکلیف، صبر کا مقام ہے تو اس کی جگہ پر شکایت، پریشانی اور جزع اور فزع کا اظہار کرنا ظلم ہے۔ بعض فرماتے ہیں گناہ کر کے اپنے اوپر ظلم کرتا ہے کہ اسے عذاب آخرت و دنیا کے لئے پیش کرتا ہے یا یہ مطلب کہ شکر کو ترک کر کے اپنے نفس پر ظلم کرتا ہے۔ کیونکہ اسے اس طرح نعمتوں سے محروم کرتا ہے یا نعمت کا شکر نہ ادا کر کے نعمت پر ظلم کرتا ہے۔ یا یہ معنی کہ وہ شکر کو غیر موضع پر رکھ کر ظلم کرتا ہے کیونکہ وہ اس کا شکر کرتا ہے جس نے اس پر انعام نہیں فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے میں جن اور انسان عجیب معاملہ میں ہیں کہ پیدا میں کرتا ہوں اور عبادت میرے سوا کی جاتی ہے، رزق میں عطا کرتا ہوں اور شکر دوسروں کا ہوتا ہے۔ اس حدیث کو حاکم اور بیہقی نے ابو داؤد کے واسطہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّ اجْنُبْنِيْ وَ بَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ﴿۳۵﴾ؕ

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد 3، صفحہ 350 (دار الفکر)

"اور (اے حبیب!) یاد کرو جب عرض کی ابراہیم نے کہ اے میرے رب بنادے اس شہر کو امن والا اور بچالے مجھے اور میرے بچوں کو کہ ہم پوجا کرنے لگیں بتوں کی[1]۔"

[1] اس ارشاد میں سوال خوف کا ازالہ کرنے اور مکہ کو امن والا بنانے کا ہے اور اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا میں اس وادی کو امن والے شہروں میں سے ایک امن والا شہر بنانے کا سوال ہے، یعنی ہمیں ان بتوں کی عبادت سے دور کردے۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ عصمت انبیاء اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اس کی حفاظت سے ہے اور بنیّ کا لفظ پوتوں کو شامل نہیں ہے، اگرچہ اس کا اطلاق پوتوں کو بھی شامل ہے جیسے ارشاد ہے یبنی آدم' یا بنی اسرائیل' یہ مجاز کے عموم کے قبیل سے ہے۔ اس لئے یہ اعتراض وارد ہی نہیں ہوتا کہ اولاد اسماعیل میں اکثر لوگ بتوں کی پوجا کرتے ہیں۔ ابن ابی حاتم نے ابن عیینہ سے روایت کیا ہے کہ اولاد اسماعیل بتوں کی عبادت میں ملوث نہ تھی اور دلیل اسی آیت کو بنایا ہے۔ وہ کہتے ہیں ان کے پاس پتھر تھے جنہیں وہ ادھر ادھر گھماتے رہتے تھے اور انہیں الدوار کہتے تھے اور وہ کہتے کہ بیت اللہ شریف بھی پتھر ہے۔ پس جہاں ہم پتھر نصب کردیں وہ اس بیت اللہ کے قائم مقام ہے۔ درمنثور میں مزید لکھا ہے کہ کہا جاتا ہے کہ کیسے ہوسکتا ہے کہ حضرت اسحاق علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تمام اولاد داخل نہ ہو فرماتے ہیں کیوں آپ نے اس شہر والوں کے لئے دعا فرمائی تھی کہ جب انہیں مکہ میں بسائے تو یہ بتوں کی عبادت نہ کریں۔ دعا فرمائی اجعل هذا البلد آمنا کہ اس شہر کو امن والا بنادے آپ نے تمام شہروں کے لئے یہ دعا نہیں فرمائی تھی۔ عرض کی کہ مجھے اور میرے بچوں کو اس شہر میں بتوں کی عبادت سے بچالے اور دعا میں آپ نے اہل مکہ کو ہی خاص فرمایا ہے اور عرض کی رَبَّنَآ اِنِّیْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ اے ہمارے پروردگار میں نے اپنی اولاد کو ٹھہرایا ہے(1) اور ابن عیینہ کا قول قرآن حکیم، سنت، اجماع اور خبر متواتر کی وجہ سے مردود ہے کیونکہ قرآن حکیم میں عمومی طور پر مشرکین سے مراد اہل مکہ ہیں ارشاد ہے سَیَقُوْلُ الَّذِیْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَ لَآ اٰبَآؤُنَا وَ لَا حَرَّمْنَا مِنْ شَیْءٍ (مشرک کہیں گے اگر اللہ چاہتا تو ہم اور ہمارے آباؤ اجداد شرک نہ کرتے اور کسی چیز کو ہم حرام نہ کرتے۔

رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ ۚ وَ مَنْ عَصَانِیْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۳۶﴾

"اے میرے پروردگار! ان بتوں نے گمراہ کردیا بہت سے لوگوں کو[1] پس جو کوئی میرے پیچھے چلا تو وہ میرا ہوگا اور جس نے میری نافرمانی کی (تو اس کا معاملہ تیرے سپرد ہے) بے شک تو غفور رحیم ہے[2]۔"

[1] اور یہاں اضلال کی نسبت بتوں کی طرف مجازی ہے کیونکہ یہ گمراہی کا سبب تھے، یعنی بہت سے لوگ ان کی وجہ سے ہدایت کے راستہ سے بھٹک گئے جب انہوں نے ان کی عبادت شروع کی۔

[2] پس جس نے دین میں میری اتباع کی وہ میرا ہے وہ دنیا و آخرت میں مجھ سے جدا نہ ہوگا حتیٰ کہ میرے ساتھ جنت میں داخل ہوگا اور جس نے میری نافرمانی کی اس کو تو معاف کردے اور اس پر رحم فرما کیونکہ تو غفور رحیم ہے۔ السدی کہتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے جس نے میری نافرمانی کی پھر توبہ کی تو تو غفور رحیم ہے(2)۔ مقاتل بن حبان فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے جس نے شرک کے علاوہ میری نافرمانی کی تو تو غفور رحیم ہے(3)۔ ظاہر یہ ہے کہ آپ نے یہ کلام اس سے پہلے کی تھی، جبکہ ابھی تک آپ کو اللہ تعالیٰ نے آگاہ نہیں کیا تھا

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 160 (العلمیہ) 2۔ تفسیر خازن، جلد 4، صفحہ 39 (التجاریہ) 3۔ تفسیر خازن، جلد 4، صفحہ 39 (التجاریہ)

کہ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ۔ شرک کرنے کو وہ معاف نہیں فرماتا۔ پھر جب آپ کو اس چیز کا علم ہو گیا تو یہ دعا مانگی وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ اور پھلوں سے انہیں رزق عطا فرما جو ایمان لائے ان میں سے اللہ اور آخرت پر آپ کا گمان تھا کہ اللہ تعالیٰ مشرک سے دنیا میں بھی انتقام لے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ اور جو کفر کرے گا میں اسے تھوڑا سا لطف اندوز کروں گا۔ پھر اسے دوزخ کے عذاب کی طرف مجبور کروں گا اور یہ بہت ہی برا ٹھکانہ ہے۔

رَبَّنَاۤ اِنِّیْۤ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْىِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِیْۤ اِلَیْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ یَشْكُرُوْنَ ﴿۳۷﴾

”اے ہمارے رب! میں نے بسا دیا ہے اپنی کچھ اولاد کو[1] اس وادی میں جس میں کوئی کھیتی باڑی نہیں، تیرے حرمت والے گھر کے پڑوس میں[2]۔ اے ہمارے رب! یہ اس لئے تا کہ وہ قائم کریں نماز[3] پس کر دے لوگوں کے دلوں کو[4] کہ وہ شوق و محبت سے ان کی طرف مائل ہوں[5] اور انہیں رزق دے پھلوں سے تا کہ وہ (تیرا) شکر ادا کریں[6]۔“

[1] نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی میں نے بسایا ہے اپنی اولاد کو یہاں مفعول حذف کیا گیا ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے اَسْكَنْتُ وَلَدًا مِّنْ ذُرِّیَّتِیْ۔ یا یہ معنی کہ میں نے اپنی بعض اولاد کو بسایا ہے۔ اور وہ اسماعیل اور آپ کی اولاد ہے کیونکہ اسماعیل کے ٹھہرانے کے ساتھ ان کا ٹھہرانا بھی متضمن ہے۔

[2] وادی اصل میں وہ جگہ ہوتی ہے جس میں پانی بہتا ہے۔ پھر پہاڑوں اور ٹیلوں کے درمیان جو راستہ ہوتا ہے اسے بھی وادی کہا جانے لگا اور جس جگہ مکہ ہے وہ دو پہاڑوں کے درمیان ایک وادی ہے جس میں کوئی کھیتی باڑی نہیں ہوتی ہے کیونکہ یہ پتھریلی زمین ہے۔ اس میں کوئی چیز نہیں اگتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن فرمایا اس شہر کو اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کی تخلیق کے دن سے حرمت عطا فرمائی ہے۔ پس یہ قیامت تک اللہ تعالیٰ کی حرمت سے حرام ہے۔ اس میں قتال کرنا کسی کے لئے حلال نہیں ہے اور میرے لئے بھی دن کی ایک گھڑی کے سوا حلال نہیں ہے۔ پس یہ قیامت تک اللہ تعالیٰ کی حرمت سے حرام ہے، نہ اس کا کانٹا توڑا جائے گا نہ اس کا شکار بھگایا جائے گا اور نہ اس کا لقطہ (گم شدہ چیز) اٹھایا جائے مگر جو اس کا اعلان کرائے اور نہ اس کا گھاس کاٹا جائے گا۔ حضرت عباس نے عرض کی یا رسول اللہ اذخر (گھاس) کی استثناء فرما دیں کیونکہ یہ لوہاروں اور گھروں میں آگ جلانے کے کام آتا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا الا الاذخر یعنی گھاس اس حکم میں داخل نہیں(1)۔ یہ حدیث بخاری اور مسلم نے ابن عباس سے روایت کی ہے۔ واقدی اور ابن عساکر نے عامر بن سعید عن ابیہ کے طریق سے اس طرح روایت کی ہے حضرت سارہ حضرت ابراہیم کے عقد میں تھیں عرصہ طویل گزر گیا مگر بچہ پیدا نہ ہوا تو حضرت سارہ نے یہ بے اولاد ہونے کی کیفیت دیکھی تو اپنی لونڈی ہاجرہ حضرت ابراہیم کو ہبہ کر دی۔ اس کے بطن سے حضرت اسماعیل پیدا ہوئے۔ حضرت سارہ کو اس سے غیرت آ گئی اور نفس میں غصہ محسوس کیا اور حضرت ہاجرہ کا تعاقب کیا اور قسم اٹھائی کہ میں ان کے تین اعضاء کاٹوں گی۔ حضرت ابراہیم نے سارہ سے فرمایا کیا تو اپنی قسم کو پورا کرنا چاہتی ہے۔ حضرت سارہ نے پوچھا میں اسے کیسے پورا کروں؟ حضرت ابراہیم نے فرمایا ان کے کان چھید دو اور اس کا ختنہ کر دو۔ تو

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 437 (قدیمی)

حضرت سارہ نے ایسا کیا حضرت ہاجرہ نے اپنے کانوں میں بالیاں ڈالیں تو ان سے ان کے حسن میں مزید اضافہ ہوگیا۔ حضرت سارہ نے یہ دیکھ کر کہا میں نے تو اس کے جمال میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ حضرت سارہ حضرت ابراہیم کے حضرت ہاجرہ کے ساتھ رہنے پر خوش نہ تھیں۔ حضرت ابراہیم نے دیکھا حضرت سارہ کا بہت زیادہ غصہ محسوس کیا تو حضرت ہاجرہ کو آپ نے مکہ مکرمہ منتقل کر دیا اور آپ ہر روز شام سے براق پر سوار ہو کر ان کی ملاقات کے لئے جاتے کیونکہ حضرت ہاجرہ سے آپ کو شدید محبت تھی(1)۔ صحیح بخاری میں ہے اور بغوی اپنی سند کے ساتھ ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا حضرت اسماعیل کی والدہ سے پہلے کسی عورت نے ازار بند نہیں باندھا تھا اور حضرت ہاجرہ نے اس لئے یہ باندھا تا کہ اپنا اثر حضرت سارہ سے چھپالیں(2)۔

پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت ہاجرہ اور اپنے بیٹے اسماعیل علیہ السلام کو مکہ مکرمہ لے کر آئے جبکہ حضرت ہاجرہ انہیں دودھ پلاتی تھیں۔ آپ نے بیت اللہ شریف کے قریب مسجد کی اوپر والی جانب میں زمزم کے اوپر ایک درخت کے پاس حضرت ہاجرہ اور اسماعیل کو چھوڑ دیا اور اس وقت مکہ مکرمہ میں نہ کوئی شخص تھا اور نہ پانی آپ نے دونوں کو وہاں ٹھہرایا اور ان کے پاس کھجوروں کا ایک تھیلا اور ایک پانی کا مشکیزہ رکھ دیا۔ پھر آپ واپس پلٹے تو حضرت ہاجرہ آپ کے پیچھے آئیں اور پوچھا اے ابراہیم ہمیں اس ویران وادی میں چھوڑ کر کہاں جا رہے ہو جہاں نہ کوئی انسان ہے اور نہ کوئی چیز ہے؟ حضرت ہاجرہ نے بار بار آپ سے سوال کیا مگر آپ علیہ السلام ان کی طرف متوجہ نہ ہوئے۔ پھر حضرت ہاجرہ نے پوچھا کیا اللہ تعالیٰ نے تمہیں یہ حکم دیا تو آپ نے فرمایا ہاں۔ حضرت ہاجرہ نے کہا پھر تو وہ ہمیں ضائع نہ کرے گا۔ یہ کہہ کر آپ اپنے بچے کے پاس واپس آگئیں۔ حضرت ابراہیم چلتے چلتے ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں سے حضرت ہاجرہ اور اسماعیل نظر نہ آتے تھے تو قبلہ شریف کی طرف متوجہ ہوئے اور ہاتھ اٹھا کر یہ دعا مانگی ربنا انی اسکنت من سے یشکرون تک۔ حضرت ہاجرہ حضرت اسماعیل کو دودھ پلاتی رہیں اور اس مشکیزہ کے پانی کو بھی استعمال کرتی رہی یہاں تک کہ مشکیزہ کا پانی ختم ہوگیا۔ آپ نے خود بھی اور بچے نے بھی پیاس محسوس کی۔ آپ اپنے معصوم بچے حضرت اسماعیل کی طرف دیکھتیں کہ وہ پیاس سے لوٹ پوٹ ہو رہا ہے، یا فرمایا کہ وہ اپنی زبان کو خشک ہونٹوں پر مار رہا ہے۔ آپ سے یہ ناقابل دید منظر نہ دیکھا گیا۔ آپ صفا کی پہاڑی کی طرف آئیں اور اس کے اوپر چڑھ گئیں پھر وادی کی طرف متوجہ ہوئیں کہ کوئی انسان نظر آجائے لیکن آپ کو کوئی شخص نظر نہ آیا۔ پھر آپ صفا سے اتریں اور وادی میں پہنچ گئیں۔ اپنی چادر کی اطراف کو اوپر کیا اور دوڑنے والے انسان کی طرح دوڑیں یہاں تک کہ وادی کراس کر گئیں۔ پھر آپ مروہ پر آئیں اس کے اوپر کھڑے ہو کر دیکھا مگر کوئی شخص نظر نہ آیا۔ آپ نے سات مرتبہ یہ چکر لگایا۔ ابن عباس نے فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لوگوں کی صفا و مروہ کے درمیان سعی اسی وجہ سے ہے۔ جب آپ نے مروہ کے اوپر سے دیکھا تو آپ نے ایک آواز سنی اور اپنے آپ کو کہا ٹھہرو، پھر غور سے آواز کے سننے کی کوشش کی تو پھر آواز سنائی دی۔ فرماتی ہیں میں نے سنا کہ کوئی کہہ رہا ہے کہ تیرے پاس مددگار آچکا ہے۔ وہ آواز ایک فرشتہ کی تھی جو زمزم کے قریب تھا۔ اس نے اپنی ایڑھی یا پروں سے زمین کو کریدا تو پانی ظاہر ہوگیا۔ حضرت ہاجرہ نے اس پانی کو اپنے مشکیزہ میں بھرنا شروع کیا۔ جب آپ پانی مشکیزہ میں ڈالتیں تو نیچے سے اور نکل آتا۔ ابن عباس فرماتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ ام اسماعیل پر رحم فرمائے، اگر وہ زمزم کو چھوڑ دیتیں یا فرمایا وہ پانی کو مشکیزہ میں نہ ڈالتیں

1۔ تاریخ ابن عساکر، جلد 69، صفحہ 88-187 (دار الفکر)　2۔ تفسیر خازن، جلد 4، صفحہ 40-39 (التجاریہ)

تو زمزم ایک جاری چشمہ ہوتا(1)۔ فرمایا حضرت ہاجرہ نے اس پانی کو خود پیا اور اپنے بچے کو دودھ پلایا فرشتے نے آپ کو کہا تم ضائع ہونے کا خوف نہ کرو کیونکہ یہاں اللہ کا گھر ہے جسے یہ بچہ اور اس کا باپ تعمیر کریں گے۔ اللہ تعالیٰ اس گھر کے مکینوں کو ضائع نہیں فرماتا۔ بیت اللہ زمین سے ٹیلے کی مانند بلند تھا۔ سیلاب آتے تھے اور اس کا دائیں بائیں سے کچھ حصہ بہا کر لے جاتے۔ یہ سلسلہ جاری رہا حتیٰ کہ اس راستہ سے جرہم قبیلہ کی ایک جماعت گذری اور مکہ کی نشیبی زمین پر پڑاؤ کیا۔ انہوں نے پانی پر ایک پرندہ بیٹھا ہوا دیکھا۔ کہنے لگے یہ پرندہ پانی پر گھوم رہا ہے۔ ہم اس وادی سے گذرے تھے اور یہاں کوئی پانی نہ تھا۔ انہوں نے کچھ لوگوں کو مشکیزے دے کر بھیجا تو انہوں نے پانی پالیا۔ واپس آکر انہوں نے اپنے قبیلہ کے لوگوں کو پانی کی اطلاع دی۔ پس جب وہ لوگ پانی پر پہنچے تو حضرت اسماعیل کی والدہ پانی کے قریب موجود تھیں۔ انہوں نے آپ سے اترنے کی اجازت طلب کی۔ تو آپ نے اجازت دی اور فرمایا تمہیں پانی پر کوئی حق نہ ہوگا۔ انہوں نے کہا ٹھیک ہے۔

ابن عباس فرماتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا انہوں نے ام اسمٰعیل کو پایا۔ وہ انسانوں سے محبت کرتی تھیں۔ پس انہوں نے اپنے گھر والوں کو بلا بھیجا اور ان کے ساتھ یہاں رہنے لگے حتیٰ کہ ان لوگوں کے معاشرے میں حضرت اسماعیل پروان چڑھے اور ان سے عربی زبان سیکھی۔ جب آپ بالغ ہو گئے تو انہوں نے اپنی ایک عورت سے آپ کا نکاح کر دیا۔ حضرت ہاجرہ کا وصال ہو گیا۔ پھر اسماعیل علیہ السلام کی شادی کے بعد حضرت ابراہیم آپ کی برکت دیکھنے آئے۔ بقیہ قصہ ہم نے سورۂ بقرہ کی آیت وَ اتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ۔ کے تحت ذکر کیا۔

۳؎ یہ لام لام کَی ہے جو اسکنت کے متعلق ہے، یعنی میں نے اس بے آب وگیاہ وادی میں انہیں صرف اس لئے بسایا ہے کہ یہ تیرے عزت والے گھر کے قریب نماز قائم کریں۔ نداء کا تکرار اور درمیان میں اس کا ذکر یہ شعور دلانے کے لئے ہے کہ یہاں ٹھہرانے سے مقصود بالذات نماز ہے اور دعا سے مقصود ان کے لئے نماز کی توفیق ہے۔

بعض علماء فرماتے ہیں یہ لام لام امر ہے اور مراد ان کے لئے اقامۃ صلوٰۃ کی دعا ہے۔ گویا ان سے اقامت کو کو طلب فرمایا اور اللہ تعالیٰ سے سوال کیا کہ انہیں نماز کی توفیق عطا فرمائے۔

۴؎ ہشام سے افئدۃ یعنی ہمزہ کے بعد یا مروی ہے اور جمہور کے نزدیک بغیر یاء کے ہے۔ یہ فواد کی جمع ہے جس کا معنی دل ہے۔ من الناس میں من تبعیضیہ ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں اگر افئدۃ الناس ہوتا تو فارس، روم، ترک اور ہند کے لوگ تم پر سیلاب کی طرح امڈ پڑتے(2)۔ سعید بن جبیر فرماتے ہیں افئدۃ الناس ہوتا تو یہود ونصاریٰ اور مجوسی بھی حج کرتے لیکن اَفْـِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ فرمایا جس سے صرف مسلمان مراد ہیں(3) یا من ابتدائیہ ہے جیسے تیرا قول ہے القلب منی سقیم اس میں من ابتدائیہ ہے مراد افئدتنا ہے۔

۵؎ سدی فرماتے ہیں تھوی کا معنی تمیل ہے یعنی مائل ہوں(4) ھوی کو الی کے ساتھ متعدی کیا کیونکہ اس میں نزوع کے معنی کی تضمین ہے۔

۶؎ اگرچہ یہ بے آب وگیاہ وادی میں ہیں جہاں کوئی کھیتی باڑی نہیں ہوتی جیسا کہ تو نے پانی والے علاقوں میں رہنے والوں کو رزق دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا کو شرف قبولیت بخشا اور مکہ کو امن والا حرم بنایا اور ہر قسم کے پھل اس میں جمع ہوتے ہیں حتیٰ کہ یہاں ہر موسم بہار، خزاں، گرمی، سردی کے شیریں وتازہ پھل ایک دن میں موجود ہوتے ہیں۔

1۔ تاریخ ابن عساکر، جلد 70، صفحہ 145 (دار الفکر)
2۔ تفسیر خازن، جلد 4، صفحہ 41 (التجاریۃ)
3۔ تفسیر خازن، جلد 4، صفحہ 41 (التجاریۃ)
4۔ تفسیر خازن، جلد 4، صفحہ 41 (التجاریۃ)

رَبَّنَآ اِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِیْ وَ مَا نُعْلِنُ ؕ وَ مَا یَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ فِی الْاَرْضِ وَ لَا فِی السَّمَآءِ ﴿۳۸﴾

"اے ہمارے رب! یقیناً تو جانتا ہے جو ہم (دل میں) چھپائے ہوئے ہیں اور جو ہم ظاہر کرتے ہیں [1] اور کوئی چیز مخفی نہیں ہے اللہ تعالیٰ پر نہ زمین میں اور نہ آسمان میں [2]"

[1] اے ہمارے رب تو ہمارے مخفی اور ظاہر امور، احوال اور مصالح کو جانتا ہے اور تو ہم پر ہماری ذاتوں سے بھی زیادہ رحم فرمانے والا ہے، ہمیں دست طلب پھیلانے کی ضرورت تو نہیں ہے لیکن فقط عبودیت کے اظہار، تیری رحمت کی احتیاج اور تیری نوازشات کو جلدی طلب کرنے کے لئے دعا کرتے ہیں۔ ابن عباس اور مقاتل فرماتے ہیں مَا نُخْفِیْ وَ مَا نُعْلِنُ سے مراد وہ وجد اور گھٹن ہے جو اسماعیل اور ان کی والدہ نے وادی غیر ذی زرع میں ٹھہرنے کے وقت محسوس کی تھی (1)۔ بعض علماء فرماتے ہیں مَا نُخْفِیْ سے مراد فرقت کے وقت کی قلبی بے چینی ہے اور مَا نُعْلِنُ سے مراد تضرع و زاری ہے۔

[2] کوئی چیز مخفی نہیں ہے اللہ تعالیٰ پر نہ زمین میں اور نہ آسمان میں کیونکہ وہ علم ذاتی کے ساتھ عالم ہے اس کی نسبت ہر معلوم کی طرف برابر اور مساوی ہے۔ مِنْ استغراق کے لئے ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ قول حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ہے۔ جبکہ اکثر علماء کا خیال ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ وَهَبَ لِیْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ ؕ اِنَّ رَبِّیْ لَسَمِیْعُ الدُّعَآءِ ﴿۳۹﴾

"سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جس نے عطا فرمائے مجھے بڑھاپے میں اسمٰعیل اور اسحٰق (جیسے فرزند) [1] بلاشبہ میرا رب بہت سننے والا ہے دعاؤں کو [2]"

[1] سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے جس نے مجھے اس وقت بیٹا عطا فرمایا جبکہ میں اولاد سے مایوس اور عمر میں بڑھاپے کو پہنچ چکا ہوں۔ ہبہ کو کبر کے ساتھ مقید کرنا نعمت کی عظمت کے لئے ہے اور اس نعمت میں جو بندہ نوازی ہے اس کا اظہار کرنے کے لئے ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں حضرت اسمٰعیل کی پیدائش کے وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر ننانوے 99 سال تھی اور حضرت اسحٰق کی پیدائش کے وقت ایک سو بارہ 112 سال تھی (2)۔ سعید بن جبیر فرماتے ہیں حضرت ابراہیم کو اسحاق علیہ السلام کی خوشخبری ملی تو آپ کی عمر ایک سو سترہ سال تھی (3)۔ ابن جریر نے اسی طرح تخریج کیا ہے۔

[2] بے شک میرا رب دعاؤں کو قبول کرنے والا ہے۔ یہ سمع الملک الکلام سے ہے، جس کا مطلب ہے کہ بادشاہ نے اس کلام کو کوئی وقعت عطا کی اور قابل اعتناء سمجھا۔ سیبویہ کہتے ہیں سمیع مبالغہ کے ان صیغوں سے ہے جو فعل کے عمل کی طرح عمل کرتے ہیں، اپنے مفعول یا فاعل کی طرف مضاف ہوتے ہیں۔ سامع کی دعاء اللہ کی طرف نسبت مجازی ہے۔ اس کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اپنے رب سے دعا مانگی تھی اور بچے کا سوال کیا تھا۔ پس اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا کو مایوس ہونے کے وقت شرف قبولیت عطا فرمایا تا کہ نعمتوں میں عظیم نعمت بن جائے۔

رَبِّ اجْعَلْنِیْ مُقِیْمَ الصَّلٰوةِ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ ۖۗ رَبَّنَا وَ تَقَبَّلْ دُعَآءِ ﴿۴۰﴾

1۔ تفسیر خازن، جلد 4، صفحہ 41 (التجاریہ)
2۔ تفسیر خازن، جلد 4، صفحہ 41 (التجاریہ)
3۔ تفسیر خازن، جلد 4، صفحہ 41 (التجاریہ)

"میرے رب! بنا دے مجھے نماز قائم کرنے والا اور میری اولاد کو بھی [1] اے ہمارے رب! میری یہ التجا ضرور قبول فرما [2]"

[1] اے میرے رب مجھے نماز کو ظاہری اور باطنی آداب کو بجالاتے ہوئے پابندی سے نماز ادا کرنے والا بنادے اور میری اولاد کو بھی نماز قائم کرنے کی توفیق عطا فرما۔ یہ ضمیر منصوب پر معطوف ہے، یعنی وَاجْعَلْ بَعْضَ ذُرِّيَّتِيْ مَنْ يُّقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ یعنی میری اولاد سے بعض کو ایسا بنادے کہ وہ نماز قائم کرنے والے ہوں۔ من بعضیہ ذکر فرمایا کیونکہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے یہ علم عطا فرمادیا تھا کہ آپ کی اولاد میں کفار بھی ہوں گے۔ ارشاد فرمایا لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ (میرا عہد ظالموں کو نہ پہنچے گا)

[2] اے ہمارے پروردگار اور میری دعا قبول فرمایا۔ یا یہ معنی کہ میری عبادت قبول فرما۔ البزی نے دعائی یعنی یاء کے اثبات کے ساتھ وقفاً اور وصلاً پڑھا ہے۔

ورش اور ابو عمرو نے صرف وصل میں یاء کو ثابت کیا ہے اور باقی قراء دونوں حالتوں میں حذف کرتے ہیں۔ امام ترمذی حضرت انس سے، امام احمد اور امام بخاری نے الادب میں، اصحاب سنن اربعہ، ابن حبان اور حاکم نے النعمان بن بشیر سے اور ابو یعلی نے براء بن عازب اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ: دعا ہی عبادت ہے(1)۔ ترمذی نے حضرت انس کے حوالے سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ دعا عبادت کا مغز ہے(2)۔

رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ ﴿۴۱﴾

"اے ہمارے رب! بخش دے مجھے اور میرے ماں باپ کو اور سب مومنوں [1] کو جس دن حساب قائم ہوگا [2]"

[1] یہ آیت کریمہ دلیل ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والدین مسلمان تھے اور آزر آپ کا چچا تھا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام تارخ تھا جیسا کہ ہم نے سورۂ بقرہ میں تحقیق کے ساتھ لکھا ہے۔ آزر کے توہم کو دور کرنے کے لئے والدی فرمایا، یعنی میرے حقیقی والدین اور ابوی نہیں کہا کیونکہ اب کا اطلاق چچا پر مجازاً ہوتا رہتا ہے اور آزر کے باپ ہونے کی تقدیر پر جیسا کہ بعض علماء نے لکھا بھی ہے تو سورۂ توبہ میں اس مغفرت طلب کرنے کا عذر خود اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا ہے وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَاۤ اِيَّاهُ" اور نہ تھی استغفار ابراہیم کی اپنے باپ کے لئے مگر ایک وعدہ (کو پورا کرنے) کی وجہ سے جو انہوں نے اس سے کیا تھا، یعنی ان کا معاملہ ظاہر ہونے سے پہلے آپ نے استغفار کیا تھا فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗۤ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ"۔ جب ظاہر ہو گیا ان کے لئے یہ اللہ کا دشمن ہے تو آپ نے اس سے برأت کا اظہار کیا۔

[2] یہاں یقوم بمعنی یثبت یا یبدو یا یظہر ہے اور یہ القیام علی الرجل سے مشتق ہے جیسے کہا جاتا ہے قَامَتِ الْحَرْبُ عَلٰى سَاقٍ جنگ اپنی پنڈلی پر کھڑی ہوئی۔ یعنی حساب ظاہر ہوگا۔ یا حساب ثابت ہوگا یا یہ معنی کہ جس دن اہل حساب کھڑے ہوں گے، یعنی مضاف حذف کیا گیا ہے اور مجازاً فعل کو مضاف الیہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے جیسا کہ اس ارشاد میں مضاف حذف کیا گیا ہے وَسْئَلِ الْقَرْيَةَ اصل میں واسئل اهل القرية ہے بعض علماء فرماتے ہیں مراد یوم یقو الناس للحساب ہے یعنی جس دن لوگ حساب کے

1۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 173 (وزارت تعلیم)
2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 173 (وزارت تعلیم)

لئے کھڑے ہوں گے لیکن مفہوم کے واضح ہونے کی وجہ سے صرف حساب کا ذکر کیا گیا ہے۔

وَ لَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ ۬ؕ اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ ﴿۴۲﴾

''اور تم یہ مت خیال کرو کہ اللہ تعالیٰ بے خبر ہے ان کرتوتوں سے جو یہ ظالم کر رہے ہیں [1] وہ تو انہیں صرف ڈھیل دے رہا ہے اس دن کے لئے جب کہ (مارے خوف کے) کھلی کی کھلی رہ جائیں گی آنکھیں [2]''

[1] غفلۃ کا معنی امور کی حقیقت پر مطلع نہ ہونا ہے۔ اس آیت میں خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور اس سے مراد آپ کو اپنے معاملہ پر ثابت قدم رکھنا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے احوال و افعال سے باخبر ہے، اس پر کوئی چیز مخفی نہیں ہے اور وہ یقیناً قلیل و کثیر پر سزا دینے والا ہے یا یہ خطاب ہر اس شخص کو ہے جو صفات الٰہی سے جاہل ہونے کی بناء پر اللہ تعالیٰ کی غفلت کا سوچتا ہے یا کفار کو ڈھیل دینے کی وجہ سے بدگمانی کا شکار ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ آیت کریمہ ہر مظلوم اور ستم رسیدہ کے اطمینان و تسلی کے لئے اور ظالموں کو تنبیہ اور دھمکی دینے کے لئے ہے۔

[2] وہ تو صرف انہیں ڈھیل دے رہا ہے اور ان کے عذاب کو مؤخر کر رہا ہے اس دن کے لئے جس دن خوف کے مارے آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا مطلب ہے آنکھیں بلند اور اپنی جگہ سے ہٹ جائیں گی۔

مُهْطِعِيْنَ مُقْنِعِيْ رُءُوْسِهِمْ لَا يَرْتَدُّ اِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ ۚ وَ اَفْـِٕدَتُهُمْ هَوَآءٌ ﴿۴۳﴾

''بھاگم بھاگ جا رہے ہوں گے اپنے سر اٹھائے ہوئے [1] ان کی پلکیں نہیں جھپکتی ہوں گی [2] اور ان کے دل (دہشت سے) اڑے جا رہے ہوں گے [3]''

[1] جلدی جلدی دوڑے جا رہے ہوں گے دائیں بائیں بالکل متوجہ نہ ہوں گے اور اپنے قدموں کی جگہ کو بھی نہیں پہچانیں گے۔ قتادہ فرماتے ہیں وہ بلانے والے کی طرف دوڑے جا رہے ہوں گے (1)۔ مجاہد فرماتے ہیں وہ ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے ہوں گے (2)۔ قاموس میں ہے هطع هطوعا اسرع مقبلا خائفا ترساں ولرزاں بڑی تیزی سے آگے بڑھتے جانا۔ یا اس کا معنی ہے کسی چیز کو ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہنا کہ اس سے نظر بالکل نہ ہٹے۔ مہطع وہ شخص جو ذلت و رسوائی کے وقت اوپر نہیں دیکھتا یا وہ شخص جو خاموشی سے اس شخص کی طرف چل رہا ہو جس نے اسے آواز دی ہے۔ القتیبی فرماتے ہیں المقنع وہ شخص جو اپنا سر اٹھائے ہوئے ہو اور صرف سامنے کی طرف متوجہ ہو (3)۔ الحسن فرماتے ہیں قیامت کے روز لوگوں کے چہرے آسمان کی طرف ہوں گے اور ایک دوسرے کو دیکھ نہ سکیں گے (4)۔

[2] یعنی ان کی نظریں ان کی طرف لوٹیں گی ہی نہیں کہ وہ اپنے آپ کو دیکھ سکیں بلکہ ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہیں گی اور جھپکتی بھی نہ ہوں گی۔

[3] اور ان کے دل دہشت سے اڑے جا رہے ہوں گے۔ ھواء کا مطلب خلاء ہے یعنی ان کے دل دہشت و حیرت کی وجہ سے سوچ و سمجھ

1۔ تفسیر خازن، جلد 4، صفحہ 42 (التجاریہ)
2۔ تفسیر خازن، جلد 4، صفحہ 42 (التجاریہ)
3۔ تفسیر خازن، جلد 4، صفحہ 42 (التجاریہ)
4۔ تفسیر خازن، جلد 4، صفحہ 42 (التجاریہ)

سے خالی ہوں گے۔ احمق کے بارے کہا جاتا ہے قلبه هواء اس کا دل خالی ہے اس میں نہ کوئی رائے اور نہ کوئی قوت فیصلہ۔ حمادہ فرماتے ہیں ان کے دل ان کے سینوں سے نکل جائیں گے، اور ان کے گلوں میں اٹک جائیں گے نہ ان کے مونہوں سے باہر آ ئیں گے اور نہ اپنی جگہ پر واپس جائیں۔ گے الافئدہ ھواء کا مطلب ہے ان میں کچھ بھی نہیں ہے۔ اسی وجہ سے زمین و آسمان کے درمیان کو خالی ہونے کی وجہ سے ھواء کہا جاتا ہے۔ سعید بن جبیر فرماتے ہیں اس کا مطلب ہے کہ ان کے دل ادھر ادھر ان کے جوفوں میں حرکت کر رہے ہوں گے، ان کے استقرار وسکون کے لئے کوئی جگہ نہ ہوگی (1)۔ امام بغوی فرماتے ہیں حقیقی معنی یہ ہے کہ دل اپنی جگہ سے ہل جائیں گے اور آنکھیں کھلی ہوں گی اور یہ سب کچھ اس دن ہولناکی کی وجہ سے ہوگا (2)۔

وَ اَنْذِرِ النَّاسَ يَوْمَ يَاْتِيْهِمُ الْعَذَابُ فَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رَبَّنَاۤ اَخِّرْنَاۤ اِلٰۤى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَ نَتَّبِعِ الرُّسُلَ ؕ اَوَ لَمْ تَكُوْنُوْۤا اَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلُ مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍ ۙ﴿۴۴﴾

"اے میرے نبی! ڈرایئے لوگوں کو اس دن سے جب آئے گا ان پر عذاب 1 ۔ تو بول اٹھیں گے ظالم اے ہمارے رب! ہمیں مہلت دے تھوڑی دیر کے لئے 2 ہم تیری دعوت پر لبیک کہیں گے اور ہم رسولوں کی پیروی کریں گے 3 اے کافرو! کیا تم قسمیں نہیں اٹھایا کرتے تھے اس سے پہلے کہ تمہیں یہاں سے کہیں جانا نہیں ہے 4 "

1 ۔ اے پیارے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ڈرایئے لوگوں کو یعنی قیامت کے دن سے یا موت کے دن سے کیونکہ ان کے عذاب کے دنوں میں سے پہلا دن موت کا دن ہے۔ یا یہ معنی کہ جس دن ان پر جلدی عذاب آئے گا دنیا میں ایصال کرنے کی وجہ سے۔

2 ۔ شرک اور تکذیب کی وجہ سے اپنے اوپر ظلم کرنے والے کہیں گے ہمیں دنیا میں مہلت دے یا یہ معنی کہ ہمارے عذاب کو موخر فرما اور ہمیں دنیا میں ایک مرتبہ پھر بھیج دے تھوڑی مقدار زمانہ کے لئے اور ہمیں اتنی مقدار مہلت دے دے کہ ہم تجھ پر ایمان لے آئیں اور تیرے پیغام رشد وہدایت کو قبول کرلیں۔

3 ۔ ہم تیری دعوت پر لبیک کہیں گے اور ہم رسولوں کی پیروی کریں گے۔ یہ فعل امر کا جواب ہے جیسا کہ دوسری آیت میں ہے لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْۤ اِلٰۤى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ وَ اَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ۔

4 ۔ انہیں جواب ملے گا کیا تم دنیا میں اس سے پہلے قسمیں نہیں اٹھاتے تھے کہ تمہیں یہاں سے کہیں نہیں جانا۔ یہ قسم کا جواب ہے۔ مطابقت کی وجہ سے خطاب کے لفظ کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ معنی یہ ہے کہ تم دنیا میں باقی رہو گے موت سے تم دوچار نہ ہوگے۔ شاید انہوں نے تکبر اور غرور کی بنا پر قسمیں اٹھائیں تھیں یا ان کی دلالت حال کی حکایت کے لئے ان کی قسموں کا ذکر کیا کیونکہ انہوں نے اپنے آپ کو مضبوط سمجھ رکھا تھا اور بڑی دور کی امنگیں رکھتے تھے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ انہوں نے قسمیں اٹھائیں کہ وہ دار آخرت کی طرف منتقل نہ ہوں گے۔ یا یہ کہ جب وہ مریں گے تو اس حالت سے پھر دوبارہ زندہ نہ ہوں گے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ لَا يَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ يَّمُوْتُ ؕ بڑی شد ومد سے اللہ تعالیٰ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ (دوبارہ) زندہ نہیں کرے گا اللہ تعالیٰ جو (ایک بار) مر جاتا ہے۔

1 ۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 163 (العلمیۃ) 2 ۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 43 (التجاریۃ)

وَّ سَكَنْتُمْ فِيْ مَسٰكِنِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ وَ تَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ وَ ضَرَبْنَا لَكُمُ الْاَمْثَالَ ﴿۴۵﴾

''اور تم آباد تھے ان لوگوں کے (متروکہ) گھروں میں جنہوں نے ظلم کئے تھے اپنے آپ پر ۱؎ اور یہ بات تم پر خوب واضح ہو چکی تھی ۲؎ کہ کیا برتاؤ کیا تھا ہم نے ان کے ساتھ ۳؎ اور ہم نے بھی بیان کی تھیں تمہارے لئے (طرح طرح) کی مثالیں ۴؎

۱؎ مثلاً قوم نوح' عاد' ثمود وغیرہم جو تم سے پہلے گذر چکے ہیں۔

۲؎ ان کے مکانوں کے کھنڈرات کے مشاہدہ اور تواتر کے ساتھ ان کی تباہی کی خبروں کی وجہ سے تم پر یہ بات واضح ہو چکی ہے۔ تبین کا فاعل مضمر ہے جس پر موجود کلام دلالت کر رہی ہے، یعنی تبین لکم حالھم یعنی تمہارے لئے ان کی ناگفتہ بہ حالت ظاہر ہو چکی ہے۔

۳؎ ہم نے ان کے ساتھ کیسا برتاؤ کیا ہے مگر پھر بھی وہ اپنے بد کرتوتوں سے باز نہ آئے کیف کی نصب فعلنا کی وجہ سے ہے۔

۴؎ ہم نے تمہارے لئے ان کے احوال بیان کئے، یعنی ہم نے تمہیں ان رسولوں کی پاکیزہ زبانوں کے ذریعے بتایا جنہیں معجزات کی تائید حاصل تھی کہ تم کفر پر ہو اور عذاب کے مستحق ہو۔ یا یہ معنی کہ ہم نے بیان کر دیا تھا جو کچھ انہوں نے کہا تھا اور پھر جو ان کے ساتھ ہم نے سلوک کیا تھا وہ حالات و واقعات تو ضرب الامثال کی طرح ہیں۔ یا یہ معنی کہ ہم نے تمہارے قرآن میں مثالیں بیان فرمائیں۔

وَ قَدْ مَكَرُوْا مَكْرَهُمْ وَ عِنْدَ اللّٰهِ مَكْرُهُمْ ؕ وَ اِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ ﴿۴۶﴾

''اور انہوں نے اپنی طرف سے بڑی فریب کاریاں کیں ۱؎ اور اللہ تعالیٰ کے پاس انکے مکر کا توڑ تھا ۲؎ اگرچہ ان کی چالیں اتنی زبردست تھیں کہ ان سے پہاڑ اکھڑ جاتے تھے ۳؎''

۱؎ یعنی کفار مکہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فریب کاری کی۔ کیونکہ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو قید کرنے یا نکالنے یا قتل کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ مفسرین فرماتے ہیں مَكْرُهُمْ میں ھم ضمیر کا مرجع وہی لوگ ہیں جو مکروا کی ضمیر کا مرجع ہیں۔ مطلب یہ کہ انہوں نے ابطال حق اور ثبوت باطل کی خاطر پوری کوشش سے مکر و فریب کیا۔ اس معنی کے اعتبار سے اس کا ماقبل کلام سے کوئی تعلق نہ ہوگا اور میرے نزدیک یہ جملہ سکنتم پر معطوف ہے اور مَكْرُهُمْ کی ضمیر مجرور موصول کی طرف راجع ہے اور مراد سابقہ کفار ہیں اور مکروا کی ضمیر مرفوع کا مرجع الناس ہے۔ یعنی اس امت کے کفار اور اس کلام میں خطاب سے غیبۃ کی طرف التفات ہے۔ معنی یہ کہ تم اپنے پیشروں کے مکانوں میں آباد رہے اور خوب واضح ہو گیا تمہارے لئے جو کچھ ہم نے ان کے ساتھ برتاؤ کیا تھا اور تم نے ان گذرے ہوئے لوگوں کے مکر کی طرح مکر کیا ہے۔

۲؎ یعنی اس کی بارگاہ میں ان کا یہ فعل شنیع لکھا ہوا ہے۔ وہ ضرور انہیں اس کی سزا دے گا۔ یا یہ معنی کہ اس کے پاس ان کے مکر کو مٹانے اور انہیں اپنے مکر کی جزاء دینے کے لئے خوب تدبیر ہے۔ اور اسے ضرور وہ بروئے کار لائے گا۔

۳؎ حضرت علی اور ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے وان کا دمکرھم یعنی دال کے ساتھ پڑھا ہے اور عام قرأت نون کے ساتھ ہے،

اگرچہ ان کی چالیں اتنی زبردست تھیں کہ ان سے پہاڑ اکھڑ جاتے۔ کسائی اور ابن جریج نے تاکید کے لئے لام کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور مضارع کو مرفوع پڑھا ہے اس بناء پر کہ ان مخففہ من الثقیلہ ہے اور لام فاصلہ ہے۔ مطلب یہ کہ ان کا مکر یعنی شرک بڑا سخت ہے جس سے پہاڑ بھی اکھڑ جاتے ہیں جیسے ارشاد ہے وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ۔ أَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا پہاڑ گریں گے لرزتے ہوئے کیونکہ وہ کہہ رہے ہیں کہ رحمٰن کا ایک بیٹا ہے۔

امام بغوی فرماتے ہیں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حکایت ہے کہ یہ آیت کریمہ اس جابر نمرود کے بارے میں نازل ہوئی جس نے حضرت ابراہیم سے جھگڑا کیا تھا۔ اس کا قصہ اس طرح ہے کہ اس نے کہا ابراہیم جو کچھ کہتا ہے۔ اگر یہ حق ہے تو میں اس کو تسلیم نہیں کرتا حتیٰ کہ میں آسمان پر چڑھ کر معلوم کرلوں کہ آسمان میں کیا ہے۔ اس نے آسمان پر چڑھنے کی مہم سر کرنے کے لئے چار گدھ کے بچے پکڑے۔ پھر ان کو پالنا شروع کیا یہاں تک کہ وہ جوان ہوگئے۔ پھر اس نے ایک تابوت بنوایا جس کا ایک دروازہ اوپر اور ایک نیچے بنوایا نمرود ایک اور شخص کے ساتھ مل کر اس تابوت میں بیٹھ گیا اور تابوت کے کناروں پر لمبی لمبی لکڑیاں باندھ دیں اور اس کے اوپر گوشت لٹکا دیا۔ پھر تابوت کو گدھوں کے پاؤں سے باندھا اور انہیں چھوڑ دیا گدھ اڑنا شروع ہوگئے اور گوشت کے لالچ میں بہت اوپر نکل گئے حتیٰ کہ اڑتے اڑتے ان کو ایک دن گذر گیا اور وہ ہوا میں بہت دور چلے گئے۔ نمرود نے اپنے ساتھی کو کہا اوپر والا دروازہ کھول کر دیکھو، کیا آسمان قریب ہے۔ اس نے دروازہ کھول کر دیکھا تو کہا آسمان بالکل اسی طرح بلندی پر ہے۔ پھر اس نے کہا نیچے والا دروازہ کھولو، زمین کو دیکھو وہ کیسی نظر آ رہی ہے؟ اس نے نیچے والا دروازہ کھول کر دیکھا اور کہا مجھے تو زمین گہرائی کی مثل اور پہاڑ دھوئیں کی مانند نظر آ رہے ہیں۔ دوسرے دن بھی گدھ اڑتے رہے، بہت بلندی پر پہنچ گئے حتیٰ کہ ان کی اڑان میں ہوا حائل ہوگئی۔ نمرود نے پھر اپنے ساتھی کو کہا دونوں دروازے کھول دو۔ اس نے اوپر والا دروازہ کھولا تو آسمان بالکل اپنی ہیئت پر بلند نظر آ رہا تھا۔ نیچے والا دروازہ کھولا تو زمین بالکل سیاہ اور تاریک نظر آ رہی تھی۔ ایک غیبی آواز آئی اے سرکش کہاں جانے کا ارادہ ہے (1)۔ عکرمہ فرماتے ہیں نمرود کے ساتھ تابوت میں غلام تھا جس نے قوس اٹھائی ہوئی تھی۔ اس نے تیر پھینکا تو تیر ایک مچھلی کے خون سے آلودہ ہو کر واپس آیا جس نے اپنے آپ کو سمندر سے ہوا میں پھینکا تھا (2)۔ بعض علماء فرماتے ہیں وہ ایک پرندے کو لگ کر واپس آیا تھا۔ اس نے کہا میں نے آسمان کے خدا کا کام تمام کر دیا ہے۔ پھر نمرود نے اپنے ساتھی کو کہا تابوت کی لکڑیاں کھول دے اور گوشت کو نیچے کر دے۔ پس اس نے حکم بجالایا گدھ تابوت سمیت دھڑام کر کے گر گئے۔ پہاڑوں نے تابوت اور گدھوں کے گرنے کی آواز سنی تو وہ گھبرا گئے اور یہ گمان کیا کہ آسمان میں کوئی واقعہ ہوگیا ہے اور قیامت قائم ہوگئی ہے۔ قریب تھا کہ وہ اس دہشت کی وجہ سے اپنی جگہ سے ہل جاتے۔ اس کی طرف یہ ارشاد وَإِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُولَ مِنْهُ الْجِبَالُ اشارہ کرتا ہے۔ یہ قصہ ایسا ہے جس کی نہ عقل تصدیق کرتی ہے اور نہ کوئی نقل ثابت ہے جو معتمد علیہ ہو۔

جمہور علماء نے لام مکسورہ اور مضارع منصوب پڑھا ہے۔ ان کا لفظ اس صورت میں نافع ہوگا اور لام لام جحود ہوگا جو نفی کی تاکید کے لئے ہوگا جیسے اس ارشاد میں ہے وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ یا ان کا لفظ مخففہ من الثقیلہ ہے اور لام لام کی ہے اور کان تامہ ہے اور جبال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم، اللہ کی آیات اور شریعتوں کی مثال ہیں۔ پہلی صورت میں معنی یہ ہوگا کہ ان کا مکر پہاڑوں کو زائل کرنے والا نہیں ہے اور دوسری صورت میں یہ معنی ہوگا کہ انہوں نے مکر کیا اور ان کا مکر ثابت رہا تا کہ وہ اس چیز کو زائل کر دیں جو پہاڑوں کی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 43 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 43 (التجاریہ)

مانند ثابت اور متمکن ہے مثلاً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا امر' آیات الٰہی اور اللہ تعالیٰ کی شرائط اور یہ محال ہے۔ الحسن فرماتے ہیں اس کا مطلب ہے کہ ان کا مکر پہاڑوں کے زوال سے بہت زیادہ کمزور تھا(1)۔

فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ۝

"تم یہ مت خیال کرو کہ اللہ وعدہ خلافی کرنے والا ہے اپنے رسولوں سے ۱؎ یقیناً اللہ تعالیٰ بڑا زبردست ہے ۲؎ اور بدلہ لینے والا ہے ۳؎"

۱؎ تم یہ گمان نہ کرو کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دوستوں کی مدد اور اپنے دشمنوں کی ہلاکت کا جو وعدہ فرمایا ہے وہ اس میں وعدہ خلافی کرے گا جیسے ارشاد ہے کہ اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا ہم ضرور اپنے پیغمبروں کی مدد کریں گے۔ اسی طرح ارشاد ہے کَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَ رُسُلِیْ۔ اللہ تعالیٰ نے لکھ دیا ہے کہ میں اور میرے رسول غالب آئیں گے۔ ایک جگہ فرمایا لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِیْنَ۔ وَ لَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ۔ مخلف لتحسبن کا مفعول ثانی ہے۔ اصل میں مخلف رسله وعده تھا۔ دوسرے مفعول کو اس لئے مقدم فرمایا تا کہ یہ ظاہر ہو کہ اللہ تعالیٰ کبھی بھی وعدہ خلافی نہیں فرماتا جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اللہ تعالیٰ وعدہ خلافی نہیں فرماتا، جب اللہ تعالیٰ کسی سے بھی وعدہ خلافی نہیں فرماتا تو اپنے رسولوں سے کیسے وعدہ خلافی فرمائے گا۔

۲؎ وہ غالب ہے اسے دھوکا نہیں دیا جا سکتا۔ وہ قادر مطلق ہے، اس کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔

۳؎ وہ اپنے اولیاء اور دوستوں کی خاطر دشمنوں سے انتقام لینے والا ہے۔

یَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَیْرَ الْاَرْضِ وَ السَّمٰوٰتُ وَ بَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ۝

"یاد کرو اس دن کو جب کہ بدل دی جائے گی یہ زمین دوسری (قسم کی) زمین اور آسمان بھی (بدل دیئے جائیں گے) ۱؎ اور سب لوگ حاضر ہو جائیں گے اللہ کے حضور میں (وہ اللہ) جو ایک ہے (اور) سب پر غالب ہے ۲؎"

۱؎ یوم یاتیهم سے بدل ہے یا انتقام کی ظرف ہے۔ یا اذکر مقدر کی ظرف ہے۔ یا لا یخلف وعده کے متعلق ہے اور اس کو فخلف کی وجہ سے منصوب بنانا جائز نہیں ہے کیونکہ اِنَّ کا ماقبل ان کے مابعد میں عمل نہیں کرتا اور وَ السَّمٰوٰتُ الْاَرْضُ پر معطوف ہے اور یہ اصل میں وَالسَّمٰوٰتُ غَیْرَ السَّمٰوٰتِ ہے لیکن ماقبل کلام کی دلالت کی وجہ سے غیر السموات کو حذف کیا گیا ہے اور یہ تبدیلی اور تغیر ذات میں ہوگا جیسے تو کہتا ہے بدلت الدراهم بالدنانير کہ میں نے درہموں کو دنانیر سے بدل دیا۔ اس پر یہ ارشاد بھی دلالت کرتا ہے بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَیْرَهَا۔ یا تبدیلی صفت میں ہوگی جیسے تیرا قول ہے بدلت الحلقة خاتماً جب سونے کو پگھلا کر اس کی شکل تبدیل کر دے۔

زمین اور آسمانوں کی تبدیلی کے متعلق کثرت سے احادیث وارد ہیں۔ بعض ذات میں تبدیلی اور بعض صفات میں تبدیلی پر دلالت کرتی ہیں۔ عبدالرزاق' عبد بن حمید' ابن جریر' اور ابن ابی حاتم نے اپنی اپنی تفاسیر میں نقل کیا ہے اور بیہقی نے سند صحیح کے ساتھ ابن مسعود سے اس آیت کے بارے مروی ہے، فرماتے ہیں زمین یوں بدل جائے گی جیسے چاندی جس میں کبھی بھی کوئی حرام خون نہیں بہایا گیا اور کبھی اس پر برائی کا عمل نہیں کیا گیا(2)۔ بیہقی نے ابن مسعود سے مرفوعاً نقل کیا ہے اور لکھا ہے کہ موقوف اصح ہے۔ میں کہتا ہوں موقوف اس باب

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 43 (التجاریہ) [illegible]

میں مرفوع کا حکم رکھتی ہے۔ ابن جریر اور حاکم نے ایک دوسرے طریق سے حضرت ابن مسعود سے روایت کی ہے، فرمایا زمین یوں سفید ہو گی۔ گویا خالص چاندی ہے(1)۔ امام احمد' ابن جریر' ابن ابی حاتم نے ابوایوب سے اور ابن جریر نے انس بن مالک سے اس آیت کے بارے میں روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس زمین کو چاندی کی زمین سے بدل دے گا جس پر کوئی خطا کا عمل نہ ہوگا(2)۔

ابوحمزہ سے عن زید عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق سے اس آیت کے متعلق مروی ہے کہ زمین چاندی کی مانند سفید ہوگی۔

ابن ابی الدنیا نے جنت کی صفت میں حضرت علی سے اس آیت کے متعلق روایت کیا ہے کہ زمین چاندی کی آسمان سونے کا ہو جائے گا(3)۔ ابن جریر نے مجاہد سے نقل کیا ہے کہ زمین گویا چاندی ہے اور آسمان بھی اسی طرح ہے(4)۔ عبد بن حمید نے حضرت عکرمہ سے نقل کیا ہے، فرمایا ہمیں یہ خبر پہنچی ہے کہ زمین لپیٹ دی جائے گی اور اس کے دوسرے پہلو کی طرف لوگ اکٹھے ہو جائیں گے(5) اور صحیحین میں سہل بن سعد سے مروی ہے، فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ قیامت کے روز لوگ سفید نہالی زمین پر جمع ہوں گے جیسے صاف آٹے کی روٹی ہوتی ہے، اس میں کسی کے لئے کوئی نشانی نہ ہوگی(6)۔

امام بیہقی نے السدی الصغیر عن الکلبی عن ابی صالح عن ابن عباس کی سند سے اس آیت کے متعلق تخریج کیا ہے زمین میں اضافہ اور کمی ہوگی۔ اس کے ٹیلے' پہاڑ' وادیاں' درخت اور جو کچھ اس میں ہے سب کچھ ختم ہو جائے گا اور عکاظی چمڑے کی طرح پھیل جائے گی اور سفید زمین چاندی کی شکل ہوگی جس پر کوئی خون نہ بہا ہوگا اور نہ اس پر کوئی برائی کا عمل ہوگا۔ آسمان ان کا سورج' چاند اور ستارے سب ختم ہو جائیں گے۔

حاکم نے ابوعمرو سے روایت کیا ہے فرمایا جب قیامت کا دن ہوگا تو زمین چمڑے کی طرح پھیل جائے گی اور لوگ جمع ہو جائیں گے۔

حاکم نے جید سند کے ساتھ حضرت جابر کے واسطہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ زمین قیامت کے روز چمڑے کی طرح پھیلی ہوئی ہوگی اور ابن آدم کے لئے اس میں سے اس کے قدموں کی جگہ کے علاوہ کوئی جگہ نہ ہوگی سب سے پہلے مجھے بلایا جائے گا۔ میں سجدہ کرتے ہوئے گر جاؤں گا۔ پھر مجھے اذن ہوگا۔ میں کھڑا ہوں گا اور عرض کروں گا اے میرے رب اس جبریل نے مجھے خبر دی تھی (جبریل رحمٰن کی دائیں طرف ہوگا جبریل نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا ہوگا) کہ تو نے اسے میری طرف وحی دے کر بھیجا ہے۔ فرمایا اور جبریل خاموش و ساکت کھڑا ہوگا حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ فرمائے گا اس نے سچ کہا تھا۔ پھر مجھے اذن شفاعت ہوگا، میں عرض کروں گا اے میرے رب تیرے بندے زمین کے اطراف میں ہیں اور یہ مقام محمود ہے۔ صحیحین میں حضرت ابوسعید الخدری سے روایت ہے، فرماتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا زمین قیامت کے دن ایک روٹی کی مانند ہوگی جسے الجبار اپنے ہاتھ میں لے گا جیسے سفر میں تم میں سے کوئی ایک روٹی کو ہاتھ میں لیتا ہے اور یہ جنتیوں کی ضیافت کے لئے ہوگا(7)۔

دراوردی فرماتے ہیں نزل اس چیز کو کہتے ہیں جو کھانے سے پہلے مہمان کو پیش کی جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس سے موقف میں ہر وہ شخص کھائے گا جو عنقریب جنت میں جانے والا ہوگا اور اسی طرح ابن مرجان نے الارشاد میں لکھا ہے کہ زمین روٹی ہو جائے گی۔ پس مومن اپنے پاؤں کے درمیان سے کھائے گا اور حوض سے پانی پیئے گا۔ ابن حجر فرماتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے موقف میں

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 167 (العلمیۃ) 2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 168 (العلمیۃ) 4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 44 (التجاریۃ)

4۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 168 (العلمیۃ) 5۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 169 (العلمیۃ) 6۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 137 (قدیمی)

زمانے کی طوالت میں بھوک کے ساتھ مومنین کو تکلیف نہیں دی جائے گی بلکہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت سے زمین کی طبع کو تبدیل کر دے گا حتیٰ کہ وہ اپنے قدموں کے نیچے سے کھائیں گے جتنا اللہ تعالیٰ چاہے گا اور اس میں کھانے کی کوئی کلفت اور تکلیف نہ ہوگی۔ ابن جریر نے سعید بن جبیر سے جو روایت کی ہے وہ اس کی تائید کرتی ہے، فرمایا زمین سفید روٹی ہو جائے گی جسے مومن اپنے قدموں کے نیچے سے کھائے گا(1) اسی طرح محمد بن کعب سے بھی نقل کی ہے۔ بیہقی نے عکرمہ سے روایت کیا ہے کہ زمین سفید ہو جائے گی جیسے روٹی ہوتی ہے اہل اسلام اس سے کھائیں گے یہاں تک کہ وہ حساب سے فارغ ہو جائیں گے۔ ابو جعفر محمد الباقر سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ خطیب نے ابن مسعود سے روایت کیا ہے، فرمایا لوگ قیامت کے روز انتہائی بھوکے ہوں گے اس سے پہلے کبھی اتنے بھوکے نہ ہوں گے۔ اتنے پیاسے کہ اس سے پہلے کبھی نہ ہوں گے ایسے برہنہ کہ اس سے پہلے اتنے کبھی نہ ہوں گے اتنے تھکے ہوئے کہ ایسے پہلے کبھی نہ ہوں گے۔ پس اللہ تعالیٰ کھلائے گا اسے کھلائے گا اور جسے اللہ تعالیٰ پلائے گا، اسے پلائے گا جسے اللہ تعالیٰ پہنائے گا اسے پہنائے گا اور جو عمل کیا ہوگا وہ اسے کافی ہوگا۔

ابن جریر نے اس آیت کے متعلق ابن کعب سے روایت کیا ہے کہ آسمان باغ ہو جائیں گے اور سمندر آگ ہو جائیں گے اور یہ زمین دوسری زمین سے بدل جائے گی(2)۔ ابن مسعود سے نقل کیا ہے فرمایا زمین قیامت کے دن سب کی سب آگ ہوگی(3)۔ کعب الاحبار سے مروی ہے، فرمایا کہ سمندر کی جگہ آگ ہوگی۔ امام مسلم نے حضرت ثوبان سے روایت کیا ہے، فرمایا یہودیوں کا ایک عالم بارگاہ رسالت میں حاضر ہوا اور پوچھا جس دن زمین اس زمین کے علاوہ دوسری زمین سے بدل جائے گی تو لوگ کہاں ہوں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پل کے پیچھے تاریکی میں ہوں گے۔ مسلم نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے، فرمایا میں نے عرض کی یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ کا ارشاد آپ نے پڑھا ہے کہ یَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَیْرَ الْاَرْضِ تو پھر اس دن لوگ کہاں ہوں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا پل صراط پر(4)۔ امام بیہقی فرماتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد علی الصراط (پل صراط پر) مجازاً ہے کیونکہ وہ تو اسے عبور کریں گے۔ اور حضرت ثوبان کی حدیث دون الجسر کا قول اس کے موافق ہے کیونکہ یہ زیادتی ہے۔ اس کے ثبوت کی وجہ سے یہی مفہوم متعین ہو جائے گا کیونکہ جب سخت قسم کی زجر واقع ہوگی تو وہ انہیں دنیا کی زمین سے موقف کی زمین کی طرف منتقل کر دے گی۔ امام بیہقی نے حضرت ابی ابن کعب سے وَّ حُمِلَتِ الْاَرْضُ وَ الْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً کے تحت روایت کیا ہے، فرمایا کفار کے چہروں پر غبار ہوگا مومنین چہرے غبار سے مبرا ہوں گے جیسا کہ ارشاد ہے وُجُوْهٌ یَّوْمَىٕذٍ عَلَیْهَا غَبَرَةٌ۔ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ اور کئی منہ اس دن غبار آلود ہوں گے ان پر کالک لگی ہوئی ہوگی۔

امام سیوطی فرماتے ہیں سلف صالحین سے یہ اختلاف چلا آ رہا ہے کہ زمین کی ذات بدل جائے گی یا صرف صفات متغیر ہوں گی۔ ابن ابی حمزہ نے پہلے قول کو ترجیح دی ہے اور اشارہ کیا ہے کہ یہ دنیا کی زمین معدوم ہو جائے گی اور موقف کی نئی زمین ہوگی۔ شیخ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ زمین کی تبدیلی زمین کے پھیلاؤ اور زمین میں کمی بیشی کے اقوال میں کوئی منافات نہیں ہے کیونکہ یہ سب کچھ دنیا کی زمین کے لئے ہوگا لیکن موقف کی زمین میں کوئی تغیر نہ ہوگا۔ زمین کی تبدیلی کے بعد لوگوں کو دنیا کی زمین سے موقف کی زمین کی

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 169 (العلمیۃ)
2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 169 (العلمیۃ)

طرف لے جایا جائیگا۔ فرماتے ہیں اسی طرح زمین کا روائی ہونا' غبار والا ہونا اور آگ بن جانا جو احادیث میں آیا ہے اس میں بھی منافات نہیں ہے بلکہ ان کو اس طرح جمع کیا جاسکتا ہے کہ بعض زمین کے ٹکڑے روٹی' بعض سفید مُیالے اور بعض آگ ہو جائیں گے اور آگ ہونا سمندر کی زمین کے ساتھ خاص ہے اور اس کی دلیل ابی بن کعب کا اثر ہے۔ میں کہتا ہوں ہوسکتا ہے کہ مومنین کے قدموں کی جگہ روٹی ہو جائے گی اور کفار کے قدموں کی جگہ غبار والی اور آگ والی ہو جائے گی۔ امام قرطبی فرماتے ہیں صاحب الافصاح نے ان اخبار کو اس طرح جمع کیا ہے کہ زمین اور آسمانوں کی تبدیلی دو مرتبہ واقع ہوگی۔ ایک مرتبہ ان کی صرف صفات تبدیل ہوں گی اور یہ تبدیلی کڑک کے نفحہ سے پہلے ہوگی۔ پس ستارے بکھر جائیں گے۔ چاند اور سورج کی روشنی ختم ہو جائے گی اور آسمان پگھلے ہوئے مادہ کی طرح ہوگا اور سروں سے پھٹ جائے گا۔ پہاڑ چلنے لگیں گے اور سمندر آگ بن جائیں گے اور زمین حرکت کرے گی اور پھٹ جائے گی حتیٰ کہ اس کی ہیئت بدل جائے گی۔ پھر دونوں نفخوں کے درمیان آسمان اور زمین لپیٹ دیئے جائیں گے اور آسمان دوسرے آسمان کے ساتھ بدل جائے گا(1)۔ ارشاد الٰہی ہے وَ اَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا اور جگمگا اٹھے گی زمین اپنے رب کے نور سے۔ اور زمین بدل جائے گی اور چمڑے کی طرح پھیل جائے گی اور بالکل اسی طرح لوٹا دی جائے گی جیسے اس میں قبریں تھیں اور جیسے انسان اس کے ظاہر اور باطن میں تھے اور دوبارہ زمین تبدیل ہوگی اور یہ اس وقت ہوگی جب لوگ محشر میں کھڑے ہوں گے۔ پس ان کے لئے وہ زمین تبدیل ہوگی جسے ساہرہ کہا گیا ہے اور اس پر لوگوں کا محاسبہ ہوگا۔ یہی زمین چاند کی طرح سفید ہوگی۔ اس میں نہ خون بہا ہوگا اور نہ کوئی معصیت کا عمل ہوگا۔ اس وقت لوگ پل صراط پر کھڑے ہوں گے اور اس پر تمام مخلوق کی گنجائش ہوگی۔ پس اس پر وہ کھڑا ہوگا جسے جہنم کے پل پر فصل دی گئی ہوگی۔ اور یہ جامد اہالہ کی مانند ہوگی۔ یہ وہی ہے کہ حضرت عبداللہ نے فرمایا وہ زمین آگ سے ہوگی جب لوگ پل صراط سے گزر جائیں گے اور دوزخی اور جنتی صراط کے پیچھے انبیاء کرام کے حوضوں سے پئیں گے۔ زمین صاف آٹے کی روٹی کی طرح ہو جائے گی۔ پس وہ اپنے قدموں کے نیچے سے کھائیں گے اور جنت میں داخل ہونے کے وقت یہ ایک روٹی کی مانند ہوگی جس سے تمام جنتی لوگ کھائیں گے اور ان کا سالن جنت کے بیل کا جگر اور مچھلی کے جگر کا زائد ہوگا۔ الطبرانی نے الاوسط میں اور ابن عدی نے ضعیف سند کے ساتھ نقل کیا ہے کہ زمین قیامت کے روز ختم ہو جائے گی سوائے مساجد کے، کیوں کہ یہ ایک دوسرے کے ساتھ مل جائیں گی۔ میں کہتا ہوں اگر یہ روایت صحیح ہے تو شاید مساجد کی زمین جنت کی زمین بن جائے گی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے میرے اور منبر کے درمیان جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے(2)۔ اسے شیخین نے صحیحین میں اور امام احمد اور نسائی نے عبداللہ بن زید المازنی سے روایت کیا ہے۔ صحیحین میں اور ترمذی میں ابو ہریرہ سے مروی ہے۔

۲؎ اور اللہ اسم جلالت کا دو وصفوں کے ساتھ ذکر اس لئے فرمایا کہ معاملہ انتہائی مشکل اور صعب ہے کیونکہ معاملہ جب ایک غالب ذات کے پاس ہو تو اسے مغلوب نہیں کیا جاسکتا اور اس کے علاوہ کسی سے مدد اور پناہ طلب نہیں کی جاسکتی۔

وَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَئِذٍ مُّقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ ﴿۴۹﴾

''اور تم دیکھو گے مجرموں کو اس روز کہ جکڑے ہوئے ہوں گے ۱؎ زنجیروں میں ۲؎''

۱؎ آپ کفار کو دیکھیں گے اس دن جب وہ اپنی قبروں سے نکلیں گے تو عقائد اور اعمال میں مشترک لوگ آپس میں جکڑے ہوئے ہوں

گے۔ سعید بن منصور نے عمر بن الخطاب سے روایت کیا ہے، فرمایا نیک شخص جنت میں نیک شخص کے ساتھ ملا ہوا ہوگا اور برا شخص دوزخ میں برے شخص کے ساتھ جکڑا ہوا ہوگا۔ یا یہ مطلب کہ اپنے شیطانوں کے ساتھ جکڑے ہوں گے۔ یا وہ عقائد باطلہ جو انہوں نے اپنائے تھے ان کے ساتھ جکڑے ہوں گے۔ یا انکے ہاتھ اور پاؤں ان کی گردنوں کے ساتھ زنجیروں سے باندھے ہوئے ہوں گے۔

۲۔ یہ صفد کی جمع ہے جب کسی کو مضبوطی سے باندھا جائے تو اس کے لئے فقد صفدتہ بولا جاتا ہے۔

سَرَابِيْلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ وَّتَغْشٰى وُجُوْهَهُمُ النَّارُ ﴿۵۰﴾

''ان کا لباس تارکول کا ہوگا ۱؎ اور ڈھانپ رہی ہوگی ان کے چہروں کو آگ ۲؎ ''

۱؎ یہ سربال کی جمع ہے اور اس کا معنی قمیص ہے۔ قطران سے مراد وہ سیال ہے جو خارش زدہ اونٹوں پر ملا جاتا ہے (تارکول)۔ پس اس کی حدت سے اس کی خارش ختم ہو جاتی ہے۔ یہ بدبودار سیاہ رنگ کی سیال چیز ہے جس میں آگ بہت جلدی بھڑکتی ہے۔ اس کے ساتھ دوزخیوں کے چمڑوں کو طلاء کیا جائے گا حتیٰ کہ وہ تیل ان پر قمیص کی مانند ہوگا تا کہ تارکول کا کاٹنا اور اس کے سیاہ رنگ کی وحشت اور ان کے جسموں میں آگ کے جلدی بھڑکنے کے ساتھ بدبو کو بھی جمع فرمادیا ہے۔ عکرمہ اور یعقوب من قطران یعنی دو منون کلموں کے ساتھ پڑھتے تھے القطر تانبا جو پگھلا ہوا ہو اور آن جو انتہائی گرم ہو۔ یہ جملہ دوسرا حال ہے یا مقرنین میں جو ضمیر ہے اس سے حال ہے۔

۲؎ یہاں صرف چہرے کا ذکر فرمایا ہے کیونکہ یہ ظاہر بدن میں معزز ترین عضو ہے جیسے باطن میں دل۔ اس لئے ارشاد فرمایا تطلع علی الافئدة یا اس لئے چہروں کا خصوصیت کے ساتھ فرمایا کیونکہ وہ ان کے ساتھ حق کی طرف متوجہ نہیں ہوئے تھے اور حق کے لئے اپنے حواس اور صلاحیتوں کو استعمال نہیں کیا تھا جو ان چہروں میں ودیعت کی گئی تھیں جیسے تطلع علی الافئدة فرمایا کیونکہ وہ معرفت حق سے خالی ہے اور جہالت کی گندگی سے مملو تھے۔

لِيَجْزِيَ اللّٰهُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۵۱﴾

''یہ اس لئے تا کہ بدلہ دے اللہ تعالیٰ ہر شخص کو جو اس نے کمایا تھا ۱؎ بے شک اللہ تعالیٰ بہت جلد حساب لینے والا ہے ۲؎ ''

۱؎ لام یا تو مقرنین کے متعلق ہے یا ظرف مستقر یعنی من قطران کے متعلق ہے یا تغشی کے متعلق ہے یا فعل مقدر کے متعلق ہے۔ تقدیر یوں ہوگی یفعل ذالک لیجزی (وہ ایسا کرے گا تا کہ بدلہ دے) اور یہ معنی بھی جائز ہے تا کہ اللہ تعالیٰ ہر مطیع اور گنہگار شخص کو بدلہ دے گا جو اس نے کمایا۔ کیونکہ جب اس نے یہ بیان فرمادیا کہ مجرموں کو ان کے جرموں کی سزا ملے گی تو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اطاعت شعاروں کو ان کی اطاعت کا اجر و ثواب ملے گا اس صورت میں لام برزوا کے متعلق ہوگا۔

۲؎ اللہ تعالیٰ بہت جلد حساب لینے والا ہے کیونکہ اسے ایک کا حساب دوسرے کے حساب سے غافل نہیں کرتا۔ جلالین میں امام سیوطی نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام لوگوں کا حساب دنیا کے نصف دن کی مقدار میں لے لے گا(1)۔ ابن المبارک اور ابو نعیم نے امام النخعی سے روایت کیا ہے، فرمایا وہ یہ خیال کرتے تھے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ لوگوں کے حساب سے نصف دن کی مقدار میں فارغ ہو جائے گا، فرمائے گا یہ جنتی ہیں اور یہ دوزخی ہیں۔ ابن مبارک اور ابن ابی حاتم نے ابن مسعود سے روایت کیا ہے، فرمایا اس دن کا نصف

1۔ تفسیر جلالین، صفحہ 211 (زمزم۔ تعلیمی)

گذرے گا تو فیصلہ ہو جائے گا یہ یہ ہیں اور یہ یہ ہیں۔ پھر یہ آیت پڑھی اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّ اَحْسَنُ مَقِيْلًا ۔ ثُمَّ اِنَّ مَرْجِعَهُمْ لَاِلَى الْجَحِيْمِ پھر انہیں لوٹا دیا جائے گا جہنم کی طرف۔

ابن ابی حاتم نے ابن عباس سے روایت فرمایا ہے یہ ضحوہ کا وقت ہوگا کہ اولیاء اللہ پلنگوں پر آہو چشم حوروں کے ساتھ ہوں گے اور اللہ کے دشمن شیطانوں کے ساتھ جکڑے ہوئے ہوں گے۔ میں کہتا ہوں یہ آثار اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ آخری نصف النہار مراد ہے۔

هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ وَلِيُنْذَرُوْا بِهٖ وَلِيَعْلَمُوْٓا اَنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّلِيَذَّكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۵۲﴾

"یہ قرآن ایک پیغام ہے سب انسانوں کے لئے (اسے اتارا گیا ہے) [1] تاکہ انہیں ڈرایا جائے اس کے ذریعے [2] اور تاکہ وہ اس حقیقت کو خوب جان لیں کہ صرف وہی ایک خدا ہے اور تاکہ اچھی طرح ذہن نشین کر لیں (اس حقیقت کو) دانش مند لوگ۔"

[1] یہ قرآن یا یہ سورہ یا جو کچھ اس میں ولا تحسبن اللہ کے قول سے وعظ و نصیحت ہے۔ لوگوں کو نصیحت کرنے کیلئے کافی ہے۔

[2] تاکہ انہیں اس کے ذریعے ڈرایا جائے یہ محذوف کلام پر معطوف ہے۔ یعنی اصل میں لینصحوا ولینذر وابه ہے۔ لام بلغ کے متعلق ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ محذوف کے متعلق ہو۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی لینذروا به انزل او تلی۔ بعض علماء فرماتے ہیں آیت کا معنی یہ ہے کہ یہ قرآن لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے احکام پہنچانے کے لئے نازل کیا گیا ہے تاکہ انہیں اس کے ذریعے ڈرایا جائے۔

[3] کیونکہ جب وہ اس چیز سے خوفزدہ ہوں گے جس سے انہیں ڈرایا گیا ہے تو یہ خوف انہیں غور و خوض کی طرف مجبور کرے گا۔ پس وہ توحید پر دلالت کرنے والی آیات یا توحید باری تعالیٰ پر متنبہ کرنے والی آیات میں غور و فکر کر کے توحید تک پہنچ جائیں گے۔

[4] اور اچھی طرح ذہن نشین کر لیں دانشمند تاکہ پرہیز کریں ان امور سے جن سے منع کیا گیا ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس پیام کے تین فوائد ذکر فرمائے ہیں۔ یہی پیام کی غرض و غایت ہیں اور کتابوں کے نزول میں ایک حکمت یہ ہے کہ انبیاء کرام لوگوں کی تکمیل کریں۔ اس کی طرف لینذروا کے ساتھ اشارہ فرمایا اور دوسری حکمت لوگوں کی قوت نظری کو مکمل کرنا ہے جس کا منتہائے کمال توحید ہے اور اس کا ذکر لِيَعْلَمُوْٓا اَنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ سے فرمایا ہے اور تیسری حکمت قوت عملیہ کی اصلاح ہے جو تقویٰ کے لباس سے مزین ہونا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی تقویٰ سے ملبوس لوگوں میں سے بنائے۔

سورۃ الحجر

ایاتہا ۹۹ ۔ سورۃ الحجر مکیۃ ۱۵ ۔ رکوعاتہا ۶

سورۃ الحجر مکی ہے اور اس میں ننانوے آیات اور چھ رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَقُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝

''الف لام را یہ آیتیں ہیں کتاب الٰہی کی اور روشن قرآن کی لے ''

لے تِلْكَ سے اس سورت کی آیات کی طرف اشارہ ہے۔ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ میں اضافت معنی ہے کتاب سے مراد یہی سورت ہے یا قرآن ہے اور قرآن کی تنکیر تفخیم یعنی اظہار عظمت کے لئے ہے، یعنی یہ اس کتاب کی آیات ہیں جو اپنی افادیت وجامعیت کے اعتبار سے کتاب کامل ہے اور یہ قرآن حق و باطل، گمراہی و ہدایت اور حلال و حرام کی وضاحت کرتا ہے۔

رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ۝

''(عذاب میں گرفتار ہونے کے بعد) بہت لے کفار کاش وہ مسلمان ہوتے ع ''

لے رُبَمَا نافع، عاصم اور ابوجعفر نے باء کی تخفیف کے ساتھ اور باقی قراء نے باء کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے یہ حرف جر ہے جو قلت کے معنی پر دلالت کرتا ہے اور یہاں مقابلہ کی مناسبت کی وجہ سے مجازاً کثرت کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ دوسرا اس بات کا شعور دلانے کے لئے کہ اگر وہ اسلام کو تھوڑا بھی پسند کرتے، اگر چہ ایک مرتبہ بھی تو اس کی طرف ان کا جلدی کرنا مناسب اور بہتر تھا مگر جب وہ کثرت سے خواہش کریں گے بلکہ ہر گھڑی اسلام کی خواہش کریں گے اس وقت ان کی کیا حالت ہوگی۔ اور اس بات پر آگاہ کرنے کے لئے رب ذکر فرمایا کہ ان کی یہ خواہش اس حد تک ہوگی کہ جس کا تعبیر کرنا بھی ممکن نہیں۔ اس لئے ایسے لفظ پر اکتفا فرمایا جو قلت پر دلالت کرتا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہاں اپنے حقیقی معنی، یعنی قلت کے لئے استعمال ہوا ہے اور قلت کی وجہ یہ ہے کہ وہ قیامت کی ہولناکیوں سے خوفزدہ ہوں گے۔ جب انہیں کسی وقت بھی کوئی مصیبت و تکلیف لاحق ہوگی تو وہ اسلام کی تمنا کریں گے۔

(ما) کافہ ہے جو رب کو اپنے عمل سے روک دیتا ہے اور اس کا فعل پر دخول بھی جائز ہو جاتا ہے۔ اس کا حق تو یہ ہے کہ یہ ماضی پر داخل ہوتا لیکن چونکہ اس معاملہ کی خبر دینے والا اللہ تعالیٰ ہے اس کا تحقق یقینی ہے۔ گویا یہ ماضی کا ہی معاملہ ہے۔ اس لئے یہاں مضارع پر داخل کر دیا گیا ہے۔

ع ان کے ایمان کی خواہش کو غائب کے صیغہ سے تعبیر کیا گیا ہے جیسے تیرے اس قول میں متکلم کی کلام کو غائب کے صیغہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حلف باللّٰہ لیفعلن یعنی اس نے قسم اٹھائی کہ وہ ایسا کرے گا اور حالانکہ یہاں لافعلن ہونا چاہئے تھا۔ ابن المبارک، ابن جریر اور بیہقی حضرت ابن عباس اور حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ وہ دونوں اس آیت کا تذکرہ کر رہے تھے کہ فرمایا

کہ یہ اس وقت ہوگا جب گنہگار مسلمان اور مشرک دوزخ میں اکٹھے ہوں گے۔ مشرکین مسلمانوں سے کہیں گے کہ تم جو کچھ کرتے رہے تمہیں بھی اس کا کوئی فائدہ نہیں ملا۔ ان کی یہ بات سن کر اللہ تعالیٰ ناراضگی کا اظہار فرمائیں گے اور مسلمانوں کو اپنی خصوصی کرم نوازی سے دوزخ سے نکال دیں گے(1)۔

حضرت ہناد، سعید بن منصور اور بیہقی نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ شفاعت قبول فرماتے رہیں گے اور لوگوں کو جنت میں داخل فرماتے رہیں گے، شفاعت قبول کریں گے اور رحم فرمائیں گے حتیٰ کہ آخر میں ارشاد ہوگا جو بھی مسلمان ہے وہ جنت میں داخل ہوجائے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد ربما یود الذین کفروا لو کانوا مسلمین کا یہی مطلب ہے(2)۔

الطبرانی نے الاوسط میں سند صحیح کے ساتھ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری امت کے کچھ لوگوں کو اپنے گناہوں کی وجہ سے عذاب دیا جائے گا۔ جتنا وقت اللہ تعالیٰ کی مشیت ہوگی وہ آگ میں رہیں گے۔ پھر مشرک انہیں عار دلائیں گے کہ ہمیں تو تمہاری تصدیق (ایمان) کا کچھ فائدہ نظر نہیں آیا تو اللہ تعالیٰ ہر موحد کو دوزخ سے نکال دے گا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ(3)۔

طبرانی، ابن عاصم اور بیہقی نے ابوموسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب دوزخی آگ میں جمع ہوں گے تو مشیت ایزدی سے کچھ اہل قبلہ (مسلمان) بھی ان کے ساتھ ہوں گے۔ کفار مسلمانوں سے مخاطب ہو کر کہیں گے کیا تم مسلمان نہیں تھے۔ وہ کہیں گے کیوں نہیں، ہم مسلمان تھے کفار کہیں گے تمہارے اسلام نے تمہیں کچھ فائدہ نہ دیا اور تم ہمارے ساتھ آگ میں جل رہے ہو۔ مسلمان کہیں گے ہمارے کچھ گناہ تھے جن کی وجہ سے ہم پکڑے گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کا یہ مذاکرہ سن کر حکم فرمائیں گے اہل قبلہ میں سے جو دوزخ میں ہے انہیں نکال دو۔ کفار جب یہ منظر دوزخ میں دیکھیں گے تو خواہش کریں گے کاش ہم بھی مسلمان ہوتے تو آج عذاب سے نکالے جاتے جیسے مسلمان نکالے گئے ہیں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ۔ (عذاب میں گرفتار ہونے کے بعد) وہ آرزو کریں گے کہ کاش وہ مسلمان ہوتے(4)۔

طبرانی نے ابوسعید خدری سے روایت کیا ہے کہ ان سے پوچھا گیا کیا تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ کے متعلق کچھ سنا ہے؟ فرمایا ہاں، میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ دوزخی مومنین کو انتقام لینے کے بعد آگ سے نکالے گا۔ جب اللہ تعالیٰ انہیں مشرکین کے ساتھ آگ میں داخل کرے گا تو مشرکین ان سے کہیں گے تم تو دنیا میں اولیاء اللہ ہونے کا دعویٰ کرتے تھے، تمہیں کیا ہوا کہ تم ہمارے ساتھ آگ میں ہو۔ جب اللہ تعالیٰ ان کی یہ کلام سنیں گے تو اذن شفاعت فرمائیں گے تو ملائکہ، انبیاء کرام اور مومنین شفاعت کریں گے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کے اذن سے وہ مومنین دوزخ سے نکل آئیں گے۔ جب مشرکین یہ دیکھیں گے تو کہیں گے کاش ہم بھی تمہاری طرح ہوتے۔ آج ہماری بھی شفاعت ہوجاتی ان دوزخ سے نکلنے والے مسلمانوں کا نام چہروں کے سیاہ ہونے کی وجہ سے جہنمیوں ہوگا۔ وہ عرض کریں گے یا اللہ ہمارا یہ نام مٹا دے۔ اللہ تعالیٰ انہیں نہر حیات میں غسل کرنے کا حکم دے گا، وہ غسل کریں گے تو ان کا یہ نام مٹ جائے گا(5)۔ ابن جریر نے ابن مسعود سے

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 172 (العلمیۃ)
2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 172 (العلمیۃ)
3۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 172 (العلمیۃ)
4۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 172 (العلمیۃ)

اسی آیت کے بارے میں روایت کیا ہے، فرمایا کفار یہ اس وقت کہیں گے جب مسلمانوں کو آگ سے نکلتا دیکھیں گے (1)۔

ہناد حضرت مجاہد سے اس آیت کے بارے فرماتے ہیں کہ جب ہر کلمہ گو یعنی لا الہ الا اللہ کہنے والا دوزخ سے باہر نکلے گا تو وہ اس وقت کہیں گے (2)۔

ذَرْهُمْ يَأْكُلُوا وَيَتَمَتَّعُوا وَيُلْهِهِمُ الْأَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ ۝

"انہیں رہنے دیجئے وہ کھائیں (پئیں) اور عیش کریں اور غافل رکھے انہیں (جھوٹی) امید کچھ عرصہ بعد وہ (حقیقت خود بخود) جان لیں گے [1]"

1۔ اے پیارے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان کافروں کو رہنے دیجئے، اپنی دنیا میں کھاتے پیتے رہیں اور لطف اندوز ہوتے رہیں۔ اور لمبی عمر کی توقع انہیں آخرت کے سامان سفر سے غافل رکھے۔ کچھ عرصہ بعد جب یہ عذاب کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کریں گے تو انہیں اپنے کرتوتوں اور نافرمانیوں کی برائی کا پتہ چل جائے گا۔

اس کلام سے غرض یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی اطاعت وانقیاد سے مایوس کیا جائے اور آپ کو بتایا جائے کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے کہ یہ بدبخت ہیں، اس کے بعد ان کو نصیحت کرنا بے فائدہ ہے۔ اس کلام میں حجت کو لازم کرنا اور ڈرایا جارہا ہے کہ یہ نعمتوں کی ترجیح اور ایسے کاموں سے بچو جو لمبی امیدوں تک پہنچانے والے ہوں۔

وَمَا أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ إِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَعْلُومٌ ۝

"اور نہیں ہلاک کیا ہم نے کسی بستی [1] کو مگر یہ کہ اس کی (ہلاکت کا وقت) لکھا ہوا تھا جو معلوم تھا [2]"

1۔ قَرْيَةٍ سے مراد اہل قریہ ہے اور من زائدہ ہے۔

2۔ یعنی ان بستی والوں کی ہلاکت کا وقت متعین ہے اور لوح محفوظ پر لکھا ہوا ہے اور اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے۔ یہ جملہ قریۃ کی صفت ہے اور عموم الصفات سے مستثنیٰ ہے۔ اصل یہ ہے کہ واؤ اس پر داخل نہ ہوتی جیسے إِلَّا لَهَا مُنْذِرُونَ میں واؤ نہیں ہے لیکن جب اس کی صورت حال کی صورت سے مشابہ ہوگئی تو تاکیداً موصوف کے ساتھ ملانے کی خاطر واؤ داخل کردی گئی اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ جملہ قریۃ سے حال ہو کیونکہ وہ موصوف کے حکم میں ہے۔ گویا یوں کہا گیا ہے وَمَا أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ إِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَعْلُومٌ ۝۔

مَا تَسْبِقُ مِنْ أُمَّةٍ أَجَلَهَا وَمَا يَسْتَأْخِرُونَ ۝

"نہ آگے بڑھ سکتی ہے کوئی قوم اپنے مقررہ وقت سے اور نہ پیچھے رہ سکتی ہے [1]"

1۔ مَا تَسْبِقُ مِنْ أُمَّةٍ میں مِن زائدہ ہے، یعنی کوئی امت اپنی ہلاکت کے مقررہ وقت سے پہلے ہلاک نہیں ہو سکتی اور مدت پوری کے وقت ہلاک سے مؤخر نہیں ہو سکتے اور معنی کا اعتبار کرتے ہوئے امت کی طرف مذکر ضمیر لوٹائی گئی ہے۔

وَقَالُوا يَا أَيُّهَا الَّذِي نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ إِنَّكَ لَمَجْنُونٌ ۝

"اور وہ کہنے لگے اے وہ شخص اتارا گیا ہے جس پر قرآن بے شک تو مجنون ہے۔"

یعنی تو مجنونوں جیسی باتیں کرتا ہے کیونکہ تو کہتا ہے کہ مجھ پر قرآن نازل ہوا۔

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 172 (العلمیۃ) 2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 172 (العلمیۃ)

لَوْ مَا تَأْتِيْنَا بِالْمَلٰٓئِكَةِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝

"تو کیوں نہیں لے آتا ہمارے پاس فرشتوں کو اگر تو سچا ہے[1]"

[1] لَوْمَا بمعنی هل لا یعنی کیوں نہیں لے آتا ہمارے پاس فرشتوں کو جو آپ کی بات کی سچائی کی گواہی دیں اور اس دعوت پر تمہاری مدد کریں جیسے ایک اور جگہ ارشاد ہے لو لا انزل الیه ملک فیکون معه نذیرا یا ہمارے تکذیب پر عقاب کو لے آتے جیسا کہ سابقہ امتوں پر فرشتے عذاب کے اترے تھے اگر تم اپنے دعوئ نبوت میں سچے ہو۔

مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوْٓا اِذًا مُّنْظَرِيْنَ ۝

"ہم نہیں اتارا کرتے فرشتوں کو[1] مگر حق کے اور[2] انہیں اس کے بعد مہلت نہیں دی جاتی[3]"

[1] نُنَزِّلُ کو حضرت حفص اور کسائی نے باب تفعیل سے مضارع متکلم کا صیغہ، یعنی دونوں کے ساتھ پڑھا ہے اور اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے اور ملائکہ مفعول ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور ابوبکر نے باب تفعیل سے واحد مونث غائب مجہول کا صیغہ یعنی تاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور الملائکہ کو نائب فاعل بنایا ہے۔ اور باقی قراء نے صیغہ واحد مونث معروف باب تفعیل سے ایک تاء کو حذف کر کے پڑھا ہے اور الملائکة کو فاعل ہونے کی وجہ سے مرفوع پڑھا ہے۔

[2] یعنی اس عذاب کے ساتھ جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک کسی قوم کے لئے یقینی ہے۔

[3] جب فرشتے نازل ہوں گے تو کفار کو کوئی مہلت و تاخیر نہ ملے گی بلکہ اسی وقت عذاب میں مبتلا کئے جائیں گے۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝

"بے شک ہم ہی نے اتارا ہے اس ذکر (قرآن مجید) کو اور یقیناً ہم اس کے محافظ ہیں[1]"

[1] چونکہ یہ کفار کے بے جا انکار اور استہزاء کا رد ہے اس لئے اس کو تاکید بالائے تاکید کے ساتھ ذکر فرمایا۔ اور ہم اس کی تحریف اور کمی بیشی سے حفاظت کرنے والے ہیں، اس میں کبھی بھی خلل واقع نہ ہوگا۔ یہ دلیل ہے کہ قرآن منزل من اللہ ہے۔ اگر یہ کسی اور مصنف کی تصنیف و تالیف ہوتا تو اس میں ضرور کمی بیشی ہوتی اور مخالفین یقیناً اس پر طعن کرنے پر قادر ہوتے۔ تباہ و برباد ہو جائیں رافضی جو یہ کہتے ہیں کہ قرآن میں خلل واقع ہوا ہے۔ اس کو حضرت عثمان وغیرہ نے جلا دیا تھا اور اس کے دس اجزاء ضائع کر دیئے تھے۔ بعض علماء فرماتے ہیں لہ میں ہ ضمیر کا مرجع نبی کریم ﷺ یعنی ہم اپنے محبوب کریم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر برے ارادہ کرنے والے سے حفاظت کرنے والے ہیں۔ اس کی مثال یہ ارشاد ہے وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ[2] (اللہ تعالیٰ آپ کو لوگوں سے محفوظ رکھے گا)۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ شِيَعِ الْاَوَّلِيْنَ ۝

"اور بے شک ہم نے بھیجے (پیغمبر) آپ سے پہلے اگلی امتوں میں[1]"

[1] یعنی ہم نے آپ سے پہلے بھی رسول بھیجے۔ شیعة کی جمع شیع ہے۔ وہ قوم جو کسی بات پر متفق ہو اور یہ شاعة سے مشتق ہے جس کا معنی پیروی کرنا ہے۔ اس کی اصل شیاع ہے۔ اس کا مطلب وہ چھوٹی لکڑیاں ہے جن کے ذریعے بڑی لکڑیوں کو جلایا جاتا ہے۔

وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝

اور نہیں آتا تھا ان کے پاس کوئی رسول ۱؎ مگر وہ ان کے ساتھ مذاق کرتے تھے ۲؎

۱؎ ھم ضمیر کا مرجع شیع ہے ان کی ماضی کی حالت کی حکایت ہے، یعنی ما اتاھم کے معنی میں ہے مِنْ رَّسُوْلٍ میں نفی کی تعمیم کے لئے من زائدہ ہے۔

۲؎ یعنی جس طرح یہ ناہنجار آپ سے مذاق کرتے ہیں۔ ان کے پیشرو بھی اپنے رسولوں سے مذاق کرتے تھے۔ اس کلام میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے۔

كَذٰلِكَ نَسْلُكُهٗ فِیْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِیْنَ ﴿۱۲﴾

"اسی طرح ۱؎ ہم داخل کرتے ہیں گمراہی کو مجرموں کے دلوں میں ۲؎"

۱؎ یعنی جس طرح ہم نے استہزاء اور کفر پہلے لوگوں کے دلوں میں پرو دیا تھا اور ان کا محبوب مشغلہ بنا دیا تھا۔

۲؎ نَسْلُكُهٗ میں ہ ضمیر کا مرجع الاستہزاء ہے یعنی ہم داخل کرتے ہیں استہزاء کو اور الْمُجْرِمِیْنَ سے مراد مشرکین مکہ ہیں۔ السلک کا معنی کسی چیز کو دوسری چیز میں ڈالنا ہے جیسے سوئی میں دھاگہ ڈالا جاتا ہے اور مطعون میں نیزہ داخل کیا جاتا ہے۔ اس آیت میں قدریہ فرقہ کا رد ہے اور اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کفار کے دلوں میں باطل کو پیدا فرماتا ہے۔

لَا یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَ قَدْ خَلَتْ سُنَّةُ الْاَوَّلِیْنَ ﴿۱۳﴾

"وہ نہیں ایمان لائیں گے ۱؎ اس پر اور گذر چکی ہے پہلوں کی یہی روش ۲؎"

۱؎ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ مجرمین سے حال ہے۔

۲؎ یعنی اللہ تعالیٰ کی پہلے لوگوں کے متعلق یہ سنت گذر چکی ہے کہ اس نے انہیں رسوا و ذلیل کیا اور ان کے دلوں میں کفر کو داخل کر دیا، یا اللہ تعالیٰ کی یہ سنت رہی ہے کہ جو اس کے رسولوں کو جھٹلاتا تھا وہ انہیں تباہ و برباد کر دیتا تھا۔

وَ لَوْ فَتَحْنَا عَلَیْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوْا فِیْهِ یَعْرُجُوْنَ ﴿۱۴﴾

"اور اگر ہم کھول بھی دیتے ۱؎ ان پر دروازہ آسمان سے اور وہ سارا دن اس میں سے اوپر چڑھتے رہتے ۲؎"

۱؎ ھم ضمیر کا مرجع وہ کفار ہیں جو لو ما تاتینا بالملائکه کی فرمائش کرتے تھے۔

۲؎ یعنی ملائکہ سارا دن آسمان کی طرف چڑھتے رہتے اور یہ اپنی آنکھوں سے دیکھ بھی لیتے۔ حضرت حسن فرماتے ہیں اس کا یہ معنی ہے کہ یہ کفار آسمان پر چڑھتے اور بالکل عیاں اور واضح قدرت کی عجائبات کا مشاہدہ کرتے۔

لَقَالُوْۤا اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُوْرُوْنَ ﴿۱۵﴾

"پھر بھی وہ یہ کہتے کہ ہماری تو نظریں بند کر دی گئی ہیں ۱؎ بلکہ ہم ایسی قوم ہیں جن پر جادو کر دیا گیا ہے ۲؎"

۱؎ جادو کے ذریعے ہماری نظریں بند کر دی گئی ہیں۔ یہ السکر سے مشتق ہے جس کا معنی سد النهر یعنی نہر کا بند ہے۔ قاموس میں اسی طرح لکھا ہے۔ ابن کثیر کی تخفیف کے ساتھ قرأت اس پر دلالت کرتی ہے۔ ابن عباس کا بھی یہی فرمان ہے۔ حضرت الحسن فرماتے ہیں سکرت بالتشدید کا معنی سحرت یعنی جادو کر دیا گیا ہے (1)۔ قتادہ فرماتے ہیں آخرت یعنی بیچھے کر دی گئی ہیں (2)۔ الکلبی فرماتے

1۔ تفسیر خازن، جلد 4، صفحہ 48 (التجاریہ)

2۔ تفسیر خازن، جلد 4، صفحہ 48 (التجاریہ)

ہیں عمیت اندھی کردی گئی ہیں(1) قاموس میں ہے سُکِّرَتْ اَبْصَارُنَا یعنی دیکھنے سے روک دی گئی ہیں اور حیران کردی گئی ہیں یا یہ معنی کہ ڈھانپ دی گئی ہیں ان پر پردہ ڈال دیا گیا ہے۔

۲۔ ہم پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جادو کر دیا ہے جیسا کہ وہ دوسرے معجزات کو دیکھ کر کہتے ہیں۔ انما اور بل کے کلمہ کا ذکر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ کفار اس بات پر قطعی یقین رکھتے تھے کہ جو کچھ انہیں نظر آ رہا ہے، اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ یہ باطل ہے اور یہ نظر بندی کا کرشمہ ہے۔

وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّ زَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ ﴿۱۶﴾

"اور بے شک ہم نے آسمان میں برج بنائے ہیں ۱؎ اور ہم نے آراستہ کر دیا ہے آسمان کو دیکھنے والوں کے لئے ۲؎"

۱؎ برج بڑے ستارے کو کہتے ہیں اور یہ بروج سے مشتق ہے جس کا معنی ظاہر ہونا ہے۔ کہا جاتا ہے تبرجت المرأۃ جب عورت پردہ سے ظاہر ہو جائے۔ عطیہ فرماتے ہیں یہ آسمان میں محل ہیں(2)۔ آیت میں علماء ہیئت و نجوم کی اصطلاح مراد نہیں ہے کیونکہ ان کے نزدیک آسمان ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں اور نویں آسمان کی حرکت سے مجبوراً تمام آسمان حرکت کرتے ہیں۔ نویں آسمان کو فلک الافلاک کہتے ہیں اور فلک الافلاک کی حرکت ایک منطقہ اور دو قطبوں پر ہے اور آٹھواں فلک الاک جو فلک الثوابت ہے۔ یہ ایک منطقہ اور دوسرے قطبوں پر ہے اور سورج آٹھویں فلک کے منطقہ کو لازم ہے اور دونوں منطقوں کے درمیان تقاطع ہے اور ایک رسم خط ہے جس کے ذریعے چاروں قطبوں کے درمیان تقاطع حاصل ہوتا ہے۔ پس چار قوس بنتے ہیں اور ہر قوس تین بروج پر مشتمل ہے۔ یہ تمام چیزیں ایسی ہیں جن کا شریعت اسلامیہ انکار اور رد کرتی ہے کیونکہ شرع میں ستاروں کا حرکت کرنا ثابت ہے۔ آسمانوں کی گردش ثابت نہیں ہے اور ہر دو آسمانوں کے درمیان پانچ سو سال کا بعد ہے اور آسمانوں کی تعداد سات سے زائد نہیں ہے۔

۲؎ یعنی ہم نے بروج کو روشنی یا آسمان کو سورج، چاند اور ستاروں سے مزین کر دیا ہے دیکھنے والوں کے لئے۔

وَحَفِظْنٰهَا مِنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ﴿۱۷﴾

"اور ہم نے محفوظ کر دیا ہے آسمان کو ہر شیطان سے جو راندہ ہوا ہے ۱؎"

۱؎ وَحَفِظْنٰهَا میں ھا ضمیر کا مرجع آسمان ہے، یعنی ہم نے آسمانوں کو محفوظ کر دیا ہے۔ اب شیطان آسمان کی طرف چڑھنے پر اور آسمان کے مکینوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالنے یا آسمان کے امور میں تصرف کرنے یا آسمانوں کے حالات پر آگاہ ہونے پر قدرت نہیں رکھتا۔

امام بغوی فرماتے ہیں حضرت ابن عباس نے فرمایا شیاطین کو پہلے آسمانوں پر جانے میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ تھی، وہ آسمانوں پر جاتے تھے اور وہاں کی خبریں کاہنوں کو بتاتے تھے۔ جب عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت ہوئی تو انہیں تین آسمانوں سے روک دیا گیا۔ پھر جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت ہوئی تو انہیں تمام آسمانوں سے روک دیا گیا۔ اس کے بعد جب کوئی آسمانوں کی باتیں چوری چھپے سننے کے لئے جاتا تو شہاب ثاقب سے اسے مارا جاتا۔ جب انہیں روکا گیا تو انہوں نے اس معاملہ کا ذکر شیطان سے کیا تو اس نے کہا زمین پر کوئی نیا حادثہ رونما ہوا ہے۔ اس نے انہیں حقیقت کی تلاش میں بھیجا تو انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن

1۔ تفسیر خازن، جلد 4، صفحہ 48 (التجاریۃ)

2۔ تفسیر خازن، جلد 4، صفحہ 49 (التجاریۃ)

کریم کی تلاوت کرتے ہوئے پایا۔ پینے لگے قسم خدا بخدا یہ حادثہ ہوا ہے(1)۔

إِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَأَتْبَعَهُ شِهَابٌ مُّبِينٌ ۞

"بجز اس کے جو چوری چھپے سن لے تو (اس صورت میں) تعاقب کرتا ہے اس کا ایک روشن شعلہ 1۔"

1۔ لیکن جو چوری چھپے سنے گا تو اس کا پیچھا کرے گا اور اسے لاحق ہو گا ظاہر شعلہ جسے دیکھنے والے دیکھتے ہیں۔ شہاب اس آگ کے شعلے کو کہتے ہیں جو ستاروں سے نکلتا ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں شیطانوں کا قصہ اس طرح ہے کہ شیطان ایک دوسرے کے اوپر چڑھ کر آسمان دنیا تک پہنچتے ہیں اور چوری چھپے فرشتوں کی باتیں سنتے ہیں۔ فرشتے انہیں شعلے مارتے ہیں اور کوئی شعلہ خطا نہیں جاتا۔ بعض کو وہ شعلے قتل کر دیتے ہیں۔ بعض کے چہرے جل جاتے ہیں یا پہلو یا ہاتھ یا جو جگہ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے جل جاتی ہے۔ بعض شعلہ لگنے سے پاگل ہو جاتے ہیں پھر وہ جنگلوں میں بھوت بن کر لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں(2)۔

حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے فرماتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ کسی امر کا فیصلہ فرماتے ہیں تو فرشتے اس قول پر سر تسلیم خم کرتے ہوئے اپنے پر پھڑ پھڑاتے ہیں جیسے کوئی زنجیر کسی چٹان پر پڑتی ہے۔ جب خوف ان کے دلوں سے نکل جاتا ہے تو وہ ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں تمہارے رب نے کیا فرمایا، وہ کہتے ہیں جو فرمایا حق فرمایا، وہ بلند و بالا اور بڑا ہے۔ پس اس الٰہی فیصلہ کو چوری چھپے سننے والا سنتا ہے جو ایک دوسرے کے اوپر ہوتے ہیں۔ اوپر والا اس کو نیچے والوں کو بتاتا ہے۔ پھر وہ اپنے سے نیچے والوں کو بتاتا ہے حتیٰ کہ آخری اس بات کو جادوگر یا کاہن کی زبان پر ڈالتا ہے۔ اکثر اوقات بات کو ساحر تک پہنچانے سے پہلے شہاب ثاقب اسے لگ جاتا ہے۔ بعض اوقات شہاب ثاقب لگنے سے پہلے وہ بات کو ساحر تک پہنچا چکا ہوتا ہے۔ پھر وہ اس بات کے ساتھ اور سو جھوٹ ملاتا ہے۔ پس کہا جاتا ہے کہ اس نے ہمیں ایسا ایسا پہلے بتایا نہیں تھا۔ پس اس آسمان سے سنی ہوئی بات کی وجہ سے کاہن کی باتوں کی تصدیق کی جاتی ہے۔ اس حدیث کو امام بخاری نے روایت کیا ہے اور ان کے طریق سے امام بغوی نے روایت کی ہے(3)۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے، فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ ملائکہ بادل میں اترتے ہیں، آسمانی فیصلہ کا تذکرہ ہوتا ہے تو شیطان چوری چھپے سن لیتے ہیں۔ پھر کاہنوں کو بتاتے ہیں۔ پھر کاہن اس کے ساتھ اپنی طرف سے سو جھوٹ ملا کر جھوٹ بکتے ہیں۔ اس حدیث کو امام بخاری نے روایت کیا ہے اور امام بغوی نے ان کے طریق سے روایت کی ہے(4)۔

وَالْأَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَأَلْقَيْنَا فِيهَا رَوَاسِيَ وَأَنْۢبَتْنَا فِيهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُونٍ ۞

"اور زمین کو ہم نے پھیلا دیا اور گاڑ دیئے اس میں محکم پہاڑ اور ہم نے اگادی اس میں ہر چیز اندازے کے مطابق 1۔"

1۔ یعنی زمین کو ہم نے پانی پر پھیلا دیا اور ہم نے اس زمین میں محکم پہاڑ گاڑ دیئے زمین ڈول رہی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر پہاڑ گاڑ دیئے اور ہم نے اگائی زمین میں یا پہاڑوں میں بلکہ دونوں میں ہر چیز ایک ایسی معین مقدار کے ساتھ جس کا حکمت تقاضا کرتی تھی یا یہ مطلب کہ ہر چیز خوبصورت اور مستحسن اگائی۔ یہ عربوں کے قول کَلَامٌ مَّوْزُوْنٌ سے ہے۔ یا یہ مطلب کہ نعمتوں کے باب میں ہر چیز

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 49 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 49 (التجاریہ)
3۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 682 (وزارت تعلیم)
4۔ تفسیر خازن، جلد 4، صفحہ 49 (التجاریہ)

کا وزن ہے۔ یا دھاتوں میں جو وزن کی جاتی ہیں وہ مراد ہیں جیسے سونا، چاندی، لوہا، تانبا وغیرہ حتیٰ کہ ہڑتال اور سرمہ وغیرہ اور پہاڑوں میں اگائی ہے جیسے یاقوت، زبرجد اور فیروزج وغیرہ۔

وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ وَمَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِيْنَ ⑳

''اور ہم نے بنا دیئے تمہارے لئے بھی اس میں رزق کے سامان[1] اور ان کیلئے بھی جنہیں تم روزی دینے والے نہیں ہو[2]''

[1] فِيهَا میں ھا ضمیر سے مراد زمین اور پہاڑ ہیں۔ مَعَايِشَ معیشۃ کی جمع ہے، یعنی کھانے، پینے، پہننے والی اشیاء اور ادویہ میں سے جن کے ساتھ تم دنیا میں زندگی بسر کرتے ہو۔

[2] اس کا مَعَايِشَ پر عطف ہے، یعنی چوپائیوں میں سے جن کو تم رزق دینے والے نہیں ہو ان کو بھی تمہارے لئے اس زمین اور پہاڑوں میں پیدا فرمایا۔ اس معنی کے اعتبار سے مَن بمعنی ما ہوگا جیسا کہ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى بَطْنِهٖ میں مَن بمعنی ما ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں مَن سے مراد عیال، خدام، غلام، چوپائے ہیں جن کے متعلق وہ یہ باطل گمان رکھتے ہیں کہ وہ انہیں رزق دیتے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ تمہیں بھی اور انہیں بھی رزق دیتا ہے اور مَن کا کلمہ عقلاء کے غلبہ کے لئے ذکر کیا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں مَن کم ضمیر مجرور پر عطف ہونے کی وجہ سے مجرور ہے۔ اس آیت کا نتیجہ ان اشیاء سے صانع کے وجود پر استدلال کرنا ہے، اس کے کمال قدرت، حکمت بالغہ اور الوہیت میں تفرد، وجوب الوجود پر استدلال کرنا ہے اور بندوں پر اپنے انعامات کا احسان جتلانا ہے تاکہ وہ اس کی توحید پر ایمان لائیں، اسی کی عبادت کریں، اسی کا شکر بجا لائیں اور اس کا انکار نہ کریں۔

وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ ۫ وَمَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ㉑

''اور نہیں کوئی چیز مگر ہمارے پاس اس کے خزانے (بھرے پڑے) ہیں[1] اور ہم نہیں اتارتے اسے مگر ایک معلوم انداز ے کے مطابق[2]''

[1] یعنی جو چیزیں ہم نے پیدا کی ہیں ان کی جنس سے کئی گنا زیادہ پیدا کرنے پر بھی ہم قادر ہیں۔ خزائنہ کی مثال اپنے اقتدار و قدرت کے اظہار کے لئے ہے، یا مقدرات الٰہیہ کو ان چیزوں سے تشبیہ دی گئی ہے جو خزانہ شدہ ہوتی ہیں اور ان کے اخراج کے لئے کسی کلفت و مشقت کی ضرورت نہیں ہوتی اور خارج میں ظاہر کرنے کو خزائن سے اخراج اور خزائن سے اس کے انزال کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔

[2] ازل میں اس کی ایجاد مقدر ہے اور اللہ تعالیٰ کے پاس اس کی مقدار معلوم ہے۔ میں کہتا ہوں شاید خزائن سے مراد وہ اعیان ہوں جو اللہ تعالیٰ کے علم میں موجود ہیں اور انزال سے مراد وجود ظلی کے ساتھ خارج ظلی میں اس کی ایجاد ہو۔

امام بغوی فرماتے ہیں امام جعفر بن محمد الصادق رضی اللہ تعالیٰ عنہما و آبائہما سے مروی ہے فرماتے ہیں۔ عرش میں بری و بحری ہر مخلوق الٰہی کی مثال موجود ہے اور وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ کی یہی تاویل ہے(1)۔ میں کہتا ہوں شاید امام صاحب کی مراد عالم المثال ہو کیونکہ وہ عالم کبیر کے لئے خیال کے قائم مقام ہے اور انسان کے خیال کا محل دماغ ہے اور عالم کبیر کے لئے خیال کا محل عرش ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں خزائن سے مراد بارش ہے کیونکہ وہ تمام چیزوں کا خزینہ ہے، وہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 51 (التجاریۃ)

یعنی الوحی" اور ہم نے پیدا فرمائی پانی سے ہر زندہ چیز۔ کہا جاتا ہے کہ آسمان سے ہر بارش کے قطرہ کے ساتھ ایک فرشتہ ہوتا ہے جو اسے وہاں گراتا ہے جہاں اللہ تعالیٰ ارادہ فرماتا ہے۔ امام بغوی نے اسی طرح لکھا ہے۔

وَاَرْسَلْنَا الرِّیٰحَ لَوَاقِحَ فَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَسْقَیْنٰكُمُوْهُ ۚ وَمَاۤ اَنْتُمْ لَهٗ بِخٰزِنِیْنَ ﴿۲۲﴾

"پس ہم بھیجتے ہیں ہواؤں کو باردار بنا کر[1]، پھر ہم اتارتے ہیں آسمان سے پانی پھر ہم پلاتے ہیں تمہیں وہی پانی[2] اور تم اس کا ذخیرہ کرنے والے نہیں ہو[3]"

[1] یعنی ہم ان ہواؤں کو بھیجتے ہیں جو بارش برسانے والے بادلوں کو اٹھائے ہوئے ہوتی ہیں۔ لَوَاقِحَ جمع ہے لاقحۃ کی۔ عرب کہتے ہیں ناقۃ لاقحۃ جب اونٹنی حاملہ ہو جائے۔ اس معنی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع ملاقیح سے منع فرمایا یعنی اس بچہ کی بیع سے منع فرمایا جو ابھی اونٹنی کے پیٹ میں ہے۔ ملقوح کی جمع ملاقیح ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ لواقح لقوح کی جمع ہو جس کا معنی دودھ دینے والی اونٹنی ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں وہ ہوائیں جو بارش برسانے والے بادلوں کی خبر لاتی ہیں انہیں حاملہ کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے اور جو ایسی ہوائیں نہ ہوں انہیں عقیم (بانجھ) کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے(1)۔

ابن مسعود فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ ہوا کو بھیجتا ہے۔ پس وہ پانی کو اٹھاتی ہیں۔ پھر بادل اس ہوا کے ذریعے چلتا ہے۔ اس کے بعد دودھ دینے والی اونٹنی کی طرح ٹپکتا ہے۔ پھر بارش برساتا ہے۔ ابو عبید فرماتے ہیں لواقح سے مراد ملاقح ہے جو ملقحۃ کی جمع ہے کیونکہ یہ ہوائیں درختوں کو ثمر بار کرتی ہیں۔ عبید بن عمیر فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ بشارت دینے والی ہواؤں کو بھیجتا ہے جو زمین کو صاف کر دیتی ہیں۔ پھر بادلوں کو چلانے والی ہواؤں کو بھیجتا ہے جو بادلوں کو اڑا دیتی ہیں۔ پھر بادلوں کو اکٹھا کرنے والی ہواؤں کو بھیجتا ہے جو بادلوں کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا دیتی ہیں اور تہ در تہ کر دیتی ہیں۔ پھر باربردار ہواؤں کو بھیجتا ہے جو درختوں کو باربردار کرتی ہیں۔ ابو بکر بن عیاش فرماتے ہیں بارش کا کوئی قطرہ نہیں گرتا مگر ان چار ہواؤں کے عمل دخل کے بعد۔ صبا بادلوں کو چلاتی ہے شمالی ان کو جمع کرتی ہیں۔ جنوبی انہیں برساتی ہیں اور دبور انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہیں۔ خبر میں ہے کہ باربردار ہوائیں جنوبی ہیں اور بعض آثار میں ہے کہ جنوبی ہوائیں چلتی ہیں تو انگور نکلتا ہے اور عقیم ہوا یہ عذاب کو لاتی ہے اور عمل تلقیح نہیں کرتی(2)۔

امام بغوی نے امام شافعی کے طریق سے اور طبرانی ابن عباس سے روایت کرتے ہیں جب ہوا چلتی ہے تو نبی کریم ﷺ دوزانو ہو کر بیٹھ جاتے اور یہ دعا فرماتے اے اللہ! اسے رحمت بنا دے اور اسے عذاب نہ بنا۔ اے اللہ اس بشارت دینے والی ہواؤں میں سے کر دے، اسے عقیم ہوا نہ بنا(3)۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں قرآن کریم میں منحوس ہواؤں کے لئے ریح کا لفظ استعمال ہوا ہے اور بشارت دینے والی ہواؤں کے لئے ریاح کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ ارشاد ہے(4) اَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ رِیْحًا صَرْصَرًا، اَرْسَلْنَا عَلَیْهِمُ الرِّیْحَ الْعَقِیْمَ۔ اَرْسَلْنَا الرِّیٰحَ لَوَاقِحَ، وَیُرْسِلُ الرِّیٰحَ مُبَشِّرٰتٍ۔

[2] ہم نے بارش کو تمہارے لئے سیرابی کا باعث بنایا۔ عرب کہتے ہیں اسقی فلان فلانا یعنی فلاں نے فلاں کو سیراب کیا، یعنی اسے

1۔ تفسیر بیضاوی، جلد 14، صفحہ 345 (فراس)
2۔ تفسیر خازن، جلد 4، صفحہ 51 (التجاریہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 51 (التجاریہ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 51 (التجاریہ)

پانی دیا تا کہ پیئے۔ عرب کہتے ہیں سقیت الرجل ماء او لبنا میں نے فلاں کو پانی یا دودھ پلایا۔ اور جب کوئی اس کو پانی عطا کرے تا کہ وہ اپنی زمین کو پانی پلائے یا اپنے جانوروں کو پانی پلائے تو اسقیتہ استعمال کرتے ہیں۔

۳؎ یعنی بارش تمہارے خزانوں میں نہیں بلکہ ہمارے خزانوں میں ہے جس چیز کو اپنے لئے ثابت فرمایا ان سے اس چیز کی نفی فرمادی یا یہ معنی کہ تم اس پانی کو کنوؤں اور تالابوں میں محفوظ کرنے والے نہیں ہو۔ یہ حکیم کی تدبیر پر دلیل ہے جس طرح یہ ہواؤں کی بعض اوقات اور جہات میں حرکت پر دلیل ہے اور ان کی جہت اور وقت ایسے ہیں کہ لوگ ان سے منتفع ہوتے ہیں کیونکہ پانی کی طبیعت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ گہرائی میں چلا جائے۔ پس اس کا بغیر رکاوٹ کے اوپر ٹھہرے رہنا یقیناً کسی سبب کا مقتضی ہے۔

وَ اِنَّا لَنَحْنُ نُحْیٖ وَ نُمِیْتُ وَ نَحْنُ الْوٰرِثُوْنَ ﴿۲۳﴾

"اور بے شک ہم ہی زندہ کرتے ہیں اور ہم ہی مارتے ہیں ۱؎ اور ہم ہی (ان سب کے) وارث ہیں ۲؎"

۱؎ ہم معرفت کے ساتھ دلوں کو زندہ کرتے ہیں اور نفوس حیوانیہ یا نباتیہ یا اس جیسی چیزوں کی تعلیق کے ساتھ جسموں کو زندہ کرتے ہیں۔ اور پھر ان چیزوں کو زائل کر کے مارتے ہیں ضمیر متکلم کا تکرار حصر پر دلالت کرنے کے لئے ہے۔

۲؎ ہم ہی ان سب کے وارث ہیں کیونکہ ہمارے سوا کوئی زندہ باقی نہ رہے گا، دوسرے کے فنا ہونے کے بعد باقی کے لئے وارث کا لفظ استعارۃً استعمال ہوا جیسا کہ میت کا وارث ہوتا ہے جو میت کے فنا ہونے کے بعد باقی رہتا ہے۔

وَ لَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِیْنَ مِنْكُمْ وَ لَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاْخِرِیْنَ ﴿۲۴﴾

"اور یقیناً ہم جانتے ہیں ان کو بھی جو گزر چکے ہیں تم میں سے اور یقیناً ہم جانتے ہیں بعد میں آنے والوں کو ۱؎"

۱؎ تمہارے احوال میں سے کوئی چیز ہم پر مخفی اور پوشیدہ نہیں ہے۔ یہاں کمال قدرت پر دلیل پیش کرنے کے بعد کمال علم کا بیان ہو رہا ہے کیونکہ جو چیز اس کی قدرت پر دلالت کرتی ہے وہ اس کے علم کی بھی دلیل ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت ابن عباس نے فرمایا الْمُسْتَقْدِمِیْنَ سے مراد مردہ اور الْمُسْتَاْخِرِیْنَ سے مراد زندہ ہیں۔ امام شعبی فرماتے ہیں اولین و آخرین مراد ہیں (1)۔ عکرمہ فرماتے ہیں الْمُسْتَقْدِمِیْنَ سے مراد وہ جنہیں اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا اور آباء کی صلبوں سے باہر نکالا اور مستاخرین سے مراد جنہیں نہ پیدا کیا گیا اور نہ ابھی تک نکالا گیا۔ مجاہد فرماتے ہیں الْمُسْتَقْدِمِیْنَ سے مراد سابقہ امتیں اور الْمُسْتَاْخِرِیْنَ سے مراد امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ حضرت الحسن فرماتے ہیں الْمُسْتَقْدِمِیْنَ سے مراد طاعت و بھلائی میں آگے بڑھنے والے ہیں الْمُسْتَاْخِرِیْنَ سے مراد طاعت و بھلائی میں تاخیر کرنے والے ہیں (2)۔ بعض فرماتے ہیں مستقدمین سے مراد نماز کی صفوں میں جو آگے ہوتے ہیں اور مستاخرین سے مراد پچھلی صفوں والے لوگ ہیں۔ ابن مردویہ نے داؤد بن صالح سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے سہل بن حنیف الانصاری سے اس آیت کے بارے پوچھا کیا یہ اللہ کے راستہ میں جہاد کے بارے میں نازل ہوئی ہے، فرمایا نہیں یہ نماز کی صفوں کے متعلق نازل ہوئی ہے (3)۔ ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، ابن حبان اور حاکم نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ ایک حسین و جمیل عورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھتی تھی۔ بعض لوگ آگے بڑھے تا کہ اس کو عورت کو دیکھیں اور بعض پیچھے ہوئے حتیٰ کہ پچھلی صف میں ہو گئے۔ پس بعض

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 52 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 52 (التجاریہ)

3۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 180 (العلمیہ)

لوگوں نے رکوع کیا تو بغلوں کے نیچے سے اس عورت کو دیکھا تو یہ آیت نازل ہوئی(1)۔ اوزاعی فرماتے ہیں اول وقت اور آخر وقت میں نماز پڑھنے والے مراد ہیں مقاتل فرماتے ہیں جہاد کی صفوں میں آگے پیچھے والے مرد ہیں۔ ابن عیینہ کے نزدیک وہ لوگ مراد ہیں جو مسلمان ہو چکے ہیں اور جو مسلمان نہیں ہوئے(2)۔

وَاِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ ؕ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿٢٥﴾

”اور بے شک آپ کا پروردگار ہی انہیں (روز قیامت) جمع کرے گا [1]۔ بے شک وہ بڑا دانا سب کچھ جاننے والا ہے [2]“

[1] جو کچھ انہوں نے اعمال کئے ان کی جزاء کے لئے یقیناً اللہ تعالیٰ انہیں جمع فرمائے گا۔ حضرت جابر سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو جس چیز پر مرے گا اللہ تعالیٰ اسے اسی چیز پر اٹھائے گا۔ اس حدیث کو احمد، حاکم اور بغوی نے روایت کیا ہے(3)۔ ھو ضمیر کا ذکر درمیان میں اس بات پر دلالت کرنے کے لئے ہے کہ لوگوں کے حشر کا صرف وہی متولی ہے اور وہی اس پر قادر ہے کسی اور کی مجال نہیں۔ جملہ کا ان کے ساتھ شروع کرنا وعدہ کی تحقیق اور اس بات پر تنبیہ کرنے کے لئے کہ سابقہ آیات جو اس کے کمال قدرت اور اشیاء کے تفصیلی علم پر دلالت کرتی ہیں تو اسکی حکمت کی صحت پر بھی دلالت کرتی ہیں جیسے کہ خود ہی صراحت فرمائی۔

[2] اس کی حکمت ظاہر ہے اور اس کے افعال پختہ ہیں اور ہر چیز کو اس کا علم محیط ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿٢٦﴾

”اور بلا شبہ ہم نے پیدا کیا انسان کو کھنکھناتی ہوئی مٹی سے [1]۔ جو پہلے سیاہ بدبودار گارا تھی [2]“

[1] ہم نے جنس بشر کو پیدا فرمایا کیونکہ نوع بشر کے باپ آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا اور اسکے ظاہر ہونے اور آنکھوں کے اس کا ادراک کرنے اور بعض کا بعض سے انس کرنے کی وجہ سے اسکا نام انسان رکھا۔ بعض فرماتے ہیں نسیان کی وجہ سے انسان کہا کیونکہ اس نے اللہ تعالیٰ سے عہد کیا اور پھر بھول گیا مِنْ صَلْصَالٍ ایسی خشک مٹی جسے ٹھکرایا جائے تو وہ آواز دینے لگے۔

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں صَلْصَالٍ وہ عمدہ اور پاک مٹی ہے جب اس میں پانی داخل ہو جائے تو وہ پھٹ جاتی ہے اور جب اس کو حرکت دی جائے تو وہ آواز دیتی ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں اس سے مراد بدبودار مٹی ہے، فرماتے ہیں یہ صل اللحم اور اصل اللحم سے مشتق ہے جس کا معنی ہے گوشت بدبودار ہو گیا(4)۔

[2] حما سے مراد ایسی مٹی ہے جو پانی کے قریب ہونے کی وجہ سے سیاہ متغیر ہوتی ہے۔ یہ صلصال کی صفت ہے۔ مسنون ایسی مٹی جس کی کوئی صورت بنائی گئی ہو۔ یہ سنۃ الوجہ سے مشتق ہے۔ ابتداء میں مٹی تھی، پھر اسے پانی کے ساتھ گوندھا گیا تو طین بن گئی۔ پھر کچھ مدت پڑا رہنے کے بعد حما (سیاہ مٹی) بن گئی۔ پھر اس کا خلاصہ نکالا گیا تو وہ سلالہ بن گئی۔ پھر اسکی ایک صورت بنائی گئی۔ تو وہ مسنون بن گئی۔ پھر خشک ہوئی تو صَلْصَالٍ بن گئی۔ مجاہد اور قتادہ فرماتے ہیں مسنون بدبودار متغیر مٹی کو کہتے ہیں۔ یہ سنت الحجر علی الحجر سے مشتق ہے جس کا مطلب پتھر کو دوسرے پتھر کے ساتھ رگڑنا۔ جو چیز پتھروں کو رگڑنے سے بہتی ہے وہ بدبودار ہوتی ہے۔ اس لئے اسے

1۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 140 (وزارت تعلیم) 2۔ تفسیر خازن، جلد 4، صفحہ 52 (التجاریہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 53 (التجاریہ)

سنین کہا جاتا ہے۔ابوعبیدہ فرماتے ہیں مسنون کا معنی مصبوب ہے۔ پس وہ پگھلے ہوئے جواہر کی طرح ہے جنہیں قوالب میں ڈھالا جاتا ہے(1)۔یہ سَن سے مشتق ہے جس کا معنی انڈیلنا ہے۔عرب کہتے ہیں سننت الماء میں نے پانی کو انڈیلا۔گویا لیسدار اور سیاہ مٹی سے انسانی ڈھانچہ کو تیار کیا گیا جو پہلے کھوکھلا تھا پھر وہ مٹی خشک ہو گئی حتی کہ جب اسے ٹکرایا گیا تو وہ بجنے لگی پھر اس پر مختلف تغیرات واقع ہوئے حتی کہ اسے برابر کر کے اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی روح پھونک دی۔

وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ ﴿۲۷﴾

''اور جان [1] کو ہم نے پیدا فرمایا اس سے پہلے ایسی آگ سے جس میں دھواں نہیں [2]''

[1] وَالْجَآنَّ۔ پر الف لام جنس کا ہے جیسا کہ انسان پر الف لام جنس کا تھا، یعنی جنس جن مراد ہے کیونکہ جب ایک شخص سے مختلف افراد ہوں اور اس فرد واحد کی تخلیق ایک مادہ سے ہو تو گویا وہ تمام افراد اسی ایک مادہ سے مخلوق ہیں۔ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں الجان ابوالجن (جنوں کا باپ) جس طرح آدم علیہ السلام ابوالبشر ہیں۔قتادہ فرماتے ہیں وہ ابلیس ہے(2) اور کہا جاتا ہے کہ الجان ابو الجن ہے اور ابلیس ابوالشیطان ہے۔اور جنوں میں مسلمان بھی ہوتے ہیں اور کافر بھی وہ پیدا ہوتے ہیں اور مرتے بھی ہیں۔شیطانوں میں کوئی مسلمان نہیں ہے اور یہ سب شیطان کے ساتھ مریں گے۔وہب نے ذکر کیا ہے کہ کچھ جنوں کے لیے توالد و تناسل ہوتا ہے، وہ کھاتے پیتے ہیں جیسا کہ انسانوں میں یہ سارا سلسلہ ہوتا ہے اور کچھ جن ہوا کی طرح ہوتے ہیں، ان میں نہ توالد ہوتا ہے اور نہ کھاتے پیتے ہیں۔الجان مضمر فعل کی وجہ سے منصوب ہے جس کی تفسیر خلقنٰہ کر رہا ہے۔

[2] یعنی آدم علیہ السلام کی تخلیق سے پہلے جنوں کو پیدا فرمایا اس گرم آگ سے جو مسام سے گذر جاتی ہے۔امام بغوی فرماتے ہیں سموم گرم ہوا جو انسان کے مسام میں داخل ہو کر اسے قتل کر دیتی ہے(3)۔کہتے ہیں سموم دن کی گرم ہوا ہے اور حرور رات کی گرم ہوا کو کہتے ہیں۔الکلبی ابوصالح سے روایت کرتے ہیں سموم وہ آگ ہے جس میں دھواں نہیں ہوتا(4)۔الصواعق (آسمانی بجلی) اس سے ہوتی ہیں یہ آسمان اور حجاب کے درمیان ایک آگ ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے گرتی ہے اور اس پر گرتی ہے جس پر گرنے کا حکم ہوتا ہے اور وہ کڑک کی آواز جو سنائی دیتی ہے وہ اس حجاب کے پھٹنے کی آواز ہوتی ہے۔بعض علماء فرماتے ہیں نار السموم سے مراد آگ کے شعلے ہیں اور بعض فرماتے ہیں نَّارِ السَّمُوْمِ۔جہنم کی آگ ہے۔ضحاک ابن عباس سے روایت فرماتے ہیں ابلیس ملائکہ کے ایک خاص گروہ سے ہے جنہیں جن کہا جاتا ہے وہ نار سموم سے پیدا کیے گئے ہیں اور جن جنات کا ذکر قرآن میں ہے کہ وہ آگ کے شعلہ سے پیدا کیے گئے ہیں اور ملائکہ کی تخلیق نور سے ہوئی ہے(5)۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۲۸﴾

''اور (اے محبوب!) یاد فرماؤ جب آپ کے رب نے کہا تھا فرشتوں کو میں پیدا کرنے والا ہوں بشر کو کھنکھناتی مٹی سے جو پہلے بدبودار کیچڑ تھی''

1۔تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 53 (التجاریۃ) 2۔تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 53 (التجاریۃ) 3۔تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 53 (التجاریۃ)

فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَ نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ﴿۲۹﴾

”تو جب میں اسے درست فرمادوں اور پھونک دوں اس میں خاص روح اپنی طرف سے[1] تو گر جانا اس کے سامنے سجدہ کرتے ہوئے[2]“

[1] نفخ کا اصل معنی خالی کھوکھلے جسم میں ہوا کا گزارنا ہے۔ روح کی دو قسمیں ہیں ایک علوی جو اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے اور مادہ سے مجرد ہے۔ اس کا کام نظر کثیف سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عرش سے اوپر ہے کیونکہ وہ روح عرش سے زیادہ لطیف ہے۔ یہی روح 'روح علوی' ہے اور نظر کثیف سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ علوی ارواح پانچ ہیں۔ بعض کا مرتبہ بعض سے بلند ہے، القلب' الروح' السر' الخفی' الاخفی۔ یہ تمام عالم امر کے لطائف ہیں، دوسری روح سفلی ہے، یہ ایک لطیف بخار ہے جو ان عناصر اربعہ سے پیدا ہوتا ہے، جن سے جسم انسانی مرکب ہوتا ہے۔ اس روح کو نفس سے تعبیر کیا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس روح سفلی کو ارواح علویہ کے لئے آئینہ بنایا ہے جیسا کہ سورج آسمان کی بلندیوں پر ہونے کے باوجود آئینہ کے سامنے آتے ہی اس کے اندر نور اور حرارت کو پیدا کر دیتا ہے اور اس آئینہ سے روشنی کرنے اور جلانے کی صفت وآثار ظاہر ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح ارواح علویہ اوج تجرد پر ہونے کے باوجود نفس کو متاثر کرتی ہیں حتیٰ کہ ان ارواح کے آثار اس روح سفلی میں ظاہر ہوتے ہیں اور انہی ارواح علویہ کے آثار کو ہر ہر فرد کی ارواح جزئیہ کہا جاتا ہے۔ پھر روح سفلی ان ارواح علویہ کے اثرات کو برداشت کر کے دل کے ٹکڑا سے متعلق ہوتی ہے اور اس پر قوت حیوانیہ اور ارواح علویہ سے حاصل شدہ معارف انسانیہ کا اس پر فیضان کرتی ہے۔ پھر ان ارواح علویہ کے ساتھ بدن کی گہرائیوں تک شریانوں کے خلا میں سرایت کرتی ہے۔ اس گردش کو کسی کھوکھلی چیز میں ہوا کے پھونکنے کے ساتھ مشابہ ہونے کی وجہ سے نفخ کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے روح انسانی کو اپنی طرف مضاف کیا ہے۔ یہ اسکی عظمت اور تشریف کے لئے ہے کیونکہ وہ اللہ کی ایسی مخلوق ہے جو غیر مادی ہے یا یہ اضافت اس لئے ہے کہ اس میں تجلیات رحمانیہ کے قبول کرنے کی استعداد ہے اور کسی غیر انسانی روح میں یہ خاصیت نہیں ہے۔ انسان میں مٹی کا عنصر غالب ہے۔ اس لئے اس کی تخلیق کو مٹی کی طرف منسوب کیا گیا ہے فرمایا خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ﴿۷۶﴾۔ لیکن حقیقت میں یہ دس اجزاء کا مرکب ہے جن میں سے پانچ کا تعلق عالم خلق سے ہے۔ عناصر اربعہ اور روح سفلی جسے نفس سے تعبیر کیا جاتا ہے اور پانچ کا تعلق عالم امر سے ہے جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے (قلب' روح' سر' خفی' اخفی) عالم خلق اور عالم امر کی دونوں خصوصیات کی جامعیت کی وجہ سے روح انسانی کو خلافت کا مستحق ٹھہرایا گیا اور نور معرفت نار عشق کا اہل قرار دیا گیا اور اسی نار عشق اور نور معرفت کی وجہ سے اس بے کیف معیت مقتضی بنایا گیا جس کا ذکر حدیث شریف میں ہے المرء مع من احب۔ اس جامعیت کی بناء پر تجلیات ذاتیہ صفاتیہ اور ظلالیہ کا مہبط بنایا گیا۔ اس معیت اور قبول تجلیات کی وجہ سے حکمت الٰہیہ متقاضی ہوئی کہ اسے سجدہ کیا جائے فرمایا۔

[2] قعوا وقع سے امر کا صیغہ ہے اور یہاں یعنی لہ میں لام بمعنی الیہ ہے، یعنی آدم علیہ السلام کی طرف جھک کر اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرو۔ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو فرشتوں کی سجدہ کا قبلہ بنایا جیسے کعبہ کو انسان کے لئے قبلہ بنایا کعبہ کی طرف سجدہ اس لئے کیا جاتا ہے کہ وہ مرکز تجلیات الٰہیہ کے ساتھ مختص ہے۔ اسی طرح آدم علیہ السلام کو فرشتوں کے سجدہ کے لئے قبلہ بنایا گیا (مطلب یہ کہ آدم علیہ السلام مسجود الیہ تھے مسجود لہ نہ تھے)

فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ﴿۳۰﴾

''پس سربسجود ہو گئے فرشتے سارے کے سارے۔ ل''

ل تمام فرشتوں نے آپ کو سجدہ کیا یا تو اس معیت کے ادراک کے باعث جس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے یا حکیم وعلیم کے امر کی تعمیل یا تقلید کی وجہ سے انہوں نے سجدہ کیا۔

تعمیم میں مبالغہ اور تخصیص کے وہم کے ازالہ کے لئے اللہ تعالیٰ نے دو تاکید کے الفاظ ذکر فرمائے۔ مبرد سے مروی ہے کہ کل کے ساتھ تاکید احاطہ کے لئے ہے اور اجمعین کے ساتھ تاکید اس بات کے اظہار کے لئے کہ تمام نے یکبارگی سجدہ کیا تھا۔ لیکن یہ قول صحیح نہیں ہے۔ اگر یہی مفہوم ہوتا تو دوسری تاکید حال اور منصوب ہوتی مرفوع نہ ہوتی۔

اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۳۱﴾

''سوائے ابلیس کے اس نے انکار کر دیا کہ وہ سجدہ کرنے والوں کے ساتھ ہو۔ ل''

ل مگر ابلیس نے سجدہ نہ کیا کیونکہ وہ معیت مذکورہ کا ادراک نہ کر سکا اور یہ نہ سمجھ سکا کہ حکیم کا قول حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ استثناء منقطع ہے کیونکہ ابلیس ملائکہ میں سے نہیں تھا کیونکہ ارشاد ہے كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ یعنی وہ جنوں میں سے تھا۔ اس ترکیب کے اعتبار سے اسکے ساتھ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ابی ان یکون مع السجدین بھی متصل ہوگا یعنی ابلیس نے انکار کیا۔ بعض علماء فرماتے ہیں میں یہ استثناء متصل ہے اور وہ ان ملائکہ سے تھا جن کو جن کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس ترکیب کی بناء پر ابیٰ الخ مستقل کلام ہوگی۔ گویا یہ ایک سائل کا جواب ہے جو کہتا ہے ابلیس نے سجدہ کیوں نہیں کیا تھا۔

قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ مَا لَكَ اَلَّا تَكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۳۲﴾

''اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے ابلیس کیا وجہ ہے کہ تو نے سجدہ کرنے والوں کا ساتھ نہیں دیا۔ ل''

ل یعنی اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو مخاطب ہو کر فرمایا اے ابلیس تجھ کو کونسی چیز آدم کو سجدہ کرنے سے مانع تھی، جبکہ حاکم کے حکم کی وجہ سے تجھ پر مطلق سجدہ واجب تھا اور آدم علیہ السلام کی فضیلت کے ظہور اور خالق وصادق اور علیم رب کے خبر دینے کی وجہ بھی تجھ پر سجدہ واجب تھا کہ یہ مسجود الیہ ہونے کا مستحق ہے۔

قَالَ لَمْ اَكُنْ لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهٗ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۳۳﴾

''وہ (گستاخ) کہنے لگا کہ میں گوارا نہیں کرتا کہ سجدہ کروں اس بشر کو جسے تو نے پیدا کیا ہے بجنے والی مٹی سے جو پہلے سیاہ بدبودار تھی۔ ل''

ل ابلیس نے اپنی انتہائی عبادت کی وجہ سے یہ کہا تھا۔ لام نفی کی تاکید کے لئے ہے یعنی میرے لئے مناسب نہیں ہے اور میرے حال کے منافی ہے کہ میں سجدہ کروں ایک جسم کثیف کو جسے تو نے بجنے والی مٹی سے پیدا کیا جو سیاہ بدبودار تھی۔ یہ انتہائی گھٹیا عنصر ہے اور مجھے تو نے آگ سے پیدا کیا۔ یہ تمام عناصر سے لطیف اور اشرف ہے۔ اس کی مزید وضاحت سورۃ اعراف کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔

قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ ﴿۳۴﴾

"اللہ تعالیٰ نے حکم دیا (اے بے ادب) نکل جا یہاں سے تو مردود ہے [1]"

[1] اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اگر تو نے میرے حکم سے سرتابی کی ہے تو نکل جا آسمان سے یا جنت سے یا ملائکہ کے زمرہ سے۔ تو مردود ہے خیر و کرامت سے دور ہے کیونکہ جو دھتکارا جاتا ہے اسے پتھروں سے رجم کیا جاتا ہے۔ یا یہ معنی کہ اگر تو آسمان کے قریب آئے تو تجھے شہابوں سے مارا جائے گا۔ یہ جملہ وعید بھی ہے اور اس شبہ اور تعریض کا جواب بھی ہے کہ فاضل کو مفضول کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دینا مناسب نہیں ہے اور جواب یہ ہے کہ تمام بھلائیاں اور خیرات اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہیں اور اس کے حکم کی اطاعت میں ہیں۔ پس جب اس نے نافرمانی کی تو خیر سے محروم ہو گیا اور دھتکارنے کا مستحق بن گیا

وَّ اِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ ۝۳۵

"اور بلاشبہ تجھ پر لعنت ہے روز جزا تک [1]"

[1] اس لعنت و پھٹکار کی انتہا قیامت تک ہے۔ اس کے بعد اس لعنت و پھٹکار پر جزاء کے مرتب ہونے کا وقت ہے۔ یا یہ معنی کہ اسے اس کے بعد ایسی سزا دی جائے گی کہ وہ اس لعنت کے ہوتے ہوئے بھی اسکو بھول جائے گا اور یہ لعنت اس عذاب آخرت پر زائد ہوگی۔ بعض علماء فرماتے ہیں لعنت کی حد قیامت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کیونکہ لوگ اس کے ساتھ کسی کام کی حد بیان کرتے ہیں (یعنی یہ بطور محاورہ ہے)۔ امام بغوی فرماتے ہیں بعض علماء نے لکھا ہے کہ آسمان والے بھی ابلیس پر لعنت کرتے ہیں جیسے زمین والے اس پر لعنت کرتے ہیں وہ زمین و آسمان میں ملعون ہے (1) میں کہتا ہوں بلکہ زمین و آسمان کا مالک بھی اس پر لعنت فرماتا ہے کیونکہ ارشاد فرمایا وَّ اِنَّ عَلَيْكَ لَعْنَتِيْٓ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ ۝۷۸۔

قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۝۳۶

"کہنے لگا! اے میرے رب پھر مہلت دے مجھے [1] اس دن تک جب مردے (قبروں سے) اٹھائے جائیں گے [2]"

[1] ابلیس نے کہا اے میرے پروردگار اگر تو نے مجھے نکالا ہے اور مجھ پر لعنت کی ہے تو مجھے مہلت دے اور مجھے موت نہ دے۔

[2] اس کی مراد یہ تھی کہ مجھے لوگوں کو گمراہ کرنے کی مہلت دی جائے اور موت سے نجات دی جائے کیونکہ دوبارہ اٹھنے کے بعد کوئی موت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی پہلی دعا (یعنی مہلت دینے کی) قبول فرمائی مگر یہ دعا کی قبولیت اس کے شرف و کرامت کے لئے نہیں بلکہ اس کی شقاوت اور معصیت میں اضافہ کے لئے تھی اور دوسری دعا (موت نہ دینے کی) قبول نہ فرمائی۔

قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ۝۳۷ اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ۝۳۸

"اللہ تعالیٰ نے فرمایا بے شک تو مہلت دیئے ہوئے گروہ میں سے ہے۔ (جنہیں) وقت مقررہ تک مہلت دی گئی ہے [1]"

[1] یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہاں جو وقت معلوم ہے جس میں تمام مخلوق مر جائے گی۔ یہ نفخہ اولیٰ کا وقت ہے کہا جاتا ہے کہ ابلیس کے مرنے کی مدت چالیس سال ہے جو دو نفخوں کے درمیان ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 54 (التجاریہ)

قَالَ رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِىْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِى الْاَرْضِ وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۳۹﴾

"وہ بولا اے رب! اس وجہ سے کہ تو نے مجھے بھٹکا دیا۔ میں (برے کاموں کو) ضرور خوشنما بنا دوں گا ان کے لئے زمین میں اور میں ضرور گمراہ کروں گا ان سب کو لے"

لے باء قسمیہ ہے اور ما مصدریہ ہے، یعنی تیرے مجھے اغواء اور گمراہ کرنے کی میں قسم کھاتا ہوں۔ یعنی میں اس دنیا میں جو دھوکوں اور فریبوں کا گھر ہے لوگوں کے لئے گناہوں کو بڑا خوشنما کر کے پیش کروں گا۔ بعض علماء فرماتے ہیں باء سببیہ ہے یعنی تو نے مجھے اغواء کیا ہے۔ اس وجہ سے میں ان کے لئے معاصی اور بدکرتوتوں کو مزین کروں گا۔ اور میں انہیں گمراہی پر برانگیختہ کروں گا۔

اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۴۰﴾

"سوائے تیرے ان بندوں کے جنہیں ان میں سے چن لیا گیا ہے لے"

لے ابن کثیر، ابوعمرو اور ابن عامر نے پورے قرآن میں ہر جگہ مخلصین کو اسم فاعل کے صیغہ پر لام کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے یعنی جنہوں نے توحید و طاعت کو تیرے لئے خالص کیا اور اپنے نفسوں کو تیری رضا کی پیروی میں لگائے رکھا وہ میری وسوسہ اندازی سے بچے رہیں گے۔ باقی قراء نے لام کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی ان لوگوں پر میرا بس نہیں چلے گا جنہیں تو نے اطاعت کے لئے چن لیا ہے اور کسی دوسری کی طاعت سے بچا لیا اور انہیں ہر قسم کے شکوک وشبہات سے پاک صاف رکھا۔ پس تو نے انہیں ہدایت دی اور اپنا چیدہ بنا لیا اس لئے ان پر میرا مکر و فریب کارگر نہیں ہوتا۔

قَالَ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيْمٌ ﴿۴۱﴾

"اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ سیدھا راستہ ہے جو میری طرف آتا ہے لے"

لے قَالَ کا فاعل اللہ تعالیٰ ہے اور ھذا سے مراد اخلاص ہے، یعنی یہ بغیر گمراہی کے مجھ تک پہنچنے کا راستہ ہے۔ مستقیم وہ راستہ جس راستہ میں کوئی کجی اور ٹیڑھا پن نہیں ہوتا۔ حضرت الحسن فرماتے ہیں حق کا راستہ سیدھا ہے(1)۔ مجاہد فرماتے ہیں حق اللہ کی طرف لوٹتا ہے اور اسی حق پر اس کا راستہ ہے اور راہ حق کسی دوسری چیز کی طرف نہیں جھکتی(2)۔ اخفش کہتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ صراط مستقیم کی راہنمائی کرنا میرے ذمہ کرم میں ہے(3)۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ ھذا کا مشار الیہ وہ مفہوم ہو جو استثناء کے ضمن میں ہے اور وہ یہ ہے مخلص کو اغواء وضلالت سے بچا لینا معنی یہ ہے کہ مخلصین کو خلاصی دینا مجھ پر حق ہے، یعنی اس کی نگہبانی کرنا میرا حق ہے اور وہ ایسا سیدھا ہے کہ اس سے انحراف نہیں ہے۔ الکسائی فرماتے ہیں یہ کلام بطور تہدید اور وعید ہے جیسے کوئی اپنے خصم (جھگڑنے والے) کو کہتا ہے تیرا راستہ میری طرف ہے تو مجھ سے بھاگ نہیں سکتا(4)۔ جیسا کہ ارشاد ہے ان ربک لبالمرصاد اس مفہوم کے اعتبار سے ھذا کا مشار الیہ وہ راستہ ہے جو ابلیس نے اپنے لیے بنایا تھا، یعنی اغواء کا راستہ۔ ابن سیرین یعقوب اور قتادہ نے علی رفع اور تنوین کے ساتھ پڑھا ہے۔ علو سے مشتق کر کے پڑھا ہے معنی یہ ہے کہ اخلاص کا راستہ پالینے سے بہت بلند ہے اور بالکل سیدھا ہے، ادھر ادھر جھکتا نہیں ہے۔

اِنَّ عِبَادِىْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ﴿۴۲﴾

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 55 (التجاریہ) 2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 183 (العلمیہ)
3۔ تفسیر خازن، جلد 4، صفحہ 55 (التجاریہ) 4۔ تفسیر خازن، جلد 4، صفحہ 55 (التجاریہ)

”بے شک میرے بندوں پر تیرا کوئی بس نہیں چلتا مگر وہ جو تیری پیروی کرتے ہیں گمراہوں میں سے [1]“

[1] ظاہر یہ ہے کہ اضافت استغراق کے لئے ہے کیونکہ استثناء موجود ہے۔ پس یہ کافر اور مومن کو شامل ہے یعنی تیری حکمرانی تسلیط الٰہی کے ساتھ گمراہوں پر ہے۔ مومنین پر تیرا وار ہرگز زمین میں نہیں چلے گا۔ اس آیت میں ابلیس نے جو استثناء کی تھی اس کی تصدیق ہے۔ یہ اس آیت کریمہ کی مثل ہے اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۹۹﴾ اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ بے شک اس کا زور نہیں چلتا ان لوگوں پر (جو سچے دل سے) ایمان لائے اور اپنے رب پر کامل بھروسہ رکھتے ہیں، اس کا زور تو ان پر چلتا ہے جو یارانہ گانٹھتے ہیں اس سے۔

اس آیت سے مقصود مخلصین کی عصمت کا بیان مقصود ہے اور شیطان کے خولی اور بے رحم پنجوں سے خلاصی کا اظہار مطلوب ہے۔ یہاں سے اس شخص کا قول غیر معتبر ہو جاتا ہے جو یہ شرط لگاتے ہیں کہ مستثنیٰ باقی سے اقل ہو کیونکہ اگر اس شرط کو قبول کیا جائے تو ان استثناؤں میں تناقض ثابت ہوتا ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ مستثنیٰ منقطع ہو۔ معنی یہ ہو کہ گمراہوں میں سے جو تیری اتباع کرے گا اسے جہنم میں داخل کیا جائے گا۔ مابعد کلام کی دلالت کی وجہ سے خبر کو حذف کیا گیا ہے اس صورت میں یہ کلام شیطان کی اس بات کی تکذیب کے لئے ہے جس میں شبہ ہوتا تھا کہ اس کو ان پر سلطانی حاصل ہے جو مخلص نہیں ہیں۔ کیونکہ شیطان کو تو صرف اور صرف گناہوں اور نافرمانی پر برانگیختہ کرنے کا اختیار ہے جیسا کہ اس کی بات کو قرآن نے بیان فرمایا وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّاۤ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ اور نہیں تھا میرا تم پر کوئی زور مگر یہ کہ میں نے تم کو (کفر) کی دعوت کی اور تم نے (فوراً) قبول کر لی میری دعوت۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عبادی میں اضافت عہدی ہو اور معنی یہ ہو کہ میرے مخلص بندے ان پر تجھے کوئی طاقت نہیں دیتا ہے۔ اس ترکیب کے اعتبار سے استثناء منقطع یقینی ہوگی۔

وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۴۳﴾

”اور بے شک جہنم وعدہ کی جگہ ہے ان سب کے لئے [1]“

[1] گمراہوں یا شیطان کے پیروں کاروں کی وعدہ کی جگہ جہنم ہے۔ اجمعین ھم ضمیر کی تاکید ہے یا حال ہے اور اس میں عامل الموعد ہے اگر آپ اسے مصدر بنائیں اور مضاف کو مقدر مانیں اور اضافت کا معنی بھی مقدر مانیں۔ اگر آپ اسے اسم مکان بنائیں تو پھر یہ عمل نہیں کرے گا۔

لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ ؕ لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ ﴿۴۴﴾

”اس کے سات دروازے ہیں [1] ہر دروازے کے لئے ان میں سے ایک حصہ مخصوص ہے [2]“

[1] ہناد، ابن المبارک اور امام احمد نے زہد میں، ابن جریر اور ابن ابی الدنیا نے دوزخ کی صفت میں اور امام بیہقی نے روایت کی ہے، فرمایا جہنم اس طرح ہے، ایک ہاتھ کو دوسرے پر رکھا اور اپنی انگلیوں کے درمیان ایک کشادگی پیدا کر کے ارشاد فرمایا یعنی ہر دروازے کے اوپر ایک دروازہ ہوگا۔ پہلے پہلی منزل بھری جائے گی۔ پھر دوسری، پھر تیسری، پھر چوتھی، پھر پانچویں، پھر چھٹی اور اس کے بعد ساتویں منزل بھری جائے گی۔ امام بغوی نے حضرت علی کا اثر اسی طرح ذکر کیا ہے، فرمایا اللہ تعالیٰ نے جنتوں کو پھیلا کر رکھا اور آگ کو

پھر حطمہ، پھر السعیر، پھر سقر، پھر جحیم، پھر ہاویہ کا درجہ ہے۔

لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ میں هُم ضمیر کا مرجع غاوین ہیں۔ جزء مقسوم کا مطلب یہ ہے کہ ہر طبقہ کے لئے ایک ایک علیحدہ حصہ ہے۔ "منهم" یا تو جزء سے حال ہے یا لکل باب کی ضمیر مستکن سے حال ہے۔ مقسوم کی ضمیر سے نہیں کیونکہ صفت اپنے موصوف سے ماقبل میں عمل نہیں کرتی۔ ابوبکر نے جزء کو بغیر ہمزہ کے تشدید کے ساتھ جزّ پڑھا ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں پہلے طبقہ میں اہل توحید ہوں گے جو آگ میں داخل ہوں گے اور اپنے گناہوں کی مقدار عذاب میں مبتلا ہوں گے۔ پھر نکل آئیں گے، دوسرے طبقہ میں نصاریٰ ہوں گے، تیسرے میں یہودی ہوں گے، چوتھے میں صابی، پانچویں میں مجوسی، چھٹے میں مشرک اور ساتویں میں منافق ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ "بیشک منافق سب سے نچلے طبقہ میں ہوں گے دوزخ (کے طبقوں) سے۔

امام بغوی فرماتے ہیں حضرت ابن عباس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں، فرمایا جہنم کے سات دروازے ہیں ایک دروازہ اس کے لئے جس نے میری امت پر تلوار سونتی (1)۔ امام قرطبی فرماتے ہیں پہلا باب جہنم ہے اس کا عذاب دوسرے طبقوں سے کم ہے۔ یہ امت محمدیہ کے گناہگاروں کے لئے مختص ہے۔ جہنم کو جہنم اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ مردوں اور عورتوں کے چہروں کی ہیئت بدل دے گی اور ان کا گوشت کھا جائے گی۔ حاویہ یہ گہرا ترین گڑھا ہے۔ البزار نے ابن عباس سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آگ کا ایک دروازہ ہے جس میں صرف وہی لوگ داخل ہوں گے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی ناراضگی مول لے کر اپنے غصہ کو ٹھنڈا کیا ہوگا (2)۔ امام ترمذی نے ابن عمر سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جہنم کے سات دروازے ہیں، سب سے زیادہ غمزدہ کرنے والا" تکلیف دہ اور بدبودار دروازہ ان زناکاروں کے لئے ہوگا جنہوں نے علم کے باوجود زنا کیا ہوگا (3)۔ امام بیہقی حضرت خلیل بن مرہ سے مرسلاً روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سورۂ تبارک الذی، حم السجدہ پڑھ کر سوتے تھے۔ فرمایا حامیم والی سورتیں سات ہیں اور جہنم کے دروازے بھی سات ہیں جہنم۔ حطمہ۔ لظیٰ، سقر، سعیر، حاویہ، جحیم، فرمایا قیامت کے روز ان سورتوں میں سے حم السجدہ ان دروازوں سے ایک پر کھڑی ہو جائے گی اور وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کرے گی اے اللہ اس میں وہ شخص داخل نہ ہوں جو مجھ پر ایمان رکھتا تھا اور میری تلاوت کرتا تھا (4)۔ الثعلبی نے نقل کیا ہے کہ جب سلمان الفارسی نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۴۳﴾ اور بے شک جہنم وعدے کی جگہ ہے، ان سب کے لئے سنا تو بے خودی کی حالت میں خوف کے مارے تین دن بھاگتے رہے۔ پھر انہیں پکڑ کر بارگاہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں پیش کیا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وجہ پوچھی تو عرض کی یا رسول اللہ یہ آیت نازل ہوئی وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِيْنَ قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا۔ اس آیت نے میرا دل پاش پاش کر دیا ہے۔ حضرت سلیمان کی اس پریشانی کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ نے مندرجہ ذیل آیت نازل فرما دی۔

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۴۵﴾

"یقیناً پرہیزگار اس دن باغوں اور چشموں میں (آباد) ہوں گے۔"

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 56 (التجاریہ)
2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 186 (العلمیہ)

ے متقین سے مراد وہ افراد ہیں جو شرک کرنے میں شیطان کی اطاعت نہیں کرتے تھے۔ فِیْ جَنّٰتٍ وَّ عُیُوْنٍ ان میں سے ہر ایک کیلئے ایک باغ اور چشمہ ہوگا یا ہر ایک کے لئے کئی باغات اور چشمے ہوں گے۔ حضرت نافع، ہشام اور حضرت حفص نے ہر جگہ عیون کو عین کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے عین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِیْنَ ﴿۴۶﴾

"(انہیں حکم ملے گا) داخل ہو جاؤ ان جنتوں میں خیر و عافیت کے ساتھ [1] بے خوف ہو کر [2]"

[1] اُدْخُلُوْهَا سے پہلے قول محذوف ہے، یعنی انہیں کہا جائے گا باغات اور چشموں میں داخل ہو جاؤ۔ سلامتی کے ساتھ، یا یہ معنی کہ تم پر سلام بھیجا گیا ہے۔

[2] موت، آفت اور خروج سے مامون ہو کر۔

وَ نَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیْنَ ﴿۴۷﴾

"اور ہم نکال دیں گے جو کچھ ان کے سینوں میں کینہ (وغیرہ) تھا [1] وہ بھائی بھائی بن جائیں گے [2] اور تختوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے [3]"

[1] یعنی ہم ان کے دلوں سے وہ کینہ دور کریں گے جو دنیا میں ان میں تھا۔ ماضی یہاں مستقبل کے معنی میں وقوع کے تحقق پر تنبیہ کے لئے ماضی سے تعبیر فرمائی ہے۔ سعید بن منصور، ابو نعیم نے الفتن میں، ابن ابی شیبہ، طبرانی اور ابن مردویہ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا مجھے امید ہے کہ میں، عثمان، طلحہ اور زبیر انہی لوگوں میں سے ہوں گے (1)۔ میں کہتا ہوں یہ شر و فتنہ ان بزرگوں کے درمیان اٹھ کھڑا ہوا حتیٰ کہ حضرت عثمان گھر میں قتل ہوئے، حضرت طلحہ اور زبیر جنگ جمل میں قتل ہوئے۔ حضرت عبد اللہ بن احمد زوائد الزہد میں عبد الکریم بن رشید سے روایت فرماتے ہیں اہل جنت، جنت کے دروازے پر پہنچیں گے تو ایک دوسرے کو غصہ آمیز نگاہوں سے دیکھ رہے ہوں گے لیکن جونہی اندر داخل ہوں گے تو اللہ تعالیٰ ان کے دلوں سے کینہ و بغض نکال دیں گے اور وہ آپس میں بھائی بھائی بن جائیں گے (2)۔ یا یہ مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں جو مختلف درجات و مراتب قرب عطا فرمائے گا تو وہ ایک دوسرے پر حسد نہیں کریں گے اللہ تعالیٰ ان جنتیوں کے سینوں سے کینہ نکال دے گا۔

[2] اِخْوَانًا جنت میں جو ضمیر ہے اس سے حال ہے یا اُدْخُلُوْهَا کے فاعل سے یا اٰمِنِیْنَ کی ضمیر سے یا اس ضمیر سے جو مضاف الیہ ہے، سے حال ہے اور عامل اضافت کا معنی ہے۔

[3] عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیْنَ بھی ترکیب میں اِخْوَانًا کی طرح ہیں اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ دونوں اِخْوَانًا کی صفت ہوں یا اس کی ضمیر سے حال ہوں کیونکہ اِخْوَانًا بمعنی متصافین ہے یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ متقابلین علی سرر جس شبہ فعل کے متعلق ہے اس سے حال ہو۔ ھناد نے مجاہد سے اس آیت کے متعلق نقل کیا ہے، فرمایا وہ ایک دوسرے کی گدی نہیں دیکھیں گے (3)۔ امام بغوی فرماتے ہیں بعض اخبار میں ہے مومن جنت میں ہوگا جب وہ اپنے مسلمان بھائی سے ملاقات کی خواہش کرے گا تو ان میں سے ہر ایک کا پلنگ دوسرے کی

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 189 (العلمیہ) 2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 189 (العلمیہ)

3۔ تفسیر قرطبی، جلد 10، صفحہ 33 (المصریہ)، الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 189 (العلمیہ)

طرف چل پڑے گا۔ پھر وہ آپس میں ملاقات کریں گے اور باہم گفتگو کریں گے(1)۔ ابن ابی حاتم نے حضرت علی بن الحسین رضی اللہ عنہما سے نقل کرتے ہیں کہ آیت کریمہ سیدنا صدیق اکبر اور عمر فاروق رضی اللہ عنہما کے حق میں نازل ہوئی ہے۔ پوچھا گیا ان میں کونسا کینہ تھا فرمایا زمانہ جاہلیت کا کینہ۔ بنی تمیم بنی عدی اور بنو ہاشم کے درمیان زمانہ جاہلیت میں کینہ تھا۔ جب یہ لوگ دولت اسلام سے مالا مال ہوئے تو آپس میں شیر وشکر ہو گئے۔ ایک دفعہ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو کمر میں درد ہو گیا تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ اپنا ہاتھ گرم کر کے ان کی کمر پر رکھا تا کہ انہیں راحت ملے تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی(2)۔ میں کہتا ہوں اس روایت کے مطابق ونزعنا جنت کی ضمیر مستکن سے حال ہوگا اور معنی یہ ہوگا کہ زمانہ جاہلیت کا کینہ جو ان کے دلوں میں تھا اسلام کی وجہ سے دنیا میں ہم نے اسے دور کر دیا۔

لَا يَمَسُّهُمْ فِيْهَا نَصَبٌ وَّ مَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ ۝۴۸

”نہیں پہنچے گی انہیں اس میں کوئی تکلیف اور نہ انہیں اس سے نکالا جائے گا[1]“

[1] فیہا میں ھا سے مراد جنت ہے۔ نصب کا معنی تھکاوٹ ہے یہ جملہ مستقل کلام ہے یا متقبلین کی ضمیر سے حال ہے منہا میں ھا کا مرجع بھی جنت ہے، یعنی وہ نکالے نہیں جائیں گے کیونکہ نعمت کی تکمیل تب ہوتی ہے جب وہ نعمت انسان کے پاس ہمیشہ رہے۔ الطبرانی نے عبداللہ بن زبیر سے نقل کیا ہے فرمایا رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام کی ایک جماعت کے پاس سے گزرے، وہ ہنس رہے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کیا تم ہنس رہے ہو، جبکہ آگ تمہارے سامنے ہے۔ اسی اثناء میں جبرئیل امین اترے اور پیغام دیا یا محمد ﷺ آپ کا رب فرماتا ہے میرے بندوں کو میری رحمت سے کیوں مایوس کرتے ہو۔

نَبِّئْ عِبَادِیْۤ اَنِّیْۤ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ۝۴۹

”بتا دو میرے بندوں کو کہ میں بلاشبہ بہت بخشنے والا از حد رحم کرنے والا ہوں[1]“

[1] نافع، ابن کثیر اور ابوعمرو نے عبادی کو یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور دوسروں نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور انی کو نافع، ابن کثیر اور ابن عمرو نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور دوسروں نے سکون کیساتھ پڑھا ہے۔

وَ اَنَّ عَذَابِیْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِیْمُ ۝۵۰

”اور (یہ بھی بتا دو کہ) میرا عذاب بھی بہت دردناک عذاب ہے[1]“

[1] ابن مردویہ نے ایک دوسرے طریق سے ایک صحابی رسول اللہ ﷺ سے روایت فرماتے ہیں، فرمایا نبی کریم ﷺ اس دروازے سے ہمارے پاس تشریف لائے جس سے بنو شیبہ داخل ہوتے تھے۔ فرمایا کیا میں تمہیں ہنستے ہوئے نہیں دیکھ رہا تھا۔ پھر آپ تشریف لے گئے، پرآنقری چال سے واپس تشریف لائے اور فرمایا میں نکلا حتی کہ حجر اسود کے پاس پہنچا تو جبرئیل امین آگئے اور کہا اے محمد ﷺ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندوں کو کیوں مایوس کر رہے ہو نبئ عبادی الخ(3)۔ اس کلام کا اسلوب بتاتا ہے کہ یہ آیت کریمہ سابقہ وعدہ اور وعید کا نچوڑ اور نتیجہ ہے۔ مغفرۃ کے ذکر میں دلیل ہے کہ متقین سے مراد شرک سے بچنے والے لوگ ہیں نہ کہ وہ افراد جو ہر قسم کے گناہ کبیرہ اور صغیرہ سے اجتناب کرتے ہیں۔ امام بغوی فرماتے ہیں ہمیں یہ خبر پہنچی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا اگر بندہ اللہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 56 (التجاریۃ)
2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 188 (العلمیۃ)
3۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 189 (العلمیۃ)

تعالیٰ کے عفو کی مقدار جان لے تو وہ حرام سے بھی اجتناب نہ کرے۔ اور اگر اس کے عذاب کی مقدار جان لے تو اس کا سانس نکل جائے(1)۔ امام ترمذی نے سند حسن کے ساتھ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت فرماتے ہیں، فرمایا رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اگر مومن کو اللہ تعالیٰ کی سزا کا پتہ چل جائے تو کوئی بھی جنت کی خواہش نہ کرے گا۔ اگر کافر کو اللہ تعالیٰ کی رحمت کا علم ہو جائے تو وہ بھی جنت سے مایوس نہ ہو(2)۔ صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے رحمت کو تخلیق فرمایا تو سو رحمتیں پیدا فرمائیں۔ پھر ننانوے رحمتوں کو اپنے پاس رکھا اور ایک رحمت کو پوری مخلوق کی طرف بھیجا کہ جو اللہ تعالیٰ کے پاس رحمت اسکے متعلق اگر کافر کو معلوم ہو جائے تو وہ بھی جنت سے مایوس نہ ہو اور اللہ تعالیٰ کے پاس جو عذاب ہے۔ اگر مومن کو اسکا علم ہو جائے تو وہ عذاب سے بے خوف نہ ہو(3)۔ اللہ تعالیٰ کی صفات غفور اور رحیم ذکر کرنے اور تعذیب کی صفات ذکر نہ کرنے میں وعدہ کو وعید پر ترجیح اور وعدہ کی تاکید کا اشارہ ہے۔ امام احمد اور مسلم حضرت سلمان سے اور امام احمد اور ابن ماجہ حضرت سعید الخدری سے اور وہ نبی کریم ﷺ سے روایت فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جس دن آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمایا تو اسی دن سو رحمتوں کو بھی پیدا فرمایا اور ہر رحمت زمین و آسمان کے فاصلہ کے مطابق تھی۔ پھر ان رحمتوں میں سے زمین کو ایک رحمت عطا فرمائی جس کی وجہ سے ماں اپنے بچہ پر قربان ہوتی ہے، وحشی اور پرندے ایک دوسرے پر فریفتہ ہوتے ہیں، اور ننانوے رحمتیں اپنے پاس رکھی ہیں جب قیامت کا دن ہوگا تو اس رحمت کے ساتھ سو کو مکمل فرمادے گا(4)۔

وَنَبِّئْهُمْ عَنْ ضَيْفِ إِبْرٰهِيْمَ ﴿٥١﴾

"اور بتائیے انہیں ابراہیم علیہ السلام کے مہمانوں کا قصہ[1]۔"

[1] اس جملہ کو نبی عبادی پر معطوف کر کے یہ بتایا کہ دنیا میں وعدہ اور وعید کی یقینی ہے جیسا کہ آخرت کے متعلق اس کے یقینی ہونے کا اظہار فرمایا ہے۔ الضیف کا اطلاق واحد، تثنیہ، جمع مذکر اور مونث کے لئے ہوتا ہے اور یہاں مراد وہ فرشتے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو بچے کی بشارت اور قوم لوط کی ہلاکت کی خبر دینے کے لئے بھیجا تھا۔

إِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا ۖ قَالَ إِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُوْنَ ﴿٥٢﴾

"جب وہ آپکے پاس آئے تو انہوں نے کہا آپ پر سلام ہو آپ نے کہا (اے اجنبیو!) ہم تو تم سے خائف ہیں[1]۔"

[1] سلٰماً مصدر ہے اور اس سے پہلے نسلم یا سلمنا فعل محذوف ہے قال کا فاعل ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ وجلون بمعنی خائفون ہے۔ آپ اس لئے خائف ہوئے تھے کہ وہ بغیر اجازت گھر میں داخل ہوئے تھے یا بے وقت آئے تھے یا اس لئے کہ انہوں نے کھانا نہیں کھایا تھا۔ کسی ناپسند بات کی توقع کے وقت نفس میں جو اضطراب پیدا ہوتا ہے اسے وجل کہتے ہیں۔

قَالُوْا لَا تَوْجَلْ إِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ﴿٥٣﴾

"مہمانوں نے کہا مت ڈریئے ہم آپ کو مژدہ سنانے آئے ہیں[1] ایک صاحب علم بچے کی پیدائش کا[2]۔"

[1] مہمانوں نے کہا مت ڈریئے ہم تیرے رب کے فرستادہ ہیں۔ نُبَشِّرُكَ کے الفاظ خوف کی نہی کی علت کی جگہ پر مستقل کلام ہیں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 56 (العلمیہ)
2۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی، جلد 7، صفحہ 55 (العلمیہ)
3۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 958 (قدیمی)
5۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 356 (قدیمی)

کیونکہ بشارت دینے والے سے ڈرانہیں جاتا۔حمزہ نے تخفیف اور نون کے فتحہ کے ساتھ نجر (نجد) نقل سے پڑھا ہے اور باقی قراء نے باب تفعیل کے ساتھ پڑھا ہے۔

۲؎ غلام سے مراد اسحٰق علیہ السلام ہیں کیونکہ ارشاد ہے فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ ۔ یعنی وہ بچہ جب بڑا ہوگا تو صاحب علم ہوگا۔حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس خوشخبری پر تعجب اس لئے ہوا کہ آپ بھی بوڑھے تھے اور آپ کی زوجہ محترمہ بھی بوڑھی تھی۔

قَالَ اَبَشَّرْتُمُوْنِیْ عَلٰۤی اَنْ مَّسَّنِیَ الْكِبَرُ فَبِمَ تُبَشِّرُوْنَ ﴿۵۴﴾

''آپ نے کہا کیا تم مجھے اس وقت خوشخبری دینے آئے ہو جبکہ مجھے بڑھاپا لاحق ہو چکا ہے پس یہ کیسی خوشخبری ہے ۱؎ ''

۱؎ یعنی کیا تم مجھے اس وقت خوشخبری دینے آئے ہو جب مجھے بڑھاپا لاحق ہو چکا ہے۔ایسی حالت میں بشارت دینے پر آپ کا استفہام انکاری ہے۔یہ کیسی خوشخبری دے رہے ہو کیونکہ اسی چیز کی بشارت جس کا وقوع عادۃً متصور نہ ہو وہ بشارت تو ہے مگر بغیر کسی دلیل کے۔ پورے قرآن میں ابن کثیر نے تُبَشِّرُوْنَ کو نون کے کسرہ اور تشدید کے ساتھ پڑھا ہے یعنی نون جمع کو نون وقایہ میں ادغام کر کے پڑھا ہے اور نافع نے نون مکسور مخففہ کے ساتھ پڑھا ہے۔دو ایک جیسے حروف کے ثقل کی وجہ سے نون جمع کو حذف کر دیا ہے اور نون وقایہ مکسورہ کی پر دلالت کر رہا ہے اور باقی قراء نے نون کے فتحہ اور نون کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔

قَالُوْا بَشَّرْنٰكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِیْنَ ﴿۵۵﴾

''وہ بولے ہم نے آپ کو سچی خوشخبری دی ۱؎ ہو جایئے آپ مایوس ہونے والوں سے ۲؎ ''

۱؎ ملائکہ نے کہا ہم تجھے سچ کے ساتھ یا یقین کے ساتھ یا ایسے طریقہ کے ساتھ جو حق ہے کے ساتھ خوشخبری دینے والے ہیں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے امره الذی لا راد لقضائه اس کا امر وہ ہے جس کے فیصلے کا کوئی رد کرنے والا نہیں۔

۲؎ مایوس ہونے والوں سے نہ ہو جایئے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ قادر ہے کہ بغیر والدین کے انسان کی تخلیق فرمادے تو بوڑھے اور بوڑھی بانجھ سے کیوں پیدا نہیں فرما سکتا۔حضرت ابراہیم کا استعجاب عادت کے اعتبار سے تھا قدرت الٰہی کے اعتبار سے نہیں تھا۔

قَالَ وَمَنْ یَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖۤ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ ﴿۵۶﴾

''آپ نے فرمایا کون ناامید ہوتا ہے اپنے رب کی رحمت سے ۱؎ بجز گمراہوں کے ۲؎ ''

۱؎ ابوعمرو،الکسائی اور یعقوب نے یہاں بھی اور سورۃ الروم میں بھی یقنطون اور سورۂ زمر میں لا تقنطوا یعنی تینوں الفاظ میں نون کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے،جبکہ باقی قراء نے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

۲؎ الضَّآلُّوْنَ سے مراد معرفت کے راستہ سے خطا کرنے والے ہیں،وہ اللہ کی رحمت کی وسعت اور اس کے کمال علم وقدرت کی معرفت نہیں رکھتے۔اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہونا گناہ کبیرہ ہے جیسا کہ اس کے عذاب سے امن میں ہونا گناہ کبیرہ ہے۔

قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَیُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۵۷﴾

''آپ نے کہا اے فرستادو! کس اہم کام کے لئے تم آئے ہو ۱؎ ''

۱؎ حضرت ابراہیم نے کہا اس بشارت کے سوا تمہارا اور کام کیا کام ہے! حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سمجھا کہ مقصود صرف بشارت

نہیں ہے کیونکہ فرشتے متعدد تھے اور بشارت کے لئے متعدد اشخاص کے ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اسی وجہ سے حضرت زکریا اور حضرت مریم علی نبینا وعلیہما السلام کی بشارتوں میں ایک فرشتے پر اکتفا کیا گیا یا آپ نے یہ خیال فرمایا کہ انہوں نے بشارت تو خوف دور کرنے کے لئے دی تھی اور پھر اگر بشارت مقصود ہوتی تو گفتگو کی ابتداء بشارت سے فرماتے۔

قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ﴿۵۸﴾

"انہوں نے کہا ہم بھیجے گئے ہیں ایک مجرم قوم کی طرف ۱؎"

۱؎ مجرمین سے مراد قوم لوط کے مشرکین ہیں۔

اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ ؕ اِنَّا لَمُنَجُّوْهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۵۹﴾

"مگر لوط کے گھر والے ہم ان سب کو بچالیں گے ۱؎"

۱؎ آل لوط سے مراد آپ کے متبعین اور آپ کے دین کو تسلیم کرنے والے ہیں۔ اگر استثناء قوم سے ہو تو استثناء منقطع ہوگی کیونکہ قوم جرم کرنے کے ساتھ مقید ہے اور اگر استثناء مجرمین کی ضمیر سے ہو تو استثناء متصل ہوگی۔ قوم اور ارسال مجرمین کو شامل ہیں اور معنی یہ ہوگا کہ ہم تمام مجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں مگر ان میں سے آل لوط اس حکم میں شامل نہیں تاکہ ہم مجرموں کو ہلاک کردیں اور آل لوط کو بچالیں۔ اور اسی ترکیب و معنی پر اِنَّا لَمُنَجُّوْهُمْ کا ارشاد دلالت کرتا ہے یعنی جس عذاب میں دوسری قوم کو مبتلا کیا گیا ہے اس سے آل لوط کو ہم بچانے والے ہیں۔ حمزہ اور کسائی نے منجوھم کو تخفیف کے ساتھ اور باقی قراء نے تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور یہ جملہ مستثنیٰ متصل کی تقدیر پر جملہ مستانفہ ہے اور مستثنیٰ منقطع کی تقدیر لکن کی خبر کے قائم مقام ہے۔ اسی ترکیب کی بناء پر الا امراتہ کو آل لوط سے یا منجوھم کی ضمیر منصوب سے مستثنیٰ بنانا جائز ہے اور مستثنیٰ منفصل کی تقدیر پر اس کی استثناء ضمیر سے ہی ہوگی کیونکہ دونوں حکموں میں اختلاف ہے۔

اِلَّا امْرَاَتَهٗ قَدَّرْنَآ ۙ اِنَّهَا لَمِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۶۰﴾

"بجز اس کی بیوی کے ہم نے (بامرالٰہی) یہ طے کیا ہے ۱؎ کہ وہ پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہوگی ۲؎"

۱؎ قَدَّرْنَآ کو ابوبکر نے یہاں بھی اور سورۃ النحل میں دال کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے دال کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔

۲؎ یعنی وہ کافروں کے ساتھ عذاب میں مبتلا ہوگی قدر فعل کو معلق فرمایا ہے حالانکہ تعلیق افعال قلوب کے خواص میں سے ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ قدر میں علم کا معنی ضمناً پایا جاتا ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ قدرنا، قلنا کے قائم مقام ہو۔ کیونکہ تقدیر بمعنی قضاء قول ہے اور اس کا اصل معنی کسی چیز کو اس کی غیر کی مقدار پر کرنا ہے اور یہاں تقدیر کے فعل کی نسبت فرشتوں نے اپنی طرف کی ہے حالانکہ یہ حقیقتاً فعل اللہ تعالیٰ کا ہے۔ اس کا جواب ہے کہ انہیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ قرب اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ اختصاص ہے۔ اس لئے انہوں نے اپنی طرف نسبت کردی یا اس لئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے تھے اور ان کی کلام سعادت کے طور پر تھی اور اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب تھی۔

فَلَمَّا جَآءَ اٰلَ لُوْطِ ِۨ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۶۱﴾ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ﴿۶۲﴾

"پس جب آئے خاندان لوط کے پاس یہ فرستادے آپ نے (انہیں دیکھ کر کہا) تم تو اجنبی لوگ معلوم ہوتے ۱؎"

ل حضرت لوط علیہ السلام نے فرمایا تم مجھے عجیب محسوس ہو رہے ہو کیونکہ تم پر نہ تو کوئی سفر کے آثار ہیں اور نہ تم اس دیہات کے باسی ہو مجھے تم سے کسی مکروہ امر کے پہنچنے کا اندیشہ ہو رہا ہے۔

قَالُوْا بَلْ جِئْنٰكَ بِمَا كَانُوْا فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ﴿۶۳﴾

''فرشتوں نے کہا (ہم اجنبی نہیں) بلکہ ہم لے آئے ہیں تمہارے پاس وہ چیز جس میں وہ شک کیا کرتے تھے ل''

ل فرشتوں نے کہا ہم ایسی چیز نہیں لائے جس کی وجہ سے تم ہمیں ناپسند کرو بلکہ ہم ایسی چیز لائے ہیں جو تمہیں خوشی و مسرت عطا کرے گی اور تجھے تیرے دشمنوں سے خلاصی دے گی اور وہ ہے عذاب جس سے تم اپنے قوم کو ڈراتے تھے اور وہ تمہارے اس بیان کے متعلق شک کرتی تھی۔

وَاَتَيْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۶۴﴾

''اور ہم لے آئے ہیں آپ کے پاس حق (عذاب) اور ہم بلاشبہ سچ کہہ رہے ہیں ل''

ل ہم یقیناً ان کا عذاب لے کر آئے ہیں، یا یہ معنی کہ ہم وہ عذاب لے کر آئے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے علم میں محقق تھا۔ اور ہم نے جو آپ کو خبر دی ہے اس میں ہم سچے ہیں۔

فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَاتَّبِعْ اَدْبَارَهُمْ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ وَّامْضُوْا حَيْثُ تُؤْمَرُوْنَ ﴿۶۵﴾

''تو چلے جایئے اپنے اہل خانہ کے ساتھ رات کے کسی حصہ میں اور خود ان کے پیچھے پیچھے چلئے ل اور پیچھے مڑ کر نہ دیکھے تم میں سے کوئی ۲ اور چلے جایئے جہاں (جانے کا) تمہیں حکم دیا گیا ہے ۳''

ل نافع اور ابن کثیر نے فاسر یعنی ہمزہ وصلی کے ساتھ السری سے مشتق کر کے پڑھا ہے اور مجرد و مزید فیہ کا معنی ایک ہی ہے۔ **بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ** سے بعض علماء نے رات کا آخری حصہ مراد لیا ہے۔

۲ یعنی کوئی تم میں سے پیچھے نہ دیکھے ورنہ ایسا ہولناک منظر دیکھے گا کہ اس کو برداشت بھی نہ کر سکے گا، یا یہ معنی کہ تا کہ اس عذاب کو نہ دیکھے جو ان کی قوم پر نازل ہو رہا ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کے لئے ان کے دل پسیج جائیں اور پھر ان کو بھی ایسا عذاب لاحق ہو جو ان کافروں کو پہنچا ہو۔ یا یہ مطلب کہ کوئی تم میں سے کسی غرض سے بھی پیچھے نہ رہ جائے کہ ورنہ اسے بھی عذاب لاحق ہو جائے گا۔ بعض علماء کہتے ہیں ان کو پیچھے دیکھنے سے اس لئے منع کیا گیا تا کہ وہ ہجرت سے دل لگالیں۔ یا التفات سے بھی متواتر چلنے اور سستی اور توقف کے ترک کرنے سے کنایہ ہے کیونکہ جو پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے اسے ضرور تھوڑا سا توقف کرنا پڑتا ہے۔

۳ یعنی تم وہاں چلے جاؤ جہاں اللہ تعالیٰ نے جانے کا حکم دیا ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے انہیں شام جانے کا حکم دیا تھا۔ مقاتل فرماتے ہیں زغر اور بعض فرماتے ہیں اردن جانے کا حکم تھا(1)۔

وَقَضَيْنَآ اِلَيْهِ ذٰلِكَ الْاَمْرَ اَنَّ دَابِرَ هٰٓؤُلَآءِ مَقْطُوْعٌ مُّصْبِحِيْنَ ﴿۶۶﴾

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 58 (التجاریہ)

اور ہم نے فیصلہ کر دیا (بذریعہ وحی) لوط کو اس امر سے کہ یقیناً ان کی جڑ کاٹ دی جائے گی جب وہ صبح کر رہے ہوں گے ؎۱"

؎۱ یعنی ہم لوط علیہ السلام کو اپنے فیصلہ سے وحی کے ذریعے مطلع فرمایا (قضٰی میں وحی کا معنی متضمن تھا اس لئے الی کے ساتھ متعدی کیا گیا) اور یہ امر مبہم تھا۔ اس کی تفسیر آئندہ کلام ہے۔ دابر کا معنی اصل ہے اور ان کا محل منصوب ہے کیونکہ یہ ذالک الامر سے بدل ہے اور اس میں اس امر کی تفخیم ہے۔ معنی یہ ہے کہ ہم ان کی اصل ہی ختم کر دیں گے کوئی ایک بھی نہیں بچے گا۔ مصبحین ھؤلاء یا مقطوع کی ضمیر سے حال ہے اور اس کا جمع ہونا معنی کے اعتبار سے ہے کیونکہ دابر ھؤلاء کا معنی مدبری ھؤلاء ہے۔

وَجَآءَ اَهْلُ الْمَدِیْنَةِ یَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۶۷﴾

"اور (اتنے میں) آ گئے شہر والے خوشیاں مناتے ہوئے ؎۱"

؎۱ مدینہ سے مراد سدوم ہے۔ وہ ایک دوسرے کو بشارت دیتے ہوئے آئے کہ لوط علیہ السلام کے مہمان آئے ہیں۔ ان سے فحش حرکات کریں گے کیونکہ فرشتے خوبصورت لڑکوں کی شکلوں میں آئے تھے۔

قَالَ اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ ضَیْفِیْ فَلَا تَفْضَحُوْنِ ﴿۶۸﴾

"آپ نے (انہیں) کہا (ظالمو!) یہ تو میرے مہمان ہیں انکے بارے میں تو مجھے شرمسار نہ کرو ؎۱۔"

؎۱ لوط علیہ السلام نے یہ اس لئے فرمایا کیونکہ مہمان کی شرمساری میزبان کی شرمساری ہوتی ہے۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ ﴿۶۹﴾

"اور ڈرو اللہ (کے غضب) سے اور مجھے رسوا نہ کرو ؎۱"

؎۱ یعنی بدکاری کے ارتکاب سے اللہ سے ڈرو۔ وَلَا تُخْزُوْنِ کو یعقوب نے لا تفضحونی اور ولا تخزونی یعنی یاء کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے یاء کو حذف کر کے پڑھا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی وجہ سے میری تذلیل نہ کرو، یا یہ معنی کہ مجھے رسوا نہ کرو۔ پہلی صورت میں خزی سے مشتق ہوگا جس کا معنی ذلت ہے اور دوسری صورت میں الخزایۃ سے مشتق ہوگا جس کا معنی حیا ہے۔

قَالُوْۤا اَوَلَمْ نَنْهَكَ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۷۰﴾

"وہ بولے کیا ہم نے تمہیں منع نہیں کیا تھا کہ دوسروں کے معاملہ میں دخل نہ دیا کرو ؎۱"

؎۱ یہ محذوف کلام پر معطوف ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہوگی اَنَتْرُکُ هٰؤُلَآءِ وَلَمْ نَنْهَکَ۔ اور استفہام انکاری ہے۔ اس میں اثبات سے نفی اور نفی سے اثبات مراد ہوتا ہے، یعنی ہم ان کو نہیں چھوڑیں گے جبکہ ہم تجھے بھی منع کرتے ہیں کہ تو کسی کو پناہ دے اور ہمارے اور ان کے درمیان تو حائل ہو جائے۔ آپ کی قوم راہزن بھی تھی اور ہر ایک مسافر کو چھیڑتی بھی تھی اور لوط علیہ السلام انہیں حتی الوسع ان افعال شنیعہ سے منع کرتے تھے۔ یا یہ معنی کہ ہم تجھے لوگوں کی ضیافت سے اور اپنے پاس ان کو ٹھہرانے سے منع کرتے تھے۔ پس اب ہم ان سے بدکاری کا ارتکاب کریں گے۔

قَالَ هٰۤؤُلَآءِ بَنٰتِیْۤ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِیْنَ ﴿۷۱﴾

"آپ نے کہا یہ میری قوم کی بچیاں ہیں اگر تم کچھ کرنا چاہتے ہوتو (ان سے نکاح کرلو) ۱؎۔"

۱؎ نافع نے بناتی کو یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور اس کی تاویل کی وجوہ سورۂ ہود میں گزر چکی ہے۔ یعنی اگر تم اپنی شہوت پوری کرنا چاہتے ہو یا جو میں تمہیں کہتا ہوں وہ کرنا چاہتے ہوتو ان سے نکاح کرلو۔

لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِیْ سَكْرَتِهِمْ یَعْمَهُوْنَ ﴿۷۲﴾

"(اے محبوب) آپ کی زندگی کی قسم ۱؎ یہ (اپنی طاقت کے نشہ میں) مست ہیں اور بہکے بہکے پھر رہے ہیں ۲؎۔"

۱؎ عمر کا لغوی معنی عُمر ہے اور تخفیف کی خاطر قسم کے ساتھ خاص کیا گیا ہے کیونکہ یہ لفظ اکثر لوگوں کی زبانوں پر جاری ہوتا ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں ابوالجوزاء حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت فرماتے ہیں، فرمایا اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ سے زیادہ معزز فرد پیدا ہی نہیں فرمایا اور آپ ﷺ کی زندگی کے علاوہ کسی کی زندگی کی قسم بھی نہیں اٹھائی (1)۔

۲؎ یعنی کفار قریش وہ اپنی شہوات کو پورا کرنے اور صحیح اور غلط کی تمیز نہ کرنے میں منہمک و مدہوش ہیں اور وہ حیران ہیں آپ کی نصیحت کو کیسے سنیں۔ یہ لوط علیہ السلام کے قصہ میں جملہ معترضہ ہے اور بعض علماء فرماتے ہیں یہ ان فرشتوں کا کلام ہے جو حضرت لوط کے مہمان تھے اور وہ حضرت لوط سے خطاب کر رہے ہیں کہ اے لوط تیری عمر کی قسم بیشک آپ کی قوم نشے میں مست ہے اور بہکے بہکے پھر رہی ہے۔

فَاَخَذَتْهُمُ الصَّیْحَةُ مُشْرِقِیْنَ ﴿۷۳﴾

"پس آلیا ان کو ایک سخت کڑک نے جب سورج نکل رہا تھا ۱؎"

۱؎ ایسی کڑک جو انتہائی خوفناک اور ہلاک کرنے والی تھی جس نے انہیں اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ بعض علماء فرماتے ہیں وہ جبرئیل امین کی چیخ تھی۔ وہ سورج کے نکلنے اور روشن ہونے کے وقت عذاب میں داخل ہوئے تھے، گویا عذاب کی ابتدا صبح سے ہوئی تھی اور اس کی تکمیل سورج کے نکلنے کے وقت ہوئی۔

فَجَعَلْنَا عَالِیَهَا سَافِلَهَا وَ اَمْطَرْنَا عَلَیْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّیْلٍ ﴿۷۴﴾

"پس ہم نے ان کی بستی کو زیروزبر کر دیا اور ہم نے برسائے ان پر کھنگر کے پتھر ۱؎"

۱؎ یعنی جو بلند مرتبہ عمارتیں تھیں یا جو بہت مضبوط قلعے تھیں۔ جبرئیل نے انہیں نیچے سے اٹھایا پھر الٹ دیا۔ پھر ہم نے ان پر ایسی مٹی برسائی جو پتھر بن گئی تھی۔ یا وہ پتھر جن پر ان کے نام کندہ تھے۔ یہ اس صورت میں سجل سے مشتق ہوگا۔ اس قصہ کا مزید بیان سورۂ ہود میں گزر چکا ہے فاء جو فَجَعَلْنَا پر ہے وہ دلالت کرتی ہے کہ بستی کے الٹنے اور پتھروں کے برسنے سے پہلے کڑک واقع ہوئی تھی۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِیْنَ ﴿۷۵﴾

"بیشک اس واقعہ میں (عبرت کی) نشانیاں ہیں غور و فکر کرنے والوں کے لئے ۱؎۔"

۱؎ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں متوسمین کا معنی دیکھنے والے ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں فراست رکھنے والے۔ قتادہ فرماتے ہیں عبرت حاصل کرنے والے۔ مقاتل فرماتے ہیں غور و خوض کرنے والے (2)۔ میں کہتا ہوں وسم کا معنی تاثیر ہے اور سمة کا معنی اثر ہے۔ اس اعتبار سے معنی یہ ہوگا اشیاء کے ظواہر اور اثرات کو دیکھنے والے جو ظاہری اثرات سے باطن کی پہچان کر لیتے ہیں۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 58 (التجاریہ) — 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 58 (التجاریہ)

وَاِنَّهَا لَبِسَبِيۡلٍ مُّقِيۡمٍ ۝

''اور بیشک یہ بستی ایک آباد راستہ پر واقع ہے لے''

لے یعنی لوط علیہ السلام کا شہر اس راستہ پر واقع ہے جو واضح اور آباد ہے، جس پر لوگ اب بھی رواں دواں ہیں اور اس بستی کے آثار دیکھتے ہیں۔ مقیم ایسی چیز جس کے آثار مٹے نہ ہوں۔

اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلۡمُؤۡمِنِيۡنَ ۝

''یقیناً اس میں نشانی ہے اہل ایمان کے لئے لے''

لے اس بیان میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لاتے ہیں اور یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ یہ بیان اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔

وَاِنۡ كَانَ اَصۡحٰبُ الۡاَيۡكَةِ لَظٰلِمِيۡنَ ۝

''اور بے شک ایکہ کے باشندے بھی بڑے ظالم تھے لے''

لے وَاِنۡ۔ یہ اصل میں انه تھا۔ ایکہ گھنے درختوں والی بستی کو کہتے ہیں۔ یہ شعیب علیہ السلام کی قوم کی بستی کا نام ہے۔ آپ کی قوم گھنے جنگلوں میں رہتی تھی اور ان کے عام درخت گنگل کے تھے۔ اور لَظٰلِمِيۡنَ پر لام ظلموا انفسهم کی تاکید کے لئے ہے اور انہوں نے اپنے نفسوں کو آگ کے لئے پیش کیا کیونکہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کا انکار کیا اور حضرت شعیب علیہ السلام کی تکذیب کی۔

فَانۡتَقَمۡنَا مِنۡهُمۡ‌ۘ وَاِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِيۡنٍ ۝

''پس ہم نے ان سے بھی انتقام لیا لے اور یہ دونوں بستیاں ۲ کھلی شاہراہ پر واقع ہیں ۳''

لے اللہ تعالیٰ نے ان پر سات دن گرمی کو مسلط فرما دیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے بادل بھیجا تو وہ اس کے نیچے پناہ لینے گئے تاکہ سکون حاصل کریں تو اللہ تعالیٰ نے ان پر آگ نازل فرما دی۔ اس آگ نے انہیں جلا کر راکھ کر دیا عذاب یوم الظلة سے یہی عذاب مراد ہے۔

۲ هما سے مراد قوم لوط کا شہر سدوم اور ایکہ ہیں۔ بعض فرماتے ہیں ایکہ اور مدین ہیں کیونکہ حضرت شعیب علیہ السلام ان دونوں شہروں کی طرف مبعوث کئے گئے تھے اور دونوں میں ایک کا ذکر دوسرے پر آگاہی دیتا ہے۔

۳ کیا اہل مکہ ان دونوں شہروں سے عبرت حاصل نہیں کرتے۔ امام اسم ہے اس کا معنی وہ چیز ہے جس کی اقتداء کی جائے۔ لوح محفوظ اور معمار کے دھاگہ کو اور راستہ کو بھی امام کہا جاتا ہے کیونکہ ان تمام سے راہنمائی حاصل کی جاتی ہے۔

وَلَقَدۡ كَذَّبَ اَصۡحٰبُ الۡحِجۡرِ الۡمُرۡسَلِيۡنَ ۝

''بیشک جھٹلایا اہل حجر نے (اللہ تعالیٰ کے) رسولوں کو لے''

لے اَصۡحٰبُ الۡحِجۡرِ سے مراد قوم ثمود ہے اور حجر، مدینہ اور شام کے درمیان وادی ہے اور مرسلین سے مراد صالح علیہ السلام اور وہ تمام رسول ہیں جن کی گواہی صالح علیہ السلام نے دی تھی۔

وَاٰتَيۡنٰهُمۡ اٰيٰتِنَا فَكَانُوۡا عَنۡهَا مُعۡرِضِيۡنَ ۝

"اور ہم نے عطا کیں انہیں اپنی نشانیاں مگر وہ ان سے روگردانی ہی کرتے رہے۔ ۱؎"

۱؎ اس کتاب کی آیات جو ان کے نبی علیہ السلام پر نازل کی گئی تھی۔ یا آیات سے مراد معجزات ہیں جیسے اونٹنی اور اس کے بچہ کا پیدا ہونا اس کا کثیر دودھ اور اس کا تمام پانی پی جانا وہ ان تمام نشانیوں سے روگردانی ہی کرتے رہے۔

وَكَانُوا يَنْحِتُونَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا آمِنِينَ ﴿٨٢﴾

"اور وہ کھود کر بنایا کرتے تھے پہاڑوں کو اپنے گھر (اور) وہ بے خوف وخطر رہا کرتے تھے ۱؎"

۱؎ انہیں اپنی پختہ عمارتوں اور بلند و بالا بلڈنگوں کے گرنے کا اور چوروں کی نقب زنی کا اور دشمنوں کی تخریب کاری کا کوئی خوف نہ تھا کیونکہ ان کی وہ عمارتیں بڑی مضبوط تھیں۔ یا یہ مطلب کہ وہ اپنی غفلت اور پہاڑوں کی حفاظت کے گمان کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بے خوف تھے۔

فَأَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُصْبِحِينَ ﴿٨٣﴾

"پس پکڑ لیا انہیں ایک خوفناک چنگھاڑ نے جب وہ صبح اٹھ رہے تھے ۱؎"

۱؎ صیحہ سے مراد عذاب کی کڑک ہے۔ مصبحین حال ہے ھم ضمیر سے یعنی جب وہ صبح کے وقت میں داخل ہو رہے تھے اس وقت پکڑ لیا انہیں سخت کڑک نے۔

فَمَا أَغْنَىٰ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿٨٤﴾

"پس فائدہ نہ پہنچایا انہیں اس (مال) نے جو وہ کمایا کرتے تھے ۱؎"

۱؎ وہ پختہ مکانات اور اموال کی کثرت اور نفری کی زیادتی میں سے کوئی چیز بھی عذاب الٰہی کو ان سے دور نہ کر سکی۔ سورۂ توبہ میں غزوۂ تبوک کے قصہ میں ہم نے ذکر کیا ہے کہ آپ ﷺ حجر کے علاقہ سے گزرے تو فرمایا ان لوگوں کے مکانوں میں جب تم داخل ہو جنہوں نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا تھا۔ روتے ہوئے داخل ہوا ایسا نہ ہو کہ وہی عذاب تم پر بھی نازل ہو۔ آپ ﷺ نے اپنی چادر سے پردہ فرمالیا اور آں حالیکہ آپ سواری پر تھے۔ آپ نے جلدی سے اپنی سواری کو وادی سے گزارا۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ ۗ وَإِنَّ السَّاعَةَ لَآتِيَةٌ ۖ فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيلَ ﴿٨٥﴾

"اور نہیں پیدا فرمایا ہم نے آسمانوں اور زمین کو نیز جو کچھ ان کے درمیان ہے مگر حق کے ساتھ ۱؎ اور بیشک قیامت آنے ہی والی ہے ۲؎ (اے حبیب ﷺ) آپ درگزر فرمایا کیجئے ان سے عمدگی کے ساتھ ۳؎"

۱؎ ہم نے زمین و آسمان اور ان کے اندر گونا گوں اشیاء کو حق کے ساتھ پیدا فرمایا ہے تا کہ اپنے صانع کے وجود اور اس کی صفات پر روشن دلیل بن جائیں اور منکرین پر حجت ہو جائیں اور ان کے ہر عذر و بہانے کو زائل اور دور کرنے والی ہو جائیں۔ یا یہ معنی کہ اس کارخانہ قدرت کو اس نہج پر بنایا گیا ہے کہ اس میں حق اور سچ ہی باقی رہ سکتا ہے، فساد اور شر کو اس میں دوام کبھی نہیں مل سکتا۔ پس حکمت الٰہیہ ان منکروں کو ہلاک کرنے اور زمین میں ان کے شر و فساد کو زائل کرنے کا تقاضا کرتی ہے۔

۲؎ قیامت یقیناً آنے والی ہے اور اللہ تعالیٰ مشرکوں اور نبیوں کے منکروں سے ضرور انتقام لے گا۔

۳؎ یعنی ان سے اعراض فرمائیے اور ان سے انتقام لینے میں جلدی نہ فرمائیے۔

إِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلَّاقُ الْعَلِيمُ ﴿۸۶﴾

"بیشک آپ کا رب ہی سب کا خالق (اور) سب کچھ جاننے والا ہے ۱؎"

۱؎ یعنی تیرا رب وہ ہے جس نے تجھے بھی پیدا فرمایا اور تمہارے دشمنوں کو بھی پیدا فرمایا اور تمام معاملات اسی کے دست قدرت میں ہیں۔ اور وہ محسن اور مجرم کو خوب جانتا ہے ان میں سے ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق جزاء عطا فرمائے گا یا یہ معنی کہ وہ تمہاری حالت کو بھی جانتا ہے اور ان کی کیفیت کو بھی جانتا ہے، وہ ہی اس لائق ہے کہ تم اپنے معاملات میں اس پر بھروسہ کرو۔ یا یہ معنی کہ وہ وہی ہے جس نے تمہیں پیدا فرمایا اور تمہیں ان اخلاق حمیدہ کی تعلیم دی جو تمہارے لئے بہتر تھے اور آج درگزر کرنا اور معاف کرنا ہی مناسب ہے۔

وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ ﴿۸۷﴾

"اور بیشک ہم نے عطا فرمائی ہیں آپ کو سات آیتیں جو بار بار پڑھی جاتی ہیں ۱؎ اور قرآن عظیم بھی ۲؎"

۱؎ مثانی جمع ہے مثناة کی جو اسم ظرف ہے۔ یا مثنیہ اسم فاعل کی جمع ہے اور یہ آیات یا سور کی صفت ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت عمر، حضرت علی اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہم کے نزدیک سبع مثانی سے مراد سورۂ فاتحہ کی سات آیات ہیں۔ حضرت قتادہ، عطاء، حسن، سعید بن جبیر کا بھی یہی قول ہے (1)۔ امام بخاری نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ام القرآن یہی سات آیتیں ہیں اور قرآن عظیم ہیں (2)۔ سورۂ فاتحہ کو سبع مثانی کہنے کی کئی وجوہ بیان کی گئی ہیں۔ ابن عباسؓ، قتادہ اور حسن نے فرمایا یہ نماز میں دہرائی جاتی ہے اور ہر رکعت میں پڑھی جاتی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا یہ اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان نصف نصف تقسیم ہے۔ اس کا نصف ثناء ہے اور نصف دعا ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے روایت فرماتے ہیں آپ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان نصف نصف تقسیم کر دیا ہے۔ یہ حدیث سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔ الحسین بن الفضل فرماتے ہیں سورۂ فاتحہ کو مثانی کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ دو مرتبہ نازل ہوئی۔ ایک مرتبہ مکہ میں اور ایک مرتبہ مدینہ طیبہ میں اور ہر مرتبہ اس کے ساتھ ستر ہزار فرشتے آئے۔ مجاہد نے اس کی وجہ تسمیہ یہ بیان فرمائی کہ اللہ تعالیٰ نے اس سورت کو اس امت کے لئے ذخیرہ فرمایا اور اسی امت کے لئے اس کو مستثنیٰ فرمایا۔ کسی دوسری امت کو یہ سورۂ مبارکہ عطا نہیں فرمائی۔ ابو زید البلخی فرماتے ہیں اس کو مثانی کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ اہل شر کو فسق سے پھیر دیتی ہے۔ اور یہ عربوں کے قول ثنیت عنانی سے مشتق ہے (3)۔ بعض علماء فرماتے ہیں مثانی کہنے کی وجہ یہ ہے اس میں اللہ تعالیٰ کی صفات عظیمہ کی ثناء ہے۔ حضرت سعید بن جبیر حضرت ابن عباسؓ سے روایت فرماتے ہیں، فرمایا سبع سے مراد سات سورتیں ہیں اور مثانی بیان کے لئے ہے اور مثانی یا تو تثنیہ سے ہے۔ ان کی قرأت کے تکرار یا الفاظ کے تکرار یا قصص و مواعظ کے تکرار کی وجہ سے انہیں مثانی کہا جاتا ہے۔ فرمایا یہ سبع طوال ہیں ان میں سے پہلی سورۃ بقرہ ہے اور آخری سورۃ الانفال مع التوبہ ہے کیونکہ سورۃ الانفال اور توبہ ایک سورت کے حکم میں ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے درمیان بسم اللہ شریف بھی نہیں لکھی جاتی۔ بعض علماء فرماتے ہیں ساتویں صورت سورۂ توبہ ہے اور بعض فرماتے ہیں سورۂ یونس

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 60 (التجاریہ) 2۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 683 (... تعلیم) 3۔ تفسیر [illegible]

ہے ابن عباسؓ فرماتے ہیں سبع طوال کو مثانی اس لئے کہا جاتا ہے کہ فرائض حدود، امثال، خیر وشر اور عبرتوں کا بار بار ذکر آتا ہے(1)۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ ثناء سے مشتق ہے کیونکہ بلاغت وفصاحت کے اعتبار سے اس کی تعریف کی گئی ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کی اسماء وصفات کے ساتھ ایسی تعریف بیان کی گئی ہے جسکا وہ اہل ہے۔ محمد بن نصر حضرت انسؓ سے روایت فرماتے ہیں، فرمایا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے مجھے تورات کی جگہ سبع طوال عطا فرمائی ہیں اور انجیل کی جگہ الر اور طس والی سورتیں عطا فرمائی ہیں اور زبور کی جگہ طس اور حوامیم کے درمیان کی سورتیں ہیں۔ اور مجھے حامیم اور مفصل سورتوں کے ساتھ فضیلت عطا فرمائی جن کو مجھ سے پہلے کسی نبی نے نہیں پڑھا۔ حضرت سعید بن جبیر حضرت ابن عباسؓ سے روایت فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کو سبع طوال عطا کی گئیں اور موسیٰ علیہ السلام کو چھ عطا کی گئیں جب آپ نے وہ تختیاں پھینک دیں تو دو اٹھالی گئیں اور چار باقی رہ گئیں(2)۔ بعض علماء فرماتے ہیں سبع سے مراد حم والی سات سورتیں ہیں۔ امام بغوی نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ثوبان سے روایت فرمایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے مجھے تورات کی جگہ سبع طوال عطا فرمائی ہیں اور مجھے انجیل کی جگہ مئین (سو آیتوں والی) عطا فرمائیں اور زبور کی جگہ مثانی عطا فرمائیں اور میرے رب نے مجھے مفصل کے ساتھ فضیلت عطا فرمائی(3)۔

طاؤس فرماتے ہیں مثانی سے مراد پورا قرآن ہے اس کی دلیل یہ ارشاد ہے اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِیْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِیَ۔ یہاں قرآن کو مثانی کہا گیا ہے کیونکہ اس میں خبریں اور واقعات دوہرائے گئے ہیں(4)۔ اس صورت میں من تبعیضیہ ہوگا اور سبع سے مراد سات سورتیں ہوں گی۔ بعض فرماتے ہیں سب سے مراد قرآن کے سات اجزاء ہیں (یعنی سات حصے ہیں) اور مثانی سے پورا قرآن مراد ہے۔

ے اور والقرآن العظیم کا عطف اختلاف صفات کی بناء پر ہے اور سابقہ تمام تاویلات کے اعتبار سے القرآن العظیم کا عطف کل کا بعض پر عطف یا عام کا خاص پر عطف کی مانند ہے۔

لَا تَمُدَّنَّ عَیْنَیْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَ لَا تَحْزَنْ عَلَیْهِمْ وَ اخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۸۸﴾

”اپنی آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھئے ان (اموال) کی طرف جن سے ہم نے لطف اندوز کیا ہے ان کے مختلف طبقوں کو اور رنجیدہ خاطر بھی نہ ہوں ان (کی گمراہی) پر جھکیئے اپنے پروں کو مومنوں کے لئے“

اے پیارے محمد ﷺ رغبت وخواہش کرتے ہوئے اپنی نظر کو نہ اٹھائیے۔ اس دنیوی مال ومتاع کی طرف جس سے انہیں ہم نے لطف اندوز کیا ہے کفار کے مختلف طبقوں کو۔ کیونکہ یہ دنیوی مال ومتاع، قرآن حکیم جیسی عظیم نعمت کے مقابلہ میں (جو آپ کو عطا کی گئی ہے) یہ بہت حقیر اور گھٹیا ہے۔ اسحاق بن راہویہ نے اپنی مسند میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کی حدیث روایت کی ہے، فرمایا جس کو قرآن حکیم کی نعمت عظمیٰ عطا کی گئی۔ پھر اس نے کسی دنیادار کو اپنے سے افضل دیکھا تو اس نے بڑی نعمت کو چھوٹا اور چھوٹی کو بڑا بنا دیا(5)۔ امام بغوی فرماتے ہیں سفیان بن عیینہ حضور نبی کریم ﷺ کے ارشاد ولم یتغن بالقرآن کی تاویل لم یستغن یہ سے فرماتے یعنی جو قرآن کی نعمت پا کر تمام دنیا سے مستغنی نہ ہو جائے (وہ ہم میں سے نہیں ہے)(6)۔ اس حدیث کو امام بخاری نے حضرت ابوہریرۃ

1_ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 60 (التجاریہ) | 2_ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 60 (التجاریہ) | 3_ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 60 (التجاریہ)
4_ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 60 (التجاریہ) | 5_ تفسیر [illegible]، صفحہ 350 [illegible] | 6_ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 61 (التجاریہ)

سے امام احمد، ابوداؤد، ابن حبان اور حاکم نے سعد سے اور ابوداؤد نے ابی لبابہ عن عبدالمنذر سے حاکم نے ابن عباس اور حضرت عائشہ سے روایت کی ہے۔ امام بیہقی نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کسی فاجر کی نعمت پر رشک نہ کرو بیشک اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کا قاتل موجود ہے جو کبھی نہ مرے گا(1)۔ امام بغوی نے جو الفاظ روایت کئے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ کسی فاجر کی نعمت پر رشک نہ کرو تجھے معلوم نہیں جو اسے مرنے کے بعد (عذاب) ملنے والا ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کا قاتل موجود ہے جو کبھی نہیں مرے گا۔ یہ حدیث حضرت وہب بن منبہ کو پہنچی تو انہوں نے ابوداؤد اعور کو بھیج کر پوچھا قاتل جو کبھی نہ مرے گا اس کا کیا مطلب ہے عبداللہ بن مریم نے فرمایا النار (یعنی آگ)۔ امام احمد، مسلم ترمذی، ابن ماجہ اور بغوی نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنے سے کمتر کو دیکھو، اپنے سے بلند تر کو نہ دیکھو۔ یہ زیادہ بہتر ہے تاکہ تم پر اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں ان کو حقیر نہ سمجھو(2)۔

ے کفار کے ایمان نہ لانے پر غمزدہ نہ ہو۔ یا یہ معنی کہ دنیا میں کافروں کی طرح دنیوی مال و متاع نہ ملنے پر غم نہ کیجئے۔

ے اپنے غلاموں کے لئے نرمی فرمایئے اور ان پر شفقت کیجئے اور ان پر رحم فرمایئے۔

وَقُلْ إِنِّيٓ أَنَا النَّذِيرُ الْمُبِينُ ﴿٨٩﴾

"اور فرمایئے کہ میں تو بلاشبہ (ایسے عذاب سے) کھلا ڈرانے والا ہوں ؎"

؎ ان کو نافع، ابن کثیر اور ابوعمرو نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے سکون کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی میں تمہیں بیان و برہان دونوں کے ساتھ ڈراتا ہوں کہ اگر تم ایمان نہ لائے تو تم پر عذاب نازل ہوگا۔

كَمَآ أَنزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِينَ ﴿٩٠﴾

"جیسے ہم نے اتارا ؎ ان بانٹنے والوں پر ؎"

؎ كَمَآ أَنزَلْنَا میں ک بمعنی مثل ہے اور ترکیب نحوی کے اعتبار سے نذیر کے مفعول محذوف کی صفت ہے۔ موصوف کو حذف کر کے صفت کو اس کے قائم مقام رکھا ہے۔

؎ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت ابن عباسؓ سے حکایت کیا گیا ہے کہ الْمُقْتَسِمِينَ سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں(3)۔

الَّذِينَ جَعَلُوا الْقُرْآنَ عِضِينَ ﴿٩١﴾

"جنہوں نے کر دیا تھا قرآن کو پارہ پارہ ؎"

؎ طبرانی نے الاوسط میں ابن عباس سے روایت کیا ہے، فرمایا ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا حضور قرآن حکیم میں الْمُقْتَسِمِينَ سے کون مراد ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا یہود و نصاریٰ۔ پھر پوچھا ان کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے سے کیا مراد ہے؟ فرمایا وہ بعض پر ایمان لاتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں۔ عضة بروزن عدہ کی جمع عضین ہے جس کا معنی گروہ اور ٹکڑا ہے۔ قاموس میں اسی طرح لکھا ہے۔ اس کی اصل عضوة بروزن فعلہ ہے اور یہ عضى الشاة سے مشتق ہے جس کا معنی ہے اس نے بکری کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ یہود و نصاریٰ نے بھی قرآن کو حق و باطل میں تقسیم کر رکھا تھا۔ انہوں نے اس کے اجزاء بنا رکھے تھے، بعض کی تصدیق

1۔ شعب الایمان، جلد 4، صفحہ 129 (العلمیۃ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 61 (التجاریۃ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ [illegible]

کرتے اور کہتے یہ حق ہے اورتورات اور انجیل سے موافق ہے۔ بعض کو جھٹلاتے اور کہتے یہ باطل ہے اورتورات وانجیل کے مخالف ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں وہ قرآن کا مذاق اڑاتے تھے۔ ایک کہتا سورۂ بقرہ میرے لئے ہے، دوسرا کہتا سورۂ آل عمران میرے لئے ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں مقتسمین سے مراد یہود ونصاری ہیں اور قرآن سے مراد ان کی اپنی کتابیں ہیں جنہیں وہ پڑھتے تھے۔ یہود و نصاری نے اپنی کتابوں کو تقسیم کر رکھا تھا۔ انہیں پہچانتے تھے لیکن ان پر عمل نہیں کرتے تھے۔ بعض علماء فرماتے ہیں مقتسمون سے مراد وہ قوم ہے جنہوں نے قرآن کو تقسیم کیا تھا۔ بعض کہتے یہ جادو ہے، بعض کہتے یہ شعر ہے، بعض کہتے کہانت ہے، بعض کہتے پہلے لوگوں کے قصے ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں اقتسام کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے بارے ان کی زبانیں مختلف تھیں، وہ کہتے یہ شاعر ساحر اور کاہن ہیں۔ مقاتل فرماتے ہیں مقتسمین سے مراد سولہ آدمی ہیں جنہیں ولید بن مغیرہ نے حج کے دنوں میں مکہ کے مختلف راستوں اور گھاٹیوں پر مقرر کیا تھا جو آنے والے حاجی کو کہتے کہ اس شخص کے فریب میں نہ آنا جو ہم سے خارج ہو گیا ہے اور نبوت کا مدعی ہے۔ ان میں کچھ کہتے یہ مجنون ہے، کچھ کہتے یہ کاہن ہے، کچھ کہتے یہ شاعر ہے اور ولید مسجد کے دروازے پر بیٹھا ہوا تھا۔ انہوں نے ولید کو حکم بنا کر بٹھایا ہوا تھا۔ جب اس سے آپ ﷺ کے متعلق پوچھا جاتا تو کیا ان سب نے ٹھیک کہا ہے (1)۔

مقتسمین سے مراد اگر یہود ہوں تو نازل ہونے والا عذاب بنو قریظہ کے قتل اور بنی نضیر کی جلاوطنی کی صورت میں ظاہر ہوا اور اگر ان سے مراد قریش ہوں تو وہ عذاب مراد ہوگا جو بدر کے دن ان پر نازل ہوا تھا جہاں وہ سب قتل ہو گئے۔ بعض علماء فرماتے ہیں مقتسمین سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے صالح علیہ السلام کو قتل کرنے کی سازش رات کے وقت تیار کی تھی اور اس پر قسمیں اٹھائی تھیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں عضین عضۃ کی جمع ہے، اس کی اصل عضھۃ اس کی ہاء کو ساقط کر دیا ہے جیسے شفہ سے حذف کرتے ہیں اس کی اصل بھی شفھۃ ہے کیونکہ اس کی تصغیر شفیھۃ آتی ہے۔ اور عضھۃ سے مراد کذب اور بہتان ہے قاموس میں ہے العضۃ الکذب یعنی عضۃ کا معنی جھوٹ ہے حدیث بیعت میں ولا یعضہ بعضنا بعضا یعنی ہمارے بعض بعض پر جھوٹ اور بہتان نہیں باندھیں گے۔ ایک اور حدیث میں ہے ایاکم والعضۃ یعنی جھوٹ سے بچو زمخشری کہتے ہیں اس کی اصل فعلۃ کے وزن پر ہے اور یہ عضھۃ سے ہے جس کا معنی البھت ہے اس کا لام کلمہ حذف کیا گیا ہے جیسے سنۃ اور شفۃ سے حذف کیا گیا ہے (2)۔ نہایۃ للجزری میں اسی طرح ہے۔ بعض فرماتے ہیں العضۃ کا معنی جادو ہے قاموس میں ہے العضون کا معنی السحر یعنی جادو ہے۔ یہ عضھۃ (بالھاء) کی جمع ہے۔ پھر اس کی جمع سالم بنائی گئی ہے تاکہ اس کے حرف حذف کی کمی پوری ہو جائے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد بھی اسی معنی میں ہے لَعَنَ اللّٰهُ الْعَاضِهَةَ وَالْمُسْتَعْضِهَةَ یعنی اللہ تعالیٰ جادو کرنے والی اور جادو طلب کرنے والی پر لعنت کرے (3)۔ النہایہ میں اسی طرح ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ کما انزلنا ولقد اتینک کے متعلق ہو کیونکہ اس کا معنی بھی انزلنا الیک ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ ہم نے آپ پر سبع مثانی کو اتارا جیسا کہ یہود ونصاری پر تورات اور انجیل کو اتارا۔ یہ مصدر محذوف کی صفت ہے۔ اس ترکیب کے اعتبار سے لا تمدن الی آخرہ جملہ معترضہ ہوگا اور الذین جعلوا القرآن عضین کا ارشاد الْمُقْتَسِمِيْنَ کی صفت ہوگا۔ اگر مقتسمین سے مراد صالح علیہ السلام کے قتل کے سازشی ہوں تو پھر الذین جعلوا مبتدا خبر ہوں گے۔

فَوَرَبِّكَ لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿٩٢﴾ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿٩٣﴾

[illegible] 2۔ تفسیر [illegible] جلد 2، صفحہ 590 (العلمیۃ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 350 (فراس)

''پس آپ کے رب کی قسم ہم پوچھیں گے ان سب سے ان اعمال کے متعلق جو وہ کیا کرتے تھے ۱؎ ''

۱؎ ہم ان سے ان کے کفر و معاصی کے متعلق ضرور باز پرس کریں گے اور جو کچھ انہوں نے قرآن کی تقسیم کی اور جھوٹ یا کذب کی نسبت قرآن کی طرف کی اس کا بھی ان سے مؤاخذہ کریں گے اور انہیں ان تمام افعال بد اور اقوال قبیحہ پر سزا ملے گی۔ امام بغوی فرماتے ہیں محمد بن اسماعیل بخاری نے فرمایا۔ اکثر علماء نے فرمایا ہے کہ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ سے مراد یہ ہے کہ ہم ان سے لا الٰہ الا اللہ کے متعلق پوچھیں گے (1)۔ امام ترمذی، ابن جریر، ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ نے حضرت انس سے انہوں نے نبی کریم ﷺ سے اسی آیت کے متعلق روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا لا الٰہ الا اللہ کے متعلق باز پرس ہوگی (2)۔

مسلم نے ابو برزہ الاسلمی سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کسی بندہ کے پاؤں اس وقت تک پل صراط سے نہ ہٹیں گے حتی کہ چار چیزوں کے متعلق پوچھ لیا جائے گا (یعنی پل صراط کو عبور کرنا ان سوالات کے بعد ہوگا) 1۔ عمر کو کس شغل میں گزارا، 2۔ اپنے جسم کو کس کام میں صرف کیا، 3۔ علم کے متعلق سوال ہوگا کہ اس پر کتنا عمل کیا۔ 4۔ مال کے متعلق سوال ہوگا کہ کیسے کمایا تھا اور کس طرح اس کو خرچ کیا تھا۔ ترمذی اور ابن مردویہ نے ابن مسعود سے اسی طرح روایت کی ہے (3)۔ طبرانی اور اصبہانی نے الترغیب میں ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا علم میں خیر خواہی کو پیش نظر رکھو، ایک دوسرے سے علم نہ چھپاؤ۔ کسی شخص کا علم میں خیانت کرنا مال میں خیانت کرنے سے زیادہ برا ہے۔ اللہ تعالیٰ علمی خیانت پر بھی تم سے مؤاخذہ کرے گا۔ ابو نعیم نے ابن عباس سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ نے فرمایا جو شخص جس مقصد کے لئے قدم اٹھاتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے متعلق باز پرس فرمائے گا (4)۔ طبرانی نے الاوسط میں ابن عمر سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص کسی قوم کا امام ہو اسے اللہ تعالیٰ سے ڈرنا چاہئے۔ اور اسے جاننا چاہئے کہ وہ ذمہ دار ہے اور اس ذمہ داری کے متعلق باز پرس ہوگی۔ اگر وہ امامت کا حق صحیح ادا کرے گا تو اسے تمام مقتدیوں کے برابر ثواب ملے گا اور اگر وہ کوتاہی کرے گا تو اس کا وبال اس پر ہوگا۔ ابن ابی حاتم اور ابو نعیم نے الحلیہ میں معاذ بن جبل سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا اے معاذ مومن سے قیامت کے روز ہر کام کے متعلق سوال ہوگا حتی کہ آنکھوں میں سرمہ لگانے کے متعلق بھی پوچھا جائے گا۔ بیہقی اور ابن ابی الدنیا نے حضرت الحسن سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو بندہ خطبہ دیتا ہے اللہ تعالیٰ اس سے اس خطبہ کی مراد کے متعلق باز پرس فرمائے گا کہ خطبہ دینے کا ارادہ کیا تھا۔ یہ حدیث مرسل ہے اور سند جید ہے۔ ابن ابی حاتم نے انفع بن عبداللہ الکلاعی سے روایت کیا ہے، فرمایا جہنم کے سات پل ہیں اور ان کے اوپر پل صراط ہے۔ مخلوق کو پہلے پل پر روکا جائے گا۔ ارشاد ہوگا ان کو روکو اب ان سے سوال ہوگا۔ نماز پر محاسبہ ہوگا اور نماز کے متعلق ان سے پوچھا جائے گا۔ ہلاک ہونے والا یہاں ہی ہلاک ہو جائے گا اور نجات پانے والا نجات پا جائے گا۔ جب دوسرے پل پر پہنچیں گے تو امامت کے متعلق محاسبہ ہوگا کیسے ادا کی تھی اور کیسے اس میں خیانت کی تھی۔ پس ہلاک ہوگا جو ہلاک ہوگا اور نجات پا جائے گا جو نجات پائے گا۔ جب تیسرے پل پر پہنچیں گے تو صلہ رحمی کے متعلق پوچھا جائے گا کہ کیسے اسے قائم کیا تھا۔ اور کیسے توڑا تھا پس ہلاک ہوگا جو ہلاک ہوگا نجات پائے گا جو نجات پائے گا۔ فرمایا رحم اس دن ہوا میں لٹکا ہوا ہوگا۔ عرض کرے گا اے اللہ جس نے مجھے ملایا تو بھی اسے ملا لے اور جس نے مجھے توڑا تو بھی اسے توڑ دے۔ ابن ماجہ نے ابو سعید الخدری سے روایت کیا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 62 (التجاریہ) 2۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی، جلد 11، صفحہ 206 (العلمیہ)

3۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 64 [illegible]

ہے، فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز بندے سے ضرور سوال کرے گا حتیٰ کہ فرمائے گا تو نے برائی کو دیکھ کر اسے روکا کیوں نہیں تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ خود ہی اسے حجت کی تلقین فرمائے گا۔ وہ بندہ عرض کرے گا اے میرے رب مجھے تجھ سے (بخشش) کی امید تھی اور میں لوگوں سے ڈرتا تھا)(1)

صحیحین میں ابن عمرؓ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے ہر ایک نگران ہے اور ہر ایک سے اپنے ماتحتوں کے متعلق پوچھ ہوگی۔ فرمایا امام لوگوں کا نگران ہے، اس سے اپنی رعیت کے متعلق پوچھا جائے گا اور ایک انسان اپنے گھر والوں پر نگران اس سے اپنی رعیت کے متعلق پوچھا جائے گا۔ عورت اپنے خاوند کے گھر اور اس کے بچوں پر نگران اس سے اس کے متعلق سوال ہوگا۔ کسی شخص کا غلام اپنے آقا کے مال پر نگران ہے۔ اس سے اس کے متعلق استفسار ہوگا۔ پس تم میں سے ہر ایک نگران ہے اور تم تمام سے اپنی رعیت کے متعلق باز پرس ہوگی(2)۔

اس مفہوم کی روایت حضرت انس سے ابن حبان، ابو نعیم اور طبرانی نے بھی روایت کی ہے۔ طبرانی نے الکبیر میں حضرت مقدام سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو شخص کسی قوم کا راہنما ہے وہ قیامت کے روز ان کے آگے آگے جھنڈا اٹھائے ہوئے آئے گا اور وہ تمام اس کے پیچھے ہوں گے۔ قوم کے متعلق اس سے سوال ہوگا اور قوم سے اس کے متعلق پوچھا جائے گا۔

طبرانی نے ہی ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص دس افراد پر امیر ہو کر حکم کرتا ہوگا قیامت کے روز اس سے ان کے متعلق سوال ہوگا۔ سوال کے متعلق احادیث بہت زیادہ ہیں۔

اگر کہا جائے کہ لنسئلنهم اجمعين اور اس کے ہم معنی احادیث اور فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْـَٔلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖۤ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ ﴿۳۹﴾ (کہ اس دن کسی انسان و جن سے اس کے گناہ کے متعلق باز پرس نہ ہوگی) میں تطبیق کیسے ہوگی۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں جمع کی صورت یہ ہوگی وہ یہ نہیں پوچھے گا کہ کیا تم نے یہ عمل کیا تھا کیونکہ وہ ان کا سب کچھ جانتا ہے۔ بلکہ وہ پوچھے گا تم نے ایسا کیوں کیا(3)۔ بیہقی نے ابو طلحہ کے طریق سے حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے اور قطرب نے اسی پر اعتماد کیا ہے اور فرمایا سوال کی دو قسمیں ہوتی ہیں 1۔ استعلام۔ علم حاصل کرنے کے لئے 2۔ توبیخ یعنی زجر و توبیخ کے لئے۔ پس لا یسئل عن ذنبه میں استعلام کی نفی ہے اور لنسئلنهم اجمعين میں توبیخ کا اثبات ہے۔ حضرت عکرمہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ان آیتوں کو جمع کرنے کی صورت بیان فرماتے ہیں کہ قیامت کا دن بڑا طویل ہوگا اور اس میں کئی جگہوں پر رکاوٹیں ہوں گی۔ بعض مقامات پر سوال ہوگا اور بعض پر سوال نہ ہوگا۔ اس کی مثال یہ ارشاد ہے هٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُوْنَ دوسری جگہ پر فرمایا ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ(4)۔ حاکم نے اسی طرح تخریج کیا ہے۔

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۹۴﴾

"سو آپ اعلان کر دیجئے اس کا جس کا آپ کو حکم دیا گیا[1] اور منہ پھیر لیجئے مشرکوں سے ۔"

[1] ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں اصدع کا معنی اظہر ہے یعنی ظاہر کرو(5)۔ نبی کریم ﷺ کو اظہار دعوت کا حکم ہو رہا ہے۔ عبداللہ

1۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 299 (وزارت تعلیم) 2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 122 (قدیمی) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 62 (التجاریۃ)

بن عبیدہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ پوشیدہ تبلیغ کیا کرتے تھے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو آپ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام کھلے عام دعوت دینے لگے۔ ابن عباسؓ سے بھی مروی ہے کہ اس کا معنی ہے امضہ اس دعوت کو حسب معمول جاری رکھو۔ الضحاک فرماتے ہیں اس کا معنی اعلم ہے یعنی لوگوں کو بتاؤ۔ اخفش کہتے ہیں اس کا معنی ہے قرآن کے ذریعے حق و باطل کے درمیان فرق کرو۔ سیبویہ کہتے ہیں اس کا معنی فیصلہ کرو اس کے ساتھ جس کا تمہیں حکم دیا گیا ہے۔ الصدع کا اصل معنی ظاہر کرنا، جدا کرنا اور تمیز دینا ہے۔

۲؎ مشرکوں کی طرف توجہ نہ فرمایئے بعض علماء فرماتے ہیں یہ آیت قتال کی آیت سے منسوخ ہے۔

اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ ﴿۹۵﴾

''ہم کافی ہیں مذاق اڑانے والوں کے شر سے بچانے کے لئے ۱؎''

۱؎ ہم ان استہزاء کرنے والوں کو ہلاک کر کے اور ان کو نیست و نابود کر کے آپ کی کفایت کریں گے۔ امام بغوی فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ اپنے نبی مکرم ﷺ کو حکم فرما رہے ہیں کہ آپ برملا اپنی دعوت کا اعلان فرمایئے اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے خوف نہ کیجئے کیونکہ اللہ تعالیٰ آپ کو ہر دشمن سے بچائے گا جیسے اس نے مستہزئین کے شر سے آپ کو بچایا تھا۔ وہ پانچ رؤساء قریش تھے۔ (1) ولید بن مغیرہ المخزومی یہ ان گستاخوں کا سرغنہ تھا۔ (2) العاص بن وائل السہمی (3) اسود بن مطلب بن الحارث بن اسد بن عبد العزیٰ ابو زمعہ۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے بددعا دی تھی اے اللہ اسے اندھا کر دے اور اس کو لاولد کر دے۔ (4) اسود بن عبد یغوث بن وہب بن عبد مناف بن زہرہ (5) الحارث بن قیس بن الطلاطلہ۔

یہ استہزاء کرنے والے بیت اللہ شریف کا طواف کر رہے تھے کہ جبرئیل امین محمد ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور آپ ﷺ کے پہلو میں کھڑے ہو گئے۔ ولید بن مغیرہ پاس سے گزرے تو جبرئیل نے کہا اے پیارے محمد ﷺ یہ شخص کیسا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا بڑا برا شخص ہے۔ جبرئیل نے کہا میں نے اس کا کام کر دیا ہے۔ پھر جبرئیل نے ولید کی پنڈلی کی طرف اشارہ کیا۔ وہ بنی خزاعہ کے ایک شخص کے پاس سے گزرا۔ وہ اپنے تیروں کے پر درست کر رہا تھا اور ولید کے اوپر ایک یمنی چادر تھی جسے وہ زمین پر گھسیٹ کر چل رہا تھا۔ اس کی چادر کا پلو ایک تیر کے پر سے اٹک گیا مگر اس نے تکبر کی وجہ سے جھک کر اسے چھڑانا پسند نہ کیا۔ اس نے پنڈلی کو جھٹکا دیا تو اس کو خراش آ گئی۔ اسی خراش سے مریض ہو کر مر گیا۔ عاص بن وائل پاس سے گزرا۔ جبرئیل نے کہا اے پیارے محمد ﷺ آپ نے اس شخص کو کیسے پایا ہے۔ آپ نے فرمایا یہ بڑا برا شخص ہے۔ جبرئیل نے اس کے پاؤں کے تلوے کی طرف اشارہ کیا اور کہا میں نے اس کا کام کر دیا ہے۔ پس وہ سیر کے لئے اپنی سواری پر جا رہا تھا اور اس کے ساتھ دو بیٹے تھے۔ وہ ایک گھاٹی میں اترا۔ اس کا پاؤں ایک چیتھڑے پر آیا تو اس کے پاؤں کے نیچے کانٹا چبھ گیا۔ اس نے چیخ و پکار شروع کی۔ میں ڈس گیا میں ڈس گیا۔ لوگوں نے پاؤں کو دیکھا مگر کچھ نظر نہ آیا۔ ٹانگ سوج کر اونٹ کی گردن کی مثل ہو گئی۔ بالآخر وہ وہاں ہی مر گیا۔ اسود بن المطلب گزرا جبرئیل علیہ السلام نے اس کی آنکھوں کی طرف اشارہ کیا اور کہا میں نے اس کا کام کر دیا ہے۔ پس اسود اندھا ہو گیا تھا۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں جبرئیل نے ایک سبز پتہ مارا جس سے اس کی بینائی ختم ہو گئی۔ آنکھوں کو درد شروع ہو گیا وہ اپنا سر دیوار پر مارنے لگا حتیٰ کہ ہلاک ہو گیا۔ الکلبی کی روایت ہے کہ اسود اپنے غلام کے ساتھ ایک درخت کے تنے کے پاس بیٹھا تھا۔ جبرئیل نے اس کا سر درخت پر دے مارا اور چہرے پر کانٹے مارے۔ اس نے غلام سے مدد طلب کی مگر غلام نے کہا مجھے تو آپ کو مارتے ہوئے کوئی نظر نہیں آتا۔ یہ سب کچھ تو خود کر رہا ہے۔ کہنے لگا

مجھے محمد ﷺ کے رب نے قتل کر دیا ہے۔ یہی کہتے کہتے مر گیا۔ اسود بن عبد یغوث گزرا۔ جبرئیل نے پوچھا آقا یہ کیسا آدمی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا یہ بھی برا آدمی ہے۔ حالانکہ یہ میرے ماموں کا بیٹا ہے۔ جبرئیل نے کہا میں نے اس کا بھی کام کر دیا ہے۔ جبرئیل نے اس کے پیٹ کی طرف اشارہ کیا تو اس کے پیٹ میں پانی جمع ہو گیا اور اسی بیماری سے مر گیا۔ کلبی کی روایت میں ہے کہ وہ اپنے گھر سے نکلا تو بادسموم لگنے سے کالا سیاہ ہو گیا حتی کہ بالکل حبشی بن گیا۔ گھر لوٹا تو گھر والے اسے پہچان ہی نہ سکے۔ انہوں نے دروازہ بند کر لیا حتی کہ وہ مر گیا۔ اور کہتا مجھے رب محمد ﷺ نے قتل کیا ہے۔ حارث بن قیس گزرا۔ جبرئیل نے پوچھا یہ کیسا آدمی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا برا آدمی ہے۔ جبرئیل اس کے سر کی طرف اشارہ کیا اور کہا میں نے اس کا کام کر دیا ہے۔ اس کی ناک سے پیپ بہنے لگی اور اسی بیماری سے مر گیا۔ ابن عباسؓ نے فرمایا اس نے نمکین مچھلی کھائی تھی جس کی وجہ سے شدید پیاس محسوس کرنے لگا۔ وہ پانی پیتا گیا حتی کہ اس کا پیٹ پھٹ گیا اور مر گیا۔ ارشاد الٰہی اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ کا یہی مطلب ہے کہ جو آپ سے اور قرآن سے مذاق کرتے ہیں۔ ہم نے خود ہی ان کا کام تمام کر دیا ہے (1)۔

طبرانی، ابو نعیم اور بیہقی نے الدلائل میں ابن عباسؓ کی حدیث نقل کی ہے کہ وہ استہزاء کرنے والے قریش پانچ سرغنے تھے۔ ولید بن مغیرہ۔ عاص بن وائل۔ عدی بن قیس۔ اسود بن یغوث اور اسود بن مطلب۔ یہ نبی کریم ﷺ کو اذیت دینے اور آپ کے ساتھ مذاق کرنے میں انتہا کو پہنچ جاتے تھے۔ جبرئیل نے رسول اللہ ﷺ کو بتایا مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں آپ کی طرف سے ان کا کام تمام کر دوں۔ پس جبرئیل نے ولید کی پنڈلی کی طرف اشارہ کیا وہ تیر کے پاس سے گزرا تو تیر سے اس کا کپڑا الجھ گیا مگر وہ کبر و غرور کی وجہ سے جھکا نہیں۔ وہ تیر اسکی رگ میں لگا اور اسے کاٹ دیا اور وہ مر گیا۔ جبرئیل نے عاص کے پاؤں کے تلوے کی طرف اشارہ کیا اسے کانٹا چبھ گیا تو اس کا پاؤں سوج گیا حتی کہ چکی کی طرح ہو گیا اور وہ مر گیا۔ جبرئیل نے عدی بن قیس کی ناک کی طرف اشارہ کیا۔ اسے پیپ آنا شروع ہو گئی اور وہ مر گیا۔ اسود بن یغوث کے سر کی طرف اشارہ کیا۔ وہ ایک درخت کے تنے کے پاس بیٹھا تھا۔ جبرئیل نے اس کا سر درخت پر مارنا شروع کر دیا اور چہرے پر کانٹے تو وہ مر گیا۔ اسود بن المطلب کی آنکھوں کی طرف اشارہ کیا تو وہ اندھا ہو گیا۔ بزار اور طبرانی نے انس بن مالک سے نقل کیا ہے، فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ لوگوں کے پاس سے گزرے تو وہ آپ کے پیچھے اشارے کرنے لگے، یہ شخص ہے جو کہتا ہے کہ میں نبی ہوں اور اس وقت آپ کے ساتھ جبرئیل تھے۔ جبرئیل نے ان کی طرف اشارہ کیا تو ان کے جسموں پر ناخن کی مثل نشان پڑ گیا حتی کہ وہ نشان پھوڑے کی شکل اختیار کر گیا۔ پھر ان میں بدبو پیدا ہو گئی اور کوئی شخص ان کے قریب بھی نہیں جا سکتا تھا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۚ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿۹۶﴾

”جو بناتے ہیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ اور خدا سو یہ (حقیقت حال) ابھی جان لیں گے[1]“

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ ﴿۹۷﴾

”اور ہم خوب جانتے ہیں کہ آپ کا دل تنگ ہوتا ہے ان باتوں سے جو وہ کیا کرتے ہیں[1]“

[1] ہم جانتے ہیں کہ ان کی شرکیہ باتوں اور قرآن پر استہزاء کو سن کر آپ کا سینہ غیظ و غضب سے بھر جاتا ہے اور آپ اس کے نفاذ کی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 64-63 (التجاریہ)

استطاعت نہیں رکھتے۔

فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۹۸﴾

"سو آپ پاکی بیان کیجئے اپنے رب کی تعریف کے ساتھ ۱؎ اور ہو جایئے سجدہ کرنے والوں سے ۲؎"

۱؎ یعنی اللہ تعالیٰ کی تسبیح تحمید کرو، یہ تمہیں دل کی افسردگی اور گھٹن سے دور کر دے گی اور اللہ تعالیٰ تمہاری طرف سے تمہارے دشمنوں کے لئے کافی ہوگا اور تمہارے غم واندوہ کو دور فرمادے گا اور آپ کے سینۂ اقدس کو ہر قسم کی گھٹن ورنج سے شفا بخشے گا۔ یا یہ معنی کہ اپنے رب کی پاکیزگی بیان کرو اس بات سے جو یہ کفار کہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی حمد کرو اس نعمت پر کہ اس نے آپ کی حق کی طرف راہنمائی فرمائی۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں اس کا معنی اپنے رب کے حکم سے نماز پڑھئے۔

۲؎ اور متواضعین میں سے ہو جایئے۔ الضحاک کہتے ہیں اس کا معنی ہے سبحان اللہ و بحمدہ کا ورد کیجئے اور نمازیوں میں سے ہو جایئے (1)۔ امام احمد، ابوداؤد اور ابن جریر حذیفہ بن یمان کے بھائی عبدالعزیز سے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو جب کوئی تکلیف پہنچتی تو فوراً نماز میں مصروف ہو جاتے (2)۔

وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ﴿۹۹﴾

"اور عبادت کیجئے اپنے رب کی یہاں تک کہ آ جائے آپ کے پاس الیقین ۱؎"

۱؎ اس آیت کریمہ میں الیقین سے مراد موت ہے جس کی آمد یقینی ہے کیونکہ یہ ہر زندہ مخلوق کو لاحق ہوگی۔ مطلب یہ ہے کہ جب تک چراغ زندگی روشن ہے۔ عبادت میں پورے ذوق وشوق سے مصروف رہئے۔ اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام کے قول میں ہے اَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا۔ امام بغوی اور دوسرے محدثین نے اپنی سند کے ساتھ بھی جبیر بن نفیر سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھ پر وحی نہیں ہوئی کہ میں مال جمع کروں اور تاجروں میں سے ہو جاؤں بلکہ میری طرف یہ وحی ہوئی ہے فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ۔ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت مصعب بن عمیر کو آتے ہوئے دیکھا جنہوں نے مینڈھے کی کھال اور نطاق باندھا ہوا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس شخص کو دیکھو اللہ تعالیٰ نے اس کا دل روشن فرمادیا ہے۔ میں نے دیکھا تھا کہ والدین اسے عمدہ کھانا کھلاتے اور پلاتے تھے اور میں نے ان کو دو سو درہم کا سوٹ پہنے ہوئے دیکھا تھا جو اس کے والدین نے خریدا تھا۔ آج ان کی یہ کیفیت جو تم دیکھ رہے ہو فقط اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم ﷺ کی محبت میں ہوئی ہے (3)۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 64 (التجاریہ)

2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 64 (التجاریہ)

3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 64 (التجاریہ)

سورۃ النحل

رکوعاتہا ۱۶	سُوْرَةُ النَّحْلِ مَكِّيَّةٌ ۱۶	ایاتہا ۱۲۸

سورۃ النحل مکی ہے، اس میں ایک سو اٹھائیس آیات اور سولہ رکوع ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَتٰۤى اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ①

"قریب آ گیا ہے حکم الٰہی [1] اس کے لئے عجلت نہ کرو [2] پاک ہے اللہ تعالیٰ [3] اور برتر ہے اس شرک سے جو وہ کر رہے ہیں [4]"

[1] اَتٰۤى بمعنی دنی اور قرب ہے یعنی امر الٰہی قریب آ گیا۔ ابن عرفہ کہتے ہیں عرب اتاک الامر بولتے جس کا مطلب، ابھی جلد ہی کام وقوع پذیر ہونے والا ہے (1)۔ پس اتیان یہاں دنو اور وجوبی وقوع کے لئے مجازاً استعمال ہوا ہے کیونکہ جس امر کا وقوع زمانہ مستقبل میں یقینی ہو وہ اپنے وجود کے یقینی ہونے میں ماضی کی طرح ہوتا ہے۔ معنی یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے امر موعود کا وقوع واجب ہے اور وہ قیامت کا قیام ہے جیسا کہ کلبی کا قول ہے۔ اس لئے تم اس پر یقین رکھو اور شک نہ کرو اور اپنے آپ کو اس طرح تیار کرو گویا کہ وہ قریب آ چکی ہے۔

[2] یعنی اس کے جلدی وقوع کا مطالبہ نہ کرو کیونکہ اس میں تمہارے لئے کوئی بھلائی نہیں ہے اور نہ تمہارا اس سے چھٹکارا ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں ابن عباس نے فرمایا جب آیت کریمہ اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ نازل ہوئی تو کفار ایک دوسرے کو کہنے لگے۔ یہ شخص کہتا ہے کہ قیامت قریب ہے۔ پس تم اپنے بدکرتوتوں سے رک جاؤ حتی کہ جو کچھ ہونے والا ہے ہم دیکھ لیں۔ جب عذاب نہ اترا تو کہنے لگے ہمیں تو کچھ نظر نہیں آیا جس سے آپ ہمیں ڈراتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ کا ارشاد نازل فرمایا۔ پھر وہ کچھ خوفزدہ ہو گئے۔ جب کچھ عرصہ گزر گیا تو کہنے لگے یا محمد ہمیں تو کچھ نظر نہیں آیا جس کی آپ ہمیں دھمکی دیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اتی امر اللہ کا ارشاد نازل فرمایا۔ حضور نبی کریم ﷺ یہ سن کر اچھلے اور لوگوں نے پھر اپنے سر اوپر اٹھائے اور یہ خیال کرنے لگے کہ حقیقتاً قیامت قریب آ گئی ہے تو اللہ تعالیٰ نے تسلی اور اطمینان کے لئے فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ نازل فرمایا پھر لوگوں کو سکون مل گیا (2)۔ ابن مردویہ نے ابن عباس سے روایت کیا ہے، فرمایا جب اتی امر اللہ کا ارشاد نازل ہوا تو صحابہ کرام خوفزدہ ہو گئے حتی کہ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ نازل ہوا (3)۔ استعجال کا معنی وقت سے پہلے کسی چیز کا طلب کرنا ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں جب یہ آیت نازل ہوئی تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا مجھے اور قیامت کو ان دو انگلیوں کی طرح ملا کر بھیجا گیا ہے۔ آپ نے اپنی انگلیوں سے اشارہ کیا قریب تھا کہ وہ مجھ سے سبقت لے جاتی (4)۔ میں کہتا ہوں صحیحین میں حضرت انس سے مروی ہے، فرمایا مجھے اور قیامت کو ان انگلیوں کی طرح ملا کر بھیجا گیا ہے (5)۔ ترمذی نے مستورد بن شداد سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا مجھے عین قیامت کے وقت میں بھیجا گیا مگر میں اس سے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 65 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 65 (التجاریہ) 3۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 204 (العلمیہ)

4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 65 (التجاریہ) 5۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 406 (قدیمی)

سبقت لے گیا جیسے یہ اس سے سبقت لے گئی ہے۔ اور آپ نے سبابہ اور وسطی انگلیوں سے اشارہ فرمایا (1)۔ امام بغوی فرماتے ہیں ابن عباس نے فرمایا نبی کریم ﷺ کی بعثت قیامت کی نشانیوں میں سے ہے۔ جب جبرئیل امین حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت کا پیغام لے کر آسمان والوں کے پاس سے گزرے تو انہوں نے کہا اللہ اکبر قیامت قائم ہو گئی۔ ایک قوم کا خیال ہے کہ امر اللہ سے مراد جھٹلانے والوں کی سزا اور تلوار کے ساتھ ان کو عذاب دینا مراد ہے۔ یہ اسطرح ہوا کہ نضر بن حارث نے دعا کی یا اللہ اگر یہ تیری طرف سے حق ہے تو ہم پر آپ طرف سے پتھروں کی بارش برسا۔ کافروں نے عذاب کو جلدی طلب کیا تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ نضر بن حارث بدر کی جنگ میں قتل ہو گیا (2)۔

۳؎ اس کا معنی ہے میں اللہ تعالیٰ کی ہر عیب و نقص سے پاکی بیان کرتا ہوں۔

۴؎ وہ اپنی صفات جلیلہ کی وجہ سے بلند و بالا ہے۔ یہ اس کے شریک بنا رہے ہیں حالانکہ وہ شریک سے پاک ہے جو اس عذاب کو ٹال سکے جس کا اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے ارادہ کر رکھا ہے۔ یا یہ معنی کہ مشرک جو اس کی صفات بیان کرتے ہیں وہ اس سے بہت بلند ہے۔ حمزہ اور کسائی نے فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ کی مطابقت کی وجہ سے تشرکون یعنی خطاب کا صیغہ پڑھا ہے اور باقی قراء نے التفات کے قاعدہ کے مطابق یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ یا یہ خطاب چونکہ مومنین و مشرکین اور دوسرے تمام لوگوں کو ہے جیسا کہ حدیث میں گزرا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کو یہ ارشاد پہنچا تو آپ اچھلے اور لوگوں نے پھر سر اوپر اٹھائے تو فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ کا ارشاد نازل کیا گیا۔

يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اَنْ اَنْذِرُوْٓا اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاتَّقُوْنِ ۝

"اتارتا ہے فرشتوں کو روح (یعنی روح) وحی کے ساتھ ۱؎ اپنے حکم سے جس پر چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے ۲؎ کہ خبردار کرو (لوگوں کو) ۳؎ کہ نہیں کوئی معبود سوائے میرے پس مجھ سے ہی ڈرا کرو ۴؎"

۱؎ عام قراء نے يُنَزِّلُ کو یاء کے ضمہ اور زاء کے کسرہ کے ساتھ باب افعال سے پڑھا ہے۔ اور الملائکۃ کو مفعول ہونے کی وجہ سے منصوب پڑھا ہے اور یعقوب نے یاء اور زاء کے فتحہ کے ساتھ باب تفعیل سے ایک تاء کو حذف کر کے پڑھا ہے اور ملائکہ کو فاعل ہونے کی بناء پر مرفوع پڑھا ہے اور روح سے مراد وحی یا قرآن ہے۔ وحی اور قرآن کو روح سے تعبیر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ان سے جہالت کی زہر سے مرے ہوئے دلوں کو زندگی ملتی ہے۔

۲؎ اپنے حکم کے سبب یا اپنے حکم کی وجہ سے۔ یعنی جس کو رسول بنانا چاہتا ہے۔

۳؎ یہ نذرت هكذا سے مشتق ہے۔ اس لئے معنی ہو گا ان کو آگاہ کرو ان مفسرہ ہے کیونکہ روح بمعنی وحی ہے جو قول پر دلالت کرتی ہے۔ یا ان مصدریہ ہے اور روح سے بدل ہونے کی وجہ سے محل جر میں ہے۔ یا یہ محل نصب میں ہے اور حرف جر حذف کیا گیا ہے۔ یا ان مخففہ من المثقلہ ہے۔

۴؎ انه میں ضمیر شان ہے۔ یہ ان کو مقصود کے ساتھ خطاب کرنے کی طرف رجوع ہے۔ یا کہا جاتا ہے کہ انذروا کا معنی خوفوا ہے یعنی اہل شرک و معاصی کو عذاب سے ڈراؤ اور انہیں بتاؤ کہ کوئی معبود برحق نہیں سوائے میرے پس تم مجھ سے ہی ڈرو۔ اس آیت کریمہ میں یہ

1۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی، جلد 9، صفحہ 44 (العلمیۃ)، تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 65 (التجاریۃ)

تنبیہ ہے کہ وحی کا ماحاصل توحید پر تنبیہ ہے اور یہی قوت علمیہ کا منتہائے کمال ہے اور تقویٰ کا حکم کمالات عملیہ کی انتہا ہے۔ یہ آیات کریمہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر دلالت کرتی ہیں کیونکہ ان آیات میں دلیل ہے۔ اللہ تعالیٰ عالم کے اصول وفروع کو اپنی حکمت کاملہ کے مطابق پیدا کرنے والا ہے۔ اگر اس کا شریک ہوتا تو وہ بھی اس پر قادر ہوتا اور اختلاف وٹکراؤ کا امکان ہوتا تو وہ بھی اس پر قادر ہوتا اور اختلاف و ٹکراؤ کا امکان ہوتا۔ اس آیت کریمہ اَتٰۤى اَمْرُ اللّٰهِ کے بعد ذیل کی آیات کے لانے کا اشارہ ہے اس طریق کی طرف جس کے ذریعے آپ ﷺ نے قیامت کی آمد کو معلوم کیا۔ نیز ان کے اس شبہ کو بھی زائل کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم کیساتھ اختصاص بعید ہے۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ تَعٰلٰى عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ۝۳

"اس نے پیدا فرمایا آسمانوں کو اور زمین کو حق کے ساتھ [1] وہ برتر ہے اس شرک سے جو وہ کر رہے ہیں [2]"

[1] یعنی اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا، یعنی ایک خاص مقدار، خاص شکل ووضع اور صفات مختلفہ پر پیدا فرمایا۔ یہ سب کچھ صانع قدیم، واحد، قدیر اور حکیم خدا کی عظمت وجود کا اعلان کر رہا ہے۔

[2] زمین وآسمان کی ہر چیز سے وہ بلند وبالا ہے اپنے وجود میں کسی احتیاج سے بلند ہے یا زمین وآسمان پر اس کی بقا نہیں ہے اور یہ دونوں جہان کی تخلیق پر قادر بھی نہیں ہیں۔ اور اس میں دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ اجرام کے قبیل سے نہیں ہے۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِیْمٌ مُّبِیْنٌ ۝۴

"اس نے پیدا فرمایا انسان کو نطفہ سے [1] پس اب وہ برملا جھگڑالو بن گیا ہے [2]"

[1] انسان کو ایک نطفہ سے پیدا فرمایا جو ایک جامد تھا جس میں کسی قسم کا احساس، حرکت سیال کی قوت نہ تھی نہ وہ وضع اور شکل رکھتا تھا حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ سے طاقتور انسان بن گیا۔

[2] پس وہ زبان دراز جھگڑالو بن گیا۔ دوبارہ اٹھنے کی نفی پر حجت کو بیان کرتا ہے، کہتا ہے مَنْ یُّحْیِ الْعِظَامَ وَهِیَ رَمِیْمٌ۔ (بھی! کون زندہ کر سکتا ہے ہڈیوں کو جب وہ بوسیدہ ہو چکی ہوں) یا مبین کا معنی ہے اپنے خالق سے برملا جھگڑا کرنے والا۔ امام بغوی فرماتے ہیں یہ آیت کریمہ ابی بن خلف انجحی کے بارے میں نازل ہوئی ہے وہ دوبارہ زندہ ہونے کا منکر تھا۔ وہ ایک پرانی ہڈی لے کر آیا اور کہا کیا تم کہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کے بوسیدہ ہونے کے بعد اسے زندہ کرے گا اور ضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّ نَسِیَ خَلْقَهٗ یہ آیت کریمہ بھی اسی کے متعلق نازل ہوئی (1)۔ ابن ابی حاتم نے سعدی سے یہ قصہ اَوَ لَمْ یَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ کے تحت نقل کیا ہے مطلب یہ ہے کہ یہ منکر اتنا بھی نہ سمجھ سکا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اس وقت تخلیق کیا تھا جب وہ نطفہ کی شکل میں تھا۔ پھر بوسیدہ ہونے کے بعد دوبارہ زندہ کرنے میں کون سا استبعاد ہے۔ آیت کا لفظ عام ہے، اگرچہ اس کا مورد خاص ہے۔ واللہ اعلم

وَ الْاَنْعَامَ خَلَقَهَا ۚ لَكُمْ فِیْهَا دِفْءٌ وَّ مَنَافِعُ وَ مِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۝۵

"نیز اس نے جانوروں کو پیدا کیا تمہارے لئے [1] ان میں گرم لباس بھی ہے [2] اور دیگر فائدے ہیں [3] اور انہیں (کا گوشت) تم کھاتے ہو [4]"

[1] وَ الْاَنْعَامَ سے مراد اونٹ، گائے اور بکریاں (وغیرہ) ہیں۔ یہ فعل مضمر کی وجہ سے منصوب ہے جس کی تفسیر مابعد خَلَقَهَا لَكُمْ کر رہا ہے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 65 (التجاریہ)

یا اس کا اعراب الانسان پر عطف کی وجہ سے منصوب ہے اور خَلَقَهَا لَكُمْ کا جملہ اجمالاً بیان ہوگا ان چیزوں کا جو انسان کے لئے پیدا کی گئی ہیں اور مابعد اس کی تفصیل ہے۔

۲؎ قاموس میں ہے دف سخت سردی کی ضد ہے، یعنی تم ان کی اون کے بنے ہوئے لباسوں سے گرمی حاصل کرتے ہو اور ان کی اون سے لباس اور لحاف بناتے ہو۔

۳؎ ان جانوروں میں تمہارے لئے دیگر فوائد بھی ہیں۔ افزائش نسل، دودھ، سواری بار برداری، کھیتی باڑی، اور بیع وشراء وغیرہ۔

۴؎ اور ان میں سے جو کھایا جاتا ہے وہ تم کھاتے مثلاً گوشت، چربی، دودھ وغیرہ۔ ظرف کی تقدیم آیات کے قافیہ کو ملانے کے لئے ہے یا اس لئے کہ عام طور پر مذکورہ جانوروں کا گوشت وغیرہ استعمال ہوتا ہے اور معائش میں انہی جانوروں پر گزارا کیا جاتا ہے بخلاف دوسرے ماکولہ جانوروں کے کیونکہ دوسرے جانور یا تو تلذذ یا دوا، کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔

وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ وَحِينَ تَسْرَحُونَ ﴿٦﴾

"اور تمہارے لئے ان میں زیب وزینت بھی ہے جب تم شام کو (چرا کر) انہیں گھر لاتے ہو اور جب تم صبح ان کو چرانے لے جاتے ہو ۱؎"

۱؎ اور تمہارے لئے ان میں زیب وزینت ہے جب تم چراگاہوں سے عصر کے وقت انہیں واپس باڑوں کی طرف لوٹاتے ہو۔ اور جب تم صبح کے وقت ان کو چراگاہوں کی طرف لے جاتے ہو کیونکہ صبح اور شام کے وقت ان ریوڑوں سے فناؤں کو رونق ملتی ہے اور دیکھنے والوں کی نظروں میں ان کے ریوڑوں کے مالکوں کی عظمت کی دھاک بیٹھتی ہے۔ آیت کریمہ میں شام کو لوٹنے کا پہلے ذکر فرمایا گیا ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ اس وقت میں ان کی زیب وزینت زیادہ ظاہر ہوتی ہے کیونکہ اس وقت ان کے پیٹ بھرے ہوتے ہیں اور کھیریاں دودھ سے لبریز ہوتی ہیں۔

وَتَحْمِلُ أَثْقَالَكُمْ إِلَىٰ بَلَدٍ لَّمْ تَكُونُوا بَالِغِيهِ إِلَّا بِشِقِّ الْأَنفُسِ ۚ إِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوفٌ رَّحِيمٌ ﴿٧﴾

"اور یہ جانور اٹھالے جاتے ہیں تمہارے بوجھ اس شہروں تک جہاں تم نہیں پہنچ سکتے مگر سخت مشقت سے بے شک تمہارا رب بہت مہربان (اور) ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے ۱؎"

۱؎ تم خود ان شہروں تک پہنچ بھی نہیں سکتے تھے، چہ جائیکہ تم یہ بوجھ بھی اٹھا کر ساتھ لے جاتے۔ بِشِقِّ الْأَنفُسِ کا معنی مشقت اور جہد ہے۔ ابو جعفر نے بشق کو شین کے فتحہ کے ساتھ اور جمہور نے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ دونوں لغتیں ہیں جیسے رَطل اور رِطل تمہارا رب بڑا رحیم اور مہربان ہے کہ اس نے تمہاری منفعت کے لئے ایسے جانور پیدا فرمائے۔

وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيرَ لِتَرْكَبُوهَا وَزِينَةً ۚ وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٨﴾

"اور اس نے پیدا کئے گھوڑے اور خچر اور گدھے ۱؎ تاکہ تم ان پر سواری کرو اور (تمہارے لئے ان میں) زینت ہے ۲؎ اور پیدا فرمائے گا ایسی سواریوں کو جو تم نہیں جانتے ۳؎"

۱؎ یہ تمام اسماء الانعام پر معطوف ہیں۔

۲؎ بعض علماء فرماتے ہیں زینۃ لتر کبوھا کے محل پر معطوف ہے اور اسلوب کو اس لئے بدلا گیا کہ زینت خالق کا فعل ہے اور سواری کرنا مخلوق کا اختیاری فعل ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ان کے جانوروں کی تخلیق کا مقصود سواری کرنا ہے جیسے گائے، بیل کا مقصود کھیتی باڑی ہے اور جانوروں سے تزیین بالعرض حاصل ہوتی ہے۔ اس آیت کریمہ سے امام ابو حنیفہؒ نے گھوڑے کے گوشت کی حرمت یا کراہت پر دلیل پکڑی ہے۔ صاحب ہدایہ فرماتے ہیں یہ آیت کریمہ احسان بتانے کے لئے ذکر کی گئی ہے اور خوراک حاصل کرنا ایک اعلیٰ منفعت ہے اور حکیم و دانا اعلیٰ منفعت کو چھوڑ کر ادنیٰ منفعت کو نہیں جتلاتا (اس سے معلوم ہوا کہ ان جانوروں کا مقصود اعلیٰ سواری اور بار برداری ہے)۔ میں کہتا ہوں بکری اور مرغی وغیرہ کا گوشت گھوڑے کے گوشت سے بھی عمدہ ہوتا ہے اور اس کے حصول پر محنت بھی کم کرنا پڑتی ہے، جبکہ گھوڑے کا گوشت سہولت سے میسر نہیں آتا۔ اس لئے گھوڑے کا گوشت کھانا منافع میں شمار نہیں ہوتا۔ پس گھوڑے کا گوشت کھانا اعلیٰ منافع میں شمار کرنا درست نہیں ہے بلکہ گھوڑوں وغیرہ کا اعلیٰ منافع وہ ہے جو ان کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے احسان کے اظہار میں ان دو منفعتوں کو ذکر کیا ہے۔ واللہ اعلم۔

یہ آیت گھوڑوں، خچروں اور گدھوں کی حرمت پر کیسے دلیل بن سکتی ہے کیونکہ یہ آیت مکیہ ہے اور اس وقت یہ سارے جانور حلال تھے پالتو گدھوں کا گوشت خیبر کے روز 6 ہجری کو حرام ہوا تھا۔ یہ مسئلہ سورۂ مائدہ میں اَلْیَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّیِّبٰتُ کے تحت گزر چکا ہے۔

۳؎ یعنی اس نے مومنین کے لئے جنت میں اور کافروں کے لئے جہنم میں ایسی چیزیں پیدا کی ہیں جنہیں نہ کسی آنکھ نے دیکھا ہے، نہ کسی کان نے سنا ہے اور نہ ان کا تصور کسی دل میں کھٹکا ہے۔

وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِیْلِ وَمِنْهَا جَآىِٕرٌ ؕ وَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِیْنَ ۝۹

”اور اللہ تعالیٰ کے ذمہ کرم پر ہے راہ راست کو دلائل سے واضح کرنا ۱؎ اور انہیں غلط راہیں بھی ہیں ۲؎ اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دے دیتا ۳؎“

۱؎ یعنی اللہ تعالیٰ کے ذمہ کرم پر صراط مستقیم کو بیان کرنا جو حق تک پہنچانے والا ہے اور یہ اس کی رحمت اور فضل ہے کہ اس نے یہ ذمہ خود لیا ہے۔ یا یہ معنی کہ سیدھا راستہ وہ ہے جس پر چلنے والا اللہ تعالیٰ تک یقیناً پہنچتا ہے کہا جاتا ہے سبیل قصد و قاصد یعنی سیدھا راستہ۔ گویا سالک اس کا قصد کرتا ہے اور اس سے ادھر ادھر نہیں ہوتا۔ السَّبِیْلِ پر الف لام جنس کا ہے۔ اسی وجہ سے اس کی طرف اضافت کی گئی ہے اور یہ اضافت اضافت معنی ہے۔

۲؎ اور ان راستوں میں ایسے بھی ہیں جو مستقیم نہیں ہیں یا اللہ تعالیٰ تک نہیں پہنچتے۔ یہاں ٹیڑھے راستہ کے بیان کے وقت اسلوب کلام بدل دیا گیا ہے کیونکہ مقصود صراط مستقیم کا بیان ہے اور راستوں کی تقسیم سیدھے اور ٹیڑھے کے درمیان بالعرض بیان ہوئی ہے۔ اور سیدھے راستہ سے مراد سنت کا راستہ ہے اور جائر یعنی ٹیڑھے راستہ سے مراد خواہشات، بدعات اور کفریہ ادیان و ملل کا راستہ ہے۔

۳؎ اگر اللہ تعالیٰ تم تمام کو ہدایت دینے کا ارادہ فرماتا تو تو تم تمام کی سیدھے راستہ کی طرف راہنمائی فرما دیتا۔ یہاں ہدایت سے مراد ایصال الی المطلوب ہے۔ یعنی مقصود تک پہنچانا ہے اور وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِیْلِ سے مراد اراءۃ الطریق یعنی راستہ دکھانا ہے۔

هُوَ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّ مِنْهُ شَجَرٌ فِیْهِ تُسِیْمُوْنَ ۝۱۰

"اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے اتارا آسمان سے پانی تمہارے لئے اس میں سے کچھ پینے کے کام آتا ہے [1] اور اس سے سبزہ اگتا ہے [2] جس میں تم (مویشی) چراتے ہو [3]"

[1] لکم انزل کا صلہ ہے یا شراب کی خبر ہے اور من تبعیضیہ اس کے متعلق ہے اور اس کی تقدیم حصر کا تصور پیش کرتی ہے اور وجہ حصر یہ ہے کہ کنوؤں اور چشموں کا پانی بھی بارش کے پانی سے ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَسَلَكَهٗ يَنَابِيْعَ اور ایک مقام پر ہے فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ

[2] ومنہ میں ہ ضمیر کا مرجع الماء (پانی) ہے، یعنی اس پانی سے تمہارے گھاس درختوں کی سیرابی اور تمہاری نباتات کی حیات ہے۔

[3] فیہ میں ہ ضمیر کا مراد گھاس اور درخت ہیں اور اس گھاس میں تم اپنے مویشی چراتے ہو۔ یہ سامت الماشیه و اسامها صاحبها سے مشتق ہے جس کا معنی ہے مالک نے اسے چرنے کے لئے چھوڑ دیا ہے۔ اسکی اصل السومہ ہے جس کا معنی علامت ہے کیونکہ جن مقامات پر مویشی چرتے ہیں وہاں آثار و علامات چھوڑ جاتے ہیں۔

يُنْۢبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّيْتُوْنَ وَالنَّخِيْلَ وَالْاَعْنَابَ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝۱۱

"اگاتا ہے تمہارے لئے اس کے ذریعہ [1] (طرح طرح کے) کھیت اور زیتون اور کھجور اور انگور اور (ان کے علاوہ) ہر قسم کے پھل [2] یقیناً ان تمام چیزوں میں (قدرت الٰہی کی) نشانی ہے اس قوم کے لئے جو غور و فکر کرتی ہے [3]"

[1] ینبت کو ابوبکر نے عاصم سے روایت کر کے جمع متکلم کا صیغہ یعنی (نون) کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے یا کے ساتھ غائب کا صیغہ پڑھا ہے۔ لکم بہ میں ہ ضمیر کا مرجع الماء ہے۔

[2] یہاں من تبعیضیہ ہے یعنی تمام پھلوں کا بعض۔ لفظ من تبعیضیہ ذکر فرمایا کیونکہ تمام پھل تو صرف جنت میں ہوں گے دنیا میں تو ان کا کچھ حصہ پیدا فرمایا تاکہ یہ جنت کے پھلوں کی یاد دلائیں جو چیزیں کھائی جاتی ہیں۔ ان سے پہلے مویشیوں کی غذا کا ذکر شائد اس لئے فرمایا کہ وہ حیوانی غذا بنتی ہیں اور حیوانی غذا نباتی غذاؤں سے افضل ہوتی ہے (اور پھر اسی غذاء نباتی میں حبوب (دانے) فواکہ (پھلوں) سے اشرف ہوتے ہیں)۔ اس لئے کھیتی کو مقدم فرمایا پھر زیتوں، نخیل اور انگور تمام پھلوں سے اشرف ہیں ان کا ذکر فرمایا اور پھر ان میں سے جس کے منافع زیادہ تھے اسے پہلے ذکر فرمایا۔ گویا یہ ترتیب واقعی پر دلیل ہے۔

[3] یعنی ان تمام اشیاء میں صانع کے وجود اس کے کمال علم حکمت بالغہ پر واضح دلالت ہے۔ اس قوم کے لئے جو غور و فکر کرتی ہے کیونکہ جو شخص غور و فکر کرتا ہے کہ ایک دانہ زمین میں گرتا ہے پھر اس میں نمی سرایت کرتی ہے تو اس کے اوپر کا حصہ پھوٹ پڑتا ہے۔ اس سے ایک کونپل نکلتی ہے اور اسی دانہ کا نیچے والا حصہ پھوٹ کر جڑوں کی شکل اختیار کرتا ہے پھر وہ بڑھتا جاتا ہے۔ اس سے پتے، کلیاں، پھول اور پھل مخصوص زمانہ میں پیدا ہوتے ہیں پھر ان سے ہر ایک کا جسم مختلف اشکال اور ذائقے رکھتا ہے حالانکہ مواد اور بیج ایک تھا۔ طبائع سفلیہ مٹی اور پانی اور طبائع علویہ تمام کو ایک جیسی میسر تھیں۔ اس تمام کرشمہ سازی کو دیکھ کر یقین ہو جاتا ہے کہ (یہ اندھی فطرت اور زمانہ کی کاری گری نہیں) بلکہ ایک فاعل مختار کی صنعت گری ہے جو ہر ضد وند سے پاک اور بلند ہے۔

وَ سَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ ۙ وَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ ؕ وَ النُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۙ

"اور اللہ تعالیٰ نے مسخر فرما دیا ہے تمہارے لئے رات، دن [1] سورج اور چاند کو اور تمام ستارے بھی [2] اسی کے حکم کے پابند ہیں [3] بیشک ان تمام چیزوں میں (قدرت الٰہی کی) نشانیاں ہیں اس قوم کے لئے جو دانشمند ہے [4]"

[1] رات اور دن کو تمہاری منفعتوں کے لئے تیار کیا ہے۔

[2] ابن عامر نے ان چاروں اسماء کو مرفوع پڑھا ہے کیونکہ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ؕ وَالنُّجُوْمُ مبتدا اور مسخرات خبر ہے۔ اہل حجاز، شام اور کوفہ امام حفص کے علاوہ نے چاروں اسماء کو منصوب پڑھا ہے کیونکہ پہلے تین النہار پر معطوف ہیں اور مسخرات ان تمام سے حال ہے، یعنی اس نے ان اشیاء کو تمہارے فائدہ کیلئے پیدا کیا ہے درآں حالیکہ یہ اللہ تعالیٰ کے تابع فرمان ہیں۔ اس نے ان کو پیدا فرمایا پھر ان کی خود تدبیر فرمائی جیسے چاہا۔ یا یہ معنی یہ مسخر ہیں ان کے جن کے لئے ان کو پیدا کیا گیا ہے۔ امام حفص نے الشمس والقمر کو النہار پر عطف کی بناء پر منصوب پڑھا ہے اور النجوم مسخرات کو ابتداء کی بناء پر مرفوع پڑھا ہے۔

[3] اس کی ایجاد اور تقدیر کے ساتھ یا اس کے حکم کے ساتھ۔ اس آیت کریمہ میں ان حقیقت ناشناسوں کا جواب اور رد ہے جو کہتے ہیں کہ نباتات کو تکوین میں مؤثر ستاروں کی حرکات وسکنات ہیں۔ اگر فرض کیا ان کی بات تسلیم کی بھی جائے تو اس میں شک نہیں کہ ستارے حادث ہیں اپنی ذات اور صفات کے لحاظ سے ممکن الوجود ہیں۔ بعض وجوہ محتملہ پر واقع ہیں تو ان کی اپنی تخلیق کے لئے کسی مخصوص اور واجب الوجود مختار ذات کا ہونا ضروری ہوگا تاکہ دور اور تسلسل لازم نہ آئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اشیاء فلکیہ یا عنصریہ کی تاثیرات عادیہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی سنت جاریہ یہ ہے کہ بعض اشیاء کو بعض اشیاء کے بعد پیدا فرماتا ہے۔ اس لئے یہ غلط ہے کہ حقیقتاً ایجاد کی نسبت کسی ایسی ذات کی طرف کی جائے جو اپنی ذات کے اعتبار سے معدوم ہے۔ جو چیز اپنی ذات میں معدوم ہے تو وہ دوسروں کو وجود کیسے عطا کر سکتی ہے۔

[4] یہاں آیات کو جمع اور عقل کو ذکر فرمایا کیونکہ ذوی العقول السلیمہ کے لئے ان میں ظاہری دلالات ہیں۔ کسی غور وفکر کی حاجت نہیں جیسا کہ نباتات کے احوال میں غور وفکر کی ضرورت تھی۔

وَ مَا ذَرَاَ لَكُمْ فِی الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۳﴾

"اور (علاوہ ازیں) جو پیدا فرمایا تمہارے لئے زمین میں (اسے بھی مسخر کر دیا) الگ الگ ہے ان کا رنگ و روپ [1] یقیناً ان میں (قدرت الٰہی کی) نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو نصیحت کو قبول کرتے ہیں [2]"

[1] دلیل پر اس کا عطف ہے یعنی تمہارے لئے مسخر کر دیا جو پیدا کیا۔ زمین میں حیوانات، نباتات اور معادن میں سے مختلفاً حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے کیونکہ عام طور پر اصناف رنگوں کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہیں۔

[2] جو نگاہ بصیرت سے دیکھتے ہیں ان کے لئے تو واضح نشانی ہے کہ ان اصناف میں طبائع، ہیئت اور مناظر میں اختلاف کسی صانع حکیم کی کرشمہ کاری سے ہے۔

وَ هُوَ الَّذِیْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِیًّا وَّ تَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْیَةً تَلْبَسُوْنَهَاۚ وَ تَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِیْهِ وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۴﴾

''اور وہی ہے جس نے پابند حکم کر دیا ہے سمندر کو[1] تا کہ تم کھاؤ اس سے تازہ گوشت[2] اور نکالو[3] اس سے زیور جسے تم پہنتے ہو[4] اور تو دیکھتا ہے کشتیوں کو[5] کہ موجوں کو چیر کر جارہی ہوتی ہیں سمندر میں[6] تا کہ (ان کے ذریعہ) تم تلاش کرو اللہ تعالیٰ کے فضل (رزق) کو[7] تا کہ تم (اسکا) شکرادا کرتے رہو[8]''

[1] اس نے سمندر کو اس طرح بنادیا ہے کہ تم اس پر سوار ہونے، اس میں سے شکار کرنے اور غوطہ زنی کی قدرت رکھتے ہو۔

[2] تا کہ تم کھاؤ اس سے تازہ گوشت، یعنی مچھلی یہاں مچھلی کی طراوت کے ساتھ صفت بیان فرمائی ہے۔ یہ تازہ ترین گوشت ہوتا ہے اور جلدی خراب ہوتا ہے۔ اس لئے اس کو کھانے کے لئے بھی جلدی کی جاتی ہے (اور تازہ تازہ کھائی جاتی ہے) اور مچھلی کھانے کے بعد پیاس اس لئے زیادہ محسوس ہوتی ہے کہ طبعاً انتڑیوں کے ساتھ چمٹ جاتی ہے اور طبیعت آنتوں سے اسے دور کرنے کیلئے پانی کی طرف مائل ہوتی ہے۔ پیاس کی وجہ مچھلی کے گرم یا خشک ہونے کی وجہ سے نہیں ہے۔ طراوت کے وصف کے ذکر میں قدرت کا اظہار ہے کہ کیسے اسے حکیم نے اپنی قدرت کاملہ سے کوڑے اور غلیظ پانی میں میٹھی اور تازہ چیز پیدا فرمادی۔ امام مالک اور الثوری نے اسی آیت سے دلیل پکڑی ہے کہ جو شخص قسم اٹھائے کہ میں گوشت نہیں کھاؤں گا تو وہ مچھلی کھانے سے حانث ہو جائے گا (کیونکہ یہاں مچھلی کو گوشت کہا گیا ہے)۔ احناف کی طرف سے اس کا یہ جواب دیا جاتا ہے کہ قسم کا مدار عرف پر ہوتا ہے اور مطلقاً گوشت سے مچھلی کا گوشت عرف میں مراد و مفہوم نہیں ہوتا مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے شر الدواب یہ کفار کے بارے میں ہے یعنی کفار کو برے دواب کہا گیا ہے لیکن اگر کوئی قسم اٹھائے کہ میں دابہ (جانور) پر سوار نہ ہوگا تو وہ کافر پر سوار ہو جائے تو حانث نہ ہوگا(1) کیونکہ (عرف میں دابہ کافر کے لئے استعمال نہیں ہوتا)۔

[3] اور نکالو تم اس سے زیور جسے تم پہنتے ہو مثلاً لوءلوء اور مرجان یعنی جن زیورات کو تمہاری عورتیں استعمال کرتی ہیں مردوں کی طرف زیورات کی نسبت اس لئے فرمائی کہ عورتیں مردوں سے ہیں اور دوسری وجہ یہ ہے کہ عورتیں مردوں کے لئے زیب و زینت کرتی ہیں۔

[4] اس کا عطف لتا کلوا پر ہے کیونکہ لتر کبوا الفلک کی قوت میں ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ مستقل کلام ہو۔

[5] یعنی اس میں پانی کی لہروں کو چیرتے ہوئے وہ کشتیاں گزرتی ہیں۔ قتادہ فرماتے ہیں آتے جاتے ہوئے ایک کشتی آتی ہے، دوسری جاتی ہے اور دونوں ایک ہوا سے چلتی ہیں۔ حضرت حسن فرماتے ہیں اس کا معنی ہے بھری ہوئی۔ فراء اور اخفش کہتے ہیں پانی کو اپنے پروں سے چیرتی ہوئے۔ مخر کا معنی پانی کو چیرنا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں المخر کشتی کے چلنے کی آواز کو کہتے ہیں۔ ابو عبیدہ فرماتے ہیں ہواؤں کے تیز چلنے کے وقت ہوا میں جو آواز ہوتی ہے اسے المخر کہتے ہیں۔ مجاہد فرماتے ہیں تمخر السفن الریاح یعنی کشتیاں ہواؤں سے ٹکراتی ہیں۔ قاموس میں ہے مخرت السفینة مخراً و مخوراً یعنی کشتی کے چلنے کے وقت ہواؤں کا سامنے آنا (اور کشتی کا انہیں چیرنا) مخر السابح کا معنی ہے۔ تیراک نے اپنے ہاتھوں سے پانی کو چیرا فلک مواخر وہ کشتیاں ہوں گی جن کے چلنے کے وقت آواز سنی جاتی ہے یا جو اپنے سینے کے ساتھ پانی چیرتی ہیں یا جو ایک ہوا کے ذریعے آتی جاتی ہیں۔

1۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 353 (فراس)

حدیث شریف میں ہے جب تم میں سے کوئی پیشاب کرنے کا ارادہ کرے تو ہوا کی طرف پیٹھ کرے(1)۔ استمخروا الریح بھی حدیث میں آیا ہے جس کا مطلب ہے اپنی پیٹھوں کو ہوا کی طرف کرو۔ گویا جب وہ اس کی طرف پیٹھ کرتا ہے تو اسے اپنی پیٹھ سے چیرتا ہے اور وہ ہوا اس کے دائیں اور بائیں سے گزر جاتی ہے۔

۲ یعنی تجارت کے لئے اس پر سوار ہو کر رزق کی وسعت تلاش کرو۔ اگر وتری الفلک لتاکلوا پر معطوف ہوگا تو لتبتغوا اس پر معطوف ہوگا اور اگر یہ کلام مستانفہ ہے تو یہ کلام مقدر پر معطوف ہوگا۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی۔ لتعبروا و لتبتغوا۔

۳ تم اس کی اپنے لئے مسخر چیزوں کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو۔ سمندر کے ذکر کے بعد شکر کا ذکر اس لئے فرمایا کیونکہ یہ بہت بڑا انعام ہے کہ اس نے ہلاکت والی جگہوں کو بھی انسان کے لئے تحصیل معاش کا سبب بنا دیا ہے۔ میں کہتا ہوں ان اشیاء کو ایسا بنایا کہ یہ شکر تک پہنچاتی ہیں یہ اس کا بہت بڑا انعام ہے کیونکہ پھر شکر دنیا میں مزید نعمت اور آخرت میں ثواب عظیم کا فائدہ دیتا ہے۔ گویا شکر تمام احسانات کا تتمہ ہے۔

وَ اَلْقٰى فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِكُمْ وَ اَنْهٰرًا وَّ سُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵﴾

”اور اللہ تعالیٰ نے گاڑ دیئے ہیں زمین میں اونچے اونچے پہاڑ تاکہ زمین لرزتی نہ رہے تمہارے ساتھ ۱ اور نہریں جاری کر دیں اور راستے بنا دیئے ۲ تاکہ تم (اپنی منزل کی) راہ پا سکو ۳“

۱ جمے ہوئے پہاڑ زمین میں گاڑ دیئے تاکہ تمہارے ساتھ لرزتی نہ رہے، یا یہ معنی کہ تمہارے ساتھ اس کا ڈولنا ناپسند تھا۔ المید کا معنی مضطرب ہونا ہے۔ زمین کے لرزنے کی وجہ یہ تھی کہ پہاڑوں کی تخلیق سے پہلے زمین کروی شکل میں تھی اور کسی ادنیٰ سبب سے حرکت کرنے لگتی تھی۔ جب اوپر بھاری بھرکم پہاڑ تخلیق کیے گئے تو وہ یہاں میخوں کی طرح ہو گئے جنہوں نے اسے حرکت سے روک دیا۔ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت وہب نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ نے زمین کو تخلیق فرمایا تو وہ ڈولنے لگی۔ فرشتوں نے کہا یہ تو اپنے اوپر کسی کو نہیں ٹھہرائے گی اللہ تعالیٰ نے اس کے اوپر صبح کو پہاڑ گاڑ دیئے۔ فرشتوں کو معلوم ہی نہ ہو سکا کہ پہاڑ کس چیز سے بنائے گئے ہیں(2)۔

عبد بن حمید، ابن جریر، ابن منذر اور ابن ابی حاتم نے قتادہ کے طریق سے عن الحسن عن قیس بن عباد کے سلسلہ سے روایت کیا ہے، فرمایا اللہ تعالیٰ نے جب زمین کو پیدا فرمایا تو وہ ڈولنے لگی فرشتوں نے کہا یہ تو اپنی پیٹھ پر کسی کو نہیں ٹھہرائے گی صبح ہوئی تو اس میں پہاڑ گاڑ دیئے تھے۔ انہیں معلوم ہی نہ ہوا کہ یہ کہاں سے پیدا ہوئے ہیں فرشتوں نے کہا اے ہمارے پروردگار ان پہاڑوں سے زیادہ بھی کوئی چیز تیری مخلوق میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہاں لوہا ہے۔ پھر فرشتوں نے پوچھا لوہے سے بھی کوئی سخت چیز تیری مخلوق میں ہے فرمایا ہاں آگ ہے۔ پھر فرشتوں نے عرض کی ہائے ہمارے رب آگ سے سخت چیز بھی کوئی تیری مخلوق میں ہے؟ فرمایا ہاں پانی ہے۔ فرشتوں نے پوچھا اے ہمارے رب پانی سے زیادہ کوئی سخت چیز تیری مخلوق میں ہے؟ فرمایا ہاں ہوا ہے۔ پھر فرشتوں نے پوچھا اے ہمارے رب ہوا سے بھی کوئی سخت چیز تیری مخلوق میں ہے؟ فرمایا ہاں مرد ہے۔ پوچھا اے ہمارے رب مرد سے زیادہ سخت چیز تیری مخلوق میں ہے؟ فرمایا ہاں عورت ہے(3)۔ اگر کوئی پوچھے کہ کیا اس سوال کی یہی حد ہے؟ میں کہوں گا نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ بہت قوی اور سخت ہے۔ اس کے علاوہ تمام ممکنات عاجز اور اپنی ذات کے اعتبار سے معدوم ہیں۔ پس جس جگہ اس کی قوت متجلی ہوتی ہے وہ چیز

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 68 (التجاریہ)　　2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 69 (التجاریہ)
3۔ در منثور، جلد 4، صفحہ 12-211 (العلمیہ)

دوسری چیزوں پر غالب آ جاتی ہے مثلاً ہاتھی چیونٹی سے طاقت ور ہے لیکن اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو ہاتھی کے عجز کو ظاہر کر دے اور چیونٹی کو غالب کر دے کیونکہ جب اس کی قوت کا عکس چیونٹی پر پڑے گا تو وہ ہاتھی پر غالب آ جائے گی قوت کبھی تمام وجوہ کے اعتبار سے ایک شی کی دوسری اشیاء سے زائد ہوتی ہے اور کبھی کسی ایک وجہ سے مذکورہ اشیاء میں یہی چیز متحقق ہے۔ واللہ اعلم۔

۲؎ وانھارا جعل کا یہ مفعول ہوگا کیونکہ القی میں جعل کا معنی موجود ہے۔

۳؎ تم اپنے مقاصد تک راہنمائی حاصل کر سکو۔ یا یہ معنی کہ تاکہ تم ان راستوں سے استدلال کر کے اللہ تعالیٰ کی معرفت پا سکو۔

وَعَلٰمٰتٍ ؕ وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۶﴾

''اور (راستوں پر) علامتیں بنادی ہیں اور ستاروں کے ذریعہ سے وہ راہ یاب ہوتے ہیں ۲؎ ''

۱؎ اور راستوں پر درختوں، پہاڑوں، ہواؤں اور ستاروں وغیرہ کی علامتیں بنادی ہیں جن سے قافلے راہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ ان علامات میں سے اسباب اور علل شرعیہ بھی ہیں جیسے اوقات جو نماز، روزہ اور زکوٰۃ کے وجوب کے لئے اسباب ہیں اور نشہ حرمت کی علت ہے۔ ان ہی علامات میں سے طبعیہ اور عقلیہ دلائل ہیں جیسے جیسے نبض کی سرعت بخار کی علامت ہے اور عالم صانع کی دلیل ہے اسی طرح معجزہ نبوت کی دلیل ہے۔

۲؎ اور ستاروں کے ذریعہ سے صحراؤں اور پہاڑوں میں رات کے وقت راہنمائی حاصل کرتے ہیں یہاں النجم پر الف لام جنس کا ہے۔ یعنی عام ستارے مراد ہیں۔ محمد بن کعب فرماتے ہیں علامات سے مراد پہاڑ ہیں اور پہاڑ دن کی علامات ہیں اور ستارے رات کی علامات ہیں (۱)۔ کلبی کہتے ہیں تمام علامات سے مراد نجوم ہیں۔ کچھ ستارے علامات ہوتے ہیں اور کچھ ستاروں سے لوگ ہدایت یا رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ سدی کہتے ہیں نجوم سے مراد ثریا، وہ سات ستارے جو قطب شمالی کی طرف ہوتے ہیں اور فرقدین اور جدی ہیں۔ ان کے تمام ستاروں کے ذریعے راستے اور قبلہ کی طرف راہنمائی حاصل کی جاتی ہے۔ میں کہتا ہوں یہ ستارے اس لئے مراد لئے گئے ہیں کیونکہ یہ قطب شمالی کے قریب ہوتے ہیں اور ان کے دائرہ کے چھوٹا ہونے کی وجہ سے یہ اپنی جگہوں سے بہت کم حرکت کرتے ہیں ' ضمیر کا مرجع قریش ہیں کیونکہ یہ لوگ اکثر تجارت کی غرض سے رات کے وقت سفر کرتے تھے اور یہی لوگ ستاروں سے راہنمائی حاصل کرنے میں مشہور بھی تھے۔ اسی وجہ سے النجم کو مقدم کیا اور ضمیر کو مقدم کیا ' تخصیص کے لئے خطاب کے صیغہ سے عدول فرمایا۔ گویا یوں ارشاد ہے کہ چونکہ ستاروں سے خصوصی طور پر قریش راہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ اس لئے شکر و اعتبار بھی ان پر زیادہ لازم ہے۔

اَفَمَنْ يَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا يَخْلُقُ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۱۷﴾

''کیا وہ ذات جس نے سب کچھ پیدا فرمایا اس کی مانند ہو سکتی ہے جس نے کچھ بھی نہیں بنایا کیا ۱؎ تم اتنا بھی غور نہیں کرتے ۲؎ ''

۱؎ اَفَمَنْ يَّخْلُقُ سے مراد اللہ تبارک وتعالیٰ ہے كَمَنْ لَّا يَخْلُقُ سے مراد اللہ تعالیٰ کے سوا جن کی عبادت کی جاتی ہے۔ اس میں ایسا لفظ استعمال فرمایا جو ذوالعقول کے لئے استعمال ہوتا ہے تو اس میں ذوالعقول کو غلبہ دیا گیا ہے، اگرچہ معبودان باطلہ میں غیر ذوالعقول بھی تھے۔ یا اس سے مراد بت ہیں اور صیغہ ذوالعقول والا اس لئے استعمال فرمایا کیونکہ مشرک انہیں (خدا) کہتے تھے اور ان کو اہل علم سے ہونا

۱۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 69 (التجاریہ)

چاہئے۔ اس لئے ان کے زعم وخیال کے مطابق صیغہ استعمال کیا ہے۔ یامن یخلق کے مقابلہ میں اس کا ذکر ہو رہا تھا اس لئے اسی جیسا لفظ استعمال فرمایا گیا۔ یا مبالغہ کے لئے ایسا کیا گیا ہے۔ گویا یوں کہا گیا ہے کہ جو پیدا کرتا ہے اس کی مانند تو ذوالعقول میں سے جو کچھ پیدا نہیں کرتے وہ بھی نہیں ہیں۔ پھر بے علم اس کی مانند کیسے ہو سکتے ہیں۔ ہمزہ انکار کے لئے اور فاء تعقیب کیلئے ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے کمال علم اور عظیم قدرت اور حکمت متقنہ اور تخلیق میں اس کے یکتا ہونے پر اتنے واضح اور کثیر دلائل کے بعد اس کے ایسے شریک کا کوئی معنی نہیں سوجھتا جو اشیاء کی تخلیق میں اس کی مثل نہیں ہے بلکہ وہ جواہر و اعراض میں سے کسی چیز کی تخلیق پر قادر نہیں حتی کہ ایک مکھی کو اڑانے اور اسے دور کرنے پر بھی قادر نہیں۔ وَ اِنْ یَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَیْــٴًـا لَّا یَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ حق تو یہ تھا کہ کلام یوں ہوتی اَفَمَنْ یَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا یَخْلُقُ ہو لیکن اس کے برعکس ذکر فرمایا اس بات پر تنبیہ کرنے کے لئے انہوں نے اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرا کر اس کو عاجز مخلوق کی جنس کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔

۲ نصیحت آموز اور عبرت آمیز اشیاء کے مشاہدہ کے بعد اعتبار اور نصیحت حاصل کرنے پر انکار ہے۔

وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۸﴾

"اور اگر تم شمار کرنا چاہو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو تو تم انہیں گن نہیں سکو گے ۱ یقیناً اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے ۲"

۱ یعنی تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو شمار ہی نہیں کر سکتے، چہ جائیکہ تم ان کا شکر ادا کر سکو۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ذکر کی گئی نعمتوں میں منحصر نہیں ہیں بلکہ یہ غیر محصور ہیں۔ پس اس کی عبادت کا حق ادا کرنا کسی کے مقدور میں بھی نہیں تم سے مقصود و مطلوب صرف کلیۃً توجہ الی اللہ اور اپنی کوتاہی کا اعتراف ہے۔

۲ تمہاری ان نعمتوں پر شکر کی تقصیر کو وہ معاف فرمانے والا ہے اور تم پر وہ بڑا رحیم ہے کیونکہ اس نے تمہارے استحقاق سے پہلے تم پر نعمتیں وسیع فرما دیں اور پھر تمہاری کوتاہیوں اور جفاؤں کے باوجود وہ نعمتوں کا سلسلہ منقطع نہیں فرماتا اور تمہارے کفران نعمت پر تمہارا عقوبت کے ساتھ مواخذہ نہیں فرماتا۔

وَ اللّٰهُ یَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَ مَا تُعْلِنُوْنَ ﴿۱۹﴾

"اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو تم چھپاتے ہو ۱ اور جو تم ظاہر کرتے ہو ۲"

۱ اللہ تعالیٰ تمہارے پوشیدہ عقائد، نیات، شکر، حقوق عبودیت کی ادائیگی سے اپنی کمزوری کا علم یا تمہاری غفلتوں اور تکبر کو جانتا ہے۔

۲ اور تمہارے ظاہری اعمال صالحہ یا فاسدہ کو بھی وہ جانتا ہے اس لئے تمہیں وہ اس پر جزاء دے گا۔

وَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا یَخْلُقُوْنَ شَیْــٴًـا وَّ هُمْ یُخْلَقُوْنَ ﴿۲۰﴾ ط

"اور جو لوگ پوجتے ہیں اللہ کے سوا (غیروں کو) ۱ وہ نہیں پیدا کر سکتے کوئی چیز ۲ بلکہ وہ خود پیدا کئے گئے ہیں ۳"

۱ عاصم اور یعقوب نے یَدْعُوْنَ کو یاء کے ساتھ اور باقی قراء نے تاء کے ساتھ پڑھا ہے۔

۲ وہ کوئی چیز بھی پیدا نہیں کر سکتے، خواہ وہ جواہر و اعراض میں کتنی ہی چھوٹی اور حقیر کیوں نہ ہو، چہ جائیکہ آسمانوں اور زمینوں کی تخلیق میں وہ اس کے شریک بنیں۔ پھر وہ انہیں کیونکر خدا سمجھ کر پکارتے ہیں اور کیونکر ایسے بے جان اللہ کے شریک ہو سکتے ہیں۔

3 ان کے اپنے وجود ہی پتھر اور لکڑی سے تراشے گئے ہیں۔ ان کی تو اپنی ذات ہی وجود کی مقتضی نہیں ہے تو پھر ان سے کسی دوسری چیز کی تخلیق کا یا کسی دوسری چیز کے وجود کا تصور کیسے ہو سکتا ہے۔

اَمْوَاتٌ غَیْرُ اَحْیَآءٍ ۚ وَمَا یَشْعُرُوْنَ ۙ اَیَّانَ یُبْعَثُوْنَ ﴿۲۱﴾

"وہ مردہ ہیں وہ زندہ نہیں 1 اور وہ نہیں سمجھتے 2 کہ کب انہیں اٹھایا جائے گا 3"

1 یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے یعنی ہم اموات۔ اگر اسم موصول سے مراد بت ہوں تو معنی یہ ہوگا کہ یہ مردہ ہیں ان پر حیات کا سلسلہ جاری ہی نہیں ہوا اور اگر اسم موصول سے مراد ہر معبود باطل ہے تو معنی یہ ہوگا کہ وہ تو اپنی ذات کے اعتبار سے مردہ ہیں زندہ نہیں ہیں۔ بلکہ ان کی اپنی حیات ہی مستعار ہے حی و قیوم ذات سے تو پھر یہ دوسروں کو کیسے زندگی عطا کر سکتے ہیں۔ جن کی یہ حیثیت ہے تو وہ الٰہ کیسے بن سکتے ہیں۔

2 چونکہ وہ مردہ اور خود مخلوق ہیں اس لئے جانتے ہی نہیں۔

3 یعنی ان کا دوبارہ اٹھنا اور ان کے عبادت گزاروں کا دوبارہ اٹھنا جب ان کے اختیار میں اور ان کے علم میں نہیں تو پھر وہ اپنے عبادت گزاروں کی جزاء پر کیسے قادر ہوں گے۔ پھر ایسے بے جان بتوں کی عبادت کا کیا فائدہ ہے۔ پس یہ عبادت کے مستحق ہی نہیں ہیں۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ دوبارہ اٹھنے کا عقیدہ رکھنا بھی لوازم تکلیف میں سے ہے۔

اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَالَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ وَّ هُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۲۲﴾

"تمہارا خدا (بس) خدائے واحد ہے 1 پس جو لوگ ایمان نہیں لاتے آخرت پر ان کے دل منکر ہیں 2 اور وہ مغرور ہیں 3"

1 حجت کے قیام کے بعد مدعیٰ کو دوبارہ یاد دلایا کہ حجت سے ثابت ہو چکا ہے کہ تمہارا خدا ایک ہے۔

2 جب اللہ تعالیٰ نے ان پر اتنی بے حد و حساب نوازشات فرمائی ہیں کہ ان کا شمار نہیں ہو سکتا حالانکہ وہ نعمتیں بالکل عیاں اور بدیہی ہیں لیکن پھر ان کے انکار کی وجہ صرف یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں نور معرفت کا بیج ڈالا ہی نہیں ہے اس لئے وہ حق دیکھنے سے اندھے ہو گئے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرو سے مروی ہے، فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو تاریکی میں پیدا فرمایا۔ پھر ان پر اپنے نور کو برسایا جسے یہ نور مل گیا وہ ہدایت پا گیا اور جو اس نور سے محروم ہو گیا وہ گمراہ ہو گیا اسی وجہ سے میں کہتا ہوں قلم اللہ تعالیٰ کے علم پر خشک ہو گیا۔ (احمد، ترمذی)(1)

3 وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت سے تکبر کرتے ہیں وہ اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کا حق عبادت سمجھتے ہی نہیں ہیں کیونکہ اس کی نعمتوں کا انکار کرتے اور اتباع رسول سے تکبر کرتے ہیں۔ اگر وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا اعتراف کر کے اللہ تعالیٰ کی ذات کو مستحق عبادت سمجھتے تو یقیناً وہ آخرت پر ایمان لاتے جس میں عبادت کی جزاء ملے گی اور عبادت کے ترک پر سزا ملے گی اور وہ سنت نبوی کی پیروی سے اعراض نہ کرتے بلکہ ہدایت کے راستہ کی تلاش میں پوری کوشش صرف کرتے۔

1۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی، جلد 9، صفحہ 79 (العلمیہ)

لَا جَرَمَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ ﴿۲۳﴾

''یقیناً[1] اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو وہ چھپاتے ہیں[2] اور جو وہ ظاہر کرتے ہیں[3] بیشک وہ پسند نہیں کرتا غرور و تکبر کرنے والوں کو[4]۔''

[1] یا تو یہ حق حقا کے معنی میں ہے یا لا بد یا لا محالہ کے معنی میں ہے، یا یہ معنی کہ جس نظریہ پر یہ کفار قائم ہیں یہ نہیں ہونا چاہئے تھا استکبار کا معنی ہے کوشش کرنے والے کا حکم کو حاصل کرنا۔

[2] اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو وہ انکار نعمت اور اسے مستحق عبادت نہ سمجھنے کا خیال دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں۔

[3] اور عبادت الٰہی اور رسول مکرم ﷺ کی اتباع سے تکبر و غرور کا جو وہ اظہار کرتے ہیں وہ اسے بھی جانتا ہے۔ ان اپنے اسم خبر سے مل کر سابقہ تاویلات پر محل رفع میں ہے کیونکہ یہ لا جرم کا فاعل ہے اور آخری تاویل مفعول ہونے کی حیثیت سے محل نصب میں ہے اور جرم کا فاعل مضمر ہے۔

[4] اللہ تعالیٰ غرور و تکبر کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جنت میں ذرہ برابر کبر داخل نہ ہوگا اور ایمان کا ذرہ برابر بھی دوزخ میں داخل نہ ہوگا۔ ایک شخص نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ ایک شخص پسند کرتا ہے کہ اس کا لباس اچھا ہو (وہ تکبر میں شامل ہے)۔ آپ ﷺ نے فرمایا اِنَّ اللّٰهَ جَمِيْلٌ يُّحِبُّ الْجَمَالَ اَلْكِبْرُ مَنْ بَطَرَ الْحَقَّ وَ غَمَصَ النَّاسَ اللہ تعالیٰ خود بھی خوبصورت ہے اور خوبصورتی کو پسند کرتا ہے اور کبر یہ ہے کہ توحید و عبادت جسے اللہ تعالیٰ نے حق فرمایا ہے اسے کوئی شخص باطل قرار دے اور لوگوں کو حقیر سمجھے۔ اس حدیث کو امام مسلم نے عبد اللہ بن مسعود سے روایت کیا ہے(1)۔ بطر الحق کا معنی نہایہ میں اس طرح لکھا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں حق کے وقت ظلم کرے اور اور حق کو حق نہ سمجھے۔ بعض فرماتے ہیں تکبر یہ ہے حق سے اعراض کرے اور اسے قبول نہ کرے میں کہتا ہوں ان تمام اقوال کا حاصل یہ ہے کہ وہ اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کی عبادت واجب نہیں سمجھتا کیونکہ وہ اپنے اوپر اس کے انعامات کا منکر ہے بلکہ اس کا خیال یہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ نے مجھ پر نوازشات فرمائی ہیں وہ اللہ تعالیٰ پر میرا حق تھیں۔

میں کہتا ہوں کبر کو ایمان کے مقابلہ میں ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ حدیث شریف میں ہے مومن اپنے وجود اور اس کے کمالات کو اللہ تعالیٰ کی عطا سمجھتا ہے اور اپنے نفس کو بذاتہ ان کمالات سے عاری اور خالی جانتا ہے۔ اس لئے وہ تکبر و غرور نہیں کرتا اور کافر اپنے وجود اور اس کے توابع کو اپنا ذاتی کمال سمجھتا ہے۔ اس لئے وہ اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے اور اس کبیر و متعال ذات کو بھول جاتا ہے۔ تصوف کی اصطلاح میں یہ ہے کہ انسان اپنے نفس اور وجود کو فانی اور کمالات سے عاری سمجھے اور سب کچھ اللہ تعالیٰ کا عطیہ سمجھے۔ واللہ اعلم۔

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ مَّاذَاۤ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ ۙ قَالُوْۤا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۲۴﴾

''اور جب ان سے پوچھا جاتا ہے[1] کہ کیا نازل فرمایا ہے تمہارے پروردگار نے[2] کہتے ہیں (کچھ نہیں) یہ تو پہلے لوگوں کے من گھڑت قصے ہیں[3]۔''

[1] یہ واقعہ اس طرح ہے کہ جب عرب کے مختلف قبائل کو نبی مکرم ﷺ کے اعلان نبوت کی خبر پہنچی تو انہوں نے حقیقت حال معلوم کرنے کے لئے ایام حج میں اپنے آدمی بھیجے۔ جب انہوں نے ان مشرکین مکہ سے پوچھا جو مختلف گھاٹیوں میں ایام حج میں بیٹھ کر نبی

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 65 (قدیمی)

کریم ﷺ کے متعلق مذموم پروپیگنڈہ کرتے تھے تو انہوں نے کہا وہ مدعی نبوت پرانے لوگوں کے قصے سناتا ہے (اس کے پاس کوئی کلام الٰہی وغیرہ نہیں ہے)

۲؎ ماذا، انزل کی وجہ سے منصوب ہے، یعنی اس نے کیا نازل کیا یا مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے، یعنی کونسی چیز تمہارے رب نے نازل کی ہے۔

۳؎ سطر لائن کو کہتے ہیں، خواہ وہ کتاب کی ہو یا درختوں کی ہو یا لوگوں کی ہو۔ اس کی جمع اسطر وسطور واسطار ہے اور جمع الجمع اساطیر اور اسطرہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس کلام کے متعلق پوچھا جا رہا ہے اس کا کوئی مقام ومرتبہ نہیں ہے۔ وہ تو پہلے لوگوں نے جھوٹ لکھے ہیں جن کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اس طرح ایک اور قول ان کا قرآن حکیم میں ہے اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا۔ اور اس شخص نے لکھوا لیا انہیں۔ پھر یہ پڑھ کر سنائے جاتے ہیں اسے ہر صبح وشام (تاکہ ازبر ہو جائیں)

لِيَحْمِلُوْۤا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۙ وَ مِنْ اَوْزَارِ الَّذِيْنَ يُضِلُّوْنَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَزِرُوْنَ ۝۲۵

”تاکہ (اس ہرزہ سرائی کے باعث) وہ اٹھائیں اپنے (گناہوں کے) پورے بوجھ قیامت کے دن ۱؎ اور ان لوگوں کے بوجھ بھی اٹھائیں جنہیں وہ گمراہ کرتے رہتے ہیں ۲؎ جہالت سے ۳؎ کتنا برا (اور گراں ہے) یہ بوجھ جسے وہ اپنے اوپر لادر ہے ہیں ۴؎“

۱؎ لیحملوا قالوا کے متعلق ہے یعنی انہوں نے یہ بات اس لئے کی تاکہ لوگوں کو گمراہ کریں اور اٹھائیں اپنی گمراہی کے گناہ مکمل طور پر کامل فرمایا کیونکہ ان کے گمراہی میں راسخ اور پختہ ہونے کا نتیجہ ان کی گمراہی تھی۔

۲؎ یعنی قیامت کے دن وہ ان گمراہ لوگوں کے بعض گناہ اٹھائیں گے جو انہوں نے ان کے گمراہ کرنے کی وجہ سے کیے ہوں گے۔ ان کے تمام گناہ ان کے ذمہ نہ ہوں گے کیونکہ جو گناہ انہوں نے خود کیے ہوں گے۔ ان کے گمراہ کرنے کا عمل دخل نہ ہوگا وہ ان کافروں کے ذمہ نہ ہوں گے اور جو انہوں نے ان کفار کے گمراہ کرنے سے کیے ہوں گے وہ ان کا بوجھ اٹھائیں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو ہدایت کی طرف بلاتا ہے اسے ان تمام لوگوں کے اجر کی مثل اجر ملے گا جو اس کی اس نیک کام میں اتباع کریں گے اور ان متبعین کے اجور میں بھی کچھ کمی نہ ہوگی اور جو گمراہی کی طرف بلاتا ہے۔ تو جتنے لوگ اس برائی میں اس کی اتباع کریں گے۔ ان تمام کے گناہوں کی مثل اس کو گناہ ملے گا اور ان گمراہی کے پیروکاروں کے گناہوں میں بھی کچھ کمی نہ ہوگی۔ اس حدیث کو امام احمد، مسلم اور اصحاب سنن اربعہ نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے[1]۔

۳؎ بِغَيْرِ عِلْمٍ، يُضِلُّوْنَهُمْ کے فاعل سے حال ہے یا یہ معنی کہ وہ ان لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں جو نہیں جانتے کہ وہ گمراہ ہیں۔ اس صورت میں مفعول سے حال ہوگا اس میں تنبیہ ہے کہ جہالت کوئی عذر نہیں ہے کیونکہ ان پر لازم تھا کہ وہ حق وباطل میں تمیز کرتے۔

۴؎ یعنی بہت بری چیز ہے جو وہ اٹھا رہے ہیں یہاں یا تو بمعنی اشیاء ہے یا ما بمعنی الذی ہے۔ فاعل ہونے کی حیثیت محل رفع میں ہے یا ضمیر مبہم سے تمیز کی حیثیت سے منصوب ہے اور مخصوص بالذم محذوف ہے۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 341 (قدیمی)

قَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَاَتَى اللّٰهُ بُنْيَانَهُمْ مِّنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَيْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَ اَتٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝۲۶

”(دعوت حق کے خلاف) مکروفریب کیا کرتے تھے وہ لوگ جو ان منکر سے پہلے گزرے پس اللہ تعالیٰ نے ان کے (فریب) کی عمارت جڑوں سے اکھیڑ کر رکھ دی پس گر پڑی ان پر چھت ان کے اوپر سے اور آ گیا ان پر عذاب جہاں سے انہیں خیال وگمان بھی نہ تھا۔[1]“

[1] ان سے پہلے جو کافر تھے انہوں نے بھی بڑے حیلے اور سازشیں کیں تاکہ اللہ کے رسولوں کو فریب دیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا امر آ پہنچا ان کی مکاریوں اور دغابازیوں کو جڑ سے اکھیڑنے کے لئے اور وہ عذاب آیا وہاں سے جہاں سے انہیں اس کے آنے کا گمان اور توقع نہ تھی۔ پس ان کے اپنے حیلے دفریب ہی ان کی ہلاکت کے اسباب بن گئے۔ ان کی مثال بعینہٖ اس قوم کی مثل تھی جنہوں نے کوئی عمارت اس لئے بنائی تاکہ اس میں پناہ لیں اور اس میں رہ کر اپنے دشمن کے خلاف سازشیں کریں۔ پس اس عمارت کے ستون کمزور ہو گئے اور ان کے اوپر اس عمارت کی چھت گر پڑی اور وہ ہلاک ہو گئے۔ یہ قرآن حکیم کی آیت بطور تمثیل ذکر کی گئی ہے (حقیقتاً ان پر چھت نہیں گری تھی)

ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے ابن عباس سے نقل کیا ہے اور امام بغوی نے بھی ابن عباس سے ذکر کی ہے اور وہب سے مروی ہے کہ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ سے مراد نمرود بن کنعان ہے جس نے ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے رب کریم کے متعلق جھگڑا کیا تھا۔ اس نے بابل میں ایک محل بنایا تھا تاکہ آسمان کی طرف چڑھ جائے اور اس محل کی اونچائی پانچ ہزار ہاتھ تھی۔ کعب اور مقاتل فرماتے ہیں اس محل کی لمبائی دو فرسخ تھی ہوا چلی تھی جس سے وہ محل سمندر میں گر گیا اور وہ محل ان نمرودیوں کے اوپر گر پڑا تھا۔ پس وہ تمام نیچے آ کر ہلاک ہو گئے تھے (1)۔

ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُخْزِيْهِمْ وَ يَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تُشَآقُّوْنَ فِيْهِمْ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اِنَّ الْخِزْيَ الْيَوْمَ وَ السُّوْٓءَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۝۲۷

”اس کے بعد روز قیامت اللہ تعالیٰ انہیں ذلیل ورسوا کرے گا[1] اور (ان سے) پوچھے گا کہاں ہیں وہ میرے شریک[2] ان کے بارے میں تم جھگڑا کیا کرتے تھے[3] بیں گے وہ لوگ جنہیں علم دیا گیا ہے کہ[4] بلاشبہ آج ہر قسم کی رسوائی اور بربادی کافروں کے لئے ہے[5]“

[1] اللہ تعالیٰ انہیں دنیا میں عذاب دینے کے سوا قیامت کے روز مزید عذاب دے گا اور انہیں رسوا کرے گا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ۔

[2] اللہ تعالیٰ فرشتوں کی زبان پر انہیں توبیخ فرمائے گا اَيْنَ شُرَكَآءِيَ کہاں ہیں میرے شریک۔ ان کو جھٹر کنے میں زیادتی کرنے کے لئے استہزاءً اور حکایۃً اپنی طرف نسبت کی کیونکہ وہ انہیں اللہ تعالیٰ کا شریک سمجھتے تھے۔ البزی نے بغیر ہمزہ کے شرکای پڑھا ہے اور باقی قراء نے ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 71 (التجاریہ)

۳۔ اے کافرو! تم جھگڑا کیا کرتے تھے رسول کریم ﷺ اور مومنین سے۔ جمہور نے تُشَآقُّوْنَ یعنی نون کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے جو یاء متکلم کے حذف پر دلالت کرتا ہے، یعنی تشاقونی کیونکہ مومنین سے جھگڑا حقیقت میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ جھگڑا کرنا ہے۔

۴۔ انبیاء کرام ملائکہ اور مومنین نے کفار پر شماتت کے اظہار اور ان کی اہانت کی زیادتی اور اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کی نعمت و ہدایت پر شکر کرنے کیلئے کہیں گے۔ اس حکایت میں ہر سننے والے کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک لطف ہے۔

۵۔ یعنی ذلت و رسوائی اور عذاب قیامت کے دن علی الکافرین کفار پر مسلط ہو گا۔

الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ۠ فَاَلْقَوُا السَّلَمَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْٓءٍ ؕ بَلٰٓى اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۞

"جن کی جانیں فرشتے قبض کرتے ہیں ۱؎ درآں حالیکہ وہ اپنے آپ پر ظلم کر رہے ہیں ۲؎ سر تسلیم خم کرتے ہوئے کہتے ہیں ہم تو کوئی برا کام نہیں کیا کرتے تھے ۳؎ (اہل علم جواب دیں گے) نہیں نہیں تم بڑے بدکار تھے بیشک اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو (برے کام) تم کیا کرتے تھے ۴؎"

۱؎ حمزہ نے دونوں جگہ یتوفھم بالیاء مذکر کا صیغہ پڑھا ہے اور باقی قراء نے تاء کے ساتھ تانیث کا صیغہ پڑھا ہے کیونکہ فاعل مونث لفظی غیر حقیقی ہے۔ ملائکہ سے مراد ملک الموت اور اس کے معاون فرشتے ہیں۔

۲؎ اپنے نفسوں پر کفر اختیار کر کے ظلم کیا کیونکہ انہوں نے اپنے نفسوں کو دائمی عذاب کے لئے خود پیش کیا تھا۔ یہ حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

۳؎ تب وہ سر تسلیم خم کرتے ہوئے کہتے ہیں ہم نے تو کوئی کفر اور حد سے تجاوز کرنے والا کوئی کام نہیں کیا تھا۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ السَّلَمَ کی تفسیر ہو اور اس سے مراد وہ قول ہو جو استسلام پر دلالت کرتا ہے۔ پس موت کے فرشتے انہیں جواب دیں گے۔ بَلٰی

۴؎ کیوں نہیں تم برائیاں کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو تم برائیاں کرتے تھے وہ تمہیں ان کرتوتوں پر یقیناً سزا دے گا اور تمہارا ان کا تمہیں کچھ نفع نہ دے گا۔ عکرمہ فرماتے ہیں اس سے مراد وہ کفار ہیں جو بدر میں قتل ہوئے تھے (1)۔ بعض علماء فرماتے ہیں فَاَلْقَوُا السَّلَمَ سے آخر آیات تک مستقل کلام ہے اور یہ قیامت کے دن کی ان کی حالت کی شرح کی طرف لوٹتی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جواب دینے والا اللہ تعالیٰ ہو اور اہل علم ہوں۔

فَادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ فَلَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ۞

"(اے کفار) پس داخل ہو جاؤ جہنم کے دروازوں سے ۱؎ تمہیں ہمیشہ رہنا ہو گا ۲؎ ہاں بیشک برا ٹھکانہ ہے غرور و تکبر کرنے والوں کے لئے ۳؎"

۱؎ جہنم کی ہر نوع کا ایک دروازہ ہے جو اس کے لئے بنایا گیا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں ابواب جہنم سے مراد جہنم کے عذاب کی مختلف صورتیں ہیں۔

۲؎ اس میں ان کا ہمیشہ رہنا مقدر کیا گیا ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 72 (التجاریۃ)

۷؎ مستکبرین سے مراد کفار ہیں اور مخصوص بالذم ہم ہے۔

وَقِيْلَ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا مَاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ ؕ قَالُوْا خَيْرًا ؕ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ؕ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ ؕ وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ ۙ﴿۳۰﴾

"اور (یونہی) پوچھا گیا ان سے جو متقی تھے کہ وہ کیا ہے جو اتارا تمہارے رب نے انہوں نے کہا (سراپا) خیر ۱؎ جنہوں نے اچھے کام کئے اس دنیا میں بھی ان کے لئے بھلائی ہے ۲؎ اور آخرت کا گھر بھی (ان کے لئے) بہتر ہے ۳؎ اور بہت ہی عمدہ ہے پرہیزگاروں کا گھر ۴؎"

۱؎ پوچھا ان سے جو گمراہ ہونے اور گمراہ کرنے سے بچے رہیں۔ ان عرب قبائل کے آنے والوں نے تمہارے رب نے کیا اتارا ہے۔ تو مومنین نے کہا ہمارے رب نے بہتر کلام نازل فرمایا ہے جس میں دین، دنیا اور آخرت کی صلاح وفلاح ہے۔ خیراً کی نصب اس بات کی دلیل ہے کہ انہوں نے جواب میں توقف نہیں کیا تھا اور انزال کا اعتراف کرتے ہوئے سوال پر جواب کو ملا دیا تھا، جبکہ کفار نے کلام کو جواب سے کاٹ دیا تھا اور مبتدا بنا کر مرفوع پڑھا تھا اور انہوں نے انزال کا اعتراف بھی نہیں کیا تھا کیونکہ انہوں نے کہا تھا ھو اساطیر الاولین۔ یعنی اس کا کوئی مرتبہ نہیں ہے۔

۲؎ جن کے عقائد اور اعمال عمدہ تھے اس دنیا میں یہ فی ھذہ الدنیا احسنوا کے متعلق ہے۔ ابن عباس نے فرمایا حسنۃ سے مراد اجر کو دس گنا تک بڑھانا ہے، ضحاک فرماتے ہیں حسنۃ سے نصرت اور فتح ہے۔ مجاہد کہتے ہیں یہ رزق حسن ہے(1)۔ میں کہتا ہوں حسنہ سے مراد دنیا میں ایسی پاکیزہ زندگی ہے جس سے خالق راضی ہو اور جوہر عقل سلیم اور طبع مستقیم رکھنے والی مخلوق کو پسند ہو اور ایسی زندگی اسی کی ہو سکتی ہے جو اپنے جیسے ممکن اور عاجز کی عبادت نہ کرے بلکہ اللہ واحد قہار کی عبادت کرے اور اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کے قرب کے درجات حاصل کرے پاکیزہ چیزوں کو حلال سمجھے اور خبائث کو حرام۔ بغیر حق کے کسی کو اذیت نہ پہنچائے اور ایسے اعمال کرے جن کا ثمر ابدی اور سرمدی ہو۔

۳؎ اور متقین کیلئے آخرت کی زندگی کا گھر دنیا کی زندگی کے گھر کی نسبت بہتر ہے کیونکہ متقی اس میں اپنے اعمال کا ثمرہ حاصل کرے گا اور ہمیشہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی کرامت میں رہے گا۔ یہ آخرت کا گھر متقین کے لئے ہے ان کے قول پر وعدہ ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا اپنے مابعد کلام سمیت ان کے قول کی حکایت بطور بدل ہو اور الخیر کی تفسیر ہو کیونکہ یہ قالوا کی وجہ سے منصوب ہے اور اس کو اس پر مقدم کیا گیا ہے کیونکہ اس کو خیر کہا گیا ہے۔

۴؎ حضرت حسن فرماتے ہیں نعم دار المتقین سے مراد دنیا ہے کیونکہ متقین یہاں سے آخرت کا زاد لے جاتے ہیں اور اکثر مفسرین کے نزدیک اس سے مراد آخرت ہے(2)۔ مخصوص بالمدح کو حذف کیا گیا ہے کیونکہ ان کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ میں کہتا ہوں یہ بھی جائز ہے کہ اضافت جنس کے لئے ہو، یعنی متقین کے لئے ہر گھر اچھا ہے، خواہ وہ دنیا کا ہو یا آخرت کا ہو۔

جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ ؕ كَذٰلِكَ يَجْزِي اللّٰهُ الْمُتَّقِيْنَ ۙ﴿۳۱﴾

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 72 (التجاریہ)

2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 72 (التجاریہ)

(ان میں) ہمیشہ رہنے کے باغ ہیں [1] جن میں وہ داخل ہوں گے رواں ہوں گی ان کے نیچے نہریں ان کے لئے
وہاں ہر چیز ہوگی جس کی وہ خواہش کریں [2] یوں [3] بدلہ دیتا ہے اللہ تعالیٰ پرہیزگاروں کو [4]۔"

[1] جَنّٰتُ عَدْنٍ۔ مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے، یعنی لھم جنت عدن۔ یا یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے وہ ھی ہے یا دار ھم ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ مخصوص بالمدح ہو۔

[2] یعنی جنت میں ان کی ہر خواہش پوری ہوگی۔ فیھا کو مقدم فرما کر یہ ظاہر فرمایا کہ انسان کی ہر خواہش صرف اور صرف جنت میں ہی مکمل ہوگی۔

[3] یعنی اس مذکور جزاء کی مثل۔

[4] اللہ تعالیٰ جزاء دیتا ہے انہیں جو شرک اور برے اعمال سے اجتناب کرتے ہیں۔

الَّذِیْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ طَیِّبِیْنَ ۙ یَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَیْكُمُ ۙ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۳۲﴾

"وہ متقی جن کی روحیں فرشتے قبض کرتے ہیں اس حال میں کہ وہ خوش ہوتے ہیں [1] اس وقت فرشتے کہتے ہیں (اے نیک بختو) سلامتی ہو تم پر [2] داخل ہو جاؤ جنت میں ان (نیک اعمال) کے باعث جو تم کیا کرتے تھے [3]"

[1] فرشتے ان کی جانیں قبض کرتے ہیں درآں حالیکہ وہ کفر و معاصی کر کے اپنی جانوں پر ظلم کرنے سے پاک ہوتے ہیں۔ یہاں بھی یہی معنی ہوگا کیونکہ یہ ظالمی انفسھم کے مقابلہ میں آیا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے پاکیزہ زندگی گزاری۔ مجاہد فرماتے ہیں وہ لوگ جن کے اقوال و افعال پاکیزہ تھے (1)۔ بعض فرماتے ہیں اس کا معنی ہے کہ وہ جنت کی بشارت کی وجہ سے شاداں و فرحاں ہیں۔ یا یہ معنی کہ وہ اپنی روحوں کے قبض ہونے پر خوش ہیں کیونکہ اب ان کی ہمیشہ توجہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہوگی۔

[2] فرشتے انہیں کہیں گے تم پر سلامتی ہو۔ بعض علماء فرماتے ہیں انہیں وہ اللہ تعالیٰ کا سلام پہنچائیں گے۔

[3] جب تم دوبارہ اٹھنا تو جنت میں داخل ہو جانا کیونکہ وہ تمہارے اعمال پر تمہارے لئے تیار کی گئی ہے۔ یا یہ مطلب ہے کہ فرشتے انہیں وفات کے وقت کہیں گے تم پر سلامتی ہو اور آخرت میں انہیں کہا جائے گا جنت میں داخل ہو جاؤ ان نیک اعمال کے باعث جو تم کرتے تھے۔

هَلْ یَنْظُرُوْنَ اِلَّاۤ اَنْ تَاْتِیَهُمُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ اَوْ یَاْتِیَ اَمْرُ رَبِّكَ ؕ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ وَ مَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَ لٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ یَظْلِمُوْنَ ﴿۳۳﴾

"یہ مشرک کس کے منتظر ہیں بجز اس کے کہ آجائیں ان کے پاس (عذاب کے) فرشتے [1] یا آجائے آپ کے رب کا (اٹل) حکم [2] یونہی ان لوگوں نے بھی کہا تھا جو ان کے پیش رو تھے [3] اور نہیں زیادتی کی تھی ان پر اللہ تعالیٰ نے بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر زیادتی کیا کرتے تھے [4]"

[1] یعنی وہ کفار جن کا ذکر گزر چکا ہے وہ نہیں انتظار کر رہے۔ بجز اس کے کہ آجائیں فرشتے ان کی روحیں قبض کرنے کے لئے۔ حمزہ اور کسائی نے یاء کے ساتھ اور باقی قراء نے تاء کے ساتھ پڑھا ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 73 (التجاریہ)

[illegible]

۳ؔ جس طرح انہوں نے شریک الٰہی اور تکذیب رسل کا فعل بد کیا ہے، بالکل اسی طرح ان سے پہلے لوگوں نے بھی کیا تھا۔ پس ان کو اس فعل پر جو سزا ملی تھی انہیں بھی ایسی سزا ملے گی۔

۴ؔ ایسے سخت عذاب میں مبتلا کر کے اللہ تعالیٰ نے ان پر ظلم نہیں کیا لیکن انہوں نے خود کفر و معاصی کا ارتکاب کیا جس کی وجہ سے اس عذاب کے مستحق ہو گئے۔

فَاَصَابَهُمْ سَیِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَ حَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۳۴﴾

”پس ملی انہیں سزا ان کے بُرے اعمال کی ۱ؔ اور گھیر لیا انہیں اس عذاب نے جس کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے ۲ؔ“

۱ؔ ان کو اپنے برے اعمال کی سزا پہنچی۔ سیات سے پہلے مضاف جزاء محذوف ہے اور جزاء کا نام ان اعمال کو دے دیا گیا ہے۔ یا یہ معنی کہ کفر و معاصی میں سے جو اعمال کئے تھے ان کی سزائیں ان کو پہنچیں۔

۲ؔ یعنی ان کے استہزاء کی سزا نے انہیں گھیر لیا۔ یا یہ معنی کہ جس عذاب کا وہ استہزاء کرتے تھے وہ ان پر نازل ہوا۔ کفار مذاق کے طور پر کہتے لَوْلَا یُعَذِّبُنَا اللّٰهُ بِمَا نَقُوْلُ (اگر یہ سچے رسول ہیں تو اللہ تعالیٰ ہماری ان باتوں پر ہمیں عذاب کیوں نہیں دیتا۔)

وَ قَالَ الَّذِیْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَیْءٍ نَّحْنُ وَ لَاۤ اٰبَآؤُنَا وَ لَا حَرَّمْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَیْءٍ ؕ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ ﴿۳۵﴾

”اور کہنے لگے وہ لوگ جنہوں نے شرک کیا کہ اگر چاہتا اللہ تو ہم عبادت نہ کرتے اس کے سوا کسی اور چیز کی نہ ہم اور نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم حرام کرتے اس کے حکم کے بغیر کسی چیز کو ۱ؔ ایسی ہی (بے سروپا) باتیں کیا کرتے تھے ان کے پیش رو ۲ؔ (اے سننے والے) کیا رسولوں کے ذمہ اس کے علاوہ اور بھی کچھ ہے کہ وہ صاف طور پر (حکم الٰہی) پہنچا دیں ۳ؔ“

۱ؔ مشرکین کی یہ کلام بطور مذاق تھی اور رسولوں کی بعثت اور مکلف بنانے کے انکار کے طور پر تھی۔ دلیل یہ دیتے تھے کہ اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے وہی ہوتا ہے اور جو وہ نہیں چاہتا وہ نہیں ہوتا تو رسولوں کے بھیجنے اور مکلف بنانے کا کیا فائدہ ہے۔ یا انہوں نے یہ بات اپنے شرکیہ نظریہ کی قباحت اور بحائر و سوائب اونٹنیوں کے تحریم کا جو برا عقیدہ رکھتے تھے اس کی برائی کے انکار کے باعث ایسا کیا۔ اور ان غلط باتوں پر دلیل یہ دیتے کہ اگر اللہ تعالیٰ ہمارے ان اعمال و عقائد پر راضی نہ ہوتا تو ہم سے ان افعال کا صدور ہی نہ ہوتا۔ ان کے ان دونوں شبہات کی وجہ یہ تھی کہ وہ رضا کو مشیت کا لازم سمجھتے تھے حالانکہ معاملہ اس طرح نہیں ہے۔

۲ؔ ان سے پہلے لوگوں نے بھی اللہ کے شریک ٹھہرائے اور اس کی حلال کردہ چیزوں کو حرام قرار دیا اور انہوں نے بعینہ ان لوگوں جیسی ہرزہ سرائی کی تھی۔

۳ؔ یعنی رسولوں پر ہدایت تک پہنچانے کی ذمہ داری نہیں ہے، ہدایت دینا تو اللہ تعالیٰ کی قدرت میں ہے، رسولوں پر تو صرف اللہ تعالیٰ

کی مرصات لوگوں اور صاف طور پر لوگوں تک پہنچاتا ہے۔

پھر یہ بیان فرمایا کہ سلسلہ بعثت انبیاء کرام تو ایک ایسا امر ہے جس پر سنت الہیہ جاری ہے اور تمام امتوں میں اس نے رسول مبعوث فرمائے ہیں۔ پھر یہ بعثت نبی ﷺ باعث ہدایت بنتی ہے جس کی ہدایت کا اللہ تعالیٰ ارادہ فرماتا ہے اور یہی چیز گمراہی میں اضافہ کا باعث بنتی ہے جس کی گمراہی کا اللہ تعالیٰ ارادہ فرماتا ہے اس کی مثال ایک عمدہ غذا کی ہے جو صالح مزاج کو نفع اور تقویت پہنچاتی ہے اور بیمار کو نقصان پہنچاتی ہے اور اس کی بیماری میں مزید اضافہ کر دیتی ہے۔ ارشاد فرمایا۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ ۖ فَمِنْهُم مَّنْ هَدَى اللَّهُ وَمِنْهُم مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلَالَةُ ۚ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ ﴿٣٦﴾

"اور ہم نے بھیجا ہر امت میں ایک رسول (جو انہیں یہ تعلیم دے) کہ عبادت کرو اللہ تعالیٰ کی اور دور رہو طاغوت سے۔[1] سو ان میں سے کچھ وہ لوگ تھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی[2] اور ان میں سے کچھ ایسے بھی تھے جن پر گمراہی مسلط ہوگئی[3] پس سیر و سیاحت کرو زمین میں اور (اپنی آنکھوں سے) دیکھو کس قدر عبرتناک تھا انجام (رسولوں کو) جھٹلانے والوں کا[4]"

[1] یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف اپنے رسول کو یہ پیغام دے کر بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں سرکش شیطان کی اطاعت و پیروی نہ کرو۔

[2] یعنی جن کی ہدایت کو اللہ تعالیٰ نے خود چاہا اور ان کو ایمان کی توفیق عطا فرمائی اپنے پیغمبروں کی راہنمائی کے ذریعے۔

[3] اور جن کے متعلق سابق فیصلہ کے ساتھ گمراہی واجب ہو چکی تھی ان کو توفیق نہ دی اور نہ ان کی ہدایت کا ارادہ فرمایا۔ پس اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے کفر پر ہی ہلاک کر دیا، ان کے شہروں کو ان سے خالی کر دیا۔ وہ اپنی رہائشوں کو ویران کر دیا اور ان کے کنویں بغیر کسی کی ملکیت کے رہ گئے۔

[4] اے معشر قریش زمین میں سیر و سیاحت کرو اور دیکھو ان رسولوں کو جھٹلانے والوں کا انجام کیسا عبرتناک تھا جیسے قوم ثمود، قوم لوط اور اصحاب الایکہ وغیرہ اس آیت کریمہ میں اس اعتراض کا جواب ہی ہے جس کی بنیاد مشیت اور رضا کو متلازم سمجھنا تھا کیونکہ اگر معاملہ اس طرح ہوتا تو اللہ تعالیٰ ان کو ان کے کفر پر عذاب نہ دیتا جو اللہ تعالیٰ کی مشیت پر مبنی تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو فرمایا کہ ان قریش میں سے جن لوگوں پر گمراہی بتقضاء الٰہی ثابت ہو چکی ہے آپ ان کی ہدایت و راہنمائی کے لئے اپنے آپ کو نہ تھکائیں اور ان کی راہنمائی پر حریص نہ ہوں۔

إِن تَحْرِصْ عَلَىٰ هُدَاهُمْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي مَن يُضِلُّ ۖ وَمَا لَهُم مِّن نَّاصِرِينَ ﴿٣٧﴾

"(اے حبیب!) آپ خواہ کتنے ہی حریص ہوں ان کے ہدایت یافتہ ہونے پر مگر اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا جنہیں وہ (پیہم سرکشی کے باعث) گمراہ کر دیتا ہے[1] اور نہیں ان کے لئے کوئی مدد کرنے والا[2]"

[1] کوفیوں نے یھدی کو یاء کے فتحہ اور دال کے کسرہ کے ساتھ معروف پڑھا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ اسے ہدایت نہیں دیتا جو خود گمراہی کا ارادہ کرتا ہے۔ فَمِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلٰلَةُ کا بھی یہی معنی ہے۔ باقی قراء نے یاء کے ضمہ اور دال کے فتحہ کے ساتھ مجہول پڑھا ہے اور من یضل مبتدا ہے اور لا یھدی خبر ہے یعنی اللہ تعالیٰ جس کو گمراہ کرتا ہے اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں ہے۔ پھر پورا جملہ ان کی خبر ہے اور اسم جلالت اس کا اسم ہے۔

[2] جن کو اللہ تعالیٰ گمراہ کرتا ہے ان پر حکم الٰہی جاری ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا اور ان سے کوئی اس عذاب کو دور نہیں کرسکتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے تیار کر رکھا ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے کہ اے محمد ﷺ جن کو اللہ تعالیٰ نے گمراہ کردیا ہے ان کی ہدایت کے لئے اگر آپ حریص بھی ہوں اور اپنے نفس کو تھکاتے بھی رہیں تو آپ کا حرص اور آپ کی تھکان آپ کو کچھ نفع نہ دے گا۔ آپ اس چیز پر قدرت نہیں رکھتے کیونکہ اللہ تعالیٰ قوی اور قاہر ہے جس کو وہ گمراہ کرتا ہے اس کو کوئی ہدایت دینے والا نہیں ہے اور جس کو وہ عذاب دینا چاہتا ہے اس کا کوئی مددگار نہیں ہے۔ جزاء کو یہاں حذف کیا گیا ہے اور سبب کو اس کے قائم مقام رکھا گیا ہے۔ واللہ اعلم

ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے ابو العالیہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کے ایک شخص کا مشرکین کے ایک شخص پر قرض تھا۔ مسلمان نے اس سے مطالبہ کیا اور اپنی کلام میں یہ بھی کہہ دیا کہ موت کے بعد ایسا ایسا ہونے کی امید ہے۔ مشرک نے کہا تمہارا خیال ہے کہ تو مرنے کے بعد دوبارہ اٹھے گا۔ پھر اس نے قسم اٹھائی کہ جسے اللہ تعالیٰ مارے گا وہ دوبارہ نہ اٹھے گا تو اللہ تعالیٰ نے ذیل کی آیت نازل فرمائی (1)۔

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ لَا يَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ يَّمُوْتُ ۭ بَلٰى وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝

"اور بڑی شد و مد سے اللہ تعالیٰ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ (دوبارہ) زندہ نہیں کرے گا اللہ تعالیٰ جو (ایک بار) مر جاتا ہے [1] ہاں ضرور زندہ کرے گا یہ اس کا وعدہ ہے اس پر لازم ہے [2] اس کو پورا کرنا [3] لیکن اکثر لوگ (اس حقیقت کو) نہیں جانتے [4]"

[1] یہ وقال الذین اشرکوا پر معطوف ہے۔ نیز اس میں یہ تنبیہ ہے کہ وہ جس طرح توحید کے منکر تھے بعینہ وہ قیامت کا انکار بھی قسمیں اٹھا کر کرتے رہے اللہ تعالیٰ نے انکار دبلیغ طریقہ پر فرمایا۔

[2] ہاں وہ انہیں دوبارہ زندہ کرے گا۔ وعداً مصدر موکد لنفسہ ہے۔ بلی اسی معنی پر دلالت کرتا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ انہیں اٹھائیگا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وعدہ ہے اور اس وعدہ کا پورا کرنا اس پر لازم ہے کیونکہ وعدہ کا خلف ممتنع ہے اور دوسری وجہ یہ بھی کہ اس کی حکمت بھی دوبارہ زندہ کرنے کا تقاضا کرتی ہے۔

[3] یہ وعدہ کی دوسری صفت ہے۔

[4] لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ حق ہے، یا یہ معنی کہ وہ نہیں جانتے دوبارہ اٹھنے کو کیونکہ وہ نہیں جانتے کہ یہ اس کی حکمت کا تقاضا اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ان کی نظر مالوف و مانوس چیز تک مقصور ہوتی ہے۔ اس لئے وہ اس کے امتناع کا خیال و عقیدہ رکھتے ہیں۔

لِيُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي يَخْتَلِفُونَ فِيهِ وَلِيَعْلَمَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّهُمْ كَانُوا كَاذِبِينَ ﴿٣٩﴾

”(وہ انہیں دوبارہ زندہ کرے گا) تاکہ واضح کردے ان پر وہ بات [1] جس میں وہ اختلاف کیا کرتے تھے [2] اور تاکہ خوب جان لیں کافر کہ بلاشبہ وہی جھوٹے تھے [3]“

[1] یہ اس کلام کے متعلق ہے جس پر بلی دلالت کرتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ انہیں دوبارہ زندہ کرے گا تاکہ ان کے لئے واضح کردے۔ ہم ضمیر کا مرجع من یموت ہے۔ یہ مومنین و کفار تمام کو شامل ہے۔

[2] جس حق کے بارے میں وہ اختلاف کرتے تھے۔

[3] وہ جھوٹے ہیں اپنی اس بات میں کہ اللہ تعالیٰ اسے دوبارہ زندہ نہیں کرے گا جو مر چکا ہے۔ اس آیت میں اس سبب کی طرف اشارہ ہے جس کی وجہ سے دوبارہ اٹھنے کی طرف اس کی حکمت تقاضا کرتی ہے اور وہ حکمت یہ ہے کہ حق و باطل کے درمیان فرق ظاہر ہو جائے اور حق کے پرستاروں کو ثواب ملے اور باطل پرستوں کو سزا دے اور یہ بھی جائز ہے کہ لِيُبَيِّنَ اور لِيَعْلَمَ ارشاد الٰہی وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا کے متعلق ہو۔ یعنی ہم نے رسول بھیجے تاکہ وہ رسول اس حقیقت کو واضح کردے جس میں وہ اس رسول کی آمد سے پہلے اختلاف کرتے تھے اور وہ گمراہی پر گامزن ہو کر اللہ تعالیٰ پر جھوٹے بہتان باندھتے تھے۔

إِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ إِذَا أَرَدْنَاهُ أَنْ نَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ﴿٤٠﴾

”ہمارا فرمان کسی چیز کے لئے جب ہم ارادہ کرتے ہیں اس (کے پیدا کرنے کا) صرف اتنا ہے کہ ہم اسے حکم دیتے ہیں کہ ہو جا پس وہ ہو جاتی ہے [1]“

[1] یعنی جب ہم مبدء میں یا معاد میں کسی شی کا ارادہ کرتے ہیں۔ قولنا مبتدا ہے اور ان نقول لہ کن فیکون ابن عامر اور الکسائی نے یہاں بھی اور سورۂ یسین میں بھی فیکون کو نصب کے ساتھ نقول پر عطف کرتے ہوئے پڑھا۔ یا کن کے جواب کی وجہ سے منصوب پڑھا ہے۔ ہم نے پہلے سورۂ بقرہ میں جواب کی تقدیر تفصیل سے کلام لکھی ہے۔ اس آیت کریمہ میں امکان بعث کا بیان ہے۔ وہ اس طرح کہ یہ سب تخلیق محض اللہ تعالیٰ کی قدرت اور مشیت سے پیدا ہوئی ہے، کسی دوسری چیز پر موقوف نہیں ہے ورنہ تسلسل لازم آتا اور اس تخلیق میں اللہ تعالیٰ کو کوئی تعب اور تھکاوٹ بھی نہیں ہے ورنہ عجز لازم آتا جو الوہیت کے منافی ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کے لئے اشیاء کی تخلیق بغیر مادہ اور بغیر مثال کے ثابت ہے تو دوبارہ پیدا کرنا بھی اس کیلئے ممکن ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میرے بندے نے میری تکذیب کی جبکہ یہ اسے مناسب نہ تھا اور اس نے مجھے گالی دی حالانکہ یہ اس کے لئے مناسب نہ تھا۔ اس کا میری تکذیب کرنا یہ ہے کہ اس نے کہا وہ مجھے دوبارہ پیدا نہیں کرے گا جیسے پہلے پیدا کیا تھا حالانکہ ابتدائی تخلیق اس کے اعادہ سے آسان نہیں تھی اس کا مجھے گالی دینا یہ ہے کہ اس نے کہا اللہ نے بیٹا بنایا ہے حالانکہ میں یکتا اور بے نیاز ہوں نہ میں نے کسی کو جنا ہے اور نہ میں جنا گیا ہوں اور میرا کوئی ہمسر نہیں ہے۔ ابن عباس کی روایت میں ہے اس کا مجھے گالی دینا یہ ہے کہ اس نے کہا کہ میرا بیٹا ہے حالانکہ میں بیوی یا بیٹا بنانے سے پاک ہوں۔ اس حدیث کو بخاری نے نقل فرمایا ہے(1)۔

وَالَّذِينَ هَاجَرُوا فِي اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مَا ظُلِمُوا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۖ وَ

لَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۱﴾

"اور جنہوں نے راہ خدا میں ہجرت کی اس کے بعد ان پر (طرح طرح کے) ظلم توڑے گئے [1] تو ہم ضرور ان کو دنیا میں بھی بہتر ٹھکانہ دیں گے [2] اور آخرت کا اجر تو بہت بڑا ہے [3] کاش! یہ جان لیتے [4]"

[1] یعنی جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے راستہ، اس کے حق اور اس کی رضا کے لئے ہجرت کی اس کے بعد کہ ان کو طرح طرح کی اذیتیں دی گئیں۔ عبدالرزاق، ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے ابن عباس اور داؤد بن ہند سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں یہ آیت کریمہ ابو جندل بن سہیل کے بارے میں نازل ہوئی (1)۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں یہ حضرت بلال، صہیب، جناب، عمار، عائش، جبیر اور ابو جندل بن سہیل کے بارے میں نازل ہوئی۔ ان کو مشرکوں نے مکہ مکرمہ میں گرفتار کر لیا تھا اور انہیں طرح طرح کی تکلیفیں دی تھیں۔

ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور عبد بن حمید نے حضرت قتادہ سے روایت کیا ہے کہ وہ صحابہ کرام تھے جن پر اہل مکہ نے ظلم کیا تھا اور انہیں اپنے گھروں سے بھی نکال دیا تھا حتیٰ کہ ایک گروہ حبشہ چلا گیا تھا۔ پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے انہیں مدینہ طیبہ میں بہتر ٹھکانہ عطا فرمایا تھا اور اسے ان کے لئے دار ہجرت بنایا تھا اور ان کیلئے مومنین کو انصار بنایا تھا (2)۔

[2] حسنةً یا تو مباءة کی صفت ہے مراد مدینہ طیبہ ہے یا یہ تبوية حسنة تھا۔

[3] اور دنیا کی نعمتوں سے آخرت میں جو انہیں نعمتیں ملتی ہیں وہ بڑی اور عظیم ہیں۔ امام بغوی فرماتے ہیں روایت ہے کہ عمر بن خطاب جب مہاجرین میں سے کسی شخص کو عطیہ دیتے تو فرماتے لے لو اللہ تعالیٰ اس میں برکت دے۔ یہ وہ ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے دنیا میں دینے کا وعدہ فرمایا تھا اور جو تیرے لئے آخرت میں جمع ہے وہ اس سے بہتر اور افضل ہے۔ پھر یہ آیت کریمہ تلاوت کرتے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ ہم دنیا میں ان کے ساتھ نیکی کا احسان کریں گے۔ بعض علماء فرماتے ہیں دنیا میں حسنہ سے مراد توفیق اور ہدایت ہے (3)۔

[4] ضمیر کفار کیلئے ہے یعنی اگر یہ کفار جانتے کہ اللہ تعالیٰ نے ان مہاجرین کے لئے دونوں جہانوں کی نعمتیں جمع کر رکھی ہیں تو یہ ان مومنین پر ظلم نہ کرتے بلکہ ان کی موافقت کرتے یا ضمیر مہاجرین کے لئے ہے، یعنی اگر مہاجرین کو معلوم ہوتا تو یہ کوشش اور صبر میں اور زیادتی کرتے۔

الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۴۲﴾

"جنہوں نے (مصائب) میں صبر کیا [1] اور (مشکلات میں اب بھی) اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں [2]"

[1] جنہوں نے تکالیف و مصائب پر صبر کیا جیسے کفار کی اذیتیں، وطن کی جدائی وغیرہ، یہ محل نصب میں ہے یا مدح کے طور پر مرفوع ہے۔

[2] وہ ہر طرف سے کٹ کر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور اپنے تمام امور اللہ تعالیٰ کی طرف تفویض کرتے ہیں۔ جب کفار قریش مکہ نے محمد ﷺ کی نبوت کا انکار کیا اور کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ کی شان اس سے بلند ہے کہ وہ اپنا رسول کسی بشر کو بنائے، اس نے اگر رسول بنانا ہی تھا تو ہماری طرف کسی فرشتے کو مبعوث کیوں نہیں فرمایا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے اس اعتراض کے جواب میں ذیل کی آیت نازل فرمائی۔

وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوۡحِىۡۤ اِلَيۡهِمۡ فَسۡـئَلُوۡۤا اَهۡلَ الذِّكۡرِ اِنۡ كُنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۴۳﴾

"اور ہم نے نہیں بھیجا آپ سے پہلے (رسول بنا کر) مگر مردوں کو ہم وحی بھیجتے ہیں ان کی طرف [1] اس دریافت کر و اہل علم سے [2] اگر تم خود نہیں جانتے [3]"

[1] اور ہم نے آپ سے پہلے لوگوں کی طرف مرد ہی رسول بنا کر بھیجے تھے وہ فرشتے نہیں تھے۔ ہم فرشتوں کے ذریعے ان کی طرف وحی بھیجتے ہیں۔ حضرت حفص نے نوحی کو جمع متکلم معروف کا صیغہ پڑھا ہے اور باقی قراء نے یاء کے ساتھ واحد غائب کا صیغہ پڑھا ہے۔

[2] اگر تمہیں شک وشبہ ہے کہ ہم نے مرد رسول بنا کر نہیں بھیجے تو یہود ونصاری سے پوچھ لو جو سابقہ کتب کا علم رکھنے والے تھے کہ کیا اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی طرف موسیٰ، عیسیٰ وغیرھما کو اور ان سے پہلے ابراہیم، نوح، آدم وغیرہم علیہم الصلوٰۃ والسلام کو رسول بنا کر بھیجا تھا؟ وہ یقیناً اس حقیقت کی گواہی دیں گے۔

[3] اس آیت کریمہ میں دلیل ہے کہ جاہل لوگوں کو مسائل کے بارے علماء سے رجوع کرنا چاہئے اور یہ بھی دلیل ہے کہ اخبار علم کا فائدہ دیتی ہیں اگر مخبر ثقہ ہو جو معتمد علیہ ہو۔

بِالۡبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ‌ؕ وَاَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكَ الذِّكۡرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيۡهِمۡ وَلَعَلَّهُمۡ يَتَفَكَّرُوۡنَ ﴿۴۴﴾

"(پہلے رسولوں کو بھی ہم نے) روشن نشانیاں اور کتابیں دے کر بھیجا [1] اور (اسی طرح) ہم نے نازل کیا آپ پر یہ ذکر [2] تاکہ آپ کھول کر بیان کریں لوگوں کے لئے (اس ذکر کو) جو نازل کیا گیا ہے ان کی طرف [3] تاکہ وہ غور وفکر کریں [4]"

[1] یہ ارسلنا کے متعلق ہے یعنی ہم نے واضح معجزات اور کتب کے ساتھ نہیں بھیجا مگر مردوں کو۔ اور یہ بھی جائز ہے استثناء میں داخل ہو کر ارسلنا کے متعلق ہو۔ یعنی ہم نے نہیں بھیجا مگر مردوں کو معجزات کے ساتھ یا یہ محذوف کے متعلق ہے جو رجالا کی صفت ہے، یعنی ہم نے نہیں بھیجا رسول بنا کر مگر مردوں کو جو بینات وزبر سے متلبس تھے۔ یا یہ مفعول ہونے یا یوحی مجہول کے نائب فاعل سے حال ہونے کی بناء پر منصوب ہے' تمام تقادیر پر فاسئلوا جملہ معترضہ ہے یا یہ لا تعلمون سے متعلق ہے اس صورت پر کہ شرط خاموش کرانے اور الزام کے لئے ہے۔

[2] ذکر سے مراد قرآن ہے اس کو ذکر اس لئے فرمایا کیونکہ یہ نصیحت ہے۔

[3] تاکہ آپ بیان کریں اس کو جو کچھ اس ذکر میں نازل کیا گیا ہے آپ کے توسط سے ان پر مثلاً وعدہ، وعید، احکام شرائع مجملہ اور متشابہ تھا۔ بیان کبھی صراحۃً قول یا فعل یا تقریر سے ہوتا ہے اور کبھی غیر صریح ہوتا ہے جیسے قیاس کا حکم ہے۔

[4] یہ اشارہ ہے نظم کلام اور اس کی دلالت کی وجوہ میں غور وخوض کرنے کی طرف تاکہ ان پر مراد ظاہر ہو جاتا اور شارع کے بیان کی ... جیسے فقہاء ... کے لفظ سے مراد قبل میں وطی کرنا ہے دبر میں نہیں کیونکہ دبر محل حرث نہیں ہے اسی طرح

ثلثۃ قروء میں ثلاثہ کا لفظ شعور دلاتا ہے کہ اس سے مراد حیض ہے طہر نہیں ہے کیونکہ طلاق مسنون طہر میں ہوتی ہے اور اس پر اجماع ہے۔ ورنہ عدت کے طہر یا تو تین سے زیادہ ہو جائیں گے یا کم ہو جائیں گے۔ واللہ اعلم

اَفَاَمِنَ الَّذِیْنَ مَكَرُوا السَّیِّاٰتِ اَنْ یَّخْسِفَ اللّٰهُ بِهِمُ الْاَرْضَ اَوْ یَاْتِیَهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَیْثُ لَا یَشْعُرُوْنَ ﴿۴۵﴾

”کیا بےخوف (اور نڈر) ہو گئے وہ لوگ جنہوں نے برے مکر کئے [1] کہ مبادا گاڑ دے اللہ تعالیٰ انہیں زمین میں [2] یا آ جائے ان پر عذاب اس طرح کہ (ان کو اس کی آمد کا) شعور ہی نہ ہو [3]“

[1] یہ برے مکر کرنے والے وہ لوگ تھے جنہوں نے یہ ارادہ کیا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کو (نعوذ باللہ) قتل کر دیں یا آپ کو قید کر دیں یا آپ کو جلاوطن کر دیں اور انہوں نے لوگوں کو ایمان لانے سے روکنے کی بھی کوشش کی تھی۔

[2] اللہ ان کو بھی قارون کی طرح دھنسا دے۔

[3] یا اچانک آسمان سے کوئی عذاب آ جائے جیسے قوم لوط اور اصحاب ایکہ کے ساتھ ہوا تھا۔

اَوْ یَاْخُذَهُمْ فِیْ تَقَلُّبِهِمْ فَمَا هُمْ بِمُعْجِزِیْنَ ﴿۴۶﴾

”یا پکڑے انہیں جب وہ (اپنے کاروبار میں) دوڑ دھوپ کر رہے ہوں [1] پس نہیں وہ (اللہ تعالیٰ کو) عاجز کرنے والے [2]“

[1] یا اللہ تعالیٰ ان کو عذاب سے پکڑ لے ان کی دوڑ دھوپ کے وقت۔ ابن عباس فرماتے ہیں اس کا معنی ہے ان کے اختلاف کے وقت ابن جریج فرماتے ہیں اس کا معنی آنے جانے کے وقت (1)۔

[2] وہ اللہ تعالیٰ سے سبقت لے جانے والے نہیں ہیں۔

اَوْ یَاْخُذَهُمْ عَلٰی تَخَوُّفٍ ؕ فَاِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ﴿۴۷﴾

”یا پکڑ لے انہیں جبکہ وہ خوف زدہ ہو چکے ہوں [1] پس بیشک تمہارا رب بہت مہربان، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے [2]“

[1] عَلٰی تَخَوُّفٍ یا فاعل سے حال ہے یا مفعول سے حال ہے۔ اس کا معنی ہے کمی کرنا نقصان کرنا۔ یعنی ان کے بعض ہلاک ہو جاتے ہیں، پھر بعض ہلاک ہو جاتے ہیں، پھر تمام ہلاک ہو جاتے ہیں کہا جاتا ہے **تخوفه الدهر** یعنی زمانہ نے اس کے مال اور جسم میں کمی کر دی۔ امام بغوی فرماتے ہیں کہا جاتا ہے کہ یہ لغت ھذیل ہے۔ الضحاک اور کلبی کہتے ہیں تخوف کا معنی خوف ہے(2)۔ میں کہتا ہوں وہ پہلے ایک قوم کو ہلاک کرتا ہے ان سے پہلے پس وہ ڈر جاتے ہیں۔ پھر ان پر عذاب آتا ہے درآں حال کہ یہ خوف زدہ ہوتے ہیں یا ان کی ہلاکت سے پہلے ہلاکت کے آثار نمودار ہوتے ہیں۔ پھر وہ ہلاک ہو جاتے ہیں جیسا کہ قوم ثمود کے ساتھ تین دنوں میں ہوا تھا، پہلے دن ان کے چہرے زرد ہو گئے تھے، دوسرے دن سرخ ہو گئے تھے، تیسرے دن سیاہ ہو گئے تھے، پھر وہ سب ہلاک ہو گئے تھے، اس تاویل پر عَلٰی تَخَوُّفٍ مفعول سے حال ہوگا۔

[2] وہ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ہے اس لئے وہ سزا دینے میں جلدی نہیں فرماتا یہی وجہ ہے کہ وہ امن میں ہو گئے ہیں یعنی بےخوف اور نڈر رہو

1۔ تفسیر خازن، جلد 4، صفحہ 76 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 76 (التجاریہ)

گئے ہیں لیکن بے خوف ہونا نہیں چاہئے تھا کیونکہ وہ رحیم ورؤف ہونے کے ساتھ ساتھ قہار، منتقم، ذوالبطش الشدید بھی ہے۔ اس کے انتقام کو برداشت کرنے کی کسی کو طاقت نہیں ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کے بے خوف ہونے کو ناپسند فرمایا ہے۔ فرمایا اَفَاَمِنَ الَّذِیْنَ مَكَرُوا السَّیِّاٰتِ۔ فا تعقیب کے لئے ہے اور وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا پر معطوف ہے، یعنی جب انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ مرسلین صرف مرد ہی تھے تو پھر محمد ﷺ کے ساتھ حیلہ سازیاں اور پھر اس مکر کے باوجود نڈر رہنا یہ مناسب نہیں تھا کیونکہ یہ بھی تو سابقہ رسولوں کی مثل ہی ہیں۔

اَوَلَمْ یَرَوْا اِلٰى مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَیْءٍ یَّتَفَیَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ الْیَمِیْنِ وَ الشَّمَآىِٕلِ سُجَّدًا لِّلّٰهِ وَهُمْ دٰخِرُوْنَ ﴿۴۸﴾

"کیا انہوں نے نہیں دیکھا ان اشیاء کی طرف جنہیں اللہ تعالیٰ پیدا فرماتا ہے [1] کہ بدلتے رہتے ہیں [2] کے سائے [3] دائیں سے (بائیں طرف) اور بائیں سے (دائیں طرف) سجدہ کرتے ہوئے اللہ کو اس حال میں کہ وہ اظہار عجز کر رہے ہیں [4]"

[1] جمہور کی قرأت (یروا) یا کے ساتھ ہے اور ضمیر کا مرجع الذین مکروا السیئات ہیں۔ حمزہ اور کسائی نے تاء کے ساتھ خطاب کا صیغہ علی سبیل التفات پڑھا ہے۔ اسی طرح سورۃ العنکبوت میں بھی انہوں نے تاء کے ساتھ پڑھا ہے اور استفہام انکاری ہے، یعنی یقیناً انہوں نے دیکھا ہے، یعنی ان لوگوں کو کہا ہے کہ اس کے کمال قدرت اور اس کی قہرمانی کو نہیں دیکھتے اور اس کے عذاب سے نہیں ڈرتے ماخلق سے پہلے ما موصولہ مبہم ہے جس کا بیان من شئی ہے۔ یہ اشیاء کی تخلیق کے عموم کا فائدہ دے رہا ہے۔

[2] ابوعمرو اور یعقوب نے یتفیؤ کو تاء فوقانیہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء تحتانیہ کیساتھ پڑھا ہے

[3] یعنی یہ لوگ کیا اس مخلوقات کی طرف نہیں دیکھتے جن کے سائے بدلتے رہتے ہیں، یعنی سورج کے بلند ہونے اور ڈھلنے کے وقت ان کے سائے ادھر ادھر ہوتے رہتے ہیں یا سورج کے مشارق ومغارب کے اختلاف کے سبب ان کے سائے بدلتے رہتے ہیں اور یہ سب تقدیر الٰہی سے ہوتا ہے۔

[4] یعنی دائیں اور بائیں جانب ہر طرف سے یہ انسان کے دائیں اور بائیں سے استعارہ ہے۔ یمین واحد اور شمائل جمع ما کے لفظ اور معنی کے اعتبار سے ہے جیسا کہ ظلالہ میں ضمیر مفرد اور سجدا للّٰہ وهم داخرون میں جمع ہے (یعنی لفظ ما کا اعتبار کرتے ہوئے مفرد ضمیر اور مدلول چونکہ جمع ہے اس کا اعتبار کرتے ہوئے جمع ضمیر لوٹا دی ہے)۔ سجدا للّٰہ اور وهم داخرون حال ہیں ظلالہ کی ضمیر سے اور سجود سے مراد طبعاً یا اختیاراً سرخم کرنا ہے۔ کہتے ہیں سجدت النخلة جب کھجور کا درخت بوجھ کی کثرت سے جھک جاتا ہے اور سجد البعیر کہتے ہیں جب وہ سر جھکاتا ہے تا کہ سوار اوپر چڑھ جائے یا سجداء الظلال سے حال ہے اور وهم داخرون ضمیر سے حال ہے یعنی ان کا سایہ اطاعت کرتے ہوئے لوٹتا ہے جتنا کہ اس کے لئے لوٹنا مقدر ہوتا ہے، یا یہ معنی کہ سایہ زمین پر واقع ہوتا ہے اور سجود کی ہیئت پر زمین کے ساتھ ملا ہوا ہوتا ہے اور اجرام بھی فی ذاتہا اللہ تعالیٰ کے افعال کے سامنے مطیع اور جھکے ہوئے ہیں۔ اور داخرون کی جمع واؤ کے ساتھ اس لئے ہے کیونکہ ان اشیاء میں ذی شعور بھی ہیں، یا اس لئے کہ اطاعت وافگندگی عقلاء کے اوصاف میں سے ہے۔

وَلِلّٰهِ یَسْجُدُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓىِٕكَةُ وَهُمْ لَا یَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۴۹﴾

”اور اللہ کے لئے سجدہ کر رہی ہے ہر چیز جو آسمانوں میں ہے ۱؎ اور جو زمین میں ہے۔ یعنی ہر قسم کے جاندار ۲؎ اور فرشتے اور وہ غرور و تکبر نہیں کرتے ۳؎“

۱؎ یعنی سورج، چاند اور ستاروں میں سے جو کچھ ہے وہ اپنے اللہ کے حضور سر افگندہ ہے۔

۲؎ اور جو زمین میں جاندار ہیں وہ بھی سربسجود ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں من دابۃ آسمان اور زمین دونوں کا بیان ہے کیونکہ دبیب حرکت جسمانیہ کو کہتے ہیں خواہ وہ زمین میں ہو یا آسمان میں ہو۔

۳؎ وَالْمَلٰٓئِكَةُ کا عطف مَافِي السَّمٰوٰتِ وَمَافِي الْاَرْضِ پر ہے۔ چونکہ مَافِي السَّمٰوٰتِ سے مراد یہ تھا کہ جو آسمانوں کی جنس سے ہے مثلاً سورج وغیرہ اور وَمَافِي الْاَرْضِ سے مراد یہ تھا کو جو زمین کی جنس سے ہے یعنی ہر جاندار وغیرہ لیکن ملائکہ زمین و آسمان کی جنس میں سے نہیں تھے اور کچھ فرشتے ایسے ہوتے ہیں جو نہ آسمان میں ہیں اور نہ زمین میں ہیں جیسے عرش کو اٹھانے والے فرشتے وغیرہ۔ بعض علماء فرماتے ہیں ملائکہ کا خصوصاً علیحدہ ذکر ان کی عظمت کے اظہار کے لئے ہے جیسے ملائکہ پر جبرئیل کا عطف اس کی عظمت کے اظہار کے لئے ہوتا ہے، ما کا کلمہ عقلاء اور غیر عقلاء دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے اور جہاں عقلاء اور غیر عقلاء جمع ہوں وہاں مَن کی بنسبت ما کا استعمال اولی ہوتا ہے۔

یہاں سجود سے مراد انقیاد و اطاعت ہے جس کا ارادہ اور تاثیر طبعی ہو یا خوشی سے اس کے امر اور اس کے مکلف بنانے کی وجہ سے ہو، یعنی یہ اطاعت و انقیاد عام ہے تاکہ اس کی اسناد عام مخلوق کی طرف کرنا صحیح ہو حتی کہ کفار جو چوپاؤں سے بھی برے ہیں ان کو بھی شامل ہو۔ بعض علماء فرماتے ہیں تمام اشیاء کے سجود سے مراد ان اشیاء میں قدرت کی صنعت گری کے اثر کا ظہور ہے جو غافل لوگوں کو سجود کی طرف دعوت دے رہا ہے۔ یہ کہنا بہتر ہے کہ سجود سے مراد طاعت ہے اور تمام اشیاء خواہ وہ حیوان ہوں یا جماد سب کی سب خوشی خوشی اللہ تعالیٰ کے مطیع ہیں، اگرچہ ہمیں ان کا شعور نہ بھی ہو لیکن وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مطیع اور ذی شعور ہیں اور زندگی سے خالی نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے قَالَتَآ اَتَيْنَا طَآىِٕعِيْنَ ایک اور جگہ فرمایا وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ۔ ترجمہ: اور کان لگا کر سنے گا اپنے رب کا فرمان اور اس پر فرض بھی یہی ہے۔ ایک اور مقام پر یوں فرمایا يَوْمَىِٕذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا ـ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا۔ ترجمہ: اس روز وہ بیان کر دے گی اپنے سارے حالات کیونکہ آپ کے رب نے اسے (یونہی) حکم بھیجا ہے۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے اَطَّتِ السَّمَاءُ وَحُقَّ لَهَا اَنْ تَئِطَّ۔ آسمان چرچرایا اور اسے حق ہے کہ وہ چرچرائے (۱)

لیکن اس تاویل کی صورت میں آیت کریمہ جن و انس کفار کے علاوہ کے ساتھ مخصوص ہوگی کیونکہ یہ اطاعت کرنے والے نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سورۂ حج میں آیت سجدہ میں فرمایا و کثیر من الناس اور اس تخصیص پر وھم لایستکبرون کا ارشاد بھی دلالت کرتا ہے۔

يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝

”ڈرتے ہیں اپنے رب کی قدرت سے ۱؎ اور کرتے ہیں جو انہیں حکم دیا جاتا ہے ۲؎“

۱؎ یعنی وہ اپنے رب سے ڈرتے ہیں کہ وہ ان پر اوپر سے عذاب نازل کر دے، یا یہ معنی کہ وہ اپنے رب سے ڈرتے ہیں کیونکہ وہ ان پر غالب ہے اپنی صفت قہر کے ساتھ جیسے ارشاد ہے وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ۔ یہ جملہ لایستکبرون کی ضمیر سے حال ہے، یا یہ اس کا

بیان ہے کیونکہ جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے وہ اس کی عبادت سے تکبر نہیں کرتا۔

۲؎ جس طاعت کا انہیں حکم دیا جاتا ہے وہ اسے بجالاتے ہیں کیونکہ یہ صفات یعنی تکبر نہ کرنا اپنے رب سے ڈرنا اور اوامر الٰہیہ کو بجالانا کفار میں نہیں پائی جاتیں۔ اس سے پتہ چلا کہ یہ آیت کفار کے علاوہ کے ساتھ خاص ہے۔ ہاں اگر تجو سے مراد انقیاد عام ہو یا قدرت کی صنعت کے اثر کا ظہور جو سجدہ کی طرف دعوت دیتا ہے تو وھم لایستکبرون سے آخر تک خاص ملائکہ کی حالت کا بیان ہوگا۔

حضرت ابوذر سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اِنِّیْ اَرٰی مَالَاتَرَوْنَ وَاَسْمَعُ مَا لَا تَسْمَعُوْنَ اَطَّتِ السَّمَاءُ اَطًّا وَحُقَّ لَهَا اَنْ تَئِطَّ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ مَا فِیْهَا مَوْضِعُ اَرْبَعَةِ اَصَابِعَ اِلَّا وَمَلَکٌ وَاضِعٌ جَبْهَتَهٗ سَاجِدًا لِلّٰهِ وَاللّٰهِ لَوْ تَعْلَمُوْنَ مَا اَعْلَمُ لَضَحِکْتُمْ قَلِیْلًا وَلَبَکَیْتُمْ کَثِیْرًا وَمَا تَلَذَّذْتُمْ بِالنِّسَاءِ عَلَی الْفُرُشَاتِ وَلَخَرَجْتُمْ اِلَی الصُّعُدَاتِ تَجْاَرُوْنَ اِلَی اللّٰهِ. قَالَ اَبُوْذَرٍ یَالَیْتَنِیْ کُنْتُ شَجَرَةً تُعْضَدُ(1)۔

میں وہ کچھ دیکھتا ہوں جو تم نہیں دیکھتے اور میں وہ سنتا ہوں جو تم نہیں سنتے۔ آسمان چرچرا رہا ہے اور چرچرانا اس کا حق ہے۔ قسم ہے اس کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے آسمان میں چار انگلی کے برابر جگہ ایسی نہیں ہے جہاں کوئی فرشتہ اپنی پیشانی اللہ کے حضور سجدہ کرنے کے لئے جھکائے ہوئے نہ ہو۔ قسم بخدا جو میں جانتا ہوں اگر تم جانتے تو تم کم ہنستے اور روتے زیادہ اور تم بستروں پر اپنی ازواج سے متمتع بھی نہ ہوتے اور تم میدان کی طرف نکل جاتے اور اللہ کی بارگاہ میں تضرع وزاری کرتے۔ (یہ سن کر) حضرت ابو ذر نے کہا کاش میں درخت ہوتا جو کاٹا جاتا (اس حدیث کو احمد، ترمذی، ابن ماجہ اور بغوی نے روایت کیا ہے۔)

وَقَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْۤا اِلٰهَیْنِ اثْنَیْنِ ۚ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَاِیَّایَ فَارْهَبُوْنِ ﴿۵۱﴾

"اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا نہ بناؤ دو خدا وہ تو صرف ایک ہی خدا ہے ۱؎ اس نے فرمایا) پس فقط مجھ سے ہی ڈرا کرو ۲؎"

۱؎ اللہ تعالیٰ نے عدد کا ذکر فرمایا ہے حالانکہ معدود پہلے ہی اس پر دلالت کر رہا ہے تو وجہ یہ ہے کہ نہی کا سیاق دو خداؤں کی نفی کے لئے ہے یا اشارہ ہے کہ دوئی الوہیت کے منافی ہے جیسا کہ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ میں واحد کا ذکر فرمایا ہے جو اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ مقصود وحدانیت کا اثبات ہے نہ کہ الوہیت کا اثبات ہے دوسرا اس میں یہ بھی ہے کہ وحدۃ الوھیت کے لوازم میں سے ہے۔

۲؎ اس جملہ میں ترہیب میں مبالغہ کے لئے اور مقصود کو صراحت کے ساتھ بیان کرنے کے لئے غائب سے مخاطب کی طرف التفات کیا گیا ہے۔ گویا یوں ارشاد ہے کہ میں ہی الٰہ ہوں مجھ سے ہی ڈرو اور صرف مجھ سے ڈرو کسی اور سے نہیں یعقوب نے فارھبونی یعنی یا کے ثبوت کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے یاء کے حذف کے ساتھ پڑھا ہے۔

وَلَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَهُ الدِّیْنُ وَاصِبًا ؕ اَفَغَیْرَ اللّٰهِ تَتَّقُوْنَ ﴿۵۲﴾

"اور اس کی ملک میں ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے ۱؎ اور اسی کی تابعداری اور اطاعت لازمی ہے ۲؎ تو کیا اللہ تعالیٰ کے سوا غیروں سے ڈرتے ہو ۳؎"

۱؎ یعنی اللہ کے لئے ہے جو الٰہ ہونے میں یکتا ہے۔ آسمانوں اور زمین میں جو بھی تخلیق ہے کسی چیز کا اس کے علاوہ سے پیدا ہونا ممکن نہیں، جبکہ معتزلہ کہتے ہیں بندے اپنے افعال کے خود خالق ہیں۔ تخلیق بھی اسی کی ہے اور ملک بھی اسی کی ہے۔ اس لئے اس سے ظلم

سکتی ہیں نہیں ہوسکتا کیونکہ جو غیر کی ملکیت میں بغیر اجازت تصرف کرتا ہے اور کسی کے لئے کسی چیز میں تصرف اس ذات یکتا کی اباحت واجازت کے بغیر جائز نہیں ہے۔

۲؎ یہاں دین سے مراد طاعت اور اخلاص ہے۔ واصباً کا معنی ایسا دائم اور ثابت ہے جس کے سقوط کا احتمال نہ ہو۔ چونکہ وہ ایک خدا ہے اس لئے وہ اس لائق ہے کہ اس سے ڈرا جائے اور بندوں کا حق ہے کہ وہ تمام حالات میں اس کی ہمیشہ اطاعت کریں جیسا کہ ملائکہ کا وصف بیان کیا گیا ہے لَّا یَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَاۤ اَمَرَهُمْ وَ یَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ۔

اسی طرح حضور ﷺ کا ارشاد ہے خالق کی معصیت میں مخلوق کی طاعت (کا حکم) نہیں ہے۔ اس حدیث کو امام احمد اور حاکم نے سند صحیح کے ساتھ عمران اور حکیم بن عمرو الغفاری سے روایت کیا ہے۔ صحیحین اور سنن ابی داؤد میں حضرت علی سے مروی ہے اللہ تعالیٰ کی معصیت میں کسی کی طاعت نہیں ہے۔ اطاعت تو صرف نیکی میں ہے(1) اور اسی معنی میں وله الدين ذا كلفة ہے یعنی کسی کو روا نہیں ہے کہ وہ دوسرے کو اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر تکلیف دے کیونکہ صرف اللہ تعالیٰ ہی مالک ہے اور کوئی نہیں۔ اور مالک اپنی ملک میں جیسے چاہتا ہے تصرف کرتا ہے۔ مالک کے سوا کسی کو مالک کی اجازت کے بغیر تصرف کرنا جائز نہیں ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں الدین سے مراد بندوں کے اعمال پر دائمی جزاء ہے۔ مومن کا ثواب ختم نہ ہوگا اور کافر کا عقاب وسزا منقطع نہ ہوگی۔ بعض علماء فرماتے ہیں الدین سے مراد کفر پر عذاب ہے اور واصب کا معنی دائمی مرض ہے۔ کہا جاتا ہے وصب فلان یوصب جب کوئی تکلیف محسوس کرے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَ لَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ۔ حدیث شریف میں ہے حضرت عائشہ فرماتی ہیں انا وصبت رسول الله ﷺ میں نے رسول اللہ ﷺ کی تیمارداری کی۔ نہایہ میں ہے وصب کا معنی دائمی اور لازم تکلیف ہے اور وصبة کا معنی تیمارداری کرنا ہے۔ قاموس میں ہے الوصب المرض یعنی وصب کا معنی مرض ہے اوصبه الله اللہ تعالیٰ نے اسے مریض کیا وصب يصب وصوبا کا معنی دام وثبت ہے اور وصب على الامر کا معنی کسی کام پر پابند کرنا اور اسے بحسن وخوبی سرانجام دینا ہے اور آیت میں اس شخص کو وعید سنانا مراد ہے جو دو خدا بناتا ہے یعنی جو ایسا کرتا ہے اس کے لئے اللہ کے پاس دائمی اور سخت عذاب ہے۔

۳؎ یہ استفہام انکاری ہے، یعنی کسی دوسرے سے نہ ڈرو کیونکہ اس کے سوا کوئی نقصان دینے والا نہیں جیسا کہ اس کے سوا کوئی نفع پہنچانے والا نہیں۔

وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ثُمَّ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَاِلَيْهِ تَجْـَٔرُوْنَ ۝۵۳

"اور تمہارے پاس جتنی نعمتیں ہیں وہ تو اللہ کی طرف سے ہوئی ہیں ۱؎ پھر جب تمہیں تکلیف پہنچتی ہے تو اس کی جناب میں گڑگڑاتے ہو ۲؎"

۱؎ ما یا تو شرطیہ ہے یا موصولہ متضمن معنی شرط ہے، یعنی جو بھی تمہیں نعمت ملے خواہ وہ عافیت ہو یا غنا ہو یا شادابی وخوشحالی وغیرہ ہو۔ پس وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ شرط کا معنی اخبار کے اعتبار سے ہے حصول کے اعتبار سے نہیں ہے کیونکہ مخاطبین کے ساتھ نعمت کا استقرار اخبار کے لئے سبب ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں، ان کا حصول اس کی طرف سے اس کے لئے سبب نہیں ہے کیونکہ حصول استقراء سے مقدم ہے۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 125 (قدیمی)

ے جب کوئی بیماری مرض سخت یا قحط وغیرہ کی صورت میں تکلیف پہنچتی ہے تو اس وقت صرف اسی کی بارگاہ میں گڑگڑاتے ہو۔ الجوار کا معنی دعا اور استغاثہ میں آواز کو بلند کرنا ہے۔

ثُمَّ إِذَا كَشَفَ الضُّرَّ عَنكُمْ إِذَا فَرِيقٌ مِّنكُم بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُونَ ﴿٥٤﴾

''پھر جب اللہ تعالیٰ دور فرما دیتا ہے تکلیف کو تم سے تو فوراً ایک گروہ تم میں سے اپنے رب کے ساتھ شرک کرنے لگتا ہے[1]''

[1] یعنی عبادت میں غیروں کو شریک ٹھہراتے ہیں۔ مِن کا کلمہ تبعیضیہ ہے اگر خطاب عام ہو اور اگر خطاب کفار کے ساتھ خاص ہو تو من بیانیہ ہوگا۔ گویا یوں فرمایا پھر ایک فریق اور وہ تم ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ اس خصوص کی صورت میں بھی تبعیضیہ کیونکہ کفار میں سے بھی بعض کفار تکلیف دور ہونے کے بعد عبرت حاصل کر لیتے ہیں جیسے ارشاد ہے فَلَمَّا نَجَّاهُمْ إِلَى الْبَرِّ فَمِنْهُم مُّقْتَصِدٌ ۔

لِيَكْفُرُوا بِمَا آتَيْنَاهُمْ ۚ فَتَمَتَّعُوا ۖ فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ ﴿٥٥﴾

''اس طرح وہ ناشکری کرتے ہیں ان نعمتوں کی جو ہم نے انہیں عطا کی ہیں[1] پس (اے ناشکرو) لطف اٹھا لو[2] چند روز میں تمہیں (اپنا انجام) معلوم ہو جائے گا[3]''

[1] یعنی وہ ناشکری کرتے ہیں ان نعمتوں کی جو ہم نے انہیں عطا کی ہیں، خصوصاً تکلیف کو دور کرنے کی نعمت۔ لام عاقبت کے لئے ہے یعنی ان کے معاملے کا انجام نعمتوں کی ناشکری ہے کیونکہ جب وہ غیر کی عبادت کرتے ہیں تو گویا انہوں نے اس غیر سے نعمت کا ہونا ثابت کر دیا۔

[2] امر تہدید کے لئے ہے۔

[3] یہ سخت وعید ہے۔

وَيَجْعَلُونَ لِمَا لَا يَعْلَمُونَ نَصِيبًا مِّمَّا رَزَقْنَاهُمْ ۗ تَاللَّهِ لَتُسْأَلُنَّ عَمَّا كُنتُمْ تَفْتَرُونَ ﴿٥٦﴾

''اور مقرر کرتے ہیں ان کے لئے جن کو یہ جانتے ہی نہیں[1] حصہ اس مال سے جو ہم نے ان کو دیا ہے[2] اللہ کی قسم تم سے ضرور باز پرس ہوگی اس کے متعلق جو تم بہتان باندھا کرتے ہو[3]''

[1] یعنی بتوں کے لئے مقرر کرتے ہیں جو جماد میں سے ہیں اور انہیں کوئی علم بھی نہیں ہے۔ پس ضمیر کا مرجع ما ہے یا یہ معنی ہے کہ وہ حصہ مقرر کرتے ان کے لئے جن کو وہ مستحق عبادت نہیں جانتے نہ نفع دینے والے اور نہ نقصان دینے والے سمجھتے ہیں بلکہ وہ انہیں خدا کا نام دیتے ہیں اور وہ یہ ان سے جہالت کی بناء پر کہتے ہیں کہ یہ خدا ہیں جو نفع، نقصان دیتے ہیں اور شفاعت کرتے ہیں۔ یا یہ معنی کہ وہ کفار ان بتوں کو حق نہیں جانتے اس صورت میں ضمیر کا مرجع کفار ہوں گے اور ما کی ضمیر عائد محذوف ہوگی اور ما دونوں تاویلوں پر موصولہ ہے۔ یا ما مصدریہ ہے اور معنی یہ ہوگا کہ وہ اپنی جہالت کی وجہ سے حصہ مقرر کرتے ہیں اور جن کے لئے مقرر کرتے ہیں وہ محذوف ہے کیونکہ وہ معلوم شدہ ہے۔ یعنی اپنی جہالت کی وجہ سے بتوں کے لئے حصہ مقرر کرتے ہیں۔

۲؎ یعنی کھیتیوں اور جانوروں میں سے حصہ جو ہم نے انہیں عطا کیے ہیں وہ اپنے گمان سے کہتے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا حصہ ہے اور یہ ہمارے شرکاء کا ہے۔

۳؎ یعنی قیامت کے روز تم سے پوچھا جائے گا یہ غیب سے خطاب کی طرف التفات ہے۔ جو تم افتراء باندھتے ہو کہ یہ بے بس مورتیاں خدا ہیں یہ ان کے لئے اس عقیدہ پر وعید ہے۔

وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ الْبَنٰتِ سُبْحٰنَهٗ ۙ وَلَهُمْ مَّا يَشْتَهُوْنَ ﴿۵۷﴾

"اور تجویز کرتے ہیں اللہ کے لئے بیٹیاں [1] سبحان اللہ! [2] اور ان کے لئے تو وہ (بیٹے) ہیں جنہیں وہ پسند کرتے ہیں [3]"

۱؎ بنو خزاعہ اور کنانہ اللہ تعالیٰ کے لئے بیٹیاں ثابت کرتے تھے وہ کہتے فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں۔

۲؎ سُبْحٰنَهٗ یہ اللہ تعالیٰ کی ہر نقص سے تنزیہ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اس کا معنی ہے کہ میں بیٹے کی اس کی طرف نسبت سے اس کی پاکی بیان کرتا ہوں یا یہ بنو خزاعہ اور کنانہ کی بات پر تعجب کے لئے استعمال ہوا ہے۔

۳؎ یعنی ان کے لئے تو بیٹے ہیں۔ ترکیب نحوی کے اعتبار سے ما کو مبتدا اور لھم کو اس کی خبر بنانا بھی جائز ہے اور جعل بمعنی اختیار کرکے بنات پر عطف کرتے ہوئے منصوب بنانا بھی جائز ہے۔ اس صورت میں فاعل اور مفعول کی ضمیر ایک شی کے لئے ہوگی لیکن معطوف کی صورت میں اس کا جواز بعید نہیں ہے اور سبحانہ اس صورت میں معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان معترضہ ہوگا۔

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ﴿۵۸﴾

"اور جب اطلاع دی جاتی ہے ان میں سے کسی کو بیٹی (کی پیدائش) کی تو (غم سے) اس کا چہرہ سیاہ ہو جاتا ہے [1] اور وہ (رنج واندوہ سے) بھر جاتا ہے [2]"

۱؎ یعنی جب ان میں سے کسی کو بیٹی کی پیدائش کی خبر سنائی جاتی ہے تو اس کا پورا دن چہرہ سیاہ رہتا ہے کیونکہ دن کا وقت لوگوں سے مذاکرہ اور لوگوں سے اختلاط کے باعث خوشی یا غم کا زمانہ ہوتا ہے لیکن رات سونے اور غفلت کا وقت ہے۔ مسوداً یعنی لوگوں سے حیاء اور تکلیف کے باعث اس کا چہرہ سیاہ رہتا ہے۔ اسود الوجہ غم واندوہ سے کنایہ ہے۔

۲؎ یعنی غم وغصہ سے بھرا ہوا ہوتا ہے وہ اس غم وغصہ کو روکتا ہے اور ظاہر نہیں کرتا ہے۔

يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ؕ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِى التُّرَابِ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴿۵۹﴾

"چھپتا پھرتا ہے لوگوں (کی نظروں) سے اس بری خبر کے باعث جو دی گئی ہے اسے (اب یہ سوچتا ہے کہ) کیا وہ اس بچی کو اپنے پاس رکھے ذلت کے ساتھ یا گاڑ دے اسے مٹی میں [1] آہ کتنا برا ہے وہ فیصلہ جو وہ کرتے ہیں [2]"

۱؎ یعنی اپنی قوم سے چھپتا ہے اس بری خبر کے باعث جو اسے دی گئی ہے۔ اسے تردد ہے کہ آیا اسے اپنے پاس رکھے ذلت کے ساتھ یا اسے مٹی میں چھپا دے اور دفن کر دے ضمیر کا مذکر ذکر کرنا ما کے لفظ کے اعتبار سے ہے۔ امام بغوی لکھتے ہیں مضر، خزاعہ اور تمیم قبائل کے

لوگ اپنی بیٹیوں کو فقر کے خوف اور غیر کفو کے نکاح کے لالچ کی بناء پر زندہ درگور کر دیتے تھے۔ عرب کے کسی شخص کے پاس جب بچی پیدا ہوتی اور اسے زندہ رکھنا چاہتا تو اسے اون یا بالوں کا بنا ہوا جبہ پہناتا اور اسے اونٹ، اور بکریاں چرانے پر مامور کر دیتا اور جب قتل کا ارادہ کرتا تو اسے اپنے پاس رکھتا۔ جب چھ سال کی ہو جاتی تو اس کی ماں سے کہتا کہ اسے میک اپ کرے۔ پھر اسے جنگل کی طرف لے جاتا اس نے صحراء میں اس کے لئے گڑھا پہلے کھود رکھا ہوتا تھا۔ جب اس گڑھے پر پہنچتا تو بچی کو کہتا اس گڑھے میں دیکھ۔ وہ دیکھتی تو وہ باپ اسے پیچھے سے دھکا دے دیتا۔ پھر اس پر مٹی ڈال کر زمین کو برابر کر دیتا۔ صعصعہ جو فرزدق شاعر کا دادا تھا۔ جب اسے کسی شخص کے بارے میں پتہ چلتا کہ وہ ایسی حرکت کرنے والا ہے تو وہ اس باپ کی طرف چند اونٹ بھیج دیتا تو اس طرح اس کی ناداری دور ہو جاتی اور وہ بچی کو زندہ رکھتا۔ فرزدق اپنے دادا کی سخاوت پر فخر کرتے ہوئے کہتا ہے میرا دادا وہ تھا جس نے زندہ درگور کرنے والوں کو منع کیا اور زندہ درگور ہونے والیوں کو زندگی عطا کی (1)۔

۲۔ وہ بہت برا فیصلہ کرتے ہیں کہ جو بچہ سے پاک ہے اس کے لئے تو بچہ اور بچی میں سے جو کمزور ہے (یعنی بچی) اسے بناتے ہیں اور اپنے لئے مذکر پسند کرتے ہیں۔ قرآن حکیم میں ایک اور جگہ ہے اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى۔

لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ مَثَلُ السَّوْءِ ۚ وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى ۗ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝

"ان لوگوں کے لئے جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے بری صفتیں ہیں لے اور اللہ تعالیٰ اعلیٰ صفات کا مالک ہے ۲ے اور وہی سب پر غالب بڑا دانا ہے ۳ے"

لے یعنی وہ لوگ جو اللہ کے لئے بنات کا قول کرتے ہیں ان کے لئے بری صفتیں ہیں مثلاً مرنے کے بعد نسل کی بقاء کے لئے اولاد کی احتیاج، بیٹوں کی بقاء کی خواہش، بیٹوں پر فخر و غرور، بچیوں کو ناپسند کرنا۔ انہیں تنگدستی اور فقر کے خوف سے زندہ درگور کرنا وغیرہ۔

۲ے اللہ تعالیٰ اعلیٰ صفات کا مالک ہے مثلاً وجوب ذاتی، غناء مطلق، اور لا الہ الا ھو اور جملہ صفات عالیہ جلال، کمال یعنی علم، قدرت اور بقاء وغیرہا سے متصف ہے اور مخلوق کی صفات سے پاک ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں مثل السوء سے مراد آگ ہے اور المثل الاعلیٰ سے مراد لا الہ الا اللہ کی گواہی دینا ہے (2)۔

۳ے وہ اپنے کمال قدرت و حکمت میں منفرد اور یکتا ہے۔

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ۝

"اور اگر (فوراً) پکڑ لیا کرتا اللہ تعالیٰ لوگوں کو لے ان کے ظلم کے باعث ۲ے چھوڑتا زمین پر ۳ے کسی جاندار کو ۴ے لیکن وہ مہلت دیتا ہے انہیں ایک مقررہ میعاد تک ۵ے پس جب آ جاتی ہے ان کی (مقررہ) میعاد تو نہ وہ ایک لمحہ پیچھے ہو سکتے ہیں اور نہ ایک لمحہ آگے ہو سکتے ہیں ۶ے"

لے النّاس پر الف لام عہدی ہے اور اس سے مراد کفار ہیں کیونکہ مؤاخذہ اور ظلم کی ان کی طرف نسبت کا قرینہ موجود ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 80-79 (التجاریہ)　　2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 80 (التجاریہ)

۲ یعنی ان کے کفر اور عصیان کیوجہ سے(1)۔ امام بیضاوی کی عبارت یہ شعور دلاتی ہے کہ الناس سے مراد تمام لوگ ہیں، وہ فرماتے ہیں الناس کے عموم اور ظلم کی اضافت سے یہ لازم نہیں آتا کہ تمام لوگ ظالم ہوں حتی کہ انبیاء کرام علیہم السلام بھی شامل ہوں کیونکہ نسبت تو تمام لوگوں کو اسوقت بھی کی جاتی ہے جب کوئی فعل ان میں عام ہو جائے اور اکثر سے صادر ہو۔ میں کہتا ہوں اس سے تو یہ لازم آتا ہے اکثر کے ظلم کی وجہ سے تمام لوگوں کا مؤاخذہ کیا جاتا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ہے۔

۳ ھا ضمیر سے مراد الارض ہے اور یہ کنایہ ہے اس سے جس پر لفظ الناس اور دابہ دلالت کرتا ہے۔

۴ یا تو دابہ سے مراد ظالم ہے جیسا کہ صاحب مدارک نے ابن عباس سے روایت کیا ہے۔ یا دابہ سے مراد مومنین صالحین کے علاوہ تمام دواب الارض ہیں کیونکہ یہ جائز نہیں کہ مومنین کے ظلم اور ان کے گناہوں کی وجہ سے ہلاک کئے جائیں۔ ہاں اگر وہ امر بالمعروف او رنہی عن المنکر ترک کر دیں تو مومنین کو سزا ہوگی کیونکہ وہ ان کے گناہوں پر راضی ہوئے یا انہوں نے اس چیز (تبلیغ) کو ترک کر دیا تھا جو ان پر واجب تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب لوگ کسی گناہ کو دیکھیں اور اسے نہ روکیں تو کوئی بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ تمام کو سزا دے۔ اس حدیث کو ابن ماجہ اور ترمذی نے روایت کیا ہے(2) اور ابو بکر صدیق کی حدیث کو امام ترمذی نے صحیح قرار دیا ہے۔ ابو داؤد اور جریر بن عبد اللہ نے اسی حدیث کے ہم معنی بیان کی ہے اور مومنین صالحین کے علاوہ جو دواب الارض ہیں۔ ان کا ابن آدم کے گناہ کی وجہ سے ہلاک ہونا جائز ہے کیونکہ وہ تمام جانور انسان کی تبع میں ہیں کیونکہ ان تمام کی تخلیق انسان کی تخلیق کی تبع میں ہے اور ان تمام جانوروں کے وجود کا نفع انسان کی طرف لوٹتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا۔

حضرت قتادہ اس آیت کے بارے فرماتے کہ اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام کے زمانہ میں ایسا کیا تھا۔ اس نے وہ تمام جو زمین پر تھا ہلاک کر دیئے تھے سوائے ان چیزوں اور لوگوں کے جو نوح علیہ السلام کی کشتی میں سوار تھے(3)۔ امام بیہقی حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت فرماتے ہیں کہ انہوں نے ایک آدمی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ ظالم اپنے آپ کو ہی نقصان پہنچاتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا نہیں قسم بخدا ظالم کے ظلم کی وجہ سے چڑیاں اپنے گھونسلوں میں مر جائیں گی(4)۔ ابن ابی شیبہ، عبد بن حمید، ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور امام بیہقی نے ابن مسعودؓ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں کیڑے مکوڑے ابن آدم کے گناہ کی وجہ سے اپنی بلوں میں عذاب دیئے جاتے ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں آیت کریمہ کا معنی یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ ظالموں کے آباء کو ان کے ظلم کی وجہ سے پکڑ لیتا تو نسل انسانی ختم ہو جاتی اور نہ اولاد ہوتی اور زمین پر کوئی باقی رہتا۔ اسی وجہ سے حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کے لئے بددعا نہ فرمائی حتی کہ وحی کے ذریعے معلوم ہو گیا کہ موجودہ کفار کی اولاد بھی کافر ہی ہوگی۔

۵ لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے کمال حلم کی وجہ سے ظالموں کو مہلت دیتا ہے۔ اس مدت تک جو اس نے ان کی عمروں کے لئے متعین کی تھی یا ان کے عذاب کے لئے مقرر فرمائی تھی تا کہ ان کے توالد کا سلسلہ چلتا رہے۔

۶ یعنی جب مقرر میعاد آ جاتی ہے تو ایک لحہ بھی پیچھے نہیں ہو سکتے اور نہ ان عمروں سے بڑھ سکتے ہیں۔ اس کا عطف اذا جاء پر ہے۔

وَ یَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ مَا یَكْرَهُوْنَ وَ تَصِفُ اَلْسِنَتُهُمُ الْكَذِبَ اَنَّ لَهُمُ الْحُسْنٰى ؕ لَا

1۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 359 (فراس)

2۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 298 (وزارت تعلیم)

3۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 227 (العلمیہ)

4۔ شعب الایمان، جلد 6، صفحہ 54 (العلمیہ)

جَرَمَ اَنَّ لَهُمُ النَّارَ وَ اَنَّهُمْ مُّفْرَطُوْنَ ﴿۶۲﴾

"اور تجویز کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کے لئے (بیٹیاں) جنہیں وہ (اپنے لئے) ناپسند کرتے ہیں اور بیان کرتی ہیں ان کی زبانیں جھوٹ [1] جب وہ کہتی ہیں کہ) فقط انہیں کے لئے بھلائی ہے [2] یقیناً [3] ان کے لئے تو آتش (جہنم) ہے اور انہیں کو (دوزخ) میں پہلے بھیجا جائے گا [4]"

[1] یعنی بیٹیاں، ریاست میں شریک رسولوں کا استخفاف اور گھٹیا اموال جو اپنے لئے ناپسند کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کے لئے تجویز کرتے ہیں اور ان کی زبانیں جھوٹ کہتی ہیں۔

[2] کہ ان کے لئے بھلائی ہے یہ جملہ الکذب سے بدل ہے۔ یمان نے لکھا ہے کہ الحسنی سے مراد آخرت میں جنت کا ملنا ہے۔ کافر کہتے تھے کہ اگر محمد ﷺ قیامت کے برپا ہونے کے قول میں سچے ہیں تو پھر بھی ہم جنت میں ہوں گے۔

[3] یقیناً لامحالہ امام بغوی فرماتے ہیں ابن عباس نے فرمایا اس کا معنی بلیٰ ہے (1)۔ میں کہتا ہوں یہ اس صورت میں ہوگا جس میں کہا گیا ہے کہ لا جرم لا سابقہ کلام کا رد ہے۔ ان کا گمان سابق یہ تھا کہ بھلائی تو صرف ان کے لئے ہے۔ مقصود یہ تھا کہ وہ دوزخ میں داخل نہ ہوں گے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے قول کا رد فرماتے ہوئے فرمایا۔

[4] ان کے لئے تو آتش جہنم ہے اور یہی دوزخ میں پہلے پہنچائے جائیں گے۔ نافع نے راء کے کسرہ کے ساتھ افراط سے مشتق کر کے پڑھا ہے۔ قاموس میں ہے مفرطون کا معنی یہ ہے کہ جو ان کے لئے حد متعین تھی اس سے وہ تجاوز کرنے والے ہیں۔ امام بغوی نے اس کا معنی مسرفون لکھا ہے۔ ابو جعفر نے راء کے کسرہ اور شد کیساتھ پڑھا ہے، یعنی باب تفعیل سے پڑھا ہے جس کا معنی کوتاہی کرنا اور ضائع کرنا ہے، یعنی وہ طاعات الٰہیہ میں کوتاہی کرنے والے ہیں اور امور الٰہیہ کو ضائع کرنے والے ہیں اور باقی قراء نے راء کے فتحہ کے ساتھ اور تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ قاموس میں ہے وہ لوگ آگ میں ڈالے گئے ہیں اور بھلا دیئے گئے ہیں۔ یا اس کا معنی ہے وہ جلدی دوزخ میں بھیجے جائیں گے۔ امام بغوی فرماتے ہیں ابن عباس نے فرمایا وہ آگ میں ڈال کر بھلا دیئے گئے ہیں مقاتل فرماتے ہیں وہ آگ میں چھوڑے گئے ہیں۔ قتادہ فرماتے ہیں وہ آگ میں جلدی بھیجے جائیں گے اور فراء نے بھی یہی مفہوم لکھا ہے۔ اسی سے ماخوذ آپ ﷺ کا ارشاد ہے اَنَا فَرَطُكُمْ عَلَى الْحَوْضِ یعنی حوض کوثر پر میں تمہارا پیشرو ہوں (2)۔ سعید بن جبیر فرماتے ہیں مفرطون بمعنی مبعدون ہے یعنی دور کر دیئے گئے ہیں۔

تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَاۤ اِلٰۤى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۶۳﴾

"بخدا ہم نے بھیجا ہے (رسولوں کو) مختلف قوموں کی طرف آپ سے پہلے پس آراستہ کر دیا ان کے لئے شیطان نے ان کے (برے) اعمال کو [1] پس وہی ان کا دوست ہے آج بھی [2] اور ان کے لئے عذاب الیم ہے [3]"

[1] پس اس امت کے اکثر لوگوں کے لئے مزین کر دیا شیطان نے ان کے برے اعمال کو جیسے اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرانا، رسولوں کی تکذیب کرنا اور پھر ان پر اصرار کرنا۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 81 (التجاریۃ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 81 (التجاریۃ)

۲ھم ضمیر کا مرجع کفار قریش ہیں کیونکہ کلام ان سے ہو رہی ہے۔ ولی کا معنی دوست مددگار اور ساتھی ہے، یعنی شیطان ان کا دوست اور ساتھی ہے اور وہ ان کے لئے اعمال خبیثہ کو آراستہ کر کے پیش کرتا ہے جیسا کہ وہ ان سے پہلے لوگوں کے لئے اعمال کو آراستہ کرتا تھا۔ وہی مومنین کے ساتھ دشمنی کرنے میں ان کا معاون ہے اور جائز ہے کہ ضمیر سابقہ امتوں کے لئے ہو اور یہ قول ماضی کی حالت کی حکایت ہو۔ یعنی شیطان دنیا میں ان کا ولی تھا جب وہ ان کے سامنے ان کے برے اعمال آراستہ کر کے پیش کرتا تھا اور یہ بھی جائز ہے کہ الیوم سے مراد قیامت کا دن ہو اور کلام مستقبل کے زمانہ کی حکایت ہو اور معنی یہ ہو کہ شیطان قیامت کے دن زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہونے میں ان کا ساتھی ہوگا۔ یا یہ معنی کہ شیطان قیامت کے روز ان کا مددگار ہوگا، یعنی ان کا اور کوئی مددگار نہ ہوگا، وہ خود اس دن عاجز ہوگا تو پھر ان کی کیسے مدد کریگا۔ یہ حقیقت میں بلیغ طریقہ پر ان کے مددگار کی نفی ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہاں مضاف محذوف ہو۔ تقدیر کلام یوں ہو فَهُوَ وَلِيُّ اَمْثَالِهِمْ مِنَ الْكُفَّارِ الْيَوْمَ یعنی وہ آج ان کی مثل کفار یعنی قریش کفار کا دوست ہے۔

۳ اور قیامت کے روز ان کے لئے دردناک عذاب ہوگا۔

وَ مَاۤ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۙ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۶۴﴾

''اور نہیں اتاری ہم نے آپ پر یہ کتاب مگر اس لئے کہ آپ صاف صاف بیان کر دیں ان کے لئے ۱ وہ بات جس میں وہ اختلاف کرتے ہیں ۲ اور (یہ کتاب) سراپا ہدایت اور رحمت ہے اس قوم کے لئے جو ایماندار ہے ۳''

۱ ھم ضمیر کا مرجع الناس ہے۔

۲ یعنی توحید، صفات، قدر، آخرت کے احوال، بندوں کے افعال اور احکام الٰہی کے بارے میں جو اختلاف کرتے تھے۔

۳ دونوں (هُدًى وَّ رَحْمَةً) لِتُبَيِّنَ کے محل پر معطوف ہیں اور علت کی بناء پر منصوب ہیں کیونکہ یہ دونوں اَنْزَلْنَا کے فاعل کے فعل ہیں۔ لِتُبَيِّنَ کے فاعل کے فعل نہیں ہیں کیونکہ وہ مخاطب کا فعل ہے۔

وَاللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ﴿۶۵﴾

''اور اللہ تعالیٰ نے اتارا آسمان سے پانی پھر زندہ کیا اس سے زمین کو اس کے بنجر بن جانے کے بعد بیشک اس میں (کھلی) نشانی ہے ان لوگوں کیلئے جو (حق کی آواز) سنتے ہیں ۱''

۱ یعنی اللہ تعالیٰ زمین کی بوٹیوں کو پانی کے ذریعے سرسبز و شاداب اور بڑھنے والا بنا دیتے ہیں اس کے خشک ہونے کے بعد اور روح نباتی سے خالی ہونے کے بعد۔ اس کرشمہ سازی میں قیام قیامت پر بہت بڑی دلیل ہے اس قوم کے لئے جو تدبر و انصاف سے سماع کرتے ہیں۔

وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ؕ نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَيْنِ فَرْثٍ وَّ دَمٍ لَّبَنًا

خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ ﴿۶۶﴾

”اور بے شک تمہارے لئے مویشیوں میں ایک عبرت ہے ۱ (دیکھو) ہم تمہیں پلاتے ہیں ۲ جو ان کے شکموں میں ۳ گوبر ۴ اور خون ہے ان کے درمیان سے نکال کر خالص دودھ ۵ جو بہت خوش ذائقہ ہے پینے والوں کے لئے ۶“

۱ یعنی ان مویشیوں میں تمہارے لیے عبرت ہے۔ عبرت ایسی دلالت کو کہتے ہیں جو جہالت سے علم تک پہنچا دے۔

۲ نُسۡقِیۡکُمۡ کو نافع، ابن عامر ابوبکر، اور یعقوب نے یہاں بھی اور سورۂ مومنون میں نون کے فتحہ کے ساتھ مجرد فعل سے پڑھا ہے اور باقی قراء نے نون کے ضمہ کے ساتھ باب انعال سے پڑھا ہے اور یہ دونوں لغتیں ہیں۔

۳ یہ عبرت کے بیان کے لئے مستقل کلام ہے۔ پہلی انعام کی طرف جو ضمیر لوٹائی گئی ہے وہ اس کے لفظ کے اعتبار سے مفرد اور مذکر ہے اور سورۂ مومنون میں اس کے معنی کے اعتبار سے مونث ہے کیونکہ انعام کا لفظ اسم جمع ہے اس کا مفرد نہیں ہے سیبویہ نے اس لفظ کو ان مفرد الفاظ سے شمار کیا ہے جو افعال کے وزن پر آتے ہیں جیسے اخلاق اور اکیاش وغیرہ، فراء۔ ابو عبیدہ اور اخفش نے بھی اسی طرح لکھا ہے۔ نعم اور انعام واحد ہے مذکر، مونث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ جس نے مونث ذکر کیا اس نے جمع کے معنی کا اعتبار کیا اور جس نے مذکر ذکر کیا وہ اس کے لفظ کا اعتبار کرتا ہے۔ کسائی کہتے ہیں ہ ضمیر کا مرجع ما ہے (یعنی ہم نے ذکر کیا ہے ان کے بطون کے بارے میں)۔ مؤرخ کہتے ہیں ضمیر کا مرجع بعض ہیں(1) کیونکہ دودھ بعض جانوروں کا ہوتا ہے۔ بعض علما فرماتے ہیں انعام سے جنس مراد ہے۔

۴ فرث اس مواد کو کہتے ہیں جو اوجھ میں ہوتا ہے، جب اس سے نکل جاتا ہے تو اسے فرث نہیں کہتے۔

۵ یعنی وہ دودھ خون اور فرث کی آلائش سے بالکل پاک ہوتا ہے، اس پر نہ خون کا رنگ ہوتا ہے اور نہ فرث کی بدبو ہوتی ہے حالانکہ دودھ ان دونوں چیزوں سے پیدا ہوتا ہے۔

۶ پینے والوں کے حلق سے اس کا گزرنا آسان ہوتا ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں ابن عباس نے فرمایا جب چوپایہ گھاس کھاتا ہے تو وہ اوجھ میں جا کر ٹھہر جاتا ہے۔ پھر وہ اس کو پیتا ہے نیچے والا گوبر، درمیان والا دودھ اور اوپر والا حصہ خون بن جاتا ہے۔ جگر اس پر مسلط ہے جو اللہ تعالیٰ کی تدبیر سے اس مواد کو تقسیم کرتا ہے۔ خون رگوں میں چلا جاتا ہے۔ دودھ کھیری میں پہنچ جاتا ہے اور گوبر اپنی کیفیت میں باقی رہتا ہے(2)۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں شاید یہ مراد ہو کہ اس کا اوسط دودھ کا مادہ ہے اور اس کا اعلیٰ اس خون کا مادہ ہے جو بدن کو غذا دیتا ہے، فرماتے ہیں جگر اوجھ میں جو منہضم کھانا ہوتا ہے اس کا خلاصہ جذب کر لیتا ہے اور فضلہ وہیں رہتا ہے۔ پھر جگر اس کو نچوڑ کر دوبارہ ہضم کرتا ہے۔ پھر چار اخلاط بناتا ہے جن کے اندر مائیت ہوتی ہے۔ پھر جگر کی قوت ممیزہ ضرورت سے زائد مائیت کو علیحدہ کر دیتی ہے اور اسے گردوں پتہ اور تلی کی طرف دھکیل دیتی ہے اور بقیہ نچوڑ (خلاصہ) کو جگر اعضاء میں تقسیم کر دیتا ہے۔ حکیم و علیم کی تقدیر سے ہر عضو کو اپنا اپنا حصہ پہنچ جاتا ہے۔ پھر اگر حیوان مونث ہو تو اس کے مزاج پر برودت اور رطوبت کا غلبہ ہوتا ہے۔ اس لئے اس کے اخلاط اس کی غذا کی مقدار پر زائد ہوتے ہیں۔ پھر جگر زائد حصہ کو جنین (حمل) کی خاطر رحم کی طرف پہنچا دیتا ہے۔ پھر جب بچہ پیدا ہو جاتا ہے تو زائد حصہ تمام یا اس کا بعض کھیری کی طرف چلا جاتا ہے۔ پھر وہ حصہ میٹھے سفید گوشت کی مجاورت کی وجہ سے سفید ہو جاتا ہے۔ پھر دودھ بن جاتا ہے جو شخص اخلاط، دودھ کے پیدا کرنے، ان کے مقر اور گزرنے کے راستوں، ان کو پیدا کرنے والے اسباب اور انہیں بر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 81 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 81 (التجاریہ)

وقت مناسب تصرف کرنے والی قوتوں میں غور وفکر کرے گا۔ وہ اللہ تعالیٰ کے کمال حکمت اور رحمت غیر متناہیہ کا اقرار بے ساختہ کرے گا۔ پہلا مِن بعضیہ ہے کیونکہ دودھ بعض جانوروں سے حاصل ہوتا ہے اور دوسرا مِن ابتدائیہ ہے جیسے سقیت من الحوض میں ہے کیونکہ گوبر اور خون کے درمیان ایک مقام ہے جس سے اسقاء کی ابتداء ہوتی ہے یہ من نسقیکم کے متعلق ہے یالبنا سے حال ہے اور ذوالحال کے نکرہ ہونے کی وجہ سے اسے مقدم کیا گیا ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ تنبیہ ہوجائے کہ یہی عبرت کا مقام ہے(1)۔

وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۶۷﴾

"اور (ہم پلاتے ہیں تمہیں) کھجور اور انگور کے پھلوں سے تم بناتے ہو اس سے میٹھا رس اور پاک رزق بلاشبہ اس میں بھی (ہماری قدرت کی) نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو سمجھدار ہیں ؎۔"

؎ یعنی کھجور اور انگوروں کا رس ہم تمہیں پلاتے ہیں۔ یہ محذوف فعل نسقیکم کے متعلق ہے اور تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا کا قول اسقاء کے بیان کے لئے مستقل جملہ ہے یا یہ مِنْ ثَمَرٰتِ الخ تَتَّخِذُوْنَ کے متعلق ہے اور مِنْهُ کا تکرار تاکید کے لئے ہے یا مِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ محذوف کی خبر ہے جسکی صفت تَتَّخِذُوْنَ ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہوگی وَمِنْ ثَمَرَاتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ ثَمَرٌ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ اور پہلی دونوں صورتوں میں ضمیر کے مذکر ہونے کی وجہ یہ ہے کہ مضاف محذوف العصیر مذکر ہے یا ثمرات بمعنی ثمر ہے۔ السکر اس چیز کا اسم ہے جس سے نشہ حاصل کیا جاتا ہے یا مصدر ہے جس کے ساتھ خمر کا نام رکھا گیا ہے۔ قاموس میں ہے سکر فرح کی طرح ہے سُكْرًا سَكَرًا مَسْكَرًا اور سُكْرًا نا یہ صحا (صحت) کی ضد ہے۔ السکر شراب کو کہتے ہیں اور نبیذ پھلوں اور کشوث اور ہر نشہ آور چیز سے بنایا جاتا ہے اور پھلوں میں سے اور سرکہ اور کھانے میں سے جو شراب بنائی جاتی اور وہ حرام ہے اسے بھی سکر کہا جاتا ہے۔ صاحب ھدایہ فرماتے ہیں سکر وہ ہے جو تر کھجور کے پانی سے بنایا جاتا ہے۔ شریک بن عبداللہ فرماتے ہیں اس آیت کی بناء پر وہ مباح ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ہم پر اپنے احسانات کا تذکرہ فرمارہے ہیں اور حرام چیز کا ذکر بطور احسان نہیں کیا جاتا اور ہماری دلیل یہ ہے کہ سکر کی حرمت پر صحابہ کرام کا اجماع ہے اور آیت کریمہ ابتداء اسلام پر محمول ہے جبکہ ہر قسم کی شراب حلال تھی۔ امام بغوی فرماتے ہیں ایک قوم کا خیال ہے کہ سکر شراب ہے اور رزق حسن سے مراد سرکہ، اور جو چیز کھجور سے بنائی جاتی ہے چھوہارے اور کشمش ہے۔ علماء فرماتے ہیں یہ آیت کریمہ شراب کی تحریم سے پہلے کی ہے۔ حضرت ابن مسعود، ابن عمر، سعید بن جبیر الحسن اور مجاہد کا یہی خیال ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں ابن عباس سے مروی ہے کہ جو پھلوں میں سے حرام چیز تیار کی جاتی ہے وہ سکر ہے اور رزق حسن سے مراد وہ ہے جو پھلوں میں سے حلال چیز تیار ہوتی ہے ابو عبیدہ فرماتے ہیں سکر سے مراد کھانا ہے۔ کہا جاتا ہے ھذا سکر لک یہ آپ کے لئے کھانا ہے۔ شعبی کہتے ہیں جو تو نوش کرتا ہے وہ سکر ہے اور جو تو کھاتا ہے وہ رزق حسن ہے۔ البغوی نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ سکر حبشہ کی لغت میں سرکہ ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں سکر حبشہ کی لغت میں نشہ آور نبیذ ہے جو چھواروں اور کشمش سے تیار ہوتی ہے جب ان کا شیرہ پکایا جائے اور گاڑھا ہو جائے۔ الضحاک اور النخعی کا یہی قول ہے کچھ لوگ نبیذ کا پینا مباح سمجھتے ہیں اور جو اس کو حرام کہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں اس آیت میں خمر بنانے کا ذکر ہے۔ حلال کرنے کا ذکر نہیں سب سے عمدہ قول یہ ہے کہ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا کا قول منسوخ

1۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 60-359 (فراس)

ہے۔(انتھی کلام البغوی)(1) امام بغوی ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے شراب کے متعلق چار آیات نازل فرمائی ہیں۔ ا۔ وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا اس آیت کے نزول کے بعد بھی مسلمان شراب پیتے رہے اور ان کے لئے حلال بھی تھی۔ یہ آیت کریمہ مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی۔ پھر مدینہ منورہ میں يَسْــَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ نازل ہوئی۔ اس کے بعد يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى اور آخر میں سورۂ مائدہ کی آیت نازل ہوئی۔ ان چاروں آیات کے نزول کا قصہ سورۂ بقرۃ کی آیت وَيَسْــَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ کے تحت ہم نے ذکر کر دیا ہے۔

وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِيْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُوْنَ ۝۶۸

”اور ڈال دی آپ کے رب نے شہد کی مکھی کے دل میں یہ بات [1] کہ بنایا [2] کر پہاڑوں میں اپنے چھتے اور درختوں (کی شاخوں) میں اور ان چھپروں میں جو لوگ بناتے ہیں [3]“

[1] یعنی شہد کی مکھی کی طرف الہام فرمایا اور ان کے دلوں میں یہ ڈال دیا۔

[2] ان مفسرہ ہے کیونکہ وحی میں قول کا معنی پایا جاتا ہے۔

[3] ابن عامر اور ابو بکر نے راء کے ضمہ کے ساتھ اور باقی قراء نے راء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ گھر کی چھت میں جس سے سایہ حاصل کیا جاتا ہے یا جو انگور کی بیلوں کے لئے چھپر بناتے ہیں۔ العرش کی اصل چھت ہیں۔ یہاں حرف جر تبعضیہ ذکر کیا گیا ہے کیونکہ ہر پہاڑ ہر درخت ہر چھت اور ہر جگہ پر چھتے نہیں بنائے جاتے۔ شہد کی مکھی کے چھتے کو بیت کہا ہے کیونکہ اسے انسان کے بیت کیساتھ بہت گہری مشابہت ہے اور اس چھتے میں ایسا حسن صنعت اور بہترین تقسیم ہے جس پر بڑے سے بڑا ماہر انجینئر بھی قدرت نہیں رکھتا۔ شاید اس پر تنبیہ کے لئے اس کا ذکر ہوا ہے۔

ثُمَّ كُلِيْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِيْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا ؕ يَخْرُجُ مِنْ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝۶۹

”پھر رس چوسا کر ہر قسم کے پھلوں سے [1] پس چلتی رہا کر اپنے رب [2] کی آسان کی ہوئی راہوں پر [3] (یوں) نکلتا ہے ان کے شکموں سے ایک شربت مختلف رنگوں والا [4] اس میں شفاء ہے لوگوں کے لئے [5] بیشک اس میں (قدرت الٰہی کی) نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر کرتے ہیں [6]“

[1] الثَّمَرٰتِ پر الف لام جنس کا ہے، یعنی ہر پھل سے جو تجھے پسند ہو اور میسر ہو خواہ کڑوا ہو خواہ میٹھا ہو۔ کل کا معنی استغراق نہیں ہے۔

[2] یعنی ان راستوں پر جن کے متعلق تیرے رب نے تجھے الہام کیا ہے اور جو شہد بنانے کا عمل سکھایا ہے۔ یا یہ معنی کہ جب تو دور دراز کے مقامات سے اپنے چھتوں کی طرف لوٹے تو اپنے رب کے بتائے ہوئے راستوں پر چل کر آ اور ادھر ادھر نہ بھٹک۔ یا یہ معنی کہ تو رس چوسنے کے بعد اپنے پیٹ کے ایسے راستوں میں اسے داخل کر جن میں اس کی قدرت کاملہ سے کلیوں کا رس شہد بن جائے۔ ذللا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 82 (التجاریہ)

ذلولی کی جمع ہے اور السبل سے حال ہے یعنی ان راستوں پر جن کو اللہ تعالیٰ نے آسان فرما دیا ہے۔ یا یہ اسلکی کی ضمیر سے حال ہے، یعنی تو اپنے رب کے راستوں پر چل درآں حالیکہ تو اپنے رب کے حکم کی پابند ہو کہا جاتا ہے کہ ان مکھیوں کے بادشاہ ان مکھیوں کو ایک مکان سے دوسرے مکان کی طرف منتقل کرتے رہتے ہیں۔ مکھیوں کا بادشاہ یعسوب ہوتا ہے۔ جب وہ ٹھہرتا ہے تو تمام مکھیاں ٹھہر جاتی ہیں اور جب وہ چلتا ہے تو یہ تمام مکھیاں چل پڑتی ہیں۔

۳ے اس آیت میں خطاب سے غائب کی طرف التفات ہے۔ گویا مکھی کے خطاب سے لوگوں کے خطاب کی طرف عدول کیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ بندوں پر انعام کا محل ہے اور مکھی کی تخلیق اور اس کو الہام سے مقصود بندوں کو نفع پہنچانا ہے۔

۴ے بعض کا رنگ سفید بعض کا سرخ بعض کا زرد اور بعض کا سبز ہوتا ہے۔

۵ے اس شہد میں مجاہد فرماتے ہیں اس کا مطلب ہے کہ قرآن میں لوگوں کے لئے شفا ہے، یعنی فیہ کی ہ ضمیر کا مرجع قرآن ہے۔ ظاہر قول پہلا ہی ہے (یعنی ہ ضمیر کا مرجع شہد ہے)(1)۔ آیت کا لفظ اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ ضمیر کا مرجع شہد ہے، یعنی شہد میں شفا ہے، اگرچہ بعض حالات میں ہے اور بعض امراض میں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شفا نکرہ ہے اور یہ بعض شفا پر دلالت کر رہا ہے اور سیاق کلام بھی تعمیم کی ایک نوع کا تقاضا کرتا ہے، ورنہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس میں بعض امراض کے لئے شفا نہ ہو جیسا کہ زہر میں بھی بعض امراض کے لئے شفا ہے کیونکہ وہ بھی بعض دواؤں میں استعمال ہوتی ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ تنوین تعظیم کے لئے ہے۔ معنی یہ ہے کہ لوگوں کے لئے اس میں بڑی شفا ہے، یعنی اکثر امراض اور اکثر اوقات میں شفاء ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ کی حدیث بھی اس مفہوم کی تائید کرتی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم پر دو شفاؤں پر عمل کرنا لازم ہے۔ (1) عسل (شہد) (2) قرآن۔ اس حدیث کو ابن ماجہ نے روایت کیا ہے (2) اور حاکم نے سند صحیح کے ساتھ روایت کی ہے۔ یہ حدیث پاک شہد کی غالبی شفا پر دلالت کرتی ہے۔

امام بغوی نے ابن مسعود کا قول ذکر فرمایا ہے کہ شہد ہر بیماری کی شفا ہے اور قرآن شفا ہے ان امراض کے لئے جو سینوں میں ہیں (3) گویا عبد اللہ بن مسعود نے حدیث مرفوع سے عموم کو ہی سمجھا ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں شہد شفا ہے یا بذات خود جیسا کہ بلغمی مراض کے لئے ہے یا دوسری دواؤں سے مل کر شفا ہے جیسا کہ تمام امراض کے علاج میں استعمال ہوتی ہے کیونکہ کوئی ایسی معجون نہیں ہے جس میں شہد کا جز نہ ہو (4)۔ صحیحین میں ابو سعید الخدری سے مروی ہے کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور عرض کی حضور میرے بھائی کو استطلاق بطن (پیٹ کا بہنا) کی بیماری ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اسے شہد پلاؤ۔ اس نے بھائی کو شہد پلائی پھر بارگاہ نبوی ﷺ میں حاضر ہوا اور عرض کی حضور شہد تو میں نے اسے پلائی ہے لیکن اس سے تو زیادہ پیٹ بہنے لگا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا ہے اور تیرے بھائی کا پیٹ جھوٹا ہے۔ پھر اس نے شہد اسے پلائی تو وہ ٹھیک ہو گیا (5)۔ یہ حدیث پاک دلالت کرتی ہے کہ شہد اکیلی ہی باعث شفا ہے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جو اسی نیت سے اسے کسی بھی مرض کے لئے استعمال کرے گا اللہ تعالیٰ اسے ان شاء اللہ شفا عطا فرمائے گا۔ امام سیوطی نے اسی طرح لکھا ہے۔

۔ جو شخص علوم دقیقہ اور افعال عجیبہ کے ساتھ ایک مکھی کے اختصاص میں گہری نظر اور گہرے تدبر سے غور و خوض کرے گا تو یقیناً وہ جان لے گا کہ کوئی قادر و حکیم ہے جس نے اس چھوٹی سی، حقیر سی مکھی کو الہام فرمایا ہے اور اسے ان کاموں پر مامور کیا ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 84 (التجاریہ)
2۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 255 (وزارت تعلیم)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 84 (التجاریہ)
4۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 360 (فراس)
5۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 360 (فراس)

وَ اللّٰهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ یَتَوَفّٰىكُمْ ﳜ وَ مِنْكُمْ مَّنْ یُّرَدُّ اِلٰۤى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَیْ لَا یَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَیْــٴًـا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ قَدِیْرٌ ۝

”اور اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا ہے تمہیں پھر جان قبض کرے گا تمہاری ۱؎ اور تم میں سے بعض ایسے ہیں جنہیں لوٹا دیا جاتا ہے ناکارہ عمر کی طرف ۲؎ تا کہ وہ کچھ نہ جانے جان لینے کے بعد ۳؎ بیشک اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا ہر چیز پر قادر ہے ۴؎“

۱؎ یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہیں پیدا فرمایا۔ پھر تمہیں بچپن میں یا جوانی میں کھولت میں یا بڑھاپے میں تمہاری جان قبض کرتا ہے۔

۲؎ اور تم میں سے بعض کو بڑھاپے کی عمر تک لوٹاتا ہے۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں اَرْذَلِ الْعُمُرِ نوے سال ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے آپ نے فرمایا اَرْذَلِ الْعُمُرِ پچھتر سال ہے۔ بعض نے فرمایا اسی سال ہے (1)۔ حضور نبی کریم ﷺ کی دعا میں ہے اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِکَ مِنْ سُوْءِ الْعُمُرِ اور ایک روایت میں ہے مِنْ اَرْذَلِ الْعُمُرِ۔ صحیحین وغیرہما میں اسی طرح ہے۔

۳؎ یعنی وہ تمام معلومات بھول جائے اور عدم علم اور سوء فہم میں بچوں کے مشابہ حالت میں ہو جائے۔ حضرت عکرمہ فرماتے ہیں جو قرآن پڑھے گا وہ اس حالت میں کبھی مبتلا نہ ہوگا (2)۔

۴؎ وہ لوگوں کی عمروں کی مقادیر کو جاننے والا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے، ایک جوان کو مار دیتا ہے اور بوڑھے فرتوت کو زندہ رکھتا ہے۔ اس آیت میں تنبیہ ہے کہ لوگوں کے احوال میں تفاوت صرف اور صرف قادر حکیم اور علیم خدا کی تقدیر سے ہے، اگر یہ طبع کے تقاضا پر ہوتا تو اس حد تک تفاوت نہ ہوتا۔

وَ اللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِی الرِّزْقِ ۚ فَمَا الَّذِیْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّیْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُمْ فَهُمْ فِیْهِ سَوَآءٌ ؕ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ یَجْحَدُوْنَ ۝

”اور اللہ تعالیٰ نے برتری بخشی ہے تم میں سے بعض کو بعض پر دولت کے لحاظ سے پس (اب بتاؤ) کیا وہ لوگ جنہیں برتری بخشی گئی ہے وہ لوٹانے والے ہیں اپنی دولت کو ان لوگوں پر جو ان کے مملوک ہیں ۱؎ تا کہ وہ سب اس میں برابر ہو جائیں ۲؎ ہرگز نہیں) تو کیا وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا انکار کرتے ہیں ۳؎“

۱؎ اللہ تعالیٰ نے تم میں سے بعض کو غنی مالک اور بادشاہ بنایا جو لاکھوں روپے خرچ کرتے ہیں اور بعض کو مملوک یا عسکری یا فقیر بنایا جو کسی چیز پر قادر نہیں ہوتا، یعنی جو غنی اور بادشاہ ہیں۔ کیا اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ رزق میں سے جو زائد ہے وہ دیتے ہیں اپنے غلاموں کو تا کہ وہ رزق میں مساوی ہو جائیں۔

۲؎ یہ جملہ اسمیہ ہے جو نفی کے جواب میں ہے۔ گویا یوں تقدیر ہے فَمَا الَّذِیْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّیْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُمْ فَیَسْتَوُوْا فِی الرِّزْقِ۔ یہ مشرکین کا رد اور ان کے خیالات باطلہ کا انکار ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بعض مخلوق کو الوہیت میں اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہراتے ہیں حالانکہ انہیں اس کی صلاحیت بھی نہیں کیونکہ وہ کسی نہ کسی چیز کو کسی اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہراتے تھے، جبکہ خود وہ اپنے غلاموں کو اس چیز میں شریک نہیں کرتے تھے جو اللہ تعالیٰ نے ان پر انعام فرمائی تھیں تا کہ وہ غلام ان کے مساوی ہو جائیں مال و دولت میں حالانکہ وہ غلام ان کی اپنی جنس سے تھے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ مطلب ہو کہ مالک اپنا رزق اپنے غلاموں پر نہیں

1۔ تفسیر خازن، جلد 4، صفحہ 85 (التجاریۃ)　2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 232 (العلمیۃ)

لوٹاتے بلکہ جو کچھ وہ غلاموں کو دیتے ہیں وہ ان کے غلاموں کا ہی رزق ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان مالکوں کے ہاتھوں انہیں پہنچایا ہے۔ پس وہ اس میں برابر ہیں، یعنی مالک اور غلام اس چیز میں برابر ہیں کہ تمام کو اللہ تعالیٰ نے رزق عطا فرمایا ہے۔ پس "فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ" جملہ منفیہ کو لازم ہے یا اس کی تاکید ہے۔

ے چونکہ مشرکین اللہ تعالیٰ کے شریک بناتے تھے۔ ان کا یہ فعل اس بات کا مقتضی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ بعض نعمتوں کو بتوں کی طرف منسوب کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ کی عطا کا انکار کرتے تھے۔ اس لئے فرمایا کیا تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا انکار کرتے ہو۔ یا اس لئے یہ فرمایا کہ وہ انکار کرتے تھے ان دلائل و حجج کے حسن کو اللہ تعالیٰ نے واضح فرمادیا تھا اور جحود کے ضمن میں کفر کا معنی پایا جاتا ہے۔ اس لئے باء کا صلہ ذکر فرمایا۔

ابوبکر نے تاء کے ساتھ تجحدون خطاب کا صیغہ پڑھا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ میں خطاب کا صیغہ ہے اور باقی قراء نے "فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ" کے ارشاد کی وجہ سے یا کے ساتھ غائب کا صیغہ پڑھا ہے۔

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَحَفَدَةً وَّرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۭ اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَتِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُوْنَ ۝

"اور اللہ تعالیٰ ہی نے پیدا فرمائیں تمہارے لئے تمہاری جنس سے عورتیں ۱؎ اور پیدا فرمائیں تمہارے لئے تمہاری بیویوں سے بیٹے اور پوتے ۲؎ تو رزق عطا فرمایا تمہیں پاکیزہ ۳؎ تو کیا (یہ لوگ) باطل پر ایمان لاتے ہیں ۴؎ اور اللہ تعالیٰ کی مہربانیوں کی ناشکری کرتے ہیں ۵؎"

۱؎ یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہاری جنس سے پیدا فرمائیں عورتیں تاکہ تم ان سے انس حاصل کرو اور تمہاری اولاد تمہاری مثل ہو۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت حواء کو آدم علیہ السلام سے پیدا فرمایا اور تمام عورتیں مردوں اور عورتوں کے نطفوں سے ہیں۔

۲؎ حفدہ سے مراد پوتے ہیں یا وہ جو خدمت میں جلدی کرنے والا ہو یہ لفظ خدام اور پوتوں دونوں کو شامل ہے۔ قاموس میں ہے حفد یحفد حفداً و حفداناً پھرتی سے کام کرنا۔ اسی طرح احتفد اور خدم کا معنی ہے۔ الحفدۃ جمع ہے حافد کی اور اس کا معنی خدام اور اعوان ہیں۔ حفدۃ الرجل سے مراد پوتے ہیں۔ اسی طرح حفید ہے، اس سے مراد خسر اور بیٹیاں بھی ہوتی ہیں۔ بغوی کہتے ہیں ابن مسعود اور النخعی نے فرمایا آیت میں حفدہ سے مراد داماد ہیں۔ ابن مسعود سے یہی مروی ہے کہ حفدہ سے مراد خسر ہے۔ اس قول کے مطابق آیت کا معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے تمہاری بیویوں سے بیٹے اور بیٹیاں عطا کیں، ان کا نکاح کرو۔ پس تمہیں ان کے سبب خسر اور داماد حاصل ہوں گے۔ عکرمہ، حسن اور ضحاک فرماتے ہیں حفدہ سے مراد خدام ہیں۔ مجاہد فرماتے ہیں مددگار ہیں۔ عطا فرماتے ہیں انسان کی وہ اولاد ہے جو اس کے معاون اور خدمت گزار ہوتے ہیں (1) میں کہتا ہوں اس آیت کریمہ میں ان تمام اقوال کے مطابق حفدہ سے مراد بیٹے ہی ہیں اور عطف وصفوں کے تغایر کی وجہ سے ہے۔ امام بیضاوی نے بھی ایک تاویل یہی بیان کی ہے۔ مقاتل اور کلبی کہتے ہیں بنین سے مراد چھوٹے بچے اور حفدہ سے مراد وہ بڑے بچے ہیں جو کام میں باپ کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ قتادہ فرماتے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 85 (التجاریہ)

ہیں وہ اولاد مراد ہے جو تمہاری خدمت کرتی ہے۔ مجاہد اور سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے حفدہ سے مراد پوتے ہیں، عوفی نے ابن عباس کا قول روایت کیا ہے کہ آدمی کی بیوی کی اولاد ہے جو پہلے شوہر سے ہو(1)۔ میں کہتا ہوں اپنی بیوی کی پہلی اولاد کو حفدہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ آدمی ان کی تربیت کرتا ہے اور ان سے ایسی خدمت لیتا ہے جو اپنی اولاد سے نہیں لیتا۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں کہ حفدہ کی ایک تاویل یہ ہے کہ حفدہ سے مراد بیٹیاں ہیں کیونکہ بیٹیاں ہی گھروں میں مکمل خدمت بجالاتی ہیں(2)۔

۳ طیبات سے مراد لذیذ اور حلال چیزیں ہیں اور مِن تبعیضیہ ہے کیونکہ دنیا میں دیا گیا رزق آخرت کے رزق کا ایک نمونہ ہے۔

۴ وہ باطل پر ایمان رکھتے ہیں کیونکہ وہ بتوں کو نفع رساں سمجھتے ہیں۔

۵ وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا انکار کرتے ہیں کیونکہ وہ نعمتوں کی نسبت بتوں کی طرف کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میرا، جنوں اور انسانوں کا عجیب معاملہ ہے، پیدا میں کرتا ہوں عبادت غیر کی کی جاتی ہے، رزق میں دیتا ہوں اور شکر غیر کا ادا کیا جاتا ہے۔ فعل پر صلہ کو مقدم فرمانے کی وجہ تخصیص میں مبالغہ کرنا ہے اور فواصل کی محافقت ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں باطل سے مراد بحیرہ، سائبہ اور وصیلہ کی حرمت کا حکم ہے جو انہیں شیطان نے دیا تھا اور اس حکم کو وہ تسلیم کرتے تھے اور نعمت اللہ سے مراد وہ پاکیزہ رزق ہے جسے اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے حلال فرمایا تھا اس کا انکار کرتے تھے اور اس کی تحلیل کے منکر تھے۔ بعض علماء فرماتے ہیں باطل سے مراد شیطان ہے اور نعمت اللہ سے مراد محمد ﷺ کی ذات اقدس ہے۔

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ شَيْـًٔا وَّلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ۝

”اور یہ لوگ عبادت کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کے سوا ان معبودوں کی جو انہیں آسمانوں اور زمین سے رزق دینے کا کچھ اختیار نہیں رکھتے اور نہ کچھ کر سکتے ہیں ۱؎“

۱؎ یعنی نہ تو بارش برسا سکتے ہیں نہ نباتات اگا سکتے ہیں۔ اخفش کہتے ہیں۔ آیت میں شیئاً بدل ہے رزق سے اور رزق سے مراد مرزوق ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ ان کے بت مرزوقات میں سے نہ کم کے مالک ہیں نہ کثیر کے۔ فراء کہتے ہیں رزقاً مصدر ہے اور شیئاً اس کا مفعول بہ ہے اور ان بتوں کو کوئی ملکیت اور استطاعت نہیں ہے لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ میں ضمیر جمع اور يَمْلِكُ میں ضمیر مفرد ذکر فرمائی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ يَمْلِكُ میں ما کے لفظ کا اور لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ میں ما کے معنی کا اعتبار کیا گیا ہے، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ضمیر لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ کا مرجع کفار ہوں۔ مطلب یہ ہوگا کہ یہ کفار کچھ بھی طاقت نہیں رکھتے حالانکہ یہ زندہ بھی ہیں تو وہ بے جان مورتیاں، پتھر کے مجسمے کیسے قدرت رکھتے ہوں گے۔

فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

”پس (اے جاہلو) نہ بیان کیا کرو اللہ تعالیٰ کے لئے مثالیں ۱؎ بیشک اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ۲؎“

۱؎ ضرب المثل کا معنی ہے ایک حال کو دوسرے حال سے تشبیہ دینا۔ تم اللہ تعالیٰ کے ذات وصفات کو جانتے ہی نہیں ہو، تمہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ کون سا وصف اس کے لئے بیان کرنا جائز ہے اور کونسا جائز نہیں ہے تو پھر تم کیسے اس کے لئے مثالیں بیان کرتے ہو؟ تمہارا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 85 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 361 (فراس)

قیاس باطل ہے کیونکہ تمہارا غائب کو شاہد پر قیاس کرنا ہے اور یہ قیاس جامع نہیں ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ ضرب الامثال اور اشیاء کی حقیقت کو جانتا ہے اور تم اشیاء کی حقیقت کو نہیں جانتے۔ یا یہ معنی کہ اللہ تعالیٰ تمہاری ضرب الامثال کی خطا اور تمہارے قیاسات کے فساد کو جانتا ہے جیسا کہ وہ کہتے تھے بادشاہ کے غلاموں کی عبادت مالک کی عبادت میں تعظیم کو زیادہ داخل کرتی ہے۔ اور وہ تمہاری اس جرم کی بڑائی کو جانتا ہے جو تم کرتے ہو اور تم یہ سب کچھ نہیں جانتے۔ اگر تمہیں اپنے جرم کا احساس ہوتا تو تم کبھی بھی یہ جرأت نہ کرتے یہ نہی کی علت ہے۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّ مَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا فَهُوَ يُنْفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَّ جَهْرًا ؕ هَلْ يَسْتَوٗنَ ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝

"بیان فرمائی ہے اللہ تعالیٰ نے ایک مثال (وہ یہ کہ) ایک بندہ ہے جو مملوک ہے اور کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتا اور (اس کے مقابلہ میں) ایک وہ بندہ ہے جسے ہم نے رزق دیا اپنی جناب پاک سے رزق حسن ۲ پس وہ خرچ کرتا رہتا ہے اس سے پوشیدہ طور پر اور اعلانیہ طور پر ۳ (اب تم ہی بتاؤ) کیا یہ برابر ہیں ۴ الحمد للہ! (حقیقت حال واضح ہو گئی) ۵ بلکہ ان میں سے اکثر لوگ (اس حقیقت کو) نہیں جانتے ۶"

۱۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی اور دوسروں کی مثال بیان فرمائی عبداً مثلاً کا بدل ہے اور مملوکاً کا یہ آزاد سے احتراز ہے کیونکہ وہ بھی اللہ کا بندہ ہے اور لا یقدر علی شیء یہ مکاتب اور ماذون سے احتراز ہے۔

۲۔ من موصولہ ہے کیونکہ عبد پر معطوف ہے۔ معنی یہ ہے کہ جو آزاد غنی اور کثیر المال ہے۔

۳۔ مثال بیان فرمائی ان بتوں کی ایک غلام کے ساتھ جو ہر قسم کے تصرف سے عاجز ہے اور اپنی اللہ تعالیٰ نے آزاد اور غنی اور سخی سے مثال بیان فرمائی جو جیسے چاہتا ہے خرچ کرتا ہے۔ اس مثال سے شرک کے امتناع اور عاجز ترین مخلوق یعنی بتوں اور اللہ تعالیٰ غنی و قادر کے درمیان تسویہ کے امتناع پر حجت پکڑی گئی ہے۔

۴۔ یہاں جمع ضمیر ذکر فرمائی کیونکہ یہ مثال دو جنسوں کے لئے ہے کیونکہ معنی یہ ہے کہ کیا آزاد لوگ اور غلام برابر ہیں۔

۵۔ تمام تعریفات اللہ کیلئے ہیں اس کے علاوہ کوئی تعریف کا مستحق نہیں ہے، چہ جائیکہ کوئی عبادت کا مستحق ہو کیونکہ وہی اللہ تعالیٰ ہی تمام نعمتیں عطا فرمانے والا ہے۔

۶۔ اکثر لوگ حقیقت کو نہیں سمجھتے۔ اس لئے وہ اللہ کی نعمتوں کو غیروں کی طرف منسوب کرتے ہیں اور غیروں کی عبادت کرتے ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ کافر کی مثال ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے یہ توفیق ہی نہیں عطا فرماتا کہ وہ کوئی نیکی کرے یا اللہ تعالیٰ کے راستہ میں کچھ خرچ کرے پس وہ عاجز ہے اور وَّ مَنْ رَّزَقْنٰهُ الخ یہ مومن کی مثال ہے جو اللہ تعالیٰ کے راستہ میں خرچ کرتا ہے ابن جریج نے عطاء سے روایت کیا ہے کہ عَبْدًا مَّمْلُوْكًا سے مراد ابوجہل ہے اور وَّ مَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا سے مراد سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں (1)۔ سب تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے حق اور مبطل میں تفریق فرما دی بلکہ اکثر اس حقیقت کو نہیں سمجھتے۔

وَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ اَحَدُهُمَاۤ اَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّ هُوَ كَلٌّ عَلٰى

1۔ تفسیر خازن، جلد 4، صفحہ 87 (التجاریہ)

مَوْلٰىهُ ۙ اَیْنَمَا یُوَجِّهْهُّ لَا یَاْتِ بِخَیْرٍ ؕ هَلْ یَسْتَوِیْ هُوَ ۙ وَ مَنْ یَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ ۙ وَ هُوَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۷۶﴾

"اور بیان فرمائی ہے اللہ تعالیٰ نے ایک اور مثال دو آدمی ہیں ان میں سے ایک تو گونگا ہے کسی چیز کی قدرت نہیں رکھتا اور وہ بوجھ ہے اپنے آقا پر[1]، جہاں کہیں وہ اس (نکمے) کو بھیجتا ہے تو وہ واپس نہیں آتا کسی بھلائی کے ساتھ[2] یا برابر ہوسکتا ہے یہ (نکما) اور وہ شخص جو حکم دیتا ہے عدل کے ساتھ[3] اور وہ راہ راست پر گامزن ہے[4]"

[1] اَبْكَمُ کا مطلب گونگا ہے جو نہ کچھ سمجھتا ہو اور نہ بولتا ہو اپنی کم عقلی کی وجہ سے تدبیر اور صنعت پر قادر نہیں ہے۔ وہ بوجھ اور وبال ہے اپنے متولی پر۔

[2] کسی کام کے لیے اس کا والی جہاں بھی اسے بھیجتا ہے کسی فہم سے کامیاب واپس نہیں لوٹتا۔ وہ اس بت کی مانند ہے جو نہ سنتا ہے نہ بولتا ہے اور نہ سمجھتا ہے۔ وہ اپنے عبادت گزار پر بھی بوجھ ہے کیونکہ اسے اس مورتی کو اٹھانے اور رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جبکہ وہ اپنے عبادت گزار کو نفع ذرہ برابر بھی نہیں پہنچاتا۔

[3] یعنی جو حلیم، فہیم، منطیق، صاحب کفایت و ہدایت ہے لوگوں کے لئے نفع بخش ہے کہ وہ انہیں اس عدل پر برانگیختہ کرتا ہے جو تمام فضائل کو شامل ہے۔

[4] وہ خود بھی صراط مستقیم پر ہے، وہ کسی مقصود و مطلوب کی طرف جاتا ہے جو قریب ترین مناسبت سے اس تک پہنچ جاتا ہے۔ یہ مثال اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے بیان فرمائی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں مَنْ یَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ سے مراد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ بعض فرماتے ہیں دونوں مثالیں مومن اور کافر کی ہیں۔ یہ قول عطاء نے ابن عباس سے روایت کیا ہے۔ عطا فرماتے ہیں اس آیت میں اَبْكَمُ سے مراد ابی بن خلف ہے اور مَنْ یَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ سے مراد حضرت امیر حمزہ، عثمان بن عفان اور عثمان بن مظعون ہیں۔ مقاتل کہتے ہیں یہ آیت ہاشم بن عمرو بن الحارث کے بارے میں نازل ہوئی جو شریر تھا اور رسول اللہ ﷺ سے دشمنی رکھتا تھا (1)۔ ابن جریر نے ابن عباس سے ضرب اللہ مثلاً عبداً مملوکاً کے متعلق روایت کیا ہے انہوں نے فرمایا یہ ایک قریشی شخص اور ان کے غلام کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور رجلین احدھما ابکم یہ حضرت عثمان غنی اور آپ کے کافر غلام اسید بن ابی العیص کے بارے میں نازل ہوئی۔ یہ غلام اسلام کو ناپسند کرتا تھا اور حضرت عثمان غنی کو صدقہ اور نیکی سے منع کرتا تھا۔

وَ لِلّٰهِ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ مَاۤ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۷۷﴾

"اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے جانتا ہے آسمانوں اور زمین کی مخفی باتوں کو[1] اور نہیں قیامت برپا ہونے کا معاملہ مگر جیسے آنکھ تیزی سے جھپکتی ہے یا اس سے بھی جلد[2] بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے[3]"

[1] یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی غیب کو نہیں جانتا مگر اس کی تعلیم سے دوسرے غیب جانتے ہیں۔ غیب اور شہادت کی شرح ہم نے سورۂ جن کی تفسیر میں ذکر کی ہے۔

۲؎ یعنی قیام قیامت کا معاملہ تیزی اور سہولت میں (جب اللہ تعالیٰ ارادہ فرمائے گا) آنکھ جھپکنے کی مانند ہے، قاموس میں ہے لمح مثل لمع کی مانند ہے، اس کا معنی آنکھ جھپکنا ہے۔ میں کہتا ہوں اس کا معنی بجلی کا آنکھ کو جھپکا دینا ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں اس کا معنی ہے جیسے آنکھ کا اوپر کے حدقہ کو نیچے کی طرف سے ملانا ہے (1)۔ اللہ تعالیٰ نے آنکھ جھپکنے کے ساتھ مثال بیان فرمائی کیونکہ عرف میں اس سے کم زمانہ معروف ہی نہیں ہے، پھر فرمایا اَوْ هُوَ اَقْرَبُ یعنی وہ اس سے بھی جلدی برپا ہوگی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ تمام مخلوقات کو ایک لمحہ میں زندہ کردے گا۔ جب وہ فرمائے گا ہو جا تو وہ ہو جائے گی، جو کچھ ہوگا وہ غیر ممتد زمانہ میں ہوگا۔

۳؎ وہ تمام خلائق کو ایک لمحہ میں دوبارہ زندہ کرنے پر قادر ہے جیسے وہ دنیا میں تدریجاً پیدا کرنے پر قادر ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں یہ آیت کفار کے بارے میں نازل ہوئی جو استہزاء قیامت کے جلدی برپا ہونے کا مطالبہ کرتے تھے۔ تمہاری اللہ تعالیٰ نے اپنے کمال قدرت سے راہنمائی فرمائی ہے۔

وَ اللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ۙ وَّ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۷۸﴾

"اور اللہ تعالیٰ نے تمہیں نکالا ہے تمہاری ماؤں کے شکموں سے ۱؎ اس حال میں کہ تم کچھ بھی نہیں جانتے تھے ۲؎ اور بنائے تمہارے لئے کان اور دل ۳؎ تاکہ تم (ان بیش بہا نعمتوں پر) شکر ادا کرو ۴؎"

۱؎ کسائی نے اُمَّهٰتِكُمْ کو ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ایک خاص لغت کی بناء پر یا ماقبل کی اتباع کی بناء پر اور حمزہ نے ہمزہ کے کسرہ اور میم کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے ہمزہ کے ضمہ اور میم کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور اس میں ھا زائدہ ہے جیسے اھراق میں ھاء زائدہ ہے۔

۲؎ تم پتھروں کی طرح بالکل جاہل تھے۔

۳؎ یعنی تمہیں ایسے آلات عطا فرمائے جن کے ذریعے تم علم حاصل کرتے ہو۔ تم اپنے مشاعر کیساتھ اشیاء کی جزئیات کو محسوس کرتے ہو۔ پھر ان کا ادراک کرتے ہو۔ تم اپنے دلوں کے ساتھ اشیاء کی مشارکات اور مباینات پر آگاہ ہوتے ہو احساس کے تکرار کے ساتھ حتیٰ کہ تمہیں بعض علوم بدیہیہ حاصل ہو جاتے ہیں اور پھر اشیاء میں غور و فکر کے ساتھ علوم کسبیہ حاصل ہوتے ہیں۔

۴؎ تاکہ تم یکے بعد دیگرے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے ملنے کو پہچانو اور پھر اس کا شکر ادا کرو۔

اَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ مُسَخَّرٰتٍ فِيْ جَوِّ السَّمَآءِ ؕ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۷۹﴾

"کیا انہوں نے کبھی نہیں دیکھا پرندوں کی طرف کہ وہ مطیع اور فرمانبردار بن کر اڑ رہے ہیں ۱؎ آسمانی میں ۲؎ کوئی چیز انہیں تھامے ہوئے نہیں بجز اللہ کے ۳؎ بیشک اس میں (کھلی) نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو ایمان لائے ہیں ۴؎"

۱؎ اَلَمْ يَرَوْا ابن عامر، یعقوب اور حمزہ نے غائب پر خطاب کو غلبہ دیتے ہوئے تاء فوقانیہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے بعید دان کے ارشاد کی بناء پر غائب کا صیغہ پڑھا ہے، یعنی پرندوں کو جو پر اور دوسرے اسباب عطا کئے گئے ہیں ان کی وجہ سے وہ اڑ رہے ہیں مطیع

1۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 362 (فراس)

وفرمانبردار ہو کر۔

۲؎ زمین وآسمان کی درمیانی ہوا میں۔ امام بغوی فرماتے ہیں کعب الاحبار سے مروی ہے کہ ہوا میں بارہ میل تک اوپر اڑان ہو سکتی ہے اس سے اوپر نہیں جا سکتے(1)۔

۳؎ اس ہوا میں انہیں کوئی روکے ہوئے نہیں ہے۔ سوائے اللہ تعالیٰ کی قدرت کے پرندوں کے جسم کا ثقل نیچے آنے کا تقاضا کرتا ہے، نہ تو ان کے اوپر کوئی علاقہ ہے، نہ نیچے کوئی سہارا ہے جو انہیں اس فضا میں ٹھہرا سکے۔

۴؎ یعنی اس اڑان کی تسخیر میں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس طرح تخلیق فرمایا ہے کہ فضا میں اڑنا ان کے لئے ممکن ہو گیا ہے اور خلاف طبع انہیں ہوا میں روکے ہوئے ہے۔ مومن قوم کیلئے ہی ان میں کھلی نشانیاں ہیں کیونکہ وہی ان سے نفع حاصل کرتے ہیں۔

وَ اللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْۢ بُيُوْتِكُمْ سَكَنًا وَّ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُيُوْتًا تَسْتَخِفُّوْنَهَا يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَ يَوْمَ اِقَامَتِكُمْ ۙ وَ مِنْ اَصْوَافِهَا وَ اَوْبَارِهَا وَ اَشْعَارِهَاۤ اَثَاثًا وَّ مَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ ۝

"اور اللہ تعالیٰ نے ہی (اپنے فضل وکرم سے) بنا دیا ہے تمہارے لئے تمہارے گھروں کو آرام وسکون کی جگہ ۱؎ اور بنائے ہیں تمہارے لئے جانوروں کے چمڑوں سے گھر (یعنی خیمے) جنہیں تم ہلکا پھلکا پاتے ہو سفر کے دن اور اقامت کے دن ۲؎ اور (اسی نے بنائے) بھیڑوں کی صوف اور اونٹوں کی اون اور بکریوں کے بالوں سے مختلف گھریلو سامان اور استعمال کی چیزیں ایک وقت مقرر تک ۳؎"

۱؎ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے وہ گھر بنائے جو پتھر اور مٹی سے بنے ہوئے ہیں جن میں تم سکون وآرام کرتے ہو اپنی اقامت کے وقت فعل بمعنی مفعول ہے۔

۲؎ اور تمہارے لئے خیمے، اخبیہ اور قبائیں بنائیں چمڑے سے اور یہ بھی جائز ہے کہ اس میں وہ خیمے بھی شامل ہوں جو بھیڑوں کی اون، اونٹوں کی صوف اور بکریوں کے بالوں سے بنائے گئے ہوتے ہیں کیونکہ یہ بال، اون وغیرہ ان کی کھالوں پر ثابت ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کی طرف نسبت کر دی۔

۳؎ تم ان خیموں کو اٹھانے میں ہلکا پھلکا پاتے ہو اپنے سفر کے دن میں۔ ابن عامر اور کوفیوں نے عین کے سکون کے ساتھ اور باقی قراء نے عین کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ دونوں لغتیں ہیں۔ اصواف بھیڑوں کی اون، اوبار اونٹوں کی اون، اشعار بکریوں کے بال یہ سب چیزیں بھی انعام میں سے ہیں۔ اثاثا سے مراد گھر کے ساز وسامان جیسے بستر، چادریں، لباس، اثاث کا مفرد نہیں ہے۔ یا اس کا معنی تمام مال ہے۔ قاموس میں یہی معنی لکھا ہے۔ متاعا سے مراد وہ سامان ہے جس کی تم تجارت کرتے ہو الی حین اس مدت تک، جس تک اللہ تعالیٰ نے ان کی بقاء کا ارادہ فرمایا ہے۔

وَ اللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّمَّا خَلَقَ ظِلٰلًا وَّ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْجِبَالِ اَكْنَانًا وَّ جَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ وَ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمْ بَاْسَكُمْ ؕ كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 88 (التجاریۃ)

لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ ﴿۸۱﴾

”اور اللہ تعالیٰ نے ہی بنائے ہیں تمہارے (آرام) کے لئے [1] ان چیزوں کے سائے جن کو اس نے پیدا فرمایا [2] اور اسی نے بنائی ہیں تمہارے لئے پہاڑوں میں پناہ گاہیں [3] اور اسی نے بنائے ہیں تمہارے لئے ایسے لباس [4] جو بچاتے ہیں تمہیں گرمی سے [5] اور (کچھ ایسے آہنی) لباس جو بچاتے ہیں تمہیں لڑائی کے وقت [6] اسی طرح وہ پورا فرماتا ہے اپنا احسان تم پر [7] تاکہ تم سر اطاعت خم کرو [8]“

[1] اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے پیدا فرمائے درخت، پہاڑ عمارتیں وغیرہ۔

[2] جن کے سائے کے ذریعے تم سورج کی گرمی سے بچتے ہو۔

[3] اور اس نے تمہارے لئے پہاڑوں میں ایسی جگہیں بنائی جن میں تم چھپتے ہو اور ان کی غاروں میں رہائش پذیر ہوتے ہو اور ان کے پتھروں کو تراش کر اپنی عمارتیں تیار کرتے ہو۔ اکنان جمع ہے کن کی اور اس نے تمہارے لئے روئی اون، ریشم سے قمیصیں بنائیں۔

[4] جو تمہیں گرمی اور سردی سے بچاتی ہیں۔ دو ضدوں میں سے ایک کا خصوصی ذکر فرمایا اور حر دونوں ہیں کیونکہ دوسرے پر کلام دلالت کر رہی ہے۔

[5] اور تمہارے لئے آہنی یا ریشم یا دوسری ایسی چیزوں سے قمیصیں بنائیں۔

[6] جو تمہیں جنگ میں تیر و تفنگ سے بچاتی ہیں۔

[7] یعنی جس طرح اس نے مذکورہ نعمتیں مکمل فرمائیں اسی طرح اس نے دوسری نعمتیں بھی مکمل عطا فرمائیں جیسے اس نے تمہاری طرف اپنا رسول مکرم ﷺ مبعوث فرمایا پھر اس کو معجزات عطا فرمائے، تم پر اپنی کتاب مبین نازل فرمائی تمہارے لئے حجت کو واضح فرمایا اور اسلام کو عزت بخشی۔

[8] تاکہ اکثر لوگ سر تسلیم خم کر دیں اور خالصۃً اللہ تعالیٰ کی اطاعت کریں۔ عطاء خراسانی کہتے ہیں اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم لوگوں کی معرفت کی مقدار پر نازل فرمایا، ارشاد فرمایا اس نے تمہارے لئے پہاڑوں میں پناہ گاہیں بنائیں۔ صحراؤں اور میدانوں کو بیان نہیں فرمایا کیونکہ وہ پہاڑوں میں رہنے والے تھے۔ جیسا کہ فرمایا و من اصوافها و اوبارها و اشعارها صوف اون کا ذکر فرمایا کیونکہ وہ اونٹ، بکریاں اور بھیڑیں پالتے تھے اسی طرح فرمایا وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِيْهَا مِنْۢ بَرَدٍ یعنی آسمان سے بارش برسنے کا ذکر فرمایا لیکن برف جو آسمانوں سے گرتی ہے اس کا ذکر نہیں فرمایا کیونکہ وہ آسمانی برف کو جانتے ہی نہیں تھے۔ فرمایا تقیکم الحر۔ گرمی کا ذکر فرمایا سردی کا ذکر نہیں فرمایا وجہ یہ تھی کہ زیادہ انہیں گرمی سے واسطہ پڑتا تھا(1)۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۸۲﴾

”(اے محبوب) اگر ان روشن دلائل کے باوجود وہ منہ پھیریں تو (فکرمند نہ ہو) آپ کے ذمہ تو صرف وضاحت سے پیغام پہنچانا [1]“

[1] یعنی اگر وہ اسلام سے اعراض کریں اور آپ کی رسالت کو قبول نہ کریں تو فکرمند نہ ہوں کیونکہ آپ کا کام تو صرف تبلیغ حق کا فریضہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 89 (التجاریہ)

سرانجام دیتا ہے اور وہ آپ نے بحسن وخوبی ادا کیا ہے۔ یہاں سبب کو مسبب کے قائم مقام رکھا گیا ہے۔ ابن ابی حاتم نے مجاہد سے روایت کیا ہے کہ ایک اعرابی نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور اللہ تعالیٰ کے متعلق پوچھا تو آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھی جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ بُيُوتِكُمْ سَكَنًا۔ اعرابی نے کہا یہ ٹھیک ہے۔ پھر آپ ﷺ نے پڑھا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ جُلُودِ الْاَنْعَامِ بُيُوتًا تَسْتَخِفُّوْنَهَا يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَيَوْمَ اِقَامَتِكُمْ اعرابی نے اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کا بھی اعتراف کیا۔ پھر آپ نے اس کے بعد کی آیات پڑھی تو اعرابی ہر نعمت کی تصدیق کرتا گیا حتی کہ آپ ﷺ نے كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ پڑھا تو اعرابی نے منہ پھیر لیا اللہ تعالیٰ نے اس وقت یہ آیت نازل فرمائی۔

يَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا وَاَكْثَرُهُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۳﴾

"وہ پہچانتے ہیں اللہ تعالیٰ کی نعمت کو (اس کے باوجود) وہ انکار کرتے ہیں اس کا ۱؎ اور ان میں سے اکثر لوگ کافر ہیں ۲؎"

۱؎ اللہ تعالیٰ نے ان پر جو نعمتیں شمار کی ہیں یا اس کے علاوہ ان تمام کا اعتراف کرتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں پھر وہ ان نعمتوں کا انکار کرتے ہیں کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت مشرکین کو چھوڑ کر خالص اللہ تعالیٰ کے لئے نہیں کرتے۔ سدی کہتے ہیں اسکا مطلب ہے کہ وہ محمد ﷺ کی نبوت کو جانتے ہیں، معجزات کی تائید کی وجہ سے پوری معرفت رکھتے ہیں لیکن عناد کی وجہ سے آپ کی نبوت کا انکار کرتے ہیں(1)۔ یہاں ثم بعد زمانی کے لئے نہیں بلکہ معرفت کے بعد انکار کے استبعاد کے لئے ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں مجاہد اور قتادہ نے فرمایا اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان نعمتوں کو جانتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں ان پر شمار فرمائی ہیں پھر جب ان سے کہا گیا کہ تم تصدیق کرو اور اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے جھک جاؤ تو انہوں نے انکار کر دیا اور کہا ہمیں تو یہ نعمتیں اپنے آباؤ اجداد سے ورثہ میں ملی ہیں۔ الکلبی نے کہا ہے کہ جب ان کے سامنے ان نعمتوں کا تذکرہ ہوا تو کہنے لگے یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں لیکن ہمارے بتوں کی سفارش سے ملی ہیں۔ عون بن عبداللہ نے کہا یہ اس شخص کے قول کی مانند ہے کہ اگر فلاں نہ ہوتا تو یہ ہو جاتا فلاں نہ ہوتا تو یہ ہو جاتا(2)۔

۲؎ نعمتوں کے اعتراف کے بعد عناد کی وجہ سے انکار کرتے ہیں۔ یہاں اکثر کا ذکر فرمایا ہے کیونکہ بعض لوگ کم عقلی اور کم غور و فکر کی وجہ سے حق کو پہچانتے ہی نہیں تھے یا ان پر حجت مکمل نہ ہوتی تھی کیونکہ وہ مکلّف ہونے کی حد کو پہنچے ہی نہ تھے، یا فرمایا اکثر ہے لیکن مراد کل ہیں۔

وَيَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا ثُمَّ لَا يُؤْذَنُ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ﴿۸۴﴾

"اور قیامت کے دن ہم اٹھائیں گے ۱؎ ہر امت سے ایک گواہ ۲؎ سب ان لوگوں کو اجازت نہ ہوگی جنہوں نے کفر کیا ۳؎ اور نہ ان سے توبہ کا مطالبہ کیا جائے گا ۴؎"

۱؎ اس سے پہلے کلام محذوف ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی اُذْكُرْ یا خَوِّفْهُمْ یا يَحِيْقُ بِهِمْ مَا يَحِيْقُ يَوْمَ نَبْعَثُ یعنی یاد کرو یا ان کو ڈراؤ یا ان کو گھیر لے گا جو گھیرے گا جس دن ہم اٹھائیں گے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 89 (التجاریہ)

2۔ تفسیر خازن، جلد 4، صفحہ 89 (التجاریہ)

ے یعنی رسول جو ان کے خلاف یا ان کے حق میں کفر و ایمان کی گواہی دے گا۔

سے پھر کفار کو عذر پیش کرنے کی اجازت نہ ہوگی کیونکہ ان کا کوئی عذر ہوگا ہی نہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں کفار کو مطلقاً کلام کرنے کی بھی اجازت نہ ہوگی۔ بعض فرماتے ہیں انہیں دنیا کی طرف لوٹنے کی اجازت نہ ہوگی۔ ثم یہاں بھی بعد زمانی کے لئے نہیں بلکہ اس خوف کی زیادتی کے اظہار کے لئے جو انہیں عذر پیش کرنے سے مانع ہوگا کیونکہ رسولوں کی ان کے خلاف شہادت کے بعد کلی طور پر مایوس ہو جائیں گے۔

ے یعنی ان سے اب اللہ تعالیٰ کی رضا کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا کیونکہ اس وقت تو اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا ممکن ہی نہیں ہوگا کیونکہ آخرت دار التکلیف نہیں ہے اور نہ وہ دنیا کی طرف لوٹیں گے تاکہ توبہ کر سکیں اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے موجب اعمال کر سکیں۔

وَإِذَا رَأَى الَّذِينَ ظَلَمُوا الْعَذَابَ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ ﴿٨٥﴾

"اور جب دیکھ لیں گے وہ لوگ جنہوں نے ظلم کیا عذاب (آخرت) کو اس وقت تک وہ عذاب ان سے ہلکا نہیں کیا جائے گا اور نہ انہیں (مزید) مہلت دی جائے گی لے"

لے آیت کریمہ میں عذاب سے مراد عذاب جہنم ہے، یعنی اس عذاب میں داخل ہونے کے بعد ان پر تخفیف نہ ہوگی اور نہ دخول سے پہلے انہیں مہلت دی جائے گی۔

وَإِذَا رَأَى الَّذِينَ أَشْرَكُوا شُرَكَاءَهُمْ قَالُوا رَبَّنَا هَٰؤُلَاءِ شُرَكَاؤُنَا الَّذِينَ كُنَّا نَدْعُو مِن دُونِكَ ۖ فَأَلْقَوْا إِلَيْهِمُ الْقَوْلَ إِنَّكُمْ لَكَاذِبُونَ ﴿٨٦﴾

"اور جب دیکھیں گے مشرک اپنے (ٹھہرائے ہوئے) شریکوں کو تو بول اٹھیں گے اے ہمارے رب یہ ہیں ہمارے بنائے ہوئے شریک جنہیں ہم پوجا کرتے تھے تجھے چھوڑ کر لے تو وہ شریک انہیں جواب دیں گے ۲ یقیناً تم جھوٹ بول رہے ہو ۳"

لے جب مشرک اپنے بتوں کو دیکھیں گے تو کہیں گے یہ ہیں ہمارے خدا جن کی ہم عبادت کرتے تھے اور جن کی ہم اطاعت کرتے تھے۔ یہ ان کا اعتراف ہے کہ ہم غلطی پر تھے یا وہ درخواست کر رہے ہیں کہ ہمارا عذاب نصف کیا جائے۔

۲ ان کے بتوں کو اللہ تعالیٰ قوت گویائی عطا کرے گا اور وہ اپنے پوجاریوں کو کہیں گے۔

۳ تم یہ کہنے میں کہ اللہ کے یہ بت شریک ہیں جھوٹے ہو، یا واقعی انہوں نے بتوں کی عبادت کی تھی بلکہ انہوں نے تو اپنی خواہشات کی بندگی کی تھی بتوں کی کلام کا حاصل یہ ہے کہ ہم نے تو تمہیں اپنی عبادت کے لئے دعوت نہیں دی تھی جیسا کہ ایک اور جگہ صراحت سے آیا ہے سَيَكْفُرُونَ بِعِبَادَتِهِمْ (وہ ان کی عبادت کا انکار کریں گے) یا اس بات میں وہ جھوٹے ہیں کہ ان بتوں نے انہیں کفر پر ابھارا تھا اور انہوں نے ان پر کفر کو لازم کیا تھا جیسا کہ صراحت ہے وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُم مِّن سُلْطَانٍ إِلَّا أَن دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِي "اور نہیں تھا میرا تم پر کچھ زور مگر یہ کہ میں نے تم کو (کفر) کی دعوت دی اور تم نے فوراً قبول کر لی میری دعوت۔

وَأَلْقَوْا إِلَى اللَّهِ يَوْمَئِذٍ السَّلَمَ ۖ وَضَلَّ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿٨٧﴾

"وہ پیش کر دیں گے بارگاہ الٰہی میں اس دن اپنی عاجزی اور فراموش ہو جائیں گے انہیں وہ بہتان جو وہ باندھا کرتے

تھے ۱؎ ‘‘

۱؎ یہ ظالم لوگ پیش کریں گے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس دن، دنیا میں تکبر کرنے کے بعد اس کے حکم تسلیم کرنے کا اعتراف اور باطل ہو جائے گا جو وہ بہتان باندھتے تھے کہ یہ بت ان کے شفعاء ہیں۔

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ زِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يُفْسِدُوْنَ ﴿۸۸﴾

’’ جن لوگوں نے کفر کیا اور دوسروں کو روکا اللہ تعالیٰ کی راہ ۱؎ سے ہم نے بڑھا دیا اور عذاب ان کے پہلے عذاب پر ۲؎ اس وجہ سے کہ وہ فتنہ وفساد برپا کیا کرتے تھے ۳؎ ‘‘

۱؎ جنہوں نے کفر کیا اور لوگوں کو بھی روکا اسلام قبول کرنے سے اور کفر پر انہیں برانگیختہ کیا۔

۲؎ ان کے اسلام سے لوگوں کو روکنے کی وجہ سے انہیں عذاب دیں گے۔ اس پہلے عذاب کے اوپر عذاب جس کے وہ کفر کی وجہ سے مستحق ہو چکے تھے۔ عبد اللہ بن مسعود فرماتے ہیں ان پر بچھو چھوڑے جائیں گے جن کے دانت لمبے لمبے کھجور کے درخت کی مانند ہوں گے۔ ابن مردویہ نے براء کے حوالہ سے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے۔ سعید بن جبیر نے فرمایا ان کو سانپوں کے ذریعے عذاب ہوگا جو بختی اونٹوں کی مثل ہوں گے اور ایسے بچھو ہوں گے جو خچروں کی مانند ہوں گے جن کے ایک مرتبہ ڈسنے سے چالیس سال تک ڈسا ہوا شخص تکلیف کو محسوس کرتا رہے گا۔ مقاتل اور ابن عباس نے فرمایا پگھلے ہوئے تانبے کی پانچ نہریں ہوں گی جو آگ کی مانند عرش کی نیچے بہہ رہی ہوں گی۔ ان میں ان لوگوں کو تین مرتبہ عذاب دیا جائے گا۔ ایک مرتبہ رات کی مقدار اور دو مرتبہ دن کی مقدار۔ بعض علماء فرماتے ہیں انہیں پہلے آگ کی گرمی کا عذاب ہوگا۔ پھر ٹھنڈک اور سردی کے عذاب کی طرف دھکیلے جائیں گے۔ وہ بخ سردی کی وجہ سے آگ کی طرف دوڑیں گے تاکہ اس سے کچھ مدد حاصل کریں (1)۔

۳؎ اور یہ سب کچھ کفر اور اسلام سے منع کرنے کے فساد کی وجہ سے ہوگا۔

وَيَوْمَ نَبْعَثُ فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا عَلَيْهِمْ مِّنْ اَنْفُسِهِمْ وَجِئْنَا بِكَ شَهِيْدًا عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ ؕ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ﴿۸۹﴾

’’ اور وہ دن (بڑا ہولناک ہوگا) جب ہم اٹھائیں گے ہر امت سے ایک گواہ ان پر انہیں میں سے اور ہم لے آئیں گے آپ کو بطور گواہ ان سب پر ۱؎ اور ہم نے اتاری ہے آپ پر یہ کتاب ۲؎ اس میں تفصیلی بیان ہے ہر چیز کا ۳؎ اور یہ سراپا ہدایت ورحمت ہے اور یہ مژدہ ہے مسلمانوں کے لئے ۴؎ ‘‘

۱؎ یعنی ہم ہر امت پر ان کے نبی علیہ السلام کو گواہ لائیں گے کیونکہ ہر امت کا نبی انہیں سے مبعوث کیا گیا تھا اور آپ کو آپ کی امت پر گواہ بنا کر لائیں گے۔

۲؎ یہ جملہ مستانفہ ہے یا حال ہے اور اس سے پہلے قد مضمر ہے۔

۳؎ ہر چیز کا تفصیلی یا مجمل بیان ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں ہے مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا اور رسول

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 90 (التجاریہ)

(کریم) جو تمہیں عطا فرمادیں وہ لے لو اور جس سے تمہیں روکیں تو ترک جاؤ وَمَنْ یَّتَّبِعْ غَیْرَ سَبِیْلِ الْمُؤْمِنِیْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى اور جو چلے اس راہ پر جو الگ ہے مسلمانوں کی راہ سے تو ہم پھیر دیں گے اسے جدھر وہ خود پھرا ہے۔ اسی طرح ارشاد ہے فَاعْتَبِرُوْا یٰۤاُولِی الْاَبْصَارِ پس عبرت حاصل کرو اے دیدۂ بینا رکھنے والو۔

۲ یعنی اور گمراہی سے ہدایت دینے والی ہے اور تمام کے لئے رحمت ہے جو اس کی برکتوں سے محروم ہوا وہ اپنی کوتاہی کی وجہ سے محروم ہوا اور خاص مسلمانوں کے لئے بشارت ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ وَ اِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰى وَ یَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ وَ الْبَغْیِ ۚ یَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝۹۰

"بیشک اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے کہ ہر معاملہ میں انصاف کرو اور (ہر ایک کے ساتھ) بھلائی کرو ۱ اور اچھا سلوک کرو رشتہ داروں کے ساتھ ۲ اور منع فرماتا ہے بے حیائی سے ۳ برے کاموں سے ۴ اور سرکشی سے ۵ اللہ تعالیٰ نصیحت کرتا ہے تمہیں تاکہ تم نصیحت قبول کرو ۶"

۱ عدل کا لفظ مساوات کا تقاضا کرتا ہے اسی مساوات کے معنی کی وجہ سے فدیہ اور جزاء کو بھی عدل کہا جاتا ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کے ارشادات ہیں اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِیَامًا وَ اَنْ تَعْدِلُوْا بَیْنَ النِّسَآءِ یعنی ہر معاملہ میں برابری کرو۔ آیت کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں مکافات (بدلے) میں مساوات کا حکم دیتا ہے۔ اگر عمل اچھا ہو تو بدلہ بھی اچھا اگر برا ہو تو بدلہ بھی برا۔ احسان کا مطلب یہ ہے کہ کسی کی نیکی کے بدلے اس سے بہتر اور افضل نیکی کرنا اور کوئی برائی کرے تو اس سے کم بدلہ لینا اور جب فیصلہ کرنا ہو تو مدعی اور مدعی علیہ کے درمیان مساوات اور برابری کا سلوک کرنا کسی ایک طرف مائل نہ ہو جانا اور اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق فیصلہ کرنا۔ میں کہتا ہوں عدل سے مراد ظلم و جور کے خلاف حق پر ڈٹ جانا ہے۔ قاموس میں ہے کہ عدل جور کی ضد ہے اور جو نفوس میں راسخ ہے وہ مستقیم ہے۔ بعض فرماتے ہیں عدل سے مراد ہر کام میں توسط اور اعتدال ہے جیسے توحید جو تعطیل اور تشریک کے وسط میں ہے۔ کسب کا قول جو جبر و قدر کے درمیان ہے واجبات اور نوافل سے بندگی اس طرح کی جائے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی حق ضائع نہ ہو۔

عبادت کرنا جو بطالت اور ترہب (رہبانیت) کے درمیان ہے، سخاوت جو بخل اور اسراف کے درمیان ہے، شجاعت جو جبن و تہور کے بین بین ہے، عفت جو فجور اور حصر کے درمیان ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں ابن عباس سے مروی ہے کہ عدل سے مراد توحید ہے اور احسان سے مراد فرائض کی ادائیگی ہے۔ ابن عباس سے ہی مروی ہے کہ احسان سے مراد توحید میں اخلاص ہے۔ حضور ﷺ کے اس ارشاد کا بھی یہی معنی ہے۔ اَلْاِحْسَانُ اَنْ تَعْبُدَ رَبَّكَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ یَرَاكَ یعنی تو اپنے رب کی اس طرح عبادت کر گویا تو اسے دیکھ رہا ہے اور اگر مراقبہ کی کیفیت پیدا نہ ہو سکے تو کم از کم یہ تو یقین کر کہ وہ تجھے دیکھ رہا ہے (1)۔ اس حدیث کو شیخین نے صحیحین میں حضرت عمر بن خطاب سے جبرئیل علیہ السلام کے سوال والی حدیث میں روایت کیا ہے۔ مقاتل نے فرمایا کہ عدل سے مراد توحید اور احسان سے مراد لوگوں کو معاف کرنا ہے (2)۔ بعض علماء فرماتے ہیں عدل سے مراد فریضہ ہے۔ اسی سے حضور ﷺ کا ارشاد ہے لَا یَقْبَلُ اللّٰهُ مِنْهُ صَرْفًا وَّ لَا عَدْلًا اللہ تعالیٰ نہ ان کا نفل قبول فرمائے گا نہ فرض اور احسان سے مراد

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 91-90 (التجاریۃ)

2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 91 (التجاریۃ)

نفل ہے کیونکہ فرائض میں کمی کو نوافل پورا کر دیتے ہیں۔

۲۔ قریبی رشتہ دار جس چیز کے محتاج ہیں ان کو وہ عطا کرنا۔

۳۔ ہر برے قول اور ہر برے فعل سے منع کرتا ہے۔ ابن عباس نے فرمایا فحشاء سے مراد زنا ہے (1)۔

۴۔ ہر وہ قول و فعل جو شریعت اور عقل سلیم کو ناپسند ہو۔

۵۔ تکبر اور ظلم۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں فحشاء سے مراد قوت شہویہ میں افراط ہے جیسے زنا کیونکہ یہ انسان کی قبیح ترین اور بری ترین حالت ہے اور قوت غضبیہ کے مشتعل ہونے کے وقت جو کام کیا جائے اسے منکر کہتے ہیں اور بغی سے مراد لوگوں پر جبر و تشدد کرنا اور ان پر اپنی بڑائی کا اظہار کرنا ہے۔ اور یہ شیطنہ ہے جو قوت وہمیہ کا نتیجہ اور مقتضی ہے۔ انسان سے جو بھی برائی اور شر صادر ہوتا ہے وہ ان اقسام میں درج ہوتا ہے اور ان تینوں قوتوں میں سے کسی ایک قوت کی وجہ سے صادر ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا یہ آیت کریمہ قرآن کریم کی جامع ترین آیت ہے (2)۔ میں کہتا ہوں اس بات کو سعید بن منصور، بخاری نے الادب میں محمد بن نصر، ابن جریر ابن المنذر، ابن ابی حاتم، طبرانی، بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے۔ امام احمد، بخاری فی الادب، ابن ابی حاتم، طبرانی اور ابن مردویہ نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ یہی آیت کریمہ حضرت عثمان بن مظعونؓ کے اسلام قبول کرنے کا سبب بنی (3)۔

امام بغوی فرماتے ہیں ابن عیینہ نے فرمایا ہے، عدل سے مراد سرأ اور علانیۃً مساوات ہے اور احسان سے مراد یہ کہ انسان کی پوشیدہ حالت علانیہ حالت سے بھی بہتر ہو اور فحشاء اور منکر سے مراد یہ ہے کہ اس کا علانیہ اس کی پوشیدہ حالت سے بہتر ہو (4)۔

۶۔ وہ تمہیں امر و نہی کی نصیحت کرتا ہے اور خیر و شر کے درمیان فرق کی نصیحت کرتا ہے۔ تاکہ تم نصیحت کو قبول کرو۔ امام بیضاوی نے یہی معنی کیا ہے (5)۔ اگر قرآن کریم میں اس آیت کے علاوہ کچھ بھی نہ ہوتا تو پھر بھی تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ کا فرمان اس پر صادق آتا۔ امام بغوی فرماتے ہیں ایوب نے فرمایا عکرمہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے یہ آیت کریمہ ولید کے سامنے پڑھی تو اس نے کہا اے میرے بھتیجے دوبارہ پڑھو۔ آپ ﷺ نے دوبارہ پڑھی تو وہ یہ کہنے پر مجبور ہو گیا بخدا یہ تو بہت شیریں ہے، اس کا ظاہر بڑا رنگین ہے، اس کا تنا پھلوں والا ہے، اس کی شاخیں پھلوں سے لدی ہوئی ہیں، یہ کسی بشر کا کلام نہیں ہے (6)۔

وَ اَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ وَ لَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا وَ قَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ كَفِيْلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۹۱﴾

"اور پورا کرو اللہ تعالیٰ کے عہد کو جب تم نے اس سے عہد کر لیا ہے ۱؎ اور نہ توڑ دو (اپنی) قسموں کو انہیں پختہ کرنے کے بعد ۲؎ حالانکہ تم نے کر دیا ہے اللہ تعالیٰ کو اپنے اوپر گواہ ۳؎ بے شک اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو تم کرتے ہو ۴؎"

۱۔ ابن جریر نے بریدہ سے روایت کیا ہے، فرمایا یہ آیت نبی کریم ﷺ کی بیعت کے بارے میں نازل ہوئی (7)۔ امام بغوی فرماتے ہیں یہاں عہد کا معنی قسم ہے۔ امام شعبی نے بھی فرمایا العہد یمین یعنی عہد قسم ہے اور اس کا کفارہ کفارہ یمین ہے (8)۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 91 (التجاریۃ) 2۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 364 (فراس) 3۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 324 (فراس)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 91 (التجاریۃ) 5۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 364 (فراس) 6۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 91 (التجاریۃ)
7۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 242 (العلمیۃ) 8۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 91 (التجاریۃ)

۲۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے ذکر کے ساتھ اپنی قسموں کو پختہ کرنے کے بعد۔

۳۔ جبکہ تم نے اسلام کی بیعت پر اللہ تعالیٰ کو گواہ بنادیا ہے کیونکہ کفیل، مکفول بہ کی حالت کی رعایت کرتا ہے اور اسے تاڑنے والا ہوتا ہے۔ یہ جملہ حال ہے۔

۴۔ اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو تم اپنے عہد و پیمان کو پورا کرتے ہو یا ان عہدوں کو توڑتے ہو۔ مجاہد کہتے ہیں یہ آیت کریمہ زمانہ جاہلیت کے حلف کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے عہد توڑنے کی ایک مثال بیان فرمائی (1)۔

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِيْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا ۭ تَتَّخِذُوْنَ اَيْمَانَكُمْ دَخَلًۢا بَيْنَكُمْ اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِيَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ ۭ اِنَّمَا يَبْلُوْكُمُ اللّٰهُ بِهٖ ۭ وَلَيُبَيِّنَنَّ لَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ۝۹۲

"اور نہ ہو جاؤ اس عورت کی مانند جس نے توڑ ڈالا اپنے سوت کو مضبوط کاتنے کے بعد (اور اسے) پارہ پارہ کر ڈالا ۱؎ تم بناتے ہو اپنی قسموں کو ایک دوسرے کو فریب دینے کا ذریعہ ۲؎ تاکہ اس طرح ہو جائے گا ایک گروہ زیادہ فائدہ اٹھانے والا دوسرے گروہ سے ۳؎ صرف آزماتا ہے تمہیں اللہ تعالیٰ ان قسموں سے ۴؎ اور واضح فرمادے گا تمہارے لئے قیامت کے روز ان باتوں کو جن میں تم اختلاف کیا کرتے تھے۔"

۱؎ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ، نَقَضَتْ کے متعلق ہے، یعنی سوت کو مضبوط طریقہ پر کاتنے کے بعد اسی عورت نے توڑ ڈالا اور اسے پارہ پارہ کر دیا اَنْكَاثًا نکث کی جمع ہے کسی بٹی ہوئی چیز کو توڑ دینا۔ ابن ابی حاتم نے ابو بکر بن ابی حفص سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں سعیدہ الاسدیہ جو پاگل تھی، بال اور چھلکے جمع کرتی تھی۔ پس یہ آیت کریمہ نازل ہوئی (2)۔ بغوی کہتے ہیں الکلبی اور مقاتل نے فرمایا یہ قریش کی ایک پاگل عورت تھی جسے ربطہ بنت عمر بن سعد بن کعب بن زید بن مناۃ بن تمیم کہا جاتا تھا اور جعر کے لقب سے ملقب تھی۔ اس کو ایک وسوسہ تھا، وہ ایک ہاتھ کی مقدار چرخہ رکھتی تھی اور ان کی انگلی کی مقدار ایک کیل رکھتی تھی اور اس کی مقدار دمرکہ تھا وہ اون اور بالوں کو خود بھی اور اپنی لونڈیوں سے کتواتی تھی، وہ صبح سے لے کر نصف دن تک کاتتی رہتی تھیں۔ جب دن کا نصف ہوتا تو سارا کاتا ہوا سوت توڑ دیتی تھی۔ یہی اس کا معمول تھا۔ آیت کا معنی یہ ہے کہ تم ایسے نہ ہو جاؤ جیسے وہ عورت تھی کہ وہ کام بھی کرتی تھی اور پھر خود ہی اسے توڑ دیتی تھی (3)۔ پس تم یا تو عہد ہی نہ کرو یا۔ پھر عہد کرو تو پورا کرو ایسے نہ بنو کہ عہد کرو اور پھر ہر مرتبہ اسے توڑ دو جب بھی عہد کرو۔

۲؎ یہ لَا تَكُوْنُوْا کی ضمیر سے حال ہے یا اس جار مجرور سے حال ہے جو خبر واقع ہو رہا ہے، یعنی اس عورت کے مشابہ نہ ہو جاؤ جس کا یہ کام تھا اپنی قسموں کو آپس میں فساد، دھوکہ، فریب کاری کا ذریعہ بناتے ہوئے دخل کی اصل وہ چیز ہے جس کو فساد کے لئے دوسری چیز میں داخل کیا جائے جو اس چیز سے نہ ہو۔ بعض علماء فرماتے ہیں الدخل اور الدغل کا معنی یہ ہے کہ ظاہر وفا کا اظہار کرنا اور باطن میں نقض کا ارادہ رکھنا ہے۔

۳؎ مجاہد فرماتے ہیں وہ لوگ ایک قوم کو اپنا حلیف بناتے تھے۔ پھر جب دوسری قوم کو مال اور تعداد کے لحاظ سے زیادہ دیکھتے تو پہلے لوگوں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 91 (التجاریہ)
2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 243 (العلمیہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 92-91 (التجاریہ)

کے ساتھ کئے ہوئے حلف کو توڑ دیتے اور ان کے دشمنوں سے حلف کرتے جو تعداد میں زیادہ ہوتے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ تم نے ضعیفوں سے عہد توڑ کر اور طاقتور لوگوں سے عہد کر کے تم عزت طلب کرتے ہو(1)۔ ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ یا یہ معنی ہے کہ تم اپنی قسموں کو فریب اور دھوکہ کا ذریعہ بناتے ہو کیونکہ تم اس قوم سے از روئے مال و تعداد کے زیادہ ہو جن سے تم نے عہد کیا ہے۔ پس اپنی کثرت کی وجہ سے اپنے عہد و پیمان کا بھی پاس نہیں رکھتے جیسا کہ قریش نے حدیبیہ کے سال مومنین کے ساتھ دس سال تک جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کیا لیکن پھر دو سال بعد اس معاہدہ کو توڑ دیا جب قریش نے اپنے آپ کو مومنین کی جماعت سے مال و دولت اور نفری کے اعتبار سے زیادہ دیکھا ھی اربی یہ جملہ امۃ کی صفت ہے اور امۃ تکون کا فاعل ہے اور تکون تامہ ہے۔ ھی فصل نہیں ہے کیونکہ یہ دو نکرہ اسموں کے درمیان ہے۔

ۓ ضمیر مجرور کا مرجع لان تکون امۃ ہے۔ یعنی، اللہ تعالیٰ تمہیں آزماتا ہے مال و تعداد کے لحاظ سے دوسری قوم سے زیادہ کر کے اور وہ دیکھتا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ سے کئے ہوئے عہد اور بیعت رسول اللہ ﷺ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھتے ہو یا قریش کی کثرت و شوکت اور مومنین کی قلت و ضعف کی وجہ سے توڑ دیتے ہو۔ بعض علماء فرماتے ہیں ضمیر الربوا کیلئے ہے۔ معنی پھر بھی مذکور مفہوم کے قریب قریب ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں ضمیر امر بالوفاء کے لئے ہے یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں عہد پورا کرنے کے امر کے ساتھ آزماتا ہے۔

وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ لٰكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَلَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۳﴾

"اور اگر چاہتا اللہ تعالیٰ تو بنا دیتا تمہیں ایک امت [1] لیکن وہ گمراہ کرتا ہے جسے چاہتا ہے اور ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے [2] اور ضرور تم سے باز پرس کی جائے گی ان اعمال سے جو تم کیا کرتے تھے [3]"

[1] یعنی اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تم اسلام پر متفق ایک امت ہوتے، اپنے عہد و پیمان کی پاسداری کرنے والے ہوتے اور اختلاف نہ کرتے۔

[2] لیکن وہ جسے چاہتا ہے رسوائی کے ساتھ گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے اپنی توفیق کے ساتھ ہدایت دیتا ہے۔

[3] مجرموں سے یہ سوال ان کا منہ بند کرنے اور مومنین سے یہ سوال جزاء دینے کے لئے ہوگا۔

وَ لَا تَتَّخِذُوْۤا اَيْمَانَكُمْ دَخَلًۢا بَيْنَكُمْ فَتَزِلَّ قَدَمٌۢ بَعْدَ ثُبُوْتِهَا وَ تَذُوْقُوا السُّوْٓءَ بِمَا صَدَدْتُّمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَ لَكُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۹۴﴾

"اور نہ بناؤ اپنی قسموں کو آپس میں فریب دینے کا ذریعہ [1] ورنہ (جادہ حق سے) پھسل جائے گا (لوگوں کا) قدم (اس پر) جم جانے کے بعد [2] اور تمہیں چکھنا پڑے گا (اس کا) برا نتیجہ [3] کہ تم نے (اپنی عہد شکنی اور فریب کاری) کے باعث لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی راہ سے روک دیا [4] اور تمہارے لئے بڑا (دردناک) عذاب ہوگا [5]"

[1] اپنی قسموں کو دھوکہ اور فریب کا ذریعہ نہ بناؤ۔ تاکہ تم لوگوں کو دھوکہ دو۔ تو تمہاری قسموں پر اعتماد کرتے ہیں اور امن میں ہو جاتے ہیں اور تم پھر ان قسموں کو توڑتے ہو۔ ضمناً عہد کو توڑنے کی قباحت کے ذکر کے بعد اب صراحۃً منہی عنہ کے قبح سے تاکیداً اور مبالغۃً نہی کی گئی ہے۔

[2] اگر تم نے احکام الٰہیہ کی پاسداری نہ کی تو تم امن میں ہونے کے بعد خود ہلاک ہو جاؤ گے۔ عرب کہتے ہیں ذلت قدمه جب کوئی

شخص عافیت کے بعد مصیبت میں گرفتار ہو جائے یا سلامتی کے بعد ہلاکت کے گڑھے میں گر جائے۔ یا یہ معنی حجۃ الاسلام پر ثابت قدم ہونے اور صراط مستقیم پر مضبوطی سے چلنے کے بعد قدم پھسل جائے گا۔ امر واقعہ یہ ہے نبی کریم ﷺ کی بیعت اسلام راستہ ہے اور اس پر استقامت اس کی پاسداری ہے اور اس کو توڑنا قدم کا پھسلنا ہے۔ فتزل قدم سے مراد فتزل اقدامکم بعد ثبوتھا ہے لیکن واحد اور نکرہ اس لئے ذکر فرمایا تا کہ دلالت کرے کہ راہ حق پر قدموں کے مضبوط ہونے کے بعد ایک قدم کا پھسلنا بھی بہت بڑی لغزش ہے تو پھر اقدام کثیرہ کے پھسلنے سے کتنا خسارہ ہوگا۔

۳۔ تم کو دنیا میں اس کا برا نتیجہ چکھنا پڑے گا۔

۴۔ اپنی عہد شکنی اور فریب کاری کے باعث لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی راہ سے روک دیا۔ تم نے خود جو دین سے خروج کیا اور دوسروں کو دین سے روکا ہے اس کا مزہ تمہیں دنیا میں بھی چکھنا پڑے گا۔ چونکہ انہوں نے ایمان کی بیعت کو توڑا اور مرتد ہو گئے تو ان کا بیعت کو توڑنا دوسروں کے لئے ایک سنت بن گیا اور وہ بھی اسی پر عمل پیرا ہو گئے۔ یا یہ معنی کہ تم نے عہد کو توڑ کر لوگوں پر عہد کو توڑنا آسان کر دیا ہے۔ پس اب تمہارے عہد پر کوئی بھی اعتماد نہیں کرے گا اور دوسرے لوگ اپنے عہود کے ساتھ تمہیں دھوکا دیں گے۔ پس تمہیں دنیا میں ہی مصیبت اور رسوائی سے دوچار ہونا پڑے گا۔

۵۔ قسموں کو توڑنے اور عہد و پیمان کی پاسداری نہ کرنے کی وجہ سے آخرت میں بھی تمہیں دردناک عذاب دیا جائے گا۔

وَلَا تَشْتَرُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ اِنَّمَا عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۹۵

"اور مت بیچو اللہ تعالیٰ کے عہدوں کو تھوڑی سی قیمت کے عوض بیشک۔ جو کچھ اللہ تعالیٰ کے پاس ہے وہی بہتر ہے تمہارے لئے ۱۔ اگر تم (حقیقت کو) جانتے ہو ۲۔"

۱۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے عہد اور بیعت رسول ﷺ کے بدلہ میں تھوڑی سی قیمت طلب نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ کے احکام پر پابندی کے عہد اور بیعت رسول اور ایمان کو توڑ کر دنیا کا مال و متاع طلب کرتے ہو حالانکہ جو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عہد پاسداری پر دنیا میں نعمت و نصرت اور آخرت میں جو ثواب ہے، وہ اس دنیا کے مال و متاع سے بہتر ہے جو تم طلب کرتے ہو۔

۲۔ اگر تم دونوں عوضوں کے درمیان جو فضیلت ہے اس کو سمجھتے۔ یا یہ معنی کہ تم اہل علم اور دانشمند ہوتے تو کبھی اعلیٰ پر ادنیٰ کو ترجیح نہ دیتے۔

مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ ۭ وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ صَبَرُوْٓا اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۹۶

"جو (مال و زر) تمہارے پاس ہے وہ ختم ہو جائے گا اور جو (رحمت کے خزانے) اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں وہ باقی رہیں گے ۱۔ اور ہم ضرور عطا کریں گے ۲۔ انہیں جنہوں نے (ہر مصیبت میں) صبر کیا ان کا اجر ان کے اچھے (اور مفید) کاموں کے عوض جو وہ کیا کرتے تھے ۳۔"

۱۔ تمہارے پاس جو دنیا کا ساز و سامان ہے وہ فنا ہو جائے گا اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کے بے پایاں خزانے ہیں وہ کبھی ختم ہونے والے نہیں۔ یہ حکم سابق کی تعلیل ہے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو دنیا کو پسند کرتا ہے وہ اپنی

چیز پر ترجیح دو(1)۔ اس حدیث کو امام احمد نے اور حاکم نے سند صحیح کے ساتھ روایت کیا ہے۔

۲ ابن کثیر نے ابوجعفر اور عاصم نے جمع متکلم کا صیغہ پڑھا ہے اور باقی قراء نے یاء کے ساتھ واحد غائب کا صیغہ پڑھا ہے اور اس میں ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہے۔

۳ جنہوں نے دنیا کی ہر مصیبت، مرض، فقر، کفار کی اذیتوں، جہاد میں استقامت وغیرہ پر صبر کیا اللہ تعالیٰ انہیں ان کے صبر کا ثواب دے گا جو ان کے اعمال کا عمدہ اجر ہوگا، ان کی نیکیوں کو دس سے سات سو گنا تک بڑھا دے گا۔ بعض علماء فرماتے ہیں بِاَحْسَنِ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ سے مراد واجبات ومندوبات ہیں کیونکہ مباحات ومنوعات سے بہتر وعمدہ ہیں۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَ لَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۞

"جو بھی نیک کام کرے مرد ہو یا عورت ۱ بشرطیکہ وہ مومن ہو ۲ تو ہم اسے عطا کریں گے ایک پاکیزہ زندگی ۳ اور ہم ضرور دیں گے ان کا اجر ان کے اچھے (اور مفید) کاموں کے عوض جو وہ کیا کرتے تھے ۴"

۱ یہاں اللہ تعالیٰ نے دونوں نوعوں مذکر ومونث کا ذکر فرمایا تا کہ تخصیص کا وہم وشبہ زائل ہو جائے۔

۲ عمل صالح کیلئے ایمان شرط ہے کیونکہ کفار کے اعمال پر ثواب کا استحقاق نہیں ہوتا لیکن ان کے اعمال پر عذاب میں تخفیف کی توقع ہو سکتی ہے۔ چونکہ ثواب کا دارومدار اخلاص اور حسن نیت پر ہے اور وہ کفار میں مفقود ہے اس لئے انہیں کوئی اجر نہیں ملے گا۔

۳ حضرت سعید بن جبیر اور عطاء فرماتے ہیں حَيٰوةً طَيِّبَةً سے مراد رزق حلال ہے۔ حسن فرماتے ہیں قناعت ہے۔ مقاتل فرماتے ہیں طاعت وفرمانبرداری کی زندگی ہے۔ ابوبکر وراق فرماتے ہیں طاعت کی مٹھاس ہے(2)، امام بیضاوی فرماتے ہیں وہ پاکیزہ زندگی گزارے گا۔ اگر وہ خوشحال ہوگا تو ظاہراً بھی اچھی زندگی بسر کرے گا اور اگر تنگ دست ہوگا تو قناعت، تقسیم الٰہی پر رضا اور آخرت میں اجر عظیم پر توقع کے ساتھ اچھی زندگی گزارے گا جبکہ کافر اگر تنگ دست ہوگا تو ظاہراً بھی اچھی زندگی سے محروم ہوگا اور اگر موسر وخوشحال ہوگا تو حرص ولالچ اور خوشحالی کے ختم ہونے کے خوف میں مبتلا ہوگا(3)۔ میں کہتا ہوں اللہ تعالیٰ کے ارشاد فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا کا بھی یہی مفہوم ہے۔ میں کہتا ہوں یہ کہنا بہتر ہے کہ بندہ جب اللہ تعالیٰ سے محبت کرتا ہے تو محبوب کی طرف سے جو مٹھاس یا کڑواہٹ ملتی ہے اس سے وہ لطف اندوز ہوتا ہے۔ حضرت مجدد رضی اللہ عنہ نے فرمایا محبوب کی تکلیف محبت کے لئے محبوب کے انعام سے بھی زیادہ لذیذ ہوتی ہے کیونکہ انعام میں محب کی مراد مقصود ہوتی ہے، جبکہ تکلیف میں محبوب کی مراد مقصود ہوتی ہے اور محبوب کی مراد محبت کے نزدیک اپنی مراد سے زیادہ محبوب وپسندیدہ ہوتی ہے۔ مولانا روم نے فرمایا۔

عاشق برلطف وبرقہرت بجد	اے عجب من عاشقم بر ہر دوضد
میں تیرے لطف وقہر کا عاشق ہوں	اور عجب عاشق ہوں کہ ہر دوضدوں پر فدا ہوں
ناخوش ازوی خوش بود در جان من	جاں فدائے یار دل رنجان من

میں کہتا ہوں اللہ تعالیٰ کا اپنے اولیاء کرام کے بارے میں ارشاد ہے۔

لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (اس کی تفسیر سورۂ یونس میں گزر چکی ہے) مومن کو جب اللہ تعالیٰ کی رضا، اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بلند مرتبہ اور بلند درجات کی بشارت ملتی ہے تو دنیا میں اس سے بہتر اسے لذت ملتی ہے جس کی وہ جنت میں ملنے کی امید رکھتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ اہل جنت کو فرمائے گا کیا تم راضی ہو؟ وہ عرض کریں گے کوئی وجہ نہیں کہ ہم خوش نہ ہوں، جبکہ تو نے ہمیں وہ کچھ عطا کیا ہے جو تو نے اپنی مخلوق میں سے کسی کو عطا نہیں فرمایا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے تمہیں اس سے بھی بہتر عطا کروں گا۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے میں نے تم پر اپنی رضا کا اظہار کیا ہے۔ پس اب میں کبھی تم پر ناراض نہیں ہوں گا(1)۔

یہ حدیث متفق علیہ ہے اور حضرت ابو سعید سے مروی ہے اور طبرانی نے الاوسط میں سند صحیح کے ساتھ حضرت جابر سے روایت کی ہے۔ اس لئے تو کسی عارف کامل نے فرمایا۔

امروز چوں جمال تو بے پردہ ظاہر است　　　در حیرتم کہ وعدۂ فردا برائے چیست

ترجمہ: آج جب تیرا جمال جہاں روشن بغیر کسی حجاب ونقاب کے ظاہر ہے تو مجھے تعجب ہو رہا ہے کہ کل کا وعدہ کس لئے ہے۔ حضرت محمد عابد مجددی نے فرمایا اگر دنیا کے پجاری بادشاہوں اور حکمرانوں کو فقراء کی لذت وراحت کا علم ہو جائے تو وہ بھی ان پر رشک وحسد کرنے لگیں۔ یہ نہ کہا جائے کہ ایمان کے لوازم میں سے جو خوف ورجاء ہے۔ اس حالت کے منافی ہے کیونکہ ہم کہتے ہیں کہ یہ حالت وکیفیت انس ومحبت پر مرتب ہوتی ہے۔ اس لئے یہ خوف کے منافی نہیں ہے کیونکہ خوف کا دار ومدار اللہ تعالیٰ کی عظمت وکبریائی کی رویت کی وجہ سے ہے اور یہ خوف مومن سے کبھی جدا نہیں ہوتا بلکہ انبیاء وکرام علیہم السلام جن کے لئے حسن خاتمہ اور اللہ تعالیٰ کی رضا قطعی اور یقینی ہے وہ دوسروں سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی عظمت وکبریائی کو مدنظر رکھتے ہیں اور دوسروں سے زیادہ وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں تم سے زیادہ علم ومعرفت رکھتا ہوں اور تم سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا ہوں(2)۔ جب صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو وحی قطعی کے ذریعے بشارت دی گئی تھی لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ إِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ لیکن پھر بھی وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے تھے اور کمال خوف رکھتے تھے تو پھر جن کی بشارت کشف ظنی کے ذریعے ہے وہ کیوں نہ ڈرتے ہوں گے۔ واللہ اعلم

میں کہتا ہوں یہ بھی جائز ہے کہ حیٰوۃ طیبہ سے مراد ایسی زندگی جو برکات کا موجب ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا واہ مومن کا ہر معاملہ اور کیفیت خیر وبہتر ہے۔ یہ سوائے مومن کے کسی اور کو حاصل نہیں مومن کو جب خوشحالی اور خیر پہنچتی ہے تو وہ شکر کرتا ہے تو یہ بھی اس کے لئے بہتر ہے۔ اگر مومن کو تکلیف پہنچتی ہے تو وہ صبر کرتا ہے تو یہ بھی اس کے لئے بہتر ہے(3)۔ اس حدیث کو امام احمد اور مسلم نے حضرت صہیب سے روایت کیا ہے۔ احمد اور ابن حبان نے اپنی صحیح میں حضرت انس سے روایت کی ہے اور بیہقی نے سند صحیح کے ساتھ حضرت سعد سے روایت کی ہے۔ حضرت مجاہد اور قتادہ فرماتے ہیں حیاۃ طیبہ سے مراد جنت کی زندگی ہے۔ اس قول کو حضرت عوف نے حضرت الحسن سے روایت کیا ہے فرمایا حَيٰوةً طَيِّبَةً صرف جنت میں ہی ہو سکتی ہے(4) اور ظاہر پہلا مفہوم ومعنی ہے۔

؎ ہم ضرور آخرت میں انہیں ان کے اچھے اعمال کی عمدہ اور اچھی جزاء دیں گے۔

فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ﴿۹۸﴾

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 969 (قدیمی)　　2۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 13 (دار المعرفۃ)

”سو جب تم قرآن کی تلاوت کرنے لگو تو پناہ مانگو اللہ تعالیٰ سے اس شیطان (کی وسوسہ اندازیوں) سے جو مردود ہے[1]“

[1] یعنی جب تم قرات قرآن کا ارادہ کرو تو اللہ تعالیٰ سے شیطان کی وسوسہ اندازیوں سے پناہ مانگ لیا کرو تا کہ قرات و تلاوت میں وہ وسوسہ اندازی نہ کرے اور کوئی جھوٹ اس میں نہ ملا دے کیونکہ اس منحوس کا تو کام ہی یہ ہے۔ ہر نبی اور رسول بھی جب تلاوت کرنے لگتا تو شیطان نے اس کی قرات میں اپنی باتیں ملانے کی کوشش کی۔ یہاں ارادہ فعل کو فعل سے تعبیر فرمایا جو ارادہ کا مسبب ہے۔ اس کی وجہ اختصار اور یہ شعور دلانا ہے کہ جو عبادت کا ارادہ کرے اسے جلدی کرنی چاہیے تا کہ فعل سے ارادہ منفک نہ ہو۔ حضرت نخعی اور ابن سیرین سے حکایت ہے کہ وہ آیت کے ظاہر کو دیکھتے ہوئے فرماتے کہ تعوذ قرات کے بعد ہونا چاہئے، دوسری ان کی دلیل یہ تھی کہ عبادت کے بعد دعا قبولیت کے زیادہ قریب ہوتی ہے اور تعوذ شیطان سے ہر وقت مطلوب ہوتا ہے۔

نبی کریم ﷺ سے صحیح حدیث مروی ہے کہ آپ ﷺ قرات سے پہلے تعوذ پڑھتے تھے اور اسی پر سلف و خلف کا اجماع ہے اور جمہور علماء کے نزدیک قرات سے پہلے تعوذ پڑھنا سنت ہے۔ حضرت عطا فرماتے ہیں قرأت سے پہلے تعوذ پڑھنا واجب ہے اور ان کی دلیل اسی آیت کریمہ کا امر کا صیغہ ہے کیونکہ امر کا حقیقی معنی وجوب ہے۔ دوسری وجہ وجوب کی یہ ہے کہ تعوذ قرأت میں وسوسہ کو دور کرنے کے لئے ہے اس لئے اس کو چھوڑنا صحیح نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ وجوب کا مشروع صحیح ہے۔ پس اسے وجوب پر ہی محمول کرنا چاہئے۔ ابن الہمام فرماتے ہیں جمہور علماء وجوب کے قائل نہیں ہیں۔ میں کہتا ہوں جمہور علماء کا تعوذ کا واجب قرار نہ دینا اس لئے ہے کہ انہوں نے دیکھا کہ نبی کریم ﷺ نے بعض اوقات قرات و تلاوت سے پہلے تعوذ چھوڑ دیا تھا۔ اگر آپ ﷺ نے تعوذ کو ترک نہ کیا ہوتا تو علماء کرام تعوذ کے ترک پر کبھی بھی اجماع نہ کرتے۔ کثیر تعداد میں احادیث موجود ہیں جن میں آپ ﷺ کی قرات بغیر تعوذ کے ذکر ہے۔ صحیحین میں ابن عباس سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ رات کے آخری تیسرے حصہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ ﷺ نے آسمان کی طرف دیکھا اور اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ(1)۔ آخر تک دس آیات پڑھیں پھر آپ اٹھے اور وضو فرمایا۔ امام مسلم نے حضرت انس ؓ سے روایت فرمایا ہے کہ ایک دن آپ ﷺ ہمارے درمیان تشریف فرما تھے کہ اچانک آپ ﷺ سو گئے پھر مسکراتے سر مبارک کو اوپر اٹھایا۔ ہم نے عرض کی یا رسول اللہ! آپ کیوں مسکرائے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا ابھی ابھی مجھ پر یہ سورت اتری ہے پھر آپ ﷺ نے بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝ اِنَّاۤ اَعۡطَیۡنٰكَ الۡكَوۡثَرَ ۝ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانۡحَرۡ ۝ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الۡاَبۡتَرُ ۝ تلاوت فرمائی۔ بے شک ہم نے آپ کو (جو کچھ عطا کیا) بے حد حساب عطا کیا۔ آپ اپنے رب کے لئے نماز پڑھا کریں اور قربانی دیں (اسی کی خاطر) یقیناً آپ کا دشمن ہی بے نام و نشان ہوگا(2)۔

مسئلہ: نماز میں قرات سے پہلے تعوذ پڑھنے میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ اور امام احمد فرماتے ہیں صرف پہلی رکعت میں تعوذ پڑھنا چاہئے۔ امام شافعی فرماتے ہیں ہر رکعت میں پڑھنا ہے۔ شیخ ابن حجر فرماتے ہیں ہر رکعت میں پڑھنا مستحب ہے۔ امام مالک فرماتے ہیں فرضی نماز میں تعوذ نہیں ہے۔

امام بیضاوی فرماتے ہیں کہ امام شافعیؒ کے لئے حجت یہ ہے کہ وہ حکم جو کسی شرط پر مرتب ہوتا ہے وہ شرط کے تکرار کے ساتھ وہ حکم

بھی قیاساً مکرر رہتا ہے(1)۔ پس آیت کریمہ اس بات پر دلیل ہے کہ نمازی ہر رکعت میں تعوذ پڑھے۔ امام مالک نے حضرت انس کی حدیث سے حجت پکڑی ہے، فرمایا ہم رسول اللہ ﷺ، ابوبکر، عمر اور حضرت عثمان کے پیچھے نماز پڑھتے تھے۔ یہ تمام جہری نماز میں سورۃ فاتحہ سے قرأت شروع فرماتے تھے۔ صحیحین میں ہے کہ یہ تمام نفوس قدسیہ الحمد للہ رب العالمین سے قرأت شروع فرماتے تھے(2)۔ ہم کہتے ہیں یہ حدیث سراً تعوذ پڑھنے کے منافی نہیں ہے اور ہماری دلیل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ پہلی رکعت میں ثناء کے بعد تعوذ پڑھتے تھے اور پہلی رکعت کے علاوہ کسی دوسری رکعت میں آپ ﷺ سے تعوذ پڑھنا مروی نہیں ہے۔ ابن ماجہ اور ابن سنی نے جبیر بن مطعمؓ سے روایت کیا ہے، فرمایا رسول اللہ ﷺ جب نماز میں داخل ہوتے تو تین مرتبہ اللّٰه اکبر کبیراً، تین مرتبہ الحمد للّٰه کثیراً اور تین مرتبہ سبحان اللّٰه بکرۃ واصیلاً اعوذ باللّٰه من الشیطان الرجیم پڑھتے تھے(3)۔ امام احمد، ابن حبان اور ابوداؤد نے جبیر بن مطعمؓ سے اس کے بعد من نفخه ونفثه و همزه کے الفاظ بھی روایت کیے ہیں یعنی شیطان کی پھونک سے اس کی تھوک سے اور اس کے وسوسہ سے پناہ مانگتا ہوں۔ امام حاکم نے بھی اسی طرح روایت کیا ہے۔ امام احمد، اہل سنن اور حاکم نے ابو سعید الخدری سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ جب رات کے وقت نماز کے لئے کھڑے ہوتے تو تکبیر کہتے پھر سبحانک اللّٰهم پڑھتے، پھر تین مرتبہ لا اله الا اللّٰه، پھر تین مرتبہ اللہ اکبر، پھر یہ پڑھتے اعوذ باللّٰه السمیع العلیم من الشیطن الرجیم من نفخه ونفثه و همزه۔ امام احمد نے حضرت ابی امامہ کی اسی طرح حدیث روایت کی ہے اس میں اعوذ باللّٰه من الشیطن الرجیم کے الفاظ ہیں اور اس کی سند میں ایک ایسا راوی ہے جس کا نام ذکر نہیں۔ ابن ماجہ اور ابن خزیمہ نے حضرت ابن مسعود کی حدیث روایت کی ہے نبی کریم ﷺ اللّٰهم انی اعوذبک من الشیطن الرجیم من همزه و نفخه ونفثه پڑھتے تھے۔ اس روایت کو حاکم اور بیہقی نے ان الفاظ میں روایت کیا ہے کان اذا دخل فی الصلوة۔ جب آپ نماز میں داخل ہوتے تو مذکورہ بالا الفاظ پڑھتے تھے(4)۔ حضرت انس سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ دار قطنی نے بھی اسی طرح روایت کیا ہے۔ اس کی سند میں الحسین بن علی بن الاسود ہیں جن میں علماء نے کلام کی ہے۔ ابوداؤد کی مراسیل میں حضرت الحسن سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ تعوذ اس طرح پڑھتے تھے اعوذ باللّٰه من الشیطان الرجیم(5)۔

صاحب ہدایہ نے لکھا ہے کہ بہتر یہ ہے کہ استعیذ باللّٰه کہا جائے تاکہ قرآن کریم کے الفاظ کے موافق ہو جائے اور اعوذ باللّٰه اس کے قریب ہے۔ میں کہتا ہوں ماہر قراء اور فقہاء کے ہاں مستعمل اعوذ باللّٰه من الشیطان الرجیم الفاظ ہیں اس کے علاوہ الفاظ متعارف نہیں جیسا کہ ہم نے احادیث ذکر کی ہیں۔ ثعلبی اور الواحدی نے ابن مسعود سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے تلاوت کی تو میں نے پڑھا اعوذ باللّٰه السمیع العلیم من الشیطان الرجیم تو آپ ﷺ نے فرمایا اعوذ باللّٰه من الشیطان الرجیم پڑھو، مجھے جبرئیل نے عن القلم عن اللوح المحفوظ کی سند سے اسی طرح سکھایا ہے(6)۔ ابو عمرو الدانی نے التیسیر میں بعینہ یہی لفظ لکھے ہیں، فرماتے ہیں میں نے اعوذ پڑھا اور اسی کو حجت سمجھتا ہوں۔ میں قراء کے درمیان نماز کے باہر جہری قرأت کے وقت اعوذ کے پڑھنے میں کوئی اختلاف نہیں جانتا۔ اسی طرح اجزاء کی ابتداء کے وقت بھی اعوذ پڑھنے میں کوئی اختلاف نہیں۔

1۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 366 (فراس)
2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 172 (قدیمی)
3۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 59 (وزارت تعلیم)
4۔ سنن صغیر از بیہقی، جلد 1، صفحہ 148 (الدراسات)
5۔ مراسیل ابی داؤد، صفحہ 6 (نور محمد)
6۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 366 (فراس)

اہل سنت و جماعت کے مذہب میں نص کی اتباع اور سنت کی اقتداء ہے۔ اسی طرح ابوعمرو بن العلاء سے مروی ہے۔ حمزہ سے مروی ہے کہ وہ سورۂ فاتحہ کی ابتداء میں خصوصی طور پر جہراً پڑھتے تھے۔ اس کے بعد سارے قرآن میں آہستہ آہستہ پڑھتے تھے۔ خلف نے حمزہ سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ خلاد نے حمزہ سے روایت کیا ہے کہ وہ جہراً اور اخفاء میں اختیار دیتے تھے اور باقی قراء سے کوئی شی منصوص مروی نہیں ہے۔

إِنَّهُ لَيْسَ لَهُ سُلْطَٰنٌ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ﴿٩٩﴾

''یقیناً اسکا زور نہیں چلتا ان لوگوں پر جو (سچے دل سے) ایمان لائے ہیں اور اپنے رب پر کامل بھروسہ رکھتے ہیں [1]''

[1] إِنَّهُ میں ہ ضمیر شان ہے لَيْسَ لَهُ میں ہ ضمیر کا مرجع شیطان ہے، سلطن کا معنی تسلط اور غلبہ ہے، یعنی ایمانداروں اور توکل علی اللہ کرنے والوں پر شیطان کا کوئی تسلط اور غلبہ نہیں ہے کیونکہ وہ اس ظالم کی باتوں کی اطاعت نہیں کرتے اللہ تعالیٰ خود ان کی حفاظت فرماتا ہے وہ اس کے وسوسوں کو قبول نہیں کرتے مگر جن چیزوں کو وہ حقیر سمجھتے ہیں۔ کبھی غفلت کی وجہ سے ان کے متعلق اس کی وسوسہ اندازی اثر دکھا دیتی ہے۔ اسی وجہ سے تعوذ کا حکم دیا گیا ہے۔ تعوذ کے حکم کے بعد شیطان کے تسلط کا ذکر کیا تا کہ یہ وہم نہ ہو کہ اس کو میرے بندوں پر کوئی غلبہ ہے۔ امام بیضاوی نے اسی طرح لکھا ہے(1)۔ میں کہتا ہوں ہوسکتا ہے کہ یہ آیت کریمہ استعاذہ کے امر کی تعلیل کے مقام میں ہو کیونکہ علی ربھم یتوکلون کا معنی بھی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پناہ لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی عزت کے ساتھ شیطان کے تسلط سے اپنے آپ کو بچاتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کی توفیق کے بغیر نہ نیکی کی طاقت ہوتی ہے نہ گناہ سے بچا جا سکتا ہے۔ استعاذہ کا بھی یہی معنی ہے۔ پس استعاذہ جس کا معنی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں التجاء کرنا اور اس پر کلی اعتماد کرنا ہے۔ یہ مخلص مومن بندوں کے دلوں کی صفات سے ہے اور یہ صفت ان سے کبھی بھی دور نہیں ہوتی لیکن زبان سے بھی انہیں استعاذہ کا حکم دیا گیا ہے تا کہ دعا کی سنت ادا ہو جائے اور تضرع وزاری میں ظاہر و باطن کے مطابق ہو جائے اور شیطان لعین سے مکمل طور پر امان حاصل ہو جائے۔

إِنَّمَا سُلْطَٰنُهُ عَلَى الَّذِينَ يَتَوَلَّوْنَهُ وَالَّذِينَ هُم بِهِ مُشْرِكُونَ ﴿١٠٠﴾

''اس کا زور تو صرف ان پر چلتا ہے جو یارانہ گانٹھتے ہیں اس سے [1] اور جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرتے ہیں [2]''

[1] یعنی شیطان کا غلبہ اور تسلط ان لوگوں پر ہوتا ہے جو اس سے محبت کرتے ہیں اور اس کا حکم مانتے ہیں اور اسے خود اپنے اختیار سے اپنے نفسوں پر مسلط کرتے ہیں۔ اسے ان پر کوئی ایسا تسلط نہیں ہوتا جو انہیں اسکی اتباع پر مجبور کرے۔ پس اس ارشاد اور مَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُم مِّن سُلْطَٰنٍ إِلَّا أَن دَعَوْتُكُمْ کے درمیان کوئی منافات نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

[2] بہ میں ہ ضمیر کا مرجع یا تو اللہ تعالیٰ ہے یا شیطان ہے۔ معنی یہ ہوگا جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرتے ہیں یا جو شیطان کی وجہ سے شرک کرتے ہیں۔

وَإِذَا بَدَّلْنَا آيَةً مَّكَانَ آيَةٍ ۙ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوا إِنَّمَا أَنتَ مُفْتَرٍ ۚ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿١٠١﴾

''اور جب ہم بدلتے ہیں ایک آیت کو دوسری آیت کی جگہ [1] اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو وہ نازل کرتا ہے [2] تو یہ لوگ کہتے ہیں تم صرف افتراپرداز ہو [3] بلکہ ان میں سے اکثر (آیت بدلنے کی حکمت کو) نہیں جانتے [4]''

1 تفسیر بیضاوی، صفحہ 366 (فراس)

1۔ یعنی جب ہم کسی آیت کی تلاوت کو منسوخ کرتے ہیں اور اس کی جگہ دوسری نازل کرتے ہیں یا جب ہم کسی آیت کا حکم دوسری آیت کے حکم کے ساتھ منسوخ کرتے ہیں۔

2۔ اللہ جانتا ہے جو وہ نازل کرتا ہے کہ اس حکم میں مصلحت تھی۔ پھر اسی میں مصلحت نہیں رہی۔ یا پہلے اس حکم میں مصلحت نہیں تھی اب اس میں مصلحت ہے یہ جملہ بدلنا کے فاعل سے حال ہے اور اسم جلالت ضمیر کی جگہ ظاہر اً ذکر کیا گیا ہے، یا یہ لفظ مستقل کلام ہے لیکن تعلیل کی جگہ میں تبدیل کا سبب ہے۔ یعنی ہم نے بدل دیا کیونکہ میں جانتا ہوں جو کس وقت مخلوق کے لئے بہتر ہے۔ ابو عمرو اور ابن کثیر نے ینزل تخفیف کے ساتھ باب افعال سے اور باقی قراء نے باب تفعیل سے تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔

3۔ کفار نے کہا اے محمد ﷺ اللہ تعالیٰ پر تم افتراء باندھنے والے ہو۔ امام بغوی فرماتے ہیں مشرکین نے کہا محمد ﷺ اپنے ہی اصحاب سے مذاق کرتا ہے ایک دن انہیں حکم دیتا ہے۔ دوسرے دن اسی حکم سے منع کرتا ہے۔ وہ اپنی طرف سے افتراء باندھتے ہیں(1)۔ قالوا کا جملہ اذا کا جواب ہے۔

4۔ بلکہ اکثر لوگ احکام کی حکمت کو نہیں جانتے اور خطاً وصواب میں تمیز نہیں کر سکتے یا یہ معنی کہ اکثر ان میں سے اہل علم اور عقلمند نہیں ہیں۔ اگر یہ لوگ دانشمند ہوتے تو جان لیتے کہ قرآن کو کسی بشر کے لئے خود گھڑنا ممکن ہی نہیں ہے اور محمد ﷺ امین ہیں ان پر افتراء کا اتہام صحیح نہیں ہے۔ شعر

اللہ تعالیٰ کی ذات بڑی بابرکت ہے وحی کسی چیز نہیں ہے اور کوئی نبی غیب (وحی) پر متہم نہیں ہوتا۔

قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُثَبِّتَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ هُدًى وَّ بُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ﴿۱۰۲﴾

"فرمائیے نازل کیا ہے اسے روح القدس نے 1 آپ کے رب کی طرف سے حق کے ساتھ 2 تاکہ ثابت قدم رکھے انہیں جو ایمان لائے ہیں 3 اور یہ ہدایت اور خوشخبری ہے مسلمانوں کے لئے 4"

1۔ اے محمد ﷺ کفار کی بات کا رد کرتے ہوئے فرمائیے جبریل نے اس کو نازل کیا ہے۔ روح کی القدس کی طرف اضافت، حاتم الجود کی طرح ہے القدس کا معنی طہر ہے یہاں ظاہر کے معنی میں ہے۔ ابن کثیر نے القدس دال کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے دال کے ضمہ کیساتھ پڑھا ہے۔ ینزل اور نزلہ میں تنبیہ ہے کہ قرآن کا انزال مصالح کے مطابق تدریجاً ہوا جو تبدیلی کا مقتضی ہے۔

2۔ یعنی حکمت بالغہ سے ملا ہوا تھا۔

3۔ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے کیونکہ جب وہ ناسخ کو سنیں گے اور اس میں جو صلاح اور حکمت ہے۔ اس میں غور و فکر کریں گے تو ان کے عقائد پختہ اور ان کے دل مطمئن ہو جائیں گے، یا یہ معنی کہ وہ تمہیں نسخ کے ساتھ آزماتا ہے تاکہ جب وہ کہیں کہ یہ ہمارے رب کی طرف سے حق ہے اور یہ حکمت ہے کیونکہ حکیم حکمت والا کام کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ ان کے لئے ثابت قدمی کا حکم لگا دیں گے۔

4۔ یہ قرآن ہدایت اور بشارت ہے اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کرنے والے ہیں۔ وَ هُدًى وَّ بُشْرٰى معطوف ہیں یثبت کے محل پر اس آیت میں اشارہ ہے کہ مسلمانوں کے علاوہ لوگوں کو ہدایت و بشارت کی اضداد ملتی ہیں۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 94 (التجاریۃ)

وَ لَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ یَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا یُعَلِّمُهٗ بَشَرٌؕ لِسَانُ الَّذِیْ یُلْحِدُوْنَ اِلَیْهِ اَعْجَمِیٌّ وَّ هٰذَا لِسَانٌ عَرَبِیٌّ مُّبِیْنٌ ﴿۱۰۳﴾

"اور ہم خوب جانتے ہیں کہ وہ کہتے ہیں کہ انہیں تو یہ قرآن ایک انسان سکھاتا ہے۔ [1] حالانکہ اس شخص کی زبان جس کی طرف یہ تعلیم قرآن کی نسبت کرتے ہیں [2] عجمی ہے [3] اور یہ قرآن فصیح و بلیغ عربی زبان میں ہے [4]"

[1] کفار کہتے کہ یہ کلام کسی آدمی نے انہیں سکھایا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں۔ امام بغوی فرماتے ہیں اس بشر سکھانے والے کے بارے میں ان کا اختلاف تھا۔ ابن عباس فرماتے ہیں آپ ﷺ ایک لوہار بلعام کو تعلیم دیتے تھے اور وہ نصرانی عجمی تھا۔ مشرکین دیکھتے کہ رسول اللہ ﷺ اس کے پاس آتے جاتے ہیں تو کہتے ان کو یہ قرآن بلعام سکھاتا ہے۔ اسی طرح ابن جریر نے اپنی سند میں سند ضعیف کیساتھ نقل کیا ہے۔ عکرمہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ بنی مغیرہ کے ایک غلام یعیش کو پڑھایا کرتے تھے اور وہ کتابیں پڑھتا تھا تو قریش نے کہا یعیش انہیں قرآن سکھاتا ہے۔ فراء کہتے ہیں مشرکین نے کہا کہ آپ ﷺ حویطب بن عبدالعزی کے غلام عائش سے سیکھتے ہیں۔ وہ مسلمان ہوا تھا اور اسلام کا حق ادا کر دیا تھا اور اس کی زبان عجمی تھی۔ ابن اسحاق فرماتے ہیں مجھے خبر پہنچی ہے کہ آپ ﷺ مروہ کے پاس ایک رومی نصرانی کے پاس بیٹھتے تھے۔ یہ بنی حضرمی میں سے کسی کا غلام تھا اور اس کا نام جبر تھا۔ یہ بھی کتابوں کا مطالعہ کرتا تھا۔ عبداللہ بن مسلم الحضرمی نے کہا کہ ہمارے دو یمنی غلام تھے۔ ایک کا نام یسار تھا جس کی کنیت ابوفکیہہ تھی اور دوسرے کا نام جبر تھا۔ یہ دونوں مکہ میں تلواریں بناتے تھے اور دونوں تورات وانجیل پڑھتے تھے۔ آپ ان دونوں کے پاس سے گزرتے تو ٹھہر جاتے اور سننے لگ جاتے۔ اسی طرح ابن ابی حاتم نے حصین بن عبداللہ بن مسلم کے طریق سے روایت کیا ہے۔ الضحاک کہتے ہیں نبی کریم ﷺ کو جب کفار ستاتے تو آپ ان دو غلاموں کے پاس بیٹھتے اور ان کے کلام سے راحت حاصل کرتے۔ مشرکین نے کہا محمد ﷺ ان دونوں سے سیکھتے ہیں۔ پس ان کی بھانت بھانت کی بولیوں پر یہ آیت نازل ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے ان کی تکذیب کرتے ہوئے فرمایا (1)۔

[2] اس شخص کی لغت جس کی طرف تم اس کلام کی نسبت کرتے ہو۔ حمزہ اور کسائی نے یاء کے فتحہ اور حاء کے فتحہ کے ساتھ فعل مجرد پڑھا ہے اور باقی قراء نے یاء کے ضمہ اور حاء کے کسرہ کے ساتھ باب افعال سے پڑھا ہے۔ قاموس میں ہے لحد الیہ مال الیہ جیسے التحد اور الحد کا معنی مال اور عدل ہے، یعنی مائل ہونا اور پھرنا یعنی وہ آپ کی طرف اشارہ کرتے تھے۔ یا یہ معنی کہ وہ اپنے قول کو صدق اور استقامت سے پھیرتے ہیں۔

[3] جو عربی لغت میں فصیح کلام کر ہی نہیں سکتا قاموس میں ہے رجل و قوم اعجم والاعجم یعنی وہ شخص اور قوم جو فصیح کلام نہ کرتا ہو جیسے عجمی اور گناہ گار ہوتا ہے۔ عجمی جو جنس عجم سے ہو اگرچہ فصیح بھی ہو، عرب کے علاوہ کو عجم کہتے ہیں۔ بعض محققین فرماتے ہیں العجمۃ ابانت کی ضد ہے یعنی جو فصیح کلام نہ کر سکتا ہو اعجام کا معنی ابہام ہے۔ کہتے ہیں استعجمت الدار جب گھر والے مرجائیں اور کوئی ایک بھی نہ بچے جو واضح جواب دے۔

[4] یہ قرآن فصیح عربی زبان میں ہے یہ دونوں جملے مستقل کلام ہیں ان کے طعن کو رد کرنے کے لئے اور دونوں کا ترکیب میں کوئی محل نہیں ہے۔ اس کی وضاحت دو طرح سے ہے۔ (1) محمد ﷺ اس عجمی سے جو کچھ سنتے ہیں وہ عجمی کلام ہے اسے نہ تو وہ سمجھتے ہیں اور نہ تم سمجھتے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 95 (التجاریۃ)

ہواور قرآن عربی ہے جسے ہم سمجھتے ہو پھر یہ قرآن عجمی کا کلام کیسے ہوسکتا ہے۔

(2) قرآن کا معنی جس طرح معجز ہے اسی طرح اس کے الفاظ بھی معجز ہیں۔ پس قرآن اگرچہ معنی میں اس عجمی کی کلام کے مطابق ہے جو وہ تورات اور انجیل سے پڑھتا ہے۔ لیکن ان معانی کی تعبیر جو سابقہ کتب میں منزل ہیں۔ قرآن کی عبارت کی مثل بنانا بشر کی طاقت میں نہیں ہے کیونکہ قرآن کے چیلنج کے سامنے ان کا عجز ظاہر ہو چکا ہے۔ فرمایا فاتوا بسورۃ من مثلہ۔ علوم کثیرہ جو کتب سماویہ میں موجود ہیں ان کا سیکھنا کسی ماہر فی العلوم استاد کی تواتر کے ساتھ ملازمت کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے تو پھر تمام علوم کا حصول اس شخص سے سیکھنا کیسے متصور ہوسکتا ہے جس سے آپ نے گزرتے ہوئے کچھ عجمی زبان میں سنا ہو جس کا معنی بھی نہ سمجھا ہو۔

اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ ۙ لَا یَهْدِیْهِمُ اللّٰهُ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۱۰۴﴾

”بیشک جو لوگ ایمان نہیں لاتے اللہ تعالیٰ کی آیتوں پر اللہ تعالیٰ انہیں ہدایت نہیں دیتا اور ان کیلئے دردناک عذاب ہے۔1“

1۔ یعنی جو تصدیق نہیں کرتے کہ یہ آیات اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی حق کی طرف راہنمائی نہیں فرماتا، یا نجات کے راستہ کی طرف یا جنت کی طرف ان کی راہنمائی نہیں فرماتا اور آخرت میں ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔

اب اللہ تعالیٰ کفار کے طعن اور شبہات کے رد کے بعد کفار پر افتراء کے معاملہ کا رد فرما رہے ہیں۔

اِنَّمَا یَفْتَرِی الْكَذِبَ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ ۚ وَ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ﴿۱۰۵﴾

”وہی لوگ تراشا کرتے ہیں جھوٹ جو ایمان نہیں لاتے اللہ تعالیٰ کی آیات پر 1 اور یہی لوگ جھوٹے ہیں 2۔“

1۔ بے ایمان لوگ ہی جھوٹ گھڑتے ہیں کیونکہ انہیں سزا کا خوف نہیں ہے تاکہ وہ خوف انہیں اس گھناؤنے جرم سے روکے، جبکہ مومن اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔ اس لئے وہ اس فعل بد سے اجتناب کرتے ہیں۔

2۔ واولئک کا مشار الیہ کفار ہیں یا قریش، یعنی یہی جھوٹے ہیں اور کوئی نہیں کیونکہ مومنین اس وقت سب سے راست باز اور عادل اور خیر القرون کی بشارت سے مبشر تھے۔ یا یہ معنی کہ یہ کفار کذب میں کامل ہیں کیونکہ آیات قرآنیہ کی تکذیب اور معصوم رسول کی تردید اور آیات قرآنیہ اور نبی کریم ﷺ پر لایعنی اعتراضات بہت بڑا جھوٹ ہے، جبکہ نبی کریم ﷺ کی نبوت کی صداقت کے لئے معجزات ان کی آنکھوں کے سامنے نمودار ہو چکے تھے۔ یا یہ معنی کہ ان کی عادت بھی جھوٹ بولنا ہے انہیں نہ دین کا کوئی حکم اور نہ مروت اس جرم سے پھیر سکتی ہے یا یہ معنی کہ وہ اپنے اس قول انت مفتر انما یعلمه بشر میں جھوٹے ہیں جملہ فعلیہ دلالت کرتا ہے کہ افتراء کا صدور ان پر منحصر ہے اور جملہ اسمیہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ جھوٹ وصف ان کو لازم ہے۔ امام بغوی نے اپنی سند کے ساتھ عبداللہ بن جراء سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں میں نے عرض کی یا رسول اللہ! مومن زنا کرتا ہے فرمایا کبھی یہ بھی اس سے سرزد ہو جاتا ہے میں نے پوچھا مومن چوری کر سکتا ہے۔ فرمایا یہ بھی ہو سکتا ہے میں نے تیسری مرتبہ پوچھا مومن جھوٹا ہو سکتا ہے۔ فرمایا نہیں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے بیشک جھوٹ تو وہ تراشتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی آیات پر ایمان نہیں رکھتے (1)۔ امام احمد نے ابو امامہ سے روایت کیا ہے، فرمایا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مومن میں جھوٹ اور خیانت کے علاوہ صفات پائی جا سکتی ہیں۔ اس حدیث کو بیہقی نے شعب الایمان میں سعد بن ابی وقاص سے روایت کیا ہے (2)۔ امام مالک اور بیہقی نے شعب الایمان میں مرسلاً روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ سے پوچھا گیا کہ مومن بزدل ہو سکتا ہے؟

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 95 (التجاریہ)　　2۔ شعب الایمان، جلد 4، صفحہ 207 (العلمیہ)

فرمایاہاں۔ پھر پوچھا گیا کیا مومن بخیل ہوسکتا ہے؟ فرمایاہاں، پھر پوچھا گیا کیا مومن جھوٹا ہوسکتا ہے؟ فرمایا نہیں۔

میں کہتا ہوں ظاہر یہ ہے کہ احادیث میں مومن مذکور سے مراد نبی کریم ﷺ کے زمانہ کے لوگ ہیں۔ اسی وجہ سے اس بات پر اجماع ہے کہ تمام صحابہ کرام صدوق اور عدول ہیں۔ ان میں سے کسی کی بات پر طعن نہ ہوگا۔ یا اس سے مراد مومن کامل ہے اور وہ صوفی فانی فی اللہ اور باقی باللہ ہے۔

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِیْمَانِهٖۤ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَ قَلْبُهٗ مُطْمَىٕنٌّۢ بِالْاِیْمَانِ وَ لٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَیْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ۝

"جس نے کفر کیا اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایمان لانے کے بعد[1] بجز اس شخص کے جسے مجبور کیا گیا ہو[2] اور اس کا دل مطمئن ہے ایمان کے ساتھ[3] (تو اس سے مواخذہ نہ ہوگا) لیکن وہ (بدنصیب) کھل جائے کفر کے ساتھ (جس کا سینہ) تو ان لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہوگا اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے[4]"

[1] یہ مبتدا متضمن معنی شرط ہے اور اس کی خبر متضمن جواب محذوف ہے اور وہ فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ہے۔ اس پر مَّنْ شَرَحَ کا جواب دلالت کر رہا ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ الذین لا یومنون بآیات اللہ سے بدل ہو اور اولٰئک ھم الکاذبون کا جملہ بدل مبدل منہ کے درمیان جملہ معترضہ ہے، یعنی جو کفر کرتا ہے وہ افتراء باندھتا ہے مگر جسے مجبور کیا گیا ہو۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اولٰئک مبتدا سے الکاذبون خبر سے بدل ہو تقدیر یوں ہوگی مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ هُمُ الْكَاذِبُوْنَ یا اُولٰٓئِكَ هُمْ مَّنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ یہ بھی ہوسکتا ہے یہ منصوب علی الذم ہو۔

[2] امام بغوی فرماتے ہیں ابن عباس نے فرمایا یہ آیت کریمہ عمار بن یاسر کے حق میں نازل ہوئی۔ مشرکین نے حضرت عمار، آپ کے ماں باپ آپ کی ماں سمیہ، صہیب بلال، خبیب اور سالم کو پکڑ لیا اور انہیں اذیتیں پہنچائیں۔ حضرت سمیہ کو دو اونٹوں کے درمیان باندھا گیا اور ان کے اندام نہانی میں نیزہ مارا گیا۔ پس وہ قتل ہوگئیں پھر ان کے خاوند یاسر کو قتل کیا گیا۔ اسلام میں سب سے پہلے جام شہادت نوش کرنے والے یہ دو خوش نصیب ہیں۔ حضرت عمار نے مجبوراً اپنی زبان سے وہ کہہ دیا جو وہ چاہتے تھے۔ قتادہ فرماتے ہیں: بنو مغیرہ نے عمار کو پکڑ لیا اور انہیں بئر میمون میں غوطے دیئے اور کہا تم محمد ﷺ کی نبوت و رسالت کا انکار کردو تو آپ نے بادل نخواستہ ان کی بات مان لی۔ آپ ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی گئی کہ عمار تو کافر ہوگیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا ہرگز نہیں، عمار تو سر سے لے کر قدموں تک ایمان سے لبریز ہے۔ ایمان اس کے گوشت اور خون میں سرایت کئے ہوئے ہے۔ حضرت عمار ان سے چھٹکارا پا کر روتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے۔ آپ ﷺ نے پوچھا تمہارے پیچھے کیا ہے؟ عرض کی شر ہے۔ پھر اپنا ماجرا عرض کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا اس وقت تمہارے دل کی کیفیت کیا تھی؟ عرض کی حضور دل تو ایمان سے مطمئن تھا۔ نبی کریم ﷺ نے اپنے غلام کی اشکبار آنکھوں کو اپنے دست کرم سے پونچھا اور فرمایا اگر وہ دوبارہ تجھے مجبور کریں تو ایسا کہہ دینا کوئی حرج نہیں ہے (جبکہ ایمان سے دل مطمئن ہو)(1)۔ اسی طرح الثعلبی اور واحدی نے ذکر کیا ہے۔ ابن ابی حاتم نے ابن عباس سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کا ارادہ فرمایا تو مشرکین نے حضرت بلال، خبیب اور عمار بن یاسر کو پکڑ لیا۔ حضرت عمار نے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 96-95 (التجاریۃ)

ان کے ساتھ تقیۃً ایسا کلمہ کہہ دیا جو انہیں اچھا لگا۔ جب آپ رسول اللہ ﷺ کے پاس پہنچے تو حقیقت حال عرض کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا اس وقت تمہارا دل اس بات کے ساتھ کھلا ہوا تھا عرض کی نہیں دل تو اس بات سے بیزار تھا۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی(1)۔ امام بغوی نے ذکر کیا ہے اور ابن ابی حاتم نے نقل کیا ہے کہ مجاہد فرماتے ہیں یہ آیت کریمہ مکہ میں چند ایمان لانے والوں کے متعلق نازل ہوئی۔ بعض صحابہ کرام نے مکہ میں رہنے والے مومنین کو لیٹر لکھے کہ مکہ سے مدینہ ہجرت کر آؤ۔ ہم تمہیں اپنوں میں شمار نہیں کریں گے حتی کہ تم ہمارے پاس آ جاؤ۔ پس وہ مدینہ طیبہ کے ارادہ سے نکلے تو قریش نے انہیں راستہ ہی میں گرفتار کرلیا۔ انہوں نے ان کو اذیت دی تو انہوں نے بادل نخواستہ کفریہ کلمات کہہ دیے۔ بغوی فرماتے ہیں مقاتل نے کہا ہے کہ یہ عامر بن الحضرمی کے غلام جبر کے متعلق نازل ہوئی۔ اسے آقا نے کفر پر مجبور کیا تو انہوں نے مجبوراً کفریہ کلمات کہہ دیئے(2)۔

۳ یعنی اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن تھا اور اس کے عقیدہ میں کوئی تبدیلی نہ تھی۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ ایمان کا رکن لازم تصدیق قلبی ہے۔ بغوی فرماتے ہیں جب جبر غلام آقا نے بعد میں اسلام قبول کرلیا تھا اور آقا و غلام نے مل کر مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کی تھی(3)۔

۴ اور جس کا دل کفر کے ساتھ منشرح ہو جائے اور وہ کفر کو پسند کرے تو ان پر اللہ کا غضب ہے اور ان کے لئے بڑا دردناک عذاب ہے۔ اکراہ کا مطلب کسی ایسے فعل پر مجبور کرنا جسے وہ ناپسند کرتا ہو اکراہ کی دو صورتیں ہیں (1)۔ ایسا اکراہ جس سے انسان کی رضا منتفی نہ ہوتی ہو اور اس کا اختیار فاسد نہ ہوتا ہو جیسے اکراہ بالضرب یا اکراہ بالحبس (2)۔ ایسا اکراہ جس سے انسان کا اختیار فاسد ہو جائے جیسے اکراہ بالقتل یا اکراہ بالقطع یعنی قتل کی دھمکی یا عضو کاٹنے کی دھمکی دینا۔ اکراہ کی دونوں قسموں میں شرط ہے کہ مجبور کرنے والا جس فعل کی دھمکی دے رہا ہے وہ اس کے کرنے پر قادر ہو اور مجبور شخص کو ظن غالب ہو کہ وہ ایسا کر گزرے گا۔ اکراہ کی پہلی قسم آیت میں مراد نہیں ہے اور وہ موثر نہیں ہے مگر بیع شراء اجارہ، اقرار اور وغیرہ میں موثر ہے۔ پس جیسے کسی مال کے بیچنے یا کسی شخص کے لئے ہزار کا اقرار کرنے یا گھر اجرت دینے یا اجرت لینے پر مجبور کیا جائے تو اسے اختیار ہے چاہے تو اکراہ کے زائل ہونے کے بعد عقد کو برقرار رکھے چاہے تو فسخ کردے کیونکہ یہ عقود فسخ کا احتمال رکھتی ہیں اور ان کی صحت کے لئے مانع اور مشتری کی رضا شرط ہے کیونکہ ارشاد ہے اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ اور اکراہ کی صورت میں رضا مفقود ہے۔ پس اگر وہ چاہے تو جائز قرار دے اور چاہے تو فسخ کردے۔ اگر اس نے ثمن پر خوشی سے قبضہ کرلیا تو بیع جائز ہے۔ آیت سے مراد قسم ثانی ہے۔ علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ جس کو کفر پر قتل کی دھمکی کے ذریعے مجبور کیا جائے تو وہ زبان سے وہ کلمات کہہ دے جس پر اسے مجبور کیا گیا ہے، جبکہ اس کا دل ایمان سے مطمئن ہو اور اس کی دلیل یہی آیت کریمہ ہے اور حضرت عمارؓ کا واقعہ ہے۔ پس بغیر اعتقاد کے کفریہ کلمات کا تلفظ کرنے والے پر کفر کا حکم نہیں لگایا جائے گا اور اس کی بیوی بائنہ نہ ہوگی لیکن اگر کوئی شخص کفریہ کلمات کہنے سے انکار کردے اور اپنی جان قربان کردے تو یہ افضل ہے۔ جیسا کہ حضرت عمار کے والدین نے کیا تھا۔ حضرت خبیب، زید بن دثنہ اور عبداللہ بن طارق نے ارتداد پر قتل کو اختیار کیا تھا۔ سیرت نگاروں نے سریہ رجیع میں لکھا ہے کہ خبیب جب قتل ہونے لگے تو انہوں نے دو رکعت نماز ادا فرمائی۔ امام بخاری نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے۔ حضرت خبیب پہلے شخص ہیں جنہوں نے اپنے قتل کے وقت دو رکعت نماز ادا فرمائی تھی۔ جب آپ دو رکعت نماز ادا کر چکے تو مشرکین

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 248 (العلمیہ)　2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 96 (التجاریہ)　3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 96 (التجاریہ)

نے آپ کو پھانسی کے تختہ پر کھڑا کر کے مدینہ طیبہ کی طرف متوجہ کیا اور مضبوطی سے باندھ دیا۔ پھر کہا اسلام کو چھوڑ دو ہم تجھے چھوڑ دیں گے۔ آپ نے فرمایا قسم بخدا میں اسلام کو چھوڑنا اب بھی گوارہ نہیں کرتا اور میں یہ پسند نہیں کرتا کہ مجھے زمین میں جو کچھ ہے مجھے مل جائے اور میں اسلام چھوڑ دوں کفار نے کہا کیا تم پسند کرتے ہو کہ اب تمہاری جگہ محمد ﷺ ہوتے اور تم اپنے گھر میں آرام سے بیٹھے ہوتے۔ فرمایا قسم بخدا میں تو یہ بھی پسند نہیں کرتا کہ محمد ﷺ کو کانٹا چبھے اور میں اپنے گھر میں بیٹھا ہوا ہوں، وہ کہتے رہے خبیب اسلام چھوڑ دو، اپنے آباء کے دین کی طرف لوٹ آؤ۔ مگر آپ مسلسل یہ کہتے رہے میں اسلام سے کبھی نہیں لوٹوں گا۔ کفار نے کہا اگر تم نے اسلام سے رجوع نہ کیا تو تجھے قتل کر دیں گے۔ فرمایا اللہ کی رضا کے لئے میرا قتل ہونا معمولی بات ہے۔ بخاری نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے کہ جب خبیب کو قتل کیا جانے لگا تو آپ نے یہ اشعار پڑھے تھے جن میں سے کچھ یہ ہیں (1)۔ مجھے کوئی پرواہ نہیں جب مسلمان ہو کر قتل ہو جاؤں اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے میں کسی پہلو پر گر جاؤں (2) یہ سب کچھ ذات الٰہیہ میں برداشت کر رہا ہوں۔ اگر وہ چاہے تو ایک کٹے ہوئے جسم کے اعضا میں برکت ڈال دے ابن عقبہ کہتے ہیں کہ حضرت زید اور حضرت خبیبؓ ایک دن شہید کیے گئے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کو ان وصال کے دن وعلیکما السلام فرماتے ہوئے سنا گیا۔ ابن ابی شیبہ نے حضرت حسن سے مرسلاً روایت کی ہے اور عبدالرزاق نے اپنی تفسیر میں معمر سے تفصیلاً ذکر کیا ہے کہ مسیلمہ نے دو آدمیوں کو پکڑ لیا تھا اور ایک سے اس نے پوچھا تو محمد ﷺ کے بارے میں کیا کہتا ہے۔ اس نے کہا وہ اللہ کے (سچے) رسول ہیں۔ پھر مسیلمہ نے پوچھا تو میرے بارے میں کیا کہتا ہے۔ اس نے کہا تو بھی ایسا ہی ہے۔ پھر دوسرے سے پوچھا تو محمد ﷺ کے بارے کیا کہتا ہے؟ اس نے کہا اللہ کے رسول ہیں۔ پھر پوچھا میرے متعلق کیا کہتا ہے؟ اس نے کہا میں بہرہ ہوں۔ اس نے تین مرتبہ پوچھا، اس نے جواباً یہی کہا۔ پس مسیلمہ نے اسے قتل کر دیا۔ جب یہ خبر آپ ﷺ کو پہنچی تو فرمایا پہلے نے اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ رخصت کو لیا اور دوسرے نے حق کو بلند کیا، اسے مبارک ہو۔

مسئلہ: جسے کسی مسلمان کے مال کو تلف کرنے پر مجبور کیا جائے تو اسے مال تلف کرنے کی گنجائش ہے کیونکہ غیر کا مال ضرورت کے وقت مباح ہوتا ہے جیسا کہ بھوک کی حالت میں ہوتا ہے اور مال والا مجبور کرنے والے سے ضمانت لے گا کیونکہ مکرہ (مجبور کیا گیا) اس کا آلہ تھا اور اتلاف اسی قبیل سے ہے۔

مسئلہ: جس شخص کو کسی دوسرے کے قتل کرنے پر مجبور کیا گیا ہو تو مجبور کے لئے دوسرے کو قتل کرنا حلال نہیں ہے بلکہ اس پر صبر کرنا واجب ہے حتی کہ خود قتل ہو جائے۔ اگر اس نے دوسرے کو قتل کر دیا تو وہ گناہ گار ہوگا کیونکہ مسلمان کا قتل کسی ضرورت کے لئے بھی مباح نہیں ہے۔ پس مجبوری کی صورت میں بھی مباح نہ ہوگا۔ پھر قصاص میں علماء کا اختلاف ہے کہ کیا وہ مکرہ پر ہوگا یا مکرہ پر ہوگا۔ یہاں تفصیل کی گنجائش نہیں ہے۔

مسئلہ: اگر کسی کو مردار کھانے یا شراب پینے پر مجبور کیا جائے اسے یہ امور کرنے جائز ہیں اور اس مسئلہ میں تمام علماء کا اجماع ہے۔ اس میں اختلاف ہے کہ اگر وہ صبر کرے اور مردار نہ کھائے حتی کہ اسے قتل کیا جائے تو کیا یہ اس کے لئے جائز ہے یا نہیں؟ امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں اس کے لئے مردار کو کھانا واجب ہے اور صبر کرنے کی اجازت نہیں ہے جیسا کہ اگر کسی کو مباح چیز کے کھانے پر مجبور کیا جائے تو اسے کھانا واجب ہوتا ہے۔ اگر وہ صبر کرے اور قتل ہو جائے تو وہ گنہگار ہوگا کیونکہ وہ بلا ضرورت اپنے نفس کے اتلاف میں مکرہ کا معاون بنا۔ امام ابو یوسف سے مروی ہے کہ وہ گنہگار نہیں ہوگا۔ امام شافعی کا بھی قول صحیح یہی ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ یہ رخصت

ہے مباح نہیں ہے۔ کیونکہ حرمت قائم ہے اوراس نے عزیمت پر عمل کیا۔ امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں حالت اضطرار مستثنی ہے۔

اس ارشاد سے الا ما اضطررتم الیہ اور قاعدہ یہ ہے کہ استثناء کے بعد تکلم مراد ہوتا ہے۔ پس وہ حرام نہیں ہے بلکہ یہ مباح ہے رخصت نہیں ہے۔ پس اس وقت میتہ حلال ذبح شدہ جانور کی طرح مباح ہوگا۔ لیکن غیر کا مال کھانا اس حکم میں نہیں کیونکہ اگر وہ غیر کا مال نہ کھائے حتی کہ قتل ہو جائے تو وہ بالاجماع ماجور ہوگا کیونکہ یہاں حرمت قائم ہے۔ پس ظاہر ہو گیا کہ اکراہ خطاب کو زائل نہیں کرتا تا کہ کبھی ایک حکم مباح ہو کبھی فرض ہو اور کبھی حرام ہو۔ اسی لئے امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں ہر تصرف جس کا حکم تلفظ پر مبنی ہو وہ رضا پر موقوف نہیں ہوتا ان پر حکم مرتب ہو جاتا ہے، اگر چہ مجبوراً بھی کرے اور یہ دس تصرفات ہیں۔ 1۔ نکاح، 2۔ طلاق، 3۔ رجعت، 4۔ ایلاء، 5۔ الفئی، 6۔ ظہار، 7۔ عتاق، 8۔ عفو عن القصاص، 9۔ یمین، 10۔ نذر۔ امام شعبی النخعی اور ثوری کا بھی یہ قول ہے۔ امام مالک، امام شافعی اور امام احمد فرماتے ہیں مکرہ کے تصرفات میں سے کسی چیز پر بھی حکم مرتب نہیں ہوتا اور ان کی دلیل حضرت عائشہ کی حدیث ہے، فرماتی ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے لا طلاق ولا عتاق فی اغلاق..... غلاق و جبر کی حالت میں طلاق اور آزادی واقع نہیں ہوتی(1)۔ اس حدیث کو احمد، ابوداؤد، ابن ماجہ، حاکم ابن جوزی، ابویعلی اور بیہقی نے صفیہ بنت عثمان عن شیبہ عن عائشہ کے طریق سے روایت کیا ہے اور اس حدیث کو حاکم نے صحیح کہا ہے۔ لیکن اسکی سند میں محمد بن عبید مکی ہے جسے ابوحاتم الرازی نے ضعیف کہا ہے۔ وجہ احتجاج یہ ہے کہ ابن جوزی نے لکھا ہے کہ قتیبہ فرماتے ہیں الاغلاق طلاق وعتاق پر اکراہ ہے اور یہ اغلقت الباب سے مشتق ہے گویا مکرہ پر دروازہ بند کر دیا گیا ہے۔ حتی کہ وہ فعل کرے جس پر اسے مجبور کیا گیا ہے۔ الحافظ فرماتے ہیں الخطابی اور ابن السید کا قول ہے۔ اس پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اغلاق کی تفسیر میں اختلاف ہے۔ اغلاق کا یہ معنی بھی ہے جو ابن جوزی نے ذکر کیا ہے۔ بعض فرماتے ہیں اغلاق کا معنی جنون ہے کیونکہ مجنون کو چھپایا گیا ہوتا ہے۔ گویا اس پر دروازہ بند کیا گیا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اغلاق کا معنی غضب ہے۔ سنن ابی داؤد میں اسی معنی میں آیا ہے اور امام احمد نے اغلاق کی تفسیر غضب سے کی ہے لیکن غضب کے ساتھ اغلاق کی تفسیر پسندیدہ نہیں ہے۔ ابن السید نے اس کا رد کیا ہے، وہ فرماتے ہیں، اگر اس کا معنی غضب کیا جائے تو کسی پر طلاق واقع ہی نہ ہوگی کیونکہ ہر شخص غصہ میں طلاق دیتا ہے۔ امام مالکؒ، شافعیؒ اور امام احمدؒ کی دوسری دلیل حضرت الحسن کی حدیث ہے، نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم سے خطا نسیان اور جو تم مجبور ہو کر کرو معاف کر دیا ہے(2)۔ اس حدیث کو ابن جوزی نے روایت کیا ہے۔ اس حدیث سے اس مسئلہ میں حجت پکڑنا جائز نہیں ہے کیونکہ یہ تو فقط دلیل ہے کہ جو گناہ مجبور ہو کر کیا جائے، وہ معاف ہے۔ اس میں یہ تو کوئی دلیل نہیں ہے کہ جو مکرہا کوئی فعل کرے گا اس پر احکام دنیویہ بھی مرتب ہوں گے۔

طبرانی کی حدیث سے بھی حجت پیش کی جاتی ہے جو حضرت ثوبان سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت سے خطا، نسیان اور جس پر وہ مجبور ہوں، کا مؤاخذہ اٹھا لیا گیا ہے(3) اسی طرح ابوالدرداء سے بھی حدیث مروی ہے۔ الحافظ فرماتے ہیں ان دونوں احادیث کی اسناد میں ضعف ہے۔ ابن ماجہ ابن حبان، دار قطنی، طبرانی، بیہقی اور حاکم نے مستدرک میں اوزاعی کی حدیث روایت کی ہے۔ بعض علماء نے اوزاعی عن عطاء عن عبید بن عمیر عن ابن عباس سے روایت کی ہے۔ ولید بن مسلم نے اوزاعی سے روایت کی ہے اور عبید بن عمیر کا ذکر نہیں کیا ہے۔ ولید کی دو اور سندیں بھی ہیں، عن محمد بن المصفی عنہ عن مالک عن نافع عن ابن عمر

1۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 148 (وزارت تعلیم)

2۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 148 (وزارت تعلیم)

3۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 148 (وزارت تعلیم)

عن ابن لہیعہ عن موسیٰ بن داؤد عن عقبہ بن عامر ابن ابی حاتم فرماتے ہیں میں نے اپنے باپ سے ان احادیث کے متعلق پوچھا تو انہوں نے فرمایا یہ احادیث منکر ہیں، گویا موضوع ہیں۔ عبداللہ بن احمد نے فرمایا میں نے اپنے باپ سے اس کے متعلق سنا تو انہوں نے انتہائی انکار فرمایا۔ اس حدیث کو ابن ماجہ نے ابوذر سے روایت کیا ہے اور اس کی سند میں شہر بن حوشب ہیں اور اس کے علاوہ سند میں انقطاع بھی ہے۔ اگر یہ حدیث صحیح بھی ہو تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث اپنے ظاہری معنی پر محمول نہیں ہے کیونکہ خطا اور نسیان کے رفع کا کوئی معنی نہیں کیونکہ جو فعل بھی خطایا نسیاناً سرزد ہو تو وہ یقیناً واقع ہوتا ہے۔ پس رفع عن امتی کا معنی یہ ہوگا کہ میری امت سے خطا او رنسیان کا گناہ اٹھالیا گیا ہے اور اس حکم کی تقدیر پر جائز نہیں جو دنیا وآخرت کے احکام کو شامل ہے کیونکہ مقتضی کے لئے عموم نہیں ہوتا ہے۔ پس مراد یا تو احکام دنیا ہوں گے یا آخرت کا حکم اور آخرت کے حکم پر اجماع ہے اور وہ مؤاخذہ کا اٹھالینا ہے، اس کے ساتھ کوئی دوسرا معنی مراد نہیں ہے اور نہ عموم ہوگا۔ ابن ہمام نے اسی طرح وضاحت کی ہے۔

ابن جوزی نے اس مروی سے بھی حجت پکڑی ہے کہ ایک شخص حضرت عمرؓ کے دور حکومت میں ایک بلند جگہ پر بیٹھا تھا کہ اس بیوی اس کے اوپر پہاڑ پر چڑھ کر بیٹھ گئی اور کہا مجھے تین طلاقیں دیں ورنہ میں اوپر سے پتھر تیرے اوپر لڑھکا دوں گی۔ خاوند نے اسے اللہ اور اسلام کا واسطہ دیا مگر وہ نہ مانی اس نے تین طلاقیں دے دیں تو وہ حضرت عمرؓ کے پاس آیا اور اپنا ماجرا بیان کیا۔ حضرت عمر نے فرمایا اپنے اہل کی طرف لوٹ جا یہ طلاق نہیں ہے۔

امام ابوحنیفہؒ نے اپنے مسلک پر کئی احادیث سے حجت پکڑی ہے۔

(1) حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تین چیزوں میں سنجیدگی تو سنجیدگی ہی ہے لیکن ان میں مذاق بھی سنجیدگی ہی متصور ہوگی۔ (1) نکاح (2) طلاق (3) رجعۃ (1)۔ اس حدیث کو ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، احمد، حاکم اور دارقطنی نے روایت کیا ہے۔ امام ترمذی نے فرمایا یہ حدیث حسن ہے حاکم نے فرمایا یہ صحیح ہے۔ ابن جوزی کہتے ہیں اس کی سند میں عطاء بن عجلان ہے جو متروک الحدیث ہے۔ ابن حجر فرماتے ہیں یہ ابن جوزی کو وہم ہوا ہے کیونکہ یہ راوی عطاء بن عجلان نہیں بلکہ اس سند میں عطاء بن ابی رباح ہے۔ ابوداؤد اور حاکم کی سند میں اس کی صراحت ہے لیکن عبدالرحمٰن بن حبیب میں علماء کا اختلاف ہے۔ نسائی کہتے ہیں یہ منکر الحدیث ہے اور دوسرے محدثین نے اسے ثقہ کہا ہے۔ پس اس صورت میں یہ حدیث حسن ہوگی۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ اکراہ اس اختیار کے ساتھ جمع نہیں ہوتا جو تصرف شرعی کے لئے معتبر ہے، جبکہ مزاح کرنے والا طلاق کی کلام کرنے میں مختار ہوتا ہے، اگرچہ طلاق کے حکم پر راضی نہیں ہوتا۔ پس اس کی طلاق تو واقع ہو جائے گی لیکن اس حدیث سے مکرہ کی طلاق کا استدلال کیسے ہوسکتا ہے جبکہ اسے کوئی اختیار ہی نہیں ہوتا۔

جواباً ہم کہیں گے کہ مکرہ بھی کلام کرنے میں کامل اختیار رکھتا ہے مگر وہ بھی اس کے حکم پر راضی نہیں ہوتا کیونکہ اس کے سامنے دو شر تھے۔ اس سے اھون کو اس نے آسان کو اختیار کیا۔ اسے اس کے اختیار پر محمول کیا جائے گا۔ ابن ہمام فرماتے ہیں اس کے اختیار پر محمول ہونے کی وجہ سے حکم کی نفی کا کوئی اثر نہ ہوگا۔ ہماری اس بات پر حضرت حذیفہ اور ان کے والد کی حدیث بھی دلالت کرتی ہے جب ان سے مشرکوں نے قسم اٹھائی تو آپ ﷺ نے ان دونوں کو فرمایا ہم کفار کے عہد کو پورا کریں گے اور ان کے خلاف اللہ تعالیٰ

1۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 142 (وزارت تعلیم)

سے مدد طلب کریں گے تو آپ ﷺ نے واضح فرمادیا کہ قسم طوعاً کرھاً برابر ہے۔ پس ثابت ہو گیا کہ اس حکم کی نفی میں اکراہ کو کوئی دخل نہیں جو حکم صرف اختیاری تلفظ کے متعلق ہوتا ہے۔ بخلاف بیع کے کیونکہ اس کا حکم لفظاً اور جو فعل اس کے قائم مقام ہو سے متعلق ہوتا ہے بشرطیکہ رضا بھی ہو اور اکراہ کی صورت میں رضا منتفی ہوتی ہے۔ امام ابوحنیفہ کی ایک دوسری دلیل حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ حدیث بھی ہے، فرمایا ہر طلاق جائز ہے مگر پاگل مغلوب العقل کی طلاق واقع نہیں ہوئی۔ اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے (1)۔ امام ترمذی فرماتے ہیں یہ حدیث ہمیں عکرمہ بن خالد عن ابی ہریرہ کی سند سے پہنچی ہے لیکن عطاء بن عجلان عن عکرمہ بن خالد کی روایت قابل حجت نہیں ہے کیونکہ عطاء ضعیف ہے اور ذاہب الحدیث ہے۔ صفوان بن الاصم کی حدیث ہے کہ ایک شخص اپنی بیوی کے ساتھ سویا ہوا تھا اور اٹھی چھری لی اور اپنے خاوند کے سینے پر چڑھ گئی اور چھری اس کے حلق پر رکھ کر کہا مجھے طلاق دو ورنہ میں تجھے قتل کر دوں گی۔ خاوند نے اسے خدا کا واسطہ دیا لیکن وہ نہ مانی خاوند نے اسے تین طلاقیں دے دیں۔ اس نے یہ واقعہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے بیان کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا طلاق میں رجوع نہیں ہے۔ ابن جوزی کہتے ہیں امام بخاری نے فرمایا صفوان بن اصم نے ایک صحابی سے جو عکرمہ کے بارے میں روایت کی ہے وہ منکر حدیث ہے۔ ابن ہمام نے ذکر کیا ہے کہ حضرت عمر سے مروی ہے کہ فرمایا چار چیزیں مبہم اور مشکل ہیں ان کا رد نہیں ہو سکتا ہے۔ (1) نکاح (2) طلاق (3) عتاق (4) صدقہ۔

میں کہتا ہوں ظاہر یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ کی حجت راجح ہے۔ اگر ہم احادیث میں تعارض تسلیم کریں تو قیاس کی طرف رجوع کرنا ہو گا اور قیاس ان چیزوں کے وقوع کا تقاضا کرتا ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۝

"اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے پسند کر لیا دنیا کی (فانی) زندگی کو آخرت کی (ابدی) زندگی پر اور بیشک اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا اس قوم کو جو کافر ہے ل۔"

ل۔ ایمان یا وعید کے بعد کفر کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے ترجیح دی دنیوی زندگی کو آخرت کی ابدی زندگی پر اور اللہ تعالیٰ کافر قوم کو ایسے علم کی طرف راہنمائی نہیں فرماتا جو انہیں ایمان پر ثابت و قائم رکھنے کا موجب بنے اور جو ٹیڑھے پن سے انہیں محفوظ رکھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے کفر اور عذاب کے دو سبب ذکر فرمائے ہیں۔ ایک سبب ظاہری اور وہ ان کا کفر کو اختیار کرنا اور آیات میں غور وفکر نہ کرنا ہے، دوسرا سبب حقیقی اور وہ اللہ تعالیٰ کا ان کی ہدایت کا ارادہ نہ فرمانا ہے۔ آیت کریمہ دلیل ہے کہ بندوں کے افعال جبر و قدر کے درمیان ہیں۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ۝

"یہ وہ لوگ ہیں مہر لگا دی ہے اللہ تعالیٰ نے جن کے دلوں، جن کے کانوں اور جن کی آنکھوں پر ل اور یہی لوگ (اپنے اعمال کے نتائج سے) غافل ہیں ع۔"

ل۔ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے دلوں پر مہر لگا دی ہے۔ پس وہ حق کا ادراک نہیں کر پاتے اور کانوں پر بھی مہر لگا دی ہے اس لئے وہ قبولیت کے ساتھ سننے کی صلاحیت نہیں رکھتے اور ان کی آنکھوں پر مہر لگا دی ہے۔ پس وہ عبرت کی نگاہ سے آیات کو نہیں دیکھتے۔

۲ یہی لوگ مکمل غافل ہیں کیونکہ یہ اپنے خالق سے ہی غافل ہیں، جبکہ اپنے خالق سے تو چوپائے اور جمادات بھی غافل نہیں ہیں۔

لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۰۹﴾

"ضرور یہی لوگ آخرت میں نقصان اٹھانے والے ہیں[1]"

[1] کیوں کہ انہوں نے اپنی عمروں کو ضائع کیا اور انہیں ان کاموں میں صرف کیا جو انہیں ابدی عذاب تک لے گئے اور کوئی ایسا عمل نہ کیا جو انہیں عذاب سے نجات دیتا اور انہیں فلاح تک پہنچاتا۔ لیکن نافرمان مومنین کا حکم ان کے خلاف ہے۔ انہوں نے بھی اگرچہ اپنی عمریں شھوات و معاصی میں ضائع کیں لیکن انہوں نے توحید کا دامن نہ چھوڑا حتی کہ اسی توحید کے بل بوتے وہ عذاب سے نجات پاکر جنت میں پہنچ جائیں گے۔

ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا ثُمَّ جٰهَدُوْا وَصَبَرُوْٓا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۰﴾

"پھر بیشک آپ کے پروردگار کا معاملہ ان کے ساتھ جنہوں نے ہجرت کی بڑی آزمائشوں سے گزرنے کے بعد[1] پھر جہاد بھی کیا اور (مصائب میں) صبر سے کام لیا[2] بیشک آپ کا رب ان آزمائشوں کے بعد (ان کے لئے) بڑا بخشنے والا بہت رحم فرمانے والا ہے[3]"

[1] عام قراء نے فُتِنُوْا کو مجہول کا صیغہ پڑھا ہے، یعنی اسلام سے روکے گئے اور تکالیف میں مبتلا کئے گئے۔ ثم ان کی حالت ان کی حالت سے بالکل مختلف ہونے پر دلالت کرنے کے لئے ہے۔ ابن سعد نے طبقات میں عمر بن حاکم سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں عمار بن یاسر کو ایسی اذیتیں دی جاتی تھیں کہ آپ کو معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ یہی کیفیت حضرت بلال، حضرت صہیب اور حضرت ابو فکیہہ کی تھی ان کے علاوہ چند مسلمان جن کو ایسی تکلیفوں میں مبتلا کیا گیا کہ انہیں کچھ بجھائی ہی نہیں دیتا تھا انہی لوگوں کے حق میں یہ آیت نازل ہوئی۔ امام بغوی فرماتے ہیں یہ آیت کریمہ ابوجہل کے رضاعی بھائی عیاش بن ابی ربیعہ، ابوجندل بن سہیل بن عمرو، ولید بن ولید بن مغیرہ سلمہ بن ہشام اور عبیداللہ ابن اسید الثقفی کے بارے میں نازل ہوئی۔ مشرکوں نے انہیں آزمائش میں ڈالا تو انہوں نے مشرکوں کو وہ سب کچھ دیا جو وہ چاہتے تھے تاکہ وہ ان کے شر سے بچ جائیں (1) اور پھر انہوں نے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کی۔

[2] پھر انہوں نے نبی کریم ﷺ کی معیت میں کفار سے جہاد کیا اور ایمان، طاعات، جہاد تکالیف پر صبر کرتے رہے اور گناہوں سے مجتنب رہے۔ حضرت الحسن اور عکرمہ فرماتے ہیں یہ آیت عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کے بارے میں نازل ہوئی۔ وہ نبی کریم ﷺ کے کاتب تھے۔ شیطان نے ان کو پھسلا دیا تو وہ کفار سے مل گئے۔ نبی کریم ﷺ نے فتح مکہ کے دن اسے قتل کرنے کا حکم فرمایا حضرت عثمان نے اس کے لئے پناہ طلب کی اور یہ حضرت عثمان کا اخیافی بھائی تھا۔ پس رسول اللہ ﷺ نے ان کو پناہ دے دی۔ پھر وہ دوبارہ مسلمان ہو گیا اور اب اسلام کی حالت بہت عمدہ رہی۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (2)۔ ابن عامر نے فَتَنُوْا کو معروف کا صیغہ پڑھا ہے، یعنی کفر اختیار کرنے اور مومنین کو تکلیف دینے کے بعد انہوں نے ہجرت کی۔ اس صورت میں اس آیت کا نزول

عامر الحضرمی کے حق میں ہوگا جس نے اپنے غلام جبر کو مجبور کیا تھا اور اسے انتہائی تکلیف دی حتی کہ اس غلام نے بظاہر ارتداد کیا۔ پھر عامر خود مسلمان ہو گیا اور اس کا اسلام خوب اور عمدہ تھا۔ جبر نے بھی دوبارہ اسلام کا اظہار کیا کیونکہ ان کا ارتداد اکراہ کی وجہ سے تھا۔ پھر دونوں نے مل کر ہجرت کی پھر دونوں نے نبی کریم ﷺ کی معیت میں کفار سے جہاد کیا اور ہر مشکل پر صبر کرتے رہے۔

ے یعنی ہجرت، جہاد اور صبر کے بعد تمہارا رب پچھلے گناہوں کو بخشنے والا ہے اور اس کے بعد دنیا و آخرت میں ان کے اعمال کے مطابق ان پر انعام فرمانے والا ہے۔ پہلے ان کی خبر محذوف ہے جس پر دوسرے ان کی خبر دلالت کر رہی ہے۔ یا یہ کہا جائے گا کہ ان ربک من بعدھا ماسبق کی تاکید لفظی ہے۔

يَوْمَ تَأْتِي كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا وَتُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

''اس دن کو یاد کرو جب آئے گا ہر نفس [1] جھگڑا کرتا ہوا صرف اپنے متعلق [2] اور پورا پورا بدلہ دیا جائے گا ہر نفس کو جو اس نے کیا ہوگا اور ان پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا [3]''

ل یوم حیم یا اذکر محذوف کی وجہ سے منصوب ہے۔

ع یعنی ہر نفس کو اپنی خلاصی کی فکر دامن گیر ہوگی اور چھٹکارے کے لئے کوشاں ہوگا، کسی دوسرے کا کچھ خیال نہ ہوگا، کافر کہیں گا اے ہمارے رب انہوں نے ہمیں گمراہ کیا، اے ہمارے رب ہم نے اپنے بڑوں اور سرداروں کی اطاعت کی۔ اللہ کی قسم ہم مشرک نہ تھے ہمیں دوبارہ دنیا میں پلٹا دے ہم نیک عمل کریں گے۔ مومن کہے گا اے میرے رب تجھ سے اپنے نفس کی امان کا سوال کرتا ہوں مجھے ظالم قوم کے ساتھ شامل نہ کرنا۔ ابن جریر نے اپنی تفسیر میں حضرت معاذ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا قیامت کے روز جہنم کو کہاں سے لایا جائے گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا ساتویں زمین سے لایا جائے گا۔ اس کی ہزار لگام ہوں گی اور ہر لگام کو ستر ہزار فرشتے کھینچ رہے ہوں گے۔ جب بندوں سے ہزار سال کی مسافت پر ہوگی تو وہ ایک سانس لے گی۔ جس کی وجہ سے ہر نبی رسل اور مقرب فرشتہ گھٹنوں کے بل بیٹھ جائے گا اور عرض کرے گا اے میرے پروردگار مجھے بچالے۔ امام بغوی فرماتے ہیں روایت ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب نے کعب الاحبار کو فرمایا ہمیں (قیامت کی ہولنا کیوں) سے ڈرایئے تو کعب نے فرمایا اے امیر المومنین قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اگر آپ ستر انبیاء کرام کے عمل کی مثل لے کر بھی قیامت کو پائیں گے تو قیامت ایسے حالات تجھ پر لائے گی کہ تجھے اپنے سوا سب بھول جائیں گے۔ جہنم ایک سانس لے گی جس کی وجہ سے ہر مقرب فرشتہ اور منتخب نبی گھٹنوں کے اوپر بیٹھ جائے گا حتی کہ ابراہیم خلیل الرحمن بھی عرض کریں گے اے میرے رب میں تجھ سے صرف اپنے نفس کا سوال کرتا ہوں۔ اس کی تصدیق اس آیت میں ہے جو تم پر نازل کی گئی ہے يَوْمَ تَأْتِي كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا

حضرت عکرمہ حضرت ابن عباس سے اس آیت کے بارے میں فرماتے ہیں قیامت کے روز آپس میں جھگڑتے رہیں گے حتی کہ روح جسم سے جھگڑے گی روح عرض کرے گی اے میرے رب میرا کوئی ہاتھ نہیں تھا جس کے ساتھ میں پکڑتی، نہ پاؤں تھا جس کے ساتھ چلتی، نہ آنکھ تھی جس کے ساتھ میں دیکھتی (یہ سب کچھ بدن کا کیا ہوا ہے)۔ جسم کہے گا تو نے مجھے لکڑی کی طرح پیدا کیا تھا۔ میرے نہ ہاتھ تھے جن کے ساتھ پکڑتا، نہ پاؤں تھے جن کے ساتھ میں چلتا، نہ آنکھیں تھیں جن کے ساتھ دیکھتا۔ پس یہ روح نور کی شعاع کی طرح میرے اندر آئی تو اس کی وجہ سے میری زبان بولنے لگی۔ میری آنکھیں دیکھنے لگیں اور میرے پاؤں چلنے لگے۔ فرمایا

اللہ تعالیٰ نے روح اور جسم کی مثال ایک اندھے اور اپاہج سے بیان فرمائی ہے۔ دونوں ایک باغ میں داخل ہوئے جس میں پھل لگے ہوئے تھے۔ اندھا پھلوں کو دیکھ نہیں سکتا تھا اور اپاہج پھلوں تک پہنچ نہیں سکتا تھا تو اندھے نے اپاہج کو اپنے اوپر اٹھایا۔ پس دونوں پھلوں تک پہنچ گئے اور دونوں عذاب کے مستحق ہو گئے (1)۔ نفسھا میں نفس کو نفس کی طرف مضاف کیا گیا ہے کیونکہ شی کے عین اور ذات کو اس کا نفس کہا جاتا ہے اور شی کی نقیض کو اس کا غیر کہا جاتا ہے۔ گویا یوں فرمایا یَوْمَ تُجَادِلُ کُلُّ اَحَدٍ عَنْ ذَاتِہٖ

۳ ہر نفس کو پوری پوری جزاء ملے گی اس عمل کی جو اس نے کیا ہو گا اور ان کے اجروں میں ذرہ برابر کمی نہ ہو گی۔

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَىِٕنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿۱۱۲﴾

”اور بیان فرمائی ہے اللہ تعالیٰ نے ایک مثال وہ یہ کہ ایک بستی تھی ۱؎ جو امن ۲؎ (اور) چین سے (آباد) تھی ۳؎ آتا تھا اس کے پاس اس کا رزق بکثرت ہر طرف سے ۴؎ اس (کے باشندوں) نے ناشکری کی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ۵؎ پس چکھایا انہیں اللہ تعالیٰ نے (یہ عذاب کہ پہنا دیا انہیں) بھوک اور خوف کا لباس ۶؎ ان کارستانیوں کے باعث جو وہ کیا کرتے تھے ۷؎“

۱؎ یعنی اللہ تعالیٰ نے ایک گاؤں کا بطور مثال ذکر فرمایا جس کے باشندوں پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا لیکن وہ مغرور ہو گئے اور کفر اختیار کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی ناشکری اور نافرمانی کی وجہ سے اپنا عذاب نازل فرمایا۔ یہ بھی جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مخصوص بستی کا ذکر فرمایا ہو جو مذکورہ صفات سے مزین تھی۔ یا یہ پہلے لوگوں کی بستیوں میں سے کوئی بستی ہے جو ان صفات سے موصوف تھی۔ اللہ تعالیٰ نے مکہ کے لئے اس کی مثال بیان فرمائی اس کے برے انجام سے ڈرانے کے لئے۔ امام بغوی فرماتے ہیں قریۃ سے مراد مکہ مکرمہ ہے(2)۔ اس صورت میں معنی یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ نے مکہ مکرمہ کو ایسی حالت میں کر دیا جو دوسری بستیوں کے لئے باعث عبرت ہے۔

۲؎ اس کے اہل کو نہ ڈرایا جاتا تھا اور نہ ان پر حملہ کیا جاتا تھا۔

۳؎ جو اپنے باسیوں کے ساتھ آباد تھی وہ تنگی اور خوف کی وجہ سے نقل مکانی کے محتاج نہیں تھے۔ جیسا کہ تمام عرب مکہ مکرمہ کی طرف آتے تھے۔

۴؎ یعنی اس کی خوراک پہنچتی تھی بڑے وسیع پیمانہ پر اور ہر علاقہ سے آتی ہے۔ خواہ وہ سمندری ہے یا بری۔

۵؎ لیکن بستی والوں نے کفر کیا اللہ کی نعمتوں کا انعم نعمۃ کی جمع ہے اور اس کی تا کو شمار نہیں کیا گیا۔ جیسے درع وادرع یا یہ نعم کی جمع ہے جیسے بوس جمع ابؤس۔

۶؎ پس اللہ تعالیٰ نے بستی والوں کو چکھایا بھوک اور خوف کا لباس۔ یہاں ذوق کو ضرر کے اثر کے ادراک کے لئے استعارۃً استعمال فرمایا اور لباس سے مراد بھوک اور خوف کا اثر ہے جیسے کمزوری، رنگ کا بدلنا، مستعار علیہ کے اعتبار سے اذاق کا لفظ استعمال فرمایا۔

۷؎ امام بغوی فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے اہل مکہ کو سات سال قحط میں مبتلا فرمایا۔ رسول اللہ ﷺ کے حکم سے عربوں نے اہل مکہ کو کھانے پینے کا سامان بھیجنا بند کر دیا حتی کہ اہل مکہ گلی سڑی ہڈیاں مردار، مرے ہوئے کتے اور خون اور اونٹ کے بال سے پکا ہوا اسواد

کھانے پر مجبور ہو گئے حتیٰ کہ ان میں سے کوئی آسمان کی طرف دیکھتا تو بھوک کی وجہ سے دھواں کی شکل دکھائی دیتا تھا۔ پھر روسائے مکہ نے رسول اللہ ﷺ سے کہا آپ کی دشمنی مردوں سے ہے، ان عورتوں اور بچوں سے تو نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو سامان بھیجنے کی اجازت مرحمت فرمادی۔ یہ لوگ ابھی مشرک تھے (1)۔ میں کہتا ہوں یہ سورت مکی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اہل مکہ کو بھوک کا مزہ چکھایا جب سات سات قحط میں مبتلا کئے گئے اور خوف سے دوچار کیا۔ ہجرت کے بعد رسول اللہ ﷺ کے فوجی دستوں کے حملوں کے ساتھ۔ پھر یا تو ان آیات کو مدنی ماننا پڑے گا یا پہلی توجیہ مراد ہوگی یعنی قریہ سے مراد مکہ کے علاوہ کوئی دوسرا شہر ہے جس کی اللہ تعالیٰ نے مثال بیان فرمائی تا کہ اہل مکہ کو اس شہر والوں کے انجام سے ڈرایا جائے جب اہل مکہ نے اللہ تعالیٰ کی مثال سے عبرت حاصل نہ کی تو اللہ تعالیٰ نے اہل مکہ کو اس بستی والوں کی سزا کی مثل سزا دی۔

وَلَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْهُمْ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

"اور آیا ان کے پاس رسول انہی میں سے 1؎ پس انہوں نے اسے جھٹلایا پھر پکڑ لیا انہیں عذاب نے اس حال میں کہ وہ ظلم ستم کیا کرتے تھے 2؎"

1؎ رسول سے مراد محمد ﷺ کی ذات گرامی ہے اور ہم ضمیر اہل مکہ کے لئے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دوبارہ اہل مکہ کا ذکر فرمایا ان کے ہم مثل سرکشوں کے ذکر کے بعد۔

2؎ انہوں نے رسول مکرم کو جھٹلایا تو عذاب نے انہیں آلیا در آں حالیکہ وہ ظلم کر رہے تھے۔ عذاب سے مراد شدید قحط ہے یا واقعہ بدر ہے۔ یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ اس کا نزول ہجرت کے بعد تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ کا قول کفرت کے فاعل سے حال ہونے کی بناء پر محل نصب میں ہو یا اس قریہ کی حالت بیان کے لئے جملہ مستانفہ ہو جس کی اللہ تعالیٰ نے مثال بیان فرمائی ہے۔ رسول سے مراد وہ رسول ہے جو اس قریہ کی طرف مبعوث کیا گیا تھا۔

فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۪ وَّاشْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۱۴﴾

"پس کھاؤ 1؎ اس سے جو رزق دیا تمہیں اللہ تعالیٰ نے جو حلال (اور) طیب ہے اور شکر کرو اللہ تعالیٰ کی نعمت کا 2؎ اگر تم اس کی عبادت کرتے ہو 3؎"

1؎ یہ مومنین کو خطاب ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے کفر کی تاریکیوں سے نجات دی اور محمد ﷺ پر ایمان لانے کی ہدایت عطا فرمائی۔

2؎ یعنی محمد ﷺ کی نبوت اور دنیوی نعمتوں کا شکر ادا کرو۔

3؎ اگر تم صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہو تو اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ چیزوں کو کھاؤ اور اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں کا شکر بجا لاؤ۔ یہ حکم زجر و توبیخ کرنے، تمثیل بیان کرنے اور اُن کی قوم کے کفار پر عذاب (قحط) نازل کرنے کے بعد فرمایا ہے تا کہ وہ زمانہ جاہلیت کی بدکاریوں اور عقائد فاسدہ سے باز آ جائیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں جن لوگوں کو حلال رزق کھانے اور نعمتوں کا شکر کرنے کے امر کے ساتھ خطاب کیا گیا تھا اس کے بعد کہ انہیں کفر سے زجر و بیخ کی گئی تھی۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم اپنے گمان کے مطابق اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہو۔ کفار کا یہ خیال تھا کہ ہم عبادت تو صرف اللہ تعالیٰ کی کرتے ہیں اور ہمارے یہ بت اللہ تعالیٰ کی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 98 (التجاریہ)

بارگاہ میں ہمارے سفارشی ہیں۔

إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ ۖ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿١١٥﴾

"اس نے تم پر حرام کیا ہے صرف مردار، خون، خنزیر کا گوشت اور وہ جس پر بلند کیا گیا ہو غیر اللہ کا نام ذبح کے وقت پس جو مجبور ہو جائے (ان کے کھانے پر بشرطیکہ) وہ لذت کا جویا نہ ہو اور نہ حد سے بڑھنے والا ہو (تو کوئی حرج نہیں) بیشک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔"

وَلَا تَقُولُوا لِمَا تَصِفُ أَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هَٰذَا حَلَالٌ وَهَٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوا عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ ۚ إِنَّ الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُونَ ﴿١١٦﴾

"اور نہ بولو جھوٹ جن کے بارے میں تمہاری زبانیں بیان کرتی ہیں (یہ کہتے ہوئے) کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے [1] اس طرح تم افترا باندھو گے اللہ تعالیٰ پر جھوٹا [2] بیشک جو لوگ اللہ تعالیٰ پر جھوٹے بہتان تراشتے ہیں وہ کبھی کامیاب نہیں ہوتے [3]"

[1] کفار کہتے کہ جوان چوپاؤں کے پیٹوں میں ہیں وہ خالص ہمارے مردوں کے لئے ہیں اور کہتے کہ بحائر سوائب حرام ہیں۔ سیاق کلام سے جو حصر مستفاد ہے اور انما کے لفظ کے ساتھ جملہ کا صدور یہ حصر اضافی ہے، یعنی جن چیزوں کو کفار نے از خود حرام کیا تھا ان کی نسبت سے اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیزوں کو بیان کیا گیا ہے۔ ان چیزوں کی حرمت کا بیان نہیں ہے جن کی حرمت احادیث طیبہ سے ثابت ہے۔ ہم نے سورۂ مائدہ میں اس بحث کو تفصیل سے لکھا ہے۔ الکذب منصوب ہے اور اس کا عامل لَا تَقُوْلُوْا ہے یعنی جھوٹ نہ بولو جن کے بارے میں تمہاری زبانیں بیان کرتی ہیں کہ فلاں جانور حلال فلاں حرام ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی حرمت وحلت کی علت بیان نہ ہو۔

هٰذَا حَلٰلٌ وَّ هٰذَا حَرَامٌ یہ الکذب سے بدل ہے یا تصف کے متعلق ہے اور ما مصدریہ ہے، یعنی اپنی زبانوں کے قول کی وجہ سے کسی چیز کو حلال یا حرام نہ کہو۔ تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ فرمایا یہ ان کی کلام میں جھوٹ کی زیادتی بیان کرنے کے لئے ہے، گویا جھوٹ کی حقیقت مجہول تھی جسے ان کی زبانوں نے بیان کیا ہے اور ان کے کلام کے لئے اس کا تعارف ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کو فصیح کلام میں سے شمار کیا گیا ہے جیسے عرب کہتے ہیں اس کا چہرہ جمال کو بیان کرتا ہے اور اس کی آنکھ جادو کو بیان کرتی ہے۔

[2] تاکہ وہ جھوٹ تراشیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ حرام قرار دیا ہے۔ لام تعلیل کے لئے ہے غرض کو متضمن نہیں ہے۔

[3] بیشک جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹے بہتان تراشتے ہیں وہ کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔

مَتَاعٌ قَلِيلٌ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿١١٧﴾

"(وہ) تھوڑا سا فائدہ اٹھالیں [1] (انجام کار) ان کے لئے دردناک عذاب ہے [2]"

[1] یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے، یعنی یہ جس میں مگن ہیں قلیل منفعت ہے جو قریب ہی ختم ہونے والی ہے جس کے لئے یہ افتراء باندھ

رہے ہیں یا یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے، یعنی ان کے لئے دنیا میں قلیل ساز و سامان ہے۔

۲ اور آخرت میں اسی افتراء کی وجہ سے ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔

وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا مَا قَصَصْنَا عَلَيْكَ مِن قَبْلُ ۖ وَمَا ظَلَمْنَاهُمْ وَلَٰكِن كَانُوا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿١١٨﴾

"اور یہودیوں پر ہم نے حرام کر دیں وہ چیزیں جن کا ذکر ہم آپ سے پہلے کر چکے ہیں ۱ اور ہم نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود ہی اپنے آپ پر ظلم کیا کرتے تھے ۲"

۱ یعنی ہم سورۂ انعام میں عَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِي ظُفُرٍ کے قول کے ساتھ ہم نے حرام کردہ چیزیں یہود پر بیان کر دی ہیں من قبل قصصنا یا حرمنا کے متعلق ہے۔

۲ بعض پاک و حلال چیزوں کو حرام کرنے کے ساتھ ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ جو حد سے تجاوز کر کے اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں پس انہیں اپنی تحریم کی سزا دی گئی۔ اس آیت میں تنبیہ ہے کہ حرمت کبھی تو کسی فعل میں موجود مضرت و نقصان کی وجہ سے ہوتی ہے اور کبھی سزا کی وجہ سے ہوتی ہے۔

ثُمَّ إِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِينَ عَمِلُوا السُّوءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابُوا مِن بَعْدِ ذَٰلِكَ وَأَصْلَحُوا إِنَّ رَبَّكَ مِن بَعْدِهَا لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿١١٩﴾

"پھر بیشک آپ کا رب ان کے لئے جنہوں نے غلطی کی (لیکن) نادانی سے ۱ پھر انہوں نے توبہ کر لی اس کے بعد اور اپنے آپ کو سنوار لیا ۲ بیشک آپ کا پروردگار اس کے بعد (ان کے گناہوں کو) بہت بخشنے والا (اور ان پر) نہایت رحم کرنے والا ہے ۳"

۱ یعنی جنہوں نے نادانی کے سبب غلطی کی یا یہ معنی کہ جو غلطی کے ساتھ متلبس ہو کر یعنی جہالت کی حالت میں یہ اللہ تعالیٰ اور اس کے عذاب کو نہ جاننے کو شامل ہو جائے اور انہوں نے غلبہ شہوت کی وجہ سے انجام میں غور نہ کرتے ہوئے غلطی کی سوء کفر اور معاصی دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

۲ توبہ کی اور اعمال کی اصلاح۔

۳ توبہ کرنے کے بعد تمہارا رب ان کے گناہوں پر پردہ ڈالنے والا ہے اور توبہ کرنے اور رجوع کرنے والے کو ثواب عطا کرنے والا ہے۔

إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِّلَّهِ حَنِيفًا وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿١٢٠﴾

"بلاشبہ ابراہیم ایک مرد کامل تھے ۱ اللہ تعالیٰ کے مطیع تھے ۲ یکسوئی سے حق کی طرف مائل تھے ۳ اور وہ (بالکل) مشرکوں سے نہ تھے ۴"

۱ قاموس میں امت کے کئی معانی ذکر کئے گئے ہیں۔ 1۔ وہ انسان جو تمام خوبیوں کا جامع ہو، 2۔ امام و پیشوا، 3۔ [illegible]

قائم، 4۔ جو تمام دینوں کا مخالف اور دین حق پر قائم ہو، 5۔ نشاط، 6۔ اطاعت، 7۔ عالم۔ ان کے علاوہ بھی کئی ہیں۔ میں نے مقام کی مناسب سے یہ چند ذکر کئے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اتنے بے شمار خصائل و اوصاف کے جامع تھے جتنے کثیر افراد میں بھی نہیں پائے جاتے، اللہ تعالیٰ نے ان کو امامت و پیشوائی کی عزت سے بھی نوازا، تھا وہ تمام ادیان کی مخالفت کرتے ہوئے اکیلے دین حق پر ایمان رکھنے والے تھے، جبکہ تمام لوگ کفر کے اندھیرے میں تھے اور شاہد و طاعت کی صفت سے بھی متصف تھے۔ آپ اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کے احکام کے عالم تھے۔ یعنی امت کے تمام معنی حضرت ابراہیم علیہ السلام میں بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں۔ حضرت ابن مسعود فرماتے ہیں حضرت ابراہیم خیر و بھلائی کا درس دینے والے تھے۔ دنیا والے آپ کی اقتدا کرتے ہیں(۱)۔ امة فعلہ کے وزن پر مفعول کے معنی میں ہے جیسے رحبۃ بمعنی مرحوب ہے اور یہ امۃ سے مشتق ہے جس کا معنی قصد کرنا ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں حضرت ابراہیم تنہا مومن تھے باقی تمام لوگ کافر تھے۔

۲ یعنی اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنے والے اور اس کے احکام کو بجالانے والے تھے۔

۳ ہر باطل سے منہ موڑ کر جو حق کی طرف متوجہ ہو۔ بعض فرماتے ہیں جو دین اسلام پر قائم ہو۔ بعض نے فرمایا جو مخلص ہو۔

۴ اس جملہ میں کفار کا رد ہے جو کہتے تھے کہ ہم دین ابراہیمی پر قائم ہیں۔

شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ ؕ اِجْتَبٰىهُ وَهَدٰىهُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۲۱﴾

''وہ (ہر لحہ) شکر گزار تھے اللہ تعالیٰ کی پیہم نعمتوں کے لئے ۱ اللہ تعالیٰ نے انہیں چن لیا اور انہیں ہدایت عطا فرمائی سیدھے راستہ کی طرف ۲''

۱ انعم جمع قلت ہے یہ لفظ اس لئے ذکر فرمایا تا کہ تنبیہ ہو جائے کہ وہ احسان شناس بندہ تو قلیل نعمتوں پر بھی شکر کو ترک نہیں کرتا تھا تو کثیر پر اس کی شکر کی کیا حالت ہوگی۔

۲ اللہ تعالیٰ نے اسے دین اسلام اور مخلوق کو اللہ تعالیٰ کی دعوت دینے کی طرف ہدایت دی۔

وَاٰتَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ؕ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۲۲﴾ؕ

''اور ہم نے مرحمت فرمائی انہیں دنیا میں بھی (ہر طرح کی) بھلائی ۱ اور وہ آخرت میں نیک لوگوں میں سے ہوں گے ۲''

۱ ہم نے اسے دنیا میں رسالت اور مقام خلت عطا فرمایا۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں حسنۃ سے مراد خلت ہے۔ ہر شخص اپنے خلیل پر پروہ اسرار ظاہر کرتا ہے جو محبّ یا محبوب سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابراہیم کی صلوۃ کی مثل صلوۃ کو طلب فرمایا عرض کی اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰى اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ۔
جب رسول اللہ ﷺ خالص محبوبیت کے بلند مرتبہ پر فائز ہونے والے تھے تو محبوبیت کے مرتبہ کی وجہ سے خلت کے مقام پر نہ رک سکے، اگرچہ مقام خلت خالص محبوبیت کے مرتبہ سے نیچے ہے لیکن رسول اللہ ﷺ نے ارادہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ خلت سے انہیں بلند مرتبہ عطا فرمائے۔ اس لئے آپ مقام خلت پر نہ ٹھہرے۔ جب آپ ﷺ کے لئے مقام خلت پر ٹھہرنا متصور نہ ہو سکا تو اللہ تعالیٰ

نے یہی مقام آپ کے ایک فرد کامل امتی کو آپ ﷺ کی اتباع کے طفیل عطا فرمادیا اور وہ فرد شیخ احمد سرھندی قدس سرہ ہیں کیونکہ تابع کا کمال حقیقت میں متبوع کا کمال ہوتا کیونکہ وہ اسکے کمال کا جزء ہوتا ہے۔(تو گویا اللہ تعالیٰ نے آپ کو مقام خلت بھی عطا فرمادیا تھا) اور یہ مرتبہ تابع کو متبوع کی متابعت کے سبب حاصل ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی دعا کو ہجرت کے ہزار سال بعد شرف قبولیت بخشا حتی کہ ایک دولت وسلطنت مکمل ہو گئی جیسا کہ بادشاہوں کی سلطنتیں ان کے بعض گورنروں کے بند قلعوں کو فتح کرنے کی وجہ سے مکمل ہوتی ہیں اور گورنروں کو یہ فتح بادشاہ کی سطوت وقہر کی وجہ سے ہوتی ہے۔ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَآلِهٖ وَاَتْبَاعِهٖ كَمَا صَلّٰى عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَآلِهٖ وَاَتْبَاعِهٖ ۔ بعض علماء فرماتے ہیں حسنہ سے مراد لسان صدق اور حمد وتعریف ہے کیونکہ تمام ادیان کے پیرو کار آپ کی ثناء میں رطب اللسان ہیں مقاتل بن حبان فرماتے ہیں اس امت کی زبان میں آپ پر درود کا ذکر ہے۔ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّآلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ۔ بعض علماء فرماتے ہیں بڑھاپے کی حالت میں نیک اولاد کی عطا مراد ہے(1)۔

ع وہ آخرت میں انبیاء معصومین میں سے ہوں گے کیونکہ کمال صلاح عصمت ہے اور عصمت کا مقتضی یہ ہے کہ ہر نیکی کا ثواب کسی کی کے بغیر پورا پورا ملے۔ اور یہ عظمت صرف معصومین کے ساتھ خاص ہے کیونکہ جو بھی گناہ صغیر یا کبیرہ کرتا ہے تو میزان میں اس گناہ کے مقابلہ میں بعض نیکیوں کے احباط کا احتمال ہوگا، بشرطیکہ رحمت اور مغفرت الٰہی نے تدارک نہ فرمایا۔ گویا یہ آیت کریمہ آپ کی دعا کی قبولیت کا بیان ہے کیونکہ آپ نے دعا مانگی تھی الحقفی بالصالحین اے اللہ مجھے نیکو کاروں کے ساتھ لاحق کر دے۔

ثُمَّ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۲۳﴾

”پھر ہم نے وحی فرمائی (اے حبیب) آپ کی طرف کہ پیروی کرو ملت ابراہیمی کی جو یکسوئی سے حق کی طرف مائل تھا ۱؎ اور وہ مشرکوں میں سے نہیں تھا ۲؎“

۱؎ اے پیارے محمد پھر ہم نے تیری طرف وحی کی کہ توحید، دعوت وارشاد کا حکیمانہ اور مشفقانہ انداز اپنانے کے بعد دیگر دلائل پیش کرنے، ہر شخص کی فہم وسمجھ کے مطابق مناظرہ کرنے قبلہ شریف کی طرف متوجہ ہونے اور دین ابراہیمی کے عقائد ومکارم سے متصف ہونے میں حضرت ابراہیم کی اتباع کرو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اطاعت اور انعامات کی شکر گزاری کے صلہ میں انعامات جو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائے تھے۔ یہ جملہ اَنْ کی تکمیل ہے۔ ثم کا کلمہ نبی کریم ﷺ کے مقام ومرتبہ کی تعظیم وبلندی کے اظہار کے لئے ہے اور آپ کے مقام اجلال پر دلالت کرنے کے لئے ہے۔ نیز اس میں یہ بھی شعور ملتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جو مقام وکرامت ملی تھی۔ اس میں سے اشرف ترین عزت وکرامت یہ تھی ہمارے رسول مکرم ﷺ کو آپ کی ملت کی اتباع کا حکم دیا تھا۔

فائدہ: اللہ تعالیٰ نے ہمارے رسول مکرم ﷺ کو حضرت ابراہیم کی ملت کی اتباع حکم فرمایا کیونکہ رسول اللہ ﷺ مرتبہ خلت کے شائق تھے اور حضرت ابراہیم سے بہت محبت کرتے تھے اور ان کی دلیل یہ ارشاد ہے قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِى السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا۔

امام بغوی فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ سوائے ان احکام کے جو شریعت ابراہیمی کے منسوخ تھے۔ بقیہ تمام احکام میں شریعت ابراہیمی پر مامور تھے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 100 (التجاریۃ)

۲؎ یہود و نصاریٰ کے گمان کے رد اور اہل مکہ کے زعم باطل کی تردید کے لئے یہ جملہ دوبارہ ذکر فرمایا۔

اِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَيَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۲۴﴾

''صرف ان لوگوں پر سنیچر کی پابندی تھی جنہوں نے اختلاف کیا تھا اس میں ۱؎ اور بلاشبہ آپ کا رب فیصلہ فرمائے گا ان کے درمیان روز قیامت ان امور کے متعلق جن میں وہ اختلاف کیا کرتے تھے ۲؎''

۱؎ یعنی ہفتہ کے دن کی تعظیم، اس کی تحریم اور اس میں صرف عبادت کرنا فرض کیا گیا ہے ان لوگوں پر جنہوں نے ہفتہ کے دن کے بارے میں اپنے نبی کی مخالفت کی تھی۔ الکلبی کہتے ہیں موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو جمعہ کے دن کا حکم فرمایا تھا فرمایا سات دنوں میں ایک دن اللہ تبارک و تعالیٰ کی عبادت کے لئے فارغ رہو۔ پس جمعہ کے دن اپنے رب کی عبادت کرو۔ اس دن اپنا کاروبار زندگی چھوڑ دو اور بقیہ چھ دن تمہارے اپنے کام کاج کیلئے ہیں۔ یہودیوں نے کہا ہم تو اس دن عبادت کریں گے جس دن اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کی تخلیق سے فارغ ہوا تھا اور وہ ہفتہ کا دن ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان پر اسی دن کی عبادت کو فرض قرار دیا اور ان پر سختی فرمائی۔ پھر عیسیٰ علیہ السلام نے عیسائیوں کو جمعہ کے دن عبادت کا حکم دیا تو انہوں نے کہا ہم یہ نہیں چاہتے کہ ہماری عید کے دن کے بعد یہودیوں کی عید ہو۔ پس انہوں نے اپنے لئے اتوار کا دن مقرر کر لیا پھر اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ علیٰ صاحبہا التسلیم کو جمعہ کا دن عطا فرمایا۔ اس امت نے اپنے رب کی عطا کو قبول کیا اور ان کے لئے اس دن میں برکتیں رکھی گئیں ہیں(1)۔ شیخین نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہم (دنیا میں) پیچھے ہیں قیامت کے دن سبقت لینے والے ہوں گے مگر ان کو ہم سے پہلے کتاب دی گئی اور ہمیں ان کے بعد عطا کی گئی۔ یہ دن ان کا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر فرض کیا تھا، یعنی جمعہ کا دن لیکن انہوں نے اس میں مخالفت کی۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ہدایت عطا فرمائی۔ سب لوگ اس میں ہم سے پیچھے ہیں۔ یہود ایک دن بعد نصاریٰ دو دن بعد (2)۔

امام بغوی نے بھی یہ حدیث ذکر کی ہے لیکن آخر میں یہ الفاظ زائد کئے ہیں قال اللہ اِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ

مسلم کی روایت ابو ہریرہ اور حذیفہ رضی اللہ عنہما سے اسی طرح مروی ہے اور وہ دونوں حدیث کے آخر میں فرماتے ہیں ہم دنیا داروں سے پیچھے ہیں اور قیامت کے دن پہلے ہوں گے مخلوق سے پہلے ان کا فیصلہ کیا جائے گا۔ بعض علماء فرماتے ہیں آیت کا معنی یہ ہے اللہ تعالیٰ نے سنیچر کی تعظیم اور تحریم صرف ان لوگوں پر فرض کی جنہوں نے اس کے بارے میں اختلاف کیا یعنی یہود۔ بعض لوگوں نے کہا ہفتہ عظیم دن ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ اشیاء کی تخلیق سے جمعہ کے دن فارغ ہوا۔ پھر ہفتہ کے دن آرام فرمایا۔ بعض لوگوں نے کہا اتوار کا دن عظیم ہے کیونکہ اس دن اللہ تعالیٰ نے اشیاء کی تخلیق کا آغاز کیا۔ پس انہوں نے اس دن کی تعظیم کو فرض قرار دیا جیسے اللہ تعالیٰ نے فرض نہیں کیا تھا حالانکہ اللہ تعالیٰ نے جمعہ کے دن کی تعظیم فرض کی تھی۔ بعض علماء فرماتے ہیں آیت کا معنی یہ ہے کہ ہفتہ کے دن کو اختلاف کرنے پر لعنت اور مسخ کا سبب بنایا گیا۔ قتادہ فرماتے ہیں وہ یہود تھے جنہوں نے اس دن مچھلیوں کو شکار کرنا حلال کیا تھا اور بعض نے شکار کرنا حرام کیا تھا۔

۲؎ اختلاف پر جزاء دینے کا فیصلہ فرمائے گا اور ہر فریق جس کا مستحق ہوگا اسے وہی جزاء دی جائے گی۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 101 (التجاریہ) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 282 (قدیمی)

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ﴿۱۲۵﴾

"(اے محبوب!) بلائیے (لوگوں کو) اپنے رب کی راہ کی طرف حکمت سے اور عمدہ نصیحت سے [1] اور ان سے بحث (ومناظرہ) اس انداز سے کیجئے جو بڑا پسندیدہ (اور شائستہ) ہو [2] بیشک آپ کا رب خوب جانتا ہے اسے جو بھٹک گیا اس کے راستہ سے اور وہ خوب جانتا ہے ہدایت پانے والوں کو [3]"

[1] اے پیارے محمد ﷺ لوگوں کو دعوت دو اسلام کے زرین احکام کی طرف قرآن حکیم کے ذریعے جو محکم اور پختہ کلام ہے۔ اس میں شک وشبہ، معارضہ وطعن کوئی گنجائش نہیں۔ یہ ایسی دلیل ہے جو حق کو واضح اور شبہات کا ازالہ کرنے والی ہے اور یہی ترغیب وترہیب کے موعظہ حسنہ ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں موعظہ حسنہ سے مراد نرمی اور محبت سے گفتگو کرنا ہے جس میں کسی قسم کی درشتی اور اکھڑ پن نہ ہو۔

[2] اور لوگوں سے بحث ومناظرہ کرو تو ایسے انداز سے جو پسندیدہ اور شائستہ ہو، مناظرہ اور مباحثہ میں نفس کی سرکشی اور شیطانی وساوس کا دخل نہ ہو بلکہ خالصۃً رضا الٰہی اور اعلاء کلمۃ اللہ مقصود ہو۔

[3] یعنی اگر دعوت حق کو کوئی قبول نہ کرے تو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ کے ذمہ فقط تبلیغ ودعوت ہے ہدایت دینا اور گمراہی پر سزا دینا یہ آپ کی ذمہ داری نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے گمراہوں اور ہدایت یافتہ لوگوں کو اور وہی ان کو سزا و جزا دے گا۔ حاکم نے جابر بن عبداللہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں جب جنگ احد کے روز جنگ سے لوگ واپس لوٹے تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت حمزہ کو نہ پایا۔ ایک شخص نے کہا میں نے انہیں ایک چٹان کے پاس کہتے ہوئے پایا ہے۔ میں اللہ کا شیر اور اسکے رسول کا شیر ہوں۔ اے اللہ میں تیری بارگاہ میں اس چیز سے براءت کا اظہار کرتا ہوں جسے یہ لوگ یعنی ابوسفیان وغیرہ لائے ہیں اور جو کچھ مسلمانوں کو شکست ہوئی ہے اس کا میں تیری بارگاہ میں عذر پیش کرتا ہوں۔ پھر آپ ﷺ حضرت حمزہ کے پاس آئے ان کا جسم دیکھا تو رو پڑے۔ جب آپ ﷺ نے دیکھا کہ آپ کا مثلہ (ناک کان کٹے ہوئے) کر دیا گیا ہے لمبا سانس لیا اور فرمایا کفن نہیں ہیں؟ ایک انصاری نے حضرت حمزہ کے اوپر کپڑا ڈال دیا۔ پھر اس کے بھائی نے کپڑا ڈالا تو آپ ﷺ نے فرمایا اے جابر یہ کپڑا تیرے بھتیجے کیلئے ہے اور یہ میرے چچا کے لئے ہے(1)۔ آپ ﷺ نے فرمایا تجھ پر اللہ کی رحمت ہو بیشک تو ایسا ہی تھا جیسا کہ میں تجھے جانتا ہوں نیکیاں کرنے والا اور صلہ رحمی کرنے والا۔ اگر صفیہ پریشان نہ ہوتی ایک روایت میں ہے اگر عورتیں نہ پریشان ہوتیں۔ ایک روایت میں ہے تیرے بعد تجھ پر پریشانی نہ ہوتی اور تیرے بعد سنت نہ بن جاتی تو میں تجھے چھوڑ دیتا حتی کہ درندوں اور پرندوں کے پیٹوں سے تیرا حشر ہوتا۔ پھر فرمایا تمہیں بشارت ہو، میرے پاس جبرئیل آئے تھے اور مجھے خبر دی ہے کہ ساتویں آسمان میں حضرت کا نام لکھا گیا ہے حمزہ بن عبدالمطلب اسد اللہ واسد رسولہ (امیر حمزہ اللہ کا شیر اور اس کے رسول کا شیر ہے)۔ پھر فرمایا پھر کبھی اللہ تعالیٰ نے مجھے قریش پر کسی جگہ فتح عطا فرمائی تو میں تیرے بدلہ میں ان کے ستر آدمیوں کا مثلہ کروں گا۔ جب مسلمانوں نے رسول اللہ ﷺ کی پریشانی دیکھی اور حضرت امیر حمزہ کا مثلہ کرنے والوں پر آپ کا غصہ دیکھا تو تمام صحابہ نے کہا اگر کسی دن ہمیں اللہ تعالیٰ نے قریش پر فتح دی ہم ان کا ایسا مثلہ کریں گے کہ ایسا کسی عرب نے نہ کیا ہوگا(2)۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا جیسا کہ ابن سعد، البزار، ابن المنذر، البیہقی نے دلائل

1۔ مستدرک حاکم، جلد 2، صفحہ 119 (الفکر)

2۔ تفسیر خازن، جلد 4، صفحہ 03-102 (التجاریہ)

میں اور حاکم نے اس حدیث کو ذکر کیا ہے۔ پس جبرئیل اسی وقت سورۂ نحل کی آخری آیات لے کر پہنچ گئے۔

وَ اِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ ؕ وَ لَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَیْرٌ لِّلصّٰبِرِیْنَ ﴿۱۲۶﴾

"اور اگر تم (انہیں) سزا دینا چاہتے ہو تو انہیں سزا دو لیکن اس قدر جتنی تمہیں تکلیف پہنچائی گئی ہے[1] اور اگر تم (ان کی ستم رانیوں پر) صبر کرو تو یہ صبر ہی بہتر ہے صبر کرنے والوں کے لئے[2]"

[1] عقوبہ اور عقاب، برائی کی جزا کو کہتے ہیں۔ فعل اور اس کی جزاء کو ایک ہی لفظ عاقب سے تعبیر فرمایا ہے۔ مشاکلت اور مقابلہ کے قاعدہ کے اعتبار سے جیسے ارشاد ہے جزٰٓؤا سیئۃ مثلھا یہاں بھی برائی کی جزاء کو سیئہ (برائی) سے تعبیر فرمایا ہے حالانکہ برائی کی جزاء برائی نہیں بلکہ عین عدل ہے۔ معنی یہ ہے کہ سیئہ (برائی) کی جزاء میں مماثلت سے آگے نہ بڑھو۔

[2] اگر تم انتقام اور عقاب سے صبر کرو تو انتقام کی بنسبت یہ صبر کرنے والوں کے لئے بہتر ہے۔ ضمیر کی جگہ مظہر کو رکھا۔ تقدیر اس طرح ہے۔ فھو خیر لکم اللہ تعالیٰ نے ان کی تعریف فرمائی کیونکہ انہوں نے تکالیف اور شدائد پر صبر کیا۔ اللہ تعالیٰ نے وان عاقبتم سے اشارہ اور وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ سے تصریحاً عفو اور معافی پر برانگیختہ کیا ہے۔ پھر صراحۃً اپنے محبوب کریم ﷺ کو عفو کا حکم فرمایا کیونکہ آپ کا علم اور اللہ تعالیٰ پر وثوق زیادہ ہے اس لئے آپ صبر کرنے کے زیادہ اہل ہیں۔ فرمایا

وَ اصْبِرْ وَ مَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَ لَا تَحْزَنْ عَلَیْهِمْ وَ لَا تَكُ فِیْ ضَیْقٍ مِّمَّا یَمْكُرُوْنَ ﴿۱۲۷﴾

"اور آپ صبر فرمائیے اور نہیں ہے آپ کا صبر مگر اللہ تعالیٰ کی توفیق سے[1] اور رنجیدہ نہ ہوا کریں ان (کی ہٹ دھرمی) پر[2] اور نہ غمزدہ ہوا کریں ان کی فریب کاریوں سے[3]"

[1] کفار کی اذیتوں پر صبر کرو اور آپ کا صبر کرنا اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اس کی اعانت سے ہے۔

[2] آپ کفار کی ستم رانیوں پر غمزدہ نہ ہوں، یا یہ معنی کہ آپ مومنین کیساتھ جو کچھ کفار کر رہے ہیں اس پر غمزدہ نہ ہوں۔

[3] آپ دل تنگ نہ ہوں ان کفار کی فریب کاریوں پر جو وہ مومنین کے ساتھ کرتے ہیں، یعنی آپ کفار کے مکر و دجل سے پریشان نہ ہوں ہم آپ کے مددگار اور معاون ہیں اور ان کو جزاء دینا ہمارے ذمہ ہے۔ ابن کثیر نے یہاں بھی اور سورۂ نمل میں ضیق کو ضاد کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے دونوں جگہ فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ دونوں لغتیں ہیں جیسے القول اور القیل ابو عمرو فرماتے ہیں۔ الضیق بالفتحہ کا معنی غم ہے اور الضیق بالکسرہ کا معنی شدت وتنگی ہے، ابو عبیدہ فرماتے ہیں الضیق بالکسر کا معنی معاش و ساکن میں قلت ہے۔ دل اور سینہ میں جو گھٹن محسوس ہوتی ہے وہ الضیق بالفتح کا معنی ہے۔ ان دونوں اقوال کا کتاب اللہ انکار کرتی ہے کیونکہ یہ دونوں متواتر قرأتیں ہیں اور مراد یہاں غم ہے۔ صحیح وہ ہے کہ یہ دونوں لغتیں ہم معنی ہیں۔ ابو قتیبہ فرماتے ہیں الضیق بالفتح یہ ضیق کی تخفیف ہے جیسے ھین وھین ولین ولین اس صورت میں یہ صفت ہوگا۔ گویا یوں ارشاد ہے فَلَا تَكُنْ فِیْ اَمْرٍ ضَیِّقٍ مِّنْ مَّكْرِھِمْ یعنی ان کی فریب کاریوں سے تنگ امر میں نہ ہوں(1)۔

اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَّ الَّذِیْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ ﴿۱۲۸﴾

"یقیناً اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ہے جو (اس سے) ڈرتے ہیں اور جو نیک کاموں میں سرگرم رہتے ہیں[1]"

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 103 (التجاریہ)

۴

لے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو گناہوں سے بچتے ہیں۔ اور نیک اعمال میں سرگرم ہیں۔ یا یہ معنی کہ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ہے جو اس کے حکم کی تعظیم کی وجہ سے اس سے ڈرتے ہیں اور جو اس کی مخلوق پر احسان اور مشفقانہ طرز عمل اپناتے ہیں۔ یا یہ معنی کہ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ہے جو انتقام لینے میں تجاوز سے ڈرتے ہیں اور جو لوگوں کی غلطیوں کو معاف کر دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی تائید اس کا فضل اور نصرت ان کی معیت میں ہوتی ہے اور معیت ذاتی ہے جو بلا کیف ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے جسے ابن سعد وغیرہ نے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ نے جو قسم اٹھائی تھی (کہ حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ نے بدلے ستر آدمیوں کا مثلہ کریں گے) اس کا کفارہ ادا فرمایا اور جو آپ ارادہ رکھتے تھے اس سے رک گئے اور صبر کیا۔ یعنی اس آیت کریمہ کے نزول کے بعد آپ نے ارادہ ترک فرمایا اور کفارہ ادا فرمایا تھا۔

ابن المنذر، الطبرانی اور البیہقی نے ابن عباس سے روایت کیا ہے جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس آیت کے شان نزول کے بارے میں روایت ہے۔ ہم نے سورت کی ابتداء میں ابن اسحاق اور ابن جریر کی روایت حضرت عطاء کے حوالہ سے اس آیت کے نزول کے بارے میں اسی طرح روایت نقل کی ہے۔ ترمذی نے روایت کی ہے اور حسن کہا ہے۔ عبداللہ الامام احمد نے زوائد المسند میں نسائی، ابن المنذر، ابن خزیمہ، ابن حبان اور الضیاء نے اپنی اپنی صحیح میں ابی بن کعب سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں جنگ احد میں انصار کے 64 آدمی اور مہاجرین کے چھ آدمی شہید ہوئے جن میں سے ایک امیر حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے۔

ان کا مثلہ کیا گیا تھا انصار نے کہا ہمارے ہاتھ کبھی کفار چڑھے تو ہم بھی انہیں قابل رحم بنا دیں گے۔ جب فتح مکہ ہوا تو اللہ تعالیٰ نے وان عاقبتم فعاقبوا کی آیت نازل فرمائی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہم صبر کریں گے اور سزا نہیں دیں گے۔ آپ ﷺ نے فرمایا ان چار افراد کے علاوہ تمام سے ہاتھ روک لو۔ امام بغوی فرماتے ہیں آیت کریمہ شہداء احد کے بارے میں نازل ہوئی۔ واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے جب اپنے مقتولوں کے ساتھ مشرکوں کا سلوک دیکھا کہ انہوں نے ان کے پیٹ چاک کر دیئے ہیں اور بری طرح انکا مثلہ کیا حتی کہ انہوں نے تمام شہداء کا مثلہ کر دیا تھا لیکن حنظلہ بن الراہب غسیل الملائکۃ کا مثلہ نہیں کیا تھا کیونکہ ان کا باپ ابو عامر الراہب (جس کا نام حضور ﷺ نے ابو عامر الفاسق رکھا تھا) ابو سفیان کے ساتھ تھا۔ اس لئے انہوں نے ان کا مثلہ نہیں کیا تھا۔ مسلمانوں نے جب اپنے شہیدوں کی یہ کیفیت دیکھی تو کہا اگر اللہ تعالیٰ نے ہمیں کفار پر غلبہ دیا تو ہم ان سے بھی زیادہ بگاڑ کریں گے اور ایسا مثلہ کریں گے جو کسی عرب نے کسی کے ساتھ نہ کیا ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ اپنے چچا امیر حمزہ پر کھڑے ہوئے اور دیکھا کہ کفار نے ان کا ناک، کان، اور مذاکیر کاٹ دیئے تھے اور پیٹ بھی پھاڑ دیا۔ ہند بنت عتبہ نے حضرت امیر حمزہ کا کلیجہ نکال کر چبایا لیکن وہ اس کے پیٹ میں ٹھہر نہ سکا حتی کہ باہر نکال دیا نبی کریم ﷺ کو جب یہ خبر پہنچی تو فرمایا اگر وہ کھا لیتی تو دوزخ میں داخل نہ ہوتی۔ حضرت حمزہ اللہ تعالیٰ کے ہاں معزز ہیں۔ اس لئے اس کے جسم کا کوئی ٹکڑا دوزخ میں داخل نہ ہوگا۔ جب رسول اللہ ﷺ نے اپنے چچا حضرت امیر حمزہ کو دیکھا تو اس طرح دیکھا کہ پہلے ایسا کبھی کسی چیز کو نہ دیکھا تھا۔ اس سے آپ کو قلبی دکھ ہوا۔ حضور نے فرمایا اے ابو السائب تجھ پر اللہ کی رحمت ہو۔ میں تو تیرے متعلق یہی جانتا ہوں کہ تو نیکیاں کرنے والا اور صلہ رحمی کرنے والا تھا۔ اگر تیرے بعد تجھ پر غم کیے جانے کا خیال نہ ہوتا تو مجھے یہ پسند تھا کہ میں تجھے ایسے ہی چھوڑ جاؤں تا کہ قیامت کے روز مختلف چیزوں کے پیٹوں سے تیرا حشر ہو۔ قسم بخدا اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے کفار پر غلبہ دیا تو میں تیرے بدلہ میں ان کے ستر آدمیوں کا مثلہ کروں گا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل

فرمائیں(1)۔ یہ ارشادات سن کر آپ ﷺ نے فرمایا ہم صبر کریں گے، آپ اپنے ارادہ سے رک گئے اور اپنی قسم کا کفارہ ادا فرمایا۔

فائدہ: حضرت ابی بن کعب کی حدیث دلالت کرتی ہے یہ آیات فتح مکہ کے وقت نازل ہوئیں اور حضرت ابو ہریرہ، ابن عباس اور عطاء بن یسار رضی اللہ عنہم کی حدیث میں ہے کہ ان کا نزول جنگ احد کے وقت ہوا۔ ابن الحصار نے ان دونوں احادیث کو اس طرح تطبیق دی ہے کہ یہ آیات ایک مرتبہ مکہ میں نازل ہوئی دوبارہ احد کے موقع پر اور تیسری مرتبہ فتح مکہ کے بعد نازل ہوئیں بار بار کا نزول بندوں کو یاد دلانے کے لئے تھا۔ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت ابن عباس اور الضحاک رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا یہ آیت سورۂ براءت کے نزول سے پہلے نازل ہوئی جب حضور ﷺ کو حکم تھا کہ جو جنگ کرے اس سے جنگ کرو لیکن جنگ کا آغاز خود نہیں کرنا ہے۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے اسلام اور اہل اسلام کو عزت عطا فرمائی اور سورۂ براءت نازل فرمائی جہاد کا حکم دیا گیا تو یہ آیت منسوخ ہو گئی۔ النخعی، الثوری، السدی، مجاہد اور ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہم فرماتے ہیں یہ آیت محکمہ ہے، منسوخ نہیں ہے اور اس شخص میں نازل ہوئی جس پر ظلم کیا گیا ہو اسے چاہئے کہ ظالم سے اتنا انتقام لے جتنی زیادتی ظالم نے کی ہے اس سے تجاوز نہ کرے۔ جزاء یا معافی کا حکم دیا اور زیادتی سے منع فرمایا ہے(2)۔

مسئلہ: علماء کا اجماعی مسئلہ ہے کہ مثلہ جائز نہیں ہے۔ ابن اسحاق نے سمرہ بن جندب سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ جب بھی وعظ و نصیحت کرنے کے لئے کھڑے ہوتے تو صدقہ کا حکم اور مثلہ سے منع کیے بغیر اپنے سٹیج سے نہ اترتے۔ مثلہ سے منع پر کثرت سے احادیث میں مروی ہیں۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى سَيِّدِ الْمُرْسَلِيْنَ۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 03-102 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 103 (التجاریہ)

سورۃ الاسراء

آیاتھا ۱۱۱ | سُوْرَۃُ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ مَکِّیَّۃٌ ۱۷ | رکوعاتھا ۱۲

سورۂ بنی اسرائیل/الاسراء مکی ہے۔ اس میں ایک سو گیارہ آیات اور بارہ رکوع ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سُبْحٰنَ الَّذِیْۤ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ①

”(ہر عیب سے) پاک ہے وہ ذات [1] جس نے سیر کرائی اپنے بندے کو رات کے قلیل حصہ میں [2] مسجد احرام سے [3] مسجد اقصیٰ تک [4] بابرکت بنا دیا ہم نے جسکے گرد و نواح کو [5] تا کہ ہم دکھائیں اپنے بندے کو [6] اپنی قدرت کی نشانیاں [7] بیشک وہی ہے سب کچھ سننے والا سب کچھ دیکھنے والا [8]“

[1] سبحان تسبیح کا اسم ہے جسکا معنی ہے پاک ہونا، کبھی یہ تسبیح کے علم کے طور پر استعمال ہوتا ہے اور مضاف نہیں ہوتا اور غیر منصرف ہے اور اس کو نصب فعل مضمر کے ساتھ دی جاتی ہے۔ تقدیر یوں ہے سبحوا اللّٰہ سبحان یا اسبح اللّٰہ سبحانہ۔ پھر سبحان فعل کے قائم مقام استعمال ہونے لگا۔ یہ تنزیہ بلیغ پر دلالت کرتا ہے اور اس کے ساتھ کلام کو شروع کرنا اس لئے ہوتا ہے کہ جو کچھ عجز و اور کمزوری کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ اس سے منزہ اور مبرا ہے۔ کبھی یہ تعجب کیلئے استعمال ہوتا ہے۔

[2] بعبدہٖ: سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور لیلا ظرف کی بناء پر منصوب ہے۔ اسری کے لفظ میں رات کو سیر کرانے کا معنی موجود تھا پھر لیلاً ذکر کیوں فرمایا، فرماتے ہیں تا کہ اسکی تنکیر مدت اسراء کی قلت پر دلیل پکڑی جائے (یعنی یہ ظاہر ہو جائے کہ اتنی طویل سیر پر بہت کم وقت صرف ہوا)

[3] صحیحین میں عن انس عن مالک بن صعصعہ کے طریق سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں مسجد حرام میں نیند اور بیداری کی درمیانی کیفیت میں تھا کہ میرے پاس جبریل براق لیکر آئے (1)' ایک دوسری روایت میں ہے میں حطیم میں پہلو کے بل لیٹا ہوا تھا کہ ایک آنے والا آیا۔ ہم نے سورۃ النجم میں اس کا تفصیلاً ذکر کیا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ سیر ام ہانی کے گھر سے شروع ہوئی تھی اور مسجد حرام سے مراد اس صورت میں حرم ہوگا جسے مسجد حرام سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ حرم سارا مسجد ہے یا اس لئے کہ حرم مسجد کو گھیرے ہوئے ہے تا کہ مبدا اور منتہیٰ میں مطابقت ہو جائے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تھے۔ مسجد میں نہیں تھے اس پر دلیل صحیحین کی روایت ہے جو عن انس عن ابی ذر حدیث عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق سے مروی ہے، فرمایا میں مکہ میں تھا کہ میرے کمرے کی چھت میرے اوپر سے کھل گئی (2)۔ اس حدیث کو بھی ہم نے سورۂ نجم میں ذکر کیا ہے۔ اسی طرح ابو یعلی نے اپنی مسند میں' اور الطبرانی

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 93 (قدیمی)　　2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 92 (قدیمی)

نے الکبیر میں حضرت ام ہانی کی حدیث روایت کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ام ہانی کے گھر میں تھے۔ یہاں سے آپ کو سیر کرائی گئی پھر اسی رات آپ لوٹے اور ام ہانی کے سامنے سیر کا واقعہ بیان فرمایا۔ فرمایا نبیوں کو میرے سامنے متشکل و مجسم کر کے لایا گیا۔ میں نے اُن کی امامت کرائی۔ پھر آپ مسجد کی طرف تشریف لے گئے اور قریش کو اپنی سیر سے آگاہ کیا۔ انہوں نے اس کو محال سمجھتے ہوئے تعجب کا اظہار کیا۔ اسی واقعہ سے کچھ مسلمان بھی مرتد ہو گئے۔ لوگ دوڑے دوڑے صدیق اکبر کے پاس گئے ان سے حضور کی بات کا ذکر کیا تو صدیق اکبر نے فرمایا اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہے تو میں اس کی تصدیق کرتا ہوں کفار کہنے لگے تم اس واقعہ کی تصدیق کرتے ہو فرمایا میں تو اس سے بھی بعید بات میں انکی تصدیق کرتا ہوں۔ اسی تصدیق کی وجہ سے آپ کو صدیق کا لقب عطا ہوا۔ ایک گروہ جنہوں نے بیت المقدس کا سفر کیا ہوا تھا پوچھا بیت المقدس کی کیفیت و شکل بیان کرو۔ اللہ تعالیٰ نے بیت المقدس آپ کے سامنے رکھ دیا۔ پس آپ دیکھ کر ان کے سامنے اسی کی کیفیت بیان کرتے رہے' انہوں نے کہا آپ نے بیت المقدس کی صفات تو بالکل ٹھیک بیان کر دی ہیں' آپ ہمیں ہمارے قافلہ کے متعلق بتاؤ' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انکے اونٹوں کی تعداد اور مال کی مقدار بھی بیان کر دی۔ فرمایا فلاں دن سورج کے طلوع ہونے کے وقت وہ قافلہ آئے گا اور اس قافلہ کے آگے بھورا اونٹ ہے' وہ دوڑ کر وادی میں گئے تو قافلہ کی وہی کیفیت پائی جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائی تھی لیکن ایمان پھر بھی نہ لائے اور کہا ما ھذ الا سحر مبین (یہ تو کھلا جادو ہے)۔ میں کہتا ہوں دونوں حدیثوں کو جمع کرنا اس طرح ممکن ہے معراج متعدد مرتبہ واقع ہوئی ایک مرتبہ حطیم سے دوسری مرتبہ ام ہانی کے گھر سے۔ امام بغوی فرماتے ہیں مقاتل نے فرمایا ہجرت سے ایک سال قبل معرج ہوئی تھی' اور رجب کا مہینہ تھا۔ بعض علماء فرماتے ہیں رمضان شریف میں ہوئی تھی۔

ۓ بیت المقدس کو اقصیٰ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ مسجد حرام سے دور ہے اور اسوقت اس کے علاوہ کوئی مسجد نہ تھی۔ قریش نے اسکی دوری کی وجہ سے تعجب کیا اور اس کو محال سمجھا۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں علم ہندسہ کے اعتبار سے یہ استحالہ دور ہو سکتا ہے مثلاً آفتاب کے دونوں کناروں کی مسافت زمین کے دونوں کناروں کے درمیان کی مسافت سے ایک سو ساٹھ گنا سے بھی کچھ زائد ہے اور ایک سیکنڈ میں آفتاب کا نچلا کنارہ اوپر کے مقام تک پہنچ جاتا ہے۔ اور یہ چیز علم کلام میں دلائل سے ثابت ہے کہ تمام اجسام اعراض کے قبول کرنے میں مساوی ہیں اور اللہ تعالیٰ ممکنات میں سے ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ اس بات پر قادر ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بدن پاک میں ایسی سرعت پیدا فرمادی ہو یا اس سے بھی زیادہ تیزی پیدا فرمادی ہو یا اس کے اندر ایسی تیزی پیدا کر دی ہو جس پر آپ سوار تھے اور تعجب معجزات کے لوازم میں سے ہے(1)۔

۵ جس کے اردگرد نہریں' درخت اور پھلوں کے ذریعے برکتیں پیدا فرمادی ہیں۔ مجاہد فرماتے ہیں مبارک کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ انبیاء کرام کی قرارگاہ اور ملائکہ اور وحی کے نزول کی جگہ ہے' اور قیامت کے روز لوگوں کا حشر یہاں سے ہوگا۔

٦ لنریہ میں ہ ضمیر کا مرجع محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس ہے جنہیں عبدہ سے یاد کیا گیا ہے۔

ے ہم اپنی قدرت کی نشانیاں دکھائیں جیسے آپ کا تھوڑی سی دیر میں چالیس دنوں کی مسافت کو طے کرنا' پھر مسجد اقصیٰ سے آسمانوں کی طرف جانا انبیاء کرام کی تمثیل اور اس کے علاوہ جو آپ نے بڑی بڑی نشانیاں دیکھی تھیں۔ کلام کو غائب سے متکلم کے صیغوں کی طرف

1۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 370 (فراس)

پھیرنا آیات کی تعظیم کیلئے ہے۔

۵ اللہ تعالیٰ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال کو سننے والا اور آپ کی دعاؤں کو قبول کرنے والا ہے اور آپ کے افعال و احوال کو دیکھنے والا ہے اور رات کی تاریکی میں آپ کی حفاظت فرمانے والا ہے۔

امام بغوی فرماتے ہیں حضرت عائشہ سے مروی ہے، فرماتی ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جسد مفقود نہیں ہوا لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کی روح کو سیر کرائی تھی(1) یعنی نیند میں سیر کرائی تھی۔ اور اس پر امام بخاری کی روایت دلالت کرتی ہے جو انس بن مالک سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مسجد کعبہ سے سیر کرائی گئی وحی سے پہلے تین شخص آئے دراں حالیکہ آپ مسجد حرام میں سوئے ہوئے تھے۔ پہلے نے کہا یہ کون ہیں؟ درمیان والے نے کہا یہ سب سے بہتر ہیں۔ تیسرے نے کہا جو ان تمام سے بہتر ہے اسے لے لو۔ پس یہ رات گذر گئی۔ پھر آپ نے انکو نہ دیکھا حتیٰ کہ وہ دوسری رات آئے اسوقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کیفیت یہ تھی کہ آپ کا دل دیکھ رہا تھا اور آنکھیں سوئی ہوئی تھیں آپ کا دل نہیں سوتا تھا۔ اسی طرح تمام انبیاء کی آنکھیں سوتی ہیں دل نہیں سوتے۔ اس مرتبہ ان آنے والوں نے کوئی کلام نہ کی تھی حتیٰ کہ وہ آپ کو اٹھا کر آب زم زم کے پاس لے گئے۔ پھر جبریل نے آپ کا سینہ مبارک ناف تک چاک کیا اور اپنے ہاتھ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر کو آب زمزم سے دھویا۔ پھر معراج کی پوری حدیث بیان کی جسمیں ہے کہ پھر آپ آسمان دنیا پر پہنچے۔ دو نہریں بہہ رہی تھیں۔ جبریل نے کہا نیل و فرات کی اصل ہے۔ پھر آپ کو جبریل آسمان کی طرف لے گئے وہاں ایک دوسری نہر تھی جس کے اوپر موتیوں و زبر جد سے بنا ہوا محل تھا۔ دریا میں ہاتھ مارا تو خالص مشک مہک اٹھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا یہ کیا ہے۔ جبریل نے کہا یہ کوثر ہے جو تیرے پروردگار نے تیرے لیے محفوظ کر رکھی ہے آگے حدیث بیان فرمائی۔ فرمایا پھر ساتویں آسمان کی طرف لے جایا گیا۔ فرمایا موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی اے میرے پروردگار میرا تو گمان نہ تھا کہ تو مجھ پر کسی کو بلندی عطا فرمائے گا۔ پھر آپ اوپر گئے (کہاں تک گئے) اس کا علم اللہ تعالیٰ کو ہے سدرۃ المنتہیٰ پر پہنچے جب رب العزت کے قریب ہوئے اور قریب ہوئے حتیٰ کہ دو کمانوں کے فاصلہ پر قریب ہوئے بلکہ اس سے بھی زیادہ قریب ہر دن اور رات میں پچاس نمازوں کی وحی فرمائی۔ موسیٰ علیہ السلام کے پاس پچاس نمازوں کا ذکر کیا تو وہ معافی کیلئے بار بار لوٹاتے رہے حتیٰ کہ نمازیں پانچ رہ گئیں۔ پھر بھی موسیٰ علیہ السلام نے آپ کو روک کر کہا اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں بنی اسرائیل کو اس سے کم نمازوں میں آزما چکا ہوں وہ عاجز آگئے اور انہوں نے وہ تھوڑی سی نمازیں بھی ادا نہ کیں۔ جبکہ آپ کی امت تو جسم، دل، بدن، آنکھوں اور کانوں کے اعتبار سے زیادہ کمزور ہے۔ آپ واپس جائیے اور اپنے رب سے تخفیف طلب کیجئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مشورہ پر ہر بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم جبریل امین کی طرف متوجہ ہوتے تا کہ وہ کوئی اشارہ کریں جبریل نے اس مشورہ کو ناپسند نہیں فرمایا۔ پانچویں مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرض کی اے میرے رب میری امت کے جسم، دل اور کان اور بدن کمزور ہیں۔ اس لیے ہم پر تخفیف فرمائیے۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ حضور نے عرض کی اے میرے پروردگار میں حاضر ہوں اور سعادت چاہتا ہوں۔ فرمایا میرے پاس حکم تبدیل نہیں ہوتا جیسا کہ میں نے ام الکتاب میں تم پر فرض کیا ہے (ایسا ہی ہوگا) ہر ایک نیکی کے بدلہ میں دس نیکیاں ہیں۔ ام الکتاب (لوح محفوظ) میں نمازیں پچاس ہیں، جبکہ آپ پر پانچ فرض ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا حضور اپنے رب پاس جائیے اور مزید تخفیف

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 105 (التجاریۃ)

طلب کیجئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قسم بخدا اب تو مجھے بار بار جانے سے شرم محسوس ہو رہی ہے۔ فرماتے ہیں پھر آپ اللہ کے نام سے نیچے اترے بیدار ہوئے تو مسجد حرام میں تھے۔ امام مسلم نے اس حدیث کو اختصار کی ساتھ ذکر کیا ہے۔ فَاسْتَيْقَظَ وَهُوَ فِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ کے الفاظ دلالت کرتے ہیں کہ معراج نیند کی حالت میں ہوئی تھی۔ اکثر علماء کا خیال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے عبد مقرب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج کی رات حالت بیداری میں سیر کرائی تھی۔ اخبار صحیحہ اس کے متعلق متواتر ہیں اور اسی پر اجماع بھی ہے۔ اگر معراج نیند میں ہوتی تو قریش انکار نہ کرتے کیونکہ خواب میں یہ سیر کوئی بعید نہیں ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں ہمارے شیخ الامام رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ بعض اہل حدیث فرماتے ہیں کہ بخاری اور مسلم کی کتابوں میں اس حدیث کے علاوہ کوئی ایسی روایت نہیں ہے جو یہ ثابت کرے کہ معراج نیند میں روح کو کرائی گئی تھی(1)۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس حدیث کا مدار شریک بن عبداللہ پر ہے جو محدثین کے نزدیک منکر الحدیث ہیں۔ تیسری بات یہ ہے کہ معراج جسکا ذکر اس حدیث میں ہے وہ وحی سے پہلے کی ہے۔ جبکہ علماء کا اتفاق ہے کہ جس معراج کا ذکر آیت میں ہے یہ ہجرت سے ایک سال پہلے اور تقریباً بارہ سال وحی کے بعد ہوئی۔ امام بغوی فرماتے ہیں ہمارے شیخ نے فرمایا میرے نزدیک یہ اعتراض صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ خواب اللہ تعالیٰ نے آپ کو وحی سے پہلے دکھایا تھا اور پھر حالت بیداری میں وحی کے بعد ہجرت سے ایک سال پہلے اسی خواب کو حقیقت ثابت کرنے کیلئے معراج کرائی جیسا کہ پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کے ساتھ 6ھ کو خواب میں فتح مکہ دیکھا لیکن اس کا تحقق 8ھ میں ہوا، واللہ اعلم۔

امام بغوی فرماتے ہیں روایت ہے کہ جب معراج کی رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واپس لوٹے اور آپ وادی طویٰ میں تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل سے پوچھا اے جبریل لوگ میری اس واقعہ کے متعلق تصدیق نہیں کریں گے۔ جبریل نے کہا ابوبکر آپ کی تصدیق کریں گے وہ صدیق ہیں۔ امام بغوی فرماتے ہیں ابن عباس اور حضرت عائشہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، فرمایا جب مجھے رات کو سیر کرائی گئی تو صبح میں مکہ میں الگ بیٹھ کر اپنے معاملہ کے بارے سوچ رہا تھا اور جان چکا تھا کہ لوگ مجھے جھٹلائیں گے۔ روایت ہے کہ آپ الگ پریشان بیٹھے ہوئے تھے۔ ابوجہل قریب سے گذرا تو پاس بیٹھ گیا اور مزاح کرنے کے انداز میں کہا کوئی نئی چیز حاصل کی ہے۔ فرمایا ہاں مجھے رات کو سیر کرائی گئی۔ ابوجہل نے کہا کہاں تک؟ فرمایا بیت المقدس تک۔ ابوجہل نے کہا صبح آپ ہمارے درمیان بھی۔ فرمایا ہاں۔ ابوجہل نے انکار نہ کیا تا کہ انکار نہ کر دیں۔ پھر ابوجہل نے کہا جو کچھ میرے سامنے بیان کیا ہے اپنی قوم کے سامنے بیان کریں گے؟ فرمایا ہاں۔ ابوجہل نے کہا اے بنی کعب بن لوی کے لوگو! ادھر آؤ۔ وہ دوڑے ہوئے آئے اور ان دونوں کے پاس بیٹھ گئے۔ ابوجہل نے کہا اپنی قوم کے سامنے بیان کیجئے جو میرے سامنے بیان کیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں مجھے رات کو سیر کرائی گئی۔ لوگوں نے پوچھا کہاں تک؟ فرمایا بیت المقدس تک۔ انہوں نے کہا پھر صبح آپ ہمارے درمیان بھی ہیں؟ فرمایا ہاں راوی فرماتے ہیں بعض لوگ تالیاں بجانے لگے اور بعض اپنے سر پر ہاتھ رکھ کر تعجب کرنے لگے۔ کچھ لوگ جو آپ کے نبی ہونے پر ایمان لا چکے تھے اور آپ کی تصدیق کر چکے تھے ان میں سے کچھ مرتد ہو گئے۔ مشرکین میں سے ایک شخص ابوبکر کے پاس دوڑتا ہوا آیا۔ کہا کیا آپ کو اپنے دوست کا علم ہے۔ اس نے کہا ہے کہ مجھے رات کے وقت بیت المقدس کی سیر کرائی گئی ہے۔ ابوبکر نے پوچھا واقعی انہوں نے ایسا فرمایا ہے۔ انہوں نے کہا ہاں۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم

---

1 تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 110 (التجاریہ)

نے کہا ہے تو میں تصدیق کرتا ہوں۔ لوگوں نے کہا کیا تو اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ وہ رات کو بیت المقدس گئے اور صبح کو واپس بھی آ گئے فرمایا ہاں، میں تو اس سے بھی بڑی بات کی تصدیق کرتا ہوں کہ صبح وشام آسمان سے انکی طرف وحی آتی ہے۔ اسی تصدیق کی وجہ سے آپ کو صدیق کا لقب ملا۔ کچھ لوگ وہاں ایسے بھی تھے جنہوں نے بیت المقدس کو دیکھا ہوا تھا۔ کہنے لگے تم ہمارے سامنے بیت المقدس کی صورت بیان کر سکتے ہو؟ فرمایا ہاں۔ حضور فرماتے ہیں میں نے بیت المقدس کے در و دیوار بیان کرنے شروع کیے، بیان کر رہا تھا کہ مجھے کچھ دشواری پیش آئی، فرمایا مسجد قریب لائی گئی میں اسے دیکھ رہا تھا اور عقیل کے قریب رکھ لی۔ میں دیکھ کر سارا کچھ بیان کرتا رہا۔ کہنے لگے قسم بخدا آپ نے بیان تو بالکل صحیح کیا ہے۔ پھر کہا اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمیں ہمارے قافلہ کے متعلق بتایئے، ہمارے لیے وہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ آپ نے اسے کہیں پایا ہے۔ فرمایا ہاں، میں بنی فلاں کے قافلہ کے اوپر سے گذرا، وہ روحاء کے مقام پر تھا۔ ان کا ایک اونٹ گم ہو گیا تھا۔ وہ اسے تلاش کر رہے تھے۔ ان کے کجاووں میں ایک پانی کا پیالہ تھا۔ مجھے پیاس لگی تھی۔ اس سے میں نے پی لیا تھا۔ پھر میں نے اسے رکھ دیا جیسا وہ تھا۔ فرمایا جب وہ قافلہ پہنچے تو پوچھ لینا کیا پیالے میں پانی تھا۔ کہنے لگے یہ تو بڑی نشانی ہے۔ فرمایا میں بنی فلاں فلاں کے قافلہ کے پاس سے گذرا۔ انکے دو آدمی ذی مر کے مقام پر اونٹ پر سوار تھے۔ میری وجہ سے انکا اونٹ بدکا۔ ان سے پوچھ لینا۔ کفار نے کہا یہ بھی بڑی نشانی ہے۔ پھر انہوں نے کہا کسی اور ہمارے قافلہ کے متعلق بتاؤ۔ فرمایا میں تنعیم کے مقام پر اس کے پاس سے گذرا۔ انہوں نے پوچھا انکے اونٹوں کی تعداد اور انکی ہیئت اور انکا سامان کتنا تھا۔ حضور فرماتے ہیں اس وقت میری پوری توجہ اس پر نہ تھی۔ پھر حزورہ کے مقام پر انکی تعداد ہیئت اور کچھ انکا سامان تھا۔ میرے سامنے کر دیا گیا۔ میں نے سب کچھ بیان کر دیا کہ اس کی ہیئت یہ ہے، بھورے رنگ کا اونٹ انکے آگے ہے جس پر سلی ہوئی دو بوریاں لدی ہوئی ہیں۔ سورج کے طلوع ہونے کے وقت تمہارے پاس پہنچے گا۔ انہوں نے کہا یہ بھی بڑی نشانی ہے۔ وہ گھاٹی کی طرف دوڑے ہوئے گئے اور یہ کہہ رہے تھے۔ قسم بخدا محمد نے واقعہ تو بالکل صحیح بیان کر دیا ہے حتی کہ وہ کداء مقام پر آئے اور وہاں سورج کے طلوع ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ اور وہ دل ہی دل میں آپ کی تکذیب کر رہے تھے۔ اچانک ان میں سے ایک نے کہا قسم بخدا سورج طلوع ہو گیا ہے۔ اسی وقت دوسرے نے کہا قسم بخدا قافلہ بھی آ گیا ہے۔ فلاں فلاں شخص اس میں ہے اور بھورا اونٹ آگے آگے ہے۔ جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا تھا ویسا ہی ہوا۔ لیکن وہ ایمان نہ لائے اور کہا ان ھذا لسحر مبین یہ تو کھلا جادو ہے(1)۔

مسلم نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے یاد ہے کہ میں حجر اسود کے پاس تھا اور قریش میرے سفر معراج کے متعلق پوچھ رہے تھے۔ انہوں نے بیت المقدس کی ایسی چیزیں پوچھیں جو مجھے یاد نہ تھیں۔ مجھے اس وقت ایسی تکلیف ہوئی کہ پہلے ایسی کبھی نہ ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اسوقت بیت المقدس کو میرے سامنے کر دیا۔ میں دیکھ کر انکے سوالوں کا جواب دیتا رہا۔ میں نے انبیاء کرام کی جماعت سے بھی ملاقات کی تھی۔ موسیٰ علیہ السلام کھڑے ہو کر نماز پڑھ رہے تھے۔ وہ چھوٹے قد اور گھنگریالے بالوں والے تھے۔ گویا وہ شنوءہ قبیلہ کے ایک فرد ہیں۔ انکی زیادہ مشابہت عروہ بن مسعود ثقفی سے ہے۔ ابراہیم علیہ السلام بھی کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔ وہ میرے مشابہ تھے۔ نماز کا وقت ہوا تو میں نے ان کی امامت کرائی۔ جب میں نماز سے فارغ ہوا تو مجھے ایک کہنے والے نے کہا اے محمد (ﷺ) یہ مالک (فرشتہ) دوزخ کے داروغہ ہیں، ان کو سلام کرو۔ میں ان کی طرف متوجہ ہوا تو انہوں نے مجھے پہلے سلام دیا(2)۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 12-111 (التجاریہ) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 96 (قدیمی)

امام بخاری نے صحیح میں روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس رات مجھے سیر کرائی گئی میری موسیٰ علیہ السلام سے ملاقات ہوئی۔ وہ چھوٹے قد اور گھنگھریالے بالوں والے تھے۔ وہ شنوءہ قبیلہ کے لوگوں کے مشابہ تھے۔ پھر فرمایا میں عیسیٰ علیہ السلام سے ملا۔ وہ درمیانہ قد سرخ رنگ والے تھے۔ یوں لگتا تھا ابھی حمام سے نکل کر آئے ہیں۔ میں نے ابراہیم علیہ السلام کو دیکھا۔ ان کی اولاد میں سے سب سے زیادہ میں انکے مشابہ ہوں۔ فرمایا مجھے دو برتن دیئے گئے۔ ایک میں دودھ تھا اور دوسرے میں شراب۔ مجھے کہا گیا جو چاہتے ہیں ایک لے لو۔ میں نے دودھ لے لیا اور اسے پی لیا۔ برتن پیش کرنے والے نے مجھے کہا تمہاری فطرت کی طرف راہنمائی کی گئی ہے یا کہا تو نے فطرت کو پالیا ہے۔ اگر آپ شراب پیتے تو آپ کی امت گمراہ ہو جاتی۔

صحیحین میں حضرت جابر سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جب قریش نے حجر اسود کے قریب میری تکذیب کی تو اللہ تعالیٰ نے بیت المقدس کو سامنے روشن کر دیا۔ میں دیکھ کر انکے سوالوں کا جواب دیتا رہا (1)۔ ہم نے سورۂ نجم میں آسمانوں اور سدرۃ المنتہیٰ کی سیر کے متعلق احادیث ذکر کی ہیں۔

وَاٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ وَكِيْلًا ۝

"اور دی ہم نے موسیٰ کو کتاب اور بنادیا ہم نے اس کتاب کو باعث ہدایت بنی اسرائیل کیلئے۔ ۱؎ اس میں انہیں حکم دیا کہ نہ بنانا میرے بغیر کسی کو (اپنا) کارساز ۲؎"

۱؎ الْكِتٰبَ سے مراد تورات ہے۔ و جعلناہ میں ضمیر کا مرجع موسیٰ یا الکتاب ہے۔ اَلَّا تَتَّخِذُوْا میں ان اس فعل کی تفسیر بیان کر رہا ہے جس پر الکتاب دلالت کر رہا ہے۔ یعنی کتبنا اور اس میں قول کا معنی پایا جاتا ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے كَتَبْنَا اِلَيْهِمْ اَنْ لَّا تَتَّخِذُوْا۔ یا ان سے پہلے حرف جر مقدر ہے یعنی لان لا تتخذوا۔ بعض علماء فرماتے ہیں ان زائدہ ہے اور القول مضمر ہے۔ ابوعمرو نے لا یتخذوا غائب کا صیغہ پڑھا ہے اور باقی قراء نے خطاب کے صیغہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

۲؎ میرے سوا ایسا رب جس پر تم توکل و اعتماد کرو اور اپنے امور اس کے سپرد کرو یعنی کسی کو میرے سوا خدا نہ بنانا اور کسی کو اپنے امور کا کارساز نہ بنانا۔

ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ؕ اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا ۝

"اے ان لوگوں کی اولاد جنہیں ہم نے (کشتی میں) کرایا نوح کیساتھ ۱؎ بیشک نوح ایک شکر گذار بندہ تھا۔ ۲؎"

۱؎ اس آیت کریمہ میں انکو اللہ تعالیٰ کے انعامات یاد کرائے جارہے ہیں کہ انکے آباؤاجداد کو غرق ہونے سے بچایا نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں سوار کر کے۔ ذُرِّيَّةَ اختصاص یا نداء کی وجہ سے منصوب ہے اگر لا تتخذوا (مخاطب) پڑھا جائے۔ یا فریۃ لا تتخذوا کا مفعول ہے اور من دونی۔ وکیلا سے حال ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا۔

۲؎ نوح علیہ السلام وہ بہت زیادہ شکر کرنے والے تھے۔ ابن مردویہ نے ابو فاطمہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا نوح علیہ السلام ہر چھوٹے بڑے عمل پر بسم اللہ اور الحمد للہ پڑھتے تھے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انہیں عَبْدًا شَكُوْرًا فرمایا (2)۔ ابن جریر اور

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 684 (قدیمی) 2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 294 (العلمیۃ)

الطبرانی نے سعد بن مسعود الثقفی الصحابی سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں نوح علیہ السلام کو عَبۡدًا شَكُوۡرًا اس لئے فرمایا کہ وہ جب بھی کچھ کھاتے یا پیتے یا کوئی کپڑے پہنتے تو اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرتے(1)۔ اس آیت میں شکر پر برانگیختہ کیا جارہا ہے یعنی تم ان لوگوں کی اولاد ہو جو نوح علیہ السلام پر ایمان لائے تھے اور انکے ساتھ کشتی میں سوار ہوئے تھے۔ پس تم بھی انکی طرح مومن بن جاؤ۔

وَقَضَيۡنَاۤ اِلٰى بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ فِى الۡكِتٰبِ لَتُفۡسِدُنَّ فِى الۡاَرۡضِ مَرَّتَيۡنِ وَلَتَعۡلُنَّ عُلُوًّا كَبِيۡرًا ۝

"اور ہم نے آگاہ کر دیا تھا بنی اسرائیل کو کتاب میں کہ تم ضرور فساد برپا کرو گے زمین میں ۱ے مرتبہ ۲ے تم (احکام الٰہی سے) بڑی سرکشی کرو گے ۳ے"

۱ے الکتاب سے مراد تورات ہے اور الارض سے مراد شام کی زمین ہے(2)۔ ابن عباس اور قتادہ نے فرمایا یہاں الی کا کلمہ علی کے معنی میں ہے اور آیت کا معنی یہ ہے ہم نے بنی اسرائیل پر لوح محفوظ میں لکھ دیا کہ تم فساد کرو گے۔ لتفسدن محذوف قسم کا جواب ہے یا حتمی فیصلہ قسم کے قائم مقام ہو کر قضینا کا جواب ہے۔

۲ے ایک فساد، یہ کہ انہوں نے تورات کے احکام کی مخالفت کی۔ محارم پر کمربستہ ہو گئے اور شعیا بن امصیا علیہ السلام کو قتل کیا۔ دوسرا فساد یہ کہ حضرت ذکریا اور یحیٰی علیہما السلام کو قتل کیا اور عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کی سازش و ارادہ کیا۔ بعض علماء فرماتے ہیں۔ ان کا پہلا فساد زکریا علیہ السلام کا قتل تھا اور دوسرے یحیٰی علیہ السلام کا قتل اور عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کا ارادہ۔

۳ے یعنی تو اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے تکبر کرو گے اور لوگوں پر ظلم و ستم روا رکھو گے۔

فَاِذَا جَآءَ وَعۡدُ اُوۡلٰٮهُمَا بَعَثۡنَا عَلَيۡكُمۡ عِبَادًا لَّنَاۤ اُولِىۡ بَاۡسٍ شَدِيۡدٍ فَجَاسُوۡا خِلٰلَ الدِّيَارِ‌ ؕ وَكَانَ وَعۡدًا مَّفۡعُوۡلًا ۝

"پس جب آ گیا پہلا وعدہ ان دونوں وعدوں سے تو ہم نے (تمہاری سرکوبی کے لئے) بھیج دیئے اپنے چند بندے جو بڑے کرخت (اور) سخت تھے ۱ے پس وہ گھس گئے (تمہاری) آبادیوں میں ۲ے اور جو وعدہ اللہ تعالیٰ نے کیا تھا وہ پورا ہو کر رہنا تھا ۳ے"

۱ے یعنی جب سزا کا پہلا وعدہ آ پہنچا تو ہم نے مسلط کر دیئے تم پر اہل نینوئی سے سنحاریب اور اس کے ساتھیوں کو۔ سعید بن جبیر کا یہی قول ہے۔ قتادہ فرماتے ہیں جالوت اور ان کا لشکر مراد ہے۔ وہ جالوت جس کو داؤد علیہ السلام نے قتل کیا تھا۔ ابن اسحاق فرماتے ہیں بخت نصر البابلی مراد ہے، امام بغوی فرماتے ہیں یہی قول ظاہر ہے(3)۔

۲ے وہ تمہارے شہروں کے درمیان گھس گئے وہ تمہیں تلاش کر کے قتل کرتے تھے۔ زجاج کہتے ہیں جوس کا معنی ہے پوری کوشش سے کسی چیز کو تلاش کرنا۔ فراء کہتے ہیں اس کا معنی ہے انہوں نے تمہیں اپنے گھروں میں قتل کر دیا۔

۳ے اور تمہاری سزا کا جو وعدہ ہے اس نے یقیناً پورا ہونا تھا۔

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 294 (العلمیہ)
2۔ تفسیر خازن، جلد 4، صفحہ 117 (التجاریہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 118 (التجاریہ)

ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَأَمْدَدْنٰكُمْ بِأَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَجَعَلْنٰكُمْ أَكْثَرَ نَفِيْرًا ﴿٦﴾

"پھر ہم نے پلٹا دیا تمہارے حق میں زمانہ کی گردش کو جو دشمن کے خلاف تھی[1] اور ہم نے قوت دی تمہیں مال سے بیٹوں سے اور بنا دیا تمہیں یعنی کثیر التعداد[2]"

[1] یعنی ہم نے تمہیں سلطنت و غلبہ عطا کیا انکے مقابلہ میں جنہیں تمہاری طرف بھیجا گیا تھا۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ستاسپ بن ہراسپ کے پوتے بہمن بن اسفندیار کے دل میں بنی اسرائیل کی شفقت کا جذبہ پیدا فرما دیا جو اپنے دادا کی وراثت میں حکمران بنا تھا۔ اس نے بنی اسرائیل کے قیدیوں کو شام بھیج دیا اور حضرت دانیال کو انکا بادشاہ بنایا۔ پھر ان اسرائیلیوں نے بخت نصر کے بقیہ لوگوں میں جو شام میں موجود تھے ان پر قبضہ کر لیا۔ یا اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام کو جالوت پر مسلط فرمایا اور انہوں نے اسے قتل کر دیا(1)۔

[2] نفیر سے مراد کسی شخص کی قوم کے افراد جو اس کے ساتھ چلتے ہیں۔ بعض علما فرماتے ہیں یہ نفر کی جمع ہے بروزن عبید۔ نفر سے مراد وہ قوم جو دشمن کے مقابلہ میں جانے کیلئے جمع ہو۔ جب اللہ تعالیٰ نے اسرائیلیوں کو غلبہ عطا فرمایا ان کے شہر پہلے سے زیادہ بارونق اور خوبصورت ہو گئے۔

إِنْ أَحْسَنْتُمْ أَحْسَنْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ ۗ وَإِنْ أَسَأْتُمْ فَلَهَا ۚ فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا ﴿٧﴾

"اگر تم اچھے کام کرو گے تو ان کا فائدہ تمہیں ہی پہنچے گا[1] اور اگر تم برائی کرو گے تو اسکی سزا بھی (تمہارے) نفسوں کو ملے گی[2] پس جب آ گیا دوسرا وعدہ (تو اور ظالم ان پر غالب آ گئے) تا کہ غمناک بنا دیں تمہارے چہروں کو[3] اور تا کہ (جبراً) داخل ہو جائیں مسجد میں جیسے داخل ہوئے تھے اس میں پہلی مرتبہ تا کہ تباہ و برباد کر کے رکھ دیں جس پر قابو پائیں[4]"

[1] اگر تم فرمانبرداری اور طاعت کو اپنا شعار بناؤ تو تم اپنے ساتھ ہی احسان کرو گے کیونکہ نیکیوں کا فائدہ تمہیں پہنچتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تو تمہاری اطاعت سے مستغنی ہے۔

[2] اگر تم فساد برپا کر کے برائی کو رواج دو گے تو اسکا وبال بھی تم پر ہو گا۔ اتصال کی وجہ سے علی کی جگہ لام کو ذکر فرمایا ہے۔

[3] جب دوسری مرتبہ سزا کا وقت آ پہنچا تو ہم نے پھر تم پر دوسرے ظالم بھیج دیے تا کہ وہ تمہارے چہروں کو غمناک بنا دیں۔ یہاں بعثنا کو حذف کر دیا ہے کیونکہ پہلا بعثنا اس پر دلالت کر رہا ہے کسائی اور یعقوب نے لنسوء نون کے ساتھ اور ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ بعثنا اور قضینا کی موافقت کرتے ہوئے تکلم اور تعظیم کے صیغہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن عامر حمزہ اور ابوبکر نے بے واحد غائب کا صیغہ پڑھا ہے۔ معنی یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ یا بعث یا وعدہ انکے چہروں کو غمناک بنا دے اور باقی قراء نے جمع مذکر غائب کا صیغہ پڑھا ہے یعنی وہ کرخت و سخت بندے تمہارے چہروں کو غمناک بنا دیں۔ امام بغوی فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے اُن پر فارس و روم' خردوش' ططیوس کو ان پر مسلط فرما دیا حتی کہ انہوں نے بنی اسرائیل میں سے بعض کو قتل کیا، بعض کو قیدی بنایا اور بعض کو ملک بدر کر دیا(2)۔

1۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 371 (فراس) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 118 (التجاریہ)

ہے تاکہ وہ بیت المقدس اور اس کے گردونواح میں داخل ہو جائیں جس طرح وہ پہلی مرتبہ داخل ہوئے تھے۔ اور وہ ہلاک کر دیں انکو جن پر وہ قابو پالیں۔ یا ما علوا میں ما ظرفیہ مصدریہ ہے۔ معنی ہوگا ان پر غلبہ کی مدت میں وہ انہیں تباہ و برباد کر دیں۔

امام بغوی فرماتے ہیں محمد بن اسحاق نے فرمایا بنو اسرائیل احکام الٰہیہ پر کمر بستہ ہو چکے تھے۔ گناہ اور نافرمانی ان میں سرایت کر چکے تھے لیکن اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کاملہ کے سبب ان سے درگذر فرماتا رہا اور ان پر نوازشات و عنایات کی بارش برساتا رہا۔ سب سے پہلے اُن کے گناہوں کے سبب ان پر جو مصیبت اتری' جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام کی زبان کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ انکا ایک بادشاہ تھا جسکا نام صدیقہ تھا اور یہ دستورِ الٰہی تھا کہ جب بنی اسرائیل پر کوئی بادشاہ بنتا تو اس کے ساتھ ایک نبی بھی مبعوث فرماتا جو اسکی راہنمائی کرتا۔ اس نبی پر کتاب نازل نہ ہوتی بلکہ ہر ایک تورات کی اتباع اور اس کے احکام کی پیروی کا حکم دیتا۔ جب صدیقہ بادشاہ بنا تو اللہ تعالیٰ نے اس کیلئے شعیا بن امضیا کو مبعوث فرمایا۔ یہ واقعہ حضرت زکریا' یحییٰ اور عیسیٰ علیہ سے پہلے کا ہے' شعیا نبی نے عیسیٰ علیہ السلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی بشارت دی تھی۔ اے یروشلم تمہیں مبارک ہو تمہارے پاس ایک گدھے پر سوار اور اس کے بعد اونٹ پر سوار آنیوالا ہے۔ صدیقہ بادشاہ بنی اسرائیل اور بیت المقدس کا ایک زمانہ بادشاہ رہا' جب اسکی بادشاہی ختم ہونے کو آئی تو بنی اسرائیل میں گناہ و غلط کاریاں شروع گئیں اور شعینا بھی انکے ساتھ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے سنحاریب بابل کے بادشاہ کو بھیجا جسکے ساتھ چھ لاکھ علم تھے سنحاریب چلتے چلتے بیت المقدس کے قریب پہنچ گیا۔ صدیقہ بادشاہ کی پنڈلی پر پھوڑا نکلا ہوا تھا۔ شعیا نبی صدیقہ کے پاس آئے اور فرمایا اے بادشاہ بنی اسرائیل بابل کا بادشاہ سنحاریب اپنے لشکر کے ساتھ تمہارے قریب پہنچ چکا ہے۔ اس کے لشکر میں چھ لاکھ جھنڈے ہیں۔ لوگ ان سے ڈر کر بھاگ گئے ہیں۔ بادشاہ صدیقہ پر یہ بات بڑی شاق گذری۔ اس نے پوچھا اے اللہ کے نبی کیا تمہارے پاس کوئی وحی آئی ہے کہ کیا ہونے والا ہے' ہمیں بتایئے اللہ تعالیٰ ہمارے اور سنحاریب اور اس کے لشکر کے ساتھ کیا کرنے والا ہے' نبی نے فرمایا میرے پاس وحی تو نہیں ہے۔ اس گفتگو کے دوران ہی اللہ تعالیٰ نے شیعا نبی کی طرف وحی فرمادی کہ تم بادشاہ کے پاس جاؤ اور اسے کہو کہ وہ وصیت لکھ دے اور اپنا جانشین بنادے۔ حضرت شعیا بنی اسرائیل کے بادشاہ کے پاس آئے اور فرمایا تمہارے پروردگار نے میری طرف وحی فرمائی ہے کہ میں تجھے حکم دوں کہ تو اپنی وصیت لکھ دے اور اپنے گھر والوں میں سے جسے چاہتا ہے اپنا خلیفہ بنادے۔ تیری موت کا وقت قریب ہے۔ جب شعیا نبی نے صدیقہ کو یہ پیغام دیا تو وہ قبلہ رو ہو کر کھڑا ہو گیا' نماز پڑھی' اور پوری حضورِ قلب اور تضرع وزاری کے ساتھ دعا مانگی اے رب الارباب' اے الہ الآلہا' اے قدوس المتقدس' اے رحمان' اے رؤوف جسے نہ اونگھ آتی ہے نہ نیند۔ میں نے جو نیک اعمال کیئے' بنی اسرائیل میں جو انصاف سے فیصلے کیے یہ سب تیری توفیق اور بندہ نوازی سے ہوئے' تجھ پر میرا باطن و ظاہر عیاں ہے' رحمٰن و رحیم رب نے اسکی دعا کو شرف قبولیت عطا فرمایا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا نیکوکار بندہ تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے شعیا کی طرف وحی فرمائی کہ صدیقہ کو بتا کہ تیرے رب نے تیری دعا قبول فرمالی ہے اور رحم فرمایا ہے اور اسکی عمر کو پندرہ سال تک مؤخر فرمادیا ہے اور اسکے دشمن سنحاریب سے بھی نجات عطا فرمادی ہے۔ شعیا آئے اور صدیقہ کو پیغام الٰہی سنادیا۔ جب صدیقہ نے یہ خبر سنی تو اسکی پریشانی دور ہو گئی اور غم و حزن دور ہو گیا اور وہ سجدہ کرتے ہوئے زمین پر گر پڑا اور عرض کی اے میرے معبود' اے میرے آباء کے معبود میں تیری ہی بارگاہ میں سجدہ کرتا ہوں۔ تیری ہی تسبیح بیان کرتا ہوں' تیری عظمت و کرامت کا اعتراف کرتا ہوں' تو ہی وہ ذات ہے' جسے چاہتا ہے شاہی عطا فرماتا ہے' جسے چاہتا ہے بادشاہی چھین لیتا ہے' جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے' جسے چاہتا ہے

ذلت دیتا ہے تو غیب وشہادت کو جاننے والا ہے۔ تو ہی اول آخر ظاہر اور باطن ہے۔ تو رحم فرماتا ہے، تو ہی مجبور الحال لوگوں کی دعاؤں کو قبول فرماتا ہے، تو نے ہی میری عرض داشت کو قبول فرمایا، میری آہ وفغاں پر رحم فرمایا۔ پھر جب سر سجدہ سے اٹھایا تو اللہ تعالیٰ نے شعیا کی طرف وحی بھیجی کہ صدیقہ کو کہو کہ وہ اپنے کسی غلام کو حکم دے کہ وہ انجیر کا پانی لائے اور اسکے زخم پر لگائے زخم ٹھیک ہو جائے گا۔ اس نے ایسا کیا تو اسے شفا بھی مل گئی۔ بادشاہ نے شعیا سے عرض کی اپنے پروردگار سے پوچھئے کہ وہ ہمیں بتائے کہ ہمارے اس دشمن کے ساتھ کیا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے شعیا کو فرمایا کہ صدیقہ کو بتاؤ کہ میں نے تمہارے دشمن کو روک دیا ہے اور تجھے ان سے نجات دے دی ہے۔ صبح ہوتے ہی سنحاریب اور اسکے پانچ کاتبوں کے علاوہ سب مر جائیں گے۔ جب صبح ہوئی تو ایک شخص نے شہر کے دروازے پر چیخ کر کہا اے بنی اسرائیل کے بادشاہ اللہ تعالیٰ نے تیرے دشمن کو روک دیا ہے تو نکلو اور دیکھو کہ سنحاریب اور اسکے لشکری ہلاک ہو چکے ہیں۔ بادشاہ باہر نکلا تو اس نے سنحاریب کو تلاش کیا مگر وہ ان مردوں میں نہ ملا۔ بادشاہ نے اسکی تلاش میں آدمی بھیجے جنہوں نے اسے اور اسکے پانچ ساتھیوں سمیت ایک غار میں سے پکڑ لیا ان میں ایک بخت نصر بھی تھا۔ انہیں وہ زنجیروں میں جکڑ کر بادشاہ کے پاس لے آئے۔ بادشاہ صدیقہ اللہ تعالیٰ کی یہ بندہ نوازی دیکھ کر صبح سے لیکر عصر تک سربسجود رہا تو اس نے سنحاریب کو کہا تو نے ہمارے رب کی قدرت کو کیسا پایا اس نے تمہیں اپنی طاقت وقوت سے قتل کر دیا ہے۔ جبکہ ہم اور تم غافل ہیں۔ سنحاریب نے کہا تمہارے رب کی خبر اور تمہاری نصرت کا علم تو مجھے پہلے ہی ہو چکا تھا، جبکہ ابھی میں شہر سے نکلا ہی نہ تھا کہ وہ اپنی رحمت سے تمہاری مدد فرمائے گا اور تم پر رحم کرے گا لیکن میں نے اپنے ہادی ومرشد کی بات نہ مانی اور میری کم عقلی نے مجھے اس شقوت میں ڈال دیا ہے۔ اگر میں کچھ سنتا اور سمجھتا تو میں تم سے جنگ کرنے کے ارادہ سے نہ آتا۔ صدیقہ نے کہا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعِزَّةِ الَّذِیْ کَفَانَا کُمْ بِمَا شَاءَ۔ شکر ہی اس عزت والے رب کا جس نے تم سے ہماری کفایت فرمائی جس طاقت سے چاہی۔ اے سنحاریب اللہ تعالیٰ نے تجھے اور تیرے ساتھیوں کو کسی عزت وکرامت کی وجہ سے نہیں چھوڑا بلکہ اس لیئے تم کو چھوڑا ہے تا کہ دنیا میں تمہاری شقوت اور آخرت میں عذاب زیادہ ہو جائے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ تم اپنے پچھلے رہنے والوں کو اس نیت ناک صورت حال سے آگاہ کرو جو ہمارے رب نے تمہاری بنا دی ہے تا کہ تم اپنے بعد والوں کو ڈراؤ۔ اگر یہ حکمتیں نہ ہوتیں تو میں تمہیں قتل کر دیتا۔ تیرا اور تیرے حواریوں کا خون اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ایک چچڑی کے خون سے بھی ارزاں اور حقیر ہے اگر میں تجھے قتل کر دوں۔ پھر بادشاہ نے اپنے ملازم کو حکم دیا کہ انہیں لے جاؤ۔ تو اس نے انکے گلے میں زنجیریں ڈال دیں اور انہیں ستر دنوں تک بیت المقدس اور ایلیاء کے اردگرد چکر لگوایا۔ وہ انہیں ہر روز ہر شخص کو دو روٹیاں جو کی پکی ہوئی کھانے کیلئے دیتا۔ سنحاریب نے بنی اسرائیل کے بادشاہ کو کہا جو سلوک تم ہمارے ساتھ کر رہے ہو اس سے تو قتل ہونا بہتر ہے بادشاہ نے حکم دیا کہ انہیں قتل والی کوٹھڑی میں لے جاؤ۔ اللہ تعالیٰ نے شعیا نبی علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی کہ بنی اسرائیل کے بادشاہ کو کہو کہ سنحاریب اور اس کے ساتھیوں کو چھوڑ دے تا کہ وہ اپنے پیچھے رہنے والوں کو ڈرائیں۔ ان کو عزت دو اور سواریوں پر سوار کر دتا کہ یہ اپنے علاقہ میں پہنچ جائیں۔ حضرت شعیا علیہ السلام نے صدیقہ بادشاہ کو یہ پیغام پہنچایا تو اس نے حکم الٰہی کی تعمیل کی۔ سنحاریب اور اسکے ساتھی وہاں سے نکل پڑے حتیٰ کہ بابل پہنچ گئے۔ وہ شہر میں داخل ہوئے تو لوگ ان کے اردگرد جمع ہو گئے۔ سنحاریب نے لوگوں کو سارا ماجرا سنایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لشکر کے ساتھ کیا گیا ہے کاہنوں اور جادوگروں نے سنحاریب کو کہا اے بابل کے بادشاہ ہم تو پہلے ہی تجھے انکے رب کی طاقت اور انکے نبی کے معاملہ کے متعلق بتا چکے تھے اور ہم نے تمہیں بتایا تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کے نبی کی طرف وحی فرماتا

ہے لیکن تو نے ہماری بات نہ مانی۔ وہ ایک ایسی امت ہے انکے رب کے ہوتے ہوئے کوئی ان پر غالب نہیں آسکتا۔ سخاریب کا معاملہ اسکی قوم کو ڈرانے کیلئے ہوا تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انکے لیے اس واقعہ کو تذکرہ اور نصیحت بنایا۔ اسکے بعد سخاریب سات سال زندہ رہا تھا پھر مر گیا۔ اسکا پوتا بخت نصر خلیفہ بنا۔ بخت نصر نے اپنے دادا جیسے کام کیئے۔ بخت نصر کا سترہ سالہ دور سلطنت رہا۔ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے بادشاہ صدیقہ کی روح بھی قبض کر لی۔ صدیقہ کے بعد بادشاہت کے حصول کیلئے جنگ و جدل اور مقابلہ شروع ہو گیا۔ بعض نے بعض کو قتل کر دیا۔ جبکہ شعیا علیہ السلام انکو نصیحت کرتے لیکن وہ انکی بات پر کان نہ دھرتے تھے۔ جب انکی سرکشی انتہا کو پہنچ گئی تو اللہ تعالیٰ نے شعیا علیہ السلام کو فرمایا تم اپنی قوم میں کھڑے ہو جاؤ میں تمہاری زبان پر اپنا پیغام جاری فرماؤں گا۔ جب شعیا علیہ السلام کھڑے ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے انکی زبان پر یہ کلمات جاری فرمائے۔ اے آسمان غور سے سن لے اے زمین توجہ سے سن، اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل کی کیفیت بیان کرنا چاہتا ہے۔ جنہیں اس نے اپنی نعمتوں سے نوازا اپنا قرب عطا فرمایا۔ اپنے بندوں پر انہیں عزت و فضیلت عطا فرمائی۔ یہ چھوڑی ہوئی بکریوں کی مانند تھے جن کا کوئی نگران نہ تھا۔ اس نے انکی بکھری بکریوں کو جمع کیا۔ گم گشتہ کو یکجا فرمایا ٹوٹے ہوؤں کو جوڑ دیا۔ انکے مریضوں کا علاج کیا انکے کمزوروں کو موٹاپا عطا فرمایا۔ انکے فربہوں کی حفاظت فرمائی۔ جب یہ سب عنایات ملیں تو یہ اکڑ گئے، ایک دوسرے کو سینگ مار کر ایک دوسرے کو قتل کرنے لگے۔ حتی کہ کوئی ہڈی صحیح نہیں رہی کہ کوئی شکستہ اسکو جوڑ دے۔ ہلاکت ہو اس خطا کار قوم کیلئے جنہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ ان پر ہلاکت کی وجہ کیا ہے۔ اونٹ کو جب اپنا وطن یاد آتا ہے تو وہ وطن کو واپس آجاتا ہے۔ گدھے کو جب اپنا چارا یاد آتا ہے تو وہ بھی لوٹ آتا ہے۔ بیل کو جب گھاس کی یاد آتی ہے تو وہ بھی لوٹ آتا ہے' لیکن یہ ایسے لوگ ہیں انہیں اس ہلاکت کی وجہ کا علم بھی نہیں حالانکہ یہ صاحب عقل ہیں۔ نہ یہ بیل ہیں نہ اونٹ ہیں۔ میں ان کی مثال بیان کرتا ہوں، اسے غور سے سنو۔ ان کو فرمایئے تمہارا کیا خیال ہے؟ ایک سفیدہ زمین بنجر و ویران پڑی ہو، اس میں کوئی آبادی نہ ہو اور اس کا مالک حکیم اور قوی ہو۔ اس نے اسے آباد کرنے کا ارادہ کیا اس نے پسند نہ کیا کہ اس کا مالک قوی ہونے کے باوجود اپنی زمین کو بنجر رکھے ہوئے کہا جائے کہ اس نے زمین کو ضائع کر دیا ہے حالانکہ وہ حکیم ہے، وہ اس کے اردگرد چاردیواری بناتا ہے اور اس میں ایک عظیم الشان محل تیار کرتا ہے اور اس میں نہر جاری کرتا ہے اور اس میں زیتون' انار' کھجور' انگور اور دوسری اقسام کے پھل دار درخت لگاتا ہے۔ پھر ایک باہمت طاقتور امانتدار محافظ سے اس زمین کی حفاظت کراتا ہے۔ جب ان درختوں پر شگوفے لگے تو وہ خراب تھے۔ لوگ کہنے لگے یہ زمین کتنی بری ہے۔ ہمارا خیال ہے اس کی دیواروں اور محل کو گرا دیا جائے، اس کی نہر کو بند کر دیا جائے اور اس کے درختوں کو جلا دیا جائے تاکہ یہ پہلے کی طرح برباد و ویران ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے میرے نبی انہیں فرمایئے یہ دیوار میرا دین ہے، یہ محل میری شریعت ہے' نہر میری کتاب ہے اور محافظ میرا نبی ہے اور درخت یہ لوگ ہیں اور جو ان درختوں پر شگوفوں کا ذکر ہے، اس سے مراد ان کے برے اعمال ہیں۔ جو انہوں نے خود فیصلہ کیا ہے میں نے ان پر وہی فیصلہ کر دیا ہے۔ یہ ایک مثال ہے جو میں نے ان کے لیے بیان کی ہے۔ یہ گائیں اور بکریاں ذبح کر کے میرا قرب چاہتے ہیں حالانکہ نہ مجھے گوشت پہنچتا ہے اور نہ میں کھاتا ہوں۔ انہیں کہا گیا کہ تقویٰ اور ناحق قتل سے اجتناب کر کے میرا قرب حاصل کرو لیکن ان کے ہاتھ خون ناحق سے سرخ ہیں اور ان کے کپڑے اس خون سے آلودہ ہیں۔ یہ لوگ میرے لیے پختہ گھر یعنی مساجد بناتے ہیں اور ان کے اندر کو بڑا صاف ستھرا رکھتے ہیں لیکن اپنے جسموں اور دلوں کو بہت گندا اور میلا رکھتے ہیں۔ مساجد میں پردے لٹکاتے ہیں اور ان کو مزین کرتے ہیں لیکن اپنی عقلوں اور اخلاق کو

درست نہیں کرتے۔ مجھے ان پختہ مساجد کی کیا ضرورت ہے میں تو ان میں رہتا نہیں ہوں۔ مساجد پر پردے لٹکانے کی کیا ضرورت، میں تو ان میں داخل ہی نہیں ہوتا میں نے ان مساجد کو بلند کرنے کا حکم دیا ہے کیونکہ ان میں میرا ذکر و تسبیح ہوتی ہے' یہ کہتے ہیں ہم روزے رکھتے ہیں لیکن ہمارے روزے اوپر نہیں اٹھائے جاتے، ہم نماز پڑھتے ہیں، ہماری نمازوں میں نور نہیں ہے، ہم صدقہ دیتے ہیں لیکن ہمارے صدقات ہمیں پاک نہیں کرتے، ہم گدھے کی مثل بلند آواز سے دعا مانگتے ہیں بھیڑیوں کی آوازوں کی طرح روتے ہیں لیکن ہماری دعائیں قبول نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ان سے پوچھتے مجھے انکا یہ سب کچھ قبول کرنے سے کیا مانع ہے، کیا زیادہ سننے والا نہیں ہوں' کیا سب سے زیادہ دیکھنے والا نہیں ہوں، کیا قبول کرنے والوں میں سے قریب ترین نہیں ہوں یا میں ارحم الراحمین نہیں ہوں۔ میں ان کے روزے کیسے قبول کروں جبکہ یہ جھوٹ بولتے ہیں اور حرام کا رزق کھاتے ہیں، ان کی نمازوں میں نور کیسے پیدا کروں جبکہ ان کے دل ان کی طرف مائل ہوتے ہیں جو میرے محارب ہیں اور میرے دشمن ہیں اور جو میرے احکام کی ہتک کرتے ہیں۔ میرے ہاں ان کے صدقات کیسے پاکیزہ ہوں، جبکہ یہ صدقہ ہی دوسروں کا مال کرتے ہیں صدقات کا اجر تو میں صرف معصوم صدقات کرنے والوں کو دیتا ہوں' میں ان کی دعاؤں کو کیسے قبول کروں جبکہ انکے قول و فعل میں بعد ہے۔ دعا میں نرم لوگوں کی قبول کرتا ہوں۔ میں اسکی دعا کو مانتا ہوں جو مسکین ہو مگر مانگنے والا نہ ہو۔ میری رضا کی علامت مساکین کی رضا ہے۔ جب میرا کلام سنتے ہیں اور تو ان کو میرا پیغام پہنچاتا ہے تو کہتے ہیں یہ تو گھڑی ہوئی باتیں اور پرانے قصے ہیں اور ایسے الفاظ سے مرکب ہے جن سے جادوگر اور کاہن کلام کو جوڑتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اگر یہ بھی چاہیں تو اسی قسم کا کلام بنا سکتے ہیں اور شیطان جو ان کی طرف وحی کرتے ہیں اس کے سبب غیب پر مطلع ہو سکتے ہیں۔ میں نے جس دن سے آسمان و زمین کو پیدا کیا ہے۔ اس دن سے اپنے اوپر ایک حتمی فیصلہ کر لیا ہے اور اس کی ایک مدت متعین کر دی ہے۔ یقیناً وہ فیصلہ ہو کر رہے گا۔ اگر یہ علم غیب کی نسبت میں سچے ہیں تو مجھے بتا دیں کہ میں کب اس فیصلہ کو نافذ کرنے والا ہوں اور کس وقت وہ فیصلہ ہو گا۔ اگر یہ قدرت رکھتے ہیں کہ جو چاہیں کر سکتے ہیں تو میری طرح اپنی قدرت کا مظاہرہ کریں۔ میں اس فیصلہ کو تمام ادیان پر غالب کروں گا اگر مشرک اس کو ناپسند بھی کریں۔ اگر یہ قدرت رکھتے ہیں کہ جو چاہیں مرکب کر سکتے ہیں تو ایسی حکمت کے ساتھ تالیف کریں جس حکمت سے میں قضا سے تدبیر کرتا ہوں۔ اگر یہ سچے ہیں تو ایسی حکمت کے ساتھ تالیف کریں جس حکمت سے میں قضا کی تدبیر کرتا ہوں اگر یہ سچے ہیں۔ میں نے اسمانوں و زمین کی تخلیق کے دن سے فیصلہ کر دیا ہے کہ میں نبوت کا سلسلہ جاری کروں گا۔ بادشاہی چرواہوں میں' عزت' کمزوروں میں' قوت ضعیفوں میں' غنیٰ فقراء میں، علم جاہلوں میں اور حکم ان پڑھوں میں رکھوں گا۔ ان سے پوچھئے یہ کب ہو گا۔ اور یہ کون کرے گا اور اس معاملہ میں اعوان و انصار کون ہوں گے۔ (بتائیں) اگر یہ جانتے ہیں۔ میں ایک امی نبی کو مبعوث کرنے والا ہوں۔ جو امی ہو گا جو اکھڑ مزاج اور درشت طبیعت نہ ہو گا۔ بازاروں میں چیخنے والا نہ ہو گا۔ فحش بات زبان پر نہ لائے گا۔ بے حیائی کی باتیں نہ کرے گا۔ میں اس کو سیدھا چلاؤں گا، اسے ہر خلق عظیم عطا کروں گا۔ سکینہ اسکا لباس' نیکی اسکا شعار تقویٰ اس کا ضمیر' حکمت اسکا معقول صدق' وفا اس کی طبیعت' عفو و نیکی اس کا اخلاق' عدل اس کی سیرت' حق اسکی شریعت اسکا نام' اسلام اس کی ملت ہو گی اور نام اس کا احمد ہو گا۔ اس کے ذریعے گمراہی کے بعد ہدایت دوں گا۔ اس کے ذریعے میں علم عطا کروں گا۔ گمنامی کے بعد اس کے ذریعے بلندی عطا کروں گا۔ نکارت کے بعد اسکے ذریعے شہرت عطا کروں گا۔ اس کے ذریعے قلت کے بعد کثرت' فقر کے بعد غنیٰ فرقت کے جمعیت عطا کروں گا۔ مختلف دلوں' بکھری خواہشات اور متفرق امتوں کو

اسکے ذریعے متحد کروں گا۔ اس کی امت کو بہترامت بناؤں گا۔ جو لوگوں کیلئے نکالی گئی ہے وہ نیکی کا درس دیں گے، برائی سے روکیں گے' مجھے یکتا مانیں گے، مجھ پر ایمان لائیں گے اور میرے لیے ہر عمل کو اخلاص سے ادا کریں گے۔ کھڑے بیٹھے رکوع میں اور سجدے میں میری عبادت کریں گے۔ میرے راستہ میں جہاد کریں گے' اپنے گھروں اور مالوں کو میری رضا کیلئے چھوڑ جائیں گے۔ میں انہیں سفر' مجلس' آرام گاہ' اور قیام گاہ' میں اپنی تکبیر' توحید' تسبیح' تحمید' مدحت اور تمجید الہام کروں گا۔ وہ ٹیلوں کے اوپر میری تقدیس' تہلیل اور بڑائی بیان کریں گے۔ میرے لیے اپنے چہروں اور اطراف کو صاف رکھتے ہیں۔ اپنے کپڑے اپنی کمروں پر باندھیں گے انکی قربانیاں ان کے خون ہوں گے۔ ان کے سینے قرآن آیات کا خزینہ ہوں گے۔ راتوں کو عبادت گذار دن کو دشمن کے سامنے شیر ہوں گے یہ میرا فضل ہے، جسے چاہتا ہوں عطا کرتا ہوں اور میں بہت بڑے فضل والا ہوں۔ جب شعیا علیہ السلام اپنے خطبہ سے فارغ ہوئے تو وہ آپ پر ٹوٹ پڑے تا کہ ان کو قتل کر دیں۔ آپ ان سے بھاگ گئے۔ سامنے ایک درخت آیا وہ پھٹ گیا اور شعیا علیہ السلام اس میں داخل ہو گئے۔ شیطان نے آپ کو پالیا اور آپ کا کپڑا پکڑ لیا۔ شیطان نے ان لوگوں کو وہ کپڑا دکھایا۔ تو انہوں نے درخت پر آری چلا دی اور اسے چیر دیا حتی کہ انہوں نے درخت کو بھی کاٹ لیا اور اس کے اندر سے شعیا علیہ السلام کو بھی دو ٹکڑے کر دیئے۔

اس کے بعد بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ نے ان میں سے ایک شخص کو بادشاہ بنایا جسکا نام ناشیہ بن آموص تھا اور اسکی راہنمائی کیلئے حضرت ہارون بن عمران کی اولاد سے ارمیا بن حلقیا کو نبی بنا کر مبعوث فرمایا۔ ابن اسحاق نے ذکر کیا ہے کہ یہ خضر علیہ السلام تھے جنکا نام ارمیا تھا۔ انکو خضر کا لقب اس لئے ملا تھا کہ ایک دفعہ یہ خشک گھاس پر بیٹھے تھے۔ اٹھے تو وہ سر سبز ہو کر لہلہا رہی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ارمیا کو اس بادشاہ کی ہدایت و راہنمائی کیلئے بھیجا تھا۔ بنی اسرائیل میں پھر گناہ در آئے۔ اور وہ نافرمانیوں کے گھوڑے پر سوار ہو گئے اور حرام چیزوں کو حلال کرنے لگے تو اللہ تعالیٰ نے ارمیا علیہ السلام کو وحی فرمائی کہ تم اپنی قوم کے پاس جاؤ اور جو میں حکم دے رہا ہوں وہ ان کو سناؤ، ان کو میری نعمتیں یاد دلاؤ اور انکے گناہ انکو بتاؤ۔ ارمیا علیہ السلام نے کہا اے میرے رب میں کمزور ہوں اگر تو مجھے قوت نہ دے، میں عاجز ہوں اگر تو مجھے اپنے مقصود تک نہ پہنچائے، میں تو رسوا ہوں گر تو میری مدد نہ فرمائے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کیا تو نہیں جانتا کہ تمام کام میری مشیت سے انجام پذیر ہوتے ہیں۔ دل اور زبانیں میرے ہاتھ میں ہیں، جیسے چاہتا ہوں انکو پھیرتا ہوں۔ میں تمہارے ساتھ ہوں میرے ہوتے تمہیں کوئی چیز لاحق نہ ہوگی۔ حضرت ارمیا اٹھے لیکن کچھ معلوم نہ تھا کہ کیا کہنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک خطبہ بلیغہ الہام فرمایا۔ جس میں طاعت کا ثواب اور گناہ کا عذاب بیان فرمایا آخر میں اللہ تعالیٰ سے روایت کر کے فرمایا میں اپنی عزت کی قسم کھاتا ہوں کہ میں ان پر فتنہ مسلط کروں گا جس میں حلیم بھی حیران ہو گئے۔ میں ان پر ایک سنگدل ظالم شخص کو ان پر مسلط کرونگا۔ جسے میں ہیبت کا لباس پہناؤنگا اور اس کے سینے سے رحم نکال لوں گا۔ اسکے پیچھے ایک لشکر ہوگا جو رات کی تاریکی کی طرح ہوگا۔

پھر اللہ تعالیٰ نے ارمیا کی طرف وحی کی کہ میں بنی اسرائیل کو یافث کے ذریعے ہلاک کرنے والا ہوں۔ یافث اہل بابل تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر بخت نصر کو مسلط کیا۔ وہ ان پر چھ لاکھ جھنڈوں کے ساتھ حملہ آور ہوا۔ وہ بیت المقدس میں اپنی لشکر سمیت داخل ہوا۔ شام کو روند ڈالا اور بنی اسرائیل کو قتل کیا حتی کہ انہیں فنا کر دیا، بیت المقدس کو ویران کر دیا۔ اس نے اپنے لشکر کو حکم دیا کہ ہر لشکر اپنی ڈھال مٹی کی بھر کر بیت المقدس میں ڈال دے۔ انہوں نے ایسا ہی کیا حتی کہ بیت المقدس کو انہوں نے مٹی سے بھر دیا۔ پھر بخت نصر نے کہا کہ شہروں کے اندر جتنے لوگ موجود ہیں ان تمام کو میرے پاس جمع کیا جائے۔ تو بنی اسرائیل کا ہر چھوٹا بڑا اس کے پاس جمع ہو گیا۔ اس نے

ان میں سے ستر ہزار بچے اپنے لیے منتخب کیے۔ جب مال غنیمت جمع ہوا تو اس نے اپنے لشکر میں اس مال کو تقسیم کرنے کا ارادہ کیا لیکن اس کے ساتھ آئے ہوئے بادشاہوں نے کہا اے بادشاہ سلامت مال غنیمت سارا تمہارا ہے اور یہ بچے جو تو نے اپنے لیے منتخب کیے ہیں یہ ہمارے درمیان تقسیم کر دے۔ تو اس نے تقسیم کیے ہر ایک کو چار چار بچے ملے۔ بقیہ اسرائیلی تین حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک حصہ کو شام میں ٹھہرایا گیا۔ ایک حصہ قیدی بنایا گیا اور ایک حصہ قتل کیا گیا۔ بابل ناشیہ اور ستر ہزار بچوں کو بیت المقدس سے بابل لے گیا۔ بنی اسرائیل کی یہ پہلی بربادی تھی جو ان پر ان کے اپنے کرتوتوں کی وجہ سے نازل ہوئی تھی: فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ سے بھی بربادی مراد ہے جو بخت نصر اور اسکے اصحاب نے کی تھی۔ پھر بخت نصر حکمران بنا رہا جتنا اللہ تعالیٰ نے چاہا۔ پھر بخت نصر نے ایک عجیب خواب دیکھا۔ لیکن اسے بھول گیا کہ اس نے دیکھا ہے۔ اس نے دانیال' حنانیا' عزاریا اور میشائیل کو بلایا جو انبیاء کی اولاد تھے اور ان سے اپنے خواب کے متعلق پوچھا۔ انہوں نے فرمایا تو خواب بتا ہم اس کی تعبیر بتائیں گے۔ اس نے کہا وہ خواب تو مجھے یاد نہیں۔ اگر تم نے مجھے وہ خواب اور اسکی تعبیر نہ بتائی تو میں تو تمہارے کندھے اکھیڑ دونگا۔ وہ اس کے پاس سے نکل پڑے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کی اور گڑگڑائے۔ پس اللہ تعالیٰ نے انہیں اس خواب سے آگاہ کر دیا۔ وہ بخت نصر کے پاس آئے اور اسے بتایا کہ تو نے ایک بت دیکھا ہے جس کی پنڈلیاں مٹی کی تھیں۔ گھٹنے اور رانیں تانبے کی اور پیٹ چاندی کا' سینہ سونے کا سر اور گردن لوہے کی تھی۔ بادشاہ نے ان کی تصدیق کی۔ جب تو خواب دیکھ رہا تھا تو تجھے تعجب ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے ایک آسمان سے پتھر بھیجا جس نے اس بت کو ریزہ ریزہ کر دیا۔ یہ وہ چیز ہے جسے تو بھول گیا تھا۔ بخت نصر نے کہا تم نے سچ کہا۔ اس نے پوچھا اس خواب کی تعبیر کیا ہے' انہوں نے کہا تجھے دنیا کے بادشاہوں کی حکومتوں کی کیفیت دکھائی گئی ہے کہ بعض کی حکومت کمزور ہے' بعض کی خوبصورت ہے اور بعض کی سخت ہے، مٹی کمزور ترین ہے، پھر تانبا اس سے سخت ہے' پھر تانبے سے چاندی خوبصورت ہے، پھر سونا چاندی سے خوبصورت ہے، پھر لوہا یہ تیری بادشاہی ہے جو پہلی تمام حکومتوں سے سخت ہے اور وہ پتھر جو اللہ تعالیٰ نے آسمان سے اتارا تھا۔ جس نے اس بت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا وہ قدرت الٰہیہ ہے جو تمام کو ختم کر دے گی۔ اور صرف اور صرف اللہ کی حکومت باقی رہ جائے گی۔

پھر اہل بابل نے بخت نصر کو کہا یہ غلام جو ہم نے تم سے الگ مانگ لیے تھے۔ ان کی وجہ سے ہماری بیگمات نے ہم سے بے رخی برتنی شروع کر دی ہے۔ انہوں نے اپنے چہرے ہم سے پھیر لیے ہیں۔ اس لئے ان کو نکال دے یا انہیں قتل کر دے۔ بخت نصر نے کہا یہ تمہاری مرضی ہے چاہو تو انہیں قتل کر دو چاہو تو نکال دو۔ جب انہوں نے غلاموں کو قتل کرنے کا ارادہ کیا تو وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں گڑگڑائے اور عرض کی اے ہمارے پروردگار ہم پر مصیبت دوسرے لوگوں کے گناہوں کی وجہ سے آئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں زندہ رکھنے کا وعدہ فرمایا۔ پس کچھ تو قتل ہو چکے تھے لیکن بخت نصر نے جنہیں چھوڑ دیا تھا ان میں دانیال' حنانیا' عزاریا اور میشائیل تھے۔

جب اللہ تعالیٰ نے بخت نصر کو ہلاک کرنے کا ارادہ کیا۔ تو بخت نصر نے اسرائیلیوں سے پوچھا جس گھر کو میں نے خراب کیا اور جن لوگوں کو میں نے قتل کیا وہ گھر کس کا تھا۔ انہوں نے کہا وہ اللہ کا گھر تھا اور اس کو آباد کرنے والے انبیاء کی اولاد تھے۔ انہوں نے ظلم وستم کیے تو اللہ تعالیٰ نے انکے گناہوں کی وجہ سے تمہیں ان پر مسلط کر دیا۔ ان کا رب آسمانوں اور زمین کا رب ہے، ساری مخلوق کا رب ہے، اس نے انہیں عزت وکرامت بخشی لیکن انہوں نے بداعمالیاں شروع کیں تو اللہ تعالیٰ نے انہیں ہلاک کر دیا اور دوسروں کو ان پر مسلط کر دیا۔ پس بخت نصر کے دل میں غرور وتکبر پیدا ہوا اس نے سوچا کہ بنی اسرائیل پر میرا قبضہ میری اپنی طاقت وسطوت کی وجہ سے ہے۔

بخت نصر نے کہا مجھے بتاؤ کہ میں آسمان پر کیسے چڑھ سکتا ہوں کہ جو کوئی آسمان میں ہے اسے قتل کر دوں اور وہاں بھی اپنی حکومت قائم کروں۔ میں نے زمین کی شاہی تو مکمل کر لی ہے۔ لوگوں نے اسے بتایا کہ مخلوق کا کوئی فرد اس پر غالب نہیں آ سکتا۔ اس نے کہا مجھے آسمان پر چڑھنے کی تدبیر بتاؤ ورنہ میں تمہیں قتل کر دونگا۔ لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں استغاثہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے ایک مچھر بھیجا جو بخت نصر کے ناک میں داخل ہو گیا اور اس کی دماغ کی رگ کو کاٹا۔ بخت نصر اس کی وجہ سے انتہائی بے چین و بے قرار ہو گیا۔ اسے سکون نہیں ملتا تھا جب تک اس کے سر پر ضربیں نہ لگائیں جاتیں۔ جب بخت نصر اس اضطرابی کیفیت میں مر گیا تو لوگوں نے اسکے سر کا اپریشن کر کے دیکھا تو انہوں نے ایک مچھر پایا جو دماغ کو کاٹ رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اسی طرح اپنی قدرت سے اپنے بندوں کو قتل ہونے سے بچا لیا۔ بنی اسرائیل جو بچ گئے تھے اللہ تعالیٰ نے انہیں نجات عطا فرمائی۔ اور شام کی طرف پھر لوٹا دیا۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے عمارتیں تعمیر کیں اور شام کے علاقہ کو پہلے سے زیادہ خوبصورت بنا دیا۔ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مقتولوں کو بھی زندہ کر دیا تھا۔ اور بھی ان کے ساتھ مل گئے تھے۔ اس لئے اسرائیلیوں کی تعداد کثیر ہو گئی تھی۔

جب بنی اسرائیل شام میں آئے تو ان کے پاس کوئی اللہ کی کتاب نہ تھی' تورات جل چکی تھی حضرت عزیر بھی بابل کے قیدیوں میں سے تھے۔ وہ بھی شام پہنچ گئے تھے۔ وہ دن رات روتے رہتے تھے اور لوگوں سے الگ ہو گئے تھے۔ ایک شخص انکے پاس آیا اور کہا اے عزیر تم کیوں روتے ہو؟ فرمایا میں کتاب کے مفقود ہونے کے غم میں رو رہا ہوں۔ اسکے بغیر تو ہماری دنیا و آخرت سنور نہیں سکتی۔ اس شخص نے کہا آپ چاہتے ہیں کہ دوبارہ تمہیں تورات مل جائے تو تم روزہ رکھو اپنے نفس اور اپنے لباس کو پاک کرو پھر کل اسی مقام پر آنا۔ حضرت عزیر لوٹے' روزہ رکھا لباس کو پاک کیا پھر وعدہ کی جگہ پہنچے۔ انتظار کرتے ہوئے بیٹھ گئے۔ وہ شخص پہنچا تو پانی سے بھرا ایک برتن لایا۔ وہ شخص حقیقت میں فرشتہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے بھیجا تھا وہ پانی اس نے حضرت عزیر کو پلایا تو قدرت الٰہی سے تورات حضرت عزیر کے دل میں نقش ہو گئی۔ آپ بنی اسرائیل کے پاس آئے۔ ان کے سامنے تورات کو پڑھا تو وہ آپ سے بہت محبت کرنے لگے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انکی روح قبض فرمالی۔ اس کے بعد بنو اسرائیل پھر برائیوں میں ملوث ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کو ان کے کرتوتوں کی ساتھ ساتھ سزا بھی دیتا رہا۔ اللہ تعالیٰ ان میں اپنے رسول بھیجتا رہا۔ بعض کی انہوں نے تکذیب کی اور بعض کو قتل کر دیا۔ آخر میں جو انبیاء کرام مبعوث ہوئے ان میں زکریا' یحییٰ اور عیسیٰ علیہم السلام تھے۔ یہ آل داؤد کے گھرانہ سے تعلق رکھتے تھے۔ پھر زکریا علیہ السلام کا انتقال ہوا۔ بعض علماء فرماتے ہیں حضرت زکریا علیہ السلام کو قتل کیا گیا تھا۔

جب عیسیٰ علیہ السلام کو اٹھا لیا گیا اور یحییٰ علیہ السلام کو انہوں نے قتل کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے خلاف ایک بادشاہ بابل سے بھیجا جس کا نام خردوش تھا وہ اہل بابل کو لیکر شام میں داخل ہوا۔ پھر جب اس نے شام پر غلبہ پا لیا تو اپنے لشکر کے رئیس کو حکم دیا جس کا نام بیورزاذان تھا جو ہاتھی پر سوار ہوتا تھا۔ کہ میں نے اپنے معبود کی قسم کھائی ہے کہ اگر میں بیت المقدس والوں پر غالب آ گیا تو انہیں اس طرح قتل کر دونگا کہ انکے خون بہہ کر میرے لشکر کے درمیان میں پہنچ جائیں لیکن اگر کوئی قتل کرنے کیلئے نہ ملے تو مجبوری ہے۔ اس نے اسرائیلیوں کو قتل کرنے کا حکم دیا حتیٰ کہ وہ اس مقام تک پہنچ جائے۔ بیورزاذان بیت المقدس میں داخل ہو کر اس جگہ پہنچا جہاں اسرائیلی قربانیاں دیتے تھے۔ اس نے دیکھا کہ خون ابل رہا ہے۔ اس نے ان سے وجہ پوچھی اے بنی اسرائیل یہ خون کیوں ابل رہا ہے مجھے صحیح صحیح بتاؤ۔ انہوں نے کہا یہ ہماری اس قربانی کا خون ہے جسے ہماری طرف سے قبول نہیں کیا گیا اس وقت سے مسلسل یہ خون بہہ رہا ہے۔

ہم آٹھ سو سال سے قربانیاں دے رہے ہیں، سب قبول ہوئیں سوائے اس ایک کے۔ رئیس نے کہا تم مجھے سچ نہیں بتا رہے۔ انہوں نے کہا اگر ہمارا پہلا زمانہ ہوتا تو یہ قبول ہوتی لیکن بادشاہت، نبوت اور وحی کا سلسلہ ہم سے منقطع ہوگیا ہے۔ اس لئے ہم سے یہ قبول نہیں کی گئی۔ بیورزاذان نے ان کے ستر جوڑے وہاں ذبح کیے لیکن خون پھر بھی نہ رکا۔ پھر اس نے ان کے ساتھ سو بچے لانے کا حکم دیا اس نے ان کو بھی وہاں ذبح کردیا لیکن خون پھر بھی نہ رکا۔ جب بیورزاذان نے دیکھا کہ خون نہیں رکا ہے تو پوچھا اے بنی اسرائیل تم پر ہلاکت ہو، مجھے سچ سچ بتاؤ (اور اپنے رب کے حکم پر صبر کرو تم اس زمین میں ایک طویل عرصہ حکومت کرتے رہے اور اپنی من مانی کرتے رہے)۔ میں تمہارا آگ پھونکنے والا نہ مرد چھوڑوں گا نہ عورت سب کو قتل کردوں گا۔ اس لئے اس سے پہلے سچ بتادو۔ جب اس نے سختی کی تو انہوں نے سچ بتادیا کہ یہ خون ایک نبی کا ہے جو ہمیں اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کے باعث امور سے منع کرتا تھا۔ اگر ہم اس کی ان امور میں اطاعت کرتے تو وہ ہماری راہنمائی فرماتے اور وہ ہمیں تمہارے معاملہ کی بھی خبر دے دیتے۔ ہم نے بدقسمتی سے ان کی تصدیق نہ کی اور ہم نے اسے قتل کردیا۔ یہ اس کا خون ہے۔ بیورزاذان نے پوچھا اس نبی کا نام کیا تھا۔ انہوں نے کہا اس کا نام یحییٰ بن زکریا تھا۔ رئیس نے کہا اب تم نے سچ بتایا ہے، اسی جیسے گناہ کی وجہ سے تمہارے رب نے تم سے انتقام لیا ہے۔ جب بیورزاذان نے دیکھا کہ انہوں نے سچ بولا ہے تو وہ سجدہ میں گر گیا۔ اس نے اپنے حواریوں کو کہا شہر کا دروازہ بند کردو اور خردوش کے لشکر کو باہر نکال دو۔ وہ بنی اسرائیل کے ساتھ اکیلا ہوگیا۔ اس نے یحییٰ بن زکریا سے مخاطب ہوکر عرض کی۔ اے یحییٰ تیری وجہ سے تیری قوم پر جو مصیبت آئی ہے اسے میرا اور تیرا رب جانتا ہے۔ اس لئے تو اپنے رب کے اذن سے رک جا قبل اس کے کہ میں تیری قوم کا ایک فرد بھی باقی نہ چھوڑوں۔ تو خون رک گیا۔ بیورزاذان نے اسرائیلیوں کے قتل کا ارادہ ترک کردیا اور کہا میں اس ذات پر ایمان لاتا ہوں جس پر بنو اسرائیل ایمان لائے ہیں اور میں یقین رکھتا ہوں کہ اس کے سوا کوئی رب نہیں ہے۔ اس نے بنی اسرائیل سے کہا خردوش نے مجھے حکم دیا تھا کہ میں تمہیں قتل کروں یہاں تک کہ خون بہہ کر لشکر کے درمیان پہنچ جائے۔ میں اس کی نافرمانی اور حکم عدولی کی طاقت نہیں رکھتا۔ اسرائیلیوں نے کہا جو تجھے حکم ہوا ہے اس کو پورا کرلے۔ اس نے ان کو ایک خندق کھودنے کا حکم دیا اور گھوڑے، خچر گدھے، اونٹ، گائے اور بکریاں لانے کا حکم دیا۔ اس نے ان کو ذبح کیا حتی کہ خون لشکر میں بہہ نکلا۔ پھر ان مواشی پر ان مقتولوں کو ڈالا گیا جو پہلے قتل ہوچکے تھے۔ خردوش یہ سمجھا کہ خندق میں سب بنی اسرائیل ہیں۔ جب خون لشکر کے وسط میں پہنچا تو بیورزاذان کی طرف خردوش نے پیغام بھیجا کہ قتل سے رک جاؤ۔ پھر وہ بابل کی طرف پلٹا۔

اس واقعہ میں بنی اسرائیل تباہ ہوگئے یا تباہ ہونے کے قریب پہنچ گئے۔ یہ دوسرا واقعہ ہے جسکے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا لَتُفْسِدُنَّ فِي الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ۔ پہلا واقعہ بخت نصر اور اس کے لشکر کا تھا اور دوسرا خردوش اور اس کے لشکر کا ہے۔ دوسرا واقعہ پہلے سے زیادہ سخت تھا۔ اسکے بعد اسرائیلیوں کی حکومت کبھی قائم نہ ہوئی۔ شام اور اس کے گردونواح کی بادشاہی رومیوں اور یونانیوں کی طرف منتقل ہوگئی۔ جو بنو اسرائیل بچ گئے تھے وہ کثیر ہوگئے اور پھر ان کو بیت المقدس میں ریاست مل گئی۔ وہ نعمتوں سے مالا مال ہوئے اور ان میں پھر گناہ و سرکشی کا دور چل نکلا۔ اس مرتبہ اللہ تعالیٰ نے ان پر طیطوس بن اسیانوس رومی کو مسلط کیا۔ اس نے ان کے شہروں کو خراب کیا اور انہیں بھگا دیا۔ اللہ تعالیٰ نے پھر اسرائیلیوں سے بادشاہی اور حکومت چھین لی اور ان پر ذلت مسلط کردی۔ وہ ہر قوم میں ذلت اور جزیہ ادا کرکے رہے بیت المقدس حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ تک ویران رہا۔ پھر حضرت عمر کے حکم سے مسلمانوں نے اسے آباد کیا[1]۔

1۔ تفسیر خازن، جلد 4، صفحہ 23-118 (التجاریہ)

حضرت قتادہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے پہلی مرتبہ جالوت کو اسرائیلیوں پر مسلط کیا۔ اس نے انکو قیدی بنایا اور انکی آبادیوں کو ویران کر دیا۔ پھر داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں گردش زمانہ کو ان کے حق میں اور ان کے دشمن کے خلاف کر دیا۔ پھر جب دوسرے وعدہ کا وقت آیا تو اللہ تعالیٰ نے بخت نصر کو ان پر مسلط کیا۔ اس نے انہیں قیدی بنایا اور آبادیوں کو تباہ کر دیا پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا امید ہے کہ اللہ تعالیٰ تم پر رحم فرمائے (عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ) اللہ تعالیٰ نے ان پر پھر رحم فرمایا۔ لیکن پھر اس قوم میں شر اور برائی پھیل گئی تو اللہ تعالیٰ نے جو چاہی ان کو سزا دی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر عربوں کو مسلط کیا جیسا کہ ارشاد فرمایا وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ[1] (اور یاد کرو جب اعلان کر دیا آپ کے رب نے کہ ضرور بھیجتا رہے گا ان پر روز قیامت تک ایسے (جابر) جو چکھائیں گے انہیں برا عذاب۔

سدی نے اپنی سند کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ بنی اسرائیل کے ایک شخص نے خواب دیکھا کہ بیت المقدس ایک بیوی کے یتیم بچہ کے ہاتھوں تباہ ہوا ہے جس کا نام بخت نصر ہے۔ بنی اسرائیل سچ بولتے تھے۔ اس لئے انکے خواب بھی سچے ہوتے تھے۔ وہ شخص پوچھتے پوچھتے بخت نصر کی ماں کے پاس پہنچ گیا۔ بخت نصر لکڑیاں کاٹ کر اپنے سر پر اٹھا کر لایا لکڑیاں پھینک کر بیٹھ گیا۔ اس شخص نے بخت نصر سے کچھ وقت گفتگو کی۔ پھر اسکو تین درہم دیئے اور کہا ان سے کھانے، پینے کی اشیاء خرید لاؤ۔ اس نے ایک درہم سے گوشت، ایک درہم سے روٹی اور ایک درہم سے شراب خریدی۔ تمام نے ملکر کھایا پیا۔ دوسرے دن بھی اس نے ایسا ہی کیا۔ تیسرے دن بھی۔ پھر اس شخص نے کہا میں یہ چاہتا ہوں کہ تم میرے لیے امان لکھ دو۔ اگر تو کسی دن بادشاہ بن جائے تو مجھے کچھ نہیں کہے گا۔ بخت نصر نے کہا تو مجھ سے استہزاء کر رہا ہے۔ اس نے کہا میں مذاق نہیں کر رہا لیکن تیرا کوئی نقصان نہیں ہوگا اگر تم یہ امان لکھ کر مجھ پر احسان کر دو۔ بخت نصر نے اسے امان لکھ دی۔ اس شخص نے کہا اگر میں تمہارے پاس آؤں اور لوگ تیرے ارد گرد جمع اور میرے اور تیرے درمیان حائل ہوں تو پھر میں کیا کروں۔ بخت نصر نے کہا تم ایک لکڑی پر اس تحریر کو بلند کرنا، میں پہچان لوں گا۔ اس نے وہ لکھا ہوا پروانہ امان اسکے حوالے کر دیا۔

بنی اسرائیل کا بادشاہ حضرت یحییٰ بن زکریا علیہما السلام کا بہت احترام کرتا تھا اور آپ نے اسے اپنا قریبی مجلسی بنایا ہوا تھا۔ بادشاہ اپنی بیوی کی بیٹی اور بقول ابن عباس اپنی بھانجی کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔ اس نے یحییٰ علیہ السلام سے مسئلہ دریافت کیا تو آپ نے اسے منع فرمایا کہ نکاح نہیں ہو سکتا۔ جب اس لڑکی کی ماں کو حضرت یحییٰ کے اس فتویٰ کا علم ہوا تو آپ کے متعلق کینہ رکھنے لگی۔ جب بادشاہ نے مجلس شراب قائم کی تو ماں نے اپنی لڑکی کو باریک سرخ لباس زیب تن کر کے اور پورا میک اپ کر کے بادشاہ کے پاس بھیجا اور کہا کہ بادشاہ کو شراب پلانا۔ جب وہ تجھ سے مطلب براری کا ارادہ کرے تو انکار کر دینا حتیٰ کہ وہ تیری شرط کو پورا کرے۔ اس لڑکی نے شرط رکھی کہ میں تیرا مدعا پورا کر سکتی ہوں بشرطیکہ پہلے یحییٰ بن زکریا کا سر ایک طشت میں میرے سامنے پیش کرو۔ اس نے کہا ظالم کسی اور چیز کا مطالبہ کر۔ لڑکی نے کہا مجھے تو صرف وہی سر چاہیے۔ جب لڑکی نے انکار کیا تو اس نے سر منگوا لیا اور اپنے سامنے رکھ دیا لیکن سر سے آواز آ رہی تھی یہ لڑکی تیرے لیے حلال نہیں ہے۔ صبح ہوئی تو خون سر سے ابل رہا تھا۔ اس نے مٹی ڈالنے کا حکم دیا۔ پھر بھی خون نہ رکا۔ اس نے دوبارہ مٹی ڈالنے کا حکم دیا۔ خون پھر بھی نہ رکا۔ حتیٰ کہ وہ شہر کی دیواروں تک پہنچ گیا لیکن ابھی بھی ابل رہا تھا۔ اسی دوران بابل کے بادشاہ صحابین نے بخت نصر کی قیادت میں اسرائیلیوں پر حملہ کرنے کیلئے بھیجا۔ حتیٰ کہ بخت نصر وہاں پہنچا تو وہ اپنے قلعوں میں محصور ہو گئے۔ جب بخت نصر کا محاصرہ طویل ہو گیا اور فتح نہ کر سکا تو اس نے واپس لوٹنے کا ارادہ کیا۔ اچانک ایک بڑھیا جو اسرائیلیوں میں

سے تھی آئی اور کہا تو شہر کو فتح کیے بغیر واپس جا رہا ہے۔ بخت نصر نے کہا ہاں کیونکہ عرصہ دراز ہو گیا ہے اور میرے لشکری بھوکے ہو گئے ہیں۔ بڑھیا نے کہا اگر تو مجھ سے ایک عہد کرتو میں تجھے شہر فتح کرنے کی ترکیب بتاتی ہوں۔ عہد یہ ہے کہ جب میں تجھے کسی کو قتل کرنے کو کہوں تو اسے قتل کرنا اور جس سے منع کروں اسے قتل نہ کرنا۔ بخت نصر نے عہد قبول کر لیا۔ بڑھیا نے کہا جب صبح ہو تو اپنے لشکر کو چار حصوں میں تقسیم کر اور چاروں کونوں پر انہیں کھڑا کر پھر ہاتھ اٹھا کر یوں دعا مانگ اللہم ہم یحییٰ بن زکریا کے خون کے واسطہ سے فتح طلب کرتے ہیں۔ دیواریں گر پڑیں گی۔ انہوں نے بوڑھی کی نصیحت کے مطابق دعا مانگی تو شہر کی دیواریں گر پڑیں اور وہ لشکری اندر داخل ہو گئے۔ بڑھیا نے کہا کسی کو قتل نہ کرنا۔ میں تمہیں یحییٰ بن زکریا کے خون کے پاس لے جاتی ہوں۔ عورت نے کہا اس خون کے اوپر اسرائیلیوں کو قتل کر۔ یہاں تک کہ یہ خون تھم جائے۔ اس نے ستر ہزار آدمی قتل کیے تو خون رک گیا۔ جب خون رک گیا تو بڑھیا نے کہا اب ہاتھ روک لو کیونکہ جب کوئی نبی قتل ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اس وقت تک راضی نہیں ہوتا جب تک قاتل اور قتل پر راضی لوگ قتل نہ ہو جائیں۔ وہ امان لکھوانے والا شخص آیا تو بخت نصر نے اسے اور اسکے گھر والوں کو امان دی۔ بخت نصر نے بیت المقدس کو ویران کر دیا اور اس میں مردار ڈال دیئے اور اس خرابی پر رومیوں نے بھی بخت نصر کی مدد کی تھی کیونکہ بنی اسرائیل نے یحییٰ بن زکریا کو قتل کیا تھا۔ بخت نصر اپنے ساتھ بنی اسرائیل کے سرداروں، دانیال، کچھ لوگ اولاد انبیاء میں سے اور جالوت کے سر کو اپنے ساتھ بابل لے گیا۔

جب بخت نصر بابل پہنچا تو صحابین مر چکا تھا۔ تو بخت نصر نے بادشاہی سنبھال لی۔ بخت نصر کے نزدیک دانیال اور انکے ساتھی بہت معزز سمجھے جاتے تھے۔ مجوسیوں کو ان سے حسد ہو گیا۔ انہوں نے انکی بخت نصر کے پاس چغلیاں کھانی شروع کر دیں۔ انہوں نے کہا دانیال اور اسکے ساتھی تیرے خدا کی تکذیب کرتے ہیں اور تیرا ذبیحہ نہیں کھاتے ہیں۔ بخت نصر نے دانیال اور انکے ساتھیوں سے حقیقت دریافت کی۔ تو انہوں نے کہا ہاں ہمارا ایک رب ہے جسکی ہم عبادت کرتے ہیں اور ہم تمہارا ذبیحہ بھی نہیں کھاتے۔ بخت نصر نے انکو سزا دینے کیلئے خندق کھدوائی۔ پھر ان چھ افراد کو اسمیں ڈال دیا اور ایک خونخوار درندہ بھی ان کے ساتھ خندق میں اتار دیا تا کہ وہ انکو کھا جائے وہ ڈال کر چلے گئے۔ شام کو واپس آ کر دیکھا تو وہ آرام سے بیٹھے تھے اور درندہ پاؤں پھیلائے ان کے پاس بیٹھا ہے۔ اس نے کسی کو خراش تک بھی نہ دی تھی اور انکے ساتھ ایک ساتواں شخص بھی بیٹھا تھا۔ پوچھا یہ ساتواں آدمی کون ہے، وہ تو چھ افراد تھے۔ ساتواں شخص خندق سے باہر آیا وہ بادشاہ تھا۔ اسے زوردار طمانچہ لگا تو وحشی بن گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے سات سال اسکی شکل کو مسخ کیے رکھا۔ وھب نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بخت نصر کو گدھ کی شکل میں مسخ کیا۔ پھر چوپایوں میں سے بیل کی شکل میں۔ پھر وحشیوں میں شیر کی صورت میں مسخ کیا۔ اسکا مسخ سات سال ہوتا رہا۔ اسکا دل انسان کا دل رہا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اسے حکومت عطا فرما دی اور وہ ایمان لایا۔ حضرت وہب سے پوچھا گیا کیا وہ مومن تھا۔ فرمایا میں نے اسکے متعلق اہل کتاب کا اختلاف پایا ہے۔ انکے بعض علماء کہتے ہیں وہ مومن ہو کر مرا بعض کہتے ہیں اس نے اللہ تعالیٰ کے گھر اور اسکی کتابوں کو جلایا، انبیاء کو قتل کیا۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس پر غضب فرمایا اور اسکی توبہ کو قبول نہیں فرمایا۔

سدی کہتے ہیں مسخ کے بعد جب بخت نصر انسانی شکل میں آیا تو اللہ تعالیٰ نے اسکو حکومت و بادشاہی عطا فرمائی۔ دانیال اور انکے ساتھیوں کی وہ بہت عزت و احترام کرتا تھا۔ مجوسیوں کو ان سے حسد ہو گیا بخت نصر کو انہوں نے کہا کہ دانیال جب شراب پیتا ہے تو پیشاب کرتا ہے۔ انکے نزدیک یہ چیز عار تھی۔ یہ سن کر بخت نصر نے دانیال اور انکے ساتھیوں کی طرف کھانا اور شراب بھیجی۔ انہوں

نے کھانا کھایا اور شراب پی پھر بخت نصر نے اپنے دربانوں کو کہا دیکھو پہلے پیشاب کرنے کیلئے کون نکلتا ہے۔ جو بھی نکلے اسے طبرزین سے مارنا، اگر چہ وہ کہے میں بخت نصر ہوں تم کہنا کہ تو جھوٹا ہے، مجھے تو بخت نصر نے ہی مارنے کا حکم دیا ہے۔ اتفاق سے سب سے پہلے پیشاب کرنے کیلئے بخت نصر نکلا۔ جب دربان نے دیکھا تو اس نے اس پر حملہ کر دیا۔ اس نے کہا ظالم میں بخت نصر ہوں۔ اس نے کہا تو جھوٹ کہتا ہے مجھے بخت نصر نے خود حکم دیا ہے۔ پس اس نے اسے مارا اور قتل کر دیا[1]۔

امام بغوی فرماتے ہیں یہ روایت کہ بخت نصر نے بنی اسرائیل پر یحیٰی بن زکریا کے قتل کے بعد حملہ کیا تھا۔ یہ مؤرخین کے نزدیک غلط ہے بلکہ اتفاق اس پر ہے کہ بخت نصر نے بنی اسرائیل پر حملہ ارمیا کے عہد میں حضرت شعیا کے قتل کے بعد کیا تھا۔ ارمیا اور یحیٰی علیہ السلام کی ولادت کے درمیان چار سو اکسٹھ سال کا فاصلہ ہے۔ بہمن بن اسفندیار کی طرف سے کیرش بن اخشورش بن اصبہبد بابل کا سردار تھا۔ اسکے زمانہ میں دوبارہ بیت المقدس کی تعمیر ہوئی۔ یہ تعمیر بخت نصر کی تخریب کے ستر سال بعد ہوئی۔ اس تعمیر کے بعد اٹھاسی سال بعد سکندر نے بیت المقدس پر تسلط کیا۔ عہد سکندری کے تین سو تریسٹھ سال بعد حضرت یحیٰی کی پیدائش ہوئی۔ صحیح وہ ہے جو ابن اسحاق نے ذکر کیا ہے۔

عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ یَّرْحَمَكُمْ ۚ وَ اِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا ۘ وَ جَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِیْنَ حَصِیْرًا ۞

" قریب ہے کہ تمہارا رب تم پر رحم فرمائے گا[1] اور اگر تم فسق و فجور کی طرف دوبارہ لوٹے تو ہم بھی لوٹیں گے[2] اور ہم نے بنا دیا جہنم کو کافروں کیلئے قید خانہ[3] "

[1] اے بنی اسرائیل قریب ہے کہ تمہارا رب تم پر رحم فرمائے اسکے بعد کہ تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاؤ اور قرآن کی اتباع کر کے اپنے اعمال کی اصلاح کر لو۔

[2] اگر پھر تم گناہوں کی طرف لوٹے اور رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت پر کمر بستہ ہوئے تو ہم بھی دوبارہ اپنے غیظ و غضب کا کوڑا برسائیں گے جو یہود میں سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تو اللہ تعالیٰ نے ان پر رحم فرمایا جیسے عبد اللہ بن سلام اور انکے ساتھی نجاشی اور کعب الاحبار وغیرہم۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی تعریف ان الفاظ میں فرمائی: مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآىِٕمَةٌ یَّتْلُوْنَ اٰیٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّیْلِ وَ هُمْ یَسْجُدُوْنَ الخ۔ اہل کتاب سے ایک گروہ حق پر قائم ہے، یہ تلاوت کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی آیتوں کی رات کے اوقات میں اور وہ سجدہ کرتے ہیں۔

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا: وَ اِذَا سَمِعُوْا مَاۤ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰۤى اَعْیُنَهُمْ تَفِیْضُ مِنَ الدَّمْعِ الخ اور جب سنتے ہیں (قرآن) کہ اتارا گیا رسول ﷺ کی طرف تو تو دیکھے گا انکی آنکھوں کو کہ چھلک رہی ہوتی ہیں آنسوؤں سے۔ جو قریظہ اور بنو النضیر وغیرہ پھر اپنی بدسرشت کی وجہ سے نافرمانیوں اور کارستانیوں کی طرف لوٹے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے اور آپ پر جادو کرنے کا ارادہ کیا، زہر کھانے میں ملایا اور آپ کے ساتھ جنگ وجدل کا سلسلہ شروع کیا تو اللہ تعالیٰ نے بھی انتقامی کارروائی فرمائی۔ بنی قریظہ کا قتل ہوا، بنی نضیر جلاوطن ہوئے اور ان پر جزیہ لگایا گیا جو وہ اپنے ہاتھ سے ذلیل وخوار ہو کر ادا کرتے تھے۔

[3] اور آخرت میں جہنم کو ہم نے انکے لئے قید خانہ بنایا ہے جس سے وہ کبھی بھی نہ نکل سکیں گے۔ بعض علماء فرماتے ہیں حصیراً کا معنی بساطاً (بچھونا) ہے جیسے چٹائی بچھائی جاتی ہے۔

1۔ تفسیر خازن، جلد 4، صفحہ 18-116 (التجاریہ)

إِنَّ هَٰذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِينَ الَّذِينَ يَعْمَلُونَ الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ أَجْرًا كَبِيرًا ﴿۹﴾

"بلاشبہ یہ قرآن وہ راہ دکھاتا ہے جو سب راہوں سے سیدھی راہ ہے [1] اور مژدہ سناتا ہے۔ ان ایمان والوں کو جو نیک عمل کرتے ہیں کہ بلاشبہ ان کے لیے بڑا اجر ہے [2]"

[1] یعنی یہ کتاب ہدایت قرآن راہنمائی کرتا ہے اس حالت یا اس رستہ کی جو تمام حالات سے بہتر یا جو تمام راستوں سے بہتر راستہ ہے یا جو قرب الٰہی کا قریب ترین راستہ ہے، یا ایسے کلمہ کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ نہایت عدل والا کلمہ ہے اور وہ لا الہ الا اللہ کی شہادت ہے۔

[2] ویبشر کو حمزہ اور کسائی نے باب افعال سے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے باب تفعیل سے تشدید کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی قرآن خوشخبری دیتا ہے۔

وَأَنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ أَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ﴿۱۰﴾

"اور بیشک وہ لوگ جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے ہم نے تیار کر دیا ہے انکے لیے دردناک عذاب [1]"

[1] اس آیت میں عَذَابًا أَلِيمًا سے مراد آگ ہے۔ اس کا ان لھم اجرا کبیرا پر عطف ہے، یعنی مومنین کو قرآن دو بشارتیں دیتا ہے، ایک اپنے اجر کی اور دوسری دشمنوں کے عذاب کی۔ یا اس کا عطف یبشر کے اضمار کے ساتھ یبشر پر ہے۔

وَيَدْعُ الْإِنسَانُ بِالشَّرِّ دُعَاءَهُ بِالْخَيْرِ ۖ وَكَانَ الْإِنسَانُ عَجُولًا ﴿۱۱﴾

"اور دعا مانگا کرتا ہے انسان برائی کیلئے جیسے دعا مانگا کرتا ہے بھلائی کیلئے [1] اور (حقیقت یہ ہے کہ) انسان بڑا جلد باز (واقع ہوا) ہے [2]"

[1] یدعو کے لفظ سے واؤ اجتماع ساکنین کی وجہ سے لفظاً ساقط ہو گئی ہے۔ اور خط سے توقیفاً خلاف قیاس ساقط ہوئی ہے۔ یعنی انسان اپنی کم عقلی اور کم فہمی کی بناء پر غصہ اور غضب کی حالت میں اپنے لیے، اپنے اہل کیلئے اور اپنے مال کیلئے بددعا کرتا ہے۔ یا وہ جس کو خیر سمجھتا ہے اس کی درخواست کرتا ہے حالانکہ وہ اسکے لیے مفید اور نفع بخش نہیں ہوتی جیسے کوئی شخص دعا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے دنیا میں اپنا حصہ عطا فرمائے۔ اسی طرح وہ دعا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے دنیا میں بھی بھلائی عطا فرمائے اور آخرت میں بھی بھلائی عطا فرمائے اور دوزخ کے عذاب سے نجات عطا فرمائے۔ اگر اللہ تعالیٰ اسکی اپنے بارے بددعا کو قبول فرما لے تو وہ ہلاک ہو جائے لیکن وہ مہربان و کریم اپنی کرم نوازی اور فضل کی وجہ سے اسکی اس بات کو قبول نہیں فرماتا۔

[2] انسان بڑا جلد باز ہے جو دل میں خواہش پیدا ہوتی ہے اسی کی طرف لپک پڑتا ہے، اس کے انجام کو نہیں سوچتا۔ پس وہ اپنے لیے ایسی دعا مانگتا ہے جسکا قبول ہونا انجام کے اعتبار سے اس کے لیے اچھا نہیں۔ ابن عباس فرماتے ہیں وہ ہر صورت میں اکتا کر دعا مانگتا ہے نہ اسے خوشی پر صبر ہے اور نہ تکلیف پر (1)۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہاں انسان سے مراد آدم علیہ السلام ہیں کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے ان کے جسم میں روح پھونکی۔ وہ ابھی ناف تک پہنچی تھی کہ آپ اٹھنے لگے لیکن گر پڑے۔ اس بات کو ابن جریر نے ابن عباس سے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 123 (التجاریہ)

روایت کیا ہے۔

واقدی نے المغازی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے غلام کے واسطہ سے حضرت عائشہؓ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک قیدی کو پکڑ کر لائے اور فرمایا اسکی خصوصی نگہداشت کرنا۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں میں ایک عورت کے ساتھ باتوں میں مشغول ہوئی تو وہ بھاگ گیا اور مجھے پتہ ہی نہ چلا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ غلام کے متعلق دریافت کیا تو عرض کی مجھے معلوم نہیں۔ میں تو اس سے غافل ہوگئی تھی اور وہ نکل گیا ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا اللہ تیرا ہاتھ کاٹ دے۔ آپ فوراً تشریف لے گئے۔ صحابہ کرام کو اس غلام کی تلاش کیلئے بھیجا۔ صحابہ کرام غلام کو پکڑ کر لے آئے۔ پھر حضور علیہ الصلوۃ والسلام میرے بستر پر تشریف لائے۔ میں اپنے ہاتھ کو الٹ پلٹ کر رہی تھی۔ فرمایا عائشہ کیا ہوا؟ میں نے عرض کی حضور میں آپ کی بددعا کے اثر کا انتظار کر رہی ہوں۔ حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے اپنے ہاتھوں کو بلند کیا اور یہ دعا فرمائی اے اللہ میں ایک انسان ہوں۔ مجھے افسوس بھی لگتا ہے اور غصہ بھی آتا ہے جیسے دوسرے انسانوں کو آتا ہے جس مومن مرد یا مومنہ عورت کیلئے میں بددعا کروں اسے اسکے گناہوں کی طہارت اور دل کی پاکی کا باعث بنادے۔ واللہ اعلم۔

ظاہر یہ ہے کہ انسان سے مراد کافر ہے اور دعا سے مراد عذاب کی دعا ہے کہ وہ مذاقاً عذاب کو جلدی طلب کرتے تھے جیسے نضر بن حارث نے دعا مانگی تھی اے اللہ بہتر گروہ کی مدد فرما۔ اے اللہ اگر یہ (قرآن اور اسلام) حق ہے تیرے نزدیک تو ہم پر آسمان سے پتھروں کی بارش برسا۔ پس یہ نضر بن حارث بدر کے دن قتل ہوا۔

وَ جَعَلْنَا الَّیْلَ وَ النَّهَارَ اٰیَتَیْنِ فَمَحَوْنَاۤ اٰیَةَ الَّیْلِ وَ جَعَلْنَاۤ اٰیَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَ الْحِسَابَ ؕ وَ كُلَّ شَیْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِیْلًا ﴿۱۲﴾

”اور ہم نے بنایا ہے رات اور دن کو (اپنی قدرت کی) دو نشانیاں [1] اور ہم نے مدھم کر دیا رات کی نشانی کو [2] بنا دیا دن کی نشانی کو روشن [3] تاکہ (دن کے اجالے میں) تم تلاش کرو رزق اپنے رب سے [4] اور تاکہ تم جان لو سالوں کی تعداد اور حساب کو [5] اور ہر چیز کو ہم نے بڑی وضاحت سے بیان کر دیا ہے [6]“

[1] یعنی دن اور رات کا ایک نسق اور نظم کے ساتھ ایک دوسرے کے پیچھے آنا ایک قادر وحکیم پر دلالت کرنے والی دو بڑی علامتیں بنایا ہے۔

[2] آیۃ سے مراد اللیل ہی ہے اور یہاں اضافت بیانیہ ہے جیسے عدد کی معدود کی طرف اضافت بیانیہ ہوتی ہے، یعنی رات کو ہم نے تاریک بنایا۔

[3] دن کو ہم نے روشن بنایا اور لوگوں کو چیزیں دکھانے والا بنایا۔ بعض علماء فرماتے ہیں آیتین سے مراد سورج اور چاند ہیں۔ تقدیر کلام اس طرح ہوگی کہ ہم نے دن اور رات کی نشانی یعنی چاند کو مدھم بنایا۔ یعنی چاند کا نور آہستہ آہستہ ہم کم کر دیتے ہیں۔ حتی کہ ختم ہو جاتا ہے۔ اور دن کی نشانی یعنی سورج کو روشن شعاعوں والا بنایا ہمیشہ اسکی روشنی میں اشیاء دیکھی جاتی ہیں۔ کسائی فرماتے ہیں عرب کہتے ہیں ابصر النهار جب دن اسطرح روشن ہو جائے کہ ہر چیز دکھائی دے (1)۔ ابن عباس فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے سورج کے نور کے ستر جزء بنائے۔ اور اتنے ہی چاند کے جزء بنائے پھر چاند کے انہتر جزءوں کو سورج کے نور کے ساتھ ملا دیا حتی کہ اللہ تعالیٰ نے جبریل کو

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 123 (التجاریۃ)

حکم فرمایا کہ چاند کے چہرے پر تین مرتبہ پر مارو۔ اس نے پر مارا تو اسکی ضوء ختم ہوگئی اور نور باقی رہا۔ ابن الکوا نے حضرت علی سے پوچھا کہ چاند میں سیاہی کیسی ہے فرمایا یہ محو کا اثر ہے(1)۔ جسکا ذکر فَمَحَوْنَا اٰیَةَ الَّیْلِ میں ہے۔

۴ یعنی رات کے وقت طاعت و ریاضت کے ساتھ اور دن کے وقت اسباب معاش کے ساتھ اپنے رب کا فضل تلاش کرو۔

۵ اور دن رات کے اختلاف یا چاند، سورج کی حرکات کے ساتھ سالوں کی تعداد اور حساب کو جان لو۔

۶ ہر وہ چیز جسکی طرف تم دین و دنیا کی فلاح حاصل کرنے کیلئے محتاج ہوا سے نہایت شرح وبسط سے بیان کر دیا ہے، اب کوئی التباس نہیں ہے، ہم نے تمہاری علتوں کو دور کر دیا ہے اور تمہارے لیے اب کوئی نہ تسلیم کرنے والی حجت باقی نہیں ہے

وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓىِٕرَهٗ فِیْ عُنُقِهٖ ؕ وَ نُخْرِجُ لَهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ كِتٰبًا یَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا ۝۱۳

"اور ہر انسان کی (قسمت کا) نوشتہ اسکے گلے میں ہم نے لٹکا رکھا ہے ۱؎ اور ہم نکالیں گے اسکے لیے روز قیامت ایک کتاب ۲؎ جسے وہ (اپنے سامنے) کھلا ہوا پائے گا ۳؎"

۱؎ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں انسان کا عمل اور جو اسکی تقدیر میں لکھا جاچکا ہے، وہ جہاں بھی جائے وہ اسکے ساتھ ہوتے ہیں۔ کلبی اور مقاتل کہتے ہیں یعنی خیر اور شر انسان کے ساتھ رہتے ہیں، اس سے جدا نہیں ہوتے حتی کہ اسکا محاسبہ ہو جائے۔ حضرت حسن فرماتے ہیں اسکا یمن اور شوم یعنی سعادت و بدبختی اسکے ساتھ رہتے ہیں۔ اہل معانی فرماتے ہیں طائر سے مراد وہ فیصلہ ہے جو کیا جاچکا ہے کہ یہ شخص یہ عمل کرے گا اور سعادت یا شقاوت کا عمل بھی لکھا جاچکا ہے وہ اسے ضرور کرے گا۔ عرب کی عادت کے مطابق شگون کو طائر کہا گیا ہے کیونکہ وہ پرندوں کے بائیں سے دائیں اڑنے اور دائیں سے بائیں اڑنے سے شگون اور فال پکڑتے تھے۔

ابوعبیدہ اور القتیبی کہتے ہیں یہاں طائر سے مراد خیر و شر کا حصہ ہے۔ عرب کہتے ہیں طَارَ سَهْمُهُمْ فُلَانٍ بِكَذَا (فلاں کا حصہ اتنا ہے) یہاں عنق (گردن) کا ذکر فرمایا کیونکہ طوق، ہار اور دوسری چیزیں جن سے تزیین حاصل کی جاتی ہے یا عیب لگایا جاتا ہے، گلے میں لٹکائی جاتی ہیں۔ عرب اسی وجہ سے جدا نہ ہونے والی چیزوں کے متعلق کہتے ہیں کہ فلاں چیز اسکے گلے میں پڑ گئی ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں جو بچہ پیدا ہوتا ہے اس کے گلے میں نوشتہ سعادت یا شقاوت لٹکا ہوتا ہے(2)۔

۲؎ کتاباً سے مراد عمل کا صحیفہ ہے۔ جمہور قراء نے تعظیم و تکلم کی وجہ سے نون کے ساتھ باب افعال سے پڑھا ہے اور کتاباً کو مفعول بہ یا مفعول محذوف سے حال ہونے کی بناء پر منصوب پڑھا ہے۔ مفعول محذوف الطائر ہے۔ اسکی تائید یعقوب اور ابوجعفر کی قرأت کرتی ہے۔ یعقوب الحسن اور مجاہد نے یخرج یعنی یاء کے فتحہ اور راء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے یعنی يَخْرُجُ لَهُ الطَّائِرُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كِتَابًا۔ ابوجعفر نے یاء کے ضمہ اور راء کے فتحہ کے ساتھ مجہول کا صیغہ پڑھا ہے یعنی يُخْرَجُ لَهُ الطَّائِرُ كِتَابًا

۳؎ یلقہ کو ابن عامر اور ابوجعفر نے یاء کے ضمہ اور لام کے فتحہ اور قاف کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے یعنی انسان کو وہ کتاب دی جائے گی۔ باقی قراء نے یاء کے فتحہ لام کے سکون اور قاف کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ یلقاہ اور منشوراً دونوں کتاب کی صفات ہیں یا یلقاہ صفت ہے اور منشوراً ضمیر مفعول سے حال ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں آثار میں ہے اللہ تعالیٰ فرشتے کو صحیفہ لپیٹنے کا حکم دیتے ہیں جب انسان کی عمر مکمل ہو جاتی ہے۔ پھر قیامت تک نہیں کھولا جاتا(3)۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 123 (التجاریۃ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 124 (التجاریۃ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 124 (التجاریۃ)

اِقۡرَاۡ كِتٰبَكَ ؕ كَفٰى بِنَفۡسِكَ الۡيَوۡمَ عَلَيۡكَ حَسِيۡبًا ؕ﴿۱۴﴾

"(اسے حکم ملے گا) پڑھو اپنا دفتر عمل تم خود ہی کافی ہو آج اپنی باز پرس کرنے کیلئے [1]"

[1] اسے کہا جائے گا اپنا نامہ اعمال پڑھ یا نامہ اعمال میں لکھا ہوگا کہ اپنا نامۂ اعمال پڑھو۔ بنفسک میں با زائدہ ہے اور حسیبًا تمیز ہے اور علی اس کا صلہ ہے کیونکہ یا تو یہ حاسب کے معنی میں ہے جیسے صریم بمعنی صارم ہوتا ہے حسب علیہ کذا سے مشتق ہے یا کافی کے معنی میں ہے اور شہید کی جگہ ذکر کیا گیا ہے۔ مدعی کیلئے کافی ہے جو چیز اسے یاد دلائے کہ حساب اور گواہی کے مرو ہی والی ہیں گویا یوں ارشاد ہے تو خود آج گواہی دینے والا امر اپنے لیے کافی ہے۔ یا نفس کی تاویل شخص پر ہوگی۔ بیہقی نے حضرت انس کے طریق سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، فرمایا سارے نامہ اعمال عرش کے نیچے ہونگے جب موقف ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ایک ہوا بھیجے گا جو اعمال ناموں کو دائیں اور بائیں ہاتھوں تک پہنچا دے گی (1)۔ ابن جریر نے قتادہ سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں اس دن وہ بھی پڑھ لے گا جو دنیا میں ان پڑھ ہوگا۔ امام بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت الحسن نے فرمایا وہ تجھ سے عدل فرمائے گا جس نے تجھے تیرے نفس پہ حسیب بنایا تھا (2)۔ ابن مبارک نے الحسن سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں ہر شخص کی گردن میں ایک قلادہ ہوگا جس میں اس کے عمل کا نسخہ ہوگا۔ وہ اسکے گلے میں لپٹا ہوا ہے۔ جب قیامت کے روز اٹھایا جائے گا تو وہ نامہ اعمال اسکے لیے کھل جائے گا۔ اسے کہا جائے گا اپنا نامہ اعمال پڑھو تم خود ہی کافی ہو آج اپنی باز پرس کیلئے۔

اصبہانی نے ابی امامہ سے نقل کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (قیامت کے دن) ایک شخص کو اسکا نامہ اعمال دیا جائے گا۔ وہ کہے گا اے میرے رب میری فلاں فلاں نیکیاں کہاں ہیں جو میں نے کی تھیں وہ میرے نامہ اعمال میں نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے جو تو نے لوگوں کی غیبت کی تھی اسکی وجہ سے وہ میں نے مٹا دی ہیں۔

مَنِ اهۡتَدٰى فَاِنَّمَا يَهۡتَدِىۡ لِنَفۡسِهٖ ۚ وَمَنۡ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيۡهَا ؕ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزۡرَ اُخۡرٰى ؕ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيۡنَ حَتّٰى نَبۡعَثَ رَسُوۡلًا ﴿۱۵﴾

"جو راہ ہدایت پر چلتا ہے تو وہ راہ ہدایت پر چلتا ہے اپنے فائدے کے لیے [1] اور جو گمراہ ہوتا ہے تو اسکی گمراہی کا وبال اسی پر ہے [2] اور نہیں اٹھائیگا کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ [3] اور ہم عذاب نازل نہیں کرتے جب تک نہ بھیجیں کسی رسول کو [4]"

[1] جو ہدایت پر چلتا ہے تو اسکا ثواب اسے ہی ملتا ہے اسکا ہدایت پر چلنا کسی غیر کو نجات نہیں دیتا بلکہ اسے ہی نجات دیتا ہے۔

[2] اور جو گمراہ ہوتا ہے تو اسکی گمراہی کا وبال اسی پر ہے۔ اسکی گمراہی کسی دوسرے کو ہلاک نہیں کرے گی بلکہ اسے ہی ہلاک کرے گی۔

ابن عبد البر نے ضعیف سند کے ساتھ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے، فرماتی ہیں حضرت خدیجہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرکین کی اولاد کے متعلق پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ اپنے آباء سے ہیں یعنی انکے حکم میں ہیں۔ پھر کچھ مدت بعد حضرت خدیجہ نے یہی سوال کیا تو فرمایا اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے جو وہ بڑے ہو کر عمل کریں گے۔ پھر اسلام کے مستحکم ہونے کے بعد پوچھا تو یہ آیت نازل ہوئی وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزۡرَ اُخۡرٰى۔

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 304 (العلمیہ) — 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 124 (التجاریہ)

۳؎ کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسروں کے گناہوں کا بوجھ نہ اٹھائے گا بلکہ وہ اپنے نفس کے گناہوں کا بوجھ اٹھائے گا۔

۴؎ ہم عذاب نازل نہیں کرتے حتیٰ کہ ہم رسول مبعوث کر دیں جو حجج و دلائل کو واضح بیان کر دے اور شرائع کو ہموار کر دے اور ان پر حجت لازم کر دے۔ امام شافعی فرماتے ہیں اس آیت میں دلیل ہے کہ نبی کی بعثت سے پہلے عقل کے ذریعے توحید کو پہچاننا واجب نہیں ہے۔ پس جس شخص کو دعوت توحید نہ پہنچی ہو تو اسے شرک کرنے اور گناہ کرنے کی وجہ سے عذاب نہیں دیا جائے گا۔ امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں حاکم اللہ تعالیٰ ہے لیکن عقل ادراک کرتی ہے جو اس پر واجب ہوتا ہے اور وہ توحید ہر عیب سے پاک ماننا اور معجزات کے مشاہدہ کے بعد نبوت کا اقرار ہے۔ یہ امور شریعت پر موقوف نہیں ہیں ورنہ دور لازم آئے گا کیونکہ شرع ان امور پر موقوف ہے۔ پس رسولوں کی بعثت سے پہلے بھی ان امور کا ادا کرنا انسان پر واجب ہے۔ مشرک کو عذاب ہوگا اگرچہ اسے دعوت نہ بھی پہنچی ہو۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی تصدیق صحیحین کی اس حدیث سے ہوتی ہے جو ابوسعید الخدری نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے، فرمایا اللہ تعالیٰ فرمائے گا اے آدم۔ وہ عرض کریں گے میں حاضر ہوں میں تجھ سے سعادت کا سوالی ہوں۔ سب خیر تیرے ہاتھ میں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے دوزخ کا حصہ نکالو۔ عرض کریں گے دوزخ کا حصہ کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے ہر ہزار میں نو سو ننانوے۔ اس ارشاد سے بچے بوڑھے ہو جائیں گے، ہر حاملہ اپنا حمل ساقط کر دے گی۔ لوگ تجھے نشہ میں نظر آئیں گے حالانکہ نشہ دہ میں نہ ہونگے لیکن اللہ کا عذاب سخت ہے۔ صحابہ کرام نے عرض کی یا رسول اللہ ہم میں سے وہ ایک خوش نصیب کون ہے؟ فرمایا تمہیں خوشخبری ہو تم میں سے ایک جہنمی ہوگا اور یاجوج ماجوج میں سے ہزار(1)۔ امام صاحب فرماتے ہیں یاجوج وماجوج بند کے پیچھے ہیں۔ انکی طرف کوئی رسول نہیں بھیجا گیا اگر رسولوں کی بعثت سے پہلے شرک پر تعذیب نہ ہوتی تو یاجوج وماجوج کو عذاب نہ دیا جاتا۔ اہل فترۃ اور جنہیں نبی کی دعوت نہیں پہنچی کے متعلق احادیث وارد ہیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ یہ لوگ بھی قیامت کے دن پوچھ گچھ کیے جائیں گے۔ بزار نے ثوبان سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب قیامت قائم ہوگی زمانہ جاہلیت کے لوگ اپنے بوجھ اپنی پیٹھوں پر اٹھائے ہوئے آئیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان سے سوال فرمائے گا وہ کہیں گے اے ہمارے پروردگار تو نے ہماری طرف کوئی رسول ہی نہیں بھیجا تھا اور نہ تیرا حکم ہم تک پہنچا تھا اگر تو ہماری طرف رسول مبعوث کرتا تو ہم زیادہ اطاعت کرنے والے ہوتے۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے اگر میں تمہیں حکم دوں تو اطاعت کرو گے۔ اللہ تعالیٰ ان سے پختہ وعدہ لے گا اور فرمائے گا جاؤ دوزخ میں داخل ہو جاؤ۔ وہ جائیں گے مگر جب دوزخ کو دیکھیں گے تو ڈر کر واپس آ جائیں گے اور عرض کریں گے اے ہمارے رب ہم ڈر گئے ہیں ہم اس میں داخل ہونے کی طاقت نہیں رکھتے اللہ تعالیٰ فرمائیں گے ذلیل وخوار ہو کر اس میں داخل ہو جاؤ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر یہ تعمیل حکم میں دوزخ کے اندر چلے جاتے تو وہ انکے لیے ٹھنڈی ہو جاتی۔

امام احمد ابن راہویہ اور البیہقی نے کتاب الاعتقاد میں اسود بن سریع رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا چار شخص قیامت کے دن حجت پیش کریں گے۔ ۱۔ بہرہ جو بالکل کچھ نہ سنتا ہو۔ ۲۔ بیوقوف شخص۔ ۳۔ بوڑھا فرتوت۔ ۴۔ ایسا شخص جو زمانہ فترہ میں مرا ہوگا۔ بہرہ کہے گا اے میرے رب اسلام آیا مگر میں کچھ سنتا ہی نہ تھا۔ احمق کہے گا اے میرے رب اسلام آیا لیکن میری یہ حالت تھی کہ بچے مجھے مینگنیاں مارتے تھے۔ بوڑھا کہے گا اسلام آیا مگر میں کچھ سمجھتا ہی نہ تھا۔ اور جو زمانہ فترہ میں مرا ہوگا وہ کہے گا اے میرے رب تیرا رسول ہی نہیں آیا تھا، میں اسلام کیسے قبول کرتا۔ اللہ تعالیٰ ان سے اپنی اطاعت کا پختہ عہد لے گا پھر

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 18-117 (قدیمی)

انہیں آگ میں داخل ہونے کیلئے بھیج دے گا۔ قسم ہے اس ذات کی جسکے قبضہ قدرت میں میری جان ہے۔ اگر وہ داخل ہوتے تو آگ ان پر ٹھنڈی اور سلامتی والی ہو جاتی۔ مذکورہ تینوں محدثین نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اسی طرح کی حدیث مرفوع نقل کی ہے۔ اس کے آخر میں ہے جو اس میں داخل ہوگا وہ ان پر ٹھنڈی اور سلامتی والی ہو جائے گی اور جو داخل نہ ہوگا اسے گھسیٹ کر دوزخ میں ڈالا جائے گا (1)۔ ابن المبارک نے مسلم بن لیسار سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے مجھے فرمایا قیامت کے روز ایک ایسا بندہ اٹھایا جائے گا جو دنیا میں اندھا، بہرہ اور گونگا ہوگا، نہ اس نے کچھ سنا ہوگا نہ دیکھا ہوگا ورنہ کچھ بولا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ پوچھے گا جو میں نے تجھے نعمتیں عطا کی تھیں انکو تو نے کیسے استعمال کیا، جو میں نے حکم دیا اسکو تو کیسے بجالایا؟ وہ عرض کرے گا اے میرے رب تو نے مجھے آنکھیں ہی نہ عطا فرمائیں جنکے ساتھ دیکھ کر میں لوگوں کی اقتداء کرتا اور نہ تو نے میری سماعت پیدا کی کہ میں اسکے ساتھ سنتا کہ تو نے یہ حکم دیا ہے اس فعل سے روکا ہے۔ نہ تو نے میری زبان بنائی کہ میں خیر و شر سے کلام کرتا میں تو ایک لکڑی کی مانند تھا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا اب میں حکم دوں گا تو تو میری اطاعت کرے گا۔ وہ کہے گا ہاں میں ضرور اطاعت کرونگا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا آگ میں چلا جا۔ وہ انکار کرے گا پھر اسے آگ میں دھکیل دیا جائے گا۔

میں بھی احناف کے قول کے مطابق کہتا ہوں کہ مشرک اگر عقلمند ہوگا تو اسے عذاب دیا جائے گا، اگر چہ اسے نبی کی دعوت نہ بھی پہنچی ہو جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ (اللہ تعالیٰ شرک کو معاف نہیں فرمائے گا)۔ یہ ارشاد اصحاب فترہ کو بھی شامل ہے۔ (فترہ اس زمانہ کو کہتے ہیں جسمیں نبی مبعوث نہ ہو)

ان احادیث کا محمول یہی ہے کہ اہل فترہ کے بعض مشرک شاید اللہ تعالیٰ سے مجادلہ کریں گے اور اپنی جہالت کا عذر پیش کریں گے۔ پس ان پر وہاں آزمائش کر کے حجت لازم کردی جائے گی جیسے منکرین جب شرک کا انکار کریں گے اور کہیں گے وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِیْنَ۔ قسم بخدا ہم مشرک نہ تھے۔ اور اپنے اوپر گواہوں کا مطالبہ کریں گے۔ تو ان کے خلاف ان کے اپنے اعضاء و جوارح گواہی دیں گے اور ان پر حجت لازم ہو جائے گی۔ وَ لِلّٰهِ الحجة البالغة۔

جس شخص کو اللہ تعالیٰ عذاب دینا چاہے گا تو اسے توحید تسلیم نہ کرنے کی وجہ سے ضرور عذاب دیگا اور اسمیں وہ عادل بھی ہوگا۔ کیونکہ اس نے اسے عقل عطا کی تھی جسکے ذریعے وہ توحید کی پہچان کر سکتا تھا۔ لیکن دوسرے احکام شرعیہ انکے ادراک کیلئے عقل کافی نہیں ہے۔ انکا بجالانا بعثت سے پہلے انسان پر واجب نہیں ہے کیونکہ ارشاد ہے مَا كَانَ اللّٰهُ لِیُضِلَّ قَوْمًۢا بَعْدَ اِذْ هَدٰىهُمْ حَتّٰى یُبَیِّنَ لَهُمْ مَّا یَتَّقُوْنَ۔ اور نہیں ہے اللہ تعالیٰ کہ گمراہ کردے کسی قوم کو اسے ہدایت دینے کے بعد یہاں تک کہ بیان کردے انکے لئے وہ چیزیں جن سے انہیں بچنا چاہئے۔

احناف کے مسلک کے مطابق اس آیت کی تفسیر میں صاحب مدارک لکھتے ہیں۔ ہم دنیا میں کسی قوم کو استیصال کا عذاب نہیں دیتے مگر ان کی طرف رسول بھیجنے کے بعد۔ پس پہلے ہم حجت کو لازم کرتے ہیں۔ پھر نافرمانی کی وجہ سے انہیں عذاب دیتے ہیں۔

میں کہتا ہوں صاحب مدارک کی یہ تاویل بہت دور کی ہے کیونکہ ما کنا معذبین تعذیب کی نفی کے عموم پر دلالت کرتا ہے کیونکہ نکرہ نفی کے سیاق میں ہے۔ دنیا میں تعذیب کی تخصیص یا استیصال (جڑ سے اکھیڑ دینا) کی تعذیب کی تخصیص کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ یہ کیسے ہو

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 305 (العلمیہ)

سکتا ہے دنیا میں اتمام حجت کے بغیر عذاب نہ دینا آخرت میں بطریق اولی عذاب نہ دینے کا تقاضا کرتا ہے۔ یہ کہنا بہتر ہے کہ بعثت سے پہلے عذاب نہ دینا معاصی کے ساتھ خاص ہے شرک کے ساتھ نہیں کیونکہ ارشاد ہے اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَادُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ[1] بیشک اللہ تعالیٰ نہیں بخشتا اس بات کو کہ شرک کیا جائے اس کے ساتھ اور بخش دیتا ہے جو اس کی علاوہ ہے جس کو چاہتا ہے۔

پس ماکنا معذبین۔ معاصی پر محمول ہوگا یعنی ہم گناہوں پر عذاب نہیں دیتے حتی کہ وہ رسول مبعوث کردیں جو ان احکام کو بیان کرے جن سے بچنا لازمی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں رسول سے مراد عام ہے، یعنی انسان اور عقل دونوں ہیں کیونکہ عقل بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول ہے اسکے ذریعے خیر وشر کی تمیز کی جاتی ہے۔ پس جن چیزوں کا ادراک کر سکتی ہے اور واجبات میں سے جن چیزوں کے ادراک میں کفایت کرتی ہے۔ انکے ادا نہ کرنے پر عقلمند کو اللہ تعالیٰ عذاب دے گا۔

فصل :۔ یہ آیت کریمہ چھوٹے بچوں اور دیوانوں کو عذاب نہ دینے پر دلالت کرتی ہے، اگرچہ وہ مشرکین کے ہی بچے ہوں۔ کیونکہ ان تک انسانی رسول کی دعوت پہنچی ہے اور نہ عقل کی۔ جیسا کہ آیت کا سیاق بھی دلالت کرتا ہے: وَ لَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی۔ اور احادیث طیبہ بھی انکی تائید کرتی ہیں۔ امام احمد نے حسن سند کے ساتھ حضرت خنساء بن معاویہ بن مریم سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں میرے چچا نے مجھے بیان کیا ہے کہ میں نے عرض کی یارسول اللہ جنت میں کون کون ہونگے؟ فرمایا نبی جنت میں ہوگا۔ شہید جنت میں ہوگا۔ پیدا ہونے والا بچہ جنت میں ہوگا۔ زندہ درگور کیا گیا جنت میں ہوگا(1)۔

امام بخاری نے سمرہ بن جندب سے ایک حدیث خواب بیان کی ہے، اس میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک شیخ کے پاس سے گذرے جو درخت کے نیچے بیٹھا تھا اور اسکے ارد گرد بچے تھے۔ جبریل علیہ السلام نے آپ کو بتایا یہ ابراہیم علیہ السلام ہیں اور یہ بچے مسلمانوں اور مشرکوں کے ہیں۔ صحابہ کرام نے پوچھا یارسول اللہ مشرکین کی اولاد بھی ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ تھی۔ فرمایا ہاں مشرکین کی اولاد بھی آپ کے پاس تھی۔ بعض علماء نے فرمایا مشرکین کے بچے جنتیوں کے خدام ہونگے۔ جیسا کہ طیالسی نے حضرت انس سے روایت کیا ہے۔ آپ سے مشرکین کے بچوں کے بارے پوچھا گیا تو فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا انکے نہ تو گناہ ہیں کہ وہ دوزخی ہوں نہ انکی نیکیاں ہیں کہ انکو بدلہ دیا جائے وہ اہل جنت کے غلام ہونگے اور اہل جنت کے خدام ہونگے۔

ابن جریر نے حضرت سمرہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں ہم نے مشرکین کے بچوں کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ اہل جنت کے خادم ہیں(2)۔ اسی حدیث کی مثل ابن مسعود سے موقوف حدیث بھی مروی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ صحیحین کی حدیث تو ان کے متعلق عدم جزم پر دلالت کرتی ہے۔ حضرت ابو ھریرہ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرکین کے بچوں کے متعلق پوچھا گیا تو فرمایا اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے جو وہ عمل کرنے والے ہیں(3)۔ اسکی مثل حضرت ابن عباس کی حدیث ہے۔ جوابا ہم کہیں گے کہ یہ حکم یعنی قطعی طور پر انکے جنتی نہ ہونے کا حکم جس پر مذکور دونوں احادیث دلالت کرتی ہیں۔ منسوخ ہے یہ حکم آیت فتح سے پہلے کا ہے جو اس آیت کو وَمَاۤ اَدْرِیْ مَا یُفْعَلُ بِیْ وَلَا بِکُمْ کو منسوخ کرنے والی ہے۔ اسی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم آیت فتح کے نزول سے پہلے اس شخص کی بات کو رد کرتے تھے جو کسی معین شخص کے جنتی ہونے کی شہادت دیتا تھا۔ اسی طرح عثمان بن مظعون کے جنتی ہونے کی گواہی جس شخص نے دی تھی اس کا بھی آپ نے رد کیا تھا۔ لیکن جب آیت فتح نازل ہوئی

1۔ مسند احمد، جلد5، صفحہ58 (صادر) 2۔ الدر المنثور، جلد4، صفحہ305 (العلمیۃ) 3۔ صحیح مسلم، جلد2، صفحہ337 (قدیمی)

تو آپ کو بہت مسرت ہوئی اور پھر آپ نے خود مخصوص افراد کے جنتی ہونے کی شہادت دی۔

یہی جواب ہے مسلم کی حدیث کا جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، فرماتی ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو انصار کے ایک بچہ کے جنازے پر بلایا گیا میں نے عرض کی یارسول اللہ! اس کے لیے مبارک ہو وہ تو جنت کی چڑیوں میں سے ایک چڑیا ہے اس لئے کہ کوئی گناہ نہ کیا اور نہ گناہ کی عمر کو پایا فرمایا اسکے علاوہ بھی کچھ ہے اے عائشہ اللہ تعالیٰ نے جنت کو پیدا کیا اور اسکے اہل پیدا کیے درآں حالیکہ وہ اپنے آباء کی صلبوں میں ہیں۔ دوزخ کو پیدا کیا اور دوزخیوں کو پیدا کیا جو ابھی اپنے آباء کے اصلاب میں ہیں(1)۔ یہ حدیث مسلمانوں کے بچوں کے بارے میں توقف پر دلالت کرتی ہے۔ حالانکہ مسلمانوں کے بچوں کے جنتی ہونے پر اجماع ہو چکا ہے۔ امام احمد، ابن ابی زید اور ابو یعلی نے فراء وغیرہ سے اجماع کا قول نقل کیا ہے۔ کتاب کی نصوص اور احادیث بھی اسکے متعلق صریح موجود ہیں کہ مسلمانوں کے بچے جنتی ہیں۔ امام نووی اور سیوطی نے اسی طرح کہا ہے۔ یہی جواب ہے ابن عباس کی روایت کا جو ابن حبان اور البزار نے روایت کی ہے فرمایا! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا! اس امت کا معاملہ حق کے قریب رہے گا جب تک یہ تقدیر اور بچوں کے متعلق کلام نہیں کریں گے۔ ابن حبان نے فرمایا ولدان سے مراد مشرکین کے بچے ہیں۔ اس حدیث کو بھی ہم آیت فتح کے نزول سے پہلے پر محمول کریں گے اور اس پر کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ابھی تک ان کے جنتی ہونے کا علم نہیں ہوا تھا۔

اگر یہ کہا جائے کہ بعض احادیث دلالت کرتی ہیں کہ مشرکین کے بچے دوزخ میں ہونگے مثلاً ابو یعلی نے البراء رضی اللہ عنہ سے روایت کیا فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسلمانوں کے بچوں کے بارے سوال کیا گیا تو فرمایا وہ اپنے آباء کے ساتھ ہیں۔ مشرکین کے بچوں کے بارے سوال کیا گیا تو فرمایا وہ اپنے آباء کے ساتھ ہونگے۔

ابوداؤد نے حضرت عائشہؓ سے روایت کیا ہے، فرماتی ہیں میں نے عرض کی یارسول اللہ مومنین کی اولاد کا کیا حکم ہے فرمایا وہ اپنے اباء سے ہیں میں نے عرض کی یارسول اللہ! بغیر کسی عمل کے فرمایا اللہ بہتر جانتا ہے جو وہ کرنے والے تھے۔ پھر میں نے پوچھا حضور! مشرکین کے بچوں کا کیا حکم ہے فرمایا وہ اپنے آباء سے ہیں میں نے کہا بغیر کسی عمل کے فرمایا اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے جو وہ کرنے والے تھے۔

امام احمد نے حضرت عائشہ سے سند ضعیف کے ساتھ روایت کیا ہے۔ فرماتی ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے مشرکین کے بچوں کا ذکر کیا تو فرمایا اگر تم چاہو تو میں تمہیں دوزخ میں ان کے چلانے کی آواز سنا دوں۔

عبداللہ بن احمد نے زوائد المسند میں ایک مجہول راوی والی منقطع سند کے ساتھ ذکر کیا ہے اور ابن ابی حاتم نے السنہ میں حضرت علی سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان اپنے دو بچوں کے بارے پوچھا جو زمانہ جاہلیت میں فوت ہو گئے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ دونوں دوزخ میں ہیں جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے چہرے پر ناگواری دیکھی تو فرمایا اگر تو ان اپنے بچوں کا ٹھکانا دیکھ لے تو تو ان سے نفرت کرے گی۔ حضرت خدیجہ نے عرض کی جو بچے آپ سے ہوئے وہ؟ فرمایا مومنین اور انکی اولاد جنت میں ہیں اور مشرکین اور انکی اولاد دوزخ میں ہیں پھر یہ آیت تلاوت فرمائی۔ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّیَّتُهُمْ بِاِیْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ اور جو لوگ ایمان لائے اور ان کی پیروی کی انکی اولاد نے ایمان کیساتھ ہم ملا دیں گے انکے ساتھ انکی اولاد کو۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 337 (قدیمی)

ابوداؤد نے حضرت ابن مسعود سے سند حسن کے ساتھ نقل کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا زندہ درگور کرنے والی اور درگور کی گئی دوزخ میں ہیں۔

حسن سند کے ساتھ سلمہ بن قیس الاشجعی سے روایت کی ہے، فرمایا میں اور میرا بھائی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئے۔ ہم نے عرض کی حضور ہماری والدہ زمانہ جاہلیت میں مرگئی ہے وہ بڑی مہمان نوازی اور صلہ رحمی کرنے والی تھی اور اس نے اپنی اس بہن کو زمانہ جاہلیت میں زندہ درگور کیا تھا جو ابھی بالغ نہ تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا زندہ درگور کرنے والی اور درگور کی گئی دوزخ میں ہیں مگر یہ کہ درگور کرنے والی زمانہ اسلام کو پالے اور اسلام قبول کرے (تو وہ جنت میں جائے گی)

ہم کہتے ہیں حدیث میں الموءودۃ سے مراد ماں ہے اور الوائدہ سے مراد دایہ ہے تاکہ دوسری احادیث کے ساتھ ان احادیث کا تعارض نہ ہو۔

باقی وہ احادیث جن میں مشرکین کے بچوں کے دوزخ میں ہونے کا ذکر ہے وہ تمام ضعیف ہیں، احادیث صحیحہ کے مقابل نہیں ہو سکتیں، چہ جائیکہ قرآن کے متعارض بھی جائیں۔

ان احادیث کے منسوخ ہونے کا قول صحیح نہیں ہے کیونکہ اخبار نسخ کا احتمال نہیں رکھتیں۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے لئے عذاب پہلے لکھا گیا ہو۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے وہ عذاب اللہ تعالیٰ نے اٹھا لے گا۔ اس پر ابن ابی شیبہ کی حدیث دلالت کرتی ہے جو حضرت انس سے مروی ہے، فرماتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں نے اپنے پروردگار سے انسانوں کے غافل بچوں کے متعلق سوال کیا کہ انہیں عذاب نہ دیا جائے تو اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ عطا فرما دیا۔ ابن عبد البر فرماتے ہیں اللاھین سے مراد بچے ہیں کیونکہ انکے اعمال بغیر کسی عزم و جزم کے لہو ولعب کی طرح ہوتے ہیں۔

امام سیوطی فرماتے ہیں قدیم وجدید علماء کے مشرکین کے بچوں کے متعلق کئی اقوال ہیں۔

(1) مذکورہ احادیث کی بناپر وہ دوزخی ہونگے لیکن یہ احادیث ضعیف ہیں بطور حجت پیش نہیں کی جا سکتیں۔

(2) وہ جنت میں ہونگے (3) وہ اہل جنت کے خادم ہونگے (میں کہتا ہوں دوسرے اور تیسرے قول میں کوئی تعارض نہیں ہے کیونکہ اہل جنت کے خادم بھی جنت میں ہونگے)

(4) وہ اللہ تعالیٰ کی مشیت میں ہونگے۔ ان کے متعلق کوئی حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ یہ قول الحمادین، ابن المبارک اور ابن راہویہ اور امام شافعی سے منقول ہے اور امام نسفی نے امام ابوحنیفہ سے بھی یہی نقل کیا ہے۔ (میں کہتا ہوں یہ قول احتیاط پر مبنی ہے اور صحیح یہ ہے کہ یہ حکم منسوخ ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے)۔ (5) ان سے بھی آخرت میں امتحان لیا جائے گا جیسے اہل فترہ سے امتحان ہوگا(1)۔ جیسا کہ بزار اور ابو یعلیٰ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کے روز چار شخصوں کو لایا جائے گا۔ بچہ، مجنون اور ایام فترت میں مرنے والا اور شیخ فانی ان میں سے ہر شخص اپنی حجت پیش کرے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ جہنم سے فرمائے گا "ظاہر ہو" اور ان سے فرمائے گا۔ میں نے اپنی طرف سے تمہارے پاس رسول بھیجے اور اب میں خود تمہاری طرف اپنا رسول ہوں، اس جہنم میں داخل ہو جاؤ۔ پس جسکی تقدیر میں شقاوت ہوگی وہ کہے گا کیا تو ہمیں جہنم میں داخل کر رہا ہے حالانکہ ہم اس

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 05-304 (العلمیۃ)

سے بھاگتے تھے اور جس شخص کی تقدیر میں سعادت ہوگی وہ دوڑ کر جہنم میں داخل ہوگا اور اللہ فرمائے گا تم نے میری نافرمانی کی تو تم میرے رسولوں کی تو اس سے زیادہ تکذیب اور نافرمانی کرتے۔ پھر ان کو (یعنی جہنم میں داخل ہونے والوں کو) جنت میں داخل کر دے گا اور ان کو (جو جہنم میں داخل نہیں ہوئے تھے) جہنم میں داخل کر دے گا(1)۔

بزار اور محمد بن یحییٰ الذہبی نے ابو سعید الخدری سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایام فترت میں ہلاک ہونے والا، پاگل اور بچہ اپنی اپنی حجت پیش کریں گے۔ ایام فترت میں مرنے والا کہے گا میرے پاس کوئی کتاب نہیں آئی تھی۔ پاگل کہے گا اے میرے رب تم نے مجھے عقلمند ہی نہیں بنایا تھا جس سے میں خیر اور شر کا ادراک کرتا بچہ کہے گا اے میرے رب میں نے عقل ہی نہیں پائی تھی۔ پھر ان کے لیے آگ بلند کی جائے گی اور ارشاد ہوگا اس میں داخل ہو جاؤ۔ پس وہ داخل ہوگا جو اللہ تعالیٰ کے علم میں سعید ہوگا اگر علم و عمل کا زمانہ پاتا۔ اور جو علم الٰہی میں شقی ہوگا اگر عمل کا زمانہ پاتا تو وہ داخل ہونے سے رک جائے گا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا تم نے میری نافرمانی کی تو پھر میرے رسولوں کی تم نافرمانی کیسے نہ کرتے اگر وہ تمہارے پاس آتے۔

طبرانی اور ابونعیم نے معاذ بن جبل سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یوم قیامت بے عقل، ایام فترت میں مرنے والے اور بچپن میں ہلاک ہونے والے کو لایا جائے گا۔ بے عقل کہے گا اے میرے رب اگر تو مجھے عقل عطا فرماتا تو عقلمندوں میں سے کوئی مجھ سے زیادہ سعادت مند نہ ہوتا۔ پھر آپ نے ایام فترت اور بچپن میں مرنے والوں کا اسی طرح ذکر کیا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا اب میں تمہیں حکم دیتا ہوں تم میری اطاعت کرو گے وہ کہیں گے ہاں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا جاؤ دوزخ کی آگ میں داخل ہو جاؤ۔ فرمایا اگر وہ داخل ہوں گے تو انہیں آگ کوئی نقصان نہ پہنچائے گی۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ ان پر دوزخ کے کچھ آثار ظاہر کرے گا۔ وہ گمان کریں گے یہ تو اللہ تعالیٰ کی ہر چیز کو ہلاک کر دیں گے۔ وہ جلدی جلدی پیچھے لوٹیں گے۔ پھر دوبارہ حکم ہوگا۔ پھر وہ لوٹ کر جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا تمہیں تخلیق کرنے سے پہلے مجھے علم تھا کہ تم کیا کرنے والے ہو(2)۔

میں کہتا ہوں یہ پانچواں قول ضروریات دین میں مناسب نہیں ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تین شخصوں سے قلم اٹھایا گیا ہے: دائمی پاگل، سونے والا حتی کہ بیدار ہو جائے۔ اور بچہ حتی کہ بالغ ہو جائے(3)۔ اس حدیث کو احمد، ابوداؤد، حاکم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے اور حضرت علی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے بھی صحیح سند سے روایت کی ہے۔ حدیث شریف میں یہ بات ثابت ہے کہ جو برائی کا ارادہ کرے تو اس سے مؤاخذہ نہ ہوگا جب تک اس برائی پر عمل نہ کرے۔ پس جس نے برائی کا ارادہ نہیں کیا برائی کو سمجھا ہی نہیں اسے کیسے سزا ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا یُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا "ذمہ داری نہیں ڈالتا اللہ تعالیٰ کسی شخص پر مگر جتنی طاقت ہو اسکی اور فرمایا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَیْهَا مَا اكْتَسَبَتْ" اسکو اجر ملے گا جو (نیک عمل) اس نے کیا اور اس پر وبال ہوگا جو برا عمل اس نے کمایا) وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی۔ اور نہیں ملتا انسان کو مگر وہی کچھ جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔

امت کا اجماع ہے کہ تکلیف کا دارومدار عقل اور بلوغ پر ہے۔ احادیث میں مولود اور مجنون کے الفاظ شاید راویوں کا وہم ہیں یا حکم الٰہی پر عمل پیرا ہو کر امتحان کے وقت آگ میں داخل ہوں گے اور نجات پا جائیں گے لیکن اہل فترہ کے مشرکین حکم الٰہی کی تعمیل نہیں

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 306 (العلمیہ)
2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 305 (العلمیہ)
3۔ مستدرک حاکم، جلد 4، صفحہ 389

کریں گے۔ امام سیوطیؒ نے فرمایا بعض علماء فرماتے ہیں مشرکین کے بچے جنت اور دوزخ کے درمیان برزخ میں ہونگے۔ بعض فرماتے ہیں وہ مٹی ہو جائیں گے لیکن اس پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ لیکن مسلمانوں کی اولاد کے متعلق اجماع ہے کہ وہ جنت میں ہونگے۔

وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا ۝

”اور جب ہم ارادہ کرتے ہیں کہ ہلاک کر دیں کسی بستی کو (اسکے گناہوں کے باعث) تو (پہلے) ہم (نبیوں کے ذریعہ) وہاں کے رئیسوں کو (نیکی کا) حکم دیتے ہیں [1] مگر وہ (الٹا) نافرمانی کرنے لگتے ہیں اس میں [2] پس واجب ہو جاتا ہے ان پر (ب کا) فرمان [3] پھر ہم اس بستی کو جڑ سے اکھیڑ کر رکھ دیتے ہیں [4]“

[1] مترفیھا سے مراد اسی بستی کے اہل ثروت اور سرکش لوگ ہیں۔ مجاہد نے امرنا کو شد کے ساتھ امرنا پڑھا ہے، یعنی ہم نے ان بستی والوں پر سرکش لوگوں کو مسلط کر دیا۔ حسن اور قتادہ نے آمرنا یعنی مد کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی ہم نے زیادہ کر دیا ایسے سرکشوں کی تعداد کو۔ جمہور قراء نے مقصور مخفف ہی پڑھا ہے۔ معنی یہ ہے کہ ہم نے اس بستی کے اہل ثروت عیش پرست لوگوں کو انکی طرف مبعوث کیے گئے۔ رسول کے ذریعہ اطاعت و فرمانبرداری کا حکم دیا۔ اس تقدیر پر وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا بھی اور بعد والا قول ففسقوا فیھا بھی دلالت کرتا ہے۔

[2] فسق کا معنی طاعت سے خروج اور نافرمانی میں تمرد و سرکشی کی انتہا کو پہنچنا ہے۔ پس یہ طاعت پر دلالت کرتا ہے۔ یعنی پہلے انہیں اطاعت کا حکم تھا لیکن انہوں نے فسق و فجور کا بازار گرم کیا۔ بعض علماء فرماتے ہیں آیت کا معنی یہ ہے کہ ہم نے انہیں فسق کا امر دیا تو وہ فسق کرنے لگے جیسے تو کہتا ہے میں نے اسے امر دیا تو وہ بیٹھ گیا کیونکہ اس سے بیٹھنے کا امر ہی سمجھا جاتا ہے۔ اس صورت میں امر کا حقیقی معنی مراد نہیں ہوگا کیونکہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ [5] اللہ برائی کا حکم نہیں دیتا۔ بلکہ مجازاً سبب مراد ہوگا۔ یعنی ان پر ہم نے نعمتوں کی بارش کی تو وہ نادان نعمتوں کے شکر کرنے کی بجائے نافرمانی کرنے لگے اور ان نعمتوں نے انہیں فسق و فجور اور سرکشی تک پہنچا دیا۔

بعض علماء فرماتے ہیں امرنا کا معنی کثرنا ہے، یعنی ہم نے مترفین کی تعداد بڑھا دی۔ کہتے ہیں آمرت الشیء و آمرته فامر یعنی میں نے اسے زیادہ کیا تو وہ زیادہ ہوگئی۔ حدیث شریف میں بھی امر بمعنی کثر استعمال ہوا ہے، فرمایا خَيْرُ الْمَالِ سِكَّةٌ مَأْبُوْرَةٌ مُهْرَةٌ مَأْمُوْرَةٌ یعنی بہتر مال کھجوروں کی لائن ہے اور ایسی بچھیری ہے جو زیادہ بچے پیدا کرنے والی ہو۔ اسی طرح ابی سفیان کا قول ہے جو اس نے ہرقل کے سامنے بیان کیا تھا لَقَدْ اَمِرَ اَمْرُ ابْنِ اَبِيْ كَبْشَةَ۔ یعنی عبداللہ کے بیٹے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شان بہت بلند ہے۔ اس طرح ایک دوسری حدیث میں ہے مالی اری امرک یامر حضور آپ کی شان تو بلند سے بلند تر ہو رہی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا واللہ لیامرن قسم بخدا جو تو نے دیکھا ہے، اس سے بھی زیادہ شان بڑھے گی۔ اسی معنی میں عبداللہ بن مسعود کا قول ہے کہ ہم زمانہ جاہلیت میں کہتے تھے قد آمر بنو فلان۔ بنو فلاں زیادہ ہو گئے۔ قاموس میں ہے آمرہ وامرہ کنصرہ یعنی اسکی نسل اور جانور زیادہ ہو گئے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ یہ امر بالضم امارۃ سے مشتق ہو یعنی ہم نے انکو امراء بنا دیا۔ یہاں صرف مترفین (اہل ثروت) کا خاص ذکر فرمایا کیونکہ دوسرے لوگ رئیسوں کے تابع ہوتے ہیں یا اس لئے کہ دنیادار زیادہ حماقت کرتے ہیں اور فسق و فجور پر زیادہ قدرت رکھتے ہیں۔

۱۳؎ یعنی ان پر عذاب اترنے کا فرمان واجب ہو چکا ہے۔ یا یہ معنی کہ انکی نافرمانیوں کے ظہور یا نافرمانیوں میں انہماک کی وجہ سے عذاب کا فرمان واجب ہو چکا ہے۔

۱۴؎ ہم انکے اہل و دیار کو ہلاک کر کے انہیں ہلاک کر دیا۔ امام بخاریؒ نے ام حبیبہ بنت ابی سفیان عن زینب بنت جحش کے طریق سے روایت کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم انکے پاس گھبرائے ہوئے تشریف لائے اور آپ یہ کہہ رہے تھے لا الہ الا اللہ عربوں کیلئے اس سے تباہی ہے۔ یاجوج وماجوج نے اتنا سوراخ کر لیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انگوٹھے اور ساتھ انگلی کو ملا کر سوراخ کا اشارہ فرمایا۔ حضرت زینب فرماتی ہیں میں نے عرض کی یارسول اللہ کیا ہلاکت ہوگی جبکہ نیک بھی موجود ہیں۔ فرمایا ہاں جب خبث (برائی) زیادہ ہو جاتی ہے (تو ہلاکت کا کوڑا سب پر برستا ہے)

وَكَمۡ اَهۡلَكۡنَا مِنَ الۡقُرُوۡنِ مِنۡۢ بَعۡدِ نُوۡحٍ‌ ؕ وَكَفٰى بِرَبِّكَ بِذُنُوۡبِ عِبَادِهٖ خَبِيۡرًۢا بَصِيۡرًا ﴿۱۷﴾

"اور کتنی قومیں ہیں جنہیں ہم نے ہلاک کر دیا ۱؎ ہے نوح کے بعد ۲؎ اور آپ کا پروردگار اپنے بندوں کے گناہوں سے اچھی طرح باخبر ہے (اور انہیں) خوب دیکھنے والا ہے ۳؎"

۱؎ کم خبریہ کثرت کا معنی دے رہا ہے۔ من القرون کم کا بیان اور تمیز ہے قرن اس قوم کو کہتے ہیں جن کا زمانہ ایک ہو۔ یعنی جن کی ولادت ایک زمانہ میں ہو۔ قاموس میں ہے کہا جاتا ہے هو على قرنى۔ یعنی وہ میرا ہم عمر ہے۔ انقضاء القرن کا معنی یہ ہے کہ ان میں سے کوئی ایک بھی باقی نہ رہا۔ قاموس میں ہے ہر امت جو ہلاک ہو جائے اور کوئی ایک بھی باقی نہ رہے تو انقضاء القرن کا لفظ بولا جا سکتا ہے۔

میں کہتا ہوں قرن الصحابہ اور قرن التابعین سے مراد وہ افراد ہونگے جنہوں نے صحبت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا شرف پایا اور جنہوں نے صحابہ کرام سے ملاقات کی سعادت حاصل کی۔ علماء کے قرن کے متعلق مختلف اقوال ہیں۔ دس سال یا بیس سال یا تیس سال یا چالیس یا پچاس یا ساٹھ یا ستر یا اسی یا سو یا ایک سو بیس سال۔ قاموس میں یہ سب اقوال موجود ہیں۔ احناف مفقود الخبر کیلئے نوے سال کا اعتبار کرتے ہیں۔ اصح یہ ہے کہ یہ مدت سو سال ہے کیونکہ محمد بن قاسم عبداللہ بن بسر المازنی سے روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انکے سر پر ہاتھ رکھ کر فرمایا یہ بچہ ایک قرن زندہ رہے گا۔ محمد بن قاسم فرماتے ہیں ہم انکی عمر شمار کرتے رہے حتی کہ سو سال مکمل ہوئے پھر انکا وصال ہوا۔

۲؎ جیسے قوم عاد ثمود وغیرہم۔ ان کی ہلاکت کا ذکر کفار مکہ کو ڈرانے کیلئے ہے وكفى بربك میں با زائدہ ہے اور ربک محل رفع میں ہے اور بذنوب عبادہ یہ علی سبیل التنازع مابعد کے متعلق ہے۔

۳؎ وہ باخبر ہے اپنے بندوں کے گناہوں سے، اگرچہ وہ اپنے نہاں خانہ دل میں چھپائے ہوئے ہوں۔ وہ اپنے بندوں کے گناہ دیکھ رہا ہے، خواہ وہ ان پر کئی پردے ڈالے ہوئے ہوں

مَنۡ كَانَ يُرِيۡدُ الۡعَاجِلَةَ عَجَّلۡنَا لَهٗ فِيۡهَا مَا نَشَآءُ لِمَنۡ نُّرِيۡدُ ثُمَّ جَعَلۡنَا لَهٗ جَهَنَّمَ‌ ۚ

يَصْلٰىهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ﴿۱۸﴾

"جو طلبگار ہیں صرف دنیا کے ۱ہم جلدی دے دیتے ہیں اس دنیا میں جتنا چاہتے ہیں (انہیں سے) جسے چاہتے ہیں ۲پھر ہم مقرر کر دیتے ہیں اسکے لیے جہنم تاپے گا وہ اسے اس حال میں کہ وہ مذمت کیا ہوا (اور) ٹھکرایا ہوا ہوگا ۳"

۱ العاجلہ کا موصوف الدار محذوف ہے اور مراد دار دنیا ہے۔ یعنی جسکی زندگی کی ساری تگ و دو فقط دنیوی زندگی کی عیش و آرام کیلئے ہوتی ہے۔

۲ اس دنیا میں ہم اسے جلدی عطا فرما دیتے ہیں۔ جو ہم چاہتے ہیں یعنی اسکی خواہش کا کل یا بعض۔ مانشاء سے مقید فرمایا کیونکہ ہر شخص اپنی ہر خواہش کو حاصل نہیں کر پاتا۔

۳ پھر آخرت میں ہم اسکے لیے مقرر کر دیتے ہیں جہنم جس میں وہ داخل ہوگا۔ مذمت کیا ہوا اور اللہ کی رحمت سے ٹھکرایا ہوا۔

وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ﴿۱۹﴾

"اور جو شخص طلبگار رہتا ہے آخرت کا اور جدوجہد کرتا ہے اسکے لیے پوری طرح ۱درآنحالیکہ وہ مومن بھی ہو ۲پس یہ وہ (خوش نصیب ہیں) جن کی کوشش مقبول ہوگی ۳"

۱ جو آخرت کی سرخروئی کیلئے ہر عمل کرتا ہو اور اوامر کی پیروی اور منہیات سے رک کر اس نے آخرت کو سنوارنے کیلئے پوری کوشش صرف کی ہو اور صرف خواہشات اور باتیں بنانے اور آرزوؤں کے ذریعے قرب کا متمنی نہیں ہوتا۔ سعیھا مصدریت کی بناء پر منصوب ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ مفعول کی حیثیت سے منصوب ہو۔ لھا میں لام کا فائدہ نیت اور اخلاص کا اعتبار ہے، یعنی اعمال کی قبولیت کا انحصار صرف اخلاص اور نیک نیتی پر ہے۔

۲ اور اسکا دل نور ایمان سے روشن بھی ہو اسمیں شرک و نفاق کی ذرہ بھر ملاوٹ نہ ہو۔ کیونکہ ایمان پر ہی اعمال کی مقبولیت کا مدار ہے۔

۳ ان تینوں شرائط حامل لوگ ہی وہ ہیں جنکی ساری کوششیں قبول فرمائی جائیں گی۔ اللہ تعالیٰ کی جناب سے ہر عمل پر انہیں جزاء ملے گی کیونکہ اللہ کے شکر سے مراد طاعت پر ثواب عطا کرنا ہے۔

كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ۭ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ﴿۲۰﴾

"ہر ایک کی ہم امداد کرتے ہیں انکی بھی (جو طالب دنیا ہیں) اور ان کی بھی (جو طالب آخرت ہیں) آپ کے رب کی بخششوں سے ۱اور آپ کے رب کی بخشش کسی پر بند نہیں ۲"

۱ کلا میں تنوین عوض کی ہے۔ مضاف الیہ کو حذف کیا گیا ہے۔ اصل میں کل واحد من الفریقین تھا۔ یکے بعد دیگرے ہم بخشش و عطا کے ساتھ امداد کرتے ہیں۔ نئی عطا کو سابقہ مدد سے ملا دیتے ہیں۔ ھولاء کلا سے بدل ہے۔ اور من عطاء ربک نمد کے متعلق ہے۔

۲ تمہارے رب کی بخشش کا دروازہ نہ کسی مومن اور نہ کسی کافر پر بند ہے بلکہ دنیا کی نعمتیں اور آسائشیں ہر ایک کے لیے ہیں۔

اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۭ وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَكْبَرُ تَفْضِيْلًا ﴿۲۱﴾

"دیکھو کیسے بزرگی دی ہے ہم نے بعض کو بعض پر ۱؎ اور آخرت باعتبار درجوں کے سب سے بڑی اور باعتبار فضل و کرم سب سے اعلیٰ ہے ۲؎"

۱؎ اے پیارے محمد دیکھئے، کیسے ہم نے دنیا میں رزق و مال حسن و جمال میں بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ کیف فضلنا سے حال کی بناء پر منصوب ہے۔

۲؎ آخرت میں تفاوت دنیا کے تفاوت سے کہیں زیادہ ہے کیونکہ وہاں جنت اور اسکے درجات اور دوزخ اور اسکے درکات کے درمیان تفاوت ہوگا۔

لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُوْمًا مَّخْذُوْلًا ﴿۲۲﴾

"نہ ٹھہرا اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی اور معبود ورنہ تم بیٹھ رہو گے ۱؎ اس حال میں کہ تمہاری مذمت کی جائے گی اور بے یار و مددگار ہو جاؤ گے ۲؎"

۱؎ یہ خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور مراد آپ کی امت ہے یا یہ کہ ہر شخص مخاطب ہے، یعنی اے انسان تو نہ بنا۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی اور معبود اور قعد بمعنی صار ہے اور یہ عربوں کے قول شحذ الشفرة حتی قعدت کانها حربة سے ہے۔ یعنی اس نے چھری کو تیز کیا حتیٰ کہ وہ نیزہ کی طرح بن گئی۔ یا یہ معنی اور نہ تم عاجز ہو جاؤ گے۔ یہ تیرے قول قعد عن الشیء اذا عجز عنه سے ہے۔ یعنی جب کوئی شخص کسی کام سے عاجز آ جائے تو عرب قعد عن الشیء بولتے ہیں۔ یعنی قعد بمعنی عجز ہے۔

۲؎ فرشتے اور ملائکہ تیری مذمت کریں گے (اور) بے یار و مددگار رہوگا۔

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ؕ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَاۤ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَاۤ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ﴿۲۳﴾

"اور حکم فرمایا آپ کے رب نے کہ نہ عبادت کرو بجز اس کے ۱؎ اور ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرو ۲؎ اگر بڑھاپے کو پہنچ جائے تیری زندگی میں ان دونوں میں سے کوئی ایک یا دونوں ۳؎ تو انہیں اف تک مت کہو ۴؎ اور انہیں مت جھڑکو اور جب ان سے بات کرو تو بڑی تعظیم سے بات کرو ۵؎"

۱؎ یعنی تیرے رب نے قطعی حکم دیا ہے۔ حضرت ابن عباس، قتادہ، الحسن اور ربیع بن انس نے یہی معنی فرمایا ہے۔ الا تعبدوا الا اياه سے پہلے باء حرف جو پہلے محذوف ہے یعنی نہ عبادت کرو بجز اللہ تعالیٰ کے۔ کیونکہ عبادت کا معنی غایت تعظیم ہے اور اس کا مستحق صرف وہی ہوگا جو غایت عظمت اور نہایت انعام والا ہوگا۔ یہ سعی آخرت کی تفصیل کی مانند ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ ان مفسرہ ہو کیونکہ قضی میں قول کا معنی پایا جاتا ہے اور ان کو ناصب بنانا جائز نہیں ہے۔

۲؎ وان تحسنوا یا احسنوا بالوالدین احسانا کے معنی میں ہے کیونکہ والدین وجود اور تعیش کا سبب ظاہری ہیں۔ اس لئے سبب حقیقی کی عبادت کے بعد سبب ظاہری کی تعظیم کا حکم فرمایا ہے۔

۳؎ اما اصل میں ان شرطیہ ہے اور ما تاکید کیلئے زائد کیا گیا ہے۔ پھر نون کو میم میں ادغام کیا گیا ہے۔ اسی وجہ سے اسکے بعد فعل پر نون

تاکید کالاحق کرنا صحیح ہوتا ہے۔ اگر ان علیحدہ ہوتو اسکے فعل پر نون تاکید کا دخول صحیح نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے ان تکرمن زیدا نہیں کہا جاتا۔ یبلغن کو حمزہ اور کسائی نے یبلغان تثنیہ کا صیغہ پڑھا ہے اور ضمیر کا مرجع الوالدان ہے اور احدھما یبلغان کی ضمیر سے بدل ہے اور او کلاھما کا عطف احدھما پر ہے۔ جمہور قراء نے یبلغن واحد کا صیغہ پڑھا ہے اور فاعل احدھما اور کلاھما ہے۔ یعنی ان میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں۔

۳؎ اف کو نافع' حفص اور ابوجعفر نے یہاں اور سورۂ انبیاء اور سورۂ احقاف میں تنکیر کیلئے تنوین کے ساتھ پڑھا ہے۔ جیسے صیہ کی تنوین ہے۔ اور فاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن کثیر' ابن عامر اور یعقوب نے بغیر تنوین کے فاء کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقی قراء نے فاء کے کسرہ کے ساتھ بغیر تنوین کے پڑھا ہے۔ اف کا کلمہ اکتاہٹ پر دلالت کرتا ہے۔ بعض فرماتے ہیں اسم فعل ہے جسکا معنی تنگدل ہوتا ہے۔ ابوعبیدہ فرماتے ہیں اف اور تف اصل میں انگلیوں کی میل کو کہتے ہیں۔ قاموس میں ہے اف ناخن کے تراشے اور اسکی میل کو کہتے ہیں یا کانوں کی میل اور اس لکڑی یا چھلکے کو کہتے ہیں جو زمین سے اٹھالیا جائے۔ یا اف کا معنی قلت ہے۔ یعنی والدین کو ایسا کلمہ بھی نہ کہو جو ادنی سی کراہت پر دلالت کرے۔ اس ارشاد کی وجہ سے تمام اذیتیں بطریق اولیٰ حرام ہو گئیں (یعنی جب اف حرام ہے تو دوسری تکالیف بدرجہ اولی حرام ہونگی۔) مثلاً کہا جاتا ہے لا یملک النقیر و لا القطمیر یعنی کسی چیز کا مالک نہیں۔

۴؎ اپنی ناپسندیدہ اور اپنی خواہش کے خلاف ہر بات پر انہیں نہ جھڑکو اور بڑے دھیمے اور میٹھے لہجہ میں ان سے بات کرو۔ ابن مسیب فرماتے ہیں ان سے ایسے بات کرو جیسے مجرم انسان ایک کرخت حاکم کے سامنے لجاجت سے بات کرتا ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں جب وہ دونوں پاس بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان سے نفرت نہ کرو اور انکا بول و براز صاف کرتے وقت اف کا کلمہ بھی نہ کہو جیسے تیرے صغرسنی کے زمانہ میں وہ تجھ سے نفرت نہیں کرتے تھے۔

وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُل رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا ﴿٢٤﴾

''اور جھکا دو ان کے لیے تواضع و انکسار کے پر ۱؎ رحمت (ومحبت) سے ۲؎ اور عرض کرو اے میرے پروردگار ان دونوں پر رحم فرما ۳؎ اس طرح انہوں نے بڑی محبت و پیار سے مجھے پالا تھا ۴؎''

۱؎ یعنی ان دونوں کے سامنے عاجزی و انکساری سے پیش آؤ۔ یہاں ذل کیلئے پروں کا ذکر فرمایا اور پھر ان کو مبالغہ کیلئے جھکانے کا حکم فرمایا۔ یا جناح سے وہ مفہوم ہے جو آیت وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ میں ہے۔ جناح کی ذل کی طرف اضافت بیان اور مبالغہ کیلئے ہے جیسے حاتم الجود میں اضافت بیانیہ ہے مطلب یہ ہے کہ والدین کے سامنے انتہائی تواضع و انکساری سے پیش آؤ۔ عروہ بن زبیر فرماتے ہیں اسکا معنی ہے ان سے نرمی سے پیش آؤ حتی کہ جو وہ پسند کریں انہیں عطا کرو انہیں منع نہ کیا جائے۔

۲؎ اس تواضع اور انکساری میں رحمت و شفقت کا جذبہ نمایاں ہو کیونکہ اب وہ دونوں اسکے محتاج ہیں جیسے کل بچپن میں وہ انکا محتاج تھا (یعنی والدین کی خدمت کرتے وقت یہ جذبہ اور خیال ہونا چاہیے کہ بچپن میں میرا جب بے بسی کا دور تھا انہوں نے تکالیف اور مشقتیں برداشت کر کے میری نشو و نما کی اور میری ہر خواہش کو اپنی جان پر کھیل کر بھی پورا کرنے کی کوشش کی۔ آج مجھے بھی انکی اس لاچاری کی حالت میں شفقت و محبت سے خدمت کرنی چاہیے)

۳؎ اور صرف اپنی فانی شفقت و مہربانی کرنے پر اکتفا نہ کرے بلکہ اپنے پروردگار سے ان دونوں کیلئے دعا مانگے کہ اے مولائے کریم

ان پر اپنی دائمی اور باقی رہنے والی رحمت کے پھول برسا۔ ان پر اپنا در رحمت کشادہ فرما۔ امام بغوی فرماتے ہیں یہ دعا اس وقت کی جا سکتی ہے جب وہ مسلمان ہوں۔ ابن عباس فرماتے ہیں اس دعا کا حکم مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَن يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ کی آیت سے منسوخ ہے(1)۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں دعا کا حکم عام ہے والدین خواہ کافر ہوں یا مسلمان دونوں کیلئے دعا کی جا سکتی ہے کیونکہ انکے لیے رحمت کی دعا کا مفہوم یہ ہوگا کہ اے اللہ انہیں دولت اسلام سے مشرف فرما(2)۔

؎ جس طرح انہوں نے میری صغرسنی میں مجھ سے رحمت ورافت کا سلوک فرمایا، میری تربیت اور میری راہنمائی فرمائی تو بھی ان پر اپنی رحمت کی بارش فرما جیسا کہ رحم کرنے والوں کیلئے تیرا وعدہ ہے کہ تو زمین پر رحم کرنے والوں پر رحم فرماتا ہے۔ حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا والد جنت کا وسطی دروازہ ہے، اب تیری مرضی چاہیے اسکی حفاظت کر، چاہے اسے ضائع کر دے(3) اس حدیث کو امام احمد ترمذی ابن ماجہ اور حاکم نے سند صحیح کے ساتھ روایت کیا ہے۔

عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں۔ فرمایا اللہ تعالیٰ کی رضا والد کی خوشنودی میں ہے اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی والد کی ناراضگی میں ہے۔ اس حدیث کو ترمذی، حاکم نے صحیح بھی لکھا ہے(4)۔

حضرت البزار نے ابن عمر اور ابو سعید الخدری سے روایت کیا ہے۔ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا احسان جتلانے والا، والدین کا نافرمان اور ہمیشہ شراب کے نشے میں دھت رہنے والا جنت میں داخل نہ ہونگے۔ اس حدیث کو نسائی اور دارمی نے روایت کیا ہے۔

حضرت ابن عمر اور حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا رسوا ہو جائے وہ شخص جسکے سامنے میرا ذکر ہو اور وہ مجھ پر درود نہ بھیجے۔ ذلیل ہو جائے وہ شخص جسکو رمضان کا مہینہ ملے اور اسکی مغفرت نہ ہو۔ ذلیل ہو جائے وہ شخص جو اپنے والدین میں سے ایک کو بڑھاپے میں پائے یا دونوں کو پھر وہ (انکی خدمت کر کے) جنت میں داخل نہ ہو۔

حضرت ابی امامہ سے مروی ہے ایک شخص نے عرض کی یا رسول اللہ والدین کا اپنی اولاد پر حق کیا ہے؟ فرمایا وہ دونوں تمہاری جنت ہیں اور تمہاری آگ ہیں۔ اس حدیث کو ابن ماجہ نے روایت کیا ہے(5)۔

حضرت ابن عباس سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کیلئے والدین کی اطاعت میں صبح کرتا ہے اس کے لیے جنت کے دو دروازے کھلے ہوتے ہیں اگر ایک کی اطاعت میں ہوتا ہے تو اسکے لیے ایک جنت کا دروازہ کھلا ہوتا ہے اور جو اللہ تعالیٰ کیلئے والدین کا نافرمان ہوتا ہے اسکے لیے دوزخ کے دو دروازے کھلے ہوتے ہیں۔ اگر ایک کا نافرمان ہوتا ہے تو ایک دروازہ کھلا ہوتا ہے۔ ایک آدمی نے عرض کی حضور اگر والدین ظالم بھی ہوں (انکے ساتھ بھی حسن سلوک کا حکم ہے) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ فرمایا اگرچہ وہ ظالم بھی ہوں، اگرچہ وہ ظالم بھی ہوں، اگرچہ وہ ظالم بھی ہوں۔

حضرت ابن عباس سے ہی مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو نیک بیٹا اپنے والدین کو نظر رحمت سے دیکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے ہر نظر کے بدلے ایک حج مقبول کا ثواب عطا فرماتا ہے۔ صحابہ کرام نے عرض کی حضور اگرچہ بیٹا دن میں سو مرتبہ بھی دیکھے؟ فرمایا ہاں اگرچہ دن میں سو مرتبہ بھی دیکھے، اللہ سب سے بلند اور پاک ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 126 (التجاریہ)　2۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 374 (فراس)　3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 126 (التجاریہ)

4۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 12 (وزارت تعلیم)　5۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 269 (وزارت تعلیم)

حضرت ابی بکرہ سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ گناہ میں سے جو چاہتا ہے بخش دیتا ہے لیکن والدین کی نافرمانی کی سزا نافرمان کو مرنے سے پہلے زندگی میں دی جاتی ہے۔ مذکورہ احادیث میں سے پہلی حدیث ابن عساکر نے بھی اور یہ تینوں امام بیہقی نے بھی شعب الایمان میں ذکر کی ہیں۔

ابن عباس سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا گناہوں میں سے جسکو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے قیامت تک اسکی سزا کو مؤخر فرما دیتا ہے۔ لیکن والدین کی نافرمانی اسکی سزا نافرمان کو مرنے سے پہلے دنیوی زندگی میں جلدی دے دی جاتی ہے۔ اس حدیث کو طبرانی نے سند ضعیف کے ساتھ اور حاکم نے روایت کیا ہے۔

رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ ؕ اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِيْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا ۝۲۵

"تمہارا رب بہتر جانتا ہے جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے ۱؎ اگر تم نیک کردار ہو گے ۲؎ تو بیشک اللہ تعالیٰ بکثرت توبہ کرنے والوں کیلئے بہت بخشنے والا ہے ۳؎"

۱؎ تمہارے دلوں میں اپنے والدین کے لیے اطاعت وفرمانبرداری کے جو جذبات ہیں یا ان سے دل ہی دل میں جو نفرت واکتاہٹ محسوس کرتے ہو، تمہارا رب ان سے اچھی طرح واقف ہے۔ گویا اس ارشاد میں ناپسندیدگی اور اکتاہٹ دل میں رکھنے سے بھی منع کیا جا رہا ہے۔ یہ معنی بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ والدین سے نیکی کرنے کے متعلق جو تمہاری نیتیں ہیں وہ انہیں خوب جانتا ہے۔ اگر تو تمہاری نیت اس خدمت میں اللہ تعالیٰ کے حکم کی پیروی اور ثواب ہے تو اسکا اجر اللہ تعالیٰ عطا فرمائے گا اور اگر والدین کی خدمت میں اگر تمہاری نیت دنیوی غرض کیلئے ہے تو تمہیں وہی ملے گا جو تم نے نیت کی ہے۔

۲؎ اگر تمہارا ارادہ اللہ تعالیٰ سے اجر وثواب لینا ہے اور بھلائی مقصود ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں اسکا معنی یہ ہے کہ اگر تم کوتاہی کے بعد اطاعت شعار اور فرمانبردار بن جاؤ گے تو قیامت کے دن والدین کے حقوق کا مطالبہ تم سے پھر بھی کیا جائے گا(1)۔

۳؎ والدین کے حق میں معصیت کے بعد توبہ کرنے والوں کو وہ بہت بخشنے والا ہے' حضرت سعید بن جبیر اس آیت کے ضمن میں فرماتے ہیں کہ جو شخص جلدی میں والدین سے نازیبا سلوک کر بیٹھے گا، اگرچہ اسکی نیت نیک تھی تو اس سے کوئی مؤاخذہ نہ ہوگا۔

اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ آیت ہر گناہ سے توبہ کرنے والے کو عام ہو اور اسمیں والدین کا مجرم بھی داخل ہو کیونکہ اسکے ذکر کے بعد یہ آیت وارد ہے' حضرت سعید بن مسیب فرماتے ہیں اوراب وہ شخص ہے جو گناہ کرے، پھر توبہ کرے، پھر گناہ کرے، پھر توبہ کرے، پھر گناہ کرے پھر توبہ کرے۔ سعید بن جبیر فرماتے ہیں اس سے مراد نیکی کی طرف رجوع کرنے والا ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں ہر دکھ اور سکھ میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والا۔ سعید بن جبیر ابن عباس سے روایت فرماتے ہیں اوابین سے مراد مسبحون ہیں یعنی تسبیح بیان کرنے والے۔ اور اس طرح یہ ارشاد ہے يٰجِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَهٗ۔ اے پہاڑو! انکے ساتھ تسبیح بیان کرو۔ قتادہ فرماتے ہیں المصلون یعنی نماز پڑھنے والے۔ عوف العقیلی فرماتے ہیں وہ لوگ جو چاشت کی نماز پڑھتے ہیں۔

امام بغوی حضرت زید بن ارقم سے روایت کرتے ہیں، فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اہل قبا کی طرف تشریف لے گئے، وہ چاشت کی نماز پڑھ رہے تھے۔ فرمایا اوابین کی نماز چاشت کے وقت کی نماز ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 127 (التجاریہ)

امام بغوی فرماتے ہیں ابن عباس سے مروی ہے، فرماتے ہیں فرشتے مغرب اور عشاء کے درمیان نماز پڑھنے والوں کو گھیر لیتے ہیں اور یہ اوابین کی نماز ہے(1)۔

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِیْرًا ﴿۲۶﴾

”اور دیا کرو رشتہ دار کو اس کا حق [1] اور مسکین و مسافر کو بھی [2] اور فضول خرچی نہ کیا کرو [3]“

[1] اپنے قریبی رشتہ داروں کو عطا کرو انکا حق یعنی ان سے صلہ رحمی، حسن معاشرت اور ان سے حسن سلوک کیا کرو۔ اکثر مفسرین کا یہی قول ہے۔ امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں ہر قریبی رشتہ دار جو بچہ ہو اور فقیر ہو۔ یا عورت ہو بالغ ہو اور فقیر ہو یا اپاہج مرد ہو یا اندھا نادار ہو ان تمام کا خرچ غنی مالدار پر واجب ہے۔ کیونکہ اسمیں نفس کی بقاء ہے، یہی اصل میں نیکی اور صلہ رحمی ہے۔ ہم نے یہ مسئلہ سورۂ بقرہ میں عَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ کے تحت تفصیل سے ذکر کیا ہے، وہاں ملاحظہ ہو۔

امام بغوی نے حضرت علی بن الحسین رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ذوالقربی سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ دار ہیں(2)۔ ابن ابی حاتم نے سدی سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ الطبرانی وغیرہ نے ابوسعید الخدری سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں جب وات ذا القربی کا ارشاد نازل ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو بلایا اور انہیں باغ فدک عطا فرمایا۔ ابن مردویہ نے ابن عباس سے اسی کی مثل روایت کیا ہے۔

ابن کثیر فرماتے ہیں یہ بات تسلیم کرنا مشکل ہے کیونکہ اگر یہ قول تسلیم کیا جائے تو آیت کا مدنی ہونا لازم ہوگا، جبکہ آیت کا مکی ہونا مشہور ہے۔ میں کہتا ہوں مشہور اور معتمد قول یہ ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے باغ فدک کا سوال کیا لیکن آپ نے عطا نہ فرمایا۔ اسی طرح عمر بن عبدالعزیز سے روایت ہے۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں یہ باغ عطا فرمایا ہوتا تو خلفاء راشدین خصوصاً حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم اپنے دور خلافت میں اسے آپ رضی اللہ عنہا سے ہرگز نہ روکتے

[2] والمسکین وابن السبیل انکی تفسیر بھی سورۂ بقرہ میں گذر چکی ہے۔

[3] اپنا مال معصیت اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں خرچ نہ کرو۔ مجاہد فرماتے ہیں اگر انسان اپنا تمام مال حق کے راستہ پر خرچ کر دے تو وہ تبذیر اور فضول خرچی نہیں ہے۔ اور اگر باطل پر ایک مد بھی خرچ کرے تو فضول خرچی اور اسراف ہے۔ حضرت ابن مسعود سے تبذیر کا مفہوم پوچھا گیا تو فرمایا بے حق کے علاوہ میں مال خرچ کرنا۔ حضرت شعبہ فرماتے ہیں میں ابواسحاق کے ساتھ کوفہ کی ایک گلی میں چل رہا تھا۔ آپ ایک دیوار کے پاس آئے جو شیشہ اور پکی اینٹوں سے بنی ہوئی تھی فرمایا عبداللہ بن مسعود نے قول انفاق المال فی غیر حقه کا یہی معنی ہے(3)۔

اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ كَانُوْۤا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ ؕ وَكَانَ الشَّیْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ﴿۲۷﴾

”بیشک فضول خرچی کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہیں [1] اور شیطان اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے [2]“

[1] فضول خرچی کرنے والے شرارت میں شیطانوں کی مثل ہیں۔ امام بغوی فرماتے ہیں عرب اس شخص کو اس قوم کا بھائی کہتے ہیں جو کسی قوم کی عادت اپناتا ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 127 (التجاریہ)　2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 127 (التجاریہ)　3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 128 (التجاریہ)

ے اور شیطان اس کی نعمتوں کا انکاری ہے۔ کفر اور کفرانِ نعمت میں انتہا کو پہنچا ہوا ہے۔ اس لئے اس کی پیروی نہیں کرنی چاہئے۔ تحقیق فرماتے ہیں۔ نعمت کو منعم کی رضا کے مطابق صرف کرنا شکر ہے۔ اور مال کو معصیت میں خرچ کرنا تبذیر ہے۔ اور یہ شکر کی ضد ہے۔ پس جو بھی معصیت میں مال صرف کرے گا وہ ناشکرا ہوگا۔ سعید بن منصور حضرت عطاء خراسانی سے نقل فرماتے ہیں کہ قبیلہ مزینہ کے کچھ لوگ رسول اللہ ﷺ سے سواریاں طلب کرنے کے لئے حاضر ہوئے آپ نے فرمایا لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ ۖ تَوَلَّوْا وَّ اَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا۔ میرے پاس کوئی سواری نہیں ہے جس پر میں تمہیں سوار کروں تو وہ واپس پلٹے جبکہ غم کی وجہ سے ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ انہوں نے یہ خیال کیا کہ شاید آپ ﷺ نے ناراضگی کی وجہ سے فرمایا ہے۔ تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی (1)۔

وَ اِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَآءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ تَرْجُوْهَا فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُوْرًا ﴿۲۸﴾

"اور اگر (بوجہ تنگدستی) تجھے ان سے منہ پھیرنا پڑے لے اور تم اپنے رب کی رحمت (یعنی خوشحالی) کے متلاشی ہو جسکی تمہیں توقع ہے تو (اس اثناء میں) ان سے بات کرو تو بڑی نرمی سے کرو۔ ے"

لے ان شرطیہ ہے اور ما زائدہ ہے معنی یہ ہے اے پیارے محمد اگر تمہیں اعراض کرنا پڑے اپنے قریبی رشتہ داروں، مساکین اور مسافروں سے۔ یہاں اعراض سے کنایۃً عدم انفاق مراد ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں یہ آیت کریمہ بلال، صہیب، سالم اور خباب رضی اللہ عنہم کے حق میں نازل ہوئی۔ یہ لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہر اس چیز کا سوال کرتے تھے جسکی انہیں ضرورت ہوئی تھی۔ بعض اوقات وہ آپ کے پاس نہ ہوتی تھی تو آپ حیاء کی وجہ سے اعراض کر لیتے اور کوئی جواب بھی نہ دیتے۔ تو اس پر اما تعرضن عنہم کی آیت نازل ہوئی (2)۔

ے اور تم اپنے رب کی رحمت (یعنی خوشحالی کے) متلاشی ہو جسکی تمہیں توقع ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اسکا معنی یہ ہے کہ اگر تم رزق کے مفقود ہونے کی وجہ سے اپنے رب سے امید رکھتے ہو کہ وہ تمہارے لیے خوشحالی کے دروازے کھول دیگا۔ اور ابتغاء کو الفقد کی جگہ رکھا ہے کیونکہ یہ اس کا سبب ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ابتغاء' فقل لهم قولا ميسورا کے متعلق ہو یعنی ان سے نرمی سے گفتگو کرو، ان سے میٹھی میٹھی باتیں کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ تم پر رحم فرمائے۔ میسوریسر الامر سے مشتق ہے جیسے سعد الوجل و نحس۔ امام بغوی فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے ان سے خوبصورتی کے ساتھ وعدہ کرو۔ بعض علماء فرماتے ہیں انکے لیے خوشحالی کی دعا کرو۔ جیسے یہ دعا اللہ تعالیٰ تمہیں غنی فرمائے اللہ تعالیٰ ہمیں اور تمہیں رزق عطا فرمائے (3)۔

سعید بن منصور نے سیار ابی الحکم سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کپڑا لایا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بہت عطا فرمانے اور سخی تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کے درمیان وہ کپڑا تقسیم فرما دیا۔ پھر ایک قوم آئی انہوں نے دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کپڑا تقسیم کر چکے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے ذیل کا ارشاد نازل فرمایا (4)۔

وَ لَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَ لَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 321 (العلمیہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 128 (التجاریہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 128 (التجاریہ)
4۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 321 (العلمیہ)

مَّحْسُوْرًا ﴿۲۹﴾

"اور نہ بنالو اپنے ہاتھ کو بندھا ہوا اپنی گردن کے ارد گرد اور نہ ہی اسے بالکل کشادہ کر دو[1] اور نہ تم بیٹھ جاؤ گے ملامت کیے ہوئے درماندہ[2]"

[1] ابن مردویہ وغیرہ نے ابن مسعود سے نقل کیا ہے، فرماتے ہیں ایک غلام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور عرض کی حضور آپ سے میری والدہ فلاں فلاں چیز کا سوال کر رہی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آج تو ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ پھر اس غلام نے کہا امی کہہ رہی ہے آپ مجھے اپنی قمیص پہنا دیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ قمیص اسے عطا فرما دی اور خود بغیر قمیض کے گھر میں بیٹھ گئے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (1)۔ ابن ابی حاتم نے المنہال بن عمرو سے اسکے ہم معنی حدیث روایت کی ہے۔ ابی امامہ سے ابن ابی حاتم نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ کو فرمایا جو کچھ میرے ہاتھ میں ہو اسے خرچ کر دیا کرو۔ حضرت عائشہؓ نے عرض کی حضور پھر تو کچھ بھی باقی نہ رہے گا تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ بغوی فرماتے ہیں حضرت نے یہ بتایا کہ ایک بچہ آیا اور عرض کی یارسول اللہ میری والدہ آپ سے قمیص مانگ رہی ہے اور اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس زیب تن کی ہوئی قمیص کے علاوہ کوئی قمیص نہ تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا فلاں وقت تک کوئی مال آ جائے گا۔ تم دوبارہ کسی وقت آنا۔ وہ ماں کی طرف واپس چلا گیا۔ ماں نے اسے دوبارہ بھیجا کہ تو جا کر عرض کر کہ امی وہ قمیص مانگ رہی ہے جو آپ نے خود پہنی ہوئی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسی وقت گھر میں تشریف لے گئے اور اپنی قمیص اتار کر اسے دے دی اور خود بغیر قمیص کے گھر بیٹھ گئے۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے نماز کیلئے اذان دی۔ صحابہ کرام انتظار کرنے لگے لیکن آپ تشریف نہ لائے۔ صحابہ کرام آپ کی تاخیر سے پریشان ہو گئے۔ کسی صحابی نے گھر پر پتہ کیا تو آپ بغیر قمیص کے تشریف فرما تھے تو اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ یعنی اپنے ہاتھوں کو حق میں خرچ کرنے سے روک لو جیسے وہ شخص ہوتا ہے جسکے ہاتھ بندھے ہوئے ہوتے ہیں اور کچھ عطا کرنے پر قادر نہیں ہوتا اور نہ جو کچھ پاس ہو وہ خرچ کر دیا کرو کہ اپنے نفس، اپنے اہل اور جن کی کفالت آپ پر واجب ہے انکے حقوق ہی پورے نہ کر سکو (2) امام بیضاوی فرماتے ہیں یہ دو ارشادات بخیل کو بخل سے اور مبذر کو اسراف سے منع کرنے کیلئے ہیں، دونوں اطراف سے منع کیا گیا ہے اور جو طریقہ ان دونوں کے درمیان ہے یعنی سخاوت اور میانہ روی اس کا حکم دیا گیا ہے (3)۔

[2] اللہ تعالیٰ اور بندوں کے نزدیک خوشحالی کی حالت میں کنجوسی یا اسراف اور سوء تدبیر کے باعث تم ملامت کئے ہوئے ہو گے۔ قتادہ فرماتے ہیں محسور کا معنی نادم ہونا ہے اور اسکا تعلق دو کیفیتوں سے ہے یا یہ معنی ہو گا تم ملامت کیے ہوئے ہو گے۔ یعنی خوشحالی کے باوجود جب تم سائلوں پر خرچ نہیں کرو گے تو سائل تجھے ملامت کریں گے اور اگر تم خوشحالی کے باعث فضول خرچی کرو گے تو مفلس و کنگال ہو جاؤ گے۔ اور دل گرفتہ ہو کر بیٹھ جاؤ گے۔ یہ حسرہ السفر سے مشتق ہے جسکا معنی ہے سفر نے اسے توڑ دیا۔ حسرتہ بالمسئلہ۔ یعنی اصرار کے ساتھ سوال کیا۔ اس صورت میں ملوما کا تعلق لا تجعل یدک مغلولۃ سے ہے اور محسورا کا تعلق لا تبسطها سے ہے۔

اِنَّ رَبَّكَ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَ یَقْدِرُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِیْرًۢا بَصِیْرًا ﴿۳۰﴾

"بیشک آپ کا رب کشادہ کرتا ہے روزی جس کے لیے چاہتا ہے[1] اور تنگ کرتا ہے (جسکے لیے چاہتا ہے) [2] یقیناً وہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 128 (التجاریہ)　2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 322 (العلمیہ)　3۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 374 (فراس)

اپنے بندوں (کے حالات) سے خوب آگاہ ہے (اور انہیں) دیکھنے والا ہے ۳؎"

۱؎ آپ کا رب جس کے لیے چاہتا ہے اس کے لیے رزق میں وسعت پیدا فرما دیتا ہے۔ یہ کشادگی اور رزق کی فراوانی آپکے ذمہ واجب نہیں ہے۔

۲؎ اور اپنی حکمت کاملہ کے تقاضا کے مطابق کسی کو تنگ روزی عطا فرماتا ہے۔ اگر آپ اپنی احتیاج وضرورت کیلئے کچھ اپنے پاس رکھ لیں تو کوئی حرج نہیں ہے۔

۳؎ وہ اپنے بندوں کے ظاہر و باطن کو جانتا ہے۔ اور اپنے بندوں کی مصلحتوں سے بھی خوب واقف ہے جو بندے خود بھی نہیں جانتے اور وہ انہیں انکی مصالح کے مطابق رزق عطا فرماتا ہے۔ یہ بھی مراد لیا جاسکتا ہے کہ بسط وقبض اس اللہ کا امر ہی جو اپنے بندوں کے باطنوں اور ظاہر کو جانتا ہے۔ پس بندوں کو چاہیے کہ وہ میانہ روی اختیار کریں۔ یا یہ معنی کہ اللہ تعالیٰ کبھی روزی کشادہ فرماتا ہے اور کبھی تنگ فرماتا ہے۔ پس تم اسکے طریقہ کو اپناؤ۔ نہ تو بالکل کنجوسی کی عادت بنالو اور نہ بالکل ہاتھ کھلا چھوڑ دو۔ ہوسکتا ہے یہ کلام مابعد کیلئے تمہید ہو۔

وَلَا تَقْتُلُوْۤا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ؕ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَ اِيَّاكُمْ ؕ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ﴿۳۱﴾

"اور نہ قتل کرو اپنی اولاد کو مفلسی کے اندیشہ سے ۱؎ ہم ہی رزق دیتے ہیں انہیں بھی اور تمہیں بھی بلاشبہ اولاد کو قتل کرنا بہت بڑی غلطی ہے ۲؎"

۱؎ اپنی بیٹیوں کو فقر وتنگدستی کے خوف سے قتل نہ کرو جیسے عرب کے بادیہ نشین کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے قتل سے منع فرمایا اور انکے رزق کی ضمانت خود عطا فرمائی۔

۲؎ ہم ہی انکو اور تمہیں رزق دیتے ہیں انکو قتل کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔ خطا کو ابن عامر نے ابن ذکوان کی روایت سے اور ابو جعفر نے خاء اور طاء کے فتحہ کے ساتھ مقصور پڑھا ہے۔ ابن کثیر نے خا کے کسرہ اور طا کے فتح کے ساتھ ممدود پڑھا ہے اور باقی قراء نے خا کے کسرہ اور طاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے، تمام کا معنی ایک ہی ہے یعنی گناہ(1)۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں جمہور کی قرأت پر خطا مصدر ہے خطاً خِطْأً کا جیسے اثم اثماً۔ اور ابن عامر کی قرأت پر اخطا سے اسم ہے جو صواب کی ضد ہے بعض علماء فرماتے ہیں اسمیں یہ بھی لغت ہے جیسے مَثَل ومِثْل وحَذَر وحِذْر۔ اور ابن کثیر کی قرأت پر یا تو یہ بھی لغت ہے۔ یا خاطا خطاءً کا مصدر ہے جیسے قاتل قتالاً(2)۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کونسا گناہ بڑا ہے؟ فرمایا تو کسی کو اللہ تعالیٰ کا مثل بنائے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ہی تجھے پیدا کیا۔ میں نے کہا حضور واقعی یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ میں نے پوچھا حضور اسکے بعد بڑا گناہ کیا ہے؟ فرمایا تو اپنے بچہ کو اس لئے قتل کرے کہ وہ تیرا کھانا کھائے گا۔ میں نے عرض کی حضور اسکے بعد کونسا گناہ بڑا ہے؟ فرمایا تو اپنے پڑوسی کی بیوی سے زنا کرے۔ متفق علیہ۔

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰۤى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ﴿۳۲﴾

"اور بدکاری کے قریب بھی نہ جاؤ ۱؎ بیشک یہ بڑی بے حیائی ہے اور بہت ہی برا راستہ ہے ۲؎"

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 129 (التجاریۃ)

2۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 375 (فراس)

لہ زنا کے دواعی اور اس پر اکسانے والے امور پختہ عزم وغیرہ سے بھی دور رہو۔ یا یہ معنی کہ زنا کے مقدمات (بوس وکنار)۔ سے بھی دور رہو، چہ جائیکہ تم بدکاری میں ملوث ہو جاؤ۔

لہ زنا ایک فعل شنیع ہے اور اسکی قباحت ہر شخص پر عیاں ہے۔ یہ بہت ہی برا راستہ ہے۔ کیونکہ زنا سے نسب کا ضیاع ہوتا ہے اور ایک نہیں ہزاروں فتنوں کی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ حضرت بریدہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ساتوں آسمان اور ساتوں زمینیں بوڑھے زانی پر لعنت کرتے ہیں اور بدکاروں کی شرمگاہیں اپنی بدبو سے دوزخیوں کو اذیت پہنچائیں گی۔ اس حدیث کو البزار نے روایت کیا ہے۔

حضرت انس بن مالک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہمیشہ بدکاری کرنے والا بت پرست کی طرح ہے۔ اس حدیث کو الخرائطی نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب انسان بدکاری کرتا ہے تو اس سے ایمان خارج ہو جاتا ہے اور وہ اس پر چھتری کی مانند اوپر معلق ہوتا ہے۔ جب وہ اس برائی سے دور ہو جاتا ہے تو ایمان واپس آجاتا ہے۔ اس حدیث کو ابو داؤد نے روایت کیا ہے۔ یہ انکے الفاظ ہیں، جبکہ ترمذی اور حاکم نے بھی روایت کیا ہے۔

صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب زانی زنا کرتا ہے تو ایماندار ہونے کی حالت میں زنا نہیں کرتا۔ اور چور مومن ہونے کی حالت میں چوری نہیں کرتا جب چوری کرتا ہے۔ اور شرابی شراب پیتا ہے تو مومن ہونے کی حالت میں شراب نہیں پیتا(1)۔

وَ لَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ وَ مَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِیِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا یُسْرِفْ فِّی الْقَتْلِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا ۝۳۳

''اور نہ قتل کرو اس نفس کو جسکو قتل کرنا اللہ تعالیٰ نے حرام کر دیا ہے مگر حق کے ساتھ لہ اور جو قتل کیا جائے ناحق تو ہم نے مقتول کے وارث کو (قصاص کے مطالبہ کا) حق دیدیا ہے لہ پس اسے چاہیے کہ قتل میں اسراف نہ کرے لہ ضرور اسکی مدد کی جائے گی لہ''

لہ اس نفس کو قتل نہ کرو جسے اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے مثلاً مسلمان اور ذمی مگر حق کے ساتھ یعنی حد یا قصاص یا بغاوت یا صحابہ کرام کو برا بھلا کہنے کی وجہ سے قتل کرنا اللہ تعالیٰ نے حرام نہیں کیا اور مرتد ان نفوس سے نہیں ہے جن کا قتل حرام ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ یَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ یُّقَتَّلُوْٓا الآیۃ۔ باغیوں کے متعلق ارشاد ہے فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ اور قصاص کے بارے فرمایا اَلنَّفْسَ بِالنَّفْسِ۔

حضرت ابن مسعود سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کسی ایسے مسلمان کا خون بہانا حلال نہیں جو لا الہ الا اللہ وانی رسول اللہ کی گواہی دیتا ہو مگر تین اشخاص کا خون بہانا حلال ہے شادی شدہ زانی، نفس کے بدلے نفس اور دین کو چھوڑنے والا، جماعت سے علیحدہ ہونے والا(2)۔ اس حدیث کو شیخین ابو داؤد، ترمذی اور نسائی نے روایت کیا ہے، دین کو چھوڑنے

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 55 (قدیمی) 2۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 191 (وزارت تعلیم)

والے سے مراد مرتد نہیں ہے کیونکہ وہ لا الہ الا اللہ کی گواہی دینے والا مسلمان ہی نہیں ہے بلکہ دین چھوڑنے والے سے مراد خواہشات کے پجاری اور جماعت کو چھوڑنے والے ہیں جیسے رافضی اور خوارج وغیرہم۔ یہ مصنف کی اپنی رائے ہے حالانکہ اہل ہواء اور بدعتیوں کو قتل کرنا جمہور علماء کے نزدیک جائز نہیں ہے۔

فصل

حضرت ابن مسعود سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کے دن سب سے پہلے خونوں کا فیصلہ ہوگا۔ متفق علیہ۔

حضرت براء بن عازب سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناحق مومن کے قتل سے دنیا کا فنا ہونا حقیر اور آسان ہے' اس حدیث کو ابن ماجہ نے حسن سند کے ساتھ روایت کیا ہے(1)' اور بیہقی نے بھی روایت کی ہے اسکی حدیث میں یہ زائد ہے کہ اگر آسمان اور زمین والے ایک مومن کے خون میں شریک ہوں تو اللہ تعالیٰ سب کو دوزخ میں داخل کرے گا۔

نسائی نے بریدہ کی حدیث روایت کی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مومن کا قتل اللہ تعالیٰ کے نزدیک زوال دنیا سے بھی بڑا واقعہ ہے(2)۔ حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو کسی مومن کے قتل میں آدھے کلمہ کے ساتھ بھی معاون ہوگا۔ تو وہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرے گا اس حال میں کہ اسکی آنکھوں کے درمیان لکھا ہوگا اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس۔ اس حدیث کو ابن ماجہ نے روایت کیا ہے(3)۔ اصبہانی نے بھی روایت کیا ہے لیکن اس نے یہ زائد بیان کیا ہے کہ ابن عیینہ نے فرمایا کہ آدھی بات کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اق کہا ہو (اُقتل کا)۔ بیہقی نے ابن عمر کی حدیث اسی طرح نقل کی ہے۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہر گناہ کی اللہ تعالیٰ سے بخشش کی امید ہے مگر جو شخص کفر پر مرے یا جان بوجھ کر کسی مومن کو قتل کرے۔ اس حدیث کو نسائی نے روایت کیا ہے(4)۔ حاکم نے اسے صحیح کہا ہے' ابوداؤد' ابن حبان اور حاکم نے حضرت ابودرداء سے روایت کی ہے' ابن حبان نے اسے صحیح کہا ہے۔ حضرت ابوموسیٰ سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب صبح ہوتی ہے تو ابلیس اپنے لشکر پھیلا دیتا ہے (اور کہتا ہے) جو آج مسلمان کو گمراہ کرے گا میں اسے تاج پہناؤں گا۔ ایک شیطان کا چیلا آ کر کہتا ہے۔ میں ایک مسلمان کو اکساتا رہا حتی کہ اس نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔ شیطان کہتا ہے ہوسکتا ہے وہ دوسری شادی کر لے۔ دوسرا آتا ہے کہتا ہے میں مسلماں کو برابر گمراہ کرتا رہا حتی کہ اس نے اپنے والدین کی نافرمانی کی ہے۔ شیطان کہتا ہے (یہ کوئی کام ہے) ہوسکتا ہے پھر وہ انکا فرمانبردار بن جائے۔ تیسرا چیلا آتا' ہے کہتا ہے میں ایک مسلمان کے ساتھ رہا حتی کہ اس نے شرک کیا ہے شیطان کہتا ہے' تو ہے تو ہے۔ (میرا صحیح تربیت یافتہ) چوتھا آتا ہے، کہتا ہے جناب میں آج ایک مسلمان کو متواتر گمراہ کرتا رہا حتی کہ اس نے (دوسرے مسلمان کو) قتل کر دیا ہے۔ شیطان کہتا ہے تو ہے تو ہے (جس نے میری منشا کو پورا کیا) پھر وہ اسے تاج پہنا دیتا ہے۔ اس حدیث کو ابن حبان نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے۔

ع جو بغیر کسی سبب شرعی کے قتل کیا گیا۔ تو اس مقتول کے وارث کو ہم نے قصاص کے مطالبہ کا حق اور تسلط دیا ہے۔

1۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 191 (وزارت تعلیم)
2۔ سنن نسائی، جلد 2، صفحہ 162 (وزارت تعلیم)
3۔ [illegible]
4۔ سنن نسائی، جلد 2، صفحہ 162 (وزارت تعلیم)

۳؎ حمزہ اور کسائی نے فلا یسرف کو تاء کی ساتھ خطاب کا صیغہ پڑھا ہے اور باقی قراء نے یاء کے ساتھ غائب کا صیغہ پڑھا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں خطاب قاتل کو ہے اور ضمیر کا مرجع وہی ہے، یعنی قاتل قتل میں اس طرح اسراف نہ کرے کہ ایسے شخص کو قتل کرے جسکا قتل کرنا حق ہی نہ تھا۔ کیونکہ عقلمند کوئی ایسا کام نہیں کرتا جسکا وبال دنیا و آخرت میں اس پر پڑے۔ ابن عباس اور اکثر مفسرین فرماتے ہیں کہ خطاب اور ضمیر مقتول کے ولی کیلئے ہے یعنی ولی قاتل کے سوا کسی کو قتل نہ کرے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں جب کسی قبیلہ کا فرد قتل ہو جاتا تو وارثوں کا غصہ اس وقت تک ٹھنڈا نہ ہوتا تھا جبتک قاتل قبیلہ کا معزز ترین شخص قتل نہ کر لیتے۔ وہ صرف قاتل کے قتل پر راضی ہی نہ ہوتے تھے۔ سعید بن جبیر فرماتے ہیں جب قتل ایک ہو تو ایک کے بدلے میں جماعت کو قتل نہ کرے۔ جبکہ زمانہ جاہلیت میں اگر مقتول کوئی معزز شخص ہوتا تو اس مقتول کے وارث صرف قاتل کے قتل پر راضی نہ ہوتے حتی کہ اسکے ساتھ اس کے اقرباء میں سے پوری جماعت کو قتل کرتے۔

قتادہ فرماتے ہیں اسکا معنی یہ ہے کہ قاتل کا مثلہ نہ کرے(1)۔

۴؎ مجاہد فرماتے ہیں ضمیر من قتل مظلوماً کی طرف راجع ہے، یعنی مقتول کے قاتل پر قصاص واجب کر کے دنیا میں اسکی مدد کی جائے گی اور آخرت میں اسکی خطائیں معاف کر کے اور اسکے قاتل پر آگ واجب کر کے اسکی مدد کی جائے گی۔ قتادہ فرماتے ہیں ضمیر مقتول کے ولی کیلئے ہے۔ یعنی قصاص کے مطالبہ میں قاتل کے خلاف اسکی مدد کی جائے گی۔ حاکم وقت پر وارث کی مدد کرنا واجب ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں ضمیر کا مرجع وہ شخص ہے جسکو مقتول کا وارث اسراف کے ساتھ قتل کرتا ہے قصاص کے وجوب کے ساتھ۔ تو گناہ مسرف پر ہوگا۔

وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۪ وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا ﴿۳۴﴾

"اور نہ قریب جاؤ یتیم کے مال کے مگر ایسے طریقہ سے جو (اس یتیم کیلئے) بہتر ہو یہاں تک کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچ جائے ۱؎ اور پورا کیا کرو اپنے عہد کو ۲؎ بیشک ان وعدوں کے بارے میں (تم سے) پوچھا جائے گا ۳؎"

۱؎ یتیم کے مال کے قریب ہی نہ جاؤ، چہ جائیکہ تم اس میں تصرف کرنے لگو۔ مگر اس طریقہ سے جس میں یتیم کے مال کی محافظت ہو اور یتیم کیلئے اس میں تجارت ہو۔ حتی یبلغ اشدہ کے الفاظ اس بہتر تصرف کی اجازت کی انتہا ہے جسکی استثناء کی گئی ہے۔

۲؎ اللہ تعالیٰ نے تم سے اپنے احکامات کی پیروی کا جو وعدہ لیا ہے اسے بھی پورا کرو اور جو تم نے لوگوں سے مشروع عہد کیا ہے اسے بھی پورا کرو۔

۳؎ مسئول بمعنی مطلوب ہے، یعنی معاہدہ کرنے والے سے یہ مطلوب ہوگا کہ وہ وعدہ کو ضائع نہ کرے بلکہ اسے پورا کرے۔ یا یہ معنی کہ وعدہ کو توڑنے والے سے پرسش ہوگی اور اس پر سزا ہوگی۔ یا یہ معنی کہ وعدہ توڑنے والے سے عہد کے متعلق سوال ہوگا تاکہ وہ خود اقرار کرلے کہ میں نے وعدہ کیا تھا۔ پھر کسی عذر سے اسکا منہ بند ہو جائے گا۔ جیسے فرمایا وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ﴿۸﴾ بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ﴿۹﴾۔ یہ بھی ہوسکتا ہے العہد سے مراد عہد کرنے والا ہو مضاف کو حذف کیا گیا ہو۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 129 (التجاریہ)

وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴿۳۵﴾

"اور پورا پورا ماپو جب تم کسی چیز کو ماپنے لگو اور تولو ایسے ترازو سے جو بالکل درست ہو[1]۔ یہی طریقہ بہتر ہے اور اسکا انجام بھی بہت اچھا ہے[2]۔"

[1] جب ماپو تو پورا پورا ماپو، ماپ میں کمی نہ کرو اور تولو ایسے ترازو سے جو بالکل درست ہو۔ حمزہ، کسائی اور حفص نے یہاں بھی اور سورۂ شعراء میں قسطاس کو قاف کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے ضمہ کے ساتھ۔ اسکا معنی میزان ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں یہ رومی لفظ ہے عربی میں منقول ہو کر آیا ہے۔ قرآن میں اسکا استعمال جائز ہے کیونکہ جب کوئی عجمی لفظ عربی کلام میں استعمال ہوتا ہے اور اس پر اعراب، تعریف و تنکیر کے احکام عربی قواعد کے مطابق جاری ہوتے ہیں تو وہ لفظ عربی بن جاتا ہے۔ اکثر علماء فرماتے ہیں یہ عربی لفظ ہے اور القسط سے ماخوذ ہی جسکا معنی عدل ہے (1)۔ المستقیم کا معنی سیدھا اور درست ہے۔

[2] یہ دنیا میں بھی بہتر ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے۔ تاویل، آل سے باب تفعیل ہے جسکا معنی لوٹنا ہے۔

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا ﴿۳۶﴾

"اور نہ پیروی کرو[1] اس چیز کی جسکا تمہیں علم نہیں[2]۔ بیشک کان اور آنکھ اور دل ان سب کے متعلق (تم سے) پوچھا جائے گا[3]۔"

[1] یہ قفا یقفوا سے مشتق ہے جسکا معنی ہے کسی کے پیچھے پیچھے چلنا، کسی کے نقش قدم کی پیروی کرنا۔ اسی سے قافیہ ہے، آثار ان کی اتباع کرتے ہیں۔

[2] ایسی چیز جس کے متعلق نہ تیرا علم حسی ہے، نہ خبر صادق ہے اور نہ کوئی دلیل عقلی ہے۔ اس آیت کریمہ سے استدلال کیا ہے۔ بعض علماء نے کہ دلائل ظنیہ پر عمل جائز نہیں ہے۔ اس استدلال کا جواب یہ ہے کہ یہاں علم سے مراد راجح اعتقاد ہے جو کسی سند سے مستفاد ہوتا ہے خواہ وہ سند قطعی ہو یا ظنی ہو اور علم کا استعمال اس معنی میں عام ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں عدم اتباع کا حکم عقائد کے ساتھ ہے (یعنی عقائد کی بنیاد علم ظنی پر نہیں ہونی چاہئے)۔ بعض علماء فرماتے ہیں پاکدامن عورتوں پر تہمت نہ لگاؤ اور جھوٹی گواہی نہ دو۔ مجاہد فرماتے ہیں اسکا معنی یہ ہے کہ جس چیز کے متعلق تمہیں علم نہ ہو اس کو کسی کی طرف منسوب نہ کرو۔ قتادہ فرماتے ہیں اسکا معنی یہ ہے کہ تو نہ کہہ کہ میں نے دیکھی ہے جو تو نے دیکھی نہیں ہے، جو سنی نہیں ہے اس کے متعلق یہ نہ کہو کہ میں نے سنا ہے اور جسکا علم نہیں ہے اسکے متعلق یہ نہ کہو کہ مجھے اسکا علم ہے (2)۔

میں کہتا ہوں وہ اخبار احاد جنکے راویوں میں اعلیٰ درجہ کی صفات ہیں، قیاس صحیح اور دو مردوں کی گواہی یا ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی کا حکم ان تمام پر عمل کرنے کا وجوب نصوص قطعیہ اور اجماع سے ثابت ہے۔ جیسے ارشاد ہے فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا۔ تو کیوں نہ نکلے ہر قبیلہ سے چند آدمی تاکہ تفقہ حاصل کریں دین میں۔ اسی طرح ایک اور ارشاد ہے فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ ۔ پس عبرت حاصل کرو اے دیدۂ بینا رکھنے والو۔ اسی طرح یہ ارشاد ہے وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۔ اور

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 129 (التجاریۃ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 130 (التجاریۃ)

بنالیا کرو دو گواہ اپنے مردوں سے۔ اور یہ تواتر کے ساتھ ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایک صحابی احکام کی تبلیغ کیلئے مختلف علاقوں میں بھیجتے تھے۔ ان تمام احکام کی اتباع علم کی اتباع ہے کیونکہ ظن پر عمل کرنے کا وجوب علم یقینی سے ثابت ہے۔

سے عنه کی ضمیر لاتقف کے مصدر کی طرف راجع ہے۔ یعنی ان تمام اعضاء سے پیروی اور اتباع کے بارے پوچھا جائے گا۔ یا ضمیر کا مرجع کل ہے یعنی اعضاء سے ان اعضاء والے شخص کے بارے پوچھا جائے گا۔ یا ضمیر کا مرجع صاحب السمع والبصر ہے یعنی ہر عضو سے جسکے یہ اعضاء تھے اسکے متعلق پوچھا جائے گا۔ کانوں سے پوچھا جائے گا کہ سننے والے نے کہا ہے کہ میں نے سنا تھا کیا واقعی اس نے سنا تھا۔ آنکھ سے پوچھا جائے گا دیکھنے والے نے کہا ہے میں نے دیکھا تھا، کیا واقعی اس نے دیکھا تھا۔ دل سے پوچھا جائے گا کہ اسکا صاحب کہتا ہے کہ میں نے جانا تھا کیا اس نے واقعی جانا تھا۔

شکل بن حمید سے مروی ہے فرماتے ہیں میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی یا نبی اللہ مجھے کوئی تعویذ سکھایئے جسکے ساتھ میں پناہ مانگوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑا اور فرمایا یہ دعا پڑھو اَعُوْذُبِکَ مِنْ شَرِّ سَمْعِیْ وَمِنْ شَرِّ بَصَرِیْ وَ شَرِّ لِسَانِیْ وَ شَرِّ قَلْبِیْ وَ شَرِّ مَنِیِّیْ۔ اے اللہ میں تجھ سے اپنے کانوں کے شر سے پناہ مانگتا ہوں اور آنکھوں کے شر سے اپنی زبان کے شر سے اور اپنے دل کے شر سے اور اپنی منی کے شر سے پناہ مانگتا ہوں۔ شکل بن حمید فرماتے ہیں میں نے اس دعا کو یاد کر لیا(1)۔ اس حدیث کو ترمذی' ابوداؤد' نسائی' حاکم اور بغوی نے روایت کیا ہے۔ اور حاکم نے اسکی تصحیح بھی کی ہے۔ سعید حدیث کے راوی نے فرمایا منی سے مراد منی کا پانی ہے، یعنی میں پناہ مانگتا ہوں کہ منی کے پانی کو ایسی جگہ گراؤں جو حلال نہیں ہے۔ اعضاء سے انکے احوال کے متعلق پوچھا جائے گا اور چونکہ اپنے صاحب پر گواہی دینے والے ہیں۔ اس لئے انکو عقلاء کے قائم مقام کرتے ہوئے لفظ اولئک کا اطلاق کیا گیا ہے' یا یہ کہا جائے گا کہ اولاء اگرچہ عقلاء کیلئے استعمال ہوتا ہے لیکن چونکہ یہ ذا کا اسم جمع ہے جو ذوالعقول اور غیر ذوی العقول دونوں کو شامل ہے۔ یہاں غیر ذوی العقول کیلئے استعمال ہوا ہے۔ یہاں خصوصیت کے ساتھ صرف ان تین اعضاء کو ذکر کیا گیا ہے کیونکہ یہ ان علوم کی تحصیل کے آلات ہیں جنکی اتباع پر حصر واجب ہے کیونکہ اکثر محسوسات کا ادراک سمع (کانوں) اور بصر (آنکھوں) سے ہوتا ہے' اور معقولات کا ادراک دل سے ہوتا ہے۔

وَلَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ﴿۳۷﴾

"اور نہ چلو زمین میں اکڑتے ہوئے (اس طرح) نہ تم چیر سکتے ہو زمین کو اور نہ پہنچ سکتے ہو پہاڑوں کے برابر بلندی میں[1]"

[1] مرحا کا معنی کبر و غرور اور ناز و نخرہ سے چلنا ہے۔ یعنی تو اپنے تکبر اور روندنے کے ساتھ تو زمین کو چیر نہیں سکتا۔ اور نہ اپنے غرور و تکبر کے ساتھ تو پہاڑوں کے برابر بلندی کو پہنچ سکتا ہے۔ یہ تکبر کرنے والے پر طعن ہے اور نہی کی تعلیل ہے کہ تکبر کرنا اور اکڑ کر چلنا محض حماقت ہے۔ یہ بالکل مفید نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ کی مشیت کے بغیر اکڑ کر چلنے والا تو کسی چیز پر قادر نہیں ہے۔ حضرت عیاض بن حمار المجاشعی سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے میری طرف وحی فرمائی ہے کہ تواضع اختیار کرو کوئی کسی پر فخر نہ کرے اور کوئی دوسرے پر بغاوت نہ کرے۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے(2)۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 130 (التجاریہ)

2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 65 (قدیمی)

حضرت ابن مسعود سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ شخص جنت میں داخل نہ ہوگا جسکے دل میں ایک ذرہ برابر بھی تکبر ہوگا۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کبر میری رداء ہے اور عظمت میری چادر ہے جو مجھ سے ان میں سے ایک بھی چھینے گا میں اسے آگ میں داخل کروں گا۔ اس حدیث کو مسلم نے راویت کیا ہے(1)۔ سلمہ بن الاکوع سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک شخص متواتر تکبر و غرور کرتا رہتا ہے حتی کہ اسکا نام جباروں (ظالموں) میں لکھا جاتا ہے۔ پھر اسے وہ سزا ملتی ہے جو ان ظالموں کو ملی تھی۔ اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے(2)۔ عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سند سے مروی ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تکبر کرنے والوں کو قیامت کے روز چیونٹیوں کی طرح انسانوں کی صورتوں میں پیدا کیا جائے گا۔ ہر طرف سے ان پر ذلت چھائی ہوئی ہوگی۔ انہیں جہنم کے قید خانہ میں ہانک کر لے جایا جائے گا۔ اس مقام کا نام بولس ہے۔ ان پر بڑی آگ غالب آجائے گی۔ پھر انہیں دوزخیوں کا نچوڑ پلایا جائے گا۔ اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے(3)۔

اسماء بنت عمیس سے مروی ہے، فرماتی ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ بہت برا ہے وہ شخص جو تکبر کرتا ہے اور اکڑتا ہے اور بزرگ و برتر اللہ تعالیٰ کو بھول جاتا ہے(4)۔ اس حدیث کو ترمذی اور بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے منبر پر کھڑے ہوکر فرمایا اے لوگو! میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کیلئے تواضع کرتا ہے اللہ تعالیٰ نے اسے بلند کرتا ہے، وہ اپنے خیال میں چھوٹا ہوتا ہے لیکن لوگوں کی نظروں میں بڑا ہوتا ہے اور جو تکبر کرتا ہے اللہ تعالیٰ نے اسے ذلیل و پست کر دیتا ہے، وہ لوگوں کی نظروں میں حقیر ہوتا ہے، اگرچہ وہ اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ لوگوں کے نزدیک کتے اور خنزیر سے بھی زیادہ ذلیل و حقیر ہوتا ہے۔

ابن جریر نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، فرمایا پوری تورات پندرہ آیات پر مشتمل بنی اسرائیل سے منقول ہے۔ پھر فرمایا ولا تجعل مع اللہ الٰھا آخر (الآیات)(5)

كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا ﴿۳۸﴾

"یہ سب (جن کا ذکر گذرا) ان میں سے ہر بری بات اللہ تعالیٰ کو (سخت) ناپسند ہے"

1 کوفیوں اور ابن عامر نے سیئہ کو ہمزہ اور ھاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اس بناء پر کہ یہ کان کا اسم ہے اور اسکا مابعد اسکی خبر ہے ذالک کا اشارہ مذکورہ خصال کی طرف ہے وَ لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ سے شروع ہوکر یہاں تک جو بیان ہوئی ہیں۔ سیئہ میں ضمیر کل کی طرف راجع ہے سیّ ء کو کل کی طرف مضاف کیا یعنی ان خصال میں سے جو منہیات ہیں وہ بری ہیں۔ کیونکہ تمام اشیاء مذکورہ مامورات و منہیات پر مشتمل ہیں۔ اہل حجاز اور بصرہ نے سیئۃ کو تا تانیث کے فتحہ اور تنوین کی ساتھ پڑھا ہے اور اسکی نصب کان کی خبر ہونے کی وجہ سے ہے۔ اور اسم ضمیر ہے اور ذالک کا مشار الیہ وہ ہے جن سے اللہ تعالیٰ نے خصوصی طور پر اس ارشاد میں منع فرمایا ہے۔

ولا تقتلوا اولادکم الی آخرہ۔

1۔ مشکوٰۃ المصابیح، صفحہ 433 (وزارت تعلیم)
2۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی، جلد 4، صفحہ 176 (العلمیہ)
3۔ جامع ترمذی مع تحفۃ الاحوذی، جلد 7، صفحہ 207 (العلمیہ)
4۔ مشکوٰۃ المصابیح، صفحہ 434 (وزارت تعلیم)
5۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 330 (العلمیہ)

کیونکہ ان تمام ارشادات میں سیئات کا ذکر ہے حسنات کا ذکر نہیں ہے۔ اس ترکیب کے اعتبار سے عند ربک مکروھا، سیئۃ سے بدل ہوگا یا معنی پر محمول ہونے کی بناء پر صفت ہے کیونکہ یہ بھی سیئاً کے معنی میں ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مکروھاً کان کی ضمیر سے حال ہو یا ظرف کی ضمیر سے حال ہو اس بناء پر کہ وہ سیئۃ کی صفت ہے مکروہ سے مراد ناپسندیدہ ہے وہ پسندیدہ کے مقابلہ میں ہوتا ہے

ذٰلِكَ مِمَّآ اَوۡحٰۤى اِلَيۡكَ رَبُّكَ مِنَ الۡحِكۡمَةِ‌ ؕ وَلَا تَجۡعَلۡ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتُلۡقٰى فِىۡ جَهَنَّمَ مَلُوۡمًا مَّدۡحُوۡرًا ﴿۳۹﴾

"یہ ہدایات جنہیں بذریعہ وحی آپ کی طرف آپ کے رب نے بھیجا ہے دانائی کی باتوں میں سے ہیں۔ [1] اور (ایسے سننے والے) نہ بنا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود [2] پھینک دیا جائے گا جہنم میں اس حال میں کہ تمہیں ملامت کی جائے گی [3]"

[1] ذالک کا مشار الیہ مذکورہ احکام ہیں۔ قاموس میں ہے الحکمۃ بالکسر العدل والعلم والحلم۔ یعنی حکمت کا معنی عدل، علم، تحمل، دانائی، عقل، نبوت، قرآن اور انجیل ہے اور میں کہتا ہوں یہاں حکمت سے مراد علم نافع ہے۔

[2] اے انسان اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسرا خدا نہ بنا۔ اس بات پر تنبیہ کیلئے مکرر ذکر فرمایا ہے کہ توحید اسلام کا مدار ہے اور اعمال کی صحت کیلئے شرط اور اسلام کا منتہیٰ ہے کیونکہ جو شخص اپنے فعل یا ترک فعل سے اللہ تعالیٰ کے علاوہ کا طلبگار ہے وہ اپنی کوشش کو ضائع کرنے والا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کو ایک ماننا حکمت کی اصل اور اس کا مدار ہے۔ توحید مقصود بالذات علم ہے اور بقیہ علوم عمل کیلئے مقصود ہیں۔ پہلے دنیا میں شرک پر مرتب ہونیوالے وبال کا ذکر فرمایا۔ پھر عقبیٰ و آخرت میں جو اس پر نتیجہ مرتب ہوگا اس کا ذکر فرمایا۔

[3] تو خود اپنے نفس کو ملامت کرے گا اور اللہ تعالیٰ اور تمام مخلوق بھی تمہیں ملامت کرے گی اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے بھی دور ہوگا۔

اَفَاَصۡفٰىكُمۡ رَبُّكُمۡ بِالۡبَـنِيۡنَ وَاتَّخَذَ مِنَ الۡمَلٰٓـئِكَةِ اِنَاثًا‌ ؕ اِنَّكُمۡ لَتَقُوۡلُوۡنَ قَوۡلًا عَظِيۡمًا ﴿۴۰﴾

"پس کیا چن لیا تمہیں تمہارے رب نے بیٹوں کے لیئے اور (اپنے لئے) بنالیا ہے فرشتوں کو بیٹیاں [1] صد افسوس) تم تو ایسی بات کہہ رہے ہو جو بہت سخت ہے [2]"

[1] یہ خطاب ان لوگوں سے ہے جو فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں کہتے تھے۔ اور استفہام انکاری ہے فاء محذوف کلام پر عطف کیلئے ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے اَجَعَلَ لَكُمُ الْبَنِيْنَ فَاَصْفَاكُمْ یعنی کیا اس نے تمہارے لیے بیٹے بنائے اور اپنے لیے فرشتوں کو بیٹیاں بنایا یہ تو تمہاری عقل اور عادت کے بھی خلاف ہے کہ تم اپنے لئے تو بیٹے پسند کرتے ہو اور اللہ تعالیٰ کے لئے بیٹیاں مانتے ہو جو تم اپنے لئے پسند نہیں کرتے خدا کے لئے ثابت کرتے ہو۔

[2] تمہارا قول بہت قبیح ہے کیونکہ اس خالق کی طرف اولاد منسوب کرتے ہو۔ اور اولاد بعض ان اجسام کے خواص سے ہے جن کو فناء لاحق ہوتی ہے۔ پھر بیٹوں اور بیٹیوں میں سے جو کمزور صنف ہے اسے تم اسکی طرف منسوب کرتے ہو اور ملائکہ جو اسکی لطیف مخلوق ہیں انہیں تم کمزور صنف بناتے ہو۔

وَلَقَدۡ صَرَّفۡنَا فِىۡ هٰذَا الۡقُرۡاٰنِ لِيَذَّكَّرُوۡا ؕ وَمَا يَزِيۡدُهُمۡ اِلَّا نُفُوۡرًا ﴿۴۱﴾

"اور بلاشبہ ہم نے مختلف انداز سے بار بار بیان کیا ہے (دلائل توحید کو) اس قرآن میں [1] تاکہ وہ نصیحت قبول کریں [2]

(بایں ہمہ) سوائی نفرت کے ان میں کسی چیز کا اضافہ نہ ہوا[3] "

[1] ہم نے اس معنی کو کئی وجوہ سے قرآن میں ثابت کیا ہے، یا یہ معنی کہ ہم نے قرآن حکیم میں عبرتوں حکمتوں، امثال، احکام دلائل اور تذکیر کو متعدد بار مختلف اسلوبوں میں بیان کیا ہے۔ یہ معنی بھی ہوسکتا ہے کہ ھذا القرآن سے مراد اس نسبت کا ابطال ہو جو وہ اللہ تعالی کی طرف اولاد کی کرتے تھے خصوصا یہ کہ اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ یعنی یہ قول ہم نے کثرت سے بیان کیا ہے کہ ان کی یہ نسبت غلط ہے۔ صرفنا کی تشدید تکثیر یعنی کثرت پر دلالت کرنے کیلئے ہے۔

[2] لِیَذَّکَّرُوْا میں جمہور علماء نے ذال کو مشدد پڑھا ہے۔ معنی یہ کہ نصیحت حاصل کریں اور اللہ تعالی کی طرف ایسی بات منسوب نہ کریں جو اسکی عظیم شان کے لائق نہیں ہے اور جو انہیں حکم ملا ہے اسکی پیروی کریں اور جس چیز سے انہیں منع کیا گیا ہے اس سے باز رہیں۔ حمزہ اور کسائی نے ذال کے سکون اور کاف کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور سورۂ فرقان میں بھی اسی طرح پڑھا ہے۔ اور یہ ذکر سے مشتق ہوگا۔ اسکا معنی بھی التذکر ہی ہے۔

[3] ہماری اس تذکیر و تصریف سے انہیں کچھ فائدہ نہیں ہوتا بلکہ مزید حق سے دور ہوتے چلے جاتے ہیں۔

قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗۤ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِى الْعَرْشِ سَبِيْلًا ﴿۴۲﴾

" اگر ہوتے اللہ کے ساتھ اور خدا جس طرح یہ کافر کہتے ہیں[1] تو ان خداؤں نے (مل کر) تلاش کرلی ہوتی عرش کے مالک (پر غالب آنے کی) کوئی راہ[2] "

[1] ابن کثیر اور حفص نے یَقُوْلُوْنَ کو غائب کا صیغہ پڑھا ہے اس بناء پر کہ کلام رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہو رہی ہے اور باقی قراء نے تا کی ساتھ مخاطب کا صیغہ پڑھا ہے اس بناء پر کہ خطاب مشرکین سے ہو رہا ہے۔

[2] اذا مابعد کی ظرف ہے، یعنی جس طرح یہ کافر کہتے ہیں اگر بات اس طرح ہوتی تو ان خداؤں نے ملکر اس صاحب عرش مالک الملک پر غلبہ حاصل کرنے کی راہ تلاش کرلی ہوتی جیسا کہ بادشاہوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ ایک دوسرے کو مغلوب کرتے ہیں تو امکان تمانع بداہۃً ثابت ہے۔ اور تمانع (ٹکراؤ) ایک کے عجز یا دونوں کے عجز کو لازم ہے اور یہ الوہیت کے منافی ہے۔ یہ جملہ انکے قول کا جواب اور لو کی جزاء ہے۔

سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا ﴿۴۳﴾

" وہ پاک ہے[1] اور وہ بہت برتر و بالا ہے ان باتوں سے جو یہ لوگ کیا کرتے ہیں[2] "

[1] اللہ تعالی تمانع اور عجز سے پاک ہے جو الوہیت کے منافی ہے۔

[2] اور مشرک جو بات اسکی طرف منسوب کرتے ہیں وہ اس سے بہت بلند ہے۔ کیونکہ اللہ تعالی اپنی ذات کی طرح بقاء اور وجود کے بلند مرتبہ پر ہے اور بیٹا بنانا وجود کا ادنی مرتبہ ہے کیونکہ اولاد کی خواہش تو ان اجسام کا خاصہ ہے جنکی فناء و تباہی جلدی ہوتی ہے اور اشتراک مالکیت کا ادنی مرتبہ ہے (اس سے ثابت ہوا کہ خدا کا کوئی شریک نہیں ہے) حمزہ اور کسائی نے یَقُوْلُوْنَ کو تاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی مشرکین کو خطاب ہو رہا ہے۔ اور باقی قراء نے یاء کے ساتھ غائب کا صیغہ پڑھا ہے اس بناء پر کہ اللہ تعالی خود اپنی ذات سے انکی بات کی نفی و تنزیہ فرما رہا ہے۔

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَ الْاَرْضُ وَ مَنْ فِيْهِنَّ ؕ وَ اِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَ لٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ﴿۴۴﴾

"پاکی بیان کرتے ہیں اسی کی ساتوں آسمان اور زمین اور جو چیز ان میں موجود ہے [1] اور (اس کائنات میں) کوئی بھی ایسی چیز نہیں مگر وہ اس کی پاکی بیان کرتی ہے اسکی حمد کرتے ہوئے [2] لیکن تم انکی تسبیح کو سمجھ نہیں سکتے [3] بیشک وہ بہت بردبار، بہت بخشنے والا ہے [4]"

[1] ابو عمرو، حفص، حمزہ، کسائی اور یعقوب نے تسبیح کو تاء کے ساتھ فاعل کی تانیث کی وجہ سے مؤنث غائب کا صیغہ پڑھا ہے اور باقی قراء نے فاعل اور فعل کے درمیان فاصلہ اور فاعل کے مؤنث غیر حقیقی ہونے کی وجہ سے یاء کے ساتھ غائب کا صیغہ پڑھا ہے۔

[2] ہر چیز بلا استثناء اسکی عیب و نقص سے تنزیہہ بیان کر رہی ہے۔ جو بھی امکان کے لوازم اور حدوث کے توابع اور الوہیت کے منافی ہے اس سے اسکی پاکی بیان کر رہی ہے۔ **بحمدہ** یہ حال ہے۔ اسکے ساتھ ساتھ اس کے جمال ذاتی اور کمال صفاتی اور اسکے مسلسل انعامات پر زبانِ قال سے اسکی حمد و ثناء کر رہی ہے، ہر چیز کی اپنی زبان ہے جو اللہ تعالیٰ نے اسے عطا فرمائی ہے اور ان تسبیحات کو صرف وہی سن سکتا ہے جسکے دل کے کان صحیح و سلامت ہیں۔

حضرت عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے، فرماتے ہیں ہم یہ بات یعنی حضور کے معجزات کو برکت شمار کرتے تھے اور تم انہیں ڈرانے کا سبب خیال کرتے ہو۔ ہم سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ ہمارے پاس پانی کم ہو گیا۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کچھ پانی کسی برتن میں بچا ہوا ہو تو لے آؤ۔ صحابہ کرام ایک برتن میں تھوڑا سا پانی لائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دست اقدس اس برتن میں رکھا اور فرمایا برکت والے پانی کی طرف آؤ اور برکت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں میں نے دیکھا کہ آپ کی انگلیوں سے پانی پھوٹ رہا تھا۔ اور ہم کھانے کی تسبیح سنتے تھے جب کھانا کھایا جا رہا ہوتا تھا۔ (بخاری)(1)

مجاہد فرماتے ہیں ہر چیز اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتی ہے، خواہ وہ ذی روح ہے یا پتھر ہے، اور انکی تسبیح سبحان اللہ وبحمدہ ہے۔ ابراہیم نخعی فرماتے ہیں کوئی جماد یا ذی روح ایسا نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تحمید بیان نہ کرتا ہو حتیٰ کہ دروازے کی چرچراہٹ اور چھت کے ٹوٹنے کی آواز بھی تسبیح بیان کرتی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ تسبیح صرف جاندار اور ذی روح چیزوں کے ساتھ خاص ہے۔ قتادہ فرماتے ہیں حیوانات اور نامیات (بڑھنے والی اشیاء) تسبیح بیان کرتی ہیں۔ حضرت عکرمہ فرماتے ہیں درخت تسبیح بیان کرتا ہے، ستون تسبیح بیان نہیں کرتا(2)۔ لیکن یہ تخصیص کا قول درست نہیں ہے کیونکہ صحیح روایت سے ثابت ہے کہ اسطن حنانہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فراق میں رونے لگا تھا (اسطن حنانہ اس ستون کو کہا جاتا ہے جسکے ساتھ حضور ٹیک لگا کر خطبہ ارشاد فرماتے تھے پھر جب منبر بنا تو آپ منبر پر خطبہ دینے لگے۔ تو وہ فراق نبوت میں رونے لگا و سبحان اللہ و بحمدہ)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے یٰجِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَهٗ وَ الطَّيْرَ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ایک پہاڑ دوسرے سے پوچھتا ہے کیا تیرے پاس سے کوئی ذکر کرنے والا گذرا ہے۔ جب وہ کہتا ہے ہاں تو وہ خوش ہوتا ہے۔ اس حدیث کو طبرانی نے ابن مسعود سے روایت کیا ہے۔ ہر چیز زبان حال سے بھی اپنے امکان اور حدوث کے ساتھ صانع قدیم واجب الوجود لذاتہ پر دلالت کر رہی ہی جو ہر نقص اور

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 505 (قدیمی)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 131 (التجاریہ)

عیب سے پاک اور صفات کمال سے متصف ہے۔ اس لئے صرف تسبیح قولی پر اکتفا درست نہیں ہے۔ زبانِ حال اور زبانِ قال ہر دو طرح سے اسکی تسبیح بیان کر رہی ہیں۔

۲؎ لیکن تم میں سے اکثر لوگ انکی تسبیح مقالی کو نہیں سمجھتے۔ مشرکین اپنی عبادت اور اندھے پن کے باعث تسبیح حالی سے بھی غافل ہیں۔

۳؎ وہ تمہارے شرک اور تمہاری غفلتوں پر جلد سزا نہیں دیتا وہ حلیم ہے۔ جو اس سے اپنے گناہوں کی بخشش طلب کرتا ہے۔ اسکو وہ معاف بھی فرماتا ہے۔

ابن منذر نے ابن شہاب سے نقل کیا ہے فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے مشرکوں کے سامنے قرآن کی تلاوت فرماتے اور انہیں اللہ تعالیٰ کی توحید کی دعوت دیتے تو مزاحاً کہتے قُلُوْبُنَا فِیْٓ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَیْهِ وَ فِیْٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ وَّ مِنْۢ بَیْنِنَا وَ بَیْنِكَ حِجَابٌ۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (1)۔

وَ اِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَیْنَكَ وَ بَیْنَ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا ﴿۴۵﴾

”اور (اے محبوب) جب آپ پڑھتے ہیں قرآن کو تو ہم (حائل) کر دیتے ہیں آپ کے درمیان اور انکے درمیان جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ایک پوشیدہ پردہ جو آنکھوں سے نہاں ہوتا ہے ۱؎“

۱؎ قرآن کی سمجھ سے انکے دل محروم ہیں اور اسکے چمکتے ہوئے موتیوں سے نفع اٹھانے سے محجوب ہیں۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں حجاباً سے مراد پردے ہیں۔ اور وہ حجاب ایسا ہے جسے حس محسوس نہیں کرتی یا یہ معنی کہ کسی دوسرے پردے سے وہ ڈھکا ہوا ہے اور انکی یہ کیفیت ہے کہ وہ اپنی ناسمجھی کا بھی شعور نہیں رکھتے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہاں مستور بمعنی الساتر ہے جیسے اس ارشاد میں ماتیا بمعنی آتیا ہے۔ کان وعدہ ماتیا۔ بعض علماء تفسیر نے حجاب سے مراد وہ پردہ لیا ہے جو اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور لوگوں کے درمیان حائل فرما دیتے تھے۔ جسکی وجہ سے لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ظاہری آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے تھے۔

امام بغوی فرماتے ہیں سعید بن جبیر سے مروی ہے کہ جب سورۃ تَبَّتْ یَدَآ اَبِیْ لَهَبٍ نازل ہوئی تو ابولہب کی بیوی ہاتھ میں پتھر اٹھائے ہوئے آئی۔ جبکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ابوبکر صدیق کے ساتھ تھے مگر اس بد بخت نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ دیکھا پوچھنے لگی ابوبکر تمہارا ساتھی کہاں ہے، مجھے اطلاع ملی ہے کہ اس نے میری ہجو کی ہے۔ ابوبکرؓ نے فرمایا قسم بخدا وہ تو شاعری کرتا ہی نہیں ہے۔ وہ گستاخ یہ کہتے ہوئے واپس مڑ گئی میں یہ پتھر لائی تھی تا کہ اسکے ساتھ انکا سر پھاڑ دوں۔ ابوبکرؓ نے عرض کی یا رسول اللہ! اس نے آپ کو نہیں دیکھا۔ فرمایا ہاں، اس نے مجھے نہیں دیکھا۔ میرے درمیان اور اسکے درمیان ایک فرشتہ تھا جو مجھ پر پردہ کیے ہوئے تھا (2)۔

میں کہتا ہوں اس روایت کے مطابق یہ آیت ایک مخصوص واقعہ کے ساتھ ہوگی۔ کیونکہ ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا تھا کہ آپ جب بھی قرآن پڑھتے ہوں تو کفار آپ کو نہ دیکھتے ہوں۔

وَّ جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ یَّفْقَهُوْهُ وَ فِیْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ؕ وَ اِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِی الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰۤى اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا ﴿۴۶﴾

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 337 (العلمیہ)

2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 132 (التجاریہ)

"اور ہم ڈال دیتے ہیں انکے دلوں پر پردہ[1] تا کہ اسے سمجھ نہ سکیں[2] اور انکے کانوں میں گرانی (پیدا کر دیتے ہیں)[3] اور جب آپ ذکر کرتے ہیں صرف اپنے رب کا قرآن میں تو وہ پیٹھ پھیر کر بھاگ جاتے ہیں نفرت کرتے ہوئے[4]"

[1] ہم انکے دلوں پر پردے ڈال دیتے ہیں جو انہیں ڈھانپ لیتے ہیں اور پردے قبول حق اور ادراک حق سے مانع بن جاتے ہیں۔

[2] انکے سمجھنے کو ناپسند کرتے ہوئے، یا یہ معنی کہ تا کہ وہ سمجھ نہ سکیں۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ اس فعل کا مفعول ہو جس پر جَعَلْنَا عَلٰی قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً دلالت کر رہا ہے یعنی مَنَعْنَاهُمْ اَنْ يَّفْقَهُوْهُ ہم نے انہیں سمجھنے سے روکا۔)

[3] انکے کانوں میں گرانی پیدا کرتے ہیں جو انہیں صدائے حق کو سننے سے مانع ہوتی ہے۔ قرآن لفظ اور معنی کے اعتبار سے معجزہ تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے معنی کو سمجھنے سے باز رکھنے کیلئے انکے دلوں پر پردے ڈال دیئے اور الفاظ کے حسن نظم کو سننے سے محروم کرنے کیلئے کانوں میں گرانی پیدا فرما دی۔

[4] یعنی جب آپ انکے بے بس بتوں اور من گھڑت خداؤں کے ذکر کے بغیر اللہ تعالیٰ کا قرآن میں ذکر کرتے ہیں تو توحید کو سننے کی بجائے اظہار نفرت کرتے ہوئے الٹے پاؤں پیچھے بھاگتے ہیں۔ وحدہ مصدر ہے جو حال کی جگہ واقع ہے۔ اسکی اصل واحداً وحدہ ہے اور نفوراً یا تو علت کی بناء پر منصوب ہے یا تولیۃ کے معنی میں مصدر کی بناء پر منصوب ہے۔ یا نفور بمعنی نافرین نافر کی جمع ہے اور حال کی بناء پر منصوب ہے۔ جیسے عاقد کی جمع عقود ہے اسی طرح نافر کی جمع نفور ہے۔

نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَسْتَمِعُوْنَ بِهٖۤ اِذْ يَسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ وَ اِذْ هُمْ نَجْوٰۤى اِذْ يَقُوْلُ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ﴿۴۷﴾

"ہم خوب جانتے ہیں جس غرض کیلئے سنتے ہیں[1] اسے جب یہ کان لگاتے ہیں آپ کی طرف اور (ہم خوب جانتے ہیں) جب یہ سرگوشیاں کرتے ہیں[2] اس وقت یہ ظالم کہتے ہیں کہ تم نہیں پیروی کر رہے مگر ایک ایسے آدمی کی جس پر جادو کیا گیا ہے[3]"

[1] ہم خوب جانتے ہیں جس طریقہ اور کیفیت میں اور جس غرض وسبب سے یہ قرآن کو سنتے ہیں آپ کے ساتھ یا قرآن کے ساتھ استہزاء کرتے ہوئے۔ يَسْتَمِعُوْنَ کا مفعول محذوف ہے۔ بہ اسکا صلہ ہے یا حال اور بیان ہے ماء کا۔ یعنی وہ قرآن کو استہزاء کیلئے یا استہزاء کرتے ہوئے سنتے ہیں جبکہ ان پر واجب تھا کہ یہ سنجیدگی اور عقیدت ومحبت کے ساتھ سنیں۔

[2] اذ يستمعون اليك اعلم کی ظرف ہے۔ اور واذهم نجوى بھی اعلم کی ظرف ہے۔ نجوی مصدر بمعنی فاعل ہے یا ذو اس سے پہلے مقدر ہے۔ یا نجی کی جمع ہے یعنی ہم انکے سننے کی غرض کو جانتے ہیں جب وہ آپ کی طرف کان لگا کر سنتے ہیں اور وہ اس غرض کو چھپائے ہوئے ہوتے ہیں۔ یا جب آپس میں سرگوشیاں کرتے ہیں یا وہ سرگوشی کرنے والے ہوتے ہیں۔

[3] الظالمون سے مراد ولید بن مغیرہ اور اسکے بد طینت دوست ہیں۔ اذ يقول یا یہ پہلے اذ سے بدل ہے۔ اسم ضمیر کی جگہ اسم ظاہر الظلمون کو اس لئے رکھا ہے تا کہ اس بات پر دلالت کرے کہ انکا یہ قول (ان تتبعون الا رجلاً مسحورا) ظلم ہے۔ مسحور اس شخص کو کہتے ہیں جس پر جادو کیا گیا ہو اور اسکی عقل زائل ہو چکی ہو۔ مجاہد کہتے ہیں مسحور کا معنی مخلوعاً (دھوکا دیا گیا) ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی ہے جو حق سے پھیرا گیا ہو۔ عرب کہتے ہیں ماسحرک عن كذا یعنی تجھے فلاں کام سے کس نے پھیرا ہے۔

ابوعبیدہ فرماتے ہیں اسکا معنی ذا سحر ہے اور سحر کا معنی پھیپھڑا ہے۔ یعنی وہ بھی تمہاری طرح پھیپھڑوں والا انسان ہے تمہاری طرح کھاتا، پیتا اور سانس لیتا ہے۔

اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا ﴿۴۸﴾

"دیکھئے (یہ گستاخ) کس طرح آپ کیلئے مثالیں بیان کرتے ہیں ۱؎ پس (اس گستاخی کے باعث) وہ گمراہ ہوگئے ۲؎ اب وہ سیدھے راستہ پر چل نہیں سکتے ۳؎"

۱؎ اے پیارے محمد دیکھئے، یہ کیسی کیسی آپکے لیے مثالیں دیتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے جادوگر ہے، کوئی کہتا ہے شاعر ہے، کوئی کہتا ہے ان پر جادو کیا گیا ہے۔ کوئی کہتا ہے کاہن ہے، کوئی کہتا ہے مجنون ہے۔

۲؎ جب انہوں نے آپ کیلئے ایسی مثالیں بیان کیں جنکے آپ قطعاً مصداق نہ تھے۔ تو اس گستاخی کی سزا کے طور پر اللہ تعالیٰ نے انہیں نعمت ایمان سے محروم کردیا۔

۳؎ چونکہ اللہ تعالیٰ نے انکے دلوں پر پردے ڈال دیے ہیں اس لئے یہ راہ حق کو نہیں پاسکتے۔ یا یہ معنی کہ وہ اپنے ارادہ کے مطابق صحیح طعن کرنے کا راستہ ہی نہیں پاتے بلکہ ایک مخبوط الحواس شخص کی طرح کبھی کچھ بکتے ہیں، کبھی کچھ جس طرح ایک ششدر انسان کو اپنے افعال کا بھی علم نہیں ہوتا۔

وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ﴿۴۹﴾

"اور انہوں نے (ازراہ انکار) کہا کہ جب ہم (مرکر) ہڈیاں اور ریزہ ریزہ ہوجائیں گے ۱؎ تو کیا ہمیں اٹھایا جائے گا از سر نو پیدا کر کے ۲؎"

۱؎ رفات ہر وہ چیز جو بوسیدہ اور ٹوٹی ہوئی ہو جیسے فتات اور حطام۔ قاموس میں ہے رفتہ ھرفتہ، کسرہ و دقہ وانکر واندق۔ یعنی یہ لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے (جیسے غراب وحطام) توڑنا اور ٹوٹنا۔ مجاہد فرماتے ہیں اسکا معنی تراباً ہے یعنی مٹی ہو جانا ہے (1)۔

۲؎ زندہ آدمی کے بدن میں تازگی ہوتی ہے اور پرانی ہڈی میں سختی ہوتی ہے۔ تو انکے درمیان بہت زیادہ بعد ہے۔ اس لئے وہ دوبارہ زندہ ہونے کا انکار کرتے ہوئے کہتے ہیں کیا ہمیں نئے سرے سے پیدا کیا جائے گا۔

قُلْ كُوْنُوْا حِجَارَةً اَوْ حَدِيْدًا ﴿۵۰﴾ اَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِيْ صُدُوْرِكُمْ ۚ فَسَيَقُوْلُوْنَ مَنْ يُّعِيْدُنَا ۭ قُلِ الَّذِيْ فَطَرَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ فَسَيُنْغِضُوْنَ اِلَيْكَ رُءُوْسَهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هُوَ ۭ قُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ قَرِيْبًا ﴿۵۱﴾

"فرمائیے (یقیناً ایسا ہی ہوگا) خواہ تم پتھر بن جاؤ یا لوہا بن جاؤ یا کوئی ایسی مخلوق بن جاؤ جس کا از سر نو پیدا کرنا تمہارے خیال میں بہت مشکل ہے ۱؎ وہ کہیں گے ہمیں دوبارہ کون (زندہ کر کے) لوٹائے گا فرمائیے وہی جس نے پیدا فرمایا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 133 (التجاریہ)

تمہیں پہلی مرتبہ ۲؎ پس وہ حیرت سے آپ کی طرف (دیکھ کر) سروں کو جنبش دیں گے اور پوچھیں گے ایسا کب ہوگا آپ بتائیے شاید اسکا وقت قریب ہی ہو ۳؎ "

۱؎ اے پیارے محمد فرما دیجئے پتھر ہو جاؤ یا لوہا بن جاؤ یا کوئی دوسری مخلوق جو تمہارے خیال میں زندگی کو قبول نہیں کرتی تھی مثلاً بوسیدہ ہڈیاں، آسمان، زمینیں اور پہاڑ۔ اللہ تعالیٰ پھر بھی تمہیں زندہ کرنے پر قادر ہے کیونکہ فلسفیوں کا قاعدہ ہے کہ اجسام اعراض کو قبول کرنے میں مشترک ہیں۔ تو پھر جب تم بوسیدہ ریزہ ریزہ ہڈیوں کی شکل میں ہو گے۔ تب بھی تمہیں زندہ کرنے پر قادر ہوگا کیونکہ اس سے پہلے یہ ہڈیاں حیات سے موصوف تھیں۔ تو وہ چیز زندگی کو قبول کرنے کی زیادہ اہل ہوتی ہے جو پہلے زندگی کی کیفیت سے موصوف تھی بنسبت اسکے جس پر پہلے یہ کیفیت طاری نہیں تھی اور نئے سرے سے اسے زندگی کی کیفیت عطا کی جائے (جیسے ایک نطفہ کو اللہ تعالیٰ نے زندگی عطا فرمائی تھی) کونوا حجارۃ کا امر تکلیفی اور الزامی نہیں ہے کیونکہ وہ ایسا تو کر ہی نہیں سکتے تھے بلکہ یہ امر تقدیری ہے۔ یعنی تم اپنے نفسوں کو پتھر، لوہا یا ایسی قوت جماد یہ فرض کرلو جو تمہارے گمان کے مطابق حیات کو قبول نہیں کرتی۔

۲؎ وہ کہیں گے ہمیں مرنے کے بعد کون زندہ کرے گا۔ آپ فرمایئے مرنے کے بعد وہی زندہ کرے گا جس نے تمہیں پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا جب تم مٹی تھے اور حیات سے بہت دور تھے۔ تو دوبارہ پیدا کرنے کی بنسبت پہلی مرتبہ پیدا کرنا دشوار ہوتا ہے تو جس نے ابتداءً تمہیں زندگی بخشی وہ تمہیں دوبارہ زندہ کرنے پر بدرجہ اولیٰ قادر ہے۔

۳؎ تو وہ آپ کو دیکھ کر تعجب اور استہزاء کرتے ہوئے سروں کو حرکت دیتے ہیں۔ اور پوچھتے ہیں وہ قیامت کب ہوگی جس میں ہمیں دوبارہ اٹھایا جائے گا۔ محبوب فرمایئے شاید وہ قریب ہی ہے۔ قیامت کو قریب سے تعبیر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ہر وہ کام جو ہونے والا ہو وہ قریب ہوتا ہے۔ یا یہ معنی کہ عالم کی تخلیق کے شروع سے اسکا زمانہ قریب ہے۔ قَرِیْبًا خبر کی بناء پر منصوب ہے، یہ ہو سکتا ہے کہ عسی کا اسم مضمر ہو ان یکون اسکی خبر ہو اور قریباً ظرف کی بناء پر منصوب ہو۔ یعنی زمانہ قریب میں ہو۔

يَوْمَ يَدْعُوكُمْ فَتَسْتَجِيبُونَ بِحَمْدِهٖ وَتَظُنُّونَ إِنْ لَّبِثْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا ﴿۵۲﴾

"اس دن کو یاد کرو جب تمہیں اللہ تعالیٰ بلائے گا ۱؎ سو تم اس کی حمد کرتے ہوئے جواب دو گے ۲؎ اور یہ گمان کر رہے ہو گے کہ تم نہیں ٹھہرے (دنیا میں) مگر تھوڑا عرصہ ۳؎ "

۱؎ تم اپنی قبور سے جواب دو گے اسکی حمد کرتے ہوئے جب تمہیں بلایا جائے گا۔ یوم قریباً سے بدل ہوگا جب قریباً کو خبر یا ظرف بنایا جائے۔ یا اذکر مقدر کی وجہ سے منصوب ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ صور اسرافیل کے ذریعے قبروں سے موقف کی طرف محاسبہ کیلئے بلائے گا۔ پس تم اسکی حمد کرتے ہوئے جواب دو گے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اسکا یہ معنی ہے کہ وہ تمہیں قبروں سے اٹھائے گا اور تم اٹھ پڑو گے۔ پس اٹھانے اور اٹھنے کیلئے دعا اور استجابت کو استعارۃ استعمال کیا ہے تا کہ ان دونوں امروں کی سرعت پر تنبیہ ہو جائے۔ اور ان دونوں سے مقصود محاسبہ اور جزاء کیلئے حاضر کرنا ہے۔

۲؎ بحمدہ تستجیبون کے فاعل سے حال ہے۔ یعنی جو اسکے کمال قدرت پر حمد کرتے ہوئے اور اپنے خالق و باعث کا اقرار کرتے ہوئے جواب دو گے۔ اس وقت وہ حمد کریں گے جب کہ اس وقت حمد نفع بخش نہ ہوگی۔ یا یہ معنی کہ وہ اٹھنے کے حکم کی اطاعت کریں گے جیسے اسکی حمد کرنے والے اطاعت کرتے ہیں۔ بعض علما فرماتے ہیں یہ خطاب مومنین کو ہے کیونکہ مومنین اللہ تعالیٰ کی حمد

کرتے ہوئے اپنی قبروں سے اٹھیں گے۔ جبکہ کفار کو محمد کی توفیق نہ ہوگی بلکہ وہ یہ کہہ رہے ہوں گے یٰوَیۡلَنَا مَنۡۢ بَعَثَنَا مِنۡ مَّرۡقَدِنَا ٞ هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحۡمٰنُ وَصَدَقَ الۡمُرۡسَلُوۡنَ۔ یٰحَسۡرَتٰی عَلٰی مَا فَرَّطۡتُّ فِیۡ جَنۡۢبِ اللّٰهِ ہائے ہم برباد ہو گئے کس نے ہمیں اٹھا کھڑا کیا ہماری خواب گاہوں سے (آواز آئے گی) کہ وہی ہے جس کا رحمان نے وعدہ فرمایا تھا اور سچ کہا تھا (اس کے) رسولوں نے صد حیف ان کو تاہیوں پر جو مجھ سے سرزد ہوئیں اللہ کے بارے میں۔

ثعلبی نے دیباج میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے جبرئیل نے بتایا ہے کہ لا الٰہ الا اللہ، مسلمان کیلئے موت کے وقت اور اسکی قبر میں اور جب وہ قبر سے اٹھے گا، انس ہوگا۔ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اگر آپ انہیں قبور سے اٹھنے کے وقت دیکھیں گے تو یہ قبروں سے سر جھاڑتے ہوئے نکلیں گے اور ہر ایک یہ کہہ رہا ہوگا لا الٰہ الا اللّٰہ والحمد للّٰہ اور انکا چہرہ روشن ہوگا۔ اور کافروں میں سے ہر ایک یہ کہہ رہا ہوگا یٰحَسۡرَتٰی عَلٰی مَا فَرَّطۡتُّ فِیۡ جَنۡۢبِ اللّٰهِ اور انکے چہرے کالے سیاہ ہوں گے۔

طبرانی، ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ نے ابن عمر سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لا الٰہ الا اللّٰہ کہنے والوں پر موت کے وقت قبور میں اور قیامت کے روز وحشت نہ ہوگی۔ گویا میں صور اسرافیل کے وقت سروں سے مٹی جھاڑتے ہوئے انکو دیکھ رہا ہوں وہ کہہ رہے ہیں اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِیۡۤ اَذۡهَبَ عَنَّا الۡحَزَنَ (1)۔ عبد بن حمید، ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے سعید بن جبیر سے اسی قسم کی روایت نقل کی ہے۔

سے اور تم یہ گمان کر رہے ہو گے کہ دنیا میں یا قبور میں ہم تو بالکل تھوڑا عرصہ ٹھہرے ہیں۔ یہ کہنے کی وجہ سے سامنے ہولناکیوں اور شدت کا نظر آنا ہے۔ قتادہ فرماتے ہیں وہ قیامت کے مقابلہ میں دنیا کی مدت کو حقیر سمجھیں گے۔

کلبی کہتے ہیں مشرکین مسلمانوں کو اذیتیں دیتے تھے تو مسلمانوں نے انکی دلآزاریوں اور اذیتوں کی شکایت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کی تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (2)۔

وَ قُلۡ لِّعِبَادِیۡ یَقُوۡلُوا الَّتِیۡ هِیَ اَحۡسَنُ ؕ اِنَّ الشَّیۡطٰنَ یَنۡزَغُ بَیۡنَهُمۡ ؕ اِنَّ الشَّیۡطٰنَ کَانَ لِلۡاِنۡسَانِ عَدُوًّا مُّبِیۡنًا ﴿۵۳﴾

"اور آپ حکم دیجئے میرے بندوں کو کہ وہ ایسی باتیں کیا کریں جو بہت عمدہ ہوں لے بیشک شیطان فتنہ وفساد برپا کرنا چاہتا ہے ان کے درمیان ع یقیناً شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے سے"

لے اسلام کی دعوت اور لا الٰہ الا اللّٰہ کی دعوت بڑے نرم اور محبت بھرے لہجہ میں دو۔ دلائل اور نصائح کے اظہار سے مزین ہو۔ مشرکین سے گفتگو کرتے وقت بھی کسی قسم کی درشتی اور غیر مہذب انداز نہ ہو۔ ان جیسا ناشائستہ لہجہ تم انکے مقابلہ میں نہ اپناؤ۔ حضرت حسن فرماتے ہیں مخالف کو فقط اتنا کہے یہدیک اللّٰہ اللہ تجھے ہدایت دے۔ اور کفار ومشرکین سے ایسا انداز اپنانے کا حکم قتال کی اجازت سے پہلے کا ہے، بعض علماء فرماتے ہیں یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی، انکو کسی کافر نے برا بھلا کہا تو اللہ نے آپ کو عفو کا حکم فرمایا۔ بعض علماء فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے مومنین کو حکم فرمایا ہے کہ وہ بات کریں تو عمدہ اور عمل کریں تو اچھا۔ بعض علماء فرماتے ہیں احسن سے مراد کلمہ اخلاص ہے یعنی لا الٰہ الا اللّٰہ

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 340 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 133 (التجاریہ)

۲۔ نزغ کا معنی دو شخصوں کے درمیان شر اور فساد کو برپا کرنا ہے، یعنی تم ایسی بات نہ کہو کہ شیطان کو تمہارے درمیان عداوت اور فساد پھیلانے کا موقع مل جائے۔

۳۔ یعنی شیطان انسان کا ایسا دشمن ہے کہ جسکی دشمنی ظاہر ہے۔ کفار کو راہ راست سے بھٹکا کر جہنم میں پہنچاتا ہے اور مومنین کو شرارت اور فوری فساد تک لے جاتا ہے۔

رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِكُمْ ۭ اِنْ يَّشَاْ يَرْحَمْكُمْ اَوْ اِنْ يَّشَاْ يُعَذِّبْكُمْ ۭ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا ﴿۵۴﴾

"تمہارا رب تمہیں خوب جانتا ہے اگر چاہے تو تم پر رحم (وکرم) فرمادے اور اگر چاہے تو تمہیں سزا دے ۱؎ اور نہیں بھیجا ہم نے آپ کو انکا ذمہ دار بنا کر (تاکہ ان کے کفر کے لیے آپ جوابدہ ہوں ۲؎"

۱؎ یعنی تمہارا رب تمہیں خوب جانتا ہے چاہے تو تمہیں ایمان قبول کرنے کی دولت کی توفیق دے اور پھر تم پر رحم فرمائے۔ چاہے تو تمہیں شرک پر مارے اور تمہیں عذاب میں مبتلا کرے۔ ابن جریج نے یہی تفسیر لکھی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ التی ھی احسن کی تفسیر ہے اور درمیان میں کلام معترضہ ہے۔ یعنی تم ان سے یہ کلمہ کہو یا اس جیسا کلمہ کہو۔ ان سے بدیانہ انداز میں بات نہ کرو، نہ انہیں گالیاں دو نہ انہیں صراحۃً دوزخی کہو کیونکہ یہ انداز انہیں شر پر برانگیختہ کرے گا۔ حالانکہ انکے خاتمہ کا امر غیب ہے جسے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا (ہوسکتا ہے وہ اسلام قبول کرلیں)۔

کلبی کہتے ہیں یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مومنین کو خطاب ہے۔ معنی یہ ہے کہ اگر وہ چاہے تو تم پر رحم فرمائے اور تمہیں اہل مکہ سے نجات عطا فرمائے۔ او ان یشا یعذبکم اور چاہے تو تمہیں عذاب دے کہ تم پر اہل مکہ کو مسلط کردے (1)۔

۲؎ اے پیارے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو کفار کا ذمہ دار بنا کر نہیں بھیجا گیا کہ آپ انہیں ایمان لانے پر مجبور کریں اور انکے کفر پر دل تنگ ہوں بلکہ آپ کو تو صرف بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر مبعوث کیا گیا ہے۔ آپ ان سے نرم انداز میں بات کریں اور اپنے جانثاروں کو حکم دیں کہ وہ انکی اذیتوں کو برداشت کریں۔

وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِمَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰي بَعْضٍ وَّاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ﴿۵۵﴾

"اور آپ کا رب خوب جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے ۱؎ اور بیشک ہم نے بزرگی دی ہے بعض انبیاء کو بعض پر ۲؎ ہم نے عطا فرمائی ہے داؤد کو زبور ۳؎"

۱؎ تمہارا رب خوب جانتا ہے کہ کون تاج نبوت اور خلعت ولایت کے قابل ہے اور کون سعادت کی شان کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے اور کون شقاوت پر پیدا کیا گیا ہے۔ یہ کفار قریش کا رد ہے کہ وہ ابو طالب کے یتیم بھتیجے کے نبی ہونے اور بلال اور صہیب کے مقام ولایت پر فائز ہونے اور نادار و فاقہ کش لوگوں کے جنتی ہونے اور رؤسائے قریش کے دوزخی ہونے کو بعید از عقل سمجھتے تھے (تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا میری بارگاہ میں دنیا، سیم وزر کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ میں تو دل کے اخلاص اور قلب کی صفائی پر نظر رکھتا ہوں (مجھے معلوم ہے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 133 (التجاریۃ)

کہ سعادت کے نور سے کس کی پیشانی روشن ہے، اور شقاوت کی کالک کس کے منہ پر لگی ہے)۔

۱؎ ہم نے بعض انبیاء کرام کو بعض پر فضائل نفسانیہ اور علائق جسمانیہ سے پاک کرنے کے ساتھ فضیلت دی ہے۔ مال کی کثرت اور اولاد کی زیادتی کے ساتھ فضیلت نہیں دی۔ کیونکہ مال کی کثرت وقلت اور اولاد کی زیادتی اور کمی کوئی معیار فضیلت نہیں ہے۔ اس آیت کے ضمن میں حضرت قتادہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خلیل بنایا' موسیٰ علیہ السلام کو شان کلیمی عطا فرمائی۔ عیسیٰ علیہ السلام کو کن سے تخلیق فرمایا (میں کہتا ہوں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بچپن میں پنگھوڑے کے اندر تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان سے کلام فرمائی' نیز انہیں کتاب وحکمت عطا فرمائی۔ تورات وانجیل کی تعلیم دی اور روح القدس سے تائید فرمائی)۔ فرماتے ہیں سلیمان علیہ السلام کو ایسی بادشاہی عطا فرمائی جو انکے بعد کسی کو ملنا مناسب نہیں۔ یعنی انکے لیے جن وانس کو مسخر فرمایا اور شیطانوں کو زنجیروں میں جکڑ کر ان کا تابع فرمان بنادیا۔ داؤد علیہ السلام کو زبور عطا فرمائی (1) جیسا کہ ارشاد ہے وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا۔

۲؎ حضرت داؤد علیہ السلام کو فضیلت اس کتاب کی وجہ سے دی جو انکی طرف وحی کی گئی تھی۔ حکومت وبادشاہی کی وجہ سے آپکو فضیلت نہ تھی۔ اس آیت کریمہ میں کفار مکہ کا رد ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت کا انکار کرتے تھے۔ فرمایا انبیاء کرام میں سے بعض کو بعض پر فضیلت فضائل نفسانیہ اور علائق جسمانیہ سے طہارت' علوم وہبیہ' مراتب قرب' اور عمومی ہدایت کے اعتبار سے عطا فرمائی مال واولاد کو وجہ فضیلت نہیں بنایا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام انبیاء پر فضیلت خاتم النبیین کا تاج زرنگار عطا فرما کر مرحمت فرمائی۔ اور آپکی امت کو خیر الامم بنایا کیونکہ قرآن میں ہے اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ﴿۱۰۵﴾ (اس زمین کے وارث نیکوکار بندے ہیں)۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کریم جیسی عظیم کتاب عطا فرمائی جو حجم میں کم لیکن علم میں زیادہ ہے اور ایک ظاہر وباہر معجزہ ہے (جس سے کسی کو انکار نہیں) اور آپکو بلند ترین درجات عطا فرمائے دَنَا فَتَدَلّٰى ﴿۸﴾ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ﴿۹﴾ پھر وہ قریب ہوا کہ اور قریب ہوا یہاں تک کہ دو کمانوں کے برابر بلکہ اس سے بھی کم فاصلہ رہ گیا۔

امام بغوی فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام کو زبور کی تعلیم دی جو ایک سو پچاس سورتوں پر مشتمل تھی اور تمام میں دعا' اور اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا تھی۔ ان میں حلال وحرام اور فرائض وحدود کے احکام نہیں تھے۔ زبور کو یہاں نکرہ اور وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ میں معرفہ ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ اصل میں فعول کے وزن پر مفعول کے معنی میں ہے جیسے ودود بمعنی مودود یا یہ مصدر ہے جیسے قبول۔ اس قول کی تائید حمزہ کی قرأت بھی کرتی ہے انہوں نے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ العباس اور الفضل کی طرح ہے۔ یا الزبور سے مراد بعض الزبور ہے یا بعضاً من الزبور ہے' جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر تھا۔ واللہ اعلم۔

امام بخاری وغیرہ نے ابن مسعود سے روایت کیا ہے، فرمایا کچھ لوگ جنوں کی پوجا کرتے تھے۔ پھر جن مسلمان ہوگئے۔ تو کئی لوگ پھر بھی ان کی عبادت پر لگے رہے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (2)۔

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيْلًا ﴿۵۶﴾

"(انہیں) کہئے اب بلاؤ' ان کو جنہیں تم گمان کیا کرتے تھے (کہ یہ خدا ہیں) اللہ تعالیٰ کے سوا وہ تو قدرت نہیں رکھتے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 134 (التجاریۃ)

2۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 685 (قدیمی)

کہ تکلیف دور کرسکیں تم سے اور نہ ہی وہ (اسے) بدل سکتے ہیں[1]"

[1] جن کو تم اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر جنوں میں سے خدا بناتے ہو وہ تو تم سے مرض' فقر اور قحط جیسی تکالیف دور نہیں کر سکتے۔ اور نہ وہ یہ طاقت رکھتے ہیں کہ تمہاری تکلیف کو کسی دوسرے کی طرف تبدیل کرسکیں۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يَدْعُونَ يَبْتَغُونَ إِلَىٰ رَبِّهِمُ الْوَسِيلَةَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ وَيَرْجُونَ رَحْمَتَهُ وَيَخَافُونَ عَذَابَهُ ۚ إِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُورًا ﴿٥٧﴾

"وہ لوگ جنہیں یہ مشرک پکارا کرتے ہیں وہ خود ڈھونڈتے ہیں اپنے رب کی طرف وسیلہ [1] کہ کونسا بندہ (اللہ تعالیٰ سے) زیادہ قریب ہے [2] اور امید رکھتے ہیں اللہ تعالیٰ کی رحمت کی اور ڈرتے رہتے ہیں اسکے عذاب سے [3]۔ بیشک، آپ کے رب کا عذاب ڈرنے کی چیز ہے [4]"

[1] یعنی جنوں میں سے مشرک جن کو خدا سمجھ کر پکارتے ہیں اور انکی عبادت کرتے ہیں۔ وہ انکے معبود (جن) خود اللہ کے رسول پر ایمان لائے ہیں اور طاعت کے ذریعے قرب الٰہی کے متلاشی ہیں۔ بعض علما فرماتے ہیں وسیلہ کا معنی رغبت کے ساتھ کسی چیز تک پہنچنا ہے۔ یہ وصیلہ سے خاص ہے کیونکہ اسکے ضمن میں رغبت کا معنی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف وسیلہ یہ ہے کہ علم وعمل کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے راستہ کی رعایت کرنا اور شریعت کے اخلاق حسنہ پر عمل کی کوشش کرنا ہے۔ پس یہی قربت ہے۔ قاموس میں ہے الوسیلة والواسلة المنزلة عندالملک والدرجة والقربة۔ یعنی وسیلہ اور واسلہ کا معنی بادشاہ کی بارگاہ میں منزلت' درجہ اور قربت ہے۔ وسل الی اللہ کا معنی ہے کہ اس نے ایسا عمل کیا جو قرب الٰہی کا باعث بنا۔

[2] ایھم اقرب' یبتغون کی واؤ ضمیر سے بدل ہے۔ یعنی جو اللہ تعالیٰ کی قریبی ہیں وہ بھی اللہ تعالیٰ کی قرب کیلئے وسیلہ ڈھونڈتے ہیں تو جو قریبی نہیں ہیں انکی کیا کیفیت ہوگی۔ زجاج نے اسی طرح لکھا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اسکا معنی یہ ہے کہ وہ اس شخص کو تلاش کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کا سب سے زیادہ قریبی ہو۔ پھر اسکا وسیلہ پکڑتے ہیں۔ یا یبتغون الوسیلہ کے ضمن میں یحرصون کا معنی ہے۔ گویا یوں معنی ہے کہ وہ شدید خواہش کرتے ہیں کہ کس عمل کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے زیادہ قریب ہو سکتے ہیں۔ یہ طاعت اور نیکی کی زیادتی کی ساتھ قرب حاصل کیا جاسکتا ہے۔

[3] جن کو یہ معبود سمجھتے ہیں وہ تو خود اللہ تعالیٰ کی رحمت کی امید رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرتے ہیں تو وہ عقل کے دشمن انہیں خدا کیسے گمان کرتے ہیں۔

[4] تمہارے رب کا عذاب یقیناً ایسا ہے کہ اس سے ہر شخص ڈرے حتیٰ کہ پیغمبر اور ملائکہ بھی۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں مطلب یہ ہے کہ جنہیں تم خدا گمان کرتے ہو جیسے ملائکہ' مسیح علیہ السلام اور عزیز علیہ السلام یہ تو تمہاری تکلیف دور کرنے پر قادر ہی نہیں ہیں (1) وہ تو خود اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پہنچنے کیلئے قریبی وسیلہ تلاش کرتے ہیں۔ ابن عباس اور مجاہد فرماتے ہیں عیسیٰ آپکی والدہ' حضرت عزیز' ملائکہ' سورج' چاند اور ستارے اپنے رب کی بارگاہ کی طرف وسیلہ ڈھونڈتے ہیں اور اپنے رب کی رحمت کی امید رکھتے ہیں اور اسکے عذاب سے ڈرتے ہیں۔ امام بغوی فرماتے ہیں مشرکین کو ایک دفعہ شدید قحط لاحق ہوا حتیٰ کہ انہوں نے مردار کھائے پھر انہوں نے نبی کریم صلی

1۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 328 (فراس)

اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں استغاثہ کیا کہ آپ انکے لیے دعا فرمائیں تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی(1)۔

وَ اِنْ مِّنْ قَرْیَةٍ اِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوْهَا قَبْلَ یَوْمِ الْقِیٰمَةِ اَوْ مُعَذِّبُوْهَا عَذَابًا شَدِیْدًا ؕ كَانَ ذٰلِكَ فِی الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا ۝۵۸

''اور کوئی ایسی بستی نہیں ہے مگر ہم اسے برباد کر دیں گے روز قیامت سے پہلے یا اسے سخت عذاب دیں گے 1؎ یہ فیصلہ کتاب (تقدیر) میں لکھا ہوا ہے 2؎''

1؎ جب اس بستی کے رہائش کفر کرتے ہیں اور میرے حکم کی سرتابی کرتے ہیں۔ مقاتل وغیرہ فرماتے ہیں مھلکوھا مومنین کے حق میں ہے یعنی مومنین کو ہم موت کی ساتھ ہلاک کرتے ہیں اور معذبوھا کا تعلق کفار کے ساتھ ہے۔ یعنی کفار کو ہم مختلف عذابوں سے دوچار کریں گے۔ ابن مسعود فرماتے ہیں جب کسی بستی میں زنا اور سود کا سلسلہ عام ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس بستی کی ہلاکت کا حکم فرماتے ہیں(2)۔

2؎ لوح محفوظ میں یہی لکھا ہوا ہے۔ حضرت عبادہ بن الصامت فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سب سے پہلے جس چیز کو تخلیق فرمایا وہ قلم تھا، پھر قلم کو فرمایا لکھ، قلم نے کہا کیا لکھوں، فرمایا تقدیر لکھ۔ پس قلم نے وہ بھی لکھا جو ہو چکا تھا اور وہ بھی لکھا جو ابد تک ہونے والا تھا(3)۔ اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے اور فرمایا یہ حدیث سند کی اعتبار سے غریب ہے۔

طبرانی اور حاکم نے ابن عباس اور طبرانی اور ابن مردویہ نے ابن الزبیر سے روایت کی ہے کہ اہل مکہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ آپ صفا کی پہاڑی کو سونا بنادیں اور یہ پہاڑ دور کر دیں تا کہ ہم کھیتی باڑی کریں تو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف وحی فرمائی کہ اگر آپ چاہیں تو میں انکو مہلت دے دوں اور اگر آپ چاہیں تو انکا مطالبہ پورا کر دوں۔ لیکن اگر یہ پھر بھی ایمان نہ لائے تو میں انکو ہلاک کر دوں گا جیسے میں نے ان سے پہلے منکروں کو ہلاک کیا تھا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عرض کی یا اللہ انہیں مہلت عطا فرما دے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی(4)۔

وَمَا مَنَعَنَاۤ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰیٰتِ اِلَّاۤ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ ؕ وَ اٰتَیْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا ؕ وَ مَا نُرْسِلُ بِالْاٰیٰتِ اِلَّا تَخْوِیْفًا ۝۵۹

''اور نہیں روکا ہمیں اس امر سے کہ ہم بھیجیں (کفار کی تجویز کردہ) نشانیاں 1؎ مگر اس نے کہ جھٹلایا تھا ان نشانیوں کو پہلوں نے (اور وہ فوراً تباہ کر دیے گئے تھے) 2؎ اور ہم نے دی تھی قوم ثمود کو ایک اونٹنی جو روشن نشانی تھی پس انہوں نے زیادتی کی اس پر 3؎ اور ہم نہیں بھیجتے ایسی نشانیاں مگر لوگوں کو (عذاب سے) خوفزدہ کرنے کے لیے 4؎''

1؎ کفار جن معجزات ونشانیوں کا مطالبہ کرتے ہیں ان کے بھیجنے سے ہمیں کوئی امر مانع نہیں ہے۔ ترک ارسال الآیات کیلئے منع کا لفظ استعارۃً استعمال کیا گیا ہے۔ اور ان موصول حرفی اپنے صلہ کے ساتھ ملکر منع کا مفعول ثانی ہے۔ اس لئے محل نصب میں ہے۔

2؎ یعنی سابقہ امتوں کے کفار جو طبع اور سوچ میں کفار مکہ کی طرح تھے۔ وہ ایسی تجویز کردہ نشانیاں دیکھ کر بھی ایمان نہ لائے تو وہ حرف

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 134 (التجاریۃ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 135 (التجاریۃ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 135 (التجاریۃ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 135 (التجاریۃ)

غلط کی طرح صفحہ ہستی سے مٹا دیئے گئے۔ اگر ہم نے انکے مطالبے کے پیش نظر نشانیاں بھیجیں اور یہ ایمان نہ لائے جس طرح پہلے کفار ایمان نہ لائے تھے تو یہ بھی ہلاک کردیے جائیں گے۔ جس طرح پہلے لوگ ہلاک کردیے گئے تھے۔ کیوں کہ پہلی امتوں کے متعلق ہمارا یہی دستور رہا ہے کہ جب وہ اپنی تجویز کردہ نشانیوں کے باوجود بھی ایمان نہ لاتے تو ہم انہیں تہس نہس کردیتے لیکن ہم نے اس امت مرحومہ (امت محمدیہ) کو مہلت دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ أَدْهَىٰ وَأَمَرُّ ۞۔ بلکہ ان کے وعدہ کا وقت (روز) قیامت ہے اور قیامت بڑی خوفناک اور تلخ ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے ان چند ہلاک شدہ قوموں کا ذکر فرمایا ہے جنہوں نے اپنی تجویز کردہ نشانیاں دیکھ کر بھی ایمان قبول نہیں کیا تھا۔

۲؎ ہم نے قوم ثمود کے مطالبہ پر اونٹنی کا روشن معجزہ انہیں دکھایا تو انہوں نے اسکا انکار کیا۔ یا انہوں نے اسکی کونچیں کاٹ کر اپنی اوپر ظلم کیا تو وہ ہلاک ہوگئے۔

۳؎ ہم کفار کی تجویز کردہ نشانیاں عذاب سے ڈرانے کیلئے بھیجتے ہیں۔ الآیات سے پہلے باء زائدہ ہے۔ اگر لوگ دنیوی عذاب سے نہیں ڈرتے تو ان پر عذاب نازل ہوجاتا ہے۔ یا یہ معنی کہ ہم معجزات یا آیات قرانیہ عذاب آخرت سے ڈرانے کیلئے بھیجتے ہیں۔

تخویفاً ترکیب نحوی کے اعتبار سے مفعول لہ ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ بالآیات حال ہو اور مفعول محذوف ہو۔ یعنی ہم اپنے رسولوں کو آیات دیکر عذاب آخرت سے ڈرانے کیلئے بھیجتے ہیں۔

وَإِذْ قُلْنَا لَكَ إِنَّ رَبَّكَ أَحَاطَ بِالنَّاسِ ۚ وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِي أَرَيْنَاكَ إِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُونَةَ فِي الْقُرْآنِ ۚ وَنُخَوِّفُهُمْ فَمَا يَزِيدُهُمْ إِلَّا طُغْيَانًا كَبِيرًا ۞

"اور یاد کرو جب ہم نے کہا تھا آپ کو کہ بیشک آپ کے پروردگار نے گھیرے میں لے لیا ہے لوگوں کو۱؎ اور نہیں بنایا ہم نے اس نظارہ کو جو ہم نے دکھایا تھا آپ کو مگر آزمائش لوگوں کے لیے۲؎ نیز (آزمائش بنایا) اس درخت کو جس پر لعنت بھیجی گئی ہے قرآن میں۳؎ اور ہم انہیں (نافرمانی کے انجام سے) ڈراتے رہتے ہیں پس نہ بڑھایا اس ڈرانے نے انہیں مگر یہ کہ وہ زیادہ سرکشی کرنے لگے ہیں۴؎"

۱؎ یعنی ذات علم اور قدرت کے ذریعہ سے تمام لوگوں کو گھیرے میں لیے ہوا ہے۔ آپ تبلیغ کا فریضہ ادا کرتے رہئے اور کسی کی پرواہ نہ کیجئے۔ یا یہ معنی ہے کہ ہم نے قریش کو ہلاک کردیا ہے یہ احاط بھم العدو سے مشتق ہے۔ یہ واقعہ بدر کی بشارت ہے اور لفظ ماضی سے تعبیر یقینی وقوع کی وجہ سے ہے۔

۲؎ ابو یعلی نے ام ہانی، ابن منذر اور انہوں نے حضرت الحسن سے روایت کیا ہے۔ کہ جس رات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سیر کرائی گئی تو صبح قریش کے سامنے آپ سارا واقعہ بیان فرما رہے تھے تو قریش مذاق کررہے تھے۔ انہوں نے آپ سے اس سیر کی نشانی طلب کی کہ آپ بیت المقدس کی کیفیت بیان کریں۔ تو آپ نے انکے ایک قافلے کا ذکر فرمایا۔ ولید بن المغیرہ سب کچھ صحیح سن کر کہنے لگا یہ تو جادوگر ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس وقت یہ ارشاد نازل فرمایا (وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِي أَرَيْنَاكَ إِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ)(1) اور ہم نے لیلۃ

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 345 (العلمیہ)

المعراج میں جو آیات اور نشانیاں آپ کو دکھائیں تھیں انکو ہم نے لوگوں کیلئے آزمائش بنادیا۔ کیونکہ کفار مکہ نے انکا انکار کیا تھا اور کچھ مسلمان بھی مرتد ہو گئے تھے۔ اسی آیت کریمہ کی وجہ سے بعض علماء سے فرمایا کہ معراج خواب میں ہوئی تھی۔ آپ کے بدن کے بغیر صرف روح کو سیر کرائی گئی تھی جیسا کہ ہم نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا قول ذکر کیا ہے۔ اور حضرت امام بخاری کی حدیث بھی ان کی تائید کرتی ہے۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں یہاں رؤیا سے مراد عالم بیداری میں آنکھ کے ساتھ دیکھنا ہے۔ سعید بن جبیرؒ حسنؒ مسروقؒ قتادہؒ مجاہدؒ عکرمہؒ ابن جریج اور اکثر مفسرین کا یہی قول ہے۔ اہل عرب بھی رویت کا لفظ آنکھ سے دیکھنے کیلئے استعمال کرتے ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دو معراج ہوئے۔ ایک معراج آنکھ کی رویت کے ساتھ تھا اور ایک معراج رویت قلب کے ساتھ تھا(1)۔

ابن مردویہ حضرت امام الحسین بن علی رضی اللہ عنہما سے روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن پریشان تھے پوچھا گیا یارسول اللہ پریشانی کی کیا وجہ ہے؟ فرمایا میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ بنی امیہ میرے اس منبر پر باری باری آرہے ہیں۔ عرض کی گئی یارسول اللہ یہ دنیا ہے جو انہیں پہنچ جائے گی۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی(2)۔ فتنہ سے مراد بنوامیہ کے دور کی بدعات اور فسق و فجور کے امور ہیں۔ ابن جریر نے سہل بن سعد کی حدیث روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ بنی فلاں آپ کے منبر پر بندروں کی طرح کود رہے ہیں۔ تو آپ کو اس واقعہ سے رنج ہوا۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی(3)۔ ابن ابی حاتم نے عمرو بن عاص سے اور یعلی بن مرہ سے یہی حدیث روایت کی ہے۔ ابن ابی حاتمؒ ابن مردویہ اور بیہقی نے الدلائل میں سعید بن المسیب سے مرسلاً روایت کی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنوامیہ کو منبروں پر دیکھا تو آپ کو اس سے پریشانی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو وحی فرمائی کہ انکو یہ دنیا عطا کی گئی ہے۔ پس آپ کی آنکھوں کو سکون مل گیا(4)۔

یہ تمام احادیث ضعیف ہیں۔ علماء کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ اس الرؤیا سے مراد وہ خواب ہے جو آپ نے حدیبیہ کے سال دیکھا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کے ہمراہ مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فوراً مکہ شریف کی طرف وقت سے پہلے چل پڑے تو مشرکین نے آپ کا راستہ روک لیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو مکہ مکرمہ میں داخل ہونے کی خبر دے چکے تھے۔ اسکے بعد آپ کو راستہ سے لوٹنا پڑا تو یہ لوٹنا بعض لوگوں کیلئے شک اور آزمائش کا موجب بنا حتیٰ کہ آئندہ سال مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ ۚ (اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کے خواب کو سچ کر دکھایا)۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں اس روایت میں نظر ہے کیونکہ یہ آیت مکی ہے اور حدیبیہ کا واقعہ ہجرت کے بعد کا ہے۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ آپ نے خواب مکہ میں دیکھا ہو اور بیان مدینہ طیبہ میں اسوقت کیا ہو۔ میں کہتا ہوں یہ بھی درست نہیں ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں شاید اس خواب کا تعلق واقعہ بدر سے ہو جیسا کہ ارشاد ہے وَاِذْ يُرِيْكَهُمُ اللّٰهُ فِيْ مَنَامِكَ قَلِيْلًا ۔

روایت ہے کہ جب آپ پانی پر دارد ہوئے تو فرمایا گویا میں اس قوم کی قتل گاہوں کو دیکھ رہا ہوں، فلاں یہاں قتل ہوگا، فلاں یہاں قتل ہوگا۔ قریش نے یہ سنا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مذاق اڑانے لگے(5)۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد4، صفحہ135 (التجاریہ)
2۔ الدر المنثور، جلد4، صفحہ346 (العلمیہ)
3۔ الدر المنثور، جلد4، صفحہ346 (العلمیہ)
4۔ الدر المنثور، جلد4، صفحہ346 (العلمیہ)
5۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ379 (فراس)

ے شجرۃ سے مراد زقوم کا درخت ہے اور اسکا عطف الرؤیا پر ہے۔ یعنی ہم نے الشجرۃ الملعونۃ کو لوگوں کیلئے آزمائش بنایا۔ امام بغوی فرماتے ہیں یہ درخت دو اعتبار سے آزمائش تھا۔

(1) ابوجہل نے کہا ابن کبشہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ایک طرف تو تمہیں آگ سے ڈراتے ہیں کہ وہ پتھروں کو بھی جلا کر راکھ کر دے گی۔ پھر کہتے ہیں اس میں زقوم کے درخت بھی ہونگے۔ اور تم جانتے ہو کہ آگ درختوں کو جلا دیتی ہے۔ اس نادان کو یہ سمجھ ہی نہ آئی کہ جو سمندل کی بہشت کی کھال کو آگ میں جلنے سے محفوظ رکھنے پر قادر ہے اور جس نے شتر مرغ کے پیٹ میں یہ صلاحیت پیدا کی ہے کہ وہ لوہے کے گرم ٹکڑوں کو نگل جائے تو اسے کچھ بھی نہیں ہوتا تو کیا وہ اس پر قادر نہیں ہے کہ وہ آگ میں ایسا درخت پیدا فرما دے جو جلے نہیں۔ تفسیر مدارک میں ہے کہ سمندل ترکستان کے علاقہ کا ایک جانور ہے جس کی کھال سے رومال بنائے جاتے ہیں۔ جب وہ میلے ہو جاتے ہیں تو انہیں آگ میں ڈالا جاتا ہے۔ تو اس طرح انکی میل دور ہو جاتی ہے اور رومال صحیح سلامت بچ جاتا ہے اس پر آگ کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ قاموس میں ہے کہ سمندل ایک پرندہ ہے جو ہندوستان کے علاقہ میں پایا جاتا ہے جسے آگ نہیں جلاتی۔

(2) ابن زبعری نے کہا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں زقوم سے ڈراتا ہے۔ اور ہم زقوم کا مفہوم مکھن اور خشک کھجور ہی جانتے ہیں۔ ابوجہل نے اپنی لونڈی کو پکارا تعالی زقیمنا ہمارے لیے زقوم لے آ تو وہ مکھن اور چھوارے لے آئی۔ اس نے کہا اے میری قوم زقوم کھاؤ یہی تو ہے جس سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں ڈراتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے زقوم کا ذکر سورۃ الصافات میں فرمایا ہے(1)۔

ابن ابی حاتم اور البیہقی نے البعث میں ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے زقوم کا ذکر فرمایا اور قریش قبیلہ کو اس سے ڈرایا تو ابوجہل نے کہا کیا تم جانتے ہو، یہ زقوم کیا ہے، جس سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں ڈراتے ہیں؟ لوگوں نے کہا نہیں۔ تو اس نے کہا عجوہ کھجور مکھن کے ساتھ ملا کر یثرب میں کھائی جاتی ہے۔ اگر ہمیں زقوم مل جائے تو ہم اسے ضرور کھائیں گے تو اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِي الْقُرْاٰنِ۔ اور یہ بھی نازل فرمایا اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ ﴿۴۳﴾ طَعَامُ الْاَثِیْمِ ﴿۴۴﴾۔ لعنت کی نسبت درخت کی طرف کی گئی ہے۔ لیکن اسکا مطلب یہ ہے کہ اسکو کھانے والے پر لعنت ہے۔ مبالغہ کیلئے مجاز اً لعنت کو درخت کی صفت ذکر کیا گیا ہے یا اس لئے اس کو درخت کو ملعونہ فرمایا کیونکہ وہ جہیم کی گہرائی میں ہے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے بہت دور ہے۔ یا اس لئے اسے ملعونہ فرمایا کیونکہ یہ ناپسندیدہ اور تکلیف دہ ہے۔ عرب ہر ناپسندیدہ اور نقصان دہ کھانے کو ملعون کہتے ہیں۔ الشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ کی تاویل شیطان، ابوجہل حکم بن العاص سے بھی کی گئی ہے۔

ے اور ہم انہیں مختلف قسم کے عذابوں سے ڈراتے ہیں۔ لیکن ہمارا ڈرانا ان میں کچھ اثر نہیں کرتا انکی سرکشی اور تکبر ہی بڑھتا جاتا ہے۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ ؕ قَالَ ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِیْنًا ﴿۶۱﴾

"اور یاد کرو جب ہم نے حکم دیا فرشتوں کو کہ سجدہ کرو آدم کو تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے اس نے کہا کیا میں سجدہ کروں اس (آدم) کو جس کو تو نے کیچڑ سے پیدا کیا ہے۔"

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 136 (التجاریہ)

۱؎ اس آیت کریمہ میں طینا کو نصب یا تو حرف جر کے حذف کے ساتھ ہے یا تمیز ہونے کی وجہ سے ہے اور اسکو ضمیر عائد محذوف سے اہل بنانا بھی جائز ہے۔ اصل عبارت یوں ہوگی خلقته وهو طين یہ حمل ما کان کے اعتبار سے ہے یا یہ وهو من طين تھا۔ مختلف وجوہ پر اس میں انکار کی علت کی طرف اشارہ ہے۔ بغوی فرماتے ہیں سعید بن جبیر نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اس طرح پیدا فرمایا کہ زمین سے میٹھی اور نمکین مٹی سے ایک مٹھی مٹی کی اٹھائی۔ پھر اس سے آدم علیہ السلام کو تخلیق فرمایا۔ پھر جو میٹھی مٹی سے پیدا ہوا وہ سعید ہے، اگرچہ اسکے والدین کافر بھی ہوں اور جو نمکین مٹی سے پیدا ہوا وہ بدبخت ہے، اگرچہ وہ انبیاء کا ہی بیٹا ہے(1)۔

امام احمد، ترمذی، ابوداؤد، حاکم اور نے ابوموسیٰ اشعری سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو ایک مٹھی مٹی سے پیدا کیا جو اس نے تمام زمین سے لی تھی۔ اس لیئے آپ کی اولاد زمین کے مختلف رنگوں پر پیدا ہوئی ہے۔ کوئی سرخ ہیں کوئی سفید، کوئی کالے اور کوئی گندمی ہیں۔ کچھ نرم مزاج اور کچھ سخت طبیعت ہیں۔ کچھ خبیث اور کچھ نیک ہیں(2)۔

قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِيْ كَرَّمْتَ عَلَيَّ ۫ لَىِٕنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗۤ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۶۲﴾

"اس نے کہا مجھے بتا یہ (آدم) جسکو تو نے مجھ پر فضیلت دی ہے ۱؎ (اسکی وجہ کیا ہے) اگر تو مجھے مہلت دے روز قیامت تک تو جڑ سے اکھیڑ پھینکوں گا اسکی اولاد کو ۲؎ سوائے چند افراد کے ۳؎"

۱؎ اَرَءَيْتَكَ میں کاف خطاب کی تاکید کیلئے ہے، اعراب میں اس کا کوئی محل نہیں ہے۔ هٰذَا اَرَءَيْتَكَ کا مفعول اول ہے اور موصول اسکی صفت ہے اور مفعول ثانی حذف کیا گیا ہے کیونکہ موصول کا صلہ اس پر دلالت کر رہا ہے۔ معنی یہ ہے کہ تو مجھے اس کے متعلق بتا تو سہی جسے تو نے مجھ پر فضیلت دی ہے اور تو نے مجھے اسے سجدہ کرنے کا حکم دیا ہے مجھے بتا کہ تو نے اسے مجھ پر کیوں فضیلت دی ہے۔

۲؎ اَخَّرْتَنِ کو ابن کثیر نے دونوں حالتوں میں یاء کو قائم رکھا ہے۔ اور نافع اور ابوعمرو نے صرف وصل کی صورت میں قائم رکھا ہے اور دوسرے قراء نے دونوں حالتوں میں یاء کو حذف کیا ہے۔ معنی یہ ہے کہ اگر تو مجھے مہلت دے قیامت تک ولئن اخرتن۔ یہ مستقل کلام ہے اس پر لام قسم کا شعور دیتا ہے اور اسکا جواب لاحتنكن ذريته ہے۔ میں اسکی اولاد کو گمراہ کر کے راہ راست سے اکھاڑ کر پھینک دوں گا یہ احتنک الجراد الزرع سے مشتق ہے جس کا معنی ہے ٹڈی کھیت کو چٹ کر گئی۔ یا اسکا معنی ہے کہ میں جیسے چاہوں گا انکی قیادت کروں گا اور ان پر مکمل طور پر کنٹرول رکھوں گا۔ یہ اس صورت میں عربوں کے قول حنک الدابه سے مشتق ہوگا جس کا مطلب ہے سواری کے نیچے والے جبڑے کو رسی سے سخت کر کے باندھ دینا۔ قاموس میں ہے احتنکه استولى عليه والجراد اكلت ماعليها۔ یعنی اس نے اس پر مکمل غلبہ حاصل کر لیا اور ٹڈی نے کھیت کا صفایا کر دیا۔

۳؎ یعنی معصومین جنکی اللہ تعالیٰ نے استثناء فرمائی ہے ان پر میرا بس نہیں چلے گا ارشاد فرمایا اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ "(3)۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں شیطان نے فرشتوں کے قول اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا سے استنباط کر کے یا انسان کی قوتوں کو دیکھ کر سمجھ لیا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 136 (التجاریۃ)　2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 120 (وزارت تعلیم)　3۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 379 (فراس)

تھا کہ اسکو بھٹکانا آسان ہے۔ انسان کی تخلیق میں وہم، غضب اور شہوت کی قوتیں رکھی گئی ہیں۔

قَالَ اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَإِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُورًا ﴿۶۳﴾

"اللہ تعالیٰ نے فرمایا جا چلا جا (جو مرضی ہو کر) سو جو تیری پیروی کریگا ان سے تو بے شک جہنم ہی تم سب کی پوری پوری سزا ہے[۱]"

[۱] یہ شیطان کو دھتکارنا ہے اور اسے کھلی چھٹی دینا ہے کہ جو دل میں آئے کر پھر اس سزا کا ذکر فرمایا جو اسکی سیاہ کاریوں پر اسے ملے گی۔ فرمایا یعنی اے لعین تیری اور تیرے پیروکاروں کی جزاء جہنم ہے یہاں غائب پر مخاطب کو غلبہ دیا گیا ہے۔ اس لئے خطاب کی ضمیر ذکر فرمائی ہے۔ اور جزاء موفورا۔

[۲] یہ عربوں کے قول وفر لصاحبک عرضہ سے مشتق ہے۔ اور جزاء کو نصب فعل مضمر کے مصدر ہونے کی وجہ سے ہے یا حال موطیہ ہے موفوراً کا۔

وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَأَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ وَشَارِكْهُمْ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ وَعِدْهُمْ ۚ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطَانُ إِلَّا غُرُورًا ﴿۶۴﴾

"اور گمراہ کرنے کی کوشش کر جن کو تو گمراہ کر سکتا ہے ان میں سے اپنی آواز (کی فسوں کاری) سے [۱] اور دھاوا بول دے ان پر [۲] اپنے گھوڑ سواروں اور پیادہ دستوں کے ساتھ [۳] اور شریک ہو جا ان کے مالوں میں اور اولاد میں [۴] اور ان سے جھوٹے وعدے کرتا رہ [۵] اور وعدہ نہیں کرتا ان سے شیطان مگر مکر وفریب کا [۶]"

[۱] وَاسْتَفْزِزْ یعنی پھسلا دے، بے وقوف بنادے، حقیر بنادے۔ قاموس میں اس کا معنی لکھا ہے کہ اس نے اسکو ذلیل کر کے گھر سے نکال دیا۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا اسکا معنی ہے تو انہیں معصیت کی طرف بلا کر گمراہ کر لے۔ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی طرف دعوت دینے والا شیطان کا لشکری ہے، ازہری فرماتے ہیں ان کو اپنی دعوت کے ساتھ اپنی طرف پھسلا لے۔ مجاہد فرماتے ہیں صوت سے مراد یہ ہے کہ تو انہیں گانے اور مزامیر کے ذریعے بلا لے(۱)۔

[۲] جلب کا معنی ہے کسی کو پنڈلی سے کھینچ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا۔ قاموس میں یہی معنی درج ہے۔ حدیث میں بھی اسی معنی میں یہ لفظ استعمال ہوتا ہے لا جلب۔ نہایہ میں ہے کہ جلب دو چیزوں میں ہوتا ہے۔ (1) زکوۃ وصول کرنے کیلئے کسی جگہ پہنچ کر لوگوں کی طرف پیغام بھیج دے کہ وہ اپنی زکوۃ اسے پہنچائیں۔ اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا اور حکم دیا کہ لوگوں کے صدقات انکے گھروں اور کنوؤں پر وصول کرو اور (2) دوسری صورت جلب کی یہ ہے کہ مقابلہ کے وقت آدمی اپنے گھوڑے کے پیچھے کسی کو لگا دے تا کہ وہ اسے شور کر کے دوڑائے۔ پس اس سے بھی منع کیا گیا ہے۔ قاموس میں ہے اجلب علی الفرس۔ گھوڑے کو ہانکا۔ جلبہ کا معنی آواز بھی ہے۔ قاموس میں ہے رعد فجلب۔ یعنی گرجا اور چیخا۔ حدیث زبیر میں ہے یقود الجیش ذا الجلب۔ یعنی وہ گرجنے والے لشکر کی قیادت کرتا ہے۔ قتیبی کہتے ہیں یہ جلبہ کی جمع ہے جسکا معنی آوازیں ہے۔ الجلب کا معنی جمع ہونا بھی ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 136 (التجاریہ)

نہایہ میں ہے اجلبوا علیه۔ وہ اس پر جمع ہو گئے۔ اَجْلَبَهُ اس نے اسکی اعانت کی۔

حدیث العقبہ میں ہے تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کرتے ہو کہ تم عرب وعجم سے جمع ہو کر جنگ کرو گے۔ اس حدیث میں مجلبۃ بمعنی مجتمعۃ استعمال ہوا ہے۔ آیت کا معنی یہ ہے کہ اپنے مکر وفریب اور گھوڑ سواروں اور پا پیادہ دستوں کو جمع کرے۔ یا یہ معنی کہ انکو گناہوں پر برانگیختہ کر لے۔ یا یہ معنی کہ انکو گناہوں کی طرف کھینچ کر لے جا یہ کہ انکی گناہوں پر اعانت کر۔

۳؎ یعنی اپنے گھوڑ سواروں اور پا پیادہ لشکروں سے۔ انکے خلاف مدد طلب کر۔ مفسرین فرماتے ہیں گناہوں میں سوار ہو کر یا پیدل چل کر گن رہنے والا ابلیس کا سپاہی ہے۔ مجاہد اور قتادہ فرماتے ہیں کہ شیطان کے جنوں اور انسانوں میں سے گھوڑ سوار اور پا پیادہ لشکر ہیں۔ یعنی ہر وہ شخص جو گناہوں میں جنگ کرتا ہے(1)۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں اسکا معنی یہ ہے کہ تو اولادِ آدم کو گمراہ کر خواہ وہ سوار ہیں یا پیدل ہیں' اور یہ بھی جائز ہے کہ شیطان کو گمراہ شخص پر تسلط کی تمثیل ہو۔ کہ وہ اس شخص کی طرح ہے جو کسی بستی پر اپنے لشکریوں کے ساتھ حملہ کرتا ہے اور اسے نیست ونابود کر دیتا ہے۔ حضرت حفص نے رجلک کو جیم کے کسرہ کے ساتھ، باقی قراء نے جیم کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ دونوں لغتیں ہیں(2)۔

۴؎ انکو حرام کی کمائی' حرام کا مال جمع کرنے اور حرام کے راستہ پر خرچ کرنے پر برانگیختہ کر۔ مجاہد' الحسن' اور سعید بن جبیر نے اسکا یہی مفہوم بیان کیا ہے۔ عطاء فرماتے ہیں اس سے مراد سود ہے۔ اور مشرکین جن جانوروں کو حرام کرتے تھے۔ مثلاً بحیرہ' سائبہ' وصیلہ اور حام وغیرہ۔ الضحاک فرماتے ہیں وہ جانور جن کو وہ اپنے بتوں کیلئے ذبح کرتے تھے(3)۔ اور والاولاد کے متعلق ابن عباس سے مروی ہے کہ اس سے مراد زندہ درگور کی گئی اولاد ہے۔ مجاہد اور الضحاک فرماتے ہیں زانیوں کی اولاد۔ حسن اور قتادہ فرماتے ہیں جنہوں نے اپنی اولاد کو نصرانی' یہودی اور مجوسی بنایا۔ حضرت ابن عباس سے ایک دوسری روایت ہے کہ اس سے مراد اولاد کے نام عبدالحارث' عبدالشمس' عبدالعزیٰ اور عبدالدار وغیرہ رکھنا ہے۔ جعفر بن محمد علیہما السلام سے مروی ہے کہ شیطان ایک انسان کے ذکر پر بیٹھ جاتا ہے۔ پس وہ انسان بسم اللہ نہیں پڑھتا تو وہ بھی عورت کے ساتھ صحبت کرتا ہے اور مرد کی طرح عورت کی فرج میں انزال کرتا ہے۔ بعض اخبار میں ہے کہ تم میں مغربین ہیں' پوچھا گیا مغربین سے کون مراد ہیں فرمایا جن میں جن شریک ہوتے ہیں(4)۔

ویعدھم

۵؎ ان سے جھوٹے وعدے کر جیسے بت شفاعت کریں گے' اپنے آباء کی کرامت پر بھروسہ کرو، توبہ میں تاخیر کرو۔ کوئی جنت ہے نہ دوزخ، نہ قیامت۔

اگر کوئی یہ کہے کہ شیطان کو ایسا حکم دینا معصیت کا حکم ہے اور اللہ تعالیٰ برائی اور معصیت کا حکم نہیں دیتا تو ہم کہیں گے یہ امر تہدید (دھمکی دینا) کے معنی میں ہے جیسے فرمایا اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ (جو چاہو کرو) یا اہانت کیلئے ہے۔ یعنی یہ میری بادشاہی میں تیرے باطل وعدے کچھ خلل نہیں ڈال سکتے۔

۶؎ یہ اسکے مواعید باطلہ کا بیان ہے۔ غرور کا معنی ہے باطل کو اس طرح مزین کرنا کہ وہ حق دکھائی دے۔

امام بغوی آثار میں فرماتے ہیں جب ابلیس کو زمین کی طرف نکالا گیا تو اس نے کہا اے میرے رب تو نے مجھے جنت سے آدم علیہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 137 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 379 (فراس)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 137 (التجاریہ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 137 (التجاریہ)

السلام کی وجہ سے نکالا ہے۔ پس اب مجھے اس پر اور اسکی اولاد پر مسلط کر دے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تو مسلط ہے۔ ابلیس نے کہا میں تیرے بغیر تو یہ طاقت نہیں رکھتا، کچھ میرے لیے اضافہ فرما۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ الایۃ آدم علیہ السلام نے عرض کی یا رب تو نے مجھ پر اور میری اولاد پر ابلیس کو مسلط کر دیا ہے اور میں تیرے بغیر اس سے بچاؤ کی طاقت نہیں رکھتا...... اللہ تعالیٰ نے فرمایا تیرا جو بھی بچہ پیدا ہوگا میں اس پر ایک محافظ مقرر کروں گا۔ آدم علیہ السلام نے عرض کی میرے لیے اضافہ فرمائیے۔ فرمایا ایک نیکی کے بدلہ دس نیکیاں عطا کروں گا۔ عرض کی کچھ مزید عطا فرمائیے۔ فرمایا توبہ کر سکتا ہے جب تک جسم میں روح ہے۔ عرض مزید اضافہ کیا جائے فرمایا یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰۤی اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا الایۃ۔ اے میرے بندو جنہوں نے زیادتیاں کی ہیں اپنی نفسوں پر مایوس نہ ہو جاؤ اللہ کی رحمت سے۔

ایک روایت میں ہے ابلیس نے عرض کی یا رب تو نے انبیاء مبعوث فرمائے اور کتابیں نازل کیں اور میرا پڑھنا کیا ہوگا فرمایا شعر، میری کتاب کیا ہوگی فرمایا اعضاء کو گدگدانا اور میرے رسول کون ہوں گے فرمایا کاہن۔ پوچھا میری رہائش کہاں ہوگی؟ فرمایا حمام۔ پوچھا میری مجلس کہاں ہوگی؟ فرمایا بازار۔ پوچھا میرا کھانا کیا ہوگا؟ فرمایا جس پر میرا ذکر نہ کیا گیا ہو۔ پوچھا میرا پینا کیا ہوگا؟ فرمایا ہر نشہ آور چیز۔ پوچھا میرا جال کیا ہے؟ فرمایا عورتیں۔ پوچھا میرا کھیل کیا ہے؟ فرمایا مزامیر (1)۔

اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ ؕ وَ كَفٰى بِرَبِّكَ وَكِیْلًا ﴿۶۵﴾

"جو میرے بندے ہیں ان پر تیرا غلبہ نہیں ہو سکتا [1] اور (اے محبوب) کافی ہے تیرا رب اپنے بندوں کی کارسازی کیلئے [2]"

[1] عبادی میں اضافت تعظیم کیلئے ہے، یعنی میرے مخلص اور وفاشعار بندوں کو اغواء کرنے کی تجھ میں قدرت نہیں ہے۔

[2] یعنی جو پناہ طلب کرتے میں اپنے رب پر توکل کرتے ہیں اور تمام امور اپنے رب کے سپرد کرتے ہیں وہ تیری فسوں کاریوں سے انکی خود حفاظت فرمائے گا۔

رَبُّكُمُ الَّذِیْ یُزْجِیْ لَكُمُ الْفُلْكَ فِی الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِكُمْ رَحِیْمًا ﴿۶۶﴾

"تمہارا رب وہ ہے جو چلاتا ہے تمہارے لیے کشتیوں کو سمندروں میں تاکہ تم تلاش کرو (بحری سفر کے ذریعہ) اسکا فضل [1] بیشک وہ تمہارے ساتھ ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے [2]"

[1] تم سمندری سفر کے ذریعہ سے نفع اٹھاؤ اور ایسا ایسا رزق تلاش کرو جو تمہارے پاس نہیں ہے۔

[2] وہ تمہارے ساتھ ہمیشہ رحیمانہ سلوک فرماتا ہے۔ اس نے تمہارے لیے ہر وہ چیز پیدا فرمادی جسکی تمہیں احتیاج تھی اور مشکل اور دشوار سفروں کو تمہارے آسان فرمادیا۔

وَ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِی الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّاۤ اِیَّاهُ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىكُمْ اِلَى الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ ؕ وَ كَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا ﴿۶۷﴾

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 137 (التجاریۃ)

"اور جب پہنچتی ہے تمہیں تکلیف سمندر میں تو گم ہو جاتے ہیں وہ (معبود) جن کو تم پکارا کرتے ہو سوائے اللہ تعالیٰ کے[1] پس جب وہ خیر و عافیت سے تمہیں ساحل پر پہنچا دیتا ہے (تو) تم روگردانی کرنے لگتے ہو[2] اور انسان (واقعی) بڑا ناشکرا ہے[3]"

[1] جب تمہیں غرق ہونے کا خوف لاحق ہوتا ہے۔ سمندر میں تو اسوقت تمہارے دلوں سے وہ سب نکل جاتے ہیں جنہیں تم معبود سمجھ کر پکارتے ہو۔ سوائے اللہ تعالیٰ کی ذات۔ اسوقت تو تمہیں اس معبود حقیقی کے علاوہ کوئی یاد ہی نہیں رہتا۔ یا یہ معنی کہ اس وقت ان بتوں سے استغاثہ بھول جاتے ہو لیکن اللہ تعالیٰ تمہاری تکلیف کو دور فرماتا ہے۔ اس دوسری تقدیر پر استثناء منقطع ہوگا۔

[2] لیکن جب وہ تمہیں غرق ہونے سے بچا کر ساحل پر پہنچا دیتا ہے۔ تو تم اسکی توحید سے روگردانی کرنے لگتے ہو۔

[3] انسان بڑا ناشکرا ہے۔ یہ اعراض کی تعلیل کی طرح ہے۔

أَفَأَمِنْتُمْ أَنْ يَخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ أَوْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ثُمَّ لَا تَجِدُوا لَكُمْ وَكِيلًا ﴿٦٨﴾

"کیا تم بےخوف ہوگئے ہو اس سے کہ اللہ تعالیٰ دھنسا دے تمہارے ساتھ خشکی کے کنارہ کو یا بھیج دے تم پر اولے برسانے والا بادل پھر اس وقت تم نہیں پاؤ گے اپنے لیے کوئی کارساز[1]"

[1] أَفَأَمِنْتُمْ میں ہمزہ انکار ہے۔ اور فا عاطفہ ہے۔ اس سے پہلے کلام محذوف ہے أَنَجَوْتُمْ فَأَمِنْتُمْ۔ یعنی کیا تم نجات پا چکے ہو اور بےخوف ہوگئے ہو؟ اس بےخوفی نے تمہیں توحید سے اعراض پر برانگیختہ کیا ہے۔ لیکن تمہیں اتنا بےخوف ہونا نہیں چاہیے تھا کیونکہ جو سمندر میں تمہیں غرق کر کے ہلاک کرنے پر قادر ہے تو وہ اس بات پر بھی قادر ہے کہ وہ خشکی کے کنارے کو دھنسا دے، جبکہ تم اسکے اوپر ہو یا خشکی کے کنارہ کو تمہارے سبب سے دھنسا دے اور تمہیں ہلاک کر دے۔ بکم یا حال ہے یا فعل کے متعلق ہے۔ یا تم پر ایسی ہوا بھیج دے جو تم پر چھوٹے چھوٹے پتھر برسائے پھر تم اپنے لیے کوئی ایسا محافظ نہ پاؤ گے جو تمہیں اس عذاب سے بچا سکے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے فعل کو کوئی رد کرنے والا نہیں ہے۔

أَمْ أَمِنْتُمْ أَنْ يُعِيدَكُمْ فِيهِ تَارَةً أُخْرَىٰ فَيُرْسِلَ عَلَيْكُمْ قَاصِفًا مِنَ الرِّيحِ فَيُغْرِقَكُمْ بِمَا كَفَرْتُمْ ۙ ثُمَّ لَا تَجِدُوا لَكُمْ عَلَيْنَا بِهِ تَبِيعًا ﴿٦٩﴾

"کیا تم اس سے بےخوف ہوگئے ہو کہ اللہ تعالیٰ تمہیں لے جائے سمندر میں دوسری مرتبہ[1] اور بھیجے تم پر سخت آندھی جو کشتیوں کو توڑنے والی ہو[2] پھر غرق کر دے تمہیں بوجہ کفر کے جو تم نے کیا[3] پھر تم نہیں پاؤ گے اپنے لیے ہم سے اس ڈبونے پر کوئی انتقام لینے والا[4]"

[1] کیا تم بےخوف ہوگئے ہو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے لیے ایسے حالات پیدا کر دے جو تمہیں سمندری سفر پر مجبور کر دیں۔

[2] ابن عباس فرماتے ہیں قاصفاً سے مراد تیز آندھی ہے۔ ابو عبیدہ فرماتے ہیں ایسی ہوا جو ہر چیز کو ریزہ ریزہ کر دے۔ قتیبی کہتے ہیں ایسی ہوا جو درختوں کو توڑ دے (1)۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 137 (التجاریۃ)

۳ یعنی تمہارے شرک کے سبب یا نجات کی نعمت کی ناشکری کے سبب تمہیں غرق کر دے۔ ابن کثیر اور ابو عمرو نے نون کے ساتھ نخسف، نرسل، نعید اور نغرقکم متکلم کے صیغے پڑھے ہیں اور باقی قراء نے یا کے ساتھ غائب کے صیغے پڑھے ہیں۔ لیکن ابو جعفر اور یعقوب نے تاء کے ساتھ تغرقکم پڑھا اور ضمیر کا مرجع الریح کو بنایا ہے۔

۴ پھر تم ہم سے اپنے لیے ڈبونے پر کوئی انتقام لینے والا نہ پاؤ گے۔ تبیعا یعنی کوئی ایسا شخص جو ہم سے بدلہ لینے کا مطالبہ کرے۔ بعض علماء فرماتے ہیں جو کوئی اس غرق پر اعتراض کرے۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ۝

"بیشک ہم نے بڑی عزت بخشی اولاد آدم کو ۱ اور ہم نے سوار کیا انہیں (مختلف سواریوں پر) خشکی میں اور سمندر میں اور رزق دیا انہیں پاکیزہ چیزوں سے ۲ اور ہم نے فضیلت دی انہیں بہت سی چیزوں پر جن کو ہم نے پیدا فرمایا نمایاں فضیلت ۳۔"

۱ ہم نے اولاد آدم کو حسن صورت، معتدل مزاج، معتدل قامت، عقل کے ساتھ تمیز کی قوت، بولنے، اشارہ کرنے اور لکھنے کے ساتھ دوسروں کو سمجھانے کی صلاحیت عطا کر کے فضیلت دی ہے۔ نیز اسباب معاش و معاد کی طرف، زمین پر پیدا ہونے والی ہر چیز پر مسلط کر تمام اشیاء انکے لیے مسخر کی گئی ہیں، صنعتوں پر قدرت اور اسباب کے استعمال پر قدرت دیکر بھی فضیلت دی ہے۔ تمام مسببات علویہ اور سفلیہ کے منافع انسان کو پہنچتے ہیں اور جانور اپنی خوراک کے حصول کیلئے اپنا سر جھکاتے ہیں، جبکہ حضرت انسان اپنی خوراک ہاتھ سے اٹھا کر منہ کی طرف لے جاتا ہے۔ اسکے علاوہ اسے عشق، معرفت، وحی اور اللہ تعالیٰ کی طرف مراتب قرب بھی عطا کیے گئے ہیں۔

حاکم نے تاریخ میں اور دیلمی نے جابر بن عبد اللہ سے روایت کیا ہے۔ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا انگلیوں کے ساتھ کھانا کرامت ہے۔

۲ اور ہم نے انہیں خشکی میں جانوروں پر اور سمندر میں کشتیوں پر سوار کیا۔ حمل، حملہ حملا سے مشتق ہے جسکا معنی ہے میں اسکے لیے ایسی چیز مقرر کی جس پر سوار ہو یا یہ معنی کہ ہم نے انہیں خشکی اور سمندر پر اٹھایا کہ وہ زمین میں دھنستے نہیں اور پانی میں غرق نہیں ہوتے۔

۳ فضل لغت میں مطلقاً زیادتی کو کہتے ہیں لیکن یہاں مراد ثواب میں اور مراتب قرب الٰہی میں زیادتی ہے۔ فضلنا میں ضمیر منصوب کا مرجع بنی آدم ہے۔ بعض افراد یعنی مومنین کے اعتبار سے جیسے اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ سے وَبُعُوْلَتُهُنَّ میں تمام مطلقہ عورتیں مراد نہیں بلکہ وہ عورتیں مراد ہیں جن سے رجوع ہو سکے۔ اس تعبیر کی وجہ یہ ہے کہ اولاد آدم میں جو کفار ہیں وہ تو اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں انتہائی خسیس، مبغوض اور خبیث ترین افراد ہیں۔ فرمایا هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ ۝ ۔ ظاہر آیت کا تقاضا یہ ہے کہ انسانوں کی فضیلت اکثر مخلوق پر ہے، تمام مخلوق پر نہیں ہے۔ اسی لیے بعض علماء فرماتے ہیں انسانوں کو ملائکہ کے علاوہ تمام مخلوق پر فضیلت ہے۔ الکلبی کہتے ہیں جبرئیل، میکائیل، اسرافیل اور ملک الموت کے علاوہ انسان کو تمام مخلوق پر فضیلت حاصل ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں انسان کو تمام مخلوق پر اور فرشتوں پر فضیلت حاصل ہے کیونکہ کبھی کبھی اکثر کو کل کی جگہ استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ۔ الی قولہ وَاَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ۔ یہاں بھی اکثر سے مراد کلہم یعنی تمام ہیں ... [illegible]

جابر کی حدیث شریف سے بھی ہوتی ہے۔ فرمایا جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام اور آپ کی اولاد کو پیدا فرمایا تو فرشتوں نے کہا اے ہمارے رب تو نے ان کو پیدا فرمایا ہے کہ یہ کھاتے ہیں پیتے ہیں، نکاح کرتے ہیں اور سوار ہوتے ہیں۔ پس انکے لیے تو دنیا کر دے اور ہمارے لیے آخرت۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں نے جیسے اپنے دست قدرت سے پیدا فرمایا ہے(1)۔ اور جس میں میں نے اپنی روح پھونکی ہے میں اسے اسکی مثل نہیں کرتا جسے میں نے کن کہہ کر پیدا فرمایا ہے۔ اس حدیث کو بیہقی نے شعب الایمان میں نقل فرمایا ہے۔ تحقیق یہ ہے کہ اولیاء اللہ عام ملائکہ سے افضل ہیں۔ لیکن عوام مومنین خطاؤں کے مٹائے جانے یا مغفرت و بخشش ہونے یا۔ اپنے گناہوں کی مقدار عقاب جھیلنے کے بعد جنت میں داخل ہونگے اور اولیاء کرام کے ساتھ لاحق ہو جائیں گے۔ اور انبیاء کرام خواص ملائکہ سے افضل ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَیْرُ الْبَرِیَّةِ ۟ (اور) یقیناً جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے وہی ساری مخلوق سے بہتر ہیں۔

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے فرماتے ہیں مومن اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان فرشتوں سے معزز ہے جو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ہیں۔ امام بغوی نے اسی طرح روایت ذکر کی ہے۔ ابن ماجہ نے یہ لفظ روایت کیے ہیں المومن اکرم علی اللہ من بعض الملائکۃ(2)۔ یعنی جنس مومن اللہ تعالیٰ کے نزدیک بعض فرشتوں سے معزز ہے۔ میں کہتا ہوں اس آیت کریمہ میں اکثر کی قید اور اسی طرح حدیث ابی ہریرہ میں بعض کی قید انبیاء کرام کی تمام ملائکہ پر فضیلت کی نفی صرف مفہوم کے اعتبار سے کرتی ہے لیکن عموم منطوق کے مقابلہ میں مفہوم کا اعتبار نہیں ہوتا۔ ارشاد ہے اُولٰٓئِكَ هُمْ خَیْرُ الْبَرِیَّةِ ۟۔

کیا آپ دیکھتے نہیں کہ آیت کا معنی یہ ہے کہ ہر مومن کو ہم نے اکثر مخلوق سے فضیلت دی ہے۔ پس یہ آیت کریمہ علماء اہل سنت کے اس قول کے منافی نہیں ہے کہ مومنین میں سے خواص فرشتوں پر حتی کہ خواص فرشتوں پر فضیلت دیئے گئے ہیں۔ اور مومنین خواص کی فرشتوں پر فضیلت کی وجہ یہ ہے کہ فرشتے طاعت پر پیدا کیے گئے ہیں، ان میں عقل ہے لیکن شہوت نہیں ہے بہائم میں بغیر عقل کے شہوت ہے۔ جبکہ انسان میں عقل بھی ہے اور شہوت بھی ہے۔ پس جو اپنے عقل کے مقتضی پر عمل کرتا ہے اور شہوت کو ترک کر دیتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے راستہ میں جہاد کرتا ہے جیسا جہاد کرنے کا حق ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ اسے چن لیتا ہے۔ ارشاد فرمایا وَ الَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ۔ (اور جو (بلند ہمت) مصروف جہاد رہتے ہیں ہمیں راضی کرنے کے لیے ہم ضرور دکھائیں گے انہیں اپنے راستے اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ (ہر وقت) محسنین کیساتھ ہے۔ لیکن جس نے اپنی شہوت کے مطابق عمل کیا اور عقل کے مقتضی پر عمل نہ کیا اور دنیا کو آخرت پر ترجیح دی پس اسکا ٹھکانا ہے۔ اور انکا ذکر قرآن سے اس طرح کیا ہے اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ۟۔ وہ حیوانوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ یہی لوگ تو غافل (و بے خبر) ہیں۔

يَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍۭ بِاِمَامِهِمْ ۚ فَمَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ فَاُولٰٓئِكَ یَقْرَءُوْنَ كِتٰبَهُمْ وَ لَا یُظْلَمُوْنَ فَتِیْلًا ۟

"وہ دن یاد جب ہم بلائیں گے تمام انسانوں کو ان کے پیشوا کے ساتھ پس وہ شخص جسکو دیا گیا اسکا نامہ عمل اسکے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 139 (التجاریہ)
2۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 291 (وزارت تعلیم)

دائیں ہاتھ میں تو یہ لوگ (خوشی خوشی) پڑھیں گے اپنا نامہ عمل اور ان پر ذرہ برابر ظلم نہیں کیا جائے گا۔"

1۔ یَوْمَ پر نصب یا تو اذکر مضمر کی وجہ سے ہے یا لَا یُظْلَمُوْنَ جس مفہوم پر دلالت کرتا ہے اسکی ظرف ہے۔

2۔ مجاہد اور قتادہ فرماتے ہیں۔ امام سے مراد انکے نبی ہیں ابو صالح اور الضحاک فرماتے ہیں۔ امام سے مراد وہ کتاب ہے جو انکی طرف نازل کی گئی تھی۔ ابن مردویہ نے حضرت علی سے روایت فرمایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قوم کو اپنے امام اور انکے رب کی کتاب کے ساتھ بلایا جائے گا۔ سعید بن جبیر حضرت ابن عباس سے روایت فرماتے ہیں کہ انہیں اس امام کے ساتھ بلایا جائے گا جو انہیں دنیا میں ہدایت یا گمراہی کی طرف بلاتا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَجَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا اور ہم نے بنا دیا انہیں پیشوا (لوگوں کے لیے) وہ راہ دکھاتے تھے ہمارے حکم سے۔

ایک اور مقام پر فرمایا وَجَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً یَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ۔ اور ہم نے بنایا تھا انہیں ایسے پیشوا جو بلا رہے تھے (اپنی رعایا کو) آگ کی طرف۔ بعض علماء فرماتے ہیں امام سے مراد انکے معبود ہیں۔ سعید بن المسیب سے مروی ہے، فرماتے ہیں ہر قوم خیر و شر میں اپنے رئیس کے پاس جمع ہوگی (1)۔ الحسن اور ابو العالیہ فرماتے ہیں امام سے مراد انکے وہ اعمال ہیں جو انہوں نے آگے بھیجے۔ قتادہ فرماتے ہیں اس کتاب کے ساتھ جس میں انکے اعمال ہونگے اور اسکی دلیل آیت کا سیاق ہے اور کتاب کو امام کہا بھی جاتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے وَكُلَّ شَیْءٍ اَحْصَیْنٰهُ فِیْۤ اِمَامٍ مُّبِیْنٍ۔ بعض علماء فرماتے ہیں امام سے مراد وہ قوتیں ہیں انہیں انکے عقائد اور افعال پر برانگیختہ کرتی تھیں۔ محمد بن کعب فرماتے ہیں امام سے مراد امہات ہے۔ یہ ام کی جمع ہے جیسے خف کی جمع خفاف ہے اور اس میں حکمت عیسیٰ علیہ السلام کی جلالت اور امام حسن اور امام حسین رضی اللہ عنہما کے شرف کا اظہار کرنا ہے۔ اور دوسری حکمت یہ کہ زنا کی اولاد کو رسوائی نہ ہو۔ امامھم ترکیب نحوی کے اعتبار سے حال ہے، یعنی ہر قوم اپنے مقتدا کے ساتھ بلائی جائے گی خواہ وہ نبی ہو یا کتاب ہو یا خیر یا شر کا رئیس ہو۔ یا اعمال کے حاملین ہوں یا انکے اعمال کے صحائف ہوں۔ یا یہ ندعوا کے متعلق ہے، یعنی ہم انکو انکے امام کے نام کے ساتھ بلائیں گے۔ کہا جائے گا اے فلاں کا گروہ، اے فلاں کے پیروکارو، اے فلاں دین والو، اے فلاں کتاب والو، اے ایسے اعمال والو، اے ابن مریم علیہا السلام اے ابن فاطمہ رضی اللہ عنہا وغیرہ۔

3۔ پس ان بلائے جانے والوں میں سے جسکو نامہ اعمال دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا تو وہ خوشی خوشی پڑھیں گے اپنا نامہ اعمال اور ان پر ذرہ برابر ظلم نہ ہوگا۔ فتیلاً مصدر کی بناء پر منصوب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان پر فتیل کی مقدار بھی ظلم نہیں کیا جائے گا۔ یا مفعول ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ کیونکہ یظلمون میں ینقصون کی تضمین ہے۔ یعنی انکے اجور میں فتیل کی مقدار بھی کمی نہیں کی جائے گی۔ فتیل اس ریشہ کو کہتے ہیں جو کھجور کی گٹھلی کے درمیان ہوتا ہے یا وہ میل جو ہاتھوں کے درمیان مل دی جاتی ہے۔ اسم اشارہ اور ضمیر کو جمع ذکر فرمایا کیونکہ من اوتی جمع کے معنی میں ہے اور دائیں ہاتھ میں کتاب دیے جانے کے ساتھ قرأت کو معلق کرنا ان پر بھی دلالت کرتا ہے جنہیں بائیں ہاتھ میں یا پیٹھ کے پیچھے نامہ اعمال دیا جائے گا۔ جب وہ اپنے اس نامہ اعمال پر مطلع ہونگے تو ان پر ایسی حیرت اور شرمندگی چھا جائے گی کہ ان کی زبانیں گنگ ہو جائیں گی، وہ پڑھیں گے نہیں بلکہ یہ کہیں گے کاش مجھے اپنا نامہ اعمال دیا ہی نہ جاتا۔ کفار اور انکے نامہ اعمال دیے جانے کا تذکرہ نہیں فرمایا کیونکہ مابعد قول میں اسکی طرف اشارہ مل جاتا ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 139 (التجاریہ)

وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿۷۲﴾

''اور جو شخص بنا رہا اس دنیا میں اندھا[1] وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا[2] اور بڑا گم کردہ راہ ہوگا[3]''

[1] بعض علماء فرماتے ہیں یہ ان نعمتوں کی طرف اشارہ ہے جنہیں رَبُّكُمُ الَّذِيْ يُزْجِيْ لَكُمُ الْفُلْكَ الی قولہ تفضیلاً کے ارشادات میں اللہ تعالیٰ نے شمار فرمایا ہے۔ یعنی جو شخص ان نعمتوں کو دیکھ کر بھی اندھا بنا ہوا ہے تو آخرت کی نعمتیں جنہیں اس نے دیکھا بھی نہیں ہے۔ ان سے بدرجہ اولیٰ اندھا ہوگا اور گمراہ ہوگا۔ یہ مفہوم حضرت ابن عباس سے مروی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ دنیا کی طرف اشارہ ہے یعنی جو اس دنیا میں دل کا اندھا ہے جیسے توحید کے روشن دلائل اور حق کا جگمگاتا راستہ نظر نہیں آتا۔

[2] بعض علماء فرماتے ہیں یہاں اَعْمٰی کا معنی تفضیل ہے اشد عمیً منه فی الدنیا ہے۔ یعنی اسے نجات کا راستہ ہی نظر نہ آئے گا۔ اگر کہا جائے کہ افعل التفضیل کیلئے رنگ، عیب کا نہ ہونا شرط ہے تو پھر یہاں کیسے تفضیل کے معنی کا اعتبار کیا گیا ہے۔ ہم کہیں گے کہ یہاں اندھے پن سے مراد دل کا اندھا ہونا ہے۔ اور افعل التفضیل کی بناء کیلئے مانع ظاہری عیب ہے (جبکہ یہاں باطنی عیب مراد ہے)

پس یہاں اَعْمٰی، احمق، اجہل اور ابلہ کی طرح ہے۔ ابو عمرو اور یعقوب نے اسی وجہ سے پہلے اَعْمٰی میں امالہ کیا ہے اور دوسرے میں امالہ نہیں کیا کیونکہ افعل التفضیل جب من کے ساتھ استعمال ہوتا ہے تو اسکا الف متوسط کے حکم میں ہوتا ہے اس میں امالہ نہیں کیا جاتا بخلاف افعل الصفۃ کے۔ لیکن ابوبکر، حمزہ اور کسائی نے دونوں حرفوں میں امالہ پڑھا ہے اور ورش نے دونوں میں بین بین پڑھا ہے اور باقی قراء نے اپنے اپنے اصول پر دونوں میں فتحہ پڑھا ہے، وہ تفضیل کے معنی کا اعتبار نہیں کرتے۔

[3] دنیا سے زیادہ آخرت میں گمراہ ہوگا کیونکہ آخرت میں تو اسکی استعداد زائل ہو چکی ہوگی اور آلہ و مہلت بھی مفقود ہونگے یعنی دنیا میں اگر توبہ کرتا تو اسکی توبہ قبول کی جاتی لیکن آخرت میں اسکی توبہ قبول نہیں ہوگی۔ یا یہ معنی کہ وہ اندھے سے بھی زیادہ گم کردہ راہ ہوگا۔

ابن مردویہ اور ابن ابی حاتم نے ابن اسحاق عن محمد بن ابی محمد عن عکرمہ عن ابن عباس کی سند سے روایت لکھی ہے، فرماتے ہیں امیہ بن خلف، ابوجہل اور قریش کے دوسرے لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہنے لگے اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ ہمارے ساتھ آیئے اور ہمارے خداؤں کو صرف ہاتھ لگا دیجئے تو ہم آپ کے ساتھ آپ کے دین میں داخل ہو جائیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قوم کے اسلام قبول کرنے کو بہت پسند فرماتے تھے(1) (تو انہوں نے یہ بات حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس لئے کہی تھی کہ آپ کو دھوکہ سے بتوں کے پاس لے جائیں لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس غلطی سے محفوظ رکھا)

وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ ۖ وَاِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا ﴿۷۳﴾

''اور انہوں نے پختہ ارادہ کیا کہ وہ آپ کو برگشتہ کر دیں اس (کتاب) سے جو ہم نے آپکی طرف وحی کی ہے[1] تاکہ آپ پر بہتان باندھ کر (منسوب کریں) ہماری طرف اسکے علاوہ تو اس صورت میں وہ آپ کو اپنا گہرا دوست بنالیں گے[2]''

[1] صاحب لباب النقول اسباب نزول میں فرماتے ہیں کہ اس آیت کے نزول کے سبب کے متعلق جو کچھ وارد ہے اس میں سے یہ حدیث اصح ترین ہے، اسکی سند جید ہے اور اسکے شواہد بھی ہیں۔

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 352 (العلمیہ)

ابن ابی حاتم نے سعید بن جبیر سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حجر اسود کو استلام فرماتے تھے۔ تو کفار نے آپ کو کہا ہم آپ کو حجر اسود کو استلام کی اجازت نہ دیں گے حتی کہ آپ ہمارے خداؤں کی طرف جھکیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سوچا اگر میں ایسا کردوں تو کیا حرج ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ میں دل سے انکا سخت مخالف ہوں(1) امام بغوی نے بھی اسی طرح کی روایت نقل کی ہے، اس میں ہے کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ مجھے جب یہ حجر اسود کے استلام کی اجازت دے دیں گے تو میں بعد میں ان سے نفرت کرتا رہوں گا۔ ابن ابی حاتم نے ابن شہاب سے بھی اسی طرح کی روایت نقل کی ہے۔ واللہ اعلم۔

ابن ابی حاتم جبیر بن نفیر سے روایت فرماتے ہیں کہ قریش نبی کریم ﷺ کے پاس آئے اور کہا اگر آپ ہماری طرف مبعوث کیے گئے ہیں تو ان گھٹیا اور غلام لوگوں کو اپنی جماعت سے نکال دیں۔ ہم آپ کے اصحاب بن جائیں گے۔ آپ کا کچھ میلان ہونے لگا تھا کہ یہ آیت کریمہ نازل فرما کر اپنے محبوب کو کفار کی حرکت سے آگاہ فرمادیا(2)۔ ابن ابی حاتم نے محمد بن کعب القرظی سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے سورۂ نجم کی آیت اَفَرَءَیۡتُمُ اللّٰتَ وَ الۡعُزّٰی پڑھی تو شیطان نے اپ کی کلام میں یہ الفاظ داخل کرنے کی کوشش کی تِلْكَ الْغَرَانِيْقُ الْعُلٰى اِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرْتَجٰى۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمادی۔ آپ ہمیشہ پریشان رہتے تھے حتی کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِکَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ وَّ لَا نَبِیٍّ اِلَّاۤ اِذَا تَمَنّٰۤی الآیۃ۔ اور نہیں بھیجا ہم نے آپ سے پہلے کوئی رسول اور نہ کوئی نبی مگر اسکے ساتھ یہ ہوا کہ جب اس نے کچھ پڑھا تو ڈال دیے شیطان نے اس کے پڑھنے میں (شکوک)(3)۔

ان احادیث میں دلیل ہے کہ یہ آیت مکی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ مدنی ہے اور اسکا سبب نزول یہ ذکر کیا ہے۔ ابن مردویہ نے العوفی عن ابن عباس کے طریق سے نقل کیا ہے کہ ثقیف قبیلہ کے لوگوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا کہ آپ ہمیں ایک سال مہلت دیں حتی کہ ہمارے بتوں کیلئے نذرانے اور ہدیئے آتے ہیں۔ جب ہم اپنے بتوں کے ان نذرانوں اور ہدیوں پر قبضہ کر لیں گے تو ہم اسلام قبول کرلیں گے۔ آپ نے انہیں مہلت دینے کا ارادہ کیا تو یہ آیت نازل ہوئی(4)۔ اس حدیث کی سند ضعیف ہے۔ امام بغوی نے یہ قصہ اس طرح ذکر کیا ہے کہ ثقیف قبیلہ کے لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور عرض کی یارسول اللہ ہم آپ کی بیعت کرتے ہیں بشرطیکہ آپ ہمیں تین کاموں کی اجازت عطا فرمائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا وہ کونسے کام ہیں؟ انہوں نے کہا ہم نماز میں رکوع نہیں کریں گے۔ ہم اپنے ہاتھوں سے اپنے بتوں کو نہیں توڑیں گے اور آپ ہمیں ایک سال تک لات کے نذرانوں سے متمتع ہونے دیں، ہم اسی عرصہ میں انکی عبادت نہیں کریں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس دین میں کوئی بھلائی نہیں جس میں نہ رکوع ہو اور نہ سجود ہو۔ رہا بتوں کو توڑنا تو یہ مرضی ہے۔ تیسری چیز لات وعزی کے نذرانوں سے متمتع ہونا اسکی میں تمہیں اجازت نہیں دے سکتا۔ قبیلہ ثقیف نے کہا یارسول اللہ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ عرب یہ سنیں کہ آپ نے ہمیں ایک ایسی اجازت عطا فرمائی ہے جو کسی اور کو نہیں عطا فرمائی۔ اور اگر آپ کو اندیشہ ہو عرب کہیں گے کہ آپ نے ثقیف کو ایسی اجازت دی ہے جو کسی اور کو نہیں دی تو آپ کہہ دیں کہ اللہ تعالیٰ نے ایسا حکم دیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے۔ آپ کے سکوت کو انہوں نے اجازت پر محمول کیا تو اللہ تعالیٰ نے وَ اِنۡ کَادُوۡا لَیَفۡتِنُوۡنَکَ الآیہ کی آیت کریمہ نازل ہوئی۔ ان مخففہ ہے اور لام فارقہ ہے۔ معنی یہ ہے کہ وہ ہمارے نازل شدہ احکام سے آپ کو پھسلا کر فتنہ میں مبتلا کرنے کے قریب تھے۔

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 352 (العلمیہ)
2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 352 (العلمیہ)
3۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 352 (العلمیہ)
4۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 352 (العلمیہ)

۲ تا کہ آپ بہتان باندھ کر ہماری طرف وہ احکام منسوب کریں جو ہم نے وحی نہیں کی۔

اگر آپ ایسا بہتان باندھیں گے تو وہ آپ کو اپنا دوست بنالیں گے۔

وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْــًٔا قَلِيْلًا ۝

"اور اگر ہم نے آپ کو ثابت قدم نہ رکھا ہوتا تو آپ ضرور مائل ہو جاتے ان کی طرف کچھ نہ کچھ ۱"

۱ یعنی اگر ہم نے آپ کو راہ حق پر مستحکم نہ کیا ہوتا تو آپ انکی خواہش کی طرف مائل ہو جاتے۔شیئا یہ مفعول مطلق ہے۔قلیلا اس پر نصب مصدر ہونے کی وجہ سے ہے۔یعنی اگر ہم آپ کو محفوظ نہ رکھتے تو آپ انکی خطرناک مکاریوں' حیلہ سازیوں کی وجہ سے اور لوگوں کے اسلام کی طرف شدید خواہش کی وجہ سے کچھ نہ کچھ آپ انکی طرف مائل ہو جاتے لیکن ہماری عصمت و دستگیری نے تجھے اس تھوڑے سے میلان سے بھی محفوظ رکھا۔ادنی سے میلان سے بھی تجھے روک لیا، چہ جائیکہ آپ شدت سے انکی طرف مائل ہونے اور نفس کے میلان سے بطریق اولی بچالیا۔یہ آیت کریمہ آپ کے کمال استقامت اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی استعداد میں صلاح پر دلالت کرتی ہے۔کیونکہ گر عصمت الہی اور تثبیت الہی شامل حال نہ ہوتی تو بھی آپ معصیت کی طرف بالکل تھوڑے سے مائل ہوتے۔اور معصیت کی طرف قلیل میلان' معصیت میں وقوع کا تقاضا نہیں کرتا۔تو پھر جب عصمت الہی نے آپ کی دستگیری فرمائی اور تھوڑے سے میلان سے بھی روک لیا ہے۔تو آپ معصیت کا کثیر ارتکاب کیسے کر سکتے ہیں۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نفس مبارک کا میلان تو معصیت سے بہت دور تھا۔آیت کریمہ صراحۃً دلالت کرتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی لوگوں کیلئے اسلام کے قبول کرنے کی شدید خواہش تھی لیکن آپ نے پھر بھی انکی درخواست کو قبول کرنے کا ارادہ بھی نہیں کیا تھا۔

اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا ۝

"(بفرض محال اگر آپ ایسا کرتے) تو اس وقت ہم آپ کو چکھاتے دوگنا عذاب دنیا میں اور دوگنا عذاب موت کے بعد پھر آپ نہ پاتے اپنے لیے ہمارے مقابلہ میں کوئی مددگار۱،۲"

۱ یعنی اگر آپ انکی طرف تھوڑے سے میلان کے قریب ہی ہوتے۔تو ہم آپ کو دوسروں کی بنسبت دنیا و آخرت کا دوہرا عذاب چکھاتے۔کیونکہ محبوب کی تھوڑی سی غلطی بھی بڑی ہوتی ہے (کوئی جتنا زیادہ عزیز ہوتا ہے اتنا ہی اسکی معمولی سی معمولی لغزش بھی ناقابل برداشت ہوتی ہے،موئے در دیدہ بود کوہ عظیم (ضیاء القرآن) اصل میں کلام عذاباً ضعفاً فی الحیوٰۃ وعذاباً ضعفاً فی الممات تھا۔پھر موصوف کا حذف کیا گیا ہے اور صفت کو اسکے قائم مقام رکھا گیا ہے۔پھر صفت کو موصوف کی طرف مضاف کیا گیا ہے۔

بعض علماء فرماتے ہیں الضعف عذاب کا اسم ہے اسکو ضعف اس لئے کہا گیا ہے کہ اس میں تکلیف زیادہ ہوتی ہے۔عذاب الحیاۃ سے مراد دنیا کا عذاب اور عذاب الممات سے مراد وہ عذاب ہے جو مرنے کے بعد ہوگا۔بعض علماء فرماتے ہیں ضعف الحیاۃ سے مراد آخرت کا عذاب ہے اور ضعف الممات سے مراد عذاب قبر ہے۔

۲ پھر آپ نہ پاتے اپنے لیے ہمارے مقابلہ میں عذاب کو دور کرنے والا مددگار۔

ابن ابی حاتم اور بیہقی نے دلائل میں شہر بن حوشب عن عبدالرحمن بن غنم کی حدیث نقل کی ہے کہ یہود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے

پاس آئے اور کہا اگر آپ نبی ہیں تو شام جائیے کیونکہ شام ارض محشر ہے اور انبیاء کی زمین ہے' تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انکی بات کی تصدیق کی اور غزوۂ تبوک پر شام کے ارادہ سے تشریف لے گئے۔ جب آپ تبوک کے مقام پر پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے سورۂ بنی اسرائیل کی یہ آیت نازل فرمائی(1)۔

وَ اِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا وَ اِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝۷۶

''اور انہوں نے ارادہ کرلیا ہے کہ پریشان و مضطرب کردیں آپ کو اس علاقہ سے تاکہ نکال دیں آپ کو یہاں سے ؎1 اور (اگر انہوں نے یہ حماقت کی) تب وہ نہیں ٹھہریں گے (یہاں) آپ کے بعد مگر تھوڑا عرصہ ؎2''

؎1 ارض سے مراد مدینہ طیبہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو مدینہ طیبہ کی طرف رجوع کرنے کا حکم فرمایا۔ جبریل نے آپ کو کہا کہ آپ اپنے رب سے سوال کیجئے کیونکہ ہر نبی کیلئے ایک خصوصی سوال کی اجازت ہوتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا جبریل میں اپنے رب سے کیا سوال کروں؟ جبریل نے کہا یہ دعا کیجئے قُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّ اَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّ اجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا ۝۸۰۔ اور دعا مانگا کیجئے کہ اے میرے رب جہاں کہیں تو مجھے لے جائے سچائی کیساتھ لے جا اور جہاں کہیں سے مجھے لے آئے سچائی کیساتھ لے آیا اور عطا فرما مجھے اپنی جناب سے وہ قوت جو مدد کرنے والی ہے۔

یہ آیت تبوک سے واپسی کے وقت نازل ہوئیں۔ یہ حدیث مرسل ضعیف ہے۔ اسکی شواہد ابو حاتم نے سعید بن جبیر سے مرسل روایت کی ہے۔ اسکے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے مشرکین نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا کہ انبیاء کرام شام میں رہتے تھے۔ کیا وجہ ہے کہ آپ مدینہ میں رہتے ہیں۔ آپ نے روانگی کا ارادہ فرمایا تو یہ آیات نازل ہوئیں۔ اسکے دوسرے طرق بھی مرسل ہیں۔ ابن جریر نے روایت کیا ہے کہ بعض یہود نے یہ بات کہی تھی۔

بغوی نے کلبی کا قول ذکر کیا ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ تشریف لائے تو یہود نے آپ کا مدینہ طیبہ ٹھہرنا حسد کی وجہ سے ناپسند کیا۔ وہ آپ ﷺ کے پاس آئے اور کہا اے ابوالقاسم آپ کو معلوم ہے کہ یہ انبیاء کی زمین نہیں ہے، انبیاء کی زمین تو شام ہے جو مقدس زمین ہے۔ وہاں ہی ابراہیم علیہ السلام اور دوسرے انبیاء کرام ہیں۔ اگر آپ بھی انکی مثل نبی ہیں تو شام تشریف لے جائیے۔ آپ کو وہاں جانے سے رومیوں کا خوف روکے ہوئے ہے لیکن اگر آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں تو وہ ان سے آپ کی حفاظت فرمائے گا۔ پس انکی یہ بات سن کر آپ نے مدینہ طیبہ سے تین میل دور اور ایک روایت میں ہے ذی الحلیفہ تک ایک لشکر تیار کیا تمام صحابہ کرام آپ کے پاس جمع ہوگئے۔ آپ شام کے ارادہ سے نکلے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی(2)۔ مجاہد اور قتادہ فرماتے ہیں ارض سے مراد مکہ کی زمین ہے اور آیت کریمہ مکی ہے۔ مشرکین نے آپ کو مکہ مکرمہ سے نکالنے کا ارادہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے انکے اس ارادہ کو پورا نہ ہونے دیا حتی کہ اللہ نے آپ کو ہجرت کا حکم فرمایا اور آپ خود مکہ چھوڑ کر مدینہ طیبہ تشریف لے گئے۔ بغوی فرماتے ہیں یہ مناسب بات ہے کیونکہ اس آیت سے پہلے اہل مکہ کی بات چل رہی ہے اور سورت بھی مکی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں تمام کفار نے مل کر ارادہ کیا تھا کہ آپ کو عرب کی زمین سے نکال دیں۔ اس پر انہوں نے بھرپور کوشش کی لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول مکرم کو وہاں ہی ٹھہرائے رکھا

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 353 (العلمیہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 140 (التجاریہ)

اور وہ اپنے ارادہ میں کامیاب نہ ہوئے (1)۔

ہے اگر وہ آپ کو نکال دیں گے تو وہ بھی آپ کے بعد نہیں ٹھہریں گے۔ ابن عامر' حمزہ' کسائی اور یعقوب نے خلافک یعنی خاء کے کسرہ اور لام کے بعد الف کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے خاء کے فتح اور لام کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ دونوں کا معنی ایک ہے، یعنی آپ کے نکلنے کے بعد یا آپ کو پریشان کرنے کے بعد اور قلیلا یہ مفعول فیہ ہے (یعنی وہ تھوڑا عرصہ ٹھہریں گے)۔ بعض علماء فرماتے ہیں بعینہ اسی طرح ہوا تھا کہ مدینہ طیبہ کے یہود میں سے بنو قریظہ قتل ہوئے۔ بنو نضیر جلاوطن کر دیے گئے اور خیبر کے یہود حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں جلاوطن ہوئے اور مشرکین مکہ بدر کے روز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خروج کے بعد قتل کیے گئے اور تمام کفار جزیرہ عرب سے نکال دیے گئے۔ بعض علماء فرماتے ہیں۔ انکا پریشان و مضطرب کرنا متحقق نہ ہوا تھا۔ اگر یہ ہو جاتا تو ان کو جڑ سے اکھیڑ دیا جاتا۔

سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا ﴿۷۷﴾

"(یہی ہمارا) دستور ہے ان کے بارے میں جنہیں ہم نے بھیجا آپ سے پہلے رسول بنا کر اور آپ نہیں پائیں گے ہمارے اس دستور میں کوئی ردوبدل لے"

لے سُنَّةَ کو مصدر ہونے کی بناء پر نصب دی گئی ہے، یعنی سَنَّ اللّٰهُ ذَالِکَ سُنَّۃً۔ یعنی ہمارا دستور تو یہ ہے کہ ہم ہر اس قوم کو ہلاک کر دیتے ہیں جنہوں نے اپنے درمیان سے اپنے رسول کو نکال دیا تھا۔ یہی اللہ تعالیٰ کی سنت ہے۔ آیت کریمہ میں بھی نسبت رسولوں کی طرف کی ہے کیونکہ فرمایا۔ جن کو ہم نے آپ سے پہلے رسول بنا کر بھیجا ان تمام کیلئے یہی دستور ہے۔ تو آپ ہمارے دستور میں کوئی تبدیلی نہ پائیں گے۔

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ؕ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ﴿۷۸﴾

"نماز ادا کیا کریں سورج ڈھلنے کے بعد لے رات کے تاریک ہونے تک ہے (نیز ادا کیجئے) نماز صبح ہے بلاشبہ نماز صبح کا مشاہدہ کیا جاتا ہے ہے"

لے لام وقت کیلئے ہے جیسے تیرے قول لثلاث خلون میں لام وقت کے بیان کیلئے ہے یعنی سورج کے ڈھلنے کے وقت نماز ادا کرو۔ ابن عباس، ابن عمر، جابر، عطاء، قتادہ، مجاہد، الحسن اور اکثر تابعین کے قول کے مطابق دلوک کا معنی ڈھلنا ہے۔ ابن مردویہ نے عمر بن خطاب سے اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح کا معنی روایت کیا ہے۔ اسی طرح بزار اور ابن مردویہ نے ضعیف سند کے ساتھ ابن عمر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ اسی معنی پر اسحاق بن راہویہ نے اپنی مسند میں روایت نقل کی ہے۔ ابن مردویہ نے اپنی تفسیر میں بیہقی نے المعرفہ میں ابو مسعود الانصاری کی حدیث روایت کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جبریل امیں سورج کے ڈھلنے کے وقت میرے پاس حاضر ہوئے اور مجھے ظہر کی نماز پڑھائی۔ دلوک دلک سے مشتق ہے۔ سورج ڈھلنے کے وقت کو دلوک اس لئے کہتے ہیں کہ سورج کی طرف دیکھنے والا اپنی آنکھوں کو ملتا ہے تاکہ سورج کی شعاعوں کو دور کرے۔ بعض علماء

فرماتے ہیں دلوک کا معنی غروب ہے۔ بغوی فرماتے ہیں ابن مسعود سے دلوک کا معنی غروب مروی ہے۔ النخعی، مقاتل بن حیان الضحاک اور سعدی کا بھی یہی قول ہے اور اس لفظ کا معنی جمع کرنا ہے۔ کیونکہ دلوک کا اصل معنی مائل ہونا ہے اور سورج جب ڈھلتا ہے یا غروب ہوتا ہے تو مائل ہوتا ہے(1)۔ قاموس میں ہے دلکت الشمس دلوکاً غربت اور اصفرت او زالت عن کبد السماء۔ یعنی سورج غروب ہوا یا زرد ہوا یا آسمان کے درمیان سے زائل ہوا۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں۔ اس ترکیب کا اصل معنی انتقال ہے۔ اسی سے دلک ہے کیونکہ دالک (مالش) اپنے ہاتھوں کو مالش کے وقت ٹھہراتا نہیں ہے۔ اسی طرح ہر وہ لفظ جسکی ترکیب دال اور لام سے ہو اسکے معنی میں انتقال کا مفہوم پایا جاتا ہے جیسے دلج، دلح، دلع، دلف اور دلہ(2)۔ امام بغوی فرماتے ہیں دلوک کا معنی زوال کرنا زیادہ بہتر ہے کیونکہ اس قول کے قائلین کی تعداد زیادہ ہے۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ اگر اسکو زوال کے معنی پر محمول کیا جائے تو آیت کریمہ تمام اوقات نماز کی جامع ہو جائے گی۔

۲؎ غسق کا معنی رات کی تاریکی ہے۔ جیسا کہ سورہ فلق میں ذکر کیا ہے۔ قاموس میں ہے غسق پہلی رات کے اندھیرے کو کہتے ہیں۔ الغاسق، کا معنی چاند یا رات ہے۔ جب شفق غائب ہو جائے۔ اس حصہ میں چار نمازوں کے اوقات کا ذکر ہے۔ ظہر، عصر، مغرب اور عشاء اور فجر کی نماز کے وقت کا ذکر آگے ہے۔

۳؎ فجر کی نماز کو قرآن الفجر کہنے کی وجہ یہ ہے کیونکہ قرآن اس میں رکن ہے جیسے نماز کو رکوع وسجود سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قرآن پر نصب الصلوٰۃ پر عطف کی بناء پر ہے۔ ای اَقِمْ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ۔ فراء نے یہی ترکیب لکھی ہے۔ اہل بصرہ فرماتے ہیں یہ اغراء کی وجہ سے منصوب ہے۔ یعنی وَعَلَیْکَ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ۔ اور اقرا قرآن الفجر کی تقدیر بھی جائز ہے۔ یعنی اِقْرَاِ الْقُرْاٰنَ فِیْ صَلٰوۃِ الْفَجْرِ فجر کی نماز میں قرآن پڑھو۔ پس فجر کی نماز میں قرات کا حکم صراحۃً ہے اور دوسری نماز میں دلالۃً ہے۔ اس سے پہلے سورۂ نساء کی آیت اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتٰبًا مَّوْقُوْتًا۝ کی تفسیر میں ہم نے نماز کے اوقات پر بحث کی ہے۔

۴؎ اس نماز کو مشہود اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس وقت رات اور دن کے فرشتے موجود ہوتے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ فرماتے ہیں میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جماعت سے پڑھنا اکیلے نماز پڑھنے سے پچیس درجے افضل ہے اور صبح کی نماز میں رات اور دن کے فرشتے جمع ہوتے ہیں۔ پھر حضرت ابو ہریرہ فرماتے ہیں اگر چاہو تو یہ پڑھو: قُرْاٰنَ الْفَجْرِ ؕ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ کَانَ مَشْهُوْدًا۝ اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے(3)۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں یا صبح کی نماز کو اس لیے مشہود کہا جاتا کہ تاریکی کو روشنی سے تبدیل کرنے اور نیند جو موت کے مشابہ ہے اسکو بیداری سے بدلنے کی قدرت کے شواہد ظاہر ہوتے ہیں یا اس لئے کہ اس میں نمازی زیادہ ہوتے ہیں اور اس نماز کا حق ہے کہ اس میں کثیر لوگ حاضر ہوں(4)۔ بعض علماء فرماتے ہیں اقم الصلوٰۃ میں صلوٰۃ سے مراد مغرب کی نماز ہے اور لدلوک الشمس سے مراد سورج کے غروب ہونے کا وقت ہے۔ الی غسق اللیل سے مراد شفق کے غائب ہونے تک ہے۔ اس میں مغرب کی نماز کے وقت کی ابتدا اور منتہیٰ کا بیان ہے۔ یہ آیت کریمہ دلالت کرتی ہے کہ مغرب کی نماز کا وقت شفق کے غروب ہونے تک ہے۔ اس سورت میں یہاں دو نمازوں کا حکم ہے (یعنی مغرب اور صبح) صرف یہاں دونوں کے اوقات کا بیان انکے کمال اہتمام کے اظہار کیلئے ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 141 (التجاریۃ)
2۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 381 (فراس)
3۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 686 (وزارت تعلیم)
4۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 382 (فراس)

وَمِنَ الَّيۡلِ فَتَهَجَّدۡ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰۤى اَنۡ يَّبۡعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحۡمُوۡدًا ﴿۷۹﴾

''اور رات کے بعض حصہ میں ۱؎ (اٹھو) اور نماز تہجد ادا کرو ۲؎ تلاوت قرآن کیساتھ) (یہ نماز) زائد ہے آپ کیلئے ۳؎ یقیناً فائز فرمائے گا آپ کو آپ کا رب مقام محمود پر ۴؎ ''

۱؎ اللیل سے پہلے من بعضیہ ہے۔

۲؎ نماز کیلئے نیند کو ترک کر دو۔ بہ کی ضمیر قرآن کیلئے ہے۔ قاموس میں ہے ھجود ھا کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ اسکا معنی نوم (سونا) ہے جیسے التھجد اور تھجد کا معنی استیقظ ہے۔ اسی طرح ھجد کا معنی بیدار ہونا بھی ہے۔ یہ اضداد میں سے ہے۔ ھجد کا معنی سونا اور سلانا ہے جیسے ھجد اور ھجدہ تھجیداً کا معنی بیدار کرنا اور سلانا ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ اگر تشدید ازالہ کیلئے ہو تو اسکا معنی نیند کو ترک کرنا ہوگا اور یہاں یہی معنی مراد ہے۔ اور اگر تشدید تعدیہ کیلئے ہو تو اس کا معنی سلانا ہوگا۔ امام بغوی فرماتے ہیں تھجد نیند کے بعد ہوتا ہے۔ تہجد اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی سونے کے بعد اٹھے (1)۔ میں کہتا ہوں جب اسکا معنی نماز کیلئے نیند کو ترک کرنا ہے تو یہ ساری رات نیند کو چھوڑنے یا سونے کے بعد رات کے کچھ حصہ میں نیند کو چھوڑنے یا ابتداء سے ہی بیدار رہنے تمام کو شامل ہے۔ اس لئے رات کے قیام کیلئے نماز سے پہلے سونے کو شرط قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ حضرت ابوذر سے مروی ہے، فرماتے ہیں ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ روزے رکھے تو آپ ہمیں نوافل نہ پڑھاتے حتی کہ مہینہ کی سات راتیں باقی رہ گئیں۔ آپ نے اس رات ہمارے ساتھ قیام فرمایا حتی کہ رات کا ثلث گذر گیا۔ چھٹی رات (آخر سے شمار کر کے) کو قیام نہ فرمایا جب پانچویں رات تھی تو آپ نے پھر ہمیں نوافل پڑھائے حتی کہ نصف رات گذر گئی۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ کاش آپ ہمیں آج ساری رات نوافل پڑھاتے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک شخص جب امام کے ساتھ نماز پڑھ کر واپس آجاتا ہے تو اسے ساری رات کے قیام کا ثواب عطا کیا جاتا ہے۔ جب چوتھی رات تھی تو پھر آپ نے ہمیں کوئی نوافل نہ پڑھائے۔ حتی کہ تین راتیں رہ گئیں جب تیسری رات تھی تو آپ نے اپنی ازواج اور اپنے اہل اور لوگوں کو جمع فرمایا۔ اور نوافل (تراویح) پڑھائے۔ اتنے طویل پڑھائے کہ ہمیں الفلاح کے فوت ہونے کا خوف لاحق ہوا۔ میں نے پوچھا الفلاح کیا ہے؟ فرمایا سحری کا کھانا۔ پھر آپ نے بقیہ دو راتوں میں نوافل نہ پڑھائے (2)۔ اس حدیث کو اصحاب سنن نے روایت کیا ہے لیکن امام ترمذی نے ثُمَّ لَمْ يَقُمْ بِقِيَّةَ الشَّهْرِ کے الفاظ ذکر نہیں کیے۔

سائب بن یزید سے مروی ہے فرماتے ہیں حضرت عمر نے ابی بن کعب اور تمیم الداری کو حکم دیا کہ وہ گیارہ رکعتیں لوگوں کو پڑھائیں، قاری سو آیتوں والی سورتیں پڑھتا تھا حتی کہ ہم قیام کے طویل ہونے کی وجہ سے لاٹھیوں پر سہارا لیتے تھے اور ہم فجر کے طلوع ہونے کے قریب واپس پلٹتے تھے۔ اس حدیث کو امام مالک نے روایت کیا ہے (3)۔ ابی بن کعب سے مروی ہے، فرماتے ہیں نماز رمضان شریف میں نوافل سے اس وقت فارغ ہوتے تھے کہ ہمارے غلام جلدی جلدی کھانا لاتے تھے کہ کہیں سحری کا کھانا رہ نہ جائے (4)۔ دوسری روایت میں ہے کہیں سحر طلوع نہ ہو جائے۔ اس حدیث کو بھی امام مالک نے روایت کیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صبح کے قریب سفر فرماتے رہتے تھے۔ ابن عمر کی حدیث میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں فرائض کے علاوہ نوافل اشارے سے پڑھتے تھے اور اسی طرف منہ کرتے تھے جس طرف سواری کا منہ ہوتا تھا اور وتر بھی سواری پر پڑھتے تھے۔ متفق علیہ (5)۔ ابن عباس

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 141 (التجاریہ) 2۔ سنن نسائی، جلد 1، صفحہ 238 (وزارت تعلیم)

3۔ موطا امام مالک، صفحہ 98 (وزارت تعلیم) 4۔ موطا امام مالک، صفحہ 99 (وزارت تعلیم) 5۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 136۔ ایضاً

فرماتے ہیں رات کے پہلے حصہ میں نماز پڑھنا نفس کو زیادہ روندتا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے جو تم پر قیام فرض کیا ہے اس کو شمار کرنا زیادہ مناسب ہے۔ کیونکہ انسان جب سو جاتا ہے تو اسے معلوم نہیں ہوتا کہ کب جاگے گا۔ لیکن رات کے آخری حصہ میں تہجد پڑھنا پہلے حصہ کی نسبت ثواب کے اعتبار سے زیادہ بہتر ہے۔ کیونکہ صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہمارا رب اپنی شان کے لائق ہر رات آسمان دنیا کی طرف نزول فرماتا ہے جب رات کا آخری تیسرا حصہ باقی رہ جاتا ہے(1) عبدالرحمٰن بن عبدالقاری سے مروی ہے، فرماتے ہیں میں عمر بن الخطاب کے ساتھ رمضان شریف کی ایک رات مسجد کی طرف نکلا لوگ جدا جدا تھے کوئی اکیلے نماز پڑھ رہا تھا۔ ایک جماعت نماز پڑھ رہی تھی۔ حضرت عمر نے یہ منظر دیکھ کر فرمایا اگر میں ان تمام لوگوں کو ایک قاری کے پیچھے جمع کر دوں تو بہتر ہوگا۔ آپ نے یہ پختہ عزم کر لیا اور تمام لوگوں کو ابی بن کعب پر جمع فرما دیا۔ عبدالرحمٰن بن عبدالقاری فرماتے ہیں پھر ایک رات میں انکے ساتھ نکلا تو لوگ اپنے قاری کے پیچھے نماز ادا کر رہے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا نعمت البدعة هذه۔ یہ کتنی اچھی بدعت ہے۔ جس وقت تم سوتے ہو اس وقت میں عبادت کرنا اس وقت سے افضل ہے جس میں تم قیام کرتے ہو۔ افضل وقت سے مراد آپ رات کا آخری حصہ سمجھتے تھے۔ اور لوگ رات کے پہلے حصہ میں قیام کرتے تھے (بخاری)(2)

مسئلہ: رات کی نماز یعنی نماز تہجد ابتداء میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت پر فرض تھی کیونکہ ارشاد ہے یَاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۙ قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا ۙ۔ پھر تخفیف نازل ہوئی۔ پس پانچ نمازوں کے ذریعے نماز تہجد کا وجوب منسوخ ہو گیا لیکن استحباب باقی رہا۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا فَاقْرَءُوْا مَا تَیَسَّرَ مِنْهُ۔ پھر اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں رات کے قیام کا وجوب باقی ہے یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں بھی منسوخ ہو گیا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں یہ وجوب باقی رہا تھا کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تین چیزیں مجھ پر فرض ہیں لیکن تمہارے لیے سنت ہیں۔ ۱۔ وتر ۲۔ مسواک کرنا ۳۔ اور رات کا قیام(3)۔ اس لئے اس آیت میں امر وجوب کے لئے ہے نافلۃ کا معنی فریضۃ ہے۔

؎ یعنی وہ فرائض جو اللہ تعالیٰ نے آپ پر فرض کیے ہیں ان پر یہ نماز زائد فریضہ ہے۔ اور میرے نزدیک مختار یہ ہے کہ رات کے قیام کا فرض نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی منسوخ ہو گیا تھا۔ آپ کیلئے بھی رات کا قیام بعد میں نفل ہو گیا تھا جیسا کہ آیت کا مدلول صراحۃً دلالت کر رہا ہے۔ اگر نافلۃ لک کا معنی فریضۃ زائدۃ ہوتا تو نافلۃ علیک فرمایا جاتا۔ کیونکہ وجوب کیلئے صلہ علی ہوتا ہے لام نہیں ہوتا۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہاں نفل ہونے کے ساتھ آپ کی تخصیص کیوں کی گئی ہے حالانکہ تمام بندوں کیلئے نماز تہجد نفل ہے۔

ہم اسکے جواب میں یہ کہتے ہیں کہ دوسرے بندوں کے نوافل انکے گناہوں کا کفارہ ہوتے ہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم معصوم تھے، آپ کا کوئی گناہ نہیں تھا اور اللہ تعالیٰ نے آپ کے اگلے پچھلے خلاف اولیٰ امور معاف فرما دیے تھے۔ پس آپ کیلئے نوافل درجات کی بلندی کیلئے تھے۔ حضرت مجاہد، ابوالحسن اور ابوامامہ نے اسی طرح روایت کیا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں تہجد کے نفل ہونے پر حضرت مغیرہ کی حدیث بھی دلالت کرتی ہے، فرماتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اتنا طویل قیام فرمایا کہ آپ کے پاؤں مبارک سوج گئے۔ عرض کی گئی حضور اتنی مشقت آپ کیوں برداشت کرتے ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے اگلے اور پچھلے ترک اولیٰ امور بھی معاف فرما دیے ہیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا میں اللہ

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 153 (قدیمی) 2۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 269 (وزارت تعلیم) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 141 (التجاریہ)

تعالیٰ شکر گذار بندہ نہ بنوں(1)۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ یہ نوافل خاص مجھ پر فرض ہیں۔ ابن عمر کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں فرائض کے علاوہ رات کے نوافل سواری کے اوپر اشارہ سے پڑھتے، خواہ سواری کا منہ کسی سمت بھی ہوتا اور وتر بھی سواری پر پڑھتے تھے۔ متفق علیہ(2)۔

مسئلہ: علماء کا اس مسئلہ میں بھی اختلاف ہے کہ امت کے حق میں تہجد مؤکدات میں سے ہے یا مستحبات میں سے ہے۔ میرے نزدیک مختار یہ ہے کہ مؤکدات میں سے ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر مواظبت اور دوام اختیار فرمایا ہے۔ دوسری اس کے سنت موکدہ ہونے کی دلیل ابن مسعود کی حدیث ہے۔ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک شخص کا ذکر کیا گیا جو صبح تک سویا رہتا ہے اور نماز (تہجد) کیلئے نہیں اٹھتا تو آپ نے فرمایا یہ ایسا شخص ہے جسکے کان میں شیطان پیشاب کرتا ہے۔ متفق علیہ(3)۔ اور اس میں شک نہیں کہ مندوبات کا تارک ملامت اور عتاب کا مستحق نہیں ہوتا۔ اگر نماز تہجد سنت مؤکدہ نہ ہوتی تو اس پر یہ ملامت نہ ہوتی۔

نافلۃ لک پر نصب بہ کی ضمیر مجرور سے حال ہونے یا مصدریت کی بناء پر ہے۔ نافلۃ کو تہجداً نافلۃ کی جگہ رکھا گیا ہے، یعنی یہ زائد فرض یا نفلی عبادت ہے۔ ہم نے نماز تہجد کے فضائل اور کچھ مسائل اور اور اس میں مناسب مقدار میں قرات کے بارے سورۂ مزمل میں ذکر کیا ہے۔

فصل: آپ صلی اللہ علیہ وسلم رات کے وقت نماز تہجد کے وقت کیسے قیام فرماتے تھے۔ زید بن خالد الجہنی سے مروی ہے، فرماتے ہیں میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز تہجد کو غور سے دیکھنا چاہا تو میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دہلیز یا خیمہ کو تکیہ بنایا (اور لیٹ کر دیکھنے لگا)۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم اٹھے اور خفیف سی دو رکعتیں ادا فرمائیں، پھر دو طویل رکعتیں، پھر دو طویل رکعتیں، پھر دو طویل رکعتیں ادا فرمائیں، پھر انکے بعد دو ایسی رکعتیں ادا فرمائیں جو پہلی رکعتوں سے کم تھیں، پھر دو رکعتیں پہلی دو سے بھی چھوٹی رکعتیں ادا فرمائیں۔ پھر آخر میں دو رکعتیں ادا فرمائیں جو پہلی سے چھوٹی تھیں، پھر وتر ادا فرمائے تو اس طرح یہ کل تیرہ رکعتیں تھیں۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے(4)۔ امام بغوی نے بھی ثم صلی رکعتین دون اللتین قبلھما کو تین مرتبہ ذکر کیا ہے۔ اور مشکوٰۃ میں چار مرتبہ یہ کلمات ذکر کیے ہیں۔ تو اس طرح پندرہ رکعتیں ہو جائینگی۔ صحیح مسلم میں بھی اسی طرح ہے۔ یہ کتاب الحمیدی' مؤطا امام مالک' سنن ابی داؤد اور جامع الاصول میں بھی ہے۔ اور اوتر علی ھذا کا معنی یہ ہے کہ ایک رکعت کے ساتھ وتر بنایا جائے اور امام بغوی نے جو ذکر کیا ہے اسکے مطابق اسکا معنی یہ ہے کہ آپ نے تین رکعتوں کے کے ساتھ وتر بنائے۔ حضرت عائشہ سے مروی ہے فرماتی ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان شریف اور رمضان کے علاوہ میں گیارہ رکعت سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے۔ چار رکعتیں پڑھتے تھے تو انکے حسن اور طوالت کے بارے نہ پوچھ (وہ کیا ہی خوب تھیں) پھر چار رکعتیں پڑھتے انکے حسن وطول کے بارے نہ پوچھ (وہ کیا ہی خوب تھیں) پھر تین رکعتیں ادا فرماتے۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں میں نے عرض کی یا رسول اللہ کیا آپ وتر پڑھنے سے پہلے سوتے ہیں؟ فرمایا اے عائشہ میری آنکھیں سوتی ہیں میرا دل نہیں سوتا (متفق علیہ)(5)۔ حضرت عائشہ سے ہی مروی ہے فرماتی ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عشاء کی نماز سے فراغت اور فجر کے درمیان گیارہ رکعتیں پڑھتے تھے ہر دو رکعتوں پر سلام پھیرتے تھے پھر ایک رکعت وتر پڑھتے

1۔ سنن نسائی، جلد 1، صفحہ 244 (وزارت تعلیم)　2۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 136۔ ایضاً　3۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 153۔ ایضاً
4۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 262 (قدیمی)　5۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 254 (قدیمی)

تھے۔ اور دو رکعتوں پر سلام پھیرتے تھے، پھر ایک رکعت وتر پڑھتے تھے اور دو سجدے ادا فرماتے سر اٹھانے سے پہلے جتنی مقدار اتنی ہوتی کہ تم میں سے کوئی ایک پچاس آیات پڑھتا ہے۔ اور جب مؤذن اذان کہہ کر خاموش ہو جاتا اور فجر ظاہر ہو جاتی تو آپ اٹھتے دو ہلکی پھلکی رکعتیں ادا فرماتے پھر دائیں جانب پر لیٹ جاتے حتی کہ مؤذن نماز کے قیام کی اطلاع دیتا تو آپ مسجد کی طرف تشریف لے جاتے۔ متفق علیہ۔ حضرت انس بن مالک سے مروی ہے، فرماتے ہیں ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رات میں نماز پڑھتا ہوا دیکھنا چاہتے تو دیکھ سکتے تھے۔ اور سویا ہوا دیکھنا چاہتے تو سویا ہوا بھی دیکھ سکتے تھے(1)۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی مہینہ روزہ رکھنا شروع کرتے تو ہم کہتے آپ کبھی افطار نہیں کریں گے اور کبھی افطار شروع کرتے تو ہم کہتے اب آپ کبھی روزہ نہ رکھیں گے۔ اس حدیث کو نسائی نے روایت کیا ہے۔ حضرت عائشہؓ سے ہی مروی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات کو تیرہ رکعتیں ادا فرماتے ان میں وتر اور دو رکعت فجر کی سنتیں بھی ہوتیں۔ مسروق سے مروی ہے فرماتے ہیں میں نے حضرت عائشہؓ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رات کی عبادت کے بارے پوچھا تو فرمایا فجر کی دو سنتوں کے علاوہ کبھی سات کبھی نو اور کبھی گیارہ رکعتیں ادا فرماتے تھے (بخاری)(2)۔ حضرت عائشہؓ سے مروی ہے فرماتی ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب رات کو اٹھ کر نماز شروع فرماتے تو پہلے خفیف سی دو رکعتیں ادا فرماتے (مسلم)(3)۔

حضرت ابو ہریرہ سے مرفوع حدیث مروی ہے کہ جب تم میں سے کوئی نماز تہجد شروع کرے تو پہلے خفیف سی دو رکعتیں پڑھے۔ ابن عباس سے مروی ہے کہ وہ ایک رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سوئے (فرماتے ہیں) آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیدار ہوئے تو مسواک کیا۔ پھر یہ آیت اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ سے آل عمران کے آخر تک آیات تلاوت فرمائیں۔ پھر کھڑے ہوئے اور دو رکعتیں ادا فرمائیں ان میں قیام، رکوع اور سجود کو لمبا فرمایا۔ پھر سلام پھیرا۔ اس کے بعد آپ پھر سو گئے حتی کہ آپ خراٹے بھرنے لگے۔ پھر آپ نے تین مرتبہ ایسا کیا اور چھ رکعتیں ادا فرمائیں، ہر بار مسواک کیا اور وضو فرمایا اور ان آیات کی تلاوت فرمائی، پھر تین رکعت وتر ادا فرمائے (مسلم)(4)۔ حضرت عائشہؓ سے مروی ہے فرماتی ہیں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم مبارک ثقیل ہو گیا تو آپ اکثر بیٹھ کر نوافل پڑھتے تھے۔ متفق علیہ(5)۔ حضرت حذیفہ سے مروی ہے کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو رات کی نماز (نوافل) پڑھتے ہوئے دیکھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتداء میں تین مرتبہ اللہ اکبر کہا پھر ذو الملكوت و الجبروت والكبرياء والعظمة پڑھا، پھر ثناء پڑھی، پھر سورۂ بقرہ تلاوت فرمائی، پھر قیام کی طرح لمبا رکوع فرمایا، اس میں سبحان ربی العظیم پڑھا، پھر رکوع سے سر اٹھایا تو رکوع کی مقدار قیام کیا اور اس میں لربی الحمد پڑھا، پھر سجدہ کیا سجدہ بھی قیام کی مقدار طویل فرمایا اور سجدہ میں سبحان ربی الاعلیٰ پڑھا پھر سجدہ سے سر اٹھایا اور دونوں سجدوں کے درمیان سجدہ کی مقدار بیٹھے رہے اور رب اغفرلی رب اغفرلی پڑھتے رہے۔ تو آپ نے اس طرح چار رکعتیں ادا فرمائیں جن میں سورۂ بقرہ، آل عمران، نساء، مائدہ یا انعام تلاوت فرمائیں۔ مائدہ اور انعام میں راوی کو شک ہے۔ اس حدیث کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ ابوذر سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے حتی کہ صبح تک یہ آیت پڑھتے رہے اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَ اِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۔ ایک صحابی سے مروی ہے فرماتے ہیں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عشاء کی نماز پڑھ لی تو کچھ دیر کیلئے سو گئے۔ پھر بیدار ہوئے اور افق کی طرف دیکھا اور یہ آیت پڑھی رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ (الی) اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ ۔ پھر بستر سے مسواک اٹھائی۔ اسکے بعد لوٹے سے پیالے میں پانی لیا اور

1۔ سنن نسائی، جلد 2، صفحہ 199 (وزارت تعلیم)
2۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 153 (وزارت تعلیم)
3۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 262 (قدیمی)
4۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 261 (قدیمی)
5۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 252-53 (قدیمی)

مسواک فرمایا پھر نماز پڑھنے کیلئے کھڑے ہوئے۔ میرا خیال ہے آپ نے سونے کی مقدار قیام فرمایا۔ پھر آپ سو گئے میں نے اندازہ لگایا نماز پڑھنے کی مقدار سوئے ہیں پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اٹھے اور پہلے کی طرح تمام افعال کیے اور پہلے کی طرح تلاوت بھی کی۔ فجر سے پہلے آپ نے یہ عمل تین مرتبہ کیا (نسائی)۔ ام سلمہ سے مروی ہے فرماتی ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اتنی مقدار سوتے جتنی دیر نماز پڑھی ہوتی پھر اتنی دیر نماز پڑھتے جتنی دیر سوئے ہوتے۔ پھر اتنی دیر سوتے جتنی دیر نماز پڑھی ہوتی حتیٰ کہ صبح ہو جاتی پھر حضرت ام سلمہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرأت حرف حرف پڑھ کر سنائی(1)۔ اس حدیث کو ابوداؤد ترمذی اور نسائی نے روایت کیا ہے۔

یہ فعل مضمر کی وجہ سے مقاماً منصوب ہے، یعنی فَيُقِيمُكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا یا يَبْعَثُكَ کی تضمین کے ساتھ یقیمک کے معنی کی بناء پر منصوب ہے یا حال ہونے کی بناء پر منصوب ہے یعنی يَبْعَثُكَ ذَا مَقَامٍ مَّحْمُوْدٍ يَحْمَدُهُ الْأَوَّلُوْنَ وَ الْاٰخِرُوْنَ یعنی آپ کا رب آپکو ایسے مقام محمود پر فائز فرمائے گا کہ پہلے اور پچھلے اسکی حمد کریں گے۔ امام بغوی نے ابو وائل عن عبداللہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق سے نقل کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خلیل بنایا اور ساتھی (یعنی تمہارا نبی) تو خلیل اللہ ہے اور تمام مخلوق سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک معزز و مکرم ہے۔ پھر آپ نے عسیٰ ان یبعثک ربک مقاماً محموداً تلاوت فرمایا وہ اپنے محبوب کو عرش پر بٹھائے گا۔ عبداللہ بن سلام فرماتے ہیں وہ اسے کرسی پر بٹھائے گا(2)۔ صحیح یہ ہے کہ مقام محمود مقام شفاعت ہے۔ احمد، ابن ابی حاتم اور ترمذی نے حضرت ابوہریرہ کے واسطہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت کے بارے ارشاد نقل فرمایا ہے مقام محمود یہ وہ مقام ہے جہاں میں اپنی امت کی شفاعت کروں گا۔ صحیحین میں حضرت انس سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کے روز مومنوں کو روک لیا جائے گا حتیٰ کہ انہیں خیال آئے گا کہ اگر ہم اپنے رب کی بارگاہ میں کوئی سفارش پیش کریں تو شاید ہمیں اپنی تکلیف سے راحت مل جائے۔ وہ سب آدم علیہ السلام کے پاس حاضر ہونگے اور عرض کریں گے آپ آدم ہیں، تمام لوگوں کے باپ ہیں، اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے دست قدرت سے پیدا فرمایا۔ تجھے اپنی جنت میں بسایا، تجھے مسجود ملائکہ بنایا، تجھے تمام اسماء کی تعلیم دی تو آپ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ہماری سفارش فرمائیں تاکہ ہماری یہ تکلیف دور ہو جائے۔ آپ فرمائیں گے میں تو تمہاری یہ تکلیف دور نہیں کر سکتا۔ پھر آپ اپنی شجرہ والی خطا کا تذکرہ کریں گے جس سے انہیں منع کیا گیا تھا۔ لیکن تم نوح علیہ السلام کے پاس جاؤ وہ پہلے نبی ہی جنہیں اللہ تعالیٰ نے مبعوث فرمایا اہل زمین کی طرف۔ پس لوگ نوح علیہ السلام کے پاس آئیں گے۔ آپ سے عرض کریں گے لیکن آپ بھی فرمائیں گے میں تو تمہاری اس سلسلہ میں کوئی مدد نہیں کر سکتا اور اپنی اس خطا کا تذکرہ کریں گے جس میں انہوں اپنے بیٹے کیلئے بغیر علم کے سوال کیا تھا۔ فرمائیں گے تم لوگ ابراہیم علیہ السلام کے پاس جاؤ وہ خلیل الرحمٰن ہیں۔ پس لوگ حضرت ابراہیم کی بارگاہ میں حاضر ہونگے اور اپنی تکلیف عرض کریں گے لیکن آپ فرمائیں گے میں تو اس سلسلہ میں تمہاری دستگیری نہیں کر سکتا اور اپنے وہ تین اقوال ذکر کریں گے جو ظاہر خلاف واقعہ تھے۔ لیکن تم لوگ موسیٰ علیہ السلام کی پاس جاؤ وہ اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے تورات عطا فرمائی' ان سے کلام فرمائی۔ راوی فرماتے ہیں لوگ موسیٰ علیہ السلام کے پاس حاضر ہونگے لیکن آپ فرمائیں میں تو تمہاری اس مشکل میں امداد نہیں کر سکتا۔ پھر نفس کو قتل کرنے کی خطا کا ذکر یں گے' فرمائیں گے اس سفارش کیلئے تم عیسیٰ علیہ السلام کے پاس جاؤ وہ اللہ کے بندے، اسکے رسول' روح اللہ اور کلمۃ اللہ ہیں۔ فرمایا وہ لوگ عیسیٰ علیہ السلام کے پاس پہنچیں گے تو آپ فرمائیں گے مجھے تو لب کشائی کی جرأت نہیں لیکن تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں جاؤ جن کے اللہ تعالیٰ نے اگلے' پچھلے سب

1۔ سنن نسائی، جلد 1، صفحہ 242 (وزارت تعلیم)   2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 145 (التجاریہ)

ترک اولیٰ امور بھی معاف فرما دیئے ہیں، وہ آپ کی بارگاہ میں حاضر ہونگے۔ حضور علیہ السلام فرماتے ہیں میں اپنے رب کریم سے اذن طلب کروں گا تو مجھے اذن مل جائے گا میں جب اپنے رب کریم کو دیکھوں گا تو سربسجود ہو جاؤں گا۔ سجدہ میں پڑا رہوں گا۔ جتنی دیر اللہ تعالیٰ چاہے گا۔ پھر ارشاد ہوگا اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سر اٹھایئے کہو تمہاری بات سنی جائے گی، تم شفاعت کرتے جاؤ ہم شفاعت قبول فرماتے جائیں گے، تم مانگتے جاؤ ہم دیتے جائیں گے۔ فرمایا میں سر اٹھاؤں گا اور اپنے رب کی حمد وثناء کروں گا جو مجھے وہ خود سکھائے گا پھر میں شفاعت کروں گا۔ میرے لیے ایک حد ہوگی میں اسکے مطابق لوگوں کو دوزخ سے نکالوں گا اور انہیں جنت میں داخل کروں گا۔ پھر میں دوبارہ اپنے رب کی بارگاہ میں اذن حاضری چاہوں گا تو مجھے اذن مل جائے گا۔ پھر میں اللہ تعالیٰ کو دیکھتے ہی سجدہ میں گر جاؤں گا۔ پس اتنی دیر سجدہ میں رہوں گا جتنا اللہ تعالیٰ چاہے گا۔ پھر ارشاد ہوگا اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سر اٹھایئے، کہیے آپ کی بات سنی جائے گی۔ شفاعت کیجئے آپکی شفاعت قبول کی جائے گی اور مانگئے آپ کو دیا جائے گا۔ فرمایا میں سر اٹھاؤں گا اور اپنے رب کی ایسی حمد وثناء کروں گا جو مجھے وہ خود تعلیم دے گا۔ پھر میں شفاعت کروں گا۔ میرے لیے ایک حد مقرر کی جائے گی۔ پس میں نکلوں گا اور لوگوں کو دوزخ سے نکالوں گا اور جنت میں داخل کروں گا پھر میں تیسری مرتبہ حاضر ہوں گا۔ بارگاہ الٰہی میں اذن طلب کروں گا تو مجھے اجازت دی جائے گی۔ جب میں اللہ تعالیٰ کی زیارت سے مشرف ہونگا تو سجدہ میں گر جاؤں گا۔ پس سجدہ میں پڑا رہوں گا جتنی دیر اللہ تعالیٰ چاہے گا۔ پھر ارشاد ہوگا اے شاہ خوباں محمد صلی اللہ علیہ وسلم سر اٹھایئے، کہیے آپ کی بات سنی جائے گی' شفاعت کرتے جایئے آپ کی شفاعت قبول کی جائے گی' مانگتے جایئے عطا کیا جائے گا۔ فرمایا میں سر اٹھاؤں گا اور اپنے رب کی ایسی حمد وثناء کروں گا جو وہ مجھے خود سکھائے گا پھر میں شفاعت کا سلسلہ شروع کروں گا میرے لیے ایک حد مقرر ہوگی۔ میں وہاں سے نکل کر لوگوں کو دوزخ سے نکالوں گا اور انہیں جنت میں داخل کروں گا حتی کہ صرف وہ لوگ دوزخ میں باقی رہ جائیں گے جن پر قرآن میں ہمیشہ دوزخ میں رہنے کا فیصلہ کیا گیا ہے(1)۔ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی عَسٰۤى اَنْ یَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا اور فرمایا یہ وہ مقام محمود ہے جسکا تمہارے نبی سے اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے۔ صحیحین میں حضرت انس سے حدیث شفاعت اسی مفہوم میں مروی ہے۔ اس میں ہے کہ میں اپنے رب کریم سے اذن طلب کروں گا تو مجھے اذن حاضری ملے گا۔ پھر مجھے ایسے محامد کا الہام ہوگا جنکے ساتھ میں اللہ تعالیٰ کی حمد کروں گا لیکن اب مجھے یاد نہیں ہے۔ پس میں ان محامد کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی حمد کروں گا۔ اور سجدہ کرتے ہوئے گر جاؤں گا۔ پھر ارشاد ہوگا اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سر اٹھایئے اور کہیے آپ کی بات سنی جائے گی۔ سوال کیجئے عطا کیا جائے گا' آپ سفارش فرمایئے آپ کی سفارش قبول کی جائے گی۔ پس میں عرض کروں گا رب امتی امتی اے میرے پروردگار میری امت کو بخش دے میری امت کو بخش دے۔ ارشاد ہوگا چلو۔ پس میں بارگاہ رب العزت سے باہر آ کر ہر اس شخص کو بھی دوزخ سے نکالوں گا جس کے دل میں ایک جو کے برابر بھی ایمان ہے۔ پھر میں چل کر ایسا کروں گا۔ اس کے بعد دوبارہ اللہ تعالیٰ کی ان محامد کے ساتھ تعریف کروں گا اور سجدہ میں گر جاؤں گا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح بیان فرمایا۔ پھر ارشاد ہوگا چلو اور اسے بھی دوزخ سے باہر نکالو جسکے دل میں ایک رائی کے دانہ سے بھی کم ایمان ہے۔ پس میں جا کر ایسا کروں گا۔ پھر چوتھی بار بھی ایسا ہوگا۔ اس مرتبہ بھی آپ نے شفاعت کا ذکر فرمایا۔ پھر میں عرض کروں گا۔ اے میرے پروردگار مجھے ان لوگوں کے بارے بھی اجازت مرحمت فرما جس نے لا الہ الا اللّٰہ کہا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا مجھے اپنی عزت' جلال' کبریائی اور عظمت کی قسم جس نے لا الہ الا اللّٰہ کہا ان کو میں باہر نکالوں گا۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 109 (قدیمی)

امام سیوطی نے فرمایا اس حدیث پر علماء نے قوی اشکال وارد کیا ہے وہ یہ کہ حدیث کا ابتدائی حصہ موقف کی تکلیف کو دور کرنے کے متعلق ہے اور آخر میں شفاعت اور دوزخ سے نکالنے کا ذکر ہے جبکہ شفاعت اور دوزخ سے نکالنا موقف' پل صراط سے گزرنے اور گذرتے وقت آگ میں گرنے والوں کے بعد ہوگا۔ دراوردی فرماتے ہیں حدیث کے راوی کی عمر زیادہ ہوگئی تھی۔ اس لئے صحیح بیان نہ کر سکے جبکہ حضرت حذیفہ کی حدیث میں صحیح ذکر ہے۔ کہ صراط کا ذکر اس شفاعت کے بعد ہے اور حضرت ابو ہریرہ اور ابو سعید کی حدیث میں ہے کہ ہر امت کو حکم ہوگا کہ جسکی عبادت کرتے تھے اسکی پیروی کرو۔ پھر منافقین کو مومنین سے جدا کرنے پھر پل صراط رکھنے اور اس سے گذرنے کا ذکر ہے۔ پھر دوزخ سے نکالنے کی سفارش کا ذکر ہے۔ گویا ہر امت کو اپنے معبود کی پیروی کا حکم سب سے پہلے ہوگا۔ اس کے بعد موقف کی تکلیف سے راحت' دوزخ سے اخراج اور شفاعت کا حکم ہوگا۔ قاضی عیاض اور نووی وغیرہما نے اسی طرح ترتیب ذکر کی ہے۔ میں کہتا ہوں حدیث میں اس ترتیب کا کوئی ضرر و نقصان نہیں ہے کیونکہ گویا حدیث میں حذف اور اختصار ہے پہلے موقف کی تکالیف کے ازالہ کیلئے شفاعت کا ذکر فرمایا۔ پھر ساتھ ہی دوسری شفاعت یعنی دوزخ سے اخراج کی شفاعت کا ذکر فرمادیا۔ یہ دونوں شفاعتیں دوسری احادیث میں ثابت ہیں۔ میں کہتا ہوں حدیث میں تھا استاذن علی ربی فی دارہ۔ میں اپنے رب سے اس کے گھر میں جانے کی اجازت طلب کروں گا۔ تو یہاں دار سے مراد جنت ہے اور اس میں اضافت تشریف کیلئے ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی رؤیت جنت کے ساتھ مختص ہے۔ اس لئے یہاں دار سے مراد جنت ہوگی۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے فرمایا لوگ قیامت کے روز ہر امت اپنے نبی کے پیچھے ہوگی عرض کریں گے اے فلاں نبی ہماری شفاعت کیجئے (سب معذوری کا اظہار کریں گے) حتی کہ شفاعت کا سلسلہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچے گا۔ یہ وہ دن ہے جس میں اللہ تعالیٰ آپ کو مقام محمود پر فائز فرمائے گا(1)۔ بعض احادیث میں ہے کہ سورج قریب آجائے گا حتی کہ لوگوں کا پسینہ نصف کانوں تک ہوگا۔ اسی حالت کرب میں وہ آدم علیہ السلام کی بارگاہ استغاثہ کریں گے تو آپ فرمائیں گے میں تو اس کام کو نہیں کر سکتا پھر لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں درخواست کریں گے تو آپ سفارش فرمائیں گی۔ اسکے بعد اللہ تعالیٰ لوگوں کے درمیان فیصلہ فرمائے گا آپ صلی اللہ علیہ وسلم چلتے چلتے جنت کے دروازہ کو پکڑ لیں گے۔ پس اس دن اللہ تعالیٰ آپ کو مقام محمود پر فائز فرمائے گا۔ تمام (اپنے بیگانے' ماننے والے نہ ماننے والے) سب لوگ آپ کی تعریف میں رطب اللسان ہونگے۔ البزار اور البیہقی نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ لوگوں کو ایک میدان میں جمع فرمائے گا کوئی نفس کلام کرنے کی جرأت نہ کر سکتا ہوگا۔ سب سے پہلے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بلایا جائے گا تو آپ عرض کریں گے لَبَّیْکَ وَ سَعْدَیْکَ وَالْخَیْرُ فِیْ یَدَیْکَ وَالشَّرُّ لَیْسَ اِلَیْکَ وَالْمَهْدِیُّ مَنْ هَدَیْتَ وَعَبْدُکَ بَیْنَ یَدَیْکَ وَبِکَ وَاِلَیْکَ لَا مَنْجَا مِنْکَ اِلَّا اِلَیْکَ تَبَارَکْتَ وَتَعَالَیْتَ رَبَّ الْبَیْتِ' (میں حاضر ہوں' اور تیری حاضری کی سعادت حاصل کرتا ہوں' ساری بھلائیاں تیرے دست قدرت میں ہیں۔ شر اور برائی کی نسبت سے تو مبرا ہے۔ ہدایت یافتہ وہی ہے جسے تو نے ہدایت سے سرفراز فرمایا تیرا بندہ تیرے سامنے ہے اور تیرے سبب سے اور تیری طرف رجوع کرنے والا ہے' اور نجات صرف تیری بارگاہ میں ہے۔ اے رب کعبہ تیری ذات بابرکت اور بلند و بالا ہے۔ اس وقت آپ شفاعت فرمائیں گے۔ اسی مقام کے متعلق ارشاد فرمایا عَسٰۤی اَنْ یَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا(2)۔ ترمذی

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 686 (وزارت تعلیم)
2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 357 (العلمیہ)

ابن خزیمہ اور ابن مردویہ نے ابوسعید الخدری سے روایت کی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں اولاد آدم کا سردار ہوں اور یہ بطور فخر نہیں بلکہ یہ حقیقت ہے' لواء الحمد میرے ہاتھ میں ہوگا اور میرا یہ کہنا بطور فخر نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ اس دن آدم اور دوسرے انبیاء میرے جھنڈے کے نیچے ہونگے۔ سب سے پہلے مجھ پر سے زمین کھلے گی اور یہ بات میں بطور فخر نہیں کہہ رہا۔ لوگوں پر تین گھبراہٹیں ہوں گی۔ پھر لوگ آدم علیہ السلام کی پاس آئیں گے اور عرض کریں آپ ہمارے باپ ہیں ہماری سفارش فرمایئے۔ آدم علیہ السلام کہیں گے میں نے لغزش کی تھی جس کی وجہ سے مجھے زمین پر اتارا گیا لیکن تم نوح کے پاس جاؤ۔ نوح علیہ السلام کے پاس پہنچیں گے تو آپ فرمائیں گے میں نے اہل زمیں کیلئے بددعا کی تھی تو وہ ہلاک ہو گئے تھے لیکن تم ابراہیم علیہ السلام کے پاس جاؤ۔ وہ ابراہیم کے پاس پہنچیں گے تو آپ فرمائیں گے میں نے بظاہر خلاف واقعہ تین باتیں کی تھی۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ باتیں حقیقۃً جھوٹی نہ تھیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے دین کے دفاع کیلئے بظاہر جھوٹی باتیں کہی تھیں۔ لیکن تم موسیٰ علیہ السلام کے پاس جاؤ۔ لوگ وہاں پہنچیں گے تو آپ فرمائیں گے میں نے ایک آدمی کو قتل کیا تھا لیکن تم عیسیٰ علیہ السلام کے پاس جاؤ۔ لوگ آپ کے پاس پہنچیں گے تو آپ فرمائیں گے میری تو اللہ کو چھوڑ کر پوجا کی گئی تھی تم محمد ﷺ کے پاس جاؤ۔ میں انکے ساتھ چلوں گا اور جنت کے دروازہ کا حلقہ پکڑ کر اسے کھٹکھٹاؤں گا۔ پوچھا جائے گا کون ہے؟ میں کہوں گا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)۔ پس میرے لیے جنت کا دروازہ کھول دیا جائے گا اور فرشتے کہیں گے خوش آمدید تو میں سجدہ میں گر جاؤں گا۔ اللہ تعالیٰ مجھے اپنی حمد وثناء اور بزرگی کا بیان الہام فرمائیں گے پھر ارشاد ہوگا سر اٹھایئے اور مانگئے، آپ کو عطا کیا جائے گا۔ شفاعت فرمایئے تمہاری شفاعت قبول کی جائے گی۔ اور کہیے تمہاری بات سنی جائے گی۔ یہ مقام محمود ہے(2)۔ علامہ قرطبیؒ نے لکھا ہے کہ تین گھبراہٹیں لوگوں پر اس وقت طاری ہوگی جب آگ کو لگاموں کے ساتھ کھینچ کر لایا جائے گا۔ پس جب وہ آگ انہیں دیکھے گی تو مزید بھڑکے گی اور بلند ہوگی۔ ابن خزیمہ اور طبرانی نے صحیح سند کے ساتھ حضرت سلمان سے روایت کیا ہے فرمایا قیامت کے روز سورج کو دس سال کی گرمی دے دی جائے گی۔ پھر اسے لوگوں کے سروں کے قریب لایا جائے گا۔ آگے حدیث میں فرماتے ہیں لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملیں گے اور عرض کریں گے حضور! ہماری شفاعت فرمائیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمائیں گے میں تمہارا ساتھی ہوں۔ پس نکلیں گے حتی کہ جنت کے دروازہ تک پہنچ جائیں گے دروازہ کے حلقہ کو پکڑ کر کھٹکھٹائیں گے۔ پوچھا جائے گا کون ہے؟ آپ فرمائیں گے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)۔ پھر آپ کیلئے جنت کا دروازہ کھولا جائے گا حتی کہ آپ اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہونگے۔ پھر سجدہ کریں گے۔ تو ندا آئے گی اپنا سر اٹھایئے سوال کرو عطا کیا جائے گا۔ شفاعت طلب کرو آپ کی شفاعت قبول کی جائے گی۔ یہ مقام محمود ہے۔ یہ حدیث نامکمل ذکر کی ہے۔ ابن ابی حاتم نے السنۃ میں اور ابن ابی شیبہ نے مکمل ذکر کی ہے۔ انہوں نے اس طویل حدیث کے آخر میں بیان کیا ہے کہ آپ ہر اس شخص کی شفاعت فرمائیں گے جس کے دل میں گندم کے دانہ برابر یا جو کے دانہ برابر یا رائی کے برابر ایمان ہوگا۔ یہی مقام محمود ہے۔ طبرانی نے کعب بن مالک سے روایت کیا ہے۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لوگ قیامت کے دن اٹھیں گے تو میں اور میری امت ایک ٹیلہ پر ہوں گے پس میرا رب مجھے ایک سبز جوڑا پہنائے گا تو مجھے اذن ہوگا میں اللہ تعالیٰ کی ایسی تعریف کروں گا جس کا وہ اہل ہے۔ یہی مقام محمود ہے(3)۔

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 357 (العلمیہ)

2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 358 (العلمیہ)

3۔ معجم کبیر از طبرانی، جلد 19، صفحہ 73 (العلمیہ)

فائدہ: شفاعت عظمیٰ فیصلہ اور طول موقف کے بارے میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طویل حدیث وارد ہے جسے بزار، ابویعلیٰ، ابوعوانہ اور ابن حبان نے اپنی اپنی صحیح میں روایت کیا ہے اور حدیث ابوہریرہ جسے شیخین وغیرہما نے روایت کیا ہے اور ابن عباس کی حدیث جسے احمد اور ابویعلی نے روایت کیا ہے۔ حضرت حذیفہ اور ابوہریرہ کی حدیث کو مسلم اور الحاکم نے روایت کیا ہے اور عقبہ بن عامر کی حدیث کو طبرانی، ابن مبارک اور ابن جریر وغیرہم نے روایت کیا ہے اور سورۂ ابراہیم میں وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْأَمْرُ کی تفسیر میں اس مسئلہ کی وضاحت گذر چکی ہے۔ علامہ قرطبی فرماتے ہیں۔ اس شفاعت سے مراد شفاعت عامہ ہے جو صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد میں اسکا ذکر ہے لِكُلِّ نَبِيٍّ دَعْوَةٌ مُسْتَجَابَةٌ فَتَعَجَّلَ كُلُّ نَبِيٍّ دَعْوَتَهُ وَ اَنَا اخْتَبَأْتُ دَعْوَتِيْ شَفَاعَةً لِأُمَّتِيْ ہر نبی کیلئے ایک مقبول دعا ہوتی ہے، ہر نبی نے اپنی وہ دعا جلدی مانگ لی لیکن میں نے اپنی وہ دعا کو امت کی شفاعت کیلئے بچا کر رکھا ہوا ہے (۱)۔ یہ شفاعت تمام اہل موقف کیلئے ہوگی۔ اور فرماتے ہیں یہ شفاعت اس لئے ہوگی تاکہ ان کا حساب جلدی شروع کیا جائے اور وہ موقف کی ہولناکیوں سے نجات حاصل کریں۔ میں کہتا ہوں میرے نزدیک اختبات دعوتی شفاعة لامتی سے مراد وہ تیسری شفاعت ہے جو گناہگاروں کو آگ سے نکالنے کیلئے ہوگی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تین شفاعتیں فرمائیں گے جس طرح وہ حدیث دلالت کرتی ہے جو ابن جریر نے اپنی تفسیر میں اور طبرانی نے المطولات میں، ابویعلی نے اپنی مسند میں البیہقی نے البعث میں ابوموسیٰ المدینی نے المطولات میں علی بن معبد نے کتاب الطاعۃ العصیان میں اور عبد بن حمید اور ابوالشیخ نے کتاب العظمت میں حضرت ابوہریرہ سے متعلق صور، صور کے پھونکنے، خوف اور غشی کے پھونکنے اور البعث کے بارے میں طویل حدیث ذکر کی ہے یہاں تک کہ جنتیوں کے جنت میں داخل ہونے دوزخیوں کے دوزخ میں داخل ہونے اور مومنین کے آگ سے نکلنے اور انکی گردنوں پر جھنمیون عتقاء اللّٰہ لکھا ہوا ہونے کو بیان فرمایا ہے۔ میں نے اس کو مختصراً ذکر کیا ہے۔ اس حدیث میں یہ بھی ذکر ہے کہ لوگ ایک موقف میں ٹھہرے ہوئے ہونگے ان کا فیصلہ نہیں ہو رہا ہوگا۔ وہ چیخیں گے اور کہیں گے کون ہماری شفاعت کرے گا تو وہ آدم علیہ السلام کے پاس آئیں گے۔ وہ فرمائیں گے میں اسکا اہل نہیں ہوں۔ پھر وہ یکے بعد دیگرے ہر نبی کے پاس آئیں گے جس نبی کے پاس جائیں گے وہ سفارش کرنے سے انکار کردے گا حتی کہ لوگ میرے پاس آئیں گے۔ میں انکے ساتھ چل پڑونگا حتی کہ میں عرش کے سامنے آکر سجدہ میں گر جاؤں گا اللہ تعالیٰ فرمائے گا کیا چاہتے ہو حالانکہ وہ سب کچھ جانتا ہے۔ میں عرض کروں گا اے میرے رب تو نے مجھ سے شفاعت کا وعدہ فرمایا تھا۔ پس اپنی مخلوق کے حق میں میری شفاعت قبول فرما اور ان کا فیصلہ فرما دے۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے محبوب میں نے تیری سفارش کو شرف قبولیت بخشا ہے میں پاس آتا ہوں اور تمہارا فیصلہ کرتا ہوں۔ یہ طویل حدیث ہے، اس میں چوپاؤں اور وحشیوں کے فیصلہ کا بھی ذکر ہے۔ پھر بندوں کے خونوں اور مظالم کا فیصلہ فرمائے گا۔ پھر ارشاد ہوگا ہر قوم اپنے معبود کے ساتھ مل جائے۔ پس وہ مل جائیں گے مومنین صرف بچ جائیں گے۔ اور ان میں منافقین بھی ہونگے پھر انکے لیے پنڈلی کھولی جائے گی تو مومنین سجدہ میں گر جائیں گے اور ہر منافق اپنی گدی (سر کا پچھلا حصہ) کے بل گرے گا۔ اللہ تعالیٰ ان کی پیٹھوں کو گائے کے مہروں کی طرح کردے گا۔ پھر پل صراط رکھا جائے گا لوگ اس کے اوپر سے گذریں گے۔ پس کچھ لوگ بالکل سلامتی کے ساتھ گذر جائیں گے اور کچھ خراشوں کے ساتھ گذر جائیں گے۔ اور کچھ لوگ جہنم میں زخمی چہروں کے ساتھ گر پڑیں گے۔ پس جب

اہل جنت' جنت کی طرف چلیں گے تو وہ کہیں گے اب ہماری جنت میں داخلہ کیلئے کون سفارش کرے گا۔ ارشاد ہوگا تمہارے باپ آدم سے زیادہ حقدار کون ہوسکتا ہے۔ وہ آدم علیہ السلام کے پاس آئیں گے آپ اپنے گناہ کا تذکرہ فرمائیں گے میں تو اب کام کی جرات نہیں کرسکتا۔ لیکن نوح کے پاس جاؤ وہ نوح علیہ السلام کے پاس آئیں گے۔ وہ بھی بارگاہ الٰہی میں لب کشائی سے معذوری کا اظہار کریں گے۔ پھر لوگ یکے بعد دیگرے ابراہیم' موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کے پاس آئیں گے۔ ہر ایک معذوری کا اظہار کرے گا۔ پھر لوگ میرے پاس آئیں گے اور رب کریم کی بارگاہ میں میرے لیے تین شفاعتوں کا حق ہے جنکا مجھ سے وعدہ کیا گیا ہے۔ پس میں جنت کی طرف چل پڑوں گا اور جنت کے دروازہ کے حلقہ کو پکڑوں گا۔ پھر جنت کے دروازہ کو کھلواؤں گا تو وہ میرے لیے کھول دیا جائے گا۔ پس جب میں اپنے رب کو دیکھوں گا تو میں سجدہ میں گر جاؤں گا۔ پھر مجھے ایسی حمد و تمجید کا اذن ہوگا جسکی اجازت مخلوق میں سے کسی اور کو نہیں دی گئی۔ پھر ارشاد ہوگا اے محمد سر اٹھایئے شفاعت کیجئے تمہاری شفاعت قبول ہوگی۔ سوال کرو تمہیں عطا کیا جائے گا۔ میں عرض کروں گا اے میرے رب تو نے مجھ سے شفاعت کا وعدہ فرمایا تھا۔ پس اہل جنت کے حق میں جنت میں داخلہ کیلئے میری شفاعت قبول فرما۔ پس میری شفاعت قبول کی جائے گی۔ ایک طویل حدیث ہے جس میں یہ بھی ہے کہ جب دوزخی دوزخ میں داخل ہونگے تو بہت سے لوگ دوزخ میں داخل ہونگے۔ انکے اعمال نے انہیں باندھ رکھا ہوگا کچھ لوگوں کے قدموں تک آگ ہوگی۔ اس سے اوپر نہ ہوگی۔ کچھ لوگوں کی نصف پنڈلی تک ہوگی۔ کئی لوگوں کے گھٹنوں تک ہوگی۔ کئی لوگوں کی کمر تک ہوگی اور کئی لوگوں کے پورے جسم کو گھیرے ہوئے ہوگی سوائے چہرے کے۔ اللہ تعالیٰ نے انکی صورتوں کو اس آگ پر حرام کر دیا ہوگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں کہوں گا اے میرے رب کچھ میرے امتی دوزخ میں ہیں ارشاد ہوگا جنہیں جانتے ہو دوزخ سے نکال لو۔ پس وہ سب نکل آئیں گے کوئی ایک بھی باقی نہیں رہے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ شفاعت کا اذن دیں گے تو ہر نبی اور شہید شفاعت کرے گا۔ ارشاد ہوگا جس کے دل میں تم دینار کے وزن برابر بھی ایمان پاتے ہو تو اسے باہر نکال لو۔ پھر ارشاد ہوگا اسے بھی نکال لو جسکے دل میں دینار کے دو ثلث' نصف دینار' ثلث دینار' دینار کی چوتھائی' قیراط اور رائی کے دانہ کے برابر ایمان پاتے ہو تو اسے نکال لو حتیٰ کہ کوئی ایسا شخص نہ بچے گا جس نے کوئی ایک بھی نیکی کی ہوگی۔ ہر ایک شافع شفاعت کرے گا تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا میں باقی ہوں اور میں ارحم الراحمین ہوں۔ اللہ تعالیٰ اپنا دست قدرت جہنم میں داخل کریں گے اور بے شمار تعداد باہر نکالیں گے اور لوگ کوئلے کی طرح ہو نگے۔ الحدیث

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں اس حدیث کا مدار قاضی اہل مدینہ اسماعیل بن رافع پر ہے اور اسی حدیث کے سبب اس پر کلام کی گئی ہے اور اس کے سیاق میں بھی نکات ہے۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ اس نے طرق اور متفرق جگہوں کو جمع کر کے ایک ہی سیاق میں ذکر کر دی ہے الحافظ ابو موسی المدینی فرماتے ہیں یہ حدیث اگرچہ اسکی سند میں ایسے راوی ہیں جن پر کلام کی گئی ہے لیکن اس حدیث کے مضامین علیحدہ علیحدہ اسانید ثابتہ سے مروی ہیں۔ اس حدیث کی صحت اور ضعف میں علماء کا اختلاف ہے۔ ابن عربی اور قرطبی نے اسے صحیح کہا ہے اور حافظ ابن حجر نے بھی اسے درست کہا ہے لیکن بیہقی نے اسے ضعیف کہا ہے۔ امام سیوطی فرماتے ہیں کہ یحییٰ بن سلام البصری نے اپنی تفسیر میں الکلبی سے نقل کیا ہے کہ جب جنتی لوگ جنت میں داخل ہو جائیں گے اور دوزخی دوزخ میں تو مومنین کا ایک گروہ دوزخ میں رہ جائے گا۔ انہیں دوزخی کہیں گے (ان مسلمانوں کو آگ مکمل طور پر جلا چکی ہوگی) ہم تو شک اور تکذیب کے گناؤنے جرم کی بناء پر پکڑے گئے لیکن تمہاری توحید نے بھی تو کچھ نفع نہیں دیا تو اس وقت وہ اتنے زور سے چیخیں گے کہ اہل جنت انکی آواز سن

لیں گے وہ آدم علیہ السلام کے پاس انکی سفارش کیلئے آئیں گے۔ آگے مذکورہ حدیث بیان فرمائی ہے۔ آخر میں ہے کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہونگے۔ آپ چل کر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پہنچیں گے اور سربسجود ہوجائیں گے۔ پھر عرض کریں گے کچھ تیرے بندوں میں گنہگار لوگ جن کو تیری توحید میں ذرہ برابر شک نہ تھا انہیں مشرک تیری عبادت پر شرم دلارہے ہیں تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے مجھے اپنی عزت کی قسم میں انہیں ضرور نکالوں گا۔

ابن حجر فرماتے ہیں اگر یہ حدیث ثابت ہوجائے تو دراوردی سے مروی گزشتہ حدیث پر وارد ہونے والے تمام اشکال دور ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ حدیث ضعیف ہے اور صریح احادیث صحیحہ کے مخالف ہے کیونکہ سوال مومنین کے جنت میں داخل ہونے سے پہلے ہوگا۔ امام سیوطی فرماتے ہیں ان احادیث کو اس طرح جمع کیا جاسکتا ہے کہ سوال دو مرتبہ ہوا ایک مرتبہ موقف میں موقف کی ہولناکیوں سے نجات دینے کیلئے اور دوسری مرتبہ جنت میں باقی ماندہ مومنین کو دوزخ سے نکالنے کیلئے ہو۔ میں کہتا ہوں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ سوال (شفاعت) تین مرتبہ ہوا ایک موقف میں راحت کیلئے۔ دوسری مرتبہ جنتیوں کے جنت میں داخلہ کیلئے اور تیسری مرتبہ دوزخ میں رہ جانے والے مومنین کو دوزخ سے نکالنے کیلئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد وَلِيَ عِنْدَ رَبِّي ثَلَاثُ شَفَاعَاتٍ وَعَدَنِيهِنَّ وَالْمَقَامُ الْمَحْمُودُ مَقَامُ الشَّفَاعَةِ کا یہی معنی ہے اور یہ شفاعت ان تینوں شفاعتوں میں سے ہر ایک کو شامل ہے۔

مسئلہ: خارجی اور معتزلہ شفاعت کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں جو گناہ کبیرہ کے مرتکب بغیر توبہ کے مرجائیں گے انکی نہ شفاعت ہوگی اور یہ وہ دوزخ سے کبھی باہر آئیں گے۔ لیکن شفاعت کے بارے کثیر احادیث وارد ہیں جو تواتر معنوی کو پہنچی ہوئی ہیں۔

(1) ابن عمر سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابراہیم کے قول رَبِّ إِنَّهُنَّ أَضْلَلْنَ كَثِيرًا مِّنَ النَّاسِ ۖ فَمَن تَبِعَنِي فَإِنَّهُ مِنِّي ۖ وَمَنْ عَصَانِي فَإِنَّكَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۔ اے میرے پروردگار ان بتوں نے تو گمراہ کردیا بہت سے لوگوں کو پس جو کوئی میرے پیچھے چلا تو وہ میرا ہوگا اور جس نے میری نافرمانی کی (تو اسکا معاملہ تیرے سپرد ہے) بیشک تو غفور و رحیم ہے۔ اور حضرت عیسیٰ کے قول إِن تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۖ وَإِن تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۔ اگر تو عذاب دے انہیں تو وہ بندے ہیں تیرے اور اگر تو بخش دے انکو تو بلاشبہ تو ہی سب پر غالب ہے (اور) بڑا دانا ہے۔ کا ذکر کیا پھر ہاتھ اٹھا کر عرض کرنے لگے امتی امتی پھر رونا شروع ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے جبریل میرے محبوب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس جاؤ اور انہیں بتا کہ ہم تجھے اپنی امت کے بارے خوش کریں گے تجھے تکلیف نہ دیں گے (1)۔

(2) بزار نے الاوسط میں اور ابونعیم نے مسند حسن کے ساتھ حضرت علی سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں اپنی امت کی شفاعت کروں گا حتی کہ میرا رب تعالیٰ ندا دے گا اے محمد کیا آپ راضی ہیں میں عرض کروں گا اے میرے رب کریم میں راضی ہوں (2)۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ میرے رب نے مجھے نصف امت بغیر حساب کے جنت میں داخل کرنے اور شفاعت کے درمیان اختیار دیا ہے تو میں نے شفاعت کو اختیار کیا ہے۔ کیونکہ یہ ہر مسلمان کیلئے ہوگی۔ دوسرے الفاظ میں ہے کہ شفاعت ہر اس شخص کیلئے ہوگی جو شرک کی آلودگی میں ملوث ہو کر نہ مرا ہوگا۔ اس حدیث کو ترمذی، ابن ماجہ، الحاکم، ابن حبان، البیہقی اور طبرانی نے عوف بن مالک اشجعی سے، امام احمد، طبرانی اور بزار نے حسن سند کے ساتھ معاذ بن جبل اور ابوموسیٰ سے۔ امام احمد، طبرانی اور بیہقی نے سند صحیح کے

ساتھ ابن عمر سے روایت کیا ہے اور اسکے آخر میں ہے کہ تم شفاعت صرف متقین کیلئے سمجھتے ہو لیکن یہ گناہگاروں خطا کاروں۔ سیاہ کاروں کیلئے بھی ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے میری شفاعت میری امت کے گناہ کبیرہ کرنے والوں کیلئے ہے(1)۔ اس حدیث کو ابوداؤد' ترمذی' حاکم اور بیہقی نے حضرت انس سے طبرانی اور ابو نعیم نے عبد بن بشیر سے اسکے ہم معنی روایت کیا ہے۔ طبرانی نے اوسط میں ابن عمر سے انہی الفاظ میں اور الکبیر میں ام سلمہ سے اس کے ہم معنی اور ترمذی اور حاکم نے حضرت جابر سے روایت کی ہے۔ کعب بن عجرہ اور طاؤس سے بھی مروی ہے۔ علامہ بیہقی کہتے ہیں یہ مرسل حسن ہے کیونکہ تابعین میں شفاعتی لاهل الکبائر کے الفاظ مشہور تھے۔ ابن ابی حاتم نے السنۃ میں حضرت انس سے مرفوعاً روایت کی ہے فرمایا میں اپنے رب کی بارگاہ میں شفاعت کرتا رہونگا اور وہ میری شفاعت قبول فرماتا رہے گا حتیٰ کہ میں عرض کروں گا اے میرے رب کریم میری شفاعت انکے حق میں بھی قبول فرما جس نے لا الہ الا اللہ پڑھا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے اے پیارے محمد یہ تیرے لیے نہیں ہے اور نہ کسی اور کیلئے ہے یہ فقط میرے اپنے لیے ہے۔ مجھے اپنی عزت' جلال اور رحمت کی قسم میں آگ میں کوئی ایک بھی نہ چھوڑوں گا۔ جس نے لا الہ الا اللہ کہا ہے۔ ایک حدیث میں فرمایا میں اپنی امت کے گنہگار لوگوں کیلئے بہترین شخص ہوں اور فرمایا میری امت کے شرار لوگوں کو اللہ تعالیٰ میری سفارش پر جنت میں داخل فرمائے گا اور نیکو کاروں کو انکے اپنے اعمال کے سبب انکو جنت میں داخل فرمائے گا۔ طبرانی نے عبادہ بن الصامت سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے۔ میں قیامت کے روز لوگوں کا سردار ہونگا اسمیں کوئی فخر نہیں ہے (بلکہ حقیقت ہے) قیامت کے روز تمام لوگ میرے جھنڈے کے نیچے کشادگی کے منتظر ہونگے اور میرے ساتھ لواء حمد ہوگا میں چلوں گا اور لوگ بھی میرے ساتھ جنت کے دروازے کی طرف چلیں گے۔ پھر میں جنت کے دروازہ پر دستک دوں گا۔ پوچھا جائے گا کون ہے؟ میں کہوں گا محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ کہا جائے گا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد مبارک ہو۔ پس جب میں جنت میں اپنے رب کا دیدار کروں گا تو میں سجدہ شکر ادا کرتے ہوئے گر جاؤں گا۔ پھر ارشاد ہوگا سر اٹھایئے کہو عطا کیا جائے گا۔ سفارش کرو آپ کی سفارش قبول کی جائے گی۔ پس مجرم اللہ تعالیٰ کی رحمت اور میری شفاعت کے طفیل نکلیں گے۔ الاوسط میں ابو ہریرہ سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں جہنم کے پاس آکر اسکا دروازہ کھٹکھٹاؤں گا پس وہ میرے لیے کھولا جائے گا۔ میں اس میں داخل ہو کر اللہ تعالیٰ کی ایسی حمد کروں گا جو نہ مجھ سے پہلے کسی نے کی ہوگی اور نہ میرے بعد کوئی کرے گا۔ پھر میں جہنم سے ان لوگوں کو نکالوں گا جنہوں نے اخلاص سے لا الہ الا اللہ پڑھا ہوگا۔ پھر قریش کے کچھ لوگ میرے پاس آئیں گے۔ میری طرف اپنی نسبت کریں گے لیکن میں انہیں دوزخ میں چھوڑ کر واپس آ ؤں گا۔ امام بخاری نے عمران بن حصین سے مرفوع حدیث نقل کی ہے کہ ایک قوم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے دوزخ سے نکلے گی اور جنت میں داخل ہوگی انہیں جهنميون کہا جائے گا(2)۔ صحیحین میں حضرت جابر سے مرفوع حدیث مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک قوم کو شفاعت کے ساتھ دوزخ سے نکالیں گے اور انہیں جنت میں داخل فرمائیں گے(3)۔ طبرانی نے ابن عمر سے مرفوعاً روایت کی ہے کہ اہل قبلہ میں سے اتنے لوگ معصیت اور نافرمانیوں کی وجہ سے دوزخ میں داخل ہونگے جنکی تعداد کو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی شمار نہیں کر سکتا۔ پس مجھے اذن شفاعت ہوگا میں سجدہ میں اللہ تعالیٰ کی ثناء کروں گا جیسے کھڑے ہو کر ثناء کروں گا ارشاد ہوگا سر اٹھاؤ اور سوال کرو آپ کو عطا کیا جائے گا۔ سفارش کیجئے آپ کی سفارش قبول

1۔ شعب الایمان، جلد 1، صفحہ 287 (العلمیہ)　2۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 971 (وزارت تعلیم)　3۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 107 [illegible]

ہوگی۔امام احمد اور طبرانی نے ایک ایسی سند کے ساتھ عبادہ بن ثابت سے روایت کیا ہے جس میں کوئی نقص نہیں ہے' کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں نے کوئی نبی اور رسول مبعوث نہیں کیا مگر اس نے مجھ سے ایک سوال کیا جو میں نے پورا فرمایا تو اے پیارے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم بھی مانگو تمہیں بھی عطا کیا جائے گا۔میں نے عرض کی قیامت کے دن مجھے اپنی امت کی شفاعت عطا کی جائے۔سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میں نے عرض کی یا رسول اللہ وہ شفاعت کیا ہوگی؟ فرمایا میں عرض کروں گا اے میرے پروردگار میری وہ شفاعت جو میں نے تیری بارگاہ میں بچار کھی تھی وہ مجھے عطا کی جائے تو اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا۔ہاں پھر وہ میری بقیہ امت کو بھی جنت میں داخل فرمائے گا۔ایک حدیث میں ہے کہ ہر نبی کو ایک مقبول دعا عطا کی گئی تو ہر نبی نے اپنی اس دعا کو دنیا میں جلدی ہی طلب کر لیا لیکن میں نے اپنی امت کی شفاعت کیلئے اسی دعا کو محفوظ کر لیا (1)۔اس حدیث کو امام بخاری اور مسلم نے ابو ہریرہ سے اور مسلم نے حضرت انس اور جابر سے' امام احمد نے عبداللہ بن عمر اور ابو سعید الخدری سے اور البزار اور بیہقی نے عبدالرحمٰن عقیل سے روایت کیا ہے۔

امام سیوطی فرماتے ہیں یہ حدیث متواتر ہے۔میں کہتا ہوں ہلاک ہو جائے وہ جو شفاعت کا انکار کرتا ہے۔بخاری و مسلم نے عمر بن خطاب سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس امت میں ایسے لوگ بھی ہوں گے جو اسلامی سزا رجم کو جھٹلائیں گے اور دجال کی آمد کا بھی انکار کریں گے' سورج کے مغرب سے طلوع ہونے کی بھی تکذیب کریں گے' عذاب قبر کے بھی منکر ہوں گے' شفاعت کو بھی نہ مانیں گے اور اس قوم کا بھی انکار کریں گے۔جو دوزخ میں جلنے کے بعد نکالے جائیں گے۔

سدی بن منصور' بیہقی اور ہناد نے حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ جو شفاعت کا منکر ہوگا اسے شفاعت سے کچھ حصہ نہ ملے گا' جو حوض کو جھٹلائے گا اس کا اس سے کچھ حصہ نہ ہوگا۔ابو نعیم نے حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری امت کے دو گروہ ایسے ہیں جنہیں قیامت کے دن میری شفاعت نصیب نہ ہوگی ایک مرجیہ اور دوسرا قدریہ۔علامہ بیہقی نے شبیب بن ابی فضالہ المکی سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے عمران بن حصین کے سامنے شفاعت کا ذکر کیا تو ایک آدمی نے کہا اے ابو نجید تم ایسی حدیثیں بیان کرتے ہو جن کا ہمیں قرآن سے کوئی اصل نہیں ملتا تو عمران بن حصین غصہ میں آگئے اور اس شخص سے مخاطب ہو کر فرمایا تو نے قرآن پڑھا ہے۔اس نے کہا ہاں فرمایا کیا قرآن میں عشاء کی چار مغرب کی تین فجر کی دو' ظہر کی چار اور عصر کی چار رکعتوں کا ذکر پایا ہے۔اس نے کہا نہیں عمران بن حصین نے فرمایا تو پھر یہ رکعتوں کی تعداد کہاں سے اخذ کی ہے' کیا تم نے یہ تعداد ہم سے حاصل نہیں کی اور ہم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کی ہے۔دوسرا یہ کہ تم ہر چالیس درہم میں ایک درہم زکوٰۃ اور بکریوں میں اتنی تعداد میں ایک بکری زکوٰۃ اور اونٹوں میں اونٹوں کی مخصوص مقدار میں زکوٰۃ جو ادا کرتے ہو کیا ان کا ذکر قرآن میں ہے اس نے کہا نہیں' تیسرا یہ کہ تم قرآن میں وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ ﴿۲۹﴾ کا ارشاد تو پڑھتے ہو لیکن سات چکروں کی تعداد اور پھر مقام ابراہیم پر طواف کے بعد نوافل کا ذکر کہیں قرآن میں پڑھا ہے۔یہ تم نے کن سے تمام باتیں اخذ کی ہیں۔کیا یہ تمام چیزیں تم نے ہم سے اور ہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل نہیں کی ہیں' تمام اہل مجلس نے کہا کیوں نہیں بات تو ایسی ہی ہے۔کیا تم نے قرآن میں کہیں پڑھا ہے کہ شہر سے باہر دور بیٹھ کر زکوٰۃ کا غلہ منگوانا جائز نہیں ہے۔اور گھوڑے کے پیچھے چیختا تا کہ وہ آگے بڑھ جائے جائز نہیں ہے اور نہ اسلام

میں نکاح شغار کی اجازت ہے (نکاح شغار یہ ہے کہ ایک شخص اپنی بیٹی کا نکاح کسی دوسرے کو کر کے دے اور دوسرا اپنی بیٹی کا نکاح اسے معاوضہ کے طور پر دے اور مہر مقرر نہ کیا جائے۔) لوگوں نے کہا یہ بھی قرآن میں تو نہیں ہے۔ پھر فرمایا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ۔ اور رسول (کریم) جو تمہیں عطا فرمادیں وہ لے لو اور جس سے تمہیں روکیں تو رک جاؤ۔

ہم نے ایسی چیزیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اخذ کی ہیں جن کا تمہیں کچھ علم نہیں ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں یزید بن صہیب الفقیر سے مروی ہے فرماتے ہیں مجھے خوارج کی رائے سے کچھ مسائل میں موافقت ہوگئی تھی۔ میں ایک نوجوان تھا ہم ایک جماعت کی صورت میں حصہ کے ارادہ سے نکلے۔ ہم مدینہ طیبہ سے گذرے جو حضرت جابر بن عبداللہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے جہنمیوں (دوزخ سے نکالے جانے والے) کا ذکر فرمارہے تھے۔ میں نے حضرت جابر کو کہا اے صحابی رسول! یہ تم کیا بیان کرتے ہو جبکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ ۚ وَكُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَآ اُعِيْدُوْا فِيْهَا۔ بیشک جسے تو جہنم میں داخل کرے تو نے اسے رسوا کر دیا اور جب بھی ارادہ کریں اس سے نکلنے کا فرط رنج والم کے باعث تو انہیں لوٹا دیا جائیگا۔ اس میں حضرت جابر نے فرمایا اے جوان تو قرآن کی تلاوت کرتے ہو میں نے کہا ہاں۔ فرمایا تو نے مقام محمود کے بارے میں سنا ہے۔ جس پر اللہ تعالیٰ آپ کو فائز فرمائے گا۔ میں نے کہا ہاں۔ فرمایا یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام محمود ہے۔ جس کے سبب اللہ تعالیٰ دوزخیوں میں سے کچھ لوگوں کو دوزخ سے نکالے گا۔ پھر آپ نے صراط اور اس پر سے لوگوں کے گذرنے کا تذکرہ فرمایا۔ اور پھر فرمایا ایک قوم دوزخ میں جانے کے بعد باہر نکالے جائیں گے(1)۔

فصل: انبیاء کرام اور دوسرے لوگوں کی شفاعت کا بیان۔

ابن ماجہ اور بیہقی نے حضرت عثمانؓ سے مرفوع حدیث روایت کی ہے کہ قیامت کے دن پہلے انبیاء، پھر علماء، پھر شہداء شفاعت کریں گے(2)۔ بزار نے بھی یہ حدیث نقل کی ہے اور اسکے آخر میں اذان دینے والوں کی شفاعت کا اضافہ ہے۔

دیلمی نے ابن عمر سے موقوف روایت نقل کی ہے کہ ایک عالم کو کہا جائے گا کہ تم اپنے شاگردوں کی سفارش کرو گے اگرچہ انکی تعداد آسمان کے ستاروں کے برابر بھی ہو۔

ابوداؤد اور ابن حبان نے حضرت ابودرداء سے مرفوع روایت نقل کی ہے کہ شہید اپنے خاندان کے ستر افراد کی شفاعت کرے گا(3)۔ احمد اور طبرانی نے عبادہ بن صامت سے مرفوعاً اور ابن ماجہ سے اسی طرح مقداد بن معدیکرب سے مرفوعاً روایت کی ہے۔ امام بیہقی نے حضرت الحسن اور الحارث بن قیس سے، ہناد نے ابوہریرہ اور حارث بن قیس سے، امام احمد نے ابو بردہ سے، حاکم نے الحسن سے اور طبرانی اور بیہقی نے سند صحیح کے ساتھ ابوامامہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری امت کے ایک شخص کی شفاعت سے قبیلہ ربیعہ اور مضر کی تعداد سے زیادہ لوگ جنت میں داخل ہونگے۔ اور بھی شفاعت کے متعلق احادیث کثیرہ وارد ہیں جن کو یہاں بیان نہیں کیا جاتا وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ لوگوں کی شفاعت پر دلالت کرتی ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے کوئی شخص بھی دوزخ میں باقی نہیں رہے گا تو پھر دوسروں کی شفاعت کا کیا مفاد ہوگا۔ میں کہتا ہوں شاید ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ دوسرے انبیاء کرام کی شفاعت انکی اپنی امتوں کے ساتھ مختص اور تمام لوگوں کو انکی شفاعت

عام نہ ہو۔ اور ہمارے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت دوسری امتوں کیلئے بھی ہوگی۔ پس آپ اپنا کوئی امتی بھی دوزخ میں نہ چھوڑیں گے۔ اور انبیاء کرام کے علاوہ (علماء شہداء اولیاء مومنین) لوگ شاید حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں شفاعت کریں گے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم انکے لیے رب کریم کی بارگاہ میں شفاعت کریں گے یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ لوگوں کو اذن شفاعت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کے ساتھ مل جائے۔

فائدہ: امام بیہقی فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد شَفَاعَتِیْ لِاَهْلِ الْكَبَائِرِ مِنْ اُمَّتِیْ (میری شفاعت میری امت کے گناہ کبیرہ کے مرتکب لوگوں کیلئے ہوگی) دلالت کرتا ہے کہ اہل کبائر کیلئے شفاعت صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے خاص ہے۔ فرشتوں کیلئے یہ عظمت نہیں ہے۔ ملائکہ صغیرہ گناہوں اور درجات کی بلندی کیلئے شفاعت کریں گے۔

فائدہ: حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ کے بعد عَسٰۤى اَنْ یَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا کا ذکر یہ ظاہر کرتا ہے کہ انسان کو مقام شفاعت پر فائز کرنے میں نماز تہجد کا بڑا دخل ہے۔

ترمذی نے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ میں تھے۔ پھر مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کا حکم ملا اور یہ آیات نازل ہوئیں(1)۔

وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّ اَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّ اجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا ۝۸۰

''اور دعا مانگا کیجئے اے میرے رب جہاں کہیں تو مجھے لے جائے (سچائی کیساتھ لے جا اور جہاں کہیں سے مجھے لے آئے سچائی کے ساتھ لے آ[1] اور عطا فرما مجھے اپنی جناب سے وہ قوت جو مدد کرنے والی ہو[2]۔''

[1]۔ مُدْخَلَ صِدْقٍ سے مراد مدینہ طیبہ ہے مُخْرَجَ صِدْقٍ سے مراد مکہ مکرمہ ہے' حضرت الحسن اور قتادہ کا یہی قول ہے۔ مُدْخَلَ اور مُخْرَجَ اسم ظرف ہیں اور ظرفیت یا مصدریت کی بناء پر منصوب ہیں، یعنی مجھے مدینہ طیبہ میں اس طرح پسندیدہ اور مرغوب داخلہ عطا فرما کہ اس میں مجھے کوئی چیز ناپسندیدہ دکھائی نہ دے اور مکہ مکرمہ سے میرا ایسا خروج فرما کہ پھر میرا اسکی طرف قلبی رجحان نہ ہو۔ الضحاک فرماتے ہیں اسکا معنی یہ ہے مجھے مکہ سے اس طرح نکال کہ مشرکین سے پوری طرح امن ہو اور مدینہ طیبہ میں اس طرح داخل فرما کہ ظاہراً اس میں مجھے غلبہ ہو۔

مجاہد فرماتے ہیں اسکا معنی یہ ہے کہ تو نے جو مجھے نبوت کا فریضہ عطا فرما کر بھیجا ہے تو اس میں مجھے سچائی کے ساتھ داخل فرما اور مجھے دنیا سے صدق کے ساتھ فراغت عطا کرتا کہ میں اس جہان فانی کو خیر باد کہوں تو اپنے فریضہ نبوت کو کماحقہ نبھا چکا ہوں۔

حضرت الحسن فرماتے ہیں مدخل صدق سے مراد جنت ہے اور مخرج صدق سے مراد مکہ ہے(2)۔ میں کہتا ہوں مدخل صدق سے مراد جنت ہو تو اسکے مقابلہ میں مخرج صدق سے مراد دنیا سے جانا ہو تو زیادہ بہتر ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ مجھے قبر میں پسندیدہ طریقہ پر داخل فرما اور قیامت کے دن عزت کے ساتھ باہر لے آنا(3)۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی ہے کہ مجھے اپنی اطاعت میں داخل فرما اور مناہی سے دور فرما۔ اور بعض فرماتے ہیں ادخال سے مراد ہر معاملہ اور ہر جگہ میں داخل کرنا مراد ہے اور اخراج

[illegible] 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 146 (التجاریہ) 3۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 382 (فراس)

سے مراد ہر معاملہ اور ہر جگہ سے نکالنا مراد ہے، یعنی کہیں جانا بھی سچائی کے ساتھ ہو اور نکلنا بھی سچائی کے ساتھ ہو۔ مجھے منافق نہ بنانا جو ایک رخ سے داخل اور دوسرے رخ سے نکلتا ہے۔ دورخا انسان اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں معزز اور امین نہیں ہوتا۔ بعض علماء فرماتے ہیں ادخال سے مراد غار میں داخل کرنا اور اخراج سے مراد اس سے سلامتی کے ساتھ نکالنا ہے۔ ادخال اور اخراج کے ساتھ صدق کی صفت لگانے کی وجہ یہ ہے کہ خروج اور دخول کی تاویل اللہ کی رضا، نصرت، عزت، کرامت اور دولت دین سے کی گئی ہے جیسا کہ قدم کا وصف صدق بیان کیا گیا ہے، ارشاد ہے اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ۔ تحقیق یہ ہے کہ اصل میں صدق اور کذب قول بلکہ خبر کی صفات ہیں انشاء کی صفات نہیں۔ صدق کا مطلب یہ ہے کہ خبر کا واقع کے مطابق ہونا۔ لیکن کبھی کبھی صدق و کذب کا اطلاق انشاء پر بھی کیا جاتا ہے کیونکہ اسکے ضمن میں خبر کا معنی پایا جاتا ہے جیسے کوئی پوچھتا ہے اَزَيْدٌ فِي الدَّارِ (کیا زید گھر میں ہے) تو یہ کلام اپنے ضمن میں یہ معنی رکھتی ہے کہ وہ اسکی حالت سے بے خبر ہے۔ کبھی صدق اور کذب افعال جوارح میں بھی استعمال ہوتے ہیں مثلاً کہا جاتا ہے صدق في القتال جب کوئی جنگ کا حق ادا کر دے اور مناسب کاروائی کرے۔ اسی سے رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ ہے یعنی جنہوں نے عہد کو پورا کیا۔ دوسرا ارشاد ہے صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا، یعنی اللہ تعالیٰ اپنے رسول کا خواب سچ کر دکھایا صدق کے ساتھ ہر اس فعل کو تعبیر کیا جاتا ہے جو ظاہراً اور باطناً فاضل ہو پھر اس فعل کو اس کی طرف مضاف کیا جاتا ہے جسکی صدق صفت ہوتا ہے جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ۔ وَلَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ۔ رَبِّ اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ صِدْقٍ۔ وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ۔ یہ سوال ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس طرح صالح بنادے کہ کوئی تعریف کرے تو تعریف کرنے میں سچا ہو۔ واللہ اعلم۔

۲۔ مجاہد فرماتے ہیں سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا کا معنی حجة بينة یعنی واضح حجت ہے۔ الحسن کہتے ہیں اسکا معنی طاقتور حکومت ہے۔ جسکے ساتھ دشمن پر غلبہ اور ایسی ظاہر عزت جسکے ساتھ میں تیرے دین کو غالب کروں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا وعدہ فرمایا کہ فارس و روم کی حکومتیں ختم فرما کر آپ کو ان پر اقتدار عطا فرمائے گا۔ قتادہ فرماتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو علم تھا کہ آپ کو اس معاملہ کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے غالب حجت کے بغیر طاقت نہیں ہے۔ اس لئے سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا کا سوال کیا تاکہ کتاب اللہ کی حفاظت اور حدود الٰہی اور اقامت دین کا فریضہ بحسن وخوبی ادا ہو سکے (1)۔ میں کہتا ہوں اللہ تعالیٰ نے خود سکھایا اور حکم دیا کہ اللہ تعالیٰ سے سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا کا سوال کرو۔ بعض علماء فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کفر کے خلاف اسلام کی نصرت کیلئے حجت اور حکومت کا سوال کیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا کو اپنے اس قول کے ساتھ قبولیت کا مژدہ سنایا اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ۔ ترجمہ بلاشبہ اللہ کا گروہ ہی غالب آنے والا ہے۔ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ۔ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ۔ ترجمہ: تاکہ غالب کردے اسے تمام دینوں پر کہ وہ ضرور خلیفہ بنائے گا انہیں زمین میں۔

وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۚ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ﴿۸۱﴾

"اور آپ (اعلان) فرما دیجئے آ گیا ہے حق اور مٹ گیا ہے باطل بیشک باطل تھا ہی مٹنے والا کی ۱۔"

۱۔ اے پیارے محمد جب فتح مبین کا پرچم لہراتے ہوئے مکہ میں داخل ہو تو یہ کہو حق آ گیا اور باطل مٹ گیا ہے اور باطل مٹنے والا ہے۔ حق سے مراد اسلام اور صرف ایک خدا کی عبادت یا قرآن ہے۔ بتوں کی عبادت کا دور ختم ہو گیا ہے۔ یہ زهق روحه سے مشتق ہے جس کا معنی ہے اس کی روح نکل گئی۔"

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 146 (التجاریہ)

اور باطل کو ثبات اس لئے نہیں ہے کیونکہ اس کی بنیاد ہی بے اصل ہے۔ ابن مسعود سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے دن مکہ میں داخل ہوئے تو بیت اللہ کے اردگرد تین سو ساٹھ بت نصب تھے۔ اور آپ کے ہاتھ میں جو چھڑی تھی اس کو بت کو چھوتے اور یہ پڑھتے جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۚ وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيدُ ﴿۴۹﴾ (1)۔ اس حدیث کو بخاری، مسلم، ترمذی اور نسائی نے روایت کیا ہے اور الطبرانی الصغیر میں ابن مردویہ نے اور امام بیہقی نے الدلائل میں ابن عباس سے اسی طرح روایت کیا ہے۔

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا ﴿۸۲﴾

"اور ہم نازل کرتے ہیں قرآن میں [1] وہ چیزیں جو (باعث) شفا ہیں [2] اور سراپا رحمت ہیں اہل ایمان کیلئے [3] اور قرآن نہیں بڑھاتا ظالموں کیلئے مگر خسارہ کو [4]"

[1] وَنُنَزِّلُ کو بصری قاریوں نے تخفیف کے ساتھ باب افعال سے پڑھا ہے اور باقی قراء نے تشدید کے ساتھ باب تفعیل سے پڑھا ہے۔ القرآن سے پہلے مِن بیانیہ ہے۔

[2] اور یہ کفر اور جہالت کی امراض کیلئے شفا ہے اور قلوب والنفس کی تاریکیوں کیلئے جلاء ہے۔ قلبی، قالبی اور نفسانی کدورتوں اور نجاستوں کو مٹانے والا ہے اور ہر قسم کی رذائل کو دور کرنے والا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں مِن تبعیضیہ ہے اور شفاء سے مراد امراض جسمانیہ سے شفاء ہے اور بعض قرآن سے مراد وہ آیات ہیں جن سے مریض کو شفا ملتی ہے جیسے سورۂ فاتحہ وغیرہ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد "عَلَيْكُمْ بِالشِّفَائَيْنِ الْعَسَلُ وَالْقُرْآنُ" کا بھی یہی مطلب ہے (یعنی تم پر دو چیزوں سے شفا طلب کرنی لازم ہے شہد اور قرآن۔ سورۂ نحل میں یہ ارشاد گذر چکا ہے۔

[3] یہ قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت ہے، یعنی ایمان والوں کیلئے اور اس سے مومنین ہی نفع اٹھاتے ہیں اور انکے لیے اس میں دینی، دنیوی اور اخروی فوائد ہیں۔

[4] لیکن منکرین قرآن کیلئے انکے کفر اور تکذیب کی وجہ سے خسارے اور گھاٹے کا سبب بنتا ہے۔ قتادہ فرماتے ہیں قرآن سے جو شخص مجلس کرے گا تو وہ زیادتی یا کمی کے ساتھ اٹھے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فیصلہ فرما دیا ہے شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا۔ یعنی مومنین کیلئے شفاء اور رحمت ہے اور ظالموں کیلئے نقصان کا اضافہ کرتا ہے۔

وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ ۚ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَئُوْسًا ﴿۸۳﴾

"اور جب ہم کوئی انعام فرماتے ہیں انسان پر تو وہ (بجائے شکر کے) منہ پھیر لیتا ہے [1] اور پہلوتہی کرنے لگتا ہے [2] اور جب پہنچتی ہے اسے کوئی تکلیف تو وہ مایوس ہو جاتا ہے [3]"

[1] جب ہم صحت اور خوشحالی سے انسان کو نوازتے ہیں یا قرآن جیسی ایمان افروز کتاب کو نازل فرما کر اس پر کرم فرماتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کے ذکر سے اعراض کرتا ہے۔ یعنی ان نعمتوں پر شکر ادا نہیں کرتا۔

[2] وناٰ کو جمہور نے رمیٰ کے وزن پر پڑھا ہے اسکا معنی ہے دور ہونا اور ذکوان نے یہاں اور سورۂ فصلت میں جاء کے وزن پر پڑھا ہے اور اسکا معنی اٹھنا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اسکا معنی دور ہونا ہے۔ اسی طرح قاموس میں ہے۔ مفہوم اور مآل ایک ہی ہے۔

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 686 (قدیمی)

کسائی اور خلف نے نون اور ہمزہ کے فتحہ پر یہاں اور سورۂ فصلت میں امالہ کیا ہے۔ اور سورۂ فصلت میں اخلاص کیا ہے اور باقی قراء نے نون اور ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور خلاد نے صرف ہمزہ کے فتحہ پر امالہ کیا ہے اور ورش نے اپنی اصل پر پڑھا ہے۔ یعنی اپنی گردن موڑتا ہے اور بہت دور چلا جاتا ہے گویا وہ اس نعمت سے بالکل مستغنی ہے۔

ع اور جب کسی مرض یا تنگ دستی میں گرفتار ہوتا ہے تو رحمت الٰہی سے مایوس ہو جاتا ہے۔

قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ ؕ فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا ﴿۸۴﴾

"آپ فرما دیجئے کہ ہر شخص عمل پیرا ہے اپنی فطرت کے مطابق [1] پس تمہارا رب ہی بہتر جانتا ہے کہ کون زیادہ سیدھی راہ پر (گامزن) ہے [2]"

[1] یعنی آپ فرمائیے کہ شکر گذار بندہ اور ناشکرا ہر ایک اپنی فطرت کے مطابق عمل پیرا ہوتا ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں اسکا معنی علی نیته ہے یعنی ہر شخص اپنی طبعی میلان یعنی ہدایت یا گمراہی کے مطابق اعمال کرتا ہے۔ حسن اور قتادہ فرماتے ہیں علی شاکلته کا معنی علی نیته ہے یعنی جو دنیا کی طرف میلان رکھتا ہے وہ اپنی ہر کاوش سے اصلاح دنیا کی نیت کرتا ہے اور جس کا رجحان آخرت کی طرف ہوتا ہے وہ اپنے ہر عمل میں رضاء الٰہی اور آخرت کی اصلاح کا ارادہ کرتا ہے۔ مقاتل نے اس کا معنی جبلت کیا ہے فراء نے علی طریقته معنی لکھا ہے یعنی اپنی فطرت کے مطابق عمل کرتا ہے۔ قتیبی نے علی طبیعته و خلیقته لکھا ہے (1) طبیعت خلیقه اور جبلة تینوں کا مفہوم ایک ہے یعنی وہ اپنی اس استعداد اور صلاحیت کے مطابق عمل کرتا ہے، جو اللہ تعالیٰ نے اس میں ودیعت فرمائی ہے اسکی مثال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی ہے کہ جو انسان کیلئے پیدا کیا گیا ہے اسکی اسے توفیق دی جائے گی۔ یہ حدیث بخاری اور مسلم نے حضرت علی سے مرفوعاً نقل کی ہے۔ ابو درداء سے مروی ہے فرماتے ہیں ہم بارگاہ رسالت میں بیٹھے یہ بحث کر رہے تھے کہ مستقبل میں کیا ہوگا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم یہ سنو کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ گیا ہے تو اس بات کی تصدیق کر لو اور جب تم یہ سنو کہ انسان کی فطرت بدل گئی ہے تو تصدیق نہ کرو کیونکہ وہ پھر وہی کرے گا جو اسکی فطرت ہے۔ اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے۔ استعداد وہ کیفیت ہے جو ہر شخص کو علت فاعلیہ اور مادیہ کے اعتبار سے حاصل ہوتی ہے۔ پس علت فاعلیہ کے اعتبار سے وہ اسم الهادی یا اسم المضل کا پرتو ہوگا اور علت مادیہ کے اعتبار سے مراد وہ کیفیت مزاجیہ ہوگی جو عناصر اربعہ کی ترکیب سے حاصل ہوتی ہے۔ پس جو عنصر غالب ہوگا اسی کے مطابق اسکی کیفیت مزاجیہ ہوگی۔ نفوس کی شہوت کا اختلاف عناصر کے ایک دوسرے پر غلبہ کی وجہ سے ہوتا ہے اور اجزاء ارضیہ کی طبائع کے اختلاف کی وجہ سے ہوتا ہے جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گذرا ہے کہ آدم کی اولاد زمین کے اجزاء کے مطابق ہے۔ بعض سرخ، بعض سفید، بعض کالے اور بعض گندمی، بعض نرم مزاج، بعض سخت طبیعت، بعض خبیث اور بعض پاکیزہ ہیں۔ بعض علماء نے علی شاکلته کا معنی علی سبیله لکھا ہے، یعنی وہ اس راستہ پر چلتا ہے جو وہ اپنے لیے منتخب کرتا ہے۔ امام بیضاوی نے اسکا یہ معنی لکھا ہے کہ وہ اس طریقہ پر عمل کرتا ہے، ہدایت اور گمراہی میں جسکے ساتھ اسکی حالت کو مناسبت ہوتی ہے۔ یا اسکی روح کا جوہر اور اسکے وہ احوال جو اسکے بدنی مزاج کے مناسب ہوتے ہیں اسکے مطابق عمل کرتے ہیں۔ قاموس میں شکل کا معنی ہے شبہ، مثل اور جو تیرے موافق ہو۔ جو تیری اصلاح کرے اور کسی شی کی وہ صورت جو محسوس اور متوہم ہو اور الشاکلة کا معنی مشکل، ناحیہ، نیت، طریقہ اور مذہب ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 147 (التجاریہ)

۲ے اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے اسے جو سیدھے راستہ اور واضح منہج پر ہے۔یعنی وہ اسے جانتا ہے جو عقائد اور اعمال کے اعتبار سے ایسے راستہ پر ہے جو حق تک پہنچانے والا ہے اور اسے بھی جانتا ہے جو تھوڑے یا زیادہ ٹیڑھے راستہ پر ہے۔

امام بخاری نے ابن مسعود سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مدینہ طیبہ کے کھیتوں میں چل رہا تھا، جبکہ آپ ایک کھجور کی چھڑی پر سہارا لیکر چل رہے تھے۔آپ کا گذر یہود کے ایک گروہ کے پاس سے ہوا وہ ایک دوسرے کو کہنے لگے کہ ان سے روح کے متعلق پوچھو۔بعض نے کہا یہ نہ پوچھو کہ کہیں کوئی ایسا جواب نہ دے دیں جو تمہیں پسند نہ ہو۔بعض نے کہا ہم ضرور پوچھیں گے۔پس ایک شخص اٹھا اور کہا اے ابوالقاسم روح کی حقیقت کیا ہے تو آپ خاموش ہو گئے۔میں سمجھ گیا کہ وحی کا نزول ہو رہا ہے۔پس میں ٹھہر گیا پھر جب وحی کی کیفیت دور ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مندرجہ ذیل آیت تلاوت فرمائی(1)۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ؕ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَاۤ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ۝۸۵

"اور یہ دریافت کرتے ہیں آپ سے ۱ے روح کی حقیقت کے متعلق (انہیں) بتایئے روح میرے رب کے حکم سے ہے اور نہیں دیا گیا ہے تمہیں علم مگر تھوڑا سا ۲ے"

۱ے وہ آپ سے اس روح کے متعلق دریافت کرتے ہیں جس سے بدن انسانی کی حیات ہے اور جو اسکی تدبیر کرتی ہے۔

۲ے آپ فرمایئے روح میرے رب کے ارشاد کن سے بغیر کسی مادہ کے پیدا کی گئی ہے جسم کے اجزاء اور اعضاء کی طرح اسکی اصل مادہ سے نہیں ہے۔یہ سوال کرنے والوں کی سمجھ کے قیاس پر بلیغ اسلوب کے ساتھ جواب دیا گیا ہے کیونکہ اس جواب سے روح کی امتیازی شان ظاہر ہو گئی ہے کہ یہ مادیات سے نہیں ہے لیکن جنہوں نے روح کی حقیقت کے متعلق سوال کیا تھا۔اسکے جواب کیلئے مفید نہیں تھے۔تو جواب نہ دینے پر حجت اور وجہ بیان فرمائی کہ

اے روح کی حقیقت دریافت کرنے والو! روح کی حقیقت تم اپنے حواس کے واسطہ سے نہیں سمجھ سکتے کیونکہ معارف نظریہ کیلئے عقل ضروریات سے اکتساب کرتی ہے اور ضروریات جزئیات کے احساس سے حاصل ہوتی ہیں۔اسی وجہ سے یہ کہا جاتا ہے جس کی حس مفقود ہے اس سے علم مفقود ہے۔اور اکثر اشیاء کا ادراک حس نہیں کر سکتی۔اور انکی ذاتیات تک نہیں پہنچ سکتی پس اسمیں سے بعض کا ادراک حس ان کے ان عوارض سے کرتی ہے جنکے ذریعے وہ دوسری اشیاء سے ممتاز ہوتی ہیں۔اور الفاظ کی وضع اشیاء محسوسہ یا ان معقولہ اشیاء کیلئے ہوتی ہے جنکا اکتساب اشیاء محسوسہ کے ذریعے ہوتا ہے۔اسی وجہ سے موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے سوال (وما رب العالمین) کے جواب میں اللہ تعالیٰ کی بعض صفات کا ذکر فرمایا۔یہ آیت کریمہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اہل بصیرت متبعین سے روح کے علم کی نفی کا تقاضا نہیں کرتی کیونکہ انکا علم حواس اور اکتساب پر منحصر نہیں ہوتا بلکہ انکا علم عام انسانوں کے علم سے وراء ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ حواس اور اکتساب کے واسطہ کے بغیر اشیاء کی حقیقتوں کا علم الہام فرماتا ہے کیونکہ انکے دلوں کے کان ہیں جن کے ساتھ وہ ایسی باتیں سنتے ہیں جو ظاہری کان نہیں سن سکتے ان کے دلوں کی آنکھیں ہوتی ہیں جن سے وہ ایسی چیزوں کو دیکھتے ہیں جنہیں یہ ظاہری آنکھیں مشاہدہ نہیں کر سکتیں۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے لَا يَزَالُ عَبْدِيْ يَتَقَرَّبُ اِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰى اُحِبَّهٗ فَاِذَا اَحْبَبْتُهٗ كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِيْ يَسْمَعُ بِهٖ وَبَصَرَهُ الَّذِيْ يُبْصِرُ بِهٖ۔الحدیث(2) یعنی میرا بندہ نوافل

1۔صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 24 (وزارت تعلیم)　2۔صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 963 (وزارت تعلیم)

کے ذریعے میرا قرب حاصل کرتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں اور جب میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں تو میں اس کے کان بن جاتا ہوں جن کے ساتھ وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھیں بن جاتا ہوں جن کے ساتھ وہ دیکھتا ہے۔ الخ۔ اصحاب بصیرت کو روح کی حقیقت کا ادراک ہوتا ہے اور انہیں یہ انکشاف حاصل ہوتا ہے کہ ہر انسان کی ارواح علویہ پانچ ہیں اور چھٹی روح سفلی ہے جسے نفس کہا جاتا ہے اور پانچ ارواح علویہ یہ ہیں: قلب، روح، سر، خفی اور اخفی۔ ان کے نزدیک ان سب میں ذاتی اور صفاتی فرق ہوتا ہے۔ وہ ان ارواح کو اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنی اولاد کو۔ لیکن بعض لوگوں کو ان میں باہم اشتباہ ہو جاتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات یہ ارواح اپنی لطافت کی وجہ سے مراتب وجوب میں مشتبہ ہو جاتی ہیں حتیٰ کہ اس اشتباہ کی وجہ سے بعض لوگ کہہ اٹھتے ہیں کہ میں نے تیس سال روح کی عبادت کی۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس کے سامنے روح کی حقیقت، اس کا امکان اور حدوث ظاہر فرمایا اور وہ بول اٹھا لَا أُحِبُّ الْآفِلِينَ (میں نہیں پسند کرتا ڈوب جانے والوں کو)۔ اگر یہ کہا جائے کہ ابن مردویہ نے عکرمہ کے واسطہ سے روایت کیا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مذکورہ آیت کریمہ پڑھی تو صحابہ کرام نے عرض کا یہ خطاب صرف ہمارے ساتھ خاص ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں بلکہ ہم اور تم سب اس کے مخاطب ہیں۔ صحابہ کرام نے عرض کیا عجیب بات ہے ایک وقت تو آپ فرماتے ہیں وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا ترجمہ "اور جسے عطا کی گئی دانائی تو یقیناً اسے دی گئی بہت بھلائی۔" اور ایک دوسرے لمحہ آپ یہ بات فرماتے ہیں (کہ روح کے متعلق مجھے تھوڑا علم دیا گیا ہے)۔ اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ وَلَوْ أَنَّمَا فِي الْأَرْضِ مِن شَجَرَةٍ أَقْلَامٌ الآیۃ ترجمہ "اور اگر زمین میں جتنے درخت ہیں قلمیں بن جائیں" الخ۔ یہ روایت اس بات کی دلیل ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی روح کی حقیقت نہیں جانتے تھے۔ ہم کہتے ہیں اگر یہ روایت صحیح ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وَمَا أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا میں خطاب فریقین (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام) دونوں کو عام ہے اور یہ بات شک سے بالاتر ہے کہ انبیاء، ملائکہ اور تمام مخلوقات کے علوم اللہ تعالیٰ کے علوم کے مقابلہ میں قلیل ہی ہیں جیسا کہ یہ آیت کریمہ اس پر دلالت کرتی ہے: وَلَوْ أَنَّمَا فِي الْأَرْضِ مِن شَجَرَةٍ۔ الآیۃ۔ اور یہ دونوں امور ایک دوسرے کے منافی نہیں کہ انبیاء کرام علیہم السلام اور ان کے کامل متبعین کو عطا کی گئی حکمت (جس میں حقیقت روح وغیرہ کا علم بھی داخل ہے) فی نفسہ خیر کثیر ہے اور انسان کے ظاہری اور باطنی کمالات کی جامع ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے علم غیر متناہی کے مقابلہ میں یہ بہت قلیل ہے۔

فائدہ: ہماری مذکور تشریح سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ آیت کریمہ مدنی ہے۔ لیکن امام بغوی نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی۔ جس کا واقعہ یوں ہے کہ قریش نے جمع ہو کر باہم مشورہ کیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمارے درمیان امانت اور صدق کی صفات کے ساتھ پروان چڑھے ہیں اور ہم نے ان میں کبھی جھوٹ کا شائبہ تک نہیں دیکھا۔ اب انہوں نے یہ دعویٰ (نبوت) کیا ہے۔ تم ایسا کرو کہ یہود مدینہ کی طرف ایک جماعت بھیجو اور اس مسئلہ کے متعلق ان سے پوچھو کیونکہ وہ اہل کتاب ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ایک جماعت یہودیوں کی طرف بھیجی۔ یہودیوں نے انہیں مشورہ دیا کہ تم ان سے تین چیزوں کا سوال کرو۔ اگر وہ ان تینوں اشیاء کا جواب دے دیں یا کسی کا بھی جواب نہ دیں تو وہ نبی نہیں اور اگر وہ دو کا جواب دیں اور ایک کا جواب نہ دیں تو وہ نبی ہیں۔ تم ان سے پوچھو کہ وہ نوجوان تھے جنہوں نے گزشتہ زمانہ میں بھاگ کر کہیں پناہ لی تھی۔ ان کا واقعہ کیا ہے؟ کیونکہ ان کے لئے یہ عجیب واقعہ ہے۔ دوسرا سوال یہ پوچھو کہ وہ شخص کون تھا جو زمین کے مشرق اور مغرب تک پہنچ گیا تھا، اس کا واقعہ کیا ہے؟ تیسرا ان سے روح

!

کے متعلق دریافت کرو۔ قریش مکہ نے آپ سے تینوں سوال کیے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کل تمہارے استفسارات کا جواب دوں گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان شاء اللہ نہ کہا۔ پس وحی رک گئی۔ مجاہد فرماتے ہیں بارہ دن وحی نہ آئی۔ بعض نے پندرہ دن ذکر کیے ہیں۔ عکرمہ فرماتے ہیں چالیس دن وحی نہ آئی۔ اہل مکہ نے کہنا شروع کر دیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے کل کا وعدہ کیا تھا لیکن اتنا عرصہ گذر گیا ہے لیکن کچھ بتایا نہیں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم وحی کے رک جانے سے بہت پریشان تھے اور اہل مکہ کی دل آزار باتیں بھی انتہائی گراں گزرتی تھیں۔ تو اس پریشانی کی کیفیت کے دوران جبریل امین یہ ارشاد لے آئے وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ۙ اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ ۫ اور ان نوجوانوں کے متعلق یہ نازل ہوا اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَ الرَّقِیْمِ ۙ كَانُوْا مِنْ اٰیٰتِنَا عَجَبًا ۝ ۔ اور شرق وغرب تک پہنچنے والے شخص کے بارے یہ نازل ہوا یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِی الْقَرْنَیْنِ ؕ ۔ اور روح کے متعلق قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ کا ارشاد نازل ہوا(1)۔ امام ترمذی نے یہ واقعہ مختصراً روایت کیا ہے۔ ابن کثیر کہتے ہیں دونوں حدیثوں کو نزول کے تعدد کے ساتھ جمع کیا جا سکتا ہے اور حافظ ابن حجر نے بھی یہی لکھا ہے لیکن یہ لکھا ہے کہ ہو سکتا ہے یہود کے سوال کے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سکوت مزید بیان کی توقع کیلئے ہو۔ اگر دونوں حدیثوں کو تطبیق نہ دی جائے تو جو روایت صحیح میں ہے وہ اصح ہے اور صحیح کی روایت اس لئے بھی ارجح ہوگی کیونکہ راوی واقعہ کے وقت موجود تھے۔ جبکہ ابن عباس کی روایت میں ایسی بات نہیں ہے۔

امام بغوی فرماتے ہیں ابن عباس سے مروی ہے کہ جس روح کے متعلق سوال تھا وہ جبریل ہے۔ الحسن اور قتادہ کا بھی یہی قول ہے(2) میں کہتا ہوں۔ عبد بن حمید اور ابوالشیخ نے الضحاک سے اسی طرح روایت نقل کی ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ روح ایک فرشتہ ہے جسکے ستر ہزار منہ ہیں اور ہر منہ کیلئے ستر ہزار زبانیں ہیں۔ وہ تمام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتا ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں یہ ایک مخلوق ہے جو ابن آدم کی صورت پر ہے انکے ہاتھ پاؤں اور سر ہیں نہ یہ ملائکہ ہیں نہ کھاتے پیتے انسان ہیں۔ سعید بن جبیر فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے عرش کے علاوہ روح سے بڑی کوئی مخلوق پیدا نہیں کی اگر وہ ساتوں آسمانوں ساتوں زمینوں اور جو کچھ ان میں ہے تمام کو ایک لقمہ کے ساتھ نگلنا چاہے تو نگل سکتا ہے۔ انکی تخلیقی صورت ملائکہ کی صورت پر ہے اور چہرے کی شکل آدمیوں کے چہرے جیسی ہے۔ قیامت کی دن وہ عرش کے دائیں جانب ہوگا اور اللہ کے سب سے زیادہ قریب ستر پردوں کے پاس ہوگا۔ اور قیامت کے دن اللہ کے قریب ہوگا۔ وہ اہل توحید کیلئے شفاعت کرے گا۔ اگر اسکے اور فرشتوں کے درمیان نور کا پردہ نہ ہوتا تو اسکے نور سے آسمانی مخلوق جل جاتی۔ عبد بن حمید اور ابن المنذر نے عکرمہ سے روایت کیا ہے کہ روح فرشتوں سے عظیم مخلوق ہے۔ اور کوئی فرشتہ نہیں اترتا مگر اس کے ساتھ روح ہوتا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں روح سے مراد قرآن ہے اور مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ کا معنی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی وحی سے ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں روح سے مراد عیسیٰ ہیں کیونکہ وہ روح اللہ اور کلمۃ اللہ ہیں۔ آیت کا معنی یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نہ تو اس طرح ہیں جیسا کہ یہود نے کہا کہ انہوں نے آپ کی والدہ پر بہتان باندھا اور نہ نصرانیوں کے قول کی طرح ہیں کہ وہ کہتے ہیں آپ اللہ کے بیٹے ہیں۔ بلکہ آپ بغیر باپ کے کن کے کلمہ کے ساتھ اللہ کے امر سے پیدا ہوئے ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمام مخلوق کا علم علم الٰہی کے مقابلہ میں قلیل ہے تو اب نعمت وحی پر آگاہ فرما رہے ہیں تا کہ آپ کفار کی اذیتوں پر صبر کریں۔ نیز اس نعمت کا بھی ذکر کیا جا رہا ہے کہ آپ کو علوم ومعارف کا ایسا سمندر عطا فرمایا جو کسی کو عطا نہیں فرمایا۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 147 (التجاریہ)　　2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 148 (التجاریہ)

وَلَئِنۡ شِئۡنَا لَنَذۡهَبَنَّ بِالَّذِیۡۤ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَیۡنَا وَكِیۡلًا ﴿۸۶﴾

''اور اگر ہم چاہتے تو سلب کر لیتے وہ وحی جو ہم نے آپ کی طرف کی ہے پھر آپ کوئی ایسا وکیل نہ پاتے جو آپ کیلئے اسکے متعلق ہماری بارگاہ میں وکالت کرتا۔ لے''

لے ولئن میں لام قسم محذوف کا پتہ دیتا ہے اور لَنَذۡهَبَنَّ قسم کا جواب ہے جو جواب شرط کے قائم مقام ہے، یعنی اگر ہم چاہتے تو قرآن کو مصاحف اور سینوں سے مٹا دیتے اور پھر آپ کوئی شخص نہ پاتے جو اسکو محفوظ و مسطور لوٹا سکتا۔

اِلَّا رَحۡمَةً مِّنۡ رَّبِّكَ ؕ اِنَّ فَضۡلَهٗ كَانَ عَلَیۡكَ كَبِیۡرًا ﴿۸۷﴾

''سوائے اپنے رب کی رحمت کے (کہ وہ ہمہ وقت آپکے شامل حال ہے) لے یقیناً اس کا فضل (وکرم) آپ پر بہت بڑا ہے۔ ٢''

لے آپ کے رب کی رحمت بھی ایسی چیز ہے جو اسکو پھر لوٹا سکتی ہے۔ اس کلام کو مستثنیٰ منقطع بنانا بھی جائز ہے۔ معنی یہ ہوگا لیکن تیرے رب کی رحمت نے اسے مٹایا نہیں ہے اور قرآن کو سینوں اور صحیفوں میں باقی رکھا ہے۔ اس صورت میں تنزیل کی نعمت کے بعد اسکے باقی رکھنے کا احسان جتلایا جا رہا ہے۔

ٹ تجھ پر اللہ کا بہت بڑا فضل ہے کہ تجھے نبی بنا کر معبوث فرمایا' تجھ پر لاریب کتاب نازل فرمائی۔ پھر مصاحف اور سینوں میں جمع کرنے' اس کو پڑھنے اور اسکے بیان کا التزام خود فرمایا ہے۔ تجھے مقام محمود پر فائز فرمایا' حوض کوثر اور دوسری بیشار نعمتیں عطا فرمائیں۔

امام بغوی فرماتے ہیں ابن مسعود نے فرمایا قرآن کو پڑھو اسکے اٹھائے جانے سے پہلے۔ کیونکہ قرآن کے اٹھائے جانے سے پہلے قیامت قائم نہ ہوگی۔ پوچھا گیا ان مصاحف سے تو اٹھا لیا جائے گا لیکن جو سینوں میں محفوظ ہے وہ کیسے اٹھا جائے گا۔ عبداللہ بن مسعود نے فرمایا رات کے وقت قرآن موجود ہوگا۔ پھر وہ سینوں سے بھی اٹھا لیا جائے گا۔ صبح لوگوں کو کچھ یاد بھی نہ ہوگا اور نہ وہ صحیفوں میں لکھا ہوا پائیں گے۔ پھر وہ شعر پڑھنا شروع کر دیں گے۔ عبداللہ بن عمرو بن العاص سے مروی ہے فرماتے ہیں قیامت اسوقت تک قائم نہ ہوگی یہاں تک کہ قرآن جہاں سے نازل ہوا تھا وہاں واپس چلا جائے گا۔ عرش کے ارد گرد شہد کی مکھیوں کی طرح اس کی آواز ہوگی' اللہ تعالیٰ پوچھیں گے تجھے کیا ہوا قرآن عرض کرے گا یارب مجھے پڑھا تو گیا لیکن مجھ پر عمل نہ کیا گیا(1)۔ میں کہتا ہوں امام بغوی نے اسی طرح ذکر کیا ہے صحیحین میں عبداللہ بن عمرو سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ علم کو بندوں سے اٹھا لے گا لیکن علم کا اٹھانا علماء کے اٹھانے کے ساتھ ہوگا۔ حتیٰ کہ ایک عالم بھی باقی نہ رہے گا لوگ جاہلوں کو اپنا مقتدا بنائیں گے اور ان سے مسائل دریافت کریں گے وہ خود بھی گمراہ ہونگے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے(2)۔

امام احمد اور ابن ماجہ نے زیاد بن لبید سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی چیز کا ذکر فرمایا اور فرمایا یہ علم کے اٹھ جانے کے وقت ہوگا۔ میں نے عرض کی یارسول اللہ علم کیسے اٹھ جائے گا۔ جبکہ ہم قرآن پڑھتے ہیں اور اپنے بیٹوں کو پڑھاتے ہیں۔ پھر قیامت تک سلسلہ در سلسلہ ہمارے بیٹے اپنی اولاد کو پڑھاتے رہیں گے۔ راوی فرماتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے زیاد تجھ پر تیری ماں روئے کہ میں تو تجھے مدینہ طیبہ کے فقیہ اور سمجھدار لوگوں سے سمجھتا تھا کیا۔ یہود و نصاریٰ تورات اور انجیل نہیں پڑھتے لیکن جو کچھ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 149 (التجاریہ)　　2۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 20 (وزارت تعلیم)

انکے احکام ہیں ان پر عمل نہیں کرتے(1)۔ ترمذی نے حضرت عبداللہ بن عمرو سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ دارمی نے ابی امامہ سے اسی طرح روایت کی ہے۔ میں کہتا ہوں عبداللہ بن مسعود نے شاید قرآن کے اٹھائے جانے اور سینوں سے محو ہونے کا قول اس حدیث کی وجہ سے کیا ہے جو انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا علم سیکھو اور لوگوں کو سکھاؤ' علم میراث سیکھو اور لوگوں کو سکھاؤ۔ قرآن سیکھو اور لوگوں کو سیکھاؤ کیونکہ میں وصال پانے والا آدمی ہوں۔ علم اٹھالیا جائے گا۔ فتنے ابھریں گے حتی کہ دو آدمی ترکہ میراث میں جھگڑیں گے تو وہ دونوں کوئی تیسرا شخص فیصلہ کرنے والا نہ پائیں گے۔ اس حدیث کو دارقطنی اور دارمی نے ابن مسعود سے روایت کیا ہے۔ صحیحین کی حدیث کا مقتضی یہ ہے کہ علم کا اٹھانا علماء کے قبض کیساتھ ہوگا، سلب نہیں کیا جائے گا اور زیادکی حدیث کا مقتضی یہ ہے کہ علم کا قبض اس پر عمل کرنے کی توفیق کے اٹھ جانے کیساتھ ہوگا۔ میں کہتا ہوں ان دونوں حدیثوں میں تطبیق اس طرح ہوگی کہ پہلے علم پر عمل کی توفیق اٹھ جائے گی جیسا کہ تو ہمارے زمانہ میں مشاہدہ کرتا ہے۔ پھر علماء کے قبض کے ساتھ مطلقاً علم اٹھ جائے جیسا کہ تم اس زمانہ میں علماء کی قلت کی وجہ سے انتہائی علم کی کمی کا نظارہ کرتے ہو حالانکہ پہلے علماء کی کثرت تھی لیکن تعلیم و تعلم کی توفیق کم تھی۔

ابن اسحاق اور ابن جریر سعید یا عکرمہ کے طریق سے ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ فرمایا سلام بن مشکم یہود کا ایک گروہ لیکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا راوی نے ان یہودیوں کے نام بھی ذکر کیے ہیں۔ یہود کہنے لگے ہم آپ کی اتباع کیسے کریں جبکہ آپ نے ہمارے قبلہ کو چھوڑ دیا ہے۔ اور جو آپ کتاب لائے ہیں اس میں توریت کی طرح کوئی ربط و نسق نہیں ہے۔ ہم پر کوئی ایسی کتاب پیش کر دو جسے پڑھ کر ہی ہم اسکی معرفت حاصل کر لیں ورنہ جیسا کلام آپ نے پیش کیا ہے ایسا تو ہم بھی پیش کر سکتے ہیں۔ تو اللہ تعالی نے یہ آیت نازل فرمائی۔

قُلْ لَّىِٕنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَ الْجِنُّ عَلٰۤى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَ لَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ﴿۸۸﴾

"(بطور چیلنج) کہہ دو کہ اگر اکٹھے ہو جائیں سارے انسان اور سارے جن اس بات پر کہ لے آئیں اس قرآن کی مثل [1] تو ہرگز نہیں لاسکیں گے اسکی مثل [2] گرچہ وہ ہو جائیں ایک دوسرے کے مددگار [3]"

1۔ جن و انس کو چیلنج کرو کہ فصاحت و بلاغت' حسن نظم اور کمال معنوی میں اسکی مثل کوئی کتاب پیش کرو۔

2۔ تو وہ ہرگز اس پر قادر نہ ہونگے حالانکہ ان میں خالص عرب' ارباب البیان' تحقیق' فصحاء و بلغاء اور شعراء موجود ہیں۔ یہ جواب قسم ہے جس پر لام موطیہ دلالت کر رہا ہے۔ اور اگر اس کو جواب قسم نہ بنایا جائے تو یہ جواب شرط ہوگا لیکن جزم اس لیے ظاہر نہیں کیونکہ شرط فعل ماضی ہے۔

3۔ اگرچہ یہ اسی کوشش میں ایک دوسرے کے معاون و مددگار بھی بن جائیں۔ امام بغوی فرماتے ہیں یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب کفار نے کہا لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ "(اگر ہم چاہیں تو ہم بھی اسکی مثل بنا سکتے ہیں) تو اللہ تعالی نے انکی تکذیب فرمائی۔ اس ارشاد میں اعجاز ہے کہ جیسا اللہ تعالی نے فرمایا ویسا ہی ہوا۔ اور وہ مقابلہ کی شدید خواہش کے باوجود ایک چھوٹی سی سورت پیش کرنے پر بھی قادر نہ ہوئے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں اللہ تعالی نے ملائکہ کا ذکر نہیں فرمایا کیونکہ ملائکہ کا اسکی مثل پیش کرنا اسکے معجزہ ہونے سے اس

1۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 303 (وزارت تعلیم)

کو خارج نہیں کرتا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ تو پہلے اس قرآن معجز کو پہنچانے میں واسطہ تھے۔ میں کہتا ہوں اتیان سے مراد اللہ تعالیٰ کی وحی کے بغیر علی سبیل المجادلہ اور معارضہ اپنی طرف سے پیش کرنا ہے اور یہ مسلم ہے کہ ملائکہ بھی غیر مخلوق کلام کی مثل پیش کرنے پر قادر نہیں ہیں۔ لیکن فرشتوں کا ذکر نہیں کیا گیا کیونکہ مذکورہ اتیان کفر ہے اور یہ منکر سے ہی متصور ہو سکتا ہے اور ملائکہ معصوم ہیں ان سے انکار متصور ہی نہیں ہو سکتا' اور وہ اس قرآن پر ایمان رکھتے ہیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ آیت کریمہ لَا تَجِدُ لَكَ بِهِ عَلَيْنَا وَكِيلًا ۝ کی تقریر ہو۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِي هَٰذَا الْقُرْآنِ مِن كُلِّ مَثَلٍ فَأَبَىٰ أَكْثَرُ النَّاسِ إِلَّا كُفُورًا ۝

"اور بلاشبہ ہم نے طرح طرح سے (بار بار) بیان کی ہیں [1] لوگوں کیلئے اس قرآن میں ہر قسم کی مثالیں (تاکہ وہ ہدایت پائیں) [2] پس انکار کر دیا اکثر لوگوں نے سوائے اسکے کہ وہ ناشکری کریں [3]"

[1] ایک چیز کو بار بار مختلف اسلوبوں سے بیان کرنے کو تصریف کہتے ہیں، یعنی ہم نے مختلف وجوہ سے حقیقت کو بیان فرمایا ہے۔

[2] اس قرآن حکیم میں عبرت' احکام وعدہ اور وعید وغیرہ ہر معنی کا بیان ہے۔ اور یہ غرابت' حسن اور نفوس میں اثر پذیری میں مثل کی مانند ہے۔

[3] اثبات میں بھی یہاں مستثنیٰ مفرغ بنانا جائز ہے کیونکہ یہ اثبات نفی کے معنی اور قوت میں ہے۔ معنی یہ ہے ان میں سے اکثر پسند نہیں کرتے مگر جحود اور انکار سے۔

امام بغوی نے عکرمہ عن ابن عباس کے سلسلہ سے لکھا ہے کہ عتبہ' شیبہ جو ربیعہ کے بیٹے تھے۔ ابو سفیان بن حرب' بنی عبد الدار کا ایک شخص (بغوی نے اس کا نام نضر بن حارث لکھا ہے) ابو البختری' اسود بن مطلب۔ زمعہ بن اسود' ولید بن مغیرہ' ابو جہل بن ہشام' عبد اللہ بن ابی امیہ' امیہ بن خلف' عاص بن وائل اور نبیہ اور منبہ جو حجاج کے بیٹے تھے۔ یہ سب اور کچھ اور بد بخت سورج کے غروب ہونے کے بعد کعبہ کی قریب جمع ہوئے۔ بعض نے کہا محمد کی طرف چند لوگ بھیجو جو ان سے بات کریں اور جھگڑا طے کریں تاکہ بعد میں جو کچھ بھی ہو تو ہم معذور سمجھے جائیں۔ انہوں نے مشورہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ایک شخص کے ذریعے پیغام بھیجا کہ تمہاری قوم کے اشراف تمہارے ساتھ بات کرنا چاہتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اسلام کی قبولیت کی حرص میں آپ جلدی جلدی تشریف لے آئے۔ آپ کا گمان تھا کہ کوئی خوشگوار تبدیلی آچکی ہوگی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم انکی ہدایت کے انتہائی خواہاں تھے۔ جب آپ مجلس میں پہنچے تو وہ کہنے لگے اے محمد ہم نے اتمام حجت کیلئے آپ کے پاس پیغام بھیجا ہے۔ ہم قسم اٹھا کر کہتے ہیں کہ جیسے آپ نے اپنی قوم کو مصیبت میں گرفتار کیا ہے ایسا کسی عرب نے پہلے نہیں کیا۔ آپ نے ہمارے آباء کو برا بھلا کہا' ہمارے دین کو معیوب کیا ہمارے دانشمندوں کو بیوقوف کہا، ہمارے خداؤں کو جھٹلایا اور ہمارے اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا۔ کوئی ایسی قباحت باقی نہیں رہی جو آپ ہمارے اور اپنے درمیان نہ لے آئے ہوں۔ اگر آپ اس نئے دین اور نئے کلام سے مال اکٹھا کرنے کے خواہشمند ہیں تو ہم آپ کیلئے اتنا مال جمع کر دیتے ہیں کہ آپ تمام لوگوں سے زیادہ مالدار ہو جائیں گے۔ اگر کسی شرف وحشمت کے متلاشی ہیں تو ہم تمہیں اپنا سردار بنا لیتے ہیں اور اگر آپ بادشاہ بننا چاہتے ہیں تو ہم تجھے اپنا بادشاہ بنا دیتے ہیں۔ اگر کوئی جن تمہارے پاس یہ کلام لیکر آتا ہے اور تم پر اس طرح غالب ہے کہ تم اسے خود دور نہیں کر سکتے تو ہم مال جمع کر کے آپ کا علاج کرا دیتے ہیں (کفار تابع جن کو رئی کہتے تھے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو کچھ

تم نے میرے بارے گھٹیا تصور کیا ہے اس سے میرا نظریہ بالکل بلند اور مختلف ہے میں یہ کلام الٰہی نہ تو مال کی طلب نہ شرف کے حصول اور نہ تمہارے اوپر حکومت کرنے کیلئے لایا ہوں بلکہ اللہ تعالیٰ نے مجھے تمہاری طرف رسول بنا کر بھیجا ہے اور مجھ پر اپنی روشن دلائل سے بھر پور کتاب نازل فرمائی ہے اور اس نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمہیں نیک اعمال پر بشارت اور انکار و بداعمالیوں پر وعید سناؤں۔ میں نے اس احکم الحاکمین کا پیغام تم تک پہنچا دیا ہے اور میں نے تمہیں پورے خلوص اور دلسوزی کے ساتھ نصیحت کی ہے۔ اگر تم میرے احکام کو قبول کرو گے تو دنیا و آخرت میں تمہیں سرفرازی اور نعمتوں سے مالا مال کیا جائے گا اور اگر تم میری تبلیغ کو قبول نہیں کرو گے تو میں امر الٰہی پر صبر کروں گا حتی کہ وہ ہمارے اور تمہارے درمیان اپنا حتمی فیصلہ فرمادے۔ کفار نے کہا اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جو تجاویز ہم نے پیش کی ہیں وہ اگر تمہیں قبول نہیں ہیں تو تجھے معلوم ہے کہ اس پورے علاقہ میں ہم سے زیادہ تنگ دست' سخت زندگی اور تنگ مکان کوئی نہیں ہے' ہمارے لیے اپنے رب سے استدعا کیجئے جس نے تمہیں رسول بنا کر بھیجا ہے کہ ان پہاڑوں نے ہماری وادی کو تنگ کر رکھا ہے۔ ان کو کہیں دور ہٹا دے اور ہمارے علاقہ کو وسیع میدانی علاقہ بنادے اور اس میں اسی طرح نہریں جاری کر دے جیسے شام اور عراق میں ہیں اور یہ بھی دعا کرو کہ وہ ہمارے مردہ آباء و اجداد کو زندہ کر دے اور ان میں ابن کلاب بھی ہو کیونکہ وہ ایک سچا اور راست باز شخص تھا ہم اپنے ان پر بزرگوار) سے پوچھیں گے کہ جو تو کہتا ہے وہ حق ہے یا باطل ہے اگر انہوں نے تیری تصدیق کر دی تو ہم بھی تیری تصدیق کر دیں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری بعثت کا مقصد یہ تو نہیں ہے۔ جو پیغام دیکر مجھے مبعوث کیا گیا تھا وہ میں نے بحسن و خوبی پہنچا دیا ہے۔ اگر تم اسے قبول کرو تو دنیا و آخرت میں تمہارا حصہ ہے اور اگر تم رد کرو تو میں اللہ تعالیٰ کے حکم پر قائم رہوں گا۔ کفار نے کہا اگر تم ایسا نہیں کر سکتے تو اپنے رب سے یہ سوال کرو کہ وہ ہمارے لیے ایک فرشتہ بھیجے جو تمہاری تصدیق کرے اور یہ بھی سوال کرو وہ تمہیں باغات' محلات اور سونے چاندی کے خزانے عطا کرے تا کہ آپ کی یہ مفلسی کی کیفیت دور ہو جائے جو ہم دیکھتے ہیں۔ آپ ہماری طرح بازاروں میں کھڑے ہوتے ہیں، رزق کی تلاش میں مصروف رہتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری بعثت کی یہ بھی غرض و غایت نہیں ہے۔ کفار نے پھر کہا ہم پر آسمان گرا دو جیسا کہ آپ کہتے ہیں کہ میرا رب ایسا کر سکتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ کام بھی میرے رب کے سپرد ہے۔ اگر وہ اسطرح تمہاری درگت بنانا چاہے گا تو ضرور ایسا کر دے گا' ان ازلی بدبختوں میں سے ایک نے کہا لن نؤمن لک حتی تاتینا باللّٰہ والملائکۃ قبیلا یعنی ہم آپ پر ہرگز ایمان نہیں لائیں گے یہاں تک کہ آپ اللہ تعالیٰ کو اور فرشتوں کو ہمارے سامنے لے آئیں۔ جب انہوں نے ایسی لایعنی باتیں کیں تو آپ اٹھ کھڑے ہوئے اور آپ کے ساتھ آپ کی پھوپھی عاتکہ بنت عبدالمطلب کا بیٹا عبداللہ بن ابی امیہ بھی کھڑا ہوا اس نے کہا اے محمد تیری قوم نے تجھ پر چند چیزیں پیش کی ہیں لیکن آپ نے انسے کوئی چیز بھی قبول نہیں فرمائی۔ پھر انہوں نے آپ سے اپنے بارے کچھ استفسار کیے جنکے ذریعے وہ آپکے بارگاہ الٰہی میں مرتبہ کو پہچان سکتے تھے۔ آپ نے وہ بھی مسائل حل نہیں فرمائے۔ پھر انہوں نے آپ سے کہا کہ جس عذاب کی تم صبح شام دھمکی دیتے ہو وہ جلدی سے ہم پر نازل کر دیں تو آپ نے ان کا یہ مطالبہ بھی پورا نہیں کیا۔ قسم بخدا میں آپ پر ایمان نہیں لاؤنگا حتی کہ آپ آسمان طرف سیڑھی لگا کر اوپر آسمان پر چڑھ جائیں اور میں اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کروں پھر آپ اپنے ساتھ ایک کھلا ہوا نسخہ لائیں اور آپ کے ساتھ چار فرشتے بھی ہوں جو آپکی بات کی صداقت کی گواہی بھی دیں۔ قسم بخدا اگر آپ یہ سب کچھ کر بھی دیں تو پھر بھی میں آپ کی تصدیق نہیں کروں گا۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انکی اسلام سے اتنی دوری اور ہٹ دھرمی دیکھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پریشان ہو

کر اپنے اہل کے پاس تشریف لے گئے۔ اسی اثنا میں یہ آیات نازل ہوئیں (1)۔

وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ﴿٩٠﴾

"اور کفار نے کہا ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے آپ پر جب تک آپ رواں نہ کریں ہمارے لیے زمین سے ایک چشمہ لے"

لے وَقَالُوْا کا عطف ابیٰ پر ہے۔ ابن جریر نے ابن اسحاق عن شیخ من اہل مصر عن عکرمہ عن ابن عباس کے طریق سے اور سعید بن منصور نے سعید بن جبیر سے اس آیت کے بارے میں روایت کیا ہے کہ یہ آیت ام سلمہ کے بھائی عبداللہ بن امیہ کے بارے نازل ہوئی (2)۔ لباب النقول میں فرمایا یہ حدیث مرسل صحیح ہے اور ماقبل حدیث کی شاہد ہے اس کی سند کی کمزوری کو پورا کرتی ہے۔ یعنی کفار مکہ نے اعجاز القرآن اور دوسرے معجزات کے بیان کے لزوم کے بعد ہٹ دھرمی اور عناد کی بناء پر لغو مطالبات اور لایعنی فرمائشوں کو پورا کرنے کو کہا کہ ہم آپ پر ایمان نہیں لائیں گے یہاں تک کہ آپ مکہ کی زمین سے ہمارے لیے جاری چشمہ نکال دیں تفجر کو کوفیوں نے تاء کے فتحہ اور جیم کے ضمہ کے ساتھ مخفف مجرد فعل سے پڑھا ہے۔ اور باقی قراء نے تاء کے ضمہ فاء کے فتحہ اور جیم کے کسرہ کے ساتھ مشدد کر کے باب تفعیل سے پڑھا ہے۔ الارض سے مراد مکہ کی زمین ہے۔ ینبوعاً ایسا چشمہ جسکا پانی ختم نہ ہو۔ ینبوع یفعول کے وزن پر نبع الماء سے مشتق ہے۔

اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ﴿٩١﴾

"یا (لگ کر تیار) ہو جائے آپ کیلئے ایک باغ کھجوروں اور انگوروں کا پھر آپ جاری کر دیں ندیاں جو اس باغ کے وسط میں (ہر طرف بہ رہی ہوں) لے"

لے اس آیت میں تفجر باتفاق القراء باب تفعیل سے ہے۔

اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ﴿٩٢﴾

"یا آپ گرادیں آسمان کو جیسے آپ کا خیال ہے ہم پر ٹکڑے ٹکڑے کر کے لے آپ اللہ تعالیٰ کو اور فرشتوں کو (بے نقاب کر کے) ہمارے سامنے لے آئیں ۲"

لے نافع، ابن عامر اور عاصم نے کِسَفًا کو سین کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ کسفة کی جمع ہے جیسے قطعة کی جمع قطع آتی ہے۔ باقی قراء نے سین کے سکون کے ساتھ مفرد پڑھا ہے اور اسکی جمع کسیاف، کسوف یعنی آسمان کا کوئی ایک طبقہ کر دے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اسکا معنی بھی القطع ہے اور سین کے سکون کے ساتھ بھی جمع ہی ہے جسے سدرة کی جمع سدر ہے۔ سورہ شعراء میں حضرت حفص نے سین کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور سورہ روم میں ابو جعفر اور ابن عامر نے سین کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اس کلام سے وہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد اَوْ نُسْقِطْ عَلَيْهِمْ كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ کی طرف اشارہ کرتے تھے۔

۲ ابن عباس اور الضحاک نے کہا قبیلاً کا معنی کفیلاً ہے یعنی اپنی نبوت کی صداقت اور صحت پر بطور گواہ اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کو لے آؤ اور تمہیں ماننے سے جو ہمیں خسارہ ہوگا اسکا کفیل اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کو پیش کرو۔ قتادہ فرماتے ہیں اسکا یہ معنی ہے کہ ہمارے سامنے

1 تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 149-50 (التجاریہ) 2 لباب النقول، جلد 4، صفحہ 267 (التجاریہ)

لاؤ تاکہ اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کو آنکھوں سے دیکھیں جس طرح عشیر بمعنی معاشر ہوتا ہے اس طرح قبیل بمعنی مقابل ہے۔ فراء کہتا ہے یہ عربوں کے قول لقیت فلانا قبیلا وقبلا سے مشتق ہے جسکا معنی دیکھنا ہے۔ قبیلاً ترکیب نحوی کے اعتبار سے اسم جلالت سے حال ہے اور ملائکہ سے جو کلمہ حال ہے وہ محذوف ہے کیونکہ موجود حال محذوف پر دلالت کر رہا ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں یہ قبیلہ کی جمع ہے یعنی فرشتوں کی مختلف اصناف میں سے ایک ایک قبیلہ کر کے لے آؤ۔ اس جمع کے اعتبار سے یہ ملائکہ سے حال ہوگا۔

اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِى السَّمَآءِ ؕ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ؕ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّىْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴿۹۳﴾

''یا تعمیر ہو جائے آپ کے لیے ایک گھر سونے کا[1] یا آپ آسمان پر چڑھ جائیں بلکہ ہم تو اس پر بھی ایمان نہیں لائیں گے کہ آپ آسمان پر چڑھیں یہاں تک کہ آپ اتار لائیں ہم پر ایک کتاب جسے ہم پڑھیں[2] آپ (ان خرافات کے جواب میں اتنا) فرما دیں[3] میرا رب (ہر عیب سے) پاک ہے میں کون ہوں مگر آدمی (اللہ کا) بھیجا ہوا[4]''

[1] زُخْرُف سے مراد سونا ہے اور اسکا اصل معنی زینت ہے یہ عبداللہ بن امیہ کا بکواس تھا۔

[2] اور ہم آپ کے صرف آسمان پر چڑھ جانے کی وجہ سے بھی ایمان نہیں لائیں گے حتی کہ آپ ہم پر کوئی کتاب اتاریں جسکو ہم اپنی آنکھوں سے پڑھیں اور اس میں آپ کی تصدیق ہو اور ہمیں آپ کی اتباع کا حکم بھی ہو

[3] قل کو ابن کثیر اور ابن عامر نے اسے ماضی کا صیغہ یعنی قال (محمد) پڑھا ہے اور باقی قراء نے امر کا صیغہ یعنی قل (یا محمد) پڑھا ہے۔ یعنی آپ انکی نامعقولات تجاویز پر تعجب کرتے ہوئے یا اللہ تعالیٰ کے آنے یا اس پر حکم لگانے یا اسکی قدرت میں کسی کے شریک ہونے کی تردید کرتے ہوئے یہ کہو۔

[4] پاک ہے میرا رب میں کون ہوں مگر بشر اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا یعنی جو تم نے فرمائش کی ہیں وہ انسانی طاقت میں نہیں ہیں بلکہ اگر اللہ تعالیٰ چاہے گا تو جو تم نے مطالبہ کیا ہے اسے پورا کر دے لیکن اسکا دستور یہ ہے کہ وہ بندوں کی تجاویز اور فرمائشوں کے مطابق آیتیں نازل نہیں کرتا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو ایسی نشانیاں اور معجزات عطا فرما دیے ہیں جو اس قسم کے خرافات کے پورا کرنے سے مستغنی ہیں۔ مثلاً قرآن حکیم (جسکی ایک آیت کی مثل تم سب ملکر بھی نہ بنا سکے) ہاتھ کے اشارہ سے آسمان کے اوپر چاند کا کلیجہ شق ہونا' نرم وحسین انگلیوں سے پانی کے چشمے جاری ہونا اور اس قسم کے دوسرے معجزات وغیرہ یہ انکے سوالات کا مجمل جواب ہے اور تفصیل دوسری آیات میں ہے: لَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِىْ قِرْطَاسٍ الایۃ۔ وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ ۔ وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ اَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْاَرْضُ اَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتٰى ؕ ۔ یعنی پہاڑ چلنے لگیں' مردے بولنے لگیں' زمین پھٹ جائے کچھ بھی ہو جائے یہ ایمان نہیں لائیں گے بلکہ سب معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْۤا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰۤى اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْۤا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴿۹۴﴾

''اور نہیں روکا لوگوں کو ایمان لانے سے جب آئی ان کے پاس ہدایت[1] مگر اس چیز نے کہ انہوں نے کہا کہ بھیجا ہے

اللہ تعالیٰ نے ایک انسان رسول بنا کر! (ایسا نہیں ہو سکتا) ہے"

لے اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا محل نصب میں ہے کیونکہ یہ منع کا مفعول ثانی ہے۔ اور ہدیٰ سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن ہے۔ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا یہ منع کا فاعل ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔

ہے یعنی نزول وحی اور ظہور حق کے بعد قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے سے کوئی چیز مانع نہیں تھی سوائے اس کے کہ انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کسی بشر کو رسول مبعوث نہیں کرتا۔ یہ انکار انتہائی غیر سنجیدہ اور غلط ہے کیونکہ عقل اور نقل اس بات پر متفق ہیں کہ رسول ان کی جنس سے ہونا چاہیے جن کی طرف اسے مبعوث کیا جا رہا ہے تاکہ وہ انہیں ان کے رب کے احکامات پہنچائے اور جنسی مناسبت کی وجہ سے وہ اس سے استفادہ کریں۔ اللہ تعالیٰ نے اس حقیقت پر ذیل کے ارشاد سے متنبہ فرمایا۔

قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ﴿۹۵﴾

"فرمایئے اگر ہوتے زمین میں (انسانوں کی بجائے) فرشتے جو اس پر چلتے (اور اس میں) سکونت اختیار کرتے تو ہم (ان کی ہدایت کیلئے) ان پر اتارتے آسمان سے کوئی فرشتہ رسول بنا کر ہے"

لے اے پیارے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) انکے اس لایعنی شبہ کا جواب دو کہ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ۔ اگر زمین پر فرشتے ہوتے جو یہاں چلتے ہوتے اور اس میں سکونت اختیار کرتے آسمان کی طرف نہ جاتے تو وہ بھی اپنے فرائض اپنے جیسوں سے حصول کرتے اور اپنے احکام کو ان سے معلوم کرتے۔

ہے یعنی ہمارا دستور اور حکمت یہی ہے کہ ہر قوم کی طرف انکی جنس سے رسول بھیجتے ہیں تاکہ ان کے لیے استفادہ اور رجوع آسان ہو۔ مَلَكًا ترکیب نحوی کے اعتبار سے رسول سے حال ہے یا اسکا موصوف ہے اور یہی ترکیب بشرا کی ہوگی لیکن ان دونوں احتمالات میں سے پہلا بہتر ہے۔

قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًۢا بَصِيْرًا ﴿۹۶﴾

"فرمایئے کافی ہے اللہ تعالیٰ گواہ میرے درمیان اور تمہارے لے بیشک وہ اپنے بندوں (کے احوال) خوب جاننے والا ہے اور انکے اعمال کو خوب دیکھنے والا ہے ہے"

لے اللہ تعالیٰ گواہ ہے کہ میں تمہاری طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں کیونکہ اس نے میرے دعوی کے مطابق میرے ہاتھ پر معجزات ظہور فرمایا جنہیں یہ حق کہ وہ اس بات پر گواہ ہے کہ میں نے تمہیں وہ پیغامات پوری خوش اسلوبی اور پوری دیانتداری سے پہنچا دیئے جو مجھے عطا کیے گئے تھے۔ لیکن تم نے حق کے ظہور کے بعد ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس لیے اب وہ خود ہی تمہارے اور ہمارے درمیان حق پرستوں کو ثواب اور باطل کے پجاریوں کو عذاب دیکر فیصلہ فرمائے گا۔ شَهِيْدًا ترکیب نحوی کے اعتبار سے حال یا تمیز ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

ہے اپنے ڈرانے والے اور ڈرائے جانے والے بندوں کے احوال ظاہرہ اور احوال باطنہ سے خوب واقف ہے۔ وہ ان کو دیکھ رہا ہے۔

اسکے عمل کی جزا دے گا۔ اس ارشاد میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی اور کفار کو دھمکی دی گئی ہے۔

وَمَنْ یَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَمَنْ یُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِهٖ ؕ وَ نَحْشُرُهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ عَلٰی وُجُوْهِهِمْ عُمْیًا وَّ بُكْمًا وَّ صُمًّا ؕ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِیْرًا ﴿۹۷﴾

''اور جسے اللہ تعالیٰ ہدایت دے وہی ہدایت یافتہ ہے [1] اور جسے وہ گمراہ کردے تو آپ نہیں پائیں گے ان (گمراہوں) کیلئے کوئی مددگار اس کے سوا [2] اور ہم اٹھائیں گے انھیں قیامت کے روز منہ کے بل [3] اس حال میں کہ وہ اندھے گونگے اور بہرے ہونگے [4] انکا ٹھکانا جہنم ہے جب بھی سرد ہونے لگے گی (جہنم کی آگ) تو ہم انکے لیے اس کی آنچ کو بڑھا دیں گے [5]''

[1] نافع نے وصل کی حالت میں یاء کو قائم رکھا ہے لیکن باقی قراء نے دونوں حالتوں میں یاء کو حذف کیا ہے۔

[2] جن کو وہ گمراہ کردے اور رسوا کردے اور شیطان کی وسوسہ اندازیوں سے نہ بچائے تو آپ اللہ تعالیٰ کے سوا انکے لیے کوئی ہدایت دینے والے مددگار نہ پائیں گے۔

[3] اور قیامت کے روز ہم انہیں اٹھائیں گے اس حال میں کہ وہ منہ کے بل چلتے ہونگے یا یہ معنی کہ وہ اوندھے کر کے گھسیٹے جائیں گے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کافر قیامت کے روز منہ کے بل کیسے چلایا جائے گا۔ فرمایا کیا وہ جس نے اسے پاؤں کے اوپر چلایا وہ اسے منہ کے بل چلانے پر قادر نہیں ہے۔ متفق علیہ (1)۔ ابوداؤد اور بیہقی نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لوگ قیامت کے روز تین مختلف حالتوں میں اٹھائے جائیں گے سوار، پیدل اور منہ کے بل۔ ایک شخص نے عرض کی یا رسول اللہ کیا وہ منہ کے بل چلیں گے فرمایا جس نے انہیں قدموں پر چلایا تھا وہ انہیں منہ کے بل چلانے پر قادر ہے (2)۔ امام ترمذی نے بھی اسی طرح یہ روایت نقل کی ہے اور اسے حسن کہا ہے۔

امام ترمذی نے معاویہ بن جندب سے ایک حسن روایت نقل کی ہے فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ تم پیدل اور سوار چلو گے اور منہ کے بل گھسیٹے جاؤ گے (3)۔ نسائی، حاکم اور بیہقی نے حضرت ابوذر سے روایت کیا ہے کہ صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بتایا کہ لوگ قیامت کے روز تین گروہوں میں ہونگے ایک کچھ کھا رہا ہوگا لباس بھی پہنے ہوئے ہوگا اور سوار بھی ہوگا۔ ایک گروہ پیدل چل رہا ہوگا اور دوڑ رہا ہوگا اور ایک گروہ کو فرشتے مونہوں کے بل گھسیٹ رہے ہونگے۔

[4] وہ اندھے ہونگے انہیں کوئی ایسی چیز دکھائی نہ دے گی جو انکی آنکھوں کو ٹھنڈک عطا کرے۔ وہ گونگے ہونگے یعنی نہ تو وہ کوئی حجت پیش کر سکیں گے اور نہ کوئی معقول عذر جو انکا قبول کیا جائے، وہ بہرے ہونگے، کوئی ایسی چیز نہ سنیں گے جو انہیں فرحت عطا کرے کیونکہ دنیا میں وہ نہ آیات الٰہی کو غور سے دیکھتے تھے اور نہ کبھی عبرت کی نگاہ اٹھائی تھی۔ حق کو سننے سے بہرے بنے ہوئے تھے اور سچ بولنے سے انکار کرتے تھے۔ امام بغوی نے حضرت ابن عباس کا قول اسی طرح ذکر کیا ہے۔ پس جب ابن عباس کا قول و تفسیر مراد ہوگی تو اس ایت کریمہ اور جن میں قیامت کے روز مجرموں کا دیکھنا، کلام کرنا اور سننا ثابت ہے، انکے درمیان کوئی منافات نہیں ہوگی۔ جیسے ارشاد ہے وَ

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 966 (وزارت تعلیم) 2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 142 وزارت تعلیم) 3۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 352 (العلمیہ)

قیامت کا انکار کیا اور انھیں معلوم نہ ہوا۔

۲ کہ اللہ تعالیٰ نے زمین آسمان کی بڑی اور شدت کے باوجود انہیں پیدا فرمایا حالانکہ پہلے ان کی کوئی مثال بھی موجود نہ تھی۔

۳ وہ قادر ہے حالانکہ یہ لوگ زمین و آسمان سے بالکل چھوٹے اور کمزور ہیں۔ آسمان و زمین سے انکی تخلیق مشکل نہیں ہے اور یہ بھی مسلم ہے کہ اعادہ ابداء سے مشکل نہیں ہوتا۔

۴ اسکا ان کی خبر پر عطف ہے، یعنی انہوں نے نہ جانا کہ اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمایا ہے انکے لیے ان کے عذاب کا ایک وقت جسکے آنے میں کوئی شک نہیں ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ وقت مقررہ موت ہے۔ بعض فرماتے ہیں قیامت کا وقت ہے۔

۵ حق کے واضح ہونے کے باوجود ظالموں نے انکار کیا۔ الا کفورا سوائے اس کے کہ وہ ناشکری کریں۔ اسکا عطف لم یروا پر ہے یعنی انہوں نے اسکی تخلیق اور مدت مقرر کرنے سے قدرت الٰہی کو نہ پہچانا۔ پس سوائے ناشکری کے انہوں نے ہر چیز کا انکار کیا۔ یہاں ضمیر کی جگہ اسم ظاہر رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ تصریح ہو جائے کہ وہ انکار اور کفر میں ظالم تھے

قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآىِٕنَ رَحْمَةِ رَبِّیْۤ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْیَةَ الْاِنْفَاقِؕ وَ كَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا۠ (۱۰۰)

”فرمایئے اگر تم مالک ہوتے ۱ میرے رب کی رحمت کے خزانوں کے ۲ تو اس وقت تم ضرور ہاتھ ہاتھ روک لیتے اس خوف سے کہ کہیں (سارے خزانے) ختم ہی نہ ہو جائیں۔ ۳ واقعی انسان بڑا تنگدل ہے ۴“

۱ اَنْتُمْ مرفوع ہے ایک ایسے فعل کی وجہ سے جسکی تفسیر تَمْلِكُوْنَ کر رہا ہے۔ تفسیر اور حذف کا فائدہ کلام میں مبالغہ پیدا کرنا اور ایجاز کے ساتھ اختصاص پر دلالت کرنا ہے۔

۲ نافع اور ابو عمرو نے ربی کو یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔

۳ اذا مابعد کی ظرف ہے، یعنی تم غربت و افلاس خوف سے ہاتھ روک لیتے ہو اور بخل کرتے ہو کہ کہیں خرچ کرنے سے ختم ہی نہ ہو جائے اور فقر و تنگ دستی کے ایام نہ آ جائیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں اسکا مطلب خشیۃ النفاد ہے۔ یعنی ختم ہونے کے خوف ہیں۔ عرب کہتے ہیں نفق الشی جب کوئی چیز ختم ہو جائے۔

۴ انسان بخیل اور ہاتھ روک لینے والا ہے کیونکہ اسکی بناء حاجت پر ہے اور وہ جس چیز کا محتاج ہوتا ہے وہ اس پر بخل کرتا ہے اور جو بالکل اسکے برعکس ہے وہ غنی ہے اور کسی چیز کا محتاج نہیں ہے وہ جو موجود ہے اس سے کئی گناہ زیادہ خرچ کرنے پر قادر ہے اس لئے اسکے خزانے ختم نہیں ہوتے۔

وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ فَسْــٴَـلْ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اِذْ جَآءَهُمْ فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّیْ لَاَظُنُّكَ یٰمُوْسٰى مَسْحُوْرًا (۱۰۱)

”۱ اور ہم نے عطا فرمائی تھیں موسیٰ علیہ السلام کو نو روشن نشانیاں آپ خود پوچھ لیں بنی اسرائیل سے ۲ جب موسیٰ آئے تھے ان کے پاس ۳ پھر فرعون نے آپکو کہا اے موسیٰ میں تمہارے متعلق خیال کرتا ہوں کہ تم پر جادو کر دیا گیا

ہے تھے"

۱۔ تِسْعَ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ سے مراد واضح معجزات ہیں۔ ابن عباس اور ضحاک نے فرمایا وہ معجزات یہ ہیں۔ عصا، ید بیضاء، زبان کی گرہ کا کھل جانا، سمندر کا شق ہونا، طوفان، ٹڈی دل، جوئیں، مینڈکوں کی کثرت، برتنوں وغیرہ کا خون سے بھر جانا۔ عکرمہ، مجاہد اور عطاء فرماتے ہیں وہ معجزات یہ ہیں۔ طوفان، ٹڈی دل، جوئیں، مینڈک، خون، عصا، ید بیضا، قحط اور پھلوں میں کمی(1)۔ ایک شخص اپنی بیوی کے ساتھ سو رہا تھا تو دونوں میاں بیوی پتھر بن گئے۔ انکی ایک عورت روٹیاں پکا رہی تھی، وہ بھی پتھر بن گئی۔ محمد بن کعب القرظی نے مسخ، سمندر کا پھٹنا اور طور کا ان کے سروں کے قریب آ کر رک جانا یہ بھی بنی اسرائیل پر ظاہر کی گئی نشانیوں میں سے ہیں، بعض علماء نے آخری تینوں نشانیوں کی جگہ طوفان، قحط اور پھلوں کو ذکر کیا ہے۔

حضرت صفوان بن عسال سے مروی ہے فرماتے ہیں ایک یہودی نے اپنے ایک دوست سے کہا چلو اس نبی کے پاس چلیں۔ اس کے دوست نے کہا اسے نبی نہ کہو اگر اس نے یہ بات سن لی تو اسکی چار آنکھیں ہو جائیں گی (یعنی بہت خوش ہوگا)۔ پس وہ دونوں بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے اور موسیٰ علیہ السلام کے نو معجزات کے متعلق سوال کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (وہ نو آیات یہ ہیں) ۱۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا، ۲۔ چوری نہ کرو، ۳۔ زنا نہ کرو، ۴۔ کسی کو ناحق قتل نہ کرو، ۵۔ کسی بے گناہ کو حاکم کے پاس نہ لے جاؤ تا کہ وہ اسے قتل کر دے، ۶۔ جادو نہ کرو، ۷۔ سود نہ کھاؤ، ۸۔ کسی پاکدامن پر تہمت نہ لگاؤ، ۹۔ میدان جنگ کے دن پیٹھ نہ پھیرو۔ اے یہودیو! تمہارے لیے خاص حکم ہے کہ تم ہفتہ کے دن نافرمانی سے بچو۔ حضرت صفوان فرماتے ہیں ان دونوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ صحیح اور جامع جواب سن کر آپ کے ہاتھ اور پاؤں چومے اور کہا ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے سچے نبی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہیں میری اتباع سے کونسی چیز مانع ہے؟ تو انہوں نے کہا حضرت داؤد علیہ السلام نے دعا مانگی تھی کہ ہمیشہ ان کی اولاد سے نبی پیدا ہوں۔ ہم اس بات سے ڈرتے ہیں کہ اگر ہم نے آپ کی اتباع کی تو یہود ہمیں قتل کر دیں گے(2)۔ اس حدیث کو ابو داؤد، نسائی، ابن ماجہ اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔ امام ترمذی نے اس کو حسن صحیح کہا اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے اور فرمایا ہم اس میں کوئی علت قادحہ نہیں جانتے۔ امام بغوی نے اس طرح روایت کی ہے کہ ایک یہودی نے اپنے دوست سے کہا آؤ ہم اس نبی سے وہ سوال پوچھیں دوسرے نے کہا اسے نبی نہ کہو، اگر انہوں نے سن لیا تو انکی چار آنکھیں ہو جائیں گی۔ ان دونوں نے وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسٰی تِسْعَ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ کے متعلق پوچھا(3)۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں آیات سے مراد وہ احکام عامہ ہیں جو ہر شریعت میں پائے جاتے ہیں۔ ہفتہ کے دن نافرمانی سے یہود کو خاص حکم سنانا جواب میں داخل نہیں ہے بلکہ یہ زائد اور علیحدہ حکم ہے۔ اس لئے اسلوب بیان بھی بدل دیا گیا ہے۔

۲۔ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ بنی اسرائیل کو فرعون سے مانگ لو تا کہ وہ انہیں تمہارے ساتھ بھیج دے یا یہ کہ اے موسیٰ بنی اسرائیل سے ان کے دین کے متعلق دریافت کرو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قراءت بصیغہ ماضی ہمزہ وصلی کے بغیر اس بات کی تائید کرتی ہے کہ خطاب موسیٰ علیہ السلام کو ہے۔ بصیغہ ماضی کی روایت سعید بن منصور نے اپنی سنن میں اور امام احمد نے الزہد میں ابن عباس سے نقل

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 152 (التجاریہ)
2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 142 (وزارت تعلیم)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 152 (التجاریہ)

کی ہے۔

۲؎ اذ ظرف ہے اور قلنا مقدر کے متعلق ہے۔ یا یہ معنی ہے کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم بنی اسرائیل سے اس گفتگو کے متعلق پوچھئے جو موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے درمیان ہوئی تھی جب آپ انکے پاس آئے تھے اور ان نشانیوں کے متعلق پوچھئے تا کہ مشرکین کیلئے آپ کی صداقت ظاہر ہو جائے یا اس لئے کہ آپ کے نفس کو تسلی ہو جائے۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ اگر انکی تجاویز اور فرمائشوں کو پورا کر بھی دیا جائے تو پھر بھی یہ عناد اور ہٹ دھرمی پر قائم رہیں گے جیسا کہ ان سے پہلے لوگ عناد اور ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے رہے ہیں یا آپ بنی اسرائیل سے اس لئے پوچھئے تا کہ آپ کے یقین میں مزید اضافہ ہو جائے کیونکہ دلائل، قوت یقین اور طمانیت قلب کا باعث بنتے ہیں۔ اس معنی کے اعتبار سے اذجاء ھم آتینا کی وجہ سے منصوب ہوگا یا یخبروک مضمر کے متعلق ہوگا۔ اس وجہ سے کہ یہ امر کا جواب ہے۔ یا یہ اذکر مضمر کی وجہ سے منصوب ہے۔ اس صورت میں یہ مستقل کلام ہوگی۔

۳؎ فرعون نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ اے موسیٰ میرا خیال تو یہ ہے کہ تجھ پر جادو کیا گیا ہے۔ یعنی میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ تمہارا دماغ مختل ہو گیا ہے کیونکہ تم ایک محال امر کی طرف دعوت دیتے ہو۔ یعنی تم کہتے ہو کہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں بعض علماء نے مسحور کا معنی حق سے پھرا ہو کیا ہے۔ فراء اور ابو عبیدہ نے مسحور کا معنی ساحر یعنی جادوگر کیا ہے فاعل کی جگہ مفعول کا وزن استعمال کیا گیا۔ محمد بن جریر نے اسکا معنی جادو کی تعلیم دینے والا کیا ہے۔ یعنی یہ سب عجائب تم اپنے جادو کے بل بوتے پر دکھاتے ہو(1)۔

قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَاۤ اَنْزَلَ هٰۤؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ بَصَآىِٕرَ ۚ وَ اِنِّیْ لَاَظُنُّكَ یٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا ۝۱۰۲

"کلیم نے جوابا فرمایا (اے فرعون!) تو خوب جانتا ہے ۱؎ کہ نہیں اتارا ان نشانیوں کو مگر آسمانوں اور زمین کے رب نے ۲؎ یہ بصیرت افروز ہیں اور اے فرعون! میں تیرے متعلق یہ خیال کرتا ہوں کہ تو ہلاک کر دیا جائے گا ۳؎۔"

۱؎ فرعون کے جواب میں موسیٰ علیہ السلام نے کہا لقد علمت کو کسائی نے تاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اس بناء پر کہ موسیٰ علیہ السلام اپنے بارے خبر دے رہے ہیں، یعنی میں جانتا ہوں۔ حضرت علی سے یہی مروی ہے، آپ فرماتے ہیں فرعون خبیث کو تو معلوم ہی نہ تھا کہ موسیٰ علیہ السلام حق پر ہیں وگرنہ وہ ایمان لے آتا لیکن موسیٰ علیہ السلام کو اس حقیقت کا علم الیقین تھا۔ باقی قراء نے علمت کو تاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی اے فرعون تو جانتا ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں وہ اس حقیقت سے آگاہ تو تھا لیکن ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کیا۔ جیسا کہ ارشاد ہے وَ جَحَدُوْا بِهَا وَ اسْتَیْقَنَتْهَاۤ اَنْفُسُهُمْ۔

۲؎ ھؤلاء سے مراد آیات ہیں۔ بصائر جمع ہے بصیرۃ کی۔ یعنی یہ ایسی نشانیاں اور آیات ہیں جو تجھ پر میری صداقت کو آشکارا کرتی ہیں لیکن تو معاند بنا ہوا ہے۔ بصائر پر نصب حال ہونے کی وجہ سے ہے۔

۳؎ ابن عباس فرماتے ہیں مثبورا کا معنی لعنت کیا ہوا ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں ہلاک شدہ۔ قتادہ فرماتے ہیں ہلاک ہونے والا ہے۔ فراء فرماتے ہیں مثبورا ایسے شخص کو کہتے ہیں جو نیکی کی توفیق سے محروم ہو(1) اور شر و فتنہ اسکی سرشت ہو۔ یہ عربوں کے قول ماثبرک عن ھذا۔ یعنی تجھے فلاں چیز سے کسی نے پھیر دیا۔ فرعون کے ظن کے مقابلہ میں موسیٰ علیہ السلام نے بھی ظن کا لفظ استعمال فرمایا لیکن ان

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 153 (التجاریہ)

دونوں ظن کے درمیان بہت شدید بعد ہے کیونکہ فرعون کا ظن باطل تھا اور ان دلائل کے معارض تھا جو یقین کا موجب ہوتے تھے۔ موسیٰ علیہ السلام کے ظن کا مدار یقین تھا کیونکہ اس کی علامات ظاہر تھیں۔

فَاَرَادَ اَنْ یَّسْتَفِزَّهُمْ مِّنَ الْاَرْضِ فَاَغْرَقْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ جَمِیْعًا ﴿۱۰۳﴾

"پس اس نے ارادہ کرلیا کہ بنی اسرائیل کو ملک سے اکھاڑ کر پھینک دے [1] تو ہم نے غرق کردیا اسے اور اس کے سارے ساتھیوں کو [2]"

[1] فرعون نے ارادہ کیا کہ وہ موسیٰ علیہ السلام اور آپ کی قوم کو جلاوطن کردے۔ ارض سے مراد یا تو مصر کی زمین ہے یہ مطلب ہے اور استیصال کے ساتھ انکو زمین سے ہی ختم کردے۔

[2] یعنی جو اس نے موسیٰ علیہ السلام اور آپ کی قوم کے متعلق بد ارادہ کیا تھا ہم نے اس کے برعکس فرعون اور اس کے لشکر کو سمندر میں غرق کردیا۔

وَّقُلْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ لِبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اسْكُنُوا الْاَرْضَ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِیْفًا ﴿۱۰۴﴾

"اور ہم نے حکم دیا فرعون کو غرق کرنے کے بعد بنی اسرائیل کو کہ تم آباد ہو جاؤ اس سرزمین میں [1] پس جب آئے گا آخرت کا وعدہ [2] تو ہم لے آئیں گے تمہیں سمیٹ کر [3]"

[1] "فرعون کو غرق کرنے کے بعد ہم نے حکم دیا بنی اسرائیل کو کہ تم آباد ہو جاؤ اس سرزمین میں جس سے فرعون نے تمہیں نکالنے کا ارادہ کیا تھا۔

[2] وَعْدُ الْاٰخِرَةِ سے مراد گردش زمانہ یا حیات اخروی یا قیامت یا دار الاخرۃ یعنی جنت ہے۔

[3] اکٹھا کر کے لے آئیں گے۔ پھر سعادت مندوں کو بدبختوں سے جدا کیا جائے گا۔ اللفیف مختلف قبائل کے لوگوں کو کہتے ہیں جب وہ اکٹھے اور ملے جلے ہوئے ہوں۔ قیامت کے دن سب اکٹھے ہونگے۔ ان میں کافر مومن نیک و فاجر سب اکٹھے ہونگے۔ بعض نے وعد الاخرۃ کا مطلب کلبی نے یہ لکھا ہے کہ جب عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان سے اترنا ہوگا تو ہم تمام قوموں کو اکٹھا لے آئیں گے اور وہ سب جمع ہو جائیں گے

وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ ؕ وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا ﴿۱۰۵﴾

"اور حق کے ساتھ ہی ہم نے اسے اتارا ہے اور حق کے ساتھ ہی وہ اترا ہے [1] اور نہیں بھیجا ہم نے آپ کو مگر (رحمت الٰہی کا) مژدہ سنانے والا اور (عذاب الٰہی سے) ڈرانے والا [2]"

[1] ظرف کی تقدیم حصر کا فائدہ دینے کیلئے ہے یعنی ہم نے قرآن کو اپنی اس حکمت کے ساتھ نازل کیا ہے جو اس کے انزال کا تقاضا کرتی تھی۔ اور یہ اس حکمت و صدق کے ساتھ نازل ہوا ہے جس پر یہ مشتمل ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اسکا یہ معنی ہے کہ ہم نے اسے آسمان سے فرشتوں کی نگرانی میں محفوظ نازل کیا ہے اور یہ ہمارے رسول پر نازل ہوا ہے تو شیطانوں کی دست برد اور التباس سے محفوظ ہے۔

[1] تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 153 (التجاریہ)

یعنی اس کے اول و آخر میں کہیں بھی باطل کی آمیزش نہیں ہے۔
۲ے اور اے پیارے محمد ہم نے تجھے اطاعت شعاروں کو جنت کی خوشخبری دینے والا اور مجرموں کو جہنم سے ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔ آپ پر صرف پیغام حق سنانا' خوشخبری دینا اور عذاب سے ڈرانا ہے مجبور کر کے ہدایت اور راہ راست پر گامزن کرنا آپ کے ذمہ نہیں ہے۔

وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّ نَزَّلْنٰهُ تَنْزِیْلًا ﴿۱۰۶﴾

"اور قرآن کو ہم نے جدا جدا کر کے نازل کیا ۱ے تا کہ آپ لوگوں کے سامنے اسے ٹھہر ٹھہر کر پڑھیں ۲ے اور ہم نے اسے تھوڑا تھوڑا کر کے اتارا ہے ۳ے"

۱ے وَقُرْاٰنًا پر نصب اس فعل کی وجہ سے جس کی تفسیر فرقناہ کر رہا ہے۔ یعنی ہم نے اسے تھوڑا تھوڑا جدا جدا اتارا ہے اکٹھا نہیں اتارا۔ اس معنی کی تائید حضرت ابن عباس کی قرأت کرتی ہے کہ انھوں نے اسے شد کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ قرآن کا نزول کثیر حصوں میں ہوا تھا اور اسکا نزول بیس سال میں ہوا تھا۔ یا فرقناہ کا معنی تفصیل سے بیان کرنا ہے۔ حضرت الحسن فرماتے ہیں اسکا معنی یہ ہے کہ ہم نے اس میں حق کو باطل سے جدا کر دیا ہے(1)۔ یہاں بھی حذف اسی طرح ہے جیسے ویوما شھدناہ میں ہے۔
۲ے آپ لوگوں پر آہستہ آہستہ پڑھیں کیونکہ یاد کرنے اور سمجھنے کیلئے اسی طریقہ میں آسانی ہے۔
۳ے اور ہم نے اسے واقعات و حادثات کے مطابق تھوڑا تھوڑا اتارا۔

قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖۤ اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖۤ اِذَا یُتْلٰى عَلَیْهِمْ یَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا ﴿۱۰۷﴾

"آپ (کفار کو) کہیے خواہ تم ایمان لاؤ اس پر یا نہ ایمان لاؤ ۱ے بیشک وہ لوگ جنہیں دیا گیا ہے علم اس سے پہلے ۲ے جب اسے پڑھا جاتا ہے ان کے سامنے تو وہ گر پڑتے ہیں ٹھوڑیوں کے بل سجدہ کرتے ہوئے ۳ے"

۱ے اے سراپا حسن و زیبائی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) فرمایئے کہ تم قرآن پر ایمان لاؤ۔ یا ایمان نہ لاؤ۔ یہ بطور تہدید اور وعید ہے۔ تمہارا قرآن پر ایمان لانا یا تمہارا انکار کرنا کسی دوسرے پر تو منفعت کو نہیں لوٹاتا کیونکہ تم ایمان لاؤ گے تو اس سے تمہیں ہی کمال اور عروج نصیب ہوگا اور تم انکار کرو گے تو قرآن کو اس میں کچھ نقصان نہ ہوگا بلکہ تم اپنا ہی زیاں کرو گے۔
۲ے یہ کلام سابقہ کلام کی تعلیل ہے یعنی اگر تم ایمان نہ لاؤ گے (تو کوئی حرج نہیں) تم سے بہتر لوگ اس پر ایمان لا چکے ہیں۔ بہتر لوگوں سے مراد اہل کتاب کے علماء ہیں جنہوں نے سابقہ کتب کا مطالعہ کیا تھا اور وحی کی حقیقت اور نبوت کی علامت پہچان چکے تھے اور حق و باطل میں تمیز کر چکے تھے۔ اور آپکے اوصاف جمیلہ اور جو کچھ آپ پر نازل ہونا ہے اسکو ان کتابوں میں پڑھ چکے تھے۔ بعض علماء فرماتے ہیں موصول سے مراد وہ لوگ ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے دین کے متلاشی تھے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد اسلام قبول کیا مثلاً زید بن عمرو بن نفیل، سلمان الفارسی اور ابوذر وغیرہ۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ جملہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینے کی تعلیل ہو۔ گویا یوں کہا گیا ہے کہ آپ جہلاء کے ایمان کی بجائے علماء کے ایمان سے تسلی حاصل کریں اور جہلاء کے اعراض و

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 153 (التجاریہ)

ہمارا تو ان کی پرواہ نہ کریں۔

ٹ ابن عباس فرماتے ہیں لاذقان سے مراد چہرے ہیں یعنی اپنی پیشانیوں کے بل گر پڑتے ہیں(1)۔ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعظیم کرتے ہوئے اور سابقہ کتب میں بعثت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا جو وعدہ تھا اسکے پورا کرنے کا شکریہ ادا کرتے ہوئے سجدہ میں گر پڑتے ہیں۔ یہ نزول قرآن کے احسان پر بھی سجدہ ریز ہوتے ہیں۔

وَّيَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا ﴿۱۰۸﴾

"اور کہتے ہیں (ہر عیب اور نقص) سے پاک ہے ہمارا رب بلاشبہ ہمارے رب کا وعدہ پورا ہو کر رہتا ہے لہ"

لہ وہ کہتے ہیں ہمارا رب وعدہ خلافی کے عیب سے پاک ہے۔ ہمارے رب کا وعدہ لامحالہ پورا ہوگا یعنی اللہ تعالیٰ نے منتخب شدہ لوگوں سے جو وعدہ فرمایا ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور ان پر قرآن کے نزول کا جو عہد کیا ہے اسے یقیناً پورا ہونا ہے۔

وَيَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ يَبْكُوْنَ وَيَزِيْدُهُمْ خُشُوْعًا ﴿۱۰۹﴾

"اور گر پڑتے ہیں ٹھوڑیوں کے بل گریہ زاری کرتے ہوئے لہ اور یہ قرآن انکے (خضوع) وخشوع کو بڑھا دیتا ہے لہ"

لہ حال کے اختلاف اور سبب کے اختلاف کی وجہ سے یخرون للاذقان کو دوبارہ ذکر کیا ہے۔ پہلا سجدہ وعدے کے پورا ہونے کے وقت شکریہ ادا کرنے کیلئے تھا اور دوسرا سجدہ مواعظ قرآن کے اثر کی وجہ سے کیا۔ یبکون حال ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ یعنی وہ اللہ تعالیٰ کے خوف کی وجہ سے روتے ہوئے سجدہ ریز ہو جاتے ہیں۔ یہاں ٹھوڑیوں کے بل گرنے کا ذکر کیا ہے کیونکہ سجدہ کرنے والے کے چہرہ سے سب سے پہلے ٹھوڑی نیچے زمین کے قریب آتی ہے۔ اور اذقان پر لام علی کے معنی میں اختصاص کیلئے ہے۔

لہ اور قرآن کا سننا ان میں خشوع کا اضافہ کرتا ہے۔ یعنی انکے باطن پر قرآن کی برکات کے نزول کی وجہ سے علم یقین اور خشوع میں اضافہ ہوتا ہے۔

مسئلہ: قرأت قرآن کے وقت رونا مستحب ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو اللہ تعالیٰ کے خوف اور خشیت کی وجہ سے رویا وہ دوزخ میں داخل نہ ہوگا حتی کہ دودھ تھیری میں واپس چلا جائے اور مسلمان کے نتھنوں میں اللہ تعالیٰ کے راستہ میں چلنے کا غبار اور جہنم کا دھواں کبھی اکٹھے نہ ہونگے(2)۔ اس حدیث کو بغوی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے بھی روایت کی ہے اور اس نے اسے صحیح فرمایا ہے۔ بیہقی نے مختلف الفاظ میں روایت کی ہے دو آنکھوں پر دوزخ کی آگ حرام ہے۔ ایک وہ آنکھ جو اللہ تعالیٰ کے خوف سے اشکبار ہوئی اور دوسری وہ جو کفار سے اسلام اور اہل اسلام کی حفاظت کرتے ہوئے بیدار رہی۔ بہز بن حکیم عن ابیہ عن جدہ کے طریق سے مروی ہے، راوی فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ تین آنکھوں پر دوزخ کی آگ حرام ہے (1) وہ آنکھ جو خشیت الٰہی کی وجہ سے روئی، (2) وہ آنکھ جو اللہ تعالیٰ کے راستہ میں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 153 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 154 (التجاریہ)

بیدار رہی(1)، (۳) اور وہ آنکھ اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیزوں کو دیکھ کر جھک گئی۔ اس حدیث کو بھی بغوی نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابو ریحانہ سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دوزخ کی آگ اس آنکھ پر حرام ہے جو خوف خدا میں اشک بار ہوئی۔ اور دوزخ کی آگ اس آنکھ پر حرام ہے جو اللہ کے راستہ میں بیدار رہی اور دوزخ کی آگ اس آنکھ پر حرام ہے جو اللہ کی حرام کردہ چیزوں کو دیکھ کر جھک گئی یا وہ آنکھ جو اللہ تعالیٰ کے راستہ میں پھوڑی گئی۔ اس حدیث کو طبرانی نے الکبیر میں روایت کیا ہے اور اسے صحیح کہا ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس بندہ مومن کی آنکھ سے خوف الٰہی میں آنسو نکلتے ہیں، اگرچہ وہ مکھی کے سر کی برابر بھی ہوں۔ پھر وہ اس کے چہرے پر آنسو لگتے ہیں تو اللہ تعالیٰ دوزخ پر اس شخص کو حرام کر دیتا ہے(2)۔

ابن مردویہ وغیرہ نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن نماز پڑھی پھر دعا مانگی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعا میں یا اللہ یا رحمٰن کہا تو مشرکین نے کہا دیکھو اس شخص کو جس نے پہلا مذہب چھوڑ دیا ہے۔ ہمیں دو خداؤں کے پکارنے سے منع کرتا ہے اور خود دو خداؤں (یا اللہ یا رحمٰن) کو پکارتا ہے(3)۔ تو اللہ تعالیٰ نے ذیل کی آیت نازل فرمائی۔

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَیًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی ۚ وَ لَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَ لَا تُخَافِتْ بِهَا وَ ابْتَغِ بَیْنَ ذٰلِكَ سَبِیْلًا ﴿۱۱۰﴾

"آپ فرمائیے یا اللہ کہہ کر پکارو یا یا رحمٰن کہہ کر پکارو ۱؎ جس نام سے اسے پکارو اسکے سارے نام (ہی) اچھے ہیں ۲؎ تو بلند آواز سے نماز پڑھو اور نہ بالکل آہستہ پڑھو۔ اسے اور تلاش کرو ان دونوں کے درمیان (معتدل) راستہ ۳؎"

۱؎ امام بغوی نے ابن عباس کا قول ذکر کیا ہے کہ ایک رات مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سر بسجود تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ میں یا اللہ یا رحمٰن کا ورد فرما رہے تھے ابوجہل نے سنا تو کہا ہمیں تو ہمارے خداؤں کے نام لینے سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم منع کرتا ہے اور خود دو خداؤں کو پکار رہا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس بات کا رد کرتے ہوئے یہ آیت نازل فرمائی۔ یہ دونوں اسماء ایک ذات کے دو اسم ہیں(4) اگرچہ اطلاق کے اعتبار مختلف ہیں اور یہ توحید ذاتی کے منافی نہیں ہے۔ عبادت کا مستحق صرف ہی ہے اور کوئی نہیں ہے او کا کلمہ تخییر کیلئے ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہود نے کہا آپ الرحمٰن کا ذکر کرتے ہیں حالانکہ یہ لفظ اکثر تورات میں اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمادیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ اور حسن اطلاق اور مقصود تک پہنچنے میں برابر ہیں۔

۲؎ دعا یہاں تسمیہ کے معنی میں ہیں۔ یہ متعدی بدو مفعول ہے لیکن پہلے کو استغناء حذف کیا گیا ہے اور ایًّا ما میں تنوین مضاف الیہ کا عوض ہے اور ما صلہ ہے اور اس میں جو ابہام ہے اسکی تاکید کیلئے ہے اور لہ کی ضمیر پہلے محذوف مفعول کیلئے ہے۔ یعنی ایا ماتدعوہ فلہ۔ یعنی ذات معبود کے اسماء حسنیٰ ہیں اور لہ الاسماء الحسنیٰ جزاء کے قائم مقام ہے اور مبالغہ کیلئے ہے اور دلالت کرنے کیلئے ہے اس مفہوم پر جو اس جملہ پر دلیل ہے۔ اصل کلام یہ ہے کہ تم ان دونوں اسماء (یا اللہ یا رحمٰن) میں سے جس نام کے ساتھ پکارو وہ صحیح اور درست ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے بہت سے اسماء حسنیٰ ہیں ان میں یہ دو اسماء بھی ہیں اور وہ اسماء حسنیٰ اس لئے ہیں کیونکہ وہ

1۔ شعب الایمان، جلد 4، صفحہ 17 (العلمیہ)
2۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 319 (وزارت تعلیم)
3۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 373 (العلمیہ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 154 (التجاریہ)

صفات کمال و جلال اور نقص و زوال سے تنزیہ پر دلالت کرتے ہیں۔ ہم نے اسماء کے متعلق تفصیلی بحث سورۃ الاعراف میں **الاسماء الحسنی فادعوہ بھا** کے تحت کی ہے۔

3۔ یعنی نماز اتنی بلند آواز سے نہ پڑھو کہ مشرکین سن لیں۔ اور اتنی آہستہ بھی نہ پڑھو کہ آپ کے پیچھے کھڑے ہونے والے مومنین بھی نہ سن سکیں۔ بلکہ دونوں کیفیتوں کے درمیان والی کیفیت سے پڑھو۔ کیونکہ متوسط امر بہتر ہوتا ہے۔ یہاں صلوٰۃ سے مراد قرات ہی ہے خواہ فرضی ہو یا نفلی کیونکہ دن کی نماز میں اخفاء کے وجوب پر اجماع ہے اور تواتر کے ساتھ منقول ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ معنی یہ ہو کہ جہاں مشرکین سن رہے ہوں تو اخفاء کرو اور رات کی نمازوں میں متوسط جہر کرو۔ امام بغوی نے بخاری عن ابی بشر عن سعید بن جبیر عن ابن عباس کے طریق اس آیت کریمہ کے بارے میں فرماتے ہیں۔ یہ آیت کریمہ اس وقت نازل ہوئی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چھپ کر نماز پڑھاتے تھے۔ آپ کی قرات بلند ہوتی تو مشرکین قرآن سن کر قرآن کی اور قرآن کو نازل کرنے والے اور اس کو لانے والے کی گستاخی کرتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا **لا تجهر بصلاتك** یعنی بلند آواز سے قراءت نہ کیا کرو تاکہ مشرک سن کر قرآن کی توہین و گستاخی نہ کرتے رہیں اور قراءت کو اتنا آہستہ نہ کرو کہ صحابہ کرام بھی آپ سے آواز نہ سن سکیں۔

بخاری نے ابو بشیر سے اسی سند کے ساتھ روایت کی ہے اور اس میں یہ زائد ہے کہ **وابتغ بين ذالك سبيلا** یعنی صحابہ سن سکیں اتنی بلند آواز سے نہ پڑھو کہ مشرکین سن لیں امام بغوی فرماتے ہیں۔ ایک قوم کا قول ہے کہ یہ آیت دعا کے بارے میں ہے۔ یہی قول حضرت عائشہ نخعی مجاہد اور مکحول رضی اللہ عنہم کا ہے(1)۔ امام بخاری نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے کہ **ولا تجهر بصلاتك ولا تخافت بها** دعا کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ ابن جریر نے ابن عباس سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ پھر پہلی روایت کو ترجیح دی ہے کیونکہ وہ از روئے سند صحیح ہے۔ اسی طرح نووی وغیرہ نے بھی پہلی روایت کو ترجیح دی ہے۔ الحافظ ابن حجر فرماتے ہیں ان دونوں روایتوں کو جمع کرنا ممکن ہے کہ یہ آیت کریمہ نماز کے اندر دعا کے متعلق نازل ہوئی ہے۔

ابن مردویہ نے حضرت ابو ہریرہ کی حدیث نقل کی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب بیت اللہ شریف کے پاس نماز پڑھتے تو دعا کے ساتھ آواز کو بلند فرماتے تو یہ آیت نازل ہوئی(2)۔ میں کہتا ہوں علامہ ابن حجر کی تاویل میرے نزدیک پسندیدہ نہیں ہے۔ کیونکہ دعوات ماثورہ نماز میں اخفاء کے ساتھ ہی منقول ہیں اور سوائے دعاء قنوت کے کسی دعا کے اخفاء کے متعلق اختلاف نہیں ہے۔ اسی طرح ارشاد ہے اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ۔ یہ ارشاد بھی تمام دعاؤں سے اخفاء کا تقاضا کرتا ہے جو نماز کے اندر ہوں یا باہر ہوں۔ پس یہ کہنا بہتر ہے کہ حضرت عائشہ کے قول میں اور حضرت ابو ہریرہ کی حدیث میں بلند آواز سے دعا پڑھنے سے مراد سورۃ فاتحہ ہو کیونکہ وہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کی دعا پر مشتمل ہے اور ابن جریر اور حاکم نے حضرت عائشہ سے جو روایت نقل کی ہے کہ حضرت عائشہ نے **اللھم ارحمنی** کہا تو یہ آیت نازل ہوئی اور حکم ہوا کہ نہ آہستہ کہو اور نہ بلند آواز سے(3)۔ جو امام بغوی نے لکھا ہے کہ عبد اللہ بن شداد نے فرمایا کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سلام پھیرتے تو بنی تمیم کے بدو بلند آواز سے دعا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 154 (التجاریہ)
2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 375 (العلمیہ)
3۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 375 (العلمیہ)

ماتحتنے اللّٰھم ارزقنا مالا و ولدا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی(1) لیکن اس شان نزول کا رد نقل متوارث سے ثابت ہو جاتا ہے۔ اور صحیح حدیث میں جو سبب نزول بیان ہوا ہے اسکے بھی یہ مخالف ہے۔ اس لیے یہ درست نہیں ہے۔ امام بغوی نے ترمذی کے طریق سے عبداللہ بن رباح الانصاری سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکر کو فرمایا میں تیرے پاس سے گذرا تو تو بہت آہستہ قرأت کر رہا تھا تو سیدنا صدیق اکبر نے کہا میں اسے سنا رہا تھا جس سے میں مناجات کرتا ہوں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھوڑا بلند آواز سے پڑھا کرو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر کو فرمایا میں تیرے پاس سے گذرا تھا تو تم بہت بلند آواز سے قرأت کر رہے تھے۔ حضرت عمر نے عرض کی حضور میں سوئے ہوئے لوگوں کو جگاتا ہوں اور شیطان کو بھگاتا ہوں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھوڑا آہستہ پڑھا کرو ابوداؤد وغیرہ نے حدیث ابی قتادہ اس طرح روایت کی ہے۔ ہم نے قرأت بالجہر اور قرأت بالاخفاء کے بعض مسائل سورۂ اعراف میں و اذا قرئ القرآن الخ کے تحت ذکر کر دیے ہیں اور ذکر بالجہر اور ذکر بالخفی کا مسئلہ بھی اسی سورت میں ادعوا ربکم تضرعا الخ کے تحت ذکر کیا ہے۔

فصل

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انداز قرأت

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرأت بلند آواز سے ہوتی اور کبھی پست آواز میں۔ اس حدیث کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے(2)۔

حضرت ابن عباس سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرأت اتنی بلند آواز سے ہوتی کہ جب آپ گھر میں تلاوت فرماتے تو حجرہ میں بیٹھے ہوئے افراد سن لیتے تھے۔ رواہ ابوداؤد(3)۔ حضرت ام سلمہ سے مروی ہے فرماتی ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرأت کا حرف حرف جدا ہوتا تھا(4)۔ اس حدیث کو ابوداؤد، ترمذی اور نسائی نے بھی روایت کیا ہے۔ ام ہانی سے مروی ہے فرماتی ہیں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرأت رات کو سنا کرتی تھی جبکہ میں اپنے بالا خانہ میں ہوتی تھی(5)۔ اس حدیث کو ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ عبداللہ بن قیس سے مروی ہے فرماتی ہیں میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرأت کے بارے پوچھا کہ آپ آہستہ قرأت فرماتے تھے یا جہراً قرأت فرماتے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا کبھی آپ آہستہ قرأت فرماتے اور کبھی جہراً فرماتے تھے(6)۔ میں نے کہا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ جَعَلَ فِی الْاَمْرِ سَعَةً۔ سب تعریفیں اس اللہ کیلئے جس نے معاملہ آسان فرما دیا۔ امام ترمذی فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح غریب ہے۔

ابن جریر نے محمد بن قرظی سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں یہود اور نصاریٰ نے کہا۔ اللہ تعالیٰ نے بیٹا بنایا ہے یا عربوں نے یہ تلبیہ پڑھا لبیک لا شریک لک لبیک الا شریکا ھولک تملکه وما ملک اور صابیوں اور مجوس نے کہا اگر اللہ کے اولیاء

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 154 (التجاریہ)
2۔ سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 194 (امدادیہ)
3۔ سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 194 (امدادیہ)
4۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 116 (وزارت تعلیم)
5۔ شمائل الترمذی، صفحہ 22 (قدیمی)
6۔ سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 210 (امدادیہ)

نہ ہوتے تو وہ درماندہ ہوجاتا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ یَكُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِیْرًا ﴿۱۱۱﴾

"اور آپ فرمایئے سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے نہیں بنایا (کسی کو اپنا) بیٹا اور نہیں ہے جسکا کوئی شریک حکومت وفرمانروائی میں اور نہیں ہے اسکا کوئی مددگار درماندگی میں اور اس کی بڑائی بیان کرو کمال درجہ کی بڑائی [1]"

[1] لَمْ یَكُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ سے مراد یہ ہے کہ الوہیت میں اسکا کوئی شریک نہیں ہے اور اسکی اندر کوئی کمزوری اور درماندگی ہی نہیں کہ کوئی اسکا مددگار ہو اور اپنی ولایت سے اسکی کمزوری اور درماندگی دور کرے اور جنسی اور غیر جنسی شریک کی نفی فرمادی اختیاری اور اضطراری شریک اور معاون کی بھی نفی کردی۔ حمد کو اس پر مرتب فرمایا تاکہ اس بات پر دلالت کرے کہ جنس حمد کا صرف وہ مستحق ہے کیونکہ اسکی ذات کامل ہے ایجاد میں منفرد ہے اور علی الاطلاق منعم حقیقی ہے۔ اسکے علاوہ سب ناقص اور اسکے مملوک ہیں خواہ نعمت ہے یا کوئی نعمت عطا کرنے والا ہے۔ پس ہر حمد کا مرجع اسکی ذات ہے۔ اس لئے کسی شریک یا ولی سے اسکی کمال درجہ بڑائی بیان کرو۔

امام احمد نے اپنی مسند میں اور طبرانی نے سند حسن کے ساتھ معاذ الجہنی سے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آیت عزت یہ ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا الی آخر سورۃ۔ اس آیت کریمہ میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی تنزیہ، تمجید، عبادت اور حمد میں جتنا بھی مبالغہ کرے پھر بھی اسے اسکے حق میں اعتراف عجز ہی کرنا چاہیے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کے روز سب سے پہلے جنہیں جنت کی طرف بلایا جائے گا وہ حمادون ہیں جو خوشی اور تکلیف میں اللہ تعالیٰ کی حمد کرتے ہیں (1) اس حدیث کو طبرانی، بیہقی اور حاکم نے روایت کیا ہے۔ حاکم نے اسے صحیح بھی کہا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حمد شکر کی اصل ہے جس بندہ نے اللہ کی حمد نہیں کی اس نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا نہیں کیا (2)۔ اس حدیث کو بیہقی اور عبدالرزاق نے الجامع میں روایت کیا ہے۔ جابر بن عبداللہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بہتر دعا الحمد للہ ہے اور افضل ذکر لا الہ الا اللّٰہ ہے (3)۔ اس حدیث کو ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ سمرہ بن جندب سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ کلام یہ چار کلمات ہیں۔ ۱۔ لا الہ الا اللّٰہ، ۲۔ اللّٰہ اکبر، ۳۔ سبحان اللّٰہ، ۴۔ الحمد للّٰہ۔ ان کلمات میں جسکو چاہو پہلے پڑھ لو کوئی حرج نہیں ہے (4)۔ اس حدیث کو مسلم اور امام احمد نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ امام بغوی نے مذکورہ بالا چاروں احادیث روایت کی ہیں۔ عمران بن حصین سے مروی ہے کہ قیامت کے روز اللہ کے بندوں میں بہتر بندے حمادون ہونگے۔ اس حدیث کو طبرانی نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابوذر سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب ترین کلام یہ ہے کہ بندہ کہے سبحان اللّٰہ (5) وبحمدہ۔ اس حدیث کو امام احمد، مسلم اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔ حضرت انس سے مروی ہے کہ جب بنی عبدالمطلب کا

1۔ شعب الایمان، جلد 1، صفحہ 91-90 (العلمیہ)
2۔ شعب الایمان، جلد 4، صفحہ 97 (العلمیہ)
3۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 174 (وزارت تعلیم)
4۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 207 (قدیمی)
5۔ مسند احمد، جلد 5، صفحہ 161 (صادر)

کوئی بچہ بولنے لگتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے یہ آیت سکھاتے وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا الآیۃ۔ اس حدیث کو ابن السنی نے عمل الیوم واللیلہ میں روایت کیا ہے۔ اسی طرح ابن السنی نے ہی عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کے طریق سے روایت کی ہے اسی حدیث کو عبدالرزاق اور ابن شیبہ نے اپنی اپنی مصنف میں عمرو بن شعیب سے مفصلاً روایت کیا ہے واللہ اعلم

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَصَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّآلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِیْنَ

سورۂ بنی اسرائیل کی تفسیر مکمل ہوئی اور اسکے ساتھ ان شاء اللہ سورۃ الکہف کی تفسیر ہوگی۔ اس سورت کی تفسیر تین رمضان المبارک ۱۴۲۰ ہجری کو مکمل ہوئی۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ سورۂ بنی اسرائیل کا اردو ترجمہ

انیس 19 رمضان المبارک بعد از نماز عشاء ۱۴۲۰ ہجری بوقت 52-9 بمطابق 28 دسمبر 1999ء مکمل ہوا۔

صَلَّی اللّٰهُ عَلٰی خَیْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِیْنَ۔